دریچۂ دل

نبیلہ عزیز

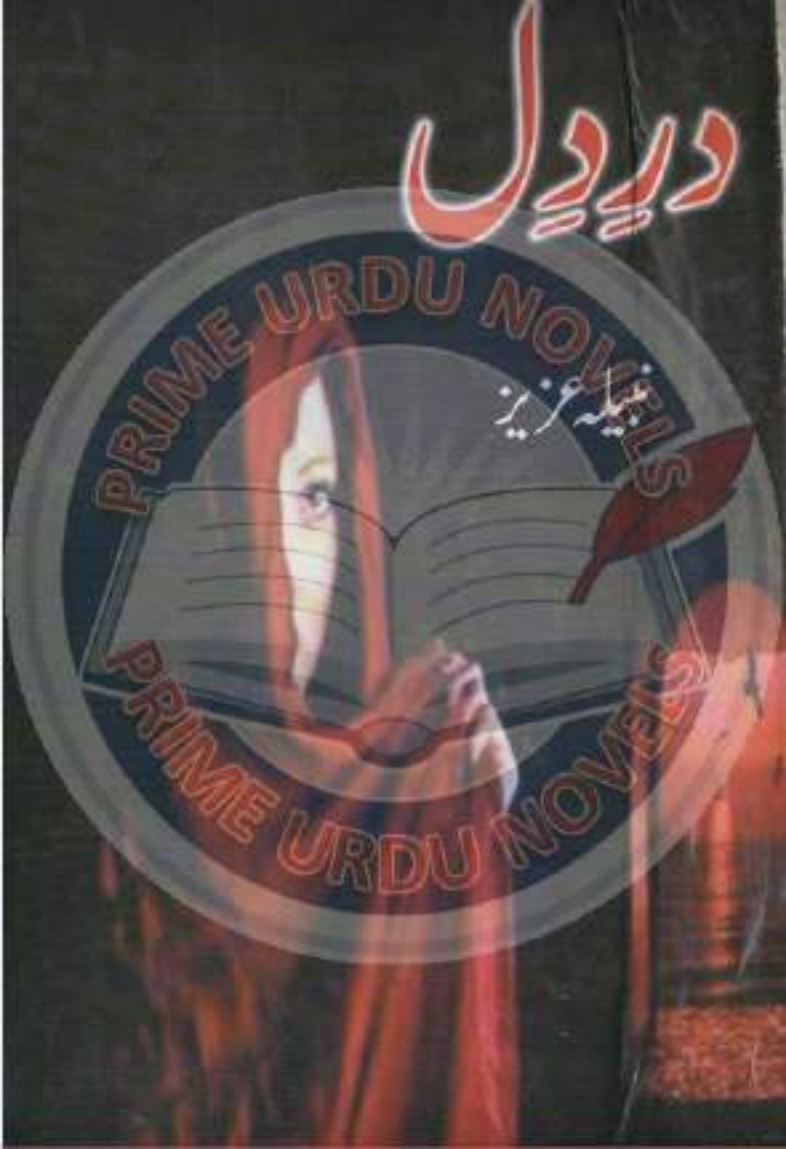

PRIME URDU NOVELS
PRIME URDU NOVELS

محبوں کی لائبریری ایڈمن فرینڈلی پیج
ہمارا مقصد اردو محفل سائٹ کی ممبرشپ کو فروغ دینا ہے
ہمارا پیج ڈائجسٹوں کی کہانیوں کی پوسٹ موجود ہے
دیوان نمبر 13 سے باقاعدہ ہر کہانی

پیش لفظ

السلام علیکم ڈیئر قارئین!

"دردِ دل"

عنوان ہے دوستی کے ایک بے مثال رشتے کا

عنوان ہے قربانی کے ایک بے لوث جذبے کا

عنوان ہے محبت کے ایک گہرے دُکھ کا

عنوان ہے معافی کے ایک رواں سلسلے کا

اور عنوان ہے عشق لاحاصل کے ہجر لاحاصل کا

یہ کہانی ہے انسانی زندگی کے لاتعداد واقعات، حالات اور جذبات کی.....!

زندگی میں کب..... کہاں..... کیا..... ہو جائے.....؟ کچھ پتہ نہیں چلتا..... اور نہ ہی انسان کا کوئی اختیار چلتا ہے کیونکہ واقعات اچانک رونما ہوتے ہیں اور اچانک رونما ہونے والے واقعات کے باعث حالات بھی اچانک بدلتے ہیں اور ان واقعات اور حالات کی وجہ سے جذبات بھی خود بخود ہی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

اس طرح کہ انسان مجبور و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کہانی کے کردار.....!

کبھی کبھی انہی واقعات، حالات اور جذبات کی وجہ سے بڑے بڑے بااختیار لوگ بھی بے بسی کے شکنجے میں دکھائی دیتے ہیں..... اور اکثر انہی واقعات، حالات اور جذبات کی بدولت ایسا بھی ہوتا ہے کہ.....

کبھی دشمنی، دوستی میں ڈھل جاتی ہے کبھی نفرت، محبت تک جا پہنچتی ہے، کبھی انتقام کا عہد کرنے والے تجسس کا اعلان کر ڈالتے ہیں، کبھی اچھے نظر آنے والے اچھے نہیں رہتے اور کبھی "بُرے" لگنے والے بُرے نہیں لگتے.....

اور کبھی کبھی عشق پیدا ہی ہجر کے لیے ہوتا ہے..... اور نامراد ٹھہرتا ہے.....

اور انہی سب چیزوں کو لے کر اس کی کہانی میں، میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ اور بہت سے پہلو دکھانے کی ایک کوشش کی ہے۔ محض ایک کوشش.....!

اور اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں یہ آپ سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا.....

کیونکہ میں نے اگر چار سال اس تحریر کو لکھا ہے تو آپ سب نے اسے چار سال پڑھا ہے.....

لکھاری لکھتے ہوئے چُوک جاتا ہے، لیکن قاری پڑھتے ہوئے کبھی نہیں چوکتا۔ کیونکہ لکھاری لفظوں کے جال میں اُلجھ کر اور تفکرات میں گھر کر لکھتا ہے، جبکہ قاری لفظوں سے لطف اندوز ہو کر اور تفکرات سے آزاد ہو کر پڑھتا ہے، لکھاری لکھتے ہوئے ذمہ داری کا ثبوت دینے کی کوشش کرتا ہے تو قاری پڑھتے ہوئے سمجھ داری کا ثبوت دینے کی کوشش کرتا ہے، لیکن قاری کو پڑھتے ہوئے ایک بات یہ ضرور سوچ لینی چاہیے کہ چار سال کی متحرک زندگی میں ایک چیز کی روانی یا تسلسل کو قائم رکھنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا جتنا

کبھی لفظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، کبھی کردار اور کبھی لکھاری کے حالات.....

اور ان تینوں چیزوں کو سمجھا کرتے کرتے اکثر دماغ سن ہو جایا کرتے ہیں اس لیے ایسے عالم میں اگر لکھاری سے کوئی بھول چوک ہو بھی جائے تو پڑھنے والوں کو چاہیے کہ نظر انداز کر دیں، آخر اس کے لیے اتنا مارجن تو ہونا ہی چاہیے نا..... کیونکہ پڑھنے والوں کے چار گھنٹوں جبکہ لکھنے والے کی چار سالوں کی محنت، محبت اور لگن کا سوال ہوتا ہے اور اس وقت میرے چار سالوں کی محنت، محبت اور لگن کا سوال آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے اور میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں، چاہے وہ جواب تعریف میں ہو، چاہے تنقید میں..... میرے لیے اہم ہی ہوگا..... اس کے علاوہ میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی ادارہ کرن ڈائجسٹ کی ایک انتہائی پیاری اور سویٹ سی مدیرہ ریحانہ احمد کا، جنہوں نے چار سال میرا بھرپور ساتھ دیا اور ''دردِ دل'' تخلیق کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اور آج دردِ دل اس بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے میری پہچان بن چکا ہے اور اس پہچان کو کتابی شکل میں لانے کے لیے ادارہ القریش پبلی کیشنز اور اس کے سرپرست محمد علی قریشی نے جتنی محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے میں ان کی تہہ دل سے مشکور ہوں اور ان کے ادارے کی مزید ترقی و کامرانی کے لیے دعا گو ہوں..... آمین.....!

اور خصوصی شکریہ..... ڈائجسٹ کے اور فیس بک کے ان سب فرینڈز کا، ان سب فیمز کا اور ان سب ریڈرز کا جنہوں نے دردِ دل پڑھا، تبصرہ کیا، لیٹر لکھے، فون کالز کیں، ایس ایم ایس کیے اور میرا ساتھ دیا.....!

اور آئندہ بھی آپ کے ساتھ آپ کی دعاؤں اور آپ کی رائے کی منتظر.....!

''نبیلہ عزیز''

♥♥♥

PRIME URDU NOVELS

اس کے قدم شکستہ تھے، کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں۔ جیسے انسان کے چہرے کے تاثرات، آنکھیں اور زبان بولتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات اپنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم، غم زدہ ہو تو بوجھل، بیمار ہو تو نڈھال قدم، عجلت میں ہو تو تیز قدم، نشے میں ہو تو بہکے قدم، ناکام ہو تو مایوس قدم، بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم، جوان ہو تو مضبوط قدم، بوڑھا ہو تو کمزور قدم، پُرعزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آ کر ہارا ہوا ہو تو "شکستہ قدم" اور آج وہ بھی ایک ہارا ہوا انسان تھا۔ آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ڈائیٹ چکھے تھے۔ کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بوجھل کئی بار نڈھال ہوئے تھے اور کئی بار بہکے بھی تھے۔ لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ ہارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہارا ہوا ایک شکست خوردہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی سکت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اتھاہ گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی نمزدہ بوجھل ذات کا بوجھ بمشکل اُٹھا کر ہسپتال کے پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا اور دور تک پھیلی کشادہ راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ مضبوط انسان وہاں دھواں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھوئیں کی تاریکی اسے سر تا پا اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں یوں کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں پہ ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہو۔ حالانکہ اب سے تھوڑی دیر پہلے تک وہ کافی حد تک مطمئن تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی ایک مدھم سی "اُمید" سانسیں لے رہی تھی۔ اسے جانے والے پہ بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت "مان" ضرور تھا لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان "اکثر" ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور اُمیدیں ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

اگر اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو وہ یقیناً کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا۔ مگر اب..... اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہت تنہا ہو گیا تھا۔ آج اس کی اُمید نے ہی دم نہیں توڑا تھا بلکہ اس کا مان بھی ختم ہو گیا تھا اس کی موہوم سی خوشی بھی بجھ کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہ اس پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں کھڑا ابھی تک کشادہ راہداری کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اتنے زیادہ لوگوں کی بدولت تنگ پڑ رہی تھی اور اب بالکل خالی اور ویران نظر آ رہی تھی۔ بالکل اس کی ذات کی طرح۔

❤

"سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟" ہسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً حاضر ہو گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم ازسرِنو صاف کرنے کی جلدی تھی۔ وہ جواباً کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پہ رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے وہ اپنے شکست خوردہ قدموں سے چل کے بمشکل ہاسپٹل سے باہر پارکنگ تک آیا تھا۔

پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی پاراڈو موجود تھی۔ اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی شاید تنہا واپسی کے احساس نے اس کی تھکن، اس کی شائستگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ تھکے تھکے انداز سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت اٹھی تھی

طرح تازہ تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھتا تھا آج بھی اس کا دل کسی انہونی شے کے خیال سے جیسے مٹھی میں آ جاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یونہی گردن موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ اچانک اس کے سیل فون پہ ہونے والی واہبریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ لب بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیئرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

ہسپتال سے گھر کے گیٹ تک آ کر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا تھا اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

''سلام صاحب۔'' چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھا لے گیا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا وہ اگر کبھی غصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی سہی مگر جواب ضرور دیتا تھا۔ لیکن نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو اس کی گہری چپ اور کسی سنگین مسئلے کا احساس پہلے سامنے میں ہی ہو گیا تھا۔ جب تک چوکیدار نے گیٹ بند کیا تب تک وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا تھا اور آگے پیچھے کچھ بھی دیکھے بنا ڈرائنگ روم کے صوفے پر آ کر ڈھے گیا تھا۔

''سلام صاحب جی۔'' اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پہ رکھے کشن ترتیب سے رکھ رہی تھی اچانک اسے آتے دیکھ کر الرٹ ہو گئی تھی مگر وہ بہت خستہ حال نظر آ رہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر گھبرا گئی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے مالک کی کیفیت کا فوراً اندازہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس پہ چھائی مایوسی اور شکستگی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ آج حقیقتاً دیکھنے والوں کو بھی ''تنہا'' لگ رہا تھا۔ اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے ملازمہ کو بیڈروم سے سگریٹ کا پیکٹ لانے کا کہا تھا اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے تپتے کتاڈوار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا اور اس سے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سو دھوئیں کے مرغولے پھیلتے جا رہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگتا رہا اور دھواں بڑھتا رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کر رہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلب پہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج اچانک۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آنے کو بیتاب ہو گئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فریش ماحول دیکھتے ہی دیکھتے حبس زدہ ہو گیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ اپنے مالک سے بہت پٹتے تھے اس کا اچھا برا انہیں بھی متفکر کر دیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی وجہ پوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں الجھا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حال پہ وہ اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہے تھے۔

وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناکی کا یہ کھیل بھی جاری تھا اور شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرسٹل ٹیبل پہ رکھا موبائل لگاتار ہونے والی واہبریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ ''تڑپ'' یہ کال کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ صرف اپنے آپ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا وہ اپنی تنہائی اپنی شکستگی کی حد دیکھنا چاہتا تھا اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر سر جھٹک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر دوبارہ نیا سگریٹ سلگا لیا تھا آج نہ تو اس کے ذہن پہ سوار بوجھ کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی ہر چیز پہ اک جمود سا طاری تھا سب کچھ جیسے ٹھہر گیا تھا۔ لمحات ساکت ہوئے لگ رہے تھے۔

♥

بڑی حویلی کے انتہائی بلند اور مضبوط در و دیوار پہ سورج کی نوخیز سنہری کرنیں اپنے وجود میں کئی رنگ سمیٹ کر نئے دن کی صبح

دھوپ کے چمکیلے رنگوں سے بے نکھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی خوبصورتی اور تازگی ابھر کر سامنے آ رہی ہو انتہائی نفاست اور اک ترتیب سے سجے گملوں میں پودے طرح طرح کے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور بے حد محنت اور خوبصورتی سے سجائی گئی کیاریاں بھی اپنی گود میں نوخیز صبح کی نشانیاں لیے ہوئے تھیں ہر طرف تازہ پھولوں کی مہک اس طرح پھیلی تھی کہ تمام آنے جانے والوں کو بھی اپنے حصار میں لے رہی تھی ایک پل کے لیے گزرنے والوں کی سانسیں مسحور ہو کے رہ جاتی تھیں اس خوشبو، اس مہک نے پورے لان کا احاطہ کر رکھا تھا مگر اس وقت کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ چند لمحے ٹھہر کر اس خوشبو کی دلفریب سرگوشیاں ہی سن لیتا۔

صرف ایک بوڑھا مالی بابا ہی جو صبح سے شام تک ان خوشبوؤں اور ان پھولوں سے باتیں کرتا تھا پورے لان میں چکراتا رہتا تھا اس کے پاس اور کوئی کام ہی نہیں تھا سوائے ان پودوں کی دیکھ بھال کے اور وہ پورا دن ان کی دیکھ بھال میں ہی گزار دیتا تھا۔ بلکہ دن تو کیا؟ اس نے تو پوری زندگی ہی گزار دی تھی بس ایک اسی لان کو سجاتے سجاتے عمر بیت گئی تھی۔

وہ بچپن سے مالی بابا کو حویلی کا یہ لان ہی سجاتے سنوارتے دیکھتی آ رہی تھی اس کے علاوہ کبھی کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔

''علیزے۔'' وہ بڑی محویت سے مالی بابا کے کام کا جائزہ لے رہی تھی جب اچانک اسے عقب سے پکارا گیا تھا وہ فوراً پیچھے پلٹی تھی۔

''جی پاپا؟'' وقار آفندی اسے پکارنے کے بعد قدم بڑھاتے ہوئے اس کے قریب آ گئے تھے۔

''میں کب سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی دیر سے یہاں کھڑی مالی بابا کو دیکھے جا رہی ہو کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی تھیں؟'' وقار آفندی نے بہت محبت اور فکرمندی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''پاپا! میں صرف یہ دیکھ رہی ہوں کہ ہم لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا لان بس ایسے ہی ہمیشہ ہر وقت سجا سجایا رہتا ہے ہمیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس لان کو سجانے سنوارنے میں مالی بابا کی محنت اور لگن کا کتنا بڑا ہاتھ ہے؟ اس لان کو سنوارنے میں ان کا خون پسینہ ایک ہو جاتا ہے۔'' علیزے نے وقار آفندی کو دیکھتے ہوئے اپنی سوچ بیان کی تھی اور وقار آفندی بیٹی کی اتنی گہری بات پہ ہلکے سے مسکرائے تھے۔

''دیکھو بیٹا ہمیشہ چیز کو سجانے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہوتا ہے اور چیز کو بگاڑنے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہوتا ہے بس فرق اتنا ہے کہ اس دنیا میں کچھ ہاتھ سنوارنے کے لیے بنائے گئے ہیں اور کچھ ہاتھ بگاڑنے کے لیے۔ اور یہ مالی بابا کی خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ان کے ہاتھوں کو کچھ سنوارنے کا ہنر بخشا ہے۔'' علیزے آفندی کا سوال اچھا تھا تو وقار آفندی کا جواب بھی کمال تھا۔

''آپ کا اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا خیال ہے پاپا؟'' اس کا سوال دلچسپ اور گہرا تھا مگر وقار آفندی خود بھلا اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے تھے؟ بس اس سوال پہ مسکرا کے رہ گئے تھے نظر اپنے ہاتھوں پہ تھی۔

''بتائیے نا پاپا!'' اس نے ضد کی تھی اور ضد اس کی فطرت بن چکی تھی۔

''میری جان میں خود اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ البتہ تم جو چاہے کہہ سکتی ہو میرے ہاتھوں کے بارے میں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ہتھیار ڈالوں کی طرح اپنے ہاتھ بیٹی کے سامنے پھیلا دیے تھے۔ اور علیزے نے چند سیکنڈ ان کے ہاتھ دیکھنے کے بعد بے ساختہ ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''میرے پاپا کے ہاتھ بہت اچھے، بہت پیارے ہیں یہ ہاتھ بھی اللہ نے کچھ سنوارنے کے لیے بنائے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان ہاتھوں نے ہمیشہ سنوارا ہی ہے بگاڑا کچھ بھی نہیں۔ ریئلی پاپا آپ بہت اچھے ہیں آپ میرے آئیڈیل ہیں آئی ایم ریئلی پراؤڈ آف یو۔'' وہ ان کے ہاتھوں کو محبت اور عقیدت سے بوسہ دیتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی تھی اور اپنی اولاد کی اتنی والہانہ محبت دیکھ کر وقار آفندی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں کتنی ہی دیر وہ کچھ کہہ نہ سکے تھے۔

ان کے دو بیٹے تھے لیکن جتنی محبت ان کی بیٹی ان سے کرتی تھی اتنا کوئی بھی نہ کرتا تھا۔ وقار آفندی کی زندگی بھی اپنی بیٹی سے شروع ہو کر بیٹی پہ ہی ختم ہوتی تھی دونوں باپ بیٹی کی محبت ایک مثالی محبت تھی۔

''السلام علیکم ڈیڈ۔'' آذر آفندی بلیک پینٹ اور وائیٹ ٹی شرٹ میں ملبوس اپنی ڈیسنٹ سی شخصیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے

سناٹا تھی۔

''والسلام اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو؟'' انہوں نے اپنی مضبوط کلائی موڑتے ہوئے ٹائم دیکھتے ہوئے پوچھا تھا اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ اور وہ لوگ آفس کے لیے آٹھ، نو بجے گھر سے نکلتے تھے۔

''مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ڈیڈ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' آذر کی بات پہ وقار آفندی کے ساتھ ساتھ علیزے نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا انداز دونوں کا استفہامیہ تھا۔

''ابھی رات کو ہی ڈیڈ کو بتانے ان کے کمرے میں بھی گیا تھا کہ میں صبح فیکٹری کی مشینری کا کچھ سامان لینے کراچی جا رہا ہوں اور اس کام میں تین چار دن لگ جائیں گے لیکن ڈیڈ اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ انہیں اس وقت کچھ بھی یاد نہیں۔'' آذر کے جواب پہ وقار آفندی بے ساختہ مسکرائے تھے۔

''ہاں اولاد جوان ہو جائے تو ماں باپ بوڑھے ہی ہو جاتے ہیں۔'' انہوں نے آذر کا کندھا تھپکا تھا۔

''لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیشہ جوان ہی رہیں۔'' آذر کی بات پہ علیزے ہنسی تھی۔

''اوے نہیں بیٹا جوانی بہت بری شے ہے۔ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے یہ جوانی۔ اگر انسان پہ یہ جوانی ہمیشہ رہتی تو دنیا میں پتا نہیں کیا کیا فساد ہوتے اور کیا کیا قیامتیں آتیں۔ شکر ہے کہ یہ خطرناک شے اللہ نے گزر جانے کے لیے بنائی ہے یہ گزر جاتی ہے تو انسان سکون صبر اور بردباری کے لبادے میں آ جاتا ہے جیسے کسی طوفان کی آندھی کے بعد سکون اور سناٹا چھا جاتا ہے کچھ ایسا ہی حال جوانی کے بعد بھی ہو جاتا ہے۔ جوانی جو بن پہ ہو تو دوسروں کو ڈراتی ہے دھمکاتی ہے ڈراتی ہے اور جو جوانی ڈھل جاتی ہے تب دوسروں سے ڈرتی ہے خوف زدہ ہوتی ہے اور روتی ہے اور رونے کا مطلب ہے عاجزی۔ اور عاجزی اللہ کو بہت پسند ہے میرے بچے۔'' وقار آفندی بہت گہرائی سے بولے تھے اور ان دونوں نے بھی انہیں بہت گہرائی سے سنا تھا۔

''صبح صبح اتنی اچھی بات بتانے کے لیے تھینکس، مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔'' آذر ہاتھ ملا کر جانے کے لیے پلٹا۔

''علیزے۔۔۔''

''جی بھائی؟''

''کچھ منگوانا ہے کراچی سے؟'' وہ جہاں بھی جاتا تھا علیزے سے ضرور پوچھتا تھا۔

''جی منگوانا ہے۔'' وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔

''کیا؟'' آذر کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ کچھ منگوا رہی ہے۔

''سمندر۔۔۔'' وہ مسکرا کر شرارت سے بولی تھی۔

''یعنی تم لاہور کو ڈبونا چاہتی ہو؟''

''نہیں میں خود ڈوبنا چاہتی ہوں۔''

''تمہارے لیے تو ایک گلاس پانی بھی کافی ہے ڈوبنے کے لیے۔'' آذر نے چھیڑا تھا۔

''نہیں میں ایسی جگہ ڈوبنا چاہتی ہوں جہاں سے میرا کوئی اتا پتا بھی نہ ملے۔''

''تو پھر سمندر کو لاہور لے کر آنے کی کیا ضرورت ہے تم میرے ساتھ کراچی چلو۔'' آذر اس کی باتوں کا جواب دلچسپی سے دے رہا تھا۔

''مگر میں چاہتی ہوں کوئی خود مجھے ڈبونے کے لیے آئے۔'' علیزے کا لہجہ عجیب سا ہوا تھا۔

''یہ تم سمندر کی بات کر رہی ہو یا کسی انسان کی؟'' آذر ٹھٹکا تھا۔

''بات تو ایک ہی ہے آذر بھائی ڈوبنے والا بھی ظالم ہوتا ہے اور ڈبونے والا بھی ظالم۔ یعنی سمندر بھی ظالم اور انسان بھی۔'' علیزے کا لہجہ بھنور تھا۔

''لگتا ہے پاگل ہو گئی ہو۔'' وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پہ چپت لگا کر آگے بڑھ گیا تھا اور علیزے مالی بابا کے

پاس جا کر باتیں کرتے وقار آفندی کے پاس آ گئی تھی۔

"چلیں پاپا ناشتہ کرتے ہیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ ان کا بازو پکڑتے ہوئے بولی تھی اور وہ اپنی بات ختم کر کے ہی بیٹی کے ساتھ قدم بڑھاتے اندر ڈائننگ روم میں آ گئے جہاں باقی فوج بھی جمع ہو چکی تھی۔

♥

آج موسم بے حد سرد تھا پچھلے کئی دنوں سے انگلینڈ کے تمام شہروں میں لگاتار ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور یہ بارش تمام شہریوں کے لیے ایک معمول بن گئی تھی جیسے یہ بھی ان کی روٹین کا حصہ ہو اور اس بارش کے باوجود وہ اپنے روزمرہ کے کام بہت ہی اچھے طریقے سے نبٹا لیتے تھے ایسی بارشیں ان کی صحت اور کام پہ ذرا اثر نہیں ڈالتی تھیں۔ لیکن آج رات ہونے والی اندھا دھند برف باری نے تمام نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا روزمرہ کی روٹین ڈسٹرب ہو کے رہ گئی تھی تمام سڑکیں، تمام راستے بند ہو چکے تھے۔

آج اندرون اور بیرون ملک جانے والی تمام فلائٹس بھی کینسل ہو چکی تھیں بہت سے شہری اپنے گھروں سے نکلنے سے بھی قاصر تھے کیونکہ ان کے کھڑکیوں، دروازوں کے آگے بھی برف کے پہاڑ کھڑے تھے آج برف چھ سے سات فٹ تک پڑی تھی اور گورنمنٹ کے ملازمین صبح سے سڑکوں اور گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے میں جتے ہوئے تھے اور یہ ان کی پھرتی اور بہادری تھی کہ دوپہر ایک بجے تک وہ گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے بہت سے لوگ برف کے ہٹتے ہی قیدیوں کی طرح گھروں سے باہر نکلے تھے اور ان قیدیوں میں ایک وہ بھی تھی جو گھر سے نکلنے کے لیے بیتاب ہو رہی تھی۔ اس نے گرم مفلر سر اور کانوں پہ لپیٹتے ہوئے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں فائزہ بیگم کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" مفلر لپیٹ کر وہ اپنے ہاتھوں پہ بلیک کلر کے گرم گلوز چڑھانے لگی تھی۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں مدیحہ؟" فائزہ بیگم نے سختی سے کہا۔

"اپنے فرینڈز کے ساتھ جا رہی ہوں مام۔ کسی کے ساتھ بھاگ نہیں رہی آپ فکر نہ کریں۔" مدیحہ دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے خفگی اور ناگواری سے بولی تھی۔

"نبیل تمہارا پاسپورٹ مانگ رہا تھا فرائیڈے کو ہم لوگ پاکستان جا رہے ہیں اس نے ٹکٹ کنفرم کروانے ہیں۔" فائزہ بیگم کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

"میں نے آپ کو کل ہی بتا دیا تھا کہ میں پاکستان نہیں جاؤں گی آپ نے میرا جواب نبیل بھائی کو بتایا نہیں؟" وہ بیرونی دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے اپنے ازلی سرکش لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"بتایا تھا مگر وہ کہتا ہے تم ایک بار پھر سوچ لو تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟ پاکستان میں یا پھر انگلینڈ میں، اگر پاکستان میں رہو گی تو سب اپنوں کے درمیان رہو گی اور اگر انگلینڈ میں رہو گی تو اکیلی رہ جاؤ گی کیونکہ انگلینڈ رہ جانے کی صورت میں تمہیں ہم سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کرنا ہوگا۔" فائزہ بیگم نرم مزاج خاتون تھیں مگر جب ان کا مزاج سخت ہوتا تھا تو پھر نرمی کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا اور ایسا ہی مزاج ان کے بیٹے نبیل حیات کا بھی تھا نبیل بہت نرم خو اور تحمل پسند آدمی تھا جبکہ مدیحہ اپنے باپ کی کاپی تھی خود سر، ضدی اور ہٹ دھرم۔ اتنی تیکھی بات کرتی کہ سننے والے کو آگ لگ جاتی تھی یہاں تک کہ وہ باپ کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی تھی البتہ نبیل غصے میں ہوتا تو اس سے دب جاتی تھی اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

"آپ لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"نہیں ہم حقیقت بتا رہے ہیں۔"

"تو پھر آپ لوگ میری حقیقت کیوں نہیں سمجھتے؟ میں پاکستان نہیں جا سکتی میں وہاں کبھی بھی ایڈجسٹ نہیں کر سکتی پاکستان از ناٹ مائی کنٹری۔" مدیحہ پاؤں پٹخ کر چیخی تھی۔

"یہ بات تم نبیل کو بتانا۔ شاید وہ تمہاری حقیقت سمجھ جائے۔" فائزہ بیگم سپاٹ سے انداز میں کہہ کر پلٹ کے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھی اور مدیحہ غصے سے بیرونی دروازہ دھڑام سے بند کر کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

برف سے اٹے روڈ ابھی بالکل صاف نہیں ہوئے تھے اس لیے وہ اپنی گاڑی لیے بغیر پیدل ہی چل پڑی تھی۔

"ہائے میڈی۔" کرسٹینا اسے دیکھتے ہی قریب آ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''آج شیلے اور برائن کا برتھ ڈے ہے اس لیے مارکیٹ سے گفٹ لینے جا رہی ہوں۔'' وہ دونوں روڈ پہ ایک ساتھ پیدل چل رہی تھیں اور دونوں نے ہی اپنے ہاتھ لانگ کوٹ کی جیبوں میں پھنسا رکھے تھے۔

''میں نے تو ان کو رات کو ہی وش کر دیا تھا۔'' کرسٹینا فخریہ بولی۔

''کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے رات کو جلدی سو گئی تھی اور ویسے بھی پارٹی تو آج ہی ہے نا؟'' مدیحہ بہت ہی نارمل سے لہجے میں بات کر رہی تھی اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب وہ کہیں اُلجھی ہوئی ہوتی تھی۔

''طبیعت تو تمہاری اب بھی خراب لگ رہی ہے۔'' کرسٹینا نے اسے غور سے دیکھا۔

''میں بہت ڈسٹرب ہوں کرسٹی۔'' بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا اور پھر شام کو شیلے اور برائن کی برتھ ڈے پارٹی میں بھی مدیحہ کی ڈسٹربنس کی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

''یہ لو ساری ڈسٹربنس کا حل۔'' جیری نے وائن کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا جیری اس کا بہت کلوز فرینڈ تھا وہ مدیحہ کی پرابلم جانتا تھا۔

''نہیں یار موڈ نہیں ہے۔'' اس نے گلاس پیچھے ہٹا دیا تھا۔

''ایک بار ہونٹوں سے تو لگاؤ موڈ خود بخود بن جائے گا۔'' جیری نے اسے چھیڑا تھا۔

''جیری پلیز میرے لیے مسئلے کا حل نشے میں نہیں ہے بلکہ کچھ سوچنے میں ہے، سمجھے سوچنے دو۔'' مدیحہ چڑ چڑی ہو رہی تھی۔

''یار وہ دیکھو وہ لوگ بھی کچھ دیر پہلے بہت پریشان تھے اب کیسے بے فکر ہو کر زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔'' جیری نے ایک لڑکی اور لڑکے کی جانب اشارہ کیا جو اس ہال کے ایک کونے میں کھڑے نشے میں بے سدھ تمام حدود کو کراس کر چکے تھے اور یہی حال موجود تمام ینگ لڑکے لڑکیوں کا بھی۔

''تم جانتے ہو جیری مجھے ایسا کچھ بھی پسند نہیں ہے۔''

''ایک بار یہ چکھ لو پھر سب کچھ پسند آ جائے گا۔'' وہ اسے شراب پینے پہ اُکسا رہا تھا۔

''ایم سوری۔'' اس نے پھر انکار کر دیا اور پھر جیری کی لاپروائی سے کندھے اچکا کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد مدیحہ کو جیری کرسٹینا کے ساتھ مصروف نظر آیا تھا وہ بھی جسمانی طلب سے غرق تھے مدیحہ اکیلی بیٹھی تھی اور پھر نہ جانے کیوں اور کب مدیحہ نے وائن بھرا گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا وہ بیٹھے بیٹھے چند اور پیگ بھی چڑھا گئی تھی اور جب فل ہو گئی تو اُٹھ کر باہر نکل آئی تھی۔

♥

تیری اس ادا سے بھی ہوں آشنا، مجھے اتنا جس پہ غرور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی، مجھے زندگی کا شعور ہے
جو سمجھ لیا تجھے بے وفا، تو پھر اس میں تیری بھی کیا خطا؟
یہ خلل ہے میرے دماغ کا، یہ میری نظر کا قصور ہے
کوئی بات دل میں وہ ٹھان کے، نہ اُلجھ پڑے تیرے شان سے
وہ نیاز مند جو کہ سر بہ خم کئی دن سے تیرے حضور ہے
میں نکل کے بھی تیرے دام سے، نہ گروں گا اپنے مقام سے
میں قتیل جور و ستم سہی، مجھے تم سے عشق ضرور ہے!
مجھے تم سے عشق ضرور ہے
مجھے تم سے عشق ضرور ہے

ڈائری کے خوبصورت صفحات پہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار لکھتے لکھتے آخری جملے پہ ٹھہر سی گئی تھی اور اس کا پین اسی ایک جملے کو

بار بار تحریر کرتا جا رہا تھا۔ ''مجھے تم سے عشق ضرور ہے'' یہ جملہ اس کا پین ہی نہیں اس کی دھڑکنیں بھی دل کے کاغذ پہ بار بار لکھتی جا رہی تھیں اس کا دل اس جملے پہ ہمک رہا تھا اور وہ اس جملے کو بار بار لکھنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

''محترمہ اب بس کرو کتنا لکھو گی اس جملے کو؟'' نگارش نجانے کب چپکے سے کمرے میں داخل ہوئی اور دبے قدموں سے چلتی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی ڈائری میں شاعری لکھنے میں ایسی محو تھی کہ اس کی آمد کا ذرا احساس نہیں ہوا تھا اور نگارش کی اچانک ابھرنے والی آواز پہ بُری طرح گڑبڑا گئی اور اس گڑبڑاہٹ نے کام خراب کر دیا تھا اس کا ہاتھ جھٹکنے سے پورا صفحہ داغ دار ہو گیا تھا اتنی خوبصورتی اور نفاست سے لکھے اشعار بدنما سے نظر آنے لگے تھے جس پہ نگارش کو تو بے حد افسوس اور ندامت بھی ہوئی تھی مگر وہ چپ چاپ عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہ گئی اس کی آنکھوں میں ہلکے سے دُکھ کا عکس تھا۔

''زری ایم سوری یار! ایم ریئلی ویری سوری۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی محویت سے لکھ رہی ہو۔'' نگارش کو گہری شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔

''اٹس اوکے بھابی چند الفاظ ہی تھے نا جو مٹ گئے کون سا قسمت کا لکھا مٹا ہے جس پہ افسوس کیا جائے؟'' زری چند لمحے بعد بغور لفظوں کی بگڑی حالت دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر نگارش کی سمت متوجہ ہوئی تھی۔

''آپ میرے بیڈ روم میں بدروحوں کی طرح کیوں چکر لگا رہی ہیں؟ عبداللہ بھائی کہاں ہیں؟'' اس نے سوال کرتے ہوئے ٹیبل پہ بکھری شاعری کی کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

''وہ نیچے نیل بھائی کے پاس بیٹھے ہیں۔'' نگارش چلتی ہوئی زری کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ رکی تھی جہاں بہت سی انگریزی پرفیومز کا کلیکشن سجا تھا وہ یونہی پرفیومز اٹھا اٹھا کر چیک کرنے لگی تھی۔

''یار یہ ''ہاٹ فرینڈ'' کی خوشبو تو مدہوش کر کے رکھ دیتی ہے۔'' نگارش پرفیوم اپنی آستین پہ اسپرے کرتے ہوئے مسحور لہجے میں بولی تھی۔

''لیکن جس نے یہ خوشبو دی ہے وہ کبھی بھی مدہوش نہیں ہونے دیتا نہ اپنی قربت میں، نہ اپنی محبت میں اور نہ اپنی فرقت میں۔'' زری نگارش کے ہاتھ میں موجود پرفیوم کی خوبصورت سی شیشی دیکھ کر بس سوچ کے رہ گئی تھی۔

''زری یہ پرفیوم برتھ ڈے پہ تمہیں کس نے گفٹ کیا تھا؟'' نگارش نے بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔

''پتا نہیں اتنے زیادہ گفٹس تھے اب تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں ہے۔'' حالانکہ اس کے دل پہ لکھا تھا کہ یہ پرفیوم کس نے دیا ہے؟

''ہوں ایسے ہے بہت قیمتی اور بہت کمال کی خوشبو ہے۔'' نگارش نے دوبارہ تعریف کی لیکن زری اسے اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ تمہیں پسند ہے تو تم رکھ لو۔

''نیل کے ساتھ مدیحہ نہیں آئی؟'' زری بات ٹالنے کو بولی تھی۔

''مدیحہ آتی تو اس وقت تمہارے سامنے ہوتی۔''

''یعنی نیچے دونوں مرد حضرات اکیلے ہیں؟''

''جی جناب اکیلے ہیں اور میں ان دونوں میں مس فٹ تھی اس لیے تمہارے پاس آ گئی۔'' نگارش ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹ کر بیڈ پر آ بیٹھی تھی۔

''مدیحہ بہت دنوں سے ہمارے گھر نہیں آئی کیا مسئلہ ہے؟'' زری کو تشویش ہوئی تھی کیونکہ بہت دنوں سے نیل ہی دو تین بار آیا تھا مدیحہ نے تو شکل بھی نہیں دکھائی تھی۔

''مسئلہ گمبھیر ہے یار۔'' نگارش سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی تھی جبکہ زری ٹھٹک سی گئی۔

''کیا مطلب؟''

''نیل بھائی اور فائزہ آنٹی پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں نیل بھائی نے اپنا سارا بزنس وائنڈ اپ کر لیا ہے اور فرانچائز کے لیے کوشش بھی کر دار ہے ہیں مگر مدیحہ اپنا پاسپورٹ نہیں دے رہی وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی، اس نے صاف انکار کر دیا ہے ان کے گھر میں کافی مسئلہ چل رہا ہے آج کل۔'' نگارش کے ساری بات بتانے پر زری خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

''وہ پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتی؟''

''یار یہ تو وہ بتا سکتی ہے کہ وہ کیوں نہیں جانا چاہتی؟'' نگارش نے کندھے اچکائے تھے۔

''کہیں کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے؟'' زری نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''سوچا تو میں نے بھی یہی ہے۔'' نگارش نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''لیکن بھائی اگر وہ کسی کو پسند کرتی تو مجھے ضرور بتاتی۔ وہ اپنی باتیں چھپاتی نہیں ہے۔'' زری ڈانواڈول تھی۔

''پھر پتا نہیں کیا چکر ہے اس نے فائزہ آنٹی کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ پاکستان نہیں جائے گی۔''

''ہوں۔ میں بات کروں گی اس سے، اگر وہ نہ آئی تو میں صبح خود جاؤں گی اس سے ملنے۔'' زری چھوٹا سا کشن گود میں لے کر نیچے فلور کشن پہ بیٹھ گئی تھی۔

''تم بھی تو پاکستان جانا چاہتی ہو تم کب جاؤ گی؟'' نگارش نے اس پہ نظریں جماتے ہوئے ذومعنی لہجے میں پوچھا تھا اور زری کی نظریں بے ساختہ اس جملے پہ جھک گئی تھیں۔

''کیا مجھ سے تنگ آ گئی ہیں؟'' وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

''ارے میری جان دل والوں سے کون تنگ آ سکتا ہے؟'' نگارش نے بیڈ پہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا جھک کر زری کا گال کھینچا تھا۔

''کیا مطلب دل والوں سے؟'' وہ انجان بنتے ہوئے بولی تھی۔

''مطلب یہ کہ تم دل والی ہو، لیکن افسوس یار'' وہ دل والا نہیں دماغ والا ہے وہ دماغ سے سوچتا اور دماغ سے ہی کرتا ہے اور تم دل سے سوچتی ہو اور دل سے کرتی ہو۔ بے شک وہ سراپا دل ہے مگر پھر بھی اس پہ دماغ حاوی رہتا ہے۔ وہ سوچ کا پرندہ ہے اور تم محبت کی چڑیا ہو، بہت دلچسپ جوڑی ہے۔'' نگارش نے وہ سب کہہ ڈالا جو زری دل میں لیے پھرتی تھی زری کا حال دل عیاں ہو جانے پہ بڑی حیرت ہوئی تھی۔

''بھائی آپ کو کیسے؟'' اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔

''سویٹ ہارٹ تم بھول رہی ہو کہ میں بھی ''ایک دل والی'' ہی ہوں میری تمہارے بھائی سے لو میرج ہے، میں نے بھی محبت کی ہے، میں بھی محبت کے استاد کی شاگرد رہ چکی ہوں بس فرق اتنا ہے کہ ہمیں ڈگری مل گئی ہے اور تم ابھی زیر تعلیم ہو۔ تمہارا امتحان ابھی باقی ہے۔'' نگارش کی شاعرانہ سی باتوں پہ زری کو خوشگوار حیرت اور خوشی ہوئی گویا اسے کوئی رازداں، کوئی غمگسار مل گیا تھا، اب وہ بھی سب کی طرح اپنے دل کی بات میں کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی، اب وہ بھی گھٹ گھٹ کے جینے کے بجائے کھل کے سانس لے سکتی تھی۔

''بھائی آئی لو یو سو مچ یار آئی لو یو سو مچ۔'' زری بے ساختہ اٹھ کر نگارش سے لپٹ گئی تھی۔

''پاگل لڑکی تم خود ہی اس بات کو چھپاتی تھیں اس لیے کبھی میں نے بھی ذکر نہیں کیا۔'' نگارش نے اس کے گال پہ پیار کیا تھا۔

''میں..... میں ڈرتی ہوں بھائی مجھے تشہیر ہونا اچھا نہیں لگتا اور پھر عبداللہ بھائی کا خیال دامن پکڑ لیتا ہے۔ وہ کیا سوچیں گے میں ان کے دوست سے۔'' زری کہتے کہتے لب بھینچ گئی تھی۔

''زری تمہیں پتا ہے نا جس دوست کی تم بات کرتی ہو وہ نبیل اور عبداللہ کی جان ہے وہ تینوں دوست اک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں ایسے میں اگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے یا تم سے شادی کرتا ہے تو مجھے پتا ہے عبداللہ بہت خوش ہوں گے اس سے بڑھ کر اور خوشی بھلا کیا ہوگی کہ ان کی بہن دلہن بن کے ان کے دوست کے گھر جائے۔'' نگارش نے بات کرتے ہوئے زری کی آنکھوں میں دیکھا اس کی آنکھوں میں بہت سی چاہت کے دیے روشن تھے۔

''مگر بھائی وہ بہت ہی پتھر انسان ہے اس نے کبھی مجھے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کبھی میرے لیے اپنے ہونٹوں سے اک حرف تک ادا نہیں کیا۔'' اسے شکایت ہوئی دل کے وہم و دو سے دل سے نکل کر چہرے پر پھیل گئے تھے۔

''وہ تمہاری عزت کرتا ہے اس لیے ایسا کرتا ہے۔'' نگارش نے سچ کہا تھا لیکن زری کو اس سچ سے وحشت اور بیزاری ہوئی تھی۔

''اتنی عزت؟ صرف میری ہی کیوں؟ مدیحہ کی کیوں نہیں کرتا؟ مدیحہ بھی تو نبیل کی بہن ہے۔ اسے دیکھتا بھی ہے اس سے

تی بھی کرتا ہے اس کے ساتھ ہنستا بھی ہے اور اس پہ غصہ بھی کرتا ہے۔" زری کی شکایتوں کا منہ کھلا تو یکدم بچھڑ گئی۔ جس پہ نگارش بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسی تھی۔

"سچ کہتے ہیں محبت میں تو ہواؤں سے بھی رقابت ہو جاتی ہے یہ تو پھر مدیحہ ہے اس کی منہ بولی بہن۔" نگارش ابھی بھی ہنس رہی تھی۔

"پگلی اگر تم غور کرو تو مدیحہ رشتے میں تمہاری نند ہوگی کیونکہ وہ مدیحہ کو بہن سمجھتا ہے اور یہ مدیحہ جو آج کل فائزہ آنٹی اور نبیل کے بھائی کے قابو میں نہیں آ رہی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو مدیحہ کب کی پاکستان جانے کے لیے مان چکی ہوتی۔" زری نگارش کی بات پہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی کیونکہ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی اس کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی وہ شروع سے مدیحہ کو ہی بہن سمجھتا آ رہا تھا اور مدیحہ بھی اس سے خاصی فرینک اور کلوز تھی لیکن زری شکایت کرتے ہوئے یہ بھول گئی کہ وہ کس رشتے پہ شکوہ کر رہی ہے؟

"کیا ہوا چپ کیوں ہو گئی ہو؟" نگارش نے اسے چھیڑا۔

"بس ایسے ہی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"یہ ٹائٹ فرینڈ" اسی نے گفٹ کیا ہے نا؟" اس کے انداز میں شرارت تھی اور زری نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ جس پہ نگارش ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی تھی اور زری نے خفت چہرہ جھکا لیا تھا۔

♥

وہ رات کو سونے سے پہلے صبح چھ بجے کا الارم سیٹ کر کے سویا تھا اسے پتا تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہے اس لیے ہو سکتا تھا کہ صبح آنکھ دیر سے کھلے۔ جس کے ڈر سے اس نے پہلے سے ہی انتظام کر لیا تھا لیکن ہوا وہ ہی تھا جس کا اسے ڈر تھا وہ اتنی گہری نیند سویا تھا کہ اس کی آنکھ الارم کی تیز آواز پہ بھی نہیں کھلی تھی یہاں تک کہ سورج کی تیز تو کیلی کرنیں براہ آمدے میں اس کے بستر تک بھی آ گئی تھیں مگر وہ دنیا جہان سے بے خبر بے تان کے گہری نیند سو رہا تھا حالانکہ گھر میں موجود اس کی امی اور بہنیں ناشتہ کرنے کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی نبٹا چکی تھیں لیکن پھر بھی ان لوگوں نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ بھی جانتی تھیں کہ وہ اتنے دنوں سے تھکا ہوا ہے۔

صبح گھر سے نکلتا ہے اور شام کو مایوس تھکا ہارا واپس آتا ہے لیکن نوکری کی نوید کہیں سے نہیں ملتی۔ کچن میں برتن دھو کر ترتیب سے رکھتے ہوئے اچانک اسکیل کا ڈونگا مریم کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا اور اک دھڑام کی آواز پہ وہ ایک دم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا اس نے غائب دماغی سے سارے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس وقت صبح چھ بجے کے مطابق ہلکا ہلکا اندھیرا ہونا چاہیے تھا جبکہ یہاں تو ہر طرف سورج صاحب کا راج نظر آ رہا تھا۔

"کیا بجا ہوا ہے امی؟" اس نے آگے بیٹھے چھوٹا سا الارم کلاک دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جو وہ قریب ہی چھوٹی سی تپائی پہ رکھ کے سویا تھا۔ مگر اس وقت کلاک بھی غائب تھا اور تپائی بھی۔

"نو بج رہے ہیں بیٹا تم تھکے ہوئے تھے اس لیے تمہیں نہیں جگایا تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو مریم تمہارا ناشتہ بنا رہی ہے۔" عابدہ خاتون نے نرمی سے کہا تھا۔

"اوہ میرے خدایا..... آپ نے یہ کیا کیا امی؟ مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا اتنے دنوں سے میں آج کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔" اسے افسوس نے شکنجے میں لے لیا تھا وہ ہالوں میں انگلیاں پھنسائے اپنے بستر پہ ہی بیٹھا رہ گیا آف وائٹ دھاگے کا بنا کیس ابھی بھی آدھا اس کی ٹانگوں پہ پھیلا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا ہوتا وہی ہے جو قسمت میں ہوتا ہے تم لاکھ اس دن کا انتظار کرتے لیکن اس دن بھی وہی ہونا ہے جو اللہ نے شروع سے ازل سے لکھ دیا ہے۔ آج تمہاری قسمت میں انٹرویو دینا نہیں لکھا تھا اسی لیے تم گہری اور بے فکر نیند سوئے رہے۔ ورنہ روزانہ تم تو صبح صبح اٹھ کر کام کی تلاش میں چلے جاتے ہو۔ آج ممکن زیادہ تو نہیں تھی؟ بس یہ سمجھ کہ آج قسمت نہیں تھی۔"

عابدہ خاتون نے بہت پیار اور تحمل سے بیٹے کو سمجھایا تھا جو نیند سے اٹھتے ہی افسوس کی حالت میں بیٹھا تھا۔ ماں کی بات پہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

''بھائی آپ کے لیے ناشتہ بناؤں؟'' مریم پگن سے نکلتی ہوئی بولی وہ ابھی ابھی پگن کے کام نبٹا کر فارغ ہوئی تھی اس چھوٹی چاروں بہنیں سکول اور کالج کے لیے نکل چکی تھیں جبکہ وہ آج کل ایگزامز سے فارغ ہو کر گھر داری میں مصروف تھی اور کے ساتھ مل کر اپنی غربت اور مفلسی پہ صبح و شام جلتی کڑھتی رہتی تھی۔

''نہیں رہنے دو۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے اچانک کھیس ہٹا کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنی چپل پہن کر تیزی سے خانے میں چلا گیا۔ ٹھنڈے پانی کے دو تین چھپاکے مارنے کے بعد گیلا ہاتھ بالوں میں پھیرتے ہوئے غسل خانے سے کمرے میں آ گیا تھا۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے، گھڑی باندھی اور فائل اُٹھا کر بغل میں دبائی اپنی آستین کے بٹن بند کرتا باہر تھا۔

''بیٹا ناشتہ تو.....''

''نہیں امی بھوک نہیں ہے۔'' وہ ان سے دُعا لینے کے لیے ان کے سامنے جھکا اور پھر اتنی ہی تیزی سے ساتھ والے کم میں چلا آیا۔

''السلام علیکم ابا! کام کے لیے جا رہا ہوں دُعا کیجیے گا۔'' وہ پیار باپ کے قریب جھکا اور ان کا ہاتھ چوم کر ان کی مسکراہٹ سمیٹ کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اور مریم اپنے بھائی کے بغیر ناشتے چلے جانے کا بوجھ دل پہ لیے تھکے تھکے قدموں سے اندر آ کر اکیلی گم سم سی بیٹھ گئی تھی ایسا ہی کچھ بوجھ عابدہ خاتون کے دل پہ بھی تھا مگر وہ ایک باہمت خاتون تھیں وہ ایک دُکھ دل چھپا کر دوسرے دُکھ کو بھلانے آ گئی تھیں ان کا شوہر دروازے کی سمت ہی دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اندر آئے اور ان کی تنہائی کٹے۔

''وہ آج پھر کام ڈھونڈنے چلا گیا ہے حالانکہ میں نے اسے منع کیا ہے کہ آج گھر پہ رہو اور تھوڑا آرام کر لو۔'' وہ شوہر آنکھوں کے سوال اسی طرح پڑھ لیتی تھیں جیسے کاغذ پہ لکھی تحریر۔

''نہیں اس نے ناشتہ نہیں کیا ایسے ہی اُٹھ کر چلا گیا ہے۔'' وہ ان کے اک اک خاموش سوال کا جواب دے رہی تھیں۔

''ہاں آپ بھی دُعا کرو اللہ اسے مایوس نہ کرے۔'' عابدہ خاتون آہستہ آہستہ شوہر کے پاؤں اور ٹانگیں دبانے لگی تھیں۔

''جی مریم دوسرے کمرے میں ہے وہ بھی اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی ہوگی دن رات اکیلی بیٹھی اپنا خون رہتی ہے۔'' وہ سارے جواب خود ہی دیتی جا رہی تھیں اور ان کے شوہر نے آہستگی سے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔ گھر میں موجود تینوں نفوس ایک ہی فرد کے متعلق سوچ رہے تھے اور اس ایک کے متعلق سوچتے سوچتے جب دوسرے کا خیال آتا تو دل دُکھ سے بھر جاتا تھا۔

♥

آج اسے تین چار دن ہو گئے تھے نوکری کے لیے بڑی حویلی کے چکر لگاتے ہوئے لیکن اس کی بدقسمتی کہ اسے حویلی بھی نہیں ملتا تھا سوائے ''مبارک خان'' کے۔ مبارک خان، وقار آفندی کا خاص ملازم تھا حویلی کے تمام اہم کام مبارک خان ذمے تھے۔ تمام ملازموں کی نگرانی کرنا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ اس کی سب پہ کڑی نظر ہوتی تھی۔ گھر کی عورتوں کو کہیں ہوتا، کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہوتی، کوئی بیمار ہوتا تو ان سب کو اپنی ذمہ داری پہ اپنے ساتھ لے کر جانا بھی مبارک خان کے میں شمار ہوتا تھا اور اکثر وہ گھر کے علاوہ وقار آفندی کے آفس کے کام بھی نبٹا لیتا تھا اور ضرورت کے وقت وہ وقار آفندی کے کے فرائض بھی سرانجام دے لیتا تھا وقار آفندی بزنس کے سلسلے میں شہر سے کہیں باہر جاتے تو بھی مبارک خان کو ساتھ لے نہیں بھولتے تھے مبارک خان ان کا رائیٹ ہینڈ تھا بہت سے کام مبارک خان کے ذمے لگا کر وہ خود اکثر لاپرواہ ہو جاتے تھے انہیں پتا ہوتا تھا کہ جو کام انہوں نے کہہ دیا ہے وہ اسے کر کے ہی دم لے گا اور دوبارہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی بھی ایسا ہی تھا وہ اپنا کام بہت محنت اور ایمانداری سے کرتا تھا۔

حویلی کے تمام ملازموں کے ساتھ وہ بہت سخت اور روکھا پھیکا تھا، اپنے مالکان کے سامنے وہ بہت مؤدب اور مہذب اور عام لوگوں کے لیے بے حد نرم اور رحم دل سا تھا وہ کسی کو دُکھ اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے آج آفندی سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے مسائل حل کروائے تھے بہت سے غریبوں کی مدد کروائی تھی اور کئی لوگوں کو نوکریاں بھی تھیں اور جس جس کو نوکری دلوائی تھی وقار آفندی آج بھی تعریف کرتے تھے کہ وہ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں اور مبارک خان

آفندی کی طرف سے ملنے والی خیرات پہ گزر بسر ہو جاتا تھا اس کی بڑی بڑی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ لوگوں کی چاپلوسی کرنے کی طرف سے شاباش کمار ہا تھا اور اسی شاباش اور لوگوں کی بھلائی کے چکر میں آئے روز وہ لوگوں سے ہزاروں وعدے کر لیتا تھا اور ایسا ہی ایک وعدہ اس نے اس کے ساتھ بھی کیا ہوا تھا کہ وہ وقار آفندی سے اسے نوکری ضرور دلائے گا لیکن آج تین چار دن ہو گئے تھے اسے حویلی کے گیٹ پہ آتے ہوئے مگر وقار آفندی ملتے ہی نہیں تھے۔

دو روز سے وہ شہر سے باہر تھے اور دو روز سے وہ کسی میٹنگ یا پریس کانفرنس کے لیے نکل جاتے تھے لیکن آج وہ بھی ارادہ کر کے آیا تھا کہ ان سے ملے بغیر ہرگز نہیں جائے گا چاہے پورا دن باہر گیٹ پہ انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

ابھی بھی اسے آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا اور چوکیدار کے ہاتھ مبارک خان کو پیغام بھجوائے بھی آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر اس وقت نہ تو مبارک خان کے کچھ آثار نظر آ رہے تھے اور نہ ہی حویلی کے مکینوں کی آمد کا دور دور تک کوئی امکان لگتا تھا وہ باہر چوکیدار کے قریب رکھی کرسی پہ بیٹھا انتظار کی سولی پہ لٹکا ہوا تھا چوکیدار بار بار اس سنجیدہ سے لیے دیے انداز والے خوبرو نوجوان کو سرتاپا غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس نے ایک بار بھی چوکیدار کی سمت توجہ کی نظر سے نہیں دیکھا تھا بس اپنے مخصوص انداز میں سر جھکائے شرافت سے بیٹھا رہا۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھڑی پہ نظر دوڑائی تھی اب آدھے گھنٹے سے بڑھ کے پچاس منٹ ہو چکے تھے اسے یہاں بیٹھے ہوئے اور مبارک خان ابھی تک حویلی سے برآمد نہیں ہوا تھا۔

"ارے سیاں میری مانو تو آج چلے جاؤ۔ آج مہینے کا آخری دن ہے آج سارے راشن پانی اور نوکروں کا حساب کتاب چکانا ہے۔ مبارک خان مہینے بھر کا حساب دینے میں مصروف ہے۔" چوکیدار نے اسے بیٹھے بیٹھے مفید مشورہ دیا تھا۔

"مہینے بھر کا حساب دینے میں مصروف ہے؟ کون سا موت کے بعد زندگی بھر کا حساب دے رہا ہے؟" وہ اپنے مخصوص تیکھے کاٹ دار لہجے میں بولنے سے باز نہیں آیا تھا حالانکہ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے لب و لہجے اور اپنے انداز پہ کنٹرول رکھے کیونکہ لوگ اس جیسے مزاج کے آدمی کو بطور ملازم ہرگز پسند نہیں کرتے تھے لوگ ملازم ایسا چاہتے تھے جو دب کے رہے نہ کہ دبا کے رکھے اور وہ بھی یہی سوچتا تھا کہ اگر اسے کام مل جائے تو وہ ہمیشہ دب کے رہے گا کیونکہ اسے کام کی "ضرورت" تھی اور ضرورت کے لیے تو انسان "کچھ" بھی کر لیتا ہے یہ تو پھر محض اس کی عادت تھی۔

"ہوئے کدھر گیا وہ آدمی؟" مبارک خان اچانک گیٹ سے نمودار ہوا اور چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔

"وہ بیٹھا ہے۔" چوکیدار نے سائیڈ پہ رکھی کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ مبارک خان اس کے قریب آتا وہ اس کی آواز سن کر خود ہی اُٹھ کے قریب آ گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے مبارک خان سے ہاتھ ملایا تھا۔

"ہاں..... ہاں وعلیکم السلام چلو اندر چلو میں نے صاحب سے بات کی ہے تمہاری نوکری کے لیے لیکن وہ کہتے ہیں کہ پہلے اس آدمی سے مل لیں اسے دیکھ پرکھ لیں پھر کام پہ رکھیں گے۔" مبارک خان اسے بتاتے ہوئے ساتھ لے کر اندر داخل ہوا تھا اور بڑی حویلی کے گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہوئے ایک بار اس کے قدم اپنی جگہ پہ جم سے گئے تھے اور دوسرے ہی پل وہ بمشکل اپنے قدموں سے جیسے بھاری پتھر باندھ کر چلتا آگے بڑھ آیا تھا عالیشان حویلی کی آن بان اس کے در و دیوار سے جھلک رہی تھی اس نے اس حویلی کو ہزاروں بار دیکھا تھا مگر باہر سے اور دور دور سے۔

آج پہلی بار اس جنت نما حویلی کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تھا حویلی جتنی باہر سے خوبصورت نظر آتی تھی اس سے سوگنا زیادہ اندر سے خوبصورت تھی کئی کنال پہ تو اس کا لان پھیلا ہوا تھا اور لان کا سبزہ نظروں کو نرم نرم سا سکون بخش رہا تھا ایک سائیڈ پہ مچھلی نما فوارہ بہہ رہا تھا اور فوارے سے نکلنے والا پانی لان کے درمیان سے چھوٹی سی ندی کی طرح چکر کھا کر حویلی کے سائیڈ والے لان کی طرف جا رہا تھا البتہ لان کی دونوں سمت آنے جانے کے لیے ایک خوبصورت چھوٹا سا گولائی کی شکل میں پل بنایا گیا تھا اور اس پل سے گزر کر ہی لان کی اس سائیڈ پہ جایا جا سکتا تھا۔

وقار آفندی اس وقت لان چیئرز پہ لان کی وسط میں بیٹھے کسی سے باتیں کر رہے تھے جب ان کی نظر مبارک خان اور اس کے ساتھ آتے آدمی پہ پڑی تھی اور ان کے پہنچنے تک وقار آفندی کی مقابل چیئر پہ بیٹھی عنیزے چیئر خلیل کر کھڑی ہو گئی تھی اس کی آنے والوں کی سمت پشت تھی۔

سمت بڑھ گئی تھی اس کی متوازن چال اور قدموں کی مہکنت وہ دور تک دیکھتا رہ گیا تھا البتہ اس حسینہ کی شکل دیکھنے سے محروم رہ گیا تھا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی ہے کیونکہ اس کے انداز کا سبب اس کا لفظ "پاپا" تھا۔

"سلام صاحب۔" اس نے قریب آ کر سلام کیا تھا جبکہ وقار آفندی سوالیہ نظروں سے مبارک خان کو دیکھ رہے تھے۔

"صاحب یہی ہے جس کے لیے آپ کو کام کا کہا تھا بہت ہی مجبور ہے بیچارہ۔" مبارک خان نے وضاحت دی حالانکہ اس آدمی کے سامنے لفظ بیچارہ خود "بیچارہ" لگ رہا تھا اس کی باڈی اور ہیلتھ اکثر لوگوں کو ٹھٹکا دیتی تھی کوئی اس کی مجبوریوں کا یقین نہیں کرتا تھا۔

"اوہ ہاں..... تو تم اس کے لیے کام کا کہہ رہے تھے؟"

"جی صاحب۔" مبارک خان تیزی سے بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی منصور حسین۔" وہ مختصر بولا تھا۔

"ہاں تو منصور حسین کیا تعلیم ہے تمہاری؟"

"میٹرک تک پڑھا ہے صاحب جی لیکن میٹرک پاس نہیں کر سکا جن دنوں امتحان تھے ہمارے گھر میں بڑی مصیبت آ گئی تھی اتنے دنوں سکول ہی نہیں جا سکا تھا۔" اپنی طرف سے اس نے سچ سچ بتانا ضروری سمجھا تھا۔

"کیا میٹرک بھی پاس نہیں کیا؟" وقار آفندی کو حیرت ہوا تھی اتنا خوبرو نوجوان تھا مگر تعلیم ندارد۔ البتہ حال حلیے سے واقعی غریب لگ رہا تھا یہ بات اور تھی کہ شکل وصورت نوابوں کی طرح تھی۔ بے شک اس کے چہرے پہ مسکینی چھائی ہوئی تھی تفکر کے سائے تھے، کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو تھی لیکن پھر بھی گدڑی میں "لعل" کی طرح پہچانا جا رہا تھا۔

"سر میٹرک پاس ہوتا تو یقیناً آج کسی افسر کے دفتر میں پرچیاں بنا رہا ہوتا یا پھر کسی ڈاکخانے میں ڈاکیا ہی لگ چکا ہوتا۔ مگر افسوس کہ میٹرک پاس نہیں ہوں اسی لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہا ہوں بڑے بڑے دفتر والے تو مجھے پوچھتے بھی نہیں ہیں اس لیے سوچا ہے کہ کسی گھر میں نوکری ڈھونڈوں چاہے کوئی چوکیدار، مالی یا پھر ڈرائیور ہی رکھ لے لیکن میری مشکل حل کر دے۔" اس نے وضاحت پیش کی تھی لیکن وقار آفندی شش و پنج کا شکار نظر آ رہے تھے۔

"صاحب کوئی مسئلہ ہے کیا؟" مبارک خان نے وقار آفندی کو کشمکش سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

"دیکھو منصور حسین دراصل ہمیں فی الحال گھر کے لیے کسی کام کرنے والے کی ضرورت نہیں ہے چوکیدار، مالی اور ڈرائیور پہلے سے موجود ہیں اور کافی اچھا کام کر رہے ہیں لہٰذا انہیں بلاوجہ کام سے نکالا نہیں جا سکتا اس طرح تو ان کے بیوی بچوں کی روزی روٹی پہ بھی لات مارنے والی بات ہو گی اس لیے ہم سوچ رہے ہیں کہ تمہیں اپنے آفس یا فیکٹری میں کسی کام پہ رکھ لیتے ہیں بس تھوڑے دن انتظار کرو ان شاء اللہ کام تمہیں ضرور مل جائے گا۔" وقار آفندی نے اسے تسلی دی تھی لیکن وہ چند دن کا سن کر مایوس ہو گیا تھا۔

"صاحب تھوڑے دنوں میں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے میرے گھر کے حالات بہت خراب ہیں آپ پلیز اور دیر نہ کریں۔" منصور حسین نے التجا کی تھی حالانکہ وہ التجا کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔

"دیکھو برخوردار کچھ سوچ سمجھ کر کوئی جگہ خالی دیکھ کر ہی تمہیں رکھنا ہے نا، بنا ضرورت کے تو نہیں رکھ سکتے؟ تم مبارک خان کو اپنا گھر کا پتا دے جاؤ جب کام نکل آیا تو وہ تمہیں بلا لے گا۔" وقار آفندی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"صاحب آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا کام کروں گا اللہ کے لیے مجھے کام پہ رکھ لیں۔" وہ پھر بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"منصور حسین چپ رہو اگر صاحب نے کہہ دیا ہے تو وہ تمہیں ضرور کام دیں گے۔" مبارک خان نے اسے مزید گلے پڑنے سے روک دیا تھا اور وہ وقار آفندی کو اندر جاتے دیکھ کر مایوس ہو گیا تھا انداز میں تھکن اتر آئی تھی۔

♥

"کیا کر سکتے ہو؟ کیسا کام ڈھونڈ رہے ہو آخر؟" اس آدمی نے اس کے تھکے تھکے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کافی بے تکلفی سے

پوچھا تھا۔

میں کسی سوپر کا کام کرنے کو بھی تیار ہوں مجھے لوگوں کے واش روم دھونا پڑیں تو وہ بھی کرلوں گا۔" اس کا لہجہ بے حد تلخ اور کچھ بھیگا ہوا تھا لہجے کی نمی اپنی مجبوری پہ تھی اور لہجے کی تلخی اپنی بے بسی پہ تھی۔ کیا وہ اتنا ہی قسمت کا مارا تھا کہ کوئی بھی اسے کام پہ نہیں رکھ رہا تھا حالانکہ ہر بندے کے سامنے التجا کرتا پھر رہا تھا۔ اس کو اتنے دن ہو گئے تھے وہ لوگوں سے "کام" بھیک کی طرح مانگتا پھر رہا تھا مگر اسے یہ بھیک کسی ایک در سے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی ہر ایک نے "سوری" کا سگنل دے کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور وہ پورا دن اپنے قدموں سے ناپ کے شام ڈھلے سڑک کے کنارے بنے اسے ڈھابے کی ایک بنچ پہ آ بیٹھا تھا جہاں اس وقت چند اور لوگ بھی چائے اور سگریٹ سے شغل فرمانے میں مصروف تھے لیکن خود اس کی جیب میں دس روپے بھی نہیں تھے کہ وہ دن بھر کا بھوکا پیاسا خالی پیٹ کو چائے کے ڈیزل سے گھورنے کے لیے ایک کپ چائے کا ہی پی لیتا۔

"اوئے باؤ جی کیا لے کر آؤں آپ کے لیے؟" ڈھابے کا ملازم صفائی ستھرائی میلا کچیلا کپڑا میز پہ پھیرنے کے بعد اپنے کندھے پہ ڈالتے ہوئے بڑے اسٹائل سے بولا تھا لیکن وہ اپنی جیبوں کے خالی پن سے واقف تھا جبھی خاموش رہا تھا۔

"باؤ جی میں آپ سے بات کر رہا ہوں کیا لینا ہے؟" اس ڈھابے کے ویٹر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

"کچھ نہیں لینا۔" اس نے فوراً نفی میں گردن ہلائی تھی اور اس کے جواب پہ جہاں ویٹر کو حیرت ہوئی تھی وہیں قریب بیٹھے ایک دکاندار نے ساختہ ہنس پڑے تھے وہ لوگ روزانہ شام پانچ بجے کی چائے اپنی دکانیں بند کر کے اسی ڈھابے سے آ کر پیتے تھے کیونکہ اس ڈھابے کی چائے بہت خالص اور مزیدار ہوتی تھی وہ کڑک سی چائے پی کر دن بھر کی تھکن بھول جاتے تھے۔

"باؤ لینا کچھ نہیں ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" ویٹر بدلحاظی سے گویا ہوا تھا۔

"اوئے گنجٹ تیری زبان کو آرام نہیں ہے تجھے کتنی بار کہا ہے کوئی نیا گاہک آ جائے تو اپنی زبان بند رکھا کر۔ گاہک ایسے ہی نہیں بن جاتے گاہک بنانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔"

"ہاں باؤ جی آپ نے کچھ نہیں بھی لینا پھر بھی آرام سے بیٹھو آرام کرو اسے اپنا ہی ہوٹل سمجھو۔" ہوٹل کا مالک اپنے ڈھابے سے نکل کر صحن میں آ گیا تھا جہاں وہ لوگ کرسیاں اور ٹوٹی پھوٹی سی چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

"شکریہ ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟" اس نے ہوٹل کے مالک کی نرمی محسوس کر کے پانی مانگ لیا تھا۔

"اوئے کیوں نہیں باؤ جی! ابھی پانی پیو، چل شیدے جا کر صاف ستھرے گلاس میں تازہ پانی لے کر آ۔" اس نے اپنے ملازم کو حکم جاری کیا تھا۔

"جی استاد ابھی لے کر آیا۔" شیدا اب جی جی کر رہا تھا آخر اپنے مالک کا رعب اور دبدبہ تھا اس پہ۔

"کیوں باؤ جی کیا پریشانی ہے؟ بڑا تھکا ہوا پریشان نظر آ رہا ہے؟" اس آدمی نے بڑی اپنائیت سے پوچھا تھا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو ان دونوں کی۔

"چاچا میری پریشانی بھی وہی ہے جو آج کل کے ہر نوجوان کی ہے، بیروزگاری نے جینا مشکل کر رکھا ہے جی چاہتا ہے کسی کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں۔" اس کا لہجہ زہرخند ہو رہا تھا۔

"اللہ معافی دے پتر! ایسا ہرگز مت کرنا اللہ بہتر کرے گا۔ تو یہ بتا تو کام کیا کر سکتا ہے؟" ان لوگوں کے قریب بیٹھا ایک اور نرم دل سا آدمی اچانک بول پڑا تھا۔

"فی الحال میرے کام سے میرے گھر والوں کو دو وقت کی روٹی بھی مل جائے تو میرے لیے یہی اللہ کا بڑا کرم ہوگا۔"

"تو پھر میرے ساتھ کام کر۔" وہ آدمی دوسری چارپائی سے اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا وہاں موجود باقی دکاندار بھی انہی کو دیکھ رہے تھے آخر ان لوگوں میں فاصلہ ہی کتنا تھا کہ وہ ان کی گفتگو نہ سن سکتے۔

"آپ کے ساتھ کام؟" اس نے بے یقینی سے سر اٹھایا تھا۔

"ہاں میرے ساتھ، مجھے بھی بہت عرصہ سے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو محنتی اور قابل بھروسہ بھی ہو اور مجھے لگتا ہے تم میرے معیار پہ پورے اترو گے۔" وہ آدمی اس سے زیادہ خوش ہوا تھا اور اس وقت ان دونوں کی خوشی دیدنی تھی جس کو دیکھ کر ہوٹل کا مالک بھی خوش ہو گیا تھا۔

ان کی بات پہ وہ بھی سچ مچ خوش ہوا تھا باوُ امتیاز سے خوشی خوشی ان کا ایڈریس لے کر کل صبح کام پہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے رُخصت ہو گیا تھا اسے اس وقت گھر جانے کی جلدی تھی اور اس جلدی اور اس خوشی میں وہ "کام" پوچھنا بھی بھول گیا تھا یہ بات اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے یاد آئی تھی کہ آخر اسے کام ملا کیا ہے؟ اور اس کشمکش میں اس کی خوشی آدھی رہ گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

"والسلام بیٹا! بیٹھو میں پانی منگواتی ہوں۔" عابدہ خاتون نے صحن میں بچھی چارپائی کی سمت اشارہ کیا تھا وہ چارپائی پہ بیٹھنے کے بجائے اندر ابا جی کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم ابا!" وہ اپنی گھسی پُرانی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وہیں ان کے قریب کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا اک خاموش سا۔

"وعلیکم السلام۔" اس تک پہنچ گیا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" وہ اب آستین کے بٹن کھول کر شرٹ اُتارنے لگا تھا شرٹ کے نیچے اس نے وائیٹ بنیان پہنی ہوئی تھی جو فی الحال وہی کافی تھی۔

"مجھے کام مل گیا ہے آج۔" اس نے ذرا ٹھہر کر انہیں خوشخبری سنائی تھی اور اس خوشخبری پہ ان کے چہرے پہ اک خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی اک ایسی مسکراہٹ جو ان کے لبوں پہ نہیں پھیل سکی تھی مگر ان کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں اپنا عکس چھوڑ گئی تھی وہ زندگی کی ایسی تلخ اور اذیت ناک اسٹیج پہ تھے کہ وہ رو تو سکتے تھے مگر کسی خوشی پہ ہنس نہیں سکتے تھے ان کے لب مسکرا نہیں سکتے تھے ان کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی اور ایسا ہی اک دُکھ آنکھیں بھی جھیل رہی تھیں کیونکہ اگر وہ روتے بھی تھے اپنے آنسو خود نہیں پونچھ سکتے تھے اور اس سے بہتر تھا کہ ان کے آنسو کسی اور کو پونچھنا پڑتے وہ رونے سے احتراز برتتے تھے وہ آنسو پی جاتے تھے۔

"مجھے ابھی یہ تو نہیں پتا کہ کام کیسا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ بس یہی کافی ہے کہ مجھے کہیں کام تو مل گیا ہے نا؟" اس نے لاپروائی سے بتایا تھا۔

"پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔" مریم اس کے لیے چائے کا کپ لے کر اندر چلی آئی وہ بھی یہ خوشخبری سن چکی تھی۔

"خیر مبارک بس تم دُعا کیا کرو۔" وہ چائے کا کپ تھامتے ہوئے کافی ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔

پچھلے پانچ منٹ سے دوربیل متواتر بج رہی تھی لیکن گھر میں موجود دونوں افراد میں سے ایک بھی اُٹھ کر دروازہ کھولنے کا نہیں لے رہا تھا حالانکہ رات دو بجے بھی وہ اسی طرح جاگ رہے تھے جیسے دن کے دو بجے کا وقت ہو۔ نبیل حیات چاہ رہا تھا کہ فائزہ بیگم اُٹھ کر دروازہ کھولیں تاکہ وہ اس کا سامنا نہ کرے جبکہ دوسری طرف فائزہ بیگم چاہ رہی تھیں کہ نبیل اُٹھ کر دروازہ کھولے تاکہ انہیں اس کے ساتھ سچ مچ بات نہ کرنی پڑے۔ اور اسی کشمکش میں وہ اپنی اپنی جگہ پہ اُٹھے اور نہ اُٹھنے کا فیصلہ ہی نہیں کر پا رہے تھے بالآخر وہ دوربیل پہ ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گئی تھی اور آخر کار نبیل حیات کو راکنگ چیئر سے اُٹھنا ہی پڑا تھا۔

مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے بیڈروم کا دروازہ کھول کر وہ نیچے اُتر آیا تھا۔ اس کے قدم جتنے مضبوط اتنے ہی بھاری محسوس ہو رہے تھے اس نے لب بھینچتے ہوئے آگے بڑھ کے دوربیل کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی وہ نشے کی حالت میں کھڑی اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے تقریباً ڈول رہی تھی۔ نبیل کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکی۔

"ہائے....." اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا کر اس کی سمت ہلکی سی مسکراہٹ اُچھالی تھی۔

"مدیحہ" نبیل یکدم غصے سے دھاڑا تھا اس کی آنکھیں غصے سے سرخ پڑ گئی تھیں وہ کافی سخت تیوروں سے اس کی سمت بڑھا تھا۔

"نبیل رُکو۔" فائزہ بیگم یکدم دہل گئی تھیں تھوڑی دیر پہلے وہ بھی اُٹھنے سے گریز کر رہی تھیں مگر جب نبیل کے سیڑھیاں اُترنے کی آواز آئی تو نہ چاہتے ہوئے وہ بھی اُٹھ آئی تھیں کہ کہیں دونوں بہن بھائی میں زیادہ بدمزگی نہ ہو جائے۔

"مما آپ پلیز اس معاملے سے دور رہیں، اب میں خود سنبھالوں گا، آخر یہ کیا چاہتی ہے؟ یہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا پلان

ہے اس کا؟" اس کا بازو اپنے جارحانہ شکنجے میں دبوچتے ہوئے اسے کھینچتا ہوا اندر لے آیا تھا اور لاکر ڈرائنگ روم کے صوفے پہ دھکیل دیا تھا وہ لڑکھڑا کے منہ کے بل صوفے پہ گری تھی اور کتنے ہی لمحے سنبھل نہیں پائی تھی۔

"نہیل کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنے کمرے میں، میں اسے دیکھتی ہوں۔" فائزہ بیگم لپک کر پھر اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آئی تھیں۔

"نہیں میں آج اس سے فائنل بات کر کے جاؤں گا اسے ایک آخری فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔" نہیل صوفے پہ جھکی ہوئی مدیحہ کی طرف دوبارہ بڑھنے لگا کہ اچانک تیزی سے فائزہ بیگم نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"کیا بات کرو گے اس سے؟ وہ تو ہوش میں ہی نہیں ہے۔" انہوں نے تلخی سے اس کے بے حس و حرکت وجود کی سمت اشارہ کیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یقیناً اب تک سنبھل کر سیدھی ہو چکی ہوتی مگر وہ ابھی بھی اوندھے منہ گری ہوئی تھی اور نہیل حیات غصے اور بے بسی سے درمیانی میز کو پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر مارتا ہوا واپس پلٹ گیا تھا۔

"وہ بھی تو بے ہوش میں نہیں ہے لیکن صبح اس کے سارے ہوش و حواس ٹھکانے آ چکے ہوں گے آپ بس اسے اتنا بتا دیجیے گا کہ کل میرے اٹھنے سے پہلے وہ یہیں مت جائے اسے جو بھی فیصلہ کرنا ہے وہ کل صبح ہونا چاہیے میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کروں گا بس۔" وہ جاتے جاتے سیڑھیوں سے پلٹ کر ماں کو اپنا فیصلہ سنا آیا تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر کا غصہ اور بے بسی کم نہیں ہو پا رہی تھی وہ اضطراری انداز میں اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرے؟ وہ اتنے دنوں سے کسی الجھن پہ نہیں آ رہی تھی اور فائزہ بیگم اس کے ساتھ بحث و تکرار کر کے تھک گئی تھیں۔ البتہ وہ خود بھی ایک بار بھی اس کے روبرو نہیں ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ معاملہ اک دوسرے کے سامنے آئے بغیر ہی نبٹ جائے لیکن اس لڑکی نے اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا وہ ان لوگوں کی ناک میں دم کر چکی تھی اور وہ مارے عزت و غیرت کے کسی کے سامنے کھل کے اپنا مسئلہ بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

نہیل اس کے ذکر سے بچنے کے لیے حتی الامکان کوشش کرتا رہتا تھا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں سے اس کا ذکر نکل ہی آتا تھا اور وہ اب اس کے خیال چلن سے اپنی تکمیل حزامی کا دامن چھوڑنے لگا تھا وہ غصہ بہت کم کرتا تھا مگر آج کل غصہ اس پہ حاوی رہنے لگا تھا صرف اس کی وجہ سے حالانکہ وہ کالی "را" سا بندہ تھا۔ کمرے میں ٹہلتے ہوئے بلکہ چکراتے ہوئے اسے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے سیل فون پہ رنگ ٹیون بجنے لگی اس نے چونک کر سیل فون اٹھایا۔

پاکستان سے اس کے دوست کی کال تھی۔

اس نے گھڑی پہ وقت دیکھا دو بج رہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ پاکستان میں اس وقت صبح سات بجے کا وقت تھا۔

♥

"السلام علیکم۔" اس نے ذرا ٹھہر کر اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہوئے تقریباً پانچ سیکنڈ کے لیے کچھ سوچا اور پھر کال ریسیو کر لی تھی۔ لیکن اپنے اعصاب کنٹرول کرنے کے باوجود اپنے لہجے کا بھاری پن مکمل طور پہ کنٹرول نہیں کر سکا تھا، جبکہ ریسیور کے دوسری طرف موجود شخص بھی حد سے زیادہ کائیاں تھا، وہ انسانوں کو صرف چہروں سے ہی نہیں بلکہ لہجوں سے بھی پہچاننے اور پرکھنے کا فن جانتا تھا، اس کی چھٹی حس بہت تیز تھی اور نہیل اس کی اس خاصیت سے بخوبی واقف تھا۔

"نہیل کیا بات ہے؟ اس وقت کیوں جاگ رہے ہو؟" اس کا پہلا تشویش بھرا سوال اٹھا تھا اور نہیل اس فکرمند سے انداز پہ ذرا دیر کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ آج کل گھر میں اس کی بہن نے کیا تماشہ بنا رکھا ہے؟ اور وہ حد سے زیادہ باغی ہو چکی ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو نہیل؟" ریسیور کے ایئر پیس سے دوبارہ اس کی گمبھیر آواز ابھری تھی اور اس آواز میں حد درجہ پریشانی کا رس گھل رہا تھا۔ نہیل سر جھٹک کر اس کی آواز کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

"کچھ نہیں سوچ رہا یار تم سناؤ آج صبح صبح مجھے کیسے یاد کر لیا؟" نہیل کا ارادہ اس کی بات گول کرنے کا تھا۔

"نہیل مجھے ٹالو مت، صاف صاف بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔" وہ نہیل کی بات جھٹک کر دوبارہ پوچھ رہا تھا اور نہیل جانتا تھا کہ وہ اپنے اس دوست سے کبھی نہیں چھپ سکتا، پھر بھی چھپنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کوشش سراسر بے سود کوشش تھی۔

[illegible] نہیں ہوتا۔ نبیل نے اس ٹالنے کی ایک اور کوشش کر دیکھی کہ شاید وہ ٹل ہی جائے مگر وہ ایسا انسان تھا کہ کوئی اس کے سامنے اپنی کھال بھی اُتار کے رکھ دیتا تو وہ مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

''نبیل تم شاید بھول رہے ہو کہ میں وہم پر نہیں بلکہ ''یقین'' پہ بات اور بحث کرنے والا آدمی ہوں۔ میں شریف کہہ سکتا ہوں کہ تم اس وقت پریشان ہو، مگر چھپا رہے ہو۔ ہاں اگر تم بتانا نہیں چاہتے یا پھر کوئی پرسنل میٹر ہے تو اٹس اوکے، میں اصرار نہیں کرتا۔'' اس نے دو ٹوک کہتے ہوئے اپنی طرف سے بات ختم کر کے نبیل کو شش و پنج سے نکالنے کی کوشش کی تھی، لیکن نبیل اس شش و پنج سے نکلنے کے بجائے مزید اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتائے؟ اور کیا چھپائے؟ اور بہت سوچنے کے بعد اس نے کہہ ہی دیا تھا۔

''مدیحہ پاکستان نہیں جانا چاہتی، اس نے انکار کر دیا ہے۔'' مدیحہ کے معاملے میں نبیل سے ایک جملہ بولنا بھی مشکل ترین ہو جاتا تھا، کل اتنی دیر عبداللہ کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ مگر پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکا تھا، البتہ اس کا ذہن بٹانے کی خاطر عبداللہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں سناتا رہا، لیکن پھر بھی اس کے ذہن پہ رکھا بوجھ کم نہیں ہوا تھا اور اب اسے رات کے اس پہر نشے کی حالت میں دیکھ کر تو اس کے اعصاب کی طنابیں مزید کھنچ گئی تھیں، یعنی جس خدشے کے تحت فائزہ بیگم نے اسے پاکستان شفٹ ہونے کا کہا تھا وہ خدشہ اب سچ ثابت ہونے لگا تھا؟ اس کے آثار اب آئے روز نظر آنے لگے تھے۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا نبیل؟'' دوسری طرف اس کی آواز گمبھیر ہی نہیں اب کچھ پُرسوچ ہو چکی تھی لہجہ مضمحل ہوا تھا۔

''بس میں اس وقت اس چیز کو سمجھ نہیں سکا تھا، میں یہی سوچتا تھا کہ اور بھی تو ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں جو پاکستان سے آ کر یہاں رہ رہی ہیں، وہ یہاں رہ کر بھی اپنی شرقیت کو نہیں بھولتیں، اب تم نگارش بھابی اور زری کو ہی دیکھ لو۔'' نبیل اپنی غلطی پہ پچھتا رہا تھا۔

''مدیحہ اور ان لوگوں میں بہت فرق ہے، نگارش ایک مذہبی گھرانے کی لڑکی ہے، بے شک وہ یورپ میں پلی بڑھی ہے، مگر اس کی تعلیم و تربیت پہ کڑی نگاہ رکھی گئی ہے، تم نے دیکھا تو ہو گا ہی کہ جیسے ہی اس کا رجحان عبداللہ کی سمت ہوا تھا اس کے گھر والوں نے چپ چاپ شرافت سے اسے عبداللہ کے ساتھ رُخصت کر دیا تھا۔ تاکہ وہ کسی غلط سمت پہ نہ چل نکلے اور رہی زری کی بات تو یہ بھی سن لو کہ اس کی لگام بھی بہت سخت ہاتھوں میں ہے، بے شک عبداللہ براؤ مائنڈڈ ہے، لیکن زری کے معاملے میں اس کی جاگیردارانہ حس جاگ اُٹھتی ہے، زری انگیجڈ جا کر بھی بالکل ایسے ہی رہتی ہے جیسے وہ اپنی حویلی میں رہتی تھی اور اس چیز میں سب سے بڑا ہاتھ عبداللہ کا ہے، وہ صرف اس کی تعلیم کے معاملے میں آزاد خیال ہے اور کسی چیز میں نہیں، جبکہ تم نے اور ممتاز انکل نے آج تک اپنے بزنس سے ہٹ کے کچھ سوچا ہی نہیں، ممتاز انکل نے اپنی بیوی، اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں سوچا اور تم نے اپنی ماں اور اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں سوچا۔ تم لوگوں نے ان کو اتنا نائم ہی نہیں دیا کہ وہ تمہاری عزت اور غیرت کو کچھ سمجھ سکیں۔

اب اگر وہ اپنی من مانی کرتی ہے تو تمہیں اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ حالانکہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ جیسی تم دونوں باپ، بیٹے کی رونین ہے، تم لوگ پہچانو گے۔ تمہاری ماں اور بہن کو صرف تمہارے پیسے کی ضرورت نہیں ہے انہیں تمہاری بھی ضرورت ہے، لیکن تم کبھی میری بات نہیں سمجھ سکے، اب بھگتو، اب جو وہ کہتی ہے وہ کرو، اب وہ بااختیار ہے اور تم بے بس۔''

اس کی ایک ایک بات حرف بہ حرف سچ تھی، اس نے نبیل کو حقیقت کا آئینہ دکھایا تو وہ مزید چپ اور سپاٹ ہو کے رہ گیا تھا اور اس کی یہ چپ دوسری طرف بھی محسوس کی جا رہی تھی، لیکن وہ اس وقت نبیل کے حق میں ہرگز نہیں تھا، اس کی نظر میں مدیحہ اپنی جگہ پہ درست تھی۔ جس لڑکی کو کبھی باپ اور بھائی کے ہوتے ہوئے بھی ان کے ہونے کا مان نہ ملا ہو اس کا ایسا ری ایکشن تو ہونا ہی تھا، وہ اگر کسی غلط روش پہ چل رہی تھی تو اس کے ذمہ دار بھی وہ لوگ خود تھے، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

''تم جانتے ہو نبیل؟ مدیحہ جب میرے ساتھ ہوتی ہے تو وہ کیوں خوش ہوتی ہے؟'' اس نے ذرا طنزیہ کہا تھا، لیکن نبیل کچھ نہ بول سکا تھا۔

وہ صرف اس لیے خوش ہوتی ہے کہ میں جب اس کے ساتھ ہوتا ہوں تو ''صرف اس کا'' بھائی ہوتا ہوں، اس وقت میرے لیے میری بہن اہم ہوتی ہے، مدیحہ اہم ہوتی ہے، میں اپنے ضروری کام بھی کچھ دیر کے لیے ترک کر دیتا ہوں، صرف اس لیے کہ وہ مجھے بھائی کہتی ہے اور میں اسے ایک بھائی ہونے کا بھرپور احساس دلا سکوں، اور میں جب اسے بھائی ہونے کا احساس دلاتا ہوں تو

وہ بھی مجھ سے پیچھے نہیں رہتی، وہ بھی مجھے بہنوں سا ایک مان دیتی ہے، خوشی دیتی ہے، کیا کبھی تم نے اس کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ کبھی اسے مان دیا ہے؟ کبھی اس کی خوشی محسوس کی ہے؟"

وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا سو فیصد سچ تھا، نبیل اپنے مقام پہ غلط تھا اس لیے چپ چاپ سن رہا تھا، وہ اس کی کوئی بھی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا، اور نہ ہی گیا وقت ہاتھ آ سکتا تھا کہ وہ سب کچھ پیچھے لے جا کر اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھال سکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اختیار کی حد ختم ہو چکی تھی۔

"نبیل بیٹیوں کے کردار بنانے اور بگاڑنے میں باپ اور بھائی کا بھی بہت بڑا عمل دخل ہوتا ہے، ذرا سی بھی نظر چوک جائے، پورا دامن داغ دار ہو جاتا ہے، اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ آخری حد تک جا کر بھی اپنی حد میں ہے، اس نے تمہاری عزت پہ کوئی داغ نہیں لگایا، اگر عزت کا بھلا چاہتے ہو تو اسے سچ مچ پاکستان لے آؤ، ورنہ پانی تمہارے سر سے گزر جائے گا۔"

"مگر کیسے لے آؤں؟ میں ایسا کیا کہوں کہ وہ جانے کے لیے تیار ہو جائے؟" نبیل اچانک اس کی بات کاٹ کے بولا تھا اور وہ دوسری طرف خاموش ہو گیا تھا، وہ نبیل کی ذہنی کیفیت بخوبی سمجھتا تھا، اس لیے اسے مزید ٹارچر کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے نارمل انداز میں لوٹ آیا۔

"ٹھیک ہے تم رہنے دو، میں خود مدیحہ سے بات کروں گا۔" اس نے نبیل کو تسلی دی تھی۔

"میں سچ کلیئر کروانے کا سوچ رہا ہوں اور مدیحہ کا پاسپورٹ مدیحہ کے پاس ہی ہے۔"

"اوکے، وہ بھی دے دے گی، تم اب آرام کرو ڈونٹ وری، مان جائے گی وہ۔" اس نے کال بند کرنے سے پہلے نبیل کو یقین دلایا تھا اور نبیل اس کی باتوں کو سوچتا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

♥

"دل آور شاہ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" وہ لڑکی ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی چوکیدار سے پوچھ رہی تھی۔

"بی بی تم ہو کون؟ اور کیوں ملنا چاہتی ہو دل آور شاہ سے؟" چوکیدار نے تیکھے اور کڑے انداز میں اس لڑکی کو سرتاپا دیکھا تھا۔ حلیے سے کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی اپنے حال حلیے سے ہی کافی غریب اور مجبور لگ رہی تھی لیکن وہ اس کی غریبی اور مجبوری دیکھ کر اسے اندر تو نہیں بھیج سکتا تھا؟

چنانچہ وہ لڑکی ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئی تھی۔

"اللہ کے لیے مجھے ایک بار دل آور شاہ سے ملنے دو، میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، تمہارے پاؤں پکڑتی ہوں۔ میں..... میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی مجھے صرف ایک بار..... صرف ایک بار ان سے ملنے دو..... میں در در انصاف کے لیے بھٹک رہی ہوں مجھے ایک بار دل آور شاہ کے سامنے اپنا حال سنانے دو خدا کے لیے میرے ہاتھوں کو دیکھو مجھ پہ ترس کھاؤ۔" وہ لڑکی کہتے کہتے آبدیدہ ہو گئی تھی اس کی آواز بھیگ گئی تھی اور حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا تھا چوکیدار بیچارہ تو برا پھنسا تھا اگر اس لڑکی سے کہتا کہ صاحب گھر پہ نہیں ہیں پھر بھی وہ بہانہ ہی سمجھتی اور اگر اسے بغیر کسی پوچھ گچھ کے انتظار کرنے کے لیے بٹھا لیتا تو بھی اپنے صاحب کی ڈانٹ کا خدشہ تھا اور غصہ الگ سہنا پڑتا۔ وہ ابھی اس لڑکی سے کچھ کہنے کے لیے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے اسے دل آور شاہ کی گاڑی آتی دکھائی دی تھی اور اس کی گاڑی کو دیکھ کر چوکیدار دل ہی دل میں بے پناہ خوش ہوا کہ چلو اچھا ہے اس لڑکی کی ملاقات کسی بھی اجازت کے بغیر ہی ہو جائے گی اور وہ بھی بہانہ کرنے سے بچ جائے گا۔

"دیکھو میں اور کچھ نہیں کہوں گی میں بس اپنا مسئلہ بتانے آئی ہوں..... وہ اگر میری عزت کو....."

"مجھے کچھ نہ کہو وہ صاحب کی گاڑی آ رہی ہے ان سے کہو۔" چوکیدار نے آہستگی سے کہتے ہوئے آنکھوں سے اسے گاڑی کی سمت اشارہ کیا تھا۔ وہ لڑکی بیتابی سے پیچھے پلٹی تھی اتنے میں دل آور شاہ کی چمچماتی ہوئی ڈارک گرے کلر کی گاڑی سیدھی گیٹ کے سامنے روش پہ آ رکی تھی چوکیدار نے فوراً اسے سلام کیا تھا اور وہ اس کے سلام کا جواب دے کر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" دل آور شاہ نے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔

"پتا نہیں صاحب کون ہے؟ لیکن بہت دیر سے آپ سے ملنے کے لیے اصرار کر رہی ہے۔ اللہ کے واسطے دے رہی ہے۔" چوکیدار نے ایک بار پھر پلٹ کر اس لڑکی کو دیکھا تھا اور پھر اپنی گاڑی دوبارہ سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے چوکیدار کو اشارہ کیا تھا۔

اسے اندر جانے دو۔ وہ اپنی باری اندر بڑھا گئے گیا اور چوکیدار نے اس لڑکی کو اجازت کا پروانہ تھما دیا تھا جو ابھی تک دل اور شاہ کی پریشانی سے مرعوب کھڑی تھی اس شخص کے سامنے بولنے کی ہمت ابھی اس میں نہیں ہو رہی تھی تو بعد میں کیا ہو سکتی تھی؟ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتی اندر پہنچی تھی۔ وہ پہلے سے ڈرائنگ روم میں کھڑا اس لڑکی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا جو آہستہ آہستہ ڈرے سہمے قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی تھی۔

"بیٹھیے۔" وہ کافی سنجیدگی سے کھڑا صوفے کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن اس لڑکی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ وہاں بیٹھ جائے۔ ایک تو اس کی شخصیت اور دوسرا اس کا اپنا نرالا سا انداز۔ کہیں بھی کوئی لچک نظر نہیں آ رہی تھی۔

"دیکھئے بی بی آپ ڈریں مت بیٹھ جائیے۔ بیٹھ کے بات کریں کیا کہنا ہے آپ کو؟ کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟" وہ معمول سے ہٹ کے کافی نرمی سے گویا ہوا تھا مگر اس کی دو ٹوک نرمی میں بھی نرمی نہیں لگتی تھی۔

"شاہ! کون ہے بیٹا؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟" بتول شاہ اس کی آواز سے اندازہ لگا چکی تھیں کہ ڈرائنگ روم میں اس کے علاوہ بھی کوئی ہے اسی لیے وہ ملازمہ کو کچن میں بھیج کر خود ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں لیکن وہاں ایک ڈری سہمی لڑکی کو دیکھ کر یکدم ٹھٹک سی گئی تھیں جبکہ ڈرائنگ روم میں کسی خاتون کے وجود کو داخل ہوتے دیکھ کر اس لڑکی کو بہت ڈھارس ملی تھی اس کی تھمی تھمی سی سانسیں نورا نور ہو گئی تھیں۔ اسے بتول شاہ کا وجود اس وقت بہت بڑی ڈھال محسوس ہوا تھا اب وہ دل آور شاہ کے سامنے کھل کر اپنا دکھ، اپنا نقصان، اپنی اذیت و بے بسی بیان کر سکتی تھی۔ وہ دل آور شاہ کو اپنی سمت متوجہ دیکھ کر ذرا سا گھبرا گئی تھی اور فوراً صوفے پر ٹک گئی تھی۔

"اماں جان آپ بھی بیٹھیے کھڑی کیوں ہیں؟" اس نے بتول شاہ کو بھی بیٹھنے کا کہا تھا جو اسے ابھی تک سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں مگر وہ خود اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا اس لیے ان کے کسی بھی سوال کا جواب فی الحال نہیں دے سکتا تھا اسی لیے ان کے سوال سے نظر ہٹا کر اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

"جی فرمائیے؟ کس لیے مجھ سے ملنا چاہ رہی تھیں آپ؟" بتول شاہ کے برابر والے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے کافی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا تھا۔

"سر..... مم..... مجھے تین ماہ ہو گئے ہیں میں تھانوں اور کچہریوں کے دھکے کھاتی پھر رہی ہوں مجھے کہیں سے کوئی انصاف نہیں مل رہا میں غریب ہوں، مجبور اور بے بس ہوں، میرے ہاتھ میں پیسوں کی گڈیاں نہیں ہیں اس لیے کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ مجھ پہ ظلم ہوا ہے..... آج اگر میں کسی امیر باپ کی بیٹی ہوتی تو کب کا انصاف مل چکا ہوتا بلکہ میرا مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا مگر اور بہت سی بدنصیبیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدنصیبی ہے کہ میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں اور میری عزت اتارنے والا ابھی تک بڑی شان سے جی رہا ہے۔" وہ لڑکی کہتے ہوئے تڑپ تڑپ کے رو دی تھی اور بتول شاہ کے ذہن کو ایک گہرا شدید دھچکا لگا تھا انہیں اس لڑکی پہ ہونے والا ظلم سن کے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا انہوں نے بے ساختہ اس لڑکی سے نظریں ہٹا کر دل آور شاہ کو دیکھا جو بھنچ کر ان سے نظر چرا گیا تھا اس کے چہرے کے تاثرات سرد پڑ گئے تھے جبکہ وہ لڑکی مزید بولے جا رہی تھی۔

"میں انصاف کے لیے جہاں بھی گئی ہوں اتنا مجھے ہی لوگوں نے غلیظ اور گندی نظروں سے دیکھا ہے کسی نے بھی میرے حال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کسی نے مجھے انصاف دلانے کا نہیں سوچا، یا تو سبھی بھاری فیس مانگتے ہیں یا پھر اس بدمعاش کا نام سن کر ہاتھ کھینچ لیتے ہیں میں شاید تھک ہار کے اپنا معاملہ رب پہ چھوڑ دیتی لیکن مجھے تھانے سے نکلتے ہوئے انسپکٹر شہباز نے مشورہ دیا تھا کہ میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں۔ میں اپنا معاملہ رب پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ رب کے بندے کے سامنے بھی دامن پھیلانا چاہتی ہوں، خدا کے لیے مجھے انصاف دلا دیں۔ مجھے برباد کرنے والا سکھ کی نیند سوتا ہے یہی سوچ کر میری رات کانٹوں پہ بسر ہوتی ہے، میں آگ پہ سوتی ہوں اور میرا داغ دار وجود راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ خدا کے لیے مجھ پہ رحم کرو۔"

وہ لڑکی اچانک اپنا دوپٹہ پھیلا کر اس کے قدموں میں گرنے کے سے انداز میں آ بیٹھی تھی اور زلزلے کی زد پہ رکھا دل آور شاہ کا دماغ یکدم جھنجھنا اٹھا تھا اس نے فوراً اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے وہ لڑکی ہنوز دوپٹہ پھیلائے بیٹھی رو رہی تھی اور وہ مٹھیاں اور لب بھینچے نجانے کون سے طوفان کے ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں تھا جب یہ طوفان اختیار سے باہر ہوا تو وہ یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا لیکن وہاں سے جانے سے پہلے وہ اس لڑکی کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال گیا تھا گویا اسے اُمید اور تسلی دے گیا تھا کہ وہ اس

کے ساتھ ہے۔

دوسری طرف بتول شاہ ساکت و صامت سی سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھیں ان کے دماغ میں اس لڑکی کی آواز گونج رہی تھی اور ساتھوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی وہ لڑکی ابھی بھی دو ذانو قالین پہ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور اس لڑکی کے آنسو بتول شاہ کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے وہ عورت تھیں، عورت کا دُکھ جانتی تھیں انہوں نے بہت ہی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور پھر اعصاب یکجا کرتے ہوئے اُٹھ کر اس لڑکی کی سمت آئی تھیں۔ ''اٹھو بیٹا اوپر صوفے پہ بیٹھو۔'' اسے کندھوں سے تھام کر کہا تھا۔

''چپ ہو جاؤ۔ میرا دل آور شاہ تمہارا کیس ضرور لڑے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' ان کے لہجے میں تسلی، دلاسہ، مان، بھروسہ، یقین سب کچھ تھا کیونکہ وہ دل آور شاہ کی ''ماں'' تھیں اور ایک ماں ہونے کے ناتے وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان کا ''بیٹا'' کیا کچھ کر سکتا ہے؟

♥

آسمان کا شفاف نیلا رنگ رفتہ رفتہ اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ اب تا حد نظر پھیلا آسمان سرمئی رنگ میں ڈھل چکا تھا اور اسی سرمئی رنگ پہ زرد رنگ کا اُداس چاند چھوٹی چھوٹی بے ضرر بدلیوں سے اُلجھتا، اپنا دامن چھڑاتا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بڑے بڑے بادلوں کی سنگت سے گھبرائی یہ بدلیاں بار بار چاند کے راستے میں حائل ہو کر اسے چھیڑ کر، اس کی اُداسی میں خلل ڈال رہی تھیں جس پہ چاند کی اُداسی اور بیزاری میں قطرہ قطرہ اضافہ ہو رہا تھا وہ ان بدلیوں کو جھک جھک پیچھے ہٹا رہا تھا بار بار جھڑک رہا تھا مگر وہ اتنی شرارتی تھیں کہ اس کا راستہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں بلکہ ان کی شرارتوں اور اٹھکیلیوں میں اور بھی آوارہ بدلیاں شامل ہو گئی تھیں اور چاند کے گرد گھیرا تنگ کر چکی تھیں اس کا جی چاہا وہ فوراً جائے اور اُداس سے بیزار چاند کو ان شیطنت باز آوارہ بدلیوں کے گھیرے سے نکال کے اپنے پاس لے آئے اور پھر آرام سے، سہولت سے، اطمینان سے بیٹھ کر اس چاند سے اس کی اُداسی کا سبب پوچھے۔

تم اور کسی کو نہ سہی صرف مجھے اپنا سمجھ کے، اپنا راز داں، اپنا غم گسار سمجھ کہ یہ بتا دو کہ تم اتنے اُداس کیوں ہو؟ کس بے مہر نے تمہیں دُکھ پہنچایا ہے؟ کس نے تمہیں اُداسی کا رنگ بخشا ہے؟ کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس سے پوچھتی ہوں، میں اس سے لڑتی ہوں۔ آخر کیوں کیا اس نے ایسا؟ حالانکہ تم تو اتنے اچھے ہو کہ جس کو بھی تم چاہ دیکھتے ہو اس کے ہی ہو جاتے ہو۔ جبکہ یہ بے مہر، بے مروت لوگ تمہاری اس ادا کو اس وفا کو بھی ''ہر جائی'' کا نام دیتے ہیں حالانکہ لوگ خود ہر جائی ہیں۔

وہ چپ کی زبان میں چاند سے باتیں کرتی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی اور کیا کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کے رخسار پہ بارش کی پہلی بوند نے بوسہ دیا تھا۔ اس نے بُری طرح چونک کر اپنے گال پہ ہاتھ رکھ کے اس بوند کو چھو کر محسوس کیا تھا اور ایک بوند کو محسوس کرتے کرتے اور بوندیں بھی اس کو چھیڑتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ تو کیا چاند چھپ گیا؟ تھک گیا ان بدلیوں سے لڑتے لڑتے؟ اس نے سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھا جس پہ چاند کا نام و نشان تک نہیں تھا البتہ بدلیاں قہقہے لگاتی پھر رہی تھیں اب آسمان کے فراخ سینے پہ ان کا راج تھا وہ ہواؤں کے سنگ اُڑتی پھر رہی تھیں جیسے چاند کو وہاں سے بھگا کر جشن منا رہی ہوں۔ اور اب چاند کی اُداسی اس پہ اثر آئی تھی اب چاند کے لیے، وہ اُداس ہو رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم کس کے لیے اتنی اُداس ہو رہی ہو۔'' کومل اپنے دھیان، اپنی اُداسی میں ایسی محو کھڑی تھی کہ اس کی آواز پہ گڑبڑا کے رہ گئی تھی۔

''حرمت تم؟'' کومل نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے گھور کے کہا تھا۔ ''ہاں میں..... کیا تم کوئی اور سمجھی تھیں؟'' حرمت کا انداز دو معنی تھا جس پہ کومل کو مزید خفگی ہوئی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔

''میرا مطلب ہے کہ رات کے وقت بارش میں بھیگنا ٹھیک نہیں ہے۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔'' حرمت نے بے دھیانی میں بارش میں بھیگتی کومل کو بارش کی سمت متوجہ کیا تھا اور اپنی بات گول کر دی تھی۔

''اتنی نازک نہیں ہوں کہ بارش کی بوندوں سے بیمار پڑ جاؤں۔'' وہ اپنے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے سر جھٹک کر بولی تھی۔

''تم جتنی نازک ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ خیر چھوڑو اس بات کو، چلو نیچے چلتے ہیں کبھی ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھتے

ہوئے اٹھا لائے کر رہے ہیں اور تم یہاں بور ہو رہی ہو۔" حرمت نے کومل کا بازو پکڑ کر اسے بیرس سے کھینچ کر کمرے میں دھکیلا تھا اسے پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں ہٹے گی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں بور ہو رہی تھی؟" کومل اس وقت اس کے ساتھ نیچے نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے جرح کر رہی تھی۔

"اوکے بابا مان لیا کہ تم بور نہیں ہو رہی..... بلکہ انجوائے کر رہی تھیں۔ لیکن میری جان ہم چاہتے ہیں کہ تم اکیلی انجوائے نہ کرو بلکہ ہمارے ساتھ مل کر انجوائے کرو۔ نیچے چلو ہم سب نے آئس کریم منگوائی ہے زین آئس کریم لے کر آ چکا ہوگا۔" حرمت کے بار بار اصرار کرنے پہ کومل کو آنا ہی پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی کومل کی سب سے پہلی نظر علیزے پہ پڑی تھی جو شاید دانیال یا پھر احمد کی کسی بات پہ ہنس رہی تھی اور یہ بات اس حویلی کی تاریخ کی اہم ترین بات تھی کہ علیزے آفندی سب کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بیٹھی ان کی باتوں پہ ہنس رہی تھی اور یہ بات وہاں موجود لوگوں کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی کہ علیزے ان کے ساتھ ان کے درمیان بیٹھی باتیں کرتی ہنس رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر ان لوگوں کا خون بڑھ رہا تھا۔

"ہونہہ؟" کومل کو دیکھ کر کوفت ہوئی تھی نہ جانے کیا بات تھی کہ علیزے باقی سب کو بھی عزیز تھی کومل کو اتنی ہی خار کی طرح چبھتی تھی۔

"کومل کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا؟" دانیال نے ایک نظر حرمت کو دیکھ کر کومل کو بیٹھنے کا کہا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" کومل نے اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے نارمل سے لاپروا لہجے میں پوچھا تھا۔

"مت پوچھو کہ کیا ہو رہا ہے؟" دانیال نے مسکراتے ہوئے جس انداز میں نفی میں گردن ہلائی تھی اس پہ زبردست سا قہقہہ پڑا تھا اور اس قہقہے میں جویریہ، مدحت، انوشہ اور احمد بھی شامل تھے جبکہ عون اور عدید تو ہنس ہنس کے دوہرے ہو رہے تھے۔

"عون اور عدید اپنی علیزے آپی کو طرح طرح کی پہیلیاں بجھوا رہے ہیں اور وہ نہ جانے کیسے کیسے جواب ڈھونڈ کے لا رہی ہے کہ ہم بھی ایسی معلومات سے بے خبر ہیں۔ اب تم یہی سوال دیکھ لو کہ ایک مشہور شخصیت کا نام لے کر پوچھ رہے ہیں۔ ان کی قبر میں کون دفن ہے؟" دانیال نے دل کھول کے ہنستے ہوئے ان لوگوں کو سوال بتایا تھا اور کومل اس سوال پہ چونک گئی تھی۔

"اب تم بتاؤ کومل۔" دانیال نے شرارت سے کہا تھا۔

"ظاہر ہے بھئی جس کی قبر ہے وہی دفن ہوں گے اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟" کومل نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کریکٹ..... دیکھا محترمہ علیزے ایسے ہوتے ہیں ذہین بچے فوراً جواب حاضر....." دانیال نے کومل کو داد دیتے ہوئے علیزے کو شرم دلائی جو عون اور عدید کے اس سوال پہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی کہ "کون دفن ہے؟"

"یہ چیٹنگ ہے دانیال بھائی پہلے آپ نے عون اور عدید کے ساتھ مل کر مشورہ کیا اور پھر مجھے بیوقوف بنایا اور ان کے سوال پہ ایسے حیرانی ظاہر کی کہ مجھے بھی ان کا سوال سن کے حیرانی ہونے لگی اسی لیے میں اس سوال کو سیریس لینے لگی۔ کیونکہ یہ پاکستان ہے، یہاں صرف بم دھماکے اور خودکش حملے ہی نہیں ہوتے یہاں دھوکے اور فراڈ بھی ہوتے ہیں، جن سے آج کل قبرستان بھی محفوظ نہیں ہیں۔ یہاں تو پتا نہیں کس کس کی قبر میں کون کون دفن ہے؟ بچوں کی مذاق میں کہی بات اتنی سنجیدگی کا روپ لے گئی تھی کہ وہاں موجود سبھی لوگ چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی، بلکہ وہ بیٹھے بیٹھے ان کو اپنے ملکی حالات کا آئینہ دکھا گئی تھی، اس کی بات پہ کسی کو بھی اعتراض یا اختلاف نہیں ہوا تھا۔

"ہائیں اتنی خاموشی کیوں ہے جی؟" زین نے ڈرتے ڈرتے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا اور ان سب کو خاموش دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ حالانکہ وہ آئس کریم لے کر اچھلتا، کودتا، ڈانس کرتا، یہاں تک آیا تھا، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ ماحول بے حد خوشگوار چھوڑ کے گیا تھا۔

"لاؤ میں آئس کریم نکالتی ہوں۔" حرمت نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے شاپر تھام لیے تھے اور جب وہ باؤلز میں آئس کریم سجائے واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں سب موجود تھے، لیکن علیزے جا چکی تھی۔

♥

آج وہ صبح ہی صبح سب سے پہلے اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر آج وہ خرگوش کی طرح خیند کے مزے لیتا رہ گیا تو بہت پیچھے رہ جائے گا۔ بلکہ پچھتا تا رہ جائے گا۔ آج اس کو نوکری کی خوشی اور ولولے نے ٹھیک سے سونے ہی نہیں دیا تھا۔ آج رات کے بارہ بجے ہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صبح کے سات بج جائیں، تاکہ اسے مزید سات گھنٹوں کے انتظار کی کوفت نہ اُٹھانا پڑے۔ لیکن وقت ایسا اٹل تھا کہ وہ چاہے ایڑیاں بھی رگڑ لیتا اپنے اصول، اپنے مقام، اپنے اوقات سے آگے یا پیچھے نہیں سرک سکتا تھا، وقت ایک ایسا گھوڑا تھا جس کی لگام خود اللہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اللہ..... کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اللہ کی رضا کے مطابق بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ بارہ گھنٹوں میں رات کا سفر طے کرتا تھا اور بارہ گھنٹوں میں دن کی مسافت ختم کرتا تھا۔ کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے پایا تھا۔ وجہ کیا تھی؟ ''خدا کے ہاتھ میں لگام'' اور بس۔

''ناشتہ نہیں کرو گے؟'' وہ نہ جانے کس دھیان میں گم تھا کہ عابدہ خاتون کی آواز بھی نہ سن سکا تھا۔

''میں تم سے پوچھ رہی ہوں بیٹا، ناشتہ کرو گے نا؟'' انہوں نے قریب آ کر اسے متوجہ کیا تھا، وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

''جی امی ناشتہ کر کے ہی جاؤں گا، آج پہلا دن ہے وہاں پتا نہیں کیا ملتا ہے اور کیا نہیں؟'' عدیل نے سمجھداری سے کام لیا تھا، کیونکہ پہلے وہ صرف نوکری تلاش کرنے جاتا تھا، کبھی ناشتہ کر لیتا تھا، کبھی چھوڑ دیتا تھا۔ مگر آج وہ کام پہ جا رہا تھا، دن بھر کام میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ اگر بھوکا رہتا تو یقیناً کل دوبارہ کام پہ جانے کے لیے ذرا بھی سکت نہ رہتی۔

''ٹھیک ہے تم باہر آ کے بیٹھو، مریم ناشتہ لگا دیتی ہے تمہارا۔'' وہ اس کا کندھا تھپک کے باہر نکل گئی تھیں اور وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے دالان میں چلا آیا تھا، مریم چھوٹی سی ٹیبل پہ ناشتہ لگانے لگی اور تھوڑی دیر بعد وہ ناشتہ کر کے عابدہ خاتون اور مریم سے دُعائے کر باپ کے پاس آیا تھا، ان کی خاموش دُعا دامن میں سمیٹ کر فوراً گھر سے نکل گیا۔ اب اسے مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ بس سٹاپ پہ آ کر پانچ منٹ بس کا انتظار کیا تھا اور شکر تھا کہ چھٹے منٹ میں بس کی ٹوٹی پھوٹی سی شکل نظر آ ہی گئی تھی۔

لیکن لوگ اس ٹوٹی پھوٹی بس کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اتنے بڑے شہر میں صرف ایک ہی بس رہ گئی تھی۔ جیسے ہی بس قریب آ کر رُکی، پورے بس سٹاپ پہ اک شور، اک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ کچھ سواریاں بس سے اُترنے کے لیے بے چین تھیں اور کچھ اس بس میں سوار ہونے کے لیے بیتاب ہو رہی تھیں اور ان بیتاب لوگوں میں وہ بھی سرِفہرست تھا۔

وہ بھی اس بس میں سوار ہونے کے لیے راستہ تلاش رہا تھا۔ مگر لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ آج بس کی وجہ سے اپنی اتنی محنتوں سے ملنے والی نوکری سے محروم ہو کے رہ جائے گا۔ جبکہ نوکری سے محرومی کا خیال ہی اتنا سوہان روح تھا۔ وہ بھی اپنا سفید پن اور تمیز بالائے طاق رکھتے ہوئے اس ہجوم اور دھکم پیل میں شامل ہو گیا تھا اور تقریباً سات، آٹھ منٹ کی مسلسل تگ و دو کے بعد وہ بس میں سوار ہونے اور ایک عدد سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس نے ایک بے چین سی نظر اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالی تھی اور اتنے سے توقف میں اسے گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے یکدم جیسے شکر کا سانس لیا تھا۔ اور یونہی دھنے دھنے سے گھڑی دیکھتے ہوئے اس کا باقی کا سفر کٹا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس ایڈریس پہ پہنچ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ جمے رہ گئے تھے۔ اس کی نظریں سڑک کنارے نصب اس بورڈ پہ تھیں جس کے نیچے امتیاز کا شیری کا نام درج تھا۔ اس وقت اس بورڈ پہ درج چاچا امتیاز کے نام نے نہیں بلکہ کسی اور چیز نے منجمد کر دیا تھا اور وہ ابھی تک اسے ہی بار بار پڑھے جا رہا تھا۔ ''چاچا اور کشاپ۔''

تو گویا اسے ورکشاپ میں کرنا تھا؟ اس کے ذہن میں تمسخرانہ سا سوال اُبھرا تھا۔ جیسے وہ خود ہی اپنے آپ کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ اگر یہی کرنا تھا تو وہ اتنے دنوں سے اپنی ڈگری فائل میں سجائے کیوں گھوم رہا تھا؟ کیا حاصل تھا اس کا جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اتنے سال دن رات پڑھائی کی تھی، موٹی موٹی کتابوں سے مغزماری کی تھی، اتنے امتحان پاس کیے تھے اور اپنی کامیابی کے لیے اتنی دُعائیں مانگی تھیں۔ لیکن آج سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا، بلکہ ''چاچا ورکشاپ'' کا بورڈ بڑے تمسخرانہ انداز میں اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل کا منہ چڑا رہا تھا، جسے وہ گھر سے نکلتے ہوئے بڑی احتیاط اور بڑی خوشی کے ساتھ اپنے ساتھ لے آیا تھا، تاکہ ضرورت پڑنے پہ وہ اس کی کوالیفکیشن بھی دیکھ لیں۔ مگر ضرورت بھلا کیا پڑ سکتی تھی؟ ضرورت سے پہلے ہی اس کی ڈگری منہ چھپانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ وہ سڑک کنارے کھڑا اپنی فائل کو بے بسی سے تھامے زخمی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اوئے باؤ عدیل تم آ گئے؟'' چاچا امتیاز اچانک ورکشاپ کے احاطے سے باہر نکلے تو پہلی نظر اسی پہ پڑی تھی جو اپنی جگہ پہ جامد کھڑا ورکشاپ کے اندر جانے کی ہمت مجتمع کر رہا تھا اور چاچا امتیاز کی آواز پہ یکدم چونک کر اپنے حواسوں میں واپس آیا تھا اور گہری سانس کھینچی تھی۔

♥

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب اچانک ان کی آنکھ کھلی تھی اور وہ بے ساختہ ہی کسی احساس کے تحت اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھیں، ان کا رخ کچن کی طرف تھا، کیونکہ کچن کی جلتی ہوئی لائٹ کے ساتھ ساتھ برتنوں کی کھڑ پٹر کی آوازیں بھی آ رہی تھیں اور کچن کے دروازے میں پہنچ کر انہیں وہی نظر آیا تھا جس کی وہ توقع کر رہی تھیں۔

''جودت۔'' ان کی آواز میں سختی کا عنصر نمایاں تھا اور وہ جو اپنے دھیان میں مگن بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے لیے کھانا نکال کر گرم کر رہا تھا ان کی آواز پہ ذرا سا چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

''جی مام؟'' اس نے اپنے تاثرات کنٹرول کرنے میں سیکنڈ کا وقت لیا تھا۔

''یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا؟'' ان کے لہجے کی سختی مزید گہری ہوئی تھی، کیونکہ اگر وہ اس طرح سختی سے پیش نہ آتیں تو کل کو باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ ان کے بڑے بیٹے اور شوہر کا زیادہ الزام ان ہی پہ آتا کہ انہوں نے ہی اسے بگاڑا ہے کیونکہ وہ اس کی ماں تھیں اور اکثر اولاد کے بگڑنے کا سبب لوگ ماں کو ہی گردانتے ہیں، چاہے اس میں ماں کا رتی برابر بھی قصور نہ ہو۔

''جودت میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے؟'' اب کی بار ان کی آواز دبی ہوئی، مگر لہجہ کافی تیز تھا۔

''مام گھر آنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے؟ گھر تو گھر ہے، جب چاہے آؤ، جب چاہے جاؤ، نو ٹینشن؟'' وہ انتہائی لاپروائی سے کہتا فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور راستے کا باؤل نکال کر ٹیبل کی سمت آ گیا اور دائیں پاؤں کی مدد سے کرسی گھسیٹ کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

''یہ رونین گھر کی نہیں ہوٹلز کی ہوتی ہے، جب چاہے آؤ اور جب چاہے جاؤ، جہاں کسی کو کوئی پروا نہیں ہوتی کہ کون آ رہا ہے؟ اور کون جا رہا ہے؟ وہاں تمہارا یہ ''نو ٹینشن'' بھی سوٹ کر جاتا ہے اور تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ گھر ہے، یہ بڑی حویلی ہے، یہاں آج تک ایسی آوارہ گردی کسی نے بھی نہیں کی جیسی تم کر رہے ہو، اگر تمہاری ان حرکتوں کا بھائی صاحب (وقار آفندی) کو پتا چل گیا تو وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بنا تمہیں گھر سے نکال دیں گے، پھر کرتے رہنا جی بھر کے آوارہ گردی۔''

ثروت بیگم کا انداز بے حد تیز اور سخت تھا، وہ جودت کو ہر ممکن طریقے سے ان حرکتوں سے باز رکھنا چاہتی تھیں، جبھی ان کا لیکچر رات کے تین بجے بھی جاری تھا، جس کا بہر حال جودت آفندی پہ ذرا بھی اثر نہیں تھا، وہ بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا، اس نے سلاد کی پلیٹ سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے ثروت بیگم کی خاموشی نوٹ کی تھی اور فوراً استفہامیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھا تھا، وہ لب بھینچے بہت کڑی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''آپ خاموش کیوں ہو گئیں مام؟ کچھ اور بھی کہیے نا، میں سن رہا ہوں ڈونٹ وری۔'' اس نے اپنی ماں کو پھر سے بولنے پہ اکسایا تھا۔

''یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ بھٹکتی رہیے مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہو گا؟'' ثروت بیگم نے غصے اور ملامت کی حد کر ڈالی تھی۔

''اُف خدایا..... اللہ معافی دے، آپ کیوں رات کے اس پہر مجھے گناہگار کرنے پہ تلی ہوئی ہیں؟ آپ میری ماں ہیں، آپ کا اک اک لفظ میرے لیے قابل احترام ہے، میں بھلا کیوں ایسا کہنے لگا؟'' اس نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

''اس وقت تم کون سا کوئی نیک کام کر کے آ رہے ہو جو تمہیں گناہگار ہونے سے ڈر لگ رہا ہے؟'' وہ حقیقتاً غصے کی بہت تیز تھیں اور زندگی میں انہیں سب سے زیادہ غصہ جودت نے ہی دلایا تھا۔ حالانکہ ان کے باقی تینوں بچے بھی تھے۔ آذر، حرمت اور مدحت! انہوں نے کبھی بھی ماں کو اس طرح تنگ نہیں کیا تھا جیسے جودت کرتا تھا، جودت ہر وہ کام کر کے رہتا تھا جس سے اسے منع کیا جاتا تھا، وہ ذہین بھی تھا، لائق بھی تھا، مگر اچھا بچہ نہیں تھا۔ اس نے آج تک کوئی بھی اچھے بچوں والا کام نہیں کیا تھا، سوائے تعلیمی

ریکارڈ کے۔ ابھی پوزیشن لینا اس کا ریکارڈ تھا اور وہ بھی صرف اس لیے تھا کہ ہر بار اگیزامز کے دنوں میں اس کا اپنے کزنز دانیال، زین، احمد اور حماد وغیرہ سے کمپیٹیشن ہو جاتا تھا، جس کے لیے وہ دن رات محنت کرتے ہوئے فرسٹ پوزیشن کو اپنا ٹارگٹ بنا لیتا تھا اور ہر بار یہ ٹارگٹ جیت کر وہ اپنے ماں، باپ اور تایا جان (دقار آفندی جس کو وہ سب "ڈیڈ" کہتے تھے) کو لاشعوری طور پہ بے پناہ خوش کر دیتا تھا۔ اگر کبھی اسے یہ احساس ہو جاتا کہ گھر والے اس کی اس کامیابی پہ کس قدر خوش ہوتے ہیں تو یقیناً وہ اگلے ہی سال ان کی یہ خوشی ملیامیٹ کر کے رکھ دیتا۔

"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں اس وقت کوئی بُرا کام ہی کر کے آرہا ہوں؟" وہ اتنے مضبوط لہجے میں بولا کہ ثروت بیگم ٹھٹک گئیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی بات کو مذاق سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا۔

"تو تم کون سا اس وقت تجہد پڑھ کے آرہے ہو؟ تمہارا تو بس ایک ہی کام ہے، دو، چار آوارہ دوست، شراب، کلب اور دو ٹکے کی فلرٹ کلاس الٹرا ماڈرن لڑکیاں..... اور بس، اس سے آگے کا تم سوچ ہی نہیں سکتے۔" ان کا لہجہ انتہائی تمسخرانہ ہو گیا تھا، جس پہ جودت نے کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے بڑے غور سے اپنی ماں کے تیور دیکھے تھے۔

"ماں صرف تجہد پڑھنا ہی نیک کام نہیں ہے، نیک کاموں کی فہرست بہت طویل ہے، اگر اس وقت آپ کو گنوانے کھڑا ہو گیا تو مجھے یقین ہے کہ صبح کا سورج طلوع ہو کر کل شام تک غروب بھی ہو جائے گا۔ لیکن وہ فہرست ختم نہیں ہو گی۔ لہٰذا آپ کے لیے مختصر بتا دیتا ہوں کہ مجھے راستے میں ایک بوڑھی عورت مل گئی تھی بہت مجبور اور بے بس تھی، اس کے بیٹے کا کہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس جا سکتی، جس کے لیے وہ جگہ جگہ بھیک مانگتی پھر رہی تھی، مجھ سے بھی اس نے بھیک مانگی اور اپنی پرابلم بتائی، سو میں رو نہیں سکا اور اس کی مدد کرنے چل دیا، اور اس وقت میں اس عورت کو اس کے بیٹے کے پاس اسلام آباد چھوڑ کے آرہا ہوں، اس کا بیٹا شدید زخمی تھا اور ہسپتال میں تھا۔ اس لیے وہاں سے واپسی میں اتنی دیر ہو گئی اور آپ جانتی ہوں کی کہ لاہور سے اسلام آباد کا سفر کتنا طویل اور کتنے گھنٹے کا ہے؟ اور اگر پھر بھی آپ کا کوئی شک باقی رہ جائے تو صبح نون کر کے اس بوڑھی عورت سے میری اس داستان کی تصدیق بھی کر لیجیے گا اور اس کے بیٹے کی عیادت بھی۔"

وہ ساری بات بے تحاشہ لفظوں میں بیان کر کے اپنا موبائل فون یہ کہہ کر ان کے ہاتھ پہ رکھ کے چلا گیا کہ سب سے پہلا نمبر اس ہسپتال کا ہے آپ وہاں سے پتا کر لیجیے گا اور ثروت بیگم حیرت اور بے یقینی سے گنگ کھڑی رہ گئی تھیں۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ پہ رکھے جودت کے موبائل کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی کچن سے باہر جہاں جودت غائب ہو گیا تھا۔ اور اب غصے سے نکلتے ہی انہیں وہی روایتی ماؤں سا پچھتاوا ہوا تھا کہ انہوں نے غصے میں اپنے بیٹے کو ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھانے دیا تھا۔ حالانکہ وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے تھکا ہوا گھر آیا تھا۔ ان کی ان ہی سوچوں میں فجر کی اذان بھی ہونے لگی تھی اور حویلی کے بیشتر لوگ نماز کے لیے اٹھنے لگے تھے اور سب سے پہلے اٹھنے والی آسیہ آفندی تھیں۔

"ثروت تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ بھی کچن کی لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر ہی آ گئی تھیں، لیکن ثروت بیگم کو کچن کے بیچوں بیچ کسی اسٹیچو کی طرح کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"ہوں ٹھیک ہوں، بس وہ نماز پڑھنے جا رہی تھی۔" ثروت بیگم نے گہری سانس لیتے ہوئے جودت کا موبائل مٹھی میں دبا کر ہاتھ پیچھے کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے تو پھر وضو کرو، میں بھی وضو کرنے ہی جا رہی ہوں۔" آسیہ آفندی ان کا کندھا تھپک کر چلی گئیں اور ثروت بیگم جودت کا موبائل رکھنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آ گئیں جہاں وہ تھکن کے باعث اتنی سی دیر میں ہی بے سدھ سو رہا تھا۔

♥

وہ چائے کا بڑا سا مگ ہاتھ میں لیے چائے پینے کے ساتھ ساتھ نیوز پیپر کی ہیڈ لائنز پہ بھی نظر دوڑا رہا تھا جب اچانک ڈور بیل کی آواز نے ذرا سا چونکا دیا تھا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اس نے خود سے سوال کرتے ہوئے بے ساختہ وال کلاک کی سمت دیکھا تھا جہاں اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور یہاں لندن میں صبح آٹھ بجے کا وقت بھی رات کے چار بجے کا وقت سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس وقت کسی کی آمد پہ حیران ہونا ایک لازمی امر تھا، کیونکہ یہ وقت یہاں کے باسیوں کے سونے کا وقت ہوتا تھا۔ یہاں لوگ عموماً دن کے

گیارہ، بارہ بجے بیدار ہونا شروع ہوتے تھے اور بیداری کا یہ سلسلہ دن کے تین، چار بجے تک جاری رہتا تھا، یعنی ان لوگوں کی صبح دن کے تین یا چار بجے ہوتی تھی۔ خصوصاً عورتوں کی صبح، کیونکہ بچوں اور مردوں کو جلدی اُٹھنا ہوتا تھا۔ بچے سکول جانے کے لیے جلدی اُٹھنے پہ مجبور ہوتے تھے اور مرد اپنے کام پر جانے کے لیے، البتہ جو مرد حضرات لیٹ کام پر جاتے تھے وہ بیویوں کے ہر لیٹ ہی بیدار ہوتے تھے اور جو جلدی اُٹھنے پہ مجبور تھے وہ اپنا ناشتہ بھی خود ہی بنانے پہ مجبور ہوتے تھے، کیونکہ رات کے ڈھائی، تین بجے سونے والی ماؤں اور بیویوں کے پاس اتنا لاڈ پیار ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ وہ صبح صبح اُٹھ کر اپنے بچوں اور شوہروں کے نخرے اُٹھاتیں اور انہیں ناشتہ بنا کر کھلاتیں، لہٰذا اپنی مدد آپ کے تحت وہ لوگ خود ہی روکھا پھیکا ناشتہ کر کے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ ان لوگوں نے آج تک صبح صبح کسی عورت کے ہاتھ سے بنے پراٹھے اور چائے کا ذائقہ بھی نہیں چکھا تھا، چاہتوں سے بھرے ذائقوں سے محروم زندگی جی رہے تھے۔ ان کے یہاں کھانے پینے میں بھی ناز نخرہ نہیں چلتا تھا۔

وہ نیوز پیپر سائیڈ میں رکھ کر دروازہ کھولنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تھا، البتہ ذہن میں اُبھرتی حیرانی اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا مگ ساتھ ساتھ تھے۔ جب تک وہ دروازے تک پہنچا، ڈور بیل تیسری بار بج چکی تھی۔ چند سیکنڈز کے توقف سے اس نے دروازہ کھول دیا تھا لیکن حیرانی ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی تھی، جس کی وجہ سامنے کھڑی ہستی تھی۔

"آپ؟" بے ساختہ منہ سے نکلا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ بھی اسے سامنے دیکھ کر تھوڑا جھجکی تھی۔

"وعلیکم السلام، آپ اس وقت یہاں؟" نبیل حیات سے اپنی حیرانی چھپائے نہیں چھپی تھی۔

"جی وہ میں مدیحہ سے ملنے آئی تھی۔" اس نے آہستگی سے اپنے ٹھہرے ہوئے مخصوص دھیمے پن سے جواب دیا تھا۔

"اوہ... اندر آیئے۔" نبیل حیات فوراً سامنے سے ہٹ گیا تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اس کے پیچھے ہی اندر آگئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بغیر والیوم کے ٹی وی چل رہا تھا۔ ناشتے کی پلیٹ درمیانی ٹیبل پر رکھی تھی، چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گویا اس وقت وہ اکیلا بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا اور باقی؟

"مدیحہ اور آنٹی وغیرہ کہاں ہیں؟" اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد استفسار کیا تھا، جبکہ نبیل حیات کی نظریں اس کے احترام میں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی نظر نہ ملے۔

"مام ڈرائیک اُٹھتی ہیں اور مدیحہ کے اُٹھنے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں۔ لیکن پھر بھی اس وقت دونوں سو رہی ہیں۔ آپ پلیز بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کچن کی سمت پلٹا۔

"نن... نہیں اس کی کوئی ضرورت ہے، میں ابھی گھر سے ناشتہ کر کے ہی نکلی ہوں۔ وہ ان نیلک عبداللہ بھائی نے کسی کام سے آج ہر حال جانا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ جانے سے پہلے مجھے ڈراپ کر جائیں، بعد میں کوئی ڈراپ کرنے والا نہیں ہوگا اس لیے کافی صبح صبح ہی آگئی ہوں اور آپ کو بھی ڈسٹرب کر دیا ہے۔" اس نے اپنی آمد کی وضاحت بیان کی اور نبیل حیات کی نظریں اُڑتے اُڑتے بھی اس کے چہرے کو چھو آئی تھی۔ حالانکہ ایسا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا، نظر کی یہ حرکت بے اختیاری تھی سو فیصد۔

"ڈسٹرب؟" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"کیا میں مدیحہ کے بیڈ روم میں جا سکتی ہوں؟" وہ نبیل حیات کی خاموشی سے اُکتا کر بولی تھی، کیونکہ وہ چپ چپ لگ رہا تھا اور بہتر تھا کہ وہ وہاں سے جلد ہی ہٹ جائے۔

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ اب کی بار بھی آہستگی سے بولا تھا۔ اس کی اجازت پا کر زری فوراً ہی سیڑھیاں عبور کر گئی تھی، جبکہ وہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا، چپ سوچ میں گم اور کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا ہوا۔ یقیناً وہ زری کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ وہ عبداللہ کی بہن تھی پڑھی لکھی، خوبصورت، شرقیت سے مالا مال، ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔ اور ایک اس کی بہن تھی پڑھی لکھی، خوبصورت، مغربی رنگ ڈھنگ میں پور پور ڈوبی، ہر لحاظ سے ان کمپلیٹ، جتنی زری سلجھی ہوئی تھی۔ اتنی ہی مدیحہ بگڑی ہوئی تھی اور اس میں قصور کس کا تھا؟ اس سوال کا جواب وہ اپنے آپ کو نہ دے سکا۔ کیونکہ جواب دینے کے لیے اسے پچھلے کھاتے کھول کے دیکھنا پڑتے جو فی الحال وہ نہیں کر سکتا تھا۔

"مبارک خان! مبارک خان۔" وہ حویلی کی پچھلی سائیڈ میں بنی ایسی سے نکل کر حویلی کی بائیں سائیڈ عبور کرتی ہوئی مرکزی حصے کی طرف آتے ہی پکاری تھی، اس کی آواز خاصی بلند تھی اور قدم عجلت بھرے لگ رہے تھے وہ لان کی نرم گھاس اپنے سینڈلز کی ہیل سے کچلتے ہوئے بڑی تیزی سے دائیں سائیڈ میں بنے سرونٹ کوارٹرز کی سمت بڑھ رہی تھی۔

"مبارک خان۔" اس نے ایک بار پھر آواز دی مگر مبارک خان موجود ہوتا تو جواب دیتا، جب وہ موجود ہی نہیں تھا تو جواب کیسے آسکتا تھا؟

"مبارک خان!" اس نے سرونٹ کوارٹرز کے کونے میں کھڑے ہو کر ایک بار پھر چیخ کر پکارا تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مبارک خان سامنے ہو تو اس کا گلا گھونٹ دے، آخر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

"علیزے کیا بات ہے؟ مبارک خان کو کیوں بلا رہی ہو؟" آذر آفندی کی آواز پہ علیزے تیزی سے پیچھے مڑی تھی۔

"آذر بھائی آپ کب آئے؟" علیزے کے چہرے سے پریشانی کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آذر مزید پریشان ہوا تھا، وہ ابھی ابھی حویلی واپس آیا تھا۔ گاڑی سیاہ پتھروں سے بنی روش پہ گھوائی کی شکل میں گھومتی ہوئی پورچ کی سمت آئی تو آذر کی پہلی نظر علیزے پہ ہی پڑی تھی، جو کافی عجلت بھرے انداز میں سرونٹ کوارٹرز کی سمت بڑھ رہی تھی اور مبارک خان کی آوازیں دے رہی تھی، جس پہ فوراً ہی آذر کو کسی پریشانی، کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

"میں بس ابھی آیا ہوں، تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں آواز دے رہی ہو مبارک خان کو؟" آذر نے ذرا سختی سے دہرا کے پوچھا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ عائشہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے، انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔" علیزے آذر کے تیور دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی، وہ لڑکیوں کے معاملے میں بہت سخت تھا، لیکن اس نے یہ سختی اور خفگی کبھی علیزے پہ ظاہر نہیں کی تھی، کیونکہ وہ ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی کزن تھی۔ باقی سب کی طرح وہ بھی اسے بہت پیار کرتا تھا اور علیزے آذر سے کافی کلوز بھی تھی۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" اس کے لہجے کی سختی ہنوز تھی۔

"کوئی بھی گھر پہ نہیں ہے۔" علیزے آہستگی سے بولی۔

"کیا۔۔۔ دانیال، زین اور جوزت وغیرہ کہاں گئے؟" آذر کا انداز تفتیشی تھا، حالانکہ آذر کافی بردبار قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے تمام کزنز میں سے سب سے بڑا تھا۔ اس کے اپنے ماں، باپ ہی نہیں اس کے چچا اور تایا بھی اس پہ ہی انحصار کرتے تھے، بلکہ وہ اس کی عزت اور قدر کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کا بہت سمجھدار، لائق فائق اور ہونہار سپوت تھا۔ تحمل اور سمجھداری اس کی شخصیت کے دو اہم رکن تھے، وہ اپنے سے چھوٹے کزنز پہ بلاوجہ اپنا بڑا پن اور رعب جمانے کی کوشش کرتا تھا، نہ ہی اس نے کبھی دوسرے کزنز یا پھر اپنے بہن، بھائیوں کی پرائیویسی یا معاملات میں انٹرفیئر کیا تھا۔ بس جو جیسا ہے، ٹھیک ہے، کہہ کر اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وہ عزت کرنا بھی جانتا تھا اور کروانا بھی۔ البتہ لڑکیوں کے معاملے میں تھوڑا روڈ تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے لڑکیوں پہ کبھی بھی زیادہ پابندیاں عائد نہیں کی تھیں، یہی وجہ تھی کہ اس کے تمام کزنز حقیقتاً اس کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے، کوئی بھی بات کہہ دینا وہ فوراً مان بھی جاتے تھے۔ شاید وہ اس کی خاموشی، اس کی چپ سے خائف رہتے تھے کہ وہ کہیں پھٹ نہ پڑے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا، وہ ایک نارمل اور ویل سیٹلڈ پرسن تھا۔

"مجھے کیا پتا کہ کہاں گئے؟" علیزے کندھے اچکاتے ہوئے واپسی کے لیے پلٹی۔

"تم چلو میں آرہا ہوں، میں پھوپھو کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔" آذر علیزے کا چپ ہونا بھانپ گیا تھا۔

"پھوپھو کی طبیعت زیادہ خراب ہے، وہ اکیلی آپ کے ساتھ نہیں جاسکتیں، میں مما کو بھیجتی ہوں؟" وہ کہتے ہوئے حویلی کے نصف دائیں مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی، اور آذر صرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ علیزے نے اس کے سخت لہجے کو کافی فیل کیا ہے۔

وہ سر جھٹک کر اس مسئلے کو پھر کبھی پہ ٹال کے انیکسی کی سمت بڑھ آیا تھا، جہاں پہنچ کر اسے علیزے کی پریشانی کا باخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ عائشہ پھوپھو کی کافی سیریس کنڈیشن تھی اور ان کے پاس سوائے انوشہ (عائشہ پھوپھو کی بیٹی) کے اور کوئی بھی نہیں تھا اور انوشہ ان کے سرہانے بیٹھی مسلسل روتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر سہلا رہی تھی۔ عائشہ پھوپھو اس وقت نیم بیہوشی کی حالت

میں تھیں، آذر نے انوشہ کو تسلی دیتے ہوئے عائشہ پھوپھو کو اپنے بازو کے سہارے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور کبھی کبھی ان دونوں مرض میں سے کوئی ایک بھی ان پہ حاوی ہو جاتا تو ان کی حالت اسی طرح غیر ہو جاتی تھی، وہ وقت بھی نہ جانے ان کا بی پی لو ہو گیا تھا یا پھر شوگر ہائی ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بے دم ہو رہے تھے، وہ اپنے قدموں پہ کھڑی ہونے اور چلنے کے قابل بھی نہیں تھیں، ان کی سکت ختم ہو چکی تھی۔ وہ انہیں لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا تو آسیہ آفندی کو پہلے سے منتظر پایا تھا۔

"آذر! عائشہ کی طبیعت تو پہلے سے بھی زیادہ خراب لگ رہی ہے۔" آسیہ آفندی نے گاڑی میں بیٹھ کر عائشہ آفندی کو پیچھے میں رکھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"جی مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" وہ گاڑی نکالتے ہوئے فکرمندی سے بولا تھا اور پھر جیسے ہی گاڑی روڈ پہ ڈالی اس نے فوراً ڈیش بورڈ سے اپنا موبائل اٹھا کر دانیال کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اس نے دوسری ہی رنگ پہ کال ریسیو کر لی تھی۔

"عائشہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے، تم ابھی ہسپتال پہنچو، میں انہیں لے کر ہسپتال ہی آ رہا ہوں۔" آذر نے ایک ہی سانس میں بات ختم کر کے اس کا جواب سنے بغیر کال بند کر ڈالی تھی اور ساتھ ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی، اسے پتا تھا کہ دانیال ماں کی طبیعت کا سن کر ان سے بھی پہلے ہسپتال پہنچ چکا ہو گا۔ کیونکہ ان تینوں بھائی، بہن، دانیال، زین اور انوشہ کے لیے ان کی ماں سب کچھ تھی۔

♥

"بی بی آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" لہجہ بے لچک سا تھا۔

"جی مومنہ۔" وہ آہستہ سے بولی تھی۔

"ہاں تو مومنہ بی بی میں نے فیصلہ کیا ہے، میں آپ کا کیس لڑنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ مضبوط اور پُرعزم لہجے میں بولا اور اس لڑکی کے چہرے پہ زندگی چمک اٹھی تھی۔

"لیکن ایک شرط....." اس کی اگلی بات نے اس لڑکی کے چہرے کی چمک، بلکہ زندگی نوچ لی تھی۔ اس نے دو دن دو دن میں گھر کر دل آور شاہ کے سرد سپاٹ پتھریلے تاثرات والے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"کیا اس کی شرط بھی باقی وکیلوں جیسی تھی؟"

"کہ آپ کسی بھی موڑ پر جا کر قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گی، چاہے آپ پر کتنی ہی مشکل اور مصیبت کیوں نہ آ جائے، آپ پھر بھی ہمیشہ ثابت قدم رہنا ہے، کسی بھی چیز سے گھبرانا نہیں ہے اور اگر ایسا کرنا ہے تو ایم سوری میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا، آپ اپنا کیس کسی اور کے ہاتھوں میں سونپ سکتی ہیں اور آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔" اس نے دو ٹوک کہتے ہوئے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا اور اس مومنہ نامی لڑکی کا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا، اس کے چہرے کی چمک اور زندگی واپس اپنے مقام پہ آ گئی تھی۔

"وکیل صاحب ایک شریف اور عزت دار لڑکی کے لیے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور جب وہ عزت بھی نہیں رہے گی تو کچھ بھی نہیں رہتا، پھر کسی مشکل، مصیبت اور آفت سے ڈر بھی نہیں لگتا۔ میں بھی ہر ڈر سے عاری ہوں اور کبھی بھی قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گی۔ کیونکہ ثابت قدم رہنے کے لیے اور انصاف پانے کے لیے میں نے بھی بہت سے لوگوں کے قدم پکڑے ہیں، بہت سے لوگوں کے پاؤں پڑی ہوں۔ بہت دھکے کھانے کے بعد آپ کے سامنے بیٹھی ہوں اس وقت۔" اس لڑکی کا لہجہ اور انداز بھی مضبوط تھے اور دل آور شاہ کی تسلی ہو گئی تھی، وہ یکدم صوفے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، پھر آپ کل ہی میرے آفس آ کر اپنا کیس ریکارڈ کروا دیں، باقی کا کام میں دیکھ لوں گا۔" وہ کہتے ہوئے جانے کے لیے ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھا تھا، لیکن اچانک کچھ یاد آنے پہ ٹھہر گیا تھا اور دوبارہ واپس پلٹ آیا تھا۔

"ایم سوری مجھے یہ بتانے کا تو خیال ہی نہیں آیا کہ میرا آفس لاہور میں ہے، آپ اسلام آباد سے لاہور کیسے جائیں گی اس کا انداز متفکر تھا۔

"جی میں بھی لاہور کی رہنے والی ہوں، لاہور کے ساتھ ہی میرا گاؤں ہے، میں یہاں اسلام آباد صرف آپ کے لیے ہوں، مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ آج کل اپنے اسلام آباد والے گھر پہ ہی ملیں گے، کیونکہ آپ اپنی اماں جان سے ملنے کے

کیے ہوئے ہیں۔" اس نے وضاحت دی تھی۔

"ہوں..... پھر ٹھیک ہے آپ لاہور پہنچ کر میرے مشی سے رابطہ کر لیجیے گا۔" وہ جیب سے کارڈ نکال کر اسے تھما گیا تھا اور اندر داخل ہوتی بتول شاہ کچھ ریلیکس ہو گئی تھیں، انہیں اب یقین ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کو انصاف ضرور ملے گا۔ اول تو دل آور شاہ کوئی بھی ایسا ویسا کیس ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور اگر لیتا تھا تو پھر کبھی ہارنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ لاہور ہائیکورٹ میں اس کی اپنی ایک ساکھ تھی، لوگ جس کیس پہ دل آور شاہ کا نام دیکھ لیتے تھے اس کیس کے مدعی یا مجرم کو بنا کیس لڑے ہی جیتا ہوا تصور کرتے تھے، جیسے اس وقت بتول شاہ کر رہی تھیں۔

♥

اس نے اپنے بھاری اور بوجھل سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے گردن سیدھی کی اور آنکھیں کھول کر بیڈ کے قریب کھڑی زری کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا سر اور دماغ ہی بھاری نہیں ہو رہے تھے، بلکہ آنکھوں کے پپوٹے بھی بھاری اور بوجھل محسوس ہو رہے تھے، جس کی وجہ سے آنکھیں کھل ہی نہیں رہی تھیں اور اس کی یہ مشکوک سی بہکی بہکی حالت زری نے بھی محسوس کی تھی۔ مگر اپنے شک کو جھٹک دیا تھا۔

"مدیحہ کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" زری نے جھک کر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا تھا اور زری کے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس یکدم اس کے جسم میں کپکپی دوڑا گیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ لیکن پھر بھی بوجھل ذہن کو ٹھکانے پہ لانے کے لیے اسے چند منٹ لگے تھے۔

"آر یو آل رائٹ مدیحہ۔" اس نے دُہرا کے پوچھا، ساتھ ہی کھوجتی ہوئی گہری نظریں اس پہ مرکوز کر دی تھیں۔

"یس آئی ایم فائن؟" مدیحہ نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی اور نبل ہٹا کر پاؤں بستر سے نیچے اتار لیے تھے۔ رات کو وہ ڈرائنگ روم میں ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ ہر سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر، لیکن اس کے قریب کھڑی فائزہ بیگم اس کی ماں تھیں۔ انہوں نے تو ماہ اسے سرد و گرم سے بچایا تھا۔ محفوظ رکھا تھا۔ پھر اب اسے کیسے اس کے حال پہ چھوڑ کے پیچھے ہٹ جاتیں، وہ رہ نہ سکیں اور جیسے تیسے بمشکل اسے سہارا دے کر بیڈ روم میں چھوڑ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کی جیکٹ اور جارگز بھی انہوں نے ہی اُتار کر رکھے تھے اور شبل بھی وہی اوڑھا کر گئی تھیں۔

"قسم سے تم کیسی ہو؟" مدیحہ نے شدید قسم کی انگڑائی روکتے ہوئے اپنے گھنگھریالے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر پیچھے کیا تھا۔ اب وہ زری کے سامنے کھڑے ہونے کا سوچ رہی تھی کہ کیسے اپنا توازن قائم رکھے، کیونکہ اس کو اپنے لڑکھڑانے کا اندیشہ پہلے سے ہی تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، لیکن تم ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" زری کا لہجہ شکی تھا۔

"اوہ یار مگر نہ کرو میں ٹھیک ہوں، بس آج ذرا لیٹ سوئی تھی، شاید دو، تین گھنٹے ہوئے ہیں مجھے سوئے ہوئے، اس لیے اچانک نیند ٹوٹنے پہ ذہن ٹھکانے پہ نہیں آ رہا، تم بیٹھو میں آتی ہوں۔" مدیحہ ننگے پیر ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور لڑکھڑانے کے ڈر سے تیز تیز قدم اُٹھاتی واش روم میں بند ہو گئی تھی۔ وہ جلد از جلد چہرے پہ پانی کے چھینٹے مار کر دانت برش کرنا چاہتی تھی، تاکہ اس کے منہ سے شراب کی بُو نہ آئے جو یقیناً زری کو ناگوار گزرتی۔ اس نے دو سے تین بار برش کیا اور پھر ماؤتھ واش سے پورا منہ حلق تک جھاں اپنے ذہن، اپنی سوچ سے اُلجھتی زری اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

زری جس چیز کے متعلق سوچ رہی تھی اس چیز کے متعلق کچھ بھی کہنا نہیں چاہتی تھی اور کہنے نہ کہنے کی کشمکش ہی اسے اُلجھا رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" مدیحہ تولیے سے چہرہ پونچھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور آئینے میں نظر آتے زری کے عکس کو دیکھتے ہوئے ہیئر برش اُٹھا کر بال سلجھانے لگی، جو اتنے گھنے اور گھنگھریالے تھے کہ بمشکل ہی سلجھتے تھے۔

"سوچ رہی ہوں کہ آج کل تم کہاں بزی ہوتی ہو؟" زری نے اچانک کہہ دیا تھا مدیحہ کے ہاتھ لمحہ بھر کو رُکے تھے اور پھر سے رواں ہو گئے۔

"جہاں پہلے ہوتی تھی۔" جواب کورا تھا۔

"پہلے تو تم مجھ سے بھی کانٹیکٹ رکھتی تھیں، گھر پہ بھی آتا جاتا تھا، اب تو تم نے اتنے دنوں سے سب کچھ ہی چھوڑ دیا ہے نہ اپنی خیر خبر، نہ ہماری۔" انداز کھوجتا ہوا، لیکن لہجہ شکوے سے پُر تھا۔

"بس میرے فرینڈز برائن اور شیلے کا کل رات برتھ ڈے تھا، بہت دنوں سے اس برتھ ڈے پارٹی کی ارینج منٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے فرصت نہیں ملی۔" وہ اپنے بالوں کو سختی سے بینڈ میں جکڑتے ہوئے بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پہ دھنس کر بیٹھ گئی تھی۔ انداز بے حد لاپروا تھا جو زری کو ہرگز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"پاکستان کب جا رہے ہیں آپ لوگ؟" اب کی بار اس نے سیدھا سیدھا سوال کیا تھا اور اس کے سوال پہ مدیحہ کے چہرے کے تاثرات یکدم سرد و سپاٹ ہو کر سختی میں ڈھل گئے تھے۔ وہ زری سے جس بات کی توقع کر رہی تھی اس نے وہی کی تھی۔ اس کی سوچ سچ ثابت ہوئی تھی۔

"میں پاکستان نہیں جا رہی۔" جواب دوٹوک تھا۔

"کیوں؟" سوال بھی مختصر آیا۔

"جس نے تمہیں پاکستان جانے کا بتایا ہے اس نے میرے نہ جانے کا بھی بتایا ہوگا اس لیے یہ "کیوں" اور "کیا" کے سوال کرنا بیکار ہے۔" مدیحہ بہت بے لچک لگ رہی تھی۔

"لیکن مدیحہ اس طرح بات کو ٹال کر تم اس بات کو دبا نہیں سکتیں۔ تمہیں کچھ تو بتانا ہی ہوگا؟" زری کافی سیریس ہو چکی تھی۔

"کیا بتانا ہوگا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس کی نظریں سوالیہ تاثر کے علاوہ ہر تاثر سے عاری تھیں۔

"پاکستان نہ جانے کی وجہ..... آخر کیا وجہ ہے کہ تم پاکستان نہیں جانا چاہتیں؟" ایک کے بعد ایک سوال تھا۔

"کوئی وجہ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہر چیز کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور میں تم سے وہ وجہ جاننا چاہتی ہوں؟" زری اپنے فرینڈشپ کے بل بوتے پہ زور دیا تھا۔

"ہر چیز کے پیچھے آپ لوگوں کا وہم بھی تو ہو سکتا ہے؟" مدیحہ کا انداز ابھی بھی عجیب سا ناقابل سیریس تھا۔

"ایک بندے کو وہم ہو سکتا ہے، لیکن سب کو تو نہیں۔" زری اپنی بات پہ قائم تھی۔

"طرز فکر ایک ہی ہو تو سب کو وہم بھی ایک ہی ہوگا۔" مدیحہ کا جواب بھی درست تھا۔ لیکن اس کی بات کو ماننے والے بہت تھے۔ اکثر بھی اس کی بات سے اختلاف ہی کرتے نظر آتے تھے۔ سو زری کو بھی اس کی بات سے اختلاف ہی ہوا تھا۔

"سب کا طرز فکر ایک نہیں ہے، بلکہ تمہاری سوچ سب کے لیے ایک سی ہو گئی ہے، تم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھنے لگی ہو۔ تمہاری نظر میں شیلے اور زرین ملک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم دونوں کو ایک ہی ترازو میں تولتی ہو۔" زری نے اپنے مخصوص دوٹوک پن سے ہٹ کے بہت تیزی سے جواب دیا تھا۔ جس پہ مدیحہ لمحہ بھر کے لیے خاموش سی ہوئی تھی۔

"زری میں تمہاری عزت کرتی ہوں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا اور دوٹوک بھی۔

"صرف عزت؟" زری بھی برجستہ بولی تھی۔

"اور کیا چاہتی ہو؟ عزت سے بڑھ کر بھی کچھ ہے؟" مدیحہ سنجیدگی پہ آ گئی۔

"ہاں ہے، مجھے، مان، رشتہ، بھروسہ، یقین، سب کچھ..... مجھے سب کچھ چاہیے مدیحہ تاکہ تم میرے سامنے اپنا آپ بے نقاب بلکہ عیاں کر دو۔ میں تمہارے اور اپنے درمیان ایسے رشتے کا مان چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی بہن سمجھ کے سب کچھ کہہ سکو۔" مدیحہ چپ چاپ گہری نظروں سے زری کی اپنائیت دیکھ رہی تھی، اس کا خلوص جانچ رہی تھی کہ اچانک سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اس کا موبائل گنگنا اٹھا تھا۔ زری نے چونک کر مدیحہ کے موبائل کی سمت دیکھا تھا۔ جو اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا اور جس کی اسکرین پہ جگمگاتی تصویر نے اک پل میں اس کی پوری ہستی بدل ڈالی تھی، اس کی دھڑکنیں بھاگم بھاگ چل نکلی تھیں، اسے بھول گیا کہ اس کے سامنے کون بیٹھا ہے؟ وہ کیا بات کر رہی تھی؟ اور..... اور وہ کہاں موجود تھی۔

"کس کا فون ہے؟" مدیحہ نے زری سے استفسار کیا، لیکن زری کا دھیان کہیں اور تھا، وہ جواب نہ دے سکی۔ لہٰذا مدیحہ

اٹھ کر خود ہی کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"ہیلو بھائی؟" اس کے انداز میں محبت، اپنائیت اور احترام تھا، قدر تھی۔ زوری اسے دیکھتی رہ گئی، مدیحہ فون پہ بات کرتے ہوئے یکسر مختلف مدیحہ لگ رہی تھی، جس کے لفظ لفظ سے پیار کا رس چھلک رہا تھا، وہ کسی بات پہ انکاری تھی، جبکہ دوسری طرف سے یقیناً اصرار کیا جا رہا تھا، جس پہ وہ اگلے چند لمحوں کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔

♥

اس کی اتنی طویل اور گہری چپ اس کے اقرار کا اعلان کرنے لگی تھی۔ جتنی اس کی چپ گہری تھی اتنی ہی اس کی سوچ اور سوچ کی یہ گہرائی اسے بہت ہی نازک مقام تک لے گئی تھی، جہاں سے اس کے انکار کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں نکلتی تھی اور اب یہ بات طے تھی کہ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ مقابل اس کا بھائی تھا۔

بے شک لوگوں کی نظر میں اس کا اور دل آور شاہ کا رشتہ منہ بولے بہن، بھائی کا تھا، لیکن اس رشتے کی قدر وہ سگے رشتوں سے بھی زیادہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہر مقام پہ اس رشتے کے حوالے سے اک دوسرے کا مان بڑھایا تھا اور کبھی بھی اس رشتے کی اہمیت کو کم نہیں ہونے دیا تھا، ان دونوں کو اپنائیت اور چاہ دیکھ کر کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ ان کا رشتہ خون کا رشتہ نہیں بلکہ منہ بولا رشتہ ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں سگے بہن، بھائیوں سے بڑھ کے اک دوسرے کو چاہتے اور عزت و احترام کرتے تھے۔ مدیحہ کو بہن بنانے کے بعد دل آور شاہ اپنی زندگی میں بہن جیسی کمی کو ہمیشہ کے لیے بھول گیا تھا اور دوسری طرف مدیحہ بھی اس رشتے کے بعد اپنے آپ کو دو بھائیوں کی بہن سمجھنے لگی تھی۔ وہ زندگی میں نبیل حیات کی بات تو ٹال سکتی تھی، لیکن دل آور شاہ کی نہیں، کیونکہ مدیحہ کے معاملے میں وہ خود بھی ایسا ہی کرتا تھا، وہ بھی ہمیشہ مدیحہ کی بات کو ہی فوقیت دیتا تھا، اس کے مقابل چاہے کوئی بھی ہوتا وہ صرف اور صرف مدیحہ کی بات کو ہی اہم جانتا تھا، تو پھر اب، اب یہ کیسے ممکن تھا کہ مدیحہ اسے انکار کر کے فون بند کر دیتی؟

موبائل فون کی دوسری طرف وہ بالکل خاموشی سے اس کے انکار اور اقرار کا منتظر تھا، جبکہ مدیحہ اپنے ضدی اور ہٹ دھرم خیالات کو آمادہ کرنے میں لگی ہوئی تھی، وہ اپنے ذہن میں پلنے والی ضد کو کچلنے کی کوشش کر رہی تھی جو کچھ اس نے سوچ رکھا تھا وہ سب مٹی کا ڈھیر ہوتا نظر آ رہا تھا، اس کے سرکش عزائم ادھورے رہ گئے تھے، صرف اور صرف دل آور شاہ کا مان رکھنے کی خاطر۔

اور اس لمحے اسے محسوس ہوا تھا کہ کسی رشتے کا مان رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان کو زہر کا گھونٹ بھی پینا پڑ جاتا ہے اور آج اس نے بھی یہ ذائقہ چکھ لیا تھا، اپنے اندر کی ضد اور جنون کو اپنے بھائی کی محبت کا لبادہ اوڑھاتے ہوئے فیصلے کا اختیار دل آور شاہ کو سونپ دیا تھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فون بند کر کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور قریب بیٹھی زوری دیکھتی رہ گئی تھی، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مدیحہ دل آور شاہ کی کتنی عزت کرتی ہے۔

♥

دانیال حسب توقع ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی بڑی حویلی کے مخصوص فیملی ہاسپٹل میں موجود تھا، جہاں سے وہ اپنے مخصوص ڈاکٹرز سے اکثر علاج معالجہ کرواتے تھے اور وہی ڈاکٹرز ان کے بطور فیملی ڈاکٹرز بھی کام کرتے تھے اور ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر ظفر بھی تھے جو عائشہ آفندی کے معالج تھے اور کافی عرصے سے وہی ان کا علاج کر رہے تھے اور اس وقت وہ انہیں ڈاکٹر ظفر کے پاس ہی لے کر آئے تھے۔

آذر کی گاڑی دیکھتے ہی دانیال لپک کے قریب آیا تھا۔

"کیا ہوا ہے امی کو؟ اتنی اچانک طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟" اس کے چہرے پر پریشانی سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں، آذر کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی وہ پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اتنی جلدی طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟ وہ تو علیزے انیکسی کی طرف گئی تو پتا چلا کہ عائشہ کی طبیعت خراب ہے اور گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے، اس لیے آذر اسے لے کر ہسپتال جا رہا ہے۔" آسیہ آفندی، دانیال کو بتاتے ہوئے گاڑی سے اتر آئی تھیں، جبکہ عائشہ آفندی کو آذر اور دانیال نے مل کر سہارا دیا تھا اور پارکنگ سے اندر ہسپتال تک لے کر آئے تھے۔ ڈاکٹر ظفر اس وقت آن ڈیوٹی تھے۔ انہوں نے عائشہ آفندی کی حالت کے پیش نظر فوری ٹریٹ منٹ شروع کر دی اور ساتھ ساتھ انہوں نے یہ

بھی انکشاف کر دیا تھا کہ اگر تھوڑی دیر اور وہ لوگ ان کو لے کر نہ آتے تو یقیناً عائشہ آفندی کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے، کیونکہ ان کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے جسم سے جیسے جان ختم ہو چکی تھی، ان کے ہاتھ پاؤں بے جان ہوتے لگ رہے تھے اور ان کی ایسی سنگین حالت کے بارے میں جان کر وہ تینوں خاموش ہو کے رہ گئے تھے۔

''تم کہاں تھے اس وقت؟'' آذر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دانیال سے استفسار کیا تھا۔

''ماموں کے ساتھ آفس میں تھا۔'' دانیال شکستہ سا سر جھکائے بیٹھا دل ہی دل میں ماں کے لیے دعا گو تھا۔

''اور باقی سب؟'' آذر کو نہ چاہتے ہوئے بھی تمام لڑکوں کی غیر موجودگی پہ غصہ آ رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ غصہ ضبط کرنے پہ مجبور تھا۔

''باقی سب مجھے بتا کر تو نہیں جاتے؟'' دانیال خفگی سے بولا۔

''لیکن زین تو تمہیں بتا کر جا سکتا ہے نا؟ وہ تو تم سے چھوٹا ہے نا، خبر رکھا کرو۔'' آذر نے اسے تنبیہ کی۔

''کیا جو دت اپنی خبر رکھنے دیتا ہے؟ یا پھر جہاں جاتا ہے بتا کر جاتا ہے آپ کو؟ چھوٹا تو وہ بھی ہے؟''

دانیال کے طنزیہ جواب آذر کو سلگا کر رکھ گئے تھے۔

''تم میری بات کا الٹا مطلب کیوں لے رہے ہو؟''

''کیونکہ آپ الٹی بات کر رہے ہیں، جو لوگ آپ کے سمجھانے سے باز نہیں آتے وہ میرے سمجھانے سے کیسے باز آ جائیں گے؟ ان کے نزدیک جو ویلیو آپ کی ہے وہ میری نہیں ہے، پھر بھی وہ بات نہیں مانتے، اس میں کس کا قصور ہے؟ میرا یا آپ کا؟'' دانیال سو فیصد درست کہہ رہا تھا، جس کا اندازہ آذر کو بھی ہو گیا تھا آج کی نسل بھلا کس کے قابو میں تھی؟ یہاں ماں، باپ کی بات سنی ان سنی کر دی جاتی تھی، وہ تو پھر بھائی کے عہدے پہ تھے اور بھائی ہونے کے ناتے وہ لوگ ان کی عزت کر لیتے تھے تو یہ بھی ان کا احسان تھا، آذر چپ ہو چکا تھا دانیال اٹھ کر آئی سی یو کی سمت آ گیا، جہاں عائشہ آفندی کا ٹریٹ منٹ جاری تھا۔

''بھائی امی کو کیا ہوا ہے؟'' دانیال کے عقب سے زین کی ہانپتی ہوئی آواز ابھری تھی، وہ شاید بہت عجلت میں یہاں تک آیا تھا، اس کے چہرے پہ بھی وہی پریشانی رقصاں تھی جو دانیال کے چہرے کو گھیرے ہوئے تھی۔ وہ زین کے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا تھا اور اگلے ایک گھنٹے میں ڈاکٹرز نے ان کی حالت خطرے سے باہر بتائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کو چوبیس گھنٹے کے لیے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ اور ان کی طبیعت کی خرابی کا سنتے ہی ان کے تینوں بھائی وقار آفندی، اسرار آفندی اور اظہار آفندی نور امی ہسپتال پہنچ چکے تھے۔

وقار آفندی نے عائشہ کی طبیعت معلوم کرنے کے بعد دانیال اور زین کو قریب بلا کر تسلی دلاسہ دیا تھا اور انہیں حوصلہ مضبوط رکھنے کا کہا تھا اور وقار آفندی کے یہ تسلیاں، دلاسے اور پیار محبت تو وہ بچپن سے لیتے آ رہے تھے، جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ اپنی بھائی اور بھانجوں کو اسی طرح پاس بلا کر، بٹھا کر، پیار اور تسلی سے سمجھاتے تھے اور ان کی اتنی محبت اور توجہ پہ وہ لوگ سچ مچ سمجھ بھی جاتے تھے، اس وقت بھی ان دونوں بھائیوں کو ان کی موجودگی سے بہت ڈھارس ملی تھی، حالانکہ باقی دونوں ماموں بھی بے حد اچھے تھے، لیکن بڑے ماموں کی تو بات ہی اور تھی جن کو وہ بھی باقی سب کی طرح ڈیڈ ہی کہتے تھے۔

♥

ورکشاپ کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے سارے میں اک طائرانہ سی نگاہ دوڑائی تھی۔ سارا ماحول اور سب کچھ وہی تھا جو کسی بھی ورکشاپ کا ہونا چاہیے تھا، وہی پیٹرول اور ڈیزل کی بدبو، وہی ٹوٹی پھوٹی سی مرمت کے انتظار میں کھڑی گاڑیاں، وہی ٹائر، ٹیوب اور پنکچر لگانے کا سامان اور وہی گاڑیوں کی سروس کے لیے ایک کونے میں مخصوص جگہ وہاں سب کچھ فٹ اور پرفیکٹ تھا۔ سوائے عدیل نیازی کے، جو ابھی بھی ایک نظر ورکشاپ کو ایک اور نظر اپنی فائل کو دیکھ رہا تھا اور ایک نظر دیکھنے میں ہی اس کا خون جل کر راکھ ہونے لگا تھا، تبھی اس نے باؤ امتیاز کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اپنی فائل لوہے کے کیل پر زوں سے اٹی شیلف پہ ڈال دی تھی اور اس برآمدے نما کھلے سے کمرے میں بیٹھ گیا جہاں باؤ امتیاز کے چھوٹے (ملازم) نے کرسی ڈال کر دی تھی۔

''یہ چھوٹا ہے، اس ورکشاپ کا سب سے اہم اور کارآمد پرزہ۔'' باؤ امتیاز نے چھوٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر اس کا تعارف کروایا تھا۔

"اس کے بغیر یہ ورکشاپ بے رنگ ہے، یہاں اگر رونق ہے تو اسی سے۔" اس نے ان کے لفظ "بے رنگ" اور "رونق" پہ حیرت سے ایک بار پھر ورکشاپ کے احاطے میں نظر دوڑائی کہ باؤ امتیاز نے کس چیز کو رنگ اور رونق کا نام دیا ہے؟ وہاں ایسی کون سی چیز تھی جس پہ اس وقت رنگ تھا اور وہ چھوٹے کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی، اسے تو چاروں اطراف ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں اور پرانے ٹائروں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

"باؤ عدیل کسی کے دم سے جو رونق اور رنگ ہوتے ہیں نا وہ انسان کے دل میں ہوتے ہیں، ماحول میں نہیں، تمہارے دل میں رونق ہوگی تو تمہیں یہ کاٹھ کباڑ سے اٹا ورکشاپ بھی جنت سے کم نہیں لگے گا۔" عدیل کے ذہن میں اٹھتی تمسخرانہ سی حیرت باؤ امتیاز نے اک پل میں نوٹ کی اور اس کا جواب بھی دے مارا تھا، جس پہ عدیل مزید حیرت سے دوچار ہوا تھا اور شرمندہ بھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ نے چھوٹے کا تعارف کروایا بھی تو کیسا؟ آپ اسے ایک اہم اور کارآمد پرزے سے تشبیہ دے رہے ہیں۔" عدیل کو اپنی بے ربط اور کھوئی کھوئی سی کیفیت سے نکل کر اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لانے پڑے تھے، جب یہاں آئی تھا تو یہاں کے ماحول کو قریب سے جاننا اور سمجھنا بھی ضروری تھا۔ تبھی اپنے انداز و اطوار کو سنبھالا دیا تھا۔

"پرزہ اس لیے کہا ہے کہ آج کل ہم ایک مشینی زندگی جی رہے ہیں، ہمارا انسانوں کے بغیر تو گزارا ہو جاتا ہے، لیکن مشینوں اور ان کے پرزوں کے بغیر نہیں ہوتا اور یہ چھوٹا ماشاء اللہ ایک ایسا پرزہ ہے جو کسی بھی وقت کہیں بھی فٹ ہو جاتا ہے، تم اگر گاڑی کے نیچے لیٹ کر اسے ٹھیک نہیں کر سکتے تو یہی پرزہ ہے جو گاڑی کے نیچے گھس کر تمہاری مشکل حل کر دے گا، بغیر گاڑی کو جیک لگائے بھی یہ گاڑی کے نیچے جا سکتا ہے۔" انہوں نے فخریہ انداز میں چھوٹے کی خوبیاں بیان کی تھیں اور عدیل بے ساختہ اس سے متاثر ہونے والے انداز میں مسکرایا تھا۔

"کیا اس کے علاوہ کوئی اور پرزے بھی ہیں یا نہیں؟" اس نے جان بوجھ کر پرزے پہ زور دیا تھا اور باؤ امتیاز اس کی شرارت پہ مسکرا دیے تھے۔

"ارے کیوں نہیں ہیں، پرزے ہوں گے تو ورکشاپ چلے گا نا؟ اوئے جیدی، سلو ادھر آؤ اپنے انچارج سے ملو، کل ہی دریافت ہوا ہے۔" انہوں نے ایک بلند اور تیز آواز سے کچھ دور گاڑی ٹھیک کرتے دو لڑکوں کو قریب بلایا تھا۔

"جی استاد جی آئے۔" وہ فوراً ہاتھوں میں پکڑے اوزار ایک طرف ڈالتے ہوئے ان کا حکم بجا لائے تھے اور ہاتھوں اور کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے قریب آ گئے تھے۔

"السلام علیکم۔" انہوں نے سنجیدہ چہرے کو کافی احترام سے سلام کیا تھا۔

"والسلام۔" عدیل نے اٹھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

"یہ جیدی ہے اور یہ سلو ہے، سلو کو تم اگر پورے نام سے پکارنا چاہو تو سلمان خان بھی کہہ سکتے ہو، کیونکہ سلو کی دادی کو بہت شوق ہے کہ لوگ اسے سلمان خان کہہ کے پکاریں، دراصل اس کی دادی اپنی جوانی سے ہی سلمان خان کی بہت بڑی فین ہیں، یوں سمجھ لو دونوں "ہانی" (ہم عمر) ہی ہوں گے، یہ تو اس کی دادی نے شادی کر لی اور بوڑھی نظر آنے لگی، ورنہ وہ بھی سلمان خان کی طرح بڑھاپے میں بھی جوان رہتیں، آخر بیچلر لائف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" باؤ امتیاز کی دلچسپ وضاحت اور سلو کے تعارف پہ باقی سب کی طرح وہ بھی ہنس دیا تھا۔ وہاں موجود جیدی، سلو اور چھوٹا بے تحاشہ ہنس رہے تھے اور عدیل سب کے بے فکرے چہرے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ بے شک وہ سب بھی کسی نہ کسی مجبوری اور ضرورت کے تحت ہی یہاں کام کر رہے تھے، لیکن پھر بھی چہروں سے آزاد اور بے فکر لگ رہے تھے، شاید اس لیے کہ ان کے کندھوں پہ ویسے بوجھ نہیں تھے، جیسے عدیل نیازی کے کندھوں پہ تھے، جن کی وجہ سے اس کے کندھے ہی نہیں بلکہ سر بھی ہمہ وقت جھکا رہتا تھا، وہ کھل کے ہنس نہیں سکتا تھا، وہ کھل کے بول نہیں سکتا تھا، کیونکہ اس کے احساسات آزاد نہیں تھے، وہ سوچ کی مضبوط مٹھی میں جکڑے تھے، اس کے اعصاب پہ اس کے حالات کا پہرہ تھا جن سے ہٹ کے وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا، اپنی کیفیت کا اظہار بھی نہیں۔

♥

"جودت!" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پرفیوم اسپرے کر رہا تھا، جب کومل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، جودت اس

کی آواز پہ فوراً اس کی سمت پلٹا۔

''جی آپا.....؟''

''کیا فری ہو اس وقت؟'' کومل نے اس کی تیاری دیکھتے ہوئے فوراً ہی بھانپ لیا کہ وہ کہیں جانے کے چکر میں ہے۔

''آپ کے لیے فراغت نکالتے کون سا دیر لگتی ہے، بس حکم کرو آپ۔'' وہ پرفیوم کی شیشی پہ کیپ چڑھا کر واپس ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے انتہائی سعادت مندی سے بولا۔ ''وہ انوشہ کو ہسپتال چھوڑنا تھا۔''

''ہیں؟ یہ انوشہ نے ہسپتال کب سے جوائن کر لیا؟'' وہ کافی غیر سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''جودت!'' کومل نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

''جی جان جودت؟'' وہ اک ادا سے بولا اور کومل خفگی سے گھورنے لگی۔

''حالانکہ میں جانتا ہوں آپ میری نہیں کسی اور کی جان بننا چاہتی ہیں۔ اپنی وے، ہماری جان کوئی اور بن جائے گی۔'' وہ ذو معنی لہجے میں کہتا عین کومل کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور اس کی بات پہ کومل کی نظر جھک گئی، مبادا کچھ عیاں نہ ہو جائے۔

''فکر نہ کریں میں آپ کے راز افشا نہیں کروں گا، ویسے جہاں آپ نے ہاتھ مارا ہے نا وہاں آپ کو کچھ بھی نہیں ملنے والا۔ جہاں لوگوں کے دل دھک دھک کرتے ہیں وہاں ان کا دل کام، کام اور صرف کام ہی کرتا رہتا ہے۔'' جودت نے کومل کو چھیڑتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی اشارے کر ڈالے تھے، وہ بڑے دنوں بعد نظر آئی تھی، اسی لیے اسے زچ کرنے پہ تلا ہوا تھا، بلکہ وہ ایسا اکثر ہی کرتا تھا، اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔

''فضول مت بولا کرو، چلو نیچے انوشہ انتظار کر رہی ہے۔'' کومل اس کی باتوں کو نظر انداز کر گئی۔

''آپ کی محبت کا ذکر اگر فضول ہے تو ٹھیک ہے، نہیں کرتے۔'' وہ الٹی سیدھی ہانکتا کومل کے پیچھے ہی بیڈ روم سے نکل آیا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' سیڑھیاں اُترتے ہوئے احمد نے پوچھا۔

''کومل آپا جہاں لے جائیں۔'' وہ کندھے اچکا کر شرارت سے بولا اور کومل نے آگے چلتے ہوئے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اسے گھورا اور اتنے میں وہ بُری طرح کسی سے ٹکرا گئی تھی۔ آذر اچانک ہی ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے باہر آیا تھا اور اندر داخل ہوتی کومل کو نہ دیکھ سکا۔ ٹکراؤ خاصا شدید تھا۔ جودت اپنی بوکھلاہٹ اور ہنسی چھپانے کے لیے رُخ موڑ گیا تھا، جبکہ چکراتے دماغ کو سنبھالتی کومل آذر کو دیکھ کر مزید چکرا گئی تھی۔ احمد کے سامنے ایسا تصادم گھبراہٹ اور خفت کا باعث تھا اور خفت تو اسے آذر اور جودت سے بھی ہو رہی تھی۔

''آر یو آل رائٹ؟'' آذر نے ٹھہر کر اس سے تصدیق چاہی، کیونکہ کومل اپنی پیشانی سہلا رہی تھی اور دوسرا ہاتھ اپنی ناک پہ رکھا ہوا تھا، پیشانی سے بھی زیادہ چوٹ اس کی ناک پہ لگی تھی۔

''جج..... جی میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا اور اتنی سخت چوٹ پہ آنکھوں میں آ جانے والے پانی کو جلدی سے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر پونچھ دیا تھا۔

''ایم سوری، میں دیکھ نہیں پایا۔'' آذر نے معذرت کی، حالانکہ غلطی کومل کی تھی جو آگے بڑھتے ہوئے پیچھے کی طرف جودت کو دیکھ رہی تھی۔

''اٹس اوکے۔'' کومل بمشکل کہہ پائی، اسے اس وقت تین لوگوں کی نظروں کا مرکز بنتے ہوئے کوفت اور بیزاری ہونے لگی تھی۔ اس لیے وہ مزید وہاں رُکے بغیر اندر چلی گئی تھی اور آذر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا لیکن کچھ خیال آ جانے پہ اگلے ہی پل ٹھہر بھی گیا تھا۔

''کیا پوچھ سکتا ہوں آپ جناب کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے احمد اور جودت کو بیک وقت مخاطب کیا۔

''میں تو اس وقت جم جا رہا ہوں، البتہ جودت کا کیا ارادہ ہے؟ کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' احمد نے کندھے اچکائے۔

''جی آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' آذر کا لہجہ طنزیہ ہو چکا تھا۔

''وہ..... میں انوشہ کو ہسپتال ڈراپ کرنے جا رہا ہوں، وہ پھوپھو سے ملنا چاہتی ہے۔'' جودت نے شرافت سے جواب دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی، پھوپھو گھر آ چکی ہیں۔'' آذر کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گیا اور احمد کوریڈور کی سمت مڑ گیا، جبکہ

جودت وہیں سیڑھیوں کے پاس کھڑا رہ گیا تھا، لیکن پھر کچھ یاد آنے پہ قدم ڈرائنگ روم کی سمت بڑھا دیئے لیکن جو کچھ وہ دل میں ٹھان کے اندر داخل ہوا تھا وہ سب اسے فوری ہی ملتوی کرنا پڑ گیا تھا، کیونکہ وہاں ایک آدھ نہیں پورا ٹولا موجود تھا، حرمت، مدحت، کومل، جویریہ اور انوشہ۔ انوشہ کو دیکھ کر اسے آذر کی بات یاد آ گئی۔

"پھوپھو گھر آ چکی ہیں شاید، دانیال انہیں سیدھا ائیکسی میں ہی لے گیا ہے۔" جودت کی اطلاع پہ وہاں یکدم ہلچل مچ گئی تھی اور سب سے پہلے صوفے سے چھلانگ کر اٹھنے والی انوشہ تھی۔ جلدی اور عجلت میں وہ اپنی چپل کے بجائے جویریہ کی چپل پاؤں میں پھنسائی وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ اپنی ماں کی آمد کی خبر سنتے ہی وہ سب کچھ بھول بھال گئی تھی اور جودت وہیں کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

♥

وہ پچھلے پانچ دن سے مسلسل تھکن اور رت جگے کا شکار تھا، اس کے ذہن پہ کوئی ٹینشن سوار تھی اور وہ اس ٹینشن کا اب کوئی حتمی حل نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لیے جو فیصلے اور جو عزم وہ کر چکا تھا ان پہ ایک بار پھر غور کر رہا تھا اور اسی غور و فکر نے اس کی آنکھوں سے نیند کا تعلق ختم کر رکھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اسے پُرسکون نیند اسی وقت آئے گی جب وہ کوئی حتمی فیصلہ کر لے گا اور آج کی رات فیصلے کی رات تھی اور اس نے اپنے اک عمر کے ارادوں پہ آخری فیصلے کی مہر لگا دی تھی۔

جس کے بعد وہ حیثیتاً تھوڑی دیر کے لیے ریلیکس ہو گیا تھا، کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا، ایک مضبوط فیصلہ۔ وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے رائٹنگ ٹیبل سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے تمام پردے ہٹا دیئے تھے، صبح کا سورج نمودار ہونے کے لیے انگڑائیاں لے رہا تھا اور تمام پرندے اک نئی صبح، اک نئے تحفے پہ اللہ کی حمد و ثنا کرتے اس کی ذات کا شکر ادا کر رہے تھے، ڈھیروں چھ گھنٹوں کے وقفے کے بعد پھر سے جاگ اٹھی تھی، نئی اُمیدیں، نئے عزم و تمنائیں لے کر صبح کی نرماہٹیں ہر چہرے سے عیاں تھیں، اس کی نظر کوارٹرز کی سمت اٹھی۔

گل اپنے کوارٹر سے نکلتے ہوئے اپنا دوپٹہ درست کرتی گھر کی اندرونی سمت میں آ رہی تھی، جہاں سے اس کے دن بھر کے کاموں کا آغاز ہوتا تھا اور اس آغاز کے لیے وہ پہلا قدم کچن میں رکھتی تھی، کیونکہ وہ صبح صبح جاگنگ وغیرہ کا عادی تھا۔ اس لیے جاگنگ اور ایکسرسائز کے بعد اسے جوس کی فوری اور شدید طلب ہوتی تھی۔ لہٰذا گل پہلا کام جوس بنانے کا ہی کرتی تھی، لیکن پچھلے چار، پانچ روز سے نہ تو وہ جاگنگ پہ گیا تھا اور نہ ہی ایکسرسائز کی تھی، اسی لیے گل کو اس سے یہ پوچھنا پڑتا تھا۔

"صاحب آپ کے لیے چائے بناؤں یا جوس؟" دروازے پہ دستک دے کر گل آج بھی یہی سوال لے کر آئی تھی۔

"چائے۔" وہ آہستگی سے کہتا کھڑکی سے ہٹ گیا تھا۔

"سنو، گلاب خان کہاں ہے؟" اس نے باہر نکلتی گل سے پوچھا۔

"صاحب وہ اپنی ڈیوٹی پہ ہے۔" گلاب خان چوکیداری پہ مامور تھا۔

"ہوں ٹھیک ہے، اسے کہو اخبار دے جائے۔"

"جی ٹھیک ہے، کہہ دیتی ہوں۔" وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر دروازہ بند کرنے لگی۔

"سنو۔"

"جی صاحب۔"

"باقی کام تم بعد میں کرنا، پہلے گلاب خان سے کہو بل ڈوگ کو اس کی خوراک دے، میرا خیال ہے اس نے ابھی اسے دودھ نہیں پلایا؟" اس نے پلٹ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا اور اک نظر بل ڈوگ کو دیکھا، جس کی بے چینی، بھوک کا اعلان کر رہی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔" گل کہہ کر چلی گئی اور وہ پلٹ کر واش روم میں آ گیا۔

آج کورٹ میں اس کے ایک کیس کی آخری سماعت تھی، کیس اہم تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ شاور لے کر وہ کافی حد تک فریش ہو چکا تھا۔ وہ تیار ہو رہا تھا جب اس کا سیل بجا۔

"السلام علیکم۔" کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا۔ دوسری طرف لاء چیمبر سے اس کے منشی قادر کا فون تھا۔ وہ اس کے آنے نہ آنے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"آ رہا ہوں میں، تم کیس کی فائلز تیار رکھو۔" اس نے مختصر کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

"صاحب چائے اور اخبار۔" گل نظر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئی یہ اس کی شرم و حیا کا سب سے بڑا ثبوت تھا، وہ بھی ایسی نیک اور شریف، ایک ملازمہ ہونے کے باوجود دل آور شاہ اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اس چیز پہ گلاب خان کو بھی اعتبار تھا جبھی تو اپنی جوان جہان، خوبصورت بیوی کو گھر کے اندر کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا مالک سخت تیکھا اور غصیلا تو ہے، مگر نظر باز نہیں۔

"رکھ جاؤ، اور آج ناشتہ مت بنانا، مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے۔" وہ چائے کی ٹرے میز پہ رکھنے کا اشارہ کر کے خود اپنے شوز نکال کر پہننے لگا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ آہستگی سے کہہ کر چلی گئی اور شوز پہننے کے بعد چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اخبار بھی سامنے کھول چکا تھا۔ وہی روزمرہ کی سیاست، کرائم اور شوبز کی سنسنی خیز خبریں تھیں جو ہر روز تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اخبار کی زینت بنا دی جاتی تھیں اور اخبار پڑھنے کے شوقین لفظوں اور جملوں کے اس ہیر پھیر سے ہی خوش ہو کر چٹخارے لیتے رہتے تھے اور اگلے روز ردی اخبار ردی میں جا کر سموسے، پکوڑے، برگر اور نان وغیرہ لپیٹنے کے کام آ جاتا تھا، گویا اخبار کا استعمال ہی کام تھا، مزا بھی لے لیا اور کام بھی چلا لیا۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا، جب بتول شاہ کا فون آ گیا، جن دنوں وہ لاہور میں ہوتا تھا وہ روزانہ صبح کے وقت اسے کال کرتی تھیں، دل آور شاہ کے لیے ان کی کال بھی روٹین کا حصہ تھی جو کبھی مس نہیں ہوتی تھی۔

"جی میں کورٹ کے لیے نکل رہا ہوں، دعا کیجیے گا۔"

"ان شاء اللہ فتح پاؤ گے، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" انہوں نے دل سے دعا دی۔ وہ ان کا فون سنتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اور گلاب خان نے گاڑی سٹارٹ ہوتے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔

"آپ گھر پہ ہیں یا کالج میں؟" اس نے بتول شاہ سے استفسار کیا تھا۔

"نہیں ابھی تو ناشتہ کرنے لگی ہوں اور تمہیں پتا ہے کہ میں کالج تھوڑا لیٹ جاتی ہوں۔" بتول شاہ نے اسے یاد دلایا۔

"مگر جب میں اسلام آباد میں ہوتا ہوں تب تو آپ کافی جلدی چلی جاتی ہیں؟" اس کی حیرت اور اعتراض پہ بتول شاہ بے ساختہ مسکرائیں۔

"پاگل میں جلدی نہیں جاتی، بلکہ تم لیٹ اٹھتے ہو اور جب تم اٹھتے ہو اس وقت میرے جانے کا ٹائم ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے تمہیں لگتا ہے کہ میں جلدی جا رہی ہوں۔" ان کے جواب پہ وہ ٹھٹک سا گیا تھا اور ان کی وضاحت سمجھ میں آتے ہی مسکرا دیا، وہ غلطی پہ تھا۔

"سوری۔"

"سوری کس لیے؟ آئندہ میں اس چیز کا خیال رکھوں گی، جب تم یہاں ہو گے تو اور زیادہ لیٹ جایا کروں گی، تاکہ میرے بیٹے کو شکوہ نہ ہو۔" وہ ان کی اتنی چاہ، اتنی ممتا پہ یکدم چپ ہو گیا تھا۔

رشتوں کے نام پہ ان کے پاس اور تھا ہی کون، سوائے دل آور شاہ کے؟ اور اس بھری دنیا میں دل آور شاہ کا بھی اور کوئی اپنا نہیں تھا سوائے ان کے۔ ان دونوں کے اپنے اور سگے رشتے بس اک دوسرے پہ ہی ختم ہوتے تھے، کوئی اپنا، کوئی تیسرا نہیں تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تیسرا تھا تو سہی، مگر کوئی اسے نگل گیا تھا۔ وہ کوئی "کون" تھا؟ یہ سوچ کر ہی اس کے ذہن و دل جلتے تندور میں جا گرے تھے، اس کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پہ سخت ہو گئی تھی، یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ لب بھینچ کر اس طرح دانت پہ دانت جما لیے تھے کہ جبڑا ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو چکا تھا، غصے کے باعث آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے، یوں جیسے خون آنکھوں میں جم گیا ہو۔ بات کرتے کرتے اچانک اس کی خاموشی اور خاموشی کے بعد اس کی موجودہ کیفیت بتول شاہ نے آنکھوں سے اوجھل رہ کر بھی جان لی تھی۔

وہ کسی اہم کیس کے لیے جا رہا تھا، اس لیے وہ اسے ہوا دے کر مزید شعلہ نہیں بنانا چاہتی تھیں، جبھی زبان پہ آیا ذکر بھی واپس پلٹ دیا تھا اور ساتھ اسے ریلیکس کرنے کے لیے کسی اور کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس کا ذکر ماں کے بعد آتا تھا، یعنی ماں اور پھر بہن، پہلے بتول شاہ، پھر مدیحہ حیات۔

"مدیحہ سے بات ہوئی تمہاری؟ کیسی ہے وہ؟" اس ٹھنڈے میٹھے رشتے کے ذکر سے بہلانے اور دھیان بٹانے کی کوشش کی

گئی تھی۔ لیکن چوٹ گہری اور دردشدید ہو تو بہلنا آسان نہیں ہوتا۔ دل آور شاہ کا زخم تازہ نہیں تھا۔ مگر جب جب گھرنٹ اُترتا تھا باسی زخم، تازہ زخم کو بھی مات دے جاتا تھا۔ تبھی تو ناقابل برداشت ہو جاتی تھیں اور ایسے عالم میں وہ اکثر پاگل ہو جاتا تھا اور اپنے اس پاگل پن کے ہاتھوں شاید وہ دوسروں کو بھی پاگل کر ڈالتا، اپنے جنون کی بھینٹ چڑھا دیتا، اگر اسے سنبھالنے والی، بتول شاہ نہ ہوتیں وہ اس کی سب حالتوں اور سب کیفیتوں سے واقف تھیں، اسی لیے چاہے مشکل سے ہی سہی، مگر اسے ہینڈل ضرور کر لیتی تھیں۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں شاہ؟" موڈ لاڈ پیار کا ہوتا تو وہ اسے شاہ پکارتی تھیں۔

"ہوں؟ کیا کہا آپ نے؟" وہ اپنے جنون کو ٹھہراتے ہوئے بولا۔

"مدیحہ کا پوچھ رہی ہوں۔" انہوں نے اپنی بات پہ زور دیا۔

"اوہ ہاں پاکستان آ رہے ہیں وہ لوگ۔" دھیان کی ملتانیں ان کی بات کی طرف موڑتے ہوئے وقت ہو رہی تھی اسے۔

"ہیں؟ کب؟ تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔" بتول شاہ کو سن کر خوشی ہوئی تھی، کیونکہ ایک نیل کی ہی تو فیملی تھی، جن کے ساتھ وہ خوش ہوتا تھا اور جن کے ذکر پہ اس کے چہرے پہ حقیقی خوشی دیکھنے کو ملتی تھی۔

"ان کا پروگرام بھی بن رہا تھا، بھی کینسل ہو رہا تھا، اس لیے نہیں بتایا۔ کب آ رہے ہیں؟ کنفرم تو نہیں ہے، لیکن نیل کی کوشش ہے کہ اس ماہ کے لاسٹ فرائیڈے تک آ جائے۔"

"ہوں۔۔۔ کون کون آ رہا ہے؟" بتول شاہ اپنے سوالات کا سلسلہ بڑھا رہی تھیں۔

"نیل، مدیحہ اور فائزہ آنٹی۔"

"اور بھائی صاحب؟" ان کا سوال دل آور شاہ کو بھی خاموش کرا گیا۔ اور اس کی خاموشی سے وہ مکمل جواب اخذ کر چکی تھیں۔

"کہاں ہوتے آج کل؟" ان ہی کے متعلق دوسرا سوال۔

"کینیڈا۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

"کیا انہیں پتا ہے کہ نیل لوگ پاکستان شفٹ کر رہے ہیں؟"

"آئی ڈونٹ نو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔

"چلو اللہ انہیں خیریت سے لے کر آئے۔" وہ صدق دل سے بولیں۔

"آمین۔" وہ جواباً آہستگی سے بولا۔

"ٹھیک ہے اماں، میں فون بند کرتا ہوں میں اس وقت جیسپر پہنچ چکا ہوں۔" اس نے گاڑی پارک کرتے ہوئے بتول شاہ سے اور امیہ کلثوم کہے اور فون بند کر کے ہینڈ فری ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا تھا۔

♥

فائزہ بیگم دروازے پہ دستک دے کر اندر چلی آئی تھیں، ان کی نظروں کا مرکز زری تھی۔

"زری بیٹی آئی ہے؟" انداز میں شوق اور پیار تھا اور لہجے میں بلا کی نرمی تھی، وہی نرمی جس سے مدیحہ کو چڑ اور کوفت ہوتی تھی، بلکہ اب تو غصہ بھی آ جاتا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی! آپ اٹھ کیوں گئیں؟ میں نے آپ کا پتا کیا تھا، آپ سو رہی تھیں۔" مقابل ہستی کے انداز و اطوار کی نرمیاں بھی کچھ کم نہیں تھیں، وہ بھی آخر زرین ملک تھی، جس کو اس کے گھر والے "موم کی گڑیا" اور "مٹی کا مادھو" بھی کہتے تھے۔ ہر ایک لیے اچھی، ہر ایک کے لیے پیاری، سب کے لیے اپنے دل میں نرمی اور چاہ کا جذبہ رکھتی تھی، کوئی کچھ بھی کہہ دیتا، بُرا نہیں مناتی تھی اور اگر مناتی بھی تو ظاہر نہیں کرتی تھی، ہمہ وقت سکون اور ٹھہراؤ کا لبادہ اوڑھے نہ جانے کیسے جی لیتی تھی؟ مدیحہ سوچتی تو وحشت سے بدک جاتی تھی کہ سب کچھ دل میں رکھ کے نہیں جیا جا سکتا۔ اور یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

کسی اور کے لیے نہیں صرف مدیحہ حیات کے لیے، جو اپنی باتیں، اپنے فیصلے، اپنے ارادے بے دھڑک کہہ دیتی تھی، جس نے چپ رہ کے اور بات دل میں رکھ کے جینا نہیں سیکھا تھا، جو ہر بات ڈنکے کی چوٹ پہ کہہ دیتی تھی، بات منہ پہ کہہ دینا اس کی عادت تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ سامنے والے کا کوئی ڈر رکھتی تھی، نہ لحاظ، دوسرے لفظوں میں اس چیز کو بے مروتی بھی کہا جا سکتا تھا اور اس بات کا تو وہ خود بھی اعتراف کرتی تھی کہ۔

"سوری میں مروت نہیں نبھا سکتی۔" اور یہ اعتراف کرتے ہوئے وہ خاصی لاپروا اور بے نیاز ہوتی تھی لیکن اس کے برعکس زرین ملک ایسا بھی نہیں کر سکتی تھی، وہ شفاف، خاموش اور سبک ندی کی مانند لڑکی مدیحہ جیسی ضدی، ہٹ دھرم اور جنگجو لڑکی کا ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔

دونوں تصویر کے دو رخ تھے اور دونوں کو اپنے علاوہ دوسرا رخ پسند نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود دونوں اک دوسرے سے بے حد قریب تھیں، مزاج کے تضادات کے باوجود دونوں کی فرینڈ شپ قائم و دائم تھی، لیکن ایک بات بڑی عجیب تھی، دونوں ہی اک دوسرے کے دل کے حال سے انجان اور ناواقف تھیں۔ البتہ یہ بات اور تھی کہ مدیحہ کے تو دل کا کوئی "حال" سرے سے تھا ہی نہیں وہ دل اور دل کے حال سے فی الحال دور تھی۔ اور جو حال زری کے دل کا تھا وہ اس نے مدیحہ سے دانستہ چھپا رکھا تھا۔ صرف اس لیے کہ اپنی عادت اور فطرت سے مجبور مدیحہ کبھی بھی اس کا راز، راز نہیں رکھ سکے گی، بلکہ کسی نیوز کی طرح خبر نشر کرتی پھرے گی اور زری فی الحال اپنے آپ کو نشر کروانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی، جبھی مدیحہ کی نگاہ سے بچ کے رہتی تھی، اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ میرے دل کی دھڑکنیں صرف دھڑکنیں نہیں رہیں، بلکہ کسی کے نام کا راگ الاپنے لگی ہیں، جہاں اس کے نام کی ذور چھوٹتی ہے وہیں پہ ایک دھڑکن بھی چھوٹ جاتی ہے۔

"مجھے نبیل نے بتایا ہے کہ زری آئی ہے، خود تو کہیں باہر چلا گیا ہے، میں نے سوچا ناشتہ بعد میں بناتی ہوں پہلے تم سے مل آؤں، تم بتاؤ کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ تم آؤ گی، عبداللہ کے ساتھ، لیکن وہ کئی بار آیا، کئی بار گیا، مگر اکیلا۔" انہوں نے افسوس اور محبت سے شکوہ کیا۔

"بس میرے فائنل ایگزامز ہو رہے تھے اس لیے بزی تھی۔" زری ان کی محبت بھرے شکوے پہ مسکرائی، اور مسکرائی تو مدیحہ بھی تھی، مگر تمسخرانہ، جیسے کہہ رہی ہو۔

"واہ ری مروت۔" کسی کی یاد چاہے آئے، چاہے نہ آئے لیکن جب وہ ملے تو مروتاً کہہ دو "جناب میں آپ کو ہی یاد کر رہا تھا، بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔" سامنے والا بے ساختہ خوش ہو جائے گا۔ یعنی مروت نبھ گئی، ٹھیک ٹھاک طریقے سے یہی حال اس وقت بھی تھا زری اور فائزہ بیگم کے بیچ..... مدیحہ مسکراتی نہ تو اور کیا کرتی؟

"نگار کہاں ہے تم اسے بھی ساتھ لے آتیں۔"

"بھائی کی طبیعت تھوڑی خراب تھی، وہ ریسٹ کرنا چاہتی تھیں، اس لیے نہیں آئیں۔"

"کیوں خیریت، کیا ہوا اسے؟" وہ متفکر ہوئیں۔

"ہاں وہ سردی کی وجہ سے ان کی کمر میں درد ہو جاتا ہے، پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے لیکن وہ کوڈامول لے کر کچھ دیر لیٹ جائیں تو ٹھیک بھی جلدی ہو جاتی ہیں۔" زری نے وضاحت دی۔

"لیکن بیٹا تمہیں میرا کہنا تو برا لگے گا، مگر میں پھر بھی کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔" ان کی دبی دبی سرزنش پہ زری مسکرا کر سر اثبات میں ہلانے لگی۔

"بے شک آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن آنٹی مجھے یہاں بھائی نے خود بھیجا ہے، حالانکہ میں نے آنے سے انکار بھی کیا تھا، لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ میں اتنے دنوں سے مدیحہ سے اور آپ سے نہیں ملی، اس لیے میرا جانا ضروری ہے، کیونکہ چند ہی دنوں میں آپ یہ ملک چھوڑ کے پاکستان جا رہی ہیں، بعد میں پتا نہیں کب ملاقات ہو، اس لیے آج کے دن سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔" اس نے کہتے ہوئے گردن ترچھی کر کے مدیحہ کو دیکھا جو پاکستان کے ذکر پہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی اور اس کی اس حرکت پہ فائزہ بیگم نے بھی اک نظر اسے دیکھا تھا، پھر اس کا انکار اور رات والی حرکت یاد آ گئی تھی اور پھر ان سے مزید اس کے بیڈ روم میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا، وہ نہ جانے زری سے کیا کہہ کر فوراً ہی واپس آ گئی تھیں۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟" مدیحہ کو لب بھینچے خاموش بیٹھے دیکھ کر زری قریب آ گئی، جبکہ مدیحہ اک جھٹکے سے اٹھی اور اپنی وارڈ روب تک چلی گئی۔ وارڈ روب کا چوتھے نمبر والا پٹ کھول کے بلیک لیدر کا بیوٹی بکس نکال کر تین ہندسوں کا پاس ورڈ ڈائل کیا اور کلک کے ساتھ بیوٹی بکس کا لاک اوپن ہو گیا۔ اس نے اپنے کاج، یونیورسٹی کے ڈاکومنٹس، بینک کے کاغذات اور کریڈٹ کارڈز کے ساتھ ساتھ اپنا پاسپورٹ بھی اسی میں سنبھال رکھا تھا، کوئی بھی ایمرجنسی پڑنے کی صورت میں وہ اپنا یہ بیوٹی بکس اٹھا کر کبھی بھی

کہیں بھی جا سکتی تھی، باقی لوگوں کی طرح اپنے ضروری کاغذات اور اشیاء ڈھونڈنے کی نوبت نہیں اٹھانا پڑتی تھی۔ اس نے بیوی کیس کی اندرونی پاکٹ کی زپ کھول کر اپنا پاسپورٹ نکالا اور خود پہ بڑا ضبط کرتی ہوئی پلٹ کر زری تک آئی تھی۔

"یہ نبیل بھائی کو دے دینا۔" اس نے جیسے اپنے پرکاٹ کے زری کے ہاتھوں میں تھما دیئے تھے۔ زری اس کا پاسپورٹ دیکھ کر اندر سے خوش ہوئی کہ چلو ان لوگوں کا تو مسئلہ حل ہوا۔ لیکن مدیحہ کا انداز اور اس کے تاثرات دیکھ کر اسے بُرا بھی لگا تھا۔

"تم تو ایسے دے رہی ہو جیسے احسان عظیم کر رہی ہو؟"

"ہاں احسان عظیم ہی ہے، اگر یہ لوگ مجبور نہ کرتے تو میں یہ احسان بھی کبھی نہ کرتی۔" وہ تلخی اور سختی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔

"ان لوگوں نے تمہیں کب مجبور کیا؟ تم تو....." زری کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں میں دل آور بھائی کے کہنے پہ مجبور ہوئی ہوں، لیکن تم یہ بتاؤ ان کو یہ بات کہنے کے لیے کس نے کہا؟ کس نے مجبور کیا؟ صرف اور صرف میرے گھر والوں نے، ان کو کوئی الہام تو نہیں ہوا تھا نا؟ بس خوش قسمتی ہے ان کی کہ بیچ میں دل آور بھائی آ گئے۔ لیکن..... لیکن زری یہ مجھے کبھی سدھار نہیں سکتے۔ میں پاکستان تو چلی جاؤں گی، لیکن یہ لوگ پچھتائیں گے، مجھے وہاں لے جا کر بھی پچھتائیں گے۔ مدیحہ ہی رہے گی، چاہے پاکستان میں رہے، چاہے انگلستان میں۔" وہ اپنے غصے اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پھنکاری تھی اور زری حقیقتاً اس کے ارادوں سے خائف ہو گئی تھی۔

"مدیحہ پلیز یہ کیا پاگل پن ہے؟ کیوں بیوقوف بن رہی ہو؟" زری نے اسے باز رکھنا چاہا۔

"یہ تو وقت آنے پہ پتا چلے گا کہ کون پاگل ہے؟ میں یا پھر یہ لوگ۔" اس کے عزائم نیک نہیں تھے۔ زری چپ ہو کے رہ گئی، اسے بھلا کتنا سمجھاتی؟ اور اگر سمجھاتی بھی تو وہ کون سا سمجھنے والی تھی؟ تھوڑی دیر اور اس کے پاس بیٹھنے کے بعد زری جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"کس کے ساتھ جاؤ گی؟" مدیحہ کو پتا تھا کہ عبداللہ شہر میں نہیں ہے، اس لیے اسے پک کرنے نہیں آئے گا۔

"تمہارے ساتھ۔" زری، نبیل کے ساتھ جانے کا سوچ کر جھجک گئی تھی، اسی لیے فوراً اپنی ذمہ داری مدیحہ پہ ڈال دی۔

"یعنی میرا سر اور میرے ہی جوتے، مجھ سے ملنے آئی ہو اور اب میں ہی چھوڑ کر آؤں؟" مدیحہ مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور زری مسکراتے ہوئے اس کے بیڈ روم سے باہر آ گئی۔ دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں اترتی نیچے آئیں، سامنے ہی نبیل اور فائزہ بیگم دونوں مل کر کوئی چیز خالی کے کارٹن میں بند کر کے اوپر سے پیکنگ ٹیپ لگا کر اسے مزید مضبوط پیکنگ کی شکل دے رہے تھے، پچھلے دو روز سے وہ اپنی ضروری چیزیں اور سامان سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔

"ارے تم جا بھی رہی ہو؟ اتنی جلدی، بیٹھو تو سہی۔" فائزہ بیگم سب چھوڑ چھاڑ کر قریب آ گئیں۔

"آئی تھین، چار گھنٹے تو گزار لے، اب اور کتنا بیٹھوں گی۔"

"لیکن بیٹا۔" وہ اسے زیادہ اصرار اور مجبور کرنے سے رُک گئیں، ان کی نظر زری کے ہاتھوں میں پکڑے پاسپورٹ پہ ٹھہر گئی تھی اور ان کی آنکھوں میں بے یقینی پھیل گئی، یہ پاسپورٹ یقیناً مدیحہ کا تھا۔ میرون رنگ کا پاسپورٹ برٹش ہونے کا ثبوت تھا اور اس ثبوت کو وہ پچھلے کئی دنوں سے مانگ رہے تھے لیکن اس نے نہیں دیا تھا اور آج؟ حیرت کا مقام تھا۔ وہ مان گئی تھی؟

"یہ مدیحہ کا پاسپورٹ ہے، آپ اس کی ٹکٹ کنفرم کروا سکتے ہیں۔" مدیحہ کے کہنے پہ زری نے پاسپورٹ نبیل کی سمت ہی بڑھایا تھا اور نبیل نے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ لیتے ہوئے بے ساختہ مدیحہ کی طرف دیکھا، وہ نظر پھیر گئی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ زری کے ہاتھ سے اس کا پاسپورٹ لیتے ہوئے نبیل کو کتنی سکی اور ہتک کا احساس ہوا تھا۔

گویا اسے اپنی بہن پہ ہی اختیار نہیں تھا، وہ دوسروں سے سفارشیں کرواتا پھر رہا تھا اور وہ سب کی بات ماننے کو تیار تھی سوائے ان کی۔ فائزہ بیگم اور نبیل چپ کے چپ رہ گئے، نبیل کو پتا تھا کہ اس نے کس کے کہنے پہ پاسپورٹ دیا ہے۔

"چلو زری مجھے دیر ہو رہی ہے، میں نے اپنے فرینڈز سے بھی ملنے جانا ہے۔" مدیحہ اسے متوجہ کرتی خود بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گئی، مجبور آ زری کو ان دونوں ماں، بیٹا سے نظر چرا کر اجازت لینا پڑی اور اس کے پیچھے باہر نکل آئی تھی، مدیحہ اپنی جینز سے گاڑی کی چابی نکال کر لاک کھول رہی تھی، زری خاموشی سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

♥

وہ فون سے واپس پلٹ کے پہلے شاور لینے گئی اور پھر کچن میں۔ کچھ دیر میں وہ شاور لے کر آئی، اتنی دیر میں اس کی ملازمہ رجو اس کا کھانا نکال کر گرم کرتی اور تازہ روٹی پکا کر دیتی تھی، البتہ یہ اور بات تھی کہ روٹی وہ بہت کم کھاتی تھی، اس کی دلچسپی چائنیز اور رائس وغیرہ میں ہوتی تھی، دیسی ٹیبل بھی شوق سے کھاتی تھی اور اس کی پسند کے کھانے پکانے کے لیے اس کی ملازمہ رجو مخصوص تھی، صبح سے لے کر شام تک علیزے کا کوئی بھی کام ہوتا وہ رجو نے ہی نپٹانا ہوتا تھا، صبح سویرے فریش جوس سے رات سونے سے پہلے دودھ کا گلاس دینے کی ذمہ داری بھی رجو کی ہی تھی، علیزے اپنی ملازمہ کو بھی بنا سنوار کے رکھتی تھی، اس کپڑے، جوتے اور دیگر اشیاء اسے خود منگوا کر دیتی تھی، وہ اپنی ملازمہ کو گندے حلیے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا باقی ملازمین میں سب سے زیادہ فریش اور تازہ دم رہنے والی ملازمہ صرف رجو ہی تھی۔

بڑی حویلی میں مبارک خان کے بعد قابل ذکر اور اہم مقام رجو کا ہی تھا، شاید اس لیے کہ مبارک خان، وقار آفندی کا ذاتی ملازم تھا اور رجو، علیزے آفندی کی خاص ملازمہ کہلاتی تھی، دونوں باپ، بیٹی کے ٹھاٹھ ہی نرالے تھے، کافی شاہانہ طرز زندگی تھا، سب سے ہٹ کے۔ وہ شاور لے کر آئی تو لنچ تیار تھا، پانچ دس منٹ میں ہی وہ لنچ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈ روم میں سونے کے گئی۔ اسے سوئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نے زور دار دستک دے ڈالی، وہ ہڑبڑا کے اٹھی اور ننگے پاؤں لپک کر دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

"عون؟" اس نے اپنے اعصاب کنٹرول کرتے ہوئے آنکھیں پوری طرح سے کھول کر حیرت سے عون کو دیکھا، وہاں اس کے ساتھ ساتھ نیند کی وجہ سے آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے اس وقت عون کی موجودگی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

"علیزے آپی وہ ڈیڈ آپ کو بلا رہے ہیں، باہر لان میں بیٹھے ہیں۔" عون نے پیغام دیا۔

"مجھے بلا رہے ہیں؟ اس وقت؟ خیریت؟" علیزے نے "اس وقت" پہ ایسے زور دیا جیسے اس وقت آدھی رات کا وقت ہو۔

"کیوں اس وقت نہیں بلا سکتے؟" عون کو حیرت ہوئی اور اس کی حیرت پہ علیزے تھوڑا سا ٹھٹک گئی، اس نے گردن موڑ کے اپنے بیڈ کی سامنے والی دیوار کے ساتھ نصب وال کلاک کو دیکھا جہاں اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ علیزے اپنا سر تھام کے رہ گئی۔ یعنی وہ اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ اسے دن رات یا پھر صبح شام کا فرق بھول گیا تھا اور دوسرا یہ کہ اس کے بیڈ روم کی دیواریں بھی ساؤنڈ پروف تھیں، باہر یا اندر کیا ہو رہا ہے کچھ پتا نہیں چلتا تھا، پردے برابر ہوتے تو دن میں بھی رات اُگ آتی تھی۔

"علیزے آپی ہوش میں تو ہیں آپ؟" عون نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"ہاں ٹھیک ہوں، تم چلو میں آتی ہوں۔" وہ اپنے ہاتھوں سے بال پیچھے ہٹاتی پلٹ کر واپس آ گئی، عون کندھے اچکا کر جا چکا تھا۔ وہ واش روم سے تولیے سے چہرہ پونچھتی ہوئی باہر نکلی۔

"ہاؤ۔" یکدم اس کے عقب سے ہاؤ کی آواز ابھری علیزے ڈر کے یکدم پیچھے ہٹی۔

"اف۔"

"ہاہاہا! آپ ڈر گئیں؟" وہ ہنس دیا بے تحاشہ اور علیزے تلملا کے رہ گئی۔

"عدید یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ڈاٹ نان سینس۔" وہ اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی، حالانکہ وہ بلاوجہ غصہ کرنے والی اور چلانے والی لڑکی نہیں تھی، لیکن اس وقت اسے حقیقتاً غصہ آیا ہوا تھا۔ پہلے عون کے دروازہ دھڑ دھڑانے کی حرکت اور اب یہ عدید وہ ایک ہی وقت میں دو بار دہل چکی تھی۔

"یہ بدتمیزی نہیں ہے، یہ تو کسی کو ڈرانے کا ایک انداز ہے علیزے آپی۔" اس نے جیسے اپنی "علیزے آپی" کی کم عقلی پہ افسوس کیا۔

"شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ، ایک تو بدتمیزی اور بیہودگی کرتے ہو اور پھر مسخرے بنتے ہو؟" علیزے نے عدید کو خاصا جھڑک دیا تھا۔

"علیزے یہ کون سا طریقہ ہے مذاق کرنے کا؟" آسیہ آفندی بیٹی کے تیور دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"مما آپ نہیں جانتیں یہ دونوں حد سے زیادہ بدتمیز ہو چکے ہیں، آس پاس کچھ بھی نہیں دیکھتے اور مذاق کرنے کھڑے جاتے ہیں۔" علیزے سچ مچ تپ گئی تھی۔

"عدی کیا کیا ہے تم نے؟" آسیہ آفندی، عدید کی سمت پلٹیں، علیزے کو اپنے دونوں بھائی بہت عزیز تھے، دونوں جڑواں

تھے، دونوں کی عمر چودہ سال تھی، کافی ذہین اور لائق تھے، لیکن دونوں ہی حد درجہ شرارتی تھے، اپنی شرارتوں سے وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی کو ستائے رکھتے تھے، بڑی حویلی میں بہت سالوں بعد ان کے دم سے رونق جاگی تھی، کبھی ان کی شرارتوں اور چھیڑ خانی کو انجوائے کرتے تھے، لیکن اگر کبھی وہ اوور ہو جاتے تو ہلکی پھلکی ڈانٹ بھی کھا لیتے تھے اور اکثر اوقات یہ ڈانٹ انہیں علیزے سے ہی کھانے کو ملتی تھی، کیونکہ سب سے زیادہ تنگ وہ اسی کو کرتے تھے، وہ درگزر بھی کرتی تھی، مگر کبھی کبھی تو پھر یہ بھی ضروری ہو جاتا تھا۔

"سوری بولو آپی کو۔" آسیہ آفندی نے خفگی سے کہا، عدید کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

"سوری۔" وہ کہہ کے فوراً کمرے سے باہر نکل گیا اور علیزے اس کی سوری پہ چونک کر سیدھی ہوئی، تب تک وہ جا چکا تھا۔

"ما۔" وہ خفگی سے تولیہ پٹخ کر جھنجلائی۔

"اٹس اوکے، ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ کہتے ہوئے واپس چلی گئیں، علیزے بال سنوار کر بُرے بُرے منہ بناتی آف موڈ کے ساتھ نیچے آ گئی۔ اس کا رُخ لان کی طرف تھا۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" گزرتے گزرتے حرمت نے پوچھ لیا۔

"باہر لان میں۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"پاپا نے بلایا ہے۔" وہ وضاحت دے کر آگے بڑھ آئی۔

ہمیشہ کی طرح وقار آفندی لان کے وسط میں چیئرز ڈالے آذر اور اسرار آفندی کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" اس نے قریب آ کر آہستگی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، آؤ بیٹھو بیٹا، کیسی ہو؟" وقار آفندی سے بھی زیادہ محبت اور گرمجوشی اسرار آفندی کے لہجے میں سمائی ہوئی تھی۔ علیزے مسکرانے کی محض کوشش کرتے ہوئے وقار آفندی کے بائیں طرف رکھی چوتھی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"عون نے ہسٹرب تو نہیں کیا تمہیں بلا کر؟" وقار آفندی اک نظر میں اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر چکے تھے، اس کا موڈ آف لگ رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وقار آفندی کا رواں رواں متفکر ہوا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اس کے پتے تتے مختصر سے جوابات پہ آذر نے بھی ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا، بظاہر تو وہ بالکل ٹھیک تھی، لیکن پھر بھی کچھ گڑبڑ ضرور تھی، موڈ خراب لگتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وقار آفندی مزید تشویش کا اظہار کرتے اچانک مبارک خان وہیں چلا آیا۔

"سلام صاحب! وہ مردان خانے میں آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"کون ملنے آیا ہے؟" آذر نے سوال کیا۔

"ایس ڈی کمپنی کے منیجر اور ایم ڈی صاحب ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" مبارک خان نے وقار آفندی کی سمت اشارہ کیا۔

"صدیقی صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں خیریت؟" وقار آفندی نے کہتے ہوئے آذر اور اسرار آفندی کو دیکھا، وہ دونوں باپ، بیٹا بھلا کیا کہہ سکتے تھے؟

"آپ دیکھتے ہیں، کس سلسلے میں ملنا چاہ رہے ہیں۔" اسرار آفندی کھڑے ہو گئے، جبکہ وقار آفندی، علیزے کو دیکھ رہے تھے، جس کو بلا کر اب وہ خود اُٹھ کر نہیں جانا چاہ رہے تھے۔

"آپ جائیے پاپا، میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہو سکتا ہے ان لوگوں کو آپ سے ضروری کام ہو؟" علیزے ان کی پریشانی بھانپ گئی۔

"آر یو شیور؟"

"یس پاپا۔"

"ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں، بیٹھو تم لوگ۔" وہ اٹھتے ہوئے علیزے کا گال پیار سے تھپک گئے تھے، جبکہ اسرار آفندی سر تھپکا تھا۔ ان کے جانے کے بعد لان میں وہ دونوں رہ گئے تھے، آذر کافی دلچسپ نظروں سے علیزے کو دیکھ رہا تھا، لیکن اس کی بجائے گردن ترچھی کر کے گیٹ دیکھنے میں مصروف تھی، جہاں سے ابھی ابھی زین اپنی بائیک لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ دھن میں چین اچھلا تھا اندرونی مین ڈور کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"ناراض ہو؟" آذر کے سوال میں بھی دلچسپی تھی۔

"کیوں؟" علیزے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم جانتی ہو۔"

"کیا؟"

"یہی کہ تم کیوں ناراض ہو۔"

"آپ کو لگتا ہے کہ میں ناراض ہوں۔"

"ہاں۔"

"جب آپ کو یہ پتا ہے کہ میں ناراض ہوں تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ آپ کی بات اور آپ کا رویہ غلط تھا اس..." علیزے کو وہ بات بھر سے یاد آئی تو خفگی نے گھیر لیا تھا۔

"ہاں تھوڑا بہت۔" وہ اعتراف کر رہا تھا۔

"تھوڑا بہت نہیں، بہت زیادہ کہیں۔ اس وقت عائشہ پھوپھو کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے جو میں کر رہی تھی... تھا۔ عائشہ پھوپھو کو اسی حال میں چھوڑ کر میں ایک بار حویلی کے اندر آئی، باری باری سبھی کے بیڈ روم چیک کیے، مگر کوئی بھی... دوبارہ پھر واپس گئی، انوشہ کو ان کے پاس بٹھایا اور ایک بار پھر ادھر آ گئی۔ مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا اور آپ تھے کہ..." علیزے... کہتے ٹھہر گئی۔

"میں اور کچھ نہیں کہہ رہا تھا، میرا صرف یہ مطلب تھا کہ اگر مبارک خان کو بلانا ہی ہے تو تم کسی اور کو بھی کہہ سکتی تھیں بڑی بزرگ کو یا پھر کسی ملازمہ کو۔" وہ صفائی دے رہا تھا، علیزے کی ناراضی وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے منانے کے جتن... رہے تھے۔

"آذر بھائی جب اچانک اتنی ایمرجنسی پڑ جائے تو انسان کچھ بھی نہیں سوچتا، بس جو ذہن میں آتا ہے وہ کرتا جاتا ہے... ایک بات اور..... جب آپ لوگوں نے ملازموں پہ اعتبار کرتے ہوئے ان کو حویلی میں رکھ ہی لیا ہے تو پھر ان پہ پورا بھروسا... کریں، ہمارے تمام ملازم بہت اچھے ہیں، آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، عزت کرتے ہیں بہن اور بیٹیوں کی طرح۔" علیزے... اپنے گھر کے تمام ملازمین سے مطمئن تھی، آذر اس کی بات پہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

"او کے ایم سوری۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"ارے آذر بھائی..... یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے شرمندہ کرنے کا ارادہ ہے؟" علیزے کو بے ساختہ خفگی... ندامت کا احساس ہوا تھا، آذر اس کے لیے بڑے بھائیوں کی جگہ تھا، قابل قدر اور قابل احترام، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آذر سے سوری کرے۔

"یار شرمندہ تو میں ہوں، خوامخواہ اتنا روڈ ہو گیا، اپنی وے آئندہ احتیاط کروں گا، لیکن تم یہ بتاؤ تمہارا اس وقت موڈ کیوں... تھا؟" آذر کی بات پہ وہ مسکرائی اور گردن اور عدید کی حرکت بتانے لگی، جسے سن کر آذر قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اپنے اتنے جاندار... بدولت وہ کسی کی نظروں کی زد میں آ گیا تھا اور عجیب سی ہی تھی کہ آذر نے بھی بے ساختہ ہی ٹیرس کی سمت دیکھا تھا، لیکن اب... کوئی بھی نہیں تھا، وہ سر جھٹک کر پھر سے علیزے کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔

♥

مبارک خان فارغ تھا، اسی لیے اپنی فراغت دور کرنے کی غرض سے چوکیدار کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"زہے نصیب جی آج تو مبارک خان خود ہمارے پاس آیا ہے، کیا بانٹوں مٹھائی یا لڈو؟" چوکیدار نے مبارک خان کو...

خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا، مبارک خان زیادہ تر وقار آفندی کے کاموں میں مصروف رہتا تھا، اسی لیے باقی ملازموں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کم ہی تھا۔ جس کو باقی ملازم مغروری کا نام دیتے تھے۔ مبارک خان، عارف کی بات پہ ہنس دیا۔

"یار ایسا تو آج تک میری بھرجائی نے نہیں کہا جیسا تو کہہ رہا ہے، مٹھائیاں بانٹ رہا ہے۔"

"یار بھرجائی تو جب کہے گی جب تُو اس کے پاس جائے گا؟ جب جانا ہی نہیں تو پھر کہنا کیا خاک ہے؟" عارف جل کے بولا، کیونکہ مبارک خان اتنے دن اپنے گاؤں نہیں جاتا تھا، اسے دو، دو، تین، تین، مہینے گزر جاتے تھے اپنے گھر والوں کی شکل دیکھے ہوئے۔

"یار تجھے کیا پتا کہ اچھا نوکر بننے کے لیے بھی بڑے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں، اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑتا ہوں تو تب بڑے صاحب آگے جگہ دیتے ہیں۔ ورنہ باقی سب کی طرح میں بھی کہیں پیچھے پڑا ہوتا۔ آگے آنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے یار۔"

"ہاں یار یہ تو ٹھیک کہا تم نے، نوکری ملنا اور پھر نوکری کرنا دونوں ہی مشکل کام ہیں، اپنے مالکوں کو خوش کرنا آسان نہیں ہوتا۔" عارف سنجیدہ اور افسردہ سا ہو گیا تھا۔

"ارے نوکری سے یاد آیا وہ آدمی دوبارہ نہیں آیا کیا؟" مبارک خان نے تیزی سے پوچھا۔

"کون آدمی؟" عارف بھول چکا تھا۔

"ارے وہی منصور حسین۔" مبارک خان کے یاد دلانے پہ عارف کو اس کی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ کام بھی یاد آ گیا۔

"نہیں یار دوبارہ کبھی اسے دیکھا ہی نہیں، ہو سکتا ہے اسے کہیں کام مل گیا ہو؟ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے۔" عارف نے کندھے اچکانے کے ساتھ ساتھ قیاس آرائی بھی کی تھی۔

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن یار آج کل کام ملنا اتنا بھی آسان نہیں ہے، پڑھے لکھے ہاتھوں میں ڈگریاں لے کر دھکے کھاتے پھر رہے ہیں، وہ تو صرف چار جماعتیں پاس ہے۔ سمجھو ہمارے جیسا ہی ان پڑھ ہے۔" مبارک خان افسوس سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے پاس ان کا فون نمبر تو ہو گا؟ تم فون کر کے پتا ہی کر لیتے کہ کیا ماجرا ہے؟" عارف نے مبارک خان کو مشورہ دیا۔

"فون کیسے کر لیتا؟ صاحب نے اس کے لیے کوئی کام بتایا ہی نہیں، خوامخواہ فون کروں گا تو اس بیچارے کی آس بھی ٹوٹ جائے گی۔" اس کے انداز میں بیچارگی تھی۔

"بس یار بڑے لوگوں کے بھی نخرے ہی ہوتے ہیں، مرضی ہو تو جس کو دل چاہے پکڑ کر کام پہ رکھ لیں اور مرضی نہ ہو تو اپنے اتنے پرانے اور وفادار ملازم کو اٹھا کر باہر پھینک دیں۔"

"بس اللہ نے ان کو دے جو رکھا ہے، وہ بیچارا اتنے دن آتا رہا، منتیں کرتا رہا، مگر صاحب نے....." عارف کو بھی افسوس نے ہی گھیر رکھا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ مبارک خان کچھ کہتا اس کی جیب میں رکھا موبائل بجا، اس نے نمبر دیکھا، کوئی انجان نمبر ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو السلام علیکم۔" پہلے ہیلو، پھر اسلام علیکم عارف، مبارک خان کی کم عقلی پہ ہنسا۔

"وعلیکم السلام۔"

"مبارک خان، منصور حسین بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے مرجھائی ہوئی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔

"اوئے منصور حسین اللہ بھلا کرے بڑی لمبی عمر ہے تمہاری، ابھی تجھے ہی یاد کر رہے تھے۔" مبارک خان کو بڑی خوشی ہوئی تھی لیکن حال عارف کا تھا۔

"کاش لمبی کی بجائے مختصر ہوتی، نجات تو ملتی۔" منصور حسین کا لہجہ تلخ تھا اور جن حالات سے وہ گزر رہا تھا ان کے بعد ایسی تلخی حیرانی کی بات تو نہیں تھی، یہ تو فطری عمل تھا۔ مبارک خان کے دل کو کچھ ہوا، بنیادی طور پہ وہ خاصا نرم دل انسان تھا، کسی کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"ایسا نہ کہو منصور حسین، اللہ رحم کرے گا صبر سے کام لو۔"

"ہونہہ..... صبر سے کام لو؟ پیٹ خالی ہو تو صبر سے کام لینا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے مبارک خان..... صبر کرنے کے لیے پیٹ کا

بھرا ہونا ضروری ہوتا ہے، صبر کرنے کے لیے انسان کو برداشت، ہمت اور سکت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں انسان کے معدے میں کچھ ہو تو بھی آسکتی ہیں، تم میرے گھر آؤ اور میرے گھر کے حالات دیکھو، تب تمہیں میری بے صبری کا احساس ہوگا نے تو بس وعدہ کر لیا اور بھول گئے، لیکن میں کیا کروں جو اتنے دنوں سے آس لگائے بیٹھا ہوں؟ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے کر دو، تاکہ میں کہیں اور جوتیاں گھسالوں؟" منصور حسین اس سے آخری فیصلہ سننا چاہ رہا تھا۔ جبکہ خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"مبارک خان جو بھی جواب دینا ہے جلدی دو میں کسی کے فون لے کر فون کر رہا ہوں۔" وہ کچھ یاد آنے پہ بولا۔

"تو تمہارا اپنا فون کہاں ہے؟" مبارک خان کو پتا تھا کہ منصور حسین کے پاس ایک موبائل ہے، بے شک وہ کافی سستا تھا۔

"دو روز پہلے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا، سبھی کے پیٹ خالی تھے۔ صبر سے کام لینا ناممکن ہو چکا تھا صرف ایک موبائل تھا، تیرہ سو روپے میں۔" مبارک خان کے سوال پہ اس نے طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا، لفظوں میں بڑی چبھن اور کاٹ تھی۔ جواباً وہ نہ کہہ سکا، بلکہ مزید شرمندگی ہوئی تھی جیسے اس کے گھر کے حالات کا ذمہ دار وہی تھا۔

"ٹھیک ہے منصور حسین تم پرسوں، نہیں پرسوں نہیں بلکہ کل ہی صاحب کے آفس آ جاؤ، میں بھی وہاں ہی ہوں گا، صاحب سے بات کریں گے کہ وہ تمہیں کام پہ رکھنا چاہتے بھی ہیں کہ نہیں؟" مبارک خان نے اسے تسلی دی اور منصور حسین کی آس بندھ گئی تھی، اس نے فون بند کر دیا۔

♥

"مما! عون اور عدید کہاں ہیں؟" وہ کافی عجلت میں تیار ہو کر نیچے آئی اور چھوٹتے ہی ان کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

"وہ تو سکول چلے گئے۔"

"کب؟ ابھی تو ان کی آواز ڈائننگ روم سے آ رہی تھی؟"

"ہاں ابھی ابھی نکلے ہیں۔"

"اوکے میں بھی چلتی ہوں بائے۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ کے مما کو پیار کرتی کوریڈور کی سمت لپکی تھی، شیشے کی طرح چمکتے فرش پہ چلتے ہوئے وہ بمشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچاتے ہوئے تیز تیز چلتی کوریڈور کے داخلی دروازے سے باہر نکلی تھی۔

"عون، عدید رکو، پلیز جسٹ ون منٹ۔" وہ اونچی آواز سے پکاری تھی اور مبارک خان کی گاڑی کی سمت بڑھتے وہ دونوں یکدم ٹھہر گئے تھے۔ مبارک خان ان کے سکول بیگ اپنی گاڑی میں رکھ رہا تھا، روزانہ صبح وہی ان کو سکول ڈراپ کرتا تھا اور پھر آفس کو آفس چھوڑنے جاتا تھا۔

"جی؟" وہ عجلت میں پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کرتی ان تک پہنچی تھی اور اس کے قریب آنے پہ انہوں نے بیک وقت "جی" کہا تھا، جس سے ان کی ناراضگی اور لاتعلقی صاف ظاہر ہو رہی تھی، علیزے ان کو یونیفارم پہنے تک سک سے تیار خفا خفا انداز میں دیکھ کر بے ساختہ مسکرائی اور دونوں کے باری باری گال چوم لیے تھے، ان کی خفگی کی پروا کیے بغیر۔

"سوری میری جان! میں کل غصے میں کچھ زیادہ کہہ گئی۔ ان فیکٹ اچانک نیند سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چلا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اتنی زیادہ ڈانٹ کے لیے آئیم سوری۔" اس نے دونوں کے گال چھو کر کہا اور وہ دونوں اک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے، آنکھوں آنکھوں میں کہا، پھر علیزے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے ہم آپ کی کل والی ڈانٹ بھول سکتے ہیں، مگر ایک شرط پہ۔" کافی شاہانہ انداز تھا ان کا۔

"کیسی شرط؟"

"آپ آج واپسی پہ ہمیں آئس کریم بھی کھلائیں گی اور شاپنگ بھی کروائیں گی، اپنی گاڑی میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ مطلب کہ سب کچھ آپ کا ہی ہوگا؟" دونوں کی شرط پہ وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

"اوکے منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر ہم بھی راضی ہیں۔" انہوں نے علیزے کو گڈ بائے کہا اور فلائنگ کس کرتے وہاں سے چلے گئے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ کالج نہیں جانا؟" آذر اور دانیال آفس جانے کے لیے نکل رہے تھے، علیزے کو گاڑیوں کے قریب روش پہ کھڑے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"جانا ہے۔"

"تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہو؟" ان کی حیرانی بجا تھی۔

"بس وہ عون اور عدید کے لیے کھڑی تھی۔" اس کے کہنے پہ آذر معاملہ سمجھ کے مسکرا دیا تھا۔

"اوکے چلتی ہوں، گڈ بائے۔" وہ اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئی، اس کا ڈرائیور گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔ آذر اور دانیال اپنی گاڑی کی طرف آ گئے۔ ان لوگوں کی گاڑیاں اک دوسرے کے آگے پیچھے حویلی کے گیٹ سے باہر نکلی تھیں۔

♥

وقار آفندی اخبار پڑھتے ہوئے مبارک خان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ عون اور عدید کو ڈراپ کر کے ابھی نہیں آیا تھا، اپنے مقررہ ٹائم سے دس منٹ لیٹ ہو چکا تھا اور اس کے لیٹ ہونے کا مطلب تھا کہ وہ یقیناً ٹریفک جام میں پھنس گیا تھا، صبح صبح لاہور کی سڑکوں پہ ٹریفک کا رش بھی بے انتہا ہوتا تھا، سکول، کالج، یونیورسٹیز اور آفیسز کے لیے نکلنے والوں کا اژدھام ہوتا تھا، اپنے وقت پہ منزلِ مقصود پہ پہنچ جانا ناممکن ہو جاتا تھا، خود وقار آفندی بھی آفس جاتے ہوئے کئی بار اس اژدھام میں پھنس چکے تھے، جس کے باعث وہ کئی بار آفس سے لیٹ ہو جاتے تھے، آج بھی انہیں ایسا ہی کچھ لگ رہا تھا، لیکن ابھی وہ گھڑی دیکھ ہی رہے تھے کہ مبارک خان بھی آ گیا، ملازم ان کا بریف کیس گاڑی تک چھوڑ آئی تھی۔

"سلام صاحب۔" مبارک خان نے ان کو دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"وعلیکم السلام، لیٹ کیوں ہو گئے تھے؟"

"ٹریفک جام تھا صاحب۔" ان کی حسب توقع جواب آیا تھا، اگلے چالیس منٹ میں وہ آفس پہنچے تھے، حالانکہ تیس منٹ کا راستہ تھا، شکر تھا کہ بس منٹ لیٹ ہوئے تھے۔ وہ کافی فریش موڈ کے ساتھ آفس میں داخل ہوئے تھے لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ ان کا یہ فریش موڈ محض کچھ دیر کے لیے ہے۔ آذر اور دانیال آج فیکٹری کے راؤنڈ پہ نکلنے والے تھے اسی لیے آفس کا کام ذرا جلدی نمٹانے کی کوشش میں تھے۔

"اوکے ڈیڈ ہم چلتے ہیں۔" آذر اجازت طلب لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، جاؤ تم لوگ اور انظہار سے کہو صدیقی صاحب کا کام ضرور کروا دے وہ کافی....." ان کا موبائل بجنے لگا تو بات ادھوری رہ گئی، سکرین پہ انجان نمبر سے کال تھی۔

"ایک منٹ۔" انہوں نے آذر وغیرہ کو رُکنے کا اشارہ کر کے کال ریسیو کر لی، وہ دونوں ٹھہر گئے۔

"وقار آفندی..... سنا ہے تمہاری ایک ہی بیٹی ہے۔" دوسری طرف کا لہجہ کافی پُراسرار اور رنگ قسم کا تھا۔

"کون ہو تم؟"

"تمہاری بیٹی کا عاشق ہر گز نہیں ہوں۔" لفظوں میں حقارت تھی۔

"میں پوچھ رہا ہوں کون ہو تم؟" وہ بُری طرح پریشان ہو اٹھے تھے اور ان کی پریشانی آذر اور دانیال کو بھی چونکا گئی تھی۔

"میری فکر چھوڑو، اپنی بیٹی کی فکر کرو، سنا ہے ابھی ابھی اس کے کالج روڈ پہ اس پہ فائرنگ ہوئی ہے، پتا نہیں بیچاری کس حال میں ہو گی؟ ایک ہی بیٹی ہے تمہاری۔ وہ بھی نہ رہی تو؟" کافی طنز اور سفاکی سے کہنے کے بعد فون بند کر دیا گیا تھا، وقار آفندی پتھرا گئے تھے، زبان لڑکھڑا گئی۔

"علیزے پہ فائرنگ؟"

♥

"واٹ..... علیزے پہ فائرنگ؟" آذر اور دانیال کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی وہ تڑپ کر ان کی ٹیبل کے قریب آئے تھے۔ وقار آفندی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا وہ خالی الذہنی سے ان دونوں کے چہرے دیکھ رہے تھے، ان کی حالت پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ڈیڈ بتایئے نا؟ کیا ہوا ہے؟ کس کا فون تھا؟" آذر اپنی پریشانی کنٹرول کرتے ہوئے ذرا تحمل سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"وہ..... وہ کالج کے روڈ پر....." انہوں نے بتانے کی کوشش کی مگر بات مکمل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

"کیا ہوا ہے کالج کے روڈ پر؟ پلیز ڈیڈ جلدی بتایئے ورنہ..... ورنہ کچھ ہو نہ جائے؟" دانیال نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور بات مکمل کرنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"علیزے پہ فائرنگ ہوئی ہے، پتا نہیں وہ کس حال میں ہے؟" وقار آفندی کہنے کے ساتھ ہی ڈھے گئے تھے ان کی حالت بھی ان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی اس عجیب سی صورتحال کو ہینڈل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"دانیال! یہ لو چابی، تم گاڑی نکالو، میں ڈیڈ کے پاس مبارک خان کو چھوڑ کے ابھی آتا ہوں۔" آذر نے پینٹ کی جیب سے چابی نکال کر دانیال کی سمت اُچھالی۔

"او کے جلدی آؤ۔" دانیال چابی لے کر تیزی سے دروازہ عبور کر گیا۔ آذر نے پلٹ کر ڈیڈ کو دوبارہ دیکھا۔

"ڈیڈ پلیز حوصلہ رکھیں اور اللہ سے دعا کریں ان شاء اللہ علیزے کو کچھ نہیں ہوگا۔" آذر نے ان کے ساتھ جیسے اپنے آپ کو بھی تسلی دی تھی۔

"میں ابھی جا کر مبارک خان کو بھیجتا ہوں اور پلیز ڈیڈ اس چیز کا آفس میں کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے، لوگ ہزاروں باتیں بنا لیتے ہیں۔" آذر نے ایسی پریشانی اور عجلت کے عالم میں بھی اس نازک پہلو پہ غور کر لیا تھا۔

"آذر میں بھی چلتا....."

"نہیں ڈیڈ آپ کہیں نہیں جائیں گے، میں اور دانیال جو جا رہے ہیں، وہاں جا کر آپ کو سب کچھ بتا دیں گے، ہو سکتا ہے یہ بات جھوٹ ہو، کسی نے ہمیں ستانے کے لیے ایسا کیا ہو؟" آذر کی بات صحیح تھی لیکن اس وقت ایسے ایسے وہم اور ہول اُٹھ رہے تھے کہ کچھ بھی ماننا مشکل ہو رہا تھا مگر پھر بھی انہیں آذر کی بات کو اہمیت تو دینی ہی تھی اسی لیے جوں کے توں بیٹھے رہے۔

آذر وہاں سے سیدھا اسٹاف روم میں گیا مبارک خان توقع کے مطابق وہیں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اسے وقار آفندی کے روم میں بھیج کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا آفس بلڈنگ سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی دانیال نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

"اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو علیزے کے ڈرائیور نے فون کر کے ہمیں اطلاع تو ضرور دینی تھی؟" آذر پُرسوچ انداز سے باہر نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ تھیں۔

"تو دیر کس بات کی ہے؟ اس نے فون نہیں کیا تو ہم خود کر لیتے ہیں، تم ٹرائی کرو اس کا نمبر۔" دانیال نے صاف روڈ پہ آتے ہی سپیڈ بڑھا دی تھی آذر کو اس کی بات خاصی معقول لگی تھی اس نے فوراً موبائل نکال کر علیزے کے ڈرائیور کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دو تین بار لگاتار ٹرائی کیا مگر اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔

"علیزے کے نمبر پہ چیک کرو۔" دانیال نے ایک اور مشورہ دیا لیکن آذر کی دونوں طرف کوشش کے جواب میں "نو آنسرنگ" کی مشینی آواز موصول ہوئی تھی اور ایسی چوبیس میں آذر کی پیشانی پہ بیچ بیچ پسینہ پھوٹ پڑا تھا، اس کے وہم و وسوسے یقین کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

♥

"دیکھو..... بیٹا تم پریشان مت ہو، اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے، تم میرے ساتھ چلو، یہ ساتھ ہی تو کالج ہے، میں ابھی فون کر کے تمہارے پیرنٹس کو بلا لیتی ہوں۔" اس حادثے کے بعد اتفاقاً گزرتے گزرتے علیزے کی ٹیچر اسے دیکھ کر اپنی گاڑی سے اتر آئی تھیں اور ہراساں سے انداز میں گاڑی سے باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھتی علیزے کو انہوں نے ہی سنبھالا تھا رفتہ رفتہ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور لوگوں نے ہی مل جل کر علیزے کے ڈرائیور کو گاڑی سے نکالا تھا جو ایک گولی کی زد میں آتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے ان کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور علیزے کی ان پہ نظر پڑتے ہی چیخیں اُبل پڑی تھیں۔

"خیر و بابا؟" وہ ان کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی اور میڈم عالیہ سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"ریلیکس..... ریلیکس بیٹا انہیں کچھ نہیں ہوگا، وہ صرف زخمی ہوئے ہیں۔ پریشانی والی بات نہیں ہے۔" انہوں نے بڑی

مشکل سے اسے قابو کیا تھا کسی آدمی نے ایمبولینس کو کال کر دی۔ انجان لوگ علیزے کو بھی دیکھ رہے تھے اور خیرو بابا کی حالت کو بھی..... ہر زبان پہ طرح طرح کی باتیں چل رہی تھیں۔ اور علیزے اتنے زیادہ لوگوں کی نظروں سے اور باتوں سے وحشت زدہ ہوئی جا رہی تھی اس کے خوف و ہراس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"علیزے.....؟" دانیال اور آذر بڑی سرعت سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے سامنے آئے تھے جہاں میڈم عالیہ، علیزے کو وہاں سے چلنے کے لیے بہلا پھسلا رہی تھیں۔

"علیزے....." اب کی بار آذر نے قریب آ کر اسے پکارا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے سامنے کیا تھا وہ میڈم عالیہ کے عقب میں کھڑی تھی جیسے چھپنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"آذر بھائی۔" علیزے اسے دیکھ کر چیخ اٹھی تھی اور تڑپ کر اس کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

"علیزے پلیز..... پلیز سنبھالو اپنے آپ کو، ہم آ گئے ہیں نا۔ کچھ نہیں ہوگا پلیز ریلیکس۔" آذر نے اتنے لوگوں پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے بہت رسمی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بھائی وہ..... وہ خیرو بابا۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو دی، آذر بُری طرح چونک گیا تھا۔ علیزے کو سامنے دیکھ کر وہ خیرو بابا کو بھول ہی گیا تھا۔

"کہاں ہیں خیرو بابا؟" اس نے فوراً استفسار کیا۔

"وہ..... ان کو گولی۔" علیزے سے آگے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ کہاں ہیں وہ؟" آذر کی پریشانی دیدنی تھی۔

"دیکھو بیٹا وہ کافی زیادہ زخمی ہو گئے تھے ان کا خون بھی کافی بہہ رہا تھا اس لیے ان کی حالت دیکھتے ہوئے دو لڑکے ایمبولینس میں ان کو ہسپتال لے گئے ہیں اور اتنی زیادہ فائرنگ اور اپنے ڈرائیور کی تشویشناک حالت دیکھ کر یہ بہت خوفزدہ ہو گئی ہے آپ اسے فوراً گھر لے جائیں۔" میڈم عالیہ نے آذر کو بتاتے ہوئے مشورہ دیا تھا آذر ان کو پہچانتا تھا وہ ایک دو بار علیزے کو ڈراپ کرنے کالج آیا تو گیٹ پہ میڈم عالیہ سے بھی ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ وہ سر اثبات میں ہلا کر دانیال کی سمت پلٹا۔

"دانیال تم علیزے کو لے کر گاڑی میں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔" آذر، علیزے کو دانیال کے حوالے کرتے ہوئے علیزے کی گاڑی کی سمت بڑھا تھا جس پہ گولیوں کے نشان دور سے ہی نظر آ رہے تھے اور رائٹ سائیڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے کالج سٹوڈنٹ پہ مشتمل ہجوم اور خون کی دھاریں بھی زمین پر وافر مقدار میں نظر آ رہی تھیں آذر ایسے وحشیانہ اور خطرناک حملے پہ اندر ہی اندر متفکر ہوتا گاڑی کے اندر جھک گیا اس نے علیزے کا موبائل اس کا بیگ اور فائل وغیرہ نکال لی تھیں پھر ڈیش بورڈ سے خیرو بابا کا موبائل بھی اٹھا لیا تھا جو ان لوگوں نے علیزے سے کانٹیکٹ میں رہنے کے لیے دے رکھا تھا اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد تمام ضروری اشیاء گاڑی سے نکال لی تھیں تاکہ کسی بھی قسم کی انوسٹی گیشن کے دوران وہ چیزیں انوالو نہ ہوں وہ چند ہی منٹوں میں کچھ فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

"یہ لو..... یہ علیزے کا سامان ہے احتیاط سے لے جاؤ اور اسے چپ کروا دو۔" اس نے کھڑکی سے جھکتے ہوئے بیگ دانیال کے حوالے کیا اور علیزے کو دیکھا جو ابھی تک رو رہی تھی۔

"لیکن آذر تم اکیلے یہاں؟" دانیال کو فکر نے آن گھیرا۔

"ڈونٹ وری میں یہاں سب کچھ سنبھال لوں گا خیرو بابا کے پاس ہاسپٹل بھی جانا ہے ابھی۔" آذر نے اسے تسلی دی۔

"لیکن تمہارے پاس تو گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"دانیال پلیز تم میری فکر نہ کرو، تم علیزے کو یہاں سے لے کر نکلنے کی کوشش کرو یہ سراسر پولیس کیس ہے، ہو سکتا ہے ابھی نہیں تو تھوڑی دیر تک پولیس بھی آ جائے، ابھی آس پاس دیکھنے والے لوگوں نے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہوں آخر کون لوگ تھے جنہوں نے فائرنگ کی؟ کسی نے تو دیکھا ہی ہوگا؟" آذر کی بات سمجھ کر دانیال بھی چپ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں علیزے کو حویلی ڈراپ کر کے دوبارہ آتا ہوں۔" دانیال نے گاڑی آگے بڑھا دی اور آذر پلٹ کر دوبارہ جائے وقوعہ پہ آ گیا تھا ابھی وہ ایک دو آدمی سے بات کرنے کا ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی آتی دکھائی دی اور لوگ

پولیس کو دیکھ کر شہد کی مکھیوں کی طرح اُڑتے چلے گئے تھے جیسے کسی نے ان کے چھتے پہ پتھر مار کر ان کو اُڑا دیا ہو۔

اور وہاں میڈم عالیہ اور دو تین اوجیڑ عمر مرد ہی کھڑے رہ گئے تھے یا پھر ذرا فاصلے پہ آذر اکیلا کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کبھی بھی وقت پہ نہ پہنچنے والی پولیس اب کیا کارکردگی دکھاتی ہے؟ پولیس کی گاڑی قریب پہنچنے تک آذر، وقار آفندی کا نمبر ڈائل کر چکا تھا دوسری طرف کال ریسیو کرنے والا مبارک خان تھا آذر کے کہنے پہ اس نے موبائل وقار آفندی کی سمت بڑھا دیا تھا۔

♥

علیزے پہ قاتلانہ حملے کی خبر بڑی حویلی کے در و دیوار ہلا کر رکھ گئی تھی، چھوٹے بڑے سبھی چکرا کے رہ گئے تھے علیزے وقار آفندی کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کی سہمی سہمی چیخوں کو سُن کر باہر آنے کا رستہ مل گیا تھا وہ بلند آواز سے رو رہی تھی اور اس کی حالت ایسی تھی کہ آسیہ آفندی نے دیور اور دیورانی کے مشورے پہ اسے کچھ دیر کے لیے ٹرینکولائزر دے کر سلا دیا تھا وہ ایسی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھی کہ سب کے تشویش بھرے سوالات کے جواب دے سکتی لہٰذا اسرار آفندی نے اسے کچھ دیر سکون دینے اور اس حادثے کو اس کے دماغ سے ذرا دور کرنے کے لیے یہی آئیڈیا سوچا تھا اور قریب منتظر سی کھڑی ثروت بیگم نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

علیزے کو اپنے کمرے میں سلا کر جیسے ہی آسیہ آفندی کمرے سے باہر آئیں انہیں راہداری سے وقار آفندی آتے دکھائی دیئے ساتھ احتیاطاً ان کے سہارے کے لیے مبارک خان بھی تھا جو ان کا بازو تھامے ہوئے تھا۔

''علیزے کہاں ہے؟'' انہوں نے آسیہ آفندی کو دیکھ کر چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے وہ ٹھیک ہے، میں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے سلا دیا ہے وہ کافی اپ سیٹ ہو چکی تھی۔'' انہوں نے شوہر کو تسلی دی۔

''آسیہ! تم ٹھیک کہہ رہی ہو نا؟'' وہ بے یقین لگ رہے تھے۔ حالانکہ آذر فون پہ ان کو اچھی خاصی تسلی دے چکا تھا اور صورتحال بھی بتا چکا تھا۔

''آپ خود دیکھ لیں۔'' آسیہ آفندی نے مڑ کر دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا تھا۔ اور وہ اتنے نمبر مطمئن تھے کہ انکار نہیں کر سکے اور کمرے میں آگے مبارک خان باہر ہی کھڑا رہ گیا۔

''علیزے میری جان۔'' وہ بے ساختہ بیڈ پہ لیٹی علیزے کے قریب آئے اور جھک کر اس کی پریشانی چوم لی تھی بے شک علیزے نیند آور گولیوں کے زیر اثر سو گئی تھی لیکن اس کا ذہنی انتشار اس کے سوئے ہوئے چہرے سے بھی عیاں ہو رہا تھا بے تحاشا رونے کی وجہ سے اس کی پلکیں جڑی ہوئی تھیں اور پپوٹے سرخ اور سوجن زدہ ہو رہے تھے وقار آفندی کا سر مٹھی میں آ گیا تھا انہوں نے بچپن میں بھی علیزے کو کبھی رونے نہیں دیا تھا وہ ذرا سا ''اُف'' بھی کرتی تو ہزاروں لوگ الرٹ ہو جاتے تھے اور آج وہ اپنے اتنا سنگین منظر، اتنا ہولناک واقعہ خود پہ سہہ آئی تھی۔

''میری جان، میری علیزے۔'' وہ اس کے قریب بیٹھے اس کے بال سہلا رہے تھے اور ان کا وہاں سے اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''وقار!'' آسیہ آفندی نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''آئیں باہر چلیں، باہر سب پریشان ہو رہے ہیں اور ہم یہاں کمرے میں آ کر بیٹھ گئے ہیں، پلیز سنبھالیے اپنے آپ کو علیزے اگر آپ کو اس طرح کمزور دیکھے گی تو اور زیادہ ٹینس ہو جائے گی۔ پلیز حوصلے اور ہمت سے کام لیں۔'' آسیہ آفندی نے ان کے کندھے پہ دباؤ ڈالتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ جواباً انہوں نے کچھ بھی نہ کہا اور علیزے کا گال تھپک کر ان کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔

''رجو کہاں ہے؟'' انہوں نے علیزے کی ملازمہ کا پوچھا۔

''علیزے کا بیڈ روم صاف کر رہی ہے شاید۔'' انہوں نے ٹائم کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''اسے کہو وہ علیزے کے پاس آ کر بیٹھے۔'' انہوں نے رُک کر آرڈر دیا تھا۔

''لیکن علیزے تو سو رہی ہے۔'' آسیہ آفندی نے حیرانی سے کہا۔

"اسی لیے تو کہا ہے، وہ جب اٹھے گی تو خود کو کمرے میں اکیلے دیکھ کر کہیں خوف و ہراس میں نہ آ جائے، رجواس کے سامنے ہو گی تو اس کی تسلی ہو جائے گی۔" وقار آخری نے وضاحت دی لیکن آسیہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھیں۔

"جاؤ اسے کہو سارے کام چھوڑ کر وہ علیزے کے پاس آ کے بیٹھے اور اس کا خیال رکھے۔" اب کی بار وہ انکار نہ کر سکیں اور پلٹ کر رجو کو بلانے آ گئیں۔ اور وہ خود ڈرائنگ روم میں چلے آئے جہاں باقی سب بھی موجود تھے۔

♥

"میڈی پاکستان جا رہی ہے۔" کرسٹینا نے آتے ہی اپنے گروپ میں شوشا چھوڑا تھا اور اس گروپ میں سب سے زیادہ چونکنے والا جیری ہی تھا۔

"سب؟ تمہیں کس نے بتایا؟" اس کے سوال میں بے چینی سی تھی۔

"بتایا تو اس نے خود ہی ہے، البتہ کب جا رہی ہے؟ اس کا نہیں پتا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"وہ تمہیں خود ملی ہے یا فون پہ بتایا ہے؟" جیری کے سوال بے ساختہ تھے وہ خود کو روک نہیں پایا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فون پہ بتایا ہے، ہو سکتا ہے وہ ادھر کینے کی طرف بھی آئے۔" جیری جتنا کانشس ہو رہا تھا کرسٹینا اتنی ہی لاپروا دکھائی دے رہی تھی اسے مدیحہ کے آنے اور جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ کبھی پاکستان نہیں جائے گی؟" ہینڈسم سی کے لان میں گھاس پہ بیٹھی شیلے نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہیلو۔۔۔ یہ ان پاکستانیوں کی صرف باتیں ہی ہیں، جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور جو کرتے ہیں وہ کہتے نہیں۔ ان کے لیے بڑی بڑی باتیں کر لینا تو آسان ہے لیکن بڑی بڑی باتوں پہ عمل کرنا بہت مشکل۔" کرسٹینا اور اس کی فیملی پاکستانیوں سے متنفر تھی یہ تو اس کی مجبوری تھی کہ مدیحہ ان کے گروپ کا حصہ تھی اس لیے برداشت کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی وہ پاکستانی مردوں سے متنفر تھی عورتوں کے لیے ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی تھی اس لیے جیسی تھی ہی سہی مدیحہ سے فرینڈشپ چل ہی رہی تھی۔

"ہیلو ایوری باڈی؟ کیا ہو رہا ہے؟" تھوڑی ہی دیر میں کرسٹینا کے قب سے مدیحہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

"ہائے۔" سبھی نے اسے وش کیا تھا لیکن جیری تو یہ بھی نہیں کر سکا تھا۔

"لگتا ہے کوئی سیریس ٹاپک چل رہا ہے۔" شیلے کے برابر گھاس پہ بیٹھتی مدیحہ نے سبھی کے چہرے اک نظر میں بھانپ لیے تھے۔

"اس وقت تو تم ہی ٹاپک ہو۔" کرسٹینا نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

"کیوں؟ کوئی ریزن؟" مدیحہ نے تیکھی نظروں سے کرسٹینا کی مسکراہٹ کا جائزہ لیا۔

"نہیں کوئی خاص وجہ نہیں، بس وہ جیری تمہیں مس کر رہا تھا، تمہارے پاکستان جانے کا سن کر پریشان ہو گیا ہے۔" کرسٹینا کا انداز جھوٹ لاپروائی لیے ہوئے تھا جبکہ اس کی بات پہ جہاں مدیحہ چونکی وہیں جیری گڑبڑا کے رہ گیا تھا وہ کرسٹینا کے ایسے حملے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

"کیوں؟ میرے جانے سے جیری کو کیا پرابلم ہے؟" مدیحہ نے براہِ راست جیری کی طرف رُخ موڑا وہ اپنے تاثرات کنٹرول کرنے میں لگا ہوا تھا۔

"جیری کو تمہارے جانے سے یہ پرابلم ہے کہ ہمارے گروپ کی ایک اچھی فرینڈ ہم سے دور ہو جائے گی اور اس کی کمی ہمیں ہمیشہ فیل ہو گی۔" شیلے نے درمیان میں بولتے ہوئے بات سنبھالی تھی اور جیری نے شیلے کو ممنون نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر کرسٹینا کو دیکھ کر دل جلا جا رہا تھا اس کا گلا دبا دے۔

"یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم لوگ، کمی تو مجھے بھی بہت محسوس ہو گی آپ لوگوں کی۔ لیکن اتنا پریشان ہونے والی بات بھی نہیں ہے ہم لوگ فون اور نیٹ پہ ہمیشہ کانٹیکٹ میں رہیں گے بلکہ تم لوگ اگر کبھی چھٹیوں میں چاہو تو مجھ سے ملنے پاکستان بھی آ سکتے ہو، ایٹ آل ہوپ کہ تم سب انجوائے بھی کرو گے۔" مدیحہ نے بے ساختہ ہی ان لوگوں کو مہمان نواز میزبان کی طرح دعوت دی تھی اور اس دعوت پہ سبھی نے مسکرا کر سر ہلایا تھا سوائے کرسٹینا کے۔

"میڈی میرا وعدہ ہے کہ کوئی اور آئے نہ آئے میں ضرور آؤں گا۔" ہیرائن نے کتاب سے سر اٹھا کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں ویٹ کروں گی۔" مدیحہ کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

"تم کب جا رہی ہو؟" شیلے نے سوال کیا۔

"نیکسٹ ویک۔"

"ٹکٹ کنفرم ہو گیا تمہارا؟"

"ہاں..... آج ہی ہوا ہے۔" مدیحہ نے کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔

"کیا پاکستان جا کر شادی کرنے کا ارادہ ہے؟" ہیرائن کے سوال میں سنجیدگی تھی۔

"نہیں..... شادی کی پلاننگ تو دور دور تک بھی نہیں ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

"ارے ابھی نہیں ہے نا؟ پاکستان جا کر ضرور ہو جائے گی۔ تمہیں پہلی نظر میں ہی کسی اکڑے ہوئے سینے اور پھولے ہوئے بازوؤں والے ہیرو سے محبت ہو جائے گی، جو بات بھی کرے کا چھت پھاڑ کے۔" کرسٹینا نے تمسخر سے کہتے ہوئے پاکستانی فلموں کے ہیرو کا نقشہ کھینچا تھا۔

"اب میرا ٹیسٹ اتنا بُرا بھی نہیں ہے کیوں ہیزی؟" مدیحہ نے چپ بیٹھے ہیزی کو بھی گفتگو میں گھسیٹا۔

"ہاں یار میڈی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے، اس کا ٹیسٹ تو اتنا اعلیٰ ہے کہ یہاں لندن جیسے شہر میں رہتے ہوئے بھی ابھی تک اسے کوئی پسند نہیں آیا، کوئی اپنے معیار کا ہی نہیں لگا، نہ کوئی مسلم، نہ کوئی کرسچن۔" ہیزی ڈائریکٹ مدیحہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا مدیحہ کی نیت صاف تھی اس لیے وہ نظر چرانے کے بجائے مسکرا دی۔

"یہ تو تم ہنڈرڈ پرسنٹ درست کہہ رہے ہو اور یہی بات کبھی کبھی میں خود بھی سوچتی ہوں کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے اتنی زیادہ آزادی بھی تھی کوئی مسئلہ، کوئی روک رکاوٹ بھی نہیں تھی مگر پھر بھی مجھے کوئی اچھا نہیں لگا؟ کسی نے بھی اس دل کو چھو نہیں کیا۔" اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی تھی۔

"لیکن یہ تو ہو سکتا ہے نا کہ تم کسی کے دل کو چھو گئی ہو؟" ہیزی نے ذو معنی بات کہی۔

"تو پھر یہ کسی کے دل کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔" وہ بے نیاز تھی۔

"کوئی تمہیں چاہتا ہے، کیا تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟" ہیزی اسے کھوج رہا تھا۔

"نہیں مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ مجھے کوئی بھی چاہ سکتا ہے اور میں ہر ایک کے لیے فکر اور تجسس نہیں پال سکتی۔" اس کے انداز میں لاپروائی ہنوز تھی اس نے ہیزی کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

"تو پھر تم کس کے لیے فکر اور تجسس پال سکتی ہو؟ کون ہو گا وہ خوش نصیب؟" ہیزی نے ہمت نہ ہاری اور کھوج کا سلسلہ جاری رکھا۔

"وہ خوش نصیب وہ ہو گا جو "صرف" مجھے چاہے گا جس کی زندگی میں پہلے اور بعد میں، میرے سوا کوئی نہیں ہو گا، جو ادھر اُدھر منہ ماری نہیں کرے گا۔" مدیحہ کی بات پہ ہیزی پل بھر کے لیے چپ سا ہو گیا تھا کیونکہ مدیحہ کے سامنے ہی وہ ایسے منہ ماری کرنے کے ہزاروں کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔

"آج کل ایسا خوش نصیب ملنا بہت مشکل ہے میڈی، بالکل فیئر آدمی تمہیں کہیں بھی نہیں ملے گا۔" ہیزی نے مدیحہ کو اس کی شرائط سے باز رکھنا چاہا۔

"ہونہہ..... مشکل ہو سکتا ہے ناممکن نہیں، اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس وسیع دنیا میں ہر قسم کے انسان آباد ہیں۔" اس کا یقین سے کہا تھا اور وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن بہت پہلے زری کے منہ سے سنا ہوا شعر بے ساختہ ہی مدیحہ کے لبوں پہ مچل گیا تھا۔

ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھنا!

انہوں نے مدیحہ کے اس شعر پہ ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے اس نے شعر کو انگلش میں ٹرانسلیٹ کر دیا تھا۔

"ہوں..... انٹرسٹنگ۔" ہیرائن نے ایک بار پھر کتاب سے نظریں ہٹا کر مدیحہ کی حوصلہ افزائی کی اور اسے داد دی تھی۔

"تمہیں کیسا لگا؟" وہ جھجکی سے مخاطب ہوئی۔
"اچھا لگا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور باقی سبھی اسے دور جاتا ہوا دیکھنے لگے۔

♥

وہ تقریباً دو بجے کورٹ سے فارغ ہوا تھا اور کورٹ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا لیکن جب اس کے لیڈر نے بتایا کہ آفس میں کافی زیادہ کام ہے تو پھر اس نے کچھ دیر کے لیے آفس کا چکر لگا لینا بھی مناسب سمجھا تھا۔ ابھی وہ پارکنگ کی سمت جا ہی رہا تھا کہ انسپکٹر شہباز سے ٹکراؤ ہو گیا، وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی ہمیشہ والی شوخی و شرارت لیے ہوئے تھی۔
"سلام شاہ جی۔" اس نے اپنی خوشی کے اظہار کے طور پہ دل آور شاہ کو سلیوٹ کیا تھا۔
"وعلیکم السلام، کیسی ہیں آپ؟" وہ چاہتے ہوئے بھی بے مروتی نہ دکھا سکا کیونکہ اسے پتا تھا وہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔
"ایک دم فٹ ہوں شاہ جی! لیکن آج کل کچھ اُلجھے بکھرے دکھائی دے رہے ہیں؟" وہ قریب آ کھڑی ہوئی۔
"یہ بھی لوگوں کی نظر کا دھوکہ ہے۔" دل آور شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، یوں جیسے وہ انسپکٹر شہباز کے سوال سے محظوظ ہوا ہو۔
"اوہ... تو آپ یہ مان رہے ہیں کہ آپ دھوکہ بھی دیتے ہیں؟" انسپکٹر شہباز کا انداز معنی خیز تھا۔
"صرف دھوکہ ہی نہیں، دغا بھی دیتا ہوں۔" وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی لائیٹر سے سگریٹ کو شعلہ دکھا دیا۔
"کام تو واقعی ہی خطرناک ہیں۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔
"اسی لیے تو کہتا ہوں بچ کے رہا کریں۔" دل آور شاہ نے اسے ڈرایا اور وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔
"شاہ جی یہ بھی خوب کہی آپ نے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔
"نظام ہے میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو باز رکھوں، آگ سے کھیلنا خطرناک ہی تو ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں اڑاتے ہوئے جارحانہ انداز دونوں کا غیر سنجیدہ تھا۔
"آپ بھول رہے ہیں شاہ جی! آگ جہاں بھی ہو پتنگا ضرور آتا ہے۔"
"میں جانتا ہوں وہ پتنگا جل کے مر بھی جاتا ہے۔"
"لیکن شاہ جی مرنے سے پہلے آگ کو چھو تو لیتا ہے نا۔ چھونے کی حسرت دل میں لے کر نہیں مرتا، چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنی حسرت تمام کر لیتا ہے۔" انسپکٹر شہباز کو اس کی باتوں سے اختلاف تھا۔
"اوہ یعنی آپ بھی حسرت تمام کرنا چاہتی ہیں؟" دل آور نے اسے جان بوجھ کر چھیڑا۔
"نہیں حسرت تمام نہیں کرنا چاہتی بلکہ تمام حسرتیں کرنا چاہتی ہوں۔"
"ماشاءاللہ کیا خیالات ہیں میڈم کے۔" اس نے سراہا۔
"میڈم بلوا آ چکا ہے۔" اچانک ایک لیڈی کانسٹیبل تیزی سے قریب آئی اور اپنی میڈم کو اطلاع دی۔
"چلیں شاہ جی آج کے لیے بخشتا آپ کو، پھر ملاقات ہو گی۔" اس نے جیسے عنایت کی تھی۔
"بڑی مہربانی ہے میڈم، بخشنے کا شکریہ الگ ہے۔" دل آور نے عاجزی سے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ گہری سانس کھینچتا سگریٹ زمین پہ پھینک کر پاؤں سے مسلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف آ گیا تھا۔
جیسے ہی وہ آفس پہنچا اس کا لیڈر الرٹ کھڑا تھا اس نے رفتہ رفتہ تمام کیسز کی تفصیلات نکال کر سامنے رکھنا شروع کر دیں۔
"اب سے تمام کیسز کی ڈیٹس نومبر کے بعد کی ہونی چاہئیں میں دو تین کیسز کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں جن کو نبٹاتے ہوئے چند دن تو لگ ہی جائیں گے بلکہ ہو سکتا ہے، زیادہ عرصہ لگ جائے۔" اس نے لیڈر کو سب کچھ سمجھاتے ہوئے اطلاع دی۔
"لیکن سر وہ تین کیسز کی تو نومبر سے پہلے....."
"ہوں..... جانتا ہوں تم بس تمام کیسز کی تاریخیں لیتے جانا، کوئی فرق نہیں پڑے گا، باقی جو ہو گا بعد میں دیکھا جائے گا۔" وہ

چند کاغذوں پہ سائن کرنے کے بعد اپنے لیٹر قادر کو بتاتا جا رہا تھا۔
''آپ جا کب رہے ہیں؟'' قادر تھوڑا پریشان ہو چکا تھا۔
''ابھی کچھ فائنل نہیں ہے آج ڈسکشن ہو گی پھر ہی کچھ پتا چلے گا۔''
''سر کل ایک لڑکی آئی تھی آفس میں۔''
''پھر؟''
''اپنا کیس ریکارڈ کروا کے گئی ہے۔''
''کیا نام تھا؟'' اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔
''مومنہ بی بی۔''
''اوہ ہاں..... مومنہ بی بی، پھر تم نے کیس ریکارڈ کیا؟''
''جی کر لیا تھا۔'' قادر مؤدب سے لہجے میں بولا۔
''اس کے کیس کی ایک کاپی مجھے دے دو۔''
وہ فائلز بند کرتے ہوئے بولا اور پین پہ کیپ چڑھا کر ٹیبل پہ ڈال دیا۔
''جی سر ابھی تیار کروا لیتا ہوں۔'' قادر اٹھ کر ریک کی سمت بڑھ گیا۔ ''بس پانچ منٹ میں مکمل کر دو سب کچھ۔ اور ہاں وہ لڑکی اپنا کوئی کانٹیکٹ نمبر وغیرہ دے کر گئی ہے یا نہیں؟'' اس نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔
''نہیں سر! نمبر وغیرہ تو کوئی نہیں دیا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''اوکے..... اب اگر وہ دوبارہ آئے یا پھر کوئی رابطہ کرے تو اس سے نمبر ضرور لے لینا اور میرے نمبر پہ فارورڈ کر دینا۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''جی سر! کر دوں گا۔'' قادر دوبارہ سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔
اور وہ خود گھڑی دیکھتے ہوئے ایک اور کیس کی فائل نکال کر چیک کرنے لگا اسے ابھی کیس چیک کرتے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔
''السلام علیکم۔'' کال ریسیو کرتے ہی سلام کرنا اس کی عادت تھی۔
''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟'' نبیل کی آواز آج کچھ نارمل اور ریلیکس لگ رہی تھی۔
''کیسا ہو سکتا ہوں؟'' وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔
''ہنا کٹا۔'' نبیل قہقہہ لگاتے ہوئے ہنسا تھا اور اس کے انداز پہ خود دل آور کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
''یہ بات تم میری اماں کے سامنے کہو تو وہ تمہیں اس کا مزا چکھائیں۔'' دل آور نے جیسے اسے دھمکی دی تھی۔
''ارے یار ماؤں کا کیا ہے؟ اچھے خاصے ریسلر بیٹے کو دیکھ کر بھی کہہ دیں گی۔ بیچارا کمزور ہو گیا ہے۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے؟'' نبیل نے جس لہجے میں کہا دل آور اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔
''ارے یہ عبداللہ کے انداز و اطوار تم نے کہاں سے سیکھ لیے؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔
''عبداللہ کے ساتھ رہوں گا تو اسی کے انداز سیکھوں گا نا؟'' نبیل بھی ہنس رہا تھا۔
''یعنی میرے ساتھ رہو گے تو میرے انداز سیکھو گے۔'' دل آور نے معنی نکالے۔
''اُف توبہ کرو یار اس دنیا میں ایک ہی دل آور شاہ کافی ہے، کہاں میں بے ضرر سا مسکین سا آدمی اور کہاں تم جیسا ہٹلر۔'' نبیل نے توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
''کیا اتنا بُرا ہوں؟'' دل آور کا لہجہ ایسا تھا کہ نبیل فوراً سنبھل گیا۔
''ارے نہیں یار! تم تو اپنی جان ہو، یہ سب تو ایک مذاق ہے۔''
''دیکھا اس طرح سیدھی لائن پہ لاتے ہیں؟'' اب کی بار دل آور کا لہجہ غیر سنجیدگی میں بدل چکا تھا اور نبیل اس کی شرارت کو سمجھ کر اسے بُرے بُرے القاب سے نوازنے لگا۔

''اوکے..... اوکے یہ سب بعد میں بھی ہوتا رہے گا تم یہ بتاؤ کٹ کون سی ڈیٹ کے کتنے رم ہوئے ہیں؟'' دل آور نے بات سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''اس ماہ کی اٹھائیس کے۔''

''اٹھائیس کو تو ایڈیڑے ہی ہو گا۔'' اس نے بھی اندازہ لگایا۔

''تم نے گھر میں سب کچھ چیک کر لیا؟'' نبیل اپنے گھر کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

''ہاں میں کل گیا تھا، پورے گھر کی صفائی نئے سرے سے کروائی ہے، کچن کا سامان بھی میں نے گلاب خان کے ہاتھوں بھجوا کر سارا کچن سیٹ کروایا ہے۔ آپ لوگوں کے بیڈ رومز میں نے خود چیک کیے ہیں سب کچھ پرفیکٹ ہے، لیکن پھر بھی کوئی کمی رہ جائے تو میری طرف سے معذرت.....'' دل آور کا لہجہ ابھی سے معذرت خواہانہ تھا۔

''میں تمہاری ایسی باتوں پہ کان دھرنے والا نہیں ہوں۔'' نبیل نے لاپروائی سے کہہ کر اللہ حافظ بولا اور فون بند کر دیا اور وہ اپنے بند موبائل کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

♥

''استاد! باؤ سے میں اس کام کے قابل تو نہیں تھا جس کام میں تم نے ڈال دیا ہے۔'' چھوٹے کے پیٹ میں کوئی بات اور دماغ میں کوئی خیال کبھی ٹکتا نہیں تھا فوراً زبان پہ آ جاتا تھا۔ چاہے اچھا ہو چاہے بُرا..... ابھی بھی وہ اپنے استاد کو ہی افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''لائق میں نے اسے اس کام میں نہیں ڈالا وہ خود اس کام میں پڑا ہے۔ مجھے ایک سمجھدار اور ایماندار آدمی چاہیے تھا اور اسے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی، مجھے میری مرضی کا آدمی مل گیا اور اسے دو وقت کی روٹی۔ اور ویسے بھی وہ تو اتنا مجبور تھا کہ سڑکوں پہ جھاڑو لگانے اور باتھ روم صاف کرنے کے لیے بھی تیار تھا تو کیا یہ کام بُرا ہے ان کاموں سے؟'' باؤ امتیاز بھی بیچارا سچ کہہ رہا تھا لیکن پھر بھی سب کو عدیل کی قسمت پہ افسوس تھا اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد بھی اس کی قسمت میں پیٹرول اور ڈیزل کی کالک ہی لکھی تھی تو بہتر تھا کہ وہ ان پڑھ ہی رہتا، دل میں کچھ بننے کا خواب تو نہ پیدا ہوتا۔

''لگتا ہے اس ورکشاپ میں آپ دونوں کے راز و نیاز کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں؟'' عدیل ان دونوں کے قریب چلا آیا تھا۔

''غلط فہمیاں بھی تو ہم دونوں پہ زیادہ ہیں۔'' چھوٹے نے گردن اکڑا کے کہا۔

''ارے گردن ذرا ڈھیلی رکھا کر ٹوٹ جائے گی، سوکھے سڑے تیلے کی طرح تو ہے۔'' باؤ امتیاز نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مار کر کہا اور عدیل اپنی مسکراہٹ روکنے میں کامیاب ہوا تھا تبھی چھوٹے کا منہ بن گیا۔

''دیکھ استاد کام وام اپنی جگہ اور عزت بے عزتی اپنی جگہ، میں اپنی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتا بتا رہا ہوں تجھے۔'' چھوٹے نے اپنے استاد کو دھمکی دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جا ڈھابے سے چائے لے کر آ۔'' باؤ امتیاز لاپروائی سے بولا۔

''جاتا ہوں، جاتا ہوں، پہلے ڈھابے والے کا پہلا کھاتہ تو صاف کرو، دو سو دس روپیہ دینا ہے اس کا، روز جاتا ہوں تو وہ عیسوں کا پوچھنے لگتا ہے، کل بھی پوچھ رہا تھا۔'' چھوٹا اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا لیکن جانے سے پہلے باؤ امتیاز کے ساتھ تک مکا کرنا چاہتا تھا۔

''ارے تمہیں اکل تو میں خود گیا تھا؟''

باؤ امتیاز نے اسے کوسا اور چھوٹا پہلے چونکا پھر کھسیا گیا، واقعی غلطی ہو چکی تھی۔

''نہیں نہیں استاد میں شام کی نہیں دن کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے بات سنبھالی۔

''اچھا تو تُو پھر اکیلا جائے پینے گیا ہو گا؟'' باؤ امتیاز نے تیور بدلے تو چھوٹے کو لائن پہ آنا پڑا۔

''ارے استاد کل نہیں پرسوں دن کی بات۔''

''جاتا ہے یا ماروں کچھ؟'' باؤ امتیاز نے گھورتے ہوئے جھک کر قریب پڑی لوہے کی ہتھوڑی اُٹھالی اور چھوٹا ورکشاپ سے گھدے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا اب کی بار عدیل ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

"آپ نے سچ ہی کہا تھا کمال کا پرزہ ہے بھی....." عدیل اس کی باتوں اور حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اسی لیے تو کہا تھا کہ اسی کے دم سے رونق ہے۔" باؤ امتیاز مسکرا دیے۔

"واقعی اس میں کوئی شک نہیں۔" عدیل کو ان سے اتفاق تھا۔

"چلو اللہ خیر رکھے تم بھی رفتہ رفتہ سب سے واقف ہو جاؤ گے، آج کا دن بھی آخر ختم ہو ہی گیا، یہ لو تمہاری پہلی دیہاڑی۔" باؤ امتیاز نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اس کی سمت بڑھائے، پہلی کمائی کی صورت میں۔

"دیہاڑی؟ لیکن میں نے تو آج کا پورا دن کوئی کام ہی نہیں کیا؟" عدیل نے تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔

"بے شک نہیں کیا، لیکن آج کے دن سے تم اب اس ورکشاپ میں شامل ہو چکے ہو، تمہارا حصہ بھی سب کے ساتھ ہی بنتا۔" انہوں نے انصاف سے کام لیا۔

"لیکن چاچا۔" عدیل متذبذب تھا۔

"ارے چھوڑ یار! آج پہلا دن ہے، خالی ہاتھ گھر جائے گا تو گھر والے کیا سوچیں گے؟ تو ایسا کر آج ان پیسوں سے گھر والوں کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے جا۔" باؤ امتیاز نے زبردستی وہ پیسے اس کی جیب میں ڈال دیے۔

"اور ہاں آئندہ کام کرے گا تو دیہاڑی ملے گی ورنہ ایسی عیاشی روز روز نہیں ہو گی۔" انہوں نے اسے ساتھ ساتھ آگاہ بھی ضروری سمجھا تھا جس پہ عدیل ممنونیت سے مسکرا دیا تھا اتنے میں سلو اور بیجی بھی پاس آ گئے اور چھوٹا بھی چائے لے کر آ گیا تھا۔

♥

"بھائی....."

"ہوں؟"

"آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کون سا جھوٹ؟" وہ انجان بنا۔

"جاب والا۔" مریم اس کے کپڑے نکالتے ہوئے آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔

"جاب والا؟ کیا مطلب؟" عدیل نظریں چرائے ہوئے بات کر رہا تھا۔

"ارے یار جب ملی ہے تو سب کچھ لے کر آیا ہوں نا؟"

"میں مانتی ہوں آپ کو جاب ملی ہے لیکن وہ نہیں ملی جو آپ نے ابا جی اور امی کو بتائی ہے۔" عدیل کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ گھر کی ضرورت کی اشیاء لے کر گھر میں داخل ہوا تو سبھی بہت خوش ہوئے تھے انہوں نے فوراً اس کے کام کی نوعیت پوچھی تھی تو وہ اپنی نوکری کی بابت بتاتے ہوئے کترا گیا تھا اس لیے جھوٹ بول دیا کہ ایک کمپنی میں ملازمت ملی ہے لیکن محدود مدت کے لیے اور اس وقت اس کے گھر والوں کے لیے محدود مدت بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ چار دن تو اچھے گزر ہی جاتے۔ لیکن مریم اس کے جھوٹ سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"تو پھر کون سی ملی ہے؟" عدیل اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے گھور کے بولا

"یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں، مجھے الہام تو نہیں ہو گا نا؟"

"جب اتنا بڑا شک ظاہر کر رہی ہو یہ بھی تو کسی الہام کی بنا پر ہی کر رہی ہو نا؟"

"نہیں بھائی یہ شک نہیں یہ میرا یقین ہے۔" مریم الماری بند کر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا کرو گی شک اور یقین کو الگ کر کے؟"

"دھوکے کی خوشی سے بچ جاؤں گی، جو آپ نے امی، ابا کو دی ہے، محض ایک جھوٹی خوشی....." مریم تلخی سے بولی۔

"لیکن یار مجھے کام تو مل ہی گیا ہے نا؟ اب اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟" عدیل نے اسے بہلانا چاہا۔

"لیکن کام کا پتا تو چلے؟"

"مریم!" عدیل نے خفگی سے کہا۔

"آپ مجھے بتا دیں میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ بھٹکنے والی نہیں تھی۔
"کل صبح جانے سے پہلے بتا دوں گا۔"
"نہیں ابھی بتائیں۔" مریم کے انداز میں بچوں کی سی ضد تھی۔
"کیا اپنے تک رکھو گی؟"
"ہاں ..." اس نے سر ہلایا۔
"وہ دراصل مجھے ورکشاپ میں کام ملا ہے۔" عدیل رُخ موڑتے ہوئے بولا وہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں دکھانا چاہتا تھا۔
"ورکشاپ؟" مریم کی نظروں میں پورا کمرا چکرا کے رہ گیا تھا اس کا اتنا لائق فائق بھائی کسی اچھی سیٹ پہ کام کرنے کے بجائے ورکشاپ میں کام کرے گا؟
"آہستہ بولو، امی نے سن لیا تو پریشان ہو جائیں گی۔"
"لیکن بھائی ..." مریم نے کچھ کہنا چاہا۔
"نہیں مریم! شکری ست کرو ہمارے لیے یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے، اللہ کا احسان ہے ہم پہ۔" عدیل نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا تھا اور خود نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا مگر مریم ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی اس کی نظروں میں عام ورکشاپوں کے مناظر گھوم گئے جہاں کوئی بھی کام کرنے والا اپنی اصلی حالت میں نہیں ملتا تھا جہاں ہر وقت ٹھوکا ٹھا کی کی آوازیں اور گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔

♥

تمہیں دل کی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آ کر تو دیکھو
تڑپنے پہ میرے نہ پھر تم ہنسو گے
کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو
وفاؤں کی ہم سے توقع نہیں ہے
مگر ایک بار آزما کر تو دیکھو

کمرے میں نصرت فتح علی خان کی آواز، کمرے کے ماحول کو خاصا سوز بخش رہی تھی اور اس سوز کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی زری اپنی سوچوں اور اپنے خوابوں کے ہمراہ کہیں سے کہیں پہنچی ہوئی تھی اس کی روح پہ کسی کی یاد کی مہک طاری تھی اور وہ اس مہک سے گھبراتی ہوئی بوجھل ماحول سے دور ہوتی چلی گئی تھی وہ کبھی کبھی فرصت سے اسے دل کے تخت پہ بٹھا کر خود اس کے سامنے اس کے قدموں میں بیٹھی تو اسے دیکھتے دیکھتے وہ عالم بھول جاتی تھی اور اس وقت بھی اس کا یہی حال تھا وہ راکنگ چیئر پہ بیٹھی آنکھیں بند کیے تصور کا جہان آباد کیے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا، جہاں وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ شرم و حیا سے مغلوب اس سے تھوڑا ہٹ کے چل رہی تھی اور لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اٹھی چال چلتے ہیں یہ دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے

اس کی بند آنکھوں اور مسکراتے لبوں نے نگارش کو شعر کہنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ زری چونک کر سیدھی ہوئی تھی اور سامنے نگارش کو دیکھ کر وہ جھنجلا سی گئی۔
"بھائی۔" اس کا لفظ بھی جھنجلایا ہوا تھا
"جی میری جان؟" نگارش نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔
"اف! کیا آپ کو بھی آج تھا؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔
"کیوں؟ کیا تم ریہرسل میں مصروف تھیں؟" نگارش کی بات پہ اس کا چہرا سرخ پڑ گیا۔

"پلیز! بھابی کچھ تو خیال کریں۔" وہ بیش ہوئی لگ رہی تھی۔
"کیسا خیال؟"
"میرے رومینس کا۔" وہ بھی شرارت سے بولی تو نگارش کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔
"ویسے یہ تو بتاؤ رومینس تم کر رہی تھیں؟ یا وہ کر رہا تھا؟" نگارش نے اسے مزید چھیڑا۔
"بھابی۔" زری نے اسے کشن دے مارا تھا اور نگارش ہنستے ہنستے بیڈ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔
"ویسے یار میں تمہیں ایک بات بتانے آئی تھی۔" نگارش نے تجسس پھیلایا۔
"کیا؟" زری کے انداز میں فطری بے ساختگی تھی۔
"عبداللہ اس سے نیٹ پہ بات کر رہے ہیں۔ اپنے بیڈ روم میں بیٹھا ہے، بہت چارمنگ لگ رہا ہے، چلو تمہیں دکھاؤں۔" نگارش نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اٹھنے کا کہا۔
"کون چارمنگ لگ رہا ہے؟" زری نے ناسمجھی سے پوچھا۔
"محترمہ آپ کے دل آور شاہ صاحب اور کون بھلا؟" نگارش نے گھورا زری اس کے اس طرح نام لینے پہ گھبرا گئی تھی۔
"پلیز آہستہ تو بولیے۔"
"اچھا چلو تمہیں دکھاتی ہوں۔" نگارش نے پھر اس کا ہاتھ کھینچا۔
"نہیں نہیں میں نہیں جا سکتی۔"
"کیوں؟ تم کیوں نہیں جا سکتیں؟"
"بس اچھا نہیں لگتا اس طرح۔"
"لیکن یار تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے؟"
"برائی کچھ نہیں ہے لیکن میرے جانے سے وہ بڑی جلدی کیمرہ آف کر دے گا۔"
"تو کر دے، کم از کم تم دیکھ تو لو گی؟"
"دیکھنے کو چھوڑیں آپ ہی بتا دیں کہ کیسا لگ رہا ہے؟" زری دلچسپی سے بولی۔
"جیسا ہمیشہ لگتا ہے۔"
"کیا کر رہا ہے؟"
"چائے پی رہا ہے۔" نگارش خفگی سے بول رہی تھی۔
"چائے کے بعد یقیناً سگریٹ پیئے گا۔" زری کو اس کی عادت کا پتا تھا وہ اس کی اک اک حرکت بڑے غور سے نوٹ کرتی تھی۔
"ظاہر ہے، یہ تینوں دوست سگریٹ بہت پیتے ہیں، کئی بار عبداللہ سے کہہ چکی ہوں پلیز اسموکنگ ختم کر دیں لیکن وہ نہیں ہیں کہتے ہیں جس روز باقی دونوں نے بھی ختم کر دی اس دن میں بھی کر دوں گا۔" زری والی خفگی کا رُخ عبداللہ کی طرف مڑ چکا تھا۔
"تو آپ باقی دونوں سے کہہ دیں کہ وہ اسموکنگ ختم کر دیں۔" زری نے اسے چھیڑتے ہوئے آئیڈیا دیا۔
"ہاں..... ہاں اڑا لو مذاق جب تمہاری شادی ہو گی تو پھر پوچھوں گی تم سے کہ شوہر کی اسموکنگ کرنے کی عادت سے ہوتی ہے۔" نگارش نے گھورتے ہوئے کہا تھا۔
"مجھے اپنے شوہر کی کسی بھی عادت سے چڑ نہیں ہو گی کیونکہ اس کی تمام عادتیں مجھے پسند ہیں، میرے دل پہ لکھی ہوئی۔" زری نے مسرور سے انداز میں جواب دیا۔
"ماشاء اللہ، شادی سے پہلے میں بھی یہی کہتی تھی۔" اب مذاق اڑانے کی باری نگارش کی تھی۔
"آپ..... آپ ہیں اور میں..... میں ہوں۔" زری کو اپنی محبت پہ یقین تھا لیکن نگارش پھر بھی متفق ہونے والی نہیں کیونکہ اسے پتا تھا کہ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے کتنے ضدی اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ اک دوسرے کی مانا گناہ سمجھتے ہیں۔

"چلو دعوت آنے پہ دیکھیں گے۔" نگارش نے چیلنج کیا تھا۔

"ان شاء اللہ۔" زری نے مسکرا کر کہا۔

"نگارش؟" اچانک عبداللہ قبلت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

"جی؟" وہ دونوں متوجہ ہوئیں۔

"زری تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" عبداللہ کے کہنے پہ نگارش نے زری کو دیکھا وہ فوراً نظر جھکا گئی۔

"جی آ رہی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور ہاں زری تم میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ۔" عبداللہ نے جاتے جاتے کام بھی کہہ دیا اور زری بُری طرح ٹھٹک گئی تھی وہ جس کام سے کترا رہی تھی وہی کام سامنے آ گیا تھا مجبوراً اُٹھنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا لیکن اس نے اُٹھنے کے ساتھ ساتھ حل بھی سوچ لیا تھا۔ سو بڑے سکون اور اطمینان سے چائے بنانے آ گئی تھی۔ اس نے تین کپ چائے بنائی۔ نگارش اور عبداللہ کے لیے اور کپ ٹرے میں رکھ کر ان کے کمرے تک آئی اور دروازے پہ دستک دی۔

"آ جاؤ زری۔" عبداللہ کی آواز میں لاپرواہی تھی لیکن زری کو اپنی بے اختیاری پہ کوئی اختیار نہیں تھا اس لیے وہ اندر نہیں جانا چاہتی تھی اسے یہ تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے باتی سب کچھ فراموش کر بیٹھے گی اور اس کی نظروں کی محویت یقیناً گڑبڑ کر سکتی تھی۔ لہٰذا احتیاط ہی بہتر تھی۔

"سائی پائے سے لے لیں، میں نیچے چولہا کھلا چھوڑ آئی ہوں میں نے نیچے جانا ہے۔" اس نے سوچا ہوا بہانہ گھڑا۔

"چولہا کیوں کھلا چھوڑ دیا۔" عبداللہ دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

"بھوک لگ رہی تھی، کباب تلنے لگی ہوں۔" اس نے ٹرے عبداللہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے واپس بھاگنے کی سوچی۔

"تم اگر مجھے بھی دے جاتیں۔" عبداللہ نے پیچھے سے آواز دی اور زری ٹھٹک گئی۔

"میں اب کباب تلنے پڑیں گے؟" زری کا جھوٹ اس کے اپنے ہی گلے پڑ گیا تھا وہ منہ بناتی فریج سے کباب نکال کر چولہا جلانے لگی۔ رات کے بارہ بجے وہ اپنے جھوٹ کے ہاتھوں مجبور کچن میں کھڑی کباب تل رہی تھی۔

♥

بچے کے کمرے میں اتنی خاموشی اور اتنا سناٹا تھا کہ اس کی سانسوں کا ارتعاش بھی شور نما لگ رہا تھا۔ وہ تکیے پہ سر رکھے اوندھے منہ لیٹا دنیا و جہاں سے بے خبر گہری نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑا تھا، پورے کمرے میں پھیلا ہوا ایسا تھا کہ یوں لگ رہا تھا مہینہ بھر بروزکہ صفائی ستھرائی ہوگی تو یہ پھیلاوا سمٹے گا۔ سگریٹ کے ٹکڑے، شراب کی خالی بوتلیں، جوس اور کولڈ ڈرنک کے خالی کین، استعمال شدہ ٹشو، چائنیز پیکنگ ہوئی ہی ڈبیا، کشنز اور تکیے اور ایسی ہی اور بھی بے شمار اشیاء تھیں جن کو دیکھ کر دماغ گھوم کے رہ جاتا لیکن وہ اس سب کے باوجود اتنے پھیلاوے میں بھی سکون کی نیند سو رہا تھا اور اس کی اس نیند اور سکون میں خلل اس کی ماما نے ڈالا تھا۔

تکیے کے نیچے رکھے موبائل کی وائبریشن اتنی تیز تھی کہ نیند کے باوجود وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا تھا اور پھر اس سارے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چند سیکنڈ غور کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے دوست سائم کے فلیٹ پہ ہے اور رات سے یہیں پہ ہے آج تو وہ رات کو بھی حویلی نہیں گیا تھا اور حویلی کا خیال آتے ہی وہ تھوڑا محتاط ہو گیا تھا اس نے لپک کے تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکال لیا۔

"ہیلو۔" اس نے کال اٹینڈ کی۔

"جودت؟" ان کے لہجے کا غصہ اور کاٹ وہ بآسانی محسوس کر رہا تھا۔

"یس ماما؟" وہ آہستگی سے بولا۔ اور دوسری طرف ثروت بیگم اس کی نیند سے بوجھل آواز کو فوراً بھانپ گئیں وہ ابھی سو کر اُٹھا ہے۔

"رات سے کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟" ان کا نرمی سے عاری لہجہ جودت کو بہت جلد نیند کے شکنجے سے نکال کر اس کے آپے میں بہت دھرم اور ناپسندیدہ انداز میں لے گیا تھا۔

"آپ اتنی فکرمند کیوں ہو رہی ہیں؟ جہاں بھی ہوں زندہ ہوں۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا دوبارہ بیڈ پہ لیٹ گیا تھا۔

"مجھے بھی پتا ہے زندہ ہو، اسی لیے تو کال سن رہے ہو، مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم رات گھر کیوں نہیں آئے؟" بیگم کو احساس تھا کہ وہ دن بہ دن اور زیادہ بگڑتا جا رہا تھا اس کی سرکشی بڑھتی جا رہی تھی اور وجہ یہ تھی کہ حویلی کے مرد حضرات ایسی لغو زانہ حرکات سے بے خبر تھے ابھی تک انہوں نے اس کے آنے جانے کا اور یار دوستوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا وہ تھوڑا آزاد اور بے فکر ہو کر یہ سب کچھ کرتا پھر رہا تھا۔

"وجہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔" اس کی آنکھوں میں رات کے مناظر گھوم گئے۔

"وجہ میں جانتی ہوں۔" وہ چبا کے بولیں۔

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ ماں کی ذہانت پہ چونکا مگر پھر سنبھل گیا تھا۔

"تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔" انہوں نے زور دے کر کہا۔

"دیکھو جوجو، شرافت سے گھر آ جاؤ، آذر بھی آنے والا ہے وہ پہلے ہی پریشان ہے صبح سے دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ اگر تمہاری رات بھر کی غیر موجودگی کا پتا چلا تو بہت برا ہوگا۔" ثروت بیگم زیادہ دیر اپنی پریشانی چھپا نہیں سکی تھیں۔

"آذر بھائی پریشان کیوں ہیں؟ اور صبح سے دھکے کس لیے کھا رہے ہیں؟" اس کے لہجے کی لاپروائی ہنوز تھی البتہ اضطراب بھی جھلک سا گیا تھا۔

"کیا تمہیں ابھی تک نہیں پتا چلا؟" ثروت بیگم کو حیرانی ہوئی حالانکہ جانتی بھی تھیں کہ وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔

"کیا مطلب؟ مام آپ بتائیں نا کیا ہوا ہے؟" وہ اُلجھن آمیز انداز سے بولا۔

"آج صبح علیزے کالج جا رہی تھی جب اچانک راستے میں دو موٹر سائیکل سوار آئے اور گاڑی پہ فائرنگ کر کے چلے گئے۔"

"ہیں؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" جوجو یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں، خیرو بابا ہسپتال میں ہیں ان کو گولی لگی ہے، زندگی اور موت سے لڑ رہے ہیں، علیزے ابھی تک شدید خوف کے مارے رو رہے اور چلائے جا رہی ہے وہ بھی کافی بے حال ہو چکی ہے۔ آذر پولیس اور پریس والوں کی طرف بھاگ کر رہا ہے احمد اور دانیال وغیرہ بھی ہسپتال میں ہیں خیرو بابا کے پاس، عون، حدید اور زین وغیرہ تو ہیں ہی چھوٹے وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ اور ایک تم ہو جس کو کچھ خبر ہی نہیں ہے، جس کی لاپروائیاں خود ایک مصیبت بن چکی ہیں۔" ثروت بیگم کی بات پہ جوجو کو اندر ان لوگوں کی پریشانیاں اور اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تھا وہ حقیقتاً گھر اور گھر والوں سے بے خبر اور لاتعلق رہنے لگا تھا۔

"خیرو بابا کس ہسپتال میں ہیں؟" جوجو نے تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا اس کا رُخ باتھ روم کی طرف تھا وہ شاور لینا تھا۔

"تم ہسپتال جانے کے بجائے گھر آؤ۔"

"کیوں؟" اس نے اچنبھے سے دیکھا۔

"کیونکہ گھر پہ کوئی نہیں ہے صرف تمہارے ڈیڈ اور ڈیڈی وغیرہ ہیں، ہو سکتا ہے کوئی کام ہی پڑ جائے؟ کسی لڑکے کا ہونا ضروری ہے۔" ثروت بیگم نے اسے سمجھایا اور کچھ دیر کے لیے تو وہ واقعی سمجھ بھی گیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں گھر ہی آ رہا ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

لیکن ان کی کال بند ہو جانے کے بعد بھی اس کا ذہن ان کی باتوں کے گرد ہی چکر اتا رہا تھا وہ بڑے اُلجھن بھرے انداز میں علیزے پہ ہونے والی فائرنگ کے متعلق سوچتا، شاور لے کر تیار ہوا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔

"ارے کہاں جا رہے ہو؟" سامنے سے آتے سائم نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

"حویلی۔"

"لیکن کیوں؟ تم تو کہہ رہے تھے آج بھی یہیں رُکو گے؟" سائم نے آج رات کے لیے بھی کافی بندوبست کر رکھے تھے لیے شنگر ہو رہا تھا۔

"نہیں یار ایک پرابلم ہو گیا ہے گھر جانا ضروری ہے۔" جوجو کو اس وقت کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔

"کیا مطلب؟ کیسی پرابلم؟" سائم چونکا۔

"ابھی تو مجھے خود بھی ٹھیک سے نہیں پتا بس مام کی کال آئی تھی۔" جودت نے چابی نکال کر سائم کے حوالے کی۔

"تو وہ تمہارا ارجنٹ والا پروگرام؟"

"پارٹیسپل کردو۔" جودت جھنجلا کر بولا اور پھر سائم کو ایک طرف ہٹا کر خود سیڑھیاں اُتر گیا تھا وہ کسی چیز کا نوٹس نہ لیتا تو کبھی نہ لیتا لیکن اگر لے لیتا تھا تو پھر پوری طرح سے انوالو ہو کر نوٹس لیتا تھا عام طور پہ وہ بھی حویلی والوں کی کوئی فکر اور قدر نہیں کرتا تھا لیکن کچھ رشتے ایسے تھے کہ جن سے وہ حقیقتاً انسیت رکھتا تھا اور ان کی عزت اور قدر کرتا تھا اس کی کزنز کومل اور علیزے بھی انہی رشتوں میں شمار ہوتی تھیں لہٰذا علیزے کی پریشانی پہ پریشان ہونا اس کے دل کی بے اختیاری حرکت تھی۔

وہ گھر پہنچا تو سب سے پہلے علیزے سے ملنے ہی گیا تھا مگر وہ سو رہی تھی سو مجبوراً نیچے ڈرائنگ روم میں چلا آیا جہاں باقی سب بھی بیٹھے ہوئے تھے اپنی اُلجھن اور پریشانی میں کسی نے بھی اس کی آمد پہ دھیان نہیں دیا لیکن اسرار آفندی کے برابر بیٹھی ثروت بیگم کی ملامتی نظریں اسی پہ تھیں وہ کھسیا کر ان سے نظریں چراتا کومل سے ساری تفصیل پوچھنے لگا جس پہ اسرار آفندی نے ان سب کو ڈرائنگ روم سے باہر بھیج دیا تھا۔

♥

آذر کی سخت ہدایت تھی کہ اس معاملے کو اخبارات اور نیوز چینلز سے دور رکھا جائے، تاکہ لوگوں کو کریدنے اور انگلی اُٹھانے کا موقع نہ ملے اور شہر کی کلب کے مشہور و معروف بزنس مین وقار آفندی کی بیٹی علیزے آفندی کا نام غلط انداز سے نہ لیا جائے۔ اور اسی لیے دو صبح سے ہزاروں پگیوں پہ ادھر سے اُدھر بھاگ دوڑ کرتا پھر رہا تھا کبھی خیرو بابا کے پاس ہاسپٹل جاتا، کبھی پولیس اسٹیشن، کبھی پریس والوں کے دفتر اور کبھی کہیں..... اسی چکر میں صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی تھی اس نے اس ایک دن میں لاکھوں روپے بھی خرچ کر دیے تھے صرف اس لیے کہ یہ معاملہ اور کسی کے علم میں نہ آئے۔

ایسے معاملوں میں لوگوں کے منہ صرف پیسے دے کر ہی بند کیے جاتے تھے سو اس نے یہ منہ پوری تسلی سے بند کیے تھے ہاسپٹل سے لے کر پولیس اسٹیشن اور پریس والوں تک اس نے پیسے کے لڈو بانٹ دیے تھے اور پیسے کے لڈو کھانے کے بعد کوئی بھی بولنے کے قابل نہیں تھا اور وہ خود مطمئن ہو کر گھر جانے کے ہسپتال سے نکلا تھا۔ خیرو بابا کے پاس دانیال اور احمد کو چھوڑ دیا تھا تاکہ خیرو بابا کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ لوگ بروقت پہنچا دیں۔ آذر کا دھیان ڈرائیونگ کے دوران بھی اسی مسئلے کی طرف تھا اس کے ذہن میں صبح سے کئی سوال مچل رہے تھے اور ان سوالوں کے جواب صرف ڈیڈ اور علیزے کے پاس تھے اسی لیے وہ یہ سوال ذرا فرصت سے کرنا چاہتا تھا مگر تسلی بخش جواب لے سکتا کیونکہ ان سوالوں کے جواب وہ فون پہ نہیں لینا چاہتا تھا بلکہ روبرو پوچھنا چاہتا تھا۔

رات کے بارہ بجے کا ٹائم تھا جب اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی تھی، اس وقت بھی تقریباً سب ہی افراد جاگ رہے تھے سب ہی کو آذر کا ہی انتظار تھا خصوصاً وقار آفندی کو۔

"السلام علیکم۔" اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے موجود افراد پہ طائرانہ سی نگاہ دوڑائی۔

"وعلیکم السلام۔" وقار آفندی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے قریب چلے آئے تھے۔

"ڈیڈ جانو، تم ٹھیک تو ہو؟" وہ اس کے چہرے کی تھکن بھانپتے ہوئے بولے۔

"یس لوکے ڈیڈ میں ٹھیک ہوں۔" وہ ان کے ساتھ آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"بھوک لگی ہے تو کھانا نکلواؤں؟" ثروت بیگم بیٹے کے لیے فکرمند ہو رہی تھیں۔

"نہیں ابھی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"چائے لو گے؟"

"نہیں کھانے کے بعد لے لوں گا، ابھی کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے دوبارہ انکار کر دیا۔

"خیرو بابا؟ کیسے ہیں؟ کچھ ہوش آیا؟" آسیہ آفندی بھی خاصی پریشان تھیں۔

"ہاں پہلے سے ٹھیک ہیں وہ، لیکن دوائیوں کی وجہ سے غنودگی چھائی ہوئی ہے، ان شاء اللہ صبح تک مکمل ہوش میں آ جائیں گے۔" اس نے ان کو تسلی دی وہ ویسے بھی ملازموں کی بہت کیئر کرتی تھیں۔

''شکرانے کے نفل پڑھوں گی جب وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' آسیہ آفندی نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ وہ صبح سے خیرو بابا کے لیے متفکر تھیں اور دانیال وغیرہ سے کئی بار ان کی خیریت پوچھ چکی تھیں۔

''ہوں اچھی بات ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''آسیہ! تم علیزے کے پاس جاؤ اسے کچھ کھانا وغیرہ دو۔'' وقار آفندی نے ان دونوں خواتین کو وہاں سے جانے کا اشارہ دیا تھا وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ آذر کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کچھ سراغ ملا؟'' ان کا انداز متجسس تھا۔

''ڈیڈ سراغ تو سراغ ملتا ہے اور یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' آذر تلخی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ بس دو لوگ موٹر سائیکل پہ آئے اور علیزے کی گاڑی پہ اندھا دھند فائرنگ کر کے بھاگ گئے، ان دونوں نے نہیں دیکھا کیونکہ دونوں کے چہروں پہ رومال بندھے ہوئے تھے، وہ کس طرف سے آئے اور کس طرف چلے گئے؟ کچھ پتا نہیں ان کی موٹر سائیکل کا نمبر وغیرہ کیا تھا؟ کچھ پتا نہیں۔ وہ خود ہمارے دشمن تھے یا محض کرائے کے غنڈے تھے؟ یہ بھی پتا نہیں۔ جب ہمیں کچھ بھی پتا نہیں تو سرا کیسے ملے گا؟'' آذر بے بسی سے لفظ چبا کر بات کر رہا تھا۔ لیکن کچھ یاد آنے پر ٹھٹک گیا۔

''ڈیڈ آپ کا سیل کہاں ہے؟''

''کیوں؟'' وقار آفندی چونکے۔

''بس کچھ یاد آ گیا ہے۔'' آذر کے انداز میں بے چینی در آئی۔

''یہ لو.....'' انہوں نے صوفے کی سائیڈ پہ رکھی چھوٹی کرسٹل ٹیبل سے سیل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ آذر نے تیز ریسیوڈ کالز کا ریکارڈ چیک کیا۔

''صبح جس نمبر سے آپ کو کال آئی تھی کیا وہ لینڈ لائن نمبر تھا؟'' آذر ایک نمبر پہ ٹھہرتے ہوئے بولا وہ کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔

''ہاں..... لینڈ لائن نمبر تھا۔'' انہوں نے یاد کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''اس آدمی نے آپ سے کیا کہا؟'' آذر کے سوال پہ وہ چونک گئے اس سوال کا جواب ذرا مشکل تھا ان کے چہرے کی سرخی پڑ گئی۔

''ڈیڈ پلیز کھل کے بتایئے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ان کی ہمت بندھائی اور مجبوراً وقار آفندی پڑا نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ آدمی ان کی بیٹی کے لیے اتنی ہتک اور حقارت سے بات کر رہا تھا کہ اس کو دوبارہ سوچتے ہوئے آفندی کے سینے میں آگ لگ گئی تھی۔ اور اس کو سن کر آذر کا چہرہ بھی لال ہو گیا تھا۔

''آپ کے خیال میں یہ آدمی کون ہو سکتا ہے؟''

''کیا آج کل بزنس میں ہماری کسی سے ان بن چل رہی ہے؟'' اس نے وقار آفندی، اسرار آفندی اور اظہار آفندی ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اسرار آفندی نے نفی میں گردن ہلائی۔

''آپ لوگ ایک بار پھر سارے معاملات کو غور اور دھیان سے سوچ لیں کبھی کسی سے کوئی جھڑپ، کوئی جھگڑا، کوئی میں یا پھر کوئی ناانصافی ہوئی ہو؟'' آذر نے ان کو اپنا اپنا حافظہ کھنگالنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ لوگ آذر کی بات پہ چونک گئے

''ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کسی پرانی رنجش کی بنا پر ایسا ہوا ہو؟'' آذر ہر پہلو پہ سوچ رہا تھا۔

''لیکن بیٹا تم جانتے تو ہو کہ ہماری تو کسی سے کوئی دشمنی، کوئی مخالفت بھی نہیں ہے، سب کچھ تمہارے سامنے ہی

وقار آفندی الجھ گئے تھے۔

''لیکن ڈیڈ بغیر وجہ کے کوئی ایسا کیوں کرے گا؟'' آذر کے سوال بھی الجھے ہوئے تھے۔

''بیٹا صبح سے ہم لوگ بھی تو ''وجہ'' ہی سوچ رہے ہیں نا؟ آخر کسی نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے پیچھے کوئی مقصد مقصد بتائے۔'' اسرار آفندی بھی پُرسوچ اور متفکر سے انداز میں بولے تھے۔

"تم اس نمبر کا پتا کرواؤ یہ نمبر کس کا ہے؟" اظہار آفندی نے سیل کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تو میں صبح ہوتے ہی کرواؤں گا لیکن مجھے یقین ہے یہ نمبر کسی کا ذاتی نمبر نہیں ہے کوئی اپنے گھر کے نمبر سے ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا یقیناً یہ نمبر کسی پی سی او یا پھر کسی پبلک پلیس کا ہوگا۔" وہ بہت زیادہ سوچ بچار سے کام لے رہا تھا وہ لوگ بھی اس کی بات سے متفق تھے۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"سوچتے ہیں کچھ کہ کیا کرنا ہے؟" آذر نے سر ہلایا اور پھر وقار آفندی کی طرف متوجہ ہوا۔

"علیزے کہاں ہے؟"

"اپنے بیڈ روم میں، کیوں؟"

"میں نے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"لیکن وہ تمہارے سوالوں کے جواب نہیں دے پائے گی۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔" وقار آفندی نے فکرمندی سے کہا وہ علیزے کے معاملے میں ماؤں سے زیادہ حساس ہو جاتے تھے ہر لمحہ اس کی فکر میں بتلا رہتے تھے۔

"میں اسے اپ سیٹ نہیں ہونے دوں گا۔" آذر کو پتا تھا کہ وہ علیزے کو ہینڈل کر لیتا ہے اور وہ اس سے ساری بات بآسانی پوچھ لے گا۔

"ٹھیک ہے تم مناسب سمجھو۔" انہوں نے اجازت دے دی۔

"آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" آذر نے انہیں تسلی دی۔

"ان شاء اللہ۔" انہوں نے دل سے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ آذر وہاں سے اُٹھ کر علیزے کے بیڈ روم میں جاتا وقار آفندی کے سیل پہ میسج ٹون بجی آذر صوفے سے اُٹھتے اُٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا تھا اور وقار آفندی کے بجائے سیل بھی اسی نے اُٹھایا تھا اور پھر میسج اوپن کیا۔

"وقار آفندی میری ایک بھلک تم آج صبح دیکھ چکے ہو اور دوسری جھلک تم کل صبح دیکھو گے، انتظار میں رہنا۔" میسج پڑھتے ہی آذر کے چہرے پہ تناؤ آ گیا تھا اس کے لب بھنچ گئے تھے اس نے فوری اسی نمبر پہ کال ملائی لیکن دوسری طرف وہ نمبر آف جا رہا تھا۔

"آذر کیا بات ہے؟ کس کا میسج ہے؟" اسرار آفندی بیٹے کے چہرے پہ پریشانی کے سائے دیکھ چکے تھے۔

"کچھ نہیں، آپ لوگ آرام کریں۔" وہ میسج ڈیلیٹ کر کے وہاں سے نکل گیا اور پیچھے وہ تینوں بھائی دیکھتے رہ گئے تھے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی پریشانی والی بات ہے۔ لیکن کیا.....؟

♥

منصور حسین ہر بات سے بے نیاز اور بے خبر صبح ہی صبح حویلی کے گیٹ پہ پہنچ گیا تھا حویلی کا چوکیدار عارف اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور پریشان بھی۔

"کیسے ہو منصور حسین؟" اس نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جیسا نظر آ رہا ہوں۔"

"ماشاء اللہ نظر تو ٹھیک آ رہے ہو، صحت بھی اچھی خاصی ہے۔" عارف نے اسے سرتاپا جانچا۔

"پیدائشی صحت مند ہوں، اِدھر اُدھر سے کھا کر صحت مند نہیں ہوا۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"ہاں یہ تو لگ رہا ہے، ورنہ اتنی غربت میں ایسی صحت کہاں رہتی ہے؟" عارف نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"تم یہ بتاؤ مبارک خان کہاں ہے؟" وہ اپنے مطلب کی بات پہ آ گیا۔

"مبارک خان تو حویلی میں ہی ہے لیکن تمہیں آج تو نہ تو مبارک خان ملے گا اور نہ ہی کوئی کام دام۔" عارف مایوسی سے بولا۔

"کیوں حویلی کے اندر کوئی آفت آ گئی ہے کیا؟" منصور حسین جل کے بولا تھا۔

"ارے یار آفت ہی سمجھو۔" عارف افسوس کا اظہار کر رہا تھا اور منصور حسین چونک گیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" اس کا سوال بے ساختہ تھا۔

"وہ کل علیزے بی بی....." عارف کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا اسے بے دھیانی میں خیال آیا کہ وہ حویلی کا پرسنل معاملہ اجنبی کے گوش گزار کرنے لگا ہے اور یہ خیال آتے ہی اس نے اپنی زبان روک لی تھی۔

"بتاؤ نا کیا ہوا؟ اور علیزے بی بی کون ہے؟" منصور حسین ایک فطری تجسس کے ہاتھوں پوچھ رہا تھا لیکن عارف یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

"کوئی نہیں تم کوئی اور بات کرو۔" عارف کے بات بدلنے پہ منصور حسین کو غصہ آیا مگر اس سے زبردستی تو نہیں پوچھ سکتا تھا سو اسے بھی بات بدلنی ہی پڑی تھی۔

"مبارک خان کو بلاؤ۔" وہ کافی سختی سے بولا تھا مبارک خان سے اس کی اچھی خاصی گپ شپ تھی جبکہ عارف کو اس کے انداز پہ حیرانی ہوئی تھی۔

"وہ ابھی اپنے کام پہ نہیں آیا ہوگا، اپنے کوارٹر میں ہوگا۔"

"تو تم کوارٹر سے بلا لاؤ۔"

"نہیں..... نہیں میں گیٹ خالی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"تمہیں میرے اندر آجانے کا ڈر ہے تو ایسا کرو گیٹ اندر سے بند کر کے چلے جاؤ۔" اس نے ذہانت کا ثبوت دیا۔

"میں نہیں جانے والا، تم چلے جاؤ بعد میں آجانا۔" عارف بیزاری سے بولا۔

"ہونہہ..... جانے والا تو میں بھی نہیں ہوں، جاؤں گا تو مبارک خان سے بات کر کے جاؤں گا، آخر وہ مجھے کس کھاتے میں اتنے لارے لگا کے خوار کر رہا ہے؟" منصور حسین بھی شاید اپنے نام کا ایک ہی تھا اس روز کی طرح آج بھی عارف کی کرسی تھسیٹ کر خود ہی بیٹھ گیا۔

"ارے تُو تو بڑا ڈھیٹ آدمی ہے۔" عارف حیرت سے بولا۔

"اب چپ کر کے بیٹھ جاؤ، ورنہ اپنا ڈھیٹ پن تمہیں دکھا بھی دوں گا۔" منصور حسین مزاج کے لحاظ سے غصے کا تیز لگتا تھا۔ ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں یہی سوچ کر عارف دوسری کرسی لے کر خود بیٹھ گیا۔

"عارف..... آذر صاحب کہاں گئے ہیں؟" مبارک خان کسی کام سے آیا تو سامنے منصور حسین کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"منصور حسین؟" وہ قریب چلا آیا۔

"ہاں منصور حسین ہی ہوں، غور سے دیکھ اور پہچان لو، تمہارے انتظار میں لیلیٰ یا مجنوں تو نہیں بن گیا؟" منصور حسین کا طنز یہ تھا۔

"دیکھو منصور حسین میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں تم بس....."

"تم مجھے ساری بات نہ بتاؤ صرف اتنا بتا دو کہ مجھے کام مل رہا ہے یا نہیں؟" منصور حسین دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"ابھی کیسے بتا دوں؟ کل میں صاحب کے آفس میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ایک مصیبت بن گئی۔ صاحب اسی وقت گھر آگئے اور میں تمہارا فون بھی نہ سن سکا۔" مبارک خان نے صفائی پیش کی۔

"تم فون نہیں سن سکے؟ کل میں پورا ایک گھنٹہ آفس کے باہر انتظار کرتا رہا، پھر تمہارے نمبر پہ کال کر کے تھک گیا مگر تم نے بات ہی نہیں کی، مبارک خان اگر تم نے بھی مجھے اسی طرح ذلیل و خوار کرنا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں کہیں اور جا کر ذلالت اٹھاتا۔" منصور حسین بے بسی سے بولا، عارف اور مبارک خان لمحہ بھر کے لیے چپ سے ہو گئے تھے۔

"دیکھو یار! ایک مسئلہ ہو گیا ہے وہ ٹھنڈا ہو جائے تو ان شاء اللہ تمہیں نوکری ضرور دلا دوں گا۔" مبارک خان نے وعدہ کیا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" آذر کی آواز ان لوگوں کے عقب سے ابھری تھی انہوں نے چونک کر دیکھا وہ جاگنگ پہ گیا ہوا اور ابھی جاگنگ سے ہی واپس آرہا تھا اس وقت وہ جاگرز پہنے ٹریک سوٹ میں ملبوس رات کے مقابلے میں تھوڑا فریش لگ رہا تھا شاید ذہن سے کچھ دیر کے لیے بوجھ اور پریشانی ہٹی ہوئی تھی۔

"صاحب یہ..... یہ منصور حسین ہے، بڑے صاحب سے ملنا چاہتا ہے، پہلے بھی ایک بار مل چکا ہے۔" عارف تیزی سے بولا تھا لیکن آذر کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"یہ کون سا وقت ہے ملنے کا؟"

"صاحب یہ روز آتا ہے لیکن صاحب سے ملاقات نہیں ہو پاتی اس لیے آج صبح صبح آ گیا ہے۔" مبارک خان نے بھی وضاحت دی۔

"اوکے ۔۔۔ ہو کے ہو جائے گی ملاقات، لیکن آج نہیں کچھ دن صبر کرو۔" آذر منصور حسین سے مخاطب ہوا تھا۔

مبارک خان نظر چرا گیا اسے منصور حسین کی مایوس نظروں سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر واپس جانے کے لیے پلٹ گیا تھا۔

"سنو۔" آذر نے آواز دی۔

"جی؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟" آذر نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"صاحب اپنے لیے کام وغیرہ ڈھونڈ رہا ہوں، ان سے کام مانگنے آیا تھا۔"

"اوہ اچھا ۔۔۔ اچھا میں کہتا۔" آذر اس کے جواب سے تھوڑا ریلیکس ہو گیا ورنہ وہ کل والے معاملے کے لیے خاصا مشکوک ہو رہا تھا۔ منصور حسین کے جانے کے بعد وہ لوگ اندر آ گئے لیکن اندر آذر کے لیے ایک اور دھماکہ منتظر تھا۔

♥

بڑے سے ڈائننگ ہال میں سولہ کرسیوں کی طویل ڈائننگ ٹیبل کے بالکل سامنے والی کرسی وقار آفندی کے لیے مخصوص تھی اور روزانہ صبح کے وقت وہ اسی کرسی پہ بیٹھے نیوز پیپر پڑھنے یا پھر ناشتہ کرنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ آج ان کے سامنے ناشتہ بھی رکھا ہوا تھا اور نیوز پیپر بھی، لیکن وہ شدومد تھامے بیٹھے پریشان حال نظر آ رہے تھے۔ دائیں طرف کرسیوں پہ اسرار آفندی اور اظہار آفندی براجمان تھے جبکہ ان کے بالکل مقابل والی کرسیوں پہ ثروت بیگم اور ثمرہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں البتہ آنی (آسیہ آفندی) اس وقت یہاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

آذر اندر قدم رکھتے ہی ماحول کی سنگینی بھانپ گیا تھا کسی انہونی کا احساس اسے ان سب کے چہروں سے ہی ہو چکا تھا وہ لب بھینچے وقار آفندی کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ فرم نے نیوز پیپر پڑھا؟" دانیال پریشانی کے عالم میں نیوز پیپر ہاتھ میں پکڑے غصے تیز قدموں سے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا اور آذر کا انداز اُلجھا ہوا تھا۔

"یہ دیکھیں ۔۔۔" اس نے نیوز پیپر کا ہیڈ لائنز والا پیج آذر کے سامنے کر دیا اور جیسے ہی آذر کی نظر ہیڈ لائن پہ گئی اس کی کنپٹی کی رگیں اُبھر آئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اس کا خون کھول اٹھا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ اخبار والے اس کے ساتھ اس طرح دھوکہ کریں گے، کل اس نے پورا دن اسی بھاگ دوڑ کی نذر کر دیا تھا لیکن حاصل کیا ہوا؟ وہی بدنامی اور رسوائی؟ وہی وقار آفندی کی بیٹی کے نام کا چرچا ۔۔۔ وہی لوگوں کی کریدتی ہوئی سوالیہ نظریں اور چٹخارے؟

"میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے ذلیلوں کو لاکھوں روپے صرف ایک دن میں کھلایا ہے، میں ان پہ کیس کر دوں گا، آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟" آذر دوبارہ نیوز پڑھتے ہوئے بھڑک اٹھا اور پھر نیوز پیپر یونہی ہاتھ میں دبوچے وہ پلٹا اور ڈائننگ ہال سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔

"آذر! آ کر پلیز بات سنو۔" دانیال اس کے پیچھے لپکا۔

"آذر! واپس آؤ۔" اسرار آفندی بھی بیٹے کے پیچھے باہر آئے تھے لیکن وہ ان سے کافی فاصلے پہ تھا۔

"دانیال! روکو اسے۔" انہوں نے دانیال کو اشارہ کیا اب کی بار دانیال بھاگنے کے سے انداز میں اس کے پیچھے آیا تھا۔ آذر اپنی گاڑی کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دانیال نے اسے بیک سے پکڑ کر روک لیا۔

"پلیز دانیال چھوڑو مجھے، مجھے پتا کرنے دو کہ ان پریس والوں نے یہ بے غیرتی کیوں کی ہے؟ ایک حملہ کل ان لوگوں نے کیا تھا اور ایک حملہ آج ان لوگوں نے کیا ہے، انہوں نے ہماری عزت اُچھالی ہے، ہمیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے، انہوں نے غداری کی ہے میرے ساتھ۔" آذر کسی طرح بھڑک رہا تھا یہ خبر اس کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی۔

وہ رات کو مطمئن ہو کر گھر لوٹا تھا کہ ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کی جائے گی لیکن پریس والوں نے تو اس کا سارا اطمینان ہی کرکے رکھ دیا تھا۔

"یہ غداری کروائی گئی ہے میری جان۔" اسرار آفندی کی آواز پہ وہ ان کی طرف پلٹا ان کی بات ہی ایسی تھی۔

"کیا کہا آپ نے؟" وہ ان کو استعجابیہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ غداری کروائی گئی ہے، جس طرح تم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اس خبر کو روکا، اسی طرح اس خبر کو پھیلانے والے نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اس خبر کو پھیلایا ہے۔ تم نے اگر لاکھوں روپے ایک دن میں کھلایا ہے، تو اس نے لاکھوں روپے ایک گھنٹے میں کھلایا ہوگا۔ تو پھر اس چیز سے اندازہ لگا لو کہ مخالف پارٹی کتنی زور پر ہے پھر حیثیت میں ہم سے کم نہیں جہاں ہماری پہنچ ہے وہاں پہنچنا اس کے لیے مشکل نہیں ہے، اور ایسے حالات میں غصے اور جذباتی انداز سے کام لینے کے بجائے عقل اور تحمل سے کام لینا پڑے گا، سوچو، سمجھو، غور و فکر کرو، تب کوئی قدم اٹھاؤ۔" انہوں نے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے ان کی بات تقریباً سمجھ چکا تھا۔

"تم اگر اس طرح مشتعل ہو کر اخبار والوں سے الجھو گے تو سمجھو اپنے آپ کو اور بھی رسوا کرو گے، میڈیا والوں سے مول لینا حکومت کے بس کی بات نہیں، ہم تو پھر ایک عام سے شہری ہیں۔ تم اس معاملے کو سلجھاؤ لیکن ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ۔ ہمیں پتا ہے کہ یہ معاملہ ہماری عزت اور غیرت کا ہے لیکن عزت اور غیرت کے معاملے میں ہمیشہ قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتے ہیں۔ ہمیں تم پہ پورا بھروسہ ہے تم سب حل کر لو گے بس صبر سے چلو، سکون سے رہو۔" انہوں نے اسے ہر طرح سے آگاہ کیا تھا، آذر چپ ہو گیا۔

اس کے ذہن میں رات وقار آفندی کے میل پہ آنے والا میسج پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

"بوجھو..... تو گویا اس نے اپنی دوسری جھلک دکھا ہی دی۔" وہ اخبار دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا وانیال اور اسرار آفندی تھوڑا ناشتہ کرتے ہوئے اندر لے آئے تھے لیکن اس کا ذہن ہنوز الجھا ہوا تھا۔

وہ برٹش لائبریری سے باہر نکلی تو یکدم ٹھنڈ لگی، اچھا خاصا دن، رات میں ڈھل چکا تھا۔ صرف ایک گھنٹے میں موسم کروٹ لے لے گا اسے ہرگز امید نہیں تھی ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ برف بھی گر رہی تھی روش پہ دور تک برف کی تہہ جم چکی تھی درختوں اور گھاس پہ سفید برف کا غبار اُترا ہوا لگ رہا تھا درختوں کے پتے برف کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے بارش اور برف میں دھواں دھواں سا ہوا کا زور بھی شامل ہو جاتا تھا اور پہلے ہی برف کا بوجھ کندھوں پہ اٹھائے زمین کی طرف جھکتے ہوئے درخت ہوا سے لہرا کے رہ جاتے تھے اور ان کا یوں رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر لہرانا ان کی تھکن کا پتا دے رہا تھا اور ان درختوں جیسا حال اس کا بھی تھا۔

وہ اتفاقاً گرم اونی ٹوپی پہنے ہوئے تھی لیکن جیکٹ گاڑی میں ہی رکھی ہوئی تھی، ہاتھوں پہ گلوز بھی نہیں چڑھائے تھے لائبریری کے احاطے سے نکل کر اپنی گاڑی تک جانا اتنی ٹھنڈ میں آسان بھی نہیں تھا لیکن اسے یہ مشکل کام کرنا ہی تھا آخر وہ یہاں کھڑی ٹھٹھر سکتی تھی؟ اس نے اپنے پینٹ کی جیبل پاکٹ میں از سائیل نکال کر اپنے بڑے سلور کلر کے بیگ میں رکھا اور بیگ بند کرنے کے بعد اطمینان سے میدان میں اُتر آئی وہ روش پہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی تقریباً بھاگ رہی تھی اور اس کے جوتے نیچے برف کی تہہ چرمرا رہی تھی وہ بھاگتے بھاگتے بھی اچھی خاصی بھیگ گئی تھی یخ ہوا کے تھپیڑوں اور برف کی بوچھاڑ نے کسی کی طرح اسے اپنے شکنجے میں لے کر اس پہ کپکپی اور لرزا طاری کر دیا تھا گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے بمشکل سرد ہاتھوں سے گاڑی کی چابی نکالی اور لاک کھول کر اندر بیٹھ گئی اس نے بیگ کندھے سے اُتار کر فرنٹ سیٹ پہ پھینکا اور گاڑی کے کیبنٹ سے تولیہ نکالا اپنا چہرہ اور ہاتھ پونچھے پھر ساتھ ہی ہیٹر بھی آن کر دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہوئی تو اس کے سردی سے تنے ہوئے اعصاب نارمل ہوئے تب جا کر اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور گھر کا رُخ کیا تھا۔ آج شام آٹھ بجے ان کی "لندن گیٹ وک" سے پاکستان روانگی تھی اس نے تمام ضروری کام نبٹا لیے تھے لائبریری کا تھوڑا کام رہتا تھا سو آج وہ نبٹانے آ گئی تھی۔ اب اسے کچھ ٹھہر کر، کرنا تھا اس لیے اطمینان سے گھر کی طرف گامزن تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ گھر پہنچی تھی۔ ڈور بیل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر سارے ایریا میں نظر دوڑائی اور پھر طمانیت

کی پرواز کر سیجا کے کانچ پہ آ کر رک گئی۔ وہ چند سیکنڈ یونہی دیکھتی رہی اور ایک لمحے کو سوچا "کیا وہ واقعی سب کچھ چھوڑ کے جا رہی ہے؟ کیا وہ پاکستان جانے کے لیے مان گئی ہے؟ کیا وہ واقعی مشرقی لڑکیوں کی طرح ہتھیار ڈال چکی ہے؟"

"مدیحہ! کیا دیکھ رہی ہو؟" فائزہ بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا وہ آج اپنی آواز اپنے لہجے سے ہی بہت ریلیکس اور پُرسکون محسوس ہو رہی تھیں۔

"کچھ نہیں۔" وہ کہہ کر اندر آ گئی۔

"عبداللہ آیا ہوا ہے، اپنی فیملی کے ساتھ۔" انہوں نے پیچھے سے اسے اطلاع دی، مدیحہ کے قدم ٹھٹک گئے۔

"زری بھی؟"

"ہاں ـــــ زری بھی آئی ہے۔" انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ہوں۔" وہ محض ہوں میں جواب دے کر اوپر آ گئی۔

وہ لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے اس لیے مدیحہ کو نہ دیکھ سکے۔

"کون تھا؟" نبیل نے عبداللہ سے بات کرتے کرتے فائزہ بیگم سے استفسار کیا تھا۔

"مدیحہ ـــــ"

"اچھا آ گئی؟ کہاں ہے اب؟" زری نے فوراً اپنے انداز سے اس کے انتظار کا اظہار کیا تھا۔

"اوپر کچھ پیکنگ کر رہی ہے، بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔" انہوں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا اور دوبارہ آ کر نگارش کے ساتھ بیٹھ گئیں سلسلہ کلام جہاں سے منقطع ہوا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا۔ وہ نگارش کو کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دے رہی تھیں اور نگارش ان کے مشورہ پہ اچھی خاصی متفق تھی وہ بھی آج کل اپنی شادی شدہ لائف کے اسی پہلو پہ سوچ رہی تھی۔

"ہیلو ایوری باڈی، ہاؤ آر یو؟" اس نے خاصی اونچی آواز سے سب کو متوجہ کیا تھا۔

"ہیلو ـــــ تم کیسی ہو؟" نگارش نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور مدیحہ کے گلے مل کر باقاعدہ اس کے رُخسار پہ پیار کیا تھا۔

"نٹ این فائن، آپ سنائیں، آج آپ کو فرصت کیسے مل گئی؟" حیرت کی بات تھی آج مدیحہ کسی سے شکوہ کر رہی تھی۔

"ہمیں تو فرصت مل گئی، لیکن تمہیں تو وہ بھی نہیں ملی۔"

"ایسے نہیں اب ایسی بھی بات نہیں ہے، میرا پکا ارادہ تھا کہ جانے سے پہلے آپ سے مل کر جاؤں گی، آپ نہ بھی آتیں تو میں خود آ جاتی۔"

"ماشاءاللہ تم سے زیادہ کمی تو نگارش ہے، جن کا مدیحہ کو احساس یا قدر تو ہے۔" عبداللہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی کی قدر ہے تو بھائی کی کیوں نہیں ہو گی؟" مدیحہ ان کی چوٹ پہ مسکرائی۔

"سنا ہے اصل سے سود پیارا ہوتا ہے؟" عبداللہ نے توجیہ پیش کی۔

"لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو اصل، اصل ہی ہوتا ہے انسان دونوں چیزوں سے ہاتھ کھینچ سکتا ہے اصل سے اور نہ ہی اصل کے ساتھ ملنے والے سود سے۔" مدیحہ کا کہا بھی سو فیصد درست تھا عبداللہ کو ماننے ہی بنی۔

"پاکستان جانا کیسا لگ رہا ہے؟" عبداللہ کے سوالوں کا رُخ مدیحہ کی طرف تھا اور وہاں موجود باقی افراد بھی انہی کی طرف متوجہ تھے۔

"میرے جواب نہ دینے کو گستاخی میں شمار تو نہیں کیا جائے گا؟" اس کی اور وں کے ساتھ ایسی تمیز، ایسی شائستگی نبیل کو حیرانی اور شک میں ڈال جاتی تھی۔

"جواب نہ دینے کی وجہ؟ عبداللہ نے بھنویں اچکائیں۔

"میں اس طرح سب کے درمیان اپنی فیلنگز کا اظہار کروں گی تو میرے گھر والوں کو گراں گزرے گا۔" وہ بات واضح نہ کر کے بھی کر گئی تھی۔

"اس لو کے ڈیئر ہم سوال بدل دیتے ہیں، تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے بھائی دل آور کے پاس جانا کیسا لگ رہا ہے؟" عبداللہ کے وار سے بچنا اتنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

''اچھا لگ رہا ہے، بہت اچھا۔'' وہ محبت سے مسکرائی۔
''ہوں..... یہ کمی ہے ناکام کی بات۔'' عبداللہ خود بھی مسکرایا تھا بلکہ باقی سب کے چہروں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
''اس سے بات ہوئی؟''
''جی آج صبح ہی ان کی کال آئی تھی۔''
''وہاں جا کر سب سے پہلا کام کیا کرو گی؟''
''شادی.....'' وہ بے ساختہ بولی۔
''کیا؟'' وہ سب ہی چونکے۔
''اپنی نہیں دل آور بھائی کی۔'' اس نے تصحیح کی۔
''اوہ اچھا..... ویسے دل آور صاحب کے ساتھ ساتھ اگر اپنے نبیل سائیں پہ بھی نظر ڈال لو تو کیا ہی کہنے ہیں؟''
عبداللہ خود شادی کر چکا تھا اس لیے اسے باقی دونوں کی آزادی اور بیچلر لائف ہضم نہیں ہوتی تھی وہ وقتاً فوقتاً جبل فائزہ بیگم کو مشورے دیتا رہتا تھا کہ وہ اپنے اپنے بیٹوں کے لیے بڑی دھوم دھام سے کوئی مہم شروع کر لیں لیکن وہ دونوں مائیں اس معاملے میں بالکل ہی ٹھنڈی تھیں جبکہ اس کی اپنی ماں جو اس کی شادی کے لیے اکثر بے چین رہتی تھیں اس نے شادی کر کے ان کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ دونوں دوست شادی کے معاملے میں ایسی عجلت پہ اکثر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔
''جس روز ہماری شادیاں ہوں گی اس روز تم اپنے بچوں کے ہیئر بدل رہے ہو گے، تمہیں شادیاں اٹینڈ کرنے کی فرصت نہیں ملے گی۔'' دل آور کی کہی ہوئی بات اس کے ذہن میں جاگی تو بے اختیار ہنس دیا۔
''کیا یاد کر کے ہنس رہا ہے؟'' نبیل متجسس ہوا۔
''دل آور سے کی بات کو۔'' عبداللہ کا لہجہ محبت پاش تھا۔
''وہی ہیئر والی؟'' نبیل ہنسا۔
''ہاں.....'' عبداللہ نے اعتراف کیا، وہ اب اپنی باتوں میں لگ چکے تھے، زری اور نگارش کی گفتگو مدیحہ کے ساتھ شروع تھی ساتھ ساتھ فائزہ بیگم بھی شامل ہو جاتی تھیں اتنے میں لینڈ لائن فون کی بیل بجی۔ فائزہ بیگم اٹھنے لگیں لیکن مدیحہ خود کھڑی ہو گئی۔
''میں دیکھتی ہوں۔'' وہ کہہ کر لاؤنج سے نکل گئی اور ڈرائنگ روم میں فون اسٹینڈ کے پاس آ گئی رنگ متواتر بج رہی تھی۔
''ہیلو.....'' اس نے ہاتھ بڑھا کر فوراً فون اٹھا لیا کہ کہیں کال بند نہ ہو جائے۔
''کون مدیحہ؟'' دوسری طرف کا بھاری بارعب لہجہ اور آواز مدیحہ کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھے۔
''ہیلو.....'' وہ خفگی سے ہیلو کہتے ہوئے اس کی موجودگی کا یقین چاہ رہے تھے۔
''بس رہی ہوں۔'' مدیحہ کا لہجہ سرد تھا۔
''ماں کہاں ہے تمہاری؟'' ان کا لہجہ بھی کچھ کم نہیں تھا اکھڑ اور خشک۔
''یہ پوچھیں کہ آپ کی بیوی کہاں ہے۔''
''ہاں ہاں جو بھی ہے بلاؤ اس کو۔'' وہ بیزاری سے بولے۔
''بلاتی ہوں آپ کی رعایا کو۔'' وہ کہہ کر ریسیور ایک سائیڈ میں ڈال کر واپس لاؤنج میں آ گئی۔
''آپ کے مالک کا فون ہے۔'' وہ ماں کے قریب آ کر کچھ اس طرح بولی کہ صرف فائزہ بیگم ہی سن اور سمجھ سکی تھیں۔
''حیات کا فون ہے؟'' وہ فوراً کھڑی ہو گئیں، مدیحہ نے جواب دینے کے بجائے لاتعلقی سے رُخ پھیر لیا تھا وہ وہاں سے چلی گئیں۔
''کھڑی کیوں ہو بیٹھو نا؟'' زری نے مدیحہ کو ہاتھ سے پکڑ کے متوجہ کیا۔
''ہوں..... تم سناؤ تم پاکستان کب آؤ گی؟'' مدیحہ، زری کے پاس صوفے پہ ٹک گئی۔
''ظاہر ہے اسٹڈی کمپلیٹ ہو گی تو میں بھی پاکستان آ جاؤں گی۔ بہت رہ لیا یہاں بھی۔'' زری نے ہلکے سے مسکرا کر کہا نے ذومعنی نظروں سے زری کو دیکھا تھا وہ ان کی نظروں سے انجان بن گئی اتنے میں نبیل پہلو بدل کر بیٹھا تو نظر سامنے بیٹھی

طرف اٹھ گئی وہ شاید مدیحہ یا نگارش کی بات پہ کچھ کنفرا رہی تھی پنک سوٹ کے ساتھ پنک بڑا سا دوپٹہ سینے اور کندھوں پہ پھیلائے، سر پہ بلیک اسکارف لپیٹے وہ بہت ہی مہذب اور پردے میں لگ رہی تھی اس کا خوبصورت گول چہرہ بلیک اسکارف کے ہالے میں دمک رہا تھا کسی بھی قسم کے میک اپ سے عاری چہرہ گلابیاں بکھیر رہا تھا چمکدار جلد اس کی فریش نیس کا منہ بولتا ثبوت تھی کوئی اسے دیکھ کر پہلی نظر میں ہی فدا ہو سکتا تھا۔

"تم بیٹھو میں فون سن کے آتا ہوں۔" عبداللہ اپنے سیل پہ آنے والی کال اٹینڈ کرتا وہاں سے اٹھ گیا اور نبیل اپنی نظر کی محویت پہ آج پھر گڑبڑا گیا تھا۔

"اگر عبداللہ دیکھ لیتا تو.....؟" اور اس "تو" کے آگے اسے شرمندگی ہی شرمندگی نظر آئی تھی وہ سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں نبیل بھائی؟" نگارش نے رفتہ رفتہ سب کو اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ لوگ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں، ہم کمرے میں چلے جاتے ہیں۔" نبیل نے نرمی سے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

"اب وہ لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں سو کھل کر بات چیت کر سکتی تھیں۔ ان کی آج شام آٹھ بجے کی فلائٹ تھی اس لیے وہ لوگ ان سے ملنے اور ان کے ساتھ گزارنے کی غرض سے صبح ہی آ گئے تھے۔ فائزہ نیلم فون سن کر بھی بھی ہی کچن میں آ گئیں اور عبداللہ وغیرہ کے لیے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کرنے لگیں پزا اور باقی فاسٹ فوڈز کے لیے نبیل نے ہوم ڈیلیوری کا آرڈر کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نگارش بھی آ کر ان کی ہیلپ کروانے لگی حالانکہ انہوں نے منع بھی کیا تھا۔

♥

وہ کچن سیٹ کر کے باقی کاموں کی طرف آئی تو سارے کام نمٹاتے نمٹاتے دن کے بارہ بج گئے اور اسے ابا کے لیے یخنی بنانے کا خیال آیا تو سر پیٹ لیا۔

"اف..... میں اتنی لاپروا ہو گئی تھی؟ ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا، انہوں نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا؟" وہ دل ہی دل میں اپنے کاموں کو کوستی ہوئی ابا کے کمرے میں چلی آئی۔

"ابا..... ابا۔" اس نے ذرا ٹھہر کر انہیں دوبارہ پکارا تھا۔ وہ اس کے پکارنے پر متوجہ نہ ہوئے تو وہ ان کے قریب آ گئی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

"ابا۔" اس نے کان لگا کے سنا اور تسلی ہوئی۔ ان کی سانسوں کا ارتعاش اس کے لیے ڈھارس بن گیا تھا، وہ سو رہے تھے۔ پہلے اس کے دل میں خیال آیا کہ ان کو جگا دے پھر سوچا پہلے کھانے کے لیے کچھ بنا لوں پھر انہیں جگاتی ہوں اور اپنے دوسرے خیال پہ عمل کرتی وہ باہر نکل آئی۔ گوشت پہلے سے صاف کر کے رکھا ہوا تھا اسے ایک بار پھر تسلی سے اچھی طرح دھویا اور یخنی کے لیے چھ حصوں ساتھ ساتھ ان کے لیے تازہ سلاد، روٹیاں اور ان کا رات کا بچا ہوا پرہیزی سالن گرم کر کے رکھ لیا تھا کہ پتا نہیں ان کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہو۔

یخنی تو آج ان کے لیے اضافی خوراک بلکہ اضافی نعمت تھی حالانکہ ڈاکٹرز نے یہ نعمت اس کے لیے ڈیلی چارٹ میں سب سے پہلے تجویز کی تھی۔ مگر..... وہ یخنی وغیرہ تیار کر کے دوبارہ کمرے میں آئی تو اسے میں وہ واقعی بیدار ہو چکے تھے فاروق نیازی کی آنکھوں میں بیٹی کے لیے محبت چھلکی، وہ حقیقتاً اس وقت بھوک ہی محسوس کر رہے تھے۔

"السلام علیکم! آپ اٹھ گئے؟ میں تھوڑی دیر پہلے آئی تھی، لیکن آپ سو رہے تھے۔" اس نے بشاشت کا اظہار کرتے ہوئے ٹرے نیبل پہ رکھی اور پھر ان کو انتہائی مضبوطی سے تھام کر ذرا سا اٹھایا اور سنگل بیڈ کے ہیڈ کراؤن کے ساتھ تکیوں کے سہارے نیم دراز سا بٹھا دیا پھر پانی لے کر ان کو کلی کروائی اور کھانا کھلانے کے لیے بیٹھ گئی۔ یخنی کا پیالہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں استفسار جاگا۔ گویا وہ پوچھنا چاہ رہے تھے کہ گوشت کہاں سے آیا؟

"وہ کل عدیل بھائی لے کر آئے تھے۔ امی نے کہا گوشت کا سالن بنا دوں بھائی کے لیے مگر بھائی نے منع کر دیا وہ کہنے لگے کہ یہ گوشت ابا جی کے یخنی بنانے کے لیے لایا ہوں اسے رکھ دو، اور گوشت لایا تو پھر بریانی بنائیں گے، ایمن اور ایمان وغیرہ کو بہت پسند ہے۔ مریم کافی کم گو لڑکی تھی لیکن جب بھی فاروق نیازی کے پاس بیٹھتی وہ خود بخود بولنا شروع ہو جاتی تھی شاید وہ انہیں ان کی خاموشی ان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی تاکہ وہ اسے سنتے ہوئے اپنی محرومی اپنی بے بسی کو بھول جائیں۔

اب بھی وہ عدیل کی بات سن کر خوش ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ مریم کے ہاتھ سے نوالے کھانے لگے۔ چند نوالے لینے کے بعد ان کا جی اچاٹ ہو گیا تو مریم نے ان کی بیزاری محسوس کرتے ہوئے بچی پلانا شروع کر دی۔

''مزیدار ہے نا؟'' اس نے ان کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے لیکن صرف آنکھوں کی جنبش سے۔

''کل بھی بنا کر دوں گی، تھوڑا گوشت بچا کے رکھ دیا ہے۔'' اس نے اپنے سگھڑاپے اور کفایت شعاری کا ثبوت پیش کیا۔ فاروق نیازی ان دیکھی مسکراہٹ سے مسکرائے تھے وہ واقعی ان کے لیے ہر وقت فکر مند رہتی تھی اور سب سے زیادہ خیال بھی وہی رکھتی تھی ان کا دل مریم کے لیے دعاؤں سے بھرا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' مریم نے اندازہ لگایا تھا لیکن وہ مزید کوئی استفسار نہ کر سکی باہر دروازے پہ دستک ہونے لگی۔

''ابا آپ ایک منٹ انتظار کریں، میں ابھی آئی۔'' وہ پیالہ رکھ کے چھوٹے تولیے سے ان کا منہ پونچھ کر باہر گئی۔

''ارے کون ہے؟ صبر تو کرو۔'' وہ تیز تیز قدموں سے دروازے تک پہنچی۔

''فاطمہ؟'' مریم اپنی دوست کو دیکھ کر کھل اٹھی۔

''اندر آؤ نا یار۔'' مریم نے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے راستہ دیا اور پھر اس سے ہاتھ ملایا۔

''کیسی ہو؟'' فاطمہ نے مریم کے سراپے پہ تنقیدی نگاہ ڈالی۔

''اللہ کا شکر ہے، تم اندر آ جاؤ میں ابا کو کھانا کھلا رہی تھی۔'' مریم اسے اشارہ کرتی خود بھی فاروق نیازی کے پاس آ گئی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے احتراماً ذرا سا سر جھکا کر کہا۔

''وعلیکم السلام بیٹھ جاؤ۔'' جواب مریم نے دیا تھا۔

''انکل کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' فاطمہ ان کی طبیعت کو بخوبی جانتی تھی پھر بھی فارمیلٹی نبھا رہی تھی محض چند دن ہی تو ہوئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور چند دنوں میں بھلا کیا فرق آ سکتا تھا؟

''ان شاء اللہ، اللہ بہتر کرنے والا ہے۔'' مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔

''باقی سب کہاں ہیں؟ آنٹی نظر نہیں آ رہیں؟'' اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہمارے محلے کی ایک جاننے والی بیمار ہیں امی ان کی عیادت کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے اپنے سکول، کالج۔'' مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

''ایمن کا کالج سب ختم ہو رہا ہے؟ ایگزامز ہو گئے کیا؟'' فاطمہ جان بوجھ کر اِدھر اُدھر کے سوال کر رہی تھی۔

''نہیں آج شاید اس کی ڈیٹ شیٹ آئے گی تب ہی کچھ پتا چلے گا۔'' وہ برتن سمیٹ کر سنک میں رکھتی ہوئی تو نظر فاروق نیازی کی نظروں سے ٹکرائی وہ انہیں ساتھ والے کمرے میں جانے کا کہہ رہے تھے شاید

''جی ابا! چلی جاتی ہوں، آپ آرام کریں، میں کچھ دیر بعد پھر آ جاؤں گی۔'' وہ نرمی سے کہہ کر ٹرے اُٹھاتے ہوئے ان کے ساتھ باہر چلی گئی برتن کچن میں رکھے اور دوسرے کمرے میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''جناب عدیل عمر صاحب کیا کر رہے ہیں آج کل؟'' فاطمہ نے کمرے کا بغور جائزہ لیا، یہ کمرا عدیل کا تھا اور باقی دو کمروں کے مقابلے میں کچھ بہتر اور قابل حالت میں تھا اس لیے جب بھی کوئی مہمان آتا اسے اسی کمرے میں بٹھایا جاتا تھا۔

''عدیل بھائی؟'' مریم ذرا سا سائڈ کی۔

''جی ہاں۔ آپ کے عدیل بھائی۔'' فاطمہ طنزیہ بولی

''انہوں نے بھلا کیا کرنا ہے؟'' مریم بات گول کر گئی۔

''وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا، میں تو صرف جاب کا پوچھ رہی ہوں۔''

''اوہ جاب ہاں جاب تو وہ کر رہے ہیں۔'' مریم بتاتے ہوئے کترا رہی تھی۔

''واقعی؟'' فاطمہ کو حیرانی ہوئی۔

''ہاں چند دن ہوئے ہیں۔''

"اچھا تو کہاں جاب ملی اسے؟"

"پلیز پھپی کا نام مت لیں، وہ نام میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔"

"میری بہن ہے؟"

"یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"جو اب ۔۔۔ کبھی فرصت ملے گی تو کچھ پوچھو گی نا؟" فاطمہ خفگی سے گویا ہوئی۔

"پلیز فاطمہ! اتنی خفا تو مت ہو۔"

"خفا؟ تمہارے بھائی نے اتنی اچھی جاب ٹھکرا دی، آخر کیوں نا صرف اس لیے نا کہ وہ جاب مجھ سے ریلیٹڈ تھی؟" فاطمہ مزید خفا ہوئی۔

"ارے نہیں یار! ایسی بات نہیں ہے، وہ دراصل خود کچھ کرنا چاہتے تھے، وہ رشوت اور سفارش کے بغیر چلنا چاہتے تھے۔" مریم نے خود سے بات بنائی کیونکہ عدیل نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا بلکہ وہ صرف یہ کہتا تھا کہ کسی اپنے یا دوست کا اور کسی جاننے والے کا احسان بھی مت لو، وہ احسان بھوجھ کے لیے گلے پڑ جاتا ہے اور ہمیں نظر جھکانے پر مجبور کر دیتا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں کسی انجان اور اجنبی شخص کا احسان لے لو تو وہ بہتر ہے وہ کم از کم بار بار احسان جتانے کے لیے آپ کے گھر تو نہیں آئے گا نا؟"

"بس ایک تو یہ بول کا اس لوگوں کے نام نہاد خودداری نہیں جاتی گردن کٹ رہی ہوگی پھر بھی نہیں مگر، سریہ بات کرو، بلکہ اٹھ کر جو یہ کتاب وغیرہ ہیں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔" مریم اٹھنے لگی۔

"نہیں چائے رہنے دو، میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

"کیوں آج میرے ہاتھ کی چائے بھی کڑوی ہو گئی؟" مریم نے فاطمہ کو ناراضی سے دیکھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر کیسی بات ہے؟"

"ہو سکے یار جاؤ لے آؤ چائے۔" فاطمہ نے ہار مانی۔

"ٹھیک ہے، تم بس پانچ منٹ ویٹ کرو۔" مریم مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی اور اس کے لیے چائے بنانے لگی۔

جب فاطمہ آئی تو مریم گھر کا دروازہ بند کر کے آنا بھول گئی تھی اس لیے دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی عدیل نے دستک دینا چاہی مگر دروازہ کھلا چلا گیا تھا جس پہ وہ حیران ہوتا اندر آ گیا۔

"مریم کہاں ہے؟" اس نے کچن اور برآمدہ خالی دیکھ کر پکارا۔

"جی بھائی! وہ دراصل کچن سے نکلو دار ہوتی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ دروازہ کیوں کھلا چھوڑ رکھا ہے؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپر اسے تھمائے۔

"پتا نہیں شاید یاد نہیں رہا۔" وہ شاپروں میں جھانکنے لگی کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جو وہ چائے کے ساتھ فاطمہ کو پیش کر سکے۔

"تمہارے لیے برگر اور باقی سب کے لیے سموسے لایا ہوں اور رات کی ہنڈیا کا سامان بھی ہے۔"

"برگر؟" مریم کو خوشی ہوئی کہ چلو فاطمہ کے لیے تو کچھ مل ہی گیا۔

"ہاں تمہیں برگر پسند ہے؟"

"جی ۔۔۔ جی ہاں۔"

"امی کہاں ہیں؟" عدیل اپنے کمرے کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

"امی خالہ کنیڈا کا پتہ کرنے گئی ہے، ابا اپنے کمرے میں ہیں اور میں فاطمہ کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔" اس نے ساری تفصیل بتائی۔

"فاطمہ؟" عدیل کے کمرے کی طرف اٹھتے قدم تھم گئے۔

"جی ۔۔۔ وہ اندر کمرے میں ہے۔" اس نے اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے تم چائے بناؤ، میں ابا کے پاس بیٹھتا ہوں۔" وہ وہیں سے پلٹ گیا۔

السلام علیکم!" فاطمہ اس کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی عدیل کے قدم رُک گئے۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟" اس نے فاطمہ کو سرسری نظروں سے دیکھا۔
"خیریت سے ہوں آپ اپنی سنائیں، کیسی گزر رہی ہے؟" فاطمہ نے اسے سرتاپا دیکھا کافی تھکا تھکا لگ رہا تھا۔
"جو گزر رہی ہے وہ اچھی ہی گزر رہی ہے۔"
"یہ اچھی مجھے تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہی؟" فاطمہ نے طنز کیا۔
"ابھی اتنی اچھی بھی نہیں ہے کہ آپ جیسے صاحب حیثیت لوگوں کو نظر آ سکے، بس اتنی اچھی ہے کہ ہم لوگ رات کو بھوکے سوتے ہیں اور صبح سکون سے اُٹھتے ہیں، بھوک کی بے چینی سے وقت سے پہلے ہی بیدار نہیں ہونا پڑتا اور ہمارے لیے پوری نیند اور بھوک کے مطابق کھانا ملنا ہی اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جن کو ہم جھٹلا نہیں سکتے۔" عدیل نے مطمئن سے انداز میں جواب دیا تھا۔
"لیکن یہ اچھی، بہت اچھی بھی ہو سکتی تھی اگر آپ جناب میری بات مان لیتے تو۔" فاطمہ کا دبا دبا غصہ طنز و تمسخر میں ڈھل گیا تھا۔
"اگر آپ کی بات مان لیتا تو اس وقت سر اُٹھا کر اپنے حالات کا تذکرہ نہ کر رہا ہوتا بلکہ آپ کی عنایت پہ سر جھکا کر ممنون ہو رہا ہوتا۔" عدیل کی بات بھی جھٹلانے والی نہیں تھی لیکن وہ مزید کچھ کہہ نہ سکی کیونکہ ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے کہ مریم ٹرے اُٹھائے چلی آئی۔
"ارے..... تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟ چلو اندر چائے پیو۔" فاطمہ کا دل چاہا انکار کر کے چلی جائے لیکن پھر مریم کے پیار سے بلانے سے آ گئی تھی عدیل پلٹ کر اباجی کے پاس چلا گیا تھا مریم اسے بھی چائے کا کپ دے گئی تھی۔

♥

"سنو....."
"جی..... صاحب؟" رجو سیڑھیاں اُترتے ہوئے ٹھہر گئی اور فوراً پلٹ کر آذر کو دیکھا۔
"عطیرے کہاں ہے؟" اس نے اپنی آستین کا بٹن بند کرتے ہوئے پوچھا وہ ابھی ابھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تھا۔
"جی! اپنے کمرے میں ہیں۔"
"جاگ رہے ہیں؟"
"جی صاحب! کافی دیر سے۔"
"ہوں..... جاؤ تم۔" وہ سر ہلا کر کچھ سوچتا ہوا اوپر آ گیا دائیں طرف آخری والا بیڈ روم عطیرے کا تھا اس نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ہلکی سی دستک دی۔
"یس کم ان....." اس کی مدھم سی آواز سنائی دی کیونکہ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا آذر دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا۔
"گڈ مارننگ۔" آذر نے اپنی آواز اور لہجے کو قدرے فریش رکھا تھا۔
"آذر بھائی؟" عطیرے اپنے بیڈ پہ کہنی میں کافی کمبلندی سے دبکی ہوئی تھی اسے دیکھ کر فوراً اُٹھ بیٹھی۔
"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وہ کافی نرمی اور رسان سے پوچھ رہا تھا۔
"کافی بہتر ہوں۔" عطیرے آہستگی سے بولی۔
"ناشتہ نہیں کیا ابھی؟"
"نہیں۔"
"تو پھر اُٹھو، ایک ساتھ کرتے ہیں۔"
"نہیں ابھی دل نہیں چاہ رہا۔"
"مگر میرا دل تو چاہ رہا ہے نا؟"
"تو آپ کریں ناشتہ۔" عطیرے نے مسکرا کر کہا۔

"صرف ناشتہ کرنے کو نہیں چاہ رہا، تمہارے ساتھ ناشتہ کرنے کو چاہ رہا ہے۔" آذر نے اپنی بات پر زور دیا۔

"پلیز آذر بھائی! موڈ نہیں ہے میں نے رجو کو بھی انکار کر دیا ہے۔"

"یعنی تمہاری نظر میں میری حیثیت رجو جتنی ہے؟ تم نے اس کو انکار کر دیا تو مجھے بھی انکار کر دیا؟" آذر نے اسے اموشنلی بلیک میل کیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" علیزے ٹھٹک گئی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں، تمہاری بات کا یہی تو مطلب ہے۔" آذر ناراضی سے کہتا صوفے پہ بیٹھ گیا اور علیزے پریشان ہو گئی۔

"میں نے ایسا کب کہا؟"

"تو تم نے ناشتہ کرنے کا بھی تو نہیں کہا؟"

"نہیں... آپ تو ناٹنڈ کر گئے؟" وہ سر جھٹک کے بولی۔

"تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔"

"سوری... آپ کو برا لگا۔"

"سوری نہیں چلے گا۔"

"تو پھر؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ناشتہ کرنے پھر دھی بات کہی۔

"اوکے، چلتی ہوں۔" وہ بے ساختہ ہنستی ہوئی کمبل ہٹا کر اٹھ گئی پنک کلر کے بیک لیس سلیپر پہنے اور گرم مفلر لپیٹتی اس کے ساتھ ہی روم سے باہر نکل آئی۔

دونوں ایک ساتھ سیڑھیاں اترتے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو وہاں باقی سب بھی موجود تھے تقریباً سبھی نے انہیں بیک وقت دیکھا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے آہستگی سے سلام کیا۔

"تم اٹھ گئیں؟" آسیہ آفندی اسے دیکھ کر فوراً قریب آئیں۔

"جی ممی، اٹھا لیا گیا ہے۔" اس نے آذر کو شکایتی نظروں سے دیکھا وہ مسکرا دیا۔

"اگر میں تمہیں اٹھا کر ساتھ نہ لاتا تو اس وقت آئی خوش کیسے ہوتیں؟" وہ آسیہ آفندی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو علیزے کو نارمل کیفیت میں دیکھ کر واقعی خوش ہو رہی تھیں کیونکہ کل صبح سے علیزے کی حالت بہت خراب تھی دہشت اور خوف کے مارے نہ کچھ کھا رہی تھی اور نہ ہی کوئی بات کر رہی تھی جبکہ آذر نے کل والی بات کا کوئی بھی ذکر کیے بغیر اس سے اتنی نارمل بات چیت کی کہ وہ خود بھی اسی بات کے حصار سے نکل آئی تھی۔

"گڈ مارننگ ممی۔" وہ کرسی کھینچ کے بیٹھ رہی تھی جب اچانک جوہت بھی ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔

"گڈ مارننگ۔" وہ جوہت کو دیکھ کر مسکرائی۔

"آج تو لگتا ہے ڈائننگ روم میں تمام بہاریں ایک ساتھ آ گئی ہیں۔" جوہت نے آذر، علیزے، کومل، حرمت اور جویریہ کی سمت دیکھتے ہوئے خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں آج تم جو نظر آ رہے ہو۔" حرمت نے گھور کے کہا۔

"لیں اپنی تو بات ہی کچھ اور ہے، جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔" انہوں نے فخریہ کالر کھڑے کیے۔

"کیسی داستان؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" حرمت نے شرارت سے کہا اور جوہت سٹپٹا گیا اس نے گھور کے حرمت کی سمت دیکھا۔

"آرام سے ناشتہ کرو، آذر بھائی ڈسٹرب ہو رہے ہوں گے۔" اس نے جان بوجھ کے آذر کا حوالہ دیا اور پھر نظر کوٹ پہ جا ٹھہری وہ خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کر رہی تھی۔

آج کون آپا بڑی چپ چپ ہیں؟" تجسس اور انداز سی تیز تھے۔ کول چونک کر سیدھی ہوئی۔

"میں یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہی ہوں، اس لیے جلدی ناشتہ کر رہی ہوں۔"

"اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اطمینان سے ناشتہ کریں، آذر بھائی ڈراپ کر دیں گے آپ کو۔" جودت نے لاپروائی سے کہا کول اور حرمت دونوں ٹھٹک گئیں آذر کافی سنجیدگی اور گہن سے انداز میں ناشتہ کر رہا تھا۔

"بھائی آپ کول آپا کو ڈراپ کر دیں گے نا؟ وہ لیٹ ہو رہی ہیں؟" کول کے انکار سے پہلے ہی جودت نے آذر سے پوچھ لیا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا، پہلے جودت کو اور پھر اک نظر کول کو دیکھا وہ پریشان سی دیکھ رہی تھی۔

"ہوں..... کر دوں گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"دیکھا؟ ہو گیا نا مسئلہ حل؟ آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔" جودت نے آنکھ دبائی۔ تھوڑی دیر بعد آذر کھڑا ہو گیا۔

"چلیں۔" اس نے کول سے کہا اور پلٹ کر علیزے کو دیکھا۔

"او کے ڈیئر تم آئی کے ساتھ باتیں کرو، ہم لوگ لنچ پہ دوبارہ ملیں گے۔" آذر نے اسے ہلکے پھلکے انداز سے کہا اور ڈائننگ ہال سے نکل گیا کول ہونق بنی جودت اور آذر کی پشت کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"چلیں..... محترمہ مسٹر آذر آفندی گاڑی سٹارٹ کر چکے ہوں گے۔" جودت نے ہاتھ لہرا کر کول کو پھر متوجہ کیا۔

"جودت پٹ جاؤ گے مجھ سے۔" کول اپنا بیگ اور کتابیں اٹھاتی جودت کو گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد جودت کی توپوں کا رخ علیزے کی سمت ہو گیا آسیہ آفندی مسکرا رہی تھیں۔

وہ گاڑی سٹارٹ کر کے ہارن دینے ہی والا تھا کہ حویلی کے مرکزی دروازے سے کول باہر نکلتی دکھائی دی وہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پہ جمائے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ حویلی کے مین ڈور اور ڈرائیوے کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا بائیں طرف کا پورا لان گھوم کے آنا پڑتا تھا اور ڈرائیوے تک آتے آتے بھی چند منٹ لگ ہی جاتے تھے اس نے ذرا سا جھک کر دوسری سائیڈ کا دروازہ کھول دیا کول آ کر کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گئی چوکیدار نے بڑا سا گیٹ وا کر دیا تھا وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے گیٹ سے نکلا اور پھر گاڑی روڈ پہ ڈال دی۔

جیسے ہی گاڑی روڈ پہ آئی اس کی سپیڈ میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ گزرے تو آذر کو گاڑی کے اندر کی خاموشی عجیب سی لگنے لگی اور اس خاموشی کا احساس ہوتے ہی اس نے بات شروع کی۔

"کون سے ایئر میں ہو؟"

"فائنل ایئر میں۔" کول نے بامشکل تمام جواب دینے کی ہمت مجتمع کی تھی۔

"فائنل ایئر؟ لیکن تمہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے تو کچھ ہی عرصہ ہوا ہے؟"

"تین سال کا عرصہ کچھ ہی عرصہ نہیں ہوتا۔" کول نے زور دے کر کہا۔

"تین سال؟ واقعی وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا؟ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں چند روز پہلے ہی تمہارا ایڈمیشن کروا کے آیا ہوں۔" کول کا ایڈمیشن آذر نے ہی کروایا تھا اسی لیے وہ وقت یاد کر کے وقت کے جلدی گزر جانے پہ حیرانی ہو رہی تھی۔

"ہم نے تین سال پڑھتے ہوئے اور اگیزامز دیتے ہوئے گزارے ہیں اس لیے ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وقت کیسے گزرا۔" کول نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا اندر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی اس کی۔

"کون سا سمسٹر چل رہا ہے؟"

"ساتواں، یعنی فائنل ایئر کا فرسٹ سمسٹر۔"

"ہوں..... تو گویا ابھی ایک سال کا وقت ہے اسٹڈی سے فارغ ہونے میں؟"

"ہاں..... تقریباً۔" کول نے سر ہلایا۔

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی سوچا نہیں، ممی سے ڈسکس کروں گی۔"

"وہ کون سا انکار کریں گی؟" آذر ثمرہ بیگم کو سوچتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دیا تھا وہ رشتے میں تو ان سب کی چچی تھیں لیکن

انہوں نے کبھی بچی ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا ہمیشہ فریش اور فرینڈلی موڈ میں نظر آتی تھیں کافی ہنس مکھ اور سافٹ نیچر کی تھیں اور دوسری بات یہ کہ وہ آذر کی بچی ہی نہیں خالہ بھی تھیں ثروت بیگم اور ثمرہ بیگم بہنیں تھیں اس لیے آذر اور جودت وغیرہ کا کول سے "میر" کا رشتہ بھی بنتا تھا۔

"آپ علیزے کے لیے بہت پریشان ہیں نا؟"

"ظاہر ہے یہ معاملہ ہی پریشانی والا ہے۔"

"کچھ مسئلہ حل ہوا؟" کول نے اتنے عرصے میں پہلی بار سر اُٹھا کر ڈرائیو کرتے آذر کو دیکھا۔

"ایک دن میں کیا مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟" کول سمجھدار تھی گھر میں لڑکیوں سے سب سے بڑی تھی اسی لیے اس کے استفسار پہ آذر کو جواب ٹالنا غیر مناسب لگ رہا تھا۔

"علیزے نے کچھ بتایا نہیں؟"

"نہیں میں نے پوچھا ہی نہیں، ابھی وہ تھوڑی سنبھل جائے پھر بات کروں گا، صبح ہی صبح یہ بات چھیڑ دیتا تو وہ مزید ڈسٹرب ہو جاتی۔" آذر کو اس کے آرام اور سکون کا بھی کتنا خیال تھا؟ کول نے رشک سے دیکھا۔

"آپ ڈسٹرب نہیں ہیں کیا؟"

"میری پریشانی کچھ اور نوعیت کی ہے اور علیزے کی کچھ اور....."

"لگتا ہے ڈسٹرب نہیں تو ہے نا؟"

"ہوں..... کہہ سکتی ہوں۔" آذر بہت نارمل بات کر رہا تھا کول کی گھبراہٹ کم ہو چکی تھی اور اسی لیے تو وہ بات بھی کر رہی تھی اور ابھی وہ کچھ اور کہنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی کہ آذر کا سیل بجا۔ اسرار آفندی کی کال تھی۔

"می ڈیڈی۔"

"تم ہسپتال پہنچو۔" وہ مختصر بولے ان کے پیچھے شور سا تھا۔

"کیوں خیریت؟" اس کا ماتھا ٹھنکا

"میں خیرو بابا کی خیریت معلوم کرنے ہسپتال آیا تھا اور میرے پیچھے میڈیا والے بھی پہنچ گئے۔" وہ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔

"اف..... آپ کو کس نے کہا تھا کہ ہسپتال جائیں؟ میں نے رات کو کہا بھی تھا کہ آپ لوگوں کو ہسپتال وغیرہ کے چکر لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم لڑکے ہی کافی ہیں اس کام کے لیے، ایک خیرو بابا ہی ہیں نا؟ ہم سنبھال لیں گے ان کو۔"

"ارے یار بھائی صاحب نے آنے کو کہا تھا۔" اسرار آفندی جھنجلائے۔

"ڈیڈ بھی کمال ہیں ہے کہ کچھ کرنے سے پہلے سوچتے نہیں ہیں؟" آذر خفا ہو رہا تھا۔

"وہ خیرو بابا کے لیے پریشان تھے۔"

"پریشان تو ہم سب ہیں، تو اس کا کیا مطلب ہے کہ ہسپتال میں ڈیرہ ڈال کے بیٹھ جائیں؟ صرف ایک ملازم زخمی ہوا ہے پورا گھر زخمی نہیں ہوا جس پہ آپ لوگ اتنے بدحواس ہو رہے ہیں، اپنی وے میں آ رہا ہوں آپ ویٹ کریں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور گاڑی کی سپیڈ مزید بڑھا دی اس نے لب بھینچ سے رکھے تھے کول اسے دیکھتے ہوئے اس وقت چونکی جب اس نے یونیورسٹی کے سامنے بریک لگائے تھے۔

"تھینک یو۔" وہ گاڑی سے اُترنے کے بعد تھینک یو کہہ رہی تھی کہ آذر گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا لے گیا تھا اس کے پاس ہاکم کم تھا ورنہ وہ ایسی بداخلاقی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ابنارمل رش ڈرائیونگ کر رہا تھا حالانکہ صبح کے وقت ایسی ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں تھی لیکن اس کا ہسپتال پہنچنا ضروری تھا اسے جلدی پہنچنا تھا۔

♥

وہ آج بہت عرصے بعد دن کے وقت سویا تھا، رات کو نیند ہی پوری نہیں ہوتی تھی اور دن میں کام پیچھا نہیں چھوڑتے تھے لہٰذا ایک بھرپور نیند اور فریش موڈ خواب و خیال ہو کے رہ گئے تھے۔

آج اس نے کورٹ نہیں جانا تھا اس لیے تقریباً فارغ ہی تھا۔ صبح اٹھا ایک دو ضروری کام نبٹایا اور گھر آ گیا اپنے کمرے میں فارغ لیٹے ہوئے بوریت ہونے لگی تو نیند کو ترجیح دی اور پھر وہ لیٹا ہی تھا کہ نیند اس پہ مہربان ہو گئی۔ وہ دن کے بارہ بجے سویا تھا اور شام کے پانچ بجے آنکھ کھلی تھی پانچ گھنٹے کی نیند کچھ کم نہیں تھی موڈ خوشگوار فریش اور دماغ ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ شاور لے کر کپڑے چینج کیے اور لان کے سائے ڈھل چکے تھے۔ مغرب کی طرف ڈوبتے سورج کی بے دم سی شعاعیں مشرق کو الوداع کہہ رہی تھیں اسے لان میں ٹہلتے دیکھ کر بل ڈوگ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے دائیں بائیں ٹہلتا اپنی تھوڑی دیر کی رہائی کی فریاد کرنے لگا۔ دل آور نے بڑھ کے اسے تھپکا بل ڈوگ لوہے کے موٹے سے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا اور وہ جس کھونٹے سے بندھا ہوا تھا وہ کھونٹا گھر کی دیوار میں نصب تھا جسے سیمنٹ اور بجری سے مضبوط کیا گیا تھا تاکہ بل ڈوگ چاہے جتنی بھی زور آزمائی کر لیتا اس کھونٹے کو نہ اکھاڑ سکتا۔

اس کی بے چینی محسوس کر کے دل آور نے اسے کھول ہی دیا تھا اور بل ڈوگ خوشی کا اظہار کرتا اپنے صحت مند جسم سمیت لمبی طویل جست لگاتا لان کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچ گیا تھا۔ دل آور لان کی ایک سائیڈ میں لگے واش بیسن پہ گیا اور طرح ہاتھ وغیرہ دھونے کے بعد آ کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گل آ گئی۔

"صاحب کچھ لیں گے آپ؟ دن میں بھی کھانا نہیں کھایا؟"

"چائے لے آؤ۔" وہ بل ڈوگ کی طرف متوجہ تھا۔

"گل....." اس نے آواز دی۔

"جی صاحب؟"

"گلاب خان کو اندر بلاؤ، میں نے تم لوگوں سے بات کرنی ہے۔" اس نے بل ڈوگ سے دھیان ہٹا کر گل سے کہا۔

"ابھی بلاتی ہوں۔" وہ سعادت مندی سے کہتی گیٹ کی طرف چلی گئی اور پانچ منٹ بعد وہ دونوں ایک ساتھ اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"جی صاحب آپ نے بلایا؟" گلاب خان مؤدب کھڑا تھا۔

"گل نبیل کی فیملی پاکستان پہنچ رہی ہے، ان کی ملازمہ اور ملازم سب نئے ہیں اور میں کچھ خاص مطمئن نہیں ہوں، ایک عرصے بعد وہ لوگ پاکستان آئیں گے اور انہیں ٹھیک سے کھانا بھی نہ ملے یہ بات میرے لیے شرمندگی کا باعث ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ محض دو دن کے لیے گل کو ان کی طرف بھیج دیتا ہوں اگر تمہیں برا نہ لگے تو؟" دل آور اپنے ملازم سے بھی اس طرح بات کرتا تھا کہ اس کی عزت نفس پہ حرف نہیں پہنچتی تھی بلکہ ملازم کا وقار بڑھا دیتا تھا وہ چاہتا تو ایک مالک ہونے کے ناتے اب ملازموں کو نبیل کے گھر جانے کا حکم بھی دے سکتا تھا مگر اس نے حکم کے بجائے ان کی رضامندی کو ترجیح دی۔

"صاحب ایسی بات کر رہے ہیں آپ؟ مجھے برا کیوں لگے گا؟" گلاب خان کا اپنے صاحب پہ مان بڑھ گیا تھا۔

"برا لگ بھی سکتا ہے، گل تمہاری بیوی، تمہاری عزت ہے اور اپنی عزت کے بارے میں تم سے بہتر فیصلہ کون کر سکتا ہے، بھلا؟"

"نہیں..... نہیں صاحب ہماری عزت کے بارے میں آپ سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا گل دو دن نہیں چار دن بھی جا کر رہ سکتی ہے، آپ جب چاہیں چھوڑ آئیں۔" گلاب خان نے اسے اختیار سونپا۔

"نہیں بس دو دن ہی کافی ہیں پھر وہ اپنی ملازمہ کو ٹریننگ کر لیں گے۔"

"لیکن صاحب آپ کیا کریں گے؟ کھانا وغیرہ کون بنائے گا؟" گلاب خان کو اس کی فکر ہوئی۔

"تم ہو نا۔" دل آور نے گلاب خان کو مسکرا کر دیکھا۔

"میں؟" اسے تعجب ہوا تھا

"ہاں..... تم کھانا تو بنا ہی لیتے ہو نا؟"

"لیکن صاحب جب سے یہ شہر آئی ہے تب سے اپنے ہاتھ کا ذائقہ اچھی نہیں رہا۔" گلاب خان گل کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا گل شرم سے چہرہ جھکا گئی اور دل آور ان دونوں کی حرکت پہ یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جبکہ وہ دونوں گل ہو کر رہ گئے تھے۔

"تمہارے ہاتھ کا ذائقہ اب بھی وہی ہے بس یہ کہو کہ تمہیں بیوی کے ہاتھ سے کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ لیکن مجبوری ہے

یار دو ن تمہیں میرے ساتھ ہوٹل کا کھانا ہی کھانا پڑے گا۔'' دل آور نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں صاحب کھا لیں گے۔'' گلاب خان سر خم کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے کل صبح جب میں کہوں تم چا کر گل کو چھوڑ آنا۔''

''جی صاحب جیسے آپ کی مرضی۔''

''او کے جاؤ تم اور گل تم چائے لے آؤ۔'' اس نے اشارہ کیا وہ دونوں ہی چلے گئے۔ چائے پینے کے بعد سگریٹ سلگا لیا۔

''چائے کے فوراً بعد سگریٹ؟ ایک ساتھ دو نشے کیسے افورڈ کر لیتے ہیں؟'' اس نے سگریٹ کا کش لیا ہی تھا کہ وہ پوچھ بیٹھی۔

''چائے طلب ہے اور سگریٹ عادت۔ ان دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک بھی نشہ نہیں کہلا سکتی، نشہ اس چیز میں ہوتا ہے جو ترجیح سے بیگانہ کر دے اور یہ دونوں تو اتنے بے ضرر ہیں کہ ہر دوسرا بندہ ان سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔'' دل آور نے اپنی رائے دی۔

''لیکن میری نظر میں تو یہ نشے کا درجہ ہی رکھتی ہیں۔'' وہ نڈر ہو کے بولی۔

''تو پھر ایک نشہ تو آپ بھی کرتی ہیں۔'' وہ جتنے سکون سے بولا تھا وہ یکدم سٹپٹا گئی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''چائے تو آپ بھی پیتی ہیں۔'' دور سان سے بولا اور اس کی رُکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔

''میں تو ایک اور نشہ بھی کرتی ہوں۔'' اب کی بار وہ رسان سے بولی تھی۔

''کون سا؟'' سوال بے ساختہ سا تھا۔

''محبت کا۔'' اس کے جواب پہ وہ جیسے بہرہ ہو گیا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کی بے نیازی اور لاتعلقی پہ اس کا چہرہ بجھ کے رہ گیا ہو۔ وہ اس کے چہرے کی بجھی روشنیوں سے نظر چراتا وہاں سے اُٹھ گیا تھا اور چونکا تو اس وقت جب بل ڈوگ نے دیوار پہ بیٹھے کیوٹ کو دیکھ کے بھونکنا شروع کیا وہ کیوٹ کو لگنا چاہتا تھا دل آور سر جھٹک کر ماضی سے حال میں پہنچا۔

''تو کیا میں زری کو یاد کر رہا تھا؟'' وہ حیرت سے سوچتا سگریٹ مسل کر بل ڈوگ کے قریب آیا اور دیوار کے قریب لا کے دیوار پہ کھونے سے باندھ دیا اسے لان میں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اسی لیے اندر آ گیا سامنے ہی ٹیبل پہ موبائل بی بی کی کیس چائل پڑی تھی وہ کل اٹھا کر اپنے اسٹڈی روم میں آ بیٹھا اور اطمینان سے کیس اسٹڈی کرنے لگا اب اسے دیر تک مصروفیت کا موقع مل گیا تھا۔

کل رات کو کھانے کا پوچھنے آئی تو بھی اس نے انکار کر دیا جب وہ بڑی ہوتا تھا تو کھانے پینے پہ بھی دھیان نہیں دیتا تھا اور کیس اسٹڈی کرتے ہوئے تو سوائے سگریٹ اور چائے کے کسی اور چیز کی طلب نہیں ہوتی تھی اس کا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر جاتا تھا اور ہر پندرہ بیس منٹ بعد چائے بھی ختم ہوتی رہتی تھی۔

♥

پورا دن اکٹھے گزارا تو ٹائم گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ مدیحہ اس وقت کچن کے رو گئی جب نگارش نے اسے تیار ہونے کا کہا۔

''تمہارے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں کہ ٹائم کم رہ گیا ہے ایئر پورٹ بھی پہنچنا ہے پھر سامان وغیرہ کی چیکنگ میں بھی ٹائم ضائع ہو گا، اٹھو جلدی سے چینج کر کے آؤ اور ایک بار پھر اپنی تمام چیزیں یاد کر لو کہ تم نے بیگ میں رکھ لی ہیں نا؟'' نگارش سمجھدار بہنوں جیسا رویہ اختیار کر رہی تھی زری مسکرائی۔

''چلو جاؤ اب۔'' زری نے مدیحہ کو اٹھایا اور وہ خاموشی سے چپ چاپ اوپر آ گئی کپڑے چینج کیے، اپنا بیڈ روم دیکھا، بیڈ روم کی سیٹنگ دیکھی اور سر جھکا کر اپنا بیگ اٹھا لیا۔ باقی کا سامان وہ لوگ پہلے ہی گاڑی میں رکھوا چکے تھے۔

''کوئی گفٹ نہیں بھیجا تم نے؟'' گھر سے نکلتے ہوئے نگارش نے زری سے سرگوشی کی۔

''کیا بھیجتی؟'' زری بھی آہستگی سے بولی۔

''اپنا دل۔''

''ہونہہ... دل کو دل بھیجتی؟''

''ہاں..... تاکہ دل کو دل سے راہ ہو جاتی۔''

''میرا دل نرم ہے اور وہ دل سخت۔'' زری اس کا تصور کرتے ہوئے بولی۔

''سخت کو نرم ہونے میں بھی دیر نہیں لگتی، بس اثر ہونا چاہیے۔'' نگارش نے گہرائی سے کہا۔

''اثر ہونے کے لیے وقت چاہیے، جو فی الحال نہیں ہے۔'' زری جواب دیتی باہر نکل آئی لیکن باہر کا موسم ابھی روڈ کی اسٹریٹ لائٹس بھی اس برفانی موسم کی وجہ سے دھندلی سی لگ رہی تھیں اور اس دھند کی وجہ سے تمام لائٹس کی روشنی بکھر آ رہی تھی۔

''مدیحہ کہاں ہے؟'' زری نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

''وہ ہم سب سے پہلے جا کر بیٹھ گئی ہے، تم بھی بیٹھ جاؤ گلی بن جاؤ گی۔'' نگارش نے خفگی سے کہا تھا اور یوں وہ دونوں آگے پیچھے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئی تھیں انہیں ایئرپورٹ پہنچتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا اور فلائٹ کا ٹائم بھی کم رہ گیا تھا۔

''میڈم۔'' مدیحہ سر جھکائے چپ چاپ سی بیٹھی تھی جب ایک شناسا سی آواز پہ چونک کر سر اٹھایا۔

''حیری؟'' اس نے حیرت سے حیری کو دیکھا۔

''تم واقعی جا رہی ہو؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا جیسے کی افسردگی نمایاں تھی۔

''آف کورس۔''

''واپس نہیں آؤ گی؟'' سوال میں آس تھی۔

''شاید۔'' وہ کوئی بھی جواب ٹھیک سے نہ دے پائی۔

''تم ہم سے ملے بغیر جا رہی ہو؟ ہمیں بتایا بھی نہیں؟ آج بھی اگر کرسٹینا نہ بتاتی تو ہمیں پتا ہی نہ چلتا؟'' وہ شکوہ کناں تھا۔

''جب چھوڑ کر جانا ہی ہے تو پھر اتنے اہتمام سے چھوڑ کر جانے کا کیا فائدہ؟ دو گھڑی کا یہ ملنا بھی کس کام کا؟'' اس کے لہجے میں تلخی در آئی پانچ قدم کے فاصلے پہ نگارش، زری اور فائزہ بیگم کھڑی تھیں البتہ نبیل اور عبداللہ سامان وغیرہ کلیئر کروا رہے تھے۔

''تم ہمیں مس نہیں کرو گی؟''

''شاید.....'' وہ عجیب سی بے حسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''باقی سب سے نہیں ملو گی؟'' حیری افسردہ لگ رہا تھا فائزہ بیگم نے بلیک لانگ کوٹ پہنے اور لانگ شوز پہنے حیری کو ناگواری سے دیکھا تھا۔

''باقی سب؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''میڈم؟'' اچانک نہ جانے کہاں سے برائن، شیلے، کرسٹینا اور جیسمین نمودار ہوئے تھے اور مدیحہ کو دیکھ کر چلا اٹھے تھے ان لوگوں کو اچانک دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور اداس بھی۔

''سوڈ کیوں آف ہے؟'' شیلے اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس لیے اس کی اداسی اور افسردگی بھی شیلے نے ہی محسوس کی تھی۔

''تو کیا اس وقت اس جگہ پہ کھڑے ہو کر میرا موڈ آن ہونا چاہیے؟'' مدیحہ نے شیلے کو خفگی سے دیکھا۔

''ڈونٹ وری یار ہم لوگ ضرور ملیں گے۔'' برائن نے انہیں تسلی دی وہ شیلے کا بھائی تھا اسی وجہ سے مدیحہ کی اس کے ساتھ کافی اچھی فرینڈ شپ تھی دونوں، بہن بھائی بے حد سوفٹ نیچر کے تھے۔

''ان شاء اللہ۔'' مدیحہ بے ساختہ بولی۔

''یہ کیا کہا؟'' برائن نے الجھ کر پوچھا۔

''میں نے کہا ہے کہ اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ملیں گے۔'' مدیحہ نے انگلش میں بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

''ہوں..... ان شاء اللہ۔'' برائن نے دہرا کے کہا اور مدیحہ مسکرا دی۔

''مدیحہ چلو۔'' فائزہ بیگم نے قریب آ کر سختی سے کہا۔

''جسٹ ون منٹ مام پلیز۔'' اس نے انہیں روکا اور کرسٹینا کو دیکھا۔

''کرسٹی! تم کچھ نہیں کہو گی؟'' مدیحہ نے خاموش کھڑی کرسٹینا کے قریب آ کر نرمی سے پوچھا۔

"اب کچھ نہ کچھ کہہ ہی رہے ہیں، میرا کہنا ضروری تو نہیں ہے؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"اگر ضروری نہیں ہے تو اتنی دور سے، اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں آئی ہو؟" مدیحہ کے استفسار پہ کرسٹینا لاجواب ہو گئی۔ اور نظر چرائی تھی۔

"میں جانتی ہوں کرسٹینا تمہاری فیملی کسی پاکستان کی دی ہوئی چوٹ سے بلبلائی ہوئی ہے اور یہی چوٹ تم لوگوں کو باقی پاکستانیوں کی طرف بڑھنے نہیں دیتی لیکن ایک بات سوچو، جس طرح تمام یورپین ایک جیسے نہیں ہیں اسی طرح تمام پاکستانی بھی ایک جیسے نہیں ہیں، اچھے بُرے لوگ ہر جگہ، ہر ملک میں پائے جاتے ہیں ایک کی سزا دوسرے کو دینا کہیں سے بھی انصاف نہیں کہلاتا اور تمہیں آج چپ نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے گروپ کی وہ لڑکی جارہی ہے جو تمہیں ہمیشہ ناگوار گزرتی تھی۔" مدیحہ اس کے روبرو کھڑی کہہ رہی تھی اور کرسٹینا کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ تو کیا مدیحہ اس کی ناگواری اور فیملی کی تہمت کے متعلق بھی جانتی تھی؟ حالانکہ اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کرسٹینا کے اندر کا حال جانتی ہے۔

"میں تم۔۔۔ تم۔۔۔" کرسٹینا بول ہی نہ پائی۔

"مدیحہ چلو بھی۔" آپ کی بار زیادہ سختی سے پکارا گیا تھا۔

"آئی مس یو صندی۔" کرسٹینا تم آنکھوں سے اس کے گلے لگ گئی اور مدیحہ کا گال چوم لیا پیچھے اور جیوری مسکرا دیئے۔

"بیسٹ آف یور فارمائی لی ہیوینز۔" کرسٹینا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"تھینک یو سو مچ، آپ کا پارا مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہو بلکہ ان سب کو لے کر آئی ہو۔ تھینک یو سو مچ۔" اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا پھر باقی سب سے مل کر ہاتھ ہلاتی وہ زری اور نگارش کے پاس آ گئی۔

"پتا نہیں ان سب سے دوبارہ ملنا ہو گا بھی یا نہیں اس لیے جلدی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تم سے تو ملاقات ہو ہی جائے گی اس لیے امید ہے کہ تم نے مائنڈ نہیں کیا ہو گا؟" اس نے زری کے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"اور بھابی آپ بھی جلدی پاکستان آنے کی کوشش کیجیے گا۔" وہ نگارش سے ملی تو ساتھ تاکید بھی کر ڈالی۔

"پہلے تم تو جاؤ۔"

"اتنی جلدی ہے آپ کو۔"

"اب جلدی تو ہو گی ایک گھنٹے سے اتنی سردی میں کھڑے کھڑے ہڈیوں کا گودا بھی جیسے جم گیا ہے۔" نگارش مصنوعی خفگی سے بولی۔

"نگارش خیریں میں عبداللہ بھائی سے کہتی ہوں گھر جاتے ہی آپ کی ہڈیاں اوون میں رکھ دیں۔" مدیحہ شرارت سے بولی اس کا موڈ پہلے سے قدرے خوشگوار ہو چکا تھا۔

"اوون میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود کسی اوون سے کم ہیں کیا؟" نگارش کا ذومعنی لہجہ مدیحہ اور زری کو ہنسنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے جناب۔" مدیحہ نے سراہا۔

"مدیحہ۔" ہمیں نے قریب آ کر کہا اور پھر نگارش اور زری کو دیکھا بس اک طائرانہ سی نظر کا موقع تھا اور اک نظر میں اس کے چہرے کا ایک آخری لمس تھا وہ کس سیٹ کر مدیحہ کے ساتھ اللہ حافظ کہتا آگے بڑھ گیا سب سے آخر میں عبداللہ سے ملاقات ہوئی تھی دونوں ویگنیں بھر چکی تھیں پھر سب چلے گئے۔ جیری بھی وہیں کھڑا تھا اور زری وغیرہ بھی۔ شاید جہاز پرواز کر چکا تھا۔

♥

ہسپتال میں میڈیا والے مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے اور اسرار آفندی ان کے گھیرے میں تنگ آئے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ انہیں کی ناک میں بیٹھے ہوئے ہیں جیسے ہی وہ خیر و بابا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ہسپتال پہنچے وہ سب بھی سمندری ریلے کی طرح امڈ آئے انہوں نے لاکھ کوشش کی وہاں سے نکلنے کی مگر اتنے ہجوم میں راستہ ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

"کل آپ کی بیٹی پہ فائرنگ ہوئی، آپ لوگوں کا ڈرائیور زخمی ہو گیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ آپ کو کسی پہ شک ہے؟" ایک صحافی نے مائیک سامنے کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''آفندی صاحب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آپ کی بھتیجی کیوں زخمی نہیں ہوئی؟'' دوسرے صحافی نے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا۔

''کل سے وقار آفندی صاحب کہیں بھی نظر نہیں آئے کیا وہ خوف کی وجہ سے ملک چھوڑ گئے ہیں؟ یا پھر اپنے کمرے میں بند ہو چکے ہیں؟''

''شٹ اپ..... یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟'' آذر جیسے ہی سب کو ہٹاتا ہوا سامنے آیا اس کے کانوں میں ایک صحافی کا تمسخرانہ سا سوال گونجا تھا۔

''بند کرو یہ کیمرے۔'' اس نے غصے سے خونخوار آنکھوں سے دیکھا۔

''سر کیمرے بند کر دینے سے آپ پورے شہر کی آنکھیں تو بند نہیں کر سکتے نا؟'' صحافی کچھ زیادہ ہی تیز تھے۔

''سر ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے یہ معاملہ دبانے کی پوری پوری کوشش کی ہے؟'' آذر کا جی چاہا ایک زوردار مکا ان کے منہ پر دے مارے لیکن اسرار آفندی نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو ایسی کسی بھی حرکت سے باز رکھا تھا وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

''چلیں ڈیڈی۔'' وہ اسرار آفندی کو ساتھ لے کر اس ہجوم کو چیرتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا اسرار آفندی کا ڈرائیور تیار کھڑا تھا ان کے آتے ہی گاڑی سٹارٹ کر دی اور خود آذر بھی اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا کیونکہ اگر یہاں ٹھہرتا تو بھی یہی کچھ ہونا تھا بہتر یہ کہ کچھ پر نظروں سے اوجھل رہتے۔

اس نے اپنا سیل نکالتے ہوئے وقار آفندی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

''السلام علیکم۔'' وہ کال ریسیو کرتے ہوئے بولے۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''خیریت؟''

''خیریت آپ کو ڈیڈی بتا دیں گے، آپ ایسا کریں کہ مبارک خان کو خیر دہا بھیج دیں وہ ان کی دیکھ بھال کر لے گا۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''مبارک خان کو؟ مگر حویلی میں بھی تو کوئی کام.....''

''ڈیڈ حویلی کے کام ہم سنبھال لیں گے آپ اسے ہسپتال بھیج دیں، دانیال تو صبح ہی ہسپتال سے گھر چلا گیا تھا اب ان کے پاس احمد اور زین بیٹھے ہوئے ہیں، احمد بھی رات سے تھک چکا ہوگا اسے گھر بھیج دیتا ہوں تاکہ وہ ریسٹ کر لے۔'' آذر کا دھیان اس طرف رہتا تھا اسی لیے احمد کے آرام کا خیال کرتے ہوئے مبارک خان کو طلب کیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں اسے بھیجتا ہوں۔ لیکن تم کہاں ہو؟''

''میں انکلیو انکل کے پاس آفس جا رہا ہوں، واپسی پہ خیر دہا سے مل کر آؤں گا، پھر گھر پہ ہی کروں گا۔''

''او کے اللہ حافظ۔'' انہوں نے فون رکھ دیا تھا اور فون بند ہونے کے بعد آذر کی سوچ کا در کھل گیا تھا اس کا دھیان اس نمبر کی طرف چلا گیا جس نمبر سے کل وقار آفندی کو کال آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہنس جانے کا ارادہ بدلا اور گاڑی ٹیلی فون ایکسچینج کی طرف موڑ دی وہ اس نمبر کی پوری ہسٹری کروانا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے ایک پاور فل سفارش بھی کروائی تھی کیونکہ کسی کے نمبر کی معلومات حاصل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

ٹیلی فون ایکسچینج پہنچ کر اس نے سپروائزر سے ملنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

''پچھلے دس منٹ سے میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' سپروائزر خوشدلی سے بولا۔

''تھینک یو سر! دراصل کل ہمیں ایک نمبر سے کال موصول ہوئی تھی۔ میں اس نمبر کی ڈیٹیل اور لوکیشن وغیرہ جاننا چاہتا ہوں ہمارا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے، بس ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے؟ جس سے ہم خود بھی بے خبر ہیں لیکن اس پہ وار کیے جا رہا ہے۔'' آذر نے تمہید باندھی۔

''جی..... جی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں آپ وہ نمبر دے دیں میں تھوڑی دیر تک آپ کو اس نمبر کی تمام ڈیٹیلز فراہم کر دوں گا۔'' سپروائزر بھی اس کی پرابلم سمجھ چکا تھا آذر چاہتا تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی کروا سکتا تھا لیکن اگر یہ بات بھی سامنے

جاتی کہ علیزے پہ فائرنگ کرنے والے نے وقار آفندی کو فون کال کر کے خود فائرنگ کی اطلاع دی تھی تو نہ جانے اور کتنے اندازے لگائے جاتے؟ اس لیے آذر نے یہ نمبر پولیس کو انکوائری کے لیے دینے کے بجائے خود اس کی پوچھ گچھ کرنا ہی مناسب سمجھا تھا جبھی وہ اس کام کے لیے خود آیا تھا کسی اور کو نہیں بھیجا تھا۔

"سر رات کو ایک موبائل نمبر سے کچھ میسجز بھی تھے اس نمبر کا کچھ پتا چل سکتا ہے؟" آذر نے "ایک" میسج کہنے کے بجائے "کچھ" میسجز کا اضافہ کیا تھا۔

"سوری آذر صاحب آپ کو اس نمبر کا وہیں سے پتا چل سکتا ہے جس موبائل کمپنی کا وہ نمبر ہے آپ اس کمپنی کے سروس سینٹر کال کریں یا پھر اس کے کسی قریبی فرنچائز میں جا کر ساری صورتحال سے آگاہ کریں۔ وہ آپ کو اس کا حل بتا دیں گے۔" سپروائزر نے آذر کو مشورہ دیا اور پھر لینڈ لائن کا نمبر لے کر اپنے کسی ملازم کو دیا اس نمبر کا ریکارڈ نکلواؤ۔" انہوں نے ملازم کو کام سونپا وہ کاغذ پہ لکھا ہوا نمبر لے کر چلا گیا تھا تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو آذر سمیت وہ بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"سر اختر صاحب کہہ رہے ہیں اس نمبر کا ریکارڈ کچھ دیر بعد ملے گا۔" اس نے آ کر پیغام دیا۔

"کتنی دیر بعد؟" آذر نے گھڑی دیکھی۔

"گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔"

"وہ پھر تو کافی لیٹ ہو جائے گا؟" آذر کو پریشانی ہوئی۔

"وقت دوں آذر صاحب میں یہ ریکارڈ آپ کے گھر یا آپ کے آفس بھجوا دوں گا یا پھر آپ اپنا آئی ڈی دے جائیں آپ کو میل کر دوں گا۔" سپروائزر کافی اچھے مزاج کا تھا آذر مل کر خوش ہوا تھا اور پھر اپنا کارڈ نکال کر تھما گیا تاکہ وہ اسے میل کر سکے۔

♥

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ آفس کا ایک چکر لگا کر واپسی پہ ہسپتال آیا تھا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے صاحب!"

خیرو بابا نے نقاہت سے کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"کیا محسوس کر رہے ہیں؟ کہیں درد وغیرہ تو نہیں ہے؟" آذر نے ان کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کافی اپنائیت اور ہمدردی سے پوچھا تھا۔

"صاحب چوٹ لگی ہے تو درد تو ہو گا نا؟"

"اگر زیادہ درد ہے تو میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں وہ کور کریں۔"

"نہیں صاحب جب تک زخم نہیں بھرے گا درد ٹھیک نہ ہو گا، آپ فکر نہ کرو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" خیرو بابا کافی ہمت اور بہادر تھے اتنی تکلیف سہہ کر بھی ان کے ماتھے پہ شکن تک نہیں تھی۔

"ان شاء اللہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔

"علیزے بی بی کیسی ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں نا؟" انہیں اب بھی علیزے کی فکر تھی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے، اس کو بچاتے بچاتے آپ خود بھی زخمی ہو گئے، آپ کو اپنے لیے بھی احتیاط کرنی چاہیے تھی۔"

"نہ صاحب! یہ تو میرا فرض بنتا تھا، بی بی کی حفاظت میرے ذمے ہی تو تھی، ساری زندگی بڑے صاحب کا نمک کھایا ہے، ان کی بیٹی کو کچھ ہو جاتا تو میں ان کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور میری زندگی کا کیا ہے؟ آج ہے، کل نہیں ہو گی۔ علیزے بی بی تو ابھی بچی ہے اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ میں تو اپنی پوری زندگی برت چکا ہوں۔" انہوں نے آذر کے ہاتھ پہ اپنا کمزور سا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں خیرو بابا! اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی زندگی ضروری اور اہم ہے آپ ہمارے لیے قابل احترام ہیں، علیزے کی جان بچا کر آپ نے ہم سب کو اپنا احسان مند کر لیا ہے، ہم لوگ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکتے۔"

"یہ احسان نہیں ہے صاحب یہ تو میرا فرض اور محبت ہے، آپ سب کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا ہے، کھلایا، سکھایا ہے اپنے بچوں کی طرح پیار کیا ہے، اور کون ایسا انسان ہے جو اپنے بچے کو چوٹ لگتے خاموشی سے دیکھ سکتا ہے؟ انسان چاہتا ہے

اس کے بچے کو کتنے والی چوٹ بھی اسے لگ جائے۔" خیرو بابا کی بات پہ آذر کو اطمینان کے ساتھ ساتھ خوشی ہوئی تھی۔

"واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے کہ آپ اس طرح سمجھتے ہیں ورنہ آج کل اتنی محبت اور ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بڑے صاحب نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں وہ بھلا کیا کہیں گے؟ آپ کی خیریت پوچھ رہے تھے کافی پریشان بھی تھے آپ کے لیے، آپ کی دیکھ بھال کے مبارک خان کو بھیجا ہے انہوں نے۔" اس نے خیرو بابا کو اطمینان دلایا۔

"یہی تو ان کی اچھائی ہے، وہ ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں اپنے ملازموں کو بھی نہیں بھولتے۔" انہوں نے وقار آفندی کی تعریف کی اور مسکرا دیا۔

"اگر آپ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں تو آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے تھوڑا جھجک کے کہا۔

"ہاں..... ہاں کیوں نہیں صاحب، آپ پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟" خیرو بابا نے بشاشت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے وہ موٹر سائیکل سوار آپ کے پیچھے گاڑی کو فالو کرتے ہوئے آئے تھے یا پھر سامنے سے آ کر حملہ کیا تھا؟"

"صاحب وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے نہیں آئے تھے اور نہ ہی سامنے سے آ کر حملہ کیا تھا، آپ کو پتا ہوگا کہ علیزے بی بی کالج روڈ پہ جائیں تو ایک روڈ مغرب کی طرف سے بھی نکلتا ہے، وہ لوگ اسی روڈ سے اچانک نکلے اور گاڑی پہ فائرنگ کر دی، میں نے گاڑی پھر بھی نہیں روکی اور علیزے بی بی کو کہا کہ وہ سیٹ پہ لیٹ جائیں وہ یکدم چیخنے چلانے لگی تھیں میری بات نہیں سنی اور اسی طرح سیٹ پہ بیٹھی رہیں۔ میں نے پھر مڑ کر انہیں کہا کہ سیٹ پہ لیٹ جائیں ان کو گولی لگ جائے گی اور علیزے بی یکدم سیٹ پہ گر گئیں لیکن میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو سامنے ایک گولی میرے آگے اور گاڑی میرے قابو سے باہر ہو گئی میں نے بریک لگا دیے تھے اور میں بریک نہ بھی لگاتا تو گاڑی رک جاتی کیونکہ انہوں نے آخر میں ٹائروں پہ بھی فائر کر دیے تھے اور میں بھاگنے سے پہلے انہوں نے ایک بار رک کر علیزے بی بی کو دیکھا تھا وہ رو رہی تھیں وہ ان کو دیکھ کر چلے گئے تھے وہ چاہتے علیزے بی بی کو مار سکتے تھے، ان کے ہاتھ میں اسلحہ بھی تھا لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا اور چلے گئے، پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ بعد میں کیا ہوا؟" خیرو بابا نے تفصیل سے بتایا تھا۔

"کیا آپ ان کو پہچان سکتے ہیں؟"

"نہیں صاحب ان کے چہرے پہ رومال بندھے ہوئے تھے۔" خیرو بابا نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ کی نظر ان کی موٹر سائیکل یا نمبر پلیٹ پہ گئی ہو؟" وہ ہر طرح سے تصدیق اور تسلی چاہتا تھا۔

"صاحب! جب موت سر پہ کھڑی ہو تو ان چیزوں کا ہوش کسے رہتا ہے؟" وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے آذر چند لمحے کے لیے خاموش ہو کے رہ گیا تھا اس کے ذہن میں پن چبھ کے رہ گئی تھی کہ ان لوگوں نے کچھ دیر رک کر، گاڑی میں جھانک کر علیزے کو دیکھا اور کچھ بھی کیے بغیر چلے گئے؟ اگر وہ چاہتے تو علیزے کو مار سکتے تھے، زخمی یا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس کی جان لے سکتے تھے مگر.....؟" اور اس مگر نے آذر کی الجھنوں میں اضافہ کر دیا۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کیا اور علیزے کی زندگی بخش کر چلے گئے؟ کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ کیا مقصد تھا ان کا؟

وہ جتنا ہی سوچتا اتنا ہی الجھتا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

"ایک سوال اور....."

"کیا پہلے کبھی علیزے کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہوئے، ٹریننگ کے دوران یا کالج کے آس پاس کوئی مشکوک آدمی نظر آیا جس کو آپ نے دو تین بار لگاتار دیکھا ہو؟"

"صاحب انہی لوگوں کو دیکھتا تھا جو اپنی بچیوں کو چھوڑنے آتے تھے کسی کے ساتھ بھائی ہوتا تھا کسی کے ساتھ باپ گاڑی پہ آتے تھے کوئی موٹر سائیکل پہ..... میں بھلا کس کس کو یاد رکھ سکتا ہوں؟" آذر کو آخری سوال کا جواب بھی مل گیا تھا باقیوں جیسا۔

"ہوں..... کوئی بات نہیں آخر پتا چل ہی جائے گا۔" آذر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ آرام کریں، میں مبارک خان کو اندر بھیجتا ہوں۔" وہ ان کا ہاتھ تھپک کر باہر نکل آیا۔ باہر کشادہ راہداری میں رکھے پلنگ پر بیٹھا مبارک خان اخبار پڑھ رہا تھا آذر سست قدموں سے مبارک خان کے پاس آ کھڑا ہوا مبارک خان اسے دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔

"خیریت تو ہے نا صاحب؟ آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہوں..... نہیں کوئی پریشانی نہیں تم خیرو بابا کا خیال رکھو اور کسی بھی چیز کی ضرورت پڑے مجھے فون پہ بتا دینا، شام کو واپس آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب جیسے آپ کا حکم۔" وہ فوراً حکم بجا لایا اور آذر ہسپتال کے احاطے سے نکل آیا تھا اس کا رُخ بڑی حویلی کی طرف تھا لیکن سوچوں کے رُخ نجانے کہاں سے کہاں جا رہے تھے، کوئی کہیں تو کوئی کہیں پہنچا ہوا تھا۔ ریشم کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی اکتا دماغ شل ہو کے رہ گیا تھا۔

یہ تو اس کی ہمت تھی کہ کل سے لگاتار اُلجھ بھی رہا تھا اور بھاگ دوڑ بھی کر رہا تھا یہاں تک کہ سب کا خیال بھی رکھ رہا تھا ہر اونچ نیچ پہ نظر تھی، برا بھلے بُرے کا احساس تھا، کیا ظاہر کرنا تھا اور کیا چھپانے رکھنا تھا اس پہ بھی اس کا دھیان تھا اور یہ سب اس کی خوبیوں اور بلند حوصلے کی نشانی تھی وہ گھر پہنچا تو وہ لوگ لنچ پہ اس کا ویٹ کرتے نظر آئے تھے لیکن پتنا فریش وہ صبح نظر آ رہا تھا اس وقت اتنا ہی ست اور اُلجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"آذر بھائی شکایت کر دیا آپ نے؟ مجھے کب سے بھوک لگ رہی تھی۔" علیزے اسے دیکھتے ہی بچارگی سے بولی۔

"تو تم کھا لیتیں۔" آذر سوچوں کا بوجھ تھوڑی دیر کے لیے جھٹکتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"آپ نے صبح میرے بغیر ناشتہ نہیں کیا تو میں لنچ کیسے کر لیتی؟" علیزے کا جواب بھی کھرا تھا آذر اتنی ٹینشن کے باوجود مسکرا دیا۔

"ٹھینک یو سو مچ اتم نے مجھے یاد رکھا، میرا انتظار کیا، بھوک برداشت کی، ٹھینک یو سو مچ۔" وہ آہستگی سے اس کا گال چھوتے ہوئے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا وقار آفندی، اسرار آفندی اور ان کی بیگمات بھی وہیں موجود تھیں۔ حرمت، مدحت، جویریہ، اشیہ اور احمد بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے، آذر نے کلاک کی سمت دیکھا تین بج رہے تھے گویا وہ سبھی اپنے وقت پہ کالج اور یونیورسٹی سے آئے تھے بس وہ لیٹ پہنچا تھا۔

"خیال کہاں ہے؟" اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے پوچھا۔

"کچھی میں۔" جواب احمد نے دیا تھا۔

"کیوں کیا کر رہا ہے؟" آذر نے اپنے سامنے نیپکن پھیلاتے ہوئے کہا۔

"آرام۔" اس نے آرام پہ زور دیا۔

"ابھی تک تھکن نہیں اُتری؟"

"رات کی تھکن رات ہی اُتار سکتی ہے، دن میں چاہے جتنا بھی آرام کر وہ کمی پوری نہیں ہوتی۔" احمد نے جواز پیش کیا۔

"اگر آج کی رات دوبارہ جاگنا پڑ گیا تو؟" آذر نے احمد کو بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔

"نن..... نہیں آذر بھائی ایک رات میں ہی کر تختہ بن گئی ہے اگر آج کی رات بھی لگ گئی تو سمجھیں ہم آپ کو "تخت" پہ نظر آئیں گے سیدھے، اکڑے ہوئے اور ٹھنڈے۔" احمد نے ہولناک سا نقشہ کھینچا تھا۔

"احمد کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" ثمرہ بیگم نے بیٹے کو سرزنش کی۔

"ممی آپ بھی تو دیکھیں ہم پہ کون سا ظلم ہو رہا ہے۔" احمد نے منمنا کے کہا۔

"یہ تھکم ہے؟" وہ گھورنے لگیں۔

"تو اور کیا ہے؟" وہ روہانسا ہونے لگا۔

"یہ کسی بیمار کی عیادت اور خدمت کا موقع ہے، فائدہ اُٹھاؤ اور ثواب حاصل کرو۔"

"یہ فائدہ اور ثواب پوری حویلی میں کوئی اور کیوں نہیں حاصل کر رہا؟" اس کا انداز ایسا تھا کہ آذر ہنسی چھپانے کے لیے پانی

کا فلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگانے پہ مجبور ہو گیا تھا جبکہ حرمت وغیرہ ہنسی نہیں روک سکی تھیں وقار آفندی بھی مسکرا رہے تھے کہ کی علیزے جو ہنس رہی تھی اس کی ہنسی ان کی رگوں میں زندگی دوڑا دیتی تھی۔

وہ لوگ ہنسی مذاق میں لنچ کر رہے تھے اتنی ٹینشن اور پریشانیوں کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے خوشگوار ماحول کافی ایجاد تھا جب اچانک آذر کے سیل پہ میسج ٹیون بجی۔ اس نے فوراً سیل نکال کر دیکھا۔

''آذر آفندی کیا خیر دہانے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال میں لے کر گئے تھے؟'' وہ میسج کر دنگ رہ گیا تھا۔

اس کا دماغ چکرا گیا تھا اور کانوں میں سے جیسے دھواں نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا وہ ششدر سا بیٹھا موبائل سکرین پہ نظر آتے کو دیکھ رہا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں کھانے کا چمچہ تھا اور ایک ہاتھ میں موبائل فون..... لیکن دونوں چیزوں کو تھامنے کے باوجود اس دونوں ہاتھ اپنی اپنی جگہ پہ ساکت ہوئے لگ رہے تھے اور یہی حال اس کی نظروں کا بھی تھا جو موبائل اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں۔

''آذر! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟'' اس کی یہ مختصر سی کیفیت سب سے پہلے وقار آفندی نے ہی نوٹ کی تھی جس پہ سب بھی آذر کی سمت متوجہ ہوئے تھے اور آذر یکدم چونک گیا تھا۔

''خیریت تو ہے نا؟'' آذر کے چہرے پہ پریشانی اور اُلجھن کے سائے صاف نظر آ رہے تھے۔

''جی..... سب خیریت ہے، ڈونٹ وری۔'' اس نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

''میسج کس کا تھا؟''

''میرے ایک دوست کا تھا۔'' اس نے بہانا بنا دیا۔

''تو پھر اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟'' وقار آفندی اسے کریدنے لگے تھے۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔'' آذر کو اپنا جھوٹ نبھانے کے لیے مزید جھوٹ بولنا پڑا۔

''اوہ..... تو اس سے مل آؤ جا کر۔''

''ابھی میں تھکا ہوا ہوں، آرام کروں گا۔'' آذر لاپروائی سے کہتا چمچہ رکھ کر پانی پیتے ہوئے فوراً ہی کھڑا ہو گیا تھا ان کی خبر سی نظریں آذر پہ ہی تھیں لیکن ان میں سے صرف علیزے کی نظریں ایسی تھیں جن میں حیرانی نہیں بلکہ خوف اور دہشت گی لہر رہی تھی۔ آذر اس کی نظروں سے تھوڑی دیر کے لیے نظر چراتا وہاں سے چلا آیا تھا اس کا رُخ اپنے بیڈروم کی طرف تھا وہ بڑی سے سیڑھیاں طے کرتا اپنے بیڈروم میں آیا تھا اور سب سے پہلے موبائل نکال کر دانیال کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

''ہیلو.....'' دانیال کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

''دانیال! میں آذر بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں میں نمبر دیکھ چکا ہوں، کہاں ہو تم؟''

''میں حویلی میں ہوں، تم ابھی بیڈروم میں آؤ، میں نے تم سے بات کرنی ہے۔'' آذر کا لہجہ عجلت بھرا تھا۔

''کیا؟ تم حویلی میں ہو؟'' اب کی بار دانیال کو اچنبھا ہوا تھا کہ وہ حویلی میں موجود ہو کر بھی فون پہ رابطہ کر رہا ہے آخر کیا وجہ ہے؟

''ہاں حویلی میں ہوں، تم جلدی آؤ اور ہاں کسی کو بتانا مت کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' آذر نے فون بند کرنے سے پہلے تاکید کی تھی۔

''اوکے۔'' دانیال نے فون بند کر دیا اور آذر اپنے بیڈروم میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا تھا اور اگلے دس منٹ میں دانیال اس کے بیڈروم میں اس کے سامنے تھا۔

''سب خیریت تو ہے نا؟'' دانیال نے پھونچتے ہی سوال کیا۔

''خیریت ہوتی تو تمہیں نیند سے نہ جگاتا۔'' آذر کے انداز و اطوار سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

''کیوں؟ کیا ہوا ہے؟'' دانیال بھی متفکر سا ہو چکا تھا۔

''میں آج خیر دہانا سے ملنے ہسپتال گیا تھا۔'' اس نے جیسے اپنے اضطراب کو بیان کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

''پھر؟''

"پھر میں نے ان سے حال چال پوچھنے کے بعد ان سے چند سوال پوچھے اور انہوں نے وہی جواب دیے جو وہ جانتے تھے۔"

"کیسے سوال پوچھے تھے؟"

"یہی کہ جن دو لڑکوں نے فائرنگ کی وہ ان کو پہچان سکتے ہیں یا نہیں؟"

"پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"وہی جو ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ ان کے چہروں پہ رومال بندھے ہوئے تھے اس لیے پہچاننا بہت مشکل کام ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کو ہسپتال کون لے کر گیا تھا؟"

"تو اب تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے؟" دانیال آذر کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے موبائل دانیال کے سامنے کر دیا۔

"آذر آخری کیا خبر بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہ ان کو ہسپتال بھی لے کر گئے تھے؟" دانیال بھی میسج پڑھ کر شاید شاکڈ رہ گیا تھا یہ میسج اب سے بیس منٹ پہلے کا تھا یعنی تازہ ترین..... اس کے کانوں سے بھی دھواں اسی طرح نکلا تھا جیسے آذر کے کانوں سے نکلا تھا۔

"اس نمبر پہ ڈائی کیا تم نے؟" دانیال نے سکرین پہ نظر آتے نمبر کو دیکھا۔

"یقیناً آف ہوگا۔" آذر کو یقین تھا۔

"ڈائی تو کرو۔"

"تم خود کر کے دیکھ لو۔" اس نے موبائل دانیال کو پکڑا دیا۔ اور پھر سچ مچ وہ نمبر پاور آف ملا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو تم؟" دانیال اس کا پُر سوچ انداز بھانپ چکا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ صرف فائرنگ ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اور مسئلے بھی سامنے آ رہے ہیں ایک ہی مسئلے کی کئی شاخیں نکل رہی ہیں۔" آذر کا انداز ہنوز پُر سوچ سا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" دانیال الجھا۔

"یار مطلب کو نہ دیکھو، تم غور کرو، علیزے پہ فائرنگ ہوئی لیکن علیزے کو نقصان نہیں پہنچا، فائرنگ کے فوراً بعد ڈیڈ کو ان کے پرسنل نمبر پہ اطلاع دی گئی۔ حالانکہ ڈیڈ کا نمبر حادثے کے وقت نہ علیزے نے کسی کو دیا تھا نہ خیرو بابا نے، یعنی نمبر پہلے سے موجود تھا؟ پھر میڈیا والوں کو خرید لیا گیا، یعنی جتنا پیسہ میں نے دیا تھا اس سے زیادہ پیسہ اس آدمی نے دیا ہوگا؟ ڈیڈ صبح خیرو بابا کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے تو میڈیا والے بھی ان کے پیچھے پہنچ گئے، یعنی انہیں خبر کی گئی تھی؟ پھر میں ہسپتال گیا تو بھی خبر ہو گئی کہ میں خیرو بابا سے ملنے گیا ہوں یہاں تک کہ میرے پرسنل نمبر پہ میسج بھی بھیج دیا ہے اور اس ساری صورتحال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی کس حد تک باخبر ہے اور کس حد تک ہم پہ نظر رکھے ہوئے ہے؟" آذر نے اپنی سوچ کا اظہار کافی تفصیل سے کیا تھا۔

"یہ تو تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن کیا کیا جا سکتا ہے اب؟" دانیال بھی اس کی سوچ پہ متفق تھا۔

"یہی کہ ہم حد سے زیادہ محتاط ہو جائیں، کوئی بات کسی سے ڈسکس نہ کریں، ہر بات اپنے تک محدود رکھیں، اور جو بھی قدم اٹھائیں اس کا کسی کو بھی علم نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہمارے بڑوں کو بھی نہیں، کیونکہ ہمارے بڑے بھی بات کو نہیں چھپا سکتے اور آج کے بعد ہر بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی، کوئی تیسرا کچھ بھی نہ سنے۔" آذر نے اسے اچھی طرح سمجھایا۔

"اوکے ایز یو وش۔" دانیال نے سر جھکا دیا۔

"اور اب میرا خیال ہے کہ جو بھی پوچھ گچھ کرنی ہے وہ تم کرو گے، تم ہسپتال جاؤ اور پتا کرنے کی کوشش کرو کہ جن لڑکوں نے خیرو بابا کو ایڈمٹ کروایا تھا انہوں نے اپنا نام و پتا درج کروایا تھا؟" آذر نے اسے کام سونپا۔

"اوکے میں پتا کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر مجھے بتا دینا۔" آذر نے تاکید کی۔

"اس نمبر کا کیا بنا جس سے کل ڈیڈ کے نمبر پہ کال آئی تھی؟" دانیال جاتے جاتے پھر واپس پلٹا۔

"میں نیلی فون ایکسچینج گیا تھا۔ سپروائزر سے ملاقات ہوئی تھی وہ کہتے ہیں کچھ دیر تک ساری انفارمیشن میل کر دیں گے۔"

آذر نے کی دی اور دائیاں باہر نکل گیا تھا۔

♥

''کومل.....'' وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب پیچھے سے حرمت کی آواز سنائی دی۔

''ہوں؟'' اس نے پلٹ کر دھیمے سے کہا۔

''لنچ نہیں کرو گی۔''

''نہیں بھوک نہیں ہے۔''

''کیوں آج بھوک کہاں اُڑ گئی؟'' حرمت کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیوں؟ میری بھوک کیوں اُڑے گی؟'' کومل نے اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔

''بس ویسے ہی.....'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تم ملازمہ سے کہو کھانا لگائے میں پیکنگ کر کے آ رہی ہوں۔'' کومل کہہ کر اوپر بیڈ روم چلی گئی تھی اور حرمت حسب توقع ہاں والے جواب پہ مسکراتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر کومل بھی وہیں چلی آئی۔

''کھانے میں کیا بنا ہے آج؟'' وہ کرسی گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''مٹن رائس اور مٹن کڑاہی اور ساتھ میں باقی لوازمات۔''

''اف یار آج پھر مٹن؟'' کومل کو کھانے میں چکن پسند تھا۔

''آذر بھائی اور ڈیڈ نے گھر پہ ہی لنچ کرنا تھا اس لیے ان کی پسند کو مدنظر رکھا گیا تھا۔'' حرمت نے آگاہ کیا۔

''اور علیزے نے؟'' کومل کو آذر اور ڈیڈ کے بعد علیزے کا خیال آیا۔

''اس کا کھانا تو پہلے ہی رجو نے تیار کرنا ہوتا ہے یقیناً کوئی دیسی نیمل بنائی ہوگی، یہ مٹن اور چکن تو اسے پسند ہی نہیں ہے۔'' حرمت سلاد کی پلیٹ میں سے مولی کی کاش اُٹھاتے ہوئے بولی۔

''ہاں..... یہ تو میں بھول ہی گئی۔'' کومل جھٹ سے بولی اور کھانا نکالنے لگی۔

''تم بتاؤ سفر کیسا رہا؟'' حرمت بالآخر اپنے مطلب کی بات پہ آ ہی گئی تھی۔

''کون سا سفر؟'' وہ انجان بنی۔

''جس پہ تمہیں بھیجا تھا۔''

''آخری سفر؟'' کومل بے ساختہ بولی۔

''بکومت، صاف صاف بتاؤ، سفر کیسا رہا اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟'' حرمت کو بے چینی ہو رہی تھی۔

''یار کیسا سفر اور کیسی باتیں چھوڑو کوئی اور بات کرو۔'' کومل کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

''کیوں کوئی اور بات کروں تم کچھ تو بتاؤ نا۔'' وہ اصرار کر رہی تھی۔

''تمہیں مایوسی ہوگی۔'' کومل کا انداز لاپروا سا تھا اور بات بھی خاصے نارمل سے انداز میں کر رہی تھی۔

''وہ کیوں؟ آخر تمہیں کس کے لیے بھیجا تھا؟'' حرمت کو تاؤ آ گیا تھا۔

''کس لیے بھیجا تھا؟'' کومل نے پانی گلاس میں اُنڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''باتیں کرنے کے لیے۔'' وہ زور دے کر بولی۔

''کیسی باتیں؟'' پھر وہی انجان پن۔

''کومل پلیز۔'' حرمت جھنجلا گئی۔

''یار پوچھ رہی ہوں نا کہ کیسی باتیں؟'' کومل نے پھر سوال دہرایا۔

''تمہاری باتیں اور ان کی باتیں۔'' اب کی بار حرمت چبا کر بولی تھی۔

''ہوں..... یعنی ہماری باتیں؟ دیکھو حرمت میری باتیں یہ تھیں کہ میری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے اور میں کون سے ایئر میں ہوں؟ اور ان کی باتیں یہ تھیں کہ وہ علیزے کے لیے بہت پریشان ہیں اور علیزے آج کل ڈسٹرب ہے۔ بس اس کے بعد فون کال

PRIME URDU NOVELS

تھی اور باتیں ختم۔" کومل نے کافی استہزائیہ سے لہجے میں بتایا تھا۔
"بس یہ باتیں؟" حرمت کو افسوس ہوا۔
"بس یہ سفر۔" کومل نے ساتھ لقمہ دیا۔
"لیکن کومل۔"
"پلیز حرمت اب کوئی صفائی دینا، میں سب جانتی ہوں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی۔
"کومل یار سنو تو۔۔۔" حرمت نے پکارا۔ مگر وہ وہاں رُکے بغیر چلی گئی تھی اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

♥

"استاد میں بڑے دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔" چھوٹا پرانے کپڑے سے اپنے تیل سے بھرے ہاتھ پونچھتا ہوا عدیل کے پاس آ بیٹھا۔ عدیل ورکشاپ کے لیے نئے پرزے منگوانے کے لیے لسٹ بنا رہا تھا لیکن چھوٹے کی بات پر ٹھہر گیا۔
"کیا بات سوچ رہے ہو۔" عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"پہلے وعدہ کرو کہ جواب ضرور دو گے۔" چھوٹے نے پہلے وعدہ لیا، عدیل کو حیرت ہو رہی تھی۔
"اوکے ضرور دوں گا۔"
"تو پھر بتاؤ کہ "مٹی" کیوں بدنام ہوئی؟" چھوٹا سنجیدہ سا منہ بنا کے بولا تھا۔
"یہ؟" عدیل کو مزید حیرت نے آ گھیرا اور دور کھڑے سلو اور جیدی کو دیکھ کر چھوٹے کی شرارت سمجھ گیا تھا وہ دونوں ہنس رہے تھے۔
"استاد کا استاد مٹی کیوں بدنام ہوئی۔" چھوٹے نے اصرار کیا۔
"اوورلنگ تیرے لیے۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا اور چھوٹا خوشی اور فتح کے احساس سے قہقہے لگاتا اٹھ کر سلو کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔
"دیکھا استاد کو بھی پتا ہے، مٹی میرے لیے بدنام ہوئی ہے، تم تو صرف نام کے سلمان خان ہو۔" اس نے سلو کو چڑایا تھا۔
"تیرے لیے بدنام ہونے سے بہتر تھا کہ مٹی مر ہی جاتی۔" سلو چھوٹے کو پرے دھکیلتا ہوا گاڑی کے انجن پہ جھک گیا تھا۔
"یار تم شیلا کی جوانی گانا شروع کرو۔" جیدی نے سلو کو چھیڑا تھا۔
"اور یہ کچھ کھے کا کہ شیلا تو اس کی منگیتر رہی ہے۔" سلو نے چھوٹے کو گھور کے دیکھا تھا اور عدیل ان کی شرارتوں اور چھیڑ چھاڑ پہ مسکراتا ہوا دوبارہ لسٹ کی طرف متوجہ ہوا تھا ان لوگوں کو پورا دن کسی نہ کسی گانے یا فلم پہ بحث اور نوک جھوک ہوتی ہی رہتی تھی اور کوئی نہ کوئی چسکا تو ایکٹرز اور ایکٹرز کو گفتگو میں گھسیٹ لاتے تھے اور جو جس کا دیوانہ ہوتا تھا اس کے بارے میں معلومات کا خزانہ بھی رکھتا تھا اور ایسے چکروں میں اگر وہ ورکشاپ کا کوئی کام ادھورا رہ جاتا تو باؤ امتیاز کے ہاتھوں ان کی شامت آ جاتی تھی اس وقت بھی کچھ ایسا ہی سال نظر آ رہا تھا۔
"یار باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کر لیا کرو یہ گاڑی آج ہی ٹھیک کر کے شیخ صاحب کے گھر پہنچانی ہے استاد تاکید کر کے گئے ہیں۔" عدیل نے بالآخر ان کو ٹوک ہی دیا تھا۔
"اور استاد نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ شیخ صاحب پیسے نہ دیں تو گاڑی اسی طرح واپس ورکشاپ ہی لے آنا۔" چھوٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔
"پھر شیخ صاحب خود گاڑی کی طرح بھاگتے ہوئے پیچھے آئیں گے۔" سلو نے بھی حصہ لیا اور عدیل چاہتے ہوئے بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا۔
"چلو اب باتیں بعد میں کرنا پہلے کام ختم کرو۔" اس نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔
"استاد سارا دن کام ہی تو کرتے رہتے ہیں۔" جیدی نے بیزاری سے کہا۔
"اوئے کمبخت سارا دن کام کرتے ہو تو کیا کام کے پیسے نہیں لیتے؟" باؤ امتیاز نے اندر آتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی

اور حمید کی بیدم آپس پڑا تھا۔

''نہیں استاد میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔'' اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں، تُو کتنا بڈ حرام ہے کام چور ہے تُو۔'' باؤ امتیاز کو موقع مل گیا اسے کھری کھری سنانے کا۔ جھکائے سنتا رہا اور باقی دونوں بڑی شرافت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود بخود اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے ان کو کرتا باؤ امتیاز، عدیل کے قریب آ کر کے۔

''بن گئی لسٹ؟''

''جی بن گئی ہے۔'' عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''کتنا خرچہ آئے گا؟'' وہ ٹوٹل حساب پوچھ رہے تھے۔

''تقریباً بیس سے پچیس ہزار کا سامان ہو گا یہ سارا۔'' عدیل نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہوں..... تو پھر ایسا کرو یہ سامان کل گوجرانوالہ جا کر لے آؤ، حمید کی مارکیٹ میں جانا اور میرا نام لینا، وہ سارا سامان ریٹ میں دیں گے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے میں جا کر لے آؤں گا، آپ سب کچھ سمجھا دیجیے گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہوں..... شام تک سب دوں گا اور سامان کے لیے رقم بھی دے دوں گا۔'' باؤ امتیاز کو اس پہ بھروسہ تھا اسی لیے اب ہر چھوٹے موٹے کام کی ذمہ داری ہی سونپتے تھے۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

''اور ہاں ایک بات بتاؤ، تمہارے ابا جی کیسے ہیں؟'' باؤ امتیاز کچھ یاد آنے پہ واپس مڑتے ہوئے ٹھہر گئے تھے۔

''اب ابا جی کی طبیعت کے لیے میں کیا کہوں؟'' عدیل نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ ان کی طبیعت ویسی ہی ہے جیسی پچھلی دو سالوں سے چلی آ رہی ہے، اب کون سا علاج کروا رہے ہیں جو انہیں فرق آ جائے گا؟'' عدیل جیسے اپنے آپ پہ طنز کر رہا تھا حالانکہ وہ بڑا صابر و شاکر سا بندہ تھا۔

''تو علاج کیوں نہیں کروا رہے؟'' باؤ امتیاز کا سوال بہت بے ساختہ سا تھا۔ عدیل، باؤ امتیاز کو دیکھتا رہ گیا۔ ''چپ کیے گئے ہو؟''

''استاد آپ صرف اتنا جانتے ہیں کہ میرے ابا جی بیمار ہیں، نہ چل پھر سکتے ہیں، نہ خود کچھ کھا پی سکتے ہیں لیکن آپ یہ جانتے کہ میری بہنیں بھی ہیں جن کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے کہ میری ہی ذمہ داری ہے ایسے میں گھر کا نظام چلے یا پھر ابا جی کا علاج؟'' عدیل نے ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا باؤ امتیاز چپ کے چپ رہ گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ عدیل اتنا خاموش خاموش اور سنجیدہ سنجیدہ سا کیوں رہتا ہے؟

''دیکھیے استاد میں ورکشاپ میں کام کر رہا ہوں، جہاز کا انجینئر نہیں ہوں کہ ایک دم سے میرے گھر کے سارے مسئلے حل جائیں پورا مہینہ گاڑیوں کی مرمت ہو گی تب جا کر تنخواہ ملے گی، اپنی وے آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا بس اللہ سے دعا کرنی چاہیے۔'' اس نے باؤ امتیاز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اُلٹا انہیں تسلی دی تھی۔

''باؤ عدیل! تُو تو واقعی بڑے حوصلے اور بڑے صبر والا ہے؟'' باؤ امتیاز آہستہ سے سراہنے والے لہجے میں بولا تھا۔

''استاد مشکلیں اور مصیبتیں خود ہی انسان کو صبر اور حوصلہ سکھا دیتی ہیں اس میں کسی کی تسلی اور ہدایت کی ضرورت بھی نہیں سب کچھ خود بخود آ جاتا ہے۔'' عدیل کا انداز ٹھہرا ہوا تھا۔

''اللہ تمہیں اس صبر کا اجر دے گا۔'' انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

''آمین۔'' وہ آہستہ سے کہہ کر کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن باؤ امتیاز کا دھیان کافی دیر اسی کی طرف لگا رہا تھا۔

♥

وہ آج صبح کافی جلدی اُٹھ گیا تھا اور جاگنگ پہ جانے کے بجائے شاور لینے باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد شاور

باہر نکلا تو دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ آجاؤ۔" اسے پتا تھا باہر کون ہوگا؟

"جی صاحب کس وقت نکلنا ہے؟" گلاب خان حکم کی تعمیل کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"سات بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے، آٹھ بجے کی فلائٹ ہے اور صبح صبح اتنا رش ہوتا ہے کہ راستے میں لیٹ ہونے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم ذرا پہلے پہنچ جائیں۔" وہ اپنے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے بولا۔

"جی صاحب یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" گلاب خان نے اتفاق کیا۔

"ہوں تم کل سے کہو کہ وہ جلدی سے ناشتہ بنا کر تیار ہو جائے، ہم راستے میں اسے نبیل کے گھر ڈراپ کر جائیں گے۔" اس نے واش روب کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔

"جی صاحب کہہ دیتا ہوں۔" گلاب خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور زلفی سے کہو اب تمہاری صرف نائٹ ڈیوٹی نہیں بلکہ فل ٹائم جاب ہوگی۔" اس نے ایک اور حکم دیا۔

"فل ٹائم؟" گلاب خان کو حیرت ہوئی۔

"ہاں یار! نبیل ہزاروں کاموں کے لیے ادھر سے ادھر بھاگنا پڑتا ہے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی گیٹ کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا، اس لیے بہتر ہے کہ زلفی کو پکا پکا واچ مین رکھ لیا جائے، تمہاری پرابلم اور بھاگ دوڑ کم ہو جائے گی اور وہ بھی ایک جگہ فٹ جائے گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے آخر میں گلاب خان سے استفسار کیا۔

"صاحب میرا خیال آپ کے خیال سے اچھا نہیں ہو سکتا، آپ نے جو بھی سوچا ہے بہتر سوچا ہے۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

"ٹھیک ہے تم جاؤ، گاڑی تیار کرو، میں آ رہا ہوں بس۔" اس نے گلاب خان کو اجازت دی اور خود تیار ہونے لگا دس منٹ میں وہ تیار ہوا، ناشتہ کیا تھا۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھا گل بھی چادر لے کر آ گئی تھی۔ گلاب خان اس کے لیے بیک ڈور کھول رہا تھا وہ پیچھے بیٹھ گئی اور خود آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج گیٹ پہ گلاب خان کے بجائے زلفی تھا جیسے ہی گاڑی سٹارٹ ہوئی اس نے گیٹ کھول دیا تھا اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے دل آور شاہ کو سلام کیا جواباً وہ بھی اشارے سے وعلیکم السلام کہنا نہیں بھولا تھا۔

"پیدل بڑھاؤ یار۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب ہم سات بجے ان شاء اللہ ایئرپورٹ پہ ہوں گے۔" گلاب خان کو اپنی ڈرائیونگ پہ یقین تھا۔ دل آور شاہ اپنا موبائل نکال کر میسجز ٹائپ کرنے لگا۔

"السلام علیکم سر۔" دوسری طرف اس کا منشی قادر تھا۔

"میں آج گھر سے نہیں آ رہا، تم آفس کا چکر لگا لینا۔"

"سر آج تو بہت اہم کیس۔۔۔"

"قادر! میں جانتا ہوں یہ کیس کتنا اہم ہے؟ لیکن میرے دوست نبیل سے زیادہ اہم نہیں ہے، میں اگلی تاریخ پہ سب ہینڈل کر لوں گا۔ تم بس تاریخ لے لو۔" اس نے منشی کو سمجھایا۔

دل آور شاہ نے کبھی بھی اپنے کسی کام میں کوتاہی نہیں کی تھی اور نہ ہی اپنے کلائنٹس کو خوار کرتا تھا بس آج کل اس کی مصروفیت ہی ایسی بڑھ گئی تھی کہ اسے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔

"آپ کل تو کورٹ آئیں گے نا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا کل کا کام تمہیں کل ہی بتا دوں گا۔"

"سر وہ مومنہ بی بی۔۔۔"

"پلیز قادر میں اس وقت کسی بھی مومنہ بی بی کو ڈسکس نہیں کر سکتا، یہ کام پھر کبھی پہ اٹھا رکھو۔" اس نے قادر کو روک دیا۔

"سوری سر!"

"اوکے رات کو مجھے فون کر کے ساری تفصیل بتا دینا۔"

اور اپنی جگہ دم توڑ چکا تھا۔

"نہیں استاد میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔" اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں، تُو کتنا بڑا حرام ہے کام چور ہے تُو۔" باؤ امتیاز کو موقع مل گیا اسے کھری کھری سنانے کا۔ جھکائے سنتا رہا اور باقی دونوں بڑی شرافت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود بخود اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ ان کو ہاتھ کر باؤ امتیاز، عدیل کے قریب آ رُکے۔

"بن گئی لسٹ؟"

"جی بن گئی ہے۔" عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"کتنا خرچہ آئے گا؟" وہ ٹوٹل حساب پوچھ رہے تھے۔

"تقریباً بیس سے پچیس ہزار کا سامان ہو گا یہ سارا۔" عدیل نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہوں..... تو پھر ایسا کرو یہ سامان کل گوجرانوالہ جا کر لے آؤ، حمید کی مارکیٹ میں جانا اور میرا نام لینا، وہ سارا سامان سستے ریٹ میں دیں گے۔" انہوں نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے میں جا کر لے آؤں گا، آپ سب کچھ سمجھا دیجیے گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہوں..... شام تک سب کچھ دوں گا اور سامان کے لیے رقم بھی دے دوں گا۔" باؤ امتیاز کو اس پہ بھروسہ تھا اسی لیے اب ہر چھوٹے موٹے کام کی ذمہ داری اسے ہی سونپتے تھے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"اور ہاں ایک بات بتاؤ، تمہارے ابا جی کیسے ہیں؟" باؤ امتیاز کچھ یاد آنے پہ واپس مڑتے ہوئے ٹھہر گئے تھے۔

"اب ابا جی کی طبیعت کے لیے میں کیا کہوں؟" عدیل نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ ان کی طبیعت ویسی ہی ہے جیسی پچھلی دو سالوں سے چلی آ رہی ہے، اب کون سا علاج کروا رہے ہیں جو اتنی فرق آ جائے گا؟" عدیل جیسے اپنے آپ پہ طنز کر رہا تھا حالانکہ وہ بڑا صابر و شاکر سا بندہ تھا۔

"تو علاج کیوں نہیں کروا رہے؟" باؤ امتیاز کا سوال بہت بے ساختہ سا تھا۔ عدیل، باؤ امتیاز کو دیکھتا رہ گیا۔ "چپ کیوں گئے ہو؟"

"استاد آپ صرف اتنا جانتے ہیں کہ میرے ابا جی بیمار ہیں، نہ چل پھر سکتے ہیں، نہ خود کچھ کھا پی سکتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ میری بہنیں بھی ہیں جن کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے کہ میری ہی ذمہ داری ہے ایسے میں گھر کا نظام چلے یا پھر کی علاج؟" عدیل نے ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا باؤ امتیاز چپ کے چپ رہ گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس ہو گیا کہ عدیل اتنا خاموش خاموش اور سنجیدہ سا کیوں رہتا ہے؟

"دیکھیے استاد میں ورکشاپ میں کام کر رہا ہوں، جہاز کا انجینئر نہیں ہوں کہ ایک دم سے میرے گھر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں پورا مہینہ گاڑیوں کی مرمت ہو گی تب جا کر تنخواہ ملے گی، اپنی وے آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا بس اللہ سے بہتری کی دعا کرنی چاہیے۔" اس نے باؤ امتیاز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

"باؤ عدیل! تُو تو واقعی بڑے حوصلے اور بڑے صبر والا ہے؟" باؤ امتیاز آہستہ سے سراہنے والے لہجے میں بولا تھا۔

"استاد مشکلیں اور مصیبتیں خود ہی انسان کو صبر اور حوصلہ سکھا دیتی ہیں اس میں کسی کی تسلی اور ہدایت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی سب کچھ خود بخود آ جاتا ہے۔" عدیل کا انداز ٹھہرا ہوا تھا۔

"اللہ تمہیں اس صبر کا اجر دے گا۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔

"آمین۔" وہ آہستہ سے کہہ کر کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن باؤ امتیاز کا دھیان کافی دیر اسی کی طرف لگا رہا تھا۔

♥

وہ آج صبح کافی جلدی اُٹھ گیا تھا اور جاگنگ پہ جانے کے بجائے شاور لینے باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد شاور لے کر

باہر نکلا تو دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
"ہوں..... آجاؤ۔" اسے پتا تھا باہر کون ہوگا؟
"جی صاحب کس وقت نکلنا ہے؟" گلاب خان حکم کی تعمیل کے لیے تیار کھڑا تھا۔
"سات بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے، آٹھ بجے کی فلائٹ ہے اور صبح صبح اسٹارش ہوتا ہے کہ راستے میں لیٹ ہونے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم ذرا پہلے پہنچ جائیں۔" وہ اپنے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے بولا۔
"جی صاحب یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" گلاب خان نے اتفاق کیا۔
"او کے تم گل سے کہو کہ وہ جلدی سے ناشتہ بنا کر تیار ہو جائے، ہم راستے میں اسے نبیل کے گھر ڈراپ کر جائیں گے۔" اس نے وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔
"جی صاحب کہہ دیتا ہوں۔" گلاب خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"اور زلفی سے کہو اب تمہاری صرف نائٹ ڈیوٹی نہیں بلکہ فل ٹائم جاب ہوگی۔" اس نے ایک اور حکم دیا۔
"فل ٹائم؟" گلاب خان کو حیرت ہوئی۔
"ہاں یار! تمہیں ہزاروں کاموں کے لیے ادھر سے ادھر بھاگنا پڑتا ہے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی گیٹ کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا، اس لیے بہتر ہے کہ زلفی کو پکا پکا واچ مین رکھ لیا جائے، تمہاری پرابلم اور بھاگ دوڑ کم ہو جائے گی اور وہ بھی ایک جگہ ٹک جائے گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے آخر میں گلاب خان سے استفسار کیا۔
"صاحب میرا خیال آپ کے خیال سے اچھا نہیں ہو سکتا، آپ نے جو بھی سوچا ہے بہتر سوچا ہے۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟
"ٹھیک ہے تم جاؤ، گاڑی تیار کرو، میں آ رہا ہوں بس۔" اس نے گلاب خان کو اجازت دی اور خود تیار ہونے لگا دس منٹ میں وہ تیار ہوا اور ناشتہ کیا تھا۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھا گل بھی چادر لے کر آ گئی تھی۔ گلاب خان اس کے لیے ریک ڈور کھول رہا تھا وہ پیچھے بیٹھ گئی اور خود آگے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج گیٹ پہ گلاب خان کے بجائے زلفی تھا جیسے ہی گاڑی سٹارٹ ہوئی اس نے گیٹ کھول دیا تھا اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے دل آور شاہ کو سلام کیا جواباً وہ بھی اشارے سے والسلام کہنا نہیں بھولا تھا۔
"اسپیڈ بڑھاؤ یار۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
"صاحب ہم سات بجے ان شاء اللہ ایئرپورٹ پہ ہوں گے۔" گلاب خان کو اپنی ڈرائیونگ پہ یقین تھا۔ دل آور شاہ اپنا موبائل نکال کر میسرڈ کال کرنے لگا۔
"السلام علیکم سر۔" دوسری طرف اس کا منشی قادر تھا۔
"میں آج کورٹ نہیں آ رہا، تم آفس کا چکر لگا لینا۔"
"سر آج تو بہت اہم کیس....."
"قادر! میں جانتا ہوں یہ کیس کتنا اہم ہے؟ لیکن میرے دوست نبیل سے زیادہ اہم نہیں ہے، میں اگلی تاریخ پہ سب مینڈل کر لوں گا۔ تم بس تاریخ لے لو۔" اس نے منشی کو سمجھایا۔
دل آور شاہ نے کبھی بھی اپنے کسی کام میں کوتاہی نہیں کی تھی اور نہ ہی اپنے کلائنٹس کو خوار کرتا تھا بس آج کل اس کی مصروفیت ہی ایسی بڑھ گئی تھی کہ اسے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔
"آپ کل تو کورٹ آئیں گے نا؟"
"کچھ کہہ نہیں سکتا، کل کا کام تمہیں کل ہی بتا دوں گا۔"
"سر! وہ مومنہ بی بی....."
"پلیز قادر میں اس وقت کسی بھی مومنہ بی بی کو ڈسکس نہیں کر سکتا، یہ کام پھر کبھی پہ اٹھا رکھو۔" اس نے قادر کو روک دیا۔
"سوری سر!"
"کوئی بات کو مجھے فون کر کے ساری تفصیل بتا دینا۔"

''ٹھیک ہے سر اللہ حافظ۔'' اس نے فون بند کر دیا تھا۔

اور اگلے پانچ منٹ میں گل کو نبیل کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ لوگ ایئر پورٹ کی سمت روانہ ہو چکے تھے اور گلاب خان کے قول کے مطابق ٹھیک سات بجے وہ لوگ ایئر پورٹ پہ موجود تھے۔ گلاب خان گاڑی میں ہی بیٹھا رہا جبکہ وہ اندر چلا گیا فلائٹ کی ٹائمنگ کا ایک بار پھر پتا کرنا تھا۔

♥

آذر نے صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اپنی میلز چیک کی تھیں اور ایک میل پہ اس کی نظریں گئی تھیں وہ بُری طرح چونکا تھا۔ یہ میل نیلی فون ایکسچینج کے سپروائزر فیضان حامد نے کی تھی جس میں انہوں نے آذر کے مطلوبہ ڈیٹا بتایا تھا، وہ نمبر اس ہسپتال کا نمبر تھا جہاں اس وقت خیرو بابا ایڈمٹ تھے۔

آذر اس نئے انکشاف پہ ایک بار پھر ساکت سا بیٹھا رہ گیا تھا یہ ساری گتھی اس قدر اُلجھی ہوئی تھی کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

''اُف..... اب کس کس چیز کا پتا کیا جائے؟'' وہ لیپ ٹاپ اسی طرح چھوڑ کر بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا اور کمرے میں بے اضطراری انداز میں ٹہلنے لگا تھا پھر کچھ سوچ کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا اور حویلی میں ہر پہل کی خاصی گہما گہمی تھی آسیہ آندھی ڈرائنگ روم میں قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

''السلام علیکم۔'' اس نے آہستگی اور احترام سے سلام کیا۔ جواباً انہوں نے اک نظر اسے دیکھ کر سر ہلایا تھا۔ آذر کا ارادہ لائبریری میں جا کر دانیال کو جگانے کا تھا لیکن پھر اس کے آرام کا خیال کر کے رُک گیا اور اپنا ذہن کچھ ریلیکس کرنے کے لیے چائے پینے کا سوچا۔ وہ وسیع و عریض کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قدم وہیں ٹھٹک گئے۔ کومل چولہے پہ چائے کے لیے پانی رکھ رہی تھی۔

''کیا ایک کپ چائے کا مجھے بھی مل سکتا ہے؟'' آذر کی آواز پہ کومل یکدم اس کی سمت پلٹی تھی آذر دروازے کے پٹوں سے ٹکا ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، سادہ سلیپر پہنے، بے ترتیب سے ہیئر اسٹائل کے ساتھ وہ اس کے دل کو اور بھی بھٹکا گیا تھا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟'' آذر نے آگے بڑھ کے جھٹکے سے کومل کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا کومل چکرا گئی تھی، وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آذر نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر پرے پھینک دیا تھا۔

''کھڑے کھڑے کہاں گم ہو جاتی ہو؟'' آذر سختی سے اسے جھڑک رہا تھا اور کومل پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی آذر کو اور کبھی گیس پہ جلتے اپنے دوپٹے کو دیکھ رہی تھی جب آذر کی سمت پلٹی تو دوپٹے کا پلو چولہے سے جا ٹکرایا تھا۔

''دوپٹے کے بجائے کپڑوں کو آگ لگ جاتی تو؟ کچن میں آتی ہو تو احتیاط کیا کرو۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کے چولہا بھی بند کر دیا تھا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' ثمرہ بیگم کچن میں داخل ہوئیں لیکن وہاں کی صورتحال دیکھ کر تڑپ گئیں۔

''دوپٹے کو پیچھے سے آگ لگ گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے دیکھ لیا۔'' آذر نے ان کو بتایا۔

''اُف خدایا! کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر کومل کو تھام لیا۔

''اسے پانی پلائیں اس کے حواس ٹھکانے پہ نہیں ہیں۔'' اس نے خود ہی گلاس میں پانی انڈیل کر ثمرہ بیگم کی سمت بڑھایا۔

''یہ بدبو کیسی ہے؟ کیا جل رہا ہے؟'' ثروت بیگم بھی اندر آ گئیں۔

''ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوا۔'' آذر ان کو تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور کومل اسے پیچھے تک دیکھتی رہ گئی۔

اپنے لیے اس کو اس قدر فکر مند ہوتا دیکھ کر جیسے دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا، اپنی ذات کے لیے اس کی پریشانی کومل کو اندر تک سرشار کر گئی تھی، ایک لمحے میں ہی وہ کتنا کانفیڈنس ہو گیا تھا؟ ثمرہ بیگم، ثروت بیگم اور باقی سب اس کے لیے متفکر ہو رہی تھیں لیکن وہ اندر ہی اندر خوشی سے رقص کر رہی تھی۔ اور وہ جو کسی ارادے سے اپنے بیڈ روم سے نکلا تھا، جوں کا توں واپس لوٹ آیا تھا اب اسے آٹھ بجے تک دانیال کے اُٹھنے کا انتظار کرنا تھا لیکن اس انتظار کے دوران اس کے دماغ میں طرح طرح کی سوچیں

رہی تھیں۔

♥

"ممی..... مریم کہاں ہے؟"

"کچن میں۔"

"فارغ ہے؟"

"وہ بھلا کب فارغ ہوتی ہے؟" عابدہ خاتون مسکرائیں۔

"ایمن وغیرہ کہاں ہیں؟"

"کالج کے لیے نکل گئی ہیں۔ کیوں کیا کام ہے؟" انہوں نے عدیل کو مذبذب کا شکار دیکھا تو پوچھ لیا۔

"یہ کپڑے استری کروانے تھے۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"کون سے کپڑے؟" مریم فوراً کچن سے نمودار ہوئی۔

"یہ گرے۔" اس نے کپڑے برآمدے میں نکال کر رکھے ہوئے تھے۔

"یہ کیا کرنے ہیں؟ وائٹ پہن جائیں۔"

"نہیں وائٹ خراب ہو جائیں گے۔"

"خراب؟"

"ہاں سفر کے دوران گاڑیوں میں ہزاروں داغ لگ جاتے ہیں ایک ہی نیا سوٹ ہے وہ بھی خراب ہو جائے گا۔" عدیل نے مریم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا، وہ سمجھ گئی تھی۔

"جانا کہاں ہے؟" عابدہ خاتون نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"وہ امی دراصل آفس کے کسی کام سے گوجرانوالہ جانا ہے، شام تک واپس آ جاؤں گا۔" اس نے فوراً ماں کو تسلی دی۔

"آپ سچ مچ گوجرانوالہ جا رہے ہیں؟" مریم اس کے کپڑے اٹھا کر اندر آئی تو مشکوک سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"سچ مچ سے کیا مطلب ہے تمہارا کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" عدیل نے اسے خفگی سے دیکھا۔

"آپ سچ بھی تو نہیں بول رہے نا؟"

"مریم میں واقعی گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔"

"میں کیسے مان لوں؟" وہ بے یقین ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو پیسے، یہ اسٹاد نے دیئے ہیں ورکشاپ کے لیے کچھ ضروری سامان لانا ہے وہاں سے۔" اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا ہوا پیسوں کا لفافہ نکال کر سامنے کیا۔

"اوکے اوکے مجھے یقین آ گیا ہے۔" مریم پیسے دیکھ کر فوراً مان گئی تھی اور استری کا پلگ لگا کر کپڑے استری کرنے بیٹھ گئی۔

"کچھ منگوانا ہے گوجرانوالہ سے؟" عدیل نہا کر آیا تو وہ کپڑے استری کر چکی تھی اور فرش سے استری اور کپڑے اٹھاتے ہوئے یکدم ہنس پڑی تھی۔

"آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے انگلینڈ یا امریکہ جا رہے ہوں؟"

"یار ہم غریبوں کے لیے یہی انگلینڈ اور امریکہ ہے۔"

"ہاں یہ غریبوں کا انگلینڈ یا امریکہ ہے نا اسی لیے یہاں نہ بجلی مل رہی ہے نہ پانی، نہ آٹا نہ چینی، یہاں موت بھی ملتی ہے تو بم دھماکے کی صورت میں۔" مریم دیکھتے ہی دیکھتے تلخ ہو گئی تھی عدیل جواباً کچھ نہ کہہ سکا، وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

"ناشتہ بنا چکی ہو؟"

"جی..... آپ جلدی سے آ جایئے۔" وہ سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی عدیل کو پتا تھا مریم حد سے زیادہ حساس ہے اس لیے وہ اس کا خیال سب سے زیادہ رکھتا تھا البتہ وہ خود بھی کافی کیئرنگ تھی ہر ایک کا خیال رکھتی تھی ہر ایک کے لیے ہلکان ہوتی رہتی تھی۔

"اچھا امی! میں چلتا ہوں۔" عدیل، ماں سے مل کر ابا جی کے پاس گیا پھر مریم کو اللہ حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل گیا تھا۔

"فی امان اللہ۔" مریم دھیمے سے کہتی ہوئی دروازے بند کر کے برآمدے میں آ گئی۔
"مریم۔" ساتھ والے گھر سے کوثر کی آواز سنائی دی۔
"جی..... باجی؟" مریم نے فوراً پوچھا۔
"تمہاری سہیلی کا فون ہے جلدی آؤ، ہولڈ پہ رکھا ہے۔" کوثر بلند آواز سے پیغام دے رہی تھی۔
"امی وہ فاطمہ کا فون ہے؟" مریم نے ماں کو دیکھا۔
"جاؤ سن آؤ جا کر۔" عابدہ خاتون نے اجازت دی اور مریم دوپٹہ پھیلا کر اوڑھتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ وہ گلی میں بہت کم نکلتی تھی، اس کا کسی کے گھر بھی آنا جانا نہیں تھا کبھی کبھار ضرورت کے وقت ہی کوثر باجی کے گھر آتی تھی۔
"السلام علیکم۔" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے صحن میں کھڑی کوثر باجی کو سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام! جلدی جاؤ۔" انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں ان فون سیٹ رکھا تھا۔
"ہیلو....."
"کہاں مر گئی تھیں؟ دوبارہ دنیا میں آتے آتے دیر ہو گئی کیا؟" فاطمہ اس کی آواز سنتے ہی چڑ گئی تھی۔
"یار آج تک دوبارہ دنیا میں کون آیا ہے جو میں آؤں گی؟" مریم ہنسی تھی اسے پتا تھا کہ فاطمہ غصے میں ہے۔
"مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ تم دنیا سے رخصت ہو گئی ہو؟"
"چلو یار یہی سمجھ لو میں دنیا سے رخصت ہو گئی ہوں اب بولو تمہیں میری یاد کیسے آ گئی؟" مریم نے مطلب کی بات پوچھی۔
"مریم کیا واقعی تم میری دوست ہو؟" فاطمہ نے ذرا افسوس سے پوچھا۔
"تمہیں کوئی شک ہے؟" مریم سنجیدہ ہو چکی تھی۔
"ہاں....." فاطمہ نے اثبات میں جواب دیا۔
"صرف اس لیے کہ پرسوں تمہارا برتھ ڈے ہے اور میں بھولی ہوئی ہوں؟" مریم نے سوال کیا اور فاطمہ حیرت سے گنگ رہ گئی، مریم کو اس کا برتھ ڈے یاد تھا۔
"تمہیں یاد تھا؟" وہ آہستگی سے بولی۔
"یاد تو مجھے پچھلے سال بھی تھا بس کسی مجبوری کی وجہ سے بھولنا پڑا۔" مریم کا لہجہ استہزائیہ تھا۔
"لیکن اس بار میں کوئی مجبوری نہیں دیکھوں گی میں نے تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے فون کیا ہے، تم نے پرسوں ضرور میرے گھر آنا ہے۔" فاطمہ نے حکم دیا۔
"لیکن فاطمہ....."
"لیکن ویکن کچھ نہیں میں گاڑی بھجوا دوں گی۔"
"مگر یار!" مریم نے بولنا چاہا۔
"میں نے کہا نا یار! میں کوئی بہانا نہیں سنوں گی۔" فاطمہ اپنی مرضی چلا رہی تھی۔
"لیکن فاطمہ مجھے امی اور بھائی سے تو پوچھ لینے دو۔"
"ان سے بھی میں ہی پوچھ لیتی ہوں۔"
"نن..... نہیں، امی تو ابا جی کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں اور بھائی گھر میں نہیں ہیں۔" مریم نے اطلاع دی۔
"بھائی صاحب کہاں ہیں تمہارے؟" فاطمہ کو ذرا ظہر کر اس کا خیال آیا تھا۔
"وہ کسی کام سے گوجرانوالہ گئے ہیں۔"
"گوجرانوالہ میں کون سا کام نکل آیا؟" فاطمہ کو حیرت ہوئی۔
"ہنس کا کوئی کام گوجرانوالہ میں؟ یقیناً کوئی لوہا وغیرہ خریدنا ہو گا؟ لوہا دہاں سے سستا مل جاتا ہے نا اس لیے۔" فاطمہ مذاق اڑایا۔
"پتا نہیں یار۔" مریم کو کوفت ہونے لگی۔

"بی بی دے، تم باقی باتوں کو چھوڑو اور میرے گھر آنے کی تیاری کرو، اور ہاں کسی گفٹ وغیرہ کے چکر میں مت پڑنا ورنہ جوں کا توں تمہارے ساتھ واپس بھیج دوں گی، بس میرے لیے تمہارا میری پارٹی میں چلے آنا ہی سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔" فاطمہ بہت اپنائیت سے بولی تھی اور مریم اس کی بات پہ مسکرا دی تھی۔

"ٹھیک ہے۔"

"ہو کے اللہ حافظ! میں ویٹ کروں گی تمہارا اور گاڑی بھی بھجوا دوں گی۔" فاطمہ نے تاکید کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور مریم ریسیور ہاتھ میں لیے چپ چاپ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ تو کوئی انکار، کوئی بہانا بھی سننے کو تیار نہیں تھی اور گھر کے حالات اقرار بھی نہیں کرنے دے رہے تھے وہ خاموشی سے اُٹھ کر گھر آ گئی۔

"خیریت ہے نا؟ فاطمہ نے فون کیوں کیا؟" عابدہ خاتون مریم کو چپ چپ سا دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"جی خیریت ہے۔"

"پھر تم کیوں پریشان ہو؟"

"پرسوں فاطمہ کی سالگرہ ہے اس نے آنے کی دعوت دی ہے، پچھلی بار بھی میں نہیں گئی تھی اور نہ اسے وش کیا تھا۔" مریم اندر ہی اندر شرمندہ سی تھی۔

"کوئی بات نہیں ہو جاتی ہے۔"

"چلی جاؤں، مگر کیسے؟" مریم خفگی سے بولی۔

"کیسے جانا چاہتی ہو؟"

"خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتی۔" وہ تلخی سے کہتی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ خالی ہاتھ جاؤ، اللہ بہتر سبب نکالے گا میں عدیل سے بات کروں گی۔"

"نہیں امی، بھائی سے کچھ مت کہیے گا۔" اس نے منع کر دیا۔

"کیوں؟"

"خوامخواہ ان کو پریشان کریں گی۔"

"جو اللہ بہتر کرے گا ابھی کل کا دن تو ہے نا۔" وہ مریم کا سر تھپکتے ہوئے بولیں اور اُٹھ کر اندر چلی گئیں، لیکن مریم وہیں بیٹھی سوچوں میں گم ہوئی تھی اسے فکر نے گھیر رکھا تھا۔

♥

"دل آور شاہ آپ ہی ہیں نا؟" کسی نے اس کے عقب سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور وہ اس جانی پہچانی سی آواز پہ ایک جھٹکے سے پلٹا تھا۔

"نبیل؟" اس کی آواز اور لہجے سے خوشی کا رس ٹپک رہا تھا۔

"دل آور....." وہ دونوں یکدم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے تھے۔

"کیسا ہے شہزادے؟" نبیل نے ہنس کر جواب دیا ان دونوں کی اس قدر محبت بھری اور جذباتی ملاقات پہ کئی لوگوں نے باقاعدہ ٹھہر کر ان کی ملاقات کا سین دیکھا تھا۔

"ماشاء اللہ پہلے سے جوان ہو گیا ہے۔" دل آور کا جملہ نبیل کو قہقہہ لگانے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"تیری یہی باتیں تو مجھے یاد رکھنے پہ مجبور کرتی ہیں۔" نبیل شرارت سے بولا۔

"اس بات کا بھی حساب لے لوں گا تم سے، تم یہ بتاؤ مدیحہ اور آئنی کہاں ہیں؟" دل آور اس کے عقب سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ بھی اندر ہیں، سامان کی چیکنگ ہونی ہے ابھی۔" نبیل نے اشارہ کیا۔

"یار چیکنگ میں تو تم لوگوں کا سارا سامان خراب ہو جائے گا، میں کچھ کرتا ہوں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سیل نکالا

اور کسی کا نمبر ڈائل کیا تھا اور واقعی اس کی سفارش کام آ گئی تھی ان کا سامان چیکنگ کے عذاب سے بچ گیا تھا اور وہ لوگ باہر آ گئے تھے۔

''بھائی.....'' مدیحہ بڑے والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی تھی۔

''میری گڑیا؟'' وہ ہنسنے سے لگی مدیحہ کا سر تھپکتے ہوئے نرمی سے مسکرایا تھا اس وقت اگر اس کے کولیگز اسے دیکھ لیتے تو ضرور رہ جاتے۔ اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہ دل آور شاہ ہے جو کورٹ میں کھڑا ہوتا تھا تو لفظوں کی جگالی اس کی اور سننے والے دم سادھ جاتے تھے۔

''کیسی ہو؟'' وہ اس کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''بس ٹھیک ہوں، آپ سنائیں کیسے ہیں؟ اور آنٹی کہاں ہیں؟'' مدیحہ نے بتول شاہ کا پوچھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں میری جان، اماں اسلام آباد میں ہیں، ان کے کاج میں آج کل انگیزام ہو رہے ہیں اس لیے میں ان کی وجہ سے نہیں آ سکیں۔ دل آور نے اس کو جواب دیا اور آگے بڑھ کے فائزہ بیگم سے ملا۔

''السلام علیکم آنٹی!'' اس نے ان کے سامنے سر خم کیا تھا اور انہوں نے دل آور کی پیشانی چوم لی تھی۔

''جیتے رہو، خوش رہو، اللہ عمر دراز کرے۔'' انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔

''آمین۔'' نبیل نے شرارت سے آمین کہا۔

''بچہ! تم سے تو میں بعد میں بات کروں گا، ابھی گھر چلو، بڑی ہوا لگ گئی ہے تمہیں۔'' دل آور، مدیحہ کے ہاتھ سے ٹرالی سے لدی ٹرالی دھکیلتا ہوا آگے بڑھا دوسری ٹرالی نبیل دھکیل رہا تھا وہ لوگ وہاں سے اپنے گھر کی ضرورت کے لیے کافی سامان خرید کر آئے تھے۔

''لائیے صاحب۔'' گلاب خان لپک کے قریب آیا۔

''نبیل صاحب کی ہیلپ کرو۔'' اس نے اشارہ کیا۔

''سلام صاحب۔'' گلاب خان نے نبیل کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' نبیل سمجھ گیا کہ وہ دل آور کا ملازم ہے۔

''لائیے صاحب میں رکھتا ہوں گاڑی میں۔'' گلاب خان نے ٹرالی کے ہینڈل اس کے ہاتھ سے تھام لیے تھے۔

''گلاب خان میں نے وین ہائر کی ہے تم اس وین میں سارا سامان لے کر نبیل صاحب کے گھر پہنچو، گاڑی میں خود لے آؤں گا۔'' دل آور نے سامان زیادہ دیکھ کر گاڑی بک کروالی تھی۔

''جی صاحب جیسے آپ کا حکم۔'' گلاب خان سعادت مندی سے بولا۔

''چلو رکھواؤ سامان گاڑی میں۔'' دل آور نے اپنی نگرانی میں سارا سامان احتیاط کے ساتھ گاڑی میں رکھوایا تھا۔

''یار ہر چیز کے معاملے میں بہت کیئرنگ ہو تم۔'' نبیل کے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاہاہا..... میں دوست تو دوست دشمن کی بھی بڑی کیئر کرتا ہوں۔'' وہ قہقہہ لگاتا ہوا اپنی گاڑی کی سمت بڑھا اور نبیل گاڑی کے قریب آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''تو جناب نے آج کل ''سرف'' رکھی ہوئی ہے؟'' نبیل سلور کلر کی چمچماتی ہوئی گاڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بس جو غریبوں کو پسند آ جائے۔'' وہ عاجزی سے کہتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا دوسری سائیڈ سے دروازہ کھول کر نبیل فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔

''ویسے یار یہ پراڈو، لینڈ کروزر، پجارو اور سرف میں کوئی خاص فرق تو نہیں ہے؟'' نبیل واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا ان گاڑیوں کے شیپ بھی پراڈو اور لینڈ کروزر جیسی ہی تھی۔

''بے شک فرق نہ ہو لیکن یار پیسے کا اور نام کا فرق تو ہے نا؟'' دل آور نے مسکرا کر فرق سے آگاہ کیا۔

''ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے، پاکستان میں چیزوں کا دکھاوا زیادہ ہی ہوتا ہے چاہے وہ موبائل فون ہو، چاہے گاڑی لڑکیوں کے ہینڈ بیگ..... بس سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی چیز باقیوں سے منفرد نظر آئے۔'' نبیل نے اپنی رائے

کیا تھا۔

"ایک بات کہوں نبیل؟" دل آور نے گاڑی روڈ پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"کہو۔۔۔"

"لاہور پاکستان کا دل ہے اور دل میں ایسی باتیں مت کرو کہ دل کو ناگوار گزرے، اس لیے بہتر ہے کہ کوئی اور بات چھیڑو۔" اس نے بڑی نرمی اور بڑے طریقے سے نبیل کو سمجھایا تھا۔

"اوہ۔۔۔ یعنی سچے اور پکے پاکستانی ہو؟" نبیل معنی خیزی سے بولا۔

وہ دونوں اتنے عرصے بعد ملے تھے اس لیے ان کی باتوں کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ جبکہ پچھلی سیٹ پہ فائزہ بیگم کے ساتھ بیٹھی مدیحہ چپ چاپ لاہور کے مناظر دیکھ رہی تھی سڑکوں پہ خاصی چہل پہل اور گہما گہمی تھی سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا تھا جو وہ لوگ فلموں اور ڈراموں میں دیکھتے تھے وہی سڑکیں، وہ راستے، وہی لوگ، وہی بازار۔

"اف۔۔۔ اب یہاں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے گا؟ جن کو کسی بھی چیز کی تمیز نہیں ہے؟" اسے سوچ کر ہی کوفت اور بیزاری ہونے لگی تھی وہ گاڑی میں پہلو بدل کر رہ گئی۔ دل آور اس کی بیزاری صورت بیک ویو مرر سے ہی دیکھ چکا تھا اور کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے نبیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"عبداللہ کیسا تھا؟"

"فٹ فاٹ ہے یار۔"

"اور نگارش بھائی؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔۔۔ ساری فیملی ہمیں ایئرپورٹ ہی آف کرنے آئی تھی۔" نبیل نارمل سے انداز میں بولا اس نے یہ بھی نوٹ نہ کیا کہ دل آور نے عبداللہ اور نگارش بھائی کا حال احوال پوچھ لیا ہے، لیکن زری کا کیوں نہیں پوچھا، وہ بھی تو عبداللہ کی فیملی کا حصہ تھی؟

"اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے پاکستان چکر لگانے کا؟" دل آور گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

"زری کی اسٹڈی کمپلیٹ ہو گئی تو پھر ہی کوئی پروگرام بنے گا اس کا، زری اور نگارش بھابھی کو اکیلے چھوڑ کر تو نہیں آ سکتا وہ۔" نبیل نے انداز اً جواب دیا تھا۔

"ہمم۔۔۔ یعنی ابھی کچھ عرصہ لگے گا؟"

"ہاں یقیناً۔" نبیل نے اس کی بات کی تائید کی۔

"خیر تم آ گئے ہو تو وہ بھی آ جائے گا۔ یار زندہ صحبت باقی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ویسے یار ایک چیز کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔" وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

"کس چیز کا؟"

"تیرے پہلو میں کوئی گوری میم نہیں ہے اس لیے۔" اس نے افسردگی اور مایوسی کا اظہار کیا۔

"جب تو لندن سے آیا تھا تو کیا تمہارے پہلو میں گوری میم تھی؟" نبیل نے گھور کے پوچھا۔

"یار یہاں کیا لڑکیاں مر گئی تھیں جو میں گوری میم لے کر آتا؟" دل آور چڑانے والے انداز میں بولا۔

"یعنی تمہارے لیے یہاں لڑکیاں زندہ ہیں اور میرے لیے مر گئی ہیں؟" نبیل نے اس کی بات کا مطلب اخذ کیا۔ جواباً وہ ایک بار پھر فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا تھا آج اس کی دلی خوشی کا اظہار اس کے قہقہوں سے ہو رہا تھا۔

"دل آور۔۔۔ باز آ جا۔" نبیل نے گھور کے کہا یہ ان کا آپس میں بات کرنے کا ایک مخصوص اسٹائل تھا۔ دل آور نے رہائشی ایریا میں پہنچتے ہوئے ان کے گیٹ کے سامنے ہارن دیا تھا۔ چوکیدار نے فوراً سلام کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

سب ملازم دل آور کی ہدایت پہ ان کے انتظار میں ڈرائیوے پر ہی کھڑے تھے ان کے گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔

"شکر ہے تیری ذات کا جس نے اتنے سالوں بعد ہمیں اپنے گھر کی چار دیواری دیکھنی نصیب کی ہے۔" فائزہ بیگم نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت تشکر کے آنسو تھے۔ لیکن ان سے چند قدم دور کھڑی

مدیحہ اس گھر کے ملازموں کو اور اس گھر کے در و دیوار کو اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کا چہرہ بالکل سرد و سپاٹ ہو رہا تھا یہی وہ گھر تھا جو اس کے باپ ممتاز حیات نے اپنی کمائی سے بنایا تھا اور یہی وہ گھر تھا جہاں اس کی ماں فائزہ حیات دلہن بن کے آئی تھیں اس گھر سے، گھر والے سے بہت ارمان وابستہ کیے تھے اور بہت سے خواب سجائے تھے، لیکن اتنے ڈھیر سارے خوابوں میں سے صرف دو خواب زندہ رہ پائے تھے۔

ایک نبیل حیات اور ایک مدیحہ حیات اور ان دونوں کے سوا باقی سارے خواب مر گئے تھے، بکھر گئے تھے، کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کے خوابوں کے باغ کو سینچنے والا خود باغی ہو گیا تھا اور اب یہی دھڑکا انہیں بیٹی کی طرف سے بھی لگا رہتا تھا۔

"مام اندر چلیں پلیز۔" نبیل نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے انہیں سوچوں کے گرداب سے نکالا۔

"چلو۔" وہ آنکھوں کی نمی پونچھتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آ گئیں، دل آور، مدیحہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

♥

وہ بیڈ پہ نیم دراز لیٹے تھے جب دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

"یس کم ان۔" ان کی اجازت پہ علیزے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

"علیزے۔" وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام ادھر بیٹھو یہاں۔" انہوں نے بیڈ پہ اپنے قریب بیٹھنے کا کہا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہوں دو دن آفس نہیں گیا اس لیے آج آفس میں فارغ رہ کر بھی تھکن ہو گئی ہے۔"

"تو آپ کوئی ٹیبلٹ لے لیتے؟"

"نہیں بیٹا ٹیبلٹ کی ضرورت نہیں ہے، چائے سے ہی تھکن دور ہو جائے گی۔"

"آپ آرام کریں میں چلی جاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔

"بیٹھو میری جان، بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ کس کام سے آئی ہو؟" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر بات کر لوں گی۔" اس نے انکار کر دیا۔

"بیٹی میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا بس ذرا سی تھکن ہے وہ بھی اتر جائے گی، تم بتاؤ کیا کہنے آئی ہو؟" انہوں نے اس کو ٹوک چکا۔ علیزے ان کے چہرے کو دیکھنے لگی وہ اسی کی طرف متوجہ تھے۔

"پاپا وہ میں نے آپ کو بتانا تھا کہ....."

"ہاں ہاں بولو بیٹا؟"

"وہ میرے ایگزامز ہونے والے ہیں میری ایک کلاس فیلو نے بتایا ہے کہ پیپرز کی ڈیٹ شیٹ آ گئی ہے شاید نیکسٹ ویک پہلا پیپر ہو گا؟" علیزے نے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کی۔

"پھر.....؟" وقار آفندی کو بھی سن کر کافی پریشانی ہوئی تھی۔

"پاپا کیا میں اب کالج نہیں جا سکتی؟" علیزے نے کافی سہمے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! کیوں نہیں جا سکتی؟ ان شاء اللہ تم کالج ضرور جاؤ گی۔" وقار آفندی نے اسے تسلی تو دے دی لیکن اندر سے خود بھی فکر اور پریشانی میں گھر گئے تھے۔

"تم پیپرز کے روز کالج جاؤ گی یا پھر پہلے بھی؟"

"پاپا پیپرز سے پہلے ہونے والے لیکچرز تو زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ لیکچرز تو اٹینڈ کرنا ہی ہوں گے؟" علیزے خود بھی پریشان اور تذبذب کا شکار تھی کہ آج کل کے مسئلے کے بعد اسے جانا چاہیے یا نہیں۔

"سب سے پہلے تو تمہاری گاڑی کا مسئلہ ہے آذر فارغ نہیں تھا ورنہ وہ ہی شوروم چلا جاتا، خیر اس کام کے لیے تو تھوڑا وقت نکال ہی لے گا، لیکن اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ہے تمہارے لیے ڈرائیور رکھنے کا۔ خیرو بابا کافی بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب

حادثے کے بعد تو اور بھی کمزور ہو گئے ہیں، ان کی عمر اب گھر بیٹھنے کی ہے ڈرائیونگ کرنے کی نہیں۔"

"لیکن پاپا کسی نئے ڈرائیور کے ساتھ کیسے سب کچھ مینج ہو گا؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ نیا ڈرائیور رکھنا، یا اس پہ اعتماد کرنا آسان بھی نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہو گا؟" علیزے فکرمند تھی۔

"کچھ ہو ہی جائے گا، تم جاؤ آرام کرو اور جاتے جاتے آذر کو میرے بیڈروم میں بھیج دو۔" انہوں نے علیزے کو وہاں سے بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد آذر ان کے سامنے تھا۔

"بیٹھو۔" وہ دائیں دیوار والے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"فارغ تھے تم؟"

"جی فارغ ہی تھا۔"

"نیند تو نہیں آ رہی؟"

"نہیں۔"

"دانیال کہاں ہے؟"

"عائشہ پھوپھو کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔"

"آج کل بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے تم دونوں میں؟" وہ چھیڑنے والے انداز سے بولے۔

"کیا نہیں ہونی چاہیے؟" وہ بھی مسکرایا۔

"ارے کیوں نہیں بیٹا ہونی چاہیے اور ضرور ہونی چاہیے، تم دونوں بھائی ہو، کزن ہو اور یہ رشتہ بہت ہی خوبصورت رشتہ ہے، جو رشتہ تم سے چھوٹا ہے اور زین دانیال سے چھوٹا ہے اس لیے تم دونوں کو انڈر اسٹینڈنگ ان کے ساتھ تو ہونی ہی تھی اس لیے بہتر ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھ لو، ویسے بھی دانیال بہت سمجھدار اور سعادت مند لڑکا ہے ہر اونچ نیچ سمجھتا ہے۔" وقار آفندی اس کی تعریف کر رہے تھے۔

"ڈیڈ آپ کی بات درمیان میں ٹوکنے کے لیے سوری، لیکن پلیز آپ وہ بات کریں جس کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے۔" آذر شائستگی سے بولا۔

"بور ہو گئے ہو؟"

"نہیں بور نہیں ہوا، بس لیٹ ہو گیا ہوں۔" آذر نے رسان سے کہا۔

"لیٹ کس لیے؟"

"آفس کا کچھ ضروری کام نمٹانا تھا۔"

"بیٹا آفس کے کام کے علاوہ بھی اور بہت سے ضروری کام نمٹانے والے پڑے ہیں۔"

"کون سے کام؟" آذر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"علیزے کے لیے نئی گاڑی لگوانی ہے، اس کے لیے کسی ڈرائیور یا کسی گارڈ کا بندوبست بھی کرنا ہے، اس کے ایگزامز سر پہ آ گئے ہیں۔" وقار آفندی نے اپنی پریشانی بیان کی۔

"کیا مطلب؟ کب ایگزامز ہیں؟" آذر چونک گیا۔

"نیکسٹ ویک....."

"اوہ..... یہ تو واقعی پرابلم ہو گئی ہے۔"

"اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ اس پرابلم کا کوئی حل نکالو۔"

"کیا اس حادثے کے بعد علیزے ذہنی طور پہ کالج جانے کے لیے تیار ہے؟" آذر کو پتا تھا کہ وہ اندر سے کتنی ڈری سہمی ہو گی۔

"یقیناً تیار ہی ہو گی، وہ خود میرے پاس آئی تھی کہ اس کے ایگزامز کی ڈیٹ شیٹ آ گئی ہے۔"

''گاڑی کا مسئلہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے جب تک شوروم سے گاڑی نکلے گی تب تک گھر سے کوئی اور گاڑی بھی استعمال میں لائی جاسکتی ہے، اصل مسئلہ تو ڈرائیور کا ہے۔''

لیکن ڈیڈ کام تو مبارک خان بھی کرسکتا ہے؟'' آذر بات کرتے کرتے ان سے سوال کر بیٹھا۔

''مبارک خان یہ کام تو کرسکتا ہے لیکن اگر اسے علیزے کی گاڑی ڈرائیو کرنے پہ مامور کردیا تو حویلی کے اور آفس کے بہت سے کام رُک جائیں گے، اس نے بہت ذمہ داریاں اُٹھا رکھی ہیں۔'' وقار آفندی بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے جو کام مبارک خان انجام دیتا تھا وہ کوئی اور ملازم نہیں کرسکتا تھا۔

''تو پھر اتنی جلدی کوئی نیا ملازم ملنا بھی تو بہت مشکل کام ہے؟ وہ بھی کوئی اعتماد کا بندہ؟'' آذر اور وقار آفندی کی پریشانی ایک ہی تھی۔

''بس بندہ اعتماد کا ہو۔''

''یہ کام بھی مبارک خان کرسکتا ہے۔'' وقار آفندی کا دھیان اس آدمی کی طرف چلا گیا جسے کافی روز پہلے مبارک خان کوئی کام دلانے کی غرض سے اپنے ساتھ لے کر حویلی آیا تھا۔

''مبارک خان؟ وہ کیسے؟''

''اس کے پاس کوئی آدمی ہے اسے کام کی ضرورت ہے ایک بار مجھ سے مل بھی چکا ہے، نام بھی بتایا تھا اس نے لیکن میرے ذہن سے محو ہو چکا ہے، میرے خیال میں وہی بندہ ٹھیک رہے گا؟'' وقار آفندی فیصلہ کر چکے تھے۔

''کون آدمی ہے؟ کچھ اتا پتا؟''

''وہ بھی پتا چل جائے گا۔ میں مبارک خان سے کہتا ہوں وہ صبح ہی اسے بلا لے گا۔''

''ٹھیک ہے آپ بلا لیجیے گا، لیکن پہلے ساری تسلی کر لیجیے گا۔'' آذر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

''اور گاڑی؟''

''گاڑی کا کام آپ پرسوں پہ رہنے دیں، ہوسکتا ہے کہ مجھے کل کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑے۔ البتہ میں کل گاڑی کی بکنگ کروا دوں گا۔'' آذر نے انہیں تسلی دی۔

''آذر بات سنو۔''

''جی ڈیڈ۔''

''ادھر آؤ۔''

''جی کہیے؟''

''اتنے دن ہو گئے تم نے کوئی بات نہیں بتائی؟ کیا بنا اس مسئلے کا؟'' وقار آفندی فائرنگ والے معاملے کا پوچھ رہے تھے۔

''ڈیڈ مجھے کوئی بات پتا چلتی تو میں بتاتا نا؟ فی الحال تو کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' آذر ٹھٹک چکا تھا یہ بات تو اس نے چھپائی تھی ان سے۔

''کیا تم نہیں بتاؤ گے تو ہمارا دشمن بھی نہیں بتائے گا؟'' انہوں نے اپنے موبائل کی طرف اشارہ کیا، یعنی وہی میسج ان کے نمبر پہ بھی آیا تھا۔

''اوہ۔'' اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔

''نہ ان لڑکوں کا پتا چلا ہے اور نہ ہی ہسپتال کے رسپشن سے کال کرنے والے آدمی کا.....'' ان لڑکوں نے اپنا نام وہ پتا غلط لکھوایا تھا۔ آذر اور دانیال اندر ہی اندر کافی بھاگ دوڑ کر چکے تھے لیکن ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور اب گزشتہ دو دن سے ہر طرف سکون ہی سکون نظر آرہا تھا دو دن سے کوئی میسج اور فون کال موصول نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی اور ایکشن سامنے آیا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا تم زیادہ ٹینشن نہ لو اور آرام کرو۔''

''او کے گڈ نائٹ۔'' آذر ان کو گڈ نائٹ کہتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

PRIME URDU NOVELS

"کتنا ہے زیرو میٹر ہے؟" سائم نے پاس سے گزرتی لڑکی کو دیکھ کر خباثت سے کھٹ پاس کیا تھا۔

"کیوں تو انجینئر ہے کیا؟" کامی نے آنکھ دبا کر کہا تھا۔

"یار اتنا تجربہ تو ہو ہی گیا ہے کہ گاڑی کو دیکھ کر ہی اس کی خوبی اور خامی کا پتا چل جاتا ہے۔" سائم نے فخریہ بولا۔

"پھر تو تمہیں انجینئرنگ کی ڈگری ملنی چاہیے؟" جودت اور کامی ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسے تھے۔

"میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔" سائم نے تائید کی تھی۔

"چل کامی یار اسے جوتوں کا ہار پہنا۔" جودت نے شان بے نیازی سے کہا۔

"تیری تو....." سائم، جودت کو مارنے کے لیے لپکا۔

"ہوئے سائم رُک، ایک اور آئی ہے۔" کامی نے دور سے آتی لڑکی کو دیکھ کر اشارہ کیا۔

"ہوئے لوفر، تجھے شرم نہیں آتی لڑکیوں کو تاڑتے ہوئے؟ گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟" وہ لڑکی قریب آ چکی تھی اس لیے کامی کی آواز سن چکی تھی جودت اور سائم یکدم اس کی اچانک درگت پہ منہ چھپاتے ہوئے اپنی ہنسی روکنے لگے۔

"میں نے تمہیں کب تاڑا ہے؟" کامی نے حیرانی سے اور معصومیت سے پوچھا۔

"تو کیا اپنی امان کو تاڑ رہے تھے؟" وہ لڑکی خاصی مرد مار قسم کی لڑکی تھی وہ ان لڑکوں کو دیکھ کر ڈرنے سہمنے والی نہیں تھی۔

"جودت، سائم!" اس نے ان دونوں کو پکارا۔

"ہونہہ..... لفنگے کہیں کے، سڑک چھاپ۔" وہ ان تینوں پہ خونخوار سی نظر ڈالتی آگے بڑھ گئی تھی۔

"ہاہاہاہا۔" وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے اس کے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے تھے۔

"سائم ایز یو میٹر تھی یا سیکنڈ ہینڈ؟" جودت نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو چلتا پھرتا راکٹ تھی یار۔" سائم نے شرارت سے کامی کو دیکھا وہ اپنا سر کھجا رہا تھا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ہر کام میں اپنا ایک اسٹینڈرڈ رکھنا چاہیے۔ جب ہمیں ہماری کلاس کی لڑکیاں پلیٹ میں سجی سجائی مل جاتی ہیں تو ہمیں ادھر اُدھر منہ مارنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟" جودت نے اس کو جھاڑا۔

"یار میں نے اسے کب چھیڑا تھا؟ میں نے بس سائم کو دعوت دی تھی۔"

"چل یار تم نے نہیں چھیڑا، لیکن وہ تو تمہیں چھیڑ گئی ہے نا۔" جودت نے مذاق اُڑایا۔

اتنے میں اس کا سیل بجنے لگا۔ پینٹ کی پچھلی پاکٹ سے سیل نکال کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"کس کا فون ہے؟" سائم اور دکی نے بیک وقت پوچھا۔ جودت نے سیل ان کے سامنے کر دیا۔

"اوہو..... بیٹھے بیٹھے قسمت جاگ اٹھی ہے۔"

"ہیلو؟" وہ کال اٹینڈ کرتے ہوئے بولا۔

"کہاں ہو؟"

"جہاں بھی ہوں تمہارے انتظار میں ہوں؟" وہ لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے بولا۔

"انتظار ختم سمجھو۔" وہ ہنسی تھی۔

"سچی؟" جودت چہکا۔

"ہاں مجھے پک کرنے آ جاؤ۔" وہ تیار بیٹھی تھی۔

"اور پک کرنے کے بعد؟" اس نے استفسار کیا۔

"جہاں تم لے جاؤ۔"

"جیتی رہو، خوش رہو میں آ رہا ہوں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

سائم چابی کہاں ہے؟" جودت بائیک پہ سوار ہوتے ہوئے بولا۔

"تمہاری پاکٹ میں۔"

"ارے نہیں یار! میں فلیٹ کی چابی کا پوچھ رہا ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

PRIME URDU NOVELS

''تم اسے لے کر فلیٹ پہ جاؤ گے؟''

''نہیں میں اسے لے کر حویلی جاؤں گا۔''

''کبھی کسی لڑکی کو لے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔'' سائم نے گھورتے ہوئے چابی اس کے حوالے کی تھی۔

''تھینک یو۔'' اس نے کہتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی۔

''یار ہمیں اکیلے چھوڑ کے جا رہے ہو؟ ہمارا ٹائم کیسے گزرے گا؟ ہمیں بھی ساتھ لے جاتے؟'' کامی نے فریاد کی جودت ہنسا تھا۔

''ایک دو اور زیرو میٹر دیکھ لو۔'' اس نے چوٹ کی اور بائیک اڑا لے گیا تھا۔ لیکن کامی کی آہیں اتنی پُر اثر تھیں کہ وہ دل کی حسرتیں دل میں ہی لے کر رہ گیا تھا اسے آذر کی کال آ گئی تھی۔

''کہاں ہو؟'' آذر کا لہجہ سنجیدہ اور دوٹوک تھا۔

''ڈیفنس۔'' جودت نے بمشکل جواب دیا۔

''ڈیفنس کیوں؟''

''وہ اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔'' اس نے بات بنائی۔

''دوست سے تم بعد میں مل لینا پہلے خیرو بابا کے پاس ہسپتال پہنچو۔''

''کیوں خیریت؟'' جودت ٹھٹکا۔

''ہاں خیریت ہی ہے، دراصل میں کام کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں اور مبارک خان کو ڈیڈ نے گھر بلوایا ہے اس لیے خیرو بابا کے پاس اور کوئی بھی نہیں ہے۔''

''اور دانیال بھائی؟'' جودت نے کسی اُمید کے تحت استفسار کیا۔

''کیا تمہیں پہلے ساری ڈیٹیلز ریکارڈ کروا دوں پھر تم آؤ گے؟'' آذر کو غصہ آ گیا تھا۔

''نن..... نہیں آپ ٹینشن نہ لیں میں آ رہا ہوں۔'' جودت کو ماننے ہی بنی۔

''میں ہسپتال میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔'' آذر نے کہہ کر کال بند کر دی اور جودت آہ بھر کے رہ گیا۔

''یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وصال یار ہوتا۔'' وہ بآواز بلند کہتا اپنی بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے ہسپتال کے لیے واپس مڑ گیا تھا اور اگلے چند منٹوں میں وہ ہسپتال میں آذر کے سامنے کھڑا تھا۔

''تم نے شام تک ہسپتال میں خیرو بابا کے پاس رہنا ہے۔''

''اور شام کے بعد؟'' جودت اپنی عادت کے مطابق بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''شٹ اپ۔ میں تم سے کوئی ہنسی مذاق نہیں کر رہا کہ تمہیں اس وقت بھی شرارت سوجھ رہی ہے؟ خیرو بابا کی حفاظت اور تیمارداری ہمارا فرض بنتا ہے ان کی یہ حالت ہماری وجہ سے ہوئی ہے ان کی ذاتی کوئی دشمنی نہیں تھی کسی سے، ایک دن کی ذمہ داری نہیں نبھا سکتے تم؟ شرم آنی چاہیے تمہیں۔'' آذر کا غصہ عود کے آیا تھا۔ جودت کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

''ایم سوری بھائی۔''

''ہونہہ..... سوری۔''

''بس یونہی منہ سے نکل گیا، ایم رئیلی سوری۔''

''اپنا منہ بند رکھا کرو۔'' آذر بے وجہ اور بات بے بات غصہ نہیں کرتا تھا لیکن جب کرتا تھا تو۔

''تم شام تک نہیں بلکہ کل میرے آنے تک یہیں رہو گے اور خیرو بابا کا ہر طرح سے خیال رکھو گے، کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔'' آذر نے اسے سزا کے ساتھ ساتھ وارننگ بھی دی تھی۔

''آپ جب تک کہیں گے میں یہیں رہوں گا۔'' وہ مؤدب سے انداز میں بولا تھا۔

''ٹھیک ہے، یہ رکھ لو، کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' آذر نے اپنے والٹ سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ جودت پیسوں کو دیکھتا رہ گیا اس کا اپنا والٹ پیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے بھلا ان پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن آذر اس سے بڑا تھا اس کا فرض تھا کہ وہ ہر چیز کا دھیان رکھتا، سو اس نے یہی کیا تھا۔ جودت سر جھٹک کر اندر خیرو بابا کے

باتیں آ گیا وہ دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے۔

♥

آج کا دن منصور حسین کے لیے بہت ہی مبارک دن تھا شاید؟ وہ پی او سے مبارک خان کو فون کرنے آیا تھا اور جیسے ہی مبارک خان نے اس کی آواز سنی فوراً خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اوئے منصور حسین تُو جلدی حویلی پہنچ، میں تجھے کب سے فون کر رہا ہوں مگر تیرا نمبر ہی بند تھا۔" مبارک خان کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ منصور حسین نے اپنا موبائل بیچ دیا ہے۔

"کیا میرے لیے کام مل گیا؟" منصور حسین کے لہجے میں بھی خوشی در آئی تھی۔

"سمجھو مل گیا ہے، بس ایک بار صاحب سے ملنا ضروری ہے۔"

"ارے میں مل تو چکا ہوں تیرے صاحب سے؟"

"منصور حسین وہ ملنا اور تھا، یہ ملنا اور ہے۔"

"کیوں کیا اب میری ان سے رشتہ داری ہونے والی ہے؟"

"اَف یار منصور حسین ایک تو تیری زبان بھی تلوار ہے تلوار، بس کاٹ دینے کو تیار۔" مبارک خان سر پیٹ کے بولا تھا۔

"تُو کام کا بندا ہے، تجھے نہیں کاٹے گی۔" منصور حسین نے اسے تسلی دی۔

"اچھا چھوڑ اس بات کو، تُو یہ بتا حویلی کب پہنچ رہا ہے؟" مبارک خان سارا کام جلدی جلدی نمٹا لینا چاہتا تھا اس کی یہی کوشش تھی کہ منصور حسین کو جیسا بھی سہی بس کام مل جائے۔

"تُو فون رکھ، میں ابھی پہنچا۔" اس نے فون بند کر دیا اور پھر بڑی حویلی کی طرف چل پڑا تھا ایک اسٹاپ تک اسے رکشہ کا سہارا لینا پڑا باقی رستہ اس نے پیدل طے کیا تھا اور جب وہ بڑی حویلی کے سامنے پہنچا اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے گر رہے تھے۔

"اوئے خانماں خراب تُو پھر آ گیا ہے؟" عارف اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"آیا نہیں، بلایا گیا ہوں۔" اس نے چبا کر جواب دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب اپنے صاحب سے پوچھ۔"

"ہیں؟ صاحب نے بلایا ہے؟" عارف کو حیرت ہوئی۔

"پہلے ایک گلاس پانی پلاؤ، پھر بتاتا ہوں۔" وہ آج پھر عارف کی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"دیکھ منصور حسین تیری وجہ سے ہمیں بھی ڈانٹ پڑتی ہے اس روز آذر صاحب بھی خفا ہو رہے تھے، تُو بس نکل یہاں سے۔" عارف نے بے مروتی دکھائی۔

"آج تو یہاں سے نکلنے سے پہلے یا تو مر کے جاؤں گا یا پھر مار کے۔" منصور حسین آج مرنے مارنے پہ تل گیا تھا۔

"یار بڑا ظالم انسان ہے تُو۔" عارف نے اسے گھورا۔

"ظالموں کے ساتھ ظالم ہونا ہی پڑتا ہے۔" اس نے عارف کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"اوئے یار یہ لو پانی پیو اور جان چھوڑو۔" عارف نے اسے پانی کا گلاس تھمایا۔

"شکریہ۔" اس نے گلاس فوراً خالی کر دیا تھا۔

"اب اندر اطلاع کرو کہ منصور حسین آیا ہے۔" اس نے نیا حکم جاری کیا۔

"لیکن.....؟"

"جو کام کہا ہے وہ کرو۔" اس نے عارف کو ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"کرتا ہوں۔" اس نے اندر انٹر کام پہ اطلاع کر دی تھی۔

"اسے اندر بھیج دو۔" مبارک خان کی طرف سے اجازت ملی۔

''تم اندر جا سکتے ہو۔'' عارف نے اشارہ کیا۔

''ڈبل شکریہ۔'' منصور حسین مسکرا کر کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور اس جنت نما حویلی میں قدم رکھتے ہی اس کی چال بہکنے لگی تھی وہ اتنی بڑی حویلی کو جیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

''ادھر آ جاؤ، صاحب مردان خانے میں ہیں۔'' مبارک خان سامنے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اسے اپنے ساتھ لیے مردان خانے میں داخل ہوا تھا۔

''السلام علیکم صاحب۔'' منصور حسین نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو یہاں۔'' وقار آفندی اس کی آواز پہ چونکے تھے اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اخبار سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

''جی..... میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' اس نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہنے کو ترجیح دی تھی۔

''اتنی دیر کہاں کھڑے رہو گے؟ بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی شکریہ۔'' منصور حسین کو بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

''کیا نام بتایا تھا تم نے؟''

''منصور حسین۔''

''تعلیم کتنی ہے؟''

''میٹرک فیل۔'' اس نے کھرا جواب دیا۔

''کرتے کیا ہو؟''

''نوکری کی تلاش۔''

''اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟''

''اس کے علاوہ فرصت ہی نہیں ملتی۔''

''کتنے عرصے سے بے روزگار ہو؟'' وقار آفندی ایک ایک بات پوچھ رہے تھے۔

''جتنے عرصے سے آپ کی حویلی کے چکر کاٹ رہا ہوں۔'' اس کے بچے تلے سے جوابات پہ وقار آفندی نے مبارک خان کی طرف دیکھا تھا جواباً مبارک خان نے انہیں تسلی رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔

''رہتے کہاں ہو؟''

''یہیں لاہور میں رہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا کام کر سکتے ہو؟ اگر تمہیں کوئی بڑی ذمہ داری سونپی جائے تو؟''

''ذمہ داری نبھا کر دکھاؤں گا صاحب! شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''ڈرائیونگ کر لیتے ہو؟''

''جی صاحب آنکھیں بند کر کے ڈرائیونگ کرنے کا کہیں گے تو وہ بھی کر لوں گا، بڑا عرصہ ایک ڈرائیور کے ساتھ رہا ہے۔'' اس نے ان کی تسلی کرائی۔

''ڈرائیونگ لائسنس ہے تمہارے پاس؟''

''صاحب ہر چیز کا لائسنس ہے آپ مانگیں تو سہی۔'' اس نے بے فکری سے کہا۔

''ہوں یہ تو اچھی بات ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ایک گارڈ کے فرائض بھی سرانجام دو۔ تمہیں ہر وقت ہماری بیٹی کے ساتھ رہنا ہو گا اس کی حفاظت کرنی ہو گی اور اس کے لیے تمہیں اپنے ساتھ ریوالور بھی رکھنا پڑے گا۔'' وقار آفندی نے اپنی گود میں رکھا ریوالور اٹھا کر سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ منصور حسین نے چونک کر وقار آفندی اور پھر مبارک خان کو دیکھا تھا۔

''یہ کیسی نوکری مل رہی تھی اسے؟'' اس کی نظر ریوالور پہ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

PRIME URDU NOVELS

وہ کافی گہری نیند سو رہی تھی جب بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل پہ رنگ ہونے لگی تھی اور اس کی گہری نیند کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا اور پھر یکدم چونک کر اٹھ بیٹھی تھی، پاکستان سے بی بی جان کی کال تھی۔

"السلام علیکم۔" کال ریسیو کرتے ہی سلام کرنے کی عادت بھی اس نے کسی خاص بندے سے سیکھی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟" بی بی جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں بی بی جان آپ کیسی ہیں؟ اور بابا کیسے ہیں؟" وہ نیند سے اٹھتے ہی اپنی ماں کی آواز سن کر خوش ہو گئی تھی۔

"میرے بیٹے کو بڑی جلدی خیال آ گیا ہے اپنی ماں اور اپنے بابا کا حال پوچھنے کا؟" ان کی ممتا شکوہ کر بیٹھی۔

"میں سوری بی بی جان دراصل آج کل ایگزامز کی بہت زیادہ مصروفیت ہے، لیکن آج سنڈے تھا میں رات کو ارادہ کر کے سوئی تھی کہ صبح اٹھ کر آپ کو کال ضرور کروں گی، آئی سوری بی بی جان میں آج آپ کو کال کرنے والی تھی۔" اس نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں۔۔۔ بیٹا اب ماں باپ کی بھی اہمیت رہ گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں، آگے پیچھے کے دنوں میں تو انہیں ہاتھ ہی نہیں لگتا۔" ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پہ زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ ہو گئی۔

"خیر چھوڑو بیٹا تم یہ بتاؤ عبداللہ کیسا ہے؟" وہ اس کی شرمندگی بھانپتے ہوئے بات ہی بدل گئی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے وہ بھی ٹھیک ہیں، آپ کی بات کرواؤں ان سے؟" زری نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں؟"

"کیوں بی بی جان؟"

"کیونکہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے نمبر پہ فون کیا تھا وہ ابھی سو رہا ہے، اس کی بیوی نے فون اٹھایا تھا۔"

"اس کی بیوی آپ کی بہو ہوتی ہے بی بی جان۔" زری نے یاد کروایا تھا۔

"کیسی بہو؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔

"کبھی نہ منی، نہ ہی کوئی بات کی، ہمارا تو اس سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔" بی بی جان کے لہجے سے ان کی خفگی اور ناراضی ظاہر تھی اور زری جانتی تھی کہ یہ سب کیوں ہے؟ اور کب تک ہے؟

"بی بی جان کسی سے کوئی واسطہ بنائیں تو بنتا ہے، یوں کسی سے ملے بغیر غلط اندازے لگانے سے تو نہیں بنتا نا؟" زری نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں جب سے انگلینڈ کی ہوا لگی ہے، تجھے اپنی ماں کے اندازے بھی غلط لگنے لگے ہیں۔" ان کے انداز کی خفگی ہنوز تھی اور زری ان کی معصومیت سی بات پہ مسکرا دی تھی۔

"انگلینڈ میں بندے کو ہوا نہیں لگتی۔ یا تو برف لگتی ہے یا بارش۔" اس نے بی بی جان کو چھیڑا تھا۔

"بس بس مجھے بہلانے پھسلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اپنے لہجے میں سختی لاتے ہوئے بولیں۔

"ارے بی بی جان میں کیوں آپ کو بہلانے لگی؟ آپ یہ بتائیں کہ باقی سب کیسے ہیں؟ کوئی گاؤں کی نئی تازی؟" زری مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی اسے پتا تھا کہ ابھی وہ بہل بھی جائیں گی۔

"باقی سب بھی ٹھیک ہیں اور گاؤں میں تو آئے روز نئی تازی ہوتی ہی رہتی ہے کسی کے گھر خوشی اور کسی کے گھر غمی۔" وہ بات کرتے کرتے آہ بھر کے بولی تھیں۔

"کیوں بی بی جان خیریت تو ہے نا؟" زری کو ان کے لہجے میں افسردگی کی جھلک نظر آئی تھی۔

"بس بیٹا زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے، اب تو اپنی ہی بیٹیوں سے خوف آنے لگا ہے۔" وہ واقعی اندر سے ڈری ہوئی لگ رہی تھیں۔

"ہوا کیا ہے؟" زری کو بے چینی ہوئی۔

"ہونا کیا ہے بیٹا، دینو موچی کی بیٹی نے زہریلی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی ہے، چار بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی اب چاروں بھائی بھی بیلے رو رہے ہیں اور ماں بھی۔" دینو موچی کی بیٹی؟ کیا نام تھا اس کا، ہاں یاد آیا زلیخا نام تھا۔ زری نے ذہن پہ زور ڈالا اور سب یاد آ گیا تھا۔

''لیکن بی بی جان زلیخا تو بہت اچھی لڑکی تھی بہت سلجھی ہوئی اور عقلمند تھی۔'' زری کے دماغ کی اسکرین پہ زلیخا کا خاکہ ابھر ہو چکا تھا وہ زری کی ہم عمر ہی تھی اور کئی بار زری سے ملنے حویلی بھی آتی تھی۔

''بیٹا یہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا؟ سب سے پہلے بندے کی عقل ہی تو مارتی ہے اور رفتہ رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے زہریلی گولیاں کھا کر، کبھی زہر میں کود کر اور کبھی گھر والوں کی خاطر کسی ان چاہے کی ڈولی میں بیٹھ کر، بس فرق اتنا ہے کہ زلیخا کی ڈولی میں بیٹھنے والی خودکشی نہیں کی بلکہ گولیاں کھا کر خودکشی کر لی ہے۔'' بی بی جان کی بات زری کے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔

''لیکن بی بی جان زلیخا کی منگنی تو اس کے چچا کے بیٹے کے ساتھ ہو چکی تھی نا۔'' زری کو اک اک بات یاد آ رہی تھی۔

''بیٹا جس کے ساتھ منگنی ہوئی تھی اس کے ساتھ محبت نہیں ہوئی اور جس کے ساتھ محبت ہوئی تھی اس کے ساتھ منگنی نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ نہ منگنی کی ڈولی میں بیٹھی اور محبت کی ڈولی میں۔'' بی بی جان بتاتے ہوئے افسردہ ہو رہی تھیں۔

''اس کے گھر والوں کو اس کی محبت کا پتا تھا؟''

''سب پتا تھا ماں باپ کو بھی اور بھائیوں کو بھی، لیکن سب کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے بیاہ کر ہی دم لیں گے اور وہ بھی اپنی اولاد تھی اس کی بھی ایک ہی ضد تھی یا ڈولی، یا جنازہ۔ آج اس کا جنازہ نہ اٹھتا تو ڈولی اٹھنی تھی۔ آخر کسی ایک کی ضد تو پوری ہونی تھی، اپنی بات کے پکے سبھی تھے اور آج بھی رو رہے ہیں پتا نہیں اپنی ہار پہ رو رہے ہیں کہ اس کی جیت پہ؟ کیا ہوتا اگر ماں جات کونج کی طرح کرلاتی پھری تھی ان کے سامنے، پر کوئی بھی تو نہیں مانا تھا۔ اب نہ مانے کا ماتم کر بھی رہے ہیں تو اس تحریر کے کیا کام کا؟'' بی بی جان جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں اور زری چپ سادھے سب سن رہی تھی۔

''بس بیٹا انہی چیزوں سے ڈر لگتا ہے اور اللہ سے دعا کرتی ہوں جیسے پہلے ایک بیٹی کے فرض سے فارغ کیا ہے۔ اب دوسری بیٹی کے فرض سے بھی فارغ کر دینا، زمانہ بڑا ظالم ہے، کب کیا ہو جائے کچھ پتا نہیں چلتا۔'' وہ زری کے لیے دعا کر رہی تھیں زری کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔

''زری۔'' انہوں نے اس کی چپ محسوس کرتے ہوئے پکارا تھا۔

''جی بی بی جان؟''

''چپ کیوں ہو گئی ہو؟''

''زلیخا کو سوچ رہی تھی۔''

''چھوڑو بیٹا ایسی باتوں کو دل پہ نہیں لیتے۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''دل کی باتوں کو دل پہ نہ لیں تو اور کیا کریں؟ آج محبت کے قبیلے کا ایک فرد مر گیا، تو کیا اس کا افسوس بھی نہ کریں؟'' زری کے لہجے میں اداسی رچی تھی بی بی جان کو خود زلیخا کی موت پہ بے حد دکھ اور افسوس تھا اس لیے مزید کچھ نہ کہا۔

''بی بی جان کیا محبت اتنی ہی نامراد ہوتی ہے؟'' اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''نامراد ہوتی ہے تبھی تو بندے کو قبر میں لے جاتی ہے، چاہے سوہنی ہو، چاہے ماہیوال، یہ کسی کو بھی نہیں دیکھتی، نہ جوانی، نہ کالے بال، نہ گوری رنگت، نہ سرخ ہونٹ، بس سارا کچھ مٹی میں لے جاتی ہے اور پیچھے غم اور ماتم چھوڑ جاتی ہے یا پھر نام۔'' بی بی جان تو آج نہ جانے محبت کے کون سے بخیے اُدھیڑنے پہ تلی ہوئی تھیں۔ اور زری کا تو خود محبت کے قبیلے سے تعلق تو بھلا کیا کہہ سکتی تھی، محبت کے خلاف تو بالکل بھی نہیں۔

بی بی جان نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا لیکن زری کا دھیان پھر بھی نہیں ہٹا، وہ مسلسل زلیخا کے متعلق اور بی بی جان کی باتوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

''بی بی جان آپ کی بیٹی بھی محبت کی بیماری دل سے لگا بیٹھی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے کون سی خودکشی کرنی ہے؟'' خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی اور اٹھ کر باہر نکل آئی۔ کچن سے برتنوں کی کھڑ پٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نگارش اٹھ چکی تھی شاید۔

''گڈ مارننگ بھابی۔'' زری نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''گڈ مارننگ سویٹ ہارٹ۔'' نگارش نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے زری کا گال چھوا تھا۔

"اف بھابی۔" زری کسمسا گئی۔

"کیوں؟"

"اتنے ٹھنڈے ہاتھ ہیں آپ کے۔" اس نے اپنے گال کو سہلایا۔

"اب میں گرم ہاتھ کہاں سے لاؤں؟" نگارش کے انداز میں شرارت تھی۔ لیکن زری نے ان کی شرارت پہ کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

"کیا بات ہے زری؟" نگارش نے آنچ دھیمی کرتے ہوئے پوچھا وہ آملیٹ بنا رہی تھی۔

"کچھ نہیں بھابی۔" زری آگے بڑھ کے اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"زری۔" نگارش نے اس کے ہاتھ سے ٹی بیگز کا پیکٹ تھام لیا تھا وہ سپرٹ چائے بنا رہی تھی۔

"جی بھابی؟"

"بات کیا ہے؟"

"بی بی جان کا فون آیا تھا۔"

"پھر؟"

"گاؤں کے دھوبی کی بیٹی ریحانہ نے آج خودکشی کر لی ہے۔" وہ آہستگی سے بولی آواز جیسے لرز رہی تھی۔

"کیوں؟ اس نے خودکشی کیوں کی ہے؟" نگارش کو پریشانی ہوئی تھی۔

"جوان لڑکی خودکشی کیوں کرتی ہے؟" الٹا زری نے نگارش سے سوال کیا تھا۔

"یعنی محبت کی وجہ سے؟" نگارش سمجھ گئی تھی۔

"ہاں ایک اور قتل محبت کے سر۔" زری تلخی سے بولی۔

"غلط ہے زری ایسا نہیں کرنا چاہیے ان لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی زندگی کے متعلق سوچنا چاہیے، یہ حرام موت ہے، کیا حاصل ہوتا ہے ایسا کر کے؟" نگارش نے مخالفت کی تھی۔

"بی بی جان بتا رہی تھیں کہ یہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا سب سے پہلے بندے کی عقل ہی کو مارتی ہے اور رفتہ رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے، آپ خود سوچیے جس بندے کی عقل ہی مر جاتی ہے وہ اپنی زندگی کے متعلق کیسے سوچ سکتا ہے؟ اسے کیسے احساس ہو سکتا ہے کہ یہ حرام موت ہے؟ وہ تو حاصل اور لاحاصل کی فکر سے بھی بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے؟" زری نے بھی دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

"میں کچھ بھی نہیں کہوں گی کہ یہ سب غلط ہے غلط کیا ہے اس لڑکی نے۔" نگارش نے سر جھٹکا۔

"دعا کیجیے بھابی یہ غلط کام آپ کی زری کو نہ کرنا پڑے۔" زری ان کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر دوبارہ چائے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو تم؟" نگارش کو شاک لگا تھا۔

"عشق مر جائے تو بندہ پاگل ہی ہو جاتا ہے غالبؔ؟"

"اسٹاپ اٹ آئندہ ایسی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

نگارش نے اسے جھڑکا۔

"ڈونٹ وری بھابی ابھی اس محبت کے در سے اتنی مایوس نہیں ہوں میں، ابھی اُمید باقی ہے آس باقی ہے، دُعا کیجیے محبت میں مجھے وہ مل جائے جو چاہا وہ پا لیا۔" اس نے نگارش کے ہاتھ تھام کے کہا تھا اور نگارش اپنی گہری نظروں سے زری کے چہرے کو کھوجنے لگی تھی۔

"بات کروں تمہارے بھائی سے؟"

"کیسی بات؟"

"تمہارے رشتے کی، تمہاری شادی کی۔"

"مگر اس میں بھائی بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ اور جو کر سکتا ہے وہ تو اتنی دور بیٹھا ہے، لاتعلق اور انجان، کبھی بھولے سے بھی خیال

آیا اسے۔ "زری کے لبوں پہ شکوہ مچل گیا تھا۔

"ان شاء اللہ اسے ہی خیال آئے گا بس ہمارے پاس جانے کی دیر ہے، سارے خیال وہی کرے گا۔" نگارش نے اسے تسلی دے کر بہلایا۔

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" وہ گہری سانس کھینچ کے بولی تھی۔

"آمین، مدیحہ کی کوئی کال وغیرہ آئی؟ فرائیڈے کو وہ لوگ گئے تھے اتنے دن ہو رہے ہیں؟"

"نہیں مدیحہ کی تو نہیں نبیل اور فائزہ کی کال آئی تھی عبداللہ بھائی بتا رہے تھے۔"

"مدیحہ نے کیوں نہیں کی؟"

"اس کے پاس اپنا ذاتی نمبر نہیں ہے اس لیے۔"

"اوہ اچھا۔" نگارش اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اور زری بھی ان کے قریب بیٹھی چائے کا کپ تھامے پھر مشغول ہو گئی تھی۔

"وائیٹ سٹی چلو گی؟" نگارش نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"بھئی شاپنگ کرنے، آج تم فارغ ہو نا؟"

"نہیں بھابی آج موڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔

"موڈ کہاں ہے؟"

"اپنے گاؤں کے دینو موچی کے گھر میں۔" اس کے جواب پہ نگارش چونکی اور پھر چپ ہو گئی تھی اسے اندازہ ہو چلا تھا زری کا پورا دن اب اسی بات کے زیر اثر اداس اور افسردہ گزرے گا وہ چاہے کچھ بھی کر لے۔

♥

وہ نماز پڑھ کے چپ چاپ چھت پہ آ گئی تھی اور اکیلی ہی چھت پہ ٹہلنے لگی۔ ذہن الجھا ہوا تھا اسی لیے تنہائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی آدھا گھنٹہ ٹہلنے کے بعد جب تھک گئی تو چھت پہ رکھی چارپائی پہ لیٹ گئی اور نظر آسمان کے نظاروں سے جا ٹکرائی تھی۔ آسمان کا کشادہ سینہ روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس سینے سے چاند کی صورت غائب تھی۔

"اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ باقی ہر چیز کو بے فکر کیوں بنایا ہے؟" وہ ستاروں کی ٹمٹماتی روشنی دیکھ کر سوچنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

"چاند رات کو بے فکری سے نکلتا اور دن چڑھنے سے پہلے غائب ہو جاتا ہے۔ سورج دن کو بے فکری سے طلوع ہوتا اور شام کو ڈوب جاتا ہے نہ کوئی جھگڑا، نہ کوئی جھنجھٹ بس ایک سی لگی بندھی روٹین۔ لیکن انسان کا ہر دن پہلے دن سے مختلف ہوتا ہے اور ہر رات نئی رات ہوتی ہے، نئی فکریں اور نئی سوچیں لے کر۔ انسان ہر روز ہلکان ہوتا رہتا تھا اور باقی ساری کائنات بے فکر لگتی ہے۔" وہ ستاروں کو دیکھتے ہوئے نجانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی کہ نیچے ان کے دروازے پہ دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" یہ آواز ایمن کی تھی۔

"دروازہ کھولو۔" باہر سے عدیل کی آواز سنائی دی۔

"بھائی آ گئے، بھائی آ گئے۔" سونیا اور عدینہ اندر سے بھاگتی ہوئی نکلی تھیں ایمن نے دروازہ کھول دیا تھا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا وہ دونوں اس سے لپٹ گئیں وہ دونوں چھوٹی جو تھیں۔

"کیسی ہو میری جان۔" عدیل ان کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔ ایمن اس کے ہاتھ سے شاپر وغیرہ تھام چکی تھی۔

"آپ کیا لے کر آئے ہیں بھائی؟" ان دونوں نے اشتیاق سے پوچھا اور عدیل ان کی معصومیت پہ مسکرایا۔

"تم لوگوں کے لیے کھانے کی چیزیں لے کر آیا ہوں میری جان، مریم سے کہو وہ تمہیں پلیٹوں میں نکال دے۔" سونیا کا سر تھپکا۔

"میں نکال لاتی ہوں۔" ایمن نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ مریم کہاں ہے؟" عدیل چونکا، اب وہ بھی مریم کی غیر موجودگی نوٹس کر چکا تھا۔
"وہ تو شاید اوپر چھت پہ ہیں۔"
"کیوں؟"
"پتا نہیں ایسے ہی نماز پڑھی تو اوپر چلی گئی۔"
مریم نے قریب آتے ہوئے جواب دیا وہ نیچے اتر آئی تھی۔
"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"
عدیل کو اپنی چہیتی بہن کی طرف سے فکر ہوئی تھی۔
"جی بالکل ٹھیک ہوں دن میں شاید کپڑے دھوتی رہی ہوں اس لیے تھکن ہو گئی ہے۔"
"اچھا کیا تمہیں بھی تھکن ہوتی ہے؟" عدیل نے خفگی سے کہا تھا وہ جانتا تھا کہ مریم دن بھر کاموں میں مصروف رہ کر اپنی فراغت کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔
"پریشانی سے انسان ہی ہوں، تھکن ہو بھی سکتی ہے۔" وہ منہ بنا کر کہتی ایمن سے شاپر وغیرہ تھام کے کچن کی طرف بڑھی۔
"آج اتنی تو طبیعت کس لیے؟ خیر تو ہے؟" عدیل کہے بغیر نہ رہ سکا۔
"خیر ہی تو ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔
"یہ وائٹ والا شاپر رکھ لو، تمہارے لیے ہے۔" اس نے مریم کو اشارہ کیا وہ ہاتھ میں پکڑے شاپرز میں سے وائٹ شاپر پکڑے گی۔
"ابھی رہنے دو بعد میں دیکھ لینا۔" عدیل کا اشارہ وہ سمجھ گئی تھی لیکن اندر سے حیران بھی ہوئی تھی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ وہ سب کے سامنے دیکھنے پہ منع کر رہا ہے؟ پھر عدیل امی ابو کی طرف آ گیا اور مریم ان سب کو فروٹ چاٹ وغیرہ پلیٹوں میں نکال کر دینے لگی اور کافی دیر بعد کمرے میں آئی تو عدیل بھی آ گیا۔
"کیا ہے بھائی؟" بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔
"تمہارے لیے سوٹ ہے۔ گوجرانوالہ میں کپڑوں کی بہت اچھی ورائٹی تھی اور کافی سستے بھی تھے یہ سوٹ یونہی تمہارے لیے بسند کر لیا، سوچا اگر دوبارہ آنا ہوا تو ایمن اور عدینہ وغیرہ کے لیے لے کر آؤں گا۔" عدیل اپنی کہہ رہا تھا اور مریم اپنی سوچ رہی تھی اس کے سامنے اچھائی فیس سائیلنون کا سوٹ تھا اور دھیان فاطمہ کی برجھڑے کی طرف تھا، دماغ جوڑ توڑ کرنے میں لگا ہوا تھا۔
"کیا بات ہے پسند نہیں آیا؟" عدیل نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔
"نن... نہیں بھائی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، بہت خوبصورت سوٹ ہے، ٹھینک یو سو مچ۔" مریم کے دماغ پہ رکھی سوچوں کا بوجھ قدرے کم ہو گیا تھا اور عدیل بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہو گیا تھا پھر اس کا سر تھپکتے ہوئے منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

♥

"ریوالور؟"
"ہاں یہ ریوالور تم رکھو گے۔" وقار آفندی نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"لیکن صاحب اس کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" منصور حسین نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔
"اس کو رکھنے کی ہی تو ضرورت ہے اور اگر ڈیوٹی کے وقت تمہیں علیزے کی گاڑی کے آس پاس کوئی بھی مشکوک آدمی نظر آئے اسے گولی مار دینا۔" انہوں نے اسے اجازت دی تھی۔
"واقعی گولی مار دوں؟" وہ حیرت سے دوہرا کر بولا تھا۔
"ہاں... واقعی گولی مار دینا۔" وہ بھی زور دے کر بولے تھے۔
"اگر کوئی مر گیا تو؟"
"تو مر جائے، دشمن کے ساتھ رعایت کرنا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنے کے برابر ہوتا ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں بھی اس بات کا قائل ہوں، کوئی رعایت نہیں، کوئی گنجائش نہیں۔" منصور حسین نے ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"مجھے اپنی بیٹی کی زندگی سے زیادہ کوئی زندگی عزیز نہیں۔" وقار آفندی کے چہرے پہ سختی اُتر آئی تھی۔ منصور حسین خان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"ریوالور چلا سکتے ہو۔"

"چلا کر دکھاؤں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پہ رکھا ریوالور اُٹھالیا تھا اور پھر ریوالور کی نال میں ہلکی سی پھونک ماری تھی۔

"نہیں یہاں نہیں، حویلی میں فائر کی آواز سے سب پریشان ہو جائیں گے۔" انہوں نے منع کر دیا۔

"نشانہ کیسا ہے؟"

"جب ریوالور چلاؤں گا نہیں تو میرے نشانے کا پتا کیسے چلے گا؟" منصور حسین نے بے دلی سے کہا تھا۔

"اسلحے کا لائسنس ہے؟" انہوں نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔

"جی صاحب ہے تو سہی، پر رینیو کروانے والا ہے۔"

"تو کروا دو، ابھی چند دنوں میں تو ضرورت ہے۔"

"کروالوں گا سر! لیکن پاس لائسنس کی فیس بھرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں ابھی۔" اس نے اصل مسئلہ بیان کیا تھا۔

"ڈونٹ وری، مبارک خان تمہارے ساتھ جائے گا اور سارا کام کروا دے گا۔ مبارک خان نے اپنا لائسنس بھی رینیو کروانا ہے شاید؟" وقار آفندی نے مبارک خان کی سمت دیکھا۔

"جی صاحب میں نے بھی آج اور کل میں ہی کروانا ہے۔" مبارک خان نے فوراً تائید کی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر منصور حسین کو بھی ساتھ لے جانا۔"

"جی لے جاؤں گا۔"

"تمہارا آئی ڈی کارڈ کہاں ہے؟"

"حاضر ہے صاحب۔" منصور حسین نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا وہ اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔

"صاحب اس کے پاس موبائل بھی نہیں ہے ہم اس سے رابطہ کیسے کریں گے؟" مبارک خان نے گلے ہاتھوں ایک بات بیان کی تھی۔

"وہ بریف کیس اُٹھا کر ادھر رکھو۔" وقار آفندی نے کاؤچ پہ رکھے بریف کیس کی سمت اشارہ کیا تھا مبارک خان نے بریف کیس اُٹھا کر ان کے سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا انہوں نے بریف کیس کا پاس ورڈ پریس کیا اور لاک اوپن کر لیا تھا پھر ایک سیٹ بمعہ چارجر کے نکال کر منصور حسین کے سامنے رکھا۔

"یہ موبائل تمہارے لیے ہے، اسے تم رکھو گے، سم کارڈ ہم خود ایشو کروا کے دیں گے۔ اور ہاں موبائل چوبیس گھنٹے آن چاہیے، فل چارجر، فل سگنل، فل کریڈٹ، کسی چیز میں بھی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔" انہوں نے دو ٹوک سمجھایا تھا۔

"ان شاء اللہ صاحب کوئی کمی نہیں آئے گی، موبائل ہی نہیں میں خود بھی چوبیس گھنٹے آن رہوں گا۔" اس نے وقار آفندی کو یقین دہانی دی تھی۔

"مبارک خان سرونٹ کوارٹر صاف کروا دے گا تم وہاں شفٹ ہو جانا، اپنا کوئی سامان لانا چاہتے ہو تو وہ بھی لے آنا۔" وقار آفندی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے بریف کیس بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔

"نوکری پکی ہے نا صاحب؟" منصور حسین نے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔

"ان شاء اللہ۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی اور وہاں سے چلے گئے تھے۔ منصور حسین اور مبارک خان پیچھے اکیلے رہ گئے۔

"شکریہ مبارک خان۔" منصور حسین اس کا مشکور ہوا۔

"کس بات کا؟"

"نوکری دلائے گا۔"

"نہیں منصور حسین نوکری تم نے خود اپنے بل بوتے پہ لی ہے، ورنہ صاحب کہاں اتنا دھیان رکھنے والے تھے، تم نے ہمت نہیں ہاری، بار بار دروازہ پہ آتے رہے۔" آج مبارک خان بھی بڑا خوش ہو رہا تھا چلو ایک غریب کا تو بھلا ہوا نا؟

"مشکور تو مجھے تھی میں نے بار بار آنا تو تھا ہی؟" منصور حسین نے خوشی اور افسردگی کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

"چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔" مبارک خان نے اشارہ کیا۔

"کہاں؟"

"تمہارے گھر۔"

"آج یہ عنایت کیوں؟"

"آج تم حویلی کے ملازموں کی لسٹ میں شامل ہو چکے ہو اس لیے۔" مبارک خان نے مسکرا کے کہا تھا۔

"بڑے خود غرض ہو؟" منصور حسین نے گھور کے کہا۔

"کام میں خود غرض ہونا ہی پڑتا ہے۔"

"چلو یہ تو وقت وقت کی بات ہے بچے۔" منصور حسین اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا اور ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ بڑی حویلی کے پُرغرور، بلند و بالا اور مضبوط عمارت کو دیکھ کے رہ گیا تھا۔ بڑی حویلی کے احاطے میں نظر دوڑاتے ہوئے اس کی نظروں میں عجیب سی حسرت ہوتی تھی عجیب سے خواب ہوتے تھے۔

"مبارک خان۔" اس نے کسی خاتون کی آواز پہ چونک کر دیکھا تو حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے بنی سیڑھیوں پہ آسیہ بیگم کھڑی تھیں۔

"جی بیگم صاحبہ؟" وہ مؤدب سا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"کار لی ہو؟" انہوں نے اک نظر منصور حسین کو دیکھ کر مبارک خان سے پوچھا۔

"آپ حکم کریں بیگم صاحبہ۔"

"فریزر میں آئس کریم نہیں ہے، علیزے کے لیے آئس کریم لے آنا۔"

"جی لے آؤں گا، صاحب نے کہہ دیا تھا مجھے۔" وقار آفندی کو آسیہ آفندی سے بھی زیادہ بیٹی کی فکر تھی وہ دن میں ایک بار آئس کریم ضرور کھاتی تھی اس لیے فریزر میں ہمہ وقت آئس کریم موجود رہتی تھی۔

"یہ کون ہے؟" انہوں نے کچھ دور کھڑے منصور حسین کے متعلق پوچھا۔

"علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور ہے اور گارڈ بھی۔" مبارک خان نے تعارف کروایا تھا۔

"السلام علیکم۔" منصور حسین نے آگے بڑھ کے سلام کیا وہ ان کی نرم و نفیس سی پُروقار شخصیت سے حقیقتاً متاثر ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی منصور حسین۔" اس نے احتراماً جواب دیا تھا۔

"صاحب سے ملاقات ہوئی؟"

"جی صاحب سے مل کر ہی آ رہے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ سر ہلا کر رہ گئیں لیکن یہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھیں کہ وقار آفندی نے اتنے جوان جہان آدمی کو کام پہ کیسے رکھ لیا ہے؟ وہ تو اتنے لگ ملازموں کے حق میں ہی نہیں تھے۔

"ہمیں اجازت ہے؟" مبارک خان نے اجازت چاہی۔

"ہوں جاؤ تم لوگ۔" انہوں نے اجازت دی اور پلٹ کر اندر چلی گئیں۔

"یہ کون ہیں؟" منصور حسین نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بڑی بیگم صاحبہ ہیں، علیزے بی بی کی امی ہیں۔"

"تمہاری علیزے بی بی کیا چیز ہیں آخر؟" اس نے مبارک خان کو دیکھا۔

''طیبہ بے بی وہ چیز ہیں، جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' مبارک خان مسکرا کے بولا۔
''یعنی دیدار لازم ہو گیا ہے؟'' جواباً وہ بھی ہنسا تھا۔
''بیگ کے منصور حسین، وہ وقار آفندی کی بیٹی ہیں۔''
''صرف دیکھنے کی ہی تو بات کی ہے۔'' منصور حسین نے ذومعنی کہا۔
''دیکھنا بھی سوچ سمجھ کے۔''
''اوئے تم سنبھال کے رکھو اپنی طیبہ بے بی کو، ہمارے دیکھنے کے لیے اور بہت ہیں۔'' منصور حسین نے شاہانہ انداز میں کہا۔
''ہاں بس یہی ٹھیک ہے۔'' مبارک خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔
اس کی گاڑی فراٹے بھرتی گیٹ سے اندر روش پہ آ رکی تھی۔ وہ ڈور کھول کے نیچے اترا تھا لیکن ابھی ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھا تو نبیل کا نمبر نظر آیا تھا۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام۔'' مجھے میرے گھر میں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے ہو؟ پلٹ کر کوئی خبر ہی نہیں لی؟'' نبیل نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔
''یعنی تمہیں تمہارے گھر میں چھوڑ کر خود بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہتا؟''
''تو اس میں کیا قباحت تھی؟''
''اپنا گھر ملازموں کے حوالے کر دیتا؟'' دل آور نے استہزائیہ پوچھا۔
''کر دیتے۔''
''کر دیتا ضرور کر دیتا، لیکن اگر کبھی تم میرے لیے اپنا بزنس اپنے کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے پاکستان آئے ہوتے۔ یا کر دیتے میرے لیے پاکستان آنے کا سوچا؟'' دل آور نے ایک ہی جملے میں اگلے پچھلے حساب بے باق کر دیئے تھے نبیل ٹھٹک کے رہ گیا تھا۔
''یہ کیا کہہ رہے رہو تم؟ اب تم میرے ساتھ میرے والا برتاؤ کرو گے؟''
''میں تمہارے ساتھ تم سے بھی بُرا برتاؤ کروں گا۔'' اس نے دھمکی دی۔
''اتنی بڑی سزا؟''
''میں نے سزائیں دینا اور سزائیں دلانا ہی تو سیکھا ہے۔'' دل آور کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔
''بس بس مجھے ڈراؤ مت اور میرے گھر پہنچو۔'' نبیل نے سر جھٹک کر کہا تھا اسے پتا تھا کہ جب دل آور کا لہجہ عجیب ہوتا تو پھر وہ خود بھی سیریس ہو جاتا ہے۔
''کیوں؟''
''یار اتنے سارے کام ہیں۔''
''میں نہیں آ سکتا۔''
''کیوں یار؟''
''بس اسلام آباد کے لیے نکل رہا ہوں۔''
''خیریت؟''
''ہوں..... اماں سے ملنے جا رہا ہوں۔''
''یار ان سے تو میں نے بھی ملنا تھا؟''
''ابھی تم اپنا گھر سیٹ کرو پھر ان سے بھی مل لینا۔'' دل آور نے مشورہ دیا۔
''گھر سیٹ کرنے کے لیے ہی تو تمہیں بلایا ہے۔'' نبیل خفگی سے بولا۔
''کیوں کیا مسئلہ ہے؟''

"کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں نا؟ اتنے سارے مسئلے بکھرے پڑے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ اپنے لیے گاڑی نکلوانی ہے، مدیحہ کے لیے گاڑی نکلوانی ہے، اپنے لیے، ماہم کے لیے اور مدیحہ کے لیے موبائل فون کے سم کارڈز لینے ہیں، اپنا بینک اکاؤنٹ اوپن کروانا ہے، کرنسی چینج کروانی ہے بلکہ اور بھی ہزاروں کام ایسے پڑے ہیں جن کے بغیر ہم بیکار بیٹھے ہیں۔" نبیل نے کاموں کی لسٹ گنوائی۔

"ایک دن صبر کرلو، کل تمہارے سارے کام ہو جائیں گے، میں کل واپس آجاؤں گا۔" دل آور نے اسے تسلی دی۔

"یار اس میں صبر کی بات کہاں سے آگئی یہ سب ضرورت کی چیزیں ہیں اور ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں، صرف لینڈ لائن نمبر کا سہارا ہے۔" نبیل نے جھنجلا کر جواب دیا تھا۔

"اچھا میں ایک کام کرتا ہوں گلاب خان کو تمہاری طرف بھیج دیتا ہوں تم اس کے ساتھ کسی بھی موبائل کمپنی کی فرنچائز میں جاؤ اور اپنی مرضی کے نمبر ایشو کروالو، اگر کیش کی ضرورت ہے تو وہ بھی بھیج دیتا ہوں اور کچھ دن کے لیے میری دوسری گاڑی بھی تم اپنے پاس رکھ لو۔" اس نے نبیل کے مسائل کا مختصر اور فوری حل سوچا تھا۔

"لیکن یار!" نبیل نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کس لیے؟ میں بھیجتا ہوں گلاب خان کو، چھوٹے موٹے کام نبٹالو، باقی میں آجاؤں تو پھر کرلوں گا۔" دل آور نے اسے ہدایت دی۔

"کل آجاؤ گے؟"

"ہوں۔"

"اوکے بھیج دو گلاب خان کو۔"

"وہ تو میں بھیج دیتا ہوں لیکن دھیان رکھنا اس کی کل تمہارے گھر میں ہے تھوڑی دیر کی تنہائی کی ضرورت ہوگی انہیں۔" دل آور کا لہجہ شرارتی تھا اور نبیل بدک گیا تھا۔

"کیا کہا؟"

"میں نے کہا ہے کہ وہ دل سے بچھڑے ہوئے ہیں انہیں ملنے کا موقع دے دینا۔" وہ اپنی شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔

"بڑا ایکسپرٹ ہے تو دونوں کے ملنے اور بچھڑنے کا۔" نبیل نے ذومعنی انداز سے پوچھا۔

"یہ بحث پھر کبھی سہی۔" دل آور نے ٹال دیا۔

"دل آور۔"

"جی میری جان؟"

"ٹال رہے ہو؟"

"نہیں یار بس بحث لمبی ہوگئی تو میں لیٹ ہو جاؤں گا اس لیے پھر کبھی۔" دل آور سنجیدہ ہو گیا تھا اور نبیل کو چپ ہونا پڑا۔

"خیر کب تک راز کو راز رکھے گا، کبھی تو سامنے آئے گا نا؟" نبیل نے دھمکی دی۔

"جب آئے گا تب دیکھا جائے گا۔"

"اوکے اللہ حافظ۔" نبیل نے کہہ کے فون رکھ دیا تھا اور دل آور موبائل کو دیکھتا نبیل کی بات سوچتا رہ گیا تھا۔

"یار اس ماہ کا ڈائجسٹ کس کے پاس ہے؟" حرمت اندر داخل ہوتے ہی کافی عجلت بھرے انداز میں استفسار کر رہی تھی۔

"انوشہ کے پاس۔" جویریہ نے لاپروائی سے کہتے ہوئے ڈائجسٹ کو ناممکن طریقے سے کشن کے نیچے چھپا دیا تھا۔

"لیکن انوشہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ کومل کے کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔" حرمت نے اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی کیا خاص بات ہے اس ماہ کے ڈائجسٹ میں؟" جویریہ آنکھیں مٹکا کے بولی تھی کومل، مدحت اور ایمنہ اپنی مسکراہٹ نہ روک پائی تھیں۔

''وہ سلسلے وار ناول کی لاسٹ قسط آئی تھی۔''

''وہ تو آ چکی ہے۔'' جویریہ نے بے ساختہ کہا تھا۔

''ہیں؟ تمہیں کیسے پتا؟ تم نے پڑھ لی ہے؟'' حرمت ٹھٹک گئی۔

''نہیں ابھی پڑھنے والی تھی کہ تم آ گئیں۔'' کومل نے آہستگی سے لقمہ دیا تھا۔

''کیا کہا؟ حرمت چیخ اٹھی اور جویریہ فوراً کشن کے نیچے سے ڈائجسٹ جھپٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

''دیکھو حرمت میں قسط پڑھنا شروع کر چکی ہوں، پہلے مجھے پڑھ لینے دو پھر تم پڑھ لینا۔'' جویریہ، حرمت اور انوشہ تینوں ہی ڈائجسٹوں کی دیوانی تھیں ہر مہینے تینوں نے باری باری ڈائجسٹ منگوانا ہوتے تھے اور جس مہینے جو ڈائجسٹ منگواتی تھی اس مہینے اس کی اجارہ داری ہوتی تھی۔ اس بار حرمت کی باری تھی سارے ڈائجسٹ اسی نے منگوائے تھے اسی لیے اسی کی اجارہ داری تھی۔

''میں نے اپنے سارے پیسے صرف اس ایک قسط کے لیے ہی تو خرچ کیے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ ابھی نہ پڑھوں؟'' حرمت نے تلملا کے کہا تھا۔

''یار تھوڑی دیر بعد پڑھو گی تو بھی تمہارے پیسے پورے ہو جائیں گے۔'' جویریہ نے اسے تسلی رکھنے کا کہا۔

''تو پھر وعدہ کرو جب تک میں قسط نہ پڑھ لوں تم کوئی بھی بات ڈسکس نہیں کرو گی، اس طرح سارا چارم ختم ہو جاتا ہے۔'' نجانے کیوں اور کیسے حرمت مان گئی تھی ورنہ وہ ناولز کے معاملے میں بے حد کریزی تھی۔

''او کے وعدہ۔'' جویریہ نے خوشی خوشی وعدہ کیا تھا۔

''چلو تم مجھو میں تب تک پڑھ لوں۔'' جویریہ خاصی خوش ہوئی تھی اور حرمت اپنی بے چینی پہ کنٹرول کرتے ہوئے کومل کے قریب فلور کشن پہ بیٹھ گئی تھی۔

''کیا ملتا ہے ان ناولز اور ڈائجسٹوں سے؟'' کومل نے تعجب سے پوچھا۔

''جو آج کل کے معاشرے سے نہیں ملتا۔'' حرمت نے دوٹوک کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب ان ناولوں اور ڈائجسٹوں سے ہمیں نصیحت ملتی ہے، زندگی جینے کا تھوڑا بہت ڈھنگ ملتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ چند لمحوں کی خوشی اور راحت ملتی ہے۔ جو آج کل حقیقت کی دنیا میں بالکل بھی نہیں ہے۔'' حرمت کے جواب پہ کومل واقعی چپ ہو گئی تھی۔

''یہ سب افسانوی باتیں ہیں یار۔'' مدحت نے سر جھٹک کر تمسخرانہ کہا تھا۔

''تمہارے سمجھنے اور میرے سمجھنے میں بہت فرق ہے یار! تم ہر چیز کو ٹیپریری لیتی ہو اور میں ڈیپ لی۔'' حرمت نے اپنی حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ مدحت بڑے سکون سے بیٹھی اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کی تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔

''حرمت۔'' باہر سے ثروت بیگم کی آواز سنائی دی تھی۔

''جی مام؟''

''وہ نیچے دانیال آیا ہے اسے کھانا نکال دو۔'' انہوں نے کومل کے بیڈ روم کا ڈور کھولتے ہوئے اسے کام سونپا۔

''دانیال کو کھانا؟''

''ہاں وہ عائشہ باجی اور انوشہ مارکیٹ تک گئی ہیں انیکسی میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے اسے کہا کہ کھانا کھا کر ہی جاؤ وہ انتظار کر رہا ہو گا۔'' انہوں نے اشارہ کیا۔

''اس بات کو بھی ڈیپ لی لیجیے گا۔'' مدحت نے پیچھے سے آواز دی تھی اور حرمت اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ وہ کچن میں آئی تو دانیال واقعی انتظار کر رہا تھا لیکن شکر تھا کہ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ احمد بھی بیٹھا ہوا تھا احمد شاید ابھی ابھی آیا تھا، پانی کی بوتل سے پانی انڈیل کر پی رہا تھا اور دانیال اس کے ساتھ محو گفتگو تھا حرمت نظروں کے حصار سے بچ گئی تھی ورنہ وہ دانیال کی چپ اور بولتی آنکھوں سے خائف ہو جاتی تھی۔

PRIME URDU NOVELS

بیگم صاحب آج کھانے میں کیا بنانا ہے؟" ملازمہ ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں ہی چلی آئی تھی۔

"قیمہ کر لیے۔" بتول شاہ کے لہجے میں حکم تھا۔

"آج اتنے دنوں بعد میرا بیٹا گھر آ رہا ہے تو کھانا بھی اسی کی پسند کا ہوگا۔"

"لیکن بیگم صاحبہ وہ قیمہ کریلے؟"

"تم جا کر مسالہ تیار کرو قیمہ اور کریلے ابھی آ جائیں گے، منصور لے کر آتا ہی ہوگا۔" بتول شاہ نے حکم جاری کیا تھا آج وہ اس کی آمد کا سن کر بہت خوش ہوئی تھیں اور کالج بھی نہیں گئی تھیں اس بار وہ کافی دنوں بعد آ رہا تھا۔ اور وہ کافی دنوں سے اس کے لیے اداس بھی ہو رہی تھیں لیکن وہ اپنے کاموں میں بڑی تھا اسی لیے اسے آنے کا نہیں کہا تھا لیکن آج جب اسے فرصت ملی تو اس نے سب سے پہلے اماں سے ملنے کا ہی سوچا تھا اور فون کر کے انہیں اطلاع بھی دے دی تھی انہوں نے اس کا بیڈ روم از سر نو صاف کروایا اور ملازمہ کو اس کی فیورٹ ڈشز بنانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا پورا دن بیٹے کی آمد کی تیاریوں میں ہی گزر گیا تھا شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا وہ تیز قدموں سے راہداری عبور کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھیں اتنے میں وہ بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم اماں۔" وہ ان کے سامنے جھک گیا اور بتول شاہ نے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔

"میری جان، جیتے رہو، خوش رہو۔" وہ اس کے کندھوں اور بالوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں اور دوبارہ پھر اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ان کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں دیکھتی ہوں تو جوان ہو جاتی ہوں، سارے غم بھول جاتی ہوں۔" ان کی آواز ہی نہیں آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں اور دل آور شاہ ان کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اندر لے آیا تھا۔

"یہ دن آپ کے اداس ہونے کے دن نہیں ہیں، یہ تو آپ کی خوشی کے دن ہیں، خوش رہا کریں اور اللہ کے رنگ دیکھتی جائیں۔" اس نے ان کو صوفے پہ بٹھاتے ہوئے کہا اور ان کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"میری خوشیوں کے دن تو اسی روز ختم ہو گئے تھے جس روز بابر شاہ کی موت ہوئی تھی۔" بتول شاہ کے لہجے میں دکھ کی ہوک اٹھ رہی تھی دل آور نے لب بھینچ لیے اور سر جھک گیا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بتول شاہ کو اپنے آپ کو کنٹرول کرنا پڑا کتنی غلطی کر رہی تھیں وہ، وہ اتنا طویل سفر طے کر کے آیا تھا اور آتے ہی انہوں نے اس کی تھکن میں اضافہ کر دیا تھا وہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہیں؟"

"تمہارے لیے جوس لے آؤں۔"

"اوہ نہیں اماں آپ بیٹھیں میں لے لوں گا یا پھر ملازمہ کو آواز دے دیجیے۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔

"ملازمہ کو کیوں؟ میں خود لے کر آتی ہوں۔" وہ نرمی سے کہہ کر کچن میں چلی گئی تھیں اور چند منٹ کے توقف کے بعد اس کے لیے انار کا جوس لے آئی تھیں۔

"آپ میرے پاس بیٹھیں اور یہ بتائیں کہ آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں؟"

"میں کمزور لگ رہی ہوں۔" وہ حیرت سے بولیں۔

"لیکن میں تو اپنے آپ کو بالکل فٹ محسوس کر رہی ہوں۔" وہ مسکرانے لگیں۔

"لگتا ہے آپ کالج کو زیادہ ٹائم دے رہی ہیں؟"

"اوہ چھوڑو ٹائم کو، تم یہ بتاؤ نیہل اور مدیحہ کیسے ہیں؟" بتول شاہ نے سر جھٹک کر استفسار کیا تھا۔

"وہ بھی فٹ فاٹ ہیں، نیہل آپ کو یاد کر رہا تھا آپ سے ملنا چاہتا تھا۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"ہاں میری بات ہوئی تھی فائزہ بھابی سے وہ پاکستان آ کر بہت خوش ہیں، اللہ کے بڑے شکرانے ادا کر رہی تھیں۔" بتول شاہ نے کل فائزہ بیگم کو باقاعدہ خود فون کیا تھا اور اتنے سالوں بعد وطن واپس آنے پہ مبارک باد دی تھی۔

''ہاں نبیل بھی، بہت خوش ہے۔'' دل آور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور مدیحہ؟''

''مدیحہ بھی ٹھیک ہے بس پہلی بار پاکستان آئی ہے اس لیے اسے ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کچھ عرصے لگے گا۔'' اس نے مدیحہ کی ناخوشی کا جواز دیا۔

''عبداللہ اور اس کی فیملی کیسی ہے؟'' وہ دل آور کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں، عبداللہ سے بھی بات ہوتی رہتی ہے۔'' اس نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور جوس کا گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

''زری سے بھی بات ہوتی ہے؟'' ان کے اس اچانک اور گہرے سوال پہ دل آور نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔

♥

بتول شاہ اس کی سمت بڑی گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں، دل آور شاہ نے چند سیکنڈز میں ہی اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کر لیے تھے۔ تاکہ وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکیں۔

''اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے؟'' انہوں نے دل آور کے چہرے پہ فوکس کر رکھا تھا لیکن وہ بھی اس کام میں ماہر تھا چہرے کے تاثرات چھپانا اور کسی کو نظر کا دھوکہ دینا اس کے لیے مشکل تو نہیں تھا۔

''میں نے کب کہا کہ سوال مشکل ہے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اچانک زری کا خیال کیسے آیا؟'' اس نے بڑی مہارت سے بات کا رُخ بدل دیا۔

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ مدیحہ کا خیال آ سکتا ہے، نبیل کا آ سکتا ہے، عبداللہ کا آ سکتا ہے تو پھر زری کا کیوں نہیں آ سکتا؟ وہ بھی تو عبداللہ کی فیملی کا حصہ ہے، بہن ہے اس کی؟'' وہ بھی اسی کی ماں تھیں چھوٹی موٹی بات سے بہلنے والی نہیں تھیں، دل آور کو مزید سنبھلنا پڑا۔

''دراصل آپ کی زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ میری زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے؟'' وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟'' دل آور کو واقعی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ جب ہی تو حیران ہو رہی تھی۔

''ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہی ہوئی ہے۔'' انہوں نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا، دل آور کو یقین نہیں آیا تھا کہ ان کا آپس میں کانٹیکٹ ہے۔

''اچھا... کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟''

''کیوں تمہیں بُرا لگا؟''

''مجھے کیوں بُرا لگے گا؟'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''تمہارے چہرے سے تو یہی لگ رہا ہے؟''

''میرے چہرے پہ نہ جایا کریں، سراسر دھوکہ دیتا ہے۔''

''میں تمہاری ماں ہوں، تمہارے دھوکے بھی سمجھتی ہوں۔'' انہوں نے یقین سے کہا۔

''تو پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ مجھے آپ کا اور زری کا کنٹیکٹ کسی لحاظ سے بُرا بلکہ عجیب لگ رہا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس خالی کیا اور ذرا آگے جھکتے ہوئے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

''کیا تمہیں زری پسند نہیں ہے؟'' ان کا یہ سوال واقعی مشکل تھا لیکن جواب تو دینا ہی تھا، چپ رہتا تو وہ اقرار سمجھتیں۔

''پسند ناپسند کا قصہ ابھی رہنے دیں۔''

''کیوں رہنے دوں؟''

''بس ابھی دل سے اس کی پسند اور ناپسند پوچھی ہی نہیں۔'' اس کا انداز ہنوز سنجیدہ ہی تھا۔

"تو پوچھو نا۔"
"نہیں اماں! ابھی پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"سب آئے گا وقت؟"
"جب میں آپ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں گا۔" اس نے برملا کہا تھا اور بتول شاہ اسے دیکھتی رہ گئیں اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ لیکن آنکھوں میں قیامت ہلکورے لے رہی تھی ان کا کلیجہ دہل گیا۔ وہ اس قیامت کو روکنا بھی چاہتیں تو روک نہیں سکتی تھیں، اب سب کچھ اختیار سے باہر تھا۔
"آپ بیٹھیں، میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ ان کی چپ سے دامن بچا کر کھڑا ہو گیا اور بتول شاہ اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھتی رہیں۔
"کھانا لگا دوں بیگم صاحبہ۔" ملازمہ کی آواز پر وہ چونک کر متوجہ ہوئیں اور اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"بھائی....."
"ہوں.....؟"
"آپ سے اجازت لینا تھی۔" اس نے دھیمے سے کہا، عدیل چونک گیا، وہ نہا کر اپنے کام پہ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، جب مریم اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔
"کیسی اجازت؟"
"وہ کل فاطمہ کی برتھ ڈے ہے، اس نے فون کر کے انوائیٹ کیا تھا میں نے جانے کے لیے ہامی تو نہیں بھری، لیکن وہ بہت اصرار کر رہی تھی۔" مریم نے آہستگی سے بتایا۔
"تو اس میں اتنا ڈرنے والی کیا بات ہے؟" عدیل کو حیرانی ہوئی۔
"آپ سے اجازت لینا تھی کہ کیا میں کل اس کے گھر جا سکتی ہوں؟"
"ہوں..... لیکن ان کا فنکشن تو رات میں ہو گا؟" عدیل نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا۔
"جی....." مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔
"تو پھر کیسے جاؤ گی تم؟ آنے جانے میں مسئلہ ہو گا؟"
"وہ گاڑی بھیج دے گی۔"
"وہ گاڑی بھیج تو دے گی، لیکن تم رات کے وقت ڈرائیور کے ساتھ اکیلی تو نہیں آ جا سکتیں؟" عدیل کو اس کے جانے کی نہیں بلکہ پک اینڈ ڈراپ کی فکر ہو رہی تھی۔
"تو پھر کس کو ساتھ لے کر جاؤں؟" مریم کو پریشانی ہو رہی تھی۔
"میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔" اس نے مریم کو تسلی دی۔
"آپ؟ لیکن آپ کیسے چھوڑ کے آ سکتے ہیں؟ آپ تو شام کو تھکے ہارے آتے ہیں، مجھے چھوڑنے کیسے جائیں گے؟ آپ کے ساتھ تو خود انسپورٹ کا مسئلہ ہے۔"
"تم میرے مسئلے کو چھوڑو، اپنی فکر کرو، تم نے کل فاطمہ کے گھر جانا ہے، تو بس فکر چھوڑ دو۔" وہ مریم کو ڈراپ کرنے کے لیے طریقہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ کی سوئی سلو کی موٹر سائیکل پہ جا کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ اگر تھوڑی دیر کے لیے سلو سے موٹر سائیکل مانگ لیتا تو یقیناً وہ انکار نہ کرتا اور اس طرح مریم آسانی سے جا بھی سکتی تھی اور آ بھی سکتی تھی۔
"لیکن بھائی۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"لیکن ویکن چھوڑو اور کل جانے کی تیاری کر لو۔" اس نے بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے کہا اور مریم سر ہلا کر پلٹ گئی۔
"سنو۔" اس نے آواز دی۔
"جی؟" وہ ٹھہر گئی۔

"اگر اس کی برتھ ڈے پہ جانا ہے تو کچھ لے کر بھی تو جانا ہے؟" جو پریشانی مریم کو جانے کا سن کر ہوئی تھی وہ ہی پریشانی عدیل کو بھی ہوئی تھی۔

"جی یہ تو ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو کیا لے کر جاؤ گی؟" اس کے سوال پہ مریم نے چہرہ جھکا لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئیں؟" عدیل اب پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"وہ دراصل اور کوئی گفٹ نہیں تھا دینے کے لیے، اتنے دنوں سے امی کا سلائی کا کام بھی ڈاؤن جا رہا ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کل جو سوٹ لائے تھے وہ میں فاطمہ کو گفٹ کر دوں گی، اتنا پیارا سوٹ ہے، اسے پسند آئے گا۔" مریم نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا اور عدیل چپ ہو گیا۔

"کیا بات ہے آپ کو بُرا لگا؟" مریم پریشانی سے پوچھ رہی تھی، آخر وہ اتنی محبت اور اتنے شوق سے لے کر آیا تھا۔

"ظاہر ہے بُرا تو لگے گا۔"

"لیکن بھائی وقت بھی تو گزارنا ہے، گھر کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم اپنے فرینڈز کے لیے کوئی اچھا گفٹ خرید سکیں ریئلی آپ اتنا پیار سے لیے سوٹ لے آئے ہیں اور میں نے گفٹ دینے کا سوچ لیا، ورنہ یہ بھی نہ ہوتا تو میں کبھی جانے کا سوچتی بھی نہیں۔" اس نے عدیل کو وجہ بتائی۔

"آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلی بار بھی میں نے اسے وش نہیں کیا تھا اور وہ ہمارے گھر آ کر کتنا خفا ہوئی تھی، اس بار بھی میں نے وش نہ ہونے کی وجہ سے اسے وش نہیں کیا تھا۔ اور بہانا کر دیا کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔" مریم اسے ساری صورتحال سے آگاہ کر رہی تھی۔

"لیکن پھر بھی اگر آپ کو بُرا لگ رہا ہے تو میں اسے منع کر دیتی ہوں کہ میں نہیں آ سکتی، کیونکہ گفٹ کے بغیر خالی ہاتھ جانا بھی تو مناسب نہیں ہے۔" مریم نے سعادت مندی سے کہا کہ اگر اسے پسند ہے تو ٹھیک، اگر نہیں تو وہ اپنا جانا کینسل کر دے گی۔ عدیل نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور پھر آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں نا؟ ایک تو کیا دس، دس سوٹ لا کر دوں گا، اگر اپنی دوست کو گفٹ دے کر خوش ہو تو میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ یہ سوٹ میں نے تمہاری خوشی کے لیے لیا ہے، سین یور تمہاری خوشی کسی اور طرح سے حاصل ہوتی ہے تو یونہی سہی۔" اس نے مریم کا سر تھپکتے ہوئے کہا تھا اور مریم کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تھینک یو بھائی! تھینک یو سو مچ۔" اس کے سر سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"میشن نائٹ ڈیئر۔" جواباً وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"تو پھر میں کل کے لیے تیاری کر لوں؟"

"بالکل کر لو، لیکن اتنا بتا دو کہ آج ناشتہ ملے گا یا نہیں؟" عدیل نے دلچسپی سے کہا۔

"اوہ سوری بھائی! میں بس پانچ منٹ میں آپ کا ناشتہ لگا رہی ہوں، آپ فوراً آ جائیے۔" وہ کہہ کے جلدی سے باہر نکل گئی اور عدیل بھی مسکراتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

♥

وہ بیزاری سے بیٹھا میگزین اُلٹ پلٹ کر رہا تھا، جب اچانک ڈاکٹرز خیر و بابا کے چیک اپ کے لیے اندر آ گئے اور آذر کی ہدایت کے مطابق وہ فوراً الرٹ ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام کیا تھا۔ ڈاکٹرز اس کے سلام کا جواب دے کر خیر و بابا کے چیک اپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کے زخم کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے چند دوائیاں تجویز کیں اور انہیں ڈسچارج کرنے کا کہہ دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" جو دت ڈاکٹرز کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

"آج ان کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے، آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے خوشی کی خبر سنائی تھی۔

"ریئلی ڈاکٹر؟"

"آف کورس۔" ڈاکٹر نے کندھے اچکائے۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" جودت نے بڑی گرمجوشی سے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا تھا۔

"مسٹر آذر آفندی کہاں ہیں؟" ڈاکٹر کی آذر کے ساتھ واقفیت تھی اس لیے اسی کا پوچھا تھا۔

"جی وہ کسی کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں، کل تک آجائیں گے۔" جودت کا دل اندر ہی اندر قلابازیاں کھا رہا تھا کہ وہ اس ہسپتال کی قید سے آزاد ہو گیا تھا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی اور بوریت الگ سے۔

"ٹھیک ہے، آپ انہیں بتا دیجیے گا۔" ڈاکٹر زکیہ کراپنے راؤنڈ پہ چلے گئے اور جودت خیرو بابا کو گھر لے جانے کا سوچنے لگا، لیکن وہ اکیلا انہیں لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا کسی دوسرے کی مدد ضروری تھی اور آذر کے بعد پہلا خیال دانیال کے سوا اور بھلا کس کا آسکتا تھا؟ اس نے اپنا سیل نکالا اور دانیال کا نمبر ڈائل کر لیا۔

"السلام علیکم۔" دانیال کی آواز خاصی مصروف تھی۔

"وعلیکم السلام! دانیال بھائی میں جودت بات کر رہا ہوں۔"

"جودت؟"

"جی ہسپتال سے بات کر رہا ہوں۔" اس کی اطلاع پہ دانیال چونک گیا تھا۔

"ہاں کہو؟"

"وہ خیرو بابا کو ڈاکٹرز نے ڈسچارج کر دیا ہے، ان کو حویلی لے کر جانا ہے، لیکن میں یہاں اکیلا ہوں۔" اس نے مسئلہ بیان کیا۔

"ڈونٹ وری یار تم ویٹ کرو، میں آرہا ہوں۔" دانیال نے عجلت میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور اگلے پندرہ منٹ میں وہ اس کے پاس ہسپتال میں موجود تھا۔ اس نے آکر تمام بلز کلیئر کیے۔ پھر دونوں مل کر انہیں سہارا دے کر گاڑی تک لائے، وہ کافی بہتر ہو چکے تھے۔ آہستہ قدموں سے چل پھر سکتے تھے اسی لیے کوئی وہیل چیئر یا پھر اسٹریچر استعمال نہیں کیا تھا۔ دانیال کی گاڑی ڈرائیو وہ اپنی لے گیا تھا۔ اس لیے جودت کی گاڑی میں ہی خیرو بابا کو لے کر وہ گھر پہنچے تھے اور گھر میں خیرو بابا کی واپسی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی، جتنی خوشی وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو ہوئی تھی، اتنی شاید خیرو بابا کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گھر کے فرد کی طرح ان کی آؤ بھگت کی تھی، یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان کے ملازم اور معمولی سے ڈرائیور ہیں۔

♥

وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی اپنے اگلے پیپر کی تیاری کر رہی تھی، جب اسے اپنی کتاب پہ کسی کا سایہ ہلتا ہوا محسوس ہوا اس نے چونک کر دیکھا سامنے وہی سنہری بالوں اور سنہری آنکھوں والا لڑکا تھا جو اس روز سب فرینڈز کے ساتھ مدیحہ کو ایئرپورٹ سی آف کرنے آیا تھا۔ زری کو اس کے نام کا پتا تھا، لیکن فی الحال یاد نہیں آرہا تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ اور شاید وہ بھی زری کی اُلجھن بھانپ گیا تھا۔

"میں جیری ہوں، میڈی کا دوست۔" اس نے مدیحہ کے حوالے سے ہی اپنا تعارف کروایا تھا۔

"جی کہیے؟"

"میڈی پاکستان میں ٹھیک تو ہے نا؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ ہم سب فرینڈز کو میڈی کے حوالے سے بہت پریشانی ہو رہی ہے، ہم سے کانٹیکٹ کرنے کا وعدہ کر کے گئی تھی، لیکن اس نے ابھی تک کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا؟" جیری، مدیحہ کے لیے حد سے زیادہ متفکر ہو رہا تھا۔

"تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے؟ کانٹیکٹ تو اس نے مجھ سے بھی نہیں کیا۔" زری نے بھنویں اچکائیں۔

"پریشانی والی بات کیوں نہیں ہے؟ پاکستانی لوگ اکثر لڑکیوں کو پاکستان لے کر جاتے ہیں تو ان پہ بہت زیادہ تشدد کرتے ہیں، انہیں پاکستان میں رہنے پہ مجبور کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ میڈی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو؟" جیری نے اپنی سوچ کا برملا اظہار کیا تھا، جس پہ زری کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے اور وہ کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"جسٹ فار یور کائنڈ انفارمیشن مسٹر جیری، مدیحہ اپنی مرضی سے پاکستان گئی ہے، اگر اسے زبردستی پاکستان لے کر جانا ہوتا تو

آج سے دو سال پہلے لے جاتے اس کی مرضی کا انتظار نہ کرتے، وہ پاکستان میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش باش ہے، آپ کے لیے فکر پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور آپ کے دماغ میں پاکستان کے خلاف جو زہر بھرا ہے پلیز وہ دور کر لیجیے، پاکستان بھی بُرا نہیں جیسا آپ نے بنا لیا ہے، اگر پاکستان میں بیٹیوں پہ ایسا ہی تشدد ہو رہا ہوتا تو میں اس وقت آپ کے سامنے زندہ نہ ہوتی، پاکستان کے ایک گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہوں۔" اس نے جیری کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی۔

"ایم سوری، میرا مقصد آپ کو اموشنل کرنا نہیں تھا۔" جیری نے سر جھکاتے ہوئے معذرت کی۔

"لیکن میرا مقصد آپ کو سمجھانا تھا، یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔" ہمیشہ کول رہنے والی زری اس وقت کافی تپی ہوئی لگ رہی تھی اور جیری خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

"اوکے آئی انڈر اسٹینڈ۔" اس نے سر ہلایا۔

"اپنی وے میں مدیحہ کو آپ کا میسج دوں گی۔ ابھی اس کے پاس اپنا سیل نمبر نہیں ہے، جب ہو گا تو آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔" زری نے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کیا اس کا لینڈ لائن نمبر مل سکتا ہے؟" جیری کو کچھ زیادہ ہی بے چینی ہو رہی تھی۔

"مل سکتا ہے، ضرور مل سکتا ہے، لیکن اگر مدیحہ اجازت دے تو۔" زری نے سر ہلایا۔

"اجازت؟" اسے سمجھ نہ آیا۔

"جی مدیحہ سے پوچھے بغیر میں اس کو نمبر آپ کو نہیں دے سکتی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"اوکے تو آپ اس سے پوچھ لیجیے۔"

"میں آپ کو کل بتا دوں گی، یا پھر مدیحہ آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔"

"تھینک یو سیم۔" جیری خوش ہو گیا تھا اور زری سر ہلا کر لائبریری کی سمت بڑھ گئی۔ دو کتابیں ایشو کروا کے وہ واپسی کے لیے یونیورسٹی کے احاطے سے باہر نکل آئی تھی۔ عبداللہ اسے پک کرنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔

"السلام علیکم بھائی۔" وہ ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! پیپر کیسا رہا؟" وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ظاہر ہے مجھ سے پوچھیں گے تو میں اچھا ہی کہوں گی۔" وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔

"اور ظاہر ہے کہ پیپر تمہارا ہے تو تم ہی سے پوچھیں گے نا؟" عبداللہ بھی مسکرا کے بولا۔

"ہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔" زری ہنس پڑی۔

"نگار شہ بھابی چلی گئیں؟"

"ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ہی ڈراپ کر کے آیا ہوں، میرا پورا دن تو تم لوگوں کی ڈرائیوری میں گزر جاتا ہے، کام میں نے کیا خاک کرنا ہے؟" عبداللہ مصنوعی خفگی سے جھنجلا کر بولا تھا۔ زری اپنی مسکراہٹ دبا گئی۔

"آپ ہماری اتنی کیئر کرتے ہیں اللہ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابی عطا کرے گا۔ ان شاء اللہ اوپر والا آپ کو دے گا میرا کیریئر بنانے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے، ورنہ میں بھی آج باقی لڑکیوں کی طرح میٹرک پاس کر کے گاؤں کی حویلی کے ایک کونے میں پڑی ہوتی، آپ کا احسان تو میری پوری زندگی پہ محیط ہے۔" زری کہتے کہتے سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ارے پاگل اس میں احسان کہاں سے آ گیا؟" عبداللہ نے اسے منع کرتے ہوئے سر جھٹکا۔

"احسان ہی تو ہے آپ نے میری خاطر سب سے ناراضی مول لے لی، بھلا کون راضی تھا میرے یہاں آنے پر؟ بابا جان تعلیم کے خلاف تھے کجا کہ ہائر اسٹڈی کے لیے کسی دوسرے ملک جانا؟ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن آپ نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا، آج گاؤں کی لڑکیوں کے لیے اور حویلی کی لڑکیوں کے لیے میں ایک مثال ہوں کہ کوئی آگے بھی بڑھ سکتا ہے، بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔" زری سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو، تعلیم ایک زیور ہے اور اس زیور کے لیے سب کو لڑنا چاہیے، اس زیور کا حصول سب کے لیے ضروری ہے، چاہے وہ گاؤں کی لڑکی ہو یا شہر کی۔" عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن بھائی اس زیور کے حصول کے لیے آپ جیسے بھائیوں کی بھی اشد ضرورت ہے ہمارے معاشرے کو، جو اپنی بہنوں کی تعلیم کے رستے میں رکاوٹ نہ بنیں، بلکہ ان کے لیے ڈھال ثابت ہوں، کاش مشرقی مردوں کی سوچ آپ جیسی ہو جائے۔" زری نے حسرت سے کہا تھا اور عبداللہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں گھر پہنچ چکے تھے، نگارش آج اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

♥

دل آور شاہ واپس لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، جب بتول شاہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں۔

"جا رہے ہو؟" ان کے لہجے میں کیا کچھ تھا، دل آور بخوبی سمجھتا تھا۔

"نہ جاؤں؟" اس نے پلٹ کر ان کو بغور دیکھا، لیکن ان کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے تھے۔ وہ اور سے اور ہو گئی تھیں ان کے چہرے پہ سرد برف کے سوا اب کچھ بھی نہیں تھا۔

"میں نے کب کہا کہ تم نہ جاؤ؟" اب کی بار لہجہ بھی کچھ اور تھا۔

"تو پھر میری کامیابی کی دعا کے ہمراہ مجھے رخصت کیجیے۔"

"خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ، تمہاری کامیابی کے انتظار میں یہ تو اپنی آنکھیں پتھر کر لی ہیں، اب پتا نہیں یہ آنکھیں پتھر سے دوبارہ آنکھیں کب بنیں گی؟" ان کا لب و لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، ان کے اندر کا درد ان کی آواز میں گھل رہا تھا اور اذیت کی لہر دل و دماغ کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

"آپ کی آنکھوں کو آنکھیں بنانے کے لیے میں پوری دنیا کو پتھر کر دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" اس نے بتول شاہ کو گلے سے لگا کر اپنی گرفت کی مضبوطی کا احساس دلایا تھا۔

"تمہارے وعدوں پہ نہیں، تمہاری آس پہ جی رہی ہوں میری جان، اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے۔" انہوں نے دل آور کی پیشانی چومی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ماں سے فارغ ہو کر وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اب میں اسلام آباد نہیں آؤں گا، بلکہ اب آپ لاہور آئیں گی، اپنی تیاری رکھیے گا۔"

"ان شاء اللہ ضرور آؤں گی۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہ ان سے مل کر گاڑی میں آ بیٹھا اور پھر ان کو ہاتھ ہلا کر گاڑی نکال لے گیا۔ اس نے نبیل کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کل واپس آ کر اس کے مسائل حل کر دے گا، اس لیے وہ آج اسلام آباد سے جلدی نکل آیا تھا لیکن ابھی اسلام آباد کی حدود سے نکل ہی رہا تھا کہ کسی نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے آتے ہوئے گاڑی روک دی اسے بریک لگانے پڑے۔

"انسپکٹر شہباز آپ؟" وہ حیرانی سے کہتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا۔ انسپکٹر شہباز سڑک کے کنارے کھڑی مہیب ہانک رہی تھی۔

"دراصل میری گاڑی خراب ہو گئی ہے، میں لاہور جا رہی تھی، آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے ڈرائیور کو مکینک کے پاس بھیجے، لیکن ابھی تک نہیں آیا۔" وہ چہرے سے پریشان لگ رہی تھی۔

"کیا خرابی ہو گئی ہے گاڑی میں؟"

"پتا نہیں، انجن بند ہو گیا ہے۔"

"چیک کیا ہے؟"

"ہاں ڈرائیور سارا انجن چیک کر کے گیا ہے، مکینک کے بغیر ٹھیک ہونے والی نہیں ہے اور میں پریشان ہو رہی ہوں، مجھے ذرا جلدی لاہور پہنچنا تھا۔" انسپکٹر شہباز نے ہاتھ میں پکڑے موبائل سے ٹائم دیکھ کر کہا۔

"چلیے پھر آپ کی پریشانی حل کیے دیتے ہیں، آیئے میرے ساتھ چلیے۔" دل آور نے اسے آفر کی۔

"لیکن شاہ جی۔" انسپکٹر شہباز کچھ کہتے کہتے رک گئی

"کیوں کوئی ڈر ہے؟" دل آور نے معنی خیزی سے کہا۔

"ڈر ہونا بھی چاہیے، مرد کا کیا بھروسہ؟" وہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے معنی خیزی سے بولی۔

''خیر بھروسے کی تو آپ بات ہی نہ کریں تو بہتر ہے، بھروسہ تو عورت کا بھی نہیں ہے۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''کیوں شاہ جی کون کمبخت دھوکہ کر گئی آپ کے ساتھ؟''

''دل آور شاہ کو دھوکہ دینے والی ابھی کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔'' دل آور شاہ نے ہنس کر کہا تھا۔

''اور جو پیدا ہوئی ہیں، انہیں آپ نے نظر عنایت ہی نہیں بخشی۔''

''کوئی سراپا التجا بھی تو نہیں ہوا ابھی تک؟'' وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شاہ جی آپ بہت بے رحم ہیں۔'' انسپکٹر شہناز کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا اور دل آور شاہ یکدم کھلکھلا کر قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

''کبھی کبھی کیوں لگتا ہے؟ یہ تو اکثر لگنا چاہیے۔'' وہ اس کی بات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''اکثر تو آپ اچھے ہی لگتے ہیں، بس کبھی کبھی اچھی رائے بدل جاتی ہے اور لگتا ہے کہ آپ.....''

''آپ بہت بُرے ہیں۔'' دل آور نے انسپکٹر شہناز کا ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔

''اب میں آپ کو بُرا بھلا تو نہیں کہہ سکتی شاہ جی۔'' انسپکٹر شہناز کا انداز خاصا روستانہ سا تھا۔

''واہ کیا پالیسی ہے! بے رحم کہہ لیا، لیکن بُرا نہیں کہہ سکتیں، آپ پولیس والوں سے بھی اللہ ہی پناہ دے آپ کے بھی اپنے قانون ہوتے ہیں۔'' وہ ابھی تک اس کی بات انجوائے کر رہا تھا۔

''اصل قانون دان تو آپ ہیں شاہ جی ہماری غلطیوں کو بھی میگنٹ کی طرح پکڑ لیتے ہیں۔'' انسپکٹر شہناز ہنسی تھی۔

''سلام میڈم! مکینک کو لے آیا ہوں۔'' اس کے عقب سے ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ جب تک مکینک نے اس کی گاڑی چیک نہ کی، ڈرائیور کے ساتھ دل آور بھی وہیں کھڑا رہا۔

''میڈم ایک گھنٹہ لگ جائے گا، گاڑی ٹھیک ہونے میں۔'' مکینک نے اسے اطلاع دی۔

''اوہ نو۔'' انسپکٹر شہناز نے سر جھٹکا۔

''آپ کا آج کا سفر میرے ساتھ لکھا ہے میڈم۔'' دل آور نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لیجیے گا شاہ جی میں آپ پولیس والی نہیں ہوں۔'' انسپکٹر شہناز نے اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا، وہ اپنی گاڑی ڈرائیور کے حوالے کر آئی تھی۔

''رعب تو اب بھی ہے نا۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''اب کیا پتا کہ آپ کا رعب مجھ پہ ہے یا میرا رعب آپ پہ۔'' وہ ہنسی۔

''نہیں میڈم آپ کا ہی رعب ہے اور آج تو کچھ ہی زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہیں۔'' اس نے انسپکٹر شہناز کو سرتاپا دیکھتے ہوئے تعریف کی تھی، وہ خوبصورت تو تھی ہی، لیکن آج راحل بلیو کلر کی بارڈر والی ساڑھی اور شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی گڈ لکنگ لگ رہی تھی۔ ورنہ اکثر وہ یونیفارم میں ہی نظر آتی تھی۔

''تھینک یو۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔

''ویسے آپ آج اسلام آباد میں کیا کر رہی تھیں؟''

''میری کزن کی شادی تھی، میں دو روز سے اسلام آباد آئی ہوئی تھی، آج واپس جا رہی ہوں۔''

''تو ہمیں ہی شادی میں انوائیٹ کر لیتیں۔'' اس نے افسوس سے کہا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ آپ بھی اسلام آباد کو رونق بخشے ہوئے ہیں؟''

''خیر آئندہ کسی کزن کی شادی ہو تو یاد رکھیے گا۔'' دل آور خاصا موڈ میں تھا۔ انسپکٹر شہناز کو حیرانی ہو رہی تھی۔

''یہ آپ ہی ہیں نا شاہ جی؟'' اس نے اپنی حیرانی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

''کیوں میڈم آپ کو کوئی ڈاؤٹ ہے؟'' دل آور نے دلچسپی سے انسپکٹر شہناز کا چہرہ دیکھا۔

''ڈاؤٹ تو نہیں، لیکن آپ کو کبھی اتنے خوشگوار موڈ میں دیکھا بھی تو نہیں۔''

''آج کل میرا بہت قریبی دوست پاکستان آیا ہوا ہے، شاید اسی کی ملاقات کا جشن منا رہا ہوں۔''

"وہ یعنی آپ "جشن بہاراں" منا رہے ہیں؟"

"جشن بہاراں نہیں "جشن یاراں" منا رہا ہوں میڈم۔" اس نے خوشگواریت سے جواب دیا۔

"کیا میں آپ کے اس دوست سے مل سکتی ہوں؟" انسپکٹر شہناز نے کافی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کیا تھا۔

"کیوں؟"

"اس خوش نصیب کی خوش نصیبی پہ رشک کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ آپ جیسی چیزوں سے دور بھاگتا ہے، پرہیز کرتا ہے، بہت سادہ دل انسان ہے۔" دل آور نے نبیل کی تعریف میں کہا۔

"آپ کا دوست سادہ دل؟" اس نے اچنبھے سے کہا۔

"آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میڈم؟" دل آور کے سوال پہ انسپکٹر شہناز قہقہہ لگا کے ہنسی تھیں اور جواباً اس نے بھی مسکراتے ہوئے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

♥

"علیزے۔۔۔"

"جی پاپا؟" وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی، جب وقار آفندی کی آواز پہ قدم تھم گئے تھے۔

"کہاں جا رہی تھیں؟"

"بس ایسے ہی عائشہ پھوپھو کی طرف۔" اس نے کندھے اچکائے۔ وقار آفندی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے برابر آ گئے اور اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

"بیٹھو۔" خود بیٹھتے تو اسے بھی ساتھ بٹھا لیا تھا۔

"خیریت پاپا؟"

"ہاں بیٹا جانی! سب خیریت ہے، وہ دراصل ہم نے تمہیں اطلاع دینی تھی کہ ہم نے تمہارے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے اور ان شاء اللہ آج آفور واپس آ گیا تو تمہاری گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے علیزے کو پاس بٹھا کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا، علیزے کی جان میں ان کی جان تھی، اس کی پریشانی ان کا خون خشک کر دیتی تھی۔ ان کے لیے وہ جتنی اہمیت رکھتے تھے، جتنی علیزے اہمیت رکھتی تھی انہوں نے اپنی پوری عمر کی محبت صرف علیزے پہ لٹائی تھی، کبھی کبھی تو آسیہ آفندی ان کی اس قدر محبت پہ حیران پریشان ہو جاتی تھیں اور ان کی حیرانی اور پریشانی کی وجہ علیزے کی آئندہ کی زندگی کا خیال ہوتا تھا۔ انہیں پتا تھا کہ باپ اتنی محبت دے گا تو وہ شوہر میں بھی اتنی ہی محبت تلاش کرے گی اور اگر وہی کمی کھٹکنے لگی تو زندگی بھر کے لیے مسئلہ بن جائے گا اور اس چیز کا اظہار انہوں نے ایک بار وقار آفندی سے بھی کیا تھا، جس پہ وہ ہنس کر سر ہلا دیے تھے۔

"ہم اس کی شادی ہی اس سے کریں گے جو ہم سے بھی زیادہ محبت دے گا اسے۔" ان کا لہجہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"آپ جیسی محبت کون کر سکتا ہے اس سے؟" آسیہ آفندی کو یقین نہیں تھا۔

"وقت آنے پہ پتا چلے گا تمہیں۔" انہوں نے بیوی کو تسلی دی۔

"آپ کی محبت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا وقار، کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے میں علیزے کی ماں ہوں، لیکن مجھ سے بھی زیادہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں میری محبت بھی آپ کی محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" آسیہ آفندی سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں اور اس وقت بھی وہ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں کھڑی باپ اور بیٹی کا محبت بھرا انداز دیکھ رہی تھیں، یونہی باپ سے باتیں کرتے کرتے علیزے کی نظر ماں کی طرف اٹھی۔

"مما آپ وہاں کیوں کھڑی ہیں؟" اس کی آواز پہ وقار آفندی نے بھی آسیہ آفندی کو دیکھا تھا۔

"آپ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔" وہ اندر آ گئیں۔

"اس طرح چھپ چھپ کے تو آپ نے جوانی میں بھی نہیں دیکھا ہمیں۔" وقار آفندی مسکرائے، علیزے بھی ہنس پڑی تھی۔

"آپ نے جوانی میں بھی دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا ہمیشہ کاروبار کی فکروں میں ہی رہتے تھے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس

نے مجھے مصروفیت کے لیے تین عدد بچے دے دیے، ورنہ میں تو اب بھی بیٹھی آپ کا آفس سے واپسی کا انتظار ہی کرتی رہتی۔" آسیہ آفندی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"تو گویا آپ کی بات کا یہ مطلب ہوا کہ اب آپ کو ہماری آفس سے واپسی کا انتظار نہیں ہوتا؟" وقار آفندی کافی اداس سے اٹھے کے لائے تھے۔ آسیہ آفندی جز بز ہی ہو گئیں۔ علیزے اپنے پیرنٹس کی ایسی دلچسپ بحث و تکرار سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"بتایئے نا حکیم صاحب اب ہماری کوئی قدر نہیں ہے آپ کی نظر میں؟" انہوں نے آسیہ آفندی کو بولنے پہ اکسایا تھا اور وہ ساختہ مسکراتے ہوئے وقار آفندی کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔

"آپ کی قدر یا تو آسیہ کا دل جانتا ہے یا آسیہ کا خدا۔" انہوں نے کتنی نرمی سے کتنی گہری بات کہی تھی۔ وقار آفندی کو شانت ہو گیا تھا۔

"ٹھیک یو آسیہ۔" انہوں نے آسیہ آفندی کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور علیزے مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹا؟"

"آپ لوگ باتیں کریں، میں انیکسی کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر نکل آئی تھی، اس کا رُخ انیکسی کی طرف تھا اور جیسے ہی وہ انیکسی میں پہنچی اسے خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا باقی لڑکیاں بھی اتفاقاً وہیں تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔

"علیزے۔" انوشہ بیڈ کے پاس آئی تھی، علیزے کبھی کبھار ہی تو اس طرف آتی تھی اور وہ بھی انوشہ کی وجہ سے۔

"کیسی ہو؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

"آؤ نا علیزے اندر آؤ۔" انوشہ نے اسے اندر آنے کا کہا، وہ اندر آ گئی۔

"ہیلو... کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سب پہ نظر دوڑائی۔

"دیکھ لیجیے کیا ہو رہا ہے۔" کومل کی آواز پہ علیزے نے چونک کر کومل کی سمت دیکھا۔

"کومل آپی کیسی ہیں آپ؟" علیزے کا لہجہ اور انداز نارمل، بلکہ اپنائیت لیے ہوئے تھا۔

"جیسی تم ہو، ویسی میں ہوں۔" کومل نے سر جھٹک کے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ جیسے تم ٹھیک ہو، ویسے میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔" کومل کی وضاحت پہ باقی سب ہنس پڑی تھیں۔

"اوہ اچھا۔" علیزے نے سر ہلایا۔

"بڑی جلدی سمجھ آ گیا ہے؟"

"آپ کے سمجھانے کا طریقہ اچھا ہے۔" علیزے معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر ساری باتیں کیوں نہیں سمجھ لیتیں تم؟" کومل کے لہجے میں ہلکے طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں سمجھی نہیں کومل آپی؟" علیزے نے اُلجھن آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"کچھ باتیں سمجھ لیتی ہو اور کچھ نہیں سمجھتیں، عجیب بات ہے؟" کومل کا لہجہ ابھی بھی طنز لیے ہوئے تھا۔

"کومل۔" حرمت اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی، اس نے کومل کو سرزنش کرنے والے انداز میں ٹوکا تھا۔

"اوے تو میں کیا کہہ رہی ہوں؟ اپنی سویٹ سی کزن سے باتیں ہی تو کر رہی ہوں؟" کومل نے تعجب سے کہا۔

"تو باتیں کرو نا، طنز تو نہیں۔" حرمت نے دبے الفاظ میں خفگی سے کہا جسے صرف کومل ہی سن سکی تھی۔

"آؤ علیزے، بیٹھو یہاں۔" کومل نے اپنے قریب صوفے پہ اشارہ کیا تھا، علیزے اس کے انداز کو بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی اور خاموشی سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"آج کل تم گھر پہ نظر آ رہی ہو، کالج چھوڑ دیا ہے کیا؟"

"نہیں کالج کیوں چھوڑوں گی بھلا؟"

"تم مسلسل اتنے روز سے گھر پہ ہو اس لیے میں نے سوچا کہ شاید....."

"وہ دراصل مجھے پک اینڈ ڈراپ کرنے کا مسئلہ تھا۔ کوئی ڈرائیور تھا اور نہ ہی میری گاڑی تھی، لیکن پاپا نے کہا ہے کہ کل تک سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اس کا بتانے کا انداز اب بھی معصوم سا تھا۔

"یعنی کل تک نیا ڈرائیور اور نئی گاڑی ارینج ہو جائیں گے؟"

"جی..... ان شیاء یہ مسئلہ آج بھی حل ہو سکتا تھا، لیکن آذر بھائی گھر پہ نہیں تھے، شوروم سے گاڑی انہوں نے ہی نکلوانی تھی، آج وہ آ جائیں گے تو ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" وہ بے فکری سے کہہ رہی تھی اور کومل کا خون جل گیا تھا۔ وہ آذر کا اس طرح ذکر کرتی تھی جیسے وہ ہی اس سے زیادہ قریب تھی، حالانکہ اگر کومل دل سے سوچتی تو علیزے ہی آذر سے زیادہ قریب تھی، وہ خود بھی تو اسی پہ زیادہ توجہ رہتا تھا اور علیزے اس کی لاڈلی اور چہیتی کزن تھی۔

"پاپی داوے وہ گئے کہاں ہیں؟"

"کراچی....."

"کیوں؟"

"کام سے۔"

"واپس کے کب؟"

"آج۔"

"وہ اچھا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر چپ ہو گئی تھی، حرمت نے علیزے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

♥

"نبیل..... نبیل۔" وہ اندر داخل ہوتے ہی نبیل کو آواز دینے لگا۔

"سلام صاحب۔" گل کچن سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

"والسلام، کل کیسی ہو تم؟" دل آور کا انداز خوشگوار سا لیے ہوئے تھا، وہ انسپکٹر شہباز کو ڈراپ کر کے سیدھا یہیں آیا تھا۔

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔"

"گل خان کہاں ہے؟ کل آیا تھا نا؟"

"جی..... صاحب آیا تھا۔"

"ملاقات ہوئی اس سے؟" اس کے سوال پہ گل کا چہرہ شرم سے جھک گیا تھا۔

"گل بی بی میں نے صرف ملاقات کا پوچھا ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر پوچھ رہا تھا۔

"یار کیوں اسے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے؟ کسی کو تو بخش دیا کرو۔" نبیل بیزار سا ہاں اترتے ہوئے قریب آ گیا تھا۔

"کوئی خود ہی کٹہرے میں کھڑا ہونے والی باتیں کرے تو میں کیا کروں؟" وہ نبیل سے مصافحہ کرتے ہوئے شرارت سے مسکرا کے بولا۔

"جاؤ گل اپنے صاحب کے لیے کچھ کھانے کے لیے لے کر آؤ۔" نبیل نے گل کو اشارہ کیا۔

"نہیں الحال کچھ نہیں چاہیے، میں نے لنچ کافی لیٹ کیا تھا۔" دل آور نے منع کر دیا۔

"تو پھر کچھ پینے کے لیے لے آؤ۔" نبیل نے دوبارہ گل کو مخاطب کیا تھا۔

"پینے کے لیے کیا؟" گل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جوسز لے آؤ۔" دل آور نے خود ہی کہہ دیا اور دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

"اسلام آباد کا چکر کیسا رہا؟"

"بس یار اماں سے ملنا تھا مل کر آ گیا۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہا۔

"اماں کیسی ہیں؟"

"ٹھیک تھیں، وہ تمہارا اور مدیحہ کا پوچھ رہی تھیں۔"

''ہوں میں فون کروں گا انہیں، ویسے یار تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے تم انہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے آتے، ہم کم ملاقات ہو جاتی؟'' نبیل نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔

''وہ مصروف ہیں آج کل۔'' دل آور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مصروف تو تم بھی ہو؟''

''ہاں یار! کام ہی کچھ ایسا ہے۔''

''کام ایسا نہیں ہے، تم خود ہی کچھ ایسے ہو، تمہیں کس نے کہا تھا کہ وکالت کی طرف جاؤ؟''

''یہ میرے بابا کا خواب تھا یار! انہیں شوق تھا کہ میں وکیل بنوں، وہ میرے نام کے ساتھ ایڈووکیٹ اور بیرسٹر کا لفظ دیکھنا چاہتے تھے۔''

''ماشاء اللہ اور تم نے ان کا خواب پورا کر دیا۔'' نبیل نے مسکرا کے ستائشی لہجے میں کہا۔

''خواب تو پورا کر دیا، لیکن وہ خواب کو تعبیر ہوتے نہ دیکھ سکے، کاش کہ وہ دیکھ سکتے کہ میں نے ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا ہے۔'' دل آور کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا اور نبیل کو اس کے دکھ کا احساس ہو گیا تھا، لیکن اب بات کا رخ بدلنا بھی مشکل تھا۔

''بھائی۔'' اچانک مدیحہ کی آواز سنائی دی، دل آور نے چونک کر سیڑھیوں کی سمت دیکھا اور نبیل نے شکر ادا کیا کہ چلو دھیان تو ہٹ گیا نا۔

''بھائی کی جان کیسی ہو؟'' دل آور سر جھکتے ہوئے جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

''بالکل بور۔'' اس نے بیزاری کا بھرپور اظہار کیا تھا۔

''کیوں بھئی؟''

''دو دن سے پاکستان آ کر اپنے بیڈ روم میں بند ہوں باہر نکلو، تب بھی بوریت دور کرنے کے لیے کچھ سامان نہیں ہے، موبائل، نہ گاڑی، نہ فرینڈز اور نہ ہی آپ..... بوریت نہ ہو تو اور کیا ہو؟'' اس نے ایک ایک چیز گنوا ڈالی۔

''او کے بابا او کے، اب میں آ گیا ہوں تو سب آ جائے، موبائل بھی، گاڑی بھی اور تمہاری بوریت کے لیے کمپنی بھی۔'' اس نے مدیحہ کو تسلی دی۔

''آپ کہاں تھے میں نے آپ کے نمبر پہ فون بھی کیا تھا۔''

''سوری یار! میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔''

''ہوں..... سنا ہے اسلام آباد بہت خوبصورت شہر ہے؟'' مدیحہ آج ذرا اپنے خول سے نکل کر بات چیت کر رہی تھی۔

''خوبصورت تو نہیں ہے، بس جب میں جاتا ہوں تو تب ہو جاتا ہے۔'' اس کی بات پہ نبیل یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تو دل آور بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

''یار تم تو جہاں بھی جاتے ہو چار چاند لگا دیتے ہو۔'' نبیل ہنس رہا تھا۔

''کوئی شک ہے تمہیں؟'' اس نے بھنویں اچکا کے نبیل کو دیکھا۔

''کوئی شک نہیں ہے یار! کوئی شک نہیں ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو پھر آج تم لوگوں کو لاہور دکھلاؤں۔'' اس نے نبیل اور مدیحہ کو آفر کی۔

''اس وقت؟'' نبیل نے ٹائم دیکھا۔

''یار شام اور رات ہی تو لاہور کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی ہیں، آج ہی تو تم لاہور کے نظارے دیکھو گے۔'' اس نے مسکرا کے کہا۔

''میرا کوئی موڈ نہیں ہے، تم مدیحہ کو لے جاؤ اس نے پاکستان نہیں دیکھا اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔'' نبیل نے انکار کر دیا۔

''کیوں تمہارا موڈ کیوں نہیں ہے؟''

''بس ایسے ہی۔''

"یہ جو "بس ایسے ہی" ہوتا ہے نا؟ یہی بہت "خاص" ہوتا ہے۔" دل آور نے معنی خیزی سے کہا۔
"سوری یار مجھے خیال نہیں رہا کہ میں ایک وکیل کے سامنے بات کر رہا ہوں۔" نبیل نے ہتھیار ڈال دیئے، کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ باتوں باتوں سے اپنے مطلب کی بات نکال لے گا اس کے سامنے انکار بھی فضول تھا۔
"چلو اٹھو پھر۔" دل آور کھڑا ہو گیا۔
"لیکن وہ چائے۔" نبیل نے گل کی طرف اشارہ کیا۔
"چائے پھر سہی۔" اس نے ٹال دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جاگ اٹھی تھیں، پورے لاہور کی رونقیں عروج پر تھیں، مدیحہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

♥

"کیا بات ہے استاد! کچھ پریشان نظر آتے ہو؟" چھوٹا گاڑی کا پنکچر لگاتے ہوئے بار بار عدیل کو دیکھ رہا تھا اور جب پنکچر لگا کر فارغ ہو گیا تو سیدھا عدیل کے پاس آ گیا۔
"ہاں یار! پریشان تو میں ہوں، لیکن سمجھ نہیں آ رہا یہ پریشانی حل کیسے ہو گی؟"
"کیا مطلب ہے استاد؟ کھل کے بول۔" چھوٹے نے بڑا پن دکھایا۔
"یار وہ دراصل مجھے کل کچھ دیر کے لیے....." عدیل کہتے کہتے رک گیا۔
"کل کچھ دیر کے لیے؟" وہ زیر لب دہرا کے بولا۔
"کیا چھٹی چاہیے؟" اس نے اندازاً پوچھا۔
"نہیں یار چھٹی نہیں چاہیے، بلکہ....." وہ پھر رک گیا۔
"اوئے استاد بتاؤ بھی، تم تو ایسے شرما رہے ہو جیسے لڑکی چاہیے؟" چھوٹے نے خفگی سے کہا تھا اور عدیل کو بتانا ہی پڑا۔
"یار مجھے نہ تو چھٹی چاہیے اور نہ ہی کوئی لڑکی چاہیے، بلکہ مجھے بائیک چاہیے، وہ بھی کل شام تھوڑی دیر کے لیے۔"
"بائیک؟" چھوٹے کو کافی حیرانی ہوئی تھی۔
"ہاں یار! بس کل شام کسی کام سے جانا ہے، پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ تھا میں نے سوچا سلو سے کہوں گا، اس کا بائیک ہے، لیکن یار اب اسے کہتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا ہے، دل نہیں مان رہا۔"
"استاد تیرا دل مانے نہ مانے لیکن میرا تو مانے گا نا؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب کہ میں اس سے کہتا ہوں، تم بے شک نہ کہو۔" چھوٹے نے اس کی مشکل حل کرتے ہوئے اسے ٹینشن فری کر دیا تھا۔
"واقعی؟"
"ہوئے آف کورس استاد۔" چھوٹے نے آف کورس کو بھی زبان سے خاصا رگڑ کے ادا کیا تھا۔
"تھینک یو یار تھینک یو سو مچ۔" عدیل کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور پھر واقعی دوسرے روز چھٹی سے پہلے چھوٹے نے سلو کی بائیک کی چابی لا کر عدیل کو تھما دی تھی اور عدیل اس کا بار بار شکریہ ادا کرتا ہوا بائیک لے کر گھر آ گیا تھا، وہ نہا دھو کر فریش ہوا تو مریم بھی کی شکل دیکھ لی تھی۔
"چلیں بھائی۔" وہ چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی، ہاتھ میں فاطمہ کے کٹ کا شاپر تھا اس نے اس سوٹ کو کافی خوبصورت پیکنگ
"چلو۔" عدیل، امی ابو کو اللہ حافظ کہتا باہر آ گیا اور دونوں بہن، بھائی فاطمہ کے گھر کے جانے کے لیے روانہ ہو گئے اور ٹھیک بیس منٹ بعد وہ فاطمہ کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ عدیل نے بائیک باہر ہی روک دی، حالانکہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مریم بائیک سے اتر گئی۔
"پک کرنے کے لیے کب آؤں؟" اس نے مریم سے پوچھا۔

"ابھی تو آئی ہوں، مجھے کیا پتا کہ ان کی پارٹی کا کیا ٹائم ختم ہے؟" مریم نے رسانیت سے کہا۔
"ٹھیک ہے میں آنے سے پہلے فون کر کے پتا کر لوں گا۔" اس نے سر ہلا دیا اور مریم پلٹ کر اندر آ گئی۔
"السلام علیکم!" فاطمہ اسے گیٹ پر ہی مل گئی تھی۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" فاطمہ، مریم سے گلے ملی تھی، آج وہ باقاعدہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی، اس کی خوبصورتی کسی کو مار رہی تھی، مریم کو وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت اور پیاری لگی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ؟"
"میں کیا سناؤں؟ تم سناؤ کہ تم اکیلی آئی ہو؟" فاطمہ نے اسے اکیلے دیکھ کر ذرا مایوسی سے کہا تھا۔
"نہیں وہ عدیل بھائی ڈراپ کر کے گئے ہیں۔"
"وہ گیٹ تک آ کر چلا گیا؟ اندر بھی نہیں آیا؟" فاطمہ کو اور زیادہ ملال ہوا۔
"وہ کام سے تھکے ہوئے آئے تھے، بس مجھے چھوڑنے کے لیے آ گئے، ابھی واپس جا کر انہوں نے کھانا بھی کھانا تھا۔"
"تو کیا یہاں اسے کھانا نہیں مل سکتا تھا؟" فاطمہ بحث کرنے کھڑی ہو گئی تھی، اسے عدیل پہ رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔
"فاطمہ پلیز یار! چھوڑو بھی، کوئی اور بات کرو۔" مریم نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔
"کیا یہ چھوڑنے کی بات ہے؟ اسے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ مجھے اپنی زبان سے وش ہی کر دے؟" فاطمہ کے دل میں افسوس اور صدمہ ہلکورے لے رہا تھا۔
"وہ جلدی میں تھے یار۔"
"ہونہہ..... اس کی جلدی میں، بخوبی سمجھتی ہوں، اسے صرف بھاگنے کی جلدی تھی، خیر تمہیں بھی تو آئے گا، دیکھو! کون تمہیں کیسے لے کر جاتا ہے۔" فاطمہ کے عزائم پہ مریم بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی اور اتنے میں وہاں کھڑے ہی ان کی جیپ اندر آ رکی جس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں فاطمہ اور مریم آ گئی تھیں اور ان دونوں نے ہی چونک کر دیکھا تھا جیپ سے تین لڑکے ایک ساتھ اترے اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی طرف ہی بڑھ آئے تھے، مریم نامحسوس انداز میں اپنی چادر درست کرتے ہوئے سٹ گئی، جبکہ فاطمہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

♥

جودت کی نظریں مسکرا کر دیکھنے والی فاطمہ پہ نہیں بلکہ چادر درست کرتے ہوئے سمٹنے والی مریم پہ تھیں، وہ سائم اور کامی کے ساتھ چلتا ہوا قریب آ گیا تھا۔
"ہیلو ڈیئر! ہیپی برتھ ڈے اینڈ مینی مینی ہیپی ریٹرن آف دی ڈے۔" سائم دو دن بعد گھر آیا تھا، اس لیے اسے اب وش کرنے کا موقع ابھی مل رہا تھا۔
"میری طرف سے بھی ہیپی برتھ ڈے۔" کامی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بس؟" فاطمہ نے آنکھیں پھیلائیں۔
"کیوں؟ کچھ اور بھی کہنا چاہیے؟" کامی نے معصومیت سے پوچھا۔ سائم مسکراہٹ دبا گیا۔
"کہنا نہیں چاہیے بلکہ دینا چاہیے۔"
"کیا دینا چاہیے؟" کامی انجان بن رہا تھا۔
"گفٹ میرا برتھ ڈے کا گفٹ۔" وہ زور دے کر بولی۔
"اچھا..... برتھ ڈے پہ گفٹ بھی دیتے ہیں۔" وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔
"ہاں اس نے کبھی کسی کو دیا ہو تب نا؟" سائم نے چوٹ کی۔
"بس بس زیادہ ظلم مت کر، دے دوں گا، تمہارے سارے گفٹس لوٹا دوں گا۔"
"کب؟" سائم تیزی سے بولا۔
"جب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"تو کیا اب تو ہاتھی کے پیروں پہ کھڑا ہے؟" سائم کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔
"تو مجھے چھوڑ اس کی بات کر، جو ہر وقت دل کے پیروں پہ کھڑا رہتا ہے، جس طرف دل چاہتا ہے اسی طرف چل پڑتا ہے۔" کامی نے معنی خیزی سے آنکھ دباتے ہوئے سائم کے کان میں سرگوشی کی، تب سائم نے چونک کر دیکھا اور اسے جودت کی چپ اور محویت کا احساس ہوا تھا۔ سائم کو دیکھنے پہ فاطمہ بھی متوجہ ہوئی۔
"جودت!" سائم نے اسے کہنی مارتے ہوئے متوجہ کیا۔
"ہوں؟"
"فاطمہ کو وش نہیں کرو گے؟" سائم چبا کے کہہ رہا تھا۔
"ہوں ــــ ہاں پاپی پرتھ ڈے۔" اس نے چونکتے ہوئے ان کو دیکھا اور پھر فاطمہ کو وش کرنے کی فارمیلٹی نبھائی۔
"تھینک یو۔" فاطمہ کانفیکشنس خفگی لیے ہوئے تھا۔
"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"ہوں ابھی تک تو ٹھیک ہی تھی، لیکن اب ....." وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سر جھٹکنے لگا۔
"آیئے تو پھر اندر چلتے ہیں۔" فاطمہ نے اندر کی طرف اشارہ کیا اور مریم کو ساتھ لے کر اندر آ گئی، اس نے ان لوگوں کا مریم کے ساتھ تعارف بھی نہیں کروایا تھا اور مریم جو وہاں کھڑے کھڑے اس لڑکے کی بے باک نظروں سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس سے ملتے ہی اس نے شکر ادا کیا تھا۔ ان کے پیچھے سائم اور کامی بھی اندر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جودت نے سائم کو شرٹ سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔
"بات سنو۔" جودت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔
"ہاں۔"
"یہ لڑکی کون ہے؟"
"فاطمہ کی فرینڈ ہے۔"
"پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟"
"پہلے وہ کبھی آئی بھی تو نہیں، اگر آتی بھی ہے تو سالوں بعد۔" سائم نے کندھے اچکائے۔
"مڈل کلاس سے لگتی ہے۔" جودت نے اندازہ لگایا۔
"تمہیں کوئی پرابلم ہے؟"
"پرابلم تو ہے نا، مڈل کلاس کی لڑکیاں مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔" جودت نے بال کھجاتے ہوئے کہا۔
"جودت اپنی سوچ کو لگام دو۔" سائم نے اسے سرزنش کرتے ہوئے باز رکھنا چاہا۔ جبکہ جودت ڈھٹائی سے مسکرا دیا تھا۔
"میری سوچ کو بے لگام کرنے والے بھی تو تم ہی ہو؟" جودت اسے کچھ جتا رہا تھا۔
"خیر چھوڑو اس بات کو، چلو اندر چلتے ہیں۔" سائم بات کو ٹال رہا تھا۔
"چلتے ہیں، پہلے نام بتاؤ۔" جودت ہنوز اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔
"نام....."
"ہوں ..... اس لڑکی کا۔" جودت نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔
"جودت یہ کیا بیہودگی ہے؟"
"نام پوچھنا بیہودگی ہے۔ حیرت ہے؟" جودت حیرانی سے کہہ رہا تھا۔
"اوے چلو یار کس بحث میں الجھ گئے ہو؟" کامی پلٹ کر ان دونوں کے پاس آ گیا۔
"اس سے نام پوچھ رہا ہوں لیکن یہ بتا ہی نہیں رہا۔" جودت اپنی بات پہ ڈٹا ہوا تھا۔
"تمہیں نام سے کیا مطلب؟" سائم گھور رہا تھا۔
"تم نام بتاؤ، مطلب میں بتا دوں گا۔" وہ انتہائی سکون سے کہہ رہا تھا سائم کو غصہ تو آیا لیکن پھر دبا گیا تھا۔

"اگر نہ بتاؤں تو؟"

"تو میرا اندر جانے کا کوئی فائدہ نہیں، میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا سائم جھنجلا گیا۔

"اوہ کم آن یار، ذرا سی بات کو خوامخواہ ایشو بنا رہے ہو تم۔"

"ایشو میں نہیں تم بنا رہے ہو، اس لڑکی کا نام ہی تو پوچھا ہے، دام تو نہیں پوچھا۔" جودت بھی جھنجلا کے بولا تھا۔

"جودت۔" سائم نے پھر غصے سے دیکھا۔

"نام بتا دو، فائدے میں رہو گے۔" جودت مسکرا رہا تھا۔

"یار وہ بہن کی دوست ہے، کچھ شرم کرو۔"

"اوکے میں شرم کر لیتا ہوں، چلا جاتا ہوں یہاں سے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔

"مریم نام ہے اس کا۔" سائم نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے وہ جودت کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا دونوں کی بہنیں کی دوستی تھی ایک دوسرے کا اچھا برا بھی برداشت کرنا پڑ ہی جاتا تھا جیسے اس وقت جودت کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نام بتانا پڑا تھا۔

"تھینک یو یار تم واقعی ایک اچھے دوست ہو۔" جودت اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔

"لیکن تم ذرا بھی اچھے دوست نہیں ہو، بات بات پہ تڑی دکھاتے ہو۔" سائم دانت پیس کے بولا تھا۔ جواباً جودت قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے ساتھ اندر آ گیا تھا اور مہمانوں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔

♥

وہ انہیں سیدھا فوڈ اسٹریٹ لے کر آیا تھا اور لاہور کے فوڈ اسٹریٹ تو ماشاء اللہ حیران کن حد تک بارونق اور گہما گہمی سے مال تھے جگمگاتی روشنیاں طرح طرح کے لوگ اور طرح طرح کے کھانے مدیحہ واقعی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ کھانوں کی مہک نے سوئی ہوئی بھوک کو جگا دیا تھا۔

"بیٹھو یہاں۔" دل آور نے ایک کرسی کھینچ کر مدیحہ کو بیٹھنے کا کہا۔

"تھینک یو۔" وہ حیران سی کہتی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ پھر وہ دونوں بھی بیٹھ گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور نے پوچھا، چہرے پہ مسکراہٹ تھی

"یہ سارا ماحول اور یہاں کی ارینجمنٹ وغیرہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

اس کی حیرانی کی وجہ یہاں کی عورتیں اور لڑکیاں تھیں، فیشن ایبل اور ماڈرن، بغیر کسی دوپٹے کے اور بغیر کسی حجاب کے کسی نے ہاف سلیوز پہن رکھی تھی اور کئی سلیولیس تھیں۔ ان کی شرٹس کے گلے بیک اور فرنٹ سے ایک جیسے ڈیپ تھے، ٹراؤزرز کے پائنچے گھٹنوں سے کئی انچ اوپر تھے اتنے کہ گوری چٹی لڑکیاں کئی منچلوں کے دل بہلا رہی تھیں، کھلے بال اور میک اپ سے سجے چہرے، مدیحہ کو ہلکا سا شاک لگا تھا کہ یہ پاکستان ہے؟

"اگر پاکستان کا یہ حال ہے تو پھر یورپ کو کیوں بدنام کر رکھا ہے کہ وہاں بے حیائی ہو رہی ہے؟ کیا یہ ہیں وہ مشرقی عورتیں جن کی مغرب میں دھوم مچی ہوئی ہے؟ مشرقی عورت، مشرقی عورت اور مشرقی عورت؟ کمال ہے ایسی مبالغہ آرائی؟" مدیحہ مسلسل سوچ میں گم تھی۔

"مدیحہ کیا سوچ رہی ہو؟" دل آور نے ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

"صرف سوچ ہی نہیں رہی، دیکھ بھی رہی ہوں۔" وہ استہزائیہ بولی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"آپ کی فیورٹ عورتیں، یعنی مشرقی عورتیں۔" اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہہ کر اشارہ کیا دل آور نے چونک کر ان کے تعاقب میں دیکھا تھا ایک لڑکی اور ایک لڑکا ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہوئے ہنس رہے تھے اور ان کی آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی دل آور کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔

"تم ادھر میری جگہ پہ آ جاؤ۔" وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا یہ بات ٹیبل کہتا تو شاید وہ ضد پہ اڑ جاتی لیکن کہنے والا دل آور تھا

تھا۔

"کیا جگہ چینج کرنے سے ماحول بھی چینج ہو جائے گا؟" وہ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

"دیکھو مدیحہ پورا پاکستان ایک جیسا تو نہیں ہے نا؟ یہ امیر گھروں کی بگڑی ہوئی لڑکیاں ہیں۔"

"تو آپ مجھے کسی ایسی جگہ لے جاتے جہاں غریب گھروں کی سلجھی ہوئی لڑکیاں ہوتیں؟" مدیحہ اپنی طرف سے طنز کر رہی تھی

"سب ایسی ہی ہیں۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے پاکستان نے فیشن کے سوا اور کسی کام میں ترقی نہیں کی؟" وہ دل کھول کے بھڑاس نکال رہی تھی۔

"یہ بحث کا وقت نہیں ہے میری جان کھانا کھاؤ۔" دل آور بحث کو ٹال گیا تھا ورنہ وہ تو ماہر تھا اس کام میں، اسے تو بس موقع چاہیے تھا۔

"اپنا موبائل دیں گے مجھے؟" وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو مدیحہ نے اس کا موبائل مانگا تھا۔

♥

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی، نہ ہم خالی

اپنی ڈائری سے شعر پڑھتے ہوئے اس کے دل سے عجیب ہوک نکلی تھی اور وہ ڈائری بند کر کے رائٹنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کر اس کاؤچ وٹو کی طرف تھا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں پٹ کھول دیے باہر لان میں رات پھیلی ہوئی لگ رہی تھی گہرے سرمئی بادلوں نے پورے ماحول کو سرمئی بنا دیا تھا۔ زری اس سرمئی ماحول کو دیکھتی ہوئی بے وجہ ہی اداس ہونے لگی تھی شاید اسے اس سرمئی رنگ سے کسی کے سرمئی رنگ کے لباس کا خیال آ گیا تھا اور لباس کے ساتھ اور بہت کچھ بھی، جن کو سوچتے ہوئے اس نے کھڑکی کے کھلے پٹ سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

"اتنی ٹھنڈ میں کیوں کھڑی ہیں؟ کیا بیمار ہونے کا ارادہ ہے؟" وہ جاتے جاتے دو پل کے لیے ٹھہرا تھا اس کے پاس اور زری کو اس کے پاس پوری کائنات ٹھہر گئی ہو اور اس نے پلکیں اٹھا کر اس کو دھڑکتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیمار ہو بھی جاؤں تو کون سا میری عیادت کو کوئی آ جائے گا۔" بس زری کا اتنا سا کہنا تھا کہ اس نے نظریں چرا لی تھیں۔

"کسی کی عیادت کے لالچ میں خود کو بیمار کرنا سراسر بیوقوفی ہے کیونکہ اس طرح بیماری طویل بھی ہو سکتی ہے، میرا مطلب ہے کہ عیادت کرنے والا نہیں بھی آ سکتا۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولا۔

"آ جائے گا تو کیا بگڑے گا اس کا، بلکہ کسی کی طبیعت ہی سنبھل جائے گی؟" زری اپنی بات پہ زور دے رہی تھی۔

"طبیعت سنبھل جائے گی لیکن حالات بگڑ جائیں گے۔"

"حالات؟" وہ نا سمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی، اندر چلی جائیں ٹھنڈ بہت ہے۔" وہ واپس جا رہا تھا زری اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ چکی تھی۔

"ٹھنڈ تو واقعی بہت ہے آپ بھی تو باہر جا رہے ہیں؟" زری نے فوراً کہا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔

آج وہ سرمئی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس اپنی تمام مردانہ وجاہتوں سمیت عبداللہ اور نبیل کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی نمایاں لگ رہا تھا زری کا دل کئی بار دھڑکنے پہ مجبور ہوا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسے ہی سوچنے پہ مجبور تھی دل کسی اور طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور ابھی نجانے وہ اور کتنا سوچتی کہ اس کے موبائل پہ بیل ہونے لگی پہلے وہ انگور کرتی رہی لیکن جب مسلسل رنگ ہوئی تو اسے کھڑکی سے ہٹ کے بیڈ کے قریب آنا ہی پڑا لیکن جیسے ہی اس نے موبائل اسکرین پہ نمبر دیکھا اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "دل آور شاہ کالنگ" وہ موبائل اسکرین کو ہی دیکھے جا رہی تھی دل کی دھڑکنیں معمول پہ آتیں تو وہ کال سننے کا سوچتی اور بالآخر کال خود ہی بند ہو گئی۔

"ہیں؟ یہ کیا ہوا ہے۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا وہ پاس آ کے چلا گیا زری کے روئیں روئیں میں بے چینی کا انبال اٹھا تھا۔ بیچین شعر تھا کہ کال دوبارہ آ گئی اس نے ایک ہاتھ سینے پہ رکھا اور سنبھل کے بیڈ پہ بیٹھ گئی کیونکہ ٹانگوں میں خوشی کے مارے سکت

نہیں رہی تھی۔ اور یونہی دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے لیس کا بٹن پریس کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس کا سلام بھی لرز رہا تھا۔

"وعلیکم السلام یہ مدیحہ آپ کو کال کر رہی تھی۔ اس سے بات کرلیں۔" وہی دل پہ دھمک چھوڑتی ہوئی بھاری گمبھیر آواز ذرا کی ذرا ساعتوں میں اُتری اور گم ہوگئی۔

"ہیلو۔" اب مدیحہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم۔" زری نے مشکل خود کو کمپوز کیا تھا ورنہ دل و دماغ تو منتشر ہی تھے۔ وہ اس کے دل و دماغ کو ستا کے رکھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟"

"اُداس۔"

"کیوں؟ اُداس کیوں ہو؟"

"بس اکیلے دل نہیں لگ رہا۔"

"پاکستان آجاؤ۔"

"کوشش تو یہی ہے بس امیگزامز کا انتظار ہے۔" زری اُداسی سے بولی۔

"خیر تم سناؤ اتنے دنوں بعد آج کانٹیکٹ کر رہی ہو؟ کیا وجہ تھی؟" زری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ابھی میرا اپنا سیل نمبر نہیں ہے ہوسکتا ہے آج ہی لے لوں، آج ہم دل آور بھائی کے ساتھ لاہور گھومنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں ابھی ابھی فوڈ اسٹریٹ سے کھانا کھایا ہے اور لاہور کے دلچسپ نظارے دیکھے ہیں۔" مدیحہ کہتے کہتے استہزائیہ انداز پہ اُتر آئی تھی۔

"دلچسپ نظارے کیا مطلب؟"

"ارے وہی جن کو آپ لوگ مشرقی نظارے کہتے ہیں۔" مدیحہ ایک ہی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔

"مدیحہ تم بھول رہی ہو کہ ہر ملک میں رہنے والے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے، اچھے بُرے انسان تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔" زری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے مت سمجھاؤ زری، میں سمجھنے والی نہیں ہوں، میں نے تو تمہیں اس لیے کال کی ہے تاکہ تمہیں تمہارے پاکستان کا حال لائیو سناؤں۔" مدیحہ کا انداز طنز لیے ہوئے تھا۔

"چار سالوں میں میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ میں اپنے وطن کا حال بھول جاؤں۔ بے شک میں یہاں رہ رہی ہوں لیکن میری جڑیں تو پاکستان میں ہی ہیں نا؟ میں نے لوٹ کر تو وہیں آنا ہے نا؟ اب اپنی فیملی کو ہی دیکھ لو، کتنے سال یہاں گزارے لیکن اپنے اصل کی طرف لوٹ گئے، پاکستان ہمارا اصل ہے اور اصل چاہے اچھا ہو چاہے بُرا، آخر قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔" محبت کی باتیں کرنے والی زری ملک کی باتیں کر رہی تھی مدیحہ کو سن کر تعجب ہوا تھا۔

"ماشاءاللہ کافی اچھا بول لیتی ہو۔"

"تھینک یو۔" زری نے اس کے طنز کا جواب خفگی سے دیا تھا۔

"باقی سب کیسے ہیں؟" مدیحہ کو سب کا پوچھنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں عبداللہ بھائی آفس گئے ہیں، بھابی اپنے پیرنٹس سے ملنے اور میں گھر پہ۔"

"اوہ..... پھر تو تم واقعی بور ہو رہی ہوگی؟ شاید اُداسی بھی اسی لیے ہے؟"

"ہونہہ..... اُداسی کسی کے لیے ہے، کسی کو پتا ہی نہیں۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"کیا مطلب؟" مدیحہ چونک گئی۔

"یہ مطلب کسی کے سمجھانے سے سمجھ نہیں آتا مدیحہ جانی۔" زری ہلکے سے ہنسی۔

"تم چھپا رہی ہو زری؟"

"چھپے ہوئے کو چھپانا کیسا؟"

"لیکن زری تم نے جو بات کہی ہے وہ۔"
"ارے مدیحہ یاد آیا کہ مجھے یونیورسٹی میں وہ چیزی ملا تھا۔" زری بات ٹال دینا چاہتی تھی۔
"چیزی کو گولی مارو، اپنی بات کہو۔"
"میری کوئی بات ہوگی تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔"
"ٹھیک ہے زری تم مجھے ٹال رہی ہو اور میں ٹل جاتی ہوں، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو مدیحہ حاضر ہے۔" مدیحہ نے بڑے سوبر سے لب و لہجہ اور انداز میں کہا تھا زری کو اس کے انداز پہ بے ساختہ پیار آ گیا تھا۔
"تھینک یو سو مچ ڈیئر اینڈ آئی مس یو ویری مچ۔" زری نے کھل کے اظہار کیا تھا۔
"سیم ہیر۔" وہ بھی جواباً آہستگی سے بولی۔
"تمہارے فرینڈز بھی تمہیں بہت مس کر رہے ہیں چیزی تمہارا پوچھنے آیا تھا میں نے اسے کہا کہ مدیحہ تم لوگوں سے خود کانٹیکٹ کرلے گی وہ تمہارے گھر کا لینڈ لائن نمبر مانگ رہا تھا لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں نے اسے نمبر نہیں دیا۔" زری اسے تفصیل سے بتا رہی تھی۔
"اوکے اچھا کیا ہے۔"
"اوکے۔" زری دھیمے سے بولی۔
"اچھا زری ہم ذرا مارکیٹ کی طرف نکل رہے ہیں تم سے بعد میں بات کروں گی دل آور بھائی میری باتوں کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔" مدیحہ الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے بولی۔
"اوکے ایز یو وش، سب کو میرا اسلام کہنا۔"
"ٹھیک ہے کہہ دوں گی لیکن یار جاتے جاتے ایک شعر تو سنا دو۔ بہت دنوں سے میں تمہارے اشعار کو مس کر رہی ہوں۔" مدیحہ تیزی سے بولی زری کا دل مدھم تال پہ دھڑکا!

تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں
ہو سکے تو سن جاؤ ایک دن اکیلے میں

دھیمی بوجھل آواز میں کہہ کر اس نے فون بند کر دیا لیکن اسے یہ نہیں پتا تھا کہ مدیحہ کے پاس کھڑے دل آور نے بھی اس کا یہ شعر بآسانی سنا ہے کیونکہ فون کا والیوم بلند تھا اتنے شور ہنگامے میں مدھم والیوم سے بات بھی تو نہیں سنی جا سکتی تھی۔ لیکن جو کچھ بھی تھا آج وہ اس کی آواز کے ذرا سے امرت سے ہی جی اٹھی تھی۔

♥

"فاطمہ میری بات سنو۔" مریم نے پاس سے گزرتی فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا تھا وہ اپنے مہمان اٹینڈ کرتی پھر رہی تھی اور مریم کونے والی کرسی پہ بیٹھی اس لڑکے کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی جو مسلسل اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔
"کیا بات ہے؟" فاطمہ ذرا ٹھہر کر متوجہ ہوئی۔
"میں نے عدیل بھائی کو فون کرنا تھا وہ مجھے پک کرنے آ جاتے۔"
"اس کے پاس موبائل ہے؟"
"نہیں کوثر باجی کے گھر فون کر کے پیغام دینا تھا۔"
"ان کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے، تھوڑی دیر بعد مہمان کھانا کھا لیں تو میں خود تمہیں ڈراپ کر آؤں گی۔"
"نہیں عدیل بھائی نے کہا تھا کہ وہ مجھے لینے کے لیے آ جائیں گے۔"
"تو ٹھیک ہے پھر انتظار کرو، ان کے آنے کا۔"
"لیکن فاطمہ میں اکیلی بیٹھی کیا کروں گی؟ تم کیک کاٹ چکی ہو اس لیے مجھے اب گھر جانا چاہیے۔" مریم اسے کیا بتاتی کہ اس جوڑے نام کے لڑکے نے اسے دیکھ دیکھ کر اپنی نظروں سے ہی زچ کر دیا ہے۔
"کھانا کھا لیا تم نے؟"

''کیوں؟ میرے گھر کے کھانے میں زہر ملا ہوا تھا کہ تمہارا بھائی بھی بھاگ گیا اور تم بھی کھانا کھائے بغیر جا رہی ہو۔'' جب غصے میں ہوتی تو اسی طرح جو منہ میں آتا کہہ جاتی تھی۔

''پلیز فاطمہ! کیوں ذرا ذرا سی بات پہ اتنی بدگمان ہو جاتی ہو؟'' مریم خفگی سے بولی۔

''تم جب غیریت برتتی ہو تبھی مجھے بدگمانی ہوتی ہے۔'' فاطمہ کا غصہ عروج پہ تھا۔

''دیکھو فاطمہ میں اگر غیریت برتتی تو تمہارے بلانے پہ اس وقت تمہارے گھر نہ آتی حالانکہ تم جانتی ہو کہ میں کہیں بھی جاتی نہیں ہوں خصوصاً رات کے وقت تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی تمہاری خاطر آ گئی، اور تم ہو کہ ابھی بھی بدگمان ہو رہی ہو؟'' مریم نے افسوس سے کہا تھا فاطمہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ مریم اگر اس کے لیے اس وقت یہاں تک آ گئی تھی تو واقعی بات تھی۔

''ہیلو ڈیئر! کیا ہو رہا ہے؟'' فاطمہ کی ایک اور فرینڈ پاس آ گئی تھی۔

''تھینک ایکشن، تم سناؤ کھانا کھا لیا؟''

''آف کورس کھانا کھا کر ہی تمہارے پاس آئی ہوں۔'' اور ذرا فاصلے پہ کھڑا جوڈت اپنے دھیان میں آگے بڑھا تھا کہ اس سے ٹکرا گیا اور کولڈ ڈرنک کے گلاسوں سے بھی ٹرے جوڈت پہ ہی الٹ گئی تھی اس کی شرٹ رنگ برنگے مشروب اُلٹنے سے رنگین ہو گئی تھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم دیکھ کر نہیں چل سکتے؟'' جوڈت نے اپنی غلطی دیئر کے سر ڈال دی۔

''جوڈت کول ڈاؤن یار سارے مہمان دیکھ رہے ہیں۔'' سائم لپک کے پاس آیا تھا اور اسے مزید غصہ نکالنے سے روکا۔

''میری ساری شرٹ خراب ہو گئی ہے اور تم.....''

''یار پلیز کیوں تماشہ بنا رہے ہو؟ تم میرے بیڈ روم میں جا کر میری شرٹ پہن لو، آؤ میرے ساتھ۔'' سائم نے کشمکش کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

''غلطی تمہاری تھی، تمہاری نظریں کہیں اور لگی ہوئی ہیں، اس کا بھلا کیا قصور ہے؟'' سائم نے جوڈت کو مزید کچھ کہنے سے بھی روک دیا تھا اور پھر اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گیا۔

''بی بی جی! باہر کوئی عدیل صاحب آئے ہیں۔'' ملازمہ نے اندر آ کر فاطمہ کو اطلاع دی۔

''ان سے کہو اندر آ جائیں۔''

''کہا تھا بی بی جی! لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ جلدی میں ہیں۔ مریم بی بی کو باہر بھیجو۔'' ملازمہ نے عدیل کا جواب ایڈوانس میں ہی پوچھ لیا تھا۔

''میں چلتی ہوں فاطمہ۔'' مریم نے جانے کے لیے پر تولے۔

''چلو۔'' فاطمہ اسے اشارہ کرتی اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' مریم کے ساتھ فاطمہ کو آتے دیکھ کر عدیل سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''وعلیکم السلام! مجھے دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اس لیے یہاں تک آئی ہوں۔'' فاطمہ کا انداز طنزیہ تھا۔

''شکریہ کس بات کا؟''

''مریم کو لے کر آنے کا۔''

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟ آپ دونوں فرینڈز ہیں ایک دوسرے سے ملنے کا حق بنتا ہے۔'' عدیل نے نارمل لہجے میں کہا۔

''کیا انسانوں کے حقوق بھی جانتے ہیں آپ؟''

''فاطمہ کافی ٹائم ہو چکا ہے، ہمیں اب چلنا چاہیے۔''

مریم نے حج بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔

"واقعی جانا چاہیے اور کے گڈ بائے۔" فاطمہ پلٹ گئی۔

"سنیے۔" عدیل نے پکارا۔

"وش یو پاپی برتھ ڈے۔" جاتے جاتے وہ اس کا شکوہ دور کر گیا تھا فاطمہ پیچھے دیکھتی رہ گئی وہ بائیک کو کک لگاتے ہوئے چند سیکنڈز بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا وہ ابھی وہیں کھڑی تھی کہ اتنے میں جودت عجلت میں تقریباً بھاگتا ہوا باہر آیا تھا لیکن باہر فاطمہ اکیلی کھڑی تھی۔ گویا وہ جا چکی تھی جودت اپنی گاڑی کے ہونٹ پہ مکا رسید کر کے رہ گیا اور دوسری ٹھوکر ٹائر کو دے ماری تھی اس کا چانس مس ہو گیا تھا۔

♥

سبز گھاس پہ شبنم کے قطرے رات بھر رونے کی نشانی تھی اور وہ رات کے آنسوؤں میں پاؤں بھگوتی پورے لان کی گھاس کو اپنے سفید کیچز سے پاؤں کا نرم لمس بخشتے ہوئے مسلسل چہل قدمی میں مصروف تھی۔ سبز گھاس کا قالین اس کے پیروں تلے دب رہا تھا اور پھولوں کی دلفریب خوشبو اس کے پیروں کی پازیب بنی جاری تھی جس طرف قدم اٹھ رہے تھے اسی طرف مہک کے جھونکے چل رہے تھے۔

"کوئی کانٹا لگ جائے گا علیزے۔" آذر اسے منع کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے آذر بھائی۔" علیزے اس کی آواز پہ مسکرا کر پلٹی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے؟"

"میں کافی دیر سے یہیں ٹہل رہی ہوں۔"

"لیکن ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ بھی ایک بار جوتے اُتار کے دیکھیں پھر آپ کو پتا چلے گا کہ ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے؟" علیزے نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"میں جوتے اُتار کے دیکھوں؟" آذر دلچسپی سے ہنسا۔

"آف کورس آپ سے ہی کہہ رہی ہوں۔" علیزے نے اصرار کیا تھا اور آذر نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے اپنے جاگرز اُتارے اور اس کے ساتھ گھاس پہ ننگے پیر ٹہلنے لگا۔

"ٹھنڈی شبنم کے قطرے پیروں میں گدگدی کرنے لگے جیسی مسکراہٹ آپ ہی آپ لبوں کا احاطہ کرنے لگی تھی اور اسے دیکھ کر علیزے ہنس پڑی۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا۔"

"کبھی کبھی میرا موڈ اچھا ہو تو میں یونہی ننگے پیر چہل قدمی کرتے ہوئے بہت انجوائے کرتی ہوں۔"

"اوہ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آج تمہارا موڈ اچھا ہے؟"

"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وجہ؟"

"نہیں ایسے ہی۔"

"حیرت ہے، بغیر وجہ کے موڈ فریش ہے؟"

"بس کبھی کبھی انسان کی کیفیت ایسی ہو ہی جاتی ہے۔ نہ اپنی اُداسی کا سبب پتا چلتا ہے اور نہ ہی خوشی کا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"لگتا ہے تم کالج جانے کے لیے خوش ہو؟" آذر نے اس کے دلکش چہرے کو اک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن ابھی تو میرے کالج جانے کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوا۔ نہ گاڑی نہ ڈرائیور اور دو روز سے آپ بھی گھر پہ نہیں تھے۔"

"آج گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا، ڈرائیور کے لیے تو ڈیڈ نے کسی کو کہہ دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ آج ڈرائیور بھی آ جائے،

اس نے شام کو آنے کا کہا ہے۔" آذر نے اسے تسلی دی۔
علیزے چلتے چلتے ٹھہر گئی تھی اور آذر اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔
"کیا ہوا؟" آذر اس کے چہرے پہ پریشانی کی پرچھائی دیکھ چکا تھا۔
"ایک بات پوچھوں آذر بھائی؟" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
"ہاں ہاں ضرور پوچھو۔" آذر ہمہ تن گوش ہوا۔
"آپ کو ابھی تک اس آدمی کا پتا نہیں چلا نا، جس نے فائرنگ کروائی تھی؟" علیزے بغور آذر کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی آذر ایک پل کے لیے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس وقت اگر وہ علیزے کے سامنے واقعی ناکامی اور مایوسی ظاہر کرتا تو یقیناً وہ اندر سے پریشان اور ہراساں ہو جاتی اور آذر اسے ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کمزور دل کی لڑکی تھی، دوسرے لفظوں میں ڈرپوک اور بزدل بھی کہا جا سکتا تھا۔
"آذر بھائی؟" اس کی آواز آذر کو ہوش کی دنیا میں لے آئی۔
"ہوں؟"
"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دیں۔"
"دیکھو علیزے ایسی باتیں سب کے سامنے شوکرنے والی نہیں ہوتیں، ایسے معاملوں میں بہت احتیاط برتنا پڑتی ہے، ہر کسی کو بات بتانے سے بات پھیل جاتی ہے اسی لیے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔"
آذر کا انداز تسلی دینے والا تھا۔
"مطلب کہ آپ کو دشمن کا پتا چل چکا ہے؟"
"بالکل۔" آذر کو علیزے کی خاطر جھوٹ بولنا پڑا تھا۔
"کون ہے وہ؟"
"ایم سوری میری جان یہ نہیں بتا سکتا۔"
"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو خود بھی پتا نہیں ہے؟" علیزے بلا جھجک کہہ گئی آذر چونک گیا تھا۔
"یعنی تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ اُلٹا اس پہ خفا ہونے لگا تھا۔
"نن..... نہیں میں یہ تو نہیں کہہ رہی۔" علیزے کو اپنی بے ساختگی اور بے یقینی پہ ندامت ہوئی تھی۔
"بہرحال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بہت جلد وہ آدمی سامنے آجائے گا۔ بس کوشش ہی ہے کہ سارے ثبوت ہاتھ آجائیں۔" وہ بار بار علیزے کو تسلی دیتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔
"اوکے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے کندھے اچکا دیے۔
"ہوں..... چلو اندر چلتے ہیں، کافی ٹائم ہو رہا ہے میں نے ابھی آفس کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔" آذر اسے کہتے ہوئے واپسی کے لیے پلٹا لیکن سامنے کومل کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔
"کومل۔"
"جی وہ میں آپ کو بلانے آئی تھی، آنی بلا رہی ہیں ناشتہ تیار ہے۔" کومل نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا اس کی نظریں جھکیں تو ان دونوں کے پیروں پہ جا کر ٹھہر گئیں وہ دونوں گھاس پہ ننگے پیر کھڑے تھے علیزے کو تو نہیں البتہ آذر کو کومل کی نظریں بہت محسوس ہوئی تھیں۔ وہ آذر کے جواب سے پہلے ہی پلٹ کر اندر چلی گئی تھی جبکہ علیزے اس کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

♥

نبیل ابھی ناشتہ کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ گیٹ پہ دل آور کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا وہ جلدی جلدی چائے کا کپ خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔
"آپ کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ابھی بتا دیجیے۔ آتے ہوئے لے آؤں گا۔" نبیل جاتے جاتے ٹھہر گیا۔
"نہیں بیٹا مجھے بھلا کس چیز کی ضرورت ہو گی؟ بس اپنے گھر کی ضرورت تھی اور گھر مل گیا۔" فائزہ بیگم گہری سانس خارج

کرتے ہوئے بولیں۔

"پلیز مادام اُداس نہ ہوا کریں۔" نبیل ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"جس ماں کا تم جیسا سمجھدار محبت کرنے والا اور لائق فائق بیٹا ہو اسے بھلا اُداس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولیں۔

"مجھے پتا ہے آپ کس کے لیے اُداس ہوتی ہیں، لیکن مام آپ کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس اُداسی اور اس انتظار کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کچھ حاصل نہیں ہوتا ایسے انتظار اور اُداسی سے۔" وہ ماں کی کیفیت کو کافی گہرائی سے سمجھتا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ ممتاز حیات کی بے گانگی کا غم دل میں دھڑکن کی طرح لیے پھرتی ہیں جب جب دل دھڑکتا ہے تب تب غم بڑھتا ہے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا جاؤ تم، دل آور تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔" انہوں نے نبیل کو یاد دلایا۔

"اوہ ہاں..... اب تو وہ مجھے گالیاں بھی دے رہا ہوگا۔" نبیل سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے پلٹا اور کرسی پہ رکھا اپنا نیوی بلیو کلر کا بریف کیس اُٹھا کر باہر کی سمت لپکا تھا لیکن سامنے سے اس کا چوکیدار کور یڈور عبور کرتے ہوئے اندر آ رہا تھا۔

"صاحب وہ دل آور صاحب کہہ رہے ہیں کہ کیا آپ زندہ ہیں؟" چوکیدار نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا تھا جس پہ نبیل بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور چوکیدار کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا گیٹ کے سامنے ہی وہ اپنی طرف لیے کھڑا تھا چیرے پہ غصہ تھا۔

"دل آور صاحب سے کہو نبیل صاحب زندہ ہیں اور آ گئے ہیں۔" نبیل نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور ذرا اونچی آواز سے کہا تھا تاکہ گاڑی میں بیٹھا دل آور بھی سن لے۔

"اب اور کتنا ایٹ کرو گے؟" وہ بالآخر نہ رہ سکا اور غصے سے بول پڑا۔

"یار تم تو ہر وقت جلدی میں ہی رہتے ہو، میں سوچتا ہوں اپنی بیوی کے ساتھ نجانے کیا کرو گے نہ پیار کرو گے، نہ اظہار کرو گے، نہ ہی انتظار کرو گے، بیچاری روئے گی اپنے نصیب پہ۔" نبیل فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا دل آور کی ہونے والی بیوی پہ افسوس کر رہا تھا۔

"اور بڑی خوش نصیب ہو گی تمہاری بیوی، ہر وقت اس کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھے رہو گے، کبھی گھر سے ہی نہیں نکلو گے۔"

"اللہ معافی دے یار! اب ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے رن مرید تو نہ کہو، اللہ ایسی نوبت نہ لائے۔"

نبیل نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اب ہنسنے کی باری دل آور کی تھی اور یونہی باتوں باتوں میں وہ کرنسی چینج کروانے کرنسی چینجر پہنچ گئے، وہاں سے بینک کا رُخ کیا اپنا اکاؤنٹ اوپن کروایا اور اے ٹی ایم کارڈ اپلائی کروا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بینک سے بھی فارغ ہو گئے تھے پھر ایک موبائل کمپنی کی فرنچائز گئے اور مدیحہ اور فائزہ بیگم کے اپنی پسند کے نمبر ایشو کروائے تھے۔

دو روز پہلے نبیل گلاب خان کے ساتھ آ کر اپنے لیے نمبر لے چکا تھا۔ لیکن مدیحہ وغیرہ کے ابھی باقی تھے سارے کام کرنے کے بعد ان کا رُخ شوروم کی طرف تھا جہاں سے نبیل نے بیک وقت تین گاڑیاں نکلوائی تھیں دل آور اسے اس شوروم میں لے کر آیا جہاں اس کی پُرانی جان پہچان تھی شوروم کے مالک اکرام مجید کچھ عرصہ پہلے کسی الزام کی زد میں آ گئے تھے اور ساتھ ہی انہیں گاڑیوں کے جعلی لیین دین کے کیس میں ملوث کر دیا گیا تھا تب اکرام مجید ہر طرف سے ناکام اور مایوس ہو کر دل آور شاہ کے پاس پہنچے تھے اور اس نے محض تین ماہ میں انہیں اس کیس سے باعزت بری کروا دیا تھا جس کی خوشی میں انہوں نے دل آور کو ایک گاڑی تحفے میں بھجوائی تھی لیکن اس نے یہ تحفہ لینے سے انکار کر دیا تھا وہ اپنے کلائنٹس سے صرف اپنی فیس لیتا تھا "چائے پانی" کے نام پہ اضافی پیسے لینا حرام سمجھتا تھا یہ اور بات تھی کہ کوئی عام شہری اس کی فیس افورڈ نہیں کر سکتا تھا اسے بس بڑی بڑی آسامیاں ہی ہائر کر سکتی تھیں جیسے اکرام مجید۔

"واؤ کیا شاندار شوروم ہے۔" نبیل شوروم کے احاطے میں داخل ہوتے ہی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کیونکہ شوروم کی سجاوٹ پارکنگ تک نظر آ رہی تھی۔

"اندر چلو..... اندر سے اور بھی شاندار لگے گا۔" دل آور گاڑی لاک کر کے اس کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر دوسرے گلاس ڈور سے باہر نکلتے آدمی پہ ٹھہر گئی۔ دل آور اس آدمی کو دیکھ بھی چکا تھا اور پہچان بھی چکا تھا لیکن وہ آدمی اتنی عجلت میں تھا کہ دل آور شاہ کو نہ دیکھ سکا البتہ اکرم مجید گلاس وال سے دل آور شاہ کو دیکھ کر خود ہی گلاس ڈور کے پاس آ گئے۔

"السلام علیکم شاہ جی! باہر کیوں رُک گئے؟ اندر آیئے نا؟" اکرم مجید بچھے جا رہے تھے۔ لیکن دل آور اس آدمی کو دیکھے جا رہا

تھا اس کی نظروں نے پارکنگ تک اس آدمی کا پیچھا کیا تھا۔

''کس کو دیکھ رہے ہو؟'' نبیل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ ''کسی کو نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اکرم مجید سے ہاتھ ملا کر اندر آ گیا۔

''کیا لیں گے شاہ جی ٹھنڈا یا گرم؟'' وہ انہیں اپنے آفس روم میں لے آئے۔

''ٹھنڈا۔'' وہ مختصر بولا۔

''اتنا ٹھنڈا کہ سینے کو کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا کر دے۔''

''جیسے آپ کی مرضی شاہ جی! آج ہمارے غریب خانے کو رونق کیسے بخشی؟''

''بس میرے دوست کا کچھ خریدنے کا موڈ تھا سوچا آپ کی دکان ہی اچھی رہے گی۔'' اس نے وسیع و عریض کشادہ جگہ کا جائزہ لیتے شوروم کو بیٹھے بیٹھے دکان کا نام دے دیا تھا یہی تو اس کا شاہانہ پن تھا۔

''اچھا تو یہ آپ کے دوست ہیں؟ کیسے ہیں سر؟'' اکرام مجید نے نبیل حیات سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور چند اور باتوں کے بعد وہ لوگ اٹھ کر گاڑیاں پسند کرنے لگے ایک ساتھ تین گاڑیاں، اکرام مجید سن کر ہی مرعوب ہو گئے تھے۔ نبیل اپنے لیے پسند کر رہا تھا لیکن دل آور کی نظریں بلیک چمچماتی مرسڈیز پہ تھیں۔

''یہ گاڑی سیل ہو چکی ہے۔'' منیجر نے آگے بڑھ کے اطلاع دی۔

''اندازہ ہے مجھے۔'' دل آور نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور پلٹ کر نبیل کے برابر آ کھڑا ہوا جس کی نظر انتخاب پہلے ہی پر ٹکی ہوئی تھی۔

''یہ کیسی رہے گی؟''

''ہوں اچھی ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر رائے دی اور نبیل نے وہی اوکے کر دی۔ مدیحہ کے لیے سلور کلر پسند تھا اس نے دل آور کو تاکید کی ہوئی تھی کہ اس کی گاڑی سلور کلر میں ہی ہونی چاہیے۔ سو اس کی گاڑی دل آور نے ہی پسند کی تھی پھر نبیل کے تمام کام نمٹانے کے بعد وہ اپنے کام نمٹانے کے لیے چل دیا تھا وہ جس کیس پہ کام کر رہا تھا وہ بہت اہم تھا۔

♥

''اندر چلا جاؤں چوکیدار صاحب؟'' منصور حسین کی آواز عقب سے ابھری تو چوکیدار بدک کے پیچھے ہٹا تھا وہ کوئی بیگ ڈالے بڑے دل جلانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''تم آ بھی گئے منصور حسین؟'' عارف اس کا بیگ دیکھ کر بولا۔

''آ گیا ہوں جناب! آ گیا ہوں دروازے کھول دو، گھر کے بھی، دل کے بھی۔'' منصور حسین کو جب سے نوکری ملی تھی اس کی باش نظر آنے لگا تھا۔ ''مجھے تو لگتا ہے بڑے صاحب نے ڈرائیور نہیں رکھا بلکہ عذاب رکھا ہے۔'' عارف نے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

''کیوں دل جلاتے ہو بادشاہو، صحت پہ اثر پڑتا ہے۔'' منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تم اندر ہی چلے جاؤ تو اچھا ہے۔'' عارف نے جھنجلا کر چھوٹا گیٹ کھول دیا تھا اور منصور حسین مسکراتے ہوئے اندر آ گیا تھا۔ مغرب کا وقت تھا شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ حویلی کے لیمپ پوسٹ روشن ہو چکے تھے گیٹ، ڈرائیوے اور گارڈن روشنیاں ہی روشنیاں تھیں رات میں دن کا سماں تھا۔ منصور حسین ہمیشہ کی طرح ایک ہی جگہ کھڑا حویلی کی خوبصورتی دیکھ رہا تھا۔

''منصور حسین۔'' مبارک خان اسے دور سے ہی دیکھ چکا تھا اسی لیے آواز دی تھی۔

''یار کھڑے کیا دیکھنے لگتے ہو؟''

''اللہ کے رنگ۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''اللہ کے رنگ؟''

''ہاں یار! دیکھتا ہوں کہ اللہ نے اگر کسی کو نوازا ہے تو بے بہا نوازا ہے اور جس کو نہیں نوازا اسے حسرت سے نواز دیا ہے وہ دوسروں کو حسرت سے دیکھتا رہے۔'' منصور حسین آہ بھر کے بولا اس کا موڈ اداس ہو چکا تھا۔

''اللہ نوازے گا یار سب کو نوازے گا دل چھوٹا نہیں کرتے۔ تم آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تمہارا کوارٹر دکھا دوں۔''

خان نے کسی دیے ہوئے [illegible] کا دروازہ کھولا۔ مبارک خان نے آگے بڑھ کے کواڑ کی کنڈی کھول دی۔

منصور حسین اندر آ گیا اس کمرے میں ایک چارپائی، دو کرسیاں، ایک میز اور ایک الماری تھی پنکھے اور بجلی کا انتظام بھی اچھا تھا کمرے کا فرش اور دیواریں صاف ستھری اور جگمگا رہی تھیں گویا ملازموں کا بھی کافی خیال رکھا گیا تھا منصور حسین کو یہ بات بڑی پسند آئی تھی۔ وہ میز پہ بیگ رکھ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا چارپائی کڑکڑا کے رہ گئی۔

"یار یہ تو ابھی سے احتجاج کرنے لگی ہے۔ میرا وزن سہہ بھی پائے گی یا نہیں؟" حسین منصور پیچھے کی طرف چارپائی پہ ہاتھ جماتے ہوئے اس پہ دباؤ ڈال کر چارپائی کی مضبوطی چیک کر رہا تھا کہ کہیں وہ ٹوٹ ہی نہ جائے۔

♥

"جد سے زیادہ وزن ڈالو گے تو کیسے سہہ پائے گی؟ بیچاری ٹوٹ ہی جائے گی نا؟" مبارک خان اس کے انداز پہ ہنس کر بولا تھا۔

"تو پھر ایسا کرو اس کی جگہ کوئی مضبوط سی چارپائی لا کر رکھو، ورنہ یہ سچ مچ ٹوٹ ہی جائے گی۔ میں بڑی "اتھری" نیند سوتا ہوں۔" منصور حسین نے مبارک خان کو پہلے سے اطلاع دی تھی۔

"رنگے پایوں والا بڑا پلنگ منگوا لوں تمہارے لیے؟" مبارک خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"ارے یار! اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو گی؟ نواڑی پلنگ پہ سونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے، ہر کروٹ پہ ڈھیلا پڑتا ہے۔" منصور حسین مزا لیتے ہوئے بولا۔

"ویسے یار آپس کی بات ہے اگر تم بڑے صاحب کے سامنے رنگے پایوں والے نواڑی پلنگ کی فرمائش کرو گے تو وہ یہ فرمائش بھی پوری کر دیں گے۔" مبارک خان نے آہستہ آواز میں کہا۔

"وجہ.....؟" منصور حسین نے حیرت سے پوچھا۔

"آخر تم علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو، ان کے ملازم ہو، کیا یہ وجہ کم ہے؟" مبارک خان اس گھر کا خاص ملازم تھا وہ علیزے اور اس کے ملازموں کی اہمیت خوب جانتا تھا اس کے ملازموں کی بھی گھر میں بڑی قدر اور اہمیت جانی جاتی تھی۔

"او اچھا..... اچھا۔" حسین حسین نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا لیکن اتنے میں ان دونوں کو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی وہ دونوں ہی چونک گئے مگر مبارک خان فوراً ہی ریلیکس ہو گیا۔ اسے آواز کی سمجھ آ گئی تھی۔

"یہ کس کی آواز ہے؟" منصور حسین انجان تھا اسی لیے پوچھ رہا تھا۔

"شیرو بابا کی۔"

"کون شیرو بابا؟"

"علیزے بی بی کے ڈرائیور۔"

"ڈرائیور؟" منصور حسین کو اچنبھا ہوا۔

"چند روز پہلے تک وہی علیزے بی بی کے ڈرائیور تھے۔"

"یار! صاف صاف بات کرو۔ "تھے" سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب کہ اب تم ہو، وہ نہیں ہیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ چند روز پہلے....." مبارک خان بات بتاتے بتاتے رُک گیا تھا۔

"چند روز پہلے کیا ہوا؟"

وہ پوچھ رہا تھا اور مبارک خان تذبذب کا شکار تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔

"کیا کوئی راز کی بات ہے؟" منصور حسین نے اس کے چہرے پہ کھوجا۔

"خیر جو بھی بات ہے تمہیں بتانی تو پڑے گی، آخر تمہیں اسی لیے تو اس نوکری پہ رکھا گیا ہے۔" مبارک خان ایک کرسی گھسیٹ

کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

''اچھا..... بتاؤ پھر۔''

''بتاتا ہوں یار۔'' مبارک خان نے خود کو سب بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔

''بچپن سے علیزے بی بی نے جب سکول میں ایڈمیشن لیا تھا خیرو بابا تب سے ان کے ڈرائیور ہیں ان کو پک اینڈ ڈراپ ان کی ذمہ داری تھی، علیزے بی بی نے کہیں اور بھی آنا جانا ہوتا تھا تو وہی لے کر جاتے تھے لیکن چند روز پہلے وہ علیزے بی بی کو ڈراپ کرنے گئے تو راستے میں گاڑی پہ فائرنگ شروع ہو گئی، خیرو بابا بہت وفادار ملازم ہیں خود زخمی ہو گئے لیکن علیزے کو ذرا سی بھی آنچ نہیں آنے دی، پچھلے کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھے کل ہی واپس آئے ہیں، ابھی کمزور ہیں، اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے اسی لیے درد سے کراہ اٹھتے ہیں۔'' مبارک خان نے اسے تفصیل سے بتایا۔

''اوہ..... یہ تو واقعی پریشانی کی خبر سنائی ہے تم نے، لیکن یار سوچنے کی بات ہے، فائرنگ کروائی کس نے تھی؟ کیا تمہارے بڑے صاحب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ چل رہی ہے؟'' منصور حسین پُرسوچ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''ارے نہیں یار!'' اس حویلی کے سبھی افراد بہت نیک، شریف اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں، نمازی اور پرہیزگار ہیں کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اگر دشمنی ہوتی تو فوراً پتا چل جاتا کہ فائرنگ کرنے والا کون تھا؟ یہ تو پتا نہیں اچانک کون دشمن اٹھ کھڑا ہوا جس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔'' مبارک خان اس بات سے خود بہت پریشان ہو رہا تھا۔

''ہوں..... یہ تو اور بھی پریشانی کی بات ہے یار! پھر کیا سوچا ہے تمہارے صاحب نے؟''

''ارے سوچنا کیا ہے بس چھان بین میں لگے ہوئے ہیں ابھی، اب دیکھو کہ کب مسئلہ حل ہوتا ہے؟'' مبارک خان بے بسی سے سر ہلا کر بولا۔

''اتنا بڑا واقعہ ہونے کے بعد تمہارے صاحب پھر اپنی بیٹی کو باہر بھیجنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ انہیں ڈر نہیں لگتا؟'' منصور حسین تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

''ڈر کس کو نہیں لگتا؟ ماں باپ ہیں آخر، علیزے بی بی بڑی منتوں مرادوں کے بعد ملنے والی اولاد ہیں ان کی، وہ ذرا سی ہوا بھی نہ لگنے دیں، پر مجبوری ہے، پڑھنے کے لیے تو بھیجنا ہی ہے۔ ان کے امتحان سر پہ پہنچ چکے ہیں، کالج نہیں جائیں گی تو پورے سال کی محنت کا نقصان ہو گا اسی لیے تو ایمرجنسی میں انہوں نے تمہیں ڈرائیور رکھ لیا ہے، ورنہ کوئی اور حالات ہوتے تو ہر طرح کی چھان بین کرتے اور پھر بھی مطمئن نہ ہوتے۔'' مبارک خان صاف صاف بات کر رہا تھا۔

''اور کیسی چھان بین کرنا تھی انہوں نے؟ شناختی کارڈ لائسنس، نام و پتا، گھر بار سب پوچھا ہے انہوں نے؟'' منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔

''یار بے شک پوچھا ہے انہوں نے لیکن پھر بھی وہ مطمئن ہونے والے نہیں، خیر شاید اللہ نے تمہاری دعا سن لی تھی اسی لیے تمہارے لیے نوکری کا سبب بنا دیا۔''

''ہاں یار! میرے لیے تو سبب بن گیا، لیکن خیرو بابا کا کیا ہو گا؟ وہ بیچارے تو بے روزگار ہو گئے نا؟'' اسے افسوس ہو رہا تھا۔

''خیرو بابا کی فکر نہ کرو صاحب نے ان کے لیے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے۔''

''انتظام..... کیسا انتظام؟'' منصور حسین کو سمجھ نہ آیا۔

''بڑے صاحب خیرو بابا کو ان کے گوٹھ بھجوا رہے ہیں۔ جہاں ان کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں رہتے ہیں وہ بھی انہی کے پاس رہیں گے اور ان کو بغیر کوئی کام کیے، گھر بیٹھے ہر مہینے تنخواہ ملتی رہے گی۔ اس طرح ان کا بڑھاپا بھی سکون سے گزرے گا اور ماہانہ خرچ بھی ملتا رہے گا۔'' مبارک خان نے مزید اطلاع دی تھی اور منصور حسین سچ مچ مرعوب ہوا تھا۔

''پھر تو تمہارے بڑے صاحب واقعی نیک آدمی ہیں۔ اپنے ملازموں کے لیے بھی اتنا اچھا سوچتے ہیں، نرم دل رکھتے ہیں سینے میں۔'' منصور حسین توصیفی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ان کے اچھا سوچنے کے لیے، ہمارا اچھا بننا ضروری ہے منصور حسین، ورنہ لوگ بُرے کے ساتھ بُرا ہی پیش آتے ہیں، مجھے اُمید ہے کہ تم اچھے بن کے ہی رہو گے۔'' مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے تھپکی دی اور منصور حسین اثبات

بات پہ دلچسپی سے مسکرا دیا تھا۔

"میں ہوں ہی اچھا، مجھے بننے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے دلچسپ انداز پہ مبارک خان بھی مسکرا دیا تھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"خیرو بابا کی طبیعت پوچھنے، لگتا ہے وہ اکیلے ہیں اس وقت؟" مبارک خان نے اندازہ لگایا۔

"تو مجھے بھی ساتھ لے چلو، میں بھی ان کی عیادت کر لوں گا۔" منصور حسین کھڑا ہو گیا تھا اور پھر مبارک خان کے ساتھ اپنے کوارٹر سے نکل کر خیرو بابا کے کوارٹر میں آ گیا۔

"السلام علیکم۔" اس کی بھاری دبنگ سی اجنبی آواز پہ خیرو بابا نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور مبارک خان کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم خیرو بابا۔" مبارک خان قریب آ کے بولا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے نقاہت زدہ آواز میں سلام کا جواب دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" منصور حسین نے پوچھنے میں پہل کی تھی جبکہ وہ اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ منصور حسین ہے خیرو بابا! ملیٹری سے بی بی کا نیا ڈرائیور۔" مبارک خان نے ان کی مشکل آسان کی۔

"اچھا۔۔۔ اچھا یہ ہے نیا ڈرائیور؟ ماشاء اللہ بڑا گھبرو جوان ہے۔" انہوں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا اور سراہا تھا۔

"شکریہ۔" منصور حسین نے ان کی ستائش بھری نظروں پہ سر جھکا لیا تھا۔

"اللہ تجھے زندگی دے پتر، چہرے سے ہی بہادر لگتے ہو، آئندہ بھی بہادر بن کے ہی رہنا۔" انہوں نے منصور حسین کو نصیحت کی وہ ان کے قریب ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔" اس نے خیرو بابا کے ہاتھ تھام لیے، لہجہ واقعی شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

"کیوں پتر؟ میرا اور تیرا تو ایسا کوئی واسطہ ہی نہیں کہ تجھے شرمندہ ہونا پڑے۔" خیرو بابا کو حیرت ہوئی۔

"بس اوپر والا کسی نہ کسی سے کوئی نہ کوئی واسطہ بنا ہی دیتا ہے، میں بہت دنوں سے نوکری کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا لیکن کہیں کوئی ٹھانی جگہ ہی نہیں مل رہی تھی، صاحب نے بھی انکار کر کے مجھے واپس بھیج دیا، لیکن اب جب آپ زخمی ہوئے ہیں تو صاحب کو آپ کے بڑھاپے کا خیال آ گیا ہے اسی لیے انہوں نے آپ کے بڑھاپے کی جگہ میری جوانی کو نوکری پہ رکھ لیا ہے۔ میری محنت اور طاقت سے آپ کا بڑھاپا مات کھا گیا ہے، آپ کو ہٹا دیا گیا ہے اور مجھے رکھ لیا گیا ہے، خیر دین کی جگہ منصور حسین کو لو کے گھر لایا گیا ہے۔ اسی لیے منصور حسین کو شرمندگی ہو رہی ہے کہ اس نے آپ کی جگہ لے لی ہے۔" منصور حسین نے ان کے ہاتھ تھامے اپنی شرمندگی کا جواز پیش کیا تو خیرو بابا اور مبارک خان حیرت سے اسے دیکھنے لگے وہ کتنا حساس ہو رہا تھا ورنہ اسے تو اس نوکری پہ خوش ہونا چاہیے تھا مگر خیرو بابا کا سن کر اس کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

"یہ کیسی بات کر رہے ہو پتر؟ سب کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں، میں نے اپنے نصیب کا کما لیا ہے، اب تجھے تیرے نصیب کا ملے گا اور ویسے بھی اللہ کسی کا حق نہیں چھوڑتا، صاحب نے مجھے نوکری سے الگ کیا ہے، مجھے میرے نصیب سے تو الگ نہیں کیا، اللہ نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا ہے میرے لیے، میرے حصے کا رزق مجھے ملتا رہے گا۔" خیرو بابا بھی بہت صابر شاکر تھے انہوں نے منصور حسین کی شرمندگی کو کم کر دیا تھا۔

"یہ تو انہوں نے واقعی بہت اچھا کام کیا ہے، مجھے سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔" منصور حسین نے ان کے جذبے کو سراہا تھا۔

"خوشی تو مجھے بھی بہت ہوئی ہے، اچھا ہے اپنے بچوں کے پاس اپنے گھٹ میں رہوں گا، ساری عمر شہر میں کام کرتے ہی گزار دی۔" خیرو بابا نے گہری سانس کھینچی اور اپنا لڑکپن یاد کرنے لگے منصور حسین کو ان کے پاس بیٹھنا اور باتیں سننا بہت اچھا لگا تھا وہ کافی دیر تک اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے اور وہ دونوں سنتے رہے۔

♥

"بجوت۔۔۔" وہ گاڑی سے اتر کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتے ہوئے روش سے لان کی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا

جب لان کے بائیں حصے سے اُبھرنے والی کومل کی آواز پہ ٹھٹک کر رُک گیا تھا۔

"کومل آپا؟"

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے سیڑھیوں سے اُتر کر چھوٹی سی ندی کے پاس سے گزر کر لان میں آ گیا تھا۔

"جی ہاں..... کومل آپا۔" اس نے سر اثبات میں ہلا کر اعتراف کیا کہ میں ہی ہوں۔

"رات کے اس پہر یہاں کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو؟" کومل نے جودت کو سرتاپا گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں تو لوفر، آوارہ ہوں، یقیناً اس وقت آوارہ گردی ہی کر کے آیا ہوں گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"لگ تو نہیں رہا کہ تم اس وقت آوارہ گردی کر کے آئے ہو؟"

"تو پھر کیا لگ رہا ہے آپ کو کہ کیا کر کے آیا ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"تھکے تھکے لگ رہے ہو، کیا بات ہے۔"

"آپ بتائیں آپ کیا کھوجنا چاہتی ہیں؟"

"یہی کہ آج تمہاری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟"

"آپ کے خیال میں میری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟" وہ اُلٹا اسی سے پوچھے جا رہا تھا۔

"کوئی لڑکی چھوڑ کر چلی گئی ہے تمہیں۔" کومل نے برملا کہہ دیا، وہ بہت بُری طرح چونک گیا تھا اس کا اندازہ کافی حد تک درست ہی تو تھا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"تمہاری چال بتا رہی ہے۔"

"کافی تیز نظر ہے آپ کی۔" وہ مسکرایا۔ "اسی بات کا تو رونا ہے۔" کومل نے سر جھٹک کر آہستگی سے کہا۔

"خیر یہ بتاؤ، کون چھوڑ گئی ہے اور کیوں گئی ہے؟" اس نے بات ٹال دی۔

"چھوڑ کر گئی بھی ہے اور نہیں بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ ابھی اسے صرف دیکھا ہے، ہیلو ہائے نہیں ہوئی، اگر ہیلو ہائے ہو جاتی تو اس طرح چھوڑ کر نہ جاتی۔" وہ ہنسہ کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟"

"یہی تو پتا کرنا ہے ابھی اور اسی سوچ نے تو چال کا رنگ بدل دیا ہے۔"

"اوہ..... تو معاملہ ابھی صرف نظروں تک ہے؟"

"نظروں تک نہیں، نظر تک ہے، صرف میری نظر تک، اک نظر کا معاملہ دوسری نظر تک پہنچے تو تبھی نظروں کا معاملہ کہلاتا ہے اور فی الحال اس کی نظر میری نظر کے ساتھ شامل نہیں ہے، لیکن ان شاء اللہ بہت جلد شامل ہو ہی جائے گی۔" جودت شرارت سے کہہ کر ہنسا تھا۔

"بڑا یقین ہے؟"

"ہاں..... کیوں نہیں، جسے خود پہ یقین نہ ہو وہ بھی کوئی آدمی ہے بھلا؟"

"اور تمہاری بات سن کے مجھے بھی ایک بات پہ یقین ہو گیا ہے۔" کومل نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیسا یقین؟"

"یہی کہ جس نے تم سے آج نظر نہیں ملائی وہ تم سے کل بھی نظر نہیں ملائے گی۔" کومل کے انداز میں یقین تھا جودت نے بے ساختہ ہنس دیا۔

"میں رُکا نہ دوسری لڑکی کی بات نہیں کر رہا، آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں بھی آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہی ہوں، اگر وہ واقعی..... نظر نہ ملانے والی شریف گھرانے کی لڑکی ہے تو۔" کومل نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"علامہ بھی ہے آپ کو کومل آپا۔"

"تم خود ہی تو کہتے ہو کہ میری نظر بھی تیز ہے اور اندازہ بھی درست ہے؟" کومل نے اسے جتایا تھا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بات درست ہی ہو؟" جودت مائنے کو تیار نہیں تھا۔

"او کے تو پھر ایسا کرنا جب وہ لڑکی تم سے نظر ملائے تم مجھے آ کر ضرور بتانا۔" کومل نے اسے ہلکا پھلکا چیلنج دیا۔

"او کے منظور ہے۔"

"اگر نہ ملائے تب بے شک نہ بتانا۔" اس نے اپنی طرف سے جودت کے سامنے راستہ رکھا۔

"ہوں۔" وہ صرف ہوں کر کے رہ گیا تھا۔

"اندر چلو ہے؟" کومل نے اندر جانے کے لیے پر تولے۔

"ہوں چلیں۔" وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے ثروت آنٹی تمہارا ہی پوچھ رہی تھیں۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"یہی کہ تم ابھی تک نہیں آئے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"تمہارے خیال میں کیا کہا ہوگا انہوں نے؟"

"نہ اچھا۔"

"ہاہاہا۔" کومل اس کے جواب پہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور حویلی کی پرسکون، خاموش دیواریں اس کی ہنسی کی جگمگاہٹ سے چند لمحے گنگنانے میں آواز کا شگاف پڑتا چلا گیا تھا۔

"تمہارا ابھی اندازہ درست ہے۔" اس کی بات پہ جودت بھی ہنس پڑا تھا۔

"او کے گڈ نائٹ۔" سیڑھیوں کے قریب جا کر وہ رک گیا تھا کومل نے پلٹ کر اسے دیکھا ایک ہاتھ سیڑھیوں کے لکڑی سے بنے موٹے سے ستون پہ تھا اور ایک قدم پہلی سیڑھی پہ۔

"کہاں چلے ہو اب؟"

"کچن میں۔"

"کیوں؟"

"بھئی کھانا کھانے اور کیوں؟"

"جہاں سے آرہے ہو، وہاں سے کھانا نہیں ملا؟" کومل نے خفگی سے کہا۔

"ملا تھا، لیکن میں نظر ملانے کے چکر میں کھانا کھانا بھول گیا تھا۔ جب ہوش آیا تب سارے مہمان کھانا کھا چکے تھے۔" جودت نے وجہ بتائی اور کومل خفگی سے گھورتی ہوئی اس کے پیچھے کچن میں ہی آ گئی۔

"بیٹھو..... میں کھانا نکال دیتی ہوں۔" اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور خود فریج کی طرف بڑھ گئی۔

"آج کل کیا مصروفیات ہیں موصوف کی؟" جودت نے ریموٹ اٹھا کر کارنر میں رکھا ٹی وی آن کر لیا۔

"موصوف؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ فریج سے سالن کا ڈونگا نکال کر پلٹی تو جودت سے پوچھا تھا۔

"اس گھر میں صرف ایک ہی "موصوف" ہیں، باقی سب تو لڑکے، لڑکیاں ہیں پیاری آپا۔" وہ چینل سرچ کرتے ہوئے کچن والی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے ان کی مصروفیات کی کیا خبر..... ؟ خبر تو تمہیں ہونی چاہیے، تم ان کے بھائی ہو۔" وہ اوون آن کرتے ہوئے بولی۔

"اب مجھ پہ اتنا بُرا وقت بھی نہیں آیا کہ میں اپنی گرل فرینڈز کو چھوڑ کر آپ کے موصوف کی خبر رکھنے لگوں، یہ کام آپ پہ ہی

بجتا ہے۔"

"مجھ پہ کیوں بجتا ہے؟ میرا کیا تعلق ان سے؟" اس نے بیگانگی اور لاپروائی ظاہر کی۔

"ارے تعلق کیوں نہیں ہے؟ آخر کزن ہیں آپ کے۔"

"وہ صرف میرے ہی کزن نہیں ہیں، اور بھی بہت سے کزنز ہیں ان کے۔" وہ سالن گرم کر کے قریب آ گئی۔

"اوہ اچھا تو آپ ان کو "صرف اپنا" دیکھنا چاہتی ہیں؟" جودت نے مطلب نکالا۔

"لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک حل ہے ان کو صرف اپنا دیکھنے کے لیے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے سنجیدگی سے بولا، کومل اسے مسلسل گھور رہی تھی۔

"ان کے ساتھ رشتہ بدل لیں، کوئی نیا رشتہ استوار کریں پھر وہ صرف ایک کے۔"

"جودت..... آرام اور خاموشی سے کھانا کھاؤ، رات کے اس پہر بھی تمہاری زبان ایسے چل رہی ہے جیسے دن ابھی شروع ہوا ہو۔" کومل نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"کیوں کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"کھانا کھا کر ٹی وی اور لائٹ بند کر دینا ورنہ صبح ڈانٹ پڑے گی، میں اب سونے کے لیے جا رہی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر کی سمت چل دی۔

"یہ کہیے کہ میں اب جاگنے کے لیے جا رہی ہوں۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"اب ایسی بھی نوبت نہیں آئی کہ میں کسی کے لیے اپنی نیندیں قربان کرتی پھروں۔" کومل نے پلٹ کر اسے جواب دیا تھا۔

"آ جائے گی نوبت، فکر نہ کیجیے۔" وہ بلند آواز سے بولا اور کومل مسکرا کر سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

♥

"واؤ..... بیوٹی فل۔" وہ روش پہ سلور کلر کی جگمگاتی کرولا دیکھ کر بے ساختہ خوش ہوئی تھی اور نبیل حیات اس کی خوشی دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"تھینکس گاڈ! تمہیں پسند تو آئی۔" اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"میں اسے ڈرائیو کر سکتی ہوں۔" وہ گاڑی کے قریب آ کر پوچھ رہی تھی۔

"وائے ناٹ....." نبیل حیات نے ہاتھ میں پکڑی چابیوں میں سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"واؤ تھینک یو۔" وہ خوشی سے بہت نارمل ری ایکٹ کر رہی تھی۔

"یو ویلکم۔" نبیل بے ساختہ مسکرایا اور مدیحہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو مدیحہ؟" فائزہ بیگم اچانک باہر آئی تھیں اور صبح صبح مدیحہ کو گاڑی سٹارٹ کرتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"لاہور کی سڑکوں پہ گاڑی اڑانے۔" اس نے شیشہ فولڈ کرتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔

"لیکن اس وقت اس حلیے میں۔" انہوں نے تعجب سے پوچھا مدیحہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اس نے ابھی تک اپنا ڈائیٹ ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر اور بے بی پنک ہاف سلیو ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ شیروں میں پنک کلر کی نرم سی قمیض چمک رہی تھی اور سیاہ گھنے گھنگریالے بال چہرے کا احاطہ کیے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے وہ اس کا حلیہ دیکھ کر جز بز ہو رہی تھیں۔

"کیوں اس حلیے کو کیا ہوا ہے؟" اس نے لاپروائی سے پوچھا۔

"لیکن مدیحہ! نائیٹ ڈریس نائیٹ ڈریس ہی ہوتا ہے۔ چینج کر لو، پھر چلی جانا۔" فائزہ بیگم نے اسے ٹوکا تھا۔

"مام پلیز! میرے فریش موڈ کو خراب مت کریں، جینز اور ٹاپ کے بجائے ٹراؤزر اور ٹاپ پہننے میں کیا حرج ہے؟"

"مگر مدیحہ۔"

"پلیز مام۔" اس نے ماں کو روک دیا کہ وہ مزید اعتراض نہ کریں۔

"لیکن جا کہاں رہی ہو؟"

"ول آور بھائی کے گھر۔" اس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ تو گھر پہ نہیں ہے۔" اب کی بار نبیل نے جواب دیا تھا۔
"کیا مطلب؟ کہاں ہیں وہ؟" وہ چونکی۔
"وہ کراچی گیا ہے کسی کیس کے سلسلے میں، چند دن میں آ جائے گا۔"
"مجھے تو نہیں بتایا انہوں نے؟"
"فون کیا تھا اس نے لیکن تمہاری نمبر بزی تھا اور اس کی فلائٹ کا ٹائم بھی ہو چکا تھا۔"
"گئے کب ہیں؟"
"کل شام کو، آج شاید اس کے کیس کی پہلی پیشی ہے۔"
"ہوں..... اوکے میں ان سے فون پہ بات کر لوں گی۔" وہ کہہ کے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی۔ اور جاتے جاتے ان دونوں کو ہاتھ بھی ہلایا تھا۔

لندن کی سڑکوں پہ تو اس نے بارہا ڈرائیونگ کی تھی لیکن آج اسے لاہور کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنے کا شوق ہو رہا تھا وہ بھی شاید اس لیے کہ نبیل، حمید اللہ اور دل آور اسے کئی بار یہ بات بتا چکے تھے کہ پاکستان کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنا جان جوکھم میں ڈالنے والی بات ہوتی ہے کیونکہ یہاں ٹریفک کا کوئی نظام نہیں ہے، کوئی قانون نہیں ہے، اسی لیے تو پاکستان میں ایکسیڈنٹ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے راستوں کا صحیح پتا نہیں تھا اسی لیے تو گاڑی بے سمت دوڑا رہی تھی لیکن یونہی بے ارادہ ہی ایک بڑی سوپر سٹور شاپ دیکھ کر اسے بوس کا احساس ہوا اور ناشتے کا خیال آیا تھا اور اسی خیال کے تحت اس نے گاڑی کو یکدم بریک لگائے تھے اس کی گاڑی کے ٹائر چرچرا کے رہ گئے۔ لیکن ساتھ ہی یکدم ایک "ٹھا" کی آواز اس کے ساتھ مدیحہ کی گاڑی میں اس کے رہ گئی تھی خود مدیحہ ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا کسی لڑکے نے اس کی گاڑی کو اپنی بائیک دے ماری تھی۔ وہ دیکھ کر غصہ سے بھرتی ہوئی خونخوار تیور لیے اپنی گاڑی سے نکل آئی اور گاڑی کے سامنے سے گھوم کر دندناتی ہوئی پیچھے کی طرف آئی تھی۔

"ایڈیٹ! اندھے ہو گئے ہو؟ تمہیں اتنی بڑی گاڑی دکھائی نہیں دی؟" سلوکی بائیک کو سنبھالتے عدیل نے اس تیز آواز پہ چونک کر اسے دیکھا۔ نظریں ٹھنک گئی تھیں۔ اس کے سامنے غضب کا حسن تھا یا غضب کی جوانی تھی وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

"کیا اب تمہیں سنائی بھی نہیں دے رہا؟" وہ جھلا کر بولی تھی۔

"لگتا آپ کی ہے مس! میرا تو کوئی قصور نہیں ہے؟" عدیل نے معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"میری مانگی؟ تم ہوش میں تو ہو؟ میں نے کہا تھا کہ میری گاڑی کو بائیک دے مارو؟"

"مس آپ نے یہ بات کہی نہیں ہے لیکن اس پہ عمل ضرور کیا ہے، بیچ سڑک میں اچانک بریک لگا کر اپنے ایکسیڈنٹ کے ساتھ ساتھ کی اور ایکسیڈنٹ کروانے کے مترادف ہے، ابھی تو شکر ہے کہ میرے پیچھے اور کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ ورنہ مجھے کچلتے ہوئے آپ کو بھی لڑا کے لے جاتی۔" عدیل نے اسے اچانک بریک لگانے کا نقصان بتایا۔

"مجھے نالومت، تم نے میری گاڑی کا نقصان کیا ہے۔ نقصان پورا کرو۔" اس نے چٹکی بجا کے اسے اشارہ کیا تھا۔

"اور جو میرا نقصان ہوا ہے وہ کون پورا کرے گا؟" عدیل بائیک کو دیکھ کر بولا۔

"آئی ڈونٹ نو، لیکن میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی، میری نئی نکور، زیرو میٹر گاڑی برباد کر ڈالی ہے تم نے۔"

"آپ کو کس نے کہا تھا کہ زیرو میٹر گاڑی لے کر صبح صبح روڈ پہ آ جائیں؟" عدیل آج خلاف مزاج بول رہا تھا۔

"مجھے زیرو میٹر گاڑی لے کر روڈ پہ آنے کے لیے کسی کی اجازت نہیں ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے تم۔" اس نے انگلی اٹھا کر غصے سے کہا تھا۔

"شٹ مجھ گیا، آپ دیکھنے میں ہی خدائی فوجدار لگ رہی ہیں، آپ کو بھلا کس کی اجازت کی ضرورت ہے؟"

"او شٹ اپ۔" وہ عدیل کے استہزائیہ انداز پہ سلگ اٹھی تھی۔

"کچھ اور نہیں کر سکتے تو بکواس بھی نہ کرو، میں تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی کہ تم کتنے پانی میں ہو؟ بس بائیک پہ ہوا خالی جھگیاں لے کر ہیرو بنے پھر رہے ہو، میرا نقصان بھلا کہاں سے پورا کرو گے؟" مدیحہ نے اس کو شرمندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''آپ کو غلط فہمی ہے میم! میں بائیک پہ سوار ہیرو بننے کی ہرگز کوشش نہیں کر رہا تھا۔ بس یہ بائیک کسی سے ایک دن کے ادھار مانگی تھی، وہی دینے جا رہا تھا کہ آپ بیچ میں آ گئیں، ویسے جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ امیر لوگ غریبوں پہ غصہ بھی نہ کریں تو اور کیا کریں؟ پھر انہیں امیر کہے بھلا؟ اور انسان کے غصے کا کیا ہے، کہتے ہیں کہ انسان کی تیوری کے تین بل تو نیند میں بھی نہیں جاتے، ہوش تو پھر ہوش ہے، انسان نیند میں ہو تب بھی غصے میں ہی رہتا ہے۔'' عدیل نے اسے جواب دیا تو وہ دنگ رہ گئی تھی وہ بائیک اٹھا کر سیدھی کرنے اور پھر اسے سٹارٹ کرتے ہوئے سوار ہو گیا تھا۔

''ایم سوری میم میری جیبیں اس وقت واقعی خالی ہیں۔ اگر بھری ہوتیں تو آپ کا نقصان کھڑے کھڑے ہی پورا کر دیتا۔ پھر بھی ٹکرائے گا تب آپ کا سارا نقصان پورا کر دوں گا اور آئندہ کوشش کروں گا کہ میری جیبیں بھری رہیں ورنہ کل کو آپ جیسی کوئی اور حسینہ غریبی کا طعنہ دے کر دھتکار دے گی۔'' وہ بائیک لے کر اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا مدیحہ ہکا بکا کھڑی تھی اگر اس نے اپنے قدم واپس موڑے ہی تھے کہ وہی بائیک اس کے قریب دوبارہ آ رکی تھی۔

''ایک بات کہنا تو بھول ہی گیا کہ آپ بے شک لندن پلٹ ہیں لیکن اپنے لندن پلٹ ہونے کا یوں پر چار تو مت کیجیے۔'' اس نے مدیحہ کے ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اس کا ٹاپ بے حد ٹائٹ تھا اور اس کے فرنٹ پہ بنے بڑے بڑے حروف میں یو کے لکھا ہوا جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا جیسے عدیل کو کیا تھا لیکن وہ نظر چرا گیا تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ یہ دیکھنے والا نظر چرا لیتا؟

''اصل یو کے تو پاکستانی بڑی مشکل سے دیکھ پاتے ہیں، لیکن اس یو کے کو ہر کوئی دیکھے گا، کسی کی نظر کو ڈیرے کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس لیے احتیاط کیجیے۔ اللہ حافظ۔'' وہ کہہ کے بائیک کو کک لگاتا ہوا ہو گیا اور مدیحہ غصے سے لال پڑتی تھی اس نے غصے کے اپنی ہی گاڑی کو ٹھوکر دے ماری تھی۔

''باسٹرڈ! سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ ایڈیٹ۔'' مارے غصے کے جو اس کے منہ میں آیا کہتی گئی۔

♥

کسی نئی جگہ پہ سونے کی وجہ سے رات بھر نیند کا تسلسل نہیں بن سکا تھا وقفے وقفے سے نیند ٹوٹتی رہی اسی لیے وہ فجر کے وقت ہی اٹھ گیا تھا؛ ہیلے ڈھالے قدموں سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اس کا ارادہ باہر گیٹ تک جانے کا تھا اسی لیے ارد گرد سائیڈ میں بنے کوارٹرز اور وسیع لان عبور کر کے روش پہ آیا تو قدم تھم گئے تھے گاڑیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور اس قطار میں ایک مرسڈیز یوں جگمگا رہی تھی جیسے ابھی شوروم سے لا کر کھڑی کی ہو۔ اس کی چمک دمک ہی نرالی تھی۔

''یہ علیزے بی بی کی نئی گاڑی ہے، رات ہی شوروم سے آئی ہے، تم ہی نے یہ گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔'' مبارک خان اس کے عقب سے نکل کر سامنے آیا تو اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسی لیے اس گاڑی کا تعارف کروا دیا تھا۔

''یعنی زیرو میٹر ڈرائیو کروں گا؟'' منصور حسین مسکرا کر بولا۔

''بالکل جی، عیش ہیں تمہارے۔'' مبارک خان نے کندھے اچکائے۔

''پرائی چیز پہ عیش کیسے یار؟'' اس نے گاڑی کی ونڈ اسکرین پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بے شک پرائی ہے لیکن اختیار تو تمہارا ہی چلے گا نا؟ تمہارے پاس رہے گی تو تمہاری ہی نظر آئے گی۔''

''چل یار دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے۔'' منصور حسین سر جھٹک کر ہنسا اور مبارک خان کے ساتھ گیٹ سے نکل آیا تھا۔

''السلام علیکم۔'' چوکیدار عارف نے ان دونوں کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟'' منصور حسین بڑی تمیز سے پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر سا کہا۔

''لگتا ہے ناراض ہو مجھ سے؟'' اس کی بات پہ مبارک خان مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

''میں نے کیوں ناراض ہونا ہے بھلا؟'' عارف نے کندھے اچکائے۔

''چلو جو بھی ہے ایسا کرو کہ پچھلی خفگی والی باتوں کو بھول کر آج سے دوستی کر لیتے ہیں، اب تو ہم لوگوں نے ساتھ ہی رہنا

منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''ہوں یہ بھی اچھی بات ہے، عارف کرلو دوستی منصور حسین دل کا بُرا نہیں ہے، بس غصے کا اور زبان کا تیز ہے۔'' مبارک خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور عارف نے جز بز ہوتے ہوئے منصور حسین سے ہاتھ ملا لیا تھا۔

''شاباش۔'' مبارک خان نے اسے تھپکی دی۔

''مبارک خان۔'' آذر جاگنگ کے لیے نکلا تو گیٹ پہ آج پھر ان لوگوں کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

''جی صاحب؟''

''یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے۔''

''کچھ نہیں صاحب، ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں تو باہر ذرا تازہ ہوا کھانے کے لیے آ گئے۔''

''تازہ ہوا کھانے کے لیے تم لوگوں کو گیٹ کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ملی؟'' اسے ان سب کا گیٹ پہ کھڑے ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔

''صاحب ہم پارک تک جانے والے تھے کہ عارف کو دیکھ کر اس کے پاس رک گئے۔'' مبارک خان صفائی پیش کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے جہاں جانا ہے جاؤ، لیکن یہاں لوفروں کی طرح کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آس پاس کے لوگ دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟'' آذر نے اسے جھڑک دیا تھا۔

''جی صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔'' مبارک خان نے سر جھکا کر کہا۔

''ہوں جاؤ۔'' اس نے سر ہلایا اور پھر ذرا ٹھہر کر انہیں دیکھا۔

''تم کو..... ادھر آؤ۔'' اس نے ان دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا تھا۔

''تم کون ہو؟'' آذر نے چند روز پہلے بھی اسے گیٹ پہ دیکھا تھا لیکن نام بھول گیا تھا۔

''جی..... میں منصور حسین ہوں۔''

''کون منصور حسین؟''

''علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور ہے، منصور حسین۔'' مبارک خان ہر بار اس کی مشکل آسان کر دیتا تھا۔

''علیزے کا ڈرائیور؟'' آذر کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''لیکن علیزے کا ڈرائیور.....'' آذر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

''بڑے صاحب نے اسے کام پہ رکھا ہے، علیزے بی بی کی حفاظت کے لیے پستول بھی دیا ہے۔''

''ہیں..... یہ سب کیا چکر ہے؟'' آذر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''ہم جائیں صاحب؟''

''ہوں۔'' وہ مچل سر ہلا کے رہ گیا تھا۔ منصور حسین اور مبارک خان چلے گئے جبکہ آذر جاگنگ پہ جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اندر آ گیا تھا اس کا رُخ آفی اور ڈیڈ کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ دستک دے کر اجازت ملنے کا انتظار کرنے لگا۔

''یس کم ان۔'' وقار آفندی کی آواز سنائی دی تھی آذر دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام، خیریت تم اس وقت یہاں؟'' انہیں صبح صبح آذر کو اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔

''جی خیریت ہی ہے، آپ آرام سے تیاری کر لیں میں انتظار کر لیتا ہوں۔'' وہ صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

''میری تیاری ہوتی رہے گی۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟'' وہ اپنا کوٹ اور ٹائی بیڈ پہ ڈال کے اس کے سامنے آ بیٹھے۔

''آپ نے علیزے کے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟''

''ہوں..... رکھ لیا ہے۔''

''مطمئن ہیں آپ؟''

''آف کورس بیٹا مطمئن ہوں تبھی تو رکھا ہے۔''

''لیکن ڈیڈ ایم سوری میں مطمئن نہیں ہوں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''غیر مطمئن ہونے کی وجہ؟''

''بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں، آپ بس اسے فارغ کریں، ہم کوئی اور ڈرائیور رکھیں گے۔'' آذر کے لہجے میں خفگی اور ناگواری تھی۔

''تو وہ وجوہات بیان کرو نا بیٹا! بغیر کسی ٹھوس وجہ کے میں اسے نہیں نکال سکتا، کام پہ رکھا ہے اسے، زبان دی ہے، کل سے آیا ہوا ہے، حویلی میں رات گزار چکا ہے، اب صبح اٹھ کر بغیر کسی وجہ کے میں اسے کہہ دوں کہ ہم تمہیں کام پہ نہیں رکھ سکتے، تم جاؤ، بستر سمیٹو اور چلتے پھرتے نظر آؤ، کیا یہ سب اچھا لگے گا؟'' انہوں نے آذر کو سمجھانے کی کوشش کی اور آذر انہیں سمجھانے کی کوشش میں تھا۔

''دیکھیے ڈیڈ! میں جوان جہان مرد کو کام پہ رکھنے کے حق میں نہیں ہوں گھر میں جوان بیٹیاں ہیں اور علیزے... کیا وہ کبھی اس کے ساتھ آیا جایا کرے گی؟'' اس کی ایک وجہ سن کر وقار آفندی بے ساختہ مسکرا دیے تھے۔ انہیں اس کی بات سمجھ آ گئی تھی کہ اصل مسئلہ منصور حسین کی جوانی ہے۔

''دیکھو بیٹا میں نے اسے اسی لیے کام پہ رکھا ہے کہ وہ 'جوان جہان مرد' ہے، اگر خدانخواستہ پھر علیزے پہ کوئی حملہ ہو جاتا ہے تو وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ تو کر سکتا ہے نا؟ خیر وہ بابا بوڑھے اور کمزور تھے انہیں تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ حملہ آور ہی انہیں اٹھا کر ہسپتال لے جا رہا ہے، منصور حسین جوان اور بہادر مرد ہے، میں نے اس کی چند باتوں سے اسے جج کیا ہے وہ بے خوف اور نڈر ہے، مشکل وقت پہ گیا تو بھلے گا نہیں، ڈٹ جائے گا تم بے فکر رہو، رہی بات اس کے جوان ہونے کی تو ایک بات یاد رکھو شریف اور ایماندار آدمی کا جوانی کبھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور وہ مجھے ایماندار لگا ہے۔'' وقار آفندی نے آذر کو تفصیل سے سمجھاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

''ڈیڈ! کسی کے ماتھے پہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ایماندار ہے۔''

''لیکن بیٹا! ایماندار کی آنکھوں میں ضرور لکھا ہوتا ہے کہ وہ ایماندار ہے، ایماندار کی آنکھ کبھی نہیں جھکتی میں نے منصور حسین کی نظر جھکتے ہوئے نہیں دیکھی۔''

''آپ اس کے اتنے حامی کیوں ہو رہے ہیں؟''

''بیٹا! اس کے خلاف ہونے کی وجہ بھی تو نہیں ہے۔''

''گویا آپ اسے کام سے نہیں نکالیں گے؟''

''یقیناً۔'' ان کے جواب پہ آذر لب بھینچے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

''مبارک خان کو کام پہ رکھتے ہوئے بھی تمہیں ایسے ہی وہم اور اعتراض ہوئے تھے اور آج وہی مبارک خان ہے جس پہ تم تمام ملازموں سے زیادہ اعتماد ہے اور اس کے بغیر ہمارے سارے کام ادھورے ہیں۔'' وقار آفندی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا تھا۔

''لیکن ڈیڈ۔''

''پلیز مائی سن! چند روز اس کا کام دیکھو، اس پہ چیک رکھو، پھر کچھ لگے تو بے شک کام سے نکال دینا، بس چند دن میری زبان کا پاس رہنے دو۔'' انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ آذر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''وقار! اتنا لیٹ کیوں ہو گئے ہیں آپ؟ ناشتہ لگ چکا ہے، علیزے اور.....'' آسیہ آفندی اپنے دھیان میں بولتی ہوئی اندر آئی تھیں لیکن ان کے ساتھ آذر کو دیکھ کر رک گئی تھیں۔

''گڈ مارننگ۔'' آذر نے آہستگی سے انہیں وش کیا۔

''ٹو یو مائی سن، کیا بات ہے تم اس وقت یہاں؟'' وہ صبح صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پریشان ہوئی تھیں۔

''ڈونٹ وری! کسی کام سے آیا تھا، او کے ڈیڈ چلتا ہوں اب۔'' آذر نے آسیہ آفندی سے کہہ کر وقار آفندی سے کہا تھا۔

''اور ناشتہ؟'' آسیہ آفندی نے پیچھے سے آواز دی۔

''جی میں آ رہا ہوں بس شاور لے کر تیار ہو جاؤں۔'' اس نے پلٹ کر جواب دیا اور باہر نکل گیا تھا۔

''وقار کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی، کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' آسیہ آفندی کو بھی اب ہر وقت کھٹکا سا لگا رہتا تھا۔

"ارے اس نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کوئی بات نہیں ہے، بس کسی کام سے آیا تھا۔" وہ اپنی ٹائی اٹھا کر آئینے کے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے، آج ان کی میٹنگ تھی اسی لیے کافی اہتمام سے تیار ہو رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"اگر تم ایسا سمجھ رہی ہو تو ایسا ہی سہی۔" وہ ذرا متبسم سے انداز میں بولے تھے۔

"وقار! میں واقعی پریشان ہو رہی ہوں۔" انہوں نے خفگی سے کہا تھا۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ وقار آفندی کی بیوی اتنی بیوقوف اور کم عقل بھی ہو سکتی ہے؟" وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آسیہ آفندی کی طرف پلٹے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ناسمجھی سے دیکھ رہی تھیں۔

"کم عقل خاتون! اگر علیزے کے حوالے سے کوئی پریشانی والی بات ہوتی تو کیا میں تمہیں اس طرح بے فکر اور ریلیکس نظر آتا۔" انہوں نے آسیہ آفندی کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر جس قدر پرسکون انداز میں کہا وہ واقعی مطمئن ہو گئی تھیں۔

"شکر ہے اللہ کا ورنہ میں تو ڈر گئی تھی۔"

"کم عقل جو ہو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"محبت کم عقل بنا دیتی ہے۔" آسیہ آفندی کہہ کر پیچھے ہٹ گئیں اور وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے تھے وہ پیچھے ان کا کوٹ اور بریف کیس بھی اٹھا کے لے آئی تھیں۔

♥

وہ ڈیکوم سے قالین اور کارپٹ صاف کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ باہر ڈور بیل بجنے لگی، کچن میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ مختصر سا کوریڈور عبور کر کے بیرونی مین ڈور کے پاس آ گئی اور ہول سے دیکھتے ہوئے باہر جھانکا تھا۔ سامنے نگارش کا چہرا نظر آیا تھا زری کھل اٹھی تھی اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا تھا۔

"بھائی۔" اس نے نگارش کو اندر بھی نہ آنے دیا اور وہیں اس سے لپٹ گئی تھی۔

"اللہ خیر کرے، کیا ہو گیا ہے؟ اتنی بے قرار کیوں؟" نگارش نے حیرانی سے اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"آئی ریئلی مس یو۔" زری نے بچوں کی طرح بڑی معصومیت سے اظہار کیا تھا۔

"ریئلی؟" نگارش نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"آف کورس۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یقین تو نہیں آ رہا۔" نگارش بے یقینی سے کہتی ہوئی اندر آ گئی عبداللہ اسے گھر ڈراپ کر کے کام پہ چلا گیا تھا۔

"بے یقینی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"جو بندہ ہر وقت ہر لمحہ، ہر آن کسی ایک کی یاد میں قید رہتا ہو، اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے لیے اس قید کے حصار سے باہر آیا ہوگا؟ اسے ایک یاد سے فرصت ملے گی تو وہ دوسرے کو نام دے گا نا؟" نگارش سچ ہی تو کہہ رہی تھی، لیکن جھوٹی تو زری بھی نہیں تھی۔ اس نے حقیقتاً اسے بہت مس کیا تھا۔

"یعنی میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں؟" زری کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

"خیر جھوٹ تو تم نہیں بول رہیں، لیکن سچ ماننے پہ دل آمادہ بھی نہیں ہے۔" نگارش نے کندھے اچکائے۔

"جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔" وہ ناراضی سے پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔

"ارے میری جان! اس میں ناراضی والی کیا بات ہے؟ جو سچ ہے وہی تو کہا ہے، تم اسے یاد کرتی ہو تو اپنا آپ بھول جاتی ہو، پھر کیسے ممکن ہے کہ تمہاری یادوں کی راہ گزر سے ہم فریبوں کا بھی گزر ہو سکے؟" نگارش نے آ کر اس کے رخسار کو چھو کر اسے چھیڑا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بھائی! جو مقام آپ کا ہے، وہ صرف آپ کا ہے، محبت اپنی جگہ اور رشتے اپنی جگہ اور ضروری نہیں کہ جس راہ گزر سے ایک گزرے اس سے دوسرا نہ گزرے، آخر راہ گزر کا نام کیا ہے؟ راہ گزر۔ یعنی اس سے کوئی بھی گزر سکتا ہے، سب کے

لیے یکساں ہوتی ہے، آپ گزرو، وہ گزرے، کوئی اور گزرے، بس فرق اتنا ہے کہ کبھی کبھی کوئی گزرنے والا اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ جاتا ہے وہ بھی ایسا ہی گزرنے والا ہے جو اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ گیا ہے۔" زری دھیمے سے بول رہی تھی اور نگارش اس کی بات کی گہرائی میں کھوئی گئی تھی۔

"کتنا خوش قسمت ہے دل آور شاہ۔" نگارش کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"بھابی؟" زری یوں بدحواس دل اس کا نام سن کر لرز گئی تھی۔

"کب تک چھپاؤ گی پگلی؟"

"جب تک وہ چھپے گا۔"

"وہ ساری عمر چھپے گا تو؟"

"تو میں ساری عمر چھپاؤں گی۔"

"زری کبھی گہرائی میں جا کر سوچا ہے تم نے کہ اگر کبھی خلاف آرزو کچھ ہو گیا تو؟" نگارش نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"تو دیوانہ موجی کی زلیخا بھی یاد ہے مجھے۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"سیانے جب کسی کو سیانا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔" زری نے سر جھکا کر نگارش اس کی بات پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم ہوش میں تو ہو؟"

"آپ جانتی بھی ہیں کہ جب وہ میرے حواسوں پہ طاری ہوتا ہے تو میرے ہوش میرے ساتھ نہیں رہتے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی۔

"کسی سے اندھا دھند محبت کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ جس سے تم محبت کرتے ہو، وہ کس سے محبت کرتا ہے، آپ سے؟ یا آپ کے کسی رقیب سے؟" نگارش نے سمجھانے کے لیے دلیل دی۔

"وہ میرے سوا کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"اتنا یقین کس بات پہ ہے؟"

"میں نے اس کی کاٹ دار آنکھوں کو کئی بار اپنے لیے جھکتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہارے احترام میں جھک جاتی ہوں؟"

"ہر گز نہیں، وہ میری محبت کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔"

"تو پھر ابھی تک اس نے کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی؟" نگارش وہموں میں پڑی ہوئی تھی۔

"شاید اس لیے کہ اسے پتا ہے کہ زری صرف اسی کی ہے، جب بھی ہاتھ بڑھائے گا کھنچی چلی آئے گی۔" آج زری کی سرشاری اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ میرے پیچھے کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟" نگارش اسے بغور دیکھتی ہوئی پاس چلی آئی تھی۔ زری نے بے ساختہ پلکیں جھکائی تھیں۔

"آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" زری نے الیکٹرک کیتل آن کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... یعنی واقعی کوئی بات ہوئی ہے؟" نگارش کو سگنل مل گیا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہوئی بھابی جی۔"

"کوئی تو بات ہوئی ہے نند جی، سرخ ہونٹوں پہ گلابی تبسم محبوب کی کسی ادا کی نشانی معلوم ہوتا ہے، خاموش ہونٹوں پہ مسکراہٹ بے معنی نہیں ہوتی۔" نگارش نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ سامنے کیا تھا۔ زری نہ پلکیں اٹھا سکی اور نہ ہی اپنی مسکراہٹ روک سکی تھی۔

"بتاؤ بھی۔" اس نے اصرار کیا۔

"اس کا فون آیا تھا۔"

"ہیں؟" نگارش اُچھل پڑی تھی۔

"کب؟"

"دو دن پہلے۔"

"فون کس لیے آیا تھا؟ کیا کہا اس نے؟"

"کہا تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ مدیحہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"مدیحہ بات کرنا چاہتی ہے، کیا مطلب ہے اس کا؟"

"مدیحہ اور نبیل اس کے ساتھ ہی تھے، مدیحہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اپنا سیل نہیں تھا اس لیے مدیحہ نے اس کے نمبر سے مجھے کال کی، اتنی دیر میرا سیل بجتا رہا اور اسکرین پہ اس کا نام جگمگاتا رہا، میں دیکھتی ہی رہی اور کال بند ہوگئی، پھر اس نے دوبارہ کال کی، میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیو کی تو دوسری طرف وہی بھاری گمبھیر آواز تھی جو دل کے نہاں خانوں میں ہر لمحہ گونجتی رہتی ہے۔" زری اس کا ذکر نہیں کرتی تھی درد کرتی تھی ایک دن میں لاکھوں بار۔

"بس اتنی سی بات تھی؟" نگارش مایوس ہوگئی۔

"یہ اتنی سی بات ہے؟"

"تو اور کیا بات ہے؟" نگارش گھور کے بولی۔

"بہت کچھ ہے میرے لیے، میں نے اس کی اور اس نے میری آواز تو سنی ہے نا؟"

"صرف آواز سنی ہے، بات تو نہیں کی نا؟"

"بات کا کیا ہے، وقت ہم دن میں ہزاروں بار کرتے ہیں۔" وہ آہستگی سے مسکرائی۔

"اف ایک تو تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کرو گی۔" نگارش نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"بھابی امت تو آپ نے بھی کی ہے، ایسا پاگل پن آپ پہ کیوں سوار نہیں ہوا؟" وہ معصومیت سے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

"کیونکہ میں تمہاری جیسی بیوقوف نہیں تھی۔"

"میں بیوقوف ہوں؟" زری آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"تو سیانی کہاں سے ہو۔"

"کیا سے۔" اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"اوے توبہ کرو تم عینیں، میں ہاری، جلدی سے چائے لے آؤ، میرا سر درد کرنے لگا ہے۔" نگارش اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری اس کے انداز پہ یکدم کھلکھلا کر ہنسی تھی اور دو کپوں میں چائے انڈیل کر باہر اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

"میری محبت کے تذکرے پہ آپ کا سر درد کرنے لگا ہے؟" وہ اسے کپ تھماتی ہوئی بولی۔

"تمہاری محبت آگے نہیں بڑھ رہی، کب سے یہی سوچ سوچ کر سر درد کرنے لگا ہے، کوئی نشوونما نہیں ہو رہی اس کی۔" نگارش کی بات پہ زری کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"یہ کیا چیز ہے تشبیہ دے دی میری محبت کو۔" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بچے سے۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"بچہ پیدا ہوتا ہے، محبت بھی پیدا ہوتی ہے، بچہ آنکھیں کھولتا ہے تو دنیا کو دیکھتا ہے، محبت آنکھیں کھولتی ہے تو محبوب کو دیکھتی ہے بچہ دنیا کو دیکھ کر روتا ہے، واویلا کرتا ہے، محبت محبوب کو دیکھ کر مسکراتی ہے، لجاتی ہے، پھر بچہ بڑا ہونے لگتا ہے، پھر محبت بھی بڑھنے لگتی ہے، بچہ سالوں میں بڑا ہوتا ہے، محبت دنوں میں بڑھتی ہے، دونوں کے قد نکلنے لگتے ہیں، پاؤں پاؤں چلنے لگتے ہیں، بچے کی ضرورتیں بڑھتی ہیں اور محبت کی خواہشیں بڑھتی ہیں دونوں کو دیکھو تو ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں، ضدی بھی اور معصوم بھی۔ بچوں کی نشوونما رک جائے تو فکر ہو جاتی ہے، ڈاکٹرز کو دکھاتی ہیں، ان کی خوراک بڑھاتی ہیں۔ اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں تمہاری محبت کی نشوونما رکی ہوئی ہے، اس کو ڈاکٹر کو دکھاؤ اور خوراک بڑھاؤ۔" نگارش نے اسے طویل مثال دی اور ساتھ میں مشورہ مفت۔

کون ڈاکٹر؟" زری نے تابی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر دل آور شاہ۔"

"واٹ؟ ڈاکٹر دل آور شاہ؟"

"آف کورس یار! بے شک وہ وکیل ہے لیکن تمہارے مرض کا وہی ڈاکٹر ہے، اسے اپنی محبت کا مرض دکھاؤ، تکلیف ہوتی ہے وہ خوراک بڑھا دے گا، باہمی مشورے سے بڑا فائدہ ہوگا تمہیں دیکھ لینا۔"

"بھابی کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تمہارا علاج شروع کیا جائے۔"

"علاج؟"

"مطلب شادی۔" نگارش نے علاج کے لفظ کا مفہوم بتایا۔

"مگر بھابی۔"

"بس کوئی اگر مگر نہیں، میں آج عبداللہ سے ضرور بات کروں گی۔"

"لیکن ابھی یہ سب مناسب نہیں ہے بھابی۔" زری پریشان ہو اٹھی۔

"غیر مناسب بھی نہیں ہے، محبت کے کسی بھی معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، تمہیں کیا پتا، محبوب کتنے جلد باز ہوتے ہیں۔" نگارش نے اسے سمجھایا تھا۔

"مگر وہ بی بی جان اور بابا جان؟" زری متفکر تھی۔

"ان کو عبداللہ ہینڈل کر لیں گے، ڈونٹ وری، نرائی تو کرنے دو، عبداللہ بھلا اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟" نگارش کی بات پر وہ جز بز ہوتی، چپ ہو گئی تھی وہ مطمئن نہیں تھی جبکہ نگارش نے ارادہ باندھ لیا تھا۔

"بتول آنٹی سے بھی بات کروں گی۔"

"آپ ہوش میں تو ہیں؟ ان سے کیا بات کرنی ہے؟" وہ بدک گئی۔

"یہی کہ وہ بیٹے کی شادی کے معاملے میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے کیوں بیٹھی ہیں؟"

"بھابی! ان کا بیٹا ہے، وہ بہتر جانتی ہوں گی کہ کب کیا کرنا ہے؟"

"ان کا بیٹا ہماری بیٹی کے دل کا چور ہے، ہمارا ہونے والا داماد ہے، ہم کیوں نہ بات کریں اس کے بارے میں؟" تھوڑی دیر پہلے نگارش اسے سمجھا رہی تھی اور اب خود اس کے ساتھ مل کر سہانے خواب سجانے میں مدد کر رہی تھی۔ داماد کے لفظ پہ زری شرما گئی تھی۔

"اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گئی تو کیا انعام دو گی؟" نگارش شرارت اور معنی خیزی سے پوچھ رہی تھی۔

"اپنے دس تولے کے نگلن آپ کی کلائیوں میں سجا دوں گی۔" زری نے سرشاری سے کہا۔

"واؤ پھر تو بیٹھے بٹھائے امیر ہو جاؤں گی۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"ویسے یار آپس کی بات ہے آج کل دس تولے کے نگلن تھی مالیت کے ہوں گے۔" نگارش نے رازدارانہ انداز میں کہا اور زری اس کے انداز پہ ہنس پڑی تھی، نگارش اب پتا نہیں کیا کیا منصوبے بنا رہی تھی۔

آج صبح اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی اسی لیے نماز کا وقت لیٹ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی وہ عجلت میں اٹھی اور سیدھی واش روم میں چلی گئی۔ جلدی جلدی وضو کیا اور قضا نماز ادا کرنے کھڑی ہو گئی تھی لیکن گہری نیند سے اچانک ہڑبڑا کر اٹھنے اور فوری طور پہ فریش ہونے کرنے سے اس کی طبیعت پہ برا اثر پڑا تھا چند منٹوں میں ہی اسے چھینکیں شروع ہو گئی تھیں اور چھینکوں کے ساتھ زکام کے اثرات بھی اُجاگر ہونے لگے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً تھوڑی دیر اور بستر میں لیٹ کر آرام کر لیتی، لیکن وہ پہلے ہی لیٹ اٹھی تھی آج کالج بھی جانا تھا اس لیے مزید لیٹ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ جیسے تیسے ہی عجلت کالج کے لیے تیار ہونے لگی یونیفارم پہنا، سینڈل پہنے، اسکارف لینا، اپنا سارا بیگ چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر نیچے آ گئی، لیکن چھینکوں نے ابھی بھی اس حال کر رکھا تھا کچھ ہی دیر میں آنکھیں اور ناک سرخ ہو گئی تھیں اور اس کی یہی حالت دیکھ کر ڈائننگ روم میں موجود نگارش پریشان ہو گئی

پریشان ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟" وقار آفندی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"ڈونٹ وری پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں، بس وہ شاید ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی وجہ سے فلو ہو گیا ہے۔" وہ ٹشو سے اپنی ناک پونچھتی ہوئی انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"آنکھیں اور ناک یہ چھینک ہوئی انہیں کیا تھا؟ رجو ادھر آؤ۔" وہ پریشانی سے غصے میں آ گئے تھے۔

"ٹھنڈے پانی سے کیوں؟" رجو نے گیزر آن نہیں کیا تھا؟ رجو ادھر آؤ۔" وہ پریشانی سے غصے میں آ گئے تھے۔

ہنس کو کے پاپا! تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی، رجو کو گیزر آن کرنے سے میں نے ہی منع کیا تھا۔ موسم چینج ہو چکا ہے، اب گرم پانی اچھا نہیں لگتا۔" علیزے نے رجو کی بچت کرا دی ورنہ واقعی اس کی شامت آ جاتی، موسم چاہے جیسا بھی ہوتا علیزے کو زیادہ ٹھنڈا پانی سوٹ نہیں کرتا تھا اور رجو آج گیزر آن کرنا بھول گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلا لوں؟ میڈیسن سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی؟" پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"پاپا! ایم فائن، پلیز کول ڈاؤن۔" اس نے ان کا بازو تھام لیا تھا۔

"بیٹھیے اور ناشتہ کیجیے۔" اس نے انہیں کرسی پہ بٹھا دیا اور خود بھی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی تھی۔

"آج ناشتے میں جوس مت لو، ہاف بوائل انڈے کے ساتھ ڈرائی کیک یا شہد لے لو۔" وقار آفندی اپنا ناشتہ بھول کر اس کے ناشتے کی فکر میں تھے۔

"نہیں ملک ٹھیک ہی ٹھیک ہے۔ آچھ۔" کہتے کہتے اسے چھینک بھی آ گئی۔

"لیکن بیٹا؟"

"تو پاپا! پلیز موڈ نہیں ہے۔" اس نے لجاجت سے کہا اور پھر رجو کو ملک ٹھیک لانے کا آرڈر دیا تھا۔

"جی ابھی لے کر آئی۔" رجو پلٹ گئی تھی۔

"اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کالج مت جاؤ، کل چلی جانا۔" آذر نے بھی لب کشائی کی تھی، کومل نے بے ساختہ پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ اسے دیکھ رہا تھا اس کا من جل اُٹھا، رومیں رومیں میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔

"نہیں ..... آج بہت اہم کلاسز ہیں، میں اپنی فرینڈ کو بتا چکی ہوں کہ آج میں کالج آ رہی ہوں۔" اس نے انکار کر دیا۔

"تو پھر اپنا بہت سا خیال رکھنا بیٹا! چھوٹی سی تو ہو، ہمیں تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔" اسرار آفندی تاکید کرتے ہوئے مسکرا کر بولے تھے اور کومل وہاں سے جلتی بھنتی ہوئی سب سے پہلے اُٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد اسرار آفندی اور احمد بھی چلے گئے علیزے بھی جوس ختم کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہیں۔" آذر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تھوڑی دیر کے لیے پک اینڈ ڈراپ لے کر اپنی عادت نہیں بگاڑ سکتی، میری گاڑی اور میرا ڈرائیور تیار ہیں میں چلی جاؤں گی، آپ فکر نہ کریں، گڈ بائے۔" وہ آہستگی سے مسکرا کر کہتی ان سب کو ہاتھ ہلا کر باہر نکل آئی۔

"میرا بیگ؟" اس نے پلٹ کر رجو کو دیکھا۔

"جی میں گاڑی میں رکھ آئی ہوں۔" اس کا بیگ گاڑی تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی رجو کی تھی۔ علیزے سر ہلا کر کوریڈور کی سمت بڑھ گئی۔ طویل و عریض کوریڈور عبور کر کے باہر نکلی تو اپنی گاڑی کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی اور بہت سی گاڑیوں میں بلیک مرسڈیز اسے دور سے ہی نظر آ گئی تھی وہ روش کا اتنا لمبا راؤنڈ لے کر گاڑی تک پہنچی اور گاڑی کا ڈور کھولنے کے لیے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا جو گاڑی کی پشت پہ بازو ٹکائے اس کی سمت پشت کیے نجانے کس سوچ میں غرق تھا کہ آواز ہی نہ سن سکا۔ اور وہ دوبارہ پکارنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

"ڈرائیور۔"

♥♥♥

علیزے کی آواز دوبارہ پکارنے کی وجہ سے ذرا تلخی لیے ہوئے تھی، جبکہ اپنی سوچ، اپنے دھیان میں گم منصور حسین نسبتاً آواز پہ یکدم چونک کر پلٹا تھا اور گاڑی کی چھت کے اوپر ہی سے گاڑی کی دوسری سائیڈ میں کھڑی اس "پھولن دیوی" کو دیکھا جس کا وہ پچھلے کئی دنوں سے مبارک خان، وقار آفندی، آذر، آسیہ آفندی، چوکیدار اور خیرو بابا کے منہ سے سنتا آرہا تھا اور اس ذکر میں جتنی شدت، جتنی محبت، جتنی عزت ہوتی تھی کہ کئی بار بلاوجہ ہی منصور حسین کا اسے دیکھنے کو دل چاہا تھا کہ آخر وہ چیز کیا ہے؟

اور آج..... اس لمحے اسے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ واقعی اس چیز کا حق رکھتی تھی کہ بڑی حویلی کا ہر فرد ہی اس کا ذکر کرتا ہر اسے ہی چاہتا اور وقار آفندی اسے چھپا چھپا کے اور سینت سینت کے رکھتے اور ہر وقت انہیں اسی کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا، یہ لگتا تھا جیسے اللہ نے اسے بڑی فرصت اور بڑے اہتمام سے بنایا تھا اور اسے بنانے کے بعد خوبصورتی کے تمام در بند کر دیے تھے۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے اللہ نے بلکش کا سارا خزانہ اسی پہ لٹا دیا ہو اور اس خزانے کی چمک دمک ہر دیکھنے والی آنکھ کو خیرہ کر دیتی تھی۔ اسے ٹھہر کر دیکھنے والے منصور حسین کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ اسے جو بھی دیکھتا تھا اسی طرح ٹھہر جاتا تھا۔

"دروازہ کھولو۔" علیزے کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی اسے لوگوں کا اپنی طرف دیکھنا اور یوں ٹھہر کر دیکھنا سخت ناگوار گزرتا تھا۔

"ڈرائیور! میں نے کہا دروازہ کھولو۔" علیزے نے اسے متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر خفگی سے جھنجلا کر کہا تھا۔

"کون سا دروازہ؟" منصور حسین کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

"گاڑی کا دروازہ۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔

"اوہ اچھا..... گاڑی کا۔" منصور حسین اچھی اور خوبصورت چیز دیکھ کر خوش بھی ہوتا تھا اور سراہتا بھی تھا لیکن مرعوب اور فریفتہ نہیں ہوتا تھا چاہے وہ چیز کتنی ہی خاص کیوں نہ ہوتی؟ یہی وجہ تھی کہ وہ علیزے کو دیکھ کر خوش بھی ہوا تھا اور سراہا بھی تھا لیکن مرعوب اور فریفتہ نہیں ہوا تھا جبھی سر جھٹک کر سیدھا ہوا اور گھوم کر اس کی سائیڈ پہ آیا اور گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا تھا۔

"پلیز۔" اس نے مؤدب سے انداز میں علیزے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، علیزے اس کی سمت دیکھے بنا آگے بڑھ کے گاڑی میں بیٹھ گئی اور منصور حسین اس کی سائیڈ کا دروازہ بند کر کے اپنی سائیڈ میں آیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کی تھی حویلی کا بڑا سا گیٹ فوراً ہی کھل گیا تھا گاڑی پانی میں تیرتی مچھلی کی طرح پھسلتی ہوئی گیٹ عبور کر گئی تھی۔ مرسڈیز ڈرائیو کرتے ہوئے منصور حسین اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھ رہا تھا اور اسی لیے بہت مگن بھی ہو رہا تھا ڈرائیونگ میں تو اسے ویسے ہی بہت مہارت تھی اسی لیے اسے کوئی پرابلم نہیں ہوئی تھی اتنی ٹریفک کے باوجود وہ گاڑی نکال لے گیا تھا وہ بہت سرشار اور جھومتا ہوا اس کے گیٹ تک پہنچا تھا لیکن جیسے ہی اس نے بریک لگائے وہ یکدم ٹھٹک گیا تھا اس کے ساتھ ہی آذر آفندی کی گاڑی نے بھی بریک لگائے تھے۔

"صاحب! آپ یہاں؟" وہ گاڑی پارک کر کے نیچے اترا تھا۔

اتنے میں آذر بھی اپنی گاڑی سے نیچے آ گیا۔

"کیوں میرے آنے پہ پابندی ہے؟" آذر نے اسے گہری استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"ارے نہیں صاحب! پابندی کیوں ہے بھلا؟ آپ سو بسم اللہ کر کے آؤ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ کوئی کام تھا تو مجھے ہی کہہ دیتے؟" منصور حسین نے کندھے اچکائے۔

"یہ کام تمہیں کہنے والا نہیں تھا نا، میں نے علیزے کی مجبوریز سے ملنا ہے، اس لیے آنا پڑا۔"

"ہوں..... یہ واقعی آپ والا کام ہے، پڑھے لکھے لوگوں والا، یہ میرے والا نہیں ہے۔" منصور حسین نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر علیزے کی سائیڈ کا دروازہ کھول دیا تھا وہ بھی نیچے اتر آئی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" آذر نے چھوٹتے ہی علیزے سے اس کی طبیعت پوچھی تھی اور اس سے پوچھنے پہ بے ساختہ ہی منصور حسین کی نظر بھی علیزے کی سمت اٹھ گئی کہ آخر اس کی طبیعت کو کیا ہوا ہے؟ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے وہ اس کی آنکھوں کی سرخی اور نمی نہیں دیکھ سکا تھا جو زکام اور چھینکوں کی مرہون منت تھی البتہ چھوٹی سی ستواں ناک پورے چہرے میں سرخ نظر آ رہی تھی۔

"کچھ بہتر ہوں اب....." وہ آہستگی اور نرمی سے بولی تھی۔

"چلو اندر چلیں۔" آذر نے کالج کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" وہ ٹھٹک گئی۔

"ہاں..... بس کام تھا۔"

"کس سے کام ہے آپ کو؟" وہ اُلجھن آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارے مجبوریز سے۔"

"میرے مجبوریز سے کیوں؟"

"علیزے! کیوں اتنے سوال کر رہی ہو؟"

"آپ مجھے صاف بتاتے جو نہیں۔" وہ پل میں پریشان نظر آنے لگی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے میری جان، پلیز تم پریشان مت ہو، میں تو بس ایسے ہی چلا آیا ہوں۔" آذر نے علیزے کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے اس کا رخسار تھپکا تھا اور چار قدم کے فاصلے پہ گاڑی سے اپنی پشت ٹکائے کھڑا منصور حسین حیرانی اور تعجب سے ان کی اتنی اپنائیت دیکھ رہا تھا۔

"آذر بھائی! مجھے پتا ہے آپ بلاوجہ نہیں آ سکتے ضرور کوئی بات ہے۔" علیزے چڑیا کا سا دل رکھتی تھی جو پل میں سہم بھی جاتا تھا اور خوف زدہ بھی ہو جاتا تھا وہ پریشانی سہہ نہیں پاتی تھی۔

"میری جان! میری جان! میں پہلے بھی تو تمہارے مجبوریز سے کئی بار ملنے آیا ہوں؟ آج کوئی پہلی بار تو نہیں آیا؟"

"نہیں..... آپ ہمیشہ اسی وقت مجبوریز سے ملنے کے لیے آتے ہیں جب کوئی بات ہوتی ہے۔" وہ مانے کو تیار نہیں تھی۔

"اُف میری جان! کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو؟" آذر نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"کیونکہ آپ مجھ سے باتیں چھپاتے ہیں تاکہ میں پریشان نہ ہو جاؤں۔" آذر اس کی معصومیت پہ مسکرا دیا تھا آف وائیٹ اسکارف کے ہالے میں لپٹا اس کا چہرا ابھی بہت معصوم لگ رہا تھا آذر کو بے ساختہ اس پہ پیار آیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے کندھے سے تھام کے آگے بڑھا لیکن علیزے کی نظر بے ساختہ ہی روڈ کی اس سمت اٹھی تھی جس طرف اس کی گاڑی پہ فائرنگ ہوئی تھی اور ایک دم سے اس کی نظروں میں وہ منظر تازہ ہو گیا تھا اس نے بے اختیار آذر کا بازو دبوچ لیا تھا۔

"علیزے! کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ اس کی زرد پڑتی رنگت بھانپ چکا تھا۔

"کک..... کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اس طرف کیا ہے؟" آذر نے اُلجھ کر پوچھا۔

"وہ..... وہ اس روز..... فائرنگ..... وہ خیر و بابا....." اس کے الفاظ بے ربط ہو رہے تھے اور آذر اس کے خوف زدہ لہجے پہ گہری سانس کھینچ کے رہ گیا تھا اس نے اپنے قدم روک لیے تھے۔

"اس سے بہتر ہے کہ تم کالج کے بجائے گھر چلو، جب طبیعت اچھی طرح ٹھیک ہو گئی تب آ جانا۔" اس نے علیزے کی حالت کے پیش نظر حل ڈھونڈا۔

"گھر.....؟"

"ہاں..... واپس گھر۔"

"نن..... نہیں واپس گھر نہیں، مجھے کلاسز اٹینڈ کرنی ہیں۔" اسے ایک دم سے اپنی کلاسز کا بھی خیال آ گیا تھا۔

"تو کیا تم نے اس حالت میں کلاسز اٹینڈ کرنی ہیں؟" آذر نے اشارہ کیا، اس کی پیشانی پہ باریک سے موتیوں کی طرح کے قطرے چمک رہے تھے۔ علیزے نے بے ساختہ اپنی پیشانی کو چھو کر دیکھا تو انگلیوں کی پوریں نم ہو گئی تھیں اس نے جلدی سے اپنے بیگ سے ٹشو نکالا اور اپنی پیشانی کے ساتھ ساتھ پورا چہرا ٹشو سے تھپتھپا ڈالا تھا اور ساتھ ہی اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ایم فائن۔" اس نے بڑی ہمت کر کے خود کو پرسکون ظاہر کیا تھا۔

"اوکے..... تو پھر جاؤ۔"

"کیا مطلب؟ آپ نہیں آئیں گے۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"تمہارے لیکچرز سے پھر کبھی مل لوں گا، ابھی آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔" اس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن آذر بھائی۔"

"ڈونٹ وری یار..... تم جاؤ میں تب تک یہیں کھڑا ہوں۔" آذر نے اسے بچوں کی طرح بہلا کر تسلی دی اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ علیزے پورا دن یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہے گی کہ وہ اس کے لیکچرز سے کیوں ملنے کے لیے آیا ہے؟" اس سے بہتر کہ وہ آج لیکچرز سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا سو اس نے کر دیا تھا۔ وہ چند سیکنڈ کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر دل کڑا کر کے تیز قدم اٹھاتی گیٹ کے اندر غائب ہو گئی تھی اور آذر بھی چند سیکنڈ وہیں کھڑا رہا پھر پلٹ کر اپنی گاڑی کی سمت آ گیا لیکن ڈور لاک کھولتے ہوئے منصور حسین پہ نظر پڑی تو وہ دوبارہ پلٹ کر اس کے قریب آ گیا تھا۔

"سنو منصور حسین....."

"جی صاحب جی، حکم....." وہ فوراً گاڑی سے پشت ٹکا کر سیدھا ہوا تھا۔

"علیزے کا خیال رکھنا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے منصور حسین کو باقاعدہ قریب آ کر تاکید کی تھی۔

"میں خیال کیسے رکھ سکتا ہوں صاحب! وہ کالج کے اندر ہیں اور میں باہر..... میرے خیال رکھنے کی ذمہ داری گیٹ سے شروع ہوتی ہے۔" منصور حسین اپنی عادت سے مجبور تھا، اس لیے کھرا کھرا جواب دیا تھا۔

"ہوں..... یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو، وہ نہیں کال ریسیو کرے تو تم اسے فوراً حویلی لے جانا، پھر میرے نمبر پہ اطلاع کر دینا۔" آذر نے تحمل سے اسے سمجھایا۔

"جی بہتر ہے صاحب! جیسے آپ کا حکم۔" اس نے مؤدب سے انداز میں سر خم کیا تھا۔

"اور ہاں..... واپسی پہ تم اسے اوپر والے روڈ سے لے کر گھر جانا، وہ اس راستے سے تھوڑی خوفزدہ ہے، ہو سکتا ہے کہ پریشان ہو جائے، اس لیے بہتر ہے کہ چند روز اس راستے سے آنا جانا چھوڑ دیں۔" آذر دائیں طرف کے روڈ کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے صاحب! لیکن صاحب ہم ابھی ابھی تو اسی روڈ سے گزر کے آئے ہیں؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ شاید بے دھیانی میں تھی اسی لیے اس نے نوٹس نہیں لیا تھا، لیکن اب اس کا دھیان ہو چکا ہے وہ یونہی پریشان ہوتی رہے گی اس لیے بہتر ہے کہ ہم ہی کوئی احتیاط کر لیں۔" آذر سمجھداری سے کام لے رہا تھا۔ منصور حسین نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے صاحب! جو آپ کا حکم، میں آئندہ اوپر والے راستے سے ہی آیا جایا کروں گا۔" اس کے لب اسے سعادتمندی ڈھل چکی تھی۔

"ہوں..... شاباش..... یہ رکھ لو، پانی وغیرہ پی لینا۔" آذر نے جیب سے والٹ نکال کر دیکھا اور چند سرخ نوٹ

کل کر منصور حسین کے ہاتھ پر رکھ دیے منصور حسین کی مضبوط چوڑی ہتھیلی پہ وہ نوٹ بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔
"کیا کہتے ہے صاحب؟" وہ ان سرخ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"یہ کیا ہے صاحب؟" وہ ان سرخ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"آج کام پہ تمہارا پہلا دن ہے یقیناً تمہارے پاس جیب خرچ بالکل بھی نہیں ہوگا، تنخواہ تو مہینے بعد ملے گی، پورا مہینہ کیسے گزرے گا؟" آذر نے پورے مہینے کا سوچ ڈالا تھا منصور حسین کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔
"کیا اس سے پورا مہینہ گزر جائے گا؟" وہ اپنی ہتھیلی پہ رکھے نوٹ دیکھ کر بولا۔
"پورا مہینہ تو نہیں البتہ پورا دن ضرور گزر سکتا ہے، تم آج کا دن گزارو، کل کا دن کل دیکھا جائے گا۔" آذر اتنی نرمی بھی برت سکتا ہے یقین نہیں آرہا تھا۔
"لیکن صاحب یہ تو تنخواہ کے اوپر کے پیسے ہوئے نا؟ میں یہ نہیں لے سکتا، بڑے صاحب کو پتا چلے گا تو کیا سوچیں گے؟ میں ایمانداری اور حق حلال کی کمائی کھانا چاہتا ہوں۔" اس نے انکار کر دیا۔
"ارے یار! اس میں بے ایمانی کہاں سے آگئی؟ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، جب تمہیں تنخواہ ملے گی تب نہیں دو گے۔" آذر نے کندھے اچکائے وہ اس سے اصرار کر رہا تھا مجبوراً منصور حسین کو وہ پیسے رکھنے پڑے تھے آذر اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ نوٹ دیکھتا رہ گیا۔
اسے واقعی بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ حویلی کے تمام فرد حقیقتاً اتنے اچھے ہیں؟ وقار آفندی سے لے کر آذر آفندی تک۔

♥

سلو جیسی اور چھوٹا بھی تھوڑی دیر پہلے ہی ورکشاپ میں آئے تھے اور آتے ہی ورکشاپ کی صفائی ستھرائی میں لگ گئے، کانچ کہ ہر شے اور ورکشاپ صاف تو نہیں ہو سکتا تھا البتہ وہ ان حصوں کی جھاڑ پونچھ ضرور کر لیتے تھے جہاں انہوں نے دن بھر اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا، سلو نے پرانے کپڑے سے پونچھ کر رکھیں، جھاڑو دیا، کولر میں تازہ پانی بھر کے برف ڈالی اور کولر کو دوبارہ اس کے پرانے جگہ پہ رکھ دیا، اب اس کولر سے انہوں نے دن بھر پانی پی پی کر اپنی پیاس بجھانی تھی..... وہ بھی اپنے انہی چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھے جب سلو کی بائیک پہ سوار عدیل ورکشاپ میں داخل ہوا تھا اور کشاپ کی دائیں دیوار کے ساتھ ہی بائیک پارکنگ کے لیے اتر آیا لیکن بائیک لاک کرنے کے بعد وہ ان کی طرف نہیں آیا تھا بلکہ وہیں کھڑا بائیک کو غور سے جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور وہ تینوں اس کی ایسی حرکت پہ اسے دیکھنے لگے۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے پاس نہیں آیا تو وہ خود اس کے پاس چلے آئے تھے اور بڑی حیران نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
"سلام استاد۔" ان تینوں نے کورس میں سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔" عدیل چونک گیا تھا۔
"کیا بائیک کی داڑھی مونچھ نکل آئی ہیں، یا بائیک کو پر لگ گئے ہیں جو اتنے غور و فکر سے دیکھ رہے ہو۔" چھوٹے نے بائیک کو دیکھتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔
"بائیک کی داڑھی مونچھ نہیں نکلی، بلکہ ٹوٹ گئی ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔
"کیا مطلب؟ کیا ٹوٹ گئی ہے؟" چھوٹا نا سمجھی سے بولا۔
"داڑھی مونچھ۔" عدیل نے بائیک کے سامنے والے حصے کی سمت اشارہ کیا بائیک کی سامنے والی ایکسٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔ سلو کے ساتھ ساتھ چھوٹا بھی بدک گیا تھا آخر سلو سے بائیک چھوٹے نے سیکھنا لگی تھی وہ بھی اپنی کارستانی پہ۔
"یہ کیا ہوا ہے؟" چھوٹا صدمے سے پوچھ رہا تھا۔
"ٹکر ہو گئی تھی۔"
"کس سے ٹکر ہو گئی تھی؟"
"ایک لڑکی سے۔"
"کیا؟ لڑکی سے؟" وہ تینوں کے تینوں اچھل پڑے تھے۔
"ہاں لڑکی سے ہوئی ہے۔" عدیل بے دلی سے بولا۔

''کب؟ کیسے ہوئی؟'' وہ بائیک کے نقصان کا صدمہ بھول کر اب اس لڑکی کے بارے میں بڑے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے۔

''یار زیرو میٹر گاڑی تھی اس کے پاس، بڑی اسپیڈ سے جا رہی تھی، اچانک نجانے اسے کیا ہوا کہ اس نے بڑی تیزی سے گاڑی کو بریک لگا دیئے، میں اس کے پیچھے ہی جا رہا تھا مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے بریک لگا دیا، میں نے بائیک کو بڑی مشکل سے کنٹرول میں کیا تھا لیکن بچتے بچتے بھی ٹکر ہو گئی۔'' عدیل پریشانی سے بتا رہا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟'' سلو نے زبان کا تالا کھولا۔

''پھر کیا ہونا تھا؟ اکٹاوہ مجھ پہ گرم ہونے لگی کہ میں نے ٹکر ماری ہے، اپنی تو غلطی ہی نہیں گن رہی تھی۔'' عدیل کو ہنسی کر ایک بار پھر غصہ آیا تھا۔

''وہ سچی تھی اور صحیح گرم ہو رہی تھی، ٹکر تو تم نے ہی ماری تھی ناں استاد۔'' چھوٹے نے مسکراتے ہوئے شرارت سے بات دہائی۔

''مجھے کیا ضرورت تھی ٹکر مارنے کی، بریک تو اس نے لگائے تھے نا؟'' عدیل نے صفائی دی۔

''تھی کیسی؟'' سلو نے بھرا پور کشائی کی..... عدیل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا وہ بڑے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بول رہا تھا۔

''چنتی مالا جیسی تھی۔'' اس نے جل کر جواب دیا۔

''ہیں واقعی؟''

''دوبارہ ملی تو دکھاؤں گا تمہیں۔''

''استاد! یہ کیوں نہیں کہتے کہ دوبارہ دیکھی تو ملواؤں گا تمہیں؟'' سلو نے خفگی سے کہا اور عدیل اس کے انداز پہ ہنس پڑا تھا۔

''بہت ذلیل لوگ ہو تم، چلو اپنا کام کرو۔''

''کام کیسے کروں؟ مجھے تو اپنی اس منحوس بائیک پہ غصہ آ رہا ہے۔'' سلو نے اپنی بائیک کو خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے واقعی جاندار چیز ہو۔

''کیوں؟ غصہ کیوں آ رہا ہے؟'' عدیل نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''پانچ سال ہو گئے ہیں مجھے اس منحوس کو چلاتے ہوئے لیکن مجال ہے جو کسی حسینہ کی گاڑی سے ٹکرائی ہو، یا کوئی حسینہ اس سے ٹکرائی ہو..... آج ایک دن کے لیے کسی کو دی تو جھٹ سے ٹکرا گئی، دل چاہ رہا ہے لوہے کا ڈنڈا اٹھاؤں اور سالی کو توڑ کے رکھ دوں۔'' سلو نے غصے سے تلملا کر کہتے ہوئے بائیک کو پاؤں سے ٹھوکر دے ماری تھی اور وہ بھی یکدم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

''ٹھہر، تجھے ڈنڈا میں لا کر دیتا ہوں۔'' جیدی نے سلو کا کندھا تھپکا۔

''کیوں تجھے بڑی جلدی ہے؟'' سلو گھور کے بولا۔

''تو اور کیا؟ میں نے سوچا شاید غصے میں تم کوئی اچھا کام ہی کر دو۔'' جیدی نے کندھے اچکائے۔

''اپنی چیز کو توڑ پھوڑ کرنا اچھا کام ہے کیا؟'' سلو ہنوز اسے گھور رہا تھا۔

''بالکل اچھا کام ہے، اب دیکھو نا ہم لوگ روز سائیکل پہ آتے ہیں اور استاد خیر سے بسوں کے دھکے کھاتا ہوا آتا ہے کیونکہ بڑے ٹھاٹھ سے بائیک پہ آتا ہے، کمبخت بائیک چلاتا ہی اتنی احتیاط سے ہے کہ جیسے بائیک درد کر رہی ہو؟ کسی حسینہ سے ٹکرائے گا خاک؟'' جیدی نے کھڑے کھڑے سلو کے لتے لے ڈالے تھے۔

''تو کیا تیرا خیال ہے کہ کسی حسینہ سے ٹکرانے کے چکر میں خود ہسپتال پہنچ جاؤں۔'' سلو نے دوبدو پوچھا۔

''تو یہ کہو نا کہ بائیک چلاتے ہوئے ڈرتے ہو، بلکہ ڈر ڈر کے چلاتے ہو۔'' جیدی نے اس کا مذاق اڑایا سلو لاجواب ہو گیا تھا۔

''دیکھ استاد! یہ جان بوجھ کر مجھ سے پنگا لے رہا ہے۔'' سلو نے دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے عدیل کو بھی درمیان میں گھسیٹ لیا تھا۔

"بس..... بس یہ معاملہ یہیں ختم کرو اور چلو کام شروع کرو۔" عدیل نے بیچ بچاؤ کروانا چاہا۔
"آج کے لیے تو چھوڑ رہا ہوں لیکن آئندہ شکل بگاڑ دوں گا اگر کچھ کہا۔" سلو اپنی طرف سے تڑی دکھا رہا تھا وہ تینوں مسکراہٹ دبا گئے۔
"شکریہ جناب شکریہ! جان بخشی کے لیے شکریہ۔" جیدی نے ہنستے ہوئے آداب پیش کیا تھا۔
"جیدی! بچ جاؤ گے۔"
"بچ گیا ہوں جناب! تم بس یہ فکر کرو کہ تمہاری بائیک جس حسینہ سے ٹکرائی ہے وہ بھلا کیسی ہوگی؟" آخر زیرو میٹر ڈرائیو کر رہی تھی وہ؟ کسی امیر کبیر گھرانے کی ہوگی؟" جیدی نے سلو کی سوئی پھر دوسری سمت میں پھیر دی۔
"ارے ہاں استاد! بتاؤ نا، کیسی تھی وہ حسینہ۔" وہ عدیل کی طرف متوجہ ہوا اور عدیل کی نظروں میں تھوڑی دیر پہلے ٹکرانے والی حسینہ (مدیحہ) کا سراپا گھوم گیا تھا اور اس کے سراپے کے ساتھ ساتھ اس کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ عدیل ان سب کے سامنے نقشہ نہیں کھینچ سکتا تھا۔
"کیا استاد؟ سوچ میں پڑ گئے ہو۔" چھوٹے نے ٹہوکا دیا۔
"نہیں یار! کچھ نہیں، کام کرو اپنا۔"
"ہم نے تم سے کچھ پوچھا ہے استاد! کیسی تھی وہ حسینہ؟" وہ اصرار کرنے لگے۔
"ارے مجھے کیا پتا یار کیسی تھی وہ؟ اس نے مجھے کھری کھری سنائیں، میں نے اسے کھری کھری سنا دیں، بس بات ختم، وہ اپنے اور میں اپنے رستے۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکا دیئے تھے۔
"اس طرح بات ختم کیسے ہوتی ہے استاد..... اس طرح تو بات شروع ہوتی ہے، تم اس کی کھری کھری باتوں کو یاد کرو گے اور وہ تمہاری کھری کھری باتوں کو سوچ کر ہنستی رہے گی، پھر تم اس کے رستے اور وہ تمہارے رستے، منزل دونوں کی ایک ہی ہوگی۔"
چھوٹے نے ان کی ملاقات بلکہ ٹکراؤ کا سارا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا۔
"بڑے خوش فہم ہو تم لوگ..... ؟" عدیل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔
"تم یہاں کے پاس خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ ہوتا بھی تو نہیں۔"
"لیکن یار اتنی خوش فہمی بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا کہ غریب کسی شہزادی کو اُٹھا کر اپنی جھونپڑی میں سجانے کے خواب دیکھنے لگے۔" عدیل کے اعتراض کیا۔
"خدا کسی غریب کی لڑکی کو اُٹھا کر محل میں سجا سکتا ہے تو کسی شہزادی کو اُٹھا کر جھونپڑی میں بھی بٹھا سکتا ہے۔" چھوٹے کی بات پر عدیل لاجواب ہو کے رہ گیا تھا۔
"وہ وقت اور ہوتے تھے جب ایسے معجزے رونما ہوتے تھے، یہ وقت، یہ زمانہ اور ہے اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" عدیل نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔
"وہ وقت اور اس لیے ہوتے تھے کہ اس وقت لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا تھا، ایمان کو مضبوط رکھ کے اللہ سے کچھ مانگتے تھے تو حتمی طور پر وہ مل جاتا تھا کیونکہ اس کے بندوں کا اس پہ ایمان مضبوط ہوتا تھا، یقین ہوتا تھا اللہ کی ذات پہ..... لیکن اب اس زمانے میں ایسا کچھ اس لیے نہیں ہوتا کہ اب لوگوں کے ایمان کمزور پڑ گئے ہیں، اللہ کی ذات پہ یقین اور بھروسہ نہیں رہا، اللہ سے کچھ مانگتے بھی ہیں تو بے یقین ہو کر..... تو پھر ایسے میں اللہ معجزے کرے بھی تو کس کے لیے..... ؟ کمزور ایمان والوں کے لیے..... ؟ بے یقین لوگوں کے لیے..... ؟ ان کے لیے جنہیں اس پہ بھروسہ ہی نہیں ہے؟"
چھوٹے نے بولنا شروع کیا ان سب کی حیرت سے آنکھیں کھل گئی تھیں کہ اتنی بڑی بڑی اور گہری باتیں کرنے والا چھوٹا ہی ہے۔
"استاد! اس وقت کوئی غریب کسی شہزادی کو چاہتا تھا تو اپنی چاہت کی "حد" کر دیتا تھا یہاں تک کہ اک دن وہ شہزادی اپنا محل چھوڑ کے اس کی جھونپڑی میں آنے پہ مجبور ہو جاتی تھی اور اسی طرح اگر کسی شہزادے کو محبت ہو جاتی تھی تو وہ اپنی محبت

اپنے عشق میں مزدور بن جاتا تھا صرف ایک لڑکی کی خاطر..... غریب جھونپڑی والی لڑکی کی خاطر....." اس نے اک اک بات کہہ کر بیان کی جیسے اس پہ سب بیت چکا ہو۔

"اوئے چھوٹے یہ عشق و محبت کی پٹی کہاں بیٹھ کے پڑھتا رہا ہے تُو.....؟" جیدی نے حیرانی سے پوچھا۔

"عشق و محبت کی پٹی اللہ سب کو ماں کے پیٹ سے ہی پڑھا کے بھیجتا ہے، بس فرق اتنا ہے کہ کسی کو یہ پٹی زبانی یاد ہو جاتی ہے اور کوئی بھول جاتا ہے، مجھے یاد رہ گئی، اور تم بھول گئے۔" چھوٹے نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور آگے بڑھنے لگا کہ نظر پڑی تو رُک گیا تھا۔

"دیکھو استاد! شہزادی کو چاہو یا شہزادے کو لیکن اتنا چاہو کہ وہ اپنے مقام سے ہٹنے پہ مجبور ہو جائیں، خود چل کے تمہارے پاس آجائیں۔" چھوٹے نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جب مجھے کسی کی چاہت ہوئی نا؟ تو ضرور تم سے مشورہ کروں گا۔" عدیل نے بات کا رُخ بدلنا چاہا۔

"مجھ سے مشورہ بے شک نہ کرنا لیکن ایک بار فرصت سے بیٹھ کر اپنے دل سے مشورہ ضرور کر لینا، دل نہ مانے تو میرے پاس رجوع کرنا..... اپنے دل و دماغ سے ایک میٹنگ ضرور رکھنا، اکثر چاہت اور محبت کے معاملے میں یہ دونوں اک دوسرے کے حلیف ہو جاتے ہیں دونوں جنگ اختیار کر لیتے ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ دونوں کو پہلے سے کنوینس کر لیا جائے۔" چھوٹا روانی سے بول رہا تھا عدیل نے چونک کر دیکھا۔

"تمہاری انجوکیشن کیا ہے؟" عدیل کو اس کی باتوں سے کچھ شک ہوا تھا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟" چھوٹا انجان بنتے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو، یہ کیا ہوتا ہے؟" عدیل نے زور دے کر کہا۔

"جانتا ہوتا تو یہاں ہوتا؟" اس نے ورکشاپ کی چار دیواری کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

"میں بھی تو یہاں ہی ہوں۔" عدیل نے اپنی مثال دی۔

آئے ہیں کتنے سکندر تم سے پہلے بھی یہاں
کھا گئی اپنی زمین یہ کیسے کیسے آسماں

چھوٹا ہنستے ہوئے بلند آواز میں گنگناتا ہوا اس سے تھوڑا دور ہٹ گیا تھا "یار چھپا کیوں رہے ہو؟ بتاؤ نا کیا انجوکیشن ہے تمہاری؟" عدیل کو تجسس ہو رہا تھا۔

"کیا فائدہ اس انجوکیشن نامی چیز کا؟ بس اس پاکستان میں یہ بھی کافی ہے کہ ایک ورکشاپ میں دن بھر کام کرو، گالیاں کھاؤ، ہتھوڑے مار مار کے مرمت کرو اور شام کو چار پیسے مل جائیں تو شرافت سے گھر لے جاؤ، آخر کو ہمارے گھر والے بھی دن ان چار پیسوں کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں، پیٹ کا دوزخ بھی تو بھرنا ہوتا ہے نا؟" چھوٹا لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"مگر یار....."

"چھوڑو استاد اس اگر مگر کو، تُو میری ڈگری نہ پوچھ، میں تیری ڈگری نہیں پوچھتا، بس چلا چل....." اس نے دونوں ہاتھ اُٹھانے کے ساتھ ساتھ سر بھی ہلکا تھا اور بالآخر عدیل کو بھی اس اصرار کا دامن چھوڑنا پڑا تھا البتہ اسے افسوس ضرور ہوا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں لیکن یہاں تو سب کے سب ہی قسمت کے مارے، بیچارے رو رہے تھے، جس کو بھی ٹٹولا جاتا اندر سے یہی ہوتا تھا۔

♥

اس کی گاڑی دیکھ کر چوکیدار نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا تھا گاڑی فراٹے بھرتی اندر آ رکی تھی۔ اس نے بریک پیڈل پہ ٹائر بڑے زور سے چرچرا کے رہ گئے تھے۔ اور گارڈوں کی یہ چرچراہٹ اندر ڈائننگ روم تک سنی گئی تھی وہ گاڑی کا دروازہ دھڑام سے بند کرتی ہوئی اندر کی طرف بڑھی تھی وہ ابھی تک اندر ہی اندر کھول رہی تھی اور ابھی تک اس آدمی کو گالیوں سے نواز رہی تھی جس نے اس کی گاڑی سے بائیک کو ٹکر ماری تھی۔

"مدیحہ! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟" نبیل اپنا ناشتہ ادھورا چھوڑ کے ڈائننگ روم سے نکل آیا تھا وہ کوریڈور کراس کر کے

اپنے بیڈ روم میں جا رہی تھی۔
"کچھ نہیں ہوا۔" اس نے سر جھٹکا۔
"کچھ تو ہوا ہے؟" نبیل اس کے چہرے کی سرخ رنگت سے ہی اس کے غصے کو بھانپ چکا تھا۔
"میں اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔" وہ خفگی سے کہہ کر سیڑھیوں کی سمت بڑھی۔
"مدیحہ....." نبیل نے دوبارہ اسے پیچھے سے آواز دی لیکن وہ رُکی نہیں تھی سیدھی اوپر چلی گئی۔ نبیل کا دل چاہا وہ اس کے پیچھے اوپر جائے لیکن اسے پتا تھا فی الحال وہ غصے میں ہے کوئی بات ہوئی بھی تو نہیں بتائے گی۔
"کیا بات ہے؟ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ مدیحہ کہاں ہے؟" فائزہ بیگم بھی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں۔
"پتا نہیں کیا ہوا ہے؟ گھر سے تو ٹھیک ٹھاک گئی تھی، واپسی پہ غصے میں لگ رہی ہے؟" نبیل نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔
"تم نے پوچھا نہیں اس سے؟ کسی سے لڑ جھگڑ تو نہیں؟" فائزہ بیگم کو کسی اور خدشے نے ستایا تھا۔
"پوچھا تو ہے لیکن اس نے بتایا نہیں کہ کیا ہوا ہے؟" وہ متفکر ہو رہا تھا۔
"خیر جو بھی ہے، پتا چل ہی جائے گا تم ایویں ٹاشن نہ کرو۔" انہوں نے اسے ڈائننگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا تھا۔
"بس اب جھوک نہیں ہے، صرف جوس کا گلاس دے دیں۔" اس نے کھڑے کھڑے ان سے جوس مانگا تھا۔
"ہونہہ اس لڑکی نے تو ہماری بھوک پیاس اُڑا کے رکھ دی ہے، نہ وہاں چین لینے دیا، نہ یہاں چین لینے دے گی۔" انہوں نے جھنجلا کر کہتے ہوئے گلاس میں جوس اُنڈیلا اور نبیل کی سمت بڑھا دیا۔
"مام پلیز..... اس کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کریں وہ اور بھی ضدی اور چڑچڑی ہو جاتی ہے۔"
"کیوں نہ کہوں؟ تم ہر وقت اسی کے لیے ہلکان اور پریشان ہوتے رہتے ہو اور وہ ہے کہ اسے پروا ہی نہیں ہوتی۔"
"کوئی بات نہیں مام! اس کا حق بنتا ہے کہ وہ اپنی ضدیں منوائے، مجھ سے چھوٹی ہے وہ۔" نبیل نے نرمی سے کہا۔
"اور ویسے بھی اگر میں اس پہ غصہ کروں گا تو تکلیف آپ کو ہی ہوگی، یاد ہے نا اس دن آپ ہی بیچ بچاؤ کرانے آ گئی تھیں۔" نبیل نے مسکراتے ہوئے انہیں وہ رات یاد دلائی جب وہ مدیحہ پہ غصہ ہو رہا تھا اس روز وہ نشے کی حالت میں گھر آئی تھی۔
"میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم اس پہ ہاتھ اُٹھاؤ، میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اس پہ اپنی گرفت مضبوط رکھو، اتنا غصہ کرو کہ وہ بغیر اجازت کے ایک قدم بھی نہ اُٹھائے۔"
"ہاہاہا..... آپ ماں ہیں نا، اس لیے غصے میں بھی نرمی کا پہلو رکھنا چاہتی ہیں، اپنی دے میری کوشش یہی ہے کہ میری گرفت اس پہ مضبوط رہے، لیکن اس مضبوط گرفت کے لیے غصہ کرنا ضروری نہیں ہے، اس کے لیے تو پیار بھی کافی ہوگا دل آوری سے میں نے کیں تو سیکھا ہے، وہ گرفت رکھتا ہے لیکن پیار سے۔" نبیل نے مسکرا کے کہا۔
"ہوں..... اچھی بات ہے۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
"اوکے میں چلتا ہوں تھوڑی دیر تک واپس آ جاؤں گا۔" وہ وال کلاک دیکھتے ہوئے بولا۔
"کہاں جا رہے ہو؟"
"بس اپنے کاروبار کے سلسلے میں کچھ معلومات اکٹھی کرنا چاہتا ہوں۔"
"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" انہوں نے بیٹے کو دعا دی اور وہ اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل آیا تھا لیکن اپنی گاڑی نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے تھے اس نے فوراً اپنی گاڑی کا شیشہ فولڈ کر کے مدیحہ کی گاڑی دیکھی تھی۔ اس کی گاڑی کی بیک سائیڈ پہ ڈینٹ پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر نبیل کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔
"مدیحہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" وہ پریشانی سے بڑبڑاتا ہوا اپنی گاڑی سے نکل آیا تھا اور اس کی گاڑی کو گھوم پھر کر آگے پیچھے سے دیکھا تھا اس کا پچھلا حصہ متاثر ہوا تھا نبیل بے ساختہ واپس گھر کے اندر چلا آیا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا؟ واپس کیوں آ گئے؟" فائزہ بیگم اپنے بیڈ روم کی سمت جاتے ہوئے ٹھٹک کے رُک گئیں۔
"مدیحہ سے کچھ کام ہے۔" اس نے سرسری سے انداز میں کہہ کر اپنی پریشانی ان سے چھپانی چاہی۔
"کیسا کام؟ خیریت تو ہے؟" وہ پھر بھی اس کی پریشانی بھانپ گئی تھیں۔

''میں مدیحہ سے مل لوں، پھر بتاتا ہوں آپ کو۔'' وہ ان سے کہہ کے اوپر آ گیا تھا مدیحہ کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دی اور اجازت کا انتظار کرنے لگا، لیکن مدیحہ جس موڈ میں اپنے بیڈ روم میں آئی تھی اس میں اجازت ملنا دشوار تھا لہٰذا وہ ایک بار دستک دینے کے بعد اندر چلا آیا تھا۔

''مدیحہ'' اس نے نرمی سے اس پکارا وہ صوفے پہ بیٹھی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے لب بھینچ کر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں لگ رہی تھی۔ نبیل خود ہی آگے بڑھ کے اس کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

''اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے تمہیں؟'' وہ نرمی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''اتنا غصہ اس لیے آ رہا ہے کہ میرا صبح ہی صبح ایک ضخیم کے ساتھ ایکسیڈنٹ.....'' مدیحہ کچھ کہتے کہتے یکدم رُک گئی تھی اس نے دوبارہ لب بھینچ لیے تھے۔

''میں جانتا ہوں مدیحہ، تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، لیکن یہ تو بتاؤ ہوا کیسے ہے؟ تم خود تو خیریت سے ہو نا؟'' نبیل اس کا سر تھپکتے ہوئے بولا مدیحہ نے نبیل کے اتنے محبت اور اپنائیت بھرے انداز پہ ذرا کی ذرا چونک کر دیکھا تھا۔ نبیل کے چہرے پہ اس کو بے پناہ شفقت نظر آئی تھی وہ بھی چند لمحوں کے لیے خود بخود نرم پڑ گئی تھی۔

''ہوں..... میں ٹھیک ہوں لیکن گاڑی کو نقصان ہوا ہے، ڈینٹ پڑ گیا ہے۔'' اس نے مختصر سے انداز میں بتایا۔

''اوکے..... سب ٹھیک ہو جائے گا، شکر ہے کہ تمہاری بچت ہو گئی۔'' نبیل واقعی شکر ادا کر رہا تھا۔

''شکر ہے کہ میرے ہاتھوں اس ذلیل کی بچت ہو گئی، دو منٹ اور ٹھہرتا تو یقیناً حلیہ بگاڑ کے رکھ دیتی، مکینک اپنی شکل کی شناخت بھی بھول جاتا۔'' وہ تمتما کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ریلیکس..... ریلیکس کول ڈاؤن میری جان یہ پاکستان ہے انگلینڈ نہیں کہ تم لوگ کسی کی غلطی پہ سب فرینڈز کے ساتھ مل کر کسی کی دھلائی دو، یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بڑا دھیان رکھنا پڑتا ہے، ذرا سی بات ایشو بن جاتی ہے خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں تو کچھ زیادہ اُچھالے جاتے ہیں۔'' نبیل نے اسے سمجھانا چاہا۔

''لیکن بھائی اس نے غلطی کی بھی وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھا، بلکہ اس نے تو مجھ سے سوری تک نہیں کہا۔'' مدیحہ عدیل کی باتیں رہ رہ کر سلگا رہی تھیں جی چاہ رہا تھا وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے واقعی نوچ کھسوٹ ڈالتی وہ اس وقت بھوکی شیرنی کی طرح چکرا رہی تھی۔

''غلطی کس کی تھی؟''

''اس کی غلطی تھی بھائی۔''

''وہ کیسے.....؟''

''میں نے ایک سوئیٹس شاپ دیکھ کر بریک لگائے تھے اور اس نے پیچھے سے بائیک دے ماری۔'' اس نے غصے سے بتایا۔

''تم نے راستے میں بریک لگائے ہوں گے، اس لیے اس نے ٹکر دے ماری، تمہاری گاڑی کے پیچھے وہ بھی فل اسپیڈ سے آ رہا ہوگا۔ جیسے ہی تمہاری گاڑی رُکی وہ گاڑی سے ٹکرا گیا۔'' نبیل نے نتیجہ اخذ کیا تھا اس کا اندازہ درست تھا لیکن مدیحہ ماننے کو تیار نہیں تھی اس کے غصے کی اصل وجہ عدیل کی نظریہ اور استہزائیہ باتیں تھیں۔

''اس طرح اس کی کوئی غلطی نہیں ہے تمہیں بریک لگاتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا اور دیکھنا چاہیے تھا کہ تم کہاں بریک لگا رہی ہو۔''

''مگر بھائی۔'' وہ تمتما کے بولی۔

''چھوڑو میری جان! کسی زیادہ نقصان سے بچ گئے ہیں یہی بہت ہے، اللہ کا شکر ادا کرو۔'' نبیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''تم تھوڑی دیر کے لیے فریش ہو کر نیچے چلی جاؤ، مام پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا اور مدیحہ محض سر ہلا کے رہ گئی تھی نبیل اس کا سر تھپک کے باہر نکل گیا تھا وہ اپنے بیڈ روم کے بیچوں بیچ کھڑی رہی پھر بے ساختہ قدم اُٹھاتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور آئینے میں آتے اپنے سراپے کو دیکھا تھا اس کے سینے پہ بڑے بڑے حروف میں U.K لکھا تھا وہ ناپ تنگ ہونے کی وجہ سے بے حد نمایاں ہو رہا تھا بلکہ اس کا تو پورا فگر ہی نمایاں ہو رہا تھا، مدیحہ کو بے ساختہ اس ناپ سے چڑ ہو

تھی اور فرنازڈریسنگ روم میں جا کر وہ ناب چینج کیا اور پھر کچن میں جا کر اسے آگ لگا دی تھی۔ بیچارا U.K کھڑے کھڑے شعلوں کی نذر ہو گیا تھا وہ باؤں پھلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی۔

قصہ ابھی بھی ہنوز تھا.....

♥

اس نے گھر سے نکلتے ہی موبائل سے سائم کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" سائم کی جاگی سوئی سی آواز سنائی دی تھی۔

"ہائے....." جودت کی آواز سنجیدہ تھی۔

"تم.....؟" سائم اس کی آواز پہ ٹھٹکا۔

"ہاں میں....." وہ دوٹوک بول رہا تھا۔

"خیریت؟ اس وقت کیوں کال کی..... آج تو ہمارا یونیورسٹی سے آف ہے شاید؟" سائم کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"میں تم سے ملنے تمہارے گھر آ رہا ہوں۔"

"میرے گھر؟ اس وقت؟ مگر کیوں۔" سائم کو یقیناً اچنبھا ہوا تھا۔

"یہ سب آ کر بتاؤں گا۔" اس نے مختصراً کہا۔

"لیکن جودت اس وقت ممی ڈیڈی سب گھر پہ ہوتے ہیں تم....." سائم نے اسے روکنا چاہا تھا۔

"کچھ نہیں کہیں گے..... میں کوئی بہانا کر دوں گا۔" جودت نے اسے تسلی دی۔

"سائم نے کچھ بھی سنے بغیر فون بند کر دیا اور اپنی بیوی بانیک کی اسپیڈ بڑھا دی۔ اس کا رخ سائم کے گھر کی طرف تھا، آج یونیورسٹی سے آف تھا اس لیے وہ بھی اپنے گھر میں ابھی تک آرام فرما رہے تھے لیکن جودت کو ایسی بے چینی لاحق تھی کہ وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگی بھی تھی تو وہ لڑکی اس کے خواب میں بھی چلی آئی تھی اور وہ بے چینی سے دوبارہ اٹھ بیٹھا تھا، اس کا سونا جاگنا ڈسٹرب ہو چکا تھا تو وہ دوسروں کا کیوں نہ کرتا؟ اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ سائم کے گھر میں موجود تھا۔

"جودت تم یہاں.....؟" فاطمہ یونیورسٹی کے لیے نکل رہی تھی جودت کو یہاں دیکھ کر اپنی گاڑی کا ڈور کھولتے کھولتے رُک گئی۔

"سائم سے ملنے آیا ہوں، میرے کچھ نوٹس رہ گئے تھے اس کے پاس، آج یونیورسٹی سے آف ہے اس لیے سوچا کہ کچھ تیاری کر لوں۔"

"ماشاءاللہ بڑے لائق ہو گئے ہو؟" فاطمہ نے اسے سرتاپا دیکھا۔

"بس کچھ دیر کے لیے....." جودت نے لقمہ دیا اور وہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی۔

"واقعی درست کہا۔"

"اپنی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہوں امی کے۔"

"ہوں..... انٹرسٹنگ۔" فاطمہ نے اسے سراہتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"ایک بات کہوں آپ سے؟" جودت رو نہ سکا اور بے ساختہ کہہ گیا۔

"ہوں..... کہو کیا کہنا ہے؟" فاطمہ نے اجازت دی لیکن جودت سوچ میں پڑ گیا کہ اس سے مریم کے بارے میں کیا پوچھے؟ کیسے پوچھے؟

"چپ کیوں ہو گئے؟ کہو نا کیا کہنا ہے؟" اس کی خاموشی دیکھ کر فاطمہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

"کچھ نہیں کہنا، آپ جائیں، پھر کبھی سہی۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" وہ اسے بغور دیکھنے لگی۔

جودت نظریں پھیر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔

PRIME URDU NOVELS

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس ابھی شاید مناسب وقت نہیں ہے جب ہوگا تب ضرور کہوں گا۔"

"اوکے ڈیئر! میرے ہوش، تم سائم سے ملو اور میں یونیورسٹی کے لیے نکلتی ہوں، کافی لیٹ ہو چکی ہوں تمہاری باتوں میں۔" موبائل سے نائم دیکھتی ہوئی بولی اور جودت فوراً سائیڈ پہ ہو گیا تھا۔

"اوکے بائے۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ آیا، فاطمہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ جودت کا رُخ سائم کے بیڈروم کی طرف تھا دُعا کر رہا تھا کہ سائم کے ممی، ڈیڈی سے ٹکراؤ نہ ہو، ورنہ کچھ دیر ان کے پاس بھی رُکنا پڑ جاتا لیکن دُعا ابھی لبوں میں ہی تھی کہ ممی نے پکار لیا۔

"جودت بیٹا! خیریت صبح صبح کیسے آنا ہوا؟" سبھی کو جودت کے اتنی صبح آنے پہ حیرت اور تجسس ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" مجبوراً اس نے پلٹ کر سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! آؤ ناشتہ کرو۔"

"نو تھینکس آنٹی! میں دراصل سائم سے اپنے نوٹس لینے آیا ہوں مجھے ضرورت تھی۔" اس نے اپنا بہانا دہرا لیا۔

"اوکے سائم اپنے بیڈروم میں ہوگا، لے لو جا کر، لیکن سنو، تمہاری آنی کہاں ہوتی ہیں آج کل؟ بہت دنوں سے انہیں کہیں بھی نہیں دیکھا؟" انہوں نے آسیہ آفندی کے بارے میں پوچھا تھا۔

"آنی گھر پہ ہی ہوتی ہیں، بس کوئی خاص فنکشن یا پارٹی ہو تو ڈیڈ کے ساتھ چلی جاتی ہیں ورنہ ان کا زیادہ تر وقت گھر پہ ہی گزرتا ہے، پورا دن کچن کا کام بھی وہ اپنی نگرانی میں کرواتی ہیں۔" جودت کو ان کے سامنے اپنی آنی کی تعریف کرنے کا موقع ملا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسز بدر (سائم کی ممی) کافی سوشل ہیں، ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر اور پارٹیز میں گزرتا ہے جبکہ آنی تمام بیگمات سے ہٹ کے آسیہ آفندی ایسی نہیں تھیں ان میں اپر کلاس والی کوئی بات ہی نظر نہیں آتی تھی حالانکہ وہ شہر کے نامور اور رئیس ترین خاندان کی بہو تھیں لیکن وقار آفندی کی بیوی ہونے کا اعزاز رکھتی تھیں۔ پھر بھی بہت سادہ اور حلیم طبع تھیں۔

"ہوں..... اچھی بات ہے، ان سے کہنا مسز بدر آپ کو یاد کر رہی تھیں، کبھی ٹائم نکال کے ملنے ہم سے بھی۔" انہوں نے کہا دیا۔

"جی کہہ دوں گا۔" جودت بور ہونے لگا تھا۔

"اوکے جاؤ تم۔"

"تھینک یو آنٹی۔" وہ اجازت ملتے ہی ریلیکس ہو گیا تھا اور اک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا کہ کہیں کوئی بدل جائے۔

وہ کوئی بھی دستک دیئے بغیر بے دھڑک اندر چلا آیا تھا سائم اپنے بیڈروم میں اے سی کی کولنگ میں مزے سے سو رہا تھا جودت نے اس کے بیڈروم کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ سائم کی سات نسلیں جاگ گئی تھیں وہ یکدم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا گر گیا ہے؟" سائم کو بوکھلاہٹ اور نیند ٹوٹنے کی وجہ سے یہی لگا تھا کہ زلزلہ آیا ہے، جب نائم نے آنکھیں پٹپٹا کے دیکھا پہلے دروازے کو پھر جودت کو اور رفتہ رفتہ ساری پوزیشن سمجھ آ گئی تھی۔

"اوہ تو یہ تم نے دروازہ بند کیا ہے؟"

"آف کورس، میں آیا ہوں تو میں نے ہی بند کیا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے اور ٹھور کشن کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"بہت ایڈیٹ ہو تم۔" سائم غصے سے کہہ کر دوبارہ بیڈ پہ گر گیا تھا۔

"جانتا ہوں میں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"اور کیا جانتے ہو؟" سائم نے استہزائیہ پوچھا۔

"کہ تم مجھ سے بھی زیادہ ایڈیٹ ہو۔" اس نے حساب برابر کیا۔

"تم بہت خبیث ہو۔" سائم نے دوبارہ کہا۔

"بکواس؟ صبح صبح کیوں نازل ہو گئے ہو۔ ایسی کیا آفت آ گئی تھی۔" اس نے چڑ کر پوچھا تھا۔

"میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ میں رات کو ہی نازل ہو جاتا۔"

"وہ کیوں؟" وہ تیکھے انداز میں بولا۔

"کیوں کا جواب تم جانتے ہو۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"یار میں کچھ بھی نہیں جانتا، نیند کی وجہ سے میرے اپنے حواس ٹھکانے پہ نہیں ہیں۔" سائم جھنجلا رہا تھا۔

"بیٹھ کر شاور لو، جب تمہارے حواس ٹھکانے پہ آ جائیں پھر بات کریں گے۔" جودت نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔

"ویسے کیا خاص بات ہے۔" اب کی بار سائم نے اسے بغور دیکھا تھا اور چند سیکنڈ مسلسل دیکھنے کے بعد یکدم اُٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔

"کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔" وہ اس کے چہرے سے ہی معاملہ پہچان گیا تھا۔

"ہوں۔" اس نے بے حد آہستگی سے سر ہلایا۔

"کیا معاملہ ہے؟ کون ہے وہ لڑکی؟" جودت فلور کشن پہ بیٹھا ہوا تھا اور سائم بیڈ پہ، لیکن دونوں آمنے سامنے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم جانتے ہو، میں نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا..... جودت تم کچھ....." سائم کہتے کہتے ایک دم رُک گیا تھا اس کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا تھا اور رات والا سارا معاملہ ذہن کی اسکرین پہ روشن ہو گیا تھا۔

"تم مریم کی بات کر رہے ہو۔" سائم بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں..... کافی ذہین ہو۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو جودت پلیز اس کا خیال دل سے نکال دو، وہ تمہارے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے، تم خوامخواہ اُلٹی جگہ پہ ٹانگ اڑا رہے ہو، بری خواری ملے گی تمہیں۔" سائم کی نیند ہوا ہو چکی تھی وہ جودت کا مدعا سمجھ کر اسے سمجھانے بیٹھ گیا تھا۔

"وہ بہت خوبصورت ہے یار۔" جودت کا لہجہ بدل گیا تھا اس کی آواز میں ہلکے خمار کی جھلک تھی۔

"تمہارے لیے خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہے، ایک سے بڑھ کر ایک مل سکتی ہے۔" سائم نے باز رکھنا چاہا۔

"اس کی سیاہ آنکھوں میں دل رہ گیا میرا، وہی ڈھونڈنا ہے اب۔" جودت اس کے سنے بغیر بول رہا تھا۔

"تمہارا دل تو کئی آنکھوں میں رہتا ہے، کبھی کسی کی نیلی آنکھوں میں، کبھی کسی کی سبز آنکھوں میں، کبھی بھوری آنکھوں میں اور کبھی شہد آنکھوں میں، کہاں کہاں سے ڈھونڈو گے؟" سائم زچ ہو رہا تھا۔

"بلیز چلا نہ یہ مستیاں چھوڑو، تمہارا اور اس کا اسٹیٹس کہیں سے بھی میچ نہیں کرتا۔"

"تو میں کون سا اس سے شادی کر رہا ہوں جو اسٹیٹس کا فرق درمیان میں آئے گا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"یعنی تم....." سائم آگے کچھ نہ کہہ سکا اس کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں۔

"میں اسے صرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، کل سے میری نیندیں اُڑا کے رکھ دی ہیں اس نے۔" جودت نے کھل کے اظہار کیا تھا سائم بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم ہوش میں نہیں ہو جاؤ مجھ سے بعد میں بات کرنا۔" سائم سپیئر پکن کر باتھ روم کی سمت بڑھ گیا انداز آکتایا ہوا تھا۔

"سائم تمہیں پتا ہے کہ میں تمہیں بتائے بغیر بھی سب کچھ کر سکتا ہوں، لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو، وہ لڑکی ایسی بھی کوئی اقلیم حسن کی اولاد نہیں ہے کہ کسی لڑکے سے فرینڈ شپ ہی نہ کر سکے، بس تم میری اس سے فرینڈ شپ کروا دو، باقی اسے پٹانا میرا کام ہے۔" جودت اسے ایک غلط کام پہ اُکسا رہا تھا لیکن سائم اس کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا مگر فاطمہ کی کسی دوست سے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا تھا سائم کے لیے مریم بھی فاطمہ جیسی ہی تھی وہ کافی سالوں سے مریم کو جانتا تھا اور اس نے جب بھی مریم کو دیکھا عزت اور شرافت کے لبادے میں ہی دیکھا تھا اور اب وہ اس کے لبادے کو داغدار نہیں کر سکتا تھا جبکہ جودت اسی کام پہ تلا ہوا تھا سائم اس کا ساتھ دینے سے انکاری تھا جبکہ جودت اپنی بات پہ بضد تھا۔

"سوری! میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"ٹھیک ہے..... ساتھ نہ دو، لیکن اس کے گھر کا ایڈریس دے دو۔" جودت نے ایک اور سوال سامنے رکھا۔

ہر لڑکی ایسا سوچتا ہی ہے۔ سائم کون سی بات مانے کو تیار نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ صرف اتنا بتا دو کہ وہ کس ایریا میں رہتی ہے۔'' جودت بس اسے ڈھونڈنے کے لیے صرف ایک نشان چاہتا تھا۔

''میں تمہیں ایک لفظ تک نہیں بتا سکتا۔'' وہ اپنی بات پہ قائم تھا۔

''او کے..... او کے کچھ مت بتاؤ، میں سب پتا کرلوں گا، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میں اگر کچھ کر گزرا تو تم مجھے روک نہیں پاؤ گے نہ ہی کوئی دوش دو گے۔'' جودت انگلی اُٹھا کے اسے وارننگ دے رہا تھا۔

''جودت تم غلط.....''

''بس تم میرے دوست ہو یہی کافی ہے، مجھے سمجھانے کا یا پھر کوئی حق جتانے کا اختیار تم کھو چکے ہو۔'' جودت اپنی جگہ سے اٹھ ہو گیا تھا۔

''جودت میں نے کبھی پہلے تمہیں کسی سے روکا ہے؟ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ لڑکی ایسی نہیں ہے تم کسی کے بارے میں سوچ لو، میں ہر طرح سے تمہارا ساتھ دوں گا۔'' سائم جھنجلا کے اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''میں صرف مریم فاروق نیازی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور جب تک وہ مل نہیں جاتی اسی کے بارے میں سوچتا رہوں گا۔'' جودت نے لفظ لفظ پہ زور دیا تھا سائم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر وہ بات ختم کر گیا تھا۔

''گڈ بائے اب میں تم سے اسی روز ملوں گا جب اس کے بارے میں مکمل انفارمیشن لے لوں۔'' وہ کہہ کے باہر نکل گیا تھا۔

سائم اپنے کمرے کے وسط میں کھڑا پریشان سا چپ رہ گیا، اسے پتا تھا کہ جودت کتنا ضدی اور ہٹ دھرم ہے اپنی منوا کر رہے گا کبھی بھی کچھ بھی کر گزرتا تھا، اس نے آج تک جو کہا تھا وہ پورا کیا تھا۔ وہ بے حد نڈر اور بے خوف لڑکا تھا بس آفیسر اور وقار آفیسر کے سامنے ان کی عزت اور احترام کے مارے اکثر چپ ہی رہتا تھا ورنہ اس نے آسانی سے کوئی بات مان لینا ہرگز نہیں سیکھا تھا۔ خاصا منہ پھٹ اور بے باک بھی تھا دل کی بات دل میں ذرا کم ہی رکھتا تھا۔ جیسے اس وقت نہیں رکھ سکا تھا۔

♥

وہ کافی دیر تک بیٹھا اپنا ایک کیس اسٹڈی کرتا رہا اور جب نیند سر پہ سوار ہوئی تو بے ساختہ گھڑی دیکھی تھی۔ رات کے ایک بجے کا ٹائم ہو رہا تھا اور صبح جلدی اٹھنے کے خیال سے اس کے دماغ پہ مزید تھکن سوار ہو گئی تھی اسی لیے سب کچھ سمیٹ کر اسٹڈی ٹیبل سائیڈ میں رکھا اور تکیہ درست کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن ابھی اسے سوئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی وہ اکثر سیل کو وائبریشن پہ ہی رکھتا تھا۔ اس نے جاگے ہوئے اسی انداز میں سیل اُٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

''یس دل آور شاہ اسپیکنگ؟'' بوجھل آواز میں بھی حد درجہ رعب تھا، حکمت تھی، دبدبہ تھا۔

''جناب! نبیل حیات بات کر رہا ہوں۔'' نبیل کی آواز پہ وہ چونک گیا تھا۔

''تم اس وقت کال کر رہے ہو؟'' دل آور کو اچنبھا ہوا تھا نیند سے اس کی آنکھیں سرخ ڈوروں سے سجنے لگی تھیں۔

''فارغ ہی اس وقت ہوا ہوں اور ویسے بھی میں نے سوچا کہ کراچی میں لوگ اتنی جلدی نہیں سوتے اس لیے یقیناً تم جاگ رہے ہو گے؟''

''جاگ رہا تھا دس پندرہ منٹ پہلے میں بھی جاگ رہا تھا، لیکن کیس اسٹڈی کرتے کرتے نیند آ گئی۔'' دل آور ایک ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے دوسرے ہاتھ سے آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہنی کے بل اُٹھ بیٹھا تھا۔

''اچھا تو پھر سو جاؤ۔'' نبیل کو جیسے اس کی تھکن پہ رحم آ گیا تھا۔

''ارے نہیں یار! تم بولو میں سن رہا ہوں۔'' اس نے نبیل کو کال بند کرنے سے روکا۔

''میں نے صرف بولنے کے لیے فون نہیں کیا، باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے۔'' نبیل نے زور دے کر کہا۔

''او کے! باتیں ہی کروں گا، تم بولو تو سہی، باتوں کے لیے تمہید تو باندھو۔'' دل آور نے ایک ہاتھ سے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور گلاس اُٹھا کر منہ سے لگا لیا تھا وہ گلاس پانی پینے کے بعد اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اُٹھا لیا تھا ایک ہاتھ سے سگریٹ اُٹھا کر ہونٹوں میں دبایا اور ایک ہاتھ سے ہی سگریٹ کو لائٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا۔

"اسموکنگ کررہے ہو۔" نبیل فون پہ ہی پہچان گیا تھا۔
"ہوں..... نیند کو بھگانے کا آسان طریقہ ہے، تم سے بات بھی تو کرنی ہے؟" وہ نبیل سے بات کرتے ہوئے نیم دراز سا بیٹھ گیا تھا۔
"اس چیز سے صرف نیند ہی نہیں بھاگتی، لڑکیاں بھی بھاگتی ہیں۔" نبیل شرارت سے بولا دل آور کے ہونٹوں کو بھی مسکراہٹ چھو گئی تھی۔
"یعنی سگریٹ لڑکیوں کے لیے "مورنین" کا کام دیتا ہے؟" دل آور انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھ کر مسکرایا اور نبیل بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔
"سگریٹ مورنین اور شراب موٹیویل ثابت ہوتی ہے۔"
"اف یار بس کرو، میرے پیٹ میں درد ہونے لگا ہے۔" نبیل نے ہنستے ہوئے اسے روکا۔
"بات تو تم نے ہی چھیڑی تھی نا۔" دل آور ابھی بھی شرارت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"اور تم نے حد کردی۔"
"حد نہیں کی، بس اندازہ لگایا ہے، ویسے یار آپس کی بات ہے لڑکیاں سگریٹ سے بھاگتی کیوں ہیں..... اسموکنگ ہم کرتے ہیں، برابری اور آکاٹ نہیں ہوتی ہے، وجہ.....؟" دل آور کے بھرپور معنی خیز سوال کو سمجھتے ہوئے ایک بار پھر نبیل کا قہقہہ بلند ہوا تو وہ دونوں ہی اس بات سے بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔
"جب شادی ہوگی تو بیوی سے پہلا سوال یہی پوچھوں گا۔" نبیل جی بھر کے انجوائے کر رہا تھا۔
"سگریٹ سلگا کے پوچھو گے یا بجھا کے؟" دل آور نے لقمہ دیا۔
"بجھا کے پوچھوں گا، سلگا کے پوچھا تو وہ قریب نہیں آئے گی۔" نبیل نے خدشہ بیان کیا۔
"ٹھیک ہے تم بجھا کے پوچھنا، میں سلگا کے پوچھوں گا۔" دل آور کی بات پہ ایک اور قہقہہ پڑا تھا۔
"تم واقعی سلگا کے پوچھنے والے آدمی ہو۔" نبیل کو ماننا پڑا۔
"گویا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم بجھا کے پوچھنے آدمی ہو۔" دل آور نے چھیڑا تھا اسے۔
"میں نبیل حیات ہوں میری جان، دل آور شاہ نہیں۔" نبیل نے اسے جتایا۔
"تم دل آور شاہ ہو بھی نہیں سکتے میری جان، دل آور شاہ بننے کے لیے بہت بڑا "جگرا" چاہیے۔" دل آور کے لہجے میں زمانے بھر کی تلخی امڈ آئی تھی۔
"واقعی دل آور شاہ صرف ایک ہی ہے، کبھی کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔" نبیل نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔
"اچھی بے! تم یہ بتاؤ رات کے اس پہر کال کیوں کی ہے؟" دل آور سر جھٹک کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ گفتگو کا ٹریک خود بخود بدل رہا تھا۔
"تم سے کچھ ڈسکس کرنے۔"
"کیا ڈسکس کرنا ہے؟" وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔
"بزنس کے سلسلے میں کچھ ڈسکس کرنا ہے یار....."
"ہوں..... بولو، سن رہا ہوں۔"
"یار جب سے میں تمہارے ساتھ شوروم گیا ہوں میری سوئی شوروم پہ ہی اٹکی ہوئی ہے۔"
"کیا مطلب؟ تم شوروم بنانا چاہتے ہو۔" دل آور اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔
"ہوں....."
"پاگل ہو گئے ہو..... تم اتنے اچھے بزنس مین ہو، اتنا وسیع کاروبار ہینڈل کرتے رہے ہو اور اب تم ایک شوروم پہ اکتفا کر کے بیٹھ جاؤ گے؟ گاڑیوں کی خرید و فروخت میں لگے رہو گے؟" دل آور کو اس کا آئیڈیا کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔
"لیکن یار مجھے بہت شوق ہو رہا ہے شوروم بنانے کا۔" نبیل واقعی آج کل اسی شوق کا شکار تھا۔

''شوروم بنانا بہت آسان کام ہے یار! لیکن شوروم کی ساکھ بنانا بہت مشکل ہے جتنا عرصہ تمہیں اس کی ساکھ بنانے میں لگے گا اتنے عرصہ میں تمہارا دیوالیہ ہو جائے گا۔ کام ایسا شروع کرو جو تمہیں شروعات میں ہی پراپرٹ دینا شروع کر دے، تاکہ پاکستان میں تمہارے قدم جم جائیں اور جب تم جان لو گے کہ تمہارے قدم جم چکے ہیں تو پھر بے شک ایک چھوڑ کے دس شوروم بناتے رہنا۔'' دل آور نے اسے اچھے طریقے سے سمجھایا نبیل تذبذب کا شکار ہونے لگا۔

''اگر ہمیں شوروم بنانے کی بجائے بنا، بنایا مل جائے تو؟''

''پہیلی مت بجھواؤ، صاف بات کہو۔'' دل آور بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔

''صاف بات یہی ہے کہ دو تین دن پہلے میری ملاقات اکرام مجید سے ہوئی تھی۔'' نبیل نے کہنا شروع کیا۔

''پھر.....؟''

''پھر اس نے مجھے پہچان لیا تھا، تمہاری وجہ سے کافی پروٹوکول دے رہا تھا، چائے بھی پلائی اس نے اور کچھ دیر بیٹھ کر باتیں بھی کرتا رہا۔''

''کیسی باتیں.....''

''یہی شوروم کے سلسلے میں۔''

''اچھا پھر.....؟''

''پھر کیا یار؟ مجھے اس کی باتوں سے یہی لگا ہے کہ وہ شوروم چھوڑنا چاہتا ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ اگر وہی شوروم میں خرید لوں تو.....؟'' نبیل نے اصل بات بتائی دل آور لمحہ بھر کے لیے چپ ہوا پھر بولنا شروع کیا۔

''دیکھو نبیل! تم جو بھی کام کرو اپنی مرضی سے کرو، میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا لیکن یار میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ ہو، تم پاکستان میں ابھی نئے نئے آئے ہو، تم یہاں کے گھاگ شکاریوں کو نہیں سمجھ سکتے، یہاں جو بھی مالدار اور دولتی آسامی نظر آتی ہے لوگ اسے گھیرنے کے لیے بڑے بڑے جال پھینکتے ہیں، اکرام مجید تم سے مل چکا ہے اور وہ یہ بھی جان چکا ہے کہ تم کتنی بڑی آسامی ہو، اور دوسرے یہ کہ یہاں ابھی نئے نئے اور انجان ہو، لیکن اکرام مجید ابھی یہ نہیں جانتا کہ وہ دل آور شاہ کے دوست کو گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ کرے اس کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔ تم اسے یہ نہ کہو کہ میں نے شوروم خریدنا ہے، بلکہ تم اسے یہ کہو کہ دل آور شاہ نے یہ شوروم خریدنا ہے۔ پھر دیکھنا کیا تاثرات ہوں گے سالے کے۔'' دل آور نے کہتے ہوئے سگریٹ سلگا دیا تھا اور نبیل اس کی بات پہ مسکرا اٹھا۔

''یار! یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے میرے ساتھ کوئی بھی فراڈ نہیں کر سکتا۔'' نبیل کے لہجے میں فخر اور یقین تھا۔

''دل آورے.....'' نبیل نے اچانک پکارا۔

''ہوں.....؟''

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔''

''ہوں..... کہو۔''

''مجھے شوروم بنانے کا شوق ہو رہا ہے اور تمہیں بزنس کرنے کا..... کیوں نا ہم دونوں کام مل کر شروع کر لیں، پارٹنر شپ کے اصولوں پہ.....؟''

''مطلب.....؟''

''مطلب کہ تم اپنے شیئرز میرے ساتھ شوروم میں انویسٹ کرو اور میں تمہارے ساتھ بزنس میں انویسٹ کرتا ہوں۔'' نبیل بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔

''دو سب تو ٹھیک ہے یار لیکن تم جانتے ہو کہ میرا پروفیشن مجھے بزنس کو ٹائم دینے کی اجازت نہیں دیتا..... بڑا مشکل ہو جاتا ہے زیادہ ٹائم نکالنا۔''

''ارے یار! تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میں ہوں نا سب سنبھالنے کے لیے، میں بزنس کو ٹائم دوں گا اور تم شوروم کو۔'' نبیل

سارے چالان خود ہی بنائے جا رہا تھا اور بالآخر اس نے دل آور کو کنوینس کر ہی لیا تھا۔

"او کے یار! جیسے تمہاری مرضی، جو دل چاہتا ہے کرو، لیکن کسی سے دھوکہ مت کھانا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"نہیں کھاؤں گا یار۔" نبیل مسکرایا۔

"خیر یہ بتاؤ مدیحہ اور آنٹی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں یار! دو تین روز پہلے مدیحہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"واٹ؟ ایکسیڈنٹ؟" دل آور ایک دم اُٹھ بیٹھا۔

"ڈونٹ وری یار! زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا شکر ہے کہ مدیحہ خود بچ گئی، بس گاڑی پہ کچھ خراشیں آئی ہیں۔" نبیل نے اسے تسلی دی۔

"تو اسے ابھی اتنی جلدی ڈرائیو کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"نئی گاڑی دیکھ کر سب کو ڈرائیو کرنے کا شوق ہو ہی جاتا ہے۔" جواباً نبیل نے وجہ بتائی۔

"یار! یہاں ہوش سے کام لینا پڑتا ہے، جوش سے نہیں، سمجھا نا اسے۔" دل آور نے تاکید کی۔

"کچھ عرصہ اور گزار لو خود بخود سمجھ جائے گی۔"

"خیال رکھا کرو اس کا۔" دل آور کے کہنے پہ نبیل مسکرا دیا۔

"مسکرا کیوں رہے ہو؟" وہ جان چکا تھا کہ نبیل مسکرا رہا ہے ان لوگوں کے ایک دوسرے کے بارے میں اندازے اتنے درست ہوتے تھے کہ کوئی دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا۔ وہ تینوں دوست آپس میں ایک دوسرے کی حرکتیں آنکھیں بند کر کے بھی جان لیتے تھے۔

"تمہاری بات پہ مسکرایا ہوں۔"

"کس بات پہ؟" دل آور نا سمجھی سے بولا۔

"خیال رکھنے والی بات، یار کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی ہے کہ میں سب کا خیال رکھتا ہوں، لیکن میرا خیال کوئی بھی نہیں رکھتا، تم بھی نہیں رکھتے۔" نبیل نے شکوہ کیا اور دل آور چند ثانیے کے لیے خاموش ہوا پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیا پتا میں ہی تو تمہارا خیال رکھتا ہوں۔" دل آور کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا اس نے ایک نیا سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا اور دھواں فضا میں چھوڑ دیا، دھوئیں کے مرغولے اُڑتے چلے گئے تھے۔

"کیسے...؟"

"یہ صرف اللہ جانتا ہے۔"

"ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتا۔" نبیل کو تجسس ہوا۔

"ایسا بہت کچھ ہے جو تم نہیں جانتے اور کبھی کبھی نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔" دل آور نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"دل آور! تو سمندر سے بھی زیادہ گہرا ہے، کبھی کبھی دل چاہتا ہے تمہاری گہرائی کی کھوج لگاؤں، لیکن ڈر لگتا ہے کہ ڈوب جاؤں گا۔" نبیل سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈر جاتے ہو اور ہم ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈوب جاتے ہیں، بس تم ساحل پہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہو کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ سمندر پہ کیا گزر رہی ہے؟ کشتی پہ کیا گزرے گی؟ کشتی اور سمندر بھنور سے کیسے بچیں گے؟ بس دیکھتے جاؤ، اس سمندر میں پیر مت ڈالو..... ڈوب جاؤ گے؟"

دل آور کا لہجہ بھی عجیب تھا اور باتیں بھی عجیب تھیں، اس کا دھیان شاید اس "کشتی" کی سمت تھا جو بے دھیانی میں اس ٹھاٹھیں مارتے گہرے سمندر میں اتر آئی تھی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا سمندر چاہتا تو پل میں اسے اپنی منہ زور لہروں کے بل بوتے پہ باہر اُچھال دیتا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ یہ سمندر بھی اس کشتی کی ہمت دیکھ رہا تھا جو بغیر کسی سہارے اور آس اُمید کے چل رہی تھی اور سمندر بھی اس کشتی کو دیکھتا تھا جو ساحل پہ کھڑے تماشہ دیکھنے والے اس آدمی کو، جو ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈر جاتا تھا۔

"کہاں کھو گئے ہو؟" نبیل کی آواز نے اسے گہری سوچ سے متوجہ کیا تھا۔

''جہاں تم کھونا چاہتے ہو۔'' اس کی بات مبہم تھی۔
''میں کہاں کھونا چاہتا ہوں؟'' نبیل کو حیرانی ہوئی۔
''یہ تو تمہیں ہی پتا ہوگا کہ تم کہاں کھونا چاہتے ہو۔'' دل آور نے لاپروائی ظاہر کی۔
''بتاؤں تمہیں میں کہاں کھونا چاہتا ہوں؟'' نبیل بتانے پہ آمادہ ہوا۔
''نہیں فی الحال مت بتاؤ، نیند اور تھکن سے خاص پتا نہیں چلے گا مجھے، کبھی فرصت سے بتانا۔'' دل آور نے اسے روک دیا۔
''یعنی کچھ نہ بتاؤں؟''
''کیا مطلب؟''
''مطلب کہ کبھی فرصت جو نہیں ملے گی۔''
''ارے ڈونٹ وری یار! مجھے واپس آنے دو، پھر فرصت ہی فرصت ملے گی۔'' دل آور نے تسلی دی۔
''اوکے..... انتظار کرتا ہوں۔''
''ضرور۔''
''ٹھیک ہے پھر تم آرام کرو، میں فون بند کرتا ہوں، دوبارہ بات ہوگی۔'' نبیل کو نام کا احساس ہوا۔
''اب نیند کہاں؟''
''کیوں؟''
''نیند کا وقت گزر گیا یار۔''
''پھر بھی کوشش تو کرو، صبح چھ، سات بجے تک تو آرام کر ہی لو گے۔'' نبیل نے مشورہ دیا۔
''اوکے..... کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''
''اوکے تو پھر گڈ نائٹ۔'' نبیل نرمی سے بولا۔
''مدیحہ کو میری طرف سے پیار دینا، جلدی فارغ ہو گیا تو اسے کال کروں گا۔''
''ٹھیک ہے جناب! آپ کا پیغام دے دوں گا۔''
''تھینک یو، اینڈ گڈ نائٹ۔'' دل آور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر اپنے دھیان میں سگریٹ چھوڑتے ہوئے سوچ کا رخ بدل گیا تھا۔ معاملہ سنگین تھا تو سوچیں بھی گہری تھیں۔

جگر میں خون رُلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں جیسا؟
مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
سرد راتوں میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں؟
آگ سی دل میں لگاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
مجھ سے بچھڑے ہو تو محبوب نظر ہو کس کے؟
آج کل کس کو مناتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟

''میں بتاؤں کہاں ہوتا ہے؟'' نگارش بھابی صوفے کے پیچھے کھڑی زری کے عقب سے اس کی گود میں رکھی شاعری پڑھ رہی تھی اور زری کو خبر ہی نہیں تھی جیسے ہی وہ بولی زری یکدم چونک گئی تھی۔
''بھابی آپ؟'' اس نے فوراً گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
''کیوں میرے ہونے پہ کوئی اعتراض ہے؟'' نگارش صوفے کی سائیڈ سے نکل کر سامنے آ گئی تھی۔
''آپ ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں؟ یا مجھے ہی خبر نہیں ہوتی۔'' وہ تعجب سے پوچھ رہی تھی۔ نگارش اطمینان سے اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"تمہیں ہی خبر نہیں ہوتی..... اور محبت کرنے والوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ ہر بات سے، ہر چیز سے بے خبر ہوتے ہیں، تمہاری طرح۔" وہ سکون سے کہہ رہی تھی۔

"میں بے خبر ہوں۔"

"بالکل....."

"وہ کیسے.....؟"

"وہ ایسے کہ تمہیں تو یہ سب ہی پتا نہیں ہوتا کہ دل میں آگ سی لگانے والا آج کل کہاں ہوتا ہے؟"

"کیا مطلب؟ کہاں ہوتا ہے؟" زری جی جان سے چونک کر متوجہ ہوئی۔

"اپنے اس سوال سے ہی سمجھ جاؤ کہ تم بے خبر ہو۔" نگارش مسکرائی۔

"بتاؤ نا بھائی؟ کہاں ہے وہ۔" زری کے انگ انگ سے بے چینی پھوٹ پڑی تھی۔

"آج کل جناب کراچی میں ہوتے ہیں، کسی کیس کے سلسلے میں۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"عبداللہ نے....."

"کب.....؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"ان کی بات ہوئی ہے اس سے؟"

"ہاں..... اس نے خود فون کیا تھا۔"

"اور کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے میری طرف سے زری کو ایک زور کا پیار دینا اور میں تمہیں وہی پیار دینے آئی ہوں۔" نگارش کے انداز میں شرارت تھی زری خفگی سے اسے گھورنے لگی۔

"پیار گھور کیوں رہی ہو؟ پیار دینے ہی تو آئی ہوں۔"

"مجھے کسی سے پیار کی ضرورت نہیں ہے، اگر پیار دینا ہی ہے تو وہ خود آ کر دے۔" کہتے ہوئے اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا تھا۔

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ، ذرا چہرہ تو اونچا کرو۔" نگارش ذومعنی انداز سے دیکھ رہی تھی۔

"بھائی پلیز مجھے کنفیوژ تو مت کریں۔"

"تو پھر کیا کروں۔"

"میری شادی۔" جواباً زری بھی شرارت سے بولی۔

"ہیں..... کیا.....؟" نگارش اچھل پڑی۔

"تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں۔" زری بھی اسی کے سے انداز میں بولی۔

"تو پھر میں بات کروں عبداللہ سے۔"

"نیک کب کریں گی؟" وہ مصنوعی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

"آج کروں گی، ابھی کروں گی، دیکھ لینا تم۔" نگارش نے کمر کس لی تھی۔

"نگارش....." عبداللہ نے ریلنگ کے قریب آتے ہوئے پکارا تھا۔

"جی..... تمہیں چائے بنانے کے لیے بھیجا تھا۔"

"سوری! میں زری کے پاس رک گئی، ابھی آ رہی ہوں۔" نگارش فوراً کھڑی ہو گئی تھی عبداللہ وہاں سے ہٹ کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔

"آج مجھے تمہارے بھائی کے ارادے نیک نہیں لگتے، شام سے ہی نگارش، نگارش پکار رہے ہیں۔" نگارش نے شرارت سے کہا زری کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اچھا ہے آپ کی بوتی انی کے پاس جا کے بند ہو گی۔''
''آج میری بوتی بند ہونے والی نہیں ہے۔''
''کیوں؟''
''آج تمہارے بھائی کا ارادہ کچھ اور ہے اور میرا ارادہ کچھ اور.....''
''آپ کا ارادہ کیا ہے؟''
''تمہارے حق میں بولنے کا۔''
''واٹ؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''
''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں یار یہ بڑا اچھا موقع ہوتا ہے بیویوں کے لیے کوئی بات کرنے کا، ہنڈرڈ پرسینٹ چانس ہوتے ہیں بات ماننے کے۔'' نگارش ذو معنی بول رہی تھی لیکن زری، نگارش کو باز رکھنا چاہتی تھی۔
''مگر بھابی.....''
''چھوڑو یار! تم بھی نا بس، کچھ کرنے دو گی نہ ہی خود کچھ کرو گی؟'' نگارش خفگی سے کہہ کر کچن میں گئی اور چائے بنانے لگی۔ چند منٹوں میں وہ چائے بنا کر واپس بھی آ گئی۔
''او کے گڈ نائٹ۔''
''بھابی سنیے تو.....'' زری نے روکا۔
''ابھی وقت نہیں ہے، تمہارے بھائی صاحب بہت بے چین ہو رہے ہوں گے، تمہاری بات بعد میں سنوں گی اپنے بیڈ میں جاؤ تو تمام لائٹس آف کر دینا شاباش، تم آرام سے بیٹھ کر شاعری پڑھتی رہو، باقی میں سنبھال لوں گی۔'' نگارش جاتے جاتے اسے بچوں کی طرح پچکار گئی تھی، اور زری پریشانی سی دیکھتی رہ گئی۔

♥

نگارش بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو عبداللہ سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھا اسی کا انتظار کرتا دکھائی دیا تھا۔ نگارش کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے بیڈ کے قریب آئی اور چائے کا کپ عبداللہ کی سمت بڑھا دیا تھا لیکن عبداللہ نے کپ تھاما، مگر اس کی کلائی سمیت۔
''آرام سے عبداللہ، چائے گر جائے گی۔'' نگارش نے اسے روکا، لیکن وہ اسے گھور کے دیکھ رہا تھا۔
''میں ہمیشہ ہر معاملے میں آرام سے ہی پیش آتا ہوں، لیکن تم میرے اس آرام اور تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو۔'' وہ نگارش کے ہاتھ سے کپ لے کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ چکا تھا۔
''میں ناجائز فائدہ اٹھاتی ہوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟'' نگارش اپنی مسکراہٹ دبا کے بولی تھی۔
''جب بھی کسی کام سے جاتی ہو، واپس آنے کا نام نہیں لیتیں اور اگر آتی بھی ہو تو دیر لگا کے۔'' عبداللہ نے اسے آنکھی سے کھینچ کے بیڈ پہ بٹھا لیا تھا۔
''اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے، بیڈ روم کے اندر آپ ہوتے ہیں اور بیڈ روم کے باہر آپ کی بہن ہے اور ظاہر ہے میں نے تو دونوں کو نائم دینا ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے گندے اچکائے۔
''ارے اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو چار دن کی مہمان ہے، چند دنوں تک چلی جائے گی، تم اپنی بات کرو، تم کیا کرو گی پھر؟''
''پھر میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔
''عبداللہ! مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے۔'' اس نے بمشکل اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھتے ہوئے کہا تھا، ورنہ عبداللہ اسے جذبات سمیت اس پہ حاوی ہو رہا تھا۔
''ابھی نہیں..... پھر کبھی۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔
''لیکن عبداللہ۔''

PRIME URDU NOVELS

"خدارا پلیز یار! اس وقت تمہارے سوا کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی، ایسے میں اگر کچھ کہہ دوگی تو سر کے اوپر سے گزر جائے گا، اس لیے اپنی بات کل کے لیے اُٹھا رکھو۔" عبداللہ کے کہنے پر نگارش کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی، اس نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیے تھے۔

صبح سنڈے تھا اس لیے جلدی اُٹھنے کی فکر نہیں تھی، وہ دونوں خوب گہری نیند سوئے اور ابھی نہ جانے کتنی دیر تک سوتے کہ اچانک بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا عبداللہ کا موبائل بجنے لگا، رنگ ٹیون کا میوزک بجتے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی، اس نے موبائل اُٹھا کر نمبر دیکھا تو اسکرین پہ بابا جان کا نمبر جلتا بجھتا دکھائی دیا، جسے دیکھ کر عبداللہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا، وہ یکدم اُٹھ بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم بابا جان۔" اس نے محبت اور اشتیاق سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہاں سے نپا تلا سا جواب آیا تھا۔

"بابا جان کیسے ہیں آپ؟ آج..... آج کیں اتنا خوش قسمت کیسے ہو گیا؟" اس کی خوشی اس کی آواز اور لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"ہم نے تمہیں تمہارے لیے فون نہیں کیا، ہم نے تمہیں زری کے لیے فون کیا ہے۔" انہوں نے اس کی خوشی پل میں ختم کر ڈالی تھی۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا اور چند ثانیے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا، لیکن وہ ان کے سامنے جذباتی ہو کر کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا، اسی لیے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے آپے میں ہی رہنا پڑا۔

"زری کے لیے فون کیا ہے؟ خیریت۔" اس کے لب و لہجے میں بھی سنجیدگی اُتر آئی تھی۔

"اسے پاکستان کب بھیج رہے ہو؟"

"پاکستان..... کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں سمجھا نہیں؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"کیا ساری زندگی اسے کنواری بٹھانا چاہتے ہو؟" انہوں نے طنزیہ کہا۔

"دیکھیے بابا جان! آپ جو کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیں، مجھے پہیلیاں سمجھ نہیں آتیں۔" اس نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"برخوردار! بات ویسے ہی صاف صاف ہے، اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟ اس کے لیے رشتہ آیا ہے، اسے پاکستان بھیجو، رشتہ طے کرنا ہے اس کا، شادی کرنی ہے اس کی۔" وہ کافی سخت اور دبنگ انداز میں بول رہے تھے۔ عبداللہ ان کی بات سن کر ٹھٹک گیا تھا۔

"زری کے لیے رشتہ آیا ہے؟" وہ جیسے دہرا کے بولا تھا اور اس کے قریب ہی بیڈ پہ جاگی سوئی سی نگارش بھی اس بات پہ یکدم اُٹھ بیٹھی تھی۔

"ہاں..... اس کے لیے رشتہ آیا ہے، پہلے بھی دو، تین اچھے رشتے آئے تھے، لیکن اس کی پڑھائی کے شوق اور تمہاری ضد کی وجہ سے ان رشتوں کو انکار کر دیا تھا، لیکن اب یہ رشتہ ایسا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا، اس لیے اسے ایک مہینے کے اندر اندر پاکستان بھیجو، بہت ہو گئی پڑھائی، پانچ سال ہونے والے ہیں آخر۔" وہ زری کی واپسی کا حکم جاری کر رہے تھے۔

"ایم سوری بابا جان! وہ اپنی پانچ سال کی محنت اور شوق ادھورا اور آخری اسٹیج پہ چھوڑ کے نہیں آ سکتی، اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور ایگزامز بھی بس چند روز میں اسٹارٹ ہونے والے ہیں، ایک مہینے سے زیادہ ٹائم لگ جائے گا، آپ انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اس رشتے سے انکار کر دیں۔" عبداللہ، زری کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں کرتا تھا، زری اسے بہت عزیز تھی، کیونکہ وہ تھی ہی ایسی نرم اور ٹھنڈی میٹھی، شبد آگیں لہجے والی، صابر اور شاکر، وہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی یا ناانصافی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ عورت ذات ہے وہ، اس کے لیے شادی ضروری ہے یا پڑھائی۔" وہ غصے سے بولے تھے۔

"دونوں چیزیں ضروری ہیں، پہلے پڑھائی، پھر شادی۔" عبداللہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"دماغ چل گیا ہے تمہارا، ولایت کے آزاد ماحول میں رہ رہ کر عزت اور غیرت کے نام کو بھی بھول گئے ہو، بہن کو اپنے نقش قدم پہ چلانا چاہتے ہو۔" وہ فون میں ہی دھاڑنے لگے تھے۔ ان کی آواز ایئر پیس سے باہر تک سنائی دینے لگی تھی۔

"تو کیا آپ کے نقش قدم پہ چلنے دوں؟ عزت، غیرت اور جاگیر کے نام پہ دلوں کو اُجاڑ دوں؟ نام نہاد عزت، نام نہاد غیرت اور جاگیر کی خاطر اپنے سگے اور قابل احترام رشتوں کو خوفزدہ کر دوں؟ بُری نظر رکھوں؟ یا پھر..... یا پھر شہریار کی طرح اسے بھی

کسی چوہدری کی چوہدراہٹ میں دے دوں؟ تاکہ وہ اس چوہدری کی پہلی بیویوں اور ان کے بچوں کو پالتی رہے؟ ہو سکتا ہے فہمی ہے آپ کی، آپ زری پہ کوئی زور زبردستی نہیں کر سکتے، میں اسے ساری زندگی کنواری بٹھا کر اس کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں لیکن اسے کسی چوہدری کے پاؤں کی جوتی نہیں بنا سکتا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں چبا کر بولا تھا۔

"تو تم اپنے باپ سے منتقا لو گے۔" وہ غرا کے بولے تھے۔

"میری اتنی مجال کہاں بابا جان! میں بھلا کون ہوتا ہوں آپ سے منتقا لینے والا؟ آپ والد محترم ہیں ہمارے، آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ، لیکن میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے، زری کے معاملے میں، میں آپ کا کوئی حکم نہیں مان سکتا، وہ پاکستان آئے گی اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر کے اور دوسری بات کہ شادی اس کی پسند اور مرضی کے بغیر نہیں ہو گی، شہریں والا معاملہ زری کے ساتھ نہیں ہو گا۔" اس نے بابا جان کو واضح الفاظ میں بتا رینا اور سمجھا دینا ضروری سمجھا تھا۔

"تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ سخت انداز میں بولے۔

"جی..... کافی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں، اگر ضد پہ آ گیا تو ولایت مجھ سے دور نہیں ہے، میں وہاں بھی آ سکتا ہوں۔" انہوں نے گویا دھمکی دی۔

"شوق سے آیئے، لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ ہو گا وہی جو زری چاہے گی، یہ ملکہ الزبتھ کی ریاست ہے، آپ کی جاگیر نہیں یہاں عورت کی ویلیو ہے، مرد کو تو کوئی جانتا بھی نہیں، یہاں صرف عورت ایک فون کال کرتی ہے اور مرد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے، آپ سوچ لیجیے کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ اگر آپ زری کے لیے آنا چاہتے ہیں تو بھی آنے کا سوچیے گا بھی مت اور اگر آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو آپ کا ریٹرن ٹکٹ میری طرف سے۔" عبداللہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا، اس نے باتوں باتوں میں انہیں بہت کچھ جتا دیا تھا، جسے سن کر انہوں نے یکدم غصے سے فون پٹخ دیا تھا اور عبداللہ موبائل کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر گہری سانس لیتے ہوئے موبائل سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا تھا۔

"کیا بات ہے عبداللہ! بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟" نگارش نے پریشانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھا کر سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"آپ زری کے بارے میں بات کر رہے تھے، آپ زری کو پاکستان بھیج دیں گے؟" نگارش عبداللہ سے بھی زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔

"ارے یار نہیں بھیج رہا۔" عبداللہ سر جھٹکتے ہوئے جھنجلا کر بولا تھا اور نگارش اس کا موڈ دیکھ کر چپ ہو گئی تھی، وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا، وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ کے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی، کافی دیر بعد شاور لے کر باہر نکلی تو عبداللہ کھڑکی میں کھڑا نظر آیا تھا، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اپنے بال سنوارنے لگی، عبداللہ ہنوز گہری سوچ میں گم تھا۔

"آپ شاور لے لیں، میں ناشتہ بناتی ہوں۔" وہ دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتے ہوئے عبداللہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ٹھہرو۔" عبداللہ کی آواز پہ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

"جی؟"

"ادھر آؤ۔" اس نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے قریب آ گئی۔

"رات کو تم کچھ کہنا چاہتی تھیں؟"

"جی..... مگر ابھی مناسب نہیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"ایسی ہی بات ہے جیسی آپ چھپا رہے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نگارش....." عبداللہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"تو پھر آپ بتائیں نا کیا مسئلہ ہے؟ بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟ زری کے رشتے کی بات کر رہے تھے آپ لوگ؟" نگارش بھی برا لگنے سے بولی تھی اور عبداللہ چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا، پھر اسے ساری بات نگارش کو بتانا پڑی، جسے سن کر نگارش ہتک سے بھر گئی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ یہاں سے پڑھ لکھ کر جائے اور وہاں کسی چنڈو، جاہل اور اجڈ کی خدمت گزاری کرے، وہ ان چیزوں کے لینے والی نہیں ہے، آپ نے بابا جان کو بتایا کیوں انہیں کہ زرین، شہرین نہیں ہے، وہ شہرین تھی جو سب کچھ سہہ گئی، یہ تو ایک دن میں مر جائے گی، ہاں اسے مارنا چاہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے، پھر جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔" نگارش، زری کے لیے تڑپ اٹھی تھی اور عبداللہ بے ساختہ نگارش کو دیکھے گیا تھا، وہ اس کے دیکھنے پہ ٹھٹک گئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ اتنی محبت زری سے؟" عبداللہ کی بات پہ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور چہرہ جھکا لیا تھا۔

"یہ سچ ہے عبداللہ! میں زری کو آپ کی بہن نہیں، اپنی بہن سمجھتی ہوں اور اپنے بہن، بھائیوں کے لیے کوئی بھی بُرا نہیں سوچ سکتا۔ بلکہ میں تو شروع سے ہی زری کے لیے کچھ اور سوچتی ہوں۔" نگارش نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا۔ عبداللہ نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"کچھ اور؟ کیا مطلب؟"

"مطلب کہ اس کی شادی کے حوالے سے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "کیا سوچتی ہو اس کی شادی کے حوالے سے۔" وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور نگارش بھی اس کے برابر کھڑی سے لگ کے کھڑی ہو گئی، باہر کا موسم آج پھر ابر آلود ہو رہا تھا۔

"جبیل بھائی اور دل آور بھائی کسی بھی لڑکی کے لیے آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتے ہیں، میں جب بھی ان دونوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے زری کا خیال آتا ہے اور مجھے لگتا ہے زری کی جوڑی دل آور بھائی کے ساتھ ہی سج سکتی ہے کسی اور کے ساتھ نہیں۔" نگارش نے بات کرتے ہوئے جبیل کا ذکر بھی شامل کر لیا تھا، تاکہ عبداللہ کو شک نہ گزرے اور دوسری طرف عبداللہ، نگارش کی بات سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ نگارش کتنی بڑی بات کہہ گئی تھی۔

"عبداللہ! زری کی شادی دل آور بھائی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو جس کا بھی نصیب بنیں گے خوش قسمت کہلائے گی وہ۔" نگارش نے پھر وہی بات دہرائی تھی اور عبداللہ کچھ کہنے کے بجائے گم سم سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"عبداللہ! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔" نگارش نے اس کا بازو ہلایا تھا۔

"کیا کہے ہو سکتا ہے نگارش؟ ایک ناممکن سی بات کہہ رہی ہو تم۔"

"اس جہان میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے عبداللہ! بس کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔" وہ اسے اکسا رہی تھی کچھ کہنے پہ اور کچھ کرنے پہ۔

"نگارش! دل آور میرا دوست ہے، ہم ایک دوسرے کے سامنے سر اٹھا کر رہتے ہیں اور آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں، نہ تو دوسری بہن کے بارے میں اس حوالے سے سوچ سکتا ہے اور نہ ہی میں اسے کچھ کہہ سکتا ہوں۔" وہ حیرانی اور بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے، لیکن اگر وہ کچھ کہے تو پھر آپ کی کیا رائے ہو گی؟" وہ اس کا عندیہ جاننا چاہتی تھی۔

"میں فی الحال اس پاپک پہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے لیے جتنی زری اہم ہے اتنا ہی دل آور بھی اہم ہے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہے اس لیے رائے دینا مشکل کام ہے، پلیز میں پہلے ہی ٹینس ہوں مجھے مزید نہ الجھاؤ۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتی لیکن جب آپ زری کی شادی کا سوچیں تو دل آور بھائی کو بھی سوچیے گا۔" نگارش نے اشارہ سے کہا اور وہاں سے ہٹ گئی تھی لیکن عبداللہ یہ نئی سوچ کے در وا کر گئی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا دوسری طرف ذہن میں بابا جان کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

''منصور حسین! تجھے دیکھ کر میں اک بات سوچ رہا ہوں۔'' عارف نے بڑی دلچسپی سے کہا تھا۔ منصور حسین ابھی اچھی خاصی تھا پرانی سی جینز پہ بدرنگ سی بنیان پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی دلکش رنگت اور کسرتی جسم کے مضبوط مسلز سے متاثر ہو رہے تھے جن کو دیکھ کر عارف کی نظروں میں ستائش اتر آئی تھی۔ اور وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''کیا سوچ رہے تھے مجھے دیکھ کر.....؟'' منصور حسین نے دلچسپی سے پوچھا اور تولیے سے بال رگڑتا ہوا کمرے میں لگے چھوٹے سے شیشے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''تمہارے چہرے کی داڑھی صاف کروا کے، تمہارے بالوں کی کٹنگ کروا کے، تمہیں نئے اور امیروں والے کپڑے سامنے لایا جائے تو قسم سے مجھے پورا یقین ہے تمہارے جیسا جوان پورے شہر میں نہیں ہوگا۔'' عارف نے بڑے شوق اور سے کہا تھا جس پہ منصور حسین یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اس کے قہقہے کی گونج کافی دور تک گئی تھی۔

''اچھا..... تو تم مجھے تصور کی آنکھ سے امیروں والے حلیے میں دیکھتے ہو؟'' منصور حسین کو عارف کی بات بہت دلچسپ لگی تھی۔

''ہاں یار! تمہاری چال ڈھال ہی ایسی ہے، یکسں تمہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے، تمہیں کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا بس غلطی سے غریب گھرانے کے فرزند بن گئے ہو۔'' عارف افسوس سے کہہ رہا تھا لیکن منصور حسین کو کوئی افسوس نہیں تھا، وہ گھرانے میں پیدا ہوا تھا وہ اسی پہ خوش تھا۔

''یار! میری اور غریبی پہ اتنا افسوس یا خوشی نہیں ہونی چاہیے، یہ سدا رہنے والی چیزیں نہیں ہیں، نہ کوئی ہمیشہ امیر رہتا ہے، کوئی ہمیشہ غریب رہتا ہے، وقت اور حالات بدلتے رہتے ہیں، اللہ میرا ساتھ دے تو میں اپنے زور بازو پہ اپنے حالات بدل سکتا ہوں اور جو چیز بدل سکتی ہے اس پہ افسوس کیسا.....؟'' منصور حسین کی بات ہی ایسی تھی کہ عارف کو متاثر ہونا پڑا تھا اور تبھی اس نے اسے بلایا تھا۔

''ہاں یار! یہ بھی تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، لیکن یار میں چوکیدار ہوں اور تم ڈرائیور، اب تم یہ بتاؤ کہ چوکیدار سے ڈرائیوری کر کے حالات کہاں تک بدلے جا سکتے ہیں۔'' عارف کے لب و لہجے میں مایوسی کا رنگ تھا۔

''تو کس نے کہا ہے کہ ساری زندگی چوکیداری کرتے ہی گزار دو، اس سے اچھا اور بہتر کام ملے تو وہ کر لو، میں بھی یہ ڈرائیوری کہ اس ڈرائیوری میں میرے گھر کے حالات کہاں تک بدلتے ہیں؟ اگر نہ ہوا تو کہیں اور ہاتھ پاؤں مار لوں گا۔'' اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

''یار! تم جانتے تو ہو کہیں اور ہاتھ پاؤں مارنا آسان نہیں ہے۔ آج کل کام کہاں ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو حالات بدلنے نہیں ملتا۔'' عارف نے گہری سانس کھینچی تھی۔

''عارف صاحب! تم اللہ کے بندے ہو، اور اللہ کے بندے اللہ سے مایوس نہیں ہوتے، اور وہ کیا کہتے ہیں کہ مشکل کے بعد سے تو خدا بھی مل جاتا ہے تم کام کی بات کرتے ہو؟ کوشش کرو میری جان تمہیں سب کچھ ملے گا، خدا بھی اور خدائی خدائی بھی۔'' منصور حسین نے پلٹ کر عارف کے کندھے پہ تھپکی دی تھی اتنے میں مبارک خان اس کے کوارٹر میں داخل ہوا تھا جسے دیکھ کر منصور حسین مسکرا دیا تھا۔

''دیکھو مبارک خان بھی تو ہے نا، جو کبھی مایوس نہیں ہوا۔'' اس نے مثال دی عارف بھی سر ہلا کر مسکرایا تھا۔

''کیا ہوا اسے؟'' اس نے عارف کا پوچھا۔

''چند منٹوں کے لیے حالت افسوس میں گیا ہے بس، پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے ابھی اس حالت سے نکل آئے گا۔'' منصور حسین نے مبارک خان کو تسلی دی۔

''حالت افسوس میں گیا کیوں تھا؟'' مبارک خان نے وجہ پوچھی۔

''غریب بندہ ہے، کسی بھی وقت حالت افسوس میں جا سکتا ہے اس پہ پابندی تو نہیں ہے نا۔'' منصور حسین نے طرفداری کر رہا تھا۔

''چلو پھر غریب بندے کی دلجوئی بعد میں کر لینا پہلے اپنے کام پہ جاؤ۔'' اس نے منصور حسین کو اشارہ کیا تھا۔

''کام۔؟''

"ہاں..... علیزے بی بی نے کہیں جانا ہے شاید۔" مبارک خان اسے بلانے آیا تھا۔

"جانا کہاں ہے؟"

"شاپنگ پہ جانا ہے شاید ساتھ میں عون اور عدید صاحب بھی ہیں۔" مبارک خان نے اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے پھر تم جاؤ میں آرہا ہوں۔" منصور حسین الرٹ ہو گیا تھا فوراً شرٹ پہن کر اپنے جوتے پہننے کے لیے بیٹھ گیا۔

"جلدی آؤ، وہ ڈرائنگ روم میں تیار بیٹھی ہیں۔" مبارک خان کہہ کر پلٹ گیا تھا اور عارف کے ساتھ وہ بھی کوارٹر سے نکل آیا تھا۔ گاڑی تک پہنچا تھا۔

اتنے میں مبارک خان کی اطلاع پہ علیزے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ حویلی کے مرکزی مین ڈور سے باہر آگئی تھی، منصور حسین نے انہیں دیکھتے ہی گاڑی کے ڈور کھول دیے تھے۔ علیزے اور عدید بیک سیٹ پہ بیٹھے تھے جبکہ عون خود ہی ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا منصور حسین گاڑی کے تمام ڈور بند کر کے دوسری طرف سے گھوم کے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ مین گیٹ بھی وا ہو گیا گاڑی فراٹے بھرتی روڈ پہ آگئی تھی۔

"علیزے آپی! پہلے کہاں جانا ہے؟ آئس کریم پارلر یا شاپنگ سینٹر؟" عون نے گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی علیزے کو دیکھا تھا۔

"یہ تم دونوں کی پسند پہ ڈپینڈ کرتا ہے کیونکہ میں تم دونوں کے کہنے پہ ہی تو آئی ہوں۔" علیزے نے لاپروائی ظاہر کی۔

"اوہ..... یعنی ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں؟ ہمیں کھلی چھوٹ ہے؟" عون نے چہکتے ہوئے علیزے کو چھیڑا تھا۔

"زیادہ بھی کھلی چھوٹ نہیں ہے، بس آئس کریم یا پھر شاپنگ، اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، میں نے انہی دونوں چیزوں کا وعدہ کیا تھا۔" علیزے نے ان کو ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"آپی صاحبہ! آپ نے اپنا وعدہ ایفا کرنے میں اتنے دن لگا دیے ہیں اب تو قرض کے ساتھ سود بھی کافی بن چکا ہے، شاپنگ اور آئس کریم کے ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی حق بنتا ہے ہمارا اور آپ ہمیں ہمارے حق سے محروم نہیں کر سکتیں۔" عدید نے بھی مطالبے میں حصہ لیا تھا۔

"تم دونوں بلیک میل کر رہے ہو، تم لوگوں نے کہا تھا کہ صرف آئس کریم کھانی ہے یا پھر شاپنگ کرنی ہے، اب یہ تیسرا حق کہاں سے نکل آیا؟" علیزے نے ان دونوں کی بے ایمانی پہ احتجاج کیا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم کچھ بھی نہیں کرتے، ہم واپس چلتے ہیں، ڈرائیور گاڑی واپس لو۔" پیچھے سے عدید نے شور مچا دیا تھا اور منصور حسین ان کے شور پہ گاڑی روکنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور بے ساختہ بیک ویو مرر سے علیزے کو دیکھا اس کی دفریب سی صورت پہ پریشانی کے سائے پھیل رہے تھے وہ یکا یک اس کی چالاکی دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ؟"

"ظاہر ہے خالی شاپنگ کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟ وہ تو ہم کسی کے ساتھ بھی جا کر سکتے ہیں، آپ ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو بہتر ہے واپس حویلی چلے جاتے ہیں۔" عون نے کندھے اچکائے اور علیزے ان دونوں کی چالاکی اور ہوشیاری دیکھ کر بے بس ہو گئی تھی۔ گھر سے اتنی دور آکر وہ واپس بھی جاتے تو اچھا نہ لگتا اور اگر وہ واپس چلے بھی جاتے تو علیزے کو معلوم تھا کہ وہ دونوں ساری زندگی اعدہ نہ نبھانے پہ طعنے دے دے کر مار دیتے۔ اس لیے بہتر تھا کہ ان کی بات مان لیتی جو مشکل تو تھی لیکن ناممکن نہیں تھی۔

"چلو ڈرائیور۔" علیزے نے اشارہ کیا۔

"کہاں؟" وہ ابھی بھی بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا علیزے کی نگاہ اٹھی تو اسے اپنی سمت دیکھتے پا کر چہرے پہ ناگواری بکھر گئی تھی۔

"مارکیٹ۔" وہ ناگوار لہجے میں ہی بولی تھی۔

"صرف مارکیٹ؟" عون نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں..... جہاں تم لوگ کہو گے وہاں بھی۔" وہ چڑ کے بولی۔

"یس۔" انہوں نے یکدم نعرہ لگایا تھا اور منصور حسین نے گاڑی آگے بڑھا دی علیزے نے دو تین بار پھر دھتے دھتے سے مرر سے دیکھا تھا لیکن اسے دوبارہ منصور حسین کی نظریں جھکی ہی نظر آئی تھیں بیک ویو مرر اس کی آنکھوں سے خالی تھا اور وہ اپنے آپ

کو اطمینان دلاتی دوبارہ سے عون اور عدیل کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھی "بس" کے سامنے گاڑی پارک کی تو وہ تینوں بھی اپنی گاڑی سے اُتر گئے تھے اور منصور حسین نے وہیں ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس نکال کر سگریٹ سلگا لیا اور تیلی کو پھونک مار کے بجھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا لیکن آگے بڑھتے ہوئے بلا ارادہ ہی عون کی نظر منصور حسین پہ پڑی تھی اس کے قدم تھم گئے، وہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس منصور حسین کی سائیڈ پہ آ رُکا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" اس نے اسے متوجہ کیا منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا۔

"جی کہیے؟" وہ الرٹ ہو گیا۔

"آپ اس گاڑی میں سگریٹ نہیں پی سکتے۔" عون جیسے حکم صادر کر رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا یہ گاڑی موم کی بنی ہے یا پھر اس میں بم فٹ ہے۔" منصور حسین بھی عادت سے مجبور تھا کہے بغیر نہ رہ سکا یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ جس سے وہ بات کر رہا ہے وہ اس کے مالک کا بیٹا ہے۔ کچھ بھی کہہ سکتا ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

"نہ موم کی بنی ہے، نہ بم فٹ ہے، یہ گاڑی علیزے آپی کی ہے اور انہیں سگریٹ کی بُو سے سخت الرجی ہے، ان کی وجہ سے آج تک حویلی میں کسی مرد نے اسموکنگ نہیں کی، اس لیے پلیز آپ بھی احتیاط کیجیے، ورنہ یہ اسموکنگ آپ کو جاب سے نکلوا بھی سکتی ہے۔" عون اتنا بڑا نہیں تھا لیکن اس نے علیزے کو خود سے کئی سال بڑا اور ذہین محسوس ہوا تھا۔

"اور ہاں..... میری بات کو مائنڈ مت کیجیے گا، مجبوری ہے، آپ کو اگر اسموکنگ کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو گاڑی سے باہر آ جائیے۔" اس نے منصور حسین کو سگریٹ پینے کا حل بتایا تھا اور پلٹ کر علیزے اور عدیل کے پاس آ گیا جو چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے اس کی بات سن رہے تھے منصور حسین چند لمحے یونہی بیٹھا رہا، پھر گہری سانس کھینچ کر گاڑی سے نکل آیا تھا لیکن اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو بجھانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ دور جاتے عون کو پیچھے تک دیکھا تھا جس کی چال ڈھال اور بات کرنے کے انداز میں ہی امیری کا زعم تھا اور منصور حسین اس بچے سے کئی سال بڑا ہونے کے باوجود بھی اس کے سامنے بس اس لیے کیونکہ غربت اس کی مجبوری تھی ایسی مجبوری جس پہ کچھ دیر پہلے عارف افسوس کر رہا تھا اس کے افسوس کی وجہ منصور حسین کو سمجھ آ گئی تھی کہ کبھی کبھی بندے کا جہاں بولنے کو دل چاہے وہ مجبوری کے مارے بول بھی نہیں سکتا۔

♥

آنے سے اس کے آئے بہار، جانے سے اس کے جائے بہار
بڑی مستانی ہے میری محبوبہ، میری زندگی ہے میری محبوبہ

عدیل کے ساتھ فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے چھوٹا بڑی ترنگ میں گانا گنگنا رہا تھا اور چھیڑتی ہوئی معنی خیز سی نظریں عدیل پہ ہی مرکوز کر رکھی تھیں۔ عدیل جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے گنگنا رہا ہے۔ اسی لیے وہ کسی ان سنی کرتا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا سڑکوں پہ تو جیسے گاڑیوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا اور اس سیلاب میں سے گزرنا اور اپنے لیے راستہ بنانا بے حد دشوار ہو رہا تھا شاید دونوں موقعے کی تلاش میں تھے کہ کب وقفہ پڑے اور وہ دونوں سڑک کراس کر کے دوسری فٹ پاتھ پہ جائیں جہاں سے دوسرا اسٹاپ قریب تھا کیونکہ ان کے روٹ کی بس دوسرے بس اسٹاپ سے باسانی مل جاتی تھی۔

"استاد! اتنے دن ہو گئے آپ کو اس حسینہ سے دوبارہ کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔" چھوٹے نے اسے چھیڑتی دیا عدیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن گھورتی ہوئی نظروں سے۔

"اس قیامت خیز ماحول میں تمہیں وہ حسینہ یاد آ رہی ہے؟" عدیل کی بات پہ چھوٹا بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"تمہیں کیا پتا استاد قیامت خیز ماحول میں اگر کوئی حسینہ یاد آ جائے تو وہ بھی جنت خیز ہو جاتا ہے، یہ بدذائقہ آوازوں والی گاڑیاں بھی خوش نما تتلیاں لگنے لگتی ہیں۔" چھوٹا سر در لیتے ہوئے بولا تھا اور عدیل اس کے انداز پہ بے ساختہ اُمڈنے والی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا جس کو دیکھ کر چھوٹا خود بھی ہنس پڑا۔

"پاگل ہو تم لوگ بھی۔" عدیل نے کہتے ہوئے سر جھٹکا اور مسکرا دیا۔

"پاگل نہیں ہم لوگ درویش ہیں درویش جو بات کہہ دیں وہی ہوتی ہے اور میں نے تو پہلے روز سے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ پلٹ حسینہ ہمارے استاد کی ہے، اور دیکھ لینا استاد ایسا ہی ہو گا اور جس دن ایسا ہوا میں داتا دربار جا کر حاضری دوں گا اور روٹ

بھی نیک چڑھاؤں گا وہ بھی اپنی محنت مزدوری کی کمائی سے۔" چھوٹا بڑے جوش و خروش سے اور پُرعزم لہجے میں کہہ رہا تھا اور عدیل اس کی خوش فہمیوں پہ مسکراتا ہوا چھوٹے کا ہاتھ پکڑ کے سڑک کراس کرنے کے لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن انتہائی تیز رفتار گاڑی کے ہارن بڑے زور سے چیخ چرائے تھے ان دونوں کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا وہ دونوں فٹ پاتھ پہ منہ کے بل گرتے گرتے بچے تھے چھوٹے کے گھٹنوں پہ خراش آئی تھی اور عدیل بمشکل اپنا توازن برقرار رکھ سکا تھا لیکن وہ پیچھے کی طرف پلٹا تو بڑے جارحانہ انداز میں نگراتے میں وہ بھی گاڑی سے اُتر چکی تھی۔

عدیل اسے دیکھ کر چونکا تھا تو وہ بھی اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی اور اس کا اس روز والا غصہ بھی عود کے آیا تھا۔

"تو آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ نے میری ہی گاڑی کے نیچے آ کر مرنا ہے؟" وہ چبا چبا کر کہتی ہوئی اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھی بلیک جینز پہ بلیک ٹاپ پہنے بلیک ہی گاگلز چڑھائے وہ اس روز سے بھی زیادہ قیامت خیز لگ رہی تھی گھنگھریالے سیاہ بالوں اور تیکھے نین نقوش کے ساتھ غصہ اس کی ناک پہ براج رہا تھا عدیل نے آج تک کسی لڑکی کو اس طرح "گہری نظر" سے نہیں دیکھا تھا اور آج جب دیکھا تھا تو دبی دبی سی مسکراہٹ لبوں پہ کھل گئی تھی اک دلکش سا احساس پورے ماحول میں بکھر گیا تھا اور ان دونوں کو دیکھ کر چھوٹا اپنے گھٹنوں کی تکلیف بھی بھول گیا تھا وہ حسینہ صرف حسینہ ہی نہیں تیز دھار تلوار تھی کلیجے میں آر پار ہو جاتی تھی۔

"آپ نے بھی تو طے کر لیا ہے کہ مجھے اپنی گاڑی کے نیچے دے کر مارنا ہے۔" وہ بڑے لاپروا اور دلچسپ سے انداز میں بولا تھا۔

"مجھے آپ کو مارنے کا کوئی شوق نہیں ہے مسٹر۔"

"لیکن مجھے تو مرنے کا بہت شوق ہے میڈم۔" جواب برجستہ تھے۔

"تو پھر مرنا ہے تو کسی اور گاڑی کے نیچے آ کر مریں، اپنا قتل میرے سر کیوں ڈال رہے ہیں؟" وہ کاٹ کھانے کو آئی تھی۔

"کیونکہ آپ جیسا قاتل پورے شہر میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔" وہ مسکرا کے بولا تھا نہ جانے کیوں وہ اسے دیکھ کر غصہ بھول گیا تھا اور بلا ارادہ ہی اسے چھیڑ بیٹھا تھا۔

"شٹ اپ مسٹر! تمہارے جیسے لوفروں کی چالاکیاں میں خوب سمجھتی ہوں لڑکیوں کو پھانسنے کے لیے خوامخواہ بات کو بڑھاتے ہو۔" وہ غصے سے پھنکاری تھی لیکن اس سے کم وہ بھی نہیں تھا۔

"میڈم! میں بھی آپ جیسی لڑکیوں کی چالاکیوں سے بخوبی واقف ہوں جہاں ایکسیڈنٹ کی کوئی تک نہ بھی بنتی ہو وہاں بھی ایکسیڈنٹ کر لیتی ہیں تاکہ لڑکوں سے پہلے لڑائی جھگڑا کریں پھر بات آگے بڑھائیں، لیکن میڈم! آپ کی نظر انتخاب غلط جگہ پہ ٹھہری ہے، میں تو غریب سا بندہ ہوں پیدل چلنے والا اور بسوں پہ دھکے کھانے والا، آپ ٹھہریں زیرو میٹر گاڑی اڑانے والی، میرا اور آپ کا بھلا کیا جوڑ ہو سکتا ہے؟ آپ اپنی راہ لیں، میں اپنی راہ۔" اس نے کہہ کے لاپروائی سے شانے اچکائے تھے اور مدیحہ کی تو جان جل گئی تھی۔

"او یو۔" اس نے ایک دم تلملا کر اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تھا لیکن وہ ایسا ناداں اور کم فہم بھی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ سے تھپڑ کھا لیتا اس نے بھی اپنے چہرے کی طرف آتے اس کے ہاتھ کو یکدم اپنی مضبوط گرفت میں جکڑا تھا اور اس کے ہاتھ کو جھٹکے سے اپنی سمت کھینچا تھا وہ اس جھٹکے سے اس کے اور قریب آ گئی تھی عدیل نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھوں پہ سے سن گلاسز اتار لیے تھے۔

"میڈم! آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ پاکستان ہے اور آپ پاکستان کے شہر لاہور میں کھڑی ہیں یہاں آپ کی انگلش اور گلاسز کا رعب نہیں چلے گا، اپنی گاڑی کو، اپنی زبان کو اور اپنے ہاتھ کو لگام ڈال کر اپنے کنٹرول میں رکھیے، ورنہ کئی ماؤں نے ایسے لعل بھی پیدا کیے ہیں جو کنٹرول کرنے پہ آ جائیں تو آپ جیسی بگڑی ہوئی چیزیں ایک منٹ میں ہی تیر کی طرح سیدھی ہو جاتی ہیں، اور دوسری بات یہ کہ آپ کو پھانسنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ آپ تو ویسے ہی سراپا دعوت ہیں، پورا شہر دیکھ رہا ہے، میں کوئی اکیلا تو نہیں ہوں اکیلے والا؟" وہ جس انداز میں دیکھتے ہوئے لفظ چبا کر بولا تھا مدیحہ سر سے پاؤں تک جل کر خاک ہو گئی تھی۔

"تم لوگ ..."

''خاموش..... آپ سڑک کنارے کھڑی ہیں اس لیے لحاظ کر رہا ہوں ورنہ آپ کو اس تھپڑ کا جواب بھی ضرور دیتا اور میرے چہرے پہ پڑا نہیں لیکن مجھے محسوس ضرور ہو چکا ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تلخی سے بولا تھا۔ چھوٹے نے حیرانی سے آنکھیں پٹپٹا کر عدیل کی سمت دیکھا تھا وہ اتنا غصے میں پہلے تو کبھی نظر نہیں آیا تھا لیکن آج تو اس کے رنگ ہی اور تھے۔ اس نے مدیحہ کا ہاتھ اک نظر دیکھا پھر جھٹکے سے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا ذرا سے فاصلے پہ بس اسٹاپ تھا اور بس وہاں آ چکی تھی۔

''چل چھوٹے، بس آ چکی ہے۔'' اس نے چھوٹے کو اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا تھا لیکن مدیحہ پیچھے ششدر سی کھڑی تھی یہ پاکستان تھا اور اسے واقعی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟ وہ آدمی دوسری بار اس کی انسلٹ کر گیا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔

دوسری ملاقات بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہیں تھی بس فرق یہ تھا کہ پہلی ملاقات میں وہ اکیلا تھا اور دوسری ملاقات میں ایک اور لڑکا اس کے ساتھ تھا وہ دونوں بس کے ہجوم میں گم ہو چکے تھے اور وہ جلتے دل و دماغ کے ساتھ پلٹ کر گاڑی میں بیٹھی اور جھٹکے سے اڑا لے گئی تھی جبکہ دوسری طرف وہ دونوں پریشان سے کھڑے رہے کیونکہ بس میں سوار ہونے سے پہلے اچانک چھوٹے کی نظر عدیل کے دائیں ہاتھ کی سمت اٹھی تھی اور وہ ٹھٹک گیا تھا۔

''استاد! یہ کیا ہے؟'' اس نے اشارہ کیا جس پہ عدیل نے چونک کر اپنے ہاتھ کی سمت دیکھا اس کے ہاتھ میں اس لڑکی کے گلاسز تھے جو عدیل نے غصے میں اس کی آنکھوں سے اتارے تھے۔

''یہ کیوں لے آئے ہو استاد؟'' چھوٹا حیران ہوا۔

''میں کب لے کر آیا ہوں یہ تو اسے واپس کرنا یاد ہی نہیں رہا۔'' عدیل خود بھی پریشان ہوا تھا اور پھر بے ساختہ دکھ کو پیچھے ہٹا کر اس کی گاڑی کی سمت لپکا لیکن وہ اپنی گاڑی سمیت غائب ہو چکی تھی۔

''وہ تو۔'' عدیل مایوسی سے وہیں کھڑا رہ گیا۔

''چلی گئی؟''

''ہاں۔''

''چلو شکر ہے۔'' چھوٹے نے شکر ادا کیا۔

''وجہ؟''

''قیامت گزر ہی جائے تو اچھی ہوتی ہے، ٹھہر جائے تو سب تباہ ہو جاتا ہے۔'' اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''لیکن استاد! تمہاری پکچر بھی خیر نہیں ہے، ایک بار پھر تمہاری شامت آنی ہے اور ضرور آنی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کہ اس حسینہ کا چشمہ چرایا ہے تم نے۔'' چھوٹے نے آنکھیں مٹکائیں۔

''یار! میں نے کب چرایا ہے؟''

''استاد! یہ تو تم میرے سامنے مکر رہے ہو نا؟ اس کے سامنے کہو گے تو پتا چلے گا۔'' چھوٹا اسے چھیڑ رہا تھا۔

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بس یار ویسے ہی اچھا نہیں لگ رہا، کیا سوچے گی بھلا؟''

''کچھ نہیں سوچے گی، لوفر، لفنگا کہے گی اور بس۔'' چھوٹے نے کندھے اچکائے اور عدیل چپ ہو گیا تھا پھر گاڑی میں سوار ہوئے تو اس نے وہ گلاسز احتیاط سے اپنی قمیص کی اوپری جیب میں ڈال لیے تھے اور ان گلاسز کے ساتھ اک عجیب سا الوداع کا احساس تھا جو عدیل کے سینے کو چھو گیا تھا بس لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بیٹھنے کے لیے سیٹ نہیں تھی کھڑے ہو کے سفر کرنا تھا اور بھی کئی لوگ کھڑے تھے اور ان میں وہ بھی شامل تھا مگر اک دلکش سا احساس لیے، عجیب سے مہکتے ہوئے جذبات کے ساتھ۔ اپنے جذبات کو لیے وہ گھر آیا تھا اور جیب سے وہ دلکش سا احساس نکال کر احتیاط اور آہستگی سے اپنے بستر کے سرہانے رکھ کر خود کپڑے اتار کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا تھا لیکن جذبات اب بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

♥

شاپنگ کرنے اور کئی جگہوں پہ گھومنے پھرنے کے بعد وہ فارغ ہو چکے تو آئس کریم کے لیے شور مچا دیا تھا لیکن علیزے

PAKISTAN URDU NOVELS
PRIME URDU

کا تھیں جواب دے چکی تھیں۔

"پلیز عون! اب گھر چلتے ہیں۔" واٹر پارک سے نکلتے ہوئے علیزے نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"بس اب صرف آئس کریم ہی تو رہ گئی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"دیکھو پلیز! میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ نڈھال سے انداز میں کہتی قریب آئی تو منصور حسین نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے منصور حسین کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اسے منصور حسین کی کاٹ دار اور بے باک آنکھیں ناگوار گزرتی تھیں۔

"لیکن ہم تو ابھی بھی نہیں تھکے۔" عدید نے کندھے اچکائے۔

"میں تم دونوں کی شکایت کروں گی پاپا سے۔" اس نے دھمکی دی۔

"کوئی بات نہیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" وہ دونوں ہنس رہے تھے اور وہ انہیں گھور کے رہ گئی۔ جیسے ہی منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کی علیزے کا دھیان اسموکنگ کی طرف چلا گیا اسے گاڑی میں سگریٹ کی بو محسوس ہوئی تھی اور اس کی پیشانی پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"پلیز ڈرائیور ایئر فریشنر آن کرو، گاڑی میں سگریٹ کی سمیل ابھی بھی ہے، میرا دماغ بھاری ہو رہا ہے۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا عون اور عدید نے چونک کر علیزے کی سمت دیکھا وہ دونوں پریشان ہو گئے تھے جبکہ منصور حسین حیران پریشان رہ گیا تھا گاڑی میں ذرا سی بھی سمیل نہیں تھی جو تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی حس اتنی تیز تھی کہ وہ ذرا سی سمیل بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھی اور یہ حیرت، تعجب اور بے یقینی کا ہی مقام تھا اتنی نازی بھی تو نہ کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی اسے تو روز حیرت کے جھٹکے لگتے تھے۔

"ڈرائیور! آپ ایئر فریشنر آن کر کے گاڑی کے تمام شیشے فولڈ کر دیں۔" عون نے تیزی سے کہا تھا اور حیران پریشان منصور حسین نے تیزی سے ایئر فریشنر کا بٹن پش کیا اور تمام کھڑکیوں کے شیشے فولڈ کر دیے تھے باہر کی تازہ ہوا اندر آنے لگی تھی تب جا کے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے پہ آیا تھا۔

"کسی کولڈ کارنر پہ گاڑی روکو۔" علیزے نے حکم جاری کیا تھا منصور حسین نے دائیں بائیں دیکھا قریب ترین کوئی بھی کولڈ کارنر نہیں تھا۔ تھوڑا آگے جا کر اسے آئس کریم پارلر دکھائی دیا تھا اور وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا کر وہاں تک فوراً پہنچا تھا۔

"آپ آئس کریم لیں گی یا کولڈ ڈرنک؟" منصور حسین خود ہی گاڑی سے اتر گیا تھا۔

"ملک شیک ہوا تو لے آؤ علیزے آپی کولڈ ڈرنک نہیں لیتیں۔" عدید نے جواب دیا تھا۔

"اور آپ کے لیے؟" اس نے عون اور عدید دونوں کو دیکھا۔

"نہیں ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بیچارے دونوں ہی سہم چکے تھے منصور حسین بھی کافی پریشان ہوا تھا وہ تیزی سے اندر گیا اور اس کے لیے ملک شیک ہوانے کے ساتھ ساتھ عون اور عدید کے لیے مینگو فلیور آئس کریم بھی لے آیا تھا۔ ان تینوں بہن بھائیوں کو چھوٹی ٹرے گاڑی کے اندر ہی مہیا کی تھی اس نے۔

"آپ نے کچھ نہیں لیا؟" عون اور عدید وغیرہ کو شروع سے خبر دیا اور مبارک خان کے ساتھ بے تکلفی کی عادت تھی اسی لیے منصور حسین کے ساتھ بھی وہ اسی طرح سے پیش آ رہے تھے۔

"ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"آئس کریم ضرورت کے لیے نہیں کھائی جاتی بلکہ شوق سے کھائی جاتی ہے۔"

"مجھے شوق بھی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ کو صرف اسموکنگ کا شوق ہے؟"

"ہاں..... شوق تو ہے لیکن لگتا ہے کہ چھوڑنا پڑے گا۔"

منصور حسین نے کہتے ہوئے اک نظر علیزے کی سمت دیکھا جس کے حواس ٹھکانے پہ آئے تو چہرے سے ہی فریش لگنے لگی تھی۔

''چھوڑ دیں تو اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات تو ہے لیکن آسان بات نہیں ہے نا۔''

''کوشش کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔'' عون نے بڑے بزرگوں کی طرح دلیل دی۔

''ہوں..... کروں گا کوشش۔'' اس نے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور راستے میں علیزے نے ملک شیک کا گلاس خالی کر کے منصور حسین کی طرف بڑھا دیا تھا وہ احتیاط سے ٹرے اور بل لے کر واپس چلا گیا تھا واپس گاڑی میں آیا تو وہ تینوں بہن بھائی واپسی کے لیے تیار بیٹھے تھے منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ علیزے کا موبائل بجنے لگا۔

''ہیلو آذر بھائی۔''

''السلام علیکم! علیزے..... کہاں ہو تم؟'' آذر نے پریشانی سے پوچھا وہ اک پل بھی ادھر اُدھر ہو جاتی وہ سب کے سب متفکر ہو جاتے تھے۔

''جی وہ میں عون اور عدید کے ساتھ آئی تھی انہوں نے مجھ سے شاپنگ کا وعدہ لیا تھا اس لیے پورا کرنا پڑا۔''

''علیزے! پاگل ہو گئی ہو تم؟ جانتی بھی ہو کہ حالات کیسے ہیں۔ پھر بھی تم ان بچوں کے ساتھ چلی گئیں؟''

''آذر بھائی! میں ان کے ساتھ اکیلی تو نہیں ہوں، ڈرائیور بھی ساتھ ہے، آپ اور پاپا خود ہی تو کہتے ہیں کہ جب ڈرائیور ساتھ ہو تو تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو اور آذر بھائی اس کی غلطی پہ اس سے خفا ہو گئے ہوں۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں ٹائم کا اندازہ ہے کوئی؟ شام ڈھل چکی ہے اور اندھیرا بھی بس گھرا ہونے والا ہے؟'' آذر اس کے لیے اتنا فکر مند ہو رہا تھا کہ بے دھیانی میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ اُلٹا علیزے کو پریشان کر چکا ہے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے وہ خود کو رونے سے روک نہیں پائی تھی۔

''علیزے.....'' آذر نے چونک کر بے تابی سے پکارا تھا وہ اس کی سسکی سن چکا تھا۔

''بھائی! میری کوئی غلطی نہیں ہے، بس وہ ضد کر رہے تھے، مم..... میں انہیں..... منع نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے ہی اتنا ہم کر دیا ہے۔'' وہ روہانسے انداز میں روتے ہوئے بے ربط سا بول رہی تھی اور آذر کی تو جان پہ بن آئی تھی وہ خواہ مخواہ اسے رلا بیٹھا تھا۔

''علیزے پلیز یار! روؤ مت، میں تمہیں ڈانٹ نہیں رہا، تمہیں صرف واپسی کا احساس دلا رہا ہوں۔ ڈیڈ بھی تمہارا پوچھ رہے تھے انہوں نے ہی مجھے فون کرنے کو کہا ہے۔''

''لیکن بھائی! ہم تو واپس ہی آ رہے ہیں۔''

''او کے پھر فون بند کرو، میں انتظار کر رہا ہوں۔'' آذر نے بات سمیٹتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا تھا اور علیزے نے بھی فون بند کر دیا مگر اس کے آنسو بند نہیں ہوئے تھے اس کا ذرا سا تو دل تھا اونچی آواز کی دھمک بھی نہیں سہہ پاتا تھا۔ منصور حسین، عون اور عدید تینوں خاموش بیٹھے تھے وہ اس کا سچ کی گڑیا کو کب تک بہلاتے؟ اور دس منٹ بعد خدا خدا کر کے وہ لوگ واپس بڑی حویلی پہنچے تو شکر کا سانس لیا تھا۔ گاڑی گول روش پہ گھوم کر گیراج کی طرف آئی تو آذر بھی قریب آ گیا تھا۔ منصور حسین نے فوراً اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا تھا نڈھال سی علیزے تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

''علیزے! آر یو آل رائٹ؟'' آذر نے فوراً اسے کندھوں سے تھام کے سہارا دیا تھا۔

''مم..... مجھے اندر جانا ہے۔'' وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی عون اور عدید بیچارے سہمے ہوئے کھڑے تھے کہ زیادہ جام ویب کرنے پہ انہیں اب ضرور ڈانٹ پڑے گی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' آذر اسے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا عون اور عدید بھی پیچھے پیچھے ہی گئے تھے جبکہ منصور حسین ڈگی کھول کے ان کے بیگز نکالنے لگا عون، عدید اور علیزے تینوں نے ہی ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی اس لیے بیگز بھی کافی زیادہ تھے سارے بیگز اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر پلٹا تو مبارک خان مین ڈور سے باہر آتا دکھائی دیا۔

''یہاں کیوں کھڑے ہو منصور حسین؟'' مبارک خان نے رُک کر پوچھا۔

"علیزے بی بی کے شاپنگ بیگز ہیں، کیا کروں؟" اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اس کے منبسط ہاتھ کی انگلیاں شاپنگ بیگز کے بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔

"علیزے بی بی کے شاپنگ بیگز ہیں تو اندر پہنچا کر آؤ، وہ خود تو یہاں لینے نہیں آئیں گی نا؟ تھوڑا بہت خود بھی عقل سے کام لے لیا جائے۔" مبارک خان نے اسے سرزنش کی تھی منصور حسین چپ ہو گیا۔

"جاؤ ان کا سامان اندر رکھ کے آؤ۔" اس نے راستے سے ہٹتے ہوئے کہا اور منصور حسین سر ہلا کر اندر آ گیا۔ اس نے حویلی کے اندرونی حصے میں پہلی بار قدم رکھا تھا اور آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں آبنوسی مین ڈور سے لے کر کوریڈور کے سنگ مرمر سے مزین چمکتے فرش تک ہر چیز کمال تھی۔

طویل کوریڈور میں تقریباً پانچ درمیانے سائز کے فانوس لٹکے ہوئے تھے اور پانچوں کا ایک ہی ڈیزائن تھا دیواروں کے ساتھ کچھ قدیمی اور کچھ جدید دور کے مناظر کی فریم شدہ پینٹنگز اور تصاویر سجی ہوئی تھیں، قطعے وقطعے سے چار پانچ آبنوسی لکڑی کے ڈیکوریشن کارنر رکھے ہوئے تھے جن پہ کچھ کرسٹل جیسے اور کچھ جانوروں کے آرٹی فیشل اجسام سجا رکھے تھے جن میں شیر اور ہرن سرفہرست تھے۔ بڑے بڑے قیمتی گلدانوں میں مختلف قسم کے ان ڈور پلانٹس بھی موجود تھے اور منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جن کا کوریڈور اتنا گلزار ہے ان کے بیڈ روم اور باقی گھر کا کیا حال ہو گا؟ وہ کوریڈور کی خوبصورتی میں گم کب کوریڈور کے آخری سرے پہ پہنچ گیا پتا ہی نہ چلا تھا چونکا تو وہ اس وقت جب اس کی سماعتوں سے وقار آفندی کی آواز ٹکرائی تھی لیکن آواز اتنی خفیف اور جانچتی لیے ہوئے تھی کہ منصور حسین پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"میری جان، میری گڑیا، آذر نے تمہیں بھلا کب ڈانٹا ہے؟ وہ تو صرف تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا، شام کہری ہو چکی تھی اور تم لوگ واپس ہی نہیں آ رہے تھے، پہلے بھی تمہارے ساتھ اتنا سنگین حادثہ پیش آ چکا ہے اب پھر کچھ ہو جاتا تو؟" وقار آفندی ڈرائنگ روم کے جہازی سائز صوفے پہ بیٹھے علیزے کا سر اپنے کندھے سے لگائے تھپک رہے تھے اور وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"علیزے! دیکھو اگر تم اب بھی چپ نہ ہوئیں تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا، تم نے ذرا سی بات پہ مجھے مجرم بنا دیا ہے، میں کتنی خجل کر رہا ہوں۔" آذر اور وقار آفندی اسے منانے بہلانے اور چپ کرانے کی کوششیں کر رہے تھے، جس پہ آسیہ آفندی بے ساختہ مسکرا اٹھی تھیں اور نجانے کیوں ان کی نظریں آذر پہ ٹھہر ہی گئی تھیں لیکن نظروں کے ٹھہرنے کا مقصد کچھ اور تھا..... وہ کب سے علیزے کو منا رہا تھا۔ بہلا رہا تھا اس کی خوشی کے لیے بار بار سوری کر رہا تھا اور اس کے انداز میں اتنی چاہ اور اتنی محبت تھی کہ آسیہ آفندی کی نظروں سے اس کے جذبات چھپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے علیزے اس کی جھکی پہ چپ ہو گئی تھی اور آذر اپنی دھونس کے اثر پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا، آسیہ آفندی بھی انہیں مسکراتے دیکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی تھیں لیکن باہر منصور حسین کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئیں۔

"کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"جی وہ علیزے بی بی کا سامان رکھنے آیا ہوں۔" اس نے شاپنگ بیگز دکھائے۔

"جاؤ اس کے بیڈ روم میں رکھ آؤ۔"

"بیڈ روم میں؟" وہ حیران ہوا۔

"ارے نہیں ایک منٹ ٹھہرو۔"

"جی۔" وہ رک گیا۔

"رجو..... رجو..... کہاں گئی ہو؟" انہوں نے کچن میں کام کرتی رجو کو پکارا تھا وہ ہینڈ ٹاکن سے ہاتھ پونچھتی بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"جی بیگم صاحبہ؟"

"اس کے ساتھ جاؤ اور علیزے کا سامان اس کے بیڈ روم میں رکھواؤ۔" انہوں نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا رجو نے پلٹ کر منصور حسین کو دیکھا اور دیکھ کر آنکھوں کا رنگ بدل گیا وہ جو کوئی بھی تھا دل کے تار ہلا دینے والوں میں سے تھا۔ "رجو" آسیہ آفندی کے پکارنے سے وہ چونک کر حواسوں میں لوٹ آئی۔

"جی..... جی بیگم صاحبہ۔"

"کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟ جو کہا ہے وہ سنائی نہیں دیا تمہیں؟"

"جج..... جی بیگم صاحبہ جا رہی ہوں۔" وہ فوراً آگے بڑھی۔

"جاؤ تم بھی۔" انہوں نے منصور حسین کو اشارہ کیا۔

"جی بہتر۔" وہ کہہ کے رجو کے پیچھے ہی چل پڑا تھا کشادہ سیڑھیوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی رجو اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ آخری پورشن پہ پہنچ کر وہ دائیں طرف مڑ گئی دائیں طرف کے آخر والا کمرہ علیزے کا تھا وہ بیڈروم کے دروازے کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔

"علیزے بی بی کے بیڈروم میں اور کوئی ملازم نہیں جا سکتا۔ صرف میں جاتی ہوں۔ اس لیے تم یہیں ٹھہرو، میں باری باری سامان اندر رکھ دیتی ہوں۔" رجو نے اسے اندر آنے سے روکا تھا وہ وہیں دروازے کے باہر ہی ٹھہر گیا وہ اکتایا ہوا اور بیزار ہو رہا تھا۔ اس لیے جلد از جلد اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا جو چار پانچ بیگ لے کر اندر گئی تھی۔ پھر دوبارہ سے لے کر گئی اور دوبارہ بھی رکھ آئی تھی بیگز سے ہاتھ آزاد ہوئے تو وہ ہاتھ جھاڑ کے واپسی کے لیے پلٹا تھا۔

"سنو۔" رجو لپک کے بیڈروم سے باہر آئی تھی۔

"جی سنائیں؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"منصور حسین۔"

"اچھا نام ہے۔"

"جی شکریہ۔"

"علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو؟"

"جی خوش قسمتی سے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور میں علیزے بی بی کی خاص ملازمہ ہوں۔"

"اور میں خاص ڈرائیور۔" منصور حسین نے دلچسپی سے مسکرا کر کہا تھا۔

"خاص تو تم دور سے ہی لگ رہے ہو۔" رجو عام سی اک لڑکی تھی عام سے جذبات تھے اپنا ہم پلہ مرد دیکھا تو فوراً ہی زچ ہو گئی تھی۔

"قریب سے دیکھنے پہ اور بھی خاص لگتا ہوں۔" منصور حسین کے جواب پہ وہ شرما گئی تھی حالانکہ منصور حسین نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔

"ابھی میں فارغ نہیں ہوں، فارغ ہو کر بات کروں گی۔"

"نہ بھی کرو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ کندھے اچکا کے لاپروائی سے بولا تھا۔

"اچھا بات سنو، تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا مجھ کو۔" رجو نے آفر کی۔

"روٹی پانی کے علاوہ کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی اور وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔" وہ اب بھی بے نیازی سے کہہ رہا تھا رجو چپ ہو گئی تھی بڑا عجیب بندہ تھا اس کی طرف دیکھے بغیر ہی چلا گیا تھا۔

♥

عبداللہ ناشتہ کرنے کے فوراً بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا۔

وہ دونوں جب سے اپنے بیڈروم سے باہر نکلے تھے وہ بار بار کن انکھیوں سے ان کے چہروں کی سمت دیکھ رہی تھی جو سنجیدگی لیے ہوئے تھے۔ ناشتہ بھی خاموشی سے کیا تھا اور عبداللہ اسی خاموشی سے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر گھر سے چلا گیا تھا ان کی خاموشی، سنجیدگی اور سپاٹ چہروں کو دیکھ کر زری کی تو جان ہی نکلی جا رہی تھی۔

"بھابی! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟" زری مین ڈور لاک کر کے سیدھی نگارش کے پاس آئی تھی نگارش ٹیبل سے برتن سمیٹ کر ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ زری نے آتے ہی اس کے ہاتھ تھام لیے تھے نگارش بھی چپ تھی، وہ زری کو بتاتی بھی تو کیا؟

"بھابی بولیے نا؟ آپ چپ کیوں ہیں؟" زری کی آواز میں انجانے خدشوں وجہ سے لرزش اتر آئی تھی۔

"بات اچھی نہیں ہے، سن کر کیا کرو گی؟" زری دھک سے رہ گئی تھی۔

"بھابی میرا دل برباد کرنا ہے تو کچھ سوچ کر کیجیے گا زری مر جائے گی اپنے شاہ کے بغیر۔" اس کے آنسو تھے کہ لب بام آ گئے۔

جیسے میں قید پنچھی پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جیسے اندر اس کا دم گھٹ رہا ہو اور رہائی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہو۔

"آج صبح پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا۔" نگارش نے بات کی ابتدا کی۔

"بابا جان کا فون؟" زری کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"ہاں..... اور انہوں نے فون تمہارے لیے کیا تھا۔" نگارش کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ یکدم ہی زری پہ بم پھوڑ دے۔

"میرے لیے مگر کیوں؟" اب پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔

"انہیں واپس پاکستان بلا رہے ہیں، تمہارے لیے کسی کا رشتہ آیا ہے، تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" نگارش نے کہہ ہی دیا اور زری یکدم چار قدم پیچھے ہٹی تھی نگارش کے ہاتھوں سے چھوڑ دیے تھے۔ اور لب بام آئے موتی گر کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ اک دھڑ دھڑ کرتی ٹرین تھی جو شور اٹھاتی ہوئی اس کے دل کو پٹری تلے روند کر گزر گئی تھی۔

"زری پلیز! میری پوری بات تو سن لو۔" نگارش نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ تھام لیے جو پل میں ٹھنڈے اور یخ ہو چکے تھے۔

"میں تو..... میں تو بات سن لوں گی، مگر میری بات کون سنے گا؟" آنکھوں سے دو موتی کیا گرے کہ باقیوں کو رستہ ہی مل گیا تھا، پتے چلے جا رہے تھے۔

"سب سنیں گے میری جان! سب سنیں گے، عبداللہ تمہارے ساتھ ہیں، انہوں نے بابا جان کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ تمہیں ابھی پاکستان نہیں بھیجیں گے، تم ابھی پڑھ رہی ہو، تمہارے ایگزامز سر پہ ہیں اور تم اپنی اسٹڈی ان کمپلیٹ چھوڑ کر نہیں آ سکتیں۔" نگارش اسے سمجھا بجھا کر تسلیاں دے رہی تھی۔

"لیکن بھابی! اک دن تو واپس جانا ہی ہے؟ کب تک یہاں رہوں گی اور اپنے دل کو زمانے کے سرد و گرم سے بچا کے رکھوں گی۔" زری کی آواز جیسے سرد و سپاٹ پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی آنسوؤں کا نمکین پانی اس کے عارض بھگو رہا تھا۔

"جانا ضرور جانا، لیکن کسی حتمی فیصلے کے بعد اور مجھے پورا یقین ہے عبداللہ تمہیں اکیلے نہیں جانے دیں گے وہ تمہارے ساتھ خود جائیں گے، اور تمہاری پسند اور مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوگا۔" نگارش نے اسے سمجھایا۔

"بھابی! میرے گاؤں کے ریوڑ موچی نے اپنی بیٹی کی پسند اور مرضی پہ سر نہیں جھکایا تو یہ تو پھر میرے بابا جان ہیں اونچے شملے والے ملک ہیں، جاگیردار ہیں دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی کے فیصلے پنچایت میں بیٹھے بیٹھے کر ڈالتے ہیں اپنی بیٹی تو ان کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔" زری متواتر رو رہی تھی۔

"زری! تم بھول رہی ہو کہ ریوڑ موچی کی بیٹی کا کسی نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا، نہ ماں نے، نہ باپ نے، نہ بہن بھائیوں نے، جبکہ میں اور عبداللہ تمہارے ساتھ ہیں، بابا جان بات کے پکے ہیں تو عبداللہ بھی انہی کے بیٹے ہیں، اول تو ضد نہیں کرتے اور جب کرتے ہیں تو ضد کو پورا کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹتے، جو کچھ شہرین کے ساتھ ہوا وہ عبداللہ کو آج بھی نہیں بھولتا اور اس کے بعد وہ تمہاری زندگی داؤ پہ نہیں لگنے دیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

نگارش نے اسے حوصلہ افزا لفظوں میں سمجھایا تھا۔

"اور ایک بات اور۔" نگارش آخر میں مسکرا کے بولی۔

"اللہ خیر۔" زری نے دل پہ ہاتھ رکھ کے دل کو سنبھالا دیا۔

"میں نے عبداللہ سے تمہاری اور دل آور بھائی کی بات کی ہے۔" نگارش نے ایک اور انکشاف کیا۔

"کیا؟" زری یکدم اچھل پڑی تھی۔

"ہاں یار! اب یقیناً وہ اسی بات کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔" وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"بھابی! اگر آس کا یہ دیا بھی بجھ گیا تو زری کی سانسوں کی لو بھی بجھ جائے گی۔" زری کو اپنے چاروں اطراف میں خطرے کی

PAKSOCIETY.COM

گھٹیاں بھی محسوس ہوئی تھیں دل پہ سیاہ بادلوں نے گھیرا ڈال لیا تھا اور وہ متوحش ہرنی کی مانند ان خطروں کی لپک سے جان بچانے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔

''اللہ نے چاہا تو یہ آس کا دیا نہیں بجھے گا، کبھی نہیں بجھے گا، ہمیشہ جلتا ہی رہے گا۔ میری دُعائیں اس دیئے کے ساتھ ہیں۔'' نگارش کا حصار لیے ہوئے۔'' نگارش نے اس کے نرم گداز دودھیا ہاتھوں کو نرمی سے دباتے ہوئے ہلکے سے اس کا رُخسار بھی تھپتھپایا تھا۔ یونہی نڈھال سی ہو کر ڈائننگ چیئر پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

''میں یہاں مر رہی ہوں، میری جان نکل رہی ہے اور اسے..... اسے پتا ہی نہیں ہے، کتنا بے خبر اور کتنا پُرسکون ہے۔ وہ اس دل پہ ہاتھ رکھ کے رو پڑی اور اسے روتا دل آور شاہ کی بے خبری ا... کھن پہ آیا تھا۔

''زری پلیز یار! کیوں پگلی بن رہی ہو؟ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو، اتنی سی بات ہوئی ہے کون سا نکاح ہو گیا ہے آپکا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔'' نگارش اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔

''میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے بھابی کچھ بھی نہیں ہے، میرا سب کچھ بگڑنے والا ہے۔ میں..... میں بکھرنے والی ہوں۔'' وہ روہانسے لہجے میں کہتی ہوئی اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی لیکن بیڈ پہ بیٹھ کر روتے روتے جانے دل میں کیا سمائی کہ اس نے اپنا موبائل فون اُٹھا کر دل آور شاہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

اس کے دل و دماغ کا بے چینی اور اضطراب سے عجب حال تھا اس کا دل چاہ رہا تھا آج دل آور شاہ اس کے سامنے ہو وہ اس کے سینے میں سما جائے، ساری دنیا اور سارے خدشوں سے چھپ جائے، اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں خود کو محفوظ کر لے پھر اس کے نام کی چادر اوڑھ کر ہر چیز سے بے فکر اور بے خبر ہو جائے۔ لیکن ایسا تو تب ہوتا جب وہ ملتا اور اس کے سامنے ہوتا دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے نمبر دوبارہ ڈائل کر ڈالا تھا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

♥

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ زری کا نمبر دل آور شاہ کے نمبر پہ بج رہا تھا۔

موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وائبریشن مسلسل ہو رہی تھی، موبائل جیسے تھرک رہا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ پکارا جا رہا ہے، البتہ وہ اتنا تڑپ کیوں رہی ہے، یہ پتا نہیں تھا..... مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس کی تڑپ پہ دل آور بھی تڑپ گیا تھا مگر وہ کال ریسیو کر کے اس کی تڑپ سن سکتا تھا نہ اپنی سنا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آج اگر کال ریسیو کر لی تو اس پجارن کی تڑپ کو ہوا مل جائے گی اور جہاں اسے ذمہ داریں طے دہیں وہ اپنی تمام کشتیاں جلا دیتی، جو فی الحال وہ نہیں چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ جس راستوں پہ زندگی چل رہی ہے ان میں ابھی بہت پیچ و خم ہیں، بڑے نشیب و فراز ہیں اور ان راستوں سے گزرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا مگر پھر بھی وہ چل رہی تھی اور اس کی یہی مسافت کئی مرتبہ دل آور کے دل میں بے چینیاں بھر دیتی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اکیلی ان راستوں پہ مشکل چل کے تھک جائے گی، نڈھال ہو کے گر جائے گی ہو سکتا ہے بے دم بھی ہو جاتی اور اگر ایسا ہوتا تو وہ بھلا سکون سے کب رہ سکتا تھا۔

ادھر اس کی کال بج رہی تھی اور ادھر وہ بے چین اور مضطرب سا کمرے میں ٹہل رہا تھا، بے سکون سی بے سکونی تھی۔ یونہی ٹہلتے اس نے اپنے ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے اس کا دھیان زری کے اردگرد گھوم رہا تھا۔

''نجانے ایسی کیا بات ہے کہ وہ میرے نمبر پہ کال کرنے پہ مجبور ہو گئی ہے؟ نجانے کیا انہونی ہو گئی ہے آج؟ وہ کیوں کر رہی ہے کال..... کیوں اپنی اور میری چپ کا تالا توڑ رہی ہے..... کیا چاہتی ہے وہ؟ اُف کیا کروں؟'' وہ بے کل سا کمرے میں اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا وہ فون کر کر کے تھک گئی تو موبائل اسکرین پہ دس مسڈ کالز کا ریکارڈ دکھائی دینے لگا تھا وہ دس بار بجی تھی، وہ دس بار تڑپی تھی اور دل آور شاہ نے دس بار اسے اگنور کیا تھا لیکن دس بار ہی بے سکون ہوا تھا وہ تڑپ کا سلسلہ بند کر چکی تھی لیکن دل آور کے بے چین کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پہ ایک بار پھر رنگ ہوئی، اس نے نمبر دیکھا لیکن کال کرنے والی زرین ملک نہیں بتول شاہ تھیں۔ اس نے بوجھل سے انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

''السلام علیکم اماں!''

''وعلیکم السلام کیسے ہو؟''

"ٹھیک ہوں۔"

"اچھا۔ مگر تمہاری آواز تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔" وہ اس کی آواز کا بوجھل اور بے چین اُتار چڑھاؤ بھانپ چکی تھیں۔

"جی ہاں..... میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں، بہت زیادہ۔" وہ اپنی انگلیوں سے اپنی کنپٹی مسلتے ہوئے بولا۔ اسے بس یہ پریشانی تھی کہ آج زری نے صبر و ضبط کا دامن چھوڑا ہے تو کیوں چھوڑا ہے؟"

"کیوں کسی کیس کا مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟" بتول شاہ نے فکر مندی سے پوچھا حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ بڑے سے بڑے پیچیدہ کیس بھی نہیں گھبراتا بلکہ دوسروں کو گھبرا کے رکھ دیتا ہے۔

"نہیں اماں! مجھے صرف ایک ہی کیس پریشان کرتا ہے، جب بھی اس کیس پہ سوچتا ہوں، فکر کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"کس کیس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس کیس کی جو انگیجمنٹ چھوڑ آیا تھا۔"

"کیا؟ زری کی بات کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے اسے؟" بتول شاہ چونک اٹھی تھیں۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔ اس کی کال آئی تھی اس کی۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"میں نے کال ریسیو نہیں کی۔" اس نے مجرمانہ سے انداز میں جواب دیا۔

"اف، دل آور شاہ تم بھی کبھی کبھی حد کر دیتے ہو۔" وہ غصے میں ہوتیں تو اسے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔

"اماں میں حد رکھنا چاہتا ہوں مگر وہ حد توڑ رہی تھی، لگ رہا تھا کہ پاگل ہو رہی تھی وہ۔" وہ بتول شاہ کو ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

"تمہیں چاہے گی تو پاگل ہی ہو گی بیچاری، لیکن دل آور شاہ دل پہ پتھر رکھ لینا اچھی بات ہے مگر دل کو پتھر بنا لینا اچھی بات نہیں

ہوتی۔"

"مگر اماں! آپ نہیں جانتیں۔ میں اگر دل کو پتھر نہ بناؤں تو کوئی اور بیچارا یا تو پاگل ہو جائے گا یا پتھر۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو کون ہے وہ بیچارا؟" وہ ٹھٹک گئیں۔

"جو بھی ہے پر جان سے عزیز ہے، اس کے لیے تو دل آور شاہ کا سر بھی حاضر ہے۔"

"پہیلیاں..... پہیلی کی بات کر رہے ہو؟"

"نہیں اماں اس ٹاپک پہ پھر بات کریں گے۔" دل آور نے سر جھٹک دیا تھا۔

"تم گئے تھے واپس کب آ رہے ہو؟"

"چند دن لگیں گے، دعا کیجیے گا کہ میں یہ کیس جیت جاؤں۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہا تھا اور بتول شاہ چپ ہو گئیں ان کا پریشان زری، جیل اور دل آور شاہ کو سوچ رہا تھا اور خود دل آور شاہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ بتول شاہ کا فون بند ہو چکا تھا لیکن زری کی یاد کا سلسلہ بند نہ ہوا، وہ ساری رات سو نہیں پایا تھا۔

♥

اس نے نیو سم خریدی تھی اور اسے خود ایکٹیویٹ کیا تھا، یہ نمبر سب کے لیے نیو اور ان نون تھا۔ اس نمبر کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ تسلی ہی کافی تھی اس نے وہ سم دوسرے موبائل میں لگائی اور موبائل جیب میں ڈال کے بائیک اُڑا لے گیا تھا۔ اس کا رخ سائم کے گھر کی طرف تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ سائم اس وقت اپنی گرل فرینڈز اور باقی دوستوں کے ساتھ اپنے فلیٹ پہ موج مستی میں مصروف ہے اور یہی موقع اس کے لیے اچھا موقع تھا اگر فاطمہ گھر پہ ہوتی تو.....

"ہیلو۔" اس نے ان کے گیٹ پر پہنچ کر چوکیدار کو مخاطب کیا۔

"سلام صاحب۔"

"واسلام! کیسے ہو؟"

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔"

"سائم صاحب سے کہو جودت صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے ڈرامہ کیا۔

''سائم صاحب تو نہیں ہیں گھر پہ۔'' جواب میں توقع کے مطابق موصول ہوا تھا۔
''اچھا کون ہے گھر پہ۔''
''جی صرف فاطمہ بی بی ہیں۔''
''اوہ..... سائم کب آئے گا؟''
''پتا نہیں صاحب۔''
''چلو میں اس کے موبائل پہ پتا کر لیتا ہوں۔'' جودت نے سر ہلایا۔
''جی جیسے آپ کی مرضی۔''
''اوکے اللہ حافظ۔'' وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا اور بائیک کو ٹک لگا کے اُڑا لے گیا مگر صرف ان کی کوٹھی کے کونے تک
میں جا کے اس نے بائیک روک لی تھی اور موبائل نکال کر میسج ٹائپ کیا تھا۔ میسج سینڈ کرنے کے ٹھیک سات منٹ بعد ان کے
گیٹ کھلا تھا اور فاطمہ کی گاڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ جودت نے بڑی پھرتی سے بائیک کے اسٹینڈ پہ لٹکا بلیک کلر کا
پہ چڑھا لیا تھا اور فاطمہ کی گاڑی کے پیچھے ہی اپنی بائیک کی اسپیڈ بڑھا دی تھی وہ بہت عجلت میں تھی اور کافی رش ڈرائیو کر رہی تھی
کے پیچھے وہ بھی اتنی ہی تیزی سے اسے فالو کر رہا تھا اور اپنے پلان کی کامیابی پہ دل ہی دل میں دل کھول کے مسکرا رہا تھا۔

♥

فاطمہ ہر دو منٹ کے وقفے سے گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا رہی تھی اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے وہ جلد از جلد مریم
پہنچنا چاہتی تھی اور اس سے بھی زیادہ جلدی جودت کو تھی وہ بھی جلد از جلد اپنی منزل پہ پہنچنا چاہتا تھا، اس کی منزل اس سے
اور یہی سرشاری اس کی روح کو معطر کیے دے رہی تھی، وہ بائیک ڈرائیو کرتے ہوئے بھی جھوم رہا تھا۔ اگلے دس منٹ کی مسافت
کرنے کے بعد فاطمہ کی گاڑی نے دائیں طرف ٹرن لیا تھا اور اس کے پیچھے جودت کی بائیک نے بھی۔
پہلی دو گلیاں کشادہ تھیں اس لیے فاطمہ کی کار بآسانی تنگ گلی کے نکڑ تک آ گئی تھی اور گلی کے کونے پہ گاڑی پارک کرنے
بعد وہ تیزی سے گاڑی سے نیچے اُتر آئی تھی اور انتہائی عجلت سے گاڑی لاک کر کے بائیں سائیڈ والی گلی میں مڑ گئی تھی
بائیک سے اُترنے کی ضرورت نہیں تھی وہ بائیک سمیت ہی اس گلی میں جا سکتا تھا اس لیے بائیک کی اسپیڈ کم رکھتے ہوئے وہ بھی
میں مڑ گیا تھا بائیک کسی اور کی لے کر آیا تھا اور سر پہ ہیلمٹ چڑھا رکھا تھا اس لیے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔
فاطمہ اس گلی کے پانچویں نمبر والے گھر کا دروازہ دھڑا دھڑ پیٹ رہی تھی اور جودت کی نظریں اس کے خوب
دروازے تک گئی تھیں اور وہیں پہ ٹھہر گئی تھیں۔ گھر کی دیوار میں دروازے کے قریب ہی چھوٹی سی نیم پلیٹ نصب تھی
رنگ اور دھندلے دھندلے سے لفظوں میں گھر کا ایڈریس اور ''فاروق نیازی'' کا نام لکھا ہوا تھا۔
جس کو پڑھنے کے بعد اس کی باقاعدہ تسلی ہو گئی تھی اور وہ بائیک کو ٹک لگا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

♥

یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے حواس باختہ ہو کر ان کے گھر کا دروازہ دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا ہو۔ مریم ابھی ابھی مغرب کی نماز پڑھ کے
ہوئی تھی امی اور ایمن نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگنے میں مصروف تھیں اس لیے ایمان ذرا فارغ تھی اس نے آگے بڑھ کے
کھول دیا تھا لیکن سامنے فاطمہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔
''فاطمہ آپی آپ؟'' اس نے بدحواس سی فاطمہ کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھا تھا۔
''عدیل کہاں ہے؟ مریم کہاں ہے؟ سب ٹھیک تو ہیں نا؟ کیا ہوا ہے گھر میں۔'' فاطمہ ایمان کو پیچھے دھکیل کر سیدھی اندر
اور بدحواسی سے کئی سوال ایک ساتھ پوچھ ڈالے تھے عدیل چھت پہ تھا اپنے گھر کے صحن میں کسی کی بلند آواز سن کر وہ بھی چلا
تھا لیکن فاطمہ کی حالت دیکھ کر ٹھٹک گیا وہ عدل کو سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر لپک کے قریب آئی تھی۔
''تم..... تم ٹھیک ہو نا؟ کیا ہوا تھا؟ کیا ہنگامہ ہوا ہے گھر میں، مریم کہاں ہے؟ وہ کیسی ہے؟ انکل تو ٹھیک ہیں نا؟''
وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر عدیل کا بازو دونوں ہاتھوں میں دبوچے خاصی بلند آواز سے سب کا پوچھ رہی تھی لیکن کیوں
تھی یہ گھر کے کسی بھی فرد کو سمجھ نہیں آیا تھا عدیل نے اس کے ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے مریم کو اک نظر دیکھا تھا۔

"مریم! لگتا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ان کو آرام سے بٹھاؤ اور پانی پلاؤ۔" عدیل نے فاطمہ کے ہاتھ پیچھے ہٹا کر مریم کو اشارہ کیا تھا مریم فوراً سامنے آ گئی تھی وہ ابھی ابھی جائے نماز سے اٹھی تھی اس کا دوپٹہ پیچھے کے گرد ہالے کی صورت میں سر پر سجا ہوا تھا فاطمہ نے عدیل کو دیکھنے کے بعد مریم کو دیکھا تھا ان دونوں کے چہروں پہ حیرانی ضرور تھی لیکن پریشانی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی جس پہ فاطمہ بُری طرح ٹھٹک گئی تھی۔

"فاطمہ! آؤ میرے ساتھ۔" مریم نے آگے اس کا بازو تھام لیا تھا لیکن فاطمہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی تھی۔

"فاطمہ! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟"

مریم نے نرمی سے اس کے کندھے پہ دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے رسانیت سے پوچھا اور سامنے کھڑا عدیل بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا فاطمہ نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کندھے سے اپنا شولڈر بیگ اتارا اور زپ کھول کر اپنا موبائل نکالا اور میسج اوپن کر کے موبائل عدیل کی سمت بڑھا دیا تھا۔ عدیل اُلجھن آمیز انداز میں اس کا موبائل تھام کے میسج پڑھنے لگا۔

"فاطمہ کہاں ہو؟ کیا تمہیں کچھ خبر نہیں ہے؟ کل رات ہمارے گھر پہ قیامت گزر گئی، میں بہت پریشان ہوں، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے، پلیز میرے پاس جلدی پہنچو تمہاری دوست مریم۔"

میسج پڑھ کے عدیل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"آپ کو یہ میسج کس نے بھیجا ہے؟" اس کا سوال بھی اُلجھا ہوا تھا۔

"میں تو یہی سمجھی تھی کہ مریم نے بھیجا ہے؟" فاطمہ اپنی جگہ حیران پریشان اور اُلجھی اُلجھی سی کھڑی تھی۔

"حالانکہ آپ جانتی بھی ہیں کہ ہمارے گھر میں فون اور موبائل کی سہولت نہیں ہے۔" عدیل نے اسے ایک اور غلطی کا احساس

تھا۔ "حیرانی پریشانی کے مارے مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ آپ لوگوں کے پاس موبائل فون ہے یا نہیں؟ مجھے تو یہ پڑھ کر شاک لگا تھا کہ کل رات آپ کے گھر پہ کوئی مصیبت گزر گئی ہے۔ میں نے وقت کا احساس کیا اور نہ ہی یہ جاننے کی زحمت کی کہ نمبر کس کا ہے؟" فاطمہ پریشانی سے بتاتی دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"بیٹھو، کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے جاننے کی زحمت ضرور کر لینی چاہیے، شام کا وقت ہے، اندھیرا گہرا ہو رہا ہے، اور آپ اکیلی عورت ذات ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئیں، وہ بھی صرف ایک میسج پڑھ کے؟ سوچیے اگر آپ کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو؟" عدیل نے تخت پہ بیٹھتے ہوئے سمجھایا تھا اور فاطمہ اس کی بات کی گہرائی جان کو متوحش سی ہو گئی تھی وہ واقعی سچ ہی تو کہہ رہا تھا آج کل ملک اور شہر کے حالات ہی ایسے تھے کہ دن کے وقت گھر سے نکلنا محال ہوتا تھا یہ تو پھر شام کا وقت تھا۔

"بھائی! آرام سے بات کریں نا، وہ پہلے ہی اتنی پریشان ہے، نہ جانے کس خبیث نے یہ گھٹیا مذاق کیا ہے؟" مریم نے عدیل کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔

"میں بھی ان محترمہ کے لیے ہی بات کر رہا ہوں۔ اگر خدانخواستہ یہ کوئی مصیبت آ جاتی تو؟" عدیل بنا رُکے سخت سست سنا رہا تھا اور اس بار فاطمہ نے اسے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو نظریں مسکرا دی تھیں۔

"کاش کہ کوئی مصیبت آ ہی جاتی تو اچھا تھا، کم از کم آپ میرے لیے پریشان تو ہوتے رہتے۔" اس نے دل میں آئی بات زبان کی نذر کر دی تھی اور عدیل اس کی بات پہ بُری طرح سٹپٹا گیا تھا اس نے بے ساختہ مریم کی سمت دیکھا تھا مریم اپنی مسکراہٹ دبا کر چہرہ جھکا گئی تھی۔

"اتنی فرصت نہیں ہے میڈم کہ دوسروں کے لیے بھی پریشان ہوتے پھریں۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"دوسرے بھی تو آپ کے لیے پریشان ہوتے ہیں مسٹر عدیل عمر؟" اس نے پیچھے سے آواز دے کر کہا تھا۔

"دوسروں کو ہم نے کہیں کہا کہ ہمارے لیے پریشان ہوتے رہیں، اپنے لیے پریشان ہونے کے لیے ہم خود ہی کافی ہیں۔" جلتا کڑھتا جواب دیتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور فاطمہ نے گردن موڑ کر مریم کو شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"آپ بھائی صاحب کی باتیں سن رہی ہو؟ پھر تم مجھے الزام دیتی ہو کہ میں ایسا ویسا کہہ جاتی ہوں۔" فاطمہ، مریم کو گھور رہی تھی مریم اس کے سوالیہ مسکرا اٹھی۔

''ارے بابا! نہیں دینی الزام، بھائی واقعی غلط کہہ رہے ہیں، میں بات کروں گی ان سے، اُٹھو تم اندر آجاؤ، یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' مریم اس کی طرفداری کرتے ہوئے بولی اور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اندر کمرے میں لے آئی تھی۔

''ایمان! فاطمہ کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔'' مریم نے کمرے سے ہی آواز دی تھی فاطمہ بے دھیانی میں صوفے پر ہی ٹک کر بیٹھ گئی اور مریم نے اس کے سامنے کرسی کھینچ لی تھی۔ اتنے میں ایمان چھوٹی سی ٹرے میں پانی کا گلاس لے آئی تھی، فاطمہ نے گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

''تھینک یو۔'' اس نے خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے ایمان کو تھینکس کہا تھا۔

''ہاں اب بولو کیا مسئلہ ہوا ہے؟'' مریم نے تحمل سے پوچھا تھا۔

''یار! میں یونیورسٹی گئی ہوئی تھی یونیورسٹی سے آف ہوا تو لائبریری چلی گئی وہاں اتنا ٹائم گزرا کہ احساس ہی نہ ہوا، بھی تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچی تھی، شاور لیا اور کپڑے چینج کر کے فارغ ہوئی تھی کہ تمہارا میسج۔ میرا مطلب ہے کہ یہ میسج ملا اور میسج پڑھنے کے بعد مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ میں فوراً گاڑی لے کر گھر سے نکل آئی۔'' فاطمہ نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

''لیکن فاطمہ یہ بھی تو سوچو تمہارے ساتھ یہ مذاق کس نے کیا ہوگا؟ کون ہے جو تمہاری اور میری دوستی کو جانتا ہے اور میری دوستی کو جانتا ہے اور میرا نمبر لے کر تمہیں بلیک میل کر رہا ہے، یہ تو سراسر دھوکے کا کیس ہے یار! تم اس نمبر کی چھان بین کرواؤ۔'' مریم نے اسے مشورہ دیا تھا۔

''وہ تو میں ضرور کرواؤں گی، لیکن یار بات پھر وہیں پہ آجاتی ہے کہ آخر میرے ساتھ مذاق کیوں اور کس کے لیے کیا گیا ہے؟ کس نے مجھے دھوکا دیا ہے؟ آخر مقصد کیا ہو سکتا ہے؟'' فاطمہ خود بھی اُلجھ رہی تھی اور اسی اُلجھے اُلجھے دھیان میں مریم کا خیال اس کی طرف سمت چلا گیا جسے فاطمہ کا بھائی جودت کے نام سے بلاتا رہا تھا اور اسی جودت نامی لڑکے کی نظریں پورے فنکشن میں مریم پر ہی ٹکی رہی تھیں وہ سب سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتا رہا تھا۔ کہیں یہ سب اس کا کارنامہ تو نہیں تھا؟ مریم نے بے اختیار سوچا تھا، اس کا سوچنا صحیح سوچا تھا لیکن وہ اپنی سوچ کا اظہار فاطمہ کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

''یہ تو تم پھر چھان بین کرواؤ گی تو مقصد کا پتا چلے گا۔ خیر تم کچھ دیر یہیں رہو اور کھانا کھا کر جاؤ۔'' مریم سر جھٹک کر کہتی ہوئی تھی۔

''ارے نہیں یار! میں نے لنچ کافی لیٹ کیا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے، اب تو لیٹ نائٹ ہی کھانا کھاؤں گی، ابھی آپ لوگوں نے کھانا کھانا ہے تو کھا لیں، میں ابھی یہیں رُکتی ہوں۔ سائم کو فون کرتی ہوں وہ مجھے پک کر لے گا۔''

فاطمہ اب خود بھی اکیلی واپس نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے وہیں ٹھہر گئی تھی۔

''زیادہ نہ کھاؤ، تھوڑا سا کھا لو۔'' مریم نے اصرار کیا۔

''نہیں یار! مائنڈ مت کرنا، میرا موڈ نہیں ہے کھانے کا۔'' فاطمہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا مریم چپ ہو گئی۔

''تم بیٹھو میں سائم کو فون کر لوں۔'' اس نے اپنے بیگ سے دوبارہ موبائل نکالا اور سائم کا نمبر ڈائل کیا تھا لیکن اس کا نمبر بزی جا رہا تھا۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے جھنجلی سے موبائل سائیڈ پہ رکھ دیا تھا لیکن موبائل رکھتے ہوئے بھی اس کی نظر صوفے کے نیچے سے جھانکتی کسی چمکتی ہوئی چیز پہ جا پڑی تھی اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر وہ چیز باہر نکال لی اور بیک کھڑے کے گلاسز دیکھ کے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''لیڈیز گلاسز؟ عدیل عمر کے تکیے کے نیچے؟'' وہ ہکا بکا اور حیران پریشان دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسی ہی کیفیت مریم کی بھی ہوئی تھی اسے بھی یہ گلاسز دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''یہ کس کے گلاسز ہیں؟'' فاطمہ نے ڈائریکٹ مریم سے پوچھا تھا۔

''یہی تو میں سوچ رہی ہوں؟''

مریم کی آواز بھی قدرے کھوئی ہوئی تھی۔

''اوہ تو مسٹر عدیل عمر کا کسی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے؟'' فاطمہ نے خود سے ہی اندازہ لگایا تھا۔

''بھائی کا کسی کے ساتھ چکر؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' مریم بے یقین بھی تھی۔

''تو پھر یہ کس محترمہ کے ہیں؟'' فاطمہ نے چڑ کر گلاسز اس کے سامنے لہرائے تھے۔

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں کہ یہ کس کے ہیں، لیکن جس کے بھی ہیں کافی خوبصورت اور اسٹائلش ہیں۔" مریم نے تعریف کی اور فاطمہ نے اسے مزید گھور کے دیکھا تھا۔

"اسٹائلش لڑکیاں ہی اسٹائلش گلاسز پہنتی ہیں لہٰذا تم یہ نہ سوچو کہ صرف گلاسز ہی اسٹائلش ہیں بلکہ یہ بھی سوچو کہ ان کو پہننے والی لڑکی بھی ماڈرن اور اسٹائلش ہے، اور وہ کون ہے؟ یہ بھی پتا کرو۔" فاطمہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"میں بھلا کیسے پتا کر سکتی ہوں؟"

"تو کیا میں پتا کروں؟"

"تو کر لو۔"

"ہونہہ..... میں کروں گی تو پتنگے لگ جائیں گے تمہارے بھائی کو۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی تھی۔

"تمہیں بھی تو لگ رہے ہیں۔" مریم نے چھیڑا۔

"میرا مشورہ مانو تو یہ گلاسز اپنے ساتھ لے جاؤ، ان کی انوسٹی گیشن کرواؤ کہ آخر یہ کس حسینہ کے ہیں۔ کون اپنے چہیتے دیکھتے ہی نکور گلاسز میرے بھائی کے تکیے کے نیچے چھوڑ گئی ہے؟ آخر کس کی رسائی ہوئی یہاں تک؟" مریم مسکرا کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اسے میں عدیل بھی واپس آ گیا تھا اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کی ڈیڑھ لیٹر کی دو بوتلیں تھیں کوک اور اسپرائیٹ اس نے دونوں بوتلیں مریم کی سمت بڑھا دیں۔ مریم سمجھ گئی تھی کہ وہ فاطمہ کے لیے ہی لے کر آیا ہے۔

"تھینکس! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں گھر جا رہی ہوں۔" فاطمہ ہمیشہ کی طرح عدیل کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"گھر..... مگر تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟" مریم ٹھٹک گئی۔

"چلی جاؤں گی، کچھ نہیں ہوتا۔"

اس نے تنک کے جواب دیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو، عدیل تمہیں چھوڑ آتا ہے۔"

عدیل کی امی نماز پڑھ کے فارغ ہو چکی تھیں فاطمہ کا سارا مسئلہ وہ ایمان کی زبانی سن چکی تھیں اس لیے فاطمہ کو اکیلے جانے سے روک دیا تھا جس پہ عدیل نے ایک بار پھر ٹیڑھا کے دیکھا تھا۔

"نہیں آنٹی! میں چلی جاؤں گی، خوامخواہ کسی کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟" اس نے انکار کر دیا۔

"ارے بیٹا! تم ہماری پریشانی میں یہاں تک چلی آئی ہو، تو کیا ہم تمہیں اسی طرح واپس بھیج دیں؟ جاؤ بیٹا فاطمہ کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔"

انہوں نے اشارہ کیا اور عدیل سب کے سامنے ماں کے حکم سے انکار نہ کر سکا اور خود بخود ہی قدم باہر دروازے کی سمت بڑھا دیے تھے۔

"جاؤ..... مرو اب؟" مریم نے فاطمہ کو اس کے پیچھے دھکیلا اور فاطمہ اپنے دل کی خوشی دل میں دباتی عدیل کے پیچھے گلی میں نکل آئی تھی وہ کافی سست قدم اٹھا رہا تھا جبکہ فاطمہ کے قدم بہت فریش اور سرشاری کیفیت کی نشاندہی کر رہے تھے وہ بڑی خوشی خوشی اس کے برابر قدم اٹھا رہی تھی اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے دل بھی بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر عدیل رُک گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ گاڑی کا لاک کھولے لیکن فاطمہ نے چابی اس کی سمت بڑھا دی تھی۔

"مجھ سے ڈرائیو نہیں ہوگی، تم ڈرائیو کرو۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آئیم سوری! میں نہیں کر سکتا۔ آپ خود کریں۔" اس نے چابی تھامنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا بلکہ گردن نفی میں ہلا کر انکار کر دیا تھا۔

"میں خود تو کر لوں، مگر ڈر ہے کہ ایکسیڈنٹ کر دوں گی، تمہارے ہوتے ہوئے میرا دھیان کسی اور طرف ذرا کم ہی جائے گا۔" اس نے کندھے اچکا کر لاپروائی ظاہر کی۔

"ویسے یہ وقت یہاں کھڑے ہو کر باتیں بنانے کا نہیں ہے۔ گاڑی نکالیں اور شرافت سے گھر چلیں۔" عدیل نے اسے گاڑی کی طرف سے اشارہ کیا تھا۔

"تم ڈرائیو کرلو تو ٹھیک ہے ورنہ یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا بھی بُرا نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور عدیل زچ ہو کر اس کے ہاتھ سے چابی جھپٹی اور لاک کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا فاطمہ جلدی سے لپک کے دوسری سائیڈ پہ پہنچی تھی اور فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی عدیل نے گاڑی بیک کی اور واپسی کے لیے مین روڈ پہ ڈال دی فاطمہ اسے اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی وہ لوگ کافی راستہ طے کر آئے تھے جب فاطمہ کو کوئی خیال چھو کے گزرا تھا۔

"اک بات پوچھوں تم سے؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"پوچھیں۔" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے اجازت دی اور فاطمہ لمحہ بھر کے لیے ٹھہری گئی تھی۔

"پوچھیے فاطمہ صاحبہ؟" اس کی چپ پہ عدیل نے اسے خود متوجہ کیا۔

"وہ گلاسز کس کے ہیں؟" آخر کار پوچھ ہی ڈالا۔

"گلاسز؟" وہ سمجھا نہیں تھا۔

"وہی گلاسز جو تمہارے بستر کے نیچے کے بیچ بڑی احتیاط سے رکھے ہیں اور یقیناً ان کی وجہ سے تم نیچے پہ سر رکھ کے نہیں سوتے ہو کے کہیں وہ گلاسز ٹوٹ ہی نہ جائیں؟" فاطمہ نے اسے گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے کہا تھا اور عدیل ان "گلاسز" کا خیال آتے ہی مسکرا دیا تھا اس کے خیال کے پردے پہ مدیحہ کا تبسم اور پُرغرور سا سراپا لہرا گیا تھا۔

"کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"بس آپ نے کسی کی یاد دلا دی اور میں مسکرا دیا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"کون ہے وہ لڑکی۔" فاطمہ کی آواز جیسے کسی پاتال سے سنائی دی تھی۔

"بتانا ضروری نہیں ہے۔" اس نے ٹال دیا۔

اس کے جواب پہ فاطمہ کا دل مزید جل کر رہ گیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ اتنی خوش تھی اور ابھی پل بھر میں ہی اس کی فتح غارت ہو گئی تھی۔

"یعنی آپ چھپا رہے ہیں؟" وہ دوبارہ سے "تم" سے آپ تک آ گئی تھی۔

"ایسی باتیں چھپانے والی ہی ہوتی ہیں۔" وہ جانے کیوں محظوظ ہو رہا تھا اور فاطمہ چپ کی چپ رہ گئی تھی اس کے پاس کہنے کچھ بھی نہیں تھا عدیل نے اس کے گھر کے سامنے بریک لگائے تھے اور فوراً سے پیشتر گاڑی سے اُتر گیا تھا۔

"میری ذمہ داری آپ کو گھر تک چھوڑنے کی تھی میں نے آپ کو گھر تک چھوڑ دیا ہے، اب آپ جا سکتی ہیں۔" وہ گھر کی دوسری طرف آیا تھا اور فاطمہ کی سائیڈ پہ کھڑکی کی سمت جھکتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ جواباً کچھ بھی نہ بولی۔

"اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا لیکن چند قدم دور جا کر واپس مڑ آیا تھا۔

"ویسے میڈم از یاد شک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میرا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں چل رہا، میرا دامن بھی صاف ہے اور دل بھی، وہ گلاسز کس میڈم کے ہیں؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا، امانت ہیں کسی کی، واپس لوٹانے ہیں۔" اس نے کھڑکی میں جھکے کہا اور دوبارہ واپس چلا گیا تھا۔

"آئو۔" اس نے رکشے والے کو اشارہ کیا تھا اور اگلے پل وہ رکشہ میں سوار ہو گیا تھا۔ فاطمہ تعجب سے اسے دیکھتی رہ گئی، پھر ذرا تسلی ہوئی تو مسکرا اٹھی تھی۔

♥

وہ اپنے پلان کی کامیابی پہ سرشار سا تھا تبھی گنگناتا ہوا کی چین گھماتا سیڑھیاں چڑھ کے سائم کے فلیٹ کے سامنے آ رکا تھا بڑی ترنگ میں دستک دی تھی سائم نے اسے ہول سے دیکھ لیا تھا اسی لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" اس نے اندر داخل ہو کر ہاتھ ہلایا تھا۔

"ہائے کہاں تھے تم؟" مائلہ لپک کے اس کے قریب آئی تھی اور دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال دیے تھے۔

"لگتا ہے تم مجھے بہت مس کر رہی تھیں؟" وہ مائلہ کے سلکی شولڈر کٹ بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولا تھا۔

"آف کورس یار! تمہارے بغیر میں ہمیشہ ہی بور ہوتی ہوں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"چلو پھر تم لوگوں کی بوریت دور کرتا ہوں۔"

"ہیں وہ کیسے؟" وہ سب کورس میں بولے تھے۔

"شیشہ کلب چلتے ہیں، پارٹی میری طرف سے۔"

"پارٹی مگر کس خوشی میں؟" یہ سوال کامی کا تھا۔

"خوشی کا بھی پتا چل جائے گا، پہلے تم لوگ تو چلو۔" سبھی لڑکے لڑکیاں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جودت کی دعوت پہ یہ قافلہ سیدھا شیشہ کلب پہنچا تھا۔ کبھی کبھی وہ سب دوست اگر خوش اور موڈ میں ہوتے تو ایک دوسرے کو شیشہ پینے کی (جو کہ ایک قسم کا نشہ ہے) دعوت دیتے تھے اور اس وقت بھی وہ لوگ جودت کی دعوت پہ اس تکلیے میں اندھیرے والے کیبن میں بیٹھے شیشہ پی کر مسرور ہو رہے تھے جودت اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شیشہ شیئر کر رہا تھا اور کامی اور سائم وغیرہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شیئر کر رہے تھے۔

"ہوں اب بولو کس خوشی میں دعوت دی ہے۔" سائم نے ذرا سا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا اور جودت کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا۔

"میں نے مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا کر لیا ہے۔" اس نے سائم کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا سائم اسے ششدر سا دیکھ رہا تھا۔

"مریم کے گھر کا پتا؟"

"جی ہاں..... مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا۔" اس نے دہرا کر اور زور دے کر کہا تھا البتہ چہرے پہ فتح مندی کا سرشار سا احساس بکھرا ہوا تھا۔

"مگر کیسے؟" سائم کو بے چینی ہوئی تھی۔

"کیسے کو چھوڑو، بس میری کامیابی پہ مبارک باد دو مجھے۔" جودت سرشاری سے بولا۔

"لیکن جودت تم....."

"بس یار بس کوئی نصیحت نہیں اور کوئی ہدایت نہیں، بس اب صرف یہ سوچو کہ جودت آفندی، مریم فاروق نیازی سے ملاقات کیسے کرے گا؟ ملاقات، مطلب ملنا، سمجھ گئے نا تم؟" وہ ذومعنی لہجے میں کہہ رہا تھا اور سائم چپ سا ہو گیا، جودت آفندی واقعی بہت خبیث ثابت ہوا تھا۔

♥

صبح گیارہ بجے کا وقت تھا جب وہ سو کر اٹھی تھی۔

اے سی کی کولنگ کی وجہ سے وہ کافی گہری اور سکون کی نیند لے کر بیدار ہوئی تھی لیکن باہر آگ اگلتے سورج نے حشر اُٹھا رکھا تھا تیز دھوپ لوگوں کے سروں پہ چڑھ کے ناچ رہی تھی اور اس دھوپ اور گرمی کو برداشت کرنے والوں کا بُرا حال تھا اس نے ذرا کی ذرا کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئیں جبھی فوراً سے پیشتر وہ دوبارہ واپس گرا دیا تھا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں الجھی الجھی ہوئی شلوار لینے کے لیے گھس گئی شلوار لینے کے بعد موڈ فریش ہوا تو تیار و کریچے آ گئی تھی اتنے میں ہاتھ میں پکڑا سیل بج اٹھا تھا اس نے اسکرین پہ نمبر دیکھا تو مسکرا کر منہ بنا لیا تھا۔

"موری جیری اس وقت بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کال ڈس کنیکٹ کرتے ہوئے دل ہی دل میں جیری سے معذرت کی تھی اور باقی کی دو تین سیڑھیاں بھی اُتر آئی۔

"گڈ مارننگ....." اس نے سامنے سے آتے نبیل کو فریش انداز میں وش کیا تھا۔

"مارننگ....." وہ کافی سنجیدگی اور کافی آہستگی سے کہہ کر پاس سے گزر کے اوپر چلا گیا تھا جس پہ مدیحہ کو بے حد اچنبھا ہوا تھا اس نے حیرانی سے مڑ کر نبیل کی پشت کو دیکھا تھا کہ آخر وہ بغیر کچھ کہے پاس سے کیوں گزر گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایسا نہیں تھا، وہ تو پاس حال چال پوچھنے اور پیار کرنے والا آدمی تھا۔ یقیناً کچھ ہوا تھا اسے جو وہ اس طرح چپ چاپ گزر گیا تھا۔

''کیا مسئلہ ہو گیا ہے آخر؟ اب تو میں نے بھی کچھ نہیں کیا جس کا انہیں غصہ ہو گا۔'' وہ سوچتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''مام..... وہ نبیل بھائی کو کیا ہوا ہے؟ وہ اتنے چپ.....'' کہتے کہتے اچانک اس کی نظر دائیں طرف کے صوفے کی سمت اٹھی تھی اور منہ کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے بلیک لیدر کے ون سیٹی صوفے پہ اس کے والد محترم ممتاز حیات بڑے شاہانہ انداز میں براجمان تھے جن کو دیکھ کر مدیحہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے وہ کھڑے کھڑے سپاٹ پتھر کی مورت بن گئی تھی۔

''کیسی ہو بیٹا؟ کیا دیکھ رہی ہو؟'' انہوں نے اسے یوں مخاطب کیا جیسے روز صبح کا معمول ہو، جیسے ڈیڑھ سال بعد ملنا کوئی خاص معنی نہ رکھتا ہو، مگر ان کے مخاطب کرنے پہ مدیحہ کے اندر غم و غصے کے اُبال اُٹھنے لگے تھے اس کا چہرہ نفرت سے سرخ پڑ گیا تھا نظروں میں کئی ایسے مناظر گھوم گئے تھے جن کی وجہ سے اس کا فشارِ خون بلند ہونے لگا تھا اور شدت ضبط سے اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں اور ایسی کیفیت میں بہتر تھا کہ وہ وہاں سے چلی جاتی۔

''مدیحہ! سلام کرو اپنے بابا کو۔'' وہ واپس پلٹ رہی تھی جب فائزہ بیگم کی آواز پہ اس کے قدم تھم گئے تھے۔

''ایم سوری مام! سلام کا مطلب ہوتا ہے کسی پہ سلامتی بھیجنا، جو میں نہیں بھیج سکتی اور ویسے بھی سلام اسے کیا جاتا ہے جسے سلام کا پتا ہو۔'' نفرت اور حقارت اس کے لب و لہجے سے ہی عیاں ہو رہی تھی۔ فائزہ بیگم اس کے جواب پہ سٹپٹا کر رہ گئیں جبکہ ممتاز حیات کے چہرے پہ غصے کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

''مدیحہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمیز سے بات کرو، بابا ہیں تمہارے۔'' انہوں نے بیٹی کو سرزنش کی تھی، جس پہ مدیحہ وہ ہی چڑھی تھی۔

''ہونہہ سوٹڈ مام! بہت بھولی، بیوقوف اور نادان عورت ہیں آپ، ہر ڈیڑھ سال بعد تھکن اُتارنے کے لیے گھر آ جاتے ہیں آپ عزت، احترام اور تمیز کے ساتھ ان کی خدمتوں میں لگ جاتی ہیں، کبھی ان سے یہ بھی تو پوچھ لیا کریں کہ وہ دو سال یا ڈیڑھ سال کہاں اور کن کاموں میں گزار کے آتے ہیں؟ یا پھر آپ یہی پوچھ لیا کریں کہ یہ عزت، احترام اور تمیز کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔'' نفرت سے طنزیہ اور استہزائیہ انداز پہ اُتر آئی تھی۔

''مدیحہ.....'' ممتاز حیات یکدم دھاڑ اُٹھے تھے، لیکن یہ بھول گئے تھے کہ مقابل ان کی اپنی ہی اولاد ہے جو ڈرنے والی یا دبنے والی ہرگز نہیں تھی۔

''مسٹر ممتاز صاحب! آہستہ آواز میں بولیے، ورنہ مجھے آپ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولنا آتا ہے۔'' وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولی تھی۔

''مدیحہ! یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو اپنے بابا کے ساتھ۔'' فائزہ بیگم بھی صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''پلیز مام! مجھے بار بار یہ احساس مت دلائیں کہ یہ میرے بابا ہیں، مجھے نفرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ میں ان کی اولاد ہوں، گھن آتی ہے اپنے آپ سے بھی، ڈیڑھ سال ہو گیا ہے مجھے اپنے آپ سے گھن آتے ہوئے، ڈیڑھ سال سے جل رہی ہوں، مر رہی ہوں، مر رہی ہوں یہ سوچ سوچ کر کہ میں اس انسان کی اولاد ہوں اور اسی انسان کا خون اور گندہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔'' وہ کہتے کہتے پھوٹ پڑی تھی اور فائزہ بیگم ششدر سی رہ گئی تھیں۔

''بدتمیز، بیہودہ لڑکی، تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم اپنے باپ سے اس لہجے میں بات کرو۔'' وہ اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے قریب آئے تھے۔ مگر وہ بھی پیچھے ہٹنے کے بجائے ان کے سامنے ڈٹ کے کھڑی رہی۔

''میں آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے اپنی توہین محسوس کرتی ہوں، آپ کی عزت میری نظر میں ڈیڑھ سال پہلے کینیڈا کے ایک ہوٹل کی راہداری میں ختم ہو گئی تھی اس روز میں نے آپ پہ فاتحہ پڑھی تھی، مر گئے تھے آپ میرے لیے، آپ کی عزت، آپ کا احترام، سب مر گیا تھا اس روز..... اور یقیناً آپ کو خبر ہو گی کہ مرے ہوئے جذبات، مرے ہوئے احساسات اور مرے ہوئے انسان زندہ نہیں ہوتے؟ آپ بھی مر گئے ہیں، سمجھے آپ؟'' وہ یکدم اونچی آواز میں دھاڑی تھی۔

''اسٹاپ اٹ جسٹ اسٹاپ اٹ۔'' انہوں نے جواباً غرا کے کہتے ہوئے ہاتھ اُٹھایا تھا لیکن اچانک نبیل سامنے آ گیا تھا۔

''پلیز بابا! کنٹرول یور سیلف۔ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

"آپ ان کو کرنے دیں، میں بھی دیکھتی ہوں کہ کیا کرتے ہیں؟ ڈیڑھ سال سے انتظار تھا اس گھڑی کا کہ کبھی میرا اور ان کا بھی سامنا ہو۔" مدیحہ یکدم دوبارہ سامنے آئی تھی۔

"مدیحہ پلیز! اپنے بیڈ روم میں جاؤ۔" نبیل نے اسے پھر سے پیچھے ہٹایا۔

"پر کچھ نہیں میں آج ان کو آئینہ دکھا کر ہی جاؤں گی، آخر ان کو پتا تو چلے کہ وہ کس حد تک گر چکے ہیں؟" وہ اونچی اور بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ نبیل نے اسے بازوؤں میں گھیرتے ہوئے بمشکل پیچھے کھینچا تھا۔ وہ عجیب جنونی سی ہو رہی تھی، اس کا انداز ہذیانی سا تھا۔

"مدیحہ! پاگل مت بنو، یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔" نبیل اسے ڈرائنگ روم سے باہر کھینچ لایا تھا۔

"اس انسان کے ساتھ یہی طریقہ ہو سکتا ہے بات کرنے کا، یہ درندہ صفت انسان ہمارا باپ نہیں ہو سکتا۔" وہ چیخ رہی تھی اور نبیل اسے زبردستی کھینچ کے بیڈ روم تک لایا تھا۔

"بیٹھو یہاں کیوں پاگل ہو رہی ہو؟ کیا ہوا ہے آخر؟" نبیل نے اسے بیڈ پہ بٹھاتے ہوئے خفگی سے کہا تھا۔

"ان کی اصلیت، ان کا جو روپ میں نے دیکھا ہے وہ آپ نے نہیں دیکھا، اسی لیے پاگل ہو رہی ہوں، آپ دیکھ لیتے تو شاید اپنے اس نام نہاد باپ کو اٹھا کر اس گھر سے باہر پھینک دیتے جو ہمارا باپ اور ہماری ماں کا شوہر کہلائے جانے کے بھی لائق نہیں ہے۔" مدیحہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ممتاز حیات کو گولی سے اڑا دے۔ اس کے اندر نے والی نفرت آج عود کے سامنے آئی تھی۔ وہ حشر اٹھا دینے کے درپے تھی۔ حالانکہ کسی حد تک نبیل حیات بھی اپنے باپ کے کرتوت جانتا تھا۔ مگر جو کچھ مدیحہ دیکھ چکی تھی اگر واقعی نبیل بھی دیکھ لیتا تو جیتے جی مر جاتا یا پھر اپنے باپ کو مار دیتا۔

"یہ فیصل آفریدی ہے تو میں بھی اسی گندے شخص کی اولاد ہوں میں بھی انہیں دکھاؤں گی کہ عیاش ہونا کیا ہوتا ہے۔" وہ جو منہ میں آ رہا تھا بولے جا رہی تھی۔

"یہ لو پانی پیو۔" نبیل نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی، میرے دل و دماغ میں جلتی آگ اس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔" وہ نبیل کا ہاتھ ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مدیحہ۔۔۔" فائزہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے پریشان نظروں سے دیکھا۔

"مام پلیز! مجھ سے کچھ مت کہیے گا، میرا دماغ پہلے ہی ماؤف ہو رہا ہے اور کچھ سنا تو پھٹ جائے گا۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا اور اتنے میں دوبارہ اس کا سیل فون بجا تھا۔ مدیحہ نے پلٹ کر بیڈ سے اپنا سیل اٹھا کر نمبر دیکھا اور اس بار کال ریسیو کرتے ہوئے سیل کان سے لگا لیا تھا۔

"ہائے جیزی! ہاؤ آر یو۔" اس نے بلا خوف و خطر بات کی تھی۔

"ایم فائن! تم سناؤ بار بار فون کیوں کر رہے ہو؟" مدیحہ بات کرتے ہوئے بیڈ روم کے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

"اوے واؤ! تم پاکستان آ رہے ہو؟ امیزنگ یار، خوب انجوائے کریں گے۔ بس جلدی سے آ جاؤ، میں بھی بہت مس کر رہی تھی، بہت بورنیت ہوتی ہے یہاں۔" وہ بانگ دہل کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی فائزہ بیگم اور نبیل اک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔ وہ مدیحہ جو ایک نارمل مدیحہ کے روپ میں ڈھل رہی تھی، ممتاز حیات کی اچانک آمد پہ دوبارہ پچھلے خول میں اتر گئی تھی۔ نبیل کو سب پہ واضح کا احساس ہوا تھا وہ بے بس سا کھڑا تھا۔

♥

"عبداللہ کو فون کروں یا نہ کروں؟"

وہ صبح سے اسی ایک کشمکش کا شکار تھا اور یہی سوچے جا رہا تھا، اس کا سارا دھیان زری کی طرف تھا اور اسی وجہ سے وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا، کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا، عبداللہ کے ساتھ اور نہ ہی نبیل کے ساتھ، کیونکہ زری ایک کی عزت تھی تو ایک کی محبت۔

دل آور شاہ اپنا رازداں بنانا بھی تو کس کو؟ اس لیے سود و زیاں کا سودا طے کرنا تھا تو خود ہی طے کرنا تھا، یہاں اس کے

دوستوں کی دوستی کام نہیں آسکتی تھی۔ البتہ اسے دوستی کا بھرم ضرور رکھنا تھا، تاکہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دل آور سے شکایت نہ ہو پائی۔ اور انہی کوششوں میں وہ زرین ملک کا دل نیزے کی انی میں پروئے جا رہا تھا۔ دل آور شاہ کا زری کو نظر انداز کرنا اس کے لیے کسی جان لیوا مرض سے کم نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل رات سے اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اور اسی حال کو مزید جاننے کے لیے عبداللہ یا نگارش بھائی کو کال کرنا چاہ رہا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا۔ لیکن عبداللہ شاید اس سے بھی زیادہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ جب ہی تو اس کا فون آ گیا۔ دل آور نے ایک ہاتھ سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟'' عبداللہ ذرا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہمیشہ کی طرح فٹ، فائن ہوں، تم اپنی سناؤ، تم فٹ نہیں لگ رہے؟'' دل آور نے گاڑی موڑتے ہوئے اپنی بات بھی اسی مطلب کی سمت موڑی تھی۔

''ہاں یار! بہت ڈپریسڈ ہوں میں۔'' عبداللہ نے اعتراف کیا تھا اور دل آور بدحواس ہوا تھا کہ آخر ان دونوں بہن بھائی کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ دونوں ہی اسے فون کرنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ بہن نے رات کو کیا تھا اور بھائی نے دن میں۔

''ڈپریسڈ ہونے کی وجہ؟'' اس نے بڑے سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وکیل تھا آخر بات پوچھنے کا ڈھنگ خوب جانتا تھا۔

''پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا کل۔'' عبداللہ نے بات شروع کی۔

''تو؟''

''تو وہ زری کو پاکستان واپس بھیجنے کا اصرار کر رہے تھے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ زری کی شادی کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے کوئی پرپوزل آیا ہوا ہے۔''

''اوہ..... تو یہ ڈیپریشن ہے۔'' دل آور نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''یہ ڈیپریشن کچھ کم نہیں ہے، دل آور ے، بہت بڑا مسئلہ ہے، میں ابھی زری کو پاکستان نہیں بھیجنا چاہتا، جبکہ وہ ضد پہ اڑ گئے ہیں، میری بات سے تو وہ ویسے ہی خار کھاتے ہیں۔'' عبداللہ پریشانی کا شکار تھا۔

''کیا بات کہی ہے تم نے؟''

''بس میں نے تو یہی کہا ہے کہ میں زری کو اس کے لاسٹ ایگزامز سے پہلے نہیں بھیجوں گا اور اگر بھیجوں گا بھی تو شادی اس کی پسند سے ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔'' عبداللہ نے اپنی بات دہرائی۔

''بات تو بڑی انقلاب کی ہے تم نے، مگر کیا یقین ہے کہ تم اس پہ قائم بھی رہو گے؟'' دل آور شاہ اس کی ثابت قدمی کا یقین چاہ رہا تھا۔

''دل آور صاحب! میں تمہارا دوست ہوں اور اپنے دوست کو تم بہتر طور پہ جانتے ہو گے، مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''لیکن گستاخی معاف، ایک بات کہنا چاہوں گا تم سے۔'' دل آور نے احتراماً کہا تھا۔

''کہو.....''

''اپنی بہن کو میرا مطلب ہے کہ زرین ملک کو تم اس کی پسند کی آزادی تو دے رہے ہو اگر یہی آزادی تمہارے لیے مشکل بن گئی تو؟'' دل آور ایک بک شاپ کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے ایک پوائنٹ کی بات پوچھ رہا تھا۔

''ہرگز نہیں، زرین ملک میری بہن ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ میری بساط سے زیادہ پاؤں نہیں پھیلائے گی، خود مشکل میں پڑ سکتی ہے، لیکن میرے لیے مشکل کھڑی نہیں کر سکتی۔ جو کہوں گا وہ مانے گی۔'' عبداللہ کے لہجے میں یقین تھا۔

''ہوں..... یہ تو بہت اچھی بات ہے، لیکن کبھی کے دل کا حال تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ کبھی کبھی کسی کی پسند پوری کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔''

"جو مشکل کام ہم اپنے لیے کر سکتے ہیں، وہ بہن اور بیٹیوں کے لیے بھی کر سکتے ہیں، میں ہائر اسٹڈی کے لیے انگلینڈ آیا تھا اور زری کی بھی خواہش تھی کہ وہ ہائر اسٹڈی کے لیے جائے سو دیکھ لو، میں نے اس کی خواہش پوری کر دی، چاہے اس کے لیے مجھے اپنی ساری لیگل کی مخالفت مول لینی پڑی تھی، میں نے لے لی اور دیکھ لینا اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوگا۔" عبداللہ کی بات اور لہجے کی سنجیدگی سے دل آور کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ زری کے لیے ڈٹ جائے گا، لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ زری کسی اور کی پسند تھی اور پسند کسی اور کو کرتی تھی۔ عبداللہ کو اگر پتا چلتا تو وہ کس کا ساتھ دیتا۔ زری کا یا پھر نبیل کا؟ فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا۔

اس ٹاپک پہ اگر سوچا بھی جاتا تو دماغ شل ہو جاتا تھا اور دل آور اکثر اس سارے معاملے سے دامن بچا کے گزر جاتا، بات زری کی ہوتی تو یا نبیل کی، وہ اکثر نظر انداز کر ڈالتا تھا۔

"ان شاء اللہ! اللہ بہتر کرے گا، تم زیادہ ٹینشن مت لو۔" وہ اس کے ساتھ موبائل پہ بات کرتا ہوا گاڑی سے نکل آیا تھا۔

"یار! ٹینشن تو ہوگی، سارا معاملہ ہی بہت سنگین ہے، اب دیکھو کہ اگر ایگزامز کے بعد زری پاکستان جاتی ہے تو بابا جان کی یہی خواہش ہوگی کہ وہ اس کی جلد سے جلد شادی کر دیں، جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ وہ پہلے پاکستان جائے، وہاں دوبارہ سے سیٹ ہو، پھر پتا چلے گا کہ وہ جاگیرداروں اور حویلی والوں سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے یا نہیں۔"

"تو پھر یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟" دل آور گاڑی لاک کر کے مضبوط قدم اٹھاتا بک شاپ کی طرف آ گیا تھا۔

"یہ سب اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں بھی کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آ جاؤں۔" عبداللہ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"تم پاکستان آ جاؤ گے اور نگارش بھابی؟"

"وہ بھی میرے ساتھ آئیں گی۔"

"لیکن تمہارے گھر والے تو انہیں قبول کرنے پہ تیار نہیں ہیں؟"

"جانتا ہوں اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تمہاری طرح لاہور میں اپنا گھر لے لوں اور میں نے تمہیں اسی لیے فون کیا ہے کہ تم میرے لیے کوئی اچھا سا گھر دیکھو۔"

"اوہ..... تو یہ معاملہ ہے؟"

"ہاں یار! مجبوری ہے، زری اکیلی ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، وہ تو پل میں ہتھیار ڈال دے گی، میرا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

"ہوں..... واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو، اچھا ارادہ ہے تمہارا، میں بات کروں گا کسی سے، گھر کرائے پہ لینا ہے یا ذاتی؟"

"نہیں یار! میں کرائے کا جھنجٹ نہیں پال سکتا، ذاتی ہی لوں گا، اگر دوبارہ انگلینڈ آیا تو اس گھر کی ذمہ داری تم ہی سنبھالو گے۔" عبداللہ نے پہلے سے ہی اطلاع دے دینا ضروری سمجھا تھا، جس پہ دل آور کے تیور بدل گئے تھے۔

"کیوں؟ میں تم دونوں کا منیجر ہوں؟ سیکرٹری ہوں؟ یا چوکیدار؟ پہلے تم دونوں کو چیزیں لے کر دوں، پھر ان کی حفاظت بھی کروں، واہ کیا بات ہے جناب؟ ساری زندگی تم دونوں کے کاموں میں گزار دوں اور اپنا کچھ نہ کروں۔" دل آور نے اسے کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔ عبداللہ اس کی بات پہ یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"اپنا کیا کرنا ہے تم نے؟" وہ غصے میں تھا اور عبداللہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"جنازہ جائز کرنا ہے، جیسے تم نے کیا ہے۔"

"صرف جنازہ ہی جائز کرنا ہے؟ شادی نہیں کرنی تم نے؟" عبداللہ نے دوبارہ چھیڑا۔

"عبداللہ صاحب! تم اس وقت فون پہ ہو، میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ میں نے کیا، کیا کرنا ہے؟ اور میرے کرنے کا سن کر تمہارے کانوں سے دھواں نہ نکل جاتا تو میرا نام بھی دل آور شاہ نہیں تھا۔" وہ اک اک لفظ غصے اور خفگی سے چبا کر بولا تھا، جس پہ عبداللہ کو جیسے ہنسی اور قہقہوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں ابھی ہمارے کام نبٹا لو، پھر بعد میں تمہیں فرصت ہی کب ملے گی بھلا؟"

"ایسی کی تیسی تمہارے کاموں کی، بس تمہیں گھر لے کر دوں گا، بس میں جو بھی چاہے کرتے رہنا، سمجھے تم؟" دل آور نے اسے جھڑکی دکھائی۔

''ارے یار! تم جانتے ہو تمہارے سوا ایسے کام کوئی نہیں کر سکتا، اسی لیے تم سے ہی کہنے پڑتے ہیں، مجبوری ہے ہماری۔''

''کیوں؟ کیا میں پراپرٹی ڈیلر ہوں؟ کسی نے گھر لینا ہے، کسی نے شوروم بنانا ہے، ایک کے بابا صاحب کینیڈا سے پاکستان آئے ہیں تو وہ پریشان ہے، ایک کے بابا جان پاکستان سے انگلینڈ جانا چاہ رہے ہیں تو وہ پریشان ہے، ایک کو مدحیہ حیات نے تنگ رکھا ہے تو دوسرا زرین ملک کے لیے ستایا جا رہا ہے۔ واہ میرے دوستو واہ! کن اُلجھنوں میں اُلجھ گئے ہو؟'' دل آور در حقیقت ان کا مذاق اُڑا رہا تھا، جس پہ عبداللہ بھی اپنی بے ساختہ ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

''ہاں یار! یہ تو تم سچ ہی کہہ رہے ہو، بہت اُلجھ گئے ہیں ہم لوگ اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تمہیں بھی اُلجھا دے، شادی کے چکروں میں۔''

''ہونہہ! مجھے اُلجھنے دو گے تو میں اُلجھوں گا نا۔'' جب تک تم دونوں میرے پیچھے پڑے ہو، میرا کچھ نہیں بننے والا۔'' آج دل آور شاہ کو رہ رہ کے اپنا خیال آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے جناب آج بار بار اپنے لیے دہائی دی جا رہی ہے، کوئی خاص وجہ؟'' عبداللہ نے معنی خیزی سے پوچھا۔ جس پہ دل آور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

''وجہ کیا ہو گی یار! آج بے وجہ ہی شادی کا دل کر رہا ہے۔'' دل آور اس سے بھی زیادہ معنی خیزی سے بولا تھا۔

''ہوئے ہوئے بڑے بیتاب لگتے ہو؟ بتول آنٹی سے بات کروں کہ ان کے بیٹے کا شادی کرنے کا دل کر رہا ہے، جوانی مسئلہ کر رہی ہے، صبر نہیں ہو رہا شہزادے سے؟''

''تمہاری بتول آنٹی کو خود ہی پتا ہے کہ ان کا بیٹا کیسا ہے؟ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں ایک بات اور جوانی کو بھی اتنا بے صبرا بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ منہ کو آنے لگے، بس میں ہر چیز کو ایک حد تک رکھنے کا قائل ہوں۔'' دل آور نے استہزائیہ سا جواب دیا تھا۔

''ویسے ایک بات تو بتاؤ یار! تمہیں کوئی پسند بھی ہے یا نہیں؟''

نہ جانے کیوں عبداللہ نے بے ساختہ ہی یہ سوال کر ڈالا تھا اور دل آور کے فرفر بولنے والے ہونٹوں پہ چپ کا تالا پڑ گیا تھا۔ وہ عجیب تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے دل آور ے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟ کیا میں زیادہ پرسنل ہو گیا ہوں؟'' عبداللہ نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

''ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے، ابھی اس پسند اور ناپسند والے معاملے پہ دھیان نہیں دیا، لیکن جب دیا تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔'' دل آور نے شائستگی سے بات ٹالی تھی۔

''کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تم نے اس معاملے پہ دھیان دیا تو تمہاری پسند، تمہارا انتخاب کیسی لڑکی ہو گی؟'' عبداللہ کا ایک اور کھوجتا ہوا سوال آیا تھا اور دل آور کی آنکھوں کے سامنے ایک نرم و ملائم اور دلکش سا سراپا پوری آب و تاب کے ساتھ جاگ گیا تھا۔ محبتوں اور مٹھاس سے گندھا ہوا، دل آور شاہ کے عشق میں پور پور ڈوبا ہوا۔

''کیا پھر کچھ غلط پوچھ لیا میں نے؟'' عبداللہ نے پھر متوجہ کیا تھا اسے۔

''میری پسند، میری اماں بہتر جانتی ہیں، ہو سکے تو ان سے پوچھ لو۔'' دل آور نے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور عبداللہ اس کے جاب پہ بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

''کیا تم اپنی اماں کی پسند سے شادی کرو گے؟''

''ہاں کہہ سکتے ہو، کیونکہ میری اور میری اماں کی پسند تقریباً ایک ہی ہو گی۔ جس سے وہ کہیں گی میں شادی کر لوں گا۔'' دل آور کے جواب پہ عبداللہ نے گہری سانس کھینچی تھی اور پھر چند اور باتوں کے بعد فون بند کر ڈالا، لیکن دل آور کے ذہن میں ہزاروں سوچیں اور ہزاروں اُلجھنیں چھوڑ گیا تھا، اس کا دماغ بوجھل اور منتشر ہو رہا تھا، وہ بوجھل قدم اُٹھاتا بک شاپ کے اندر آ گیا تھا، کچھ کتابیں لینی تھیں۔

♥

پھر ایک لیلیٰ گھڑی ہوتی ہے نئے زمانے کی تمنیوں میں
پھر ایک وعدہ امر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
ابھی تو بچھڑتے ہو دوستوں میں، عزیز کوئی جدا نہیں ہے
کوئی ادھر سے اُدھر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
محبتوں میں تو پتھروں کو بھی موم ہوتے سنا ہے لیکن
تمہارے دل پہ اثر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
وہ جس کی خاطر زمانے بھر کو بنا رہے ہو تم اپنا دشمن
وہی نہ اپنا اگر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

نگارش کسی کام سے باہر نکلی تھی لیکن گھر کے چھوٹے سے لان میں اسے سفید کاغذ جابجا بکھرے ہوئے نظر آئے تھے، اس نے آگے بڑھ کے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھا۔ زری کی ہینڈ رائٹنگ میں چند اشعار تحریر تھے، بن کر پڑھ کے نگارش نے چونک کر زری کے بیڈ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں سے اور بھی کاغذ زمین کی طرف چلے آرہے تھے۔ اس نے ڈائری پھاڑ ڈالی تھی شاید۔

"وہ مائی گاڈ! یہ کیا کیا اس نے؟" نگارش چکرا گئی تھی وہ سب کچھ چھوڑ پھاڑ کے اندر کی طرف بھاگی اس کا رخ زری کے بیڈ روم کی طرف تھا اس نے آتے ہی دروازہ دھڑام سے کھولا تھا۔

"زری....." نگارش نے تڑپ کے پکارا تھا اسے اور تیز کی تیزی سے اس کے پاس آئی تھی اس نے بے تحاشہ آنسو بہاتی آنکھوں سے روتی ہوئی زری کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟ پاگل ہوگئی ہو کیا؟" نگارش نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"ہاں پاگل ہوگئی ہوں میں، تڑپ مٹا رہی ہوں اپنے اندر کی، یہ لفظ صرف لفظ نہیں ہیں یہ اس شخص کی یاد، اس کی تڑپ اس کی طلب ہیں، جب جب اس کے لیے تڑپی ہوں تب تب میں نے لفظ تحریر کیے ہیں، جب جب اسے یاد کیا ہے، تب تب اپنے دل کا حال لکھا ہے اور وہ شخص..... وہ میری تڑپ، میرے دل کا حال ہی نہیں جانتا، انجان پھر رہا ہے مجھ سے، جیسے میرا..... میرا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے، جیسے اس کے انجان پن سے مجھے تو درد ہی نہیں ہوتا، مجھے تو تکلیف ہی نہیں ہوتی، پورا ایک سال ہوگیا ہے اسے دیکھے ہوئے، اس سے بات کیے ہوئے، آج میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کر لیا تو وہ میرا دیوتا بن بیٹھا، اس کے سامنے گڑگڑاتی رہی لیکن اس نے فون کو آن کر کے کان سے لگانے کی زحمت نہیں کی۔ جانتی ہیں آپ کتنی بار فون کیا ہے میں نے..... دس بار، پورے دس بار اور دس بار اس نے تڑپ کا تماشہ دیکھا ہے، ایک بٹن..... محض ایک بٹن دبا کر اس تڑپ کو کان سے لگا کر قرار نہیں دیا، صرف یہ سوچ کر کہ کہیں زری اس قرار، اس تسلی کی عادی نہ ہو جائے۔ کہیں اس سے عمر بھر کا ساتھ نہ مانگ لے، بھائی میری بات کا نوٹ یہ لکھ کے رکھ لیں، وہ شخص دوستیاں نبھانے والا شخص ہے، محبتیں نہیں، وہ کبھی میری محبت پہ ترس نہیں کھائے گا، کبھی گلے نہیں لگائے گا، وہ کبھی بھی زرین ملک پہ اپنی نگاہِ یار کی برسات نہیں برسائے گا اور میں ترس ترس کر پیاسے صحرا کی مانند ہو جاؤں گی۔"

زری رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ دل آور شاہ کے مجسمہ ستم سے آگاہ بھی کر رہی تھی نگارش سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"زری پلیز کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہو؟ ہو سکتا ہے اسے تمہاری کال کا پتا ہی نہ چلا ہو، ہو سکتا ہے وہ سو رہا ہو، یا پھر سیل ہی اس کے پاس نہ ہو؟" نگارش نے اس کی تسلی کے لیے کئی بہانے ڈھونڈے تھے جس پہ زری بے ساختہ تلخی سے مسکرائی تھی۔

"کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے پاس سیل نہ ہو، سیل اس کے پاس تھا، اس کے ہاتھ میں تھا، پھر بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی، اس نے میرے لیے، میری ہی کال ریسیو نہیں کی، نظر انداز کر دی، اس کے سیل پہ ڈائیریکشن ہوتی رہی اور وہ دیکھتا رہا، میری تڑپ کا تماشہ دیکھتا رہا۔" زری اک اک بات یوں بتا رہی تھی جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی رہی تھی یا پھر اسے الہام ہوا ہو، ایسے عالم میں اگر دل آور شاہ اس کی باتیں سن لیتا تو یقیناً ششدر رہ جاتا، اس کی باتیں اور اس کی عادتیں تو وہ ایسے جانتی تھی جیسے اس کے اندر سمائی تھی اور ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔

"لیکن زری اسے بھلا کیا پرابلم تھی کال ریسیو کرنے میں.....؟"

"پرابلم تھی بھائی! پرابلم ہی تو تھی، آپ نہیں سمجھیں گی اس بامروت شخص کی پرابلم کو....." اس نے دکھ سے کہتے ہوئے سر جھٹکا

تھا۔

"مگر زری! تم خوامخواہ اپنا دل جلا رہی ہو، دل آور بھائی، تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ہی رہیں گے۔" نگارش حوصلہ دلانے کرنے دیتی تھی زری بے تحاشہ رونے کے بعد راکنگ چیئر پہ گرنے کے سے انداز میں ڈھے گئی تھی لیکن اچانک بجنے والے اس کے سیل نے اسے بُری طرح چونکا دیا تھا نگارش نے لیپ کے اس کا سیل بیڈ سے اُٹھایا تھا اور اس کا چہرہ یکدم کھل اُٹھا تھا۔

"زری! بتول آنٹی کی کال ہے۔" نگارش نے چہکتے ہوئے پُرجوش سے انداز میں کہا تھا اور زری نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے بے یقینی سے دیکھا تھا لیکن نگارش نے اتنے میں کال آن کر کے موبائل زری کے کان سے لگا دیا تھا۔

"السلام علیکم۔" زری نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو بیٹا؟" بتول شاہ کا پُرسکون ٹھہرا ہوا لہجہ اور محبت بھری آواز سنائی دی تھی۔

"جی ٹھیک ہوں میں۔" زری اور کہتی بھی تو کیا؟

"اوہ اچھا..... تو تم نے بھی میرے دل آور کی طرح جھوٹ بولنا سیکھ لیا ہے؟" ان کی بات پہ زری کا دل زور سے دھڑکا تھا کہ "انہیں میرے حال میری کنڈیشن کا کیسے پتا چلا؟"

"ایم سوری آنٹی! میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟"

"وہ بھی یہی کہتا ہے، حالانکہ بات پل میں سمجھ جاتا ہے۔ پھر بھی کہتا ہے کہ میں سمجھا نہیں۔" بتول شاہ ذرا مسکرا کے بولی تھیں۔

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟" زری نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "اسی کی جس سے تم بات کرنا "چاہ" رہی تھیں، جس کو تم نے دس بار کریدا ہے، دس بار ضرب لگائی ہے تم نے۔" بتول شاہ کی بات سن کر زری دھک سے رہ گئی تھی اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ دل آور شاہ نے اپنی اماں کو کیسے بتا دیا؟

"بیٹا! اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے، وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا، میں اس کی ماں ہی نہیں ہمراز بھی ہوں، اس کی ہر بات جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے کل رات زندگی میں پہلی بار اس کے نمبر پہ فون کیا تھا۔ لیکن وہ سن نہیں سکا لیکن جب اس کے فون نہ سننے پہ دل برداشتہ مت ہونا، اس کی کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔ وہ تمہاری کال سے بہت ڈسٹرب تھا، پریشان تھا کہ آج زری اپنی چپ کیوں توڑ رہی ہے؟ آخر کیا وجہ ہے؟ اور یقیناً اسی پریشانی میں وہ رات بھر سویا بھی نہیں ہوگا؟" بتول شاہ بات کر رہی تھیں اور زری کے دل پہ پھوار برس رہی تھی اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا دلکش تھا کہ دل آور شاہ نے اسے کسی کے ساتھ ڈسکس تو کیا ہے نا؟ کسی کے سامنے اس کا نام لیا ہے، اس کا ذکر کیا ہے، کال بے شک نہیں سنی مگر کال پہ پریشان تو ہوا ہے؟ رات بھر سویا نہیں، جاگ کر مجھے سوچا تو ہے نا؟ وہ بے ساختہ پلکیں موند کر دل ہی دل میں تشکر کا احساس لیے خدا کے حضور جھک گئی تھی دل بھرے پہ سجدہ کر رہا تھا۔ روح شانت ہو چکی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے چہرے پہ بکھرنے والے سکون اور اطمینان کے رنگ نگارش کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکے تھے نگارش اس کے قریب آئی اور زری نے شدت جذبات اور خوشی کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے نگارش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

"تم پاکستان کب آ رہی ہو؟" بتول شاہ نے ذرا ٹھہر کے سوال کیا۔

"نیکسٹ منڈے سے میرے فائنل ایگزامز اسٹارٹ ہو رہے ہیں، مہینہ یا پھر ڈیڑھ مہینہ لگ جائے گا میری واپسی کو۔"

"اچھی بات ہے، جلدی سے آ جاؤ میں بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"جی ضرور کیوں نہیں۔" زری سے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"نگارش کیسی ہے؟"

"جی نگار بھابی بھی ٹھیک ہیں، میرے پاس ہی ہیں۔"

"ارے واہ..... بات کرواؤ میری۔" انہوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور زری نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون نگارش کو تھما دیا

تھا۔

"السلام علیکم آنٹی۔"

"وعلیکم السلام! جیتی رہو کیسی ہو؟"

"جی اللہ کا احسان ہے ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"بیٹا پاکستان کا چکر لگاؤ تم لوگ، کیا انگلینڈ کے ہی ہو کے رہ گئے ہو۔"

"ان شاء اللہ! بہت جلد ہم لوگ پاکستان آئیں گے۔ عبداللہ خود بھی کہہ رہے تھے، کافی عرصہ ہو گیا ہے، اور اب تو دل آور بھائی کی طرح جمیل بھائی بھی چلے گئے ہیں۔ عبداللہ بہت اکیلا فیل کرتے ہیں اپنے آپ کو۔"

"وہ اکیلا بندہ اکیلا ہی فیل کرے گا نا۔"

"بس جلدی سے آجاؤ۔"

"ضرور آئیں گے آنٹی، آپ دعا کیجیے، بس کچھ پریشانیاں ہیں اللہ کرے کہ یہ پریشانیاں دور ہو جائیں۔"

"ان شاء اللہ..... اللہ کرم کرے گا۔" بتول شاہ نے تسلی دی اور پھر کافی دیر نگارش کے ساتھ ہاتوں میں مصروف رہی تھیں اور جیسے ہی فون بند ہوا۔ نگارش، زری پہ چڑھ دوڑی تھی۔

"آپ بولو محترمہ! کیا کہا تھا میں نے؟ کب سے سمجھا رہی ہوں، تسلیاں دے رہی ہوں، لیکن تم ہو کہ پاگل پن کی حد کر ڈالی تھی۔ تڑپ تڑپ کر میرا کلیجہ بھی تڑپا ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر اور بتول آنٹی کا فون نہ آتا تو میں خود رونے والی تھی۔" نگارش نے اسے چپت رسید کرتے ہوئے کہا اور زری کھلکھلاتی ہوئی، ہنستی ہوئی سرور سی ہو رہی تھی۔

"بس بھابی اس نے مجھے نظر انداز بھی تو ایسے ہی کیا تھا کہ میرے دل میں اک بات کا خوف بیٹھ گیا تھا۔"

"کس بات کا خوف....." نگارش نے ٹھٹک کے پوچھا۔

بھول شاعر۔

جسے اپنا یار کہنا، اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیث دلبراں ہے، یہ کمال دلبری ہے

زری نے شعر کہتے ہوئے نگارش کو دیکھا تھا۔

"بس اسی بات سے ڈر گئی تھی کہ میرا دلبر بھی مجھے بھنور میں نہ چھوڑ جائے۔"

"ہوشیار..... بھاڑ میں گئی تمہاری شاعری، سر درد کر ڈالا ہے۔" نگارش اسے کھینچ کے کشن مارتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری ایک بار پھر کھلکھلائی تھی اور سر شاری راکنگ چیئر پہ جھولنے لگی، ہونٹ بے وجہ ہی مسکرا رہے تھے۔

♥

"امی! کہاں جا رہی ہیں آپ؟" وہ ایکسی کے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھیں کہ پیچھے سے دانیال کی آواز سنائی دی۔ عائشہ آنٹی کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

"حویلی کی طرف۔"

"کیوں؟"

"ارے کیوں کا کیا مطلب ہے؟"

"کیوں کا مطلب ہے کہ آپ کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو پھر کیوں جا رہی ہیں آپ؟" دانیال عشاء کی نماز پڑھ کے آیا تھا اور ابھی کچن سے پانی پی کر نکلا تھا جب ان کو کہیں باہر جاتے دیکھ کر رک گیا تھا۔

"میری طبیعت کافی بہتر ہے، ایک ہی جگہ رہ رہ کر دماغ بھی تھک گیا ہے اور جسم بھی، بے شک سبھی باری باری میرے پاس آتے رہتے ہیں لیکن میں تو ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ گئی ہوں۔" وہ کافی دھیمے سے کہہ رہی تھیں اور دانیال ان کی بات پہ اتفاق کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"ہوں..... ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، جانا چاہیے آپ کو، انوشہ کہاں ہے؟"

"انوشہ بھی وہیں ہو گی لڑکیوں کے پاس۔"

''تو پھر میں اکیلا گھر پہ کیا کروں گا، چلیے میں بھی چلتا ہوں۔'' وہ تجف سے کہتا ہوں ان کے ساتھ ہولیا اور عائشہ آفندی سے ساختہ اس کی بات پہ مسکرا اٹھی تھیں۔

اور وہ دونوں ماں بیٹا ایک ساتھ جو بلی میں داخل ہوئے تھے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ سبھی یکدم چونک اٹھے تھے۔ کومل اور آذر ہی ان کے بڑے بھتیجی اور بھتیجے تھے اور وہی دونوں سب سے زیادہ خوش ہو کر ان کی طرف آئے تھے اور دونوں ہی اپنی اس بے ساختگی پہ پل بھر کے لیے ٹھٹک سے گئے۔ کومل نے آذر کو دیکھ کر چہرہ جھکا لیا تھا جبکہ آذر نے آگے بڑھ کے عائشہ پھوپھو کا بازو تھام لیا تھا۔

''آیئے پھوپھو، یہاں بیٹھیے۔'' آذر نے اپنی جگہ پیش کی تھی اور وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی تھیں۔

''کیا بات ہے بھئی، آج کیا محفل لگا رکھی ہے؟''

انہوں نے آذر سے پوچھا تھا جو اس چھ پارٹی میں ذرا کم ہی نظر آتا تھا اس کا زیادہ تر وقت کاروباری سلسلوں میں گزرتا تھا گھر پہ ہوتا تب بھی وقار آفندی، اسرار آفندی اور افتخار آفندی کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ ڈسکس کرنے میں مصروف نظر آتا تھا۔

''پھوپھو! دراصل یہ محفل میں نے نہیں لگائی بلکہ لگوائی گئی ہے اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ہماری اس شرارتی بلی کا ہے۔'' آذر نے قالین پہ بیٹھی انوشہ کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

''اچھا وہ کیسے؟'' انہیں اور دانیال کو حیرت بھی ہوئی تھی اور دلچسپی بھی۔

''وہ ایسے کہ میں عشاء کی نماز پڑھ کے اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے جا رہا تھا جب یہ مجھے سیڑھیوں سے پکڑ لائی ہے اور اپنی بات منوانے کی ضد کر رہی ہے، مگر اس کی بات ماننا ذرا مشکل کام ہے اس لیے میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ کیا کروں اور کیا نہیں۔''

آذر اپنی پھوپھی زاد کزن انوشہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا جو معصوم اور مسکین سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔

''کیسی بات؟ کیسی ضد اور کیسا فیصلہ؟'' عائشہ آفندی کو تجسس ہوا تھا کہ ان کی بیٹی ان کے بھتیجے سے کیا منوانا چاہ رہی ہے، وہ بھی اتنے لوگوں کے ساتھ مل کر۔

''تو کیا اس پلان کو تم لوگوں نے سیکرٹ رکھنا ہے۔'' آذر کو حیرانی ہوئی۔

''نہیں سیکرٹ تو نہیں رکھنا، لیکن پہلے آپ کی اجازت تو مل جائے، پہلے آپ تو مان جائیں نا۔''

''کام بہت مشکل ہے، میرا ماننا آسان نہیں ہے، یوں سمجھ لو یہ ایک رسک ہے اور میں اکیلا اتنی عوام کا رسک نہیں لے سکتا۔'' آذر نے عوام کہتے ہوئے لڑکیوں کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ دانیال اور احمد مسکرا دیے تھے۔

''تو آپ دانیال بھائی کو اور احمد بھائی کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔''

انوشہ بھرپور طریقے سے کیس لڑ رہی تھی۔ ساری لڑکیوں نے دل ہی دل میں اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دی تھی۔

''اوکے میں اگر اجازت دے بھی دیتا ہوں تو ڈیڈ سے اجازت کون لے گا۔'' آذر نے دوسرے پہلو کا ذکر کیا جس کو سر کرنا واقعی سب کے لیے مشکل تھا۔

''ان سے صرف دو ہی لوگ اجازت لے سکتے ہیں۔'' انوشہ نے فوراً کہا۔

''ایک آپ اور ایک علیزے۔'' اس نے آذر کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس کی بات پہ کومل نے چونک کر دیکھا تھا اس کے چہرے پہ جو رنگ ابھرا تھا وہ آذر کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا اور آذر یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔

♥

کومل کے چہرے پہ اک واضح ناگواری تھی جو کسی اور کو تو نہ سہی لیکن آذر کو بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی جس کی وجہ سے اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ڈائریکٹ کومل کے چہرے کی سمت دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور دوسری طرف کومل اپنے چہرے پہ اس کی نظروں کی تپش اور اک الجھی ہوئی کھوج محسوس کر چکی تھی جبھی ذرا سا پہلو بدل کر چہرے کا رخ موڑ لیا۔ یعنی آذر نے اپنی نظروں کا پہلو پھر بھی نہیں بدلا۔

''آذر.....'' دانیال نے اسے ٹہوکا دیا۔

''ہوں.....؟'' وہ بڑے الجھے ہوئے انداز میں متوجہ ہوا کیونکہ وہ ہنوز کومل کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔

"انوشہ تم سے کچھ کہہ رہی تھی شاید؟" دانیال نے اسے یاد دلایا۔

"ہوں..... سن رہا ہوں اور سب دیکھ رہا ہوں، مگر سمجھ نہیں پا رہا۔" آذر کا لہجہ پُرسوچ اور مبہم سا تھا اس نے دوبارہ اک اچٹتی سی نظر کومل پہ ڈالی، وہ اپنے قریب بیٹھی حرمت اور دانیانہ کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا..... کیا سمجھ نہیں پا رہے۔" انوشہ کو آذر کی بات سمجھ نہیں آئی تھی مگر دانیال بخوبی سمجھ چکا تھا۔

"یہی کہ آپ لوگوں کا پروگرام کینسل ہونا چاہیے یا پھر اوکے؟" آذر بہت ٹھہر کے بات کر رہا تھا۔

"آذر بھائی پلیز! ہمارا پروگرام اوکے ہونا چاہیے کینسل نہیں، اسی لیے تو آپ کے سامنے یہ عدالت لگا رکھی ہے، پلیز کچھ رحم کریں، فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہیے۔" انوشہ التجائی لہجات سے بولی۔

"تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کا یہ کام علیزے سے کہنا چاہیے، ڈیڈ مجھے تو انکار کر سکتے ہیں لیکن علیزے کو نہیں۔" آذر نے کومل کے چہرے کے تاثرات دوبارہ جانچنے کے لیے جان بوجھ کر علیزے کا نام لیا تھا لیکن اس بار شاید اپنے تاثرات کنٹرول کر چکی تھی اس کا چہرہ نارمل تھا۔

"علیزے سے؟ لیکن وہ تو سو چکی ہوگی؟" انوشہ نے وال کلاک دیکھا جو بارہ بجنے کا ٹائم ہو رہا تھا اور علیزے تو عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد فوراً سونے کے لیے چلی جاتی تھی۔

"تو کوئی بات نہیں صبح کا انتظار کر لو صبح بات کر لینا۔" آذر نے کندھے اچکائے۔

"علیزے جاگ رہی ہے۔" زین نے اندر داخل ہوتے ہوئے گڈ نیوز سنائی۔

"سچ.....؟" انوشہ چہکی تھی۔

"سچ....." زین نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتا کہ علیزے جاگ رہی ہے؟" انوشہ کو ایک اور سوال سوجھا تھا۔

"علیزے کی لائٹ جو ابھی ابھی اس کے بیڈ روم سے نکلتی ہوئی دکھائی دی ہے جس کا مطلب ہے کہ شہزادی علیزے اپنی خواب گاہ میں ابھی جاگ رہی ہیں، آپ نے اپنی کوئی عرضی پیش کرنی ہو تو کر سکتی ہیں۔" زین نے صوفے پہ بیٹھ کے آلتی پالتی مارتے ہوئے شاہانہ انداز میں جواب سے نوازا تھا۔

"واہ بے وارث تو کمال ہو گیا، آج تو علیزے بھی جاگ رہی ہے۔" احمد مسکرا کر بولا۔

"میں ابھی علیزے کو بلا کے لاتی ہوں۔" انوشہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور وہ سب انوشہ کی پھرتی پہ ہنس پڑے تھے اب عائشہ آفندی کی طرح آذر اور دانیال بھی سارا تماشہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انوشہ علیزے کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"عائشہ پھوپھو کیسی ہیں آپ؟" علیزے سب کو سلام کرنے کے بعد سیدھی عائشہ آفندی کے پاس آئی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسی ہو؟" انہوں نے نرمی اور شفقت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، بس سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ انوشہ آپی نے بلا لیا۔" علیزے ان سب لوگوں کو اک نظر دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"تمہاری انوشہ آپی نے تمہیں کسی کام کے لیے بلایا ہے۔" عائشہ آفندی مسکرا کے بولیں۔

"کس کام کے لیے؟" علیزے نے سوالیہ نظروں سے انوشہ کی سمت دیکھا۔

"جی ہاں کام کے لیے بلایا ہے کیونکہ یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔" انوشہ نے تمہید باندھی۔

"کیسا کام.....؟" علیزے کو حیرانی ہوئی

"کمپنی کے ایشو؟ کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے، بس یوں سمجھ لو کہ آپ دو ہوا تبدیل کرنے کا کام ہے۔" احمد نے بھی مداخلت کی۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔" علیزے ان کی پہیلیاں نہیں بوجھ سکتی تھی۔

"مطلب کہ ان سب لوگوں کا گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔" آذر نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

''اوہ اچھا..... تو اس میں مشکل کیا ہے؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''مشکل یہ ہے کہ ان کا پروگرام مری اور اسلام آباد گھومنے کا ہے، لاہور کی سڑکوں سے نکل کر اسلام آباد کی سڑکوں پہ جانا چاہتے ہیں۔'' آذر نے مزید اطلاع پہنچائی تھی جس پہ علیزے کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔

''ریئلی.....؟''

''آف کورس یار! اگر تم ساتھ دے دو تو؟'' انوشہ کو خود میدان میں اُترنا پڑا تھا۔

''میں ساتھ دے دوں..... وہ کیسے؟'' اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''ڈیڈ سے اجازت لے کر۔'' انوشہ نے مدعا بیان کیا۔

''اوہ تو یہ کام ہے؟'' علیزے نے سر ہلایا

''ہاں یار! یہی کام ہے اور یہی سب سے مشکل کام ہے، جو صرف تم کر سکتی ہو۔''

''ہوں وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....'' علیزے چپ ہو گئی۔

''لیکن کیا؟'' انوشہ بے صبری سے بولی۔

''لیکن اگر پاپا نہ مانے تو؟'' اس نے انکار کا خدشہ ظاہر کیا۔

''یہ ہو نہیں سکتا کہ تم کوئی کام کہو اور وہ انکار کریں۔'' انوشہ کو کامل یقین تھا کہ وہ مان جائیں گے۔

''تو پھر آذر بھائی سے کہیں کہ وہ پاپا سے اجازت لینے میں میرا ساتھ دیں، وہ میرے ساتھ چلیں۔'' علیزے نے معصومیت اور سادگی سے کہا تھا لیکن ذرا غافل سے پہ بیٹھی کومل نے سانپ کی طرح پھنکار کے سر اُٹھایا تھا اس کی نظروں میں کسی تلوار کی سی کاٹ تھی۔

''ارے ہاں..... یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے آپ لوگوں کو ڈیڈ سے ایک ساتھ اجازت مانگنی چاہیے وہ آپ دونوں کو انکار نہیں کریں گے، آذر بھائی پلیز اُٹھ جائیں، ورنہ ڈیڈ سو جائیں گے۔'' انوشہ ہر طرف بس جلدی ہی مچا رہی تھی۔

''تو اچھا ہے نا صبح بات کریں گے۔ ڈیڈ کا موڈ بھی فریش ہو گا۔'' آذر نے اسے روکنا چاہا۔

''نہیں صبح نہیں..... ابھی بات کریں۔'' وہ ضد پہ اڑی ہوئی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کے آذر کو بالآخر اُٹھنا ہی پڑا تھا انوشہ بھی آج اس کی نرمی کا بھرپور فائدہ اُٹھا رہی تھی اور آذر بھی اسے اس لیے انکار نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس کی اکلوتی پھوپھو کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس نے آج تک ان سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا، آج بھی نجانے کس موڈ میں تھی کہ یہ انوکھی فرمائش کر بیٹھی تھی اور آخر سے انکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''چلو علیزے تم بھی ساتھ جاؤ اور سنو اجازت لے کر ہی آنا۔'' اس نے علیزے کو آذر کے ساتھ بھیجا اور ساتھ ساتھ تاکید بھی ضروری سمجھا تھا، وہ دونوں ایک ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلے تھے لیکن باقی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی کومل نے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے آذر اور علیزے کو کافی تیز اور سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا، اس کے دل میں رقابت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے۔

''کومل! کیا دیکھ رہی ہو؟'' حرمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے متوجہ کیا تھا وہ یکدم چونک اُٹھی تھی۔

''کچھ نہیں.....'' وہ مختصر سا جواب دیتی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' حرمت نے دوبارہ استفسار کیا۔

''میرا سر درد کر رہا ہے، اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔'' وہ اپنی کنپٹی سہلاتے ہوئے بڑے ضبط سے کہتی وہاں سے چلی گئی اور حرمت پیچھے دیکھتی رہ گئی، کیونکہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے اصرار کر کے روک بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے سمجھا سکتی تھی، اس کا موڈ پہلے ہی خراب تھا، غصے میں کچھ بول دیتی تو خوامخواہ تماشہ بن جاتا جبھی مجبوراً حرمت کو چپ ہو کے بیٹھنا پڑا تا کہ وہاں موجود اور لوگوں کو بھی کومل کے رویے کی خبر نہ ہو۔ لیکن حرمت یہ نہیں جانتی تھی کہ دانیال بھی سب کچھ جانتا ہے اور اس وقت کومل کی تمام حرکتیں نوٹ کر رہا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح حرمت کرتی تھی۔

♥

''پاپا پلیز..... مان جائیں۔'' علیزے نے التجائیہ انداز میں دہائی دی تھی۔

"دیکھو بیٹا! میں نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے۔" وقار آفندی کافی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔
"تو پھر مجھے اجازت کیوں نہیں دے رہے آپ؟"
"بس تمہارے لیے کوئی اجازت نہیں ہے، تم گھر میں ہی ٹھیک ہو۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔
"کیوں؟ میرے لیے اجازت کیوں نہیں ہے؟ میں بھی گھر سے نکلنا چاہتی ہوں، گھومنا پھرنا چاہتی ہوں، سب لڑکیوں کی طرح انجوائے کرنا چاہتی ہوں پلیز۔" پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے کسی چیز پہ ضد کر رہی تھی اور وقار آفندی مان نہیں رہے تھے حالانکہ علیزے کے ایک بار کہنے پہ انہوں نے سب کو جانے کی اجازت دے دی تھی سوائے علیزے کو۔
"دیکھو بیٹا! تم اتنا طویل سفر کرو گی تو تھک جاؤ گی، دوسرے وہاں کا موسم بھی تمہیں سوٹ نہیں کرے گا اور سب سے اہم بات کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں سے دور بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا، جب تک تم گھر سے باہر ہو گی مجھے بے چینی ہوتی رہے گی، مری کے پہاڑ، کھائی اور دشوار ترین راستے اُف توبہ، میں تمہیں وہاں بھیجنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہرگز نہیں۔" وہ سختی سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلا رہے تھے علیزے نے رد ہونے انداز میں آذر کی سمت دیکھا وہ خاموشی اور دلچسپی سے دونوں باپ بیٹی کی بحث و تکرار سن رہا تھا لیکن علیزے کی گولڈن براؤن کانچ سی آنکھوں میں تیرتے شفاف پانیوں کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔
"پلیز ڈیڈ! اگر علیزے نہیں جائے گی تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔" آذر نے ایک دم سے فیصلہ سنایا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" وقار آفندی، آذر کو علیزے کے حق میں بولتے دیکھ کر خفگی سے گویا ہوئے۔
"تو اور کیا کہوں؟ ہم سب چلے گئے تو وہ اکیلی پیچھے کیا کرے گی۔" آذر کی بات پہ علیزے کو ڈھارس بندھ گئی تھی کہ چلو کوئی تو ہے جو اس کا ساتھ دینے کے لیے۔
"تو یہ وہاں جا کر بھلا کیا کرے گی؟" وہ بنوز خفگی سے پوچھ رہے تھے۔
"نئے لوگ، نئے شہر، نئی جگہیں دیکھے گی، گھومے پھرے گی، باقی سب کی طرح انجوائے کرے گی اور بھلا کیا کرنا ہے اس نے؟" آذر نے اس کی بھرپور حمایت کی تھی۔
"لیکن آذر تم جانتے ہو کہ....."
"ڈونٹ وری ڈیڈ! کچھ نہیں ہو گا، ہم سب ہیں نا ساتھ، اس کی ذمہ داری آپ مجھے سونپ دیں، جیسے لے کر جاؤں گا، ویسے لے کر بھی آؤں گا، یہ صرف آپ کی ہی علیزے نہیں ہے، ہماری بھی ہے، جتنی فکر آپ کو ہوتی ہے، اتنی ہمیں بھی ہوتی ہے، اسی لیے آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ میں علیزے کو آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔" آذر نے وقار آفندی کو کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی وہ چپ سے ہو گئے تھے۔
اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی آسیہ آفندی اپنے ہاتھوں سے سونے کی چوڑیاں اُتارتے ہوئے ان لوگوں کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھیں کیونکہ وقار آفندی ابھی بھی اجازت دینے سے پہلے تذبذب کا شکار تھے جبکہ آذر انہیں اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"ڈیڈ! کیا خیال ہے آپ کا؟" اس نے انہیں سوچوں سے نکالا، آسیہ آفندی اور علیزے مسکراہٹ دبا گئی تھیں۔
"ٹھیک ہے یہ بھی جا سکتی ہے لیکن....." انہوں نے دل پہ پتھر رکھتے ہوئے بالآخر اسے بھی اجازت دے دی تھی۔
"لیکن کیا....." آذر نے ان کی ادھوری بات پہ استفسار کیا۔
"کچھ نہیں، بعد میں بتاؤں گا، تم لوگ جا کر آرام کرو۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے بولے تھے۔
"ٹھیک ہے ڈیڈ! تھینک یو سو مچ۔" آذر فوراً صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی کھڑی ہو گئی تھی۔
"گڈ نائٹ پاپا، گڈ نائٹ مما۔" وہ ان دونوں سے مل کر آذر کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی اور جیسے ہی وہ دونوں واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے وہاں یکدم ہی اک ہلچل سی مچ گئی تھی سب کا جوش عروج پہ تھا۔

♥

وہ بڑے بڑے سرخ رنگے پایوں والی مضبوط انواری چارپائی پہ اوندھے منہ لیٹا کافی گہری نیند سو رہا تھا جب باہر کوارٹر کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی اور نیند گہری ہونے کی وجہ سے پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ دستک کی آواز

کہاں سے آرہی ہے؟ لیکن چند سیکنڈ نیند سے بیدار ہوتے ذہن پہ زور ڈال کے سوچا تو ادراک ہوا کہ وہ بڑی حویلی کے مہمان خانے میں محوِ خواب ہے اور جیسے ہی اس کا ذہن اور اعصاب لحاف نے پہ آئے تو اسے فوراً ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ دروازہ بند کیے بغیر لیٹ ہو چکا ہے، تبھی تو وہ یکدم تڑپ کے اُٹھ بیٹھا تھا اور کھلی کھڑکی اور دروازے کے نیچے سے روشنی اپنا رستہ بنائے اندر چلی آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ باہر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور ٹائم بھی کافی زیادہ ہو چکا تھا جس پہ منصور حسین کو یقین تھا کہ مبارک خان اس کی کلاس لینے کے لیے آیا ہے اور اس طرح اِدھر اُدھر دروازہ بجا رہا ہے لہٰذا منصور حسین نے اک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر نکلنے کے لیے کوارٹر کا دروازہ کھول دیا لیکن مبارک خان کے بجائے شہزادی علیزے کی خادمہ کو دیکھ کر اس کے اٹھتے مزتے قدم تھم گئے تھے۔

''السلام علیکم۔'' رجو نے بڑی تمیز سے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! فرمایئے کیا پیغام لائی ہیں آپ؟'' منصور حسین نے کافی ٹھہرے ہوئے اور پُرسکون لہجے میں دریافت کیا تھا۔

''اندر آجاؤں؟'' رجو اس کے کوارٹر کے دروازے سے باہر کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

''نہیں۔'' منصور حسین نے جواباً انکار کر دیا تھا، دوٹوک اور کھرا انکار۔

''کیوں منصور حسین؟ میں اندر کیوں نہیں آسکتی؟'' رجو نے خفگی سے پوچھا تھا۔

''کیونکہ میں تمہیں اندر بلا کر مشکوک نہیں ہونا چاہتا، اس لیے جس کام سے آئی ہو، وہ کام بتاؤ۔'' منصور حسین کے انداز میں کوئی لچک اور کوئی نرمی نہیں تھی رجو کو تو وہ اس اکھڑے سے انداز میں بھی دل کو لگ رہا تھا۔

''تمہارے ماتھے پہ بل بہت ہیں، شاید اسی لیے ماتھے پہ بل ڈال کے بات کرتے ہو؟'' وہ پھر بھی اسے سراہے بغیر نہیں آئی تھی۔

''مطلب کی بات کرو بی بی! کیوں آئی ہو؟'' منصور حسین ایسی باتوں میں آنے والا نہیں تھا لیکن رجو تو اس پہ مرمٹی تھی۔

''مطلب کی بات ہی تو کر رہی ہوں منصور حسین، پر تم آنکھ ہی نہیں ملا رہے؟'' رجو جیسے ناراضی سے بولی تھی۔

''دیکھو بی بی! میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں، کسی سے آنکھیں ملانے نہیں، میں بندہ بڑا کھرا ہوں، یا تو کام کرتا ہوں یا کام کی بات سنتا ہوں، فضول میں وقت ضائع نہیں کرتا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ کام کی بات کرو، کیوں آئی ہو یہاں؟ کس نے بھیجا ہے؟'' اس نے ایک بار پھر استفسار کیا تھا لیکن رجو صدمے کی سی کیفیت میں کھڑی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی کتنا روکھا، کتنا کھردرا اور کتنا بے مروت ثابت ہوا تھا وہ..... اور ایک وہ تھی جو اتنے دنوں سے اسے دیکھ دیکھ کر ہی خوش اور فدا ہو رہی تھی۔

''اللہ حافظ.....'' منصور حسین نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور دروازہ بند کرنے لگا تھا، رجو باہر کھڑی تو کھڑی رہ گئی تھی لیکن بند دروازے کو دیکھ کر اسے دوبارہ کچھ یاد آیا تو دروازے پہ ایک بار پھر مُکّے برسا ڈالے لیکن منصور حسین نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے منصور حسین، ان کی بات سنو جا کر۔'' رجو نے مجبوراً باہر سے ہی آواز دے کر پیغام دیا تھا۔

''کیوں بلایا ہے؟'' اب کی بار اس نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا وہ کندھے پہ تولیہ رکھے ہوئے تھا یقیناً نہانے کے لیے باتھ روم کی سمت جا رہا تھا۔

''ان ہی سے جا کر پوچھ لو۔'' رجو کہہ کر پلٹ گئی تھی۔

''ہوں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا۔ دس منٹ بعد وہ تیار ہو کر سید حاد وقار آفندی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

''سلام صاحب!''

''وعلیکم السلام! منصور حسین کیسے ہو؟'' وہ علیزے کا ملازم تھا اس لیے وقار آفندی اسے ایک الگ سا پروٹوکول دے رہا تھا۔

''اللہ کا کرم ہے صاحب۔'' وہ شکر گزاری سے بولا۔

''کوئی پریشانی کوئی تنگی تو نہیں ہے نا یہاں؟''

"نہیں صاحب! سب ٹھیک چل رہا ہے۔"

"کسی چیز پہ کوئی اعتراض یا پریشانی ہو تو بتا دینا۔"

"جی ضرور۔"

"گاڑی سروس کروائی تم نے؟"

"نہیں صاحب! ابھی تک تو نہیں کروائی، ایک دو بار مبارک خان اور عارف وغیرہ کے ساتھ مل کر خود ہی گاڑی کو چمکا لیا تھا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"چوکس جس کا ہو اسے ہی اچھا لگتا ہے، نئی گاڑی ہے اسے پراپر طریقے سے سروس کروانا چاہیے تھا تمہیں۔"

"آپ کہتے ہیں تو آج ہی کروا لیتا ہوں۔" وہ مؤدب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ہوں اس لیے تو تمہیں بلایا ہے کہ تم آج کا دن تمام ضروری کام نبٹا لو کل تو تم لوگوں نے نکلنا ہوگا۔" وقار آفندی کافی آرام دہ انداز میں بات کر رہے تھے لیکن منصور حسین ان کی بات پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"آج کے دن کام نبٹا لوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے ناسمجھی سے استفسار کیا تھا۔

"ارے بھئی میرا مطلب ہے کہ کل جانا ہے آپ لوگوں نے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"مری اور اسلام آباد۔"

"کیوں صاحب! خیریت؟" اس نے ٹھٹک کے پوچھا تھا۔

"منصور حسین! تم بھی شاید پاگل ہی ہو، مری اور اسلام آباد لوگ کیوں جاتے ہیں بھلا۔"

"ہنی مون منانے۔" منصور حسین کا برجستہ جواب آیا تھا جس پہ وقار آفندی بھی سٹپٹا گئے تھے تب منصور حسین کو بھی احساس ہوا کہ وہ بے ساختگی میں کافی غلط بات کہہ گیا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ لوگ تو ہنی مون منانے بھی جاتے ہیں، پکنک منانے بھی جاتے ہیں اور وہ انگلش کا کیا لفظ ہے؟ ہاں وہ کیا کہتے ہیں کہ ہالیڈیز بھی منانے جاتے ہیں۔" منصور حسین نے فوراً بات سنبھالی تھی تبھی وقار آفندی بھی تھوڑا ریلیکس ہو گئے تھے۔

"ہاں یہ سب بھی ہالیڈیز منانے جا رہے ہیں، میں نے تو علیزے کو منع کیا تھا لیکن وہ ضد کر رہی تھی اس لیے مجبوراً اسے بھی بھیج رہا ہوں لیکن تمہاری ذمہ داری پہ۔" انہوں نے منصور حسین کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"میری ذمہ داری پہ۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تمہاری ذمہ داری پہ، تمہیں اس کی حفاظت کرنا ہوگی، اس کے آس پاس کڑی نظر رکھو گے اور اس کے آس پاس ہی رہو گے، جو بھی نوٹس کرو گے فوراً بتا دینا، ایسی ویسی کوئی پرابلم بن جائے تو تم اسلحہ بھی استعمال کر سکتے ہو، ریوالور تو پہلے ہی تمہارے پاس ہے یہ گولیاں بھی رکھ لو، اس میں کچھ اور سامان بھی ہے احتیاط سے رکھنا۔" وقار آفندی ایک چھوٹا سا بیگ اس کی سمت بڑھا رہے تھے۔

"لیکن صاحب! گاڑی میں یہ سب کیسے جا سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ہوگا، تم بے فکر رہو، علیزے کی گاڑی کو کسی بھی چیک پوسٹ پہ نہیں روکا جائے گا، میں نے سارا انتظام کر دیا ہے اور ایسے بھی تمہارے پاس لائسنس بھی تو ہے نا؟ تم کون سا کوئی غیر قانونی چیز لے کر جا رہے ہو؟ یہ سب تو علیزے کی حفاظت کے لیے ہے تمہارا ریوالور چوبیس گھنٹے لوڈڈ ہونا چاہیے، اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی معاف نہیں ہوگی۔" وقار آفندی اس کی برین واشنگ کر رہے تھے اور منصور حسین ہر بات پہ سر ہلا رہا تھا۔

"ابھی تم گاڑی سروس کروا کے آؤ باقی باتیں تمہیں بعد میں سمجھاتا ہوں۔" انہوں نے منصور حسین کو جانے کا اشارہ کیا جس پہ وہ کھڑا ہو گیا۔

"جی بہتر۔"

"گڈ اب تم جا سکتے ہو۔"

"مہربانی صاحب۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"اور سنو۔"

"جی.....؟"

"کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ تم اسلحے سے لوڈڈ ہو، خود علیزے کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔" انہوں نے اسے تاکید کی تھی۔

"جیسے آپ کا حکم۔" اس نے سر جھکا دیا۔

"اوکے جا سکتے ہو تم۔" انہوں نے کہہ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور منصور حسین اس مردان خانے سے نکل آیا تھا لیکن وہ ان لوگوں کے اس اچانک پروگرام پہ سخت کوفت اور بیزاریت کا شکار ہوا تھا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اتنے طویل سفر، مسلسل خاموشی اور اتنے گھنٹے لگاتار ڈرائیونگ سے کیا حال ہوگا۔ اور اسی حال کو سوچتے ہوئے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو منصور حسین؟" مبارک خان اسے گاڑی کی سمت بڑھتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

"گاڑی سروس کروانے۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ اچھا۔ علیزے بی بی نے مری جانا ہے نا اس لیے۔" مبارک خان کو شاید پہلے سے پتا تھا اس لیے منصور حسین کے بتانے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔

"جی ہاں۔ مری جانا ہے اس لیے۔" اس کا موڈ آف تھا اسی لیے کوفت زدہ سے انداز میں بولا تھا۔

"کیا بات ہے یار! تمہارا موڈ کیوں خراب ہو رہا ہے؟" مبارک خان نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"یار تم خود سوچو اتنا طویل سفر، اتنی تھکاوٹ اور حاصل وصول کچھ بھی نہیں، ایسے میں موڈ تو خراب ہو گا ہی۔" منصور حسین کے چہرے پہ ہلکے غصے کا اثر تھا مبارک خان گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اسے۔

"حاصل وصول کیوں نہیں ہے؟ اس کام کے اس نوکری کے پیسے نہیں لیتے تم؟ ماہانہ تنخواہ لیتے ہو، آخر کس لیے؟ اس کام کے لیے نا؟ تو پھر یہ بیزاری اور غصہ کیوں ہے؟ کون سا محنت میں کام کر رہے ہو۔ اگر یہ ڈرائیونگ اتنا ہی مشکل کام ہے تو نوکری چھوڑ دو کہیں اور نوکری کر لو، کسی بینک یا کسی آفس میں۔" مبارک خان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ گھر کے ضروری کاموں کے علاوہ تمام ملازموں پہ نظر رکھے اور انہیں ہدایت سے نوازتا رہے، تبھی آج منصور حسین کا موڈ دیکھ کر بھی وہ چپ نہیں رہ سکا تھا بے شک منصور حسین سے ساتھ اس کی کافی انڈر اسٹینڈنگ اور دوستی ہو چکی تھی لیکن اصول پھر بھی اصول تھے، وہ ذات کا پٹھان تھا، حق بات کہنے سے باز نہیں رہ سکتا تھا جبکہ منصور حسین اس کی شکل دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ مبارک خان نے اسے سخت لہجے میں اسے گھرکی سنائی ہیں۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا مبارک خان، ورنہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے، علیزے بی بی جہاں بھی جائیں مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا۔" منصور حسین افسوس سے کہہ رہا تھا اسے مبارک خان کی بات پہ دکھ ہوا تھا کتنی جلدی ڈانٹ دیا تھا اس نے۔

"لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔" مبارک خان کا انداز اب بھی نپا تلا سا تھا۔

"ہوں..... بہت اچھا کیا ہے تم نے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تم جاؤ اب، کام کرو اپنا۔" مبارک خان کہہ کر اندر چلا گیا تھا اور منصور حسین بے دلی سے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے خود بخود ہی رجو کا خیال آ گیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی خود اس نے بھی تو رجو کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنایا تھا اس بیچاری کو بھی تو اتنا ہی افسوس اور دکھ ہوا ہوگا؟ اللہ نے چند منٹوں میں ہی اس کا بدلہ لے لیا تھا اور منصور حسین کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ جیسا سلوک ہم کسی کے ساتھ کرتے ہیں، ویسا ہی ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نے آئندہ کے لیے اللہ سے معافی مانگ لی تھی۔

♥

"بھائی..... بھائی..... پلیز جلدی اٹھیں ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" عدیل دن بھر کا تھکا ہوا تھکا ہارا صحت مند نوجوان ڈالے کافی گہری نیند سو رہا تھا جب اچانک ایمن نے آ کر اسے جھنجوڑ کے جگا دیا تھا۔

"ابا جی طبیعت؟ کیا ہوا ہے انہیں؟" عدیل بھی اس اچانک افتاد پہ گھبرا گیا تھا۔

"ان کے سینے میں بہت شدید درد ہے، بہت تکلیف میں ہیں وہ۔" ایمن کی آواز بھرا گئی تھی اور عدیل یکدم چادر پرے پھینک کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنی چپل پہن کر تیز تیز قدم اُٹھاتا وہ پانچ سیکنڈ میں سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔

"امی! کیا ہوا ہے ابا جی کو....." عدیل کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک سو رہے تھے، میری بھی آنکھ لگ گئی تھی لیکن جیسے ہی کروٹ بدلی تو ان کی طرف نظر اٹھ گئی، تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تکلیف میں ہیں اور کراہ رہے ہیں، اُٹھ کر پتا کیا ہے تو اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ سینے میں درد ہے، اب تو ان سے کراہا بھی مشکل ہو گیا ہے۔" امی بھی ابا جی کو تکلیف میں دیکھ کر رو رہی تھیں مریم اور ایمان ابا جی کے قریب بیٹھی ان کا سینہ سہلا رہی تھیں لیکن ان کے چہرے پہ تکلیف کے آثار کم نہیں ہو رہے تھے بلکہ اور بڑھ رہے تھے۔

"آپ حوصلہ رکھیں میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں، انہیں ہسپتال لے چلتے ہیں۔" عدیل عجلت سے کہتا اُلٹے پاؤں باہر نکل گیا تھا۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا گلیوں میں ہونے والی چہل پہل اور شور ہنگامہ ماند پڑ چکا تھا لوگ اب اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سو رہے تھے عدیل اپنی گلی سے تقریباً بھاگتا ہوا مین روڈ تک آیا تھا۔ مین روڈ روشنیوں سے بھرا پڑا تھا بے فکر لوگ موج مستی میں مگن تھے ایسے میں وہ اکیلا فکر مند سا ٹیکسی کی تلاش میں مسلسل اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"ٹیکسی۔" اس نے ایک ٹیکسی کو قریب آتے دیکھا تو فوراً سامنے آ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بمشکل بریک لگائے تھے۔

"دیکھیے بھائی صاحب! میرے والد صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے پلیز....." عدیل دیکھ چکا تھا کہ ٹیکسی میں پہلے سے دو سواریاں موجود ہیں پھر بھی التجا کر ڈالی تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں صاحب! میں نے یہ سواریاں ایئر پورٹ چھوڑنی ہیں ان کی فلائٹ مس ہو جائے گی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کر دیا تھا۔

"دیکھیے کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے پلیز کچھ خیال کریں۔" عدیل روہانسا ہو گیا تھا۔

"دیکھو صاحب! خوامخواہ بکھیڑے میں مت پڑو، جاؤ کسی اور ٹیکسی والے سے کہو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اک جھٹکے سے آگے بڑھائی عدیل اُچھل کے پیچھے ہوا تھا ورنہ یقیناً فٹ پاتھ پہ جا گرتا۔

"ٹیکسی....." اپانک اک اور ٹیکسی اس کے سامنے سے گزری تھی لیکن اس نے بھی عدیل کی آواز نہیں سنی تھی۔

"اوہ....." اب کی بار اسے سڑک کی دوسری جانب ایک رکشہ دکھائی دیا اور عدیل اندھا دھند اس رکشے کی سمت دوڑ پڑا۔

"ہیلو بھائی صاحب! ہسپتال چلنا ہے۔" اس نے رکشے میں آڑے ترچھے سوئے ڈرائیور کو بازو ہلا کر متوجہ کیا وہ غنودگی کے عمیق مشکل سے جاگا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے باؤ جی؟" رکشہ ڈرائیور نے اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہسپتال جانا ہے، ایک مریض کو لے کر، بہت ایمرجنسی ہے پلیز....."

اس معصیت کے عالم میں تو یوں لگ رہا تھا جیسے شہر کا شہر ویران اور سنسان ہو گیا ہو، جہاں وقت پڑنے پہ کوئی سواری ہی نہ مل رہی تھی۔

"معاف کرنا باؤ جی! میرا رکشہ تو صبح سے خراب ہے، یہ کمبخت ٹھیک ہوتا تو میں اتنے آرام سے یوں نہ سو رہا ہوتا، تمہیں ضرور لے چلتا۔" اس رکشہ ڈرائیور نے بھی معذرت کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی تھی اور عدیل کے ماتھے پہ پریشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا کہ نجانے گھر میں تکلیف کے مارے ابا جی کی کیا حالت ہو رہی ہو گی اور اسے یہاں کوئی ٹیکسی یا رکشہ وغیرہ ہی نہیں مل رہا تھا اس نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے اور روہانسے سے انداز میں اوپر آسمان کی سمت دیکھا تھا آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے اور دل کی گہرائیوں سے فریاد نکلی تھی۔

"یا اللہ..... رحم فرما....." اس نے اس مشکل اور کڑے وقت میں اپنے رب کو پکارا۔ جو کبھی بھی کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ اس کے جملہ بھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کے پیچھے اچانک کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اور زوردار ہارن بجا۔ کیونکہ وہ اپنی بے خیالی میں سڑک کے بیچوں بیچ چل رہا تھا۔

عدیل نے گاڑی کے بارن پہ یکدم تڑپ کے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے گاڑی ڈرائیو کرنے والے کو دیکھ نہیں پایا تھا اور لپک کے گاڑی کے قریب آیا تھا لیکن ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان لڑکی کو دیکھ کر اس کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی تھی عدیل کو اس لڑکی سے ہونے والی پچھلی ملاقاتیں بخوبی یاد تھیں اس لیے اس سے توقع رکھنا فضول تھا جبھی وہ کچھ کہنے سے پہلے ہی چپ ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے کسی گاڑی کے نیچے آ کر مرنے کا بہت شوق ہے تمہیں۔" وہ غصے سے چبا کر بولی تھی لیکن عدیل نے جواب دیے بغیر قدم پیچھے ہٹا لیے تھے۔

"او مسٹر ہیرو ... میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں؟" وہ گاڑی سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" عدیل بڑے کرب سے بولا تھا اپنے اندر کی بے بسی کے غبار کو وہ بمشکل ضبط کر رہا تھا۔

"بہرے ہو گئے ہو؟"

"ہاں اندھا بھی ہو گیا ہوں۔" اس کے لہجے میں اذیت تھی جو فی الحال مدیحہ نہیں محسوس کرنے سے قاصر تھی۔

"تو پھر اندھے اور بہرے ہو کر سڑکیں کیوں پھلانگ رہے ہو کوئی گاڑی روند کر گزر جائے گی۔" وہ طنزیہ بول رہی تھی۔

"اس وقت ہر گاڑی مجھے روند کر ہی گزر رہی ہے میڈم۔" عدیل کی آواز دکھ سے لرز رہی تھی اور شکست خوردہ سا لہجہ بھی چھپ نہیں رہا تھا پہلی بار مدیحہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"وجہ پوچھ کر کیا کریں گی؟"

"یہ تو جدا کا مسئلہ ہے نا، پہلے وجہ تو بتاؤ۔"

"میرے بابا کی طبیعت خراب ہے، وہ بہت تکلیف میں ہیں اور مجھے کوئی رکشہ یا ٹیکسی نہیں مل رہی، پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اسی سڑک پہ پھر رہا ہوں۔" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا اور مدیحہ اس کی بات پہ ٹھٹک گئی تھی اس نے عدیل کو مڑ تا گہری نظروں سے دیکھا تھا اس کا حلیہ بتا رہا تھا جیسے ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر آیا ہو۔

"تم کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہے؟" وہ مشکوک سے لہجے میں بولی تھی اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا تھا وہ پھٹ پڑا تھا۔

"میں ایک مجبور اور بے بس انسان ہوں، اس وقت اپنے باپ کی موت کے خوف سے سڑکوں پہ مارا مارا پھر رہا ہوں، آپ جیسے امیر اور عیاش لوگ اپنی گاڑیوں میں گزرتے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی آوارہ، کوئی موالی شاید ڈرامے کر رہا ہوں آپ لوگ کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں تو آپ کو کسی دوسرے کا احساس ہو؟ ہر چیز کی سہولت نے آپ لوگوں کے اندر سے حسی بیدار کر دی ہے، زیرو میٹر گاڑی میں بیٹھ کر پیدل چلنے والوں کو آپ لوگ کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں، جنہیں روند کر گزرنے پہ کوئی پروا نہیں ہوتی آپ کو، میں نے اسی لیے کہا تھا آپ سے کہ وجہ مت پوچھیں، اگر پوچھ بھی لیں گی تو کیا کریں گی آپ؟ اگر میں بازو کہہ کر گزر جائیں گی بس اور کیا کریں گی؟ جا ئیں گزر جائیں، جہاں پورے شہر کی گاڑیاں گزر رہی ہیں وہاں آپ کی بھی گاڑی گزر گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اگر میرے بابا کی زندگی باقی ہے تو کوئی بھی چیز انہیں موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی۔" عدیل کا سارا غصہ اور سارا غبار مدیحہ پہ نکل گیا تھا اور وہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی مگر وہ تختی سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔

"ٹیکسی۔" ایک بار پھر وہ کسی ٹیکسی کے پیچھے بھاگا تھا لیکن یہاں بھلا کون سننے والا تھا۔ تیز رفتار ٹیکسی زناٹے سے گزر گئی تھی اور عدیل شکستہ سا واپس گھر کی سمت چل پڑا تھا، ابھی کچھ دور آیا تھا کہ پیچھے ایک بار پھر ہارن بجا عدیل بغیر رُکے چلتا رہا لیکن اب بار مدیحہ نے ہارن پہ ہاتھ رکھ کے ہٹایا نہیں تھا عدیل نے تختی سے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا مسئلہ ہے میڈم؟" وہ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" اس نے کہتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور عدیل گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ذرا سا ڈھیلا پڑ گیا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو شاید منہ موڑ کے آگے بڑھ جاتا لیکن اس وقت وہ غصے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا اس نے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

''اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی اور عدیل سنجیدگی سے اسے راستہ سمجھانے لگا۔ وہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھا چکی تھی اور چند منٹ بعد ہی وہ اس کی مطلوبہ گلی کے نکڑ پہ گاڑی کھڑی کر کے سیدھی ہوئی تھی۔

''اب.....؟'' اس نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ یہیں ٹھہریں، میں انہیں لے کر آتا ہوں۔'' عدیل کہہ کے عجلت سے نیچے اتر آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پہ آ رکا تھا۔

''امی! دروازہ کھولیں۔'' اس نے دستک دی پانچ سیکنڈ میں ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

''بھائی! اتنی دیر لگا دی آپ نے۔'' مریم کے چہرے پہ بدحواسی ناچ رہی تھی۔

''ٹیکسی نہیں مل رہی تھی، ابھی بھی کسی کی گاڑی ملی ہے، ٹیکسی نہیں ملی۔'' وہ بتاتے ہوئے ابا جی کی طرف آیا تھا وہ نیم بیہوشی کی حالت میں تھے عدیل نے انہیں بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔

''میں ساتھ چلوں؟'' عابدہ خاتون آگے بڑھیں۔

''نہیں امی! گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے، رات کے اس پہر یہ سب اکیلی کیسے رہیں گی، حالات تو ویسے ہی بہت خراب ہیں۔'' عدیل نے منع کر دیا۔

''تو پھر میں ساتھ چلتی ہوں، آپ اکیلے کہاں کہاں بھاگ دوڑ کریں گے۔'' مریم، عابدہ خاتون کو نہ سکتے دیکھ کر خود تیار ہو گئی تھی۔

''لیکن مریم۔'' عدیل نے روکنا چاہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے مریم، وہ ساتھ چلی جاتی ہے جاؤ مریم چادر لے آؤ۔'' عابدہ خاتون نے اشارہ کیا تھا اور پھر عدیل کے پیچھے پیچھے مریم بھی نکل آئی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ سے پشت ٹکائے بیٹھی اس شخص کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی جس کے نام سے بھی واقف نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا انتظار کر رہی تھی، نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ بنا سوچے سمجھے اس کے ساتھ چلی آئی تھی ورنہ اتنی نرم اور حساس تو وہ کبھی نہیں تھی جتنی آج ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنے اس اقدام پہ خود بھی بہت حیران تھی لیکن جو بھی تھا وہ کسی کو یوں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی، اس شخص کی پریشانی سن کر وہ اپنا دن بھر کا غم و غصہ بھی بھول گئی تھی اور ساتھ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس شخص کے ساتھ ہونے والی پہلی دو ملاقاتیں کیسی گزری تھیں۔

جس کے بعد وہ اس شخص کا خون پی جانے کے درپے ہو جاتی تھی، اسے پورا پورا دن گالیوں سے نوازتی رہتی، بلکہ اس کا بس چلتا تو وہ اسے یقیناً قتل بھی کر ڈالتی، لیکن آج وہ اس شخص کو اپنی گاڑی میں اپنے ساتھ اپنے برابر بٹھانے کا لائی تھی، وہ بھی محض اس کی مدد کرنے کی خاطر۔

وہ انہی سوچوں میں گم چپ بیٹھی سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی جب وہ شخص گلی سے نکل کر گاڑی کی سمت آتا دکھائی دیا تھا مدیحہ اسے دیکھ کر گاڑی سے اتر آئی اور گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا۔

''تھینک یو۔'' عدیل نے تھینکس کہہ کر بمشکل نیچے جھکتے ہوئے ابا جی کو پچھلی سیٹ پہ لٹایا اس کے پیچھے مریم بھی آ رکی لیکن وہ گاڑی کے قریب کھڑی مدیحہ کو دیکھ کر ٹھٹک کے رک گئی۔

''مریم! تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔'' عدیل ابا جی کو لٹا کے سیدھا ہوا تو مریم کو بیٹھنے کا کہا جو حیران نظروں سے مدیحہ کو دیکھ رہی تھی البتہ مدیحہ نے اسے بڑے نارمل بلکہ سرسری سے انداز میں دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

''چلیں۔'' عدیل نے مدیحہ کی سمت دیکھا۔

''اوکے.....'' وہ کندھے اچکا کر دوسری سائیڈ سے گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھی اور گاڑی سٹارٹ کر دی مریم اور عدیل بھی بیٹھ چکے تھے وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے مین روڈ تک لے آئی تھی۔

''کون سے ہاسپٹل جانا ہے۔'' مدیحہ نے سنجیدگی سے پوچھا لیکن مریم چونک گئی تھی اس لڑکی کے لب و لہجے سے ہی لگ رہا تھا وہ لندن پلٹ ہے مریم پچھلی سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی اسی لیے مدیحہ اسے صرف ایک سائیڈ سے ہی دکھائی دے رہی تھی مریم کی نظر

اس کی گداز دودھیائی کلائی اور مخروطی ہاتھوں پہ ٹھہر گئی تھی۔

اس کی کلائی میں خوبصورت اور نفیس سے دو بریسلٹ سجے ہوئے تھے اور نفاست سے ترشے ہوئے ناخنوں پہ شاکنگ پنک کلر کی نیل پالش اس کے دودھیا ہاتھوں کو دو آتشہ بنا رہی تھی۔ اس کا ایسا جائزہ تو عدیل نے بھی نہیں لیا تھا جیسا مریم لے رہی تھی۔ بیچارہ مدیحہ کو خبر بھی نہیں تھی کہ پیچھے بیٹھی لڑکی اتنے غور سے اسے دیکھ رہی ہے۔

''بتایئے نا کہاں جانا ہے آپ نے؟ کون سے ہسپتال کی طرف ٹرن لوں۔'' مدیحہ نے ایک بار پھر عدیل کو مخاطب کیا۔

''میو ہسپتال، یہ یہاں کا سب سے بڑا سرکاری ہسپتال ہے۔'' عدیل نے بتایا اور ساتھ ہی راستہ بھی بتانے لگا۔ جس پہ مدیحہ نے چونک کر دیکھا تھا گویا وہ لوگ کسی پرائیویٹ ہسپتال کا خرچہ بھی افورڈ نہیں کر سکتے تھے؟ مدیحہ اس شخص کے حالات پہ حیران ہو رہی تھی اور مریم اس لڑکی پہ..... وہ اتنی پریشانی کے باوجود اس لڑکی کے متعلق سوچ رہی تھی بلکہ گاڑی میں موجود تینوں نفوس ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے اور ان کی سوچوں کا تسلسل مدیحہ کے موبائل کی رنگ نے توڑا تھا ڈیش بورڈ پہ رکھے موبائل کی نیلی لائٹس بار بار روشن ہو رہی تھیں مدیحہ نے موبائل اٹھا کر کال اس کنکٹ کر دی لیکن پانچ سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ رنگ بجنے لگی کال کرنے والا جیل تھا جو اسے دوپہر سے تقریباً سو مرتبہ کال کر چکا تھا اور مدیحہ اسے ایک ہی جواب دے کر فون بند کر دیتی اس وقت بھی اس نے موبائل آن کر کے بولنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ ان کے بولنے کا انتظار کیا تھا۔

''مدیحہ پلیز! رات بہت ہو گئی ہے، گھر واپس آ جاؤ، جو بھی بات کہنی ہے، گھر آ کر کہو، پلیز میری بات مان لو۔'' جیل اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

''ایم سوری بھائی! میں نے آپ کو پہلی کال میں ہی بتا دیا تھا کہ جب تک وہ اس گھر میں ہیں، میں نہیں آؤں گی، بس بات ختم، آپ انہیں نکال دیں، میں ابھی آ جاتی ہوں۔'' مدیحہ نے سرد سے لہجے میں لاپروائی سے کہا تھا جس پہ عدیل نے ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا کتنی سخت تھی وہ لڑکی، اس کی کاٹ تو اس کے نین نقوش سے ہی ظاہر ہو جاتی تھی، معاف کرنے والوں میں سے تو ہرگز نہیں تھی۔ پھر بھی عدیل کے ساتھ آ گئی تھی۔ عدیل کو حیرت نے چھوا تھا۔

''دیکھو مدیحہ! وہ بابا ہیں ہمارے، میں کیسے ان کو گھر سے نکال سکتا ہوں؟''

''اوکے میں تو گھر سے نکل چکی ہوں نا؟ آپ کیوں بار بار کال کر کے مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں؟ دوبارہ کال نہ کیجئے گا، اللہ حافظ۔'' اس نے کہہ کے کال بند کی اور موبائل ڈیش بورڈ پہ پٹخ دیا تھا وہ دونوں بہن بھائی چپ چاپ اس کی گفتگو سنتے رہ گئے اور اس نے میو ہسپتال کی پارکنگ میں گاڑی اک جھٹکے سے لا کے پارک کی تھی اور گاڑی کے آٹو میٹک لاک کھول دیے تھے عدیل تیزی سے نیچے اترا گیا اور پھر آناً فاناً وہ لوگ اپنے باجی کو اسٹریچر پہ ڈال کے اندر لے گئے اور مدیحہ وہیں پارکنگ میں کھڑی رہ گئی اور اپنی بھاگ دوڑ میں عدیل کو اس کا خیال ہی نہ رہا تھا۔

♥

اپنا پن ہی اک بیگانے پن میں ہے
پورا عالم اک دیوانے پن میں ہے
یہ جو میں تم سے انجان بنا پھرتا ہوں
ساری بات ہی اسی انجانے پن میں ہے

عبداللہ کی ڈائری میں تحریر شعر پڑھتے پڑھتے نگوری کی آنکھیں خوشی اور بے یقینی سے چمک اٹھی تھیں وہ عبداللہ کے چھوٹے سے اسٹڈی روم سے نکل کر ننگے پاؤں نیچے کی طرف بھاگی تھی۔

''بھابی..... بھابی..... کہاں ہیں آپ؟'' وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے زور زور سے پکارتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔

''یا اللہ خیر..... کیا آفت آ گئی ہے؟'' نگارش گھبرا کر دل پہ ہاتھ رکھتی ہوئی کچن سے باہر نکل آئی اس کے ہاتھ میں چمچہ تھا وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور باقاعدہ ایپرن بھی باندھ رکھا تھا۔

''یہ شعر..... یہ شعر پڑھا آپ نے؟'' اس نے عبداللہ کی ڈائری نگارش کے سامنے لہرائی اور نگارش نے اس کی بات پہ گھبرا کر اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"اُف اللہ..... تمہارے یہ شعر..... کیا کروں میں ان شعروں کا دن رات انہی میں چکراتی رہتی ہو، بلکہ مجھے بھی چکرا کے رکھ دیا ہے۔" نگارش نے خفگی سے کہتے ہوئے اسے گھور کے دیکھا تھا۔

"دل کو بہلاتی ہوں بھائی! خوبصورت لفظوں کے اظہار سے دل کو سکون رہتا ہے۔"

"لیکن یار کیسا سکون..... کون سا وہ خود تمہیں شعر سناتا ہے، جنہیں سن کر تمہارے دل کو سکون رہتا ہے؟" نگارش کبھی کبھی اس کی اس قدر دیوانگی پہ جھنجلا جاتی تھی۔

"بھائی! یوں سمجھ لیں کہ وہ خود ہی مجھے شعر سناتا ہے، اگر یقین نہیں آتا تو یہ شعر پڑھ کے دیکھ لیں۔" اس نے پھر ڈائری سامنے کی تھی اور مجبوراً نگارش کو وہ شعر پڑھنا پڑا اور شعر کے نیچے دل آور شاہ کا نام لکھا ہوا تھا اور ساتھ میں ٹائم اور ڈیٹ بھی تحریر تھی۔

"اوہ تو اس شعر کی بات کر رہی ہو؟" نگارش نے یہ ڈائری پہلے سے پڑھ رکھی تھی۔ یہ ڈائری عبداللہ کی تھی لیکن اس میں شعر تینوں دوستوں نے اپنی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں تحریر کر رکھے تھے۔

"بھائی! یہی شعر تو دنیا کا خوبصورت ترین شعر ہے۔" زری اس شعر کے لفظوں اور دل آور کے نام پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی سرشاری اور بڑی چاہ سے بولی تھی۔

"اس سے اگلا شعر بھی تو پڑھو۔" نگارش کہتے ہوئے واپس کچن کی طرف پلٹ گئی۔

"اگلا شعر..... وہ کس کا ہے؟"

"پڑھو تو سہی، پتا چل جائے گا۔" نگارش نے کچن سے ہی جواب دیا تھا اور زری نے تجسس کے ہاتھوں اگلا صفحہ پلٹ دیا تھا۔

تیرے دل خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے
نشاط جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں سے تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

زری نے زیر لب یہ شعر پڑھا تھا الفاظ واقعی دل کو چھو گئے تھے لیکن شعر کے نیچے لکھا "نہیل حیات" کا نام اس کے دل کو چھونے والا نہیں تھا، وہ دل آور شاہ کی دیوانی تھی اس کی پجارن، اس کی جوگن تھی، پیر کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک اس کے عشق میں ڈوبی ہوئی، تن بھی گھائل، من بھی گھائل، کسی اور طرف دیکھتی بھی تو کیسے؟

وہ تو سوتی بھی اسی خیال سے تھی کہ خواب میں وہ ملے گا، اس سے ملاقات کی آس پلکوں پہ نیند بٹھا جاتی تھی، اس کا سونا جاگنا دل آور شاہ کے لیے تھا، اس کا پہننا اوڑھنا دل آور شاہ کے لیے تھا، اس کا جینا مرنا دل آور شاہ کے لیے تھا اور جب اس کا سب کچھ دل آور شاہ کے لیے تھا تو اسے دل آور شاہ کے پہلو میں کھڑا نہیل حیات کیسے دکھائی دے سکتا تھا؟ اس کا نام زری کی نظروں میں بھلا کیسے جچ سکتا تھا؟ سمجھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی نظر ایک بھی دل آور شاہ سے ہٹ کے ادھر سے اُدھر دیکھ لے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا اس نے دوبارہ صفحہ پلٹ کے نظر دل آور شاہ کے لکھے ہوئے شعر پہ جمادی تھی۔

"شعر پڑھا تم نے؟" نگارش اپرن کھولتے ہوئے دوبارہ کچن سے نکل آئی۔

"ہوں پڑھا ہے لیکن دل کو نہیں لگا۔" زری نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا، نگارش نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم، جس دل کو "دل آور شاہ" لگ جائے اس کو کوئی اور شے لگ سکتی ہے بھلا؟"

"ڈیٹی نیلی آف کورس بھائی! ایسا ہی ہے، وہ اتنا دل کو لگ گیا ہے کہ اب تو میرا دل بھی دل آور شاہ بن گیا ہے، بے رُخ اور بے نیاز مجھ سے آنکھ ہی نہیں ملاتا، بالکل اسی کی طرح، وہی چال چلن ہیں میرے دل کے جیسے اس کے تھے۔" زری بولتے ہوئے جیسے چہک رہی تھی۔

"اپنے دل کو اتنا نہ سر پہ چڑھاؤ، پچھتاؤ گی، دل بگڑ جائے تو قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لگام ڈالو اسے۔" نگارش اسے شرارت سے سمجھا رہی تھی۔

"بھائی! بہت دیر ہو چکی ہے اب تو اس بے لگام کو وہی لگام ڈال سکتا ہے جس کے لیے یہ بے لگام ہوا ہے۔"

''وہ خود بے لگام ہے، تمہارے دل کو بھلا کیا لگام ڈالے گا؟'' نگارش نے مذاق اڑایا تھا اور زری بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

''بے لگام تو بھائی بھی بہت تھے، لیکن دیکھ لیں آج کتنے قابو میں ہیں۔'' زری نے نگارش کو چھیڑا۔

''محترمہ! تمہارے بھائی کو قابو کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے میں نے، اپنا دل، اپنی جان، اپنی زندگی اور زندگی بھر کی تمام خدمتیں ان کے نام لکھی ہیں میں نے، تب جا کے آج وہ میرے قابو میں ہوئے ہیں۔''

''اوہو تو اسی لیے انہوں نے یہ شعر لکھا ہوا ہے؟'' زری نے تیسرا صفحہ پلٹ کے عبداللہ کا لکھا ہوا شعر سامنے کیا تھا۔

اب اُداس کیوں پھرتے ہو، سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں
دوستی کا دعویٰ کیا، عاشقی سے کیا مطلب
میں تیرے فقیروں میں، میں تیرے غلاموں میں

اس نے بلند آواز سے شعر سناتے ہوئے نگارش کو معنی خیز اور شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔

''ارے یار! ان تینوں دوستوں کے کیوں چھے چھے کھول رہی ہو۔ عبداللہ کو یہ ڈائری بہت عزیز ہے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے بریف کیس میں رکھتے ہیں، آج نجانے کیسے ٹیبل پہ بھول گئے ہیں، لاؤ میں واپس رکھ آؤں۔'' نگارش نے زری کو ڈائری اُٹھاتے پہلے سے باز رکھا۔

''ارے..... رہے..... اب کہاں؟ یہ انمول خزانہ اب میرے پاس رہے گا۔'' زری نے ڈائری پیچھے کر لی۔

''ارے پاگل ہو گئی؟ عبداللہ واپس آتے ہی اس ڈائری کو تلاش کریں گے، ایک بار میں نے بھی یہ ڈائری ٹیبل سے اُٹھا کر دراز میں رکھ دی تھی اور انہوں نے پورا گھر اُلٹ پلٹ دیا تھا۔''

نگارش نے اسے ڈائری چھپانے والی حرکت سے روکنا چاہا لیکن وہ بھی زری تھی دیوانگی کی حد تک دیوانی۔ دل اور شاعر کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے الفاظ کو وہ اتنی آسانی سے کسی اور کو نہیں سونپ سکتی تھی چاہے وہ اس کا سگا بھائی عبداللہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ کیونکہ اس ڈائری میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے تھے جن سے اس شخص کے اظہار جھلک رہے تھے اور وہ تیسرے صفحے پہ لکھے اس کے اظہار کو دل کی گہرائیوں سے پڑھنا چاہتی تھی اور محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''ایم سوری بھائی! آج سے میں چور بھی بن گئی۔'' اس نے نگارش کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

''زری.....'' اس نے گھور کے دیکھا۔

''پلیز.....'' وہ جواباً التجائیہ سا بولی تھی۔

''عبداللہ کو پتا چل جائے گا یار! انہیں پتا ہے کہ آج کل تم ہی اپنے ایگزامز کی تیاری کے لیے اسٹڈی میں جاتی ہو۔''

''تو کوئی بات نہیں آپ کہہ دیجیے گا کہ میں اب اسٹڈی میں نہیں جاتی۔'' زری نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''اُف خدایا.....'' نگارش نے سر تھام لیا تھا۔

''تھینک یو۔'' زری مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔

''میں شکایت کروں گی۔ عبداللہ سے کہ یہ اپنے پیپرز کی تیاری نہیں کر رہی بلکہ آج کل کے دنوں میں بھی پوئٹری پڑھنے میں مصروف ہے۔''

''اوکے کر دیجیے گا شکایت۔'' وہ ریلیکس تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ نگارش کچھ بھی نہیں کرے گی۔

''میں واقعی کر دوں گی۔''

''آپ واقعی کر دیجیے گا۔'' زری ہنستے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔

♥

وہ شکستہ سے انداز میں راکنگ چیئر پہ جھولتے ہوئے مسلسل چھت کو گھور رہا تھا اس کی آنکھیں رات بھر جاگنے کی وجہ سے بوجھل، سرخ ہو رہی تھیں، سر تھا کہ سوچوں کے عذاب سے پھٹا جا رہا تھا اور دل و دماغ پہ اک عجیب سا بوجھ مسلط ہو چکا تھا۔ اُلجھن اور پریشانی ایسی تھی کہ سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی کوئی حل نہیں مل رہا تھا وہ اس آگ اور عذاب میں اکیلا ہی بھٹک رہا تھا کہ اچانک اس کا سیل

سنے لگا۔ اتفاقاً سیل اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا جبھی اس نے تھکے تھکے سے انداز میں سیل اسکرین اپنے سامنے کی تھی۔ اسکرین پہ "کال کالنگ" کے لفظ جگمگا رہے تھے اور دل آور شاہ کی کال تھی لیکن نبیل حیات میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے بات کرتا کیونکہ اگر اسے بات کرنا تو ساری بات بتانی پڑتی۔ نبیل کی نظر اندازی سے اس کی ایک کال مسڈ ہو چکی تھی۔ اور دو سیکنڈ کے وقفے سے ہی دوسری کال آنے لگی نبیل کو یہ بھی پتا تھا کہ اگر اب بھی کال پک نہ کی تو وہ پریشان ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا تھا کہ گھر کے نمبر پہ فون کھڑکا دیتا اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی کال ریسیو کر لیتا۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے بمشکل ہیلو کہا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔" اس نے جواباً سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" نبیل بولنے کی فارمیلٹی نبھا رہا تھا۔

"کہاں ہو؟" دل آور شاہ کی تفتیش شروع ہو چکی تھی۔

"گھر پہ۔"

"تو پھر کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے؟"

"طبیعت نہیں تھی۔"

"طبیعت۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟" دل آور کو اس کی آواز سن کے ہی پریشانی ہو چکی تھی۔

"ہمارے گھر میں بھی کچھ ٹھیک بھی ہوا ہے؟" نبیل کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔

"کیا بات ہے نبیل؟ کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟" دل آور کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ کسی کی عزت اور غیرت سے بڑا مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی اسی سولی پہ چڑھا ہوا ہوں، بے غیرتی کے گھونٹ پی رہا ہوں، ذلت کی زندگی جی رہا ہوں، ایسی زندگی جینے سے تو بہتر ہے کہ میں خود کو گولی مار دوں۔" نبیل جس حد تک دباؤ میں تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

"یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تم؟ کیا مدیحہ نے کچھ کہا ہے؟" دل آور کا پہلا خیال مدیحہ کی طرف ہی گیا تھا اور نبیل کے لب تلخی سے بھنچ گئے تھے کنپٹی کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

"مدیحہ ہے گی تو تب جب گھر پہ ہو گی۔" انا اور غیرت کا سر کچل کے بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا کیونکہ بنے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا پھر بھی دل آور نے کوئی بھی بات کوئی بھی مسئلہ دل آور سے چھپا ہوا نہیں تھا وہ سب جانتا تھا۔

"مدیحہ گھر پہ نہیں؟ کیا مطلب؟ کہاں ہے وہ؟" نبیل کی شکست اس کے لہجے سے عیاں ہو رہی تھی وہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"نبیل! مجھے صاف صاف بتاؤ کیا ہوا ہے؟ مدیحہ کہاں ہے؟" دل آور کے انداز میں سختی اتر آئی تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں دل آور ے! مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہے اور ابھی تک گھر نہیں آئی۔"

"مگر کیوں؟ کیوں نہیں آئی وہ؟" دل آور کی آواز میں غصہ تھا اس کی کنپٹیوں کا لہو بھی دہک اٹھا تھا۔

"وہ چاہتی ہے کہ میں بابا کو گھر سے نکال دوں۔"

"واٹ؟ کس لیے؟" دل آور کو حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"اس لیے کہ اسے بابا سے نفرت ہے، وہ انہیں ناپسند کرتی ہے، وہ اس گھر میں رہیں گے تو وہ نہیں رہے گی اور اسی ضد پہ اڑی بیٹھی ہے اور وہ اکیلی لڑکی گاڑی لے کر صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہے۔" نبیل شکست خوردہ سا رو دینے کو تھا۔

"تو تم مجھے اب بتا رہے ہو؟" اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بتاتا تمہیں؟ یہ کہ میری بہن کی سرکشی دیکھو یا میرے باپ کی عیاشی دیکھو؟ اتنے اتنے مہینے باہر عیاشی کرتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو تھکن اتارنے گھر آ جاتے ہیں اور سالوں ان کا انتظار کرنے والی میری ماں، شکایت کا لفظ زبان پہ لائے بغیر ان کی خدمت میں لگ جاتی ہے۔ صرف اسی بات پہ خوش ہو جاتی ہے کہ وہ گھر تو آئے ہیں نا؟ اور میں انہیں پکڑ کے گھر سے ہی نکال دوں؟ کیا ایسا کرنا مجھے زیب دیتا ہے۔ کیا میری ماں یہ سب سہہ پائے گی؟ تو پھر بتاؤ یار میں کیا کروں؟ بہن کو گھر لے کر آؤں؟ یا

باپ کو گھر سے نکالوں؟" نبیل دکھ سے کہتا چلا گیا اور اس کی بات سن کے دل آور بھی خاموش ہو گیا تھا بے بسی کی انتہا پہ غم انگیز حیات ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، وہ کیا کر سکتا تھا آخر..... دل آور نے جواباً کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا تھا، اسے اس وقت مدیحہ پہ غصہ اور غصہ بھی غضب کا تھا۔

♥

"حرمت..... میں نے کہہ دیا نا میں کہیں نہیں جاؤں گی، پلیز مجھے فورس مت کرو، تم لوگوں نے جانا ہے تو جاؤ، مگر مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔" کومل کی تیز اور تلخ آواز پہ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے دہلیز پہ ہی ٹھہر گیا لیکن کومل اور حرمت اسے دیکھ چکی تھیں۔

"بھائی آپ؟ آپ نارک کیوں گئے ہیں؟" حرمت نے سر پہ دوپٹہ درست کیا تھا جبکہ کومل بنوز ضدی سے انداز میں گھٹنوں اکڑائے بیٹھی رہی۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کون کہاں نہیں جا رہا؟" آذر کی گہری کھوجتی ہوئی نظریں کومل پہ جمی ہوئی تھیں۔

"وہ بھائی دراصل کومل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے وہ کہہ رہی تھی کہ میں نہیں جاؤں گی تم لوگ چلے جاؤ۔" حرمت نے کومل کا بھرم رکھتے ہوئے بہانہ کیا تھا۔

"تو کوئی بات نہیں جب ان کی طبیعت ٹھیک ہو گی تب چلے جائیں گے ابھی پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔" آذر نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" کومل نے چونک کے دیکھا تھا کہ کیا وہ اس کی خاطر اس کا احساس کر رہا تھا یا پھر اسے کچھ جتا رہا تھا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ میں ابھی سب کو منع کر دیتا ہوں، ہمارے لیے آپ اہم ہیں، یہ پروگرام نہیں۔" آذر نے واپس قدم موڑے۔

"لیکن؟" کومل نے تیزی سے اسے روکا۔

"لیکن؟" آذر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"لیکن سب کو اچھا نہیں لگے گا، سب کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔"

"آپ کو تو اچھا لگے گا نا؟ آپ کی طبیعت جو خراب ہے۔"

"نہیں..... نہیں میری وجہ سے سب کا پروگرام کینسل نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر کیا ہونا چاہیے؟"

"جانا چاہیے سب کو۔" کومل نے کہتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔

"سب میں آپ بھی تو شامل ہوتی ہیں؟"

"مگر میری طبیعت....." وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلا لیتے ہیں اور ویسے بھی ابھی تو پوری رات اور پورا دن ہم لوگ گھر پہ ہی ہیں، کل صبح نکلنا ہے ہم نے، تب تک یقیناً آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔" آذر بڑے سکون سے اسے تسلی دے رہا تھا اور کومل جز بز سی ہو گئی۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟ کل تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی نا آپ کی؟" آذر کہتے ہوئے اسے اب بھی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کومل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا حرمت کھانستے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپا کر رُخ موڑ گئی۔

"گڈ..... آپ بھی اپنی تیاری کر لیجیے، اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور پیچھے حرمت کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم کیوں دانت نکال رہی ہو؟" کومل اندر سے خجل تو ہو چکی تھی لیکن جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

"واہ محترمہ! میرے سامنے کیسے غصے سے اکڑ اکڑ کر باتیں کر رہی تھیں اور ان کے سامنے ایک دم بھیگی بلی بن گئیں؟ نہیں بھی انکار کرتیں نا کہ میں نہیں جاؤں گی۔" حرمت نے گھور کے کہا۔

"کیسے انکار کرتی؟ پہلی بار تو انہوں نے کچھ کہا ہے۔ اب جانا تو پڑے گا نا؟" کومل نے معصوم بن کے کہا۔

"ارے بھئی کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟" جوت ان کی بات سنتے ہوئے اندر آ گیا۔

"ہم ناردرن ایریاز جا رہے ہیں۔" حرمت نے فوراً چہک کے بتایا تھا۔

"نادرن امریاز؟ کون کون جا رہا ہے؟"

"تمام بیچ پارٹی۔"

"مطلب کہ میں بھی؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"آپ گھر پہ ہوں گے تو جائیں گے نا؟" وہ خفگی سے بولی۔

"ارے یار! آہستہ بولو کیوں مروانا چاہتی ہو؟" جودت نے حرمت کو چپت لگاتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"تو اچھا ہے نا، آپ کی کلاس ہونی چاہیے، آخر رات رات بھر کہاں رہتے ہیں آپ؟ رات کو بھی آپ گھر پہ نہیں تھے اسی لیے آپ کو ہمارے اس پروگرام کی خبر نہیں ہے۔" حرمت پھر بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔

"کوئل آپا۔" جودت نے کوئل کو مدطلب نظروں سے دیکھا۔

"کوئل آپا کی تو خود کلاس لگنے والی ہے، آپ بس اپنی خیر منائیں۔" حرمت نے جس انداز میں کہا تھا کوئل یکدم کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

"ماشاءاللہ..... ماشاءاللہ، حسین کے چمن میں آج تو بڑے شگوفے پھوٹ رہے ہیں؟ کیا ماجرا ہو گیا آج؟" جودت نے ذو معنی لہجے میں کہا تھا۔

"اف! تم سب بہن بھائی ایک سے بڑھ کے ایک ہو۔" کوئل نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ جس پہ دونوں ہی ہنس پڑے تھے اور کچھ دیر بعد وہ بھی اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے اب تو کوئل بھی اپنی تیاری پورے جوش و خروش سے کر رہی تھی اور باقی سب لڑکیاں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

♥

زری یونیورسٹی سے سیدھے کے گھر آئی تو فریش ہونے کے لیے باتھ روم چلی گئی اور نگارش اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ دس منٹ بعد ہی زری چینج کر کے نیچے چلی آئی تھی۔

"بھیا کیسا رہا؟" نگارش کھانا ٹیبل پہ لگاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"شکر ہے اللہ کا بہت اچھا رہا۔" زری کھانا کھانے کے لیے بیٹھ چکی تھی۔

"عبداللہ کو بتایا؟"

"جی ہاں..... سب سے پہلے انہوں نے ہی پوچھا ہے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی جب باہر ڈور بیل سنائی دی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" زری اٹھنے لگی لیکن نگارش نے روک دیا۔

"تم کھانا کھاؤ میں دیکھ لیتی ہوں، ساتھ والی نیلی سے کوئی ہو گا۔" نگارش کرسی کی بیک سے دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتی ہوئی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا تھا لیکن اک ہلکی سی چیخ سے ذرا سا اچھل کے پیچھے ہوئی تھی اور اس کی آواز پہ کھانا کھاتی ہوئی زری لپک کے کچن سے باہر نکلی تھی۔

"بھابی! کیا ہوا ہے؟ کون ہے؟" وہ ہراساں سی نگارش کے پاس آئی لیکن دروازے کے پاس آ کر اس کے قدم بھی جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اس کی ٹانگوں میں لرزش آ گئی تھی۔

♥

اس کی رنگت یکلخت زرد پڑ گئی تھی یوں جیسے کسی نے اچانک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ ششدر سی کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور دل کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے سگریٹ کی طرح اپنے پیروں تلے مسل دیا ہو، جس کی اذیت اس کے پورے جسم و جاں میں سرایت کر گئی تھی اور ہونٹ محض کپکپا کے رہ گئے تھے۔

"اسد بھائی آپ؟" یہ مختصر سا تین لفظی جملوں زبان سے ادا کرنے میں بھی اسے دانتوں پسینہ آ گیا تھا اور اس کی خوبصورت پیشانی یکلخت عرق آلود ہو گئی تھی، وہ اپنے قدموں پہ بمشکل کھڑی تھی اسی لیے لرزتے ہاتھوں سے سہارے کے لیے نگارش کا بازو تھام لیا تھا۔ حالانکہ وہ ابھی اپنے سامنے کھڑے اس کی کرخت شکل آدمی کو دیکھ کر کافی گھبرائی ہوئی تھی، لیکن زری جیسی حالت تو پھر بھی نہیں

تھی، البتہ جب زری نے اس آدمی کو اسد بھائی کہا تھا تو نگارش بری طرح چونک گئی تھی، تب اسے پتا چلا کہ وہ آدمی کوئی اور نہیں عبداللہ اور زری کے بڑے بھائی اسد اللہ ہیں جن کو ہار پہنا تصویروں میں دیکھا تھا، لیکن آج جب اچانک انہیں حقیقت میں سامنے دیکھا تھا تو وہ پہچان نہیں پائی تھی، بلکہ ان کی ہائٹ اور ان کا حلیہ دیکھ کر ڈر گئی تھی، تب ہی تو وہ یکدم چیئر کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

ان کے کرخت چہرے کو ان کی بڑی بڑی مونچھیں اور بھی سفاک اور بے رحم بنا رہی تھیں، وہ اپنی موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے ان دونوں کا کافی گہرائی سے جائزہ لے رہے تھے زری کے لیے ان کی خونخوار آنکھوں کے تیور نئے نہیں تھے، البتہ نگارش ضرور انجان تھی۔ اسی لیے اندر سے سہمی ہوئی تھی۔

''کیا اس عیاش ملک اور سفید چمڑی والے لوگوں میں رہ رہ کر اپنوں کی شکل بھی بھول گئی ہے تمہیں؟ اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' وہ بولے تو ان کی بارعب اور دبنگ آواز پہ دونوں ہی کانپ کے رہ گئی تھیں۔

''نن... نہیں بھائی... ایسی تو... گگ... کوئی... بات... نہیں ہے... بس... وہ... وہ... آپ کو اچانک... دیکھ کر... یقین نہیں آ رہا تھا۔'' زری نے بے ربط سے انداز میں تقریباً ہکلاتے ہوئے کہا تھا اور دوپٹے کے پلو سے فوراً پیشانی سے پسینہ پونچھا تھا۔

''السلام علیکم بھائی! آیئے آپ اندر آ جایئے۔'' نگارش نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے متانت سے انہیں سلام کیا اور اندر آنے کے لیے راستہ دیا تھا، کیونکہ وہ دونوں دروازے میں ہی کھڑی تھیں، لیکن ملک اسد اللہ نے نہ تو اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور نہ ہی اپنے رسم و رواج اور روایات کے مطابق ان دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا، نگارش کو اندر سے خفت تو ہوئی تھی، لیکن یہ خفت اس نے ظاہر نہیں کی تھی، کیونکہ سچویشن ہی کچھ ایسی تھی کہ کچھ کہنا سننا ہی بے کار تھا۔

''راستہ دو۔'' انہوں نے ہنوز سامنے کھڑی زری کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا تھا، وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی ملک اسد اللہ مضبوط قدم اُٹھاتے اندر آ گئے تھے۔ نگارش نے حیرت سے دروازے سے باہر دیکھا تھا، ان کے ساتھ کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھے اور اکیلے تھے، حیرت کی بات تھی، وہ پاکستان سے بغیر سامان کے آئے تھے؟

''بھائی!'' زری نے خوف کے مارے نگارش کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا، جیسے کبھی نہ چھوڑنے کا ارادہ ہو۔

''ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوگا، تم ان کے پاس چلو، میں عبداللہ کو فون کر کے بتاتی ہوں۔'' نگارش نے زری کو تسلی دلائی تھی۔

''نہیں بھائی! اب تو عبداللہ بھائی بھی کچھ نہیں کر سکتے، بلکہ اب تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' زری کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

''زری پلیز! اتنی جلدی حوصلہ مت ہارا کرو، یہ دنیا ہے اور دنیا میں کبھی بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے، یہاں ہر بات، ہر کام ہر صورت ممکن ہے، یہ مت سوچو کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، اسد بھائی بھی انسان ہیں، کوئی جن بھوت نہیں ہیں جو چند منٹوں میں ہی تمہیں اپنے پنجوں میں دبوچ کر پاکستان لے جائیں گے، تمہیں پاکستان لے کر جانا ان کے لیے اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا بہت سے مراحل سے گزرنا ہوگا اور سب سے بڑی بات کہ تمہارا پاسپورٹ عبداللہ کے پاس ہے اور بغیر پاسپورٹ کے لے کر جائیں گے تو خود ان پہ کیس بن جائے گا، اس لیے تم بے فکر رہو، تم محفوظ ہو، ان کے سامنے جاؤ اور ریلیکس طریقے سے بات کرو، بوکھلانے کی اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ معاملہ تم نہیں عبداللہ ہینڈل کریں گے، اس لیے تمہیں اس مسئلے پہ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ڈرنے کی ضرورت ہے۔'' نگارش نے اسے ذرا سا ڈانٹ کے سمجھایا تھا اور زری کو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات مانتے دیکھ تھی، لیکن اسد بھائی کے سامنے جانے کا حوصلہ اور ہمت پھر بھی نہیں ہو رہا تھا۔

''ایم سوری بھائی! میں ان کے سامنے نہیں جا سکتی، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔'' اس نے پھر بھی انکار کر ڈالا تھا۔

''اُف! اگر اتنی ہی ہمت تھی تو محبت جیسی آگ دہکانے کی کیا ضرورت تھی؟'' نگارش تلملا گئی۔

''بھائی پلیز...'' آہستہ بولیے۔'' زری اور بھی گھبرا گئی۔

''تو پھر جاؤ اندر ان سے کھانا... اور چائے وغیرہ پوچھو۔'' نگارش نے اسے اندر کی سمت دھکیلا۔

''مگر بھائی وہ...''

PRIME URDU NOVELS

...ری یا گل ہو گئی ہو گیا؟ وہ اندر بیٹھے کیا سوچ رہے ہوں گے؟ اس طرح اکیلے بیٹھے بیٹھے تو انہیں اور بھی غصہ آئے گا، ...مانگی ہیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' نگارش اسے ہر طرح سے سمجھا رہی تھی، لیکن وہ ابھی بھی ڈر رہی تھی۔

''تو پھر آپ میرے ساتھ آیئے۔'' زری نے نگارش کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹا۔

''لیکن میں عبداللہ کو فون تو کر لوں؟''

''بعد میں کر لیجیے گا، پہلے اندر تو آیئے۔'' زری اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں تھی اس لیے نگارش کو اس کے ساتھ ہی آنا پڑا۔

...یں لیا اور بحال کرنے کے بعد۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو ملک اسد اللہ انہیں فون پر کسی سے محوِ گفتگو دکھائی دیے تھے، ان کو اک نظر دیکھنے کے بعد وہ پھر اپنی بات کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''وہ ابھی مصروف ہیں، تم یہیں ٹھہرو، میں عبداللہ کو فون کر کے ابھی آتی ہوں۔'' نگارش نے کافی مدھم آواز میں سرگوشی کی اور زری کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹ گئی۔

''ٹھہرو لڑکی۔'' نگارش کے عقب سے ان کی گرجدار آواز ابھری تھی اور نگارش کے قدم وہیں پر ہی رک گئے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹھہر گئی تھی۔

''واپس آؤ۔'' انہوں نے اسے واپس آنے کا حکم جاری کیا تھا۔

''جی کہیے۔'' نگارش، عبداللہ کے بڑے بھائی ہونے کے ناتے ان کا احترام کرتی ہوئی مؤدب سی آ کھڑی ہوئی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اسے فون کرنے کی، اسے خود آنے دو، آخر ہمیں بھی تو پتا چلے کہ اس کے آنے جانے کی روٹین کیا ہے، کتنی نظر رکھتا ہے وہ بہن اور بیوی کی۔'' وہ غصے سے طنزیہ بول رہے تھے۔

''وہ شام سات بجے آئیں گے۔'' نگارش نے اس کے آنے کا ٹائم پہلے سے بتا دیا۔

''اوہ اچھا تو شام سات بجے واپس آتا ہے، چاہے اس کے پیچھے اس کی بہن اور بیوی جو بھی چاہے گل کھلاتی رہیں؟ ملک اسد اللہ اپنے باپ کی طرح جب بولتے تھے تو اچھا برا کچھ بھی نہیں دیکھتے تھے، بلکہ بولتے ہوئے تو ان کی سوچ بھی مفلوج ہو کے رہ جاتی تھی کہ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا؟

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' نگارش کو ان کی بات گولی کی طرح لگی تھی، وہ یک دم بلبلا اٹھی تھی۔

''مجھ سے دھیمی آواز میں بات کرو لڑکی، میں کچھ غلط نہیں کہہ رہا، اس انجان ملک اور انجان شہر میں دو جوان لڑکیاں گھر پہ اکیلی ہوں تو کبھی بھی کوئی بھی گھر پہ آ سکتا ہے، اگر میں آ سکتا ہوں تو کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔ اور یہ بات ملک عبداللہ نے شاید کبھی سوچی ہی نہیں گی۔'' ان کی بدمزاجی کا نگارش کو پتا تھا، لیکن وہ شکی مزاج بھی ہیں، یہ ان کی باتوں سے اور طرزِ فکر سے ظاہر ہو رہا تھا۔

''سر ایک بات میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں، ملک عبداللہ کی بیوی اور آپ کی بھاوج ہوں، میں اگر آپ سے دھیمی آواز میں بات کروں گی تو آپ کو بھی مجھ سے تمیز سے بات کرنا ہو گی، نمبر دو آپ جب سے آئے ہیں غلط ہی تو کہہ رہے ہیں، یہ ملک اور یہ شہر آپ کے لیے انجان ہو گا، ہمارے لیے تو نہیں نا؟ ہم اس ملک اور شہر کے باسی ہیں، یہاں دو جوان لڑکیوں کے بجائے اگر ایک جوان لڑکی بھی گھر پہ ہو تو کبھی بھی کوئی بھی گھر پہ نہیں آ سکتا، کیونکہ آنے والا بخوبی جانتا ہو گا کہ اس کا کیا حشر ہو گا؟ آپ کو بھی ہم نے خود سے ایوائیڈ، ورنہ میری ایک فون کال ہی آپ کو اس گھر، اس شہر سے تو کیا اس ملک سے بھی نکلوا سکتی ہے، آپ پانچ منٹ کے اندر اندر ڈرائنگ روم کے بجائے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے اور نمبر تین وہ بیٹیاں اور بیویاں مرد کے گھر سے جانے کے لیے گل کھلاتی ہیں جن کو پابند کر کے اور قید کر کے رکھا جاتا ہے، جن پہ اعتماد نہیں کیا جاتا جن کو دنیا سے کاٹ کے دیواروں سے لگا دیا جاتا ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عبداللہ ایسے نہیں ہیں، انہیں بیوی پہ بھی اعتماد ہے اور بہن پہ بھی، لہٰذا آپ کو اس حوالے سے فکر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، لیکن اس سب کے باوجود میرے لیے ایک بات بڑی اہم ہے کہ آپ عبداللہ کے بڑے بھائی ہیں، اس رشتے کے حوالے سے آپ میرے بھائی بھی ہیں اور جینٹ بھی، آپ کا احترام سر آنکھوں پہ، جب تک عبداللہ نہیں آ جاتے، آپ بیٹھیے، آرام کیجیے اور حکم کیجیے کہ آپ نے کیا کھانا ہے؟ تب تک میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' نگارش بولنے پہ آئی تو کمال کر دیا، ...کی حیرت زدہ سی آنکھیں پھیلائے نگارش کو دیکھتی رہ گئی، نگارش اتنی اسٹرانگ تو کبھی بھی نہیں لگی تھی، جتنی اس وقت لگ رہی

تھی، تو گویا زری کے مقابلے میں وہ کسی کے بھی سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتی تھی؟ ملک اسد اللہ نے جواباً کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن اتنے میں اپنی بات مکمل کر کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی تھی۔

''ہوں تو اس تمیز دار بیوی سے شادی کی ہے ملک عبداللہ نے؟'' وہ زیر لب طنزیہ سے لہجے میں بولے تھے۔

''نگارش بھابی ایسی نہیں ہیں، بہت اچھی ہیں وہ۔'' زری نے بھی اس کی طرفداری میں ذرا تاخیر نہیں کی تھی۔

''ہونہہ جتنی اچھی ہے میں دیکھ رہا ہوں اور ہاں ہمارے خاندان میں اسی عورت کو بھاوج کہا جاتا ہے جو خاندانی ہو، اچھی حسب نسب کی ہو، اس کے آگے پیچھے بھرا پرا خاندان ہو، ہماری ہم پلہ اور ہماری ٹکر کی ہونی چاہیے ہماری بہو۔ کسی دو ٹکے کے خاندان کے دو ٹکے کی لڑکی ہماری بہو نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہم اسے بھاوج مانتے ہیں۔'' وہ پھر بولے تھے اور بنا سوچے سمجھے ہی بولے تھے۔ زری نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا تھا۔

''بس بس..... زیادہ طرفداری کرنے کی کوشش مت کرو، ہم بنا کہے ہی سب کچھ جانتے ہیں۔'' ان کا لب و لہجہ حقارت سے ہوئے تھا۔ جس پہ زری کو کافی تکلیف ہوئی تھی لیکن دوبارہ بولنے کی جرأت نہیں کر سکی تھی، اتنے میں نگارش بھی چائے لے کر وہاں آ چکی تھی۔

♥

مسلسل دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور ڈاکٹر کی ٹریٹ منٹ کے بعد صبح چھ بجے کے قریب ابا جی کو ذرا سا ہوش آیا تو ان لوگوں کے دماغ ٹھکانے پہ آئے تھے آدھے گھنٹے بعد انہیں آئی سی یو سے ایمرجنسی وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا مریم تیزی سے آگے بڑھ کے ان کے سرہانے آ کھڑی ہوئی تھی وہ ان کا ہاتھ تھام کے ہاتھ سہلانے لگی۔

''آپ لوگوں کی قسمت اچھی تھی کہ آپ انہیں بروقت ہسپتال لے آئے۔ ورنہ پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹہ اور لیٹ ہو جاتے تو یہ انیک ان کی جان بھی لے سکتا تھا۔'' ڈاکٹر رضوی ان کا بی پی چیک کرنے کے بعد عدیل کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

''اللہ کا شکر ہے جس نے کسی کو فرشتہ بنا کر ہماری مدد کے لیے بھیج دیا ورنہ.....'' عدیل ورنہ سے آگے کچھ کہہ ہی نہ سکا اس کا دھیان اچانک مدیحہ کی طرف چلا گیا تھا جو انہیں اس مشکل وقت میں یہاں تک چھوڑنے آئی تھی لیکن پارکنگ میں اترنے کے بعد عدیل کو اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا یہاں تک کہ اس کا شکریہ ادا کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور اب اس کا خیال آتے ہی عدیل کو اپنی سنگین ترین کوتاہی کا احساس ہوا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ..... یہ کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟'' عدیل سر پہ ہاتھ مارتا ہوا ڈاکٹر کو وہیں چھوڑ کے باہر کی سمت بھاگا۔ اس نے بھی نہ سوچا کہ ڈاکٹر رضوی کیا سوچیں گے؟ وہ ہسپتال کے طویل ترین احاطے سے بھاگتا ہوا پارکنگ تک آیا اور ادھر ادھر مستانی اندر میں نظریں دوڑانے لگا۔

وہ لوگ رات تقریباً ساڑھے تین بجے یہاں آئے تھے اور اس وقت خاصا گہرا اندھیرا تھا ہر طرف الیکٹرک پول اور لیمپ پوسٹ روشن تھے لیکن اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا دھندلا سورج فی الحال اپنی نوخیز کرنوں میں نرمیاں سمیٹے ہوئے انگڑائیاں لیتا بیدار ہو رہا تھا۔ سورج کی ہلکی ہلکی کسمساہٹ ماحول پہ اک عجیب سا سحر طاری کیے ہوئے تھی نئے دن کی شروعات ہو چکی تھی زندگی ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی اور عدیل اس جاگے سوئے وقت میں نئے دن کی روشنیاں لے کر مدیحہ حیات کو تلاش کرتا پھر رہا تھا جیسے یقین ہو کہ وہ ابھی بھی وہیں ہو گی۔ لیکن ہر طرف نظر دوڑانے پہ بھی جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو وہ مایوسی سے واپس مڑ گیا، دل میں پشیمانی بلکورے لے رہی تھی وہ سر جھٹکتا ہوا پارکنگ ایریا سے نکل رہا تھا جب اچانک دائیں طرف نگاہ اٹھی اور وہ بے یقینی سے دیکھتا رہ گیا۔

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی چپ چاپ ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی اور عدیل اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔ اس کے قدم مدیحہ کی سمت اٹھنے لگے، وہ کافی دور کھڑی تھی۔ لیکن عدیل کو بے حد قریب لگ رہی تھی اتنی قریب کی اس کی سانسیں معطر ہو گئی تھیں۔ آس پاس کا سارا ماحول ہی مہک اٹھا تھا کسی دلکش سے جذبے نے سب کچھ مہکا کے رکھ دیا تھا وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور نظریں اس کے چہرے پہ جما دی تھیں۔

''السلام علیکم۔'' عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔ مدیحہ نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا اور اسے دیکھ کر دوبارہ نظریں جھ

ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اس نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا ہو۔

"ایم سوری۔" وہ دوبارہ بولا مگر اب کی بار مدیحہ نے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ سوری کسے کہہ رہا ہے۔

"دیکھئے میڈم! میں آپ سے مخاطب ہوں، اپنی غلطی پہ معافی مانگتا ہوں، آپ جو جی چاہے سزا دیں، بندہ حاضر ہے۔" اس نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے کہا تھا مدیحہ نے اس کے جھکے ہوئے سر کو گھور کے دیکھا۔

"کیسی معافی؟ اور کیسی سزا؟" اس کی طرح اس کا لہجہ بھی تیکھا تھا اور الفاظ بھی تیکھے تھے۔

"اپنی پریشانی میں آپ کو یہیں بھول گیا۔" عدیل کی نظریں اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی گھنی مڑی ہوئی سیاہ پلکوں پہ ٹھہریں اس کی شخصیت کا تیکھا پن اس کی پلکوں سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔

"مسٹر! میں کوئی بے جان چیز نہیں ہوں جسے آپ جہاں چاہے بھول جائیں۔" وہ طنزیہ انداز میں چبا کر بولی۔

"اس وقت تو آپ مجھے بے جان چیز ہی لگ رہی ہیں، جسے جہاں چھوڑ کے گیا تھا وہیں پہ ہے، اگر جاندار ہوتی تو اپنی جان کا استعمال کرتے ہوئے یہاں سے وہاں ہو چکی ہوتی۔" عدیل کا لہجہ دلچسپ اور متبسم سا تھا مدیحہ نے یکدم سر اٹھا کے اسے دیکھا تھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مدیحہ کو اس کی آنکھوں میں اک لبھا دینا ہوا احساس اپنی سمت بہتا ہوا محسوس ہوا تھا تبھی وہ نظریں چرا کر اپنی عینک کی پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکالنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟ اندھیرا نہیں چھلیں گی؟ میرے اباجی کو ہوش آ چکا ہے اور یہ سب آپ کی مہربانی سے ہی ہوا ہے۔"

"مہربانی جب بھی ہوتی ہے اوپر والے کی ہوتی ہے، کوئی بندہ کبھی بھی مہربان نہیں ہوتا جب تک کہ اوپر والا نہ چاہے۔"

"ماشاء اللہ ایسی باتیں بھی کر لیتی ہیں آپ؟" عدیل کو مدیحہ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی اسی لیے کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ غصے سے اس کی سمت پلٹی۔

"مطلب کہ ایک بار پھر مجھ سے گستاخی ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔" عدیل مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا کیونکہ اس کے تیور خاصے جارحانہ تھے۔

"دیکھو مسٹر! میرے پاس معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی بکواس اپنے تک ہی رکھیں۔"

"اوکے اوکے اپنے تک ہی رکھوں گا، لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس مسٹر کا ایک نام بھی ہے جسے لوگ "عدیل عمر" کہتے ہیں۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ مجھے عدیل کہتی ہیں یا عمر؟" عدیل نے مسکراتے ہوئے اسے اپنا نام بتایا تھا مدیحہ نے اسے استہزائیہ نظروں سے سراپا دیکھا تھا۔

"مجھے آپ کے نام سے کیا لینا دینا۔" وہ کندھے اچکا کے بولی۔

"لیکن مجھے تو آپ کے نام سے لینا دینا ہے نا، میڈم کہہ کہہ کے بوریت ہونے لگی ہے، پلیز یور گڈ نیم؟" عدیل نے انتہائی مؤدبانہ انداز میں اس کا نام پوچھا تھا، جس پہ مدیحہ نے کافی تیکھی اور تیز نظروں سے اسے گھورا تھا۔

"آپ کو میرے نام سے کیا لینا دینا؟"

"میڈم! ساری باتیں بتانے کے لیے نہیں ہوتیں، کچھ باتیں بس سمجھنے کے لیے ہوتی ہیں، آپ اپنا نام بتا دیں، میں کسی ایسی جگہ آپ کا نام لکھ دوں گا جو کورے کاغذ سے بھی زیادہ کوری ہو گی۔" نہ جانے عدیل کس موڈ میں تھا کہ بے ساختہ ہی کہہ گیا تھا اور مدیحہ کے تیور اور بھی بگڑ گئے تھے۔

"کس خوش فہمی میں آپ....." وہ پھنکار کے بولی تھی جبکہ عدیل پھر بھی مسکرا دیا۔

"صرف اس خوش فہمی میں کہ جو انسان بے جان چیز بن کے میرے لیے اتنے گھنٹے ایک ہی جگہ پہ کھڑا رہ سکتا ہے تو اگر وہ جاندار بن جائے تو کیا ہو گا؟" عدیل نے برملا اظہار کیا تھا۔

"شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ..... میں یہاں آپ کے لیے نہیں آپ کے فادر کے لیے کھڑی ہوں صرف اس لیے کہ شاید آپ کو دوبارہ کوئی کام پڑ جائے اور آپ کو دوبارہ ٹیکسی اور آٹو کے پیچھے نہ بھاگنا پڑے، لیکن یہاں تو میرا خیال ہے کہ کسی کی مدد کرنا بھی محال ہے، لوگ اپنے مطلب کے لیے غلط مطلب نکال لیتے ہیں۔" مدیحہ نے اسے جھاڑ کے رکھ دیا تھا۔

"اگر یہ غلط ہو تو غلط مطلب ہی نکلے گا نا میڈم! آپ کو اگر میرے فادر کا اتنا ہی خیال تھا تو آپ کو اندر آ کر ان کی خیریت

پوچھنی چاہیے تھی، آپ کو پتا تھا کہ ان کی اتنی سیریس کنڈیشن ہے پھر بھی آپ آرام سے پارکنگ میں کھڑی ہیں اندر جانے کے بجائے واپس جا رہی ہیں تو میں اس چیز کو کیا سمجھوں؟ یہی نا کہ آپ میرے لیے میرے انتظار میں کھڑی تھیں؟ میں آیا ہوں تو واپس جا رہی ہیں؟ میرے فادر کی عیادت تو آپ نے پھر بھی نہیں کی؟" عدیل نے جیسے شکوہ کیا تھا اور مدیحہ اس کی باتوں پہ ایک بار پھر شرمندہ ہوئی تھی۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا اگر وہ یہاں اس کے فادر کے لیے کھڑی تھی تو اسے ان کے لیے اندر بھی جانا چاہیے تھا اگر وہ یہاں عدیل کے انتظار کرنے کے بعد بھی واپس پلٹ جاتی تو خود بخود ہی غلط مطلب نکل آتے، اس میں عدیل کی تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ غلطی اس کی اپنی تھی جسے رفع کرنے کے لیے وہ سر جھکا کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس سمت چل پڑی جہاں سے عدیل اس کی طرف آیا تھا اور اسے ہسپتال کے اندرونی حصے کی سمت بڑھتے دیکھ کر عدیل بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لیا تھا۔

پارکنگ سے ایمرجنسی وارڈ تک کا فاصلہ ان دونوں نے خاموشی سے طے کیا تھا دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تو مریم کی نظریں ان دونوں پہ ٹھہر گئی تھیں وہ بڑی ہو چکی تھی لیکن عدیل کے ساتھ چلتی ہوئی بچ رہی تھی۔

"ہیلو۔" مدیحہ نے قریب آ کے کافی آہستگی سے کہا تھا۔

"السلام علیکم۔" مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"یہ مریم ہے میری چھوٹی بہن اور مریم یہ۔" عدیل اس کا تعارف کرواتے ہوئے رکا تھا۔

"مدیحہ حیات۔" مدیحہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور عدیل اس کے نام پہ مسکرایا۔

"مدیحہ ....." وہ زیر لب دہرا کے بولا اور پھر ابا جی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ بھی مدیحہ کو ہی دیکھ رہے تھے نظروں میں کافی سوالیہ سا تھا۔

"ابا جی! ان کا نام مدیحہ حیات ہے، عدیل بھائی کی دوست ہیں۔ رات ان کی گاڑی میں ہی آپ کو ہسپتال لے کر آئے تھے۔" مریم نے قریب جا کے انہیں تفصیل سے بتایا تھا فاروق نیازی کے چہرے اور آنکھوں سے شفقت کا احساس ابھرا تھا۔ مدیحہ اور عدیل لفظ "دوست" پہ ہی حیران اور جز بز ہو رہے تھے۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟" مدیحہ سر جھکا کر ان سے مخاطب ہوئی۔

"سوری مدیحہ جی! یہ بول نہیں سکتے۔" مریم نے آہستگی اور کافی دکھ سے کہا تھا بس پہ مدیحہ نے بڑی طرح چونک کر دیکھا تھا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ بیمار ہیں، دیئر الائز ہیں اور ان کی یہ کنڈیشن پچھلے چار سال سے ایسی چلی آ رہی ہے۔" مریم کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ مدیحہ جیسے دم بخود کھڑی رہ گئی اس نے کافی ششدر سے انداز میں مریم اور عدیل کے چہروں کی سمت دیکھا تھا۔

مریم چہرہ جھکائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ عدیل ایک دم چپ کھڑا تھا جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو۔ مدیحہ تو رات سے یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے ابا جی کی ویسے ہی تھوڑی بہت طبیعت خراب ہوئی ہے تو ان شاء اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن وہ اذیت اور تکلیف کی کس اسٹیج پر ہیں؟ یہ تو وہ اس وقت جان ہی نہیں پائی تھی۔ یہ تکلیف تھی یا زندگی بھر کا عذاب تھا؟ خود ان کے لیے بھی اور ان کے گھر والوں کے لیے بھی۔ چار سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اور چار سال کسی کا ایسی تکلیف اور اذیت کو جھیلنا بھی کم نہیں تھا، بس کو سوچ کر ہی مدیحہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور دل و دماغ میں دکھ اور افسوس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں، بیٹھیے نا؟" مریم اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی اور بینچ کے قریب کھڑی مدیحہ کو بیٹھنے کا کہا تھا۔

"ایم سوری ..... مجھے ان کی تکلیف کا اس حد تک اندازہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ معمولی سی طبیعت خراب ہے ابھی سینے میں تھوڑا بہت پین ہو رہا ہے تو یہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے لیکن یہ سب تو ....."

مدیحہ حیرت زدہ سی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے خاموش ہو گئی تھی۔

"اٹس اوکے! پہلی بار دیکھنے پہ کسی کو بھی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ خیر آپ پریشان نہ ہوں، اللہ رحم کرے گا۔ آپ بیٹھیے آرام

ے بات نہیں دیکھے۔ آپ بھی رات سے ہمارے ساتھ ہی جاگ رہی ہیں، ابھی تو ناشتہ بھی کرنا ہوگا آپ نے؟'' مریم کافی نارمل بات کر رہی تھی یوں جیسے پہلے سے جان پہچان ہو جبکہ عدیہ نے ناشتے کا سن کر بے ساختہ اپنے سیل فون سے ٹائم چیک کیا تھا پونے سات بجے کا وقت ہو رہا تھا گویا رات تمام ہو چکی تھی اور وقت کی رفتار گھوم پھر کے دوبارہ وہیں پہ آ گئی تھی جب کل صبح وہ اپنے گھر سے نکلی تھی کل صبح شاید نو دس بجے کا ٹائم تھا اور اب صبح کے سات بج رہے تھے۔

''خیریت ... کیا ہوا ہے؟ کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ؟''

عدیل اس کے دیکھنے کا انداز سمجھ گیا تھا۔

''ہوں آئی تھنک مجھے اب چلنا چاہیے۔ ٹائم بہت ہو چکا ہے۔'' وہ مریم اور فاروق نیازی کو دیکھتے ہوئے عدیل سے مخاطب ہوئی تھی۔

''ایز یو وش میڈم! آیئے میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ آؤں۔'' عدیل اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا تبھی تو فوراً سر خم کر دیا تھا۔

''اوکے مریم جی اٹس نو میٹ یو۔ اللہ حافظ انکل۔'' عدیہ نارمل سے انداز میں کہتی ہوئی مریم سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئی تھی۔

''آپ دوبارہ کب آئیں گی؟'' مریم نے شاید اپنے بھائی کے دل پہ کھلا سوال پڑھ لیا تھا جسے سن کر عدیہ کے قدم یکدم تھم سے گئے تھے اس نے پلٹ کر مریم کو دیکھا۔

''فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتی، آپ کی یاد میں اثر ہوا تو ضرور آؤں گی۔'' عدیہ اسے جواب دے کر ٹھہری نہیں تھی باہر نکل آئی اس کے پیچھے عدیل بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل آیا تھا۔

''ایک بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے۔'' عدیل نے اس کے برابر چلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا عدیہ نے چلتے چلتے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''پوچھیے۔'' اس نے اجازت دی۔

''رات کے دو بجے آپ تنہا سڑکوں پہ کیا کر رہی تھیں؟'' عدیل کے ذہن میں رات سے دبا ہوا سوال اُمڈ آیا تھا جس پہ عدیہ کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے تھے اور پیشانی پہ ناگوار بل پڑ گئے اور اس کا ازلی غصہ خود کے سامنے آیا تھا۔

''میرا اور آپ کا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ مجھ سے کوئی پرسنل سوال پوچھیں، میری ذرا سی نرمی سے شاید آپ اپنی حد بھول گئے ہیں، میں رات کے دو بجے تنہا سڑکوں پہ کیا کر رہی تھی۔ یہ میرا اور میرے گھر والوں کا مسئلہ ہے۔ آپ کو اس فکر میں ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سمجھے آپ؟'' اس نے یہ میں عدیل کو کھری کھری سنا ڈالی تھیں اور عدیل اس کے اس قدر جلدی بدلتے رویے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اس نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی عدیل اور کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ سوائے معذرت کرنے کے۔

''ایم سوری میڈم! میں واقعی پرسنل ہو گیا تھا، پھر یہ کہنا چاہیے کہ میں آپ کی ذرا سی نرمی پہ اپنی اوقات، اپنی حد بھول گیا تھا۔ جس پہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ ایم رئیلی سوری۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں معذرت کر رہا تھا اور عدیہ اس پہ ایک نگاہ غلط ڈالے بغیر متانت سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اور عدیل وہیں راستے میں کھڑا رہ گیا عدیہ نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اپنی جیز کی پاکٹ سے چابی نکال کر لاک کھولا اور گاڑی نکال لے گئی تھی حالانکہ اسے خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

♥

وہ دن بھر کی تھکن اور رات بھر کے رت جگے سے کافی بجھی گئی تھی لیکن اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی فلائٹ میگی کی کال بھی آئی تھی وہ اسے واپس آنے کے لیے واسطے دے رہی تھیں لیکن عدیہ کی ایک ہی شرط تھی اور اس کی یہ شرط ماننا ان کے لیے مشکل تھا تبھی عدیہ نے یکدم فون بند کر دیا تھا اور اپنے پیٹ کی بھوک کا بندوبست کرنے کے لیے ''آواری'' کا رُخ کیا تھا۔

اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے اس نے کافی ہیوی ناشتہ آرڈر کیا تھا۔ اس نے ناشتہ پوری رغبت سے کیا تھا تبھی ناشتے کے بعد طبیعت فریش ہو گئی تھی لیکن ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ اپنی گاڑی تک پہنچی ہی تھی کہ ساری فریشنس ہوا ہو گئی گاڑی کا اگلا ٹائر پنکچر ہوئے اس کا سیل گنگنایا تھا اور جیسے ہی اس نے نمبر دیکھا اس کے ہوش بھیج گئے تھے اور اعصاب میں تناؤ آ گیا۔ کیونکہ کرنے والا اور شاہ تھا۔

''ہیلو.....'' مدیحہ کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس کی کال وہ ٹس کٹیکٹ کرتی۔
''دل آور شاہ بات کر رہا ہوں۔'' اس کے غصے کی لپک اس کی بات سے ہی ظاہر ہو گئی تھی۔
''جی میں جانتی ہوں۔''
''صرف جانتی ہو نا، پہچانتی نہیں ہو۔''
''پہچانتی بھی ہوں۔''
''تم اگر پہچانتی تو پوری رات اور پورا دن گھر سے باہر نہ گزارتیں جس لاہور کی سڑکیں بھی دل آور شاہ کو سلام کرتی ہیں تم انہی سڑکوں پہ دل آور شاہ کا سر نیچا کرتی پھر رہی ہو۔'' وہ غصے اور غضب سے بھرا ہوا تھا۔
''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ کا سر نیچا ہو۔''
''شٹ اپ مدیحہ، جسٹ شٹ اپ اپنی زبان کو لگام دو، تم جو کچھ کر چکی ہو، میرا سر نیچا کرنے کے لیے وہی کافی ہے۔''
''بھائی آپ کو چوٹ لگی ہے تو آپ کس قدر بلبلا رہے ہیں، اسی طرح آپ میری چوٹ کا بھی تو اندازہ کیجیے۔'' دو دن بعد میں چپا کر بولی تھی دونوں بہن بھائی کے میٹر گھومے ہوئے تھے۔
''تمہیں جو چوٹ لگی ہے وہ ہمیں بتاتی کیوں نہیں ہو؟''
''افسوس! میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو میری چوٹ اور میری اذیت کو بیان کر سکیں، جس کے بعد یقیناً آپ بھی اور میرا معصوم اور سادہ لوح بھائی نبیل بھی منہ چھپانے پہ مجبور ہو جائیں گے، لیکن میں بیان کروں بھی تو کیسے؟ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اس شخص کے ہوتے ہوئے میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی، اگر میں وہاں رہی تو بہت بڑا ہنگامہ ہو جائے گا۔''
وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے بات کر رہی تھی۔
''دیکھو مدیحہ! میں نے اس وقت تم سے کوئی بحث کرنے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ اگر تمہیں میری عزت اور میری غیرت کا ذرہ سا بھی احساس یا کوئی پروا ہے تو تم جہاں کہیں بھی ہو ابھی اور اسی وقت گھر واپس چلی جاؤ۔ میں اگر خود لاہور میں ہوتا تو تمہیں اپنے گھر لے جاتا، لیکن تمہارا اکیلے گھر میں جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں واپس اپنے گھر ہی جانا ہوگا۔ نبیل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' دل آور نے فیصلہ مدیحہ پہ چھوڑ دیا۔
''لیکن دل آور بھائی میں وہاں.....''
''میں نے تمہیں فورس کرنے کے لیے فون نہیں کیا بس یہ کہا ہے اگر تمہیں میری عزت اور میری غیرت کا ذرا سا بھی احساس ہے تو واپس گھر چلی جاؤ۔ نہیں تو آج کی رات بھی باہر سڑکوں پہ ہی گزار لینا، میں دوبارہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ او کے اللہ حافظ۔'' دل آور نے دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور مدیحہ جوں کی توں کھڑی رہ گئی۔ دل آور شاہ ایک بھائی ہونے کے ناتے ہر بار اس کے آڑے آ جاتے تھے اور وہ ان کی وجہ سے ہر بار بے بس ہو جاتی تھی اس وقت بھی اسے خون کے گھونٹ پی کر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

♥

بڑی حویلی میں آج جیسے پُرجوش سی ہلچل مچی ہوئی تھی یک جز پشن نے اک اودھم سا مچا رکھا تھا ساری تیاری افراتفری کے عالم میں ہو رہی تھی اور یہ افراتفری زیادہ تر لڑکیوں کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ کوئی دوپٹہ میچ کر رہی تھی تو کوئی اپنے جوتے، کسی کو سوٹ سے میچنگ بیگ چاہیے تھا، تو کسی کو میچنگ جیولری کی ضرورت تھی۔
انوشہ اور حرمت مبارک خان کو ساتھ لیے مارکیٹ گئی ہوئی تھیں انہوں نے اپنی کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی، کومل اور جویریہ کو بیوٹی پارلر جانے کی ضرورت تھی اس لیے وہ دونوں جودت کے پیچھے پڑ گئیں حالانکہ جودت ہاتھ آنے والا نہیں تھا لیکن اسے اپنی کومل آپا سے بڑی انسیت تھی زیادہ دیر انکار نہ کر سکا اس لیے مانتے ہی بنی۔
''لیکن میرے پاس تو بائیک ہے۔ آپ بائیک پہ کیسے جائیں گی؟''
''تو کسی سے گاڑی لے لو نا۔''
''ایم سوری! میری ڈرائیونگ کے پیش نظر کوئی بھی مجھے اپنی گاڑی نہیں دیتا۔'' جودت شرارت سے ہنسا۔

"تو پھر؟" کومل اور جویریہ پریشان ہوگئیں۔

"پھر یہ کہ گاڑی آپ مانگیں تو مل سکتی ہے۔" جودت نے آنکھوں آنکھوں میں آذر کی سمت اشارہ کیا تھا جو باہر لان میں بیٹھا پائپ پیتے ہوئے میگزین دیکھ رہا تھا۔

"میں مانگوں؟" کومل بدک گئی۔

"جانا بھی تو آپ نے ہے، بالوں کی کٹنگ، تھریڈنگ اور فیشل بھی تو آپ نے کروانے ہیں کون سا میں کروانے جا رہا ہوں۔" جودت نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور کومل یکدم تلملا گئی تھی۔

"تم بہت خبیث ہو جودت۔"

"جی! میں جانتا ہوں۔" وہ اپنی سعادت مندی سے بولا کہ جویریہ سے مسکراہٹ دبانا مشکل ہو گیا۔ "جاؤ نا گاڑی مانگو ان سے۔" کومل نے اشارہ کیا۔

"ان سے....." جودت نے آنکھیں مٹکائیں۔

"ہاں ان سے۔" وہ زچ ہو چکی تھی۔

"تو یہ کومل آپا تو پ..... میرے باپ، دادا کی توبہ، میں اوکھلی میں سر نہیں دے سکتا، یہ کام کرنا ہے تو آپ نے خود ہی کرنا ہے، ورنہ میں گیا تو میری کلاس شروع ہو جائے گی، اس لیے پلیز....." اس نے کومل کو راستہ دیا۔

"مگر میں۔"

"یار اچھی جاؤ پہلے ہی اتنا ٹائم ویسٹ ہو چکا ہے۔" جویریہ ان کی بحث سے جھنجلا اٹھی تھی۔

"جائیے نا۔" جودت نے معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمجھی نہ کبھی تمہیں بھی کوئی کام پڑ ہی جائے گا جودت، لیکن دیکھنا تم سے بدلہ نہ لوں تو میرا نام بھی کومل آفندی نہیں۔" وہ اسے واران کرتی ہوئی اپنا دوپٹہ شانے پہ درست کرتے ہوئے لان میں نکل آئی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے آذر کے قریب جا کے سلام کیا تھا۔

"والسلام۔" آذر نے میگزین سے نظریں ہٹا کر کومل کی سمت دیکھا تھا۔

"آپ فارغ ہیں؟" کومل کو پوچھتے ہوئے کافی جھجک محسوس ہوئی تھی۔

"جی کیوں خیریت؟"

"آپ نے کہیں جانا تو نہیں ہے۔" اس نے ہمت کر کے اگلا سوال پوچھا۔

"فی الحال تو کوئی کام نہیں ہے، اس لیے ابھی کہیں نہیں جانا، آپ کو کوئی کام ہے کیا؟" آذر حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جی..... وہ دراصل آپ کی گاڑی چاہیے تھی کچھ دیر کے لیے۔"

"وہ کس لیے؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"وہ ہم لڑکیوں نے بیوٹی پارلر جانا تھا۔"

"تو مبارک خان کہاں ہے اس کے ساتھ چلی جائیں۔"

"وہ حرمت اور انوشہ کو لے کر مارکیٹ گیا ہوا ہے انہوں نے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔"

"اوہ اچھا۔" آذر کو چپ ہونا پڑا تھا۔

"ساتھ کون جا رہا ہے؟"

"جودت....."

"اوکے آپ چابی لے جائیں، لیکن جودت سے کہیے گا کہ گاڑی ہوش و حواس میں رہ کر ڈرائیو کرے۔" آذر نے کہتے ہوئے سامنے ٹیبل پر اپنے موبائل کے ساتھ رکھی کی چین اٹھا کر کومل کی طرف بڑھا دی۔

"تھینک یو..... تھینک یو سو مچ۔" کومل چابی لے کر اس کا تھینکس کہتی ہوئی پلٹ گئی۔

"کومل۔" آذر نے پیچھے سے آواز دی۔

"جی۔" کومل جی جان سے واپس مڑی تھی۔
"آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔" اس کے پوچھنے پر کومل یکدم سٹپٹا گئی۔
"ٹھیک ہوں۔"
"ماشاءاللہ بڑی جلدی ٹھیک ہوگئی ہیں۔" وہ متبسم سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"تھوڑی دیر پہلے ٹیبلٹ لی تھیں۔"
"او کے اچھی بات ہے، جا سکتی ہیں آپ۔" آذر نے نارمل سے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے اجازت دی اور کومل سر ہلا کر وہاں سے چلی گئی تھی؛ جودت اور جویریہ پودوں کی اوٹ میں کھڑے کومل کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔
"یہ لو ذلیل انسان۔" اس نے چابی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔
"ذلیل انسان نے آپ کی ملاقات کروادی اور کیا چاہیے آپ کو؟" جودت اسے چھیڑتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھا تھا اور پھر انہیں ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا۔ حویلی میں اب مدحت، انیہ اور علیزے ہی رہ گئی تھیں۔
مدحت اور انیہ اپنے تمام ڈریسز سوٹ کیسز میں پیک کروا کے بیگ میں رکھوا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ماسک اور مساج بھی جاری تھے، جبکہ علیزے ان سب چیزوں سے بے نیاز تھی، اسے نہ تو کسی ماسک اور مساج کی ضرورت تھی اور نہ ہی بیوٹی پارلر کی اور اس کے ڈریسز بھی پہلے سے ہی اتنے موجود تھے کہ وہ مہینہ بھر بھی کہیں رہنے کے لیے جاتی تو روز نیا ڈریس زیب تن کر سکتی تھی، اس لیے باقی سب کے مقابلے میں وہ کافی ریلیکس اور سکون میں تھی، البتہ اسے اپنے ملازموں کا کافی خیال تھا، اس نے بہتو کو پیسے دے کر شاپنگ کے لیے بھیجا ہوا تھا، لیکن کوشش کے باوجود اسے منصور حسین کہیں بھی دکھائی نہیں دیا اور اسی کو ڈھونڈنے کے خیال سے وہ باہر نکل آئی تھی۔

"السلام علیکم آذر بھائی۔" علیزے آذر کو دیکھ کے وہیں چلی آئی تھی۔
"وعلیکم السلام آؤ بیٹھو۔" آذر کے چہرے پہ خوشگوار حیرت چھا گئی تھی۔
"آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟" علیزے اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔
"میں اکیلا کب ہوں؟" آذر نے دلچسپی سے مسکرا کے کہا۔
"کیا مطلب؟ کون ہے آپ کے ساتھ؟"
"تم....."
"میں.....؟" علیزے نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیران ہوئی، لیکن پھر اس کی بات سمجھ کر مسکرا اٹھی۔
"اوہ تو آپ ابھی کی بات کر رہے ہیں؟"
"شاید....."
"ہوں لگتا ہے کافی خوشگوار موڈ میں ہیں۔"
"ہنڈرڈ پرسنٹ۔" آذر نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ریزن.....؟" علیزے نے فوراً پوچھا۔
"وداؤٹ ریزن۔"
"آئی کانٹ بلیو اٹ۔" وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔
"بلیو می۔" آذر نے مسکرا کے کہا۔
"او کے بٹ۔"
"اپنی دے سویٹ ہارٹ، تم یہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کس کام سے آئی ہو۔" آذر نے بات بدلی۔
"آپ سے ڈرائیور کا پوچھنے آئی تھی۔"
"کس ڈرائیور کا؟"
"اپنے ڈرائیور کا۔"

"او و منصور حسین کا؟"

"جی اسی کا پوچھنے آئی ہوں، کہاں ہے وہ؟ صبح سے ڈھونڈ رہی ہوں؟"

"گاڑی سروس کروانے گیا ہوا ہے، تھوڑی دیر تک آجائے گا، کوئی کام ہے کیا؟"

"نہیں کچھ خاص کام نہیں ہے، بس اسے مارکیٹ بھیجنا ہے۔" علیزے نے کندھے اچکائے۔

"تمہاری تیاری مکمل ہوگئی۔"

"نہیں پینٹنگ ابھی کرنی ہے، رجو مارکیٹ سے آئے گی تو پینٹنگ کردے گی۔"

"او و منصور حسین بھی آگیا۔" آذر کی نظر گیٹ کی سمت اٹھی تھی اور چمکتی دمکتی لشکارے مارتی مرسڈیز گیٹ سے اندر آتی کی منصور حسین گاڑی سے اترا ہی تھا کہ آذر نے اشارے سے قریب بلا لیا تھا، وہ بھاری قدم اٹھاتا سبز گھاس بوٹوں تلے روندتا ہوا ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم صاحب۔"

"وعلیکم السلام! کہاں تھے تم؟"

"جی گاڑی سروس کروانے گیا ہوا تھا۔"

"تو اتنی دیر کیوں لگا دی، دوپہر سے نکلے ہوئے ہو تم۔"

"گاڑی ورکشاپ چھوڑ کر اپنے گھر والوں سے ملنے چلا گیا تھا، اتنے دن ہو گئے تھے گھر گئے ہوئے، کافی اداسی ہو رہی تھی، بیوی اور بابا جی بھی اداس تھے ان سے مل آیا ہوں تو خوش ہو گئے ہیں وہ، کہہ رہے تھے یہ نوکری چھوڑ دو، جس میں تم ہمیں بھی بھول گئے ہو۔" منصور حسین بتاتے ہوئے بھی اداس اور بوجھل بوجھل سا لگ رہا تھا۔ آذر چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ سکا، اتنے میں آذر کا سیل فون بج اٹھا تھا اور وہ کال اٹینڈ کرتا ہوا علیزے سے ایکسکیوز کر کے اٹھ کر ان کی دوسری سائیڈ پہ چلا گیا تھا۔

"کیا تمہارے پاس نئے کپڑے نہیں ہیں؟" علیزے نے پہلی بار منصور حسین کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا تھا، اس کے سستے سے بے رنگ کپڑے علیزے کی طبیعت کے خلاف تھے، وہ تو اپنے ملازموں کو بھی خوشبوؤں میں بسا ہوا دیکھنا چاہتی تھی، فریش اور تازہ دم، منصور حسین دیسے تو صاف ستھرا، دھلا دھلایا سا رہتا تھا، بس اس کے کپڑے پرانے اور بدرنگ سے تھے جن کو وہ ہر بار دھو کر پہنتا تھا، لیکن ان میں پھر بھی کوئی خاص چمک دمک نہیں آئی تھی۔

"نہیں بی بی جی! نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے؟ تین جوڑے ہیں وہ ہی کافی ہیں، کل صاحب سے تنخواہ ملی تھی وہ آج اپنے گھر والوں کو دے آیا ہوں ان شاء اللہ آئندہ تنخواہ ملی تو نیا جوڑا لینے کی کوشش کروں گا۔"

"یعنی نیا سوٹ لینے کے لیے مہینہ بھر انتظار کرو گے۔"

"جی تو اور کیا کروں؟" منصور حسین کے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تم ایسا کرو کہ ابھی مارکیٹ جاؤ اور اپنے لیے کپڑے لے کر آؤ، پیسے میں تمہیں دیتی ہوں۔" علیزے کی بات پہ منصور حسین بری طرح چونک کر اپنی علیزے بی بی کی طرف دیکھا تھا کہ یہ فیاضی جتلا رہی ہے؟

"کپڑے؟" منصور حسین کو یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں کپڑے! رجو کو بھی بھیجا ہے، وہ بھی اپنے کپڑے لینے گئی ہوئی ہے، تم بھی جا کر لے آؤ۔" علیزے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی منصور حسین کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

"لیکن بی بی جی کپڑے کس لیے لینے ہیں؟" وہ ناسمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا کل صبح نرپ پہ نہیں جانا؟"

"جی ہاں جانا ہے۔"

"تو اسی لیے تمہیں اور رجو کو کہہ رہی ہوں تاکہ تم دونوں بھی نئے کپڑے لے لو، سب نے نئے کپڑے لیے ہیں، رجو بھی چلی گئی ہے، صرف تم رہ گئے ہو۔" علیزے کو اب اپنے ڈرائیور کی فکر تھی کہ وہ نئے کپڑوں میں نہیں ہوگا تو برا لگے گا۔

"او و اچھا تو اس لیے کہہ رہی ہیں آپ؟" منصور حسین دھیما پڑ گیا تھا۔

''ہوں آؤ میرے ساتھ۔'' علیزے کہتی ہوئی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھی تھی اور منصور حسین نے بے دلی سے قدم اس کے پیچھے ہی بڑھا دیے تھے۔

وہ آگے آگے چلتی ہوئی چھوٹے سے پل سے گزر کر لان کراس کر کے مین ڈور کے سامنے والے حصے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اندر کوریڈور میں داخل ہوئی تھی اور منصور حسین بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب جا کر علیزے ٹھہر گئی۔

''تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ کہہ کے سیڑھیاں چڑھ گئی اور منصور حسین وہیں کا وہیں اسٹچو بن کے کھڑا ہو گیا تھا، لیکن ابھی چند سیکنڈ گزرے ہی تھے کہ وقار آفندی اور عائشہ آفندی دونوں بہن، بھائی ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے تھے منصور حسین، وقار آفندی کے ساتھ چلتی سادہ اور نفیس سے لباس میں ملبوس اس خوبصورت اور گریس فل سی عورت کو دیکھ رہا تھا، جس سے بات کرتے ہوئے وقار آفندی کے چہرے پہ شفقت اور ملائمت بالکل اسی طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے علیزے سے بات کرتے ہوئے ان کی پوری شخصیت پہ طاری ہو جاتی تھی، وہ عورت جو بھی تھی اس کی شخصیت بھی وقار آفندی سے کم نہیں تھی، ان کی تمکنت، ان کا وقار ان کی چال ڈھال سے ہی جھلک رہا تھا۔

''یہ یقیناً بڑے صاحب کی بہن ہوں گی؟'' منصور حسین نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔

''سلام صاحب۔'' اتنے میں وہ دونوں قریب آ چکے تھے، اس لیے منصور حسین کو فوراً سلام کرنا پڑا۔

''والسلام! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

''وہ علیزے بی بی نے بلایا تھا۔''

''کیوں؟''

''شاید کہیں بھیجنا ہے۔''

''اوہ اچھا اچھا اس نے تمہیں کپڑے لینے کے لیے بھیجنا ہو گا؟ صبح سے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔'' وقار آفندی کو جیسے یاد آ گیا تھا۔

''جی..... شاید اسی لیے۔'' منصور حسین نے سر ہلایا۔

''ہوں ٹھیک ہے، لیکن گاڑی سروس کروائی تم نے؟''

''جی کروالی ہے۔''

''سامان وغیرہ چیک کیا؟''

''نہیں صاحب! سامان رات کو چیک کروں گا اور رات کو ہی رکھ لوں گا۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' وہ بھی اس کی بات سمجھ چکے تھے کہ ایسا کام سب کے سامنے کرنا ٹھیک نہیں، وہ رات کو ہی سب دیکھ کر لیتا تو ہی ٹھیک ہو گا۔

''اور ان سے ملو، یہ علیزے کی اکلوتی پھوپھی اور ہماری اکلوتی ہمشیرہ ہیں، عائشہ آفندی، یہ بھی ٹرپ پہ ساتھ جائیں گی، ان کا بھی خیال رکھنا۔'' منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا، اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، وہ وقار آفندی کی بہن ہی تھیں۔

''سلام بیگم صاحب۔'' اس نے مرعوب سے انداز میں سلام کیا، حالانکہ وہ مرعوب ہوتا نہیں تھا۔

''والسلام! کون ہے یہ؟'' عائشہ آفندی نے وقار آفندی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''علیزے کا ڈرائیور ہے منصور حسین۔'' انہوں نے سرسری بتایا۔

''منصور حسین؟'' عائشہ آفندی نے زیرلب دہراتے ہوئے اسے سرتاپا دیکھا تھا وہ واقعی کڑیل جوان مرد تھا، وہ کتنا بہادر اور کتنا مضبوط تھا، یہ اسے دیکھ کر ہی احساس ہو جاتا تھا، لیکن پھر بھی آنکھیں اور گردن جھکائے کھڑا تھا۔

''ڈرائیور! یہ لو پیسے۔'' علیزے کی مداخلت پہ تینوں نے چونک کر دیکھا تھا۔

''پیسے.....؟'' منصور حسین کی تنخواہ کے علاوہ پیسے لینا ہمیشہ ہی عجیب لگا تھا اس کا ضمیر ہی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کوئی اس پہ ترس کھائے یا ہمدردی کرے۔ وہ بس محنت کر کے کھانے پہ خوش ہوتا تھا اس کے لیے یہی کافی تھا کہ صاحب نے اسے نوکری دے دی تھی۔

''ہاں..... جاؤ جا کر اپنے کپڑے لے آؤ۔'' علیزے نے اسے پیسے تھماتے ہوئے کہا، منصور حسین نے وقار آفندی کو دیکھا۔

''ہاں منصور حسین رکھ لو اور جا کر کپڑے خرید و، تمہارے کپڑے خاصے پرانے ہیں۔'' انہوں نے بیٹی کی ہاں میں ہاں ملائی۔
''ٹھیک ہے صاحب اور بی بی مہربانی آپ۔'' وہ سر ہلا کر کہتا ہوا ان تینوں کو اللہ حافظ کہہ کے کوریڈور کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے مطمئن سی ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

♥

''گڈ مارننگ ڈیڈ۔'' وقار آفندی اس وقت ڈائننگ ہال میں عون اور عدید کے ساتھ اکیلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جب آذر بھی وہیں چلا آیا تھا۔
''مارننگ مائی سن مارننگ آؤ بیٹھو۔'' انہوں نے اپنی بائیں سائیڈ والی کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا، کیونکہ دائیں سائیڈ پہ عون اور عدید بیٹھے ہوئے تھے۔
''باقی سب کہاں ہیں؟'' آذر کو صبح صبح ڈائننگ ہال میں پھیلے سناٹے پہ حیرت ہوئی تھی۔
''سب اپنی اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہے ہیں۔'' عدید نے شرارت سے جواب دیا تھا، جس پہ وقار آفندی اور آذر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔
''گڈ مارننگ ڈیڈ۔'' کومل کی آواز پہ ان چاروں نے بیک وقت سر اُٹھا کر ڈائننگ ہال کے داخلی دروازے کی سمت دیکھا، وائٹ اور فیروزی بارڈر والی وائٹ لانگ شرٹ اس کے پاؤں کو چھو رہی تھی، لائٹ سے میک اپ اور جیولری کے ساتھ اس کی تیاری بھی کمال کی تھی، آذر نے سرسری سا ہی لیکن اسے سر تا پا دیکھا تھا اور کومل کی کھڑے کھڑے ہی اپنی تیاری پہ کی گئی محنت وصول ہو گئی تھی۔
''سیم ٹو یو بیٹا! بیٹھو نا، ناشتہ کرو۔'' انہوں نے آذر کے برابر والی کرسی کی سمت اشارہ کیا، لیکن وہ اس کے برابر بیٹھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اس لیے عون اور عدید کے برابر بیٹھ گئی۔
''گڈ مارننگ۔'' جویریہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔
''گڈ مارننگ ڈیڈ۔'' احمد اور حماد بھی چلے آئے۔
''گڈ مارننگ ڈیڈ۔'' حرمت، مدحت، جویریہ اور انیہ بھی ایک ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ پورا ہال فل ہو گیا۔ اسرار آفندی اور ثروت بیگم بھی آ چکے تھے، البتہ شمرہ بیگم اور اظہار آفندی گھر پہ نہیں تھے۔ وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔
''گڈ مارننگ پاپا۔'' اتنی بہت ساری آوازوں میں علیزے کی نرم سی آواز اُبھری تو ساری آوازیں تھم گئی تھیں۔
''ارے پاپا کا بیٹا، پاپا کا جانو آ گیا۔'' وقار آفندی نے بازو وا کر دیے تھے، آج علیزے گھر سے باہر جا رہی تھی، اس لیے ان کا انداز ان کا لہجہ بے حد والہانہ سا تھا۔ علیزے ان کے سینے سے لگ گئی۔
''بس کریں پاپا! علیزے آپی اکیلی تو نہیں جا رہیں؟ باقی سب بھی تو جا رہے ہیں۔'' عون نے انہیں ٹوکا۔
''باقی سب تو نہیں نہ کہیں جاتے ہی رہتے ہیں، لیکن میرا بچہ تو پہلی بار جا رہا ہے۔'' وقار آفندی نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔
''تو پھر آپ اپنے بچے کو یا تو گھر پہ رکھ لیں یا پھر خود ساتھ چلے جائیں۔'' آسیہ آفندی نے بھی خفگی سے مداخلت کی تھی، جس پہ وہ سب ہنس پڑے تھے اور اسی ہنسی مذاق میں انہوں نے ناشتہ کیا اور روانگی کے لیے اپنی گاڑی تک پہنچ گئے۔
جانے سے پہلے وقار آفندی نے رجو اور منصور حسین کو بلا کر ایک بار پھر ہدایات جاری کی تھیں اور تب ان سب کو رخصتی کا پروانہ دیا تھا وہ سب اپنا اپنا سامان پہلے ہی گاڑیوں میں رکھوا چکے تھے، اس لیے سب سے مل کر اپنی اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے تھے۔ البتہ وقار آفندی، علیزے کو خود گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ رخصت ہوئی تو وہ اندر گئے تھے۔

♥

چار گاڑیوں پہ مشتمل یہ قافلہ انجان اور ان دیکھی منزل کی سمت گامزن تھا، سب سے آگے علیزے کی گاڑی تھی جس میں منصور حسین، رجو اور علیزے تھے، اس کے پیچھے آذر کی گاڑی تھی جس میں وہ چاروں بہن بھائی تھے۔ آذر، جویت، حرمت اور مدحت۔ ان کے پیچھے احمد کی گاڑی تھی جس میں وہ پانچوں بہن، بھائی موجود تھے۔ احمد، حماد، کومل، جویریہ اور انیہ اور سب سے آخر میں دانیال کی

گاڑی تھی جس میں دانیال، زین، انوشہ اور ان کی والدہ محترمہ عائشہ آفندی تھیں۔

عائشہ آفندی اکثر بیمار رہتی تھیں، جس کی وجہ سے ڈاکٹرز اکثر ہی انہیں آب و ہوا تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے تھے، لیکن وہ اپنے بھائیوں کے اصرار کے باوجود بھی کبھی شہر سے باہر نہیں گئی تھی، لیکن اس بار جب سب بچوں نے ہالی ڈیز منانے کا پروگرام بنایا تو وقار آفندی نے باقاعدہ انہیں بلا کر ساتھ جانے کا مشورہ دیا تھا اور اس بار چاہتے ہوئے بھی وہ انکار نہیں کر پائی تھیں کہ اب وہ اکیلی نہیں تھیں، سب بچے ساتھ تھے اور یہی احساس ان کی طبیعت کو اور بھی تازگی بخش گیا تھا، وہ ساتھ چلنے کے لیے مان گئی تھیں اور اب انجوائے بھی کر رہی تھیں اور انجوائے تو علیزے بھی کر رہی تھی جیسے ہی گاڑی لاہور کی ہنگامہ خیز سڑکوں سے نکل کر موٹروے پر آئی تو ان سب کی طبیعت پہ خوشگوار سا اثر پڑا تھا۔

"علیزے بی بی۔" رجو نے بے ساختہ اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں؟" علیزے گاڑی سے باہر کے مناظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ پہلی بار مری جا رہی ہیں؟" رجو کو چپ چپ سا عذاب لگ رہا تھا۔ جب ہی بولنے کے لیے راستہ نکالا۔

"ہاں پہلی بار جا رہی ہوں۔" علیزے نے اثبات میں جواب دیا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا ڈرائیور کرتا منصور حسین ان دونوں کے سوال جواب بآسانی سن رہا تھا۔

"تو آپ پہلے کبھی کیوں نہیں گئیں؟ حالانکہ امیر لوگوں کے بچے تو ہمیشہ گرمیوں میں ہالی ڈیز منانے مری ضرور جاتے ہیں۔" رجو کو سب پتا بھی تھا، پھر بھی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

"وہ امیر لوگوں کے بچے ہوتے ہیں، بڑی حویلی کے نہیں۔" رجو، علیزے کے جواب پہ متاثر تو ہوئی، لیکن چپ نہیں ہوئی۔

"بے شک بڑی حویلی کے بچوں پہ پابندی ہے، لیکن علیزے بی بی آپ پہ تو کوئی بھی پابندی نہیں ہے۔ آپ تو ہر جگہ جا سکتی ہیں۔"

"ارے تمہیں کس نے کہا کہ مجھ پہ کوئی پابندی نہیں ہے؟ مجھ پہ جتنی پابندیاں ہیں کبھی میرے پاپا سے تو پوچھو، وہ بھی تمہیں بتائیں گے۔" علیزے کو رجو کی کم عقلی پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"لیکن علیزے بی بی! وہ پابندی تو نہ ہوئی نا؟ وہ تو احتیاط ہے، بڑے صاحب کو پتا ہے کہ آپ ذرا ذرا سی بات کا اثر لے لیتی ہیں، طبیعت خراب ہو جاتی ہے، آپ کی نازک مزاجی کے لیے ہی تو احتیاط کرتے ہیں وہ؟"

"مجھے نازک مزاج بھی تو انہوں نے ہی بنایا ہے نا۔" علیزے ہلکے سے مسکرائی تھی اور رجو کے ساتھ ساتھ منصور حسین نے بھی دل ہی دل میں اس کی بات کی تائید کی تھی، منصور حسین کو کچھ عرصہ ہوا تھا اس حویلی میں آئے ہوئے، لیکن وہ اس کچھ ہی عرصے میں جان چکا تھا کہ اس پوری حویلی میں جو اہمیت علیزے بی بی کی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہے، اس کا رعب حسن شہزادیوں سے کم نہیں تھا، وہ بڑی حویلی کی ریاست کی شہزادی تھی اور شہزادیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی، منصور حسین کو کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس چھوٹی سی لڑکی میں آخر ایسا کیا تھا جو اسے باقی سب سے ممتاز اور منفرد بناتا تھا۔

شاید کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی تھی، لیکن وقار آفندی کے دو بیٹے بھی تو تھے، انہیں تو کبھی ایسا پروٹوکول نہیں ملا تھا جیسا علیزے کو ملتا تھا۔ یا پھر یہ کہ وہ سب کزنز سے چھوٹی تھی، لیکن نہیں، بات تو پھر وہیں پہ آ جاتی تھی کہ چھوٹے تو عون اور عدید بھی تھے جو علیزے سے بھی چھوٹے تھے اور ایسے ناز نخرے تو کبھی ان کے بھی نہیں اٹھائے گئے، جیسے ہر روز علیزے کے اٹھائے جاتے تھے؟ یا پھر یہ کہ اسے چاہیے کہ اس سارے پروٹوکول کی وجہ اس کی حد درجہ خوبصورتی تھی، ایسی خوبصورتی جو منصور حسین نے اپنی انتیس سالہ زندگی میں آج تک نہیں دیکھی تھی، بلکہ جو دیکھی تھی وہ ساری خوبصورتی ایک طرف اور علیزے آفندی کی خوبصورتی ایک طرف تھی، بلکہ پھر بھی دیکھا جاتا تو علیزے کے حسن کا پلڑا بھاری ہی رہتا، کیونکہ وہ بلا شک و شبہ ایک حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت سے لے کر زعفرانی ہونٹوں تک دلکشی کی بہاریں بکھیرتی نظر آتی تھیں، اس کے معصوم رخساروں پہ کبھی دلوں کی دھڑکنیں بوسہ دیتی تھیں اور کبھی دل اس کی نوک پلک پہ ٹھہر جاتے تھے، شفاف سی شفاف آنکھوں میں کوئی اپنا عکس دیکھ لیتا تو اپنی دنیا ہار دیتا اور اسی دنیا کے خوف سے وقار آفندی اسے چھپا کے، سنبھال سنبھال کے رکھتے تھے اور اسے، یہ کہہ کر یہ اعتراف کرتا پڑتا تھا کہ واقعی وہ ایسی چیز تھی جس کی حفاظت کرنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسے سیانت سینت کے رکھا جاتا اور الگ پروٹوکول دیا جاتا، لیکن حیرت کی بات تھی کہ

ں بار وقار آفندی نے اسے چھپا چھپا کے رکھنے کے بجائے سب کے ساتھ ٹرپ پہ بھیج دیا تھا۔

"تو پھر صاحب نے آپ کو ٹرپ پہ کیوں بھیج دیا؟" منصور حسین کے ذہن میں آئے سوال کو رجو نے زبان دے دی۔

"وہ تو اب بھی نہیں بھیج رہے تھے، بس میں نے تھوڑی ضد کی اور تھوڑا آذر بھائی نے ساتھ دیا تو مجبوراً انہیں ماننا پڑا۔" علیزے کی ایک اور بڑی خوبی تھی کہ وہ حد سے زیادہ معصوم اور سادہ تھی، نیک نیت اور صاف دل لڑکی تھی، رجو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی معصومیت ہنوز تھی۔

"بڑے صاحب آپ سے پیار بھی تو بہت کرتے ہیں، ان کی تو جان ہے آپ میں۔" رجو نے مسکرا کے کہا تھا۔ جواباً علیزے بھی مسکرائی۔

"میری بھی جان ہے ان میں، ان جیسا باپ کوئی ہو ہی نہیں سکتا، وہ ہیں تو میں ہوں، میرے پاپا میرا فخر ہیں۔" علیزے کے چہرے پہ محبت کے سائے اُتر آئے تھے اور وہ بے ساختہ اپنا سیل فون اُٹھا کر انہیں میسج لکھنے لگی اور پھر "آئی مس یو اور آئی لو یو" کے کئی میسج ایک ساتھ وقار آفندی کے نمبر پہ سینڈ کروا لے تھے، جن کے فوری بعد ان کی کال آ گئی تھی۔

"ریلی پاپا! میں پہلی بار شہر سے باہر جا رہی ہوں، بہت عجیب بھی لگ رہا ہے اور بہت اچھا بھی، لیکن اس کے باوجود میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں، ابھی رجو کے ساتھ بھی آپ کی ہی باتیں کر رہی تھی۔" علیزے شاید پہلی بار اتنے جوش سے بول رہی تھی، دوسری طرف وقار آفندی ہنس رہے تھے کہ ان کی بیٹی کو باہر جا کر بولنا آ گیا ہے۔

"آئی لو یو پاپا۔" علیزے نے بے ساختہ اظہار کیا تھا اور اس کے ایسے پُرجوش سے انداز پہ منصور حسین نے بلا ارادہ ہی اسے دیکھ لیا تھا، وہ بے پناہ خوش تھی اور سچی خوشی کے رنگ اس کے پورے چہرے پہ بکھرے ہوئے تھے۔

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" منصور حسین نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی، کیونکہ آذر پیچھے سے ہارن پہ ہارن دے رہا تھا۔

♥

"نگارش... نگارش... کہاں ہو؟ یہ دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے؟" شام سات بجے عبداللہ گھر آیا تو گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا، جس پہ اسے اچھی خاصی تشویش ہوئی تھی۔

"نگارش..." وہ نگارش کو پکارتا ہوا آ رہا تھا۔

"کہاں ہو تم؟ اور یہ دروازہ..." جیسے ہی عبداللہ نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا اس کی زبان کو بریک لگ گئے تھے۔ کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا، ناقابلِ یقین۔

ملک اسد اللہ اپنی پختی اور جاہ و جلال سمیت سامنے ہی صوفے پہ براجمان تھے اور ان کے مقابل والے صوفے پہ زری اور نگارش خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھیں، یوں جیسے انہوں نے بادی بنا کے بھار رکھا ہو۔ لیکن اس ساری پاکیوزیشن سے ہٹ کے عبداللہ مرد تھا، مضبوط اعصاب کا مالک، اس نے چند سیکنڈ میں ہی اپنے تمام تاثرات کو درکر لیے تھے، وہ کوئی بھی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ ظاہر کر کے انہیں خود پہ حاوی ہونے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے گھبراہٹ کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے حیرت کے باوجود بھی اپنی حیرت ظاہر نہیں کی تھی، بلکہ ایک دم پُرسکون اور مطمئن سا نظر آنے لگا تھا، تب ہی قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"السلام علیکم۔" وہ اس سے مخل گیر ہونے کے لیے نہیں اُٹھے تھے بس ہاتھ ملا کر مصافحہ کرنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"والسلام! کیسے ہو؟"

"اللہ کا احسان ہے، ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ سنائیں آج ہمارے غریب کدے کو رونق کیسے بخش دی؟" عبداللہ بریف کیس بھی ساتھ پڑے صوفے پہ پھینک چکا تھا۔

"یہ پاکستان میں گرمی اور لوڈ شیڈنگ ہو رہی تھی اس لیے سوچا ہم بھی ذرا انگلینڈ کی فضاؤں سے لطف اُٹھا لیں۔" وہ صوفے سے ٹیک لگائے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولے تھے۔

"اور یقیناً آپ نے ابھی تک انگلینڈ کی فضاؤں سے لطف نہیں اُٹھایا ہو گا؟" عبداللہ خفیف سا مسکرایا تھا۔

"اُٹھائیں گے، سارے لطف اُٹھائیں گے، پہلے تم لوگوں سے مل تو لیں۔" ان کا انداز مبہم سا تھا۔

"تو کے انا بھی ہوتا رہے گا۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ کھانا وغیرہ کھایا آپ نے؟" عبداللہ ساری باتیں چھوڑ کے مہمان نوازی پہ اتر آئے۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے کھانے کی، کھانا ہم وہیں سے کھائیں گے جہاں سے پچھلے دو دن سے کھا رہے ہیں۔" انہوں نے انکار کر دیا۔
"یعنی آپ کو یہاں آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں؟" عبداللہ نے پوائنٹ کی بات نوٹ کی تھی۔
"بالکل....."
"تو دو دن پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے؟"
"بس کوئی ضرورت کام نہ بنانا تھا۔"
"تو بنا گیا کام؟"
"ایک بنا گیا ہے اور ایک رہ گیا ہے۔" انہوں نے کہتے ہوئے نظریں زری پہ جما دی تھیں اور عبداللہ ان کی بات اور ان کی نظروں کا مفہوم بآسانی سمجھ گیا تھا۔
"جو رہ گیا ہے اسے رہنے ہی دیں۔"
"کیوں؟ آخر کیوں رہنے دیں؟"
"کیونکہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔" عبداللہ نے تھلم کھلا انہیں دھمکی دی تھی اور ان کا جبڑے بھینچے خون کھول اٹھا تھا۔ وہ یکدم دھاڑ اٹھے تھے۔

♥

تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو ہمیں؟ ملک اسد اللہ کو؟" ان کی بلند اور گرجدار آواز در و دیوار ہلا دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس وقت تو ان کی آواز نے در و دیوار کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا، کیونکہ ان کی خونخوار آنکھوں میں حقیقتاً خون اترا ہوا تھا وہ تو جیسے ان تینوں کو اپنی آنکھوں سے ہی نگل جانے کے درپے ہو رہے تھے اور ان کا پہلا ہدف عبداللہ ہی تھا۔
"ہمارے درمیان ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی جس پہ میں آپ کو دھمکی دوں گا۔" عبداللہ نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔
"بات نہیں ہوئی لیکن تم نے بات کا اشارہ ضرور دیا ہے۔" وہ غصے سے چبا کر بولے تھے۔
"اوہ تو آپ اشارہ بھی سمجھتے ہیں؟" اس نے حیرانی کا اظہار کیا جس پہ ملک اسد اللہ اور بھی بھڑک اٹھے۔
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ان کا مزاج برہم اور تیور خاصے خطرناک ہو رہے تھے۔
"آپ خود سمجھدار ہیں، میرا اشارہ سمجھ چکے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں بالکل ایسے جیسے میں آپ کا اشارہ سمجھ چکا ہوں، کیونکہ میں بھی آپ کا ہی بھائی ہوں، سمجھداری ورثے میں ملی ہے۔" عبداللہ کا اطمینان اور سکون برقرار تھا۔
"لیکن تمہاری سمجھداری کا وقت ختم ہو چکا ہے، اب ہماری باری ہے، اب وہی ہوگا جو ہماری سمجھداری کہے گی۔" انہوں نے دائیں ہاتھ سے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو پھر کیا کہتی ہے آپ کی سمجھداری؟ کیا ہونا چاہیے؟" وہ بھنویں سکیڑتے ہوئے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"بتائیں تمہیں کہ ہماری سمجھداری کیا کہہ رہی ہے؟" وہ سختی سے پوچھ رہے تھے۔
"جی حضور! میں ہمہ تن ہوش ہوں۔" عبداللہ نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔
"تم دونوں اندر جاؤ۔" انہوں نے زری اور نگارش کو بیڈ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔
"نہیں یہ دونوں کہیں نہیں جائیں گی، یہیں رہیں گی، یہ دونوں پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکیاں ہیں، چھوٹی بچیاں نہیں ہیں کہ ان سے کوئی بڑی بات چھپائی جائے، آپ نے جو بات کہنی ہے صاف صاف کہیے، ہم سب سن رہے ہیں۔" عبداللہ نے ان دونوں کو جانے سے روک دیا تھا حالانکہ زری وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی اس کی جان سولی پہ لگی ہوئی تھی وہ ایسی ٹینشن چوائس فیس نہیں کر سکتی تھی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن نگارش وہاں سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ ان دونوں بھائیوں کی جنگ لائیو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ معاملہ بہت نازک اور گمبھیر ہو چکا تھا۔

"تم سب سن نہیں رہے بلکہ یہ کہو کہ تم سب بے حیا ہو گئے ہو، بے غیرت ہو گئے ہو تم۔" وہ عبداللہ کی سمت دیکھتے ہوئے غضبناک انداز میں دھاڑے تھے۔

"خبردار بھائی صاحب! بہت ہو گئی عزت اور غیرت کی تکرار..... میں آپ کو مزید اپنی انسلٹ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں اگر بے غیرت ہوں تو آپ کہاں کے غیرت مند ہیں؟ کیا ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی بہن کا ہاتھ تھما دینا غیرت کہلاتا ہے آپ کی نظر میں، وہ ملک حق نواز جو سات سال پہلے آپ کی ہمشیرہ شہرین بی بی کا ہاتھ آپ کی کوشش کے باوجود حاصل کار چکا ہے، ٹھکرا چکا ہے آپ کی بہن کو اور آپ اب اسی ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی دوسری بہن کا ہاتھ تھمانا چاہتے ہیں؟ کیا یہی غیرت مندی کا ثبوت ہے کیا میں بھی آپ جیسا غیرت مند بن جاؤں؟ نام نہاد غیرت مند، جس نے اپنی جاگیر اور اپنی پارٹی بڑھانے کے لیے اپنی بہنوں کی زندگیاں برباد کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنی بہنوں سے کوئی ذاتی پرخاش تھی تو آپ کو چاہیے تھا کہ آپ انہیں زہر دے کر مار دیتے کم از کم وہ ایسی ذلت کی زندگی جینے سے تو بچ جاتیں۔" اب کی بار عبداللہ نے جواب دیا تو انہی کے سے انداز میں، دو سیر کو سوا سیر ثابت ہوا تھا۔

"جس کی قسمت، جس کا مقدر جہاں لکھا ہو گا وہیں شادی ہو گی نا؟ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہر انسان کا نصیب تو پہلے سے لکھا جا چکا ہے۔" ملک اسد اللہ نے جیسے دامن جھاڑا تھا اور سارا الزام ان کی قسمت اور ان کے نصیب کے ذمے ڈال دیا تھا۔

"ہونہہ اگر ہر انسان کا نصیب اس کا مقدر پہلے سے لکھا جا چکا ہے تو پھر آپ کو اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ مقدر پہ چھوڑ دیں، جو جس کا مقدر ہو گا اسے مل جائے گا۔" عبداللہ نے انہیں لاجواب کر ڈالا تھا لیکن وہ پھر بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

"لیکن زرین ملک کا نصیب ملک حق نواز کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور اس نصیب کو جڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا، نہ تم نہ کوئی اور۔" انہوں نے اک قہر بھری نظر عبداللہ پہ اور دوسری زری پہ ڈالی تھی وہ ساکت و صامت سی بیٹھی تھی، ملک حق نواز کا نام اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر تا تھا، شہرین کو ٹھکرانے والے کے ساتھ زرین کو جوڑا جا رہا تھا، یہ رشتہ تھا یا عمر بھر کا پھندا؟

"ملک حق نواز ایک بار مرے اور دوبارہ پیدا ہونے کے بعد ہر گناہ سے پاک صاف ہو کر بھی سامنے آئے تو میں تب بھی اپنی بہن کا نصیب اس کے ساتھ جڑنے نہیں دوں گا، آپ چاہے جتنے مرضی جتن کر لیں، زری کی شادی ملک حق نواز کے ساتھ ہرگز نہیں ہو گی، چاہے اس کے لیے آپ مجھے گولی مار دیں۔" عبداللہ نے دو ٹوک کہتے ہوئے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور ملک اسد اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر عبداللہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

"ضد اور انا کا مسئلہ آ جائے تو گولی مارنا ہمارے لیے مشکل بھی نہیں ہے ملک عبداللہ صاحب، سامنے چاہے تم جیسا جوان گھبرو بھائی ہو، چاہے زرین ملک جیسی جوان بہن ہو، ہماری گولی بس نشانہ دیکھتی ہے، رشتہ یا تعلق نہیں دیکھتی۔" انہوں نے عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے دبایا تھا۔

"اور آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ گولی سے ڈرنے والے جراثیم ہم میں بھی نہیں ہیں، اگر آپ حق بات کو ضد اور انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں تو ایسے ہی سہی۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"اسے پاکستان بھیجو، سارے فیصلے خود بخود ہو جائیں گے۔"

"اسے پاکستان بھیجوں گا نہیں، اسے پاکستان لے کر جاؤں گا، خود اپنے ساتھ۔" عبداللہ نے اپنی طرف اشارہ کیا اور ملک اسد اللہ چونک اٹھے تھے وہ خود پاکستان جانے کا کہہ رہا تھا تو گویا وہ واقعی اس مسئلے میں پوری طرح ٹانگ اڑانا چاہتا تھا۔

"تم پاکستان جاؤ گے؟"

"جی آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"تم حویلی میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔"

"تو آپ سے کس نے کہا کہ میں حویلی میں قدم رکھوں گا؟" عبداللہ کا انداز ان سے بھی زیادہ روکھا اور نپا تلا سا تھا۔ وہ اس کی بات پہ ایک بار پھر چونکے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب کیا ہو سکتا ہے بھائی صاحب! مطلب تو سارے آپ کے ہوتے ہیں، آپ لوگوں نے ہی شرط رکھی تھی کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں گا تو تبھی حویلی میں قدم رکھ سکوں گا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں حویلی میں قدم رکھ سکوں، لیکن اس بات پہ تو پابندی نہیں ہے نا کہ میں پاکستان میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔ اتنا بڑا پاکستان آخر کس کام آئے گا؟ پاکستان میں دل آور شاہ اور نہیل حیات کے اپنے گھر ہو سکتے ہیں تو ملک عبداللہ کا اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے اور اس گھر میں ملک عبداللہ کی بہن ساری زندگی بھی رہنا چاہے تو با آسانی رہ سکتی ہے، اپنی بہن کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں میں۔ اللہ کے کرم سے بہت ہم ہے بازوؤں میں، کمزور یا اغر نہیں ہوں۔" عبداللہ نے انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا تھا اور وہ تپ گئے تھے۔

"تم غلط کر رہے ہو ملک عبداللہ، اپنوں سے ٹکر لینے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے کہ اپنے سے ٹکر نہ لیں تو اچھا ہے، ورنہ نقصان ہی ہوگا۔" وہ بھی ان کی باتوں کے گھیرے میں آنے والا نہیں تھا۔

"ہم یہاں زرین کو لینے کے لیے آئے ہیں اور اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے، تم چاہے کچھ بھی کر لو۔" انہوں نے دانت پیس کے کہا اور اپنا رخ زری کی سمت موڑ لیا تھا۔

"اور تم بھی کان کھول کر سن لو، آج تمہارا پہلا پیپر تھا، اسی لیے ہم آج تمہیں یہی بتانے آئے ہیں کہ ہم تمہارے آخری پیپر کا انتظار کر رہے ہیں، ختم کر دیہ پڑھائی کا کھیڑا اور واپس پاکستان چلو، ورنہ کیا ہوگا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" وہ کہہ کر پلٹے اور ڈرائنگ روم سے نکل گئے تھے عبداللہ چاہنے کے باوجود انہیں روک نہیں سکا تھا اور زری ان کی دھمکی پہ خاک کا ڈھیر ہو گئی تھی اس کا جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا نگاہیں الگ پریشان تھی اور عبداللہ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑا گہری سوچ کا شکار تھا، اسے اپنے سامنے ایک کھلی جنگ نظر آ رہی تھی اور ضد اور انا کی اس جنگ میں کیا نفع تھا کیا نقصان؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔

♥

"بھائی..... کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟" جودت نے سامنے دانت اسکرین پہ نظریں جمائے ڈرائیو کرتے آذر سے سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب؟" آذر نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر جودت کو دیکھا جو اس کے برابر ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔

"مطلب کہ منصور حسین ڈرائیونگ میں کمال کی مہارت رکھتا ہے، اس کی ڈرائیونگ دیکھ رہے ہیں آپ؟ گاڑی روڈ پہ نہیں پانی پہ پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، لگتا ہے بہت ماہر ہے اس چیز میں؟" جودت پچھلے تین گھنٹے سے اس فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا یہی ایک چیز نوٹ کر رہا تھا اور آخر سے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"ہوں میں بھی یہی دیکھ رہا تھا، واقعی بہت مہارت ہے اسے، اور اس کی مہارت نظر بھی آ رہی ہے، جس رش سے گاڑی نکالنا ہمارے لیے بھی مشکل ہو جاتا ہے، وہ وہاں سے بھی با آسانی سے نکل جاتا ہے، اس نے ایک بار بھی گاڑی کے بارڈروں کو ہرٹ نہیں ہونے دیا، بالکل برابر جا رہے ہیں۔" آذر نے بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے جل سے کام نہیں لیا تھا بلکہ کھل کر سراہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی نظریں سامنے روڈ پہ چلتی ملیزے کی گاڑی پہ ہی تھیں جو کبھی کبھی تیز رفتاری کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتی تھی۔

"آخر ڈرائیور کس کا ہے؟ مہارت تو ہوگی؟ ڈیڈ نے بھی تو چن کے ڈرائیور رکھا ہوگا اسے۔" جودت مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

"بھائی....." حرمت نے آذر کو پکارا۔

"جی؟"

"آپ نے کہیں اسٹاپ نہیں لینا۔"

"کیوں؟"

"وہ کومل کو بھوک لگی ہے، کچھ کھانا چاہتی ہے۔" حرمت نے آہستگی سے بتایا۔

"کومل کو بھوک لگی ہے؟ تمہیں کیسے پتا؟ ان کی گاڑی تو پیچھے آ رہی ہے؟" آذر نے سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس نے میرے نمبر پہ میسج کیا ہے۔" حرمت نے کومل کو بتانے کا ذریعہ بتایا۔

"اوہ اچھا" آذر نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

"کومل آپا غصے کی بہت تیز اور بھوک کی بہت کچی ہیں، اس لیے جلدی انتظام کر لیجیے بھائی جی۔" حرمت بے ہنستے ہوئے چھیڑا تھا لیکن آذر اس کی ذو معنی بات کی گہرائی تک نہیں جا سکا تھا بلکہ اس کا انداز بہت سرسری سا تھا۔

"اب تو اسلام آباد پہنچ کر ہی کچھ ہوگا، یہاں نزدیک تو کوئی ریسٹورنٹ نہیں ہے۔" آذر نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اسلام آباد پہنچنے میں کتنا ٹائم ہے۔" حرمت نے کومل کا دوسرا میسج پڑھ کے آذر سے پوچھا تھا۔

"بس تھوڑا ٹائم ہی رہ گیا ہے۔" آذر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اسے تسلی دی تھی۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے اور اسلام آباد کے سیور سے کھانا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔" جودت نے انگڑائی لیتے ہوئے سستی سے کہا۔

"سیور کا کھانا نہیں بریانی مشہور ہے اور بریانی بھی ہر قسم کی۔" آذر نے اس کی بات کی تصحیح کی تھی۔

"جی ہاں میں بھی بریانی کھانے کا ہی کہہ رہا تھا وہاں کی بریانی ہی تو مشہور ہے۔" جودت بھی جانتا تھا کیونکہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ پہلے بھی کئی بار اس طرف آیا تھا اور ہمیشہ وہ لوگ سیور پر ضرور جاتے تھے۔

"چلو پھر آج سیور پہ ہی سہی۔" آذر بھی وہیں جانے پہ آمادہ تھا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی اور ساتھ ہی موبائل اُٹھا کر منصور حسین کو بھی سیور پہ جانے کی اطلاع دی تھی تاکہ وہ اسی سائیڈ پہ ٹرن لے، اس نے سعادتمندی سے اوکے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

♥

سیور سے اپنی پسند کی بریانی کھانے کے بعد ان لوگوں نے بیکرز کا رُخ کیا تھا جو سیور سے زیادہ دور نہیں تھا وہاں کی کولڈ کافی آذر کو بہت پسند تھی وہ جب بھی کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تھا بیکرز سے کافی پیے بغیر نہیں جاتا تھا وہ چاروں گاڑیاں پارکنگ میں پارک کرنے کے بعد گاڑیوں سے اتر آئے تھے البتہ لڑکیاں گاڑیوں میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آذر نے پارکنگ میں پھرتے ویٹرز کو آذر لینے کے لیے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا ویٹرز مینو بک ہاتھ میں لیے الرٹ کھڑے تھے اشارہ ملتے ہی سر خم کر دیا اور فوراً ہی گاڑیوں کی سمت بڑھ گئے، البتہ آذر خود علیزے کی گاڑی کی سمت آ گیا۔ منصور حسین نے آذر کو دیکھتے ہی علیزے کی سائیڈ کا شیشہ نوک کر دیا تھا۔

"کافی پیو گی؟" اس نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے علیزے سے پوچھا۔

"آپ کو پتا ہے میں کافی نہیں پی سکتی، اتنی کڑوا ہٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

"کولڈ کافی ہے یار۔" آذر مسکراتے ہوئے اسے کافی پینے پہ آمادہ کر رہا تھا۔

"ہے تو کافی نا؟" وہ کافی پینے کو تیار نہیں تھی۔

"یار! بہت بزول ہو تم، کافی پینے سے بھی ڈرتی ہو، ایک بار ٹرائی کر کے تو دیکھو۔" وہ اسے اکسا رہا تھا۔

"لو کے لے آئیں۔" بالآخر وہ مان گئی تھی۔

"منصور حسین! تم کیا لو گے؟"

"ضرورت نہیں ہے صاحب جی ابھی تو کھانا کھایا ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"لو کے۔" آذر پلٹ کر اندر چلا گیا احمد، حماد، جودت، دانیال اور زین باتوں میں اس کے پہنچنے تک اپنا آرڈر تیار کروا چکے تھے۔

"ایک کپ علیزے کے لیے بھی۔" دانیال کے ہاتھ سے اپنا کپ تھامتے ہوئے آذر نے دانیال کو ایک اور کپ تیار کروانے کا کہا۔

"علیزے اور کافی..... دو متضاد چیزیں ہیں یار؟" دانیال کو حیرانی ہوئی۔

"آئی تو یار! بٹ میں نے کہا ہے تو وہ ضرور پیے گی۔" آذر کافی کے بڑے سے کپ میں اسٹرا اور اسپون انسرٹ کرتے ہوئے مسکرا کے بولا۔

"اوہ تو وہ تمہارے کہنے پہ کافی پی رہی ہے؟" دانیال نے آذر کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کافی ذو معنی لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں پینی چاہیے؟" الٹا آذر نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

"ارے نہیں نہیں یار! جینی چاہیے ضرور جینی چاہیے، لیکن یار اتنا ضرور یاد رکھنا کہ ابھی آدھا سفر باقی ہے، کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔" دانیال بھی اپنے آفس فیلو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ڈونٹ وری یار! میں نے سوچا وہ پہلی بار ہمارے ساتھ آئی ہے، کھائے پیئے انجوائے کرے، صرف گھومنا پھرنا ہی تو ٹرپ نہیں ہے، اس کے لیے تو کافی ٹینا بھی ایڈوانچر ہی ہوگا۔" آذر، علیزے کو اس ٹرپ کے تمام رنگ قریب سے دکھانا اور انجوائے کروانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے اپنے ساتھ ہر کام میں شامل کیا جاتا چاہے زبردستی اور اصرار کر کے ہی سہی۔

"لیجیے میم! آپ کی کافی۔" آذر نے علیزے کی سائیڈ پہ کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا تھا۔

"تھینکس۔" علیزے نے مسکراتے ہوئے کپ تھام لیا تھا۔

"اوکے انجوائے کرو۔" آذر تمام آرڈر کابل پے کرنے کے لیے واپس پلٹ گیا تھا۔

لیکن جیسے ہی علیزے نے اسٹرا کے ذریعے کولڈ کافی اپنے حلق سے نیچے اتاری تھی اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے اسے یوں لگا جیسے اس نے زہر پی لیا ہو اسے بہت زور کی ابکائی آئی تھی وہ اک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی اس نے منہ میں بھرا ہوا مشروب نیچے انڈیل دیا تھا اور کڑواہٹ کی وجہ سے اس کے منہ کا ذائقہ بھی خراب ہو گیا اور اسے ابکائی آنے لگی تھی اس کی زور زور سے ابکائی کی آواز پہ اندر کی سمت بڑھتا آذر یکدم کرنٹ کھا کے پیچھے کی طرف پلٹا تھا۔

"علیزے....." وہ اسے پارکنگ کے فٹ پاتھ کے قریب جھکی ابکائی کرتی ہوئی نظر آئی تھی اور وہ اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"او مائی گاڈ! یہ میں نے کیا کر دیا؟" وہ اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے لپک کے اس کے قریب آیا تھا تب تک علیزے گاڑی سے نکل کر فٹ پاتھ کے کنارے کو تھام چکی تھی۔

"کیا ہوا علیزے؟ تم ٹھیک تو ہو؟" آذر نے اس کا دوسرا بازو تھام لیا تھا۔

"وہ..... وہ کافی اتنی کڑوی۔" علیزے کو اپنی زبان، اپنا منہ بے حد کڑوا محسوس ہو رہا تھا۔

"رجوا گاڑی سے پانی کی بوتل لے کر آؤ۔" آذر نے رجو کو اشارہ کیا۔

"جی صاحب....." رجو لپک کے گاڑی کے اندر گھس گئی اور فوراً پانی کی بوتل نکال لائی تھی۔

"یہ لو۔" آذر نے ڈھکن کھول کر بوتل اس کی سمت بڑھا دی اور علیزے نے کلی کرنے کے بعد پانی پیا تھا لیکن اس کے منہ کا ذائقہ پھر بھی بہتر نہیں ہوا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" اتنے میں دانیال اور جودت وغیرہ بھی وہیں آ گئے تھے۔ وہ علیزے کی سمت متفکر سی نظروں سے دیکھ رہے تھے آذر نے ایک ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب سے رومال نکال کے اس کی سمت بڑھا رہا تھا نیچے فرش پہ کولڈ کافی کا کپ اوندھا پڑا تھا جس کی وجہ سے فرش گندا ہو رہا تھا عجیب سی پوزیشن تھی یہاں لیکن دانیال بغیر بتائے ہی جان چکا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔

"میں نے کہا تھا نا آذر صاحب! ابھی آدھا سفر باقی ہے؟" دانیال نے اسے متوجہ کرتے ہوئے چوٹ کی تھی اور کافی پھینکنے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"یہ باتیں بعد میں کرنا پہلے اس کے لیے جوس لے کر آؤ۔" آذر نے دانیال کو گھور کے دیکھا تھا اور دانیال مسکرا دیا۔" کندھے اچکا کر پلٹ کے اندر چلا گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے علیزے کو.....؟" عائشہ آفندی ان کو علیزے کی گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر اپنی گاڑی سے اتر آئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا پھوپھو! ٹھیک ہے یہ۔" آذر خود ہی سب کو تسلیاں دے رہا تھا کیونکہ غلطی اس سے ہوئی تھی اس لیے ٹینشن بھی اسی نے کرنی تھی اور علیزے، آذر کے چہرے کے گھبرائے ہوئے تاثرات دیکھ کر اس کی پریشانی سمجھ گئی تھی اس لیے اسے اپنی گھبراہٹ اور پریشانی سے نکالنے کے لیے اسے اپنا آپ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔

"لیکن کچھ تو ہوا ہے نا؟" عائشہ آفندی بھی پریشان ہو چکی تھیں۔

"اٹس او کے پھوپھو! میں بالکل ٹھیک ہوں، بس یہ تھوڑی سی کافی پی ہے تو اچھی نہیں لگی، اس لیے آذر بھائی نے اب جوس منگوایا ہے۔" علیزے نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے خود انہیں تسلی دی تھی۔

"یہ لیجیے جناب جوس حاضر ہے۔" دانیال جوس لے کر بہت جلدی واپس آیا تھا۔

"تھینک یو....." علیزے نے مسکراتے ہوئے کہا اور جوس کا مگ تھام لیا تھا۔

"اسی طرح مسکراتی رہا کرو یار! تمہاری ذرا سی تکلیف ہماری جان نکال دیتی ہے۔" دانیال بھی جواباً مسکرا کے بولا تھا۔

"میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ آپ لوگوں کی جان نہ نکالوں، مگر پھر بھی....." وہ جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے دلچسپی اور شرارت سے ہنس پڑی تھی۔

"مگر پھر بھی نکال ہی دیتی ہو۔" دانیال اس کا ادھورا جملہ مکمل کرتے ہوئے یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جس پہ علیزے، عائشہ آذر اور جودت بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائے تھے۔

"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں میں تب تک بل کلیئر کروا کے آتا ہوں۔" آذر کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور گاڑیوں سے نکلی ہوئی عوام دوبارہ اپنی اپنی جگہ سنبھال چکی تھی لیکن اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی علیزے کو دیکھ کر جودت کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ اس سے لفٹ مانگ بیٹھا تھا۔

"کیا میں بھی مرسڈیز کا مزا لے سکتا ہوں؟" وہ شرارت سے کہتے ہوئے علیزے سے پوچھ رہا تھا۔

"ارے کیوں نہیں جودت بھائی، آپ ہمیں جوائن کر سکتے ہیں۔" علیزے خوش ہو کر بولی تھی اسے اپنے سارے کزنز سے ان تھی کیونکہ سب کزنز کو اس سے جو محبت تھی اتنا چاہتے تھے اسے..... منصور حسین نے گاڑی کی لیفٹ سائیڈ کی طرف جھکتے ہوئے لیفٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"آہا..... اس میں بیٹھنے کا تو مزا ہی کچھ اور ہے۔" جودت نے کھل کے اظہار کیا تھا۔

"گاڑی نکالو منصور حسین۔" آذر نے آتے ہی ان لوگوں کو نکلنے کا سگنل دیا تھا اور منصور حسین نے گاڑی کے شیشے چڑھاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر لی تھی۔

"اب کہاں چلنا ہے صاحب؟" منصور حسین نے گاڑی روڈ پہ ڈالنے سے پہلے جودت سے پوچھا تھا۔

"مجھ سے نہیں، اپنی میڈم سے پوچھو، میں تو اس گاڑی میں مہمان ہوں۔" جودت نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور منصور حسین کی نظروں کا اور سوال کا رُخ علیزے کی طرف ہو گیا تھا اس نے بیک ویو مرر سے علیزے کی سمت دیکھا تھا۔

"اب کہاں جانا ہے میڈم؟"

"مجھے کیا پتا کہ کہاں جانا ہے؟ میں کون سا یہاں آتی جاتی رہی ہوں؟ آپ نے پوچھا ہے تو آذر بھائی سے پوچھیں۔" اس نے کندھے اچکا کر سر ہلاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

"جی جناب! اب آذر بھائی سے پوچھیے۔" جودت نے منصور حسین کو شرارت سے اشارہ کیا تھا اور منصور حسین کی مجبوری تھی اس کو پوچھنا ہی پڑا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کے آذر کی گاڑی کے پاس آ گیا تھا۔

"کس طرف جانا ہے صاحب؟" وہ ان کے اگلے پروگرام کا پوچھ رہا تھا۔

"یہاں سے شاہ فیصل مسجد قریب ہے پہلے وہاں چلتے ہیں پھر بعد میں لوک ورثہ، شکر پڑیاں، لیک ویو پارک اور چھتر پارک کی طرف چلتے ہیں۔" آذر نے بالترتیب سب جگہوں کے نام گنوائے تھے کہ ان سب جگہوں پہ جانا ہے۔

"آپ نے سب پکنک اسپاٹ ایک ہی دن میں دیکھنے ہیں؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔

"بالکل کیونکہ ہم نے یہ پکنک اسپاٹ صرف دیکھنے ہیں یہاں ویراڈال کے نہیں بیٹھنا، مری کے لیے بھی نکلنا ہے۔" آذر نے منصور حسین کی بات مذاق میں اڑائی تھی۔

"ٹھیک ہے صاحب! جیسے آپ کی مرضی، لیکن ایسا ممکن نہیں ہے آپ کو ایک ایک جگہ پہ ہی اتنا ٹائم لگ جائے گا کہ آپ یہیں رکنے پہ مجبور ہو جائیں گے۔"

"ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے ہم نے یہاں کوئی پکنک نہیں کروانی، اس لیے ہمیں اپنے بنگلے پہ پہنچنا ہے، رات وہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے، سمجھے تم؟" آذر نے اسے وجہ بتائی۔

''جی صاحب! یہ بھی بہتر ہے۔'' منصور حسین سر ہلا کے واپس آ گیا تھا اور پھر ذرا سیٹ سنبھال لی تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے راستے میں آذر بھائی کو میں بھی یہی سمجھا رہا تھا کہ شام ہو جائے گی لیکن وہ کہتے ہیں کہ بے شک شام ہو جائے ہم نے یہ رات مری میں ہی بسر کرنی ہے جیسے وہاں ان کے لیے کوئی دلہن بیٹھی انتظار کر رہی ہو۔'' جوہت مذاق کے موڈ میں تھا۔

''اچھا تو یہ بات تھی مجھے تو پتا ہی نہیں تھا؟'' منصور حسین نے پہلی بار مذاق میں کسی کا ساتھ دیا تھا۔

''جوہت بھائی! میں بتاؤں گی آذر بھائی کو کہ آپ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' علیزے نے دھمکی دی۔

''بتانا ضرور بتانا لیکن مری پہنچ کر.....'' جوہت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا اور منصور حسین اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔

''جوہت بھائی! وہ ہم سے بڑے ہیں۔''

''ہاہاہا..... وہ صرف تم سے بڑے ہیں۔ تمہیں ہی بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ تم آذر بھائی کی اور ڈیڈ کی ''کاکی'' ہو۔'' جوہت کہتے ہوئے خوب ہنس رہا تھا۔

''آپ اب میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟'' علیزے نے اسے خفگی بھری نظروں سے دیکھا۔

''میں ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا، توبہ توبہ، تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہارے گیت گانے کو دل چاہتا ہے۔'' وہ معصوم سے بولا۔

''گیت اور نے ہاں جوہت بھائی آپ کا گٹار کہاں ہے؟ آپ ساتھ نہیں لائے؟'' علیزے کو اچانک اس کے گٹار کا خیال آیا تھا۔

''لایا ہوں یار اسب کچھ لایا ہوں، لیکن مری چل کے.....'' جوہت نے پھر شرارت سے کہا تھا اور ہنستے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا منصور حسین بھی چوکنا اور ہوشیار ہو کے بیٹھ چکا تھا کیونکہ شاہ فیصل مسجد کی طرف جانے والے روڈ پہ پولیس گاڑیوں کی چیکنگ کے بعد آگے جانے کی پرمشن دے رہی تھی سیکیورٹی کافی ٹائٹ تھی اور منصور حسین کی گاڑی میں اسلحہ تھا لیکن منصور حسین بے بے ڈھارس ہی کافی تھی کہ گاڑی میں رجوا اور علیزے بی بی بھی ہیں، کیونکہ لیڈیز کی موجودگی میں گاڑی کی چیکنگ اا اؤ نہیں تھی۔

''علیزے بی بی آپ اور رجو کھڑکی کے ساتھ ہو کر بیٹھیں۔'' منصور حسین نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے پیچھے کی طرف دیکھا تھا۔

''کیوں؟'' کیوں کا سوال اٹھانے والا جوہت تھا۔

''اس طرح گاڑی کی چیکنگ نہیں ہوگی۔''

''تو اس میں ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاڑی کی چیکنگ ہو یا نہ ہو، ہم کون سا اسلحہ یا غیر قانونی سامان لے کر جا رہے ہیں؟'' جوہت نے اپروائی سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن خوامخواہ یہ لوگ ہمارا ٹائم برباد کریں گے۔'' منصور حسین نے سر جھٹکا۔

اتنے میں ایک پولیس کا شیبل قریب آ چکا تھا لیکن گاڑی میں رجو اور علیزے کو دیکھ کر گاڑی کو پاس کا سگنل دے دیا تھا اور اس کے پیچھے باقی تین گاڑیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا منصور حسین کو جس چیز کا ڈر تھا وہ اس سے بچ گیا تھا آخر وقار آفندی نے اسے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ وہ اسلحے سے کھیلتا ہے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

''لو جی جناب! پہنچ گئے ہم شاہ فیصل مسجد۔'' جوہت نے مسجد کی پارکنگ میں پہنچتے ہی نعرہ لگایا تھا اور رفتہ رفتہ سبھی اپنی گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔

''واؤ.....'' جوہت نے ایک لڑکی کو پاس سے گزرتے دیکھ کر بے ساختہ اظہار کیا تھا۔

''واؤ نہیں کہتے جوہت بھائی، سبحان اللہ کہتے ہیں۔'' علیزے نے معصومیت سے اسے ٹوکا۔

''کسے دیکھ کر؟'' وہ شرارت سے بولا۔

''مسجد کو دیکھ کر'' جوہت اس کے جواب پہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

''تمہیں کس نے کہا کہ میں نے مسجد کو دیکھ کے واؤ کہا ہے۔''

''تو پھر.....؟'' علیزے ہونق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے واؤ کا مر بڑ وہ ہے، بلیک جینز اور ریڈ ٹاپ والی۔" جوت نے اشارہ کیا تھا اور علیزے اس لڑکی کو دیکھ کر سٹپٹا گئی تھی اس کی پنڈلیاں اور بازو بر ہنہ تھے اس کا لباس بے حد چست تھا وہ اپنی کسی دوست سے تصویریں بنوا رہی تھی اور وہاں موجود لڑکوں کا اس کی طرف دھیان تھا۔

"جوت! تم یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" آذر نے قریب آتے ہی تفتی سے پوچھا۔

"جو بھی دیکھ رہے ہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"جوت۔" آذر نے تختی سے پکارا تھا جس پہ جوت گھبرا کے متوجہ ہوا۔

"جی چلیے میں تو مذاق کر رہا ہوں۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور علیزے، انوشہ اور حرمت وغیرہ کے گروپ میں شامل ہو گئی تھی ان سب لڑکیوں نے سر پہ دوپٹے اوڑھ لیے تھے، علیزے تو اندر آ کر حیران و پریشان رونگی جگہ جگہ لڑکے، لڑکیوں کے گروپ کھڑے تھے ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، کچھ تصویریں بنوا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں موجود لوگ مسجد میں نہیں کسی پارک میں کھڑے ہوں، بے ادبی کا تو کسی کو خیال ہی نہیں رہا تھا لڑکیاں ننگے سر گھوم پھر رہی تھیں، لڑکے شرارتیں کر رہے تھے انہوں نے مسجد کے چکنے فرش کو ریپ سمجھ رکھا تھا اور ان کی یہی سمجھ تو ملک میں تباہی کا باعث تھی علیزے کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی تھی۔

"لوگوں نے اللہ کے گھر کو پارکنگ اسپاٹ بنا رکھا تھا، جہاں لوگوں کو زیارت کرنے کے لیے آنا چاہیے تھا وہاں لوگ تفریح اور پرکے لیے آ رہے تھے آذر بھائی واپس چلیں۔۔۔؟" علیزے نے مزید وہاں کا ماحول برداشت نہیں کر سکی تھی۔

"واپس۔۔۔؟" آذر کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی حیرت ہوئی تھی۔

"جی یہاں بہت رش ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔" علیزے کو واقعی یہاں آ کر الجھن سی ہوئی تھی۔

"تو تم ایسا کرو کہ تم جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھو اتنے میں ہم مسجد گھوم پھر کے دیکھ لیں۔" کومل کسی کے بھی بولنے سے پہلے خود بول پڑی تھی۔

"لیکن آپ لوگ یہاں کیا؟"

"ہم لوگ یہاں اتنی دور سے مسجد دیکھنے کے لیے آئے ہیں اور دیکھ کر ہی جائیں گے، تمہاری طبیعت فریش نہیں ہے اس لیے تم جا کر تھوڑی دیر آرام کرو، موڈ فریش ہو جائے گا۔" کومل نے بڑی اپنائیت سے اسے وہاں سے ہٹانا چاہا تھا اور علیزے تو تھی ہی سادہ طبیعت، نورانی گئی تھی اور جو کے ساتھ واپس پارکنگ میں آ گئی لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔

"فرحان کہاں ہے؟" وہ غصے سے اور زور سے پکاری تھی منصور حسین اپنی بے حسیائی میں گاڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا جب علیزے کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"تم نے تمہیں گاڑی میں اسموکنگ کرنے سے منع کیا تھا لیکن تم پھر بھی باز نہیں آئے؟" علیزے نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ جھپٹا اور دور سڑک پہ پھینک دیا تھا جبکہ منصور حسین شعلے کے پیکر میں بھڑکتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کتنی جرأت تھی غصے سے اس نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر دور اچھال دیا تھا حیرت کی بات تھی وہ لڑکی تھی تو نہیں تھی جیسی لگ رہی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں پی پی جی۔ آیا نہیں رہا، میں ابھی ایئر فریشنر آن کرتا ہوں۔"

"شٹ اپ۔۔۔ غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعی اچھے نہیں لگتے۔" علیزے کا مسجد میں موجود پبلک کا غصہ منصور حسین پہ نکل گیا تھا۔

"میں نے غلطی جان بوجھ کے نہیں کی پی پی جی۔" منصور حسین کا سر جھکا ہوا تھا۔

"کی تو ہے نا؟" وہ غصے سے بھری ہوئی تھی اور زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کسی پہ غصہ کیا تھا وہ بھی منصور حسین پہ۔

"اسی لیے تو معذرت بھی کر رہا ہوں۔" منصور حسین ایئر فریشنر آن کر کے گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

"رجو! اسے کہو کہ اپنی زبان بند رکھے، مجھے اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" علیزے چڑچڑی ہو رہی تھی اور منصور حسین اس کے غیر معمولی غصے پہ خاموش تماشائی بنا غصے کی پھاپ دیکھ کے رہ گیا تھا۔

♥

وہ جب سے واپس گھر آئی تھی مسلسل اپنے بیڈ روم میں بند تھی۔

اس نے بیڈ روم سے باہر نکلنے کی اور کسی سے بات کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی ممتاز حیات کی موجودگی کی وجہ سے اسے سب پہ ہی غصہ تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ یہ غصہ اس کے اندر ہی دبا ہوا تھا، غبار کی طرح باہر نہیں نکلا تھا، شاید باہر نکل آتا تو شدت ذرا کم ہو جاتی لیکن فی الحال تو غصہ نکالنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں چکراتے ہوئے وہ اچھی خاصی تھک چکی تھی اور اب تو اسے بھوک کا بھی احساس ہونے لگا تھا رات کے ایک بجے کا وقت تھا کوئی ملازم یا ملازمہ اسے بیڈ روم میں کھانا لا کر نہیں دے سکتے تھے اس لیے اگر کھانا کھانا ہی تھا تو خود جا کر..... وہ دروازے کلاک کی سمت دیکھتی ہوئی چپل پہن کر باہر نکل آئی تھی باہر پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا گھر کی تمام فینسی لائٹس کے بجائے نائٹ بلب جل رہے تھے جن کی ملگجی سی روشنی میں وہ خاموشی سے چلتی ہوئی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہی تھی جب اچانک اس کے قدم تھم گئے تھے دائیں سائیڈ والے بیڈ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور لائٹ جلنے کا مطلب تھا کہ اندر ہیٹر فرد بھی جل رہا ہے۔ مدیحہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم سیڑھیوں کی سمت نہیں بڑھا سکی تھی بلکہ وہ اس بیڈ روم کی طرف آ گئی جہاں لائٹ بھی جل رہی تھی اور لائٹ جلانے والا بھی۔

اس نے ہاتھ کی مدد سے دروازے پہ ذرا سا دباؤ ڈالا تھا اور دروازہ اس کے ہلکے سے دباؤ سے کھلتا چلا گیا تھا وہ سے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں سے جس محسوس ہو رہا تھا مدیحہ نے ہاتھ سے نادیدہ دھوئیں کو رفع کرنے کی کوشش کی تھی اور دھیمے قدموں سے چلتی کھڑکی کے پاس آ گئی، کھڑکی کے پردے ہٹا کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے تھے تازہ اور خنک ہوا کا اک تیز جھونکا اندر آیا تھا اور وہ اس جھونکے کی تازگی کو محسوس کرتی ہوئی پلٹ کر نبیل کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو مسلسل راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور آس پاس کی ہر چیز سے بے نیاز اور لاتعلق نظر آ رہا تھا۔

''بھائی! ایم سوری.....'' مدیحہ ڈائریکٹ اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی لیکن نبیل نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

''بھائی میں آپ سے مخاطب ہوں۔'' مدیحہ نے ذرا اونچی آواز میں کہا اور نبیل کی راکنگ چیئر تھم گئی تھی اور پھر پانچ سکنڈ کے توقف سے اس نے انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کیوں آئی ہو؟'' اس کی آواز بے حد بوجھل اور بھاری ہو رہی تھی لہجہ بے گانگی لیے ہوئے تھا۔

''آپ سے سوری کہنے آئی ہوں۔''

''کس لیے.....؟'' اسے حیرانی ہوئی۔

''آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئے ہیں۔''

''ہونہہ..... یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا، عادی ہو چکا ہوں۔'' نبیل تلخی اور استہزائیہ انداز سے کہتا ہوا چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میں ایسا کرنا نہیں چاہتی لیکن ہو جاتا ہے، میری برداشت ختم ہو جاتی ہے، میں خود پہ کنٹرول نہیں کر پاتی۔'' مدیحہ جھنجلا کے کہہ رہی تھی۔

''تم نہیں جان سکتی مدیحہ، تمہاری اک برداشت ختم ہو جانے سے ہمارا کیا کیا ختم ہو جاتا ہے، عزت، غیرت، غرور اور ہماری انا، سب کچھ ختم ہو کے رہ جاتا ہے، نبیل حیات کسی قابل نہیں رہتا، اپنے آپ سے ہی نظریں نہیں ملا پاتا، بے غیرت بن جاتا ہے، صرف..... صرف تمہاری برداشت کی وجہ سے.....'' نبیل کا لہجہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

''میں اس معاملے میں بہت بے بس ہوں بھائی، ایم رئیلی سوری۔'' مدیحہ نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور سر جھکانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو چھلک گئے تھے وہ راکنگ چیئر کے سامنے رکھی چھوٹی سی کرسٹل ٹیبل کے پاس کھڑی اس کے آنسو قالین پہ نہیں ٹیبل پہ گر رہے تھے اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتا ہوا نبیل یکدم چونک گیا تھا۔

مدیحہ رو رہی تھی؟ ناقابل یقین بات تھی..... حیرت کا مقام تھا۔

''مدیحہ! کیا بات ہے؟ تم رو کیوں رہی ہو؟'' نبیل سگریٹ کا پیکٹ وہیں چھوڑ کے فوراً اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''میں بہت بُری ہوں بھائی! بہت بُری، میں نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے لیکن..... لیکن میں کیا کروں؟ ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ.....'' مدیحہ کہتے کہتے بھی شدت سے روئی تھی اور نبیل نے اسے بے ساختہ اپنے بازو میں گھیرتے ہوئے کندھے سے لگا

لیا تھا۔ ے

''ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوتا، تم بیٹھو یہاں.....؟'' نبیل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا اور اسے صوفے پہ بٹھایا..... لیکن وہ متواتر رو رہی تھی۔

''دیکھو مدیحہ! اس طرح جذباتی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، کچھ کرنے کے لیے دماغ کو ٹھنڈا اور دل کو وسیع رکھنا پڑتا ہے، صبر، ہمت اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے، تمہارے دل و دماغ میں جو کچھ ہے وہ تم مجھ سے شیئر بھی تو کر سکتی ہو..... اور کچھ نہ سہی تو تمہارے دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا، پلیز مدیحہ ''ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ'' اپنے اندر کا غبار نکالو، دل کا بوجھ کم کرو، اپنے آپ کو نارمل اس فرسٹریشن سے پلیز۔'' نبیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کے انہیں سہلایا تھا اور اس کا سر تھپکا تھا۔

لیکن مدیحہ کچھ بھی بتانے کی یہ پھر شیئر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اس کے اندر کا غم و غصہ آنسوؤں کے رستے باہر نکل رہا تھا اور پھر نبیل نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگا کر رونے دیا تا کہ وہ جتنا چاہتی کھل کر رو لیتی جس کے بعد اس کے دل و دماغ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا، لیکن نبیل یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل و دماغ کا بوجھ صرف رو لینے سے کم ہونے والا نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک نہ جانے کتنی بار رو چکی ہوتی۔

''مدیحہ! یہ لو پانی پیو۔'' نبیل نے گلاس میں پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھا دیا تھا اور مدیحہ نے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ ایسی کیا چیز ہے جو تمہیں بے چین اور بے کل رکھتی ہے؟'' نبیل کافی تحمل اور سکون سے پوچھ رہا تھا۔

''بھائی! آپ جانتے ہیں نا کہ بابا کا کردار کیسا ہے؟'' مدیحہ کا پوچھتے ہوئے سر جھکا ہوا تھا۔ اور یہ ایک ایسا سوال تھا جس پہ نبیل فوری طور پر ہاں یا نا میں جواب نہیں دے سکتا تھا کیونکہ دونوں صورتوں میں اسے مدیحہ سے نظر چرانی پڑتی۔

''بتائیے نا بھائی!'' وہ بضد اصرار پہ چور رہی تھی۔

''ہوں.....'' اس نے محض ہوں کہنے پہ اکتفا کیا تھا۔

''اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ میری ایک دوست تھی لو میری تھامسن.....؟'' مدیحہ کے دوسرے سوال پہ نبیل ''ہوں'' کہنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا کیونکہ اسے مدیحہ کی اگلی بات خود بخود ہی سمجھ آ گئی تھی۔

''لو میری، میری دوست تھی، میری کلاس فیلو تھی، میری ہم عمر تھی، ہم لوگ اپنی ہالیڈیز منانے کے لیے انگلینڈ سے کینیڈا گئے تھے، وہاں..... وہاں..... لو میری کے.....'' مدیحہ کہتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی اور نبیل کی رنگت سفید لٹھے کی مانند ہو گئی اس کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز گونج رہی تھی اپنے باپ کا نام نہاد مجسمہ دل کے بت خانے میں ایسا زور سے گرا کہ پاش پاش ہو گیا تھا اور مدیحہ کے دل و دماغ کی اذیت نبیل کے جسم و جاں میں سرایت کر گئی تھی بے شک مدیحہ کی بات ابھی ادھوری تھی لیکن اس کے مفہوم اور معنی بہت مکمل تھے اور اس بار تو وہ مدیحہ کو بھی تسلی نہیں دے سکا تھا۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور نبیل مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھا رہ گیا تھا۔ دل پہ بوجھ سا آ گرا تھا۔

♥

شاہ فیصل مسجد دیکھنے کے بعد ان لوگوں نے لوک ورثہ کا رخ کیا تھا جہاں اپنے کلچر کا ہر رنگ ہر تاثر دیکھنے کے لیے موجود تھا اپنی ثقافت کا منہ بولتا ثبوت، خصوصاً وہ جگہ۔ جہاں ایک عورت کنویں کے قریب بجلی کنویں سے پانی بھر رہی تھی، لڑکیاں اس منظر کو دیکھ کر بہت ایکسائیٹڈ ہوئی تھیں، بے شک وہاں تمام چیزیں آرٹی فیشل تھیں لیکن ان کا تاثر بہت نیچرل تھا، وہاں کی بیل گاڑی، گھوڑا تانگہ، اونٹ کے اسٹیچو اور میوزیم کے اندر ہر چیز ان لوگوں کے شوق اور اشتیاق کو ابھارنے کے لیے کافی تھیں اور جودت نے ان کو ہر چیز کے متعلق بتانا کرانا کے شوق کو اور بھی ہوا دے رکھی تھی ان کو ساری جگہیں گھومنے پھرنے کے بعد لوک ورثہ ہی پسند آیا تھا۔

لوک ورثہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں علیزے نے بھی بہت انجوائے کیا تھا وہ بھی سب کے ساتھ گھومنے پھرنے اور تصویریں بنوانے میں شامل رہی تھی اور پھر شکر پڑیاں سے واپسی پہ شام گہری ہو چکی تھی سبھی یہ رات اسلام آباد ہی رُکنا چاہتے تھے لیکن آذر یہاں رُکنے کے لیے تیار نہیں تھا وہ مری پہنچنا چاہتا تھا اس لیے اس نے منصور حسین کو گاڑی مری روڈ کی طرف موڑنے کا سگنل دیا تھا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے حکم کی تعمیل کی تھی۔

"یار منصور حسین! میں تو بور ہو گیا ہوں کوئی گانا ہی سنا دو۔" جوت نے بوریت کا اظہار کرتے ہوئے کیبنٹ میں رکھی ہوئی وائن البم پلٹ کر دیکھی تھیں۔

"مجھے گانا سننا آتا ہے صاحب، سنانا نہیں۔" منصور حسین کی نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں، بات وہ جوت سے کر رہا تھا لیکن ذہن علیزے کے دوپہر والے غصے کی طرف تھا جو اس نے منصور حسین پہ اُنڈیلا تھا، وہ ابھی تک حیران تھا کہ علیزے بی بی نے اس پہ اتنا غصہ کیا ہے۔ اسے ڈانٹا ہے؟ حیرت تھی۔

"یار! ایک تو تم بھی نا بہت نپے تلے سے آدمی ہو، کھرا کھرا جواب دیتے ہو، بندے کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔" جوت نے منہ بنا کے کہا تھا۔

"منافقت سے کام نہیں لیتا صاحب۔" منصور حسین نے اسپیڈ کم رکھتے ہوئے کہا اور ساتھ والی گاڑی کو راستہ دیا تھا۔

"کیا اپنی بیوی کے ساتھ بھی ایسے ہی پیش آتے ہو رو کھے پھیکے سے۔" جوت کو حیرت ہو رہی تھی۔

"بیوی نہیں ہے۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"ارے کیوں نہیں ہے؟"

"شادی نہیں ہوئی ابھی۔"

"اوہ اچھا..... لیکن یار اب تک شادی ہو جانی چاہیے تھی تمہاری، یہی تو عمر ہوتی ہے شادی کرنے کی، انتیس تیس کے تو ہو گے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن....." منصور حسین کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا تھا۔

"لیکن کیا یار! کوئی محبت وحبت کا چکر ہے کیا؟" جوت منصور حسین میں پوری طرح سے دلچسپی لے رہا تھا۔

"محبت؟" منصور حسین نے محبت کے نورانی لفظ کو زیر لب دہرایا تھا اور دل کو یوں لگا جیسے کسی نے ہلکے سے دبایا ہو، اپنی نرم، نازک ہتھیلی میں اور پھر دوسرے ہی پل اس نرم و نازک ہتھیلی سے آزاد کر دیا ہو۔

منصور حسین نے اپنے دل کو ٹھہرانے کے لیے دائیں بائیں دیکھا اور گہری سانس کھینچی تھی لیکن دوبارہ ونڈ اسکرین کی سمت دیکھنے سے پہلے اس کی نظریں بیک ویو مرر پہ جا ٹھہری تھیں علیزے کی گولڈن براؤن آنکھوں کا عکس بیک ویو مرر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھی جوت اور اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی ہو اور اسے بھی اس کے جواب کا انتظار ہو۔

منصور حسین نے گاڑی کی اندرونی مدھم اور ہلکی سی لائٹ بجھا دی تھی تاکہ اسے پیچھے کا کوئی بھی منظر دکھائی نہ دے، جس کی وجہ سے پھر اس پہ کوئی فرد جرم عائد ہوتی۔

"ارے یار! لائٹ کیوں بجھا رہے، مجھے میری بات کا جواب دو۔" جوت نے پھر لائٹ جلانی چاہی تھی۔

"رہنے دیں صاحب! پیچھے رجو سو رہی ہے، اس کی نیند خراب ہو گی۔" اس نے جوت کو لائٹ جلانے سے منع کیا تھا۔

"او کے نہیں جلاتا، لیکن تم جواب تو دو، تم محبت کرتے نا کسی سے۔" جوت جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ کرتے ہو۔"

"ہونہہ..... جو لگتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔" منصور حسین نے سر جھٹکا۔

"نہیں منصور حسین! جو ہوتا ہے وہی لگتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ کو جو لگتا ہے آپ وہی سمجھ لیں۔"

"میرے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ تمہیں محبت ہے اور بس ہے۔" جوت نے منصور حسین پہ محبت کی مہر لگا دی تھی اور منصور حسین نا چاہتے ہوئے بھی ہلکے سے مسکرا دیا تھا اور اسے لائٹ بجھانے کا یہ بھی ایک فائدہ ہوا کہ جوت اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔

"بھائی! مری اور کتنا دور ہے؟" علیزے کا صبر جواب دے چکا تھا وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک چکی تھی۔

"ڈونٹ وری! آدھے گھنٹے کا سفر رہ گیا ہے۔" جوت نے اسے تسلی دی اور میوزک پلیئر آن کر دیا تھا۔

♥

وہ تقریباً پندرہ بیس منٹ شاور کے نیچے کھڑے رہنے کے بعد نہا کر فریش ہوا تو تولیے سے بال رگڑتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا تھا اس کی پہلی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی سمت اٹھی تھی جہاں دودھ کا گلاس اور چائے کا کپ ڈھانپ کے رکھے گئے تھے گویا اس کے نہانے کے دوران ملازم آ کر رکھ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے چائے کے کپ پہ رکھا ڈھکن ہٹایا اور چائے کی بھاپ بیتابی سے اوپر کی طرف اٹھی تھی وہ کپ اٹھا کر اپنے روم کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا تھا۔

اوائل نومبر کے دن تھے سردی اپنے پر رفتہ رفتہ پوری کائنات پہ پھیلا رہی تھی ماحول میں خنک ہوا مور کی طرح پنکھ پھیلا کے ناچ رہی تھی اور اس کے ناچ کا سرور ہر ذی روح کی رگ رگ میں اترتا جا رہا تھا، بالکل ایسے جیسے دل آور شاہ کی رگوں میں اتر رہا تھا وہ رات کے اس پہر نہا کر شرٹ پہنے بغیر کندھوں پہ تولیہ ڈالے کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس لطف اور سرور کے موسم میں تصور جاناں کا در جانا بھی اک لاشعوری عمل تھا، لیکن اس عمل میں بھی کوئی مداخلت کر بیٹھا تھا اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی تھی اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے سیل نکال کے دیکھا نمبر انجانا تھا چند سیکنڈ وہ دیکھتا رہا پھر بالآخر کال اٹینڈ کر ہی لی تھی۔

"السلام علیکم....." اس کی آواز اور لہجہ کافی سنجیدہ سے تھے۔

"وعلیکم اسلام! آپ کون بات کر رہے ہیں؟" دوسری طرف سے کافی گھبرائی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

"دل آور شاہ اسپیکنگ۔" اس نے نسوانی آواز کو یقین دلایا تھا۔

"مم..... میں معصومہ بی بی بات کر رہی ہوں سر۔" جواباً اس نے بھی اپنا تعارف کروایا تھا اور دل آور چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا تھا لیکن اس خاموشی میں اس کا پہلا خیال صرف اس طرف گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر فون کیوں کر رہی تھی۔

"جی کہیے بی بی! آپ نے رات کے اس پہر فون کیوں کیا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" دل آور کو حقیقتاً تشویش ہوئی تھی۔

"سر..... اس وقت تو ٹھیک ہوں لیکن آئندہ کے لیے کوئی بھروسہ نہیں ہے، اس خبیث کو پتا چل گیا ہے کہ میں اس پہ کیس کر رہی ہوں اس لیے اس نے اپنے بندوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہے، میں تین دن سے چھپتی پھر رہی ہوں، اب تو مجھے کوئی بھی اپنے گھر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتا، وہ کسی بھی وقت مجھے قتل کروا سکتا ہے، لیکن سر میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرتی ہوں، میں مر بھی جاؤں تو اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچایئے گا۔" معصومہ بی بی روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کی آواز بھی بھیگی تھی اور لہجہ دھیما اور دبا دبا سا لگ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوری اور چھپ کے فون کر رہی ہو۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ کچھ نہیں ہو گا آپ کو، آپ حوصلہ رکھیں۔"

"نہیں سر! ایسا ممکن نہیں ہے، اس کے بندے کتوں کی طرح میری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں انہیں جہاں بھی میری خبر مل گئی مجھے گولی مار دیں گے۔" وہ روتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کر پا رہی تھی اور دل آور کے ذہن نے ہمیشہ کی طرح فوری کام کیا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ کچھ نہیں ہو گا آپ کو، آپ بس اتنا بتا دیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

"مم..... میں؟" وہ بتاتے ہوئے ذرا ہچکچا گئی تھی۔

"معصومہ بی بی! مصیبت اور مشکل کے وقت اللہ کے بعد آدمی کو اپنے ڈاکٹر اور اپنے وکیل پہ بھروسہ رکھنا ہی پڑتا ہے، وہ سب بتانا پڑتا ہے جو ہم نے باقی سب سے چھپا رکھا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا، بیماری بتائے بغیر ڈاکٹر زندگی اور موت کی جنگ نہیں لڑ سکتا، اور راز بتائے بغیر وکیل انصاف اور ہار جیت کی جنگ نہیں لڑ سکتا، اب یہ آپ پہ ڈپینڈ کرتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے اپنی زندگی بچانی ہے یا پھر اس خبیث کے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔" دل آور کا لہجہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سخت ہو گیا تھا اور معصومہ بی بی اس کی بات سن کر لاجواب اور شرمندہ ہو گئی تھی۔

"سر! میں..... میں اس وقت اوکاڑہ میں ہوں، یہاں میری ایک کزن رہتی ہے اس کی یہاں شادی ہوئی ہے لیکن اب..... اب تو دو روز سے اس کے سسرال والے بھی باتیں کرنے لگے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ میری خبر میرے گاؤں ہی نہ پہنچا دیں۔"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا، آپ اطمینان رکھیں، صبح ہونے سے پہلے پہلے آپ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی۔" دل آور نے تسلی دلائی۔

"لیکن سر....."

"آپ باقی باتیں کسی اور وقت کے لیے رہنے دیں، فی الحال مجھے اس جگہ کا ایڈریس لکھوا دیں جہاں آپ رو رہی ہیں، آپ کو تھوڑی دیر تک پک کر لیا جائے گا۔" دل آور کی تسلی اور حوصلے پہ مومنہ بی بی بے یقین سی ہو گئی تھی اسے یقین نہ آیا کہ اتنا بڑا آفیسر اس کے کیس میں اس حد تک انوالو ہو رہا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی فیس اور معاوضے کے؟

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟"

"دیکھیے بی بی! میں نے آپ سے کہا کہ اس وقت کوئی اور سوال جواب مت کریں۔" دل آور نے خفگی سے اسے ٹوک دیا تھا اور مومنہ بی بی نے جلدی جلدی سے ایڈریس لکھوا دیا تھا۔

"معافی چاہتی ہوں سر! تھوڑی دیر کے لیے دل میں بدگمانی آ گئی تھی کہ کہیں وہ آپ تک نہ پہنچ جائے۔" وہ ندامت اور شرمساری سے کہہ رہی تھی۔

"ہونہہ..... وہ مجھ تک نہیں پہنچے گا بلکہ میں اس تک پہنچوں گا اور معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اپنی زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے ہر انسان اپنی زندگی محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہے، آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یقیناً ایسا ہی سوچتا..... اچھی دے آپ فون بند کریں تھوڑی دیر تک آپ کو کال آ جائے گی کہ آپ کو کون پک کرنے آ رہا ہے؟"

"آپ کا شکریہ سر! بہت شکریہ۔" مومنہ بی بی نے فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے سرد چائے کے کپ کو دیکھا تھا۔

بھاپ اڑاتی چائے برف ہو چکی تھی اور برف تو اس کا جسم بھی ہو چکا تھا لیکن بخت یہ تھی کہ اس کے جسم میں دوڑتا ہوا بہت گرم تھا جو باہر کی سردی ذرا کم ہی محسوس ہونے دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سردی سے بے نیاز چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ کے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شاور لے کر باہر نکلا، تولیہ صوفے پہ پھینکا، بال برش کیے اور پھر اس دوران سوچتے ہوئے کسی حتمی فیصلے پہ پہنچ کر اپنا سیل فون دوبارہ اٹھا لیا تھا حالانکہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے پتا تھا کہ وہ کسی کو نیند سے ڈسٹرب کر رہا ہے، لیکن اس کے بغیر کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔

"ہیلو..... انسپکٹر شہباز اسپیکنگ۔" دوسری طرف سے نیند سے بوجھل آواز سنائی دی تھی اس نے یقیناً اس کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔

"السلام علیکم! دل آور شاہ بات کر رہا ہوں۔" دل آور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"ارے شاہ جی آپ اس وقت؟" انسپکٹر شہباز کی نیند جیسے ہوا ہو گئی تھی یوں لگا جیسے وہ بستر سے اٹھ کے بیٹھ گیا ہو۔

"شرمندہ ہوں آپ کو نیند سے ڈسٹرب کر دیا۔" دل آور کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو رہا تھا۔

"ارے نہیں نہیں شاہ جی ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ سو سم اللہ کر کے ڈسٹرب کرو، ہم غریبوں کے تو ماتھے پہ شکن تک نہیں آئے گی۔" انسپکٹر شہباز کی خوشی اس کے لب و لہجے سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ کہاں ہیں اس وقت؟" دل آور کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے گہری نیند سے جگا کر اادھر سے ادھر ڈھونڈنے کے لیے کیسے کہے؟

"ایسی کیا بات ہو گئی آخر آج میرے شاہ جی کچھ پریشان لگتے ہیں؟" انسپکٹر شہباز اس کی سنجیدگی سے اس کی پریشانی بھانپ چکی تھی۔

"وہ دراصل میں نے آپ کو کسی کام کے لیے فون کیا تھا۔" دل آور نے بات شروع کی۔

"جانتی ہوں شاہ جی! آپ نے کسی کام کے لیے ہی فون کیا ہے، ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ کو ہماری یاد آئے۔ ہمارا فون کھڑکایا ہے تو آپ کی مجبوری..... خیر اللہ بھلا کرے اس مجبوری کا جس نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور تو کیا۔" انسپکٹر شہباز نے شکر ادا کیا تھا۔

"آپ جانتی ہیں انسپکٹر شہباز میرا پروفیشن مجھے کسی کو یاد کرنے کے لیے بھی ٹائم نہیں دیتا میرے دوستوں کو مجھ سے شکوے ہونے لگتے ہیں۔"

"جانے دیجیے شاہ جی! آپ بہانہ کرتے ہوئے اور صفائی دیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔"

"حالانکہ میرا کام ہی یہی ہے۔" وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔

"ارے کون کہتا ہے کہ آپ صفائی دیتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کو جج کے سامنے شعلے اگلتے ہوئے اور گرجتے برستے ہی سنا ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا تھا۔

"بس کورٹ کی حد تک....." دل آور نے نارمل سے انداز میں کہا۔

"ہرگز نہیں آپ کورٹ سے باہر بھی ویسے ہیں، روکھے پھیکے اور سڑیل سے..... مجال ہے جو کبھی آنکھ بھر کے یہ بھی دیکھا ہو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکی بھی کام کرتی ہے جو آتے جاتے ہوئے بڑی آس سے دیکھتی ہے کہ شاید دل آور شاہ اسے لائن ہی مار دے۔" انسپکٹر شہناز جل کے بولی تھی اور دل آور کا فلک شگاف قہقہہ بہت دور تک گونجا تھا۔

"لائن تو مار ہی دوں لیکن میڈم آزاد پنچھی ہوں، حوالات سے ڈرتا ہوں، آپ لوگ اندر کرتے ہوئے دیر نہیں لگاتے۔" وہ دلچسپی سے بولا تھا۔

"شاہ جی! آپ ایک بار لائن تو مارو، آپ کو اپنے دل کے اندر کروں گی، حوالات کے اندر نہیں۔"

"حوالات کے اندر کرنے کے لیے اور جو ہیں۔" انسپکٹر شہناز نے اسے آفر کی تھی۔

"سوری میڈم! قید آخر قید ہی ہوتی ہے چاہے دل کی ہو یا حوالات کی، میرا تو دم گھٹتا ہے، میں تو کسی کے دل میں بھی نہیں رہ سکتا۔" دل آور نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا..... کسی کے دل میں رہیں سکتے، لیکن کسی کو دل میں رکھ تو سکتے ہیں نا؟"

"یہ کام بھی کافی مشکل ہے۔" وہ شرارت سے بولا تھا اور انسپکٹر شہناز اس کی چالاکی پہ مسکرا اٹھی تھی۔

"آپ بندہ گھما دیتے ہو، بات گھمانا کون سا مشکل کام ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں نے اس وقت آپ کو گھمانے کے لیے ہی فون کیا ہے۔"

"او کے فرمایئے پھر.....؟" وہ پوری طرح سے متوجہ تھی۔

"آپ کو اس وقت اوکاڑہ جانا ہوگا۔"

"اوکاڑہ..... اس وقت.....؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"جی میں نے کسی عام سی خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکی کو فون نہیں کیا بلکہ ایک لیڈی پولیس آفیسر کو فون کیا ہے، جس کے لیے "اس وقت" اور "اس وقت" کوئی معنی نہیں رکھتے، یہ کسی کی موت اور زندگی کا سوال ہے، آپ کا پہنچنا ضروری ہے۔" دل آور نے زور دے کر کہا تھا۔

"لیکن شاہ جی....."

"آپ جا رہی ہیں یا نہیں.....؟" وہ دوٹوک پوچھ رہا تھا۔

"ہوں جا رہی ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے آپ نکلنے کی تیاری کریں میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کے فون بند کر دیا اور مومنہ بی بی کو بتا دیا کہ انسپکٹر شہناز اسے لینے کے لیے آ رہی ہے۔

♥

کل رات مری پہنچتے ہی انہیں تھکن کے مارے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں؟ نیند اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے انہیں کھانا بھی یاد نہیں رہا تھا بس انہیں بستر کی طلب تھی اور جیسے ہی انہیں بیڈ روم نظر آئے، وہ دیوانہ وار لپکے تھے البتہ آور نے اپنی نگرانی میں سب کا سامان نکلوا کے ان کے کمروں میں بھجوایا تھا، گیٹ بند کروایا تب اپنے بیڈ روم میں گیا تھا، سب سے پہلے بستر پہ اسیر ہونے والی علیزے ہی تھی، عائشہ آفندی اسے دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ سو رہی تھی، اس لیے انہوں نے رجو کو بھی اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور منصور حسین کو بھی کمرے میں جا کر آرام کرنے کے لیے کہا تھا ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ خود بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔

وہ لوگ تقریباً رات کے بارہ بجے سوئے تھے اور اس وقت صبح کے بارہ بجے کا وقت ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی بھی بیدار نہیں ہوا تھا کیونکہ باہر صبح سے بارش اور برف باری ہو رہی تھی اور پہلی نظر دیکھنے پہ یہی احساس ہو رہا تھا کہ ابھی رات

ہے ماحول میں پھیلا طلسماتی سا اندھیرا اور غبار شام کا سا سماں پیدا کر رہے تھے۔

''منصور حسین! چائے پیو گے؟'' رجو کچن کی طرف جا رہی تھی جب مین ڈور کے بیچوں بیچ کھڑے منصور حسین کو دیکھ کر ٹھہر گئی تھی۔

''ہاں بنا دو۔'' منصور حسین دھیمے لہجے میں بولا۔

رجو سر ہلاتی ہوئی فوراً پلٹ گئی پھر وہ چائے لے کر آئی تو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور خود ہی اِدھر اُدھر کی بے تکی باتوں میں اس کا سر کھانے لگی۔

''رجو..... رجو.....'' علیزے، رجو کو پکارتی ہوئی اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی تھی۔

''جی علیزے بی بی!'' رجو، منصور حسین کو وہیں چھوڑ کے بھاگی بھاگی آئی تھی۔

''اتنا ٹائم ہو گیا تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟'' علیزے اپنے اردگرد شال لپیٹتے ہوئے کافی سستی سے بولی تھی۔

''جو جاگے تھے بی بی ایسا موسم دیکھ کر وہ بھی سو گئے اس لیے میں آپ کو بھلا کیا جگاتی۔''

''وہ سامنے کون بیٹھا ہے؟''

''منصور حسین۔'' رجو نے مسکرا کے بتایا۔

''منصور حسین؟'' علیزے نے دوبارہ دیکھا کیونکہ منصور حسین نے اپنے اردگرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں پکڑے کپ سے چائے پی رہا تھا کو ریڈور کی سمت اس کی پشت تھی، اس لیے دور سے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ ''ناشتہ بناؤں آپ کے لیے.....؟''

''ہوں، بناؤ۔'' وہ اسے کہہ کے برف باری دیکھنے کے شوق میں خود بھی باہر نکل آئی تھی۔

''سلام بی بی۔'' منصور حسین اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''والسلام..... تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر جاؤ۔'' اس نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دیا تھا۔

''جی بہتر.....'' وہ سر جھکا کے پلٹ گیا تھا۔ اور علیزے خود وہاں بڑے سے ستون کے پاس کھڑی ہو کر برف باری دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پہ ایسے قدرتی منظر کو دیکھتے ہوئے خوشی اور اشتیاق کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

''گڈ مارننگ بے بی۔'' دانیال بھی اس کے قریب ہی آن کھڑا ہوا تھا۔

''سیم ٹو یو بھائی۔'' وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

''رات کیسی گزری؟''

''کچھ پتا نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کہ نیند نے کچھ خبر نہیں ہونے دی، میں تو فوراً ہی سو گئی تھی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب ہم بھی فوراً ہی سو گئے تھے البتہ کچھ خوابوں نے بہت ستائے رکھا تھا۔'' بات کرتے کرتے دانیال کا ٹریک بدل گیا تھا، علیزے نے چونک کر دیکھا وہ قریب آتی حرمت کو دیکھ کر کہہ رہا تھا حالانکہ اس کا انداز کافی غیر محسوس قسم کا تھا۔ لیکن حرمت محسوس کر چکی تھی اور اس کے چہرے پہ شرم کا گلابی عکس لہرا رہا تھا۔

''کس کے خوابوں نے؟'' علیزے نے جان بوجھ کے چھیڑا تھا۔

''بتا دیا تو خفا ہو گی۔''

''اور نہ بتایا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔''

''ارے میری جان! تمہارا کیا ہے چھوٹی سی چڑیا ہو، جب چاہے پکڑ کر منا لو۔'' دانیال نے علیزے کے کندھے پہ بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

''حرمت آپی! دانیال بھائی آپ کو چڑیا کہہ رہے ہیں، کہتے ہیں جب چاہو پکڑ لو۔'' علیزے نے شرارت سے کہا تھا اور دانیال گھبرا گیا تھا۔

"علیزے! میں نے ایسا کب کہا؟"

"ابھی ابھی کہا تو ہے۔"

"یار! میں نے تو تمہیں کہا ہے۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"میں جانتی ہوں آپ نے مجھے کہا ہے۔" علیزے سرگوشی سے بولی تھی اور حرمت اس کی یہ بلند سرگوشی سنتے ہوئے یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی دانیال نے علیزے سے نظر بچا کے حرمت کی ہنسی کو اپنی نظروں میں سمیٹا تھا۔

"اوہ تم شرارتی ہو گئی ہو۔"

"بس کل سے ہو گئی ہوں ورنہ پرسوں تک تو ٹھیک تھی۔" علیزے کا موڈ کافی خوشگوار ہو رہا تھا اور اس کے موڈ کی یہ خوشگواریت پورے گروپ پر ہی طاری ہو رہی تھی، رفتہ رفتہ سب نیند سے بیدار ہو چکے تھے اور ایسا شاندار موسم دیکھ کر باہر نکلنے کے لیے مچل گئے تھے عائشہ آفندی نے کافی روکا لیکن ان سب کا کہنا تھا کہ وہ یہاں گھومنے پھرنے اور انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں اندر بیٹھنے کے لیے نہیں۔ البتہ عائشہ آفندی نے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ کل سے تھکی ہوئی تھیں اور دوسرے باہر بہت زیادہ ٹھنڈ تھی۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے وہ اتنی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے اپنی ٹینٹ لے کر کمرے میں آ کے لیٹ گئی تھیں اور ان لوگوں کا چار گاڑیوں پہ مشتمل قافلہ ایک بار پھر روانگی کے عمل میں تھا۔ آج حرمت اور مدحت نے کومل کو اپنی گاڑی میں کھینچ لیا تھا اور اسے فرنٹ سیٹ پہ آذر کے برابر بیٹھنے کا موقع فراہم کیا تھا کیونکہ جودت آج پھر علیزے کی گاڑی میں منصور حسین کے ساتھ انجوائے کر رہا تھا۔

وہ جب اپنے بنگلے سے نکلے تھے تب دن کے بجے کا ٹائم تھا اور تین بجے کا ٹائم کب شام آٹھ بجے میں تبدیل ہو گیا تھا ان لوگوں کو احساس ہی نہ ہوا۔ احساس تو اس وقت ہوا جب جودت نے ان لوگوں کو فلم دیکھنے کا آئیڈیا دیا تھا۔

"نو سے بارہ کا شو یار۔" جودت نے احمد اور زین کے کندھے پہ ہاتھ مار کے کہا۔

"لیکن لڑکیاں۔" احمد جز بز سا ہو گیا۔

"فلم اچھی ہوئی تو دیکھ لیں گے نہ ہوئی تو واپس چلیں گے۔" اس نے شانے اچکائے۔

"یہ ٹھیک ہے چلو۔" زین ان سے پہلے آگے بڑھ گیا تھا لیکن آذر فلم دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر سب لڑکے لڑکیوں کو تیار لگ کر دو زیادہ دیر انکار نہیں کر سکا تھا مگر علیزے تھکی ہوئی تھی اس نے واپس بنگلے پہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"لیکن علیزے تم....." آذر کو خفگی ہوئی۔

"آئی ایم سوری بھائی! میں کل سے بھی تھکی ہوئی ہوں مسلسل تین گھنٹے بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے، میں آرام کرنا چاہتی ہوں، سونا چاہتی ہوں، بہت نیند آ رہی ہے۔" علیزے کو فلم دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے بہتر تھا کہ وہ گھر جا کر آرام کر لیتی اس کے چہرے پہ بھی تھکن کے آثار تھے آذر اسے مزید اصرار کر کے زبردستی نہیں روک سکا تھا۔

"او کے جاؤ تم آرام کرو۔" آذر نے اس کے رخسار تھپک کے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی پلٹ آئی تھی رجو اور منصور حسین گاڑی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بیٹھتے ہی منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کر دی ابھی وہ راستے میں ہی تھے جب اس کے نمبر پہ آذر کی کال آ گئی تھی۔

"ہمارے آنے تک تم سونا مت، علیزے اکیلی ہے، خیال رکھنا اس کا، پھوپھو تو کھانا کھا کر سو گئی ہیں میں نے ابھی کال کی ہے انہیں مگر وہ ریسیو نہیں کر رہیں۔" آذر نے اسے تاکید کی تھی۔

"جی صاحب جیسے آپ کا حکم، آپ کہو تو ساری رات نہیں سوؤں گا۔" منصور حسین نے تابعداری سے کہا۔

"گڈ..... بعد میں ملتے ہیں۔" آذر نے کہہ کے فون بند کر دیا اور راستے میں منصور حسین نے بنگلے کے سامنے بریک لگائے تھے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا وہ ایک جھٹکے سے گاڑی اندر لے آیا۔

"میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں بی بی جی۔" رجو گاڑی سے اترتے ہی کچن کی طرف بڑھی تھی۔

"نہیں رہنے دو، میں سونے جا رہی ہوں۔" علیزے شال سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت آ گئی اور رجو اپنے کمرے کی سمت چلی گئی۔ جبکہ منصور حسین وہیں کھڑا رہ گیا تھا کیونکہ اسے جاگنے کا حکم ملا تھا اور اس نے اس حکم کی تعمیل کرنی تھی وہ اسی ستون کے

پاس کھڑا سگریٹ پھونکنے لگا۔ باہر کی سردی اور اندر کی سوچ دونوں اپنے عروج پہ تھیں وہ کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔

''منصور حسین! تم سوئے نہیں ابھی تک؟'' رجو نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھی۔

''نہیں آذر صاحب نے جاگنے کے لیے کہا ہے۔''

''اوہ اچھا پہرہ دے رہے ہو؟''

''ہوں۔''

''میں بھی دوں؟'' رجو شرارت سے بولی۔

''نہیں تم جاؤ جا کر سو جاؤ۔'' اس نے اسے اپنے ساتھ جاگنے سے منع کر دیا تھا۔

''لیکن.....''

''میں نے کہا نا جا کر سو جاؤ۔'' منصور حسین نے سختی سے منع کیا تو وہ فوراً پلٹ کر چلی گئی اور وہ خود بھی اپنے کمرے کی طرف آ گیا تھا موبائل کو چارجنگ پہ لگا کر دوبارہ گرم چادر اوڑھے باہر آ کر ٹہلنے لگا۔

♥

رات بہت سرد تھی۔

برف کی ہلکی ہلکی سی پھوار اب بھی جاری تھی اور اس ٹھٹھرا دینے والے موسم میں کوریڈور سے باہر مین ڈور کے سامنے والے حصے میں ٹہلتے منصور حسین کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں وہ کل اور آج کی مسلسل ڈرائیو سے کافی تھکا ہوا تھا اور اوپر سے سردی نے برا حال کر رکھا تھا، نیند اور تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی کافی بوجھل ہو رہی تھیں وہ سر جھکائے چادر لپیٹے دائیں بائیں ٹہل رہا تھا اسے پتا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے کمرے میں گیا تو اسے نیند آ جائے گی اور آذر صاحب خوامخواہ اس پہ خفا ہوں گے اس لیے وہ اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے نبھاتے ہوئے اپنے آپ کو سردی کے حوالے کیے ہوئے تھا۔

''منصور حسین.....'' اپنے عقب سے اجنبی آواز سن کر منصور حسین چونک کر پلٹا سامنے کوئی اور نہیں اس بنگلے کا چوکیدار کھڑا تھا جس کے ساتھ منصور حسین کی صبح صبح ملاقات ہو چکی تھی۔

''ہوں.....؟'' اس نے صرف ''ہوں'' کہنے پہ اکتفا کیا تھا۔

''یہاں تو بہت ٹھنڈ ہے؟''

''ہاں جانتا ہوں۔''

''پھر یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟'' چوکیدار نے حیرانی سے پوچھا۔

''مجبوری ہے، آرڈر ملا ہے یہاں ٹہلنے کا۔'' منصور حسین کا لہجہ طنزیہ اور تلخ سا ہو گیا۔

''اوہ اچھا لیکن اتنی ٹھنڈ میں کب تک اس طرح ٹہلتے رہو گے؟ اگر کہو تو کوکوں والی انگیٹھی لا دوں؟'' چوکیدار کو اتنی سردی میں ٹہلتے منصور حسین سے کافی ہمدردی محسوس ہوئی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری گھر والی نے کوکے دہکائے ہیں۔ تم کہتے ہو تو لے آتا ہوں۔'' چوکیدار کافی کھلے دل کا اور مہمان نواز لگتا تھا اس سے منصور حسین کی سردی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

''ارے نہیں یار! تمہاری مہربانی میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، تمہاری گھر والی نے تمہارے لیے کوکے دہکائے ہیں، تم بھی ٹھنڈے ہوئے ہو گے، گرمائش لو جا کر۔'' اس نے چوکیدار کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی پیشکش سے انکار کر دیا۔

''ارے یار! ہم تو روز یہ گرمائش لیتے رہتے ہیں اور اگر نہ بھی لیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو اس موسم کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن تم یہاں نئے ہو، تم عادی نہیں ہو، اس لیے ڈر ہے کہ موسم تم پہ اثر نہ کر جائے۔'' چوکیدار کے متفکر سے خیال پہ منصور حسین کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کیا مجھے دیکھنے کے بعد بھی تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ موسم مجھ پہ اثر کر جائے گا۔'' منصور حسین کا اشارہ اپنی صحت کی طرف تھا۔

''کیوں منصور حسین تم انسان نہیں ہو کیا؟ جس پہ موسم اثر نہیں کر سکتا؟'' چوکیدار کا سوال بھی بجا تھا۔

"انسان ہوں یار! لیکن ایک مرد ہوں اور مرد پہ موسم اثر نہیں کرتے، مرد پہ عورت اثر کرتی ہے، صرف عورت..... اور موسم عورت پہ اثر کرتے ہیں، ان تینوں کا اثر سے تال میل ہے آپس میں، مرد، عورت اور موسم، تینوں کو کبھی ایک جگہ اکٹھا کر دو تو قیامت کا پل پن اٹھائیں گے۔" منصور حسین کا جواب بھی بجا تھا چوکیدار واقعی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا بات کہی ہے منصور حسین، دل خوش ہو گیا ہے اور اسی خوشی میں تمہارے لیے چائے کا ایک کپ بھی ہو گیا۔" چوکیدار منصور حسین کو شاباش دیتے ہوئے پلٹ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے لیے دہکتے کوئلوں والی انگیٹھی لے آیا تھا اور پھر اسے انگیٹھی کے قریب کرسی بھی کھینچ دی۔

"تم بیٹھ کر ہاتھ سینکو میں چائے لے آؤں۔" وہ دوبارہ اپنے کوارٹر کی سمت چلا گیا اور منصور حسین کرسی پہ بیٹھ کے آگ کی تپش سے لطف اندوز ہونے لگا تھا دہکتے سرخ انگارے انگیٹھی میں جیسے بھڑک رہے تھے اور وہ ان دہکتے بھڑکتے کوئلوں پہ نظر جمائے نہ جانے ان میں کیا کھوج رہا تھا کہ اسے چوکیدار کی واپسی کا بھی احساس نہیں ہوا۔

"لو منصور حسین چائے پیو۔" چوکیدار نے چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اس کے چہرے کے سامنے کیا تھا وہ اپنی بیوی سے گرما گرم تازہ چائے بنوا کے لایا تھا منصور حسین نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"مہربانی ہے یار! کافی زحمت کی ہے تم نے۔" وہ اس کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے کافی ممنون سے لہجے میں بولا۔

"ارے زحمت کیسی؟ تم مہمان ہو یہاں، اور دوسری بات کہ تم ملازم ہو اور ایک ملازم کی حالت کو ایک ملازم ہی سمجھ سکتا ہے، ایک لوگ اپنا تو خیال کر لیتے ہیں، تمہارے اور میرے جیسے ملازموں کا نہیں کرتے، اس لیے ایک دوسرے کا خیال اور احساس ہمیں کرنا چاہیے، مالکوں سے ایسی اُمید فضول ہوتی ہے۔" چوکیدار مسکرا کے کہتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کے اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا تھا۔

"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہمارے مالک لوگ اتنے بُرے بھی نہیں ہیں، کافی خیال رکھتے ہیں، اب یہی دیکھ لو، میں نے یہاں آنا تھا اور میرے پاس گرم کپڑے بھی نہیں تھے اس لیے طیبہ بی بی نے پیسے دیے اور میں جا کر اپنے لیے گرم کپڑے اور یہ گرم چادر لے آیا، اب اگر یہاں سردی میں میں اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہوں تو میرے پاس گرم کپڑوں کا تھوڑا بہت سہارا تو ہے نا؟ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو میں واقعی ٹھٹھر رہا ہوتا، اس سے اب تم ہی اندازہ لگاؤ کہ ہمارے مالک اچھے ہیں یا بُرے؟" منصور حسین نے اپنے مالکوں کی طرف داری کی اور چوکیدار مزید کچھ نہیں کہہ سکا وہ اس کے جواب پہ خاموش ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد منصور حسین اسے دوبارہ سے اپنے ساتھ باتوں پہ آمادہ کر چکا تھا ان دونوں کی کچھ دیر کے لیے محفل جم گئی تھی۔

"تم سگریٹ بھی پیتے ہو؟" چائے کے بعد منصور حسین نے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی تو چوکیدار نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

"ہاں یار! شراب مہنگی ہے وہ نہیں پی سکتا، سگریٹ سستا ہے، اس لیے پی لیتا ہوں۔" اس نے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے دانستہ سے انداز میں کہا اور پھر سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر ماچس کا شعلہ جلا لیا۔ لیکن سرد ماحول اور سرد ہوا کے باعث ماچس کی تیلی کا یہ ننھا سا شعلہ فوراً بجھ گیا تھا وہ ایسے سرد موسم کی تاب نہیں لایا تھا اس لیے منصور حسین کو ایک اور تیلی جلانی پڑی لیکن اب کی بار منصور حسین نے اس شعلے کو ہاتھ کی اوٹ کا سہارا دیا اور اپنے ہاتھ کی سمت ذرا سا جھکتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

"یہ بھی نہ پیا کرو۔" چوکیدار نے منع کیا تھا۔

"جس روز یہ بھی مہنگا ہو گیا اس روز نہیں پیوں گا۔" اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھ کر سر جھٹکا۔

"اچھی بات ہے....." چوکیدار مسکرایا اور منصور حسین اِدھر اُدھر دیکھنے لگا چوکیدار کی باتیں اور سوال و جواب اب بھی جاری تھے ان کی نشست کافی دیر قائم رہی تھی۔

♥

مری میں کوئی سینما نہیں تھا جہاں وہ فلم دیکھنے کے لیے جاتے، یہاں کسی نے اپنی رہائش گاہ کو سینما کا روپ دے رکھا تھا۔ جس سے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کو ہر چیز سے خالی کر کے پورے ہال میں کرسیوں کا انتظام کر رکھا تھا اور ایک صاف دیوار پہ پروجیکٹر کے ذریعے فلم دکھائی جاتی تھی یہاں کا ماحول بھی ان سب کو خاصا دلچسپ لگا تھا، ان کے علاوہ اور بھی چند منچلے اور بے فکرے لوگ موجود تھے۔

''حرمت! تم لوگ کھانے کے لیے کچھ لو گی؟'' یہاں موجود ہر آدمی کے ہاتھ میں کھانے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی جسے دیکھ کر آواز کو لڑکیوں کا خیال آ گیا تھا۔

''جی میں پاپ کارن لوں گی۔'' حرمت نے فوراً اپنی پسند بتا دی۔ پھر باری باری سب نے اپنی پسند آذر کو بتائی۔ آذر سر ہلا کر پلٹ گیا لیکن کچھ یاد آنے پہ دوبارہ ان کی سمت پلٹا تھا۔

''ارے کومل! آپ نے تو کچھ بتایا ہی نہیں؟ اس نے انوشہ کے ساتھ ایک سائیڈ پہ کھڑی کومل سے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''آپ نے کچھ پوچھا بھی تو نہیں؟'' کومل نے آہستگی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

''پوچھا تو میں نے انوشہ اور جویریہ سے بھی نہیں، پھر بھی انہوں نے اپنی پسند بتا دی ہے۔'' آذر کے جواب پہ کومل لاجواب ہو گئی تھی۔

''اپنی پسند بتا دینا اچھا ہوتا ہے، سامنے والے کو بندے کی پسند اور ناپسند کا پتا تو چل جاتا ہے نا؟ اور اس طرح دوسرا بندہ آگاہ بھی ہو جاتا ہے، بڑے فائدے ہوتے ہیں پسند بتا دینے کے۔'' انوشہ نے فوراً مداخلت کی تھی اور کومل نے چونک کر دیکھا۔ انوشہ کی بات ذو معنی تھی۔

''بتائیے اپنی پسند میں سن رہا ہوں۔'' آذر انتظار میں کھڑا تھا۔

''آئس کریم۔'' کومل نے آہستگی سے کہا۔

''آئس کریم.....؟ اس موسم میں؟'' آذر کو اچنبھا ہوا۔

''جی اس موسم میں۔'' کومل نے سر ہلایا۔

''لیکن کومل اس موسم میں آئس کریم سے گلا خراب ہو جائے گا، بیمار پڑ جاؤ گی۔'' آذر نے اسے باز رکھنا چاہا۔

''اس موسم میں ہی تو آئس کریم کھانے کا مزا آتا ہے، آپ بھی ٹرائی کر کے دیکھیں۔'' کومل بے ساختہ کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

''اوکے ایز یو وش۔'' اس نے کندھے اچکائے اور زین کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تھا اس گھر سے باہر ہی چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی وہیں پہ کھانے پینے کی ہر چیز دستیاب تھی تھوڑی دیر بعد وہ ان سب کی پسند کی تمام چیزیں لے آیا تھا لڑکے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کھاتے پھر رہے تھے اور اتنے میں فلم بھی اسٹارٹ ہو گئی وہ سب اپنی اپنی جگہ پہ لگ کے بیٹھ گئے تھے کومل، آذر کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

♥

علیزے اپنے روم میں آتے ہی گہری نیند سو گئی تھی سردی اور تھکن کی وجہ سے جیسے ہی اسے بستر کی نرمی اور کمرے میں موجود ہیٹر کی گرمائش میسر آئی اس کی پلکیں فوراً ہی بند ہونے لگیں اور چند سیکنڈز میں ہی وہ پُرسکون اور گہری نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ باہر موسم اپنی کن جولانیوں پہ ہے؟ وہ جس کروٹ سوئی تھی اتنی دیر اسے اسی کروٹ پہ گزر گئی تھی بہت دیر گزر جانے کے بعد اسے نیند میں ہی تھکن کا احساس ہوا تو اس نے دائیں طرف سے بائیں طرف کروٹ بدلی اور کروٹ بدلتے ہوئے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے سرسری سے انداز میں دیکھا اور دوبارہ پلکیں موند لی تھیں لیکن پلکیں موندنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جس کی وجہ سے علیزے نے یکدم پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

دائیں طرف کھلنے والی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور پردے پہ کسی آدمی کا سایہ لہرا رہا تھا اور پردہ بھی ہل رہا تھا علیزے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کے دل و دماغ میں خوف کی ایک لہر سرایت کر گئی تھی۔

''گگ..... کون..... ہے؟'' اس نے خوفزدہ سے لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس پہ ایسی دہشت سوار ہوئی تھی کہ حلق سے اس کی آواز ہی نہ نکل سکی اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بستر سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی اور یہی دیکھ لیتی کہ باہر کون ہے؟

''پاپا۔'' علیزے نے گھٹی گھٹی سی آواز میں اپنے پاپا کو پکارا جیسے وہ اس کے پکارنے پہ فوراً اس کے پاس پہنچ جائیں گے علیزے کو اپنی موت اپنے بہت قریب محسوس ہو رہی تھی، دل تھا کہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور خوف تھا کہ اس کی روح کانپ

رہا تھا علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے باہر سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ان سرگوشیوں میں کوئی کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"آذر بھائی۔" اس کی دوسری پکار آذر بھائی کے لیے تھی لیکن وہ اپنے پاپا کو اور آذر بھائی کو یہاں بستر میں بیٹھے بیٹھے نہیں بلا سکتی تھی، انہیں بلانے کے لیے اسے فون کی ضرورت تھی لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ آذر بھائی کے آنے تک وہ زندہ نہیں بچے گی لیکن پھر بھی لرزتے کانپتے ہاتھوں سے وہ موبائل ٹٹولنے لگی اور سائیڈ ٹیبل سے موبائل ٹٹولتے ہوئے پانی کا جگ دھڑام سے زمین پہ گرا اور چکنا چور ہو گیا تھا علیزے خود بھی چیخ کے اُٹھ بیٹھی تھی اس نے وحشت زدہ ہو کر یکدم کھڑکی کی سمت دیکھا جہاں سے کسی نے ہاتھ اندر بڑھا کر کھڑکی کا پٹ زور سے بند کر دیا تھا اور اس منظر پہ علیزے کی چیخ بڑی بے ساختہ تھی وہ یکدم بستر سے چھلانگ مار کے اُتری اور دروازہ کھول کے باہر بھاگ نکلی تھی۔

ٹھنڈے فرش پہ ننگے پیر اور ننگے سر بھاگتی ہوئی وہ چیخ رہی تھی اس کا رُخ کوریڈور کی سمت تھا اور کوریڈور سے باہر ٹہلتا منصور حسین بھی اس کی چیخوں کی آواز پہ بُری طرح چونک گیا تھا۔

"علیزے بی بی؟" وہ اندر کی پریشان سے پریشان اپنی جیب سے ریوالور نکال کے کوریڈور کی سمت لپکا لیکن علیزے کوریڈور کا تمام فاصلہ طے کرتی ہوئی آئی اور سامنے سے آتے منصور حسین سے بُری طرح لپٹ گئی اور منصور حسین اس کے اس طرح لپٹ جانے پہ ساکت و صامت رہ گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، علیزے بی بی اس کے سینے سے آ لگی تھیں؟ حیرت تھی، نہ قیامت تھی، کچھ اور ہی تھا، علیزے کا چہرہ منصور حسین کے گرد لپٹی چادر میں چھپ گیا تھا اتنا کہ منصور حسین کے سینے سے لگ گیا تھا۔

"علیزے بی بی....." منصور حسین نے اپنے مضبوط اعصاب اور بلند کرداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسے احتیاط سے متوجہ کیا

"نہیں ڈرائیور وہ..... وہ..... میرے..... کمرے میں کوئی..... آدمی..... کوئی..... آدمی گھسنے کی..... تک..... کوشش..... کر رہا تو" علیزے بے ربط سے لہجے میں بمشکل بول پائی تھی۔ منصور حسین یکدم چونک گیا تھا۔

"کوئی آدمی..... کب؟ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" منصور حسین نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے کمرے کی سمت بڑھنا چاہا تھا لیکن علیزے اس سے الگ ہو کر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی منصور حسین جھنجلا گیا اس نے علیزے کو دونوں کندھوں سے تھام کے اسے خود سے الگ کیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

"آپ میرے پاس کیوں چھپ رہی ہیں؟ میں آپ کا ملازم ہوں ملازم، آپ کا ڈرائیور منصور حسین کچھ اور مت سمجھیے مجھے۔" اس نے علیزے کو ذرا سا جھنجوڑ کے اسے ہوش دلایا تھا اس کے حواس ٹھکانے پہ آ جائیں کیونکہ منصور حسین کو پتا تھا کہ وہ ایسی حرکت بدحواسی میں کر رہی ہے اور وہ اس کے جھنجوڑنے پہ واقعی ہوش میں آ گئی تھی اور ہوش میں آتے ہی اسے پہلا خیال منصور حسین کے ہاتھوں کے لمس کا آیا تھا وہ یکدم ہڑبڑ کے پیچھے ہٹی اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی منصور حسین کو اس کی بدحواسی کا مزید احساس ہوا تھا وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑی تھی۔ منصور حسین اپنی گرم چادر اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اس سے نظر چرا کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا علیزے کو بھی اپنے دوپٹے کی کمی کا احساس ہوا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چادر اپنے اردگرد اوڑھ لی اور کوریڈور میں تنہا کھڑے رہنے کے بجائے وہ بھی منصور حسین کے پیچھے اپنے کمرے میں چلی آئی وہ اس کے کمرے کی تمام لائٹس جلا چکا تھا۔

"کیا ہوا ہے یہاں؟ کہاں دیکھا ہے آپ نے کسی آدمی کو؟" منصور حسین اس کے پورے کمرے میں جائزہ لیتے ہوئے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا بیڈ کے قریب فرش پہ پانی گرا ہوا تھا اور شیشے کے جگ کے ٹوٹے ہوئے کانچ کافی دور تک بکھرے ہوئے تھے، قریب ہی علیزے کا موبائل بھی پانی میں گرا ہوا تھا۔

"وہاں کھڑکی کے پاس۔" علیزے نے ڈرتے ڈرتے اشارہ کیا۔ منصور حسین کانچ کے ٹکڑوں کو اپنے بوٹوں تلے روندتا ہوا کھڑکی کے قریب چلا آیا کھڑکی کے پٹ آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن کھڑکی کا ہک واقعی کھلا ہوا تھا اس نے پردہ ہٹا کر اپنا ریوالور نکالا اور یکدم دونوں پٹ کھول دیے لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا منصور حسین نے کھڑکی سے باہر سر نکال کے جھکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا لیکن وہاں تو دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے علیزے بی بی۔" اس نے پلٹ کر دم سادھے کھڑی خوفزدہ سی علیزے کو دیکھا۔

"وہ یہاں ہی کھڑا تھا اس نے جگ گرنے کی آواز سن کر کھڑکی بند کر دی، وہ بھاگ گیا ہوگا۔" علیزے کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کا پورا جسم لرز رہا تھا دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی بڑے حادثے سے بچ نکلی تھی لیکن ہر بار تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا نا؟"

"وہ کون تھا؟ کیسے آیا اور کیسے بھاگ گیا؟ گیٹ کے سامنے اور راہداری کے باہر تو میں پہرہ دے رہا تھا؟" منصور حسین کو حیرت اور پریشانی ہو رہی تھی اس کی موجودگی میں علیزے بی بی کو کچھ ہو جاتا تو وقار آفندی کے سامنے اسے ہی جوابدہ ہونا پڑتا، انہوں نے علیزے کی حفاظت اسی کے ذمے لگا کر بھیجا تھا منصور حسین کو سوچ کر ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا اسی لیے وہ زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

"آپ بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں۔" وہ باہر نکلنے لگا۔

"نہیں ڈرائیور تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" علیزے اکیلے پن سے ڈر رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ٹھہر گیا۔

"مجھے اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اور مجھے آپ کے ساتھ ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔" منصور حسین کہہ کے باہر نکل گیا اور وہ لان کے اس حصے کی طرف آیا جہاں علیزے کے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی، کھڑکی سے باہر لان کی روندی ہوئی گھاس سے لگ رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی آیا تھا اس نے اس نکلے کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کو دیکھا جہاں سے کوئی بھی کود کر باآسانی اندر آ سکتا تھا منصور حسین ان سب دیواروں سے جھانک کے بھی دیکھ آیا تھا لیکن اسے کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا بلکہ منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جو بھی یہاں آیا تھا اس کی اسپیڈ بہت تیز تھی جو وہ اتنی جلدی غائب ہو گیا۔

"کوئی ملا؟" وہ واپس آیا تو علیزے نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اگر کسی نے ملنا ہوتا تو بھاگنے کی ضرورت کیا تھی بھلا؟" وہ مایوسی سے کہہ رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" علیزے پوچھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی وہ کافی خوفزدہ اور ڈری سہمی سی لگ رہی تھی اور اوپر سے ٹھنڈ کی وجہ سے اس کی رنگت الگ نیلی پیلی ہو رہی تھی۔

"میں آذر صاحب کو کال کر کے گھر بلاتا ہوں۔"

"نن..... نہیں..... تت..... تم ان کو کال مت کرو۔" علیزے نے بے ساختہ اسے روک دیا۔

"کیوں علیزے بی بی اتنی بڑی بات ہو گئی ہے اور آپ؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی۔

"اس سے پہلے اس سے بھی بڑی بات ہو چکی ہے اور تمہیں نہیں پتا کہ اس بات کا کتنا اثر ہوا تھا، سب کتنے پریشان اور ٹینس ہوئے تھے، اتنے دن حویلی کے سب لوگ اسی پریشانی کے زیر اثر رہے تھے اور اب بھی یقیناً ایسا ہی ہوگا۔" علیزے پریشان اور کنفیوژن کا شکار تھی۔ منصور حسین کو اس کی بات پہ تعجب ہوا تھا۔

"لیکن علیزے بی بی۔"

"پلیز ڈرائیور! میں بہت پریشان ہوں، کیونکہ میں اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی، پہلے ہی سب میری وجہ سے اتنا پریشان رہتے ہیں اور اب میری وجہ سے ان کا پروگرام خراب ہو، میں یہ نہیں چاہتی۔" علیزے کا لہجہ روہانسا ہو رہا تھا اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے علیزے بی بی؟"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے تو اس میں دوسروں کا کیا قصور ہے کہ میری وجہ سے وہ سب بھی ڈسٹرب ہوں۔" علیزے کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"اس میں ڈسٹرب ہونے کی کیا بات ہے؟"

"تم سمجھ نہیں رہے، اس میں ڈسٹرب ہونے کی ہی تو بات ہے، پاپا کو یا آذر بھائی کو پتا چلے گا تو وہ فوراً واپسی کا آرڈر دے دیں گے اور یہ سب جو اتنی خوشی خوشی گھومنے پھرنے کے لیے آئے ہیں ان کا موڈ خراب اور پروگرام بدمزا ہو کے رہ جائے گا، بلکہ

آئندہ کبھی بھی اجازت نہیں ملے گی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سب پہ پابندی لگ جائے گی۔" علیزے بنیادی طور پہ ایک ڈری سہمی اور ڈرپوک سی لڑکی تھی اس وقت بھی اس کے دل میں خوف پوری طرح سے موجود تھا لیکن وہ اپنے اندر کے اس خوف کو دباتی ہوئی باقی سب کا خیال کر رہی تھی اسے پتا تھا کہ پاپا کا غصہ باقی سب پہ ہوگا اور اسے ساتھ لانے والے آذر بھائی کو بھی پاپا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

"لیکن علیزے بی بی! اگر کوئی نقصان ہو گیا تو؟" منصور حسین کو اندر ہی اندر پریشانی لاحق تھی اسے بھی بار بار وقار آفندی کا ہی خیال آ رہا تھا۔

"نہیں ہوگا نقصان، تم رجو سے کہو آ کر میرے کمرے میں سو جائے، میں اب لائٹ جلا کر سوؤں گی اور سنو تم صرف گیٹ کی طرف ہی نہیں باقی گھر کی طرف بھی دھیان رکھنا، دیواریں کافی چھوٹی ہیں۔" اس نے منصور حسین کو تاکید کی اور منصور حسین اسے دیکھ کے رہ گیا، وہ چھوٹی سی کم عمر اور کمسن سی لڑکی دوسروں کے خیال سے اپنے اندر کا خوف اندر ہی دبا کر بہادری اور سمجھداری کا ثبوت دے رہی تھی۔ منصور حسین کو اس لمحے وہ معصوم سی لڑکی بہت اچھی اور بہت پیاری لگی وہ بے ساختہ اسے ہی دیکھے گیا۔

"ڈرائیور....." علیزے نے اسے وہیں کھڑے دیکھ کر متوجہ کیا۔ وہ یکدم چونک گیا۔

"میں نے تم سے کہا ہے، سنا تم نے؟"

"جج.... جی.... سب سن لیا ہے، ابھی بھیجتا ہوں۔" وہ فوراً اس کے کمرے سے باہر نکل آیا اور رجو کو جگا کر علیزے کے کمرے میں بھیج دیا، مگر اس کے باوجود منصور حسین کی پریشانی اور سوچ کم نہیں ہوئی تھی وہ اب زیادہ چوکس ہو کر جاگ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ سب کیا ہوا ہے؟

"کیا علیزے بی بی کا دشمن اتنا باخبر ہے کہ وہ ان کے پیچھے مری بھی پہنچ گیا ہے، تو کیا واقعی علیزے بی بی کی جان کو خطرہ ہے؟ لیکن ان کے دشمن نے انہیں ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟ ہو سکتا ہے وہ موقع کی تلاش میں ہو؟" منصور حسین کے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں اور طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے اسے اس مسئلے کا کوئی سر پیر نظر نہیں آ رہا تھا، ریشم کی گتھی کی طرح ہر ڈوری الجھی ہوئی تھی اور سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

♥

وہ نرم بستر پہ اوندھی لیٹی گہری نیند سو رہی تھی جب اچانک اس کے سیل پہ اولڈ رنگ بجنے لگی۔

اس نے اس رنگ کی آواز سے بچنے کے لیے تکیہ اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیا تاکہ اس کی نیند ڈسٹرب نہ ہو، لیکن دوسری طرف والا شاید کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ یا مجبور تھا جو اسے بار بار رنگ کر رہا تھا، مدیحہ نے بالآخر غصے سے بھناتے ہوئے تکیہ پرے پھینکا اور سیل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو.....؟" اس کا غصہ اور بیزاریت اس کی ایک ہیلو میں ہی سمٹے ہوئے تھے۔

"میڈی! میں جیری بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف کی آواز سن کر اسے مزید غصہ آیا۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے بات کرنے کا؟"

"میڈی! میں اس وقت مشکل میں ہوں۔" وہ بیچارا پریشان لگ رہا تھا۔

"مشکل میں کیا مطلب؟" وہ کروٹ بدل کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا میں پاکستان آ رہا ہوں تو یار! میں اس وقت پاکستان میں ہوں۔"

"واٹ؟ پاکستان میں؟" وہ کرنٹ کے اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں پاکستان میں۔"

"مگر کہاں ہو؟"

"لاہور ایئرپورٹ پہ ہوں۔"

"اُف مائی گاڈ..... تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟" مدیحہ ایک تو نیند سے اٹھی تھی اور ایک جیری کی اچانک آمد پہ وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟

''میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اچانک سرپرائز دوں گا، لیکن یہاں آ کر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ تمہارے گھر کا پتا مجھے معلوم ہے، اسی لیے پریشان ہو کر تمہیں کال کی ہے۔'' حیری خود بھی شرمندہ ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے میڈی! تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا۔'' مدیحہ کو خاموش دیکھ کر حیری نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

''ہوں؟ نہیں ایسی بات نہیں ہے تم وہیں ٹھہرو، میں ابھی آ رہی ہوں۔'' مدیحہ نے کہہ کر فون بند کر دیا اور کمبل پرے ہٹا کر بستر سے اٹھ گئی، باتھ روم میں جا کر چہرے پہ پانی کے چھپاکے مارے اور تولیے سے چہرہ پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی، بلیک ٹراؤزر پہ اس نے وائٹ بلف سلیوز ٹائپ پہن رکھا تھا اور ٹاپ کے اوپر ہی اس نے بلیک لانگ جرسی پہن لی، بالوں کو پونی میں جکڑ کے اپنا کمرے کا گرما گرم مظر کھینچا اور اپنے سر اور گردن کے اردگرد لپیٹ کر جو گرز کے، گاڑی کی چابی، موبائل اور بیگ اٹھائے اور کمرے سے نکل آئی وہ کافی عجلت سے سیڑھیاں اتری تھی جس پہ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ممتاز حیات نے چونک کر دیکھا انہیں اپنے گھر میں اتنی جلدی کسی کے اٹھنے کی ہرگز اُمید نہیں تھی لیکن مدیحہ کو دیکھ کر انہیں اچنبھا ہوا تھا۔ وہ بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن انہیں نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

''رکو..... کہاں جا رہی ہو تم؟'' ان کی آواز پہ مدیحہ کے قدم ٹھہر گئے تھے وہ ان کے سوال پہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے ایڑیوں کے بل گھوم کر انہیں دیکھا۔

''ایئرپورٹ.....'' مختصر سا جواب دیا تھا۔

''ایئرپورٹ؟'' انہوں نے جواباً دہرایا تھا۔

''جی ایئرپورٹ، اپنے بوائے فرینڈ کو لینے کے لیے جا رہی ہوں، انگلینڈ سے آیا ہے، صرف مجھ سے ملنے کی خاطر۔'' اس نے اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم؟ نبیل کہاں ہے؟ اسے تمہاری بیہودہ حرکتوں کا پتا نہیں ہے شاید؟'' وہ یکدم غصے سے دھاڑے تھے۔ مدیحہ کے لبوں پہ ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''یہی تو مجھے افسوس ہے کہ نبیل بھائی کو آپ کی بیہودہ حرکتوں کا بھی پتا نہیں ہے شاید، ورنہ وہ آپ کو کب کا ذلیل کر کے اس گھر سے نکال چکے ہوتے۔'' مدیحہ، ممتاز حیات کے سامنے جب بھی بولتی تھی آگ اگلتی تھی اس کا دل چاہتا تھا وہ اپنے بدکردار باپ کو آگ لگا کر جلا دے، بھسم کر ڈالے ان کو، لیکن اس کی بے بسی تھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

''اپنی زبان کو لگام دو۔''

''آپ جیسے گھٹیا اور بے لگام انسان کی اولاد ہوں، مجھے کون لگام ڈال سکتا ہے بھلا؟'' وہ ممتاز حیات کو بے عزت کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی شاید۔

''بکواس بند.....''

''ایم سوری! میں لیٹ ہو رہی ہوں، حیری ایئرپورٹ پہ میرا انتظار کر رہا ہوگا، آپ کی یہ تکرار پھر کبھی سہی۔'' مدیحہ ان کا خون جلاتی ہوئی اطمینان سے پلٹ کر گوریڈور عبور کر گئی اور پیچھے ممتاز حیات کا خون کھولتا رہ گیا۔ ممتاز حیات کو اس کے بوائے فرینڈ کا سن کر غصہ آیا تھا مدیحہ کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی، اس کا مطلب تھا کہ جو وہ سوچتی تھی، جو وہ چاہتی تھی، وہ کر سکتی تھی۔

''ہوں..... حیری بہت اچھا کیا کہ تم پاکستان آ گئے۔'' وہ ڈرائیو کرتے ہوئے حیری کو دل ہی دل میں شاباش دے رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایئرپورٹ پہ موجود تھی اور حیری کو ڈھونڈ رہی تھی۔

''میڈی۔'' وہ ایئرپورٹ پہ موجود تمام نئے پسنجرز میں حیری کو ڈھونڈ رہی تھی جب اسے اپنے عقب سے حیری کی آواز سنائی دی۔

''حیری۔'' وہ بے ساختہ پیچھے پلٹی۔

''ہائے۔'' حیری نے بہت ہی دھیمے سے لہجے میں کہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر امڈنے والی خوشی اور جذبے کو دبا رہا ہو۔

''کیسے ہو؟''

"کچھ پتا نہیں۔" جیری نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
"لگتا ہے پاکستان آکر حواس گم ہو گئے ہیں تمہارے؟" مدیحہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔
"پتا نہیں۔"
"اف جیری۔" مدیحہ اسے گھورتے ہوئے چیخ اٹھی تھی اور جیری یکدم قہقہہ لگا کے ہنس پڑا جس پہ مدیحہ بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائی۔
"اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے مدیحہ کو دیکھتے ہوئے تعریف کی۔
"اتنے دنوں بعد دیکھ رہے ہو اس لیے، ورنہ اتنی اچھی بھی نہیں لگ رہی میں نیند سے اٹھ کے ایسے ہی آ گئی ہوں۔" مدیحہ نے سادگی سے کہا تھا۔
"کیونکہ تمہیں پتا تھا کہ تم ایسے بھی اچھی ہی لگتی ہو۔" جیری کی بات پہ مدیحہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی وہاں موجود کئی لوگ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہے تھے اور لوگوں کے دیکھنے کی وجہ جیری تھا، پاکستانی مسلم لڑکی کے ساتھ انگریز لڑکا سب کے لیے دلچسپی اور تجسس کا باعث تھا۔
"ہوں..... یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن کیا اب مجھے یہیں ایئرپورٹ پہ کھڑا رکھو گی۔ کافی تھک چکا ہوں میں۔" جیری نے خود ہی اسے احساس دلایا تو مدیحہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔
"اوکے اوکے..... چلو میرے ساتھ۔" وہ ہنستی ہوئی اسے کہہ کر آگے بڑھ گئی اور جیری اپنے سامان والی ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ مدیحہ نے گاڑی کی ڈگی کھول کر اس کا سامان رکھوایا اور خود فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی ساتھ ہی جیری کے لیے اپنے برابر والی سیٹ کا ڈور کھول دیا تھا۔
"تھینک یو۔" جیری نے بیٹھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور مدیحہ پارکنگ سے گاڑی نکالنے لگی۔
"کتنے بجے کی فلائٹ تھی تمہاری؟" وہ ایئرپورٹ کے وسیع و عریض احاطے سے گاڑی نکالتے ہوئے جیری کی سمت متوجہ ہوئی۔
"پانچ بجے کی۔"
"اور تم نے مجھے چھ بجے کال کی؟" اسے ٹائم بھی یاد تھا۔
"ہاں ایک گھنٹہ تو باہر نکلنے میں ہی لگ گیا تھا۔"
"ہوں اور سناؤ یہ ائن، شین، کرسٹینا وغیرہ کیسے ہیں؟" وہ ایک روڈ سے یوٹرن لیتے ہوئے بولی۔
"سب ٹھیک ہیں اور سب ہی تمہیں مس کرتے ہیں۔" جیری بہت خوش نظر آ رہا تھا۔
"لیکن تم جیسا مس تو نہیں کرتے نا؟ تم نے مجھے مس کیا اور ملنے چلے آئے؟" مدیحہ مسکرا رہی تھی۔
"میرے مس کرنے کی شدت کو جانتی ہو؟" جیری کا لہجہ دھیما مگر سوال بہت گہرا تھا مدیحہ ایسے سوال اور ایسی باتیں اکثر اگنور کر جاتی تھی۔
"شدت ہی تو ہے، جو تم یہاں تک آ گئے ہو۔" مدیحہ نے جواب تو دیا تھا مگر سرسری سے انداز میں۔
"یعنی تمہیں شدت کا احساس نہیں ہے۔" جیری نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ مدیحہ نے سن کر بھی ان سنی کر دیا اس سلسلے پہ آ کر مدیحہ نے جیری کی کبھی بھی پذیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں کی تھی وہ اپنی حد میں سمٹ کر رہ جاتی تھی۔
"کہاں لے کر جا رہی ہو؟" جیری نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا تھا۔
"اپنے گھر....."
"نہیں میڈی! میں تمہارے گھر نہیں جانا چاہتا۔"
"تو پھر.....؟"
"میں کسی ہوٹل میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"ہوٹل میں کیوں؟" مدیحہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔
"بس میں ہوٹل میں ایزی فیل کروں گا۔"
"تو میرے گھر میں کیا پرابلم ہے؟"
"پرابلم کچھ بھی نہیں ہے۔ بس میں آزاد اور ریلیکس رہنا چاہتا ہوں، پلیز تم کسی اچھے سے ہوٹل کا ٹرخ کرو۔" جیزی اپنے کہے پہ قائم تھا۔
"کیا تم میری فیملی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو؟"
"نہیں میں اپنی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔" وہ نہیں مان رہا تھا۔
"جیزی! تم میرے مہمان ہو..... تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا چاہیے۔" وہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔
"دیکھو میڈی! میں تمہارا ہی مہمان ہوں، تمہارے گھر جاؤں یا نہ جاؤں۔"
"یہ کیسے مہمان ہو تم؟"
"بس تم سمجھ کر بھی نہیں سمجھو گی۔" جیزی نے فوراً کہا۔
"بالکل....."
"بہت ضدی ہو تم....."
"تمہیں اب پتا چلا ہے۔" وہ ہنسی تھی۔
"بہت پہلے سے جانتا ہوں۔"
"لیکن پھر بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتے۔" وہ مایوسی سے سر ہلا رہی تھی اور پھر جیزی کے اصرار پہ مجبوراً اسے ہوٹل کا رخ کرنا پڑا وہ اسے شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں لے آئی تھی، اس کے لیے کمرہ ریزرو کروایا اور اسے کمرے میں چھوڑ کر، آرام کرنے کا کہہ کے واپس آ گئی تھی۔

♥

عدیل کو تین چار دن ہو گئے تھے وہ کام پہ نہیں جا سکا تھا لیکن اس نے فون کر کے باؤ امتیاز کو اپنی غیر حاضری کی وجہ ضرور بتا دی تھی وہ بھی سن کر بہت پریشان ہوئے تھے انہوں نے ہسپتال آنا بھی چاہا تھا لیکن عدیل نے انہیں منع کر دیا کیونکہ ابی اور امی کو تو اس نے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی ورکشاپ میں کام کرتا ہے، اگر باؤ امتیاز ابا جی کی عیادت کے لیے آ جاتے تو یقیناً اس کا راز کھل جاتا اس لیے اس نے انہیں روک دیا تھا لیکن وہ دوسروں کو روکنا بھول گیا، ابا جی آج ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئے تھے اور وہ تینوں بھی ان کی عیادت کے لیے آج ہی آ گئے تھے۔ عدیل ابا جی کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا جب باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
"میں دیکھتا ہوں۔" وہ عابدہ خاتون کو اٹھنے سے منع کرتے ہوئے خود اٹھ کر باہر نکل آیا۔
"کون ہے؟" اس نے پوچھتے ہوئے دروازہ بھی کھول دیا۔
"السلام علیکم۔" سب سے پہلے چھوٹے نے سلام میں پہل کی تھی اور عدیل ٹھٹک گیا تھا۔
"وعلیکم السلام۔" عدیل انہیں دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا تھا اس نے ان سے کافی پریشان سے انداز میں ہاتھ ملایا تھا۔
"کیسے ہو استاد! چاچی کیسے ہیں؟" سلو نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا حال پوچھا تھا۔
"ہوں ٹھیک ہوں۔" عدیل نے کافی مختصر سا جواب دیا تھا۔
"کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے استاد؟" چھوٹا بھی اس کا متفکر سا چہرہ بھانپ چکا تھا۔
"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، آؤ تم لوگ اندر آ جاؤ۔" عدیل اب انہیں واپس تو نہیں لوٹا سکتا تھا اس لیے غور کو کہتا کرتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا وہ تینوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے ان تینوں کے ہاتھ میں ڈھیر سارے شاپر تھے وہ کافی زیادہ فروٹ اور کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔
"یار! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" عدیل نے وہی گھسا پٹا سا روایتی جملہ دہرایا۔
"یہ ہم تمہارے لیے نہیں اپنے انکل کے لیے لائے ہیں۔" چھوٹے نے مسکرا کر کہا۔

"انکل؟" عدیل نے چھوٹے کے استعمال پہ حیرت سے اسے دیکھا۔

"یس انکل تمہارے فادر ہمارے انکل ہی تو ہیں۔" چھوٹے کا لب و لہجہ بدل گیا سلو اور جیدی بے ساختہ مسکرا دیئے تھے۔

"عدیل! باہر کون ہے بیٹا؟" عابدہ خاتون نے آواز دے کر پوچھا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی! ہم ہیں عدیل صاحب کے کولیگ....." سلو نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور اپنا تعارف کروایا تھا۔

"وعلیکم السلام! آؤ آؤ بیٹا بیٹھو تم لوگ۔" عابدہ خاتون فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں اور عدیل ان تینوں کے انداز دیکھ کر حیران رہ گیا تھا انہوں نے عدیل کا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ وہ تو ان کی آمد پہ بُری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

"تھینک یو آنٹی! انکل کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! اب تو پہلے سے بہت بہتر ہیں۔"

"ہم تو بہت دنوں سے آنا چاہ رہے تھے لیکن عدیل صاحب نے خود ہی منع کر دیا، ہمارے سینئر ہیں یہ، اس لیے ان کی بات سے انحراف بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر آج سوچا کہ اپنی مرضی ہی کر لیں۔" چھوٹے نے مسکرا کے کہا تھا اور عدیل غش کھا کے گرنے کو تھا وہ ان تینوں کو آنکھیں پھیلا پھیلا کے دیکھ رہا تھا اور کشاپ میں وہ کیا نظر آتے تھے اور اس وقت کیا نظر آ رہے تھے؟ عدیل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"بیٹا! آپ لوگ بیٹھو باتیں کرو، میں چائے بھجواتی ہوں۔" وہ وہاں سے باہر نکل گئیں اور وہ تینوں فاروق نیازی کی سمت متوجہ ہو گئے فاروق نیازی، انہیں دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔

"انکل! آپ کا بیٹا بہت ذہین اور بہت انٹیلی جنٹ ہے، ہم آفس میں انہیں اپنا استاد مانتے ہیں، کیوں استاد؟" چھوٹے نے شرارت سے کہتے ہوئے عدیل کی سمت دیکھا۔

"لیکن حقیقت میں تو تم خود استاد ہو۔" عدیل کو اعتراف کرنا ہی پڑا کہ چھوٹا ہی سب کا استاد ہے، ہر کام میں ہر..... ہر بات میں آگے۔

"مان گئے نا استاد؟" چھوٹا یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا ان کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک میں فاروق نیازی کا دل بہل گیا تھا ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خوش ہوئے ہیں۔

"مان گئے جناب! مان گئے، آج تو تم تینوں کی ڈریسنگ بھی بہت کمال کی ہے۔" عدیل نے ان کی پینٹ شرٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"عدیل صاحب! آپ جانتے ہیں ہماری ڈریسنگ تو ہر روز ہی کمال کی ہوتی ہے اب ورکشاپ کے مکینکوں کی طرح گندے کپڑے پہن کر تو نہیں گھوم سکتے نا؟" وہ باتوں باتوں میں سب کچھ کہہ بھی گیا تھا اور عدیل اس کی اس چالاکی پہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔

"چائے....." وہ چاروں خوش گپیوں میں مصروف تھے جب نسوانی آواز پہ یکدم بریک لگ گئے عدیل نے گردن موڑ کر دیکھا ایمان ٹرے لیے کھڑی تھی۔

"ایمن....." عدیل فوراً کھڑا ہو گیا تھا اور چھوٹی سی ٹیبل کھینچ کے ان تینوں کے سامنے رکھنے لگا، لیکن اپنے دھیان اپنی ترنگ میں ہنستے چھوٹے کی نظریں بلا ارادہ ہی ایمان پہ جا ٹھہری تھیں۔

بھولی بھالی، معصوم سے چہرے والی، سادہ سی لڑکی چھوٹے کو ایک پل میں چھوٹے سے بڑا بنا گئی تھی اس کی ہنسی تھم چکی تھی۔

"کیا بات ہے شہریار صاحب؟ آپ چپ کیوں ہو گئے؟" سلو نے چھوٹے کو اس کے پورے نام سے مخاطب کرتے ہوئے ٹوکا دیا۔

"نن..... نہیں..... کچھ نہیں....." اس نے یکدم چونکتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"شہریار؟" عدیل نے بھی بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا وہ چھوٹے کا اصلی نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

"دیکھیے انکل..... عدیل صاحب ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں جیسے اپنے کولیگ کے نام کا بھی پتا نہ ہو۔" چھوٹے نے پھر بات سنبھالی تھی اور عدیل سنبھل گیا تھا۔

"ٹھیک ہو۔" چھوٹے نے ایمن کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔ عشنہ عدیل فاروق نیازی کی سمت متوجہ تھا تشو سے ان کا منہ صاف کر رہا تھا۔ سلو اور جیدی نے بھی شکریہ ادا کیا تھا ایمن خاموشی سے کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی لیکن چھوٹے کے دل و دماغ میں اپنا نقش چھوڑ گئی اور چھوٹے کی کیفیت باقی دونوں سے بھی چھپی ہوئی نہیں رہ سکی تھی وہ اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

♥

تو یقین کر لو، یقین کر، وہ رائیگاں، وہ رائیگاں
میری زندگی سے نکل گیا جو لمحہ تیرے خیال کا

اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی کپکپیوں سے لکیر بناتے ہوئے اس کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے، وہ بے آواز رو رہی تھی شاید اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے، اس کی ذات پہ رنج کا عالم تھا اور اس عالم میں وہ بے طرح یاد آ رہا تھا اتنا کہ اس کے بغیر زری کو اپنی سانسیں بھی سینے کا بوجھ لگنے لگی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ بے دم سے انداز میں راکنگ چیئر پہ جھول رہی تھی جب پورے گھر کے سناٹے میں لینڈ لائن فون کی گھنٹی بج اٹھی لیکن زری میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر فون اٹینڈ کرتی، وہ جیسے تھی، ویسے ہی پڑی رہی۔

"زری..... فون اٹینڈ کرو، میں قرآن پاک پڑھ رہی ہوں۔" نگارش نے اپنے بیڈ روم سے اسے آواز دی اور مجبوراً زری کو اپنے آپ کو سنبھالنا پڑا ورنہ یقیناً نگارش کا غصہ اور ناراضی سہنا پڑتی، اسی لیے وہ گہری سانس کھینچتی ہوئی راکنگ چیئر سے اٹھی اور اپنے آنسو پونچھ کر فون سیٹ کے پاس آ گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" دل آور شاہ کی طرح سلام میں پہل کرنے کی عادت تھی، لیکن اس کی آواز سن کر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی نبیل کو یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کا فون زری نے ریسیو کیا ہے۔

"السلام علیکم۔" زری نے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے دوبارہ سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام..... کیسی ہیں آپ؟" دوسری طرف کی آواز لوٹ رہی تھی۔

"کون.....؟" زری نے اس مدھم اور ٹھہری ہوئی آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"نبیل حیات۔"

"ارے آپ؟ کیسے ہیں؟" زری کی اُلجھن حل ہو گئی تھی۔

"جیسی آپ ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب اُداس....."

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"یہ میں نہیں کہہ رہا آپ کی آواز کہہ رہی ہے۔"

"میری آواز.....؟" زری ٹھٹکی۔

"آپ کی آواز کہہ رہی ہے کہ آپ روئی ہیں، آپ کی آواز پہ آنسوؤں کا بوجھ ہے۔" نبیل تو یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کے سامنے بیٹھ کے اسے دیکھتا رہا ہو

"آپ کو شاید کوئی وہم ہو رہا ہے۔" زری نے سر جھٹکا۔

"تو آپ میرا وہم دور کر دیں نا؟ کہہ دیں کہ آپ اُداس نہیں ہیں اور آپ روئی بھی نہیں ہیں، آپ جھوٹ بھی کہیں گی تو میں مان جاؤں گا، دل آور نہیں ہوں جو سچ بات بھی نہیں ماننا۔" نبیل نے بات کرتے کرتے ایک مثال کے طور پہ دل آور کا نام لیا تھا مگر زری سمجھی کہ اس کا دل دھڑک گیا بلکہ اس کے نام پہ تو زری کا رواں رواں دھڑکتا تھا۔ اگر اس کی یہ دھڑکن نبیل حیات سن لیتا تو یقیناً دوسری بات نہ کرتا۔

"آپ نے شاید عبداللہ بھائی سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے؟" زری بات ٹال گئی۔

"ہوں..... شاید۔" نبیل نے آہستگی سے کہا۔
"وہ گھر پہ نہیں ہیں۔"
"آپ تو ہیں نا۔"
"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" زری پہلے ہی پریشان تھی نبیل کی مبہم سی باتوں پہ اور بھی اُلجھنے لگی تھی۔
"میرا مطلب ہے کہ آپ کو پیغام دے سکتا ہوں نا؟ آپ گھر پہ ہی ہیں نا؟" نبیل نے اپنی بات سنبھالی کیونکہ اس کی آواز کے بعد چھانے والی خوشگواریت کے باعث وہ بے ساختگی کا مظاہرہ کر رہی تھا۔
"جی ضرور دے سکتے ہیں۔"
"وہ دراصل عبداللہ نے دل آور کو کوئی گھر دیکھنے کے لیے کہا تھا، دل آور تو شہر میں نہیں ہے، اس لیے اس نے گھر دیکھنے کے لیے مجھے بھیج دیا، میں کل ہی وہ گھر دیکھ کر آیا ہوں، گھر کافی اچھا ہے، آپ عبداللہ سے کہیے گا مجھے کال کر لے، میں اسے ساری لوکیشن خود بتا دوں گا۔" نبیل نے اسے پیغام دیا تھا۔
"اوکے کہہ دوں گی۔"
"ٹھیک ہے، پھر فون بند کرتا ہوں۔" نبیل نے بات ختم کی۔
"ایک منٹ پلیز۔" وہ بے اختیار بول اٹھی تھی، اور اس کی اس بے اختیاری پہ نبیل کا دل تھم گیا تھا، دھڑکنیں بھی ہمہ تن گوش ہو گئی تھیں کہ وہ کچھ کہنے والی ہے۔
"جی..... میں سن رہا ہوں۔" اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔
"آپ نے جو گھر دیکھا ہے کیا وہ آپ لوگوں کے گھر سے قریب ہے؟" زری پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ آپ نے جو گھر دیکھا ہے کیا وہ دل آور کے گھر سے قریب ہے؟ لیکن وہ چاہنے کے باوجود بھی اتنا واضح سوال پوچھ نہیں پائی تھی۔ مجبوری اور مصلحت آڑے آ گئی اور اسی مصلحت نے نبیل حیات کو خوش فہمی کی دنیا میں دھکیل دیا تھا۔
"افسوس کہ وہ گھر میرے گھر سے قریب نہیں ہے، بلکہ دل آور کے گھر سے قریب ہے۔" نبیل کے جواب نے مایوس اور اُداس پڑتی زری کو پل میں خوش کر دیا تھا۔
"اوکے..... میں فون بند کرتی ہوں۔"
"ایک منٹ پلیز۔" اب کی بار نبیل نے اسے روک لیا تھا۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" نبیل نے ذرا سا حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"جی پوچھیے۔" اس نے اجازت دی۔
"آپ اُداس کیوں تھیں؟" وہ نبیل کے سوال پہ ٹھٹکی، پھر مسکرا دی تھی۔
"پہلے تھی، مگر اب نہیں ہوں۔" زری کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ خوش ہے، تھوڑی دیر پہلے والی اُداسی ختم ہو چکی تھی۔
"اب کیوں نہیں ہیں؟"
"بس کچھ نہیں، میں فون بند کر رہی ہوں، اللہ حافظ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا، اس کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ پاکستان میں ان کا گھر دل آور کے گھر سے قریب ہو گا۔ وہ فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی اپنی خوشی سنبھال رہی تھی، جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی، زری کو یقین تھا کہ نبیل کا ہی فون ہے، اسی لیے اس نے دوبارہ ریسیو نہیں کیا، لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ کبھی کبھی انسان کا یقین بھی اسے دھوکا دے جاتا ہے، وہ فون سیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ دل آور شاہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ لیکن اس نے اس یقین پہ ریسیو نہ کیا کہ دوسری طرف نبیل حیات ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ کے اپنے کمرے میں آ گئی، لیکن کافی دیر بعد نگارش کی بات نے اسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔
"دل آور بھائی کی کال کب آئی؟" وہ زری سے پوچھ رہی تھی۔
"دل آور کی کال؟" زری کو اچنبھا ہوا۔
"ہاں..... سی ایل آئی پہ تو انہی کا نمبر ہے، کیا تم نے ریسیو نہیں کیا۔" نگارش کو بھی تعجب نے گھیرا تھا۔

''سی ایل آئی پہ اس کا نمبر؟ اوہ مائی گاڈ'' اس نے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے فون کی طرف دوڑ لگائی اور اس کا نمبر دیکھ کر تو دل مٹھی میں آ گیا۔

''ہائے میں مر گئی، یہ میں نے کر دیا؟ اس کا فون تو اتنی دیر بجتا رہا اور میں سمجھی کہ نہیں.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے رہ گئی تھی۔

''اب رونے سے کیا ہو گا؟ بلکہ یہ سوچو کہ عشق میں عاشق لوگوں کا اتنا نقصان دنیا یا دوسرے لوگ نہیں کرتے، جتنا نقصان وہ خود اپنا کرتے ہیں۔ کبھی جلد بازی میں، کبھی لاپروائی میں اور کبھی شدت میں، اور بعد میں تمہاری طرح سر پکڑ کر بیٹھ کے روتے ہیں، مگر اسی رونے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا، نہ تو دل آور بھائی کی دوبارہ کال آ سکتی ہے اور نہ ہی تم اپنی غلطی کی تلافی کر سکتی ہو، اس لیے بہتر ہے کہ یہ رونا دھونا بند کرو۔'' نگارش کو اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

''بھائی! مجھے نہیں پتا تھا، میں تو سمجھی تھی کہ نبیل.....''

''تو کیا نبیل انسان نہیں ہے؟ کیا تم اس کی کال نہیں سن سکتیں؟'' نگارش نے اسے جھڑک دیا اور زری اپنی غلطی پہ دل مسوس کے رہ گئی، اس نے کال کیوں کی تھی؟ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا۔

♥

اس نے ہیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ساری رات جاگ کر گزاری تھی، رجو تو نورانی سو گئی، لیکن علیزے نیند کے باوجود بھی سو نہیں پائی، اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھ جھپکے گی اور کوئی وحشی اسے دبوچ لے گا اور اسی وحشی کے خوف سے اسے سکون کی نیند سونے ہی نہیں دیا تھا، حالانکہ اسے پتا تھا کہ باہر منصور حسین پہلے سے زیادہ چوکس ہو کر پہرہ دے رہا ہے اور اندر رجو اس کے پاس ہے، لیکن پھر بھی وہ نیند سے آنکھ نہیں ملا پائی تھی۔

فجر کے وقت اٹھی، وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئی، کچھ وقت عبادت میں گزرا تو ذہن پہ طاری خوف کم ہو گیا، وہ تسبیح ختم کر کے اٹھی اور جائے نماز سمیٹنے لگی، لیکن جونہی جائے نماز سمیٹتے ہوئے اس کی نظر اپنے بیڈ پہ رکھی منصور حسین کی بلیک ٹرکی چادر پہ پڑی تھی۔

''اگر یہ چادر کسی نے میرے پاس دیکھ لی تو؟ سب ہی سوال کریں گے، وجہ پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے؟ اوہ نو.....'' وہ جائے نماز الماری میں رکھ کے فوراً بیڈ کے قریب آئی تھی اور اپنے کمبل میں جھانکتی ہوئی وہ چادر کھینچ لی تھی، وہ اس چادر کو گول مول کر کے گھسیٹتی ہوئی باہر نکل آئی تھی، اس کا رخ منصور حسین کے کمرے کی طرف تھا۔ علیزے کو منصور حسین کے کمرے کا پتا تو نہیں تھا، لیکن اندازہ ضرور تھا کہ وہ کسی لاسٹ والے بیڈ روم میں ہے اور اس نے لاسٹ والے بیڈ روم کے دروازے پہ ہی دستک دی، چند سیکنڈ بعد دروازہ کھولنے والا منصور حسین ہی تھا، اس کے سر پہ بندھا ہوا رومال بتا رہا تھا کہ وہ بھی وضو کی حالت میں ہے اور اس نے بھی ابھی ابھی نماز ادا کی ہے۔ اس لمحے علیزے کو دیکھ کر منصور حسین کی نظریں جھک گئی تھیں۔

''یہ تمہاری چادر دینے آئی ہوں۔'' اس نے چادر منصور حسین کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ بی بی جی۔'' اس نے جھکی نظر سے کہتے ہوئے چادر تھام لی تھی۔

''تم سوئے نہیں رات بھر؟'' علیزے کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ بھی جاگتا رہا ہے۔

''نہیں.....''

''کیوں؟''

''بس پریشانی میں نیند نہیں آئی۔'' وہ آہستگی سے بول رہا تھا۔

''تمہیں کیا پریشانی تھی؟''

''مجھے بڑے صاحب کی طرف سے پریشانی تھی، انہوں نے آپ کی ذمہ داری، آپ کی حفاظت مجھے سونپی تھی، اس لیے آپ کی پریشانی میری پریشانی اور آپ کا نقصان بھی میرا نقصان ہے۔''

''لیکن میں تم سے یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ تم اس بات کا ذکر کسی سے بھی مت کرنا، نہ پاپا سے، نہ آذر بھائی سے۔'' علیزے نے اسے منع کیا تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں بی بی جی! میں بڑے صاحب سے اتنی بڑی بات نہیں چھپا سکتا، یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔'' منصور حسین نے انکار کر دیا تھا۔

''تمہاری بتائی ہوئی اتنی بڑی بات پوری حویلی میں پریشانی کا پہاڑ کھڑا کر دے گی، پاپا میرا کالج جانا اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیں گے، آذر بھائی پھر سے ان دیکھے دشمن کی کھوج میں لگ جائیں گے اور باقی سب افراد چپ ہو کے رہ جائیں گے۔'' علیزے نے اسے اس بات کے سائیڈ افیکٹ بتائے تھے۔

''لیکن علیزے بی بی! بات چھپا لینا مسئلے کا حل تو نہیں ہے نا۔ اس طرح آپ کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔'' منصور حسین بے حد پریشان اور اُلجھا ہوا تھا۔

''کسی نے مجھے نقصان پہنچانا ہوتا تو اب تک پہنچا چکا ہوتا۔'' علیزے نے خفگی سے کہا تھا اور منصور حسین چونک گیا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''میرا مطلب ہے کہ کوئی ہمیں محض ہراساں کرنا چاہتا ہے، نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔'' علیزے نے کافی گہری بات کہی تھی، منصور حسین کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا، وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

''لیکن بی بی جی! یہ صرف آپ کا اندازہ بھی تو ہو سکتا ہے، دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی دشمن سے بے خبر ہو کر رہنا چاہیے، جو لوگ دشمن کو کمزور سمجھتے ہیں اور اس سے بے خبر ہو کر رہتے ہیں وہ لوگ نقصان اُٹھاتے ہیں، آپ لاپروائی اور غفلت سے کام مت لیں، بڑے صاحب کو بتا دیں، وہ یقیناً سارے مسئلے کو دور کر لیں گے۔'' منصور حسین اسے سمجھا رہا تھا۔

''جب مناسب لگا تب بتا دوں گی، فی الحال نہیں بتا سکتی اور اس بات کا تم بھی مت بتانا۔''

''لیکن بی بی جی! صاحب کو پتا چلا تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گے۔'' اور آئندہ کے لیے وہ مجھ پہ اعتبار بھی نہیں کریں گے۔'' منصور حسین بے بس اور تذبذب کا شکار تھا۔

''اور اگر بتاؤ گے تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گی۔'' علیزے نے اسے دھمکی سے نوازا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں، اس مسئلے کو اپنے تک رکھو گے تو بہتر رہے گا۔''

''جی.....'' وہ محض جی کہہ کے رہ گیا تھا۔

''اور صنوبر کب آئے تھے رات کو؟'' وہ جاتے جاتے پھر ٹھہر گئی تھی۔

''دو بجے آئے تھے۔''

''ٹھیک ہے، سب سو رہے ہیں، تم بھی سو جاؤ۔'' علیزے اسے کہہ کے واپس پلٹ گئی اور منصور حسین اندر چلا گیا، وہ رات بھر سے جاگ رہا تھا اب نماز کے بعد اسے نیند آنے لگی تھی، اس کا ارادہ سونے کا تھا اور علیزے بھی اب سونے کا ارادہ لے کر پلٹی تھی لیکن آج شاید نیند اس کے نصیب میں نہیں تھی۔

''علیزے۔'' کومل کی چبھتی ہوئی آواز پہ علیزے کے قدم وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔

''ارے کومل آپی! آپ جاگ رہی ہیں۔'' علیزے نے نارمل سے انداز میں کہا، لیکن کومل کا انداز نارمل نہیں تھا۔

''جاگ بھی رہی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں۔'' کومل کے لب و لہجے میں شک بول رہا تھا، لیکن علیزے اس کے اس شک سے بے خبر تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہیں؟'' اس نے لاپروائی سے پوچھا تھا۔

''منصور حسین کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں تم؟'' کومل کے سوال پہ علیزے ٹھٹک گئی تھی کہ کومل نے اسے دیکھ لیا ہے۔

''وہ..... وہ..... ڈرائیور کی چادر، یہاں کوریڈور میں گری ہوئی تھی، وہی اُٹھا کر اسے دے کر آئی ہوں۔'' علیزے نے فوراً وضاحت دی تھی، تاکہ اسے اصل بات کا پتا نہ چلے، لیکن کومل رقابت کی جلن میں کچھ بُرا سوچنے سے بھی باز نہیں آئی تھی۔

''اتنی اہم تھی وہ چادر۔'' اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا، نظروں میں ہلکی سی کاٹ تھی۔

''کومل آپی! وہ چادر ہمارے لیے اہم نہ سہی، لیکن اس کے لیے تو اہم ہے نا؟'' علیزے نے پھر بھی کافی سادگی سے جواب دیا

تھا۔

''اتنی اہم کہ بڑی حویلی کی لاڈلی اور نخریلی بیٹی جس نے کبھی اپنی چادر بھی زمین سے جھک کر نہیں اُٹھائی ہوگی، وہ اپنے ڈرائیور کی چادر اُٹھا کر اس کے بیڈ روم میں پہنچا کے آ رہی ہے؟ واہ یار حیرت ہو رہی ہے اور رشک آ رہا ہے منصور حسین کی اس چادر پہ۔'' کومل کو پہلی بار کوئی ایسا موقع ہاتھ آیا تھا کہ وہ تنہائی میں علیزے کو تشنز چھو سکتی۔

''کومل آپی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' علیزے اب بھی اس کے کاٹ دار لفظوں کے مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

''میں جو کہہ رہی ہوں، تم اس سے انجان بن رہی ہو۔'' کومل نے کافی چبا کے کہا تھا۔

''آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف کہیں، مجھے آپ کی ایسی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں۔'' علیزے پریشان سی اُلجھنے لگی تھی۔

''تم اس وقت.....''

''ارے کومل، علیزے تم لوگ یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' اپنے بیڈ روم سے نکلتی عائشہ آفندی کو دیکھ کر کومل کی ادھوری بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

''پھوپھو میرے کمرے میں جائے نماز نہیں تھی، میں وہ لینے کے لیے نکلی ہوں تو علیزے منصور حسین کے کمرے سے آ رہی تھی۔ اسے اس کی چادر دے کر، وہ بھی اس وقت جب سارا عالم تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔'' کومل نے چھوٹتے ہی عائشہ آفندی کو باتوں باتوں میں اصل بات کا اشارہ دے دیا تھا اور اس کی اس بات پہ ان کی روح کانپ اُٹھی تھی۔

''کومل! تم کیا بول رہی ہو، تمہیں شاید خود بھی اندازہ نہیں ہے؟'' عائشہ آفندی کا لہجہ سخت تھا۔

''پھوپھو! میں نے کچھ غلط.....''

''بس اپنے کمرے میں جاؤ تم۔'' انہوں نے کومل کو مزید کچھ بولنے کی مہلت نہیں دی تھی اور کومل، علیزے پہ ایک طنزیہ سی نظر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

''عائشہ پھوپھو! کومل آپی یہ..... یہ کیا کہہ رہی تھیں؟'' علیزے کا لہجہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ کومل کی بات کے مفہوم کو وہ تھوڑا بہت سمجھ ہی چکی تھی، لیکن پھر بھی ذہن ایسا معصوم اور کورا تھا کہ وہ اس بات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''چھوڑو اس بات کو، پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی ہے، آؤ تم اپنے کمرے میں آ جاؤ، باہر بہت ٹھنڈ ہے۔'' وہ علیزے کو بازو سے تھامتے ہوئے اپنے ساتھ لیے اس کے کمرے میں آ گئی تھیں، وہاں صوفے پہ رجو بھی کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔

''رجو یہاں کیوں سو رہی ہے؟'' انہیں حیرت ہوئی، علیزے کسی کو بھی اپنے کمرے میں سونے نہیں دیتی تھی۔

''میں رات کو سوتے میں ڈر گئی تھی، اس لیے رجو کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔''

''ہوں اچھا کیا تم نے، اگر مجھے کہہ دیتیں تو میں آ جاتی تمہارے پاس۔'' وہ اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں، لیکن علیزے کومل کی بات پہ اُلجھی ہوئی تھی، ذہن منتشر سا ہو رہا تھا۔

♥

اک موم کی گڑیا ہے، اک پریم کہانی ہے
اک شاخ ہے نازک سی
کلیوں کی جوانی ہے
وہ پھول کی تتلی ہے
شعلہ ہے کہ پانی ہے
ہے شان سمندر کی
لہروں کی روانی ہے
وہ نور سحر ہے یا اک شام سہانی ہے
دیکھوں تو سپنا ہے
سوچوں تو کہانی ہے

کیا نام رکھوں اس کا، کیا بات کہوں اس سے؟
وہ دن کا اُجالا ہے، وہ رات کی رانی ہے
اک موم کی گڑیا ہے، اک پریم کہانی ہے

"واؤ جودت بھائی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔" انوشہ، حرمت اور انیہ وغیرہ نے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہوئے اسے ستائشی انداز میں سراہا تھا۔ اس نے ان سب کی فرمائش پہ نظم انہیں گٹار کی دھن پہ سنائی تھی اور اس کی آواز اور یہ دھن اتنی خوبصورت اور بارہا تھیں کہ ان سب کو سن کر مزا آ گیا تھا، بلکہ سب سراہے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ ذرا فاصلے پہ بیٹھا آذر بھی مسکرا رہا تھا۔

"یہ نظم میں نے اسپیشلی علیزے کو ڈیڈی کیٹ کی ہے، اور مجھے لگتا ہے یہ نظم کسی نے علیزے کے لیے ہی لکھی ہے۔" جودت نے علانیہ کہا تھا اور وہاں موجود سب ہی لوگ ہنس پڑے تھے، علیزے کافی چپ چپ بیٹھی تھی، لیکن ان سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر چہرہ دھکا لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ موم کی گڑیا آج اداس اور چپ چپ سی لگتی ہے۔" دانیال نے علیزے کو شرارت سے چھیڑا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔"

"تو پھر خاموش کیوں بیٹھی ہو؟"

"کچھ نہیں، بس پاپا کو مس کر رہی تھی۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے، تو تم ایسا کرو نا پاپا کو فون کر لو۔" دانیال نے مشورہ دیا۔

"کیا تھا، لیکن ان کا سیل بزی تھا۔"

"کوئی بات نہیں، تھوڑی دیر بعد کر لینا۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن اس سے پہلے کہ تم فون کرو، اتنی دیر میں ہم بیت بازی کھیلتے ہیں۔" جودت کا نیا آئیڈیا سامنے آیا تھا۔

"مجھے پوئٹری نہیں آتی۔" اس نے جیسے شرمندگی سے کہا تھا۔

"لو جی قصہ ہی ختم ہوا۔" جودت نے گٹار سائیڈ پہ رکھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے۔

وہ لوگ اس وقت الگ الگ پتھروں پہ بیٹھے ہوئے سورج کی مدھم اور کمزور سی کرنوں سے لطف اندوز ہونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، وہ صبح سے گھر سے نکلے ہوئے تھے، پہلے وہ مری کے مال روڈ پہ اودھم مچاتے رہے اور پھر جب بہت زیادہ گھومنے پھرنے سے بعد تھک گئے تو اس پہاڑی کی اس سطح پہ آ نکلے جہاں ان کے تھوڑی دیر بیٹھنے اور محفل جمانے کی جگہ دستیاب ہو رہی تھی، یہاں آنے سے ذرا پہلے سارے پتھر بھی تھے جن پہ انہوں نے بآسانی اپنی اپنی نشست سنبھال لی تھی اور یہاں ہی جودت کو..... گٹار بجانے کا خیال آیا تھا اور شاید اس کا گٹار بجانے کا موڈ بھی ہو رہا تھا تب ہی بہت اچھا بجایا تھا۔

"آذر جو! تم میرے ساتھ چلو ہم تھوڑی دیر واک کر لیں۔" عائشہ آفندی سب بچوں کو فی مذاق پہ آمادہ دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"پھوپھو! میں چلوں آپ کے ساتھ۔" آذر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو میں کون سا دور جا رہی ہوں، ابھی آ جاتی ہوں تم لوگ انجوائے کرو۔" وہ آذر کو منع کرتی ہوئی رجو کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی تھیں، وہ جب سے یہاں آئی تھیں ان لوگوں کے ساتھ ایک بار بھی باہر نہیں نکلی تھیں، موسم بہت زیادہ خراب تھا اس لیے انہوں نے سردی میں نکلنے کا رسک نہیں لیا تھا، لیکن آج بارش اور برف باری نے تھوڑا وقفہ دیا تھا۔ تب ہی وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر آ گئی تھیں۔

"آپ اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دیں، کہیں آپ کا پیر نہ پھسل جائے۔" ایک ڈھلوانی سطح سے اترتے ہوئے رجو نے احتیاطاً ٹھہر کر انہیں ہاتھ پکڑنا چاہا تھا، لیکن اس ڈھلوانی سطح سے اترتے ہوئے بلا ارادہ ہی ان کی نظر اس پہاڑی کے نیچے والی سڑک پہ جا پڑی تھی جہاں کی رنگینیوں میں پوری دنیا گم ہو کے رہ گئی تھی۔ ان کو لگا جیسے زمین آسمان ایک ہو گئے ہوں اور ان کے اس تصادم پہ عائشہ آفندی ساکت ہو گئی تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ پہ جامد ہو چکی تھیں۔

''کیا ہوا ہے بی بی جی! آپ رُک کیوں گئی ہیں؟'' رجو نے انہیں بازو ہلا کر متوجہ کیا تھا اور عائشہ آفندی حواسوں میں آتے ہی یکدم چیخ اٹھی تھیں۔

''زہرہ۔'' وہ اتنی بلند آواز سے چیخ کے پکار رہی تھیں کہ آس پاس کی فضا میں بھی ان کی آواز گونج کے رہ گئی تھی۔

''زہرہ! زکو زہرہ۔'' وہ یکدم رجو سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے اُترنے کے لیے لپکی تھیں، لیکن اتنی عجلت اور بے دھیانی کی وجہ سے ان کے قدم غیر متوازن ہو گئے تھے اور جیسے ہی ان کے قدموں نے توازن کھویا وہ لڑھکتی ہوئی زمین پہ آ گری تھیں۔

''زہرہ! زکو..... رجو خدا کے لیے روکو اسے، وہ جا رہی ہے، زہرہ۔'' عائشہ آفندی گرنے اور اتنی شدید چوٹ کے باوجود پھر سے پکارنے کے لیے اٹھی تھیں، لیکن ان کی پکار ان کی زہرہ کے علاوہ اور سب نے ہی سنی تھی اور اسے دور جاتے دیکھ کر عائشہ آفندی مرغ بسمل کی مانند تڑپی تھیں۔

''زہرہ.....'' وہ زمین سے اُٹھ کے اس کے پیچھے جانے کے لیے لپک رہی تھیں، جب اچانک پیچھے سے دانیال اور آذر نے تھام لیا تھا۔

''امی! کیا ہوا ہے، کہاں جا رہی ہیں آپ؟'' دانیال ان کے مٹی سے خراب ہوئے کپڑے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''وہ..... وہ زہرہ..... زہرہ کو دیکھا ہے میں نے، دانیال، جاؤ، جاؤ اسے روکو بیٹا۔ اسے کہو عائشہ بلا رہی ہے۔'' وہ تو جیسے پاگل ہو چکی تھیں اور آذر کے ساتھ ساتھ دانیال بھی حیران رہ گیا تھا۔

''زہرہ آنٹی؟'' ان دونوں نے حیرانی سے زیر لب دہرایا تھا۔

''ہاں زہرہ..... میری زہرہ۔'' عائشہ آفندی کہتے ہوئے سینے پہ ہاتھ رکھ کے تڑپ تڑپ کے رو رہی تھیں۔

''آپ روئیں مت، ہم دیکھتے ہیں۔'' آذر اور دانیال انہیں باقی سب کے حوالے کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے، لیکن مطلوبہ جگہ پہ بار بار تلاش کرنے کے باوجود بھی وہ انہیں کہیں نظر نہیں آئی تھیں، آذر اور دانیال دونوں کے ذہن میں زہرہ آنٹی کے متعلق زندہ تھے لیکن اتنے سالوں بعد ان نین نقوش میں کیا فرق آیا تھا یہ تو وہ بھی نہیں جانتے تھے، لیکن اگر عائشہ آفندی نے انہیں پہچان لیا تھا تو وہ دونوں بھی پہچان سکتے تھے اور اس چیز سے پتا چلتا تھا کہ ان میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا، تب ہی تو انہوں نے جلدی اور آسانی سے پہچان لیا تھا۔

''سوری پھوپھو! وہ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔'' آذر نے واپس آتے ہوئے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا، اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''وہ چلی گئی، وہ میرے دیکھتے دیکھتے تو چلی گئی ہے۔'' عائشہ آفندی بے تحاشہ رو رہی تھیں اور پھر وہاں سے وہ سب انہیں بمشکل واپس بنگلے پہ لے کر آئے تھے۔

''امی بس کریں نا، کیوں انتظار رو رہی ہیں بیمار پڑ جائیں گی۔'' دانیال نے ان کا کندھا دبایا۔

''تم..... تم بھائی، بھائی صاحب کو کال ملاؤ میں انہیں بتاتی ہوں۔'' انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور مجبوراً دانیال کو کال کرنا ہی پڑی تھی۔

''ہیلو۔'' وقار آفندی کی آواز ایئر پیس سے سنائی دی تھی۔

''بھائی صاحب! میں عائشہ بات کر رہی ہوں۔'' وہ آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔

''عائشہ! تم رو رہی ہو، کیا ہوا ہے۔'' وہ پریشان ہو اُٹھے تھے۔

''بھائی صاحب! میں نے..... میں نے زہرہ کو دیکھا ہے، ابھی دیکھا ہے تھوڑی دیر پہلے۔'' وہ بتاتے ہوئے پھر سے رونے لگی تھیں۔

''زہرہ کو؟'' وقار آفندی کی آواز کسی گہرے پاتال میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوئی تھی، ریسیور میں سناٹا چھا گیا تھا۔

♥

اور یہ سناٹا کافی دیر یونہی چھایا رہا تھا۔

وقار آفندی کی آواز کہیں گم ہو چکی تھی، جبکہ اس چیز سے بے خبر عائشہ آفندی اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔

"ہاں..... میں نے زہرہ کو دیکھا ہے بھائی صاحب..... وہ..... وہ..... میری زہرہ ہی تھی وہ میرے سامنے ہی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی، اور میں..... میں اسے پکارتی رہ گئی، اس نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں، میری آواز بھی نہیں سنی، وہ..... وہ تو رکی بھی نہیں اور چلی گئی۔" عائشہ آفندی گہرے صدمے کے زیر اثر تھیں، اسی لیے ان کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

اور گہرے صدمے کے زیر اثر تو شاید وقار آفندی بھی تھے جن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔

"عائشہ! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شاید؟" انہوں نے سوال کیا تھا، لیکن بمشکل.....

"نہیں ہرگز نہیں، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، اتنے سال ہو گئے پہلے کبھی ایسی غلط فہمی نہیں ہوئی تو آج کیوں ہوئی تھی بھلا؟ میں اپنے پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ زہرہ ہی تھی، وہ سر سے پاؤں تک زہرہ تھی، زہرہ میرے دل پہ لکھی ہے، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟" عائشہ آفندی کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہہ رہے تھے اور وقار آفندی کو یقین بھی دلا رہی تھیں۔

"لیکن عائشہ....." انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا، مگر عائشہ آفندی نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"نہیں بھائی صاحب! اب کوئی تسلی یا دلاسہ مت دیجیے گا، وہ یہیں کہیں ہے، میرے آس پاس، بس آپ نے ایک بار پھر اسے تلاش کرنا ہے، وہ اسی ملک میں ہے، وہ سر رول جائے گی، بس ایک بار..... صرف ایک بار اس سے پوچھنا ہے کہ وہ اپنی عائشہ کو اس طرح اچانک بغیر بتائے کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟ اس نے اگر کسی کے ساتھ شادی کر لی تھی تو مجھے بتا کر جاتی، غیروں کی طرح، دشمنوں کی طرح کیوں چلی گئی؟" عائشہ آفندی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا، کال بند ہونے کی آواز پہ عائشہ آفندی چونک گئیں۔ انہوں نے فوراً دانیال کی سمت دیکھا تھا۔

"فون بند کیوں ہو گیا ہے؟"

"جی یہاں سگنلز کا مسئلہ ہے، کال ڈراپ ہو جاتی ہے۔" دانیال انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ کافی دیر سے پریشان حال سی رو رہی تھیں اور دانیال ان کی طرف سے متفکر ہو رہا تھا، اسے پتا تھا کہ ان کی صحت پہ برا اثر پڑے گا، لیکن وہ تھیں کہ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں، انہیں اس وقت زہرہ کے سوا کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا، اتنے سالوں بعد وہی جوانی والی بے صبری آنکھ بھری تھی۔

ان کی زبان پہ صرف زہرہ کا نام تھا۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زہرہ کو کہیں سے ڈھونڈ کے اپنے سامنے لے آئیں اور وہ سب کچھ پوچھ ڈالیں جو وہ اتنے سالوں سے اپنے دل و دماغ میں لیے پھر رہی تھیں۔ لیکن ان کا بس چلتا تب نا؟ دانیال ان کی حالت کے پیش نظر ان کی میڈیسن لے آیا تھا۔

"پلیز یہ میڈیسن کھالیں، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے زبردستی انہیں میڈیسن کھلائی تھیں، کیونکہ ان کی میڈیسن میں نیند کی دوا بھی شامل تھی، جس کے بعد وہ یقیناً تھوڑی ریلیکس ہو جاتیں، اسی لیے وہ انہیں ان کے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اور انہیں مکمل اوڑھا کر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ باہر آ کر بھی ٹہلتے ہوئے اسی بات کو سوچ رہا تھا۔

♥

وقار آفندی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور ان کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ان کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے، ان کی سوچیں، ان کے خیالات اور ان کا سکون سب کچھ برباد اور منتشر ہو کے رہ گیا تھا، ان کا ذہن ہر چیز سے مفلوج ہوا تھا تو انہوں نے عائشہ آفندی کا فون بغیر کچھ کہے ہی بند کر دیا تھا، کیونکہ اس وقت ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، ان کی قوت گویائی بھی جیسے سلب ہو چکی تھی، وہ جہاں تھے وہاں ہی بیٹھے رہ گئے۔ ان کی ذات دھواں دھواں ہو رہی تھی اور اس دھوئیں کے مرغولے آسمان کی سمت اٹھ رہے تھے، اک اذیت ناک اور تلخ سا غبار تھا جو ان کے اطراف میں بہت تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اور وہ اس دھوئیں اور تلخ غبار میں ڈوبتے جا رہے تھے اور انہیں اس کیفیت میں نہ جانے اور کتنی دیر گزر جاتی کہ اچانک مبارک خان آفس روم کے دروازے پہ دستک دے کر اندر چلا آیا۔

"صاحب جی! وہ نیچے ڈرائنگ روم میں معیز ہمدانی آپ کا انتظار....." مبارک خان کی کہتے کہتے اچانک ان کی سمت نظر اٹھی تھی اور وہ بے ساختہ چپ ہو گیا۔ قیامت گزر جانے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے، وہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں؟" مبارک خان ان کی ٹیبل کے قریب آ گیا تھا، لیکن وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئے تھے اور مبارک

خان کی تشویش اور بڑھ گئی تھی۔

''صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک نہیں لگ رہے؟'' اس نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے کو ہلایا اور وقار آفندی یکدم جیسے کسی سکتے سے باہر آئے، انہوں نے چونک کر مبارک خان کی سمت دیکھا، ان کی آنکھیں خالی خالی سی لگ رہی تھیں۔

''صاحب! آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟'' مبارک خان ان کی طرف سے بے حد پریشان ہو رہا تھا اور وقار آفندی کچھ بھی بولنے سے قاصر نظر آ رہے تھے، اس نے کچھ سوچتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جگ سے پانی انڈیل کر گلاس ان کی سمت بڑھا دیا تھا۔

''صاحب! یہ پانی پئیں۔'' اس نے ان کی حالت کے پیش نظر فوراً انہیں پانی نکال کے دیا تھا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ انکار کرتے ہوئے اپنی چیئر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مٹھیاں بھینچے ہوئے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے، ان کے ہر انداز سے بے سکونی، بے چینی اور اضطراب جھلک رہا تھا۔

''صاحب! آپ کچھ بتائیے؟''

''بس کرو مبارک خان! بس کرو، چپ ہو جاؤ۔'' وقار آفندی یکدم غصے سے دھاڑ اُٹھے تھے اور مبارک خان ان کی ایسی گرج پہ گڑبڑا کے رہ گیا، وقار آفندی کا غصہ اور وہ بھی اس انتہا کا؟ مبارک خان حیرت زدہ سا ہو رہا تھا، وقار آفندی کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ حیرت تو لازماً ہونی تھی۔

''گاڑی نکالو، ہمیں حویلی جانا ہے۔'' انہوں نے اپنا کوٹ اور موبائل اُٹھاتے ہوئے حکم جاری کیا۔

''جی بہتر۔'' وہ حیرت کے باوجود ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گلاس ٹیبل پہ رکھ کے باہر نکل گیا اور اس کے پیچھے وہ بھی باہر نکل آئے۔ آفس میں کیا ہو رہا تھا اور وہ کیا، کیا کام ادھورے چھوڑ کے جا رہے تھے، انہیں کوئی احساس نہیں تھا، ان کی ذات پہ کیا بیت رہی تھی، یہ صرف وہی جانتے تھے۔ مبارک خان نے بہت عجلت میں گاڑی نکالی تھی اور ان کے نیچے پہنچنے تک وہ ان کے لیے گاڑی کا دروازہ بھی کھول چکا تھا اور جیسے ہی وہ اندر بیٹھے آفس کے گارڈز نے آگے بڑھ کے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے ہی پل مبارک خان نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور کافی رش ڈرائیو کرتے ہوئے حویلی کا رُخ کیا تھا، وقار آفندی کی حالت گاڑی میں بھی کافی مضطرب محسوس ہو رہی تھی، مبارک خان کو تجسس تو ہو رہا تھا، لیکن وہ اب دوبارہ کچھ کہہ کر ان کا ضبط نہیں آزمانا چاہتا تھا، اسی لیے چپ ہو کے بیٹھا رہا اور بہت جلد حویلی کے بڑے سے گیٹ کے سامنے آ کر بریک لگائے تھے۔ عارف نے وقار آفندی کی گاڑی دیکھتے ہوئے ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر پھرتی سے اُٹھ کر گیٹ کھول دیا۔ وقار آفندی کی اپنے وقت سے پہلے آفس سے واپسی سب کے لیے ہی حیرانی اور تشویش کا باعث تھی۔

آسیہ آفندی اپنی دونوں دیورانیوں ثروت بیگم اور ثمرہ بیگم کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی چائے پی رہی تھیں، جب اچانک اندر داخل ہونے والی وقار آفندی کی گاڑی دیکھ کر چونک گئیں۔

''وقار آ بھی گئے؟'' وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

''آپ لوگ بیٹھیں، میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔'' وہ معذرت کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، اتنے میں وقار آفندی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کوریڈور تک پہنچ چکے تھے اور ان کے پیچھے آسیہ آفندی بھی تیز تیز قدم اُٹھاتی قریب آ گئیں۔ وقار آفندی کوٹ بازو پہ ڈالے کوریڈور میں چلتے ہوئے ہی اپنے گلے سے ٹائی کی ناٹ کھولنا شروع ہو گئے تھے۔

''وقار! آپ آج جلدی آ گئے ہیں، کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' آسیہ آفندی ان کے بازو سے ان کا کوٹ تھامتے ہوئے کافی فکرمندی سے پوچھ رہی تھیں۔

''ہوں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے بمشکل مختصر سے جواب سے نوازا تھا۔

''لیکن آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟ سب ٹھیک تو ہیں نا؟ علیزے کیسی ہے؟'' آسیہ آفندی کا پہلا خیال علیزے کی سمت گیا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہیں، سب ٹھیک ہیں، علیزے بھی ٹھیک ہے، ڈونٹ وری۔'' وہ اپنے بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے اور آسیہ آفندی بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

"لیکن آپ ٹھیک نہیں ہیں، آپ....."

"آسیہ..... پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔" وقار آفندی نے آسیہ آفندی کی سمت پلٹتے ہوئے نہ جانے کس انداز کس لہجے میں کہا تھا کہ آسیہ آفندی حیرت اور بے یقینی سے پتھر کی طرح ایک ہی جگہ پہ جم کے رہ گئی تھیں۔

"تنہا چھوڑ دوں۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھیں اور وقار آفندی ٹھٹک گئے۔

"آسیہ! میں اس وقت بہت اُلجھا ہوا اور بہت پریشان ہوں، پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔" اس بار انہوں نے ذرا ٹھہر کے سمجھایا تھا اور آسیہ آفندی، وقار آفندی کی اجنبی سی صورت، اجنبی سا انداز دیکھتی ہوئی باہر نکل گئیں، وہ گلے پڑنے والی اور بحث و تکرار کرنے والی بیویوں میں سے نہیں تھیں، اسی لیے دل میں اُٹھتے ہزاروں سوال، وسوسے اور وہم دل میں ہی دبائے ہوئی چلی گئیں اور وقار آفندی راکنگ چیئر پہ ڈھے گئے تھے، دل و دماغ میں ایک اُٹھا شور سی مچی ہوئی تھی۔

♥

سوکھے پیڑ پہ بہار آجائے تو ہرے پیڑ بھی اسے حیرانی اور حسد سے دیکھتے ہیں کہ یہ مرتے مرتے جینے کیسے لگا؟ اور اس پہ بہار آئی ہے تو کیوں آئی ہے؟ آخر وجہ کیا تھی؟ وہ سوکھے سے ہرا کیسے ہو گیا؟ اس کی شادابی کا راز کیا ہے؟

سب ہی اس راز کو جاننا چاہتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے مدیحہ، فائزہ بیگم اور ممتاز حیات جاننا چاہتے تھے کیونکہ نبیل حیات بھی سوکھے اور خشک پیڑ پہ آج بہار آئی لگ رہی تھی اور اس بہار کو سب ہی نے محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ ملازموں نے بھی، کیونکہ نبیل نے نبیل بلاوجہ ہی مقررہ تنخواہ سے زیادہ پیسے دیئے تھے، حالانکہ ملازموں نے تو کہا بھی نہیں تھا، وہ سب زیادہ پیسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

"صاحب! یہ پیسے؟" ان کے ملازم نے پیسے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا، لیکن نبیل نے ہاتھ اُٹھا کر ملازم کو کچھ کہنے سے روک دیا۔

"یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، رکھ لو۔" اس نے باقاعدہ خود بول کر اپنی خوشی کا اعلان کیا تھا۔

"صاحب! بہت مہربانی ہے آپ کی، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔" ملازم اور ملازمہ دعائیں دیتے ہوئے پلٹ گئے تھے، لیکن نبیل ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی دہلیز میں کھڑی مدیحہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا، کیونکہ وہ ڈائریکٹ اسی کی سمت دیکھ رہی تھی اور اس کے دیکھنے کا انداز خاصا گہرا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی دہلیز سے ہٹ کے نبیل کے ساتھ والے صوفے پہ آبیٹھی۔

"کیا مطلب؟ میری خوشی؟" وہ چان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"خوشی آپ کی ہے، مطلب بھی آپ جانتے ہوں گے، آپ ہمیں نہ بتانا چاہیں تو یہ الگ بات ہے۔" مدیحہ اسے سنجیدگی سے سمجھا رہی تھی۔

"اوہ مدیحہ! کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں کیا نہیں بتانا چاہتا؟" نبیل حیران ہوا تھا۔

"وجہ..... اپنی خوشی کی۔" مدیحہ کا لہجہ مضبوط اور نظریں نبیل پہ جمی ہوئی تھیں۔

"اوہو ری خوشی بتانے کا مرا نہیں آتا، پوری خوشی بتاؤں گا تو تمہیں بھی خوشی ہو گی۔" نبیل بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا، چہرے پہ اس کی خوشی کا عالم اب بھی وہی تھا جو زری کی کال سنتے ہوئے تھا۔

"تو آپ ادھوری خوشی میں اتنے خوش ہو رہے ہیں کہ ملازموں میں پیسے بانٹتے پھر رہے ہیں؟" مدیحہ نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... صرف اسی لیے کہ شاید کوئی غریب خوش ہو کر دل سے دعا دے دے اور میری ادھوری خوشی پوری خوشی میں تبدیل ہو جائے۔" نبیل بڑے دل سے کہہ رہا تھا اور مدیحہ اس کے لہجے کی شدت پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کسی سے محبت کرتے ہیں، آپ نے کبھی بتایا کیوں نہیں؟" مدیحہ کو حقیقتاً نبیل کے اس جذبے کا جان کر بہت حیرانی اور دکھ ہوا تھا۔

"میں کسی سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں، نہ میری ماں اور نہ بہن نے، میرے دونوں دوستوں نے۔"

نبیل کے منہ سے بلا ارادہ ہی شکوہ پھسلا تھا اور مدیحہ کو اس شکوے نے گردن جھکانے پہ مجبور کر دیا تھا، وہ شرمندہ ہوئی تھی۔

''ایم سوری! میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں، میں سمجھتی تھی کہ آپ بھی میری طرح اس جذبے، اس احساس سے خالی، بس جیے جا رہے ہیں، آپ کی کسی بھی لڑکی سے شادی کر دیں گے اور آپ کا گھر بس جائے گا۔'' مدیحہ جو سوچتی تھی وہی کہہ رہی تھی۔ نبیل اس کی بات پہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔

''میری جان! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا جن لوگوں کے دل بس جاتے ہیں، ان لوگوں کے گھر بڑی مشکل سے بستے ہیں، ہمیشہ ایک ہی چیز بستی ہے یا دل یا گھر۔'' نبیل نے خاصی گہری بات کہی تھی، مدیحہ اس کی باتوں پہ حیران ہو رہی تھی۔

''اور جو لوگ لو میرج کر لیتے ہیں؟ وہ تو اپنا گھر بھی بسا لیتے ہیں اور دل بھی؟'' مدیحہ نے اپنے اندازے کے مطابق کہا۔

''ہونہہ..... غلط فہمی ہے تمہاری، کبھی قریب سے مشاہدہ کرنا، پھر تمہیں پتا چلے گا کہ گھر بسانے کی کوشش میں دل اُجڑ چکا ہوتا ہے اور جن لوگوں کا گھر بھی بستا ہے اور دل بھی وہ لوگ دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔'' نبیل کی بات پہ مدیحہ کو اتفاق کرنا ہی پڑا تھا، کیونکہ اس نے سو فیصد درست بات کہی تھی۔

''اللہ کرے کہ آپ کا بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہو۔'' مدیحہ نے روایتی بہنوں کی طرح دُعا دی تھی۔

''آمین.....'' نبیل نے صدق دل سے آمین کہا۔

''تو پھر آپ بتا دیں نا کہ کون ہے وہ لڑکی جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟'' مدیحہ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھ ہی لیا تھا اور نبیل اس کی بات پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

''صبر میری جان صبر، دل آور کو آنے دو، پھر سب پتا چل جائے گا تمہیں۔''

''کیا مطلب؟ دل آور بھائی کو بھی اس سلسلے کا پتا ہے؟''

''نہیں پتا کیونکہ میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں، ہاں اب وہ آئے گا تو ضرور شیئر کروں گا۔''

''اوہ تو یعنی آپ سب سے چھپائے پھر رہے ہیں؟'' مدیحہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہہ سکتی ہو۔'' اس نے بھی اثبات میں جواب دیا۔

''اوکے ایز یو وش، دل آور بھائی کے آنے کا ہی انتظار کر لیتے ہیں۔''

''بالکل میں بھی اس کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔'' نبیل جیسے کوئی ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔

''ٹھیک ہے، پھر میں چلتی ہوں، آپ سے بعد میں ملاقات ہوتی ہے۔'' مدیحہ اپنی گاڑی کی چابی اُٹھاتے ہوئے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''مدیحہ.....''

''جی بھائی؟'' نبیل کی آواز پہ اس کے قدم تھم گئے تھے۔

''میں نے سنا ہے جیری پاکستان آیا ہوا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟'' نبیل کا لہجہ اور انداز سنجیدہ ہو چکے تھے۔

''جی آپ نے ٹھیک سنا ہے، وہ کل ہی پاکستان آیا ہے، ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے، میں اس وقت اسے ہی پک کرنے جا رہی ہوں۔'' اس نے بغیر جھجکے اور بغیر رُکے اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔ نبیل کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''ڈونٹ وری! وہ ہمارے نام نہاد بابا جیسا نہیں اور بدنیت نہیں ہے، اس کا کریکٹر ہمارے بابا کے کریکٹر سے لاکھ درجہ بہتر اور اچھا ہے۔ بدکردار نہیں ہے وہ اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہے عزت کرنا بھی جانتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی ریلیشن نہیں ہے، جس کی وجہ سے آپ کو شرمندہ ہونا پڑے اور گردن جھکانی پڑے، وہ میرا محض ایک دوست ہے، اس کے علاوہ اور کچھ مت سمجھیے گا، اس وقت وہ پاکستان میں ہمارا مہمان ہے اور مہمان نوازی کرنا ہمارا حق بنتا ہے، مجھے یہ حق نبھانے سے مت روکیے گا۔'' مدیحہ نے نبیل کے سامنے ہر بات واضح کر دی تھی اور نبیل اس کی ساری بات سمجھ گیا تھا، اسی لیے سر کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی، وہ جان چکا تھا کہ مدیحہ اتنی سرکشی دکھاتی ہے تو کیوں؟ وہ غلط نہیں تھی، بس طریقہ غلط تھا۔

♥

''زوبیہ، زوبیہ نیچے آؤ دونوں۔'' مریم نے صحن میں کھڑے ہو کر چھت پہ کھیلتی دونوں بہنوں کو آواز دی تھی۔

"ی آپی؟" وہ دونوں اُچھلتی کودتی نیچے اُتر آئیں۔

"دونوں اپنا ہوم ورک ختم کرو۔" مریم نے برآمدے میں تخت پہ رکھے ان کے سکول بیگز کی طرف اشارہ کیا۔

"آپی! رات کو ختم کرلیں گے۔" زوبی نے لجاجت سے کہا۔

"ہرگز نہیں رات کو لائٹ نہیں ہوتی، اندھیرے میں تم لوگوں سے پڑھا نہیں جاتا، نیند آجاتی ہے، اس لیے ابھی بیٹھو اور ختم کرو شاباش....." اس نے انہیں برآمدے کی سمت دھکیلا تھا اور خود کچن کی سمت آگئی، کیونکہ رات کے کھانے کے لیے تیاری بھی تو کرنی تھی۔

"امی! اس سے تو بہتر ہے کہ میں کالج چھوڑ دوں۔" کچن سے سنائی دیتی ایمن کی آواز پہ مریم کے قدم باہر برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔

"تو بیٹا تم بتاؤ اور کیا کروں؟ اگر میرے پاس کچھ پیسے ہوتے تو میں تمہارے ابا جی کی دوائی لے آتی، کل سے انہوں نے دوائی نہیں لی اور میں نے عدیل اور مریم کے سامنے بھی ذکر نہیں کیا کہ ان کی دوائی ختم ہو چکی ہے، وہ دونوں بھی پریشان ہوں گے، عدیل اپنی تنخواہ پہلے ہی ایڈوانس لے چکا ہے اور کہاں سے لے گا بھلا؟" عابدہ خاتون کی پریشان اور متفکر سی آواز پہ مریم جیسے مجسمہ سی ہو گئی تھی۔ ابا جی نے کل سے دوائی نہیں کھائی تھی اور ان لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا؟ مریم سوچ کر ہی پریشان ہو گئی۔

"اگر وہ دوائی نہیں لیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے؟ اب کیا ہو گا؟ عدیل بھائی بھی ایڈوانس لے چکے ہیں، اُف، کیا کریں اب؟" مریم کی پریشانی کا گھوڑا بے سمت دوڑ پڑا تھا، اب اسے چین نہیں تھا۔

"امی! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ میں کالج چھوڑ دیتی ہوں، یہ فیس اور کتابوں کا خرچہ سب فضول ہے، ایمان بھی کالج چھوڑ دے گی، اس طرح کچھ تو بوجھ کم ہو گا۔" ایمن الٹا امی کو سمجھا رہی تھی اور مریم تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں آکر بستر پہ ڈھے سی گئی۔

اس مسئلے کا کوئی حل بجھائی نہیں دے رہا تھا، صرف ایک کمانے والا تھا اور پورا گھر کھانے والا تھا۔ اور اس کی جاب بھی ایسی تھی کہ بمشکل گزارا ہوتا تھا، اوپر سے ابا جی کی بیماری ان کا علاج آخر کیا کچھ ہو سکتا تھا اکیلے بندے سے۔" مریم سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگی۔

"مریم آپی! وہ فاطمہ آپی آئی ہیں۔" ایمان نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطلاع دی اور مریم یکدم اُٹھ بیٹھی۔

"فاطمہ آئی ہے؟" اسے حیرانی ہوئی تھی۔

"جی ہاں فاطمہ آئی ہے، کیونکہ آپ جو نہیں آتیں۔" فاطمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کے بجائے شکوہ کیا تھا۔

"السلام علیکم۔" مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام! آج حجرہ نشین کیوں ہوئی بیٹھی ہو؟" فاطمہ نے چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آج دل پہ تھوڑا بوجھ آگیا ہے، باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" مریم بے ساختہ کہہ گئی تھی۔

"دل پہ بوجھ آگیا ہے؟ مگر کس قسم کا؟" فاطمہ کو حیرانی ہوئی تھی کہ مریم پہلی بار اس سے کچھ ڈسکس کر رہی ہے۔

"جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے فاطمہ! میں بس اپنے گھر کے حالات کی طرف سے پریشان ہوں، چند دن پہلے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی، وہ ہاسپٹلائز رہے ہیں، کافی خرچہ اُٹھانا پڑا عدیل بھائی کو، اب گھر کے اور اسکول کالجز کے بھی اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ کیا بتاؤں تمہیں۔" مریم اتنی پریشان تھی کہ سب کہہ دیا تھا، حالانکہ پہلے وہ اپنے گھر کے حالات کبھی کسی سے شیئر نہیں کرتی تھی، لیکن آج اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے؟" فاطمہ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سر ہلایا۔

"یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے فاطمہ۔"

"میں جانتی ہوں یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے، اسی لیے تو تمہارے لیے ایک آفر لے کر آئی ہوں، باوجود اس کے کہ تم اور تمہارا بھائی پہلے بھی ایک آفر ٹھکرا چکے ہو۔" فاطمہ کی بات پہ مریم نے یکدم جھٹکے سے سر اُٹھا کر دیکھا۔

"آفر..... کیسی آفر.....؟" مریم نے اچنبھے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے لیے جاب کی آفر۔'' فاطمہ نے مختصر بتایا۔

''میرے لیے جاب کی آفر؟ فاطمہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' مریم کو دھچکے و دھچکے سے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

''میں جو کہہ رہی ہوں، تم سن رہی ہو، کیا خیال ہے کرو گی جاب؟'' فاطمہ نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں جاب.....'' مریم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اگر گھر کے حالات بہتر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ آفر قبول کر لینی چاہیے، ایک آدمی آج کل کے مہنگائی کے دور میں گھر نہیں چلا سکتا، بیماریوں کے علاج، گھر کے اخراجات، اسکول اور کالجز کی فیسیں اور دیگر ضروریات واقعی ایک آدمی سے ہینڈل نہیں ہو سکتیں، گھر کے باقی افراد کو بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے، اور میرا خیال ہے کہ یہ موقع اللہ نے تمہیں دیا ہے، اب کی بار ٹھکرانا مت، ورنہ پچھتاؤ گی۔'' فاطمہ اسے سمجھا رہی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی۔ مریم کو احساس ہو چکا تھا کہ فاطمہ ٹھیک کہہ رہی ہے، حالانکہ مریم نے پہلے بھی ایک، دو بار جاب کرنے کی بات کی تھی، لیکن عدیل نے سختی سے منع کر دیا تھا، لیکن آج کل گھر کے جو حالات جا رہے تھے، ان کے پیش نظر ضروری تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے مقام پہ ڈٹ جاتی، ورنہ عدیل اکیلا ہی اس چکی میں پستا رہتا۔

''اب کیا سوچ رہی ہو؟'' فاطمہ نے خفگی سے ٹہوکا دیا۔

''سوچ نہیں رہی، فیصلہ کر رہی ہوں۔'' مریم بے حد سنجیدہ تھی۔

''کیسا فیصلہ؟''

''جاب کرنے کا۔''

''ہوں..... اچھی بات ہے، کرنا چاہیے۔'' فاطمہ نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور مریم نے آخر کار فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

''ٹھیک ہے، مجھے یہ آفر قبول ہے، تم بتاؤ جاب کیا ہے؟'' مریم ایک مضبوط فیصلہ کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

''ارے جاب تو بہت ایزی ہے تمہارے لیے، میری آنٹی کی ایک پرائیویٹ انگلش اکیڈمی ہے، انہیں ایک اچھے مزاج کی فی میل ٹیچر کی ضرورت ہے، وہ تو آج اخبار میں اشتہار دینا چاہ رہی تھیں، لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ایک بار مجھے زبانی کر لینے دیں، مجھے سب سے پہلا خیال تمہارا ہی آیا تھا، اکیڈمی کا ماحول بہت ہی اچھا ہے اور سیلری بھی بہت اچھی ہوگی، تمہیں شکایت نہیں ہو گی، اور یہ جاب ایسی ہے کہ تمہیں کسی بھی انٹرویو کی کوفت نہیں اُٹھانا پڑے گی، وہ تو تمہیں فوراً اپائنٹ کر لیں گی، بس تمہارے ہامی بھرنے کی دیر ہے۔'' فاطمہ اس کے لیے ڈھال بن گئی تھی، مریم کو اور بھلا کیا چاہیے تھا، اس نے ہامی بھر لی تھی اور فاطمہ اس کے فیصلہ پہ بے حد خوش ہوئی تھی۔

♥

اس کا پیپر ختم ہو چکا تھا، وہ فارغ ہو چکی تھی، اس لیے اپنے ٹیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے وہ کمپیوٹر لیب میں آ گئی، جہاں اسٹڈی کرتے کرتے اسے ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور جب ہوش آیا تو اپنے سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

''اُف خدایا! اتنا ٹائم ہو گیا ہے؟'' اس نے اپنے موبائل سے ٹائم چیک کرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

''عبداللہ بھائی کی کال بھی نہیں آئی؟'' وہ سارا پھیلاوا سمیٹتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور کمپیوٹر لیب سے نکلتے ہی عبداللہ کا نمبر ڈائل کیا تھا، دوسری طرف پہلی رنگ پہ ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو.....''

''السلام علیکم بھائی! آپ آئے کیوں نہیں؟ اور نہ ہی کال کی ہے آپ نے؟ اتنا ٹائم ہو رہا ہے۔'' زری ٹائم دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوتا، مجھے پتا تھا کہ تم پیپر کی تیاری کر رہی ہو، اس لیے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا، اب تم تیار رہو میں بس آ رہا ہوں۔'' عبداللہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ زری اپنا دوپٹہ اور اسکارف اچھی طرح اوڑھتی ہوئی یونیورسٹی کا طویل ترین احاطہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی گیٹ سے نکل آئی، اسے پتا تھا کہ عبداللہ کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، وہ بس بیک میں کام کرتا تھا وہ اس کی یونیورسٹی سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے وہ زری کو آسانی سے پک اینڈ ڈراپ کر دیتا تھا، زری کو ابھی وہاں کھڑے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ یکدم اس کا رنگ فق ہو گیا، اس کے دائیں طرف سے ملک اسد اللہ کی آواز اُبھری تھی۔

''کہاں تھیں اتنی دیر سے؟ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟ اتنا لمبا ہو گیا تھا تمہارا پیپر؟'' وہ عین اس کے سامنے؟

کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے زری کو سرتاپا قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا، وہ اپنی جگہ پہ کانپ کے رہ گئی تھی۔

"وہ..... میں اپنے نیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے لیب میں چلی گئی تھی، عبداللہ بھائی کو میں نے صبح ہی بتا دیا تھا۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بمشکل جواب دیا تھا کہ کہیں جواب نہ دینے پہ وہ مزید غضب سے نہ بھر جائیں۔

"اپنے عبداللہ بھائی کی بات ہم سے نہ ہی کرو تو بہتر ہے، خیر چھوڑو اس قصے کو، آؤ ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔" انہوں نے زری کو کہتے ہوئے ذرا فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کی سمت اشارہ کیا۔

"نن..... نہیں تھینک یو، عبداللہ بھائی مجھے لینے کے لیے آ رہے ہیں، ابھی فون پہ بات ہوئی ہے ان سے۔" زری ان کے ساتھ جانے کا کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی، وہ اسے آتے جاتے اپنی موت کے فرشتے کی طرح دکھائی دیتے تھے، اور اپنی موت کے فرشتے کے ساتھ اپنی مرضی سے کیسے جا سکتی تھی بھلا؟

"ہم بھی تو تمہیں ہی لینے کے لیے آئے ہیں؟" وہ کافی سخت اور برفیلے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"جی..... وہ تو..... ٹھیک ہے، لیکن..... وہ عبداللہ بھائی بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس وقت زری پہ ایک ایک لمحہ عذاب گزر رہا تھا، ان کی دہشت ہی اتنی تھی کہ ایسے ٹھنڈے اور یخ بستہ موسم میں وہ اور بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں بالکل یخ ہو رہے تھے اور ماتھے پہ بھی ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں، اسے منع کر دو، ہمارے ساتھ چلو۔" انہوں نے اسے دوبارہ چلنے کا اشارہ کیا۔

"ایم سوری بھائی! میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔" اس نے انکار کر دیا تھا اور ملک اسد اللہ ایسے صاف انکار پہ آگ کی طرح بھڑک اٹھے تھے۔

"تم ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کر رہی ہو؟" ان کی غضبناک دھاڑ پہ آس پاس کے لوگ بھی ٹھہر گئے تھے، زری نے شرمندگی اور خوف سے چہرہ جھکا لیا، وہ ان کے اس قدر غیض و غضب کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

"دیکھتے ہیں کہ کیسے نہیں جاتی ہو تم۔" انہوں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے زری کا بازو دبوچا اور اسے کھینچتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے آئے تھے۔

"نہیں بھائی صاحب! اس طرح تو نہیں نا۔" عبداللہ نے ان کا بازو تھام کے انہیں روک دیا تھا، وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہے تھے۔

"دیکھو ملک عبداللہ! ہم تمہیں بار بار سمجھا رہے ہیں کہ ہمارے راستے میں مت آؤ، مت ٹانگ اڑاؤ اس معاملے میں۔" انہوں نے جیسے عبداللہ کو دھمکی دی تھی۔

"کیا کر لیں گے آپ؟ زری کو اپنے ساتھ لے جائیں گے؟ ہونہہ دیکھتا ہوں میں کہ کیسے لے کر جاتے ہیں۔" عبداللہ بھی غصے سے کہہ رہا تھا اور پھر وہاں سے پلٹ کر اپنی گاڑی کی سمت چلا گیا۔ ملک اسد اللہ زری کو دوبارہ اپنی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگے، اس سے پہلے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوتے ایک پولیس کار جھٹکے سے ان کے قریب آ رکی، انہوں نے ملک اسد اللہ کو ہینڈز میں اریسٹ کر لیا تھا اور زری ملک اسد اللہ کو پولیس والوں کے شکنجے میں دیکھ کر ششدر سی رہ گئی تھی۔

"بھائی!" اس نے پلٹ کر عبداللہ کی سمت دیکھا وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا کسی کا فون سن رہا تھا۔

"بھائی پلیز روکیں انہیں وہ اسد بھائی کو لے کر جا رہے ہیں۔" زری ایک بہن تھی، اپنے بھائی کو مشکل میں دیکھ کر رہ بھی نہیں سکتی تھی، وہ بھاگتی ہوئی عبداللہ کے قریب آئی تھی۔

"ان کے سنگین عزائم کے آگے بند باندھنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے، جانے دو فی الحال، انہیں بھی تو پتا چلے کہ جیل کی سلاخیں کس چیز کا نام ہے؟ پاکستان میں تو چوہدری اور ملک لوگ جیل میں بند ہونا اپنی توہین سمجھتے ہیں، اپنی جگہ غریبوں کے بچوں کو پیش کر دیتے ہیں اور وہ بے گناہ چاہے جتنے سال جیل میں سڑتا رہے، انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔" عبداللہ اپنے جاگیردارانہ ماحول کو کافی اچھی طرح جانتا تھا اور مخالفت بھی کرتا تھا، لیکن اپنے بابا جان اور بھائی صاحب کے سامنے کبھی اس کی ایک بھی نہیں چلی تھی، اسی لیے تو وہ ان لوگوں سے دور ہو گیا تھا۔

"لیکن بھائی! یہاں پر ویس میں وہ جیل میں قید کاٹیں گے، کیا یہ اچھے لگے گا؟" زری پھر بھی اس کا بھلا چاہ رہی تھی۔

"وہ اگر جیل میں قید نہیں کاٹیں گے تو تم پاکستان جا کر قید کاٹو گی۔" عبداللہ کا لہجہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ بھی تو تمہیں ملک حق نواز کی قید میں دینا چاہتے ہیں، آج اگر ڈٹ جاؤ گی تو کل اس قید سے بچ جاؤ گی، انہیں جانے دو، تاکہ انہیں پتا چلے کہ تم کمزور نہیں ہو۔" عبداللہ اسے سمجھا رہا تھا، لیکن زری جو اپنے سینے میں موم کا دل رکھتی تھی، وہ اس موم کے دل کو پتھر کا دل نہیں بنا سکتی تھی، وہ اس وقت اپنے بارے میں نہیں، بلکہ اسد اللہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی، آپ فی الحال انہیں آزاد کروا دیں، میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے انہیں تکلیف اٹھانا پڑے اور مجھے بابا جان اور بی بی جان کے سامنے شرمندگی ہو، اگر وہ جیل چلے گئے تو بی بی جان کو بھی تکلیف ہوگی۔" زری آہستگی سے سر جھکائے کہہ رہی تھی اور عبداللہ اس کے دھیمے سے لہجے اور جھکے ہوئے سر کو دیکھ کے رہ گیا اور پھر تاسف سے ایک گہری سانس کھینچی تھی۔

"کاش کہ وہ بھی اپنی بہن کے لیے اسی طرح کچھ اچھا سوچ لیں، جیسا وہ ان کے لیے سوچ رہی ہے۔" عبداللہ نے اپنے موبائل پہ کسی کو کال ملاتے ہوئے کچھ کہا تھا اور پھر ملک اسد اللہ کو آزاد کرنے کا کہہ کر خود گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

"بیٹھو....." اس نے زری کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"لیکن وہ اسد بھائی۔" اس نے ذرا فاصلے پہ کھڑے اسد اللہ اور پولیس آفیسرز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ وری پانچ منٹ بعد چھوڑ دیں گے تم بیٹھو۔" عبداللہ نے اسے تسلی دلائی تھی اور تب جا کے اس نے قدم آگے بڑھائے تھے۔ ملک اسد اللہ کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے، وہ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہی تھی، البتہ ملک اسد اللہ نے صرف ایک بار دیکھا تھا، وہ بھی عبداللہ کی سمت دیکھا تھا، لیکن ان کا ایک بار دیکھنا بھی غضب کا تھا۔

عبداللہ اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا اور زری اس واقعے پہ چپ ہو کے رہ گئی تھی، نہ جانے ابھی اور کیا کچھ ہونا باقی تھا؟

♥

بہت بے چین رہتی ہے طبیعت ایک مدت سے
دل و جاں کو نہیں مل پائی راحت ایک مدت سے

بہت مجبور ہوں ورنہ بہت محسوس کرتا ہوں
مری جاں تم سے ملنے کی ضرورت ایک مدت سے

تمہارے غم سے گھبرا کر میں اب لوگوں سے کہتا ہوں
کہ میں نے ترک کر دی ہے محبت ایک مدت سے

اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا تو لیپ ٹاپ کی وال پہ یہ تین اشعار اسے سیاہ رنگ کے لفظوں میں لکھے نظر آئے تھے۔ اس کی وال پیپر کا کلر کمبی نیشن بلیک اینڈ وائٹ تھا، سفید اسکرین پہ سیاہ رنگ کے چنار کے پتوں کے درمیان لکھے یہ اشعار بے پناہ اداسی کا اعلان کر رہے تھے اور وہ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اور بھی بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا اسی لیے لیپ ٹاپ کو وہیں بیڈ پہ چھوڑ کے بیڈ سے اٹھ گیا، آج نہ جانے کیوں اسے بار بار کسی کا خیال ستا رہا تھا۔ ورنہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ دل آوارہ شاہ کو بے چینی لاحق ہوتی۔ اور جب ہوتی تھی تو وہ اپنے مضطرب دل کو اندر ہی اندر مارنے کی اور اس کی خواہش اور احساسات دبانے کی کوشش کرتا تھا، اب سگریٹ پہ سگریٹ سلگتا رہتا اور وہ اپنے اندر کا غبار سگریٹ کے دھوئیں کی صورت باہر نکالتا رہتا تھا۔

"آپ کچھ بے چین سے لگتے ہیں؟" زری کی دھیمی آنچ دیتی آواز پہ دل آور نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے اسے دیکھا تھا، وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بڑی تمکنت سے بیٹھی اس دیکھ رہی تھی اور اپنے دل کی پیاس کو قطرہ قطرہ سیراب کر رہی تھی، اس لیے وہ خود کو دنیا کی امیر ترین عورت تصور کر رہی تھی، جس کا محبوب سرتاپا اس کے سامنے تھا اور سر جھکائے غلاموں کی طرح بیٹھا تھا، اس لمحے اسے دو جہاں کے والی سے اور کچھ نہیں چاہیے تھا، بس صرف ایک خواہش تھی کہ یا لمحے ٹھہر جائیں، یا پھر یونہی بیٹھے بیٹھے عمر تمام

ہو جائے لیکن وہ تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں چاہتا تھا، نہ لمحوں کو ٹھہرانا چاہتا تھا، نہ عمر بتانا چاہتا تھا، کیونکہ وہ ایک حقیقت پسند آدمی تھا، حقیقت کو افسانہ سمجھ کے زری کی طرح خوش نہیں ہو سکتا تھا۔

''کس لیے بے چین ہیں؟ میری وجہ سے یا اس تنہائی کی وجہ سے؟'' وہ اسے بولنے پہ اُکسا رہی تھی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' اس نے پھر چہرہ جھکا لیا۔

''تو آپ صحیح سمجھا دیں۔'' زری میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی کہ اس سے سوال جواب کرنے بیٹھ گئی تھی۔

''عبداللہ کو اور کتنی دیر لگے گی؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جتنی دیر آپ کو بے چینی بتانے میں لگے گی۔'' زری تو جیسے اسے ستا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔'' وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے۔

''مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی کہ آپ بھی نظر چرانے والوں میں سے ہوں گے۔'' زری کی آواز پہ دل آور کے قدم تھم گئے تھے۔

''مجھے بھی آپ سے یہ اُمید نہیں تھی کہ آپ نظر جمانے والوں میں سے ہوں گی۔'' دل آور نے واپس پلٹتے ہوئے برجستہ جواب دیا تھا اور زری بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی کا سحر ایسا تھا کہ دل آور نے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا لیکن ان کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اس کی ساعتوں میں زری کی اس ہنسی کی کھنک باقی رہی تھی، وہ عبداللہ سے ملنے آیا تھا، لیکن عبداللہ ویٹنگ روم میں شاور لے رہا تھا اور نگارش اپنے میکے گئی ہوئی تھی، اسی لیے وہ زری کے پاس زیادہ دیر تنہا نہیں بیٹھا تھا، وہ آج جس موڈ میں تھی وہ دل آور شاہ کو بھی بے چین کر رہی تھی، اسی لیے تو وہ اُٹھ آیا تھا، لیکن گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان زری کی طرف ہی تھا۔ اور اس وقت بھی اس کا دھیان اسی کی طرف تھا جب اس دھیان کے تسلسل کو فجر کی اذان نے توڑ دیا تھا۔

دل آور نے چونک کر دیکھا، اس کا لیپ ٹاپ بیڈ پر ہنوز آن ہی پڑا ہوا تھا اور ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا، اس نے سر جھٹکتے ہوئے سگریٹ جھٹک کر ایش ٹرے میں مسلا اور خود باتھ روم کی سمت بڑھ گیا، اذان ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے وضو کر کے اب نماز بھی پڑھنی تھی، جب ہی اپنے بوجھل اور تھکے تھکے ذہن سے ہر بات جھٹک ڈالی تھی اور پھر نماز کے بعد دعا میں اپنے لیے یقین اور سکون مانگا تھا، اللہ سے صبر اور اطمینان عطا کرنے کی درخواست کی تھی، وہ آج حقیقتاً اُداس اور بجھا بجھا سا تھا، شاید زری والی بات ہی اس کے اندر اُتر آئی تھی، وہ اسے بے وجہ ہی یاد کر رہا تھا، دل کو بے کلی لاحق تھی۔

♥

مری کا موسم آج بھی بہت اچھا ہو رہا تھا۔

سب ہی اپنے وقت پہ بیدار ہو گئے تھے، لیکن صرف علیزے تھی جو ابھی تک سو رہی تھی، اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی، اس لیے اس کی نماز بھی قضا ہو چکی تھی، اب تو دن کے ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا، اسی لیے عائشہ آفندی نے رجو کو اسے جگانے کے لیے بھیجا۔ رجو نے باقاعدہ اس کے بیڈ روم کے دروازے کو زور زور سے پیٹا تھا، تب جا کے علیزے کی آنکھ کھلی تھی۔

''کون ہے؟'' اس کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

''بی بی جی! میں ہوں، رجو، دروازہ کھولیں بی بی جی، بہت ٹائم ہو رہا ہے، دن کے بارہ بج رہے ہیں۔'' رجو نے باہر سے ہی اپنا اعلان جاری رکھا تھا۔

''بارہ بج گئے؟'' علیزے نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے کہا، اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور قدم بھی تھوڑے غیر متوازن لگ رہے تھے، کل وہ بہت ڈسٹرب رہی تھی اس لیے رات کو ٹرینکولائزر لے کر سوئی تھی، جب ہی اس وقت اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے، ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔

''جی بارہ بج گئے ہیں، آپ فریش ہو کر آ جائیں، عائشہ بی بی آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔'' رجو کہہ کر چلی گئی اور علیزے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتی ہوئی باتھ روم میں آ گئی اور دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی، اک عجیب سا احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، وہ اپنے ہاتھ، پاؤں، اپنا چہرہ، اپنی گردن چھو چھو کر دیکھ رہی تھی، اتنی دیر سونے کی وجہ سے سارا جسم سویا سویا سا لگ رہا تھا۔ ''علیزے'' اس کے بیڈ روم سے آذر کی آواز سنائی دی۔

"جی آذر بھائی آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی جلدی برش کیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔ "اتنی دیر لگا دی تم نے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" آذر کو تشویش ہو رہی تھی۔

"جی ٹھیک نہیں رات ٹریکولائزر لے کر سوئی تھی اس لیے جلدی آنکھ نہیں کھلی بلکہ اب بھی جسم تھکا تھکا سا لگ رہا ہے۔" وہ سر جھکائے آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری! ابھی فریش ہو جاؤ گی، باہر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، کیا آج نہ ملنے کا ارادہ نہیں ہے۔" آذر اسے فریش کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

"جی ابھی آئی ہوں۔" وہ انکار کر کے ان لوگوں کا موڈ نہیں خراب کرنا چاہتی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لیتی تھی۔

"او کے جلدی آ جاؤ۔" وہ اس کا ہاتھ تھپک کے باہر نکل گیا اور علیزے گرم کپڑے پہننے لگی، وہ تھوڑی دیر میں باہر آئی تو واقعی سب ہی منتظر تھے۔

"لیجیے شہزادی علیزے آ چکی ہیں، اب قافلے کو روانگی کی اجازت دیجیے۔" کومل کا لہجہ دھیما لیکن طنزیہ اور کاٹ دار تھا آذر نے آج پھر اسے چونک کر دیکھا تھا کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں کھڑا تھا بآسانی سن سکتا تھا۔ اور اس کی بات سن کر آذر کو آج بھی سخت الجھن اور حیرت ہوئی تھی کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ ایسا کیوں تھا آخر؟

"کیا بات ہے آج اتنا لیٹ کیوں ہو گئیں؟" عائشہ آفندی کو بھی اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔

"بس نیند گہری تھی اس لیے وقت کا احساس نہیں ہوا، ایم سوری کہ آپ سب کو میری وجہ سے انتظار کرنا پڑا۔" علیزے نے بے حد آہستگی سے کہتے ہوئے کومل کی سمت دیکھا تھا۔ جس کے چہرے کی ناگواری وہ پہلے تو نہیں لیکن اب بآسانی محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ کومل کے اندر کی کاٹ اور ناگواری کی جھلک دیکھ چکی تھی۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیئر! تم پورا دن بھی سوئی رہتیں تو ہم پورا دن انتظار کر سکتے تھے۔" دانیال نے مسکرا کر اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو بھائی! اٹس مائی پلیژر۔" علیزے کا لہجہ سنجیدہ تھا وہ کل سے کچھ چپ چپ سی تھی اسے کومل کا شک اندر ہی اندر کسی پن کی طرح چبھ رہا تھا۔

"چلو پھر جلدی سے ناشتہ کرو، آج نتھیا گلی کے لیے نکلنے ہیں۔" دانیال نے اسے ناشتہ یاد دلایا۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے، آپ چلیں میں راستے سے کچھ لے لوں گی۔" علیزے کو واقعی بھوک نہیں تھی اس کے انکار پہ سب کھڑے ہو چکے تھے ان کا رخ باہر گاڑیوں کی سمت تھا عائشہ آفندی کے ساتھ علیزے بھی دھیمے اور سست قدم اٹھاتی باہر نکل آئی تھی۔

سامنے ہی روش پہ منصور حسین گاڑی کا دروازہ کھولے الرٹ کھڑا تھا علیزے کی ڈائریکٹ نظر اسی پہ پڑی تھی اور اتفاقاً منصور حسین نے بھی اسی پل نظریں اٹھا کر اندرونی مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتی علیزے کی سمت دیکھا تھا نظروں کا یہ تصادم علیزے کے لیے خفت کا باعث تھا اسے جب بھی اپنا منصور حسین سے لپٹنا یاد آتا تھا وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ جاتی تھی، یہی وجہ تھی کہ کل سے اس کا منصور حسین سے نظر ملانا محال ہو گیا تھا، ایک کومل والی بات اور دوسری اپنی بدحواسی میں کی گئی حرکت، دونوں ہی اس کے ڈوب مرنے کے لیے کافی تھیں، منصور حسین نے بھی اسے دیکھ کر نظریں جھکا لی تھیں اور جب وہ اس کے پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھی تو وہ دروازہ بند کر کے اپنی سائیڈ پہ آ گیا دوسری گاڑیاں رفتہ رفتہ نکل چکی تھیں۔

وہ بھی گاڑی بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر لے آیا تھا، آج عائشہ آفندی علیزے کے ساتھ تھیں اور رجو منصور حسین کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے علیزے بیٹا! تم اداس اور چپ چپ سی لگ رہی ہو؟" عائشہ آفندی پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں علیزے کی خاموشی سب ہی کو محسوس ہو رہی تھی۔

"ارے پھوپھو! میں نے بتایا تو ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، بس تھکن ہو رہی ہے، کبھی اتنا سفر جو نہیں کیا اور پھر پورا دن گھومنا پھرنا، میری تو ٹانگوں اور پاؤں کی ایڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے، میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔" علیزے نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے تسلی دی۔

"تو کسی روز ریسٹ کر لو نا۔" انہوں نے اپنے ہاتھ سے علیزے کے چہرے پہ آئے بال پیچھے ہٹائے تھے۔
"میرا ریسٹ کرنا دوسروں کو نا گوار گزرتا ہے۔" علیزے کا لہجہ ذرا سا بھیگ گیا اس سے کومل کی ناگواری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"کس کو ناگوار گزرتا ہے؟" عائشہ آفندی کو اچنبھا ہوا۔
"ہوں..... کسی کو بھی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی طرف سے بات ٹالنے کی کوشش کی تھی۔
"مگر بیٹا....."

"پلیز آپ اس بات کو رہنے دیں، زیادہ کریدنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔" علیزے نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور عائشہ آفندی چپ ہو گئی تھیں وہ بھی تو زہرہ سے ملنا چاہتی تھیں، اسے کریدنا چاہتی تھیں، کیا اسے بھی اس کریدنے پہ تکلیف ہو سکتی تھی؟ لیکن عائشہ آفندی کو اس طرح یہ پتا تو چل سکتا تھا نا کہ وہ انہیں بتاتا ہے سب کچھ چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ کیوں کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا؟ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ پیچھے عائشہ پہ کیا گزر رہی ہے؟ کیا بیتی ہے اس کی ذات پہ؟ عائشہ آفندی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"چپ چپ! کیا سوچ رہی ہیں؟"
"کچھ نہیں بیٹا۔" انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے کہا اور علیزے کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

♥

"جس طرف بھی دیکھ رہا ہوں، ہر طرف سوچیں ہی سوچیں نظر آ رہی ہیں، کیا بات ہے؟ تم بھی سوچ میں گم ہو گئے؟" دانیال سے کہتا ہوا آذر کے برابر ایک پہاڑی کے اوپر بنی ریلنگ کے قریب آ کھڑا ہوا۔
"کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں اس وقت ہر چہرے پہ گہری سوچ کے سائے دیکھ رہا ہوں، امی بھی سوچ میں گم ہیں، علیزے بھی چپ اور پر سوچ سی ہے، کومل کے چہرے کا بھی یہی حال ہے اور ادھر تم بھی اسی مرض کا شکار ہوئے کھڑے ہو۔" دانیال کی خفگی ہنوز تھی۔

"دانیال! تم نہیں جانتے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟" آذر بے حد الجھا ہوا تھا۔
"ہونہہ..... تمہارے جیسا بے خبر نہیں ہوں میں۔" دانیال استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا، آذر نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"میرے جیسا بے خبر؟ کیا مطلب؟"
"تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟" دانیال کے اندازے پہ آذر کی آنکھیں حیرت سے بے یقینی سے پھیل گئیں کہ اس نے اس قدر درست اندازہ کیسے لگا لیا؟
"دانیال! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" آذر حیران پریشان تھا۔
"میں کہہ رہا ہوں کہ تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ اتنا کھردرا کیوں ہے؟" دانیال تو جیسے کسی نجومی کی طرح سب کچھ پرفیکٹ بتا رہا تھا۔

"دانیال.....؟" وہ حیرت کے مارے مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا اور دانیال نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور آنکھوں کے اس پار ڈوبتے سورج کو دیکھا اور آذر کو وضاحت دی تھی۔

"دن شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے سورج بیدار ہوتا ہے اور یہ سورج پورا دن پوری کائنات پہ راج کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سورج ڈوب جاتا ہے اور آسمان کے سینے پہ چاند جگمگانے لگتا ہے، ٹھنڈی میٹھی روشنیوں والا چاند، سب ہی اس چاند کو اس کی نرمی اور ٹھنڈک کی وجہ سے پسند کرتے ہیں اور لوگوں کی اس پسندیدگی کی وجہ سے سورج کو چاند سے جلن ہونے لگتی ہے اسے اپنے آپ پہ بھی غصہ آتا ہے کہ وہ غروب کیوں ہوتا ہے؟ کیوں چاند کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے؟ لیکن یہ ڈوبنا اور ابھرنا ایک فطرت ہے اور یہ فطرت کہاں سے اب تک جاری رہے گی، اسی طرح سورج کی چاند سے جلن بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔" دانیال، آذر کو ایک مثال دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آذر پھر بھی نا سمجھی سے دیکھ رہا تھا۔

''میری اس مثال کا اشارہ علیزے اور کومل کی طرف ہے، کومل سورج ہے، بڑی حویلی کی بڑی بیٹی، اس نے ہمیشہ اپنے تمام کزنز میں راج کیا ہے؟ لیکن جیسے ہی علیزے پیدا ہوئی، پورے گھر کی توجہ اور پیار محبت علیزے کی سمت منتقل ہو گیا، پورا دن سورج کی دھوپ میں گزارنے والے لوگ چاند کے شیدائی ہوئے تو سورج کو بھی شکایتیں ہونے لگیں، اسے چاند سے حسد اور جلن محسوس ہوتی تھی، بڑی حویلی میں علیزے چاند تھی تو کومل بھی سورج کا سا مقام رکھتی تھی اس لیے یہ پرخاش اس کے دل میں بچپن سے پل آ رہی ہے کسی بھی بچے نے کومل کی حیثیت کو کم نہیں کیا تھا سوائے علیزے کے اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی، آذر صاحب، یہ معاملہ بہت سنگین ہے، یہ قصہ بہت دور تک جاتا ہے۔'' دانیال آج شاید آذر کی آنکھوں سے ناسمجھی کی پٹی اتارنے کے درپے تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب کہ کومل کے ساتھ دل کے معاملے میں بھی ایسا ہی سلوک ہوا ہے، کومل جس کو پسند کرتی ہے وہ علیزے کو پسند کرتا ہے۔'' دانیال کے اس دھماکے پہ آذر دو قدم دور اچھلا تھا، وہ دانیال کو ششدر سا دیکھ رہا تھا، وہ ایسے انکشاف کر رہا تھا کہ آذر دنگ رہ گیا تھا۔

''کومل شاید بچپن کی ساری باتیں اگنور کر کے علیزے کے ساتھ نارمل کزنز کی طرح بی ہیو کرتی لیکن آذر آفندی کی محبت اسے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے، کیونکہ کومل آذر کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے اور آذر، علیزے کو دیکھ کر اس پہ قربان ہوتا ہے، ایسے عالم میں تم بتاؤ کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ درست کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کیسے علیزے کے ساتھ دوستوں کی طرح اور کزنز کی طرح رہ سکتی ہے؟ کیسے بڑی بہنوں کا سا سلوک کر سکتی ہے؟ علیزے اور کومل کے درمیان تم کھڑے ہو میرے دوست اور فیصلہ بے پناہ مشکل ہے کہ کس کو کس طرف جانا چاہیے؟'' دانیال نے آج اس قصے کا سارا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا تھا اور آذر نے بے ساختہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھام لیا کہ مبادا وہ کہیں گر ہی نہ جائے۔

''اور ہاں..... ایک بات اور اس سارے قصے میں علیزے بے گناہ اور انجان ہوتے ہوئے بھی اس چکی میں پس رہی ہے، اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن پھر بھی قصوروار ٹھہرائی جا رہی ہے۔'' دانیال اسے ہر بات سے آگاہ کر رہا تھا۔

''کومل مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' آذر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''کیوں؟ یہ کیوں نہیں ہو سکتا بھلا؟ کیا اس چیز پہ کوئی پابندی ہے؟'' دانیال نے اس کے بچکانہ سے سوال پہ خفگی سے کہا۔

''مگر دانیال.....''

''کیا تم نے اپنے ماتھے پہ لکھوا رکھا ہے کہ تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کوئی تمہیں پسند نہ کرے؟'' دانیال کو آذر کی لاپروائی اور نادانی پہ چڑ ہو رہی تھی۔

''میں علیزے کو پسند کرتا ہوں؟ دانیال تم غلط فہمی کا شکار ہو، میں علیزے کو.....''

''ہاں تم علیزے کو محض اپنی کزن سمجھتے ہو، ہے نا؟ ہونہہ کزنز تو پھر اور بھی بہت ہیں۔ صرف علیزے کے لیے ہی اتنے بلکان کیوں ہوتے ہو؟ وہ تمہارے لیے اتنی اسپیشل کیوں ہے؟ مان لو میرے یار کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے، تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کومل تمہیں پسند کرتی ہے۔ اور پسند کا یہ چکر کچھ مناسب نہیں ہے، کیا بنے گا آخر؟'' دانیال خود بھی متفکر ہو رہا تھا جبکہ آذر تو مزید کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ وہ سب واپسی کا شور مچا رہے تھے اور آذر جیسے مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی تک آیا تھا۔

♥

وہ اپنے دھیان میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھیں، لیکن اندر داخل ہوتے ہی انہیں شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا، بیڈ روم سگریٹ کے دھوئیں سے دھواں دھواں ہو رہا تھا اور اس قدر زہریلے دھوئیں سے ان کا دم گھٹ گیا۔

وہ کھانستے ہوئے بمشکل کھڑکی تک گئی تھیں اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔

''وقار! یہ آپ اسموکنگ کر رہے ہیں؟ اتنی زیادہ..... ہر چیز دھواں دھواں ہو گئی ہے۔'' آسیہ آفندی ان کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہے تھے۔

''کھڑکی بند کر دو آسیہ۔'' انہوں نے بے حد گمبھیر اور بوجھل آواز سے کہا تھا۔

''کیسے بند کر دوں کھڑکی؟ پورا بیڈ روم جس زدہ ہو رہا ہے آپ کا دم نہیں گھٹ رہا؟'' آسیہ آفندی پریشانی سے جھنجلا رہی تھیں۔

''دم گھٹ رہا ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کھڑکی بند کر دو۔'' وقار آفندی کا لہجہ بہت عجیب ہو رہا تھا، آسیہ آفندی بے بس سی کھڑی تھیں آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا ان کو اس حال میں دن رات تمام کرتے ہوئے اور ان کو پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا ان سے اس حال کی وجہ پوچھتے ہوئے، وہ جب زیادہ اصرار کرتی تھیں تو وقار آفندی غصے سے ڈانٹ دیتے تھے اور وہ ہزاروں اُلجھنیں ذہن میں لیے پلٹ جاتی تھیں۔

''ایسی کیا بات ہے آخر جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرتے؟'' آسیہ آفندی ان کے قریب آ گئی تھیں اور وقار آفندی نے ان کے سوال کو نظر انداز کر کے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے ہنکارا بھرا۔

''علیزے کے برتھ ڈے میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں ان لوگوں کو کہو صبح واپس آ جائیں۔'' ان کو اس حال میں بھی علیزے کا برتھ ڈے یاد تھا، اتنے دنوں بعد کوئی بات کی بھی تھی تو علیزے کی۔ آسیہ آفندی چپ سی ہو گئیں۔

''علیزے کا برتھ ڈے یاد ہے آپ کو؟''

''ہونہہ تمہیں کس نے کہا کہ میں بھول گیا ہوں؟'' وہ استہزائیہ ہنسے تھے۔

''علیزے انیس سال کی ہو رہی ہے، اس کی انیس برتھ ڈیز سیلیبریٹ کی ہیں میں نے کوئی ایک بھی بھولا ہوں تو بتاؤ مجھے؟'' یہ ان کا ریکارڈ تھا کہ انہوں نے علیزے کا ایک بھی برتھ ڈے مس نہیں کیا تھا، وہ ہمیشہ ہر سال کہیں ملک سے باہر بھی ہوتے تھے تو اس کے برتھ ڈے پر ضرور واپس آ جاتے تھے اور کافی دھوم دھام سے سیلیبریٹ کرتے تھے تو اس بار کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کا برتھ ڈے سیلیبریٹ نہ ہوتا اور مس ہو جاتا؟

''لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس بار برتھ ڈے مس ہو جائے گا، کوئی سیلیبریشن نہیں ہو گی۔'' آسیہ آفندی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وقار آفندی کی زندگی میں علیزے کی کوئی بھی خوشی مس نہیں ہو سکتی، ان شاء اللہ جب تک زندہ ہوں یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔'' وہ پُرعزم سے لہجے میں کہتے ہوئے راکنگ چیئر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ذرا فریش ہونے کے لیے باتھ روم کا رُخ کیا اور آسیہ، آذر کو فون کرنے کے لیے چل دیں۔

وقار آفندی نے اتنے دنوں بعد اپنی چپ کا روزہ توڑا تھا اس لیے آسیہ آفندی کے لیے فی الحال یہ بھی کافی تھا کہ چلو انہوں نے کسی کام میں دلچسپی تو لی ہے نا؟ اسی لیے تو انہوں نے فوراً فون کر کے اپنی فوج کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا۔

♥

''کیا.....؟ ہم واپس جا رہے ہیں؟'' علیزے نے آذر کے منہ سے واپسی کا سن کر کافی بے یقین اور ترسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ تو جب سے آئی تھی تب سے ہی واپس جانا چاہ رہی تھی، لیکن ان سب کی خاطر خاموش تھی کہ اس کی وجہ سے وہ سب خوامخواہ بدمزا ہوں گے، لیکن اس وقت اچانک واپسی کی خبر سن کر جیسے اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔

''ہوں..... ہم واپس جا رہے ہیں۔'' آذر نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن بھائی! اتنی جلدی.....؟'' واپسی کی اطلاع پہ سب سے پہلے اعتراض اور خفگی انوشہ کو ہوئی تھی، وہ سب اس وقت ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشست سنبھالے بیٹھے تھے اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر کھڑا آذر سب کی نظروں کا مرکز تھا اور سب کی نظریں سوالیہ تھیں۔

''آنی کی کال آئی تھی، ڈیڈ نے خود واپسی کا آرڈر دیا ہے کہ صبح تم سب کو حویلی میں موجود ہونا چاہیے اب یہ جلدی ہے یا دیر یہ میں نہیں جانتا۔'' آذر نے سب کو باری باری وضاحتیں اور جواب دینے کے بجائے صاف صاف بتا دیا کہ یہ آرڈر اوپر سے آیا ہے، اس لیے اس میں اعتراضات کی اور خفگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا تھا، وہاں موجود سب ہی افراد چپ ہو کے رہ گئے تھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان لوگوں میں کافی گپ شپ اور ہنسی مذاق ہو رہا تھا، مگر واپسی کا سن کر علیزے کے سوا سب بجھ سے گئے تھے۔

''کیا بات ہے؟ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟'' عائشہ آفندی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہیں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں، لیکن ان سب کو خاموش دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔

''ہم لوگ صبح واپس جا رہے ہیں، ڈیڈ نے واپسی کا کہا ہے۔'' آذر نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا..... خیریت تو ہے نا؟'' عائشہ آفندی کو تشویش ہوئی۔

''کیا اپنے گھر جانے کے لیے خیریت ہونا ضروری ہوتا ہے؟'' آذر نے بے تاثر سے انداز میں پوچھا تھا عائشہ آفندی ٹھٹک کے رُک گئیں۔

''نہیں بیٹا! یہ بات نہیں ہے میں تو پیچھے والوں کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھی، آج اچانک واپسی کا حکم دے دیا ہے تو کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا۔'' انہوں نے وضاحت دی تھی۔ ''نہیں کوئی مسئلہ نہیں آپ لوگ بس واپسی کی تیاری کریں، صبح صبح یہاں سے نکلنا ہوگا، اس لیے اپنے اپنے سامان کی پیکنگ ابھی سے کر لیں، تاکہ صبح ہم لوگ لیٹ نہ ہوں۔'' وہ کھڑے کھڑے ان سب کو ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا اور وہ سب بجھے بجھے سے انداز میں اُٹھ کر اپنے اپنے کمرے کی سمت چل دیئے سب نے کافی پھیلاوا سمیٹنا تھا۔

♥

''ہیلو گڈ مارننگ۔'' وہ دروازے کے ہینڈل پہ ذرا سا دباؤ ڈالتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''ہائے..... سم ٹو یو میڈی۔'' حبیری اپنے روم میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا، جب مدیحہ اچانک اندر چلی آئی اور وہ اسے دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

''اٹس اوکے..... بیٹھو ناشتہ کرو تم۔'' مدیحہ اسے اشارہ کرتی ہوئی خود کھڑکی کی سمت بڑھ گئی اور کھڑکی کے تمام پردے اک جھٹکے سے ہٹا دیئے تھے چمکتے سنہرے دن کی روشنی لپک کے اندر داخل ہوئی اور پورا کمرہ کھل اُٹھا۔

''کیسی لگی یہاں کی صبح.....؟'' مدیحہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نائس ویری نائس۔'' اٹر یکٹو اینڈ فریش مارننگ ایز لائیک یو۔'' حبیری نے بھی جواباً کھلے دل سے اظہار کیا۔ مدیحہ ایک دم کھلکھلا اُٹھی۔

''غلط کہہ رہے ہو تم، میں تو مارننگ سے بھی زیادہ فریش اور اٹریکٹو ہوں۔'' مدیحہ کا موڈ آج کچھ فریش تھا، اسی لیے وہ اپنی فریش نیس کا اظہار بھی کافی فریش انداز میں کر رہی تھی۔

''ہوں ایم اگری ود یو۔'' حبیری نے اس کی شوخی سے اتفاق کیا۔

''جو سچ ہے، جو حقیقت ہے، اس سے اگری تو ہونا ہی پڑے گا نا؟'' مدیحہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔

''ہوں..... یہ بھی ٹھیک ہے۔'' حبیری ناشتہ کرتے ہوئے مسکرایا اور مدیحہ بھی ہنستی ہوئی پلٹ کر بیڈ روم پہ آ بیٹھی۔

''ارے یہ کیا ہے؟'' اس کی نظر بیڈ پہ بکھرے پھیلاوے کی سمت اب گئی تھی۔

''تمہارے لیے گفٹس ہیں۔'' اس نے بھی لاپروائی سے جواب دیا۔

''میرے لیے گفٹس؟ کیا مطلب؟'' اسے حیرت ہوئی تھی۔

''لیس ابرائن، شینے، کرسٹینا اور باقی فرینڈز نے بھیجے ہیں۔'' حبیری ناشتہ ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا۔

''ارے واؤ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' مدیحہ کو حقیقتاً بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ اس کے فرینڈز نے اسے گفٹس بھجوائے ہیں، وہ بھی اتنے شوق اور اتنی محبت سے۔

''تم پہلے مجھے ملی کب ہو؟'' وہ صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کل ملی تو تھی؟'' مدیحہ برائن کا بھیجا ہوا گفٹ اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

''تو کیا آتے ہی بتا دیتا؟''

''ہاں..... بتا دیتے اس میں کیا حرج تھا بھلا؟'' وہ گفٹ ریپر کھول چکی تھی، اس نے مدیحہ کے لیے بہت قیمتی پرفیوم بھیجا تھا، مدیحہ اس پرفیوم کی مہک سے مسحور ہو گئی تھی۔

''حرج تھا یار! کیونکہ کل میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔'' حبیری اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیا مطلب؟ کس لیے ذہنی طور پہ تیار نہیں ہو۔'' مدیحہ نے چونک کر حیری کی سمت دیکھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کی لو دیتی آنکھیں بول رہی تھیں وہ سب سنا رہی تھیں جو مدیحہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ ''اس گفٹ کے لیے جس کے لیے تم بھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہو۔'' حیری نے اپنی جیب سے چھوٹی سی سرخ رنگ کی مخملی ڈبیہ نکال کر مدیحہ کے سامنے کی تھی اور مدیحہ اس سرخ رنگ کی ڈبیہ کو دیکھ کر گنگ ہو گئی، بے شک وہ ڈبیہ بند تھی، لیکن اس میں موجود گفٹ مدیحہ کے ذہن اور سوچ سے چھپا ہوا نہیں تھا، کیونکہ وہ گفٹ پوشیدہ ہو کر بھی پوشیدہ نہیں تھا۔

''حیری..... یہ..... یہ..... کیا کہہ رہے ہو تم؟'' مدیحہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کیا بولے اور کیا نہ بولے؟

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو، لیکن دیکھو میڈی میری تم سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ تم پلیز اس وقت اس گفٹ کو مت ٹھکرانا۔ ابھی میرے پاس بہت ٹائم ہے، تم مجھے سوچو، مجھے پرکھو، پھر جو فیصلہ کرو تو مجھے بتا دینا، ابھی یہ گفٹ تم اپنے پاس رکھو، اگر تم نے کبھی یہ گفٹ پہن لیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے قبول کر لیا، اور اگر مجھے واپس کر دیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے، میں نہ تم سے سوال کروں گا، نہ جواب، ہمیشہ کے لیے سامنے سے ہٹ جاؤں گا، بس یہ میرا تم سے وعدہ ہے اور عہد بھی۔'' حیری نے جو کچھ کہا تھا اس پہ کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ مدیحہ نے لب بھینچے ہوئے اک نظر حیری کو اور اک نظر اس کے ہاتھ کی سمت دیکھا اور پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے وہ گفٹ تھام لیا اور حیری کے چہرے پہ اُمید کے کئی رنگ آ ٹھہرے تھے اور ہونٹوں کو مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

''تھینک یو میڈی۔'' وہ آہستگی سے بولا اور مدیحہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''چلیں؟'' حیری نے خود ہی استفسار کیا۔

''ہوں..... چلو۔'' وہ سرخ ڈبیہ مٹھی میں دباتی ہوئی اُٹھ کر باہر نکل آئی اور اپنی اُلجھن اور بے دھیانی میں باقی کے گفٹس بھی اُٹھانا بھول گئی تھی، اس لیے وہ سارے گفٹس حیری خود اُٹھا کر اس کے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔

♥

مریم کی بات پہ پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

عابدہ خاتون نے یکدم فاروق نیازی کی سمت دیکھا اور وہ بستر پہ لیٹے ان ہی کی سمت دیکھ رہے تھے، مریم اپنی بات کر چکی تھی اس لیے اب ان کے بولنے کی منتظر تھی، عابدہ خاتون خود اس وقت حیرت اور بے یقینی کے شکنجے میں تھیں کہ مریم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ وہ یہ قدم کیوں اُٹھانا چاہتی ہے؟ آخر بیٹھے بیٹھے کیا ہوا ہے اسے؟ کیا سوچ سمائی ہے اس کے ذہن میں؟

''ابا جی! میں نے آپ دونوں سے اجازت مانگی ہے، آپ کو خاموش ہونے کا نہیں کہا۔'' مریم نے پھر سے بات چھیڑ دی۔

''لیکن بیٹا! تم یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟'' فاروق نیازی کے اشارے پہ عابدہ خاتون نے استفسار کیا، اور ان کے استفسار پہ مریم نے سر اُٹھا کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔

''امی! آپ جانتی ہیں کہ میں یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہوں؟ بے شک خود میری کوئی خواہشیں، کوئی بہت زیادہ ضرورتیں نہیں ہیں، لیکن ایمن، ایمان، زوبیہ اور زوبیہ کی تو ضرورتیں ہیں نا؟ کیونکہ وہ ابھی پڑھ رہی ہیں، انہیں اور کچھ نہ سہی، لیکن سکول اور کالج کے لیے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، فیسز کے علاوہ بھی ہزاروں خرچے ہوتے ہیں اور یہ خرچے عدیل بھائی کیسے پورے کر رہے ہیں، یہ آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں، گھر کے اخراجات اور ابا جی کی بیماری کا علاج بھی ٹھیک طریقے سے ہو جائے تو ہمارے سر پہ اللہ کا بڑا احسان ہو گا، لیکن ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے، گھر میں اور کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو عدیل بھائی کا ہاتھ بٹا سکے، کوئی بھائی نہیں ہے جو برابر چل کے مدد کر سکے، ایسے میں اگر میں کچھ کر سکتی ہوں تو مجھے کرنا چاہیے، آپ مجھے روکیے مت، بلکہ خوشی خوشی اجازت دیجیے، میں وعدہ کرتی ہوں کہ عدیل بھائی کا بھائیوں کی طرح ساتھ دوں گی، آپ پلیز! میرے بارے میں نہیں، عدیل بھائی کے بارے میں سوچیں، وہ کتنے پریشان رہتے ہیں، کتنا بوجھ ہے ان پہ، پلیز ابا جی! آپ گھر کے حالات بخوبی جانتے ہیں، مجھے اجازت دینے سے بہت بہتری آ جائے گی۔'' مریم نے ان کا بے جان سا ہاتھ تھام لیا اور انہیں متفق کرنے کی پوری کوشش کی تھی ان کی بے تاثر آنکھیں اس وقت آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

ان کی بیماری نے ان کے بچوں کو پریشانیوں اور نظرات میں ڈال دیا تھا، وقت سے پہلے بڑا بنا دیا تھا، لڑکیاں جس عمر میں اپنی

خواہشیں اور خواب پورے کرنے کا سوچتی ہیں، ان کی بیٹیاں گھر کے حالات اور ضرورتیں پوری کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ ان کے آنسو بہو کران کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے اور انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مریم کو اجازت دے دی، کیونکہ مریم نے جو کچھ کہا تھا وہ سب صحیح تھا، سب کچھ ان کے سامنے ہی تو تھا۔

''لیکن عدیل نہیں مانے گا۔'' عابدہ خاتون کو عدیل کی طرف سے ڈر تھا۔

''ان کو میں منالوں گی۔'' مریم اپنے آنسو پونچھتی ہوئی سیدھی ہوئی اور ابا جی کا ہاتھ دباتے ہوئے ان کے ہاتھ پہ بوسہ دیا۔

''تھینک یو ابا۔'' وہ ان کا شکریہ ادا کرتی وہاں سے اٹھ گئی، اس نے امی اور ابا جی کو تو منا لیا تھا، لیکن ابھی عدیل کا مسئلہ باقی تھا اور اگلی صبح ایسا ہی ہوا تھا عدیل کو مریم کے جاب کرنے کا سن کر جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

''مریم جاب کرے گی؟ لیکن کیوں؟'' عدیل نے ناشتہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

''بیٹا! اچھی آفر ہے، اچھی سیلری ہے اور مریم بھی تو پورا دن گھر میں فارغ اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھی رہتی ہے، اس لیے میں نے اور تمہارے ابا جی نے سوچا ہے کہ وہ جاب کر لے، کم از کم تمہاری ہی کچھ ہیلپ ہو جائے گی۔'' عابدہ خاتون نے عدیل کو بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن عدیل کا مزاج برہم ہو چکا تھا۔

''اب میں اپنی ہیلپ، بہنوں سے کرواؤں گا۔''

''دیکھو بیٹا! بہن کوئی طعنہ نہیں ہے، جس پہ مرد کو غصہ آ جائے، بہن پہ اعتماد کرو، اس پہ بھروسہ رکھو تو بھائیوں سے کم ثابت نہیں ہوتی، کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں بہنوں نے بھائیوں کے ساتھ دیئے ہیں، تمہیں کیوں اعتراض ہے۔'' مریم کے کہنے پہ عابدہ خاتون پورا پورا اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

''امی! آپ کس زمانے کی اور کن مثالوں کی بات کر رہی ہیں؟ آپ آج کل کے معاشرے کو اور آج کل کے چال چلن کو نہیں جانتیں، یہاں مرد، عورت کو نگلنے کے لیے تیار کھڑا ہے، کوئی بہت ہی قسمت والی یا عزت والی عورت ہو گی جو مرد کے شکنجے سے بچ نکلتی ہو گی، ورنہ عورت کو بچتے ہوئے کم ہی دیکھا ہے۔'' عدیل سخت انکاری تھا۔

''کیا آپ کو اپنی بہن پہ اعتماد نہیں ہے؟'' مریم کچن کی دہلیز پہ آ کھڑی ہوئی اور اس کے سوال پہ عدیل چونک گیا۔

''بتایئے نا بھائی! کیا آپ کو اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے؟'' وہ کافی دو ٹوک اور سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''مریم! میں یہ بات نہیں کر رہا، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔''

''بھائی! میں آپ سے آپ کی بات کا مطلب نہیں پوچھ رہی، میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں؟'' وہ ضدی بچے کی طرح ایک ہی سوال پہ اڑ چکی تھی۔

''مریم! یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟'' عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

''آپ بس میرے سوال کا جواب دیں، آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں؟ اگر اعتماد ہے تو مجھے جاب کرنے دیں، اور اگر اعتماد نہیں ہے تو مجھے منع کر دیں، میں کبھی جاب کرنے کا ذکر بھی نہیں کروں گی، بلکہ کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالوں گی۔'' مریم نے عدیل کے سامنے بہت کڑا سوال رکھ دیا تھا، وہ نہ ہاں میں جواب دے سکتا تھا اور نہ ہی نا میں، وہ تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔

''سوچ کیا رہے ہیں؟ جواب دیں مجھے؟'' مریم نے کبھی اس طرح ضد میں آ کر بات نہیں کی تھی، آج اس کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔

''دیکھو مریم! مجھے تم پہ اعتماد ہے، خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے، لیکن یہ معاشرہ اعتماد کے قابل نہیں ہے، میں تم پہ تو اعتماد کر سکتا ہوں لیکن اس معاشرے پہ نہیں کر سکتا۔'' نے مریم کو کندھوں سے تھام لیا۔

''آپ کو مجھ پہ اعتماد ہے نا؟ تو پھر آپ بے فکر ہو جائیں، آپ کی عزت کو میں نے سنبھال کے رکھنا ہے، اس معاشرے نے نہیں۔'' مریم نے اسے پورا یقین دلایا تھا اور یہ اس کا یقین اور لہجے کی مضبوطی تھی کہ عدیل اسے مزید منع نہیں کر سکا اور مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ بے ساختہ اس کے کندھے سے لگ گئی اور عدیل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے بھائیوں سا بھرپور مان بخشا تھا، عابدہ خاتون کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔

''اب بس کرو، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے، کام پر بھی جانا ہے تم نے۔'' انہوں نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے انہیں آواز

دی اور عدیل پلٹ کر دوبارہ عائشہ کرنے کے لیے آ بیٹھا، پھر جیسے ہی عدیل گھر سے رُخصت ہوا، مریم بھی فاطمہ کی بتائی ہوئی ایکسڈی چانے کے لیے تیار ہونے لگی، وہ آج پہلی بار جا رہی تھی، اس لیے کافی اچھی طرح تیار ہوئی تھی، حالانکہ اس کی تیاری میں بھی سادگی کی جھلک تھی، لیکن پھر بھی بہت اچھی لگ رہی تھی، وہ امی اور ابا جی سے مل کر گھر سے نکل آئی، یہ اس کا گھر سے نکلنے والا پہلا قدم تھا، لیکن اس کے ارادے بہت مضبوط تھے، حوصلہ بلند اور نیت نیک تھی، اسی لیے کامل یقین تھا کہ اللہ اس کا ساتھ بھی دے گا اور اس کی عزت کی حفاظت بھی کرے گا، کیونکہ سب کی عزتوں کا محافظ اور رکھوالا تو وہی تھا۔ اوپر والا.....!

♥

علیزے مری سے عجیب سے احساسات لے کر جا رہی تھی۔

آذر کے ذہن پہ بھی دانیال کا کیا گیا انکشاف حاوی تھا۔

عائشہ آفندی کے دل پہ زہرہ سے نہ ملنے کا رنج طاری تھا۔

اور کومل، آذر کی توجہ نہ ملنے پہ اندر ہی اندر گیلی لڑکی کی طرح سلگ رہی تھی، اس کا بس چلتا تو علیزے کو منظر سے ہٹا دیتی۔ وہ علیزے جو ہر طرح سے بے ضرر تھی، جو کسی کے لیے بُرا نہیں سوچتی تھی، جو کسی کے ساتھ کچھ بُرا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جس کے لیے آذر سمیت سب کزنز برابر تھے، جو نہ حسد کرتی تھی، نہ دل میں میل رکھتی تھی، بس اپنی ذات کے دائرے میں رہتی تھی، وقار آفندی یا باقی حویلی والے اسے اتنا لاڈ پیار دیتے تھے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا بھلا؟ وہ خود تو نہیں کہتی تھی کہ سب اسے پروٹوکول دیں، لیکن پھر بھی کومل اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی تھی، وہ علیزے کو اپنا رقیب سمجھتی تھی، اسی لیے اب وہ اپنی اس جلن اور رقابت کو اپنے لفظوں تک لے آئی تھی، اپنے لہجے اور انداز سے اظہار کرنے لگی تھی اور اس کے اسی اظہار کا بوجھ علیزے اپنے دل پہ لیے بھی بھی ہی واپسی کے سفر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔

بلکہ اس سفر میں کئی لوگ بجھے بجھے سے اور مایوس سے تھے، لیکن جودت ہنوز بشاش بشاش اور خوش تھا اور اس کا نشانہ آج بھی منصور حسین تھا۔

''کیا بات ہے منصور حسین! تم چپ چپ سے ہو؟'' اس نے گردن موڑتے ہوئے منصور حسین کی سمت دیکھا۔

''میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے چپ رہنا پڑتا ہے۔'' منصور حسین نے گہری سانس کھینچی تھی۔

''کیوں یار! باتوں کے دوران ڈرائیونگ نہیں ہو سکتی؟''

''ہو سکتی ہے، لیکن یہ کام مالکوں کا ہے، وہ باتیں بھی کرتے ہیں اور ڈرائیونگ بھی، لیکن ہم ملازم لوگوں کا کام ہوتا ہے چپ رہنا اور چپ رہ کر کام کرتا ہمارے بولنے پہ اعتراض ہوتا ہے۔'' منصور حسین کے جواب ہمیشہ کھرے ہی ہوتے تھے۔

''یار منصور حسین! تم ہمیشہ اتنی جلی کٹی سی باتیں کیوں کرتے ہو؟ یوں لگتا ہے جیسے تم سے یا محبت چھن گئی ہے یا عزت؟'' جودت کی بات پہ پوری گاڑی گھوم کے رہ گئی تھی، گاڑی کے ٹائر چرچرا اُٹھے تھے۔ منصور حسین کے ہاتھ کسی فولاد کی طرح اسٹیئرنگ پہ جم گئے تھے۔

''بے شک میں ملازم ہی سہی جودت صاحب! لیکن اپنی عزت اور محبت پہ بات کرنے کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا، چاہے وہ آپ ہوں، چاہے کوئی اور.....'' منصور حسین کا لہجہ بہت سخت اور چٹریلا ہو رہا تھا۔ جودت نے حیرت سے منصور حسین کی سمت دیکھا۔ اس کے تیور تھپکا دینے کی حد تک بگڑے ہوئے تھے۔

''آپ میری ذات پہ بات کریں، میری ذاتی باتوں اور معاملات پہ بات نہ کریں، کیونکہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔'' منصور حسین نے جودت کو ایک حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا اور یہ اشارہ بہت واضح تھا، جس پہ منصور حسین کو کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی، اس لیے وہ سر جھٹک کر گاڑی دوبارہ سے اسٹارٹ کر چکا تھا، جودت نہ جانے کیوں کچھ بھی کہے بغیر چپ ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے واقعی ایک غلط بات کہی تھی اور منصور حسین ایک غیرت مند آدمی تھا، جس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی، جب ہی جودت بھی منصور حسین کی خفگی سہہ گیا۔

''ایم سوری یار!'' جودت نے آہستگی سے سوری کیا اور منصور حسین کی نظر بے ساختہ بیک ویو مرر کی سمت اُٹھ گئی۔

''علیزے بی بی کہتی ہے کہ غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے غلطی اچھے نہیں لگتے۔'' منصور حسین نے علیزے کی بات

دہرائی۔

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' جودت کو سمجھ نہیں آئی تھی، لیکن علیزے سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے اس کا غصہ اور اس کی بات یاد دلا رہا ہے۔

''میرا مطلب ہے کہ میں بھی علیزے بی بی کی بات سے متفق ہوں، مجھے بھی غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے، اور معافی دینے کو بھی دل نہیں چاہتا۔'' منصور حسین نے اپنے غصے پہ قابو پا لیا تھا، اس لیے قدرے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا، ورنہ ایک پل میں اس کا پارہ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا، وہ برداشت نہیں کرتا تھا، کسی کی بات سہہ نہیں پاتا تھا، اسی لیے اکثر لوگ اس سے نالاں ہی رہتے تھے، رجو، عارف اور مبارک خان کی طرح.....

''اچھا..... علیزے نے یہ بات کہی ہے؟ لیکن علیزے اتنی سخت تو نہیں ہے؟ کیوں علیزے یہ کیا سن رہا ہوں میں؟'' جودت نے گردن موڑ کر علیزے کو دیکھا۔

''جی ٹھیک سن رہے ہیں آپ.....'' وہ ذرا سنبھل کے بیٹھ گئی۔

''ارے واقعی؟ تم اتنی سخت تو نہیں ہو؟'' جودت حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں اتنی نرم بھی نہیں ہوں جودت بھائی! آپ میری نرمی پہ مت جائیں، بات اصول کی آجائے گی تو اصول کی کروں گی، میں یہ سوچتی ہوں جن لوگوں نے بعد میں معافی مانگنی ہوتی ہے وہ پہلے غلطی ہی کیوں کرتے ہیں؟'' علیزے نے سنجیدگی سے کہا۔

''غلطی کرنے سے پہلے سوچنا کون ہے یار؟''

''لیکن سوچنا چاہیے نا، میں کہتی ہوں کہ غلطی کرنے سے پہلے سو بار سوچو اور اچھا کام کرنے سے پہلے ایک بار بھی مت سوچو، بس میرا تو یہی پوائنٹ آف ویو ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے اور جودت حیران ہوا تھا کہ علیزے بھی ایسی باتیں کر لیتی ہے۔

''خیر فی الحال اس بات کو چھوڑو اور اپنے ڈرائیور سے کہو کہ میرا سوری قبول کر لے۔'' جودت نے سفارش کے لیے کہا۔

''نو..... میں یہ نہیں کہہ سکتی، یہ اس کی اپنی مرضی پہ ڈپینڈ کرتا ہے۔'' علیزے نے نفی میں سر ہلایا اور منصور حسین کو علیزے کی یہ بات اور انداز بہت اچھے لگے تھے، اس نے دل ہی دل میں علیزے کو سراہا تھا۔

''کیوں منصور حسین! پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' جودت، علیزے کی طرف سے رُخ موڑ کر سیدھا ہوا تھا۔

''اگر اس روز میری غلطی پہ علیزے بی بی نے مجھے معاف کر دیا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی آپ کو معاف کر دیتا۔'' منصور حسین نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو تم علیزے کا بدلہ مجھ سے لو گے؟'' جودت کو اچنبھا ہوا۔

''نہیں صاحب! بدلہ نہیں لے رہا، بلکہ ان کے اصول پہ چل رہا ہوں، آخر ڈرائیور ہوں ان کا۔'' منصور حسین نے کافی اطمینان سے جواب دیا۔

''سوچ لو منصور حسین! غلطی کر رہے ہو، معافی نہ دے کر۔'' جودت نے اسے دھمکایا۔

''دیکھیے صاب! اگر آپ صاحب ہونے کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ مالک ہیں اور میں ملازم اور اگر آپ انسانیت کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر معافی میری مرضی سے ہی ملے گی۔'' منصور حسین بھلا کب کسی سے دبنے والا تھا، جودت اسے دیکھ کر رہ گیا

''میں معافی تمہاری مرضی سے چاہتا ہوں۔'' وہ بھی آخر جودت تھا زچ کر دینے والا۔

''ٹھیک ہے، سوچوں گا۔'' منصور حسین نے سکون سے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی، وہ لوگ مری اور اسلام آباد کی حدود سے نکل آئے تھے، اب ان کا رُخ لاہور کی سمت تھا۔

♥

پورے گھر میں خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ دونوں اس خاموشی کے دوران گھر کی چیزیں سمیٹتی پھر رہی تھیں، ملازمین نے پیکنگ کا کام ابھی سے شروع کر دیا تھا، کیونکہ عبداللہ نے کنفرم کروا لیے تھے اور آج زری بھی اپنے ایگزامز سے فارغ ہو گئی تھی، اس لیے اب ان کی واپسی کنفرم ہو چکی تھی۔

"کیا بات ہے اتنی خاموش کیوں ہو؟" نگارش ریک میں بھی کتابیں ایک کارٹن میں بند کر کے رکھتے ہوئے زری کی سمت متوجہ ہوئی۔

"ڈر لگ رہا ہے۔" زری رائٹنگ ٹیبل سے ساری چیزیں سمیٹتے ہوئے بہت بے دل اور سست لگ رہی تھی۔

"کس چیز سے؟" نگارش ٹیبل اور کرسیوں پہ ڈسٹ کور چڑھا رہی تھی۔

"پاکستان سے....." زری کی آواز دھیمی تھی۔

"کیوں؟"

"مجھے لگتا ہے پاکستان مجھے نگل جائے گا، میں پاکستان کی سرزمین پہ نہیں بلکہ کسی دلدل میں قدم رکھنے والی ہوں، جس میں میں دھنس جاؤں گی، بے بس ہو جاؤں گی اور..... اور یہی بے بسی سوچ کر میرا دل ڈوب رہا ہے، نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" زری کی حالت خاصی عجیب سی ہو رہی تھی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کیا تمہیں عبداللہ پر بھروسہ نہیں ہے؟" نگارش نے خفگی سے پوچھا۔

"بھروسہ ہے بھابی! ان پہ تو پورا بھروسہ ہے، لیکن جو وہاں میری تاک لگائے بیٹھے ہیں، ان پہ بھروسہ نہیں ہے۔" زری روہانسی ہو گئی۔

"وہاں دل آور بھی تو ہے؟ کیا اس پہ بھی بھروسہ نہیں ہے؟" نگارش نے جان بوجھ کر دل آور کا ذکر کیا تھا۔

"وہاں ملک حق نواز بھی تو ہے بھابی! کیا دل آور شاہ، ملک حق نواز سے چھین لے گا مجھے؟ کیا مجھے اس سے بچا لے گا؟ کیا میرے بھروسے پہ پورا اترے گا وہ؟ ہزاروں لوگوں کے لیے لڑتا ہے، کیا ملک حق نواز سے لڑے گا میرے لیے؟ اگر وہ میرے لیے لڑنے کو تیار ہے تو میں آج ہی پاکستان جانے کے لیے تیار ہوں۔ مگر بھابی مجھے پورا یقین ہے وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا، وہ سب کے لیے لڑ سکتا ہے، مگر میرے لیے نہیں۔" زری کے آنسو اس کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے اور نگارش چپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"دل آور اتنا بزدل نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہی ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں یا عبداللہ کو کسی محاذ پہ اکیلا چھوڑ دے، مجھے پوری امید ہے کہ وہ ہم لوگوں کا ساتھ دے گا، ملک حق نواز اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے، بس چند دن کی بات ہے، تم خود دیکھ لینا، کہ یا تو دل آور تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، لیکن عبداللہ کا ساتھ ضرور دے گا، عبداللہ کی بات ہوئی تھی دل آور سے وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ہمیں ریسیو کرنے کے لیے خود آئے گا، عبداللہ کو کسی بھی کام کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" نگارش نے زری کو حوصلہ اور یقین دلایا تھا اور زری کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ نگارش بھابی کی تسلی پہ ذرا سی ڈھارس ہوئی تھی اسے۔

"بھابی! یہ آپ....."

"بس..... بس یہ ساری باتیں یہیں رہنے دو اور کام کرو میرے ساتھ، میری ہیلپ کروانے کی بجائے اتنا مجھے ٹینشن دے کے مار رہی ہو۔" نگارش نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور زری اپنے آپ کو سنبھالتی بمشکل کام کی طرف متوجہ ہوئی تھی، ورنہ خدشے اور وسوسے اب بھی اس کے دل و دماغ میں ہلکورے لے رہے تھے، مگر وہ کنٹرول کر گئی۔

♥

"کیا میں اپنی ذاتی گاڑی لے سکتا ہوں؟" جیری کو بیٹھے بیٹھے گاڑی کا خیال آیا تھا، آخر وہ کب تک مدیحہ کی گاڑی پہ ڈپینڈ کر سکتا تھا؟

"پتا نہیں۔" مدیحہ نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ارے کیوں پتا نہیں ہے؟ تمہارے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں اور تمہیں پتا ہی نہیں ہے؟" جیری نے حیرت سے کہا۔

"میرے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں گاڑیوں کی انفارمیشن ساتھ لیے پھر رہی ہوں، شوروم ان کا ہے، کام ان کا ہے، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں گاڑیوں کی معلومات رکھتی پھروں؟" مدیحہ نے کافی خفگی سے جواب دیا۔

"تو پھر میں کس سے معلومات لوں؟"

''معلومات کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں چاہیے کہ تم گاڑی رینٹ پہ لے لو۔'' مدیحہ نے اسے ایک مفید مشورے سے نوازا۔

''گاڑی رینٹ پہ.....؟''

''ہاں..... ظاہر ہے تم نے زیادہ عرصہ تو یہاں نہیں رہنا، ایسے میں اگر تم نیو زیرو میٹر گاڑی لیتے ہو تو اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے، پندرہ بیس لاکھ کی گاڑی اگر تم جانے سے پہلے سیل بھی کرو گے تو وہ سیکنڈ ہینڈ کہلائے گی اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی کوئی بھی پندرہ بیس لاکھ میں تم سے نہیں خریدے گا، تمہیں پانچ، چھ لاکھ کا نقصان ضرور ہوگا اس لیے اتنے بڑے نقصان سے بہتر ہے کہ تم کوئی اچھی سی گاڑی رینٹ پہ لے لو، ڈرائیو تم خود کرلو گے۔'' مدیحہ کا انداز اب بھی لاپرواسا تھا، جبکہ جیری نہ جانے کیوں ہنس رہا تھا۔

''کیا بات ہے، کیوں ہنس رہے ہو؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟'' مدیحہ نے دائیں طرف ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

''اس لیے ہنس رہا ہوں کہ تمہیں تو گاڑیوں کی معلومات ہی نہیں ہے، پھر بھی اتنا کچھ بتا دیا؟'' جیری نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مدیحہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تھینک گاڈ! تمہارے چہرے پہ مسکراہٹ تو آئی۔'' جیری نے شکر ادا کیا۔

''اوکے اوکے..... اب یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟'' مدیحہ نے گاڑی کی اسپیڈ کم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''گاڑی کا پتا کرتے ہیں، کہاں سے ملے گی؟'' جیری آج کے دن میں گاڑی کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔

''چلو ڈھونڈتے ہیں، جہاں سے بھی مل گئی۔'' مدیحہ نے کندھے اچکائے تھے اور پھر یونہی اپنی موج مستی میں رینٹ پہ ملنے والی گاڑیاں دیکھنے چل دیئے تھے۔

♥

یونہی کوئی مل گیا تھا
یونہی کوئی مل گیا تھا
سرِ راہ چلتے چلتے
سرِ راہ چلتے چلتے

چھوٹا خاصی سریلی آواز میں یوں لہک لہک کر گنگنا رہا تھا جیسے فلم میں گانا بھی اسی پہ پکچرائز کیا گیا ہو۔

''واہ چھوٹے واہ! کیا کمال کا گاتے ہو یار! لیکن کیا بات ہے یار آج تمہارے گانے کا اثر نہیں ہو رہا؟'' سلو نے بھی کام کرتے ہوئے درمیان میں لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ وہ درحقیقت عدیل کو چھیڑ رہے تھے، جبکہ عدیل چپ چاپ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا، آج ورکشاپ میں کام زیادہ تھا، اس لیے عدیل خود ساتھ مل کر کام کروا رہا تھا۔ دو تین گاڑیوں کا کام بیک وقت ہو رہا تھا۔ گاڑیوں کے انجن کھلے پڑے تھے اور ڈیزل سے ان کے کپڑے ابتر ہو رہے تھے۔

''اثر ہو رہا ہے یار پاگل! ہو رہا ہے، بس ظاہر آہستہ آہستہ ہوگا۔'' چھوٹے نے مطمئن سے انداز میں کہا۔

''ارے یار! اثر کیا ہونا ہے بھلا؟ تم گانے ہی اداس گا رہے ہو۔'' جیدی نے منہ بنا کے کہا۔

''ہیں یہ وجہ ہے؟'' چھوٹے نے بھنویں اچکائیں۔

''تو اور کیا؟ کوئی دل کو چھونے والا گاؤ گے تو اثر ہوگا نا؟''

''ہاں یار! یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں بھی نرا گونگا ہی ہوں۔'' چھوٹے نے اپنے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔

''چلو کوئی بات نہیں، اب اپنا ٹریک بدل لیتا ہوں۔'' اس نے کسی نئے گانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔

''شاباش.....'' جیدی اور سلو نے ہمت بندھائی۔

موسم ہے عاشقانہ ..... موسم ہے عاشقانہ
اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لانا

چھوٹے نے ایک نیا سُر لگایا اور بے ساختہ عدیل کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ امڈ آئی، وہ اس کی اس مسکراہٹ کے لیے ہی تو اسے جتن کر رہے تھے۔

''ہرے.....'' انہوں نے عدیل کو مسکراتے دیکھ کر نعرہ لگایا۔

"بہت کمینے ہو تم لوگ۔" عدیل نے ریشم سے گاڑی کے ٹائر کا پیچ کستے ہوئے سر جھٹکا۔ البتہ چہرے کی مسکراہٹ بدستور تھی۔

"ہم لفنگے بھی ہیں استاد۔" سلو معنی خیزی سے کہہ کر ہنسا تھا۔

"جانتا ہوں، بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔

"استاد! اب آپ جیسا شریف بھی تو نہیں ہوا جا سکتا کہ بندہ کسی کو یاد بھی کرے اور بتائے بھی نہ؟" چھوٹے نے اسے چھیڑا۔

"ارے! میں کس کو یاد کرنے لگا بھلا؟" عدیل نے تعجب سے کہا۔

"یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا استاد! اگر نہیں پتا تو اپنے دل سے پوچھ لو۔" چھوٹا معنی خیزی سے بات کر رہا تھا، عدیل ہنس دیا۔

"میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ خوش فہمیاں پالنا اچھی بات نہیں ہے، اس سے بہتر ہے کہ بندہ اپنا کام کر لے۔" عدیل نے چھوٹے کو گاڑی کے نیچے گھسنے کا اشارہ کیا، کیونکہ اس گاڑی کا کچھ کام نیچے لیٹ کر کرنے والا تھا، گاڑی کو انہوں نے پہلے ہی جیک پہ چڑھا رکھا تھا۔

"سوری استاد! میرا موڈ آج بہت اچھا ہے، آج نیچے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، یہ کام سلو یا جیدی سے کہو۔" چھوٹے نے پہلی بار کسی کام سے انکار کیا تھا اور عدیل بھی نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ کسی سے بھی کہنے کے بجائے خود ہی نیچے لیٹ کر گاڑی کے نیچے گھس گیا۔

"ارے..... ارے استاد! یہ کیا کر رہے ہو؟ آپ نکلو باہر، میں خود کر لیتا ہوں۔" چھوٹے نے عدیل کو کام کرتے دیکھ کر منع کیا، مگر عدیل اب ادھورا کام کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

"کوئی بات نہیں، کام تو کرنا ہی ہے، چاہے جس طرح بھی کرنا پڑے۔" عدیل کی آواز گاڑی کے نیچے سے آ رہی تھی۔

"ہیلو..... کیا ہمیں کوئی گاڑی رینٹ پہ مل سکتی ہے؟" سنجیدہ سی نسوانی آواز پہ وہ چاروں ہی چونک گئے تھے، چھوٹے نے بونٹ گردن موڑ کے دیکھا تھا اور مدیحہ کو دیکھ کر بُری طرح ٹھٹکا تھا۔

"آپ.....؟" وہ اسے پہچان چکا تھا، لیکن مدیحہ اسے نہیں پہچانی تھی۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں مسٹر؟" مدیحہ نے حیران حیران سی نظروں سے دیکھتے چھوٹے کو دوبارہ متوجہ کیا اور اب کی بار اس کی آواز پہ عدیل بھی چونک گیا، اس نے گاڑی کے نیچے سے ہی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تھی، ذرا سے فاصلے پہ اسے دو دھیا رنگی بلیک کلر کے باریک ڈوریوں والے سینڈلز میں مقید نظر آئے تھے اور ان کے ساتھ جو گرز والے پاؤں بھی نظر آ رہے تھے، یعنی ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ عدیل سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کے گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔

"السلام علیکم میڈم!" عدیل اپنے کپڑوں سے دھول مٹی جھاڑتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوا، اب کی بار مدیحہ نے چونک کر دیکھا تھا اور عدیل کو اس ماحول اور اس حلیے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں۔

"تم یہاں؟" وہ اپنے تاثرات پہ کنٹرول نہیں کر پائی تھی اور بے ساختہ بول اٹھی، اس کے سوال پہ عدیل کے لبوں کو ایک تلخ سی مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

"جی ہاں..... میں یہاں، میرے جیسے بے کار لوگوں کا یہی ٹھکانہ ہے۔" عدیل نے لاپروائی سے کہا، لیکن مدیحہ تو جیسے کسی شاک میں آ گئی تھی، وہ ہکا بکا سی عدیل کا حلیہ دیکھ رہی تھی۔

"لیکن تم..... یہ کام کیسے.....؟" مدیحہ یوں بات کر رہی تھی جیسے پہلو میں کھڑا حیدر ہی نہیں سامنے کھڑا عدیل اس کا دوست ہو، جس سے اس کے کام پہ افسوس ہو رہا ہو۔

"کیوں میڈم! اس کام میں کیا برائی ہے بھلا؟" عدیل نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"برائی نہیں ہے لیکن....." مدیحہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"سلو! میڈم اور صاحب کے لیے کرسیاں لے کر آؤ۔" عدیل نے سلو کو اشارہ کیا تھا۔

"جی استاد! ابھی لایا۔" سلو نے جواباً بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

"بیٹھیے....." عدیل نے مدیحہ اور حیدر کو بیٹھنے کی آفر کی، حالانکہ عدیل کو خود مدیحہ کے ساتھ حیدر کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بہت عجیب سا فیل ہوا تھا، لیکن وہ اس چیز کا اظہار نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اس کے پاس نہ ایسا کوئی حق تھا، نہ تعلق۔

''نو تھینکس! بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔'' مدیحہ نے انکار کر دیا۔
''تو آپ آئی کیوں ہیں؟'' عدیل ڈائریکٹ اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔
''پتا نہیں کیوں آئی تھی۔'' مدیحہ نے نفی میں سر ہلایا۔
''کس چیز کی ٹیلنشن لے رہی ہیں آپ؟'' عدیل نے بغور اس کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔
''کہا نا کچھ نہیں، چلو حیری، واپس چلو۔'' مدیحہ کہتے ہوئے یکدم پلٹ گئی۔ حیری بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گیا تھا۔
''میڈم! آپ کو رینٹ پہ گاڑی مل سکتی ہے، آپ ٹھہریے تو سہی۔'' عدیل نے پیچھے سے آواز دی، لیکن مدیحہ بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گئی، وہ سب دیکھتے رہ گئے۔
مدیحہ کوشش کے باوجود اپنی کیفیات پہ کنٹرول نہیں کر پائی تھی، اس لیے اسے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور وہ وہاں سے آ گئی تھی، لیکن اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا، اسی اُلجھن نے اسے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا، حیری کو بھی مدیحہ کے ری ایکٹ پہ حیرت ہوئی تھی اور حیرت تو عدیل وغیرہ کو بھی ہو رہی تھی کہ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔

منڑاں دی چھتری توں اڈھ گئی
امبراں نے لامدی اے اڈاریاں

پھل کوئی ولایت والا لے گیا
پڈا میں رہ گیا کیاریاں

چھوٹے نے ایک اور موقع کی مناسبت سے گانا ڈھونڈ لیا تھا، اب کی بار عدیل نے اسے گھور کے دیکھا تھا اور چھوٹے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے رُخ موڑ گیا۔
''ویسے استاد! اللہ جھوٹ نہ بلوائے آج صاف لگ رہا تھا کہ میڈم کے دل میں اُتر گئے ہو، اس ڈیزل اور دھول مٹی سمیت، آج تو میڈم کے منہ سے کوئی شرارہ بھی نہیں پھوٹا۔'' چھوٹے نے دوبارہ عدیل کی سمت رُخ موڑتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
''لیکن یار! میڈم کے پہلو میں وہ مسٹر کون تھا؟'' سلو کا دھیان حیری کی طرف تھا۔
''اپنے استاد کا رقیب اور کون؟'' چھوٹے نے جھٹ سے بیان دیا۔
''بکو مت، جو منہ میں آتا ہے بول جاتے ہو۔'' عدیل نے اسے جھڑک دیا۔
''بول نہیں جاتا استاد! کھنک تو تم بھی گئے ہو۔'' چھوٹا بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا، عدیل زچ ہو گیا۔
''ہاں..... ہاں کھنک گیا ہوں، پھر؟'' اس نے چڑ کے پوچھا۔
''پھر لڈیاں پاواں۔'' چھوٹے نے قہقہہ لگاتے ہوئے بھنگڑا ڈالا اور اس کے ساتھ جیدی اور سلو بھی شامل ہو گئے تھے اور عدیل بھی اتنے غصے کے باوجود اپنا قہقہہ نہیں روک پایا۔

♥

عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا جب ان لوگوں کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی بڑی حویلی میں داخل ہوئی تھیں، اور ان کو دیکھتے ہی حویلی میں یکدم ہلچل سی مچ گئی، سب سے پہلے عون اور عدید بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے اور علیزے کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر بے ساختہ اس سے لپٹ گئے۔
''آئی مس یو علیزے آپی! آئی مس یو سو مچ۔'' وہ دونوں بڑی معصومیت سے باری باری اپنی بیتابی کا اظہار کر رہے تھے۔
''آئی مس یو جانو۔'' علیزے نے ان کی پیشانی پہ پیار کیا اتنے میں وقار آفندی، آسیہ آفندی، ثروت بیگم، ثمرہ بیگم اور اسرار آفندی بھی باہر نکل آئے اور سب ہی بچوں سے بہت محبت اور بہت خوشی سے ملے، لیکن جب وہ سب لوگ اندر آئے تو ان کی حیرت اور خوشی سے آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔
''ارے علیزے کے برتھ ڈے کی تیاری ہو رہی ہے نا؟'' دانیال نے گھر میں ہونے والی تیاری دیکھ کر فوراً ہی جان لیا تھا

ٹیبل پہ انویٹیشن کارڈز بھی بکھرے ہوئے تھے جو لوگوں میں تقسیم کرنے تھے۔

"ہوں بالکل..... چودہ نومبر کا دن تم لوگ بھول سکتے ہو، مگر میں نہیں، چودہ نومبر کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔" وقار آفندی، علیزے کو اپنے بازو کے حصار میں لیے کھڑے تھے۔

"چودہ نومبر کا دن تو ہم بھی نہیں بھول سکتے، اللہ نے ہمیں اتنی پیاری اتنی کیوٹ سی کزن سے نوازا تھا۔" دانیال نے شرارت سے کہتے ہوئے علیزے کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی، دانیال، انوشہ اور زین بھی حقیقتاً علیزے سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے، آخر ان کی کزنوں کا تو علیزے سے دوہرا رشتہ تھا۔

"کزن کزن، علیزے، علیزے، ہونہہ..... بھاڑ میں گئی علیزے، کان پک گئے ہیں اس کا نام سن سن کر....." کومل بمشکل خود کو چیخنے کرتی ہوئی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ حرمت اور آذر دونوں بہن بھائی نے بیک وقت کومل کی سمت دیکھا تھا، وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں طے کر گئی تھی۔ آذر گہری سانس کھینچ کے رہ گیا، البتہ باقی سب بڑے زور و شور سے اپنے نرپ کی روداد سنانے میں مصروف تھے۔

بڑی حویلی میں پھر سے رونقیں جاگ اٹھی تھیں لیکن ان رونقوں اور ہنگاموں کے باوجود وقار آفندی کا سارا دھیان عائشہ آفندی کی طرف تھا۔ عائشہ آفندی ہنسنے اور مسکرانے کے باوجود کافی اداس اور کچھ کھچی کھچی سی لگ رہی تھیں اور یہ بات آسیہ آفندی نے نوٹ کر لی تھی اسی لیے وہ عائشہ آفندی کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے عائشہ! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ اتنی تھکی تھکی سی کیوں لگ رہی ہو؟" آسیہ آفندی کو پریشانی ہو رہی تھی۔

"میں تو سالوں سے تھکی ہوئی ہوں بھابی! اس کمی کو محسوس نہیں ہوتا۔" عائشہ آفندی کا لہجہ اور آواز کافی کمزور سے تھے۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ پتا نہیں کیا ہوا ہے؟" عائشہ آفندی بے بس اور نا امیدی ہو رہی تھیں۔

"عائشہ! کیوں اتنی مایوس اور نا اُمید ہو رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو؟" وہ ان سے بضد اصرار پوچھ رہی تھیں۔

"امی نے مری میں زہرہ آنٹی کو دیکھا تھا، اس لیے اداس ہیں۔" زین نے لاپروائی سے کہتے ہوئے آسیہ آفندی کی مشکل آسان کی تھی لیکن آسیہ آفندی بھی زہرہ کا نام سن کر ٹھٹک گئی تھیں۔

"کیا..... زہرہ کو دیکھا تھا؟ لیکن کب؟ کہاں؟" آسیہ آفندی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔

"مری میں دیکھا تھا، آٹھ، دس دن ہو گئے ہیں، دل پہ یہی بوجھ لیے پھر رہی ہوں۔" عائشہ آفندی کے لہجے سے نقاہت جھلک رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ نڈھال ہو چکی ہوں۔

"تو پھر تم اس سے ملی تھیں؟" آسیہ آفندی کا اگلا سوال اُٹھا۔

"ملتی تو شاید دل پہ یہ بوجھ نہ رہتا۔"

"کیا مطلب ہے عائشہ! سب صاف صاف بتاؤ نا؟" وہ اُلجھ گئیں۔ اور پھر عائشہ آفندی نے زہرہ کو دیکھنے کی ساری روداد سنا کے بعد سن کر آسیہ آفندی چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ زہرہ یہیں کہیں ہے پاکستان میں؟"

"ہاں..... وہ یہیں ہے۔" اب عائشہ آفندی کے لہجے میں یقین شامل ہو چکا تھا۔

"ہوں..... تم فکر نہ کرو، میں وقار سے بات کروں گی، ہم اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" آسیہ آفندی نے انہیں تسلی دی اور پھر رات کو جب وہ سونے کے لیے بیڈ روم میں آئیں تو انہوں نے سب سے پہلا ذکر زہرہ کا ہی چھیڑا تھا۔

"کیا آپ کو پتا ہے عائشہ نے زہرہ کو دیکھا ہے؟" وہ بیڈ پہ بیٹھے ہوئے کمبل درست کر رہی تھیں، وقار آفندی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے کوئی ضروری فائل چیک کر رہے تھے، جب ان کی بات پہ ٹھٹھر گئے۔

"ہاں..... پتا ہے، سب پتا ہے، لیکن پلیز میں آج کل کے دنوں میں اپنے گھر میں کوئی ایسا ذکر نہیں سننا چاہتا جس کی وجہ سے کنفیوژن اور بدمزگی پیدا ہو، اس لیے عائشہ سے بھی کہہ دو کہ فی الحال اس بات کو یہیں رہنے دے۔" وقار آفندی نے ان کو سختی سے منع کر دیا تھا اور آسیہ آفندی چپ رہ گئی تھیں، وہ اب اور کیا کہہ سکتی تھیں بھلا؟ اسی لیے خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔

PRIME URDU NOVELS

البتہ وقار آفندی کا ذہن پھر سے بھٹک چکا تھا، وہ فائل سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بستر سے اُٹھ گئے سگریٹ اور دھوئیں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

♥

علیزے کے برتھ ڈے کی ارینجمنٹ حویلی میں ہی ہو رہی تھی اور اس ساری ارینجمنٹ کی ذمہ داری مبارک خان پہ تھی، مبارک خان نے دن رات ایک کر رکھا تھا، ہر کام اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا اور منصور حسین اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا، اس وقت بھی وہ اسے کھوجتا ہوا حویلی کی چھت پہ آ گیا تھا، کیونکہ حویلی کے چاروں اطراف ریلنگ پہ لائٹنگ کا کام ہو رہا تھا، حویلی کو دلہنوں کی طرح سجایا جا رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' منصور حسین نے کافی آہستگی سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! آؤ آؤ منصور حسین بیٹھو۔'' مبارک خان نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا۔

''نہیں یار! میں بیٹھنے نہیں آیا، میں کسی کام سے آیا ہوں۔'' منصور حسین کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''کس کام سے؟'' مبارک خان بھی پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا، کیونکہ منصور حسین اس وقت سنجیدہ اور بے لچک نظر آ رہا تھا۔

''مجھے دو دن کی چھٹی چاہیے، میں جب سے کام پہ آیا ہوں ایک دن بھی چھٹی نہیں لی، لیکن اب مجھے ضرورت ہے، میں نے گھر جانا ہے۔'' منصور حسین کافی تھکا ہوا تھا شاید، گھر جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو منصور حسین! تم جانتے بھی ہو کہ آج کل گھر میں کتنا کام ہے، کتنی مصروفیت ہے اور تم چھٹی لینا چاہ رہے ہو؟'' مبارک خان نے کافی خفگی سے اسے دیکھا۔

''مبارک خان! یہ کام تو کبھی ختم نہیں ہوں گے، تو کیا کبھی گھر نہیں جاؤں گا؟'' منصور حسین کو اس سے بھی زیادہ خفگی ہوئی تھی۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ مجبوری کے مارے سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے، مجھے دیکھ لو، چھ مہینے ہو گئے ہیں، میں گھر نہیں گیا، میرے بھی ماں، باپ ہیں، بہنیں ہیں، بھائی ہے، بیوی ہے، کیا میرا دل نہیں چاہتا گھر جانے کے لیے؟'' مبارک خان کا لہجہ بھی قدرے اداس ہو گیا، جس پہ منصور حسین کو نا چاہتے ہوئے بھی خاموش ہونا پڑا۔

''دیکھو منصور حسین! یہ فنکشن ختم ہو لینے دو، پھر تم آرام سے چھٹی لے لینا اور گھر جا کر ریسٹ کر لینا۔'' مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہوں..... ٹھیک ہے، لیکن صرف اس فنکشن تک۔'' منصور حسین کو ماننا ہی پڑا تھا، ورنہ وہ چھٹی لینے کا پکا ارادہ کر کے آیا تھا۔

''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہو گا۔'' مبارک خان نے اسے تسلی دی اور منصور حسین سر ہلا کر پلٹ گیا۔

''اور سنو منصور حسین۔'' اس نے پیچھے سے اسے پکارا۔

''ہوں کہو؟'' وہ ٹھہر گیا۔

''بڑے صاحب نے کہا ہے، علیزے بی بی کی گاڑی سروس کروا لاؤ، گیراج میں کھڑی ہے، کافی گندی لگ رہی ہے۔'' مبارک خان نے پیغام دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، کروا لاتا ہوں۔'' وہ کہہ کر چلا گیا اور ابھی وہ نیچے آیا ہی تھا کہ علیزے نے پکار لیا۔

''جی بی بی! کہیے؟'' وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

''میں نے بوتیک جانا ہے۔'' وہ بھی کافی دھیمی آواز میں بولی تھی، جب سے مری میں اس کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا تھا وہ منصور حسین سے آنکھ ملا کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

''معذرت چاہتا ہوں بی بی جی! فی الحال میں گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہوں۔''

''تو پھر میں کیسے جاؤں گی؟''

''آپ انتظار کر لیں، بعد میں چلی جائیے گا، تب تک گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔'' منصور حسین بھی آہستگی سے جواب دے رہا تھا۔

"کس نے جانا ہے؟" آذر اور دانیال بھی ڈرائنگ روم سے نکل آئے تھے۔

"میں نے بوتیک جانا ہے، لیکن ڈرائیور گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہے، اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اب کس کے ساتھ جاؤں؟" علیزے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

"آذر کے ساتھ چلی جاؤ، یہ بھی مارکیٹ کی طرف ہی جا رہے ہیں۔" دانیال نے فوراً مشورہ دیا۔

"نہیں..... میں نے کسی کام سے کہیں اور بھی جانا ہے، میں اپنے ساتھ نہیں لے کر جا سکتا، تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔" آذر نے بھی فوراً ہی انکار کر دیا، وہ علیزے کے قریب ہو کر اسے خوامخواہ دوسروں کی نفرت اور حقارت کا نشانہ نہیں بنوانا چاہتا تھا، اسی لیے پچھلے کئی دنوں سے اس سے کترا رہا تھا۔

"لیکن میں....." دانیال نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم فارغ ہو دانیال، تم لے جاؤ، میں فی الحال بزی ہوں۔" آذر نے دانیال کو درمیان میں ہی ٹوک دیا، دانیال چپ ہو گیا، اب وہ انکار کیسے کرتا؟ سو مجبوراً جانے کے لیے مان گیا تب کہیں منصور حسین بھی آزاد ہوا اور گاڑی لے کر حویلی سے نکل آیا، وہ بھی آذر اور علیزے کے متعلق ہی سوچ رہا تھا، منصور حسین کی نظر بڑی گہری نظر تھی، پہلی نظر اور پہلی ملاقات میں ہی پہچان جاتا تھا کہ کون کیا ہے؟ کس مزاج کا ہے؟ کیا کہتا ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ اور یہی حال آذر سے مل کر بھی ہوا تھا، وہ آذر کی چاہت، اس کی طبیعت سب جان گیا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ آذر پچھلے چند روز سے کچھ چپ چپ اور ڈسٹرب سا ہے اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ علیزے کی بے رخی کی وجہ سے ڈسٹرب ہے، کیونکہ آذر جتنا علیزے سے کلوز نظر آتا تھا آج کل اتنا ہی دور نظر آ رہا تھا، جس کے پیچھے یقیناً کوئی بڑی وجہ ہی تھی۔

منصور حسین نے اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے گاڑی سیدھی چابنہ در کشاپ کے اندر لا کھڑی کی اور خود گاڑی سے اتر آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سامنے کھڑے عدیل سے ہاتھ ملایا۔

"وعلیکم السلام! آیئے بیٹھیے منصور صاحب۔" عدیل نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور منصور حسین آگے بڑھ کے کرسی کی طرف آ گیا۔

"شکریہ۔" وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر کرسی پہ بیٹھ گیا، اسے حویلی میں ہوتے ہوئے سگریٹ پینے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا، اس لیے وہ جب بھی حویلی سے نکلتا اپنا شوق، اپنی عادت پوری کر لیتا تھا۔

"کہیے کیا حکم ہے ہمارے لیے؟" عدیل گاہک کو بڑے پیار اور بڑے احترام سے ہینڈل کرتا تھا۔

"گاڑی سروس کروانی ہے۔" اس نے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو آپ نے سروس کروائی تھی؟" عدیل کے بولنے سے پہلے ہی چھوٹا بول پڑا۔

"دو ہفتے کی بات ہے، اور دو ہفتے میں تو انسان کی سروس کی ضرورت پیش آ جاتی ہے، تم گاڑی کی بات کر رہے ہو؟" اس نے مسکرائیہ انداز میں کہہ کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں اڑا دیا۔

"ارے باؤ منصور! یہاں لوگ دو، دو سال گاڑی سروس نہیں کرواتے، آپ دو ہفتے کی بات کر رہے ہو؟" چھوٹا کون سا کم تھا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے، تمہیں پتا نہیں ہے شاید؟" منصور حسین کے لہجے میں تمسخر تھا۔

"کس کی ہے جناب؟" چھوٹے نے بھی تجسس سے پوچھا تھا۔

"آخندی انڈسٹریز کے مالک وقار آخندی کی بیٹی کی گاڑی ہے۔" منصور حسین نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا اور چھوٹے نے ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔

"اوہ اچھا پھر تو ان کا حق بنتا ہے کہ جب چاہیں گاڑی سروس کروائیں۔"

"بالکل میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔" منصور حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہیں؟" چھوٹے کا ذہن اب کہیں اور جا پہنچا تھا۔

"ظاہر ہے، اسی لیے تو اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔" منصور حسین پاؤں سیدھے کر کے بیٹھ گیا۔

"پھر تو بڑے خوش قسمت ہو یار منصور۔" چھوٹے نے رشک کا اظہار کیا۔

"ارے بھئی میں ڈرائیور ہوں، خوش قسمت کیسے ہو گیا بھلا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یار منصور! اتنے بھولے نہ بنو، لوگ یہاں وقار آفندی سے ملنے کے لیے ترستے ہیں، مہینوں پہلے ٹائم لیتے ہیں اور آپ ان کے گھر میں رہتے ہو، ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہو، یہ خوش قسمتی کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟" چھوٹا خفگی سے کہہ رہا تھا جس پہ منصور حسین نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

"میں ایسی خوش قسمتی کو دل پہ نہیں لیتا شہریار صاحب! اور نہ ہی چھوٹی موٹی خوش قسمتی پہ خوش ہوتا ہوں۔" منصور حسین کا انداز بڑا شاہانہ تھا، جسے دیکھ کر عدیل بے ساختہ مسکرا دیا اور اس کی بات سے متاثر بھی ہوا تھا، بالکل ٹھیک کہا منصور صاحب آپ نے، میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات رکھتا ہوں کسی امیر کبیر آدمی اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور دُعا سلام کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنا انسان کی سب سے بڑی بیوقوفی اور کم عقلی کی علامت ہے اور ہی علامت ہمارے چھوٹے میں بے بہا پائی جاتی ہے۔" عدیل ذرا فارغ تھا، اس لیے کرسی کھینچ کر خود بھی منصور حسین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ منصور حسین پہلے بھی ایک دفعہ ان کے پاس آ چکا تھا۔ اس لیے ان میں تھوڑی بہت بے تکلفی بھی ہو چکی تھی۔

"اس کا کوئی قصور نہیں ہے، یار عدیل! یہ عمر ہی ایسی ہے، خوش فہمیوں میں ڈالنے والی۔" منصور حسین نے مذاق اُڑایا اور اسی ہنسی مذاق میں وہ گاڑی سروس کرنے میں لگ گئے، البتہ عدیل کافی دیر منصور حسین سے باتوں میں مصروف رہا تھا۔

♥

جوت کافی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسز بدر کا انتظار کر رہا تھا، وہ شاید اوپر اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھیں، عاصم، سائم اور فاطمہ گھر پہ نہیں تھے، شاید اسی لیے ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور جوت انتظار کرتے ہوئے بور ہونے لگا۔

"ارے جوت تم یہاں؟" سائم اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور جوت کو صوفے پہ بیٹھا دیکھ کر بے ساختہ حیرت اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"جی ہاں..... میں ہی ہوں، میری آمد نہیں ہے۔" جوت نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"ہاں..... تمہاری آمد تو مری اور اسلام آباد بھٹکنے کے لیے گئی ہوئی تھی، واپسی کب ہوئی۔" سائم مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"دو دن پہلے۔"

"اچھا تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟"

"سوچا پہلے کھکن اُتار لوں، پھر بتا دوں گا۔" جوت نے کندھے اچکائے۔

"کیسی کھکن؟" سائم کا سوال معنی خیز سا تھا۔

"ارے نہیں ایسی ویسی کھکن نہیں تھی، ساری فیملی کے ہوتے ہوئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔" جوت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اچھا اتنا احترام کرتے ہو فیملی کا۔"

"آف کورس یار! جب بہنیں اور بھائی ساتھ ہوں تو احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"چلو شکر ہے، کسی کا تو احترام کرتے ہو نا۔" سائم نے شکر ادا کیا تھا اور جوت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"ہیلو مائی سن! کیا ہو رہا ہے؟" مسز بدر ملک سک سے تیار ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" جوت فوراً کھڑا ہو گیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ آج کیسے آنا ہوا؟ مجھے پتا چلا ہے کہ تم کافی دیر سے انتظار کر رہے ہو؟" وہ جوت کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئیں۔

"جی! وہ آنٹی نے آپ کے لیے یہ کارڈ بھیجا ہے۔" جوت نے کارڈ ان کی سمت بڑھا دیا

"اوہ تو علیزے کی برتھ ڈے ہے؟" مسز بدر کارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"جی! اور آنٹی نے آپ کو اسپیشلی انوائٹ کیا ہے، اسی لیے یہ کارڈ مجھے دے کر بھیجا ہے۔"

"ہاں..... ہاں کیوں نہیں بھئی، میں ضرور آؤں گی۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہامی بھری اور جودت ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ارے اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو بیٹھو نا؟" سائم اور مسز بدر نے بیک وقت اسے روکا تھا۔

"ایم سوری اِنی الحال بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے، میں نے ابھی کہیں اور بھی جانا ہے کارڈ دینے کے لیے۔" اس نے معذرت چاہی تھی۔

"کہاں جانا ہے؟ میں بھی چلتا ہوں۔" سائم بھی کھڑا ہو گیا۔

"مسز رزاق کی طرف....." جودت نے سائم کی آنٹی کا نام لیا۔

"ارے وہ تو اس وقت اکیڈمی میں ہوں گی؟" سائم نے اطلاع دی۔

"تو کوئی بات نہیں، میں اکیڈمی چلا جاتا ہوں، ان ٹیکٹ یہ کام مجھے آنٹی نے سونپا ہے، اس لیے اسے پورا کرنا ضروری ہے اور تم زحمت بھی کوتاہی نہیں کر سکتا۔" جودت نے اصل وجہ بتائی۔

"اوکے..... چلو پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" سائم جانے کے لیے تیار تھا۔

"ریلیکس گو....." جودت کہتے ہوئے پلٹا اور مسز بدر کو اللہ حافظ کہہ کر سائم کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"اور سناؤ کوئی نئی تازہ؟ تمہارے دن کیسے گزرے؟" جودت بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"سو بورنگ یار! کوئی مزا نہیں آ رہا، موسم بے رنگ سا گزر رہا ہے۔" سائم نے منہ بنایا۔

"اچھا..... یہ سب تم کہہ رہے ہو؟" جودت نے مذاق اڑاتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں یار! طبیعت فریش نہیں ہے۔" سائم نے اعتراف کیا۔

"تو پھر کریں فریش؟" جودت نے چھیڑا۔

"تم تو کرلو گے، لیکن میں کیا کروں گا؟" سائم منہ بنا کے بولا تھا۔

"یار! جینے میں اپنی طبیعت فریش کرنا چاہتا ہوں ویسے ہو نہیں رہی نا؟" جودت کے جواب پہ سائم اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا، اسی لیے چپ بھی ہو گیا اور راستے میں جودت نے بائیک اکیڈمی کی پارک میں لا کھڑی کی تھی۔

جودت اور سائم کو چوکیدار پہلے سے جانتا تھا، اس لیے فوراً گیٹ کھول دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور سیدھے قدم پرنسپل کے آفس روم کی طرف بڑھا دیے تھے۔

"ویسے یار! رنگا رنگ خوشبوئیں اور رنگا رنگ نظارے دیکھنے ہوں تو بندہ گرلز کالج یا اکیڈمی کا رخ کرے۔" جودت کے لہجے اور آنکھوں میں شرارت تھی، وہ کلاس روم سے نکل کر سیڑھیاں اترتی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"جودت! انسان بنو، آنٹی کو پتا چلا تو ناراض ہوں گی۔" سائم نے اسے ٹہوکا دیا تھا اور مجبوراً جودت نے سر جھکا لیا۔

لیکن جب وہ مسز رزاق کو کارڈ دے کر واپس آ رہے تھے کہ کلاس روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے جودت کے قدم اچانک رک گئے، وہ ایک سرسری نظر میں ہی پہچان گیا تھا کہ وہ کون ہے؟

"جودت....." سائم نے اسے اپنے ساتھ نہ پا کر فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"میں شاید اپنا سیل بھول آیا ہوں، تم چلو میں لے آؤں۔" جودت اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا بہانا بنا کر پلٹ گیا اور سائم اس کی ذہانت سے بے خبر گیٹ عبور کر گیا۔

اس کی کلاس آف ہو چکی تھی اسی لیے وہ اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی پلٹ رہی تھی جب کسی کو کلاس روم کے دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ جا لگ کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی لیکن جیسے ہی اس کے چہرے پہ نظر گئی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہائے..... کیسی ہیں آپ؟" جودت اسے اپنی گہری نظروں کی زد میں رکھتے ہوئے قدم بڑھاتا ہوا قریب آ گیا۔

"آپ کون ہیں میں آپ کو نہیں جانتی۔" مریم نے اپنی چادر درست کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"آپ کا گھائل ہوں، بس جاننے کے لیے یہی کافی ہے۔" جودت جتنے قدم بڑھا کے قریب آیا تھا، مریم اتنے ہی قدم اٹھا کر پیچھے ہوئی تھی۔

"شٹ اپ! تمیز سے بات کریں، آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" مریم کافی پُراعتماد لڑکی تھی، وہ جودت سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔

"لیکن مجھے تو بتانے کی ضرورت ہے نا مریم فاروق نیازی؟" جودت نے اس کا پورا نام لیا، جس پہ مریم نے چونک کر دیکھا اور جودت اس کے ری ایکٹ پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے، آج اس پہ بھی یقین آ گیا ہے، راستے میں آپ کی ہی طلب کر رہا تھا اور یہاں آپ مل گئیں، اللہ کا شکر ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں بھلا۔" جودت اس کے چہرے پہ نظریں جمائے اسے بغور دیکھ رہا تھا اور مریم نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ جودت نے اسے روک دیا۔

"فی الحال کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ذرا جلدی میں ہوں، آپ سے پھر ملوں گا، اللہ حافظ۔" وہ اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بے باک نظروں سے دیکھتا پلٹ کر چلا گیا اور مریم وہیں کی وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

♥

"شہناز بی بی! آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔" انسپکٹر شہناز ڈیوٹی پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، جب ملازمہ کی اطلاع پہ اس کے ہاتھ رُک گئے۔

"کون ملنے کے لیے آیا ہے؟" اس کا سوال کھوجتا ہوا تھا۔

"پتا نہیں کون ہے، آپ سے ملنے پہ بضد ہے۔" ملازمہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے، بٹھاؤ اس کو، میں آ رہی ہوں۔" اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنے آپ پہ ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور شوز پہننے کے بعد اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل لے کر خود بھی نیچے آ گئی، لیکن ڈرائنگ روم میں چار، پانچ گارڈز کے ساتھ اس آدمی کو دیکھ کر انسپکٹر شہناز بُری طرح ٹھٹک گئی تھی، اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"السلام علیکم۔" اسے دیکھ کر وہ آدمی کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام! بیٹھیے۔" مجبوراً اسے فارمیلٹی نبھانی ہی پڑی۔

"شکریہ میڈم بہت شکریہ۔" وہ آدمی بیٹھ گیا۔

"کہیے؟ کون ہیں آپ اور کس سلسلے میں آئے ہیں؟" اس کا لب و لہجہ پروفیشنل ہو چکا تھا۔

"ملک حق نواز نام ہے میرا، مومنہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملنا چاہتا ہوں، ملاقات کروا دیں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا تھا، نپے تلے انداز میں۔

"ملک حق نواز؟" انسپکٹر شہناز دنگ رہ گئی تھی۔

یہ نام اس کی سماعتوں پہ کسی بم کی طرح پھٹا تھا۔

لیکن اس نے ایک ذہین اور سمجھدار آفیسر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے تمام تاثرات لمحے کے ہزارویں حصے میں کنٹرول کر لیے تھے، کیونکہ یہاں اس کا مشتعل ہونا خود اس کی ذات کو ہی نہیں اس گھر میں موجود اس کے ماں باپ اور مومنہ بی بی کو بھی کسی مشکل میں ڈال سکتا تھا، کیونکہ اس وقت وہ اکیلی تھی اور سامنے کھڑے افراد مسلح تھے، وہ ڈری نہیں تھی بس قدرے محتاط ہو گئی تھی، ایسے ہزاروں کیسز سے روزانہ ان کا واسطہ پڑتا تھا جن میں اکثر خود پولیس آفیسرز کو یا پھر ان کے گھر والوں کو نقصان اُٹھانا پڑتا تھا، اس لیے وہ کسی عظیم نقصان کے خیال سے ہی کچھ سہمی پڑ گئی۔

"اوہ..... تو آپ ہیں ملک حق نواز صاحب؟" اس نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا۔

"کیا بات ہے میڈم! کیا میرا نام پہلی بار سنا ہے آپ نے؟" ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو گہری اور کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھا۔

"ارے نہیں ملک صاحب! نام پہلی بار نہیں سنا، دیکھا پہلی بار ہے۔" انسپکٹر شہناز کافی خوش اخلاقی سے بات کر رہی تھی۔

"ہوں تو پھر مجھے دیکھا ہے تو مجھے سمجھ بھی گئی ہوں گی آپ؟" ملک حق نواز جیسے انسپکٹر شہناز کو کچھ باور کروا رہا تھا اور نادان تو وہ بھی نہیں تھی، البتہ یہ الگ بات تھی کہ وہ نادان بن رہی تھی کیونکہ صورتحال ہی کچھ ایسی تھی۔

''جی..... جی بالکل بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں، آپ کی حیثیت، آپ کا مرتبہ سب سمجھ میں آچکا ہے، بس آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' انسپکٹر شہباز نے کافی عاجزی اور ملنساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے میڈم شہباز! آپ نے شاید غور نہیں کیا؟ میں اپنی عرض تو پہلے جملے میں ہی واضح کر چکا ہوں، لیکن کوئی بات نہیں، ایک بار پھر سہی۔'' ملک حق نواز آج اپنے مزاج کے خلاف بڑے ٹھہراؤ سے بات کر رہا تھا۔

''جی کہیے! میں سن رہی ہوں۔'' انسپکٹر شہباز نے اپنی ساری توجہ ملک حق نواز کی سمت مرکوز کر رکھی تھی۔

''دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملاقات کرنا چاہ رہا ہوں، لیکن دونوں ہی کہیں میسر نہیں آ رہے، البتہ یہ سننے میں ضرور آیا ہے کہ ان دونوں کا آپ سے پرسنل کانٹیکٹ رہتا ہے، اس لیے سوچا ہے کہ آپ سے ہی کہا جائے کہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالیں، تاکہ کچھ وہ اپنی کہہ سن لیں اور کچھ میں اپنی کہہ سن لوں۔ کہیے کیا خیال ہے آپ کا؟''

ملک حق نواز بڑے طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن انسپکٹر شہباز سب سمجھتی تھی وہ نا سمجھ بچی نہیں تھی جو اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتی، اس نے بھی کچھ بولنا تو تھا لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔

''دیکھیے ملک صاحب! دل آور شاہ ایک بہت اچھے، بہت ذہین اور سمجھدار وکیل ہیں، میرا ان کے ساتھ کوئی پرسنل ریلیشن شپ نہیں ہے جس کی وجہ سے پرسنل کانٹیکٹ ہو گا، بس ہمارا پروفیشن ایسا ہے کہ کبھی کبھار آمنا سامنا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے دعا سلام بھی ہوتی رہتی ہے، لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، البتہ دل آور شاہ کے بارے میں اتنا ضرور پتا ہے کہ آج کل وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ دو تین روز تک واپس لاہور آ جائیں گے لیکن یہ بات پھر بھی کنفرم نہیں ہے، ہو سکتا ہے وہ لیٹ ہو جائیں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جلدی واپس آ جائیں اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور رہی بات مومنہ بی بی کی تو ان کے بارے میں بھی میری معلومات کچھ ایسی ہی ہیں، کیونکہ مومنہ بی بی، دل آور شاہ کا کیس ہے، اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات دل آور شاہ کو ہی ہو گی، آپ ان کی واپسی کا انتظار کر لیں، آپ کا سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' انسپکٹر شہباز نے مومنہ بی بی کے متعلق مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا جس پہ ملک حق نواز کی پیشانی پہ ناگواری کے باعث بل پڑ گئے تھے۔

''انسپکٹر شہباز! آپ کی معلومات ناقص اور محدود ہو سکتی ہے لیکن ملک حق نواز کی نہیں، میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ مجھے دیکھ کر مجھے سمجھ گئی ہوں گی، لیکن آپ تو کچھ بھی نہیں سمجھیں۔ ملک حق نواز آپ کے گھر کی اس چار دیواری میں بیٹھ کر اس چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ یہاں بیٹھ کر بھی آپ کے پورے گھر کے بارے میں بتا سکتا ہوں جس کے ثبوت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مومنہ بی بی اس وقت اسی چار دیواری میں موجود ہے، میں چاہوں تو ایک منٹ میں اسے نکال کر باہر لے آؤں۔ سمجھیں آپ؟'' ملک حق نواز نے کافی سخت لہجے میں کہتے ہوئے انسپکٹر شہباز کے سامنے چٹکی بجائی تھی اور انسپکٹر شہباز نے خود کو ایسا کنٹرول کیا تھا کہ اپنا رنگ فق نہیں ہونے دیا ورنہ اگر یہاں اس کا رنگ فق ہو جاتا تو ساری بازی پلٹ جاتی، ملک حق نواز نے محض پتا پھینکا تھا کہ رنگ گیا تو لگ گیا، نہ لگا تو نہ سہی۔

''ملک صاحب! میں نے بھی آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں آپ کی حیثیت، آپ کا مرتبہ سب سمجھ چکی ہوں، آپ کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی ہو چکا ہے پھر بھی سب کچھ دیکھتے ہوئے میں آپ سے جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں؟ آپ اس وقت بااختیار ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں، ایسے میں میں غلط بیانی سے کام لے کر معاملہ کیوں بگاڑوں گی بھلا؟ میں بیوقوف نہیں ہوں، اس وقت میرے لیے آپ کی بات اہم ہے، آپ میرے گھر آئے ہیں، اچھے طریقے سے بات کر رہے ہیں، کوئی غصہ نہیں ہے، کوئی دھمکی نہیں، پھر بھی اگر میں آپ کے ساتھ جھوٹ بولوں گی تو یہ الٹا میرے لیے نقصان دہ ہو گا آپ کے لیے نہیں..... ہاں اگر آپ کو شک ہے کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے، میرے گھر میں ہے تو پلیز میں آپ سے کہوں گی کہ آپ اپنا شک دور کر لیں، میرا گھر کھلا پڑا ہے، آپ تلاشی لے سکتے ہیں، حالانکہ میرے گھر کی تلاشی لینے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے، آپ کے لیے قانوناً جرم ہے یہ، لیکن پھر بھی آپ کو میری طرف سے اجازت ہے، آپ اپنی تسلی کر لیں۔'' انسپکٹر شہباز کے اعتماد کے آگے ملک حق نواز کا پھینکا گیا پتا بیکار ہو گیا تھا وہ بھی خود پہ اعتماد رکھ کے اتنی بڑی بات کہہ گئی تھی کہ ملک حق نواز خاموش رہ گیا۔

''دیکھیے انسپکٹر شہباز! میں اس وقت آپ کے گھر کی تلاشی لینے کے ارادے سے نہیں آیا، میں تو آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ مجھے انجان مت سمجھیے گا؟ میں انجان نہیں ہوں، دل آور شاہ سے کہیے گا کہ مجھ سے غافل مت رہے، کیں مومنہ بی بی کو

انصاف دلاتے دلاتے اپنا نقصان نہ کر لے، کیونکہ دل آور شاہ کی وجہ سے یا مومنہ بی بی کی وجہ سے میری ساکھ خراب ہوئی تو اچھا نہیں ہوگا، آج کل الیکشن کے دن ہیں، میری بدنامی سے میری پارٹی کو نقصان پہنچا تو سب کا انجام بُرا ہی ہوگا اتنا بُرا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔" ملک حق نواز نے اُنگلی اُٹھا کر وارننگ دی تھی اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اور ہاں..... جو بھی اس معاملے میں شریک ہوگا سب لپیٹ میں آئیں گے، معافی کسی کے لیے بھی نہیں ہوگی۔" اس نے جاتے جاتے ایک اور وارننگ دی اور اپنے گارڈز کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔

"معاف کرنے والا تو دل آور شاہ بھی نہیں ہے ملک صاحب....." انسپکٹر شہباز کی آواز پر ملک حق نواز کے قدم تھم گئے تھے، اس نے یکدم پلٹ کر انسپکٹر شہباز کی سمت دیکھا۔

"آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟" ملک حق نواز نے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

"میں دھمکی نہیں دے رہی ملک صاحب! آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ اگر آپ بے قصور ہیں تو دل آور شاہ بھی آپ سے کچھ نہیں لے گا اور اگر آپ واقعی قصوروار ہیں تو دل آور شاہ کے عتاب سے بچنا اتنا آسان نہیں ہوگا آپ کے لیے، میری یہ بات آپ بے شک لکھ کر رکھ لیں، معافی کی گنجائش ان کے پاس بھی نہیں ہوتی۔" انسپکٹر شہباز نے ملک حق نواز کو دل آور شاہ کے متعلق تھوڑا بہت بتا دینا ہی مناسب سمجھا تھا کہ کہیں وہ دل آور شاہ کو ایری غیری شخصیت ہی نہ سمجھتا پھرے۔

"یہ دھمکی نہیں تو اور کیا ہے؟" ملک حق نواز نے انسپکٹر شہباز کو کافی سخت نظروں سے دیکھا تھا۔

"اگر یہ اتنی سی بات آپ کو دھمکی لگ رہی ہے تو پھر دھمکی ہی سہی۔" اس نے کندھے اچکائے اور ملک حق نواز مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا کیونکہ ایک پولیس آفیسر کے گھر پہ ان کا کوئی ہنگامہ برپا کرنا بھی ان کے حق میں ٹھیک نہیں تھا لہٰذا ضبط ہی بہتر تھا۔

"ہوں ٹھیک ہے پھر، اللہ حافظ۔" انسپکٹر شہباز کے تنے ہوئے اعصاب اور بھی تن گئے تھے ملک حق نواز کی نظریں چھید دینے والی تھیں لیکن پھر بھی وہ لب بھینچتی ہوئی زہر کا گھونٹ پی کے رہ گئی، وہ آج اگر ملک حق نواز کے سامنے خاموش ہوئی تھی تو محض مومنہ کی وجہ سے، کیونکہ وہ اپنے غصے اور اشتعال کی وجہ سے مومنہ بی بی کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی، ملک حق نواز آج کل اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اسے جان سے بھی مار سکتا تھا، اسی لیے تو وہ جگہ جگہ اس کی بُو سونگھتا پھر رہا تھا اور دوسری طرف دل آور شاہ نے مومنہ بی بی کی حفاظت کی ذمہ داری اسے سونپی ہوئی تھی اس لیے اسے یہ ذمہ داری ہر حال میں نبھانی بھی ہے، کچھ بھی ہو جائے۔

"شہباز! کیا بات ہے بیٹا! کون تھے یہ لوگ؟" تیمور رضوی کی آواز پہ انسپکٹر شہباز یکدم چونک گئی۔

"کیا ہوا ہے؟ پریشان لگ رہی ہو؟" انہوں نے دوبارہ استفسار کیا وہ بیٹی کے چہرے سے ہی پریشانی بھانپ چکے تھے۔

"کچھ نہیں ابی جان! بس وہ مومنہ بی بی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی، ملک حق نواز میرے گھر تک ملنے گیا ہے۔" انسپکٹر شہباز نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے مختصر سے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا..... تو یہ ملک حق نواز تھا؟" انہوں نے پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے اور ملک حق نواز ان کے گھر سے نکل رہا تھا جسے دیکھ کر ان کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"جی ہاں..... یہ وہی خبیث ہے۔" انسپکٹر شہباز غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟ اس نے کچھ کہا ہے کیا؟"

"جی ہاں..... اسے شک ہو چکا ہے کہ مومنہ میرے پاس ہے اور میرا دل آور شاہ سے پرسنل کانٹیکٹ بھی ہے۔" انسپکٹر شہباز کبھی اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور کبھی پیشانی مسل رہی تھی۔

"اوہ..... تو یہ مسئلہ ہے؟"

"جی یہی مسئلہ ہے اور اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ نہیں آ رہا؟" انسپکٹر شہباز پریشانی کے مارے ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں ٹہل رہی تھی اسے مومنہ بی بی کے لیے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تو بیٹا! تم دل آور شاہ سے بات کرو نا، اسے ساری صورتحال سے آگاہ کرو، وہ یقیناً کوئی حل سوچ لے گا۔" انہوں نے بیٹی کو مشورہ دیا۔ لیکن انسپکٹر شہباز کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ دل آور شاہ کو پریشان کرے، آخر وہ کیا سوچے گا کہ انسپکٹر شہباز اتنی جلدی ذمہ داری سے گھبرا گئی ہے۔

''نہیں ابی جان! میرا دل نہیں مان رہا، میں دل آور شاہ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''لیکن بیٹا! اس طرح تو مسئلہ حل نہیں ہوگا نا۔ اب تو مومنہ بی بی کے ساتھ ساتھ خود تمہاری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو چکا ہے، ملک حق نواز سامنے آچکا ہے آخر؟'' عبدالقیوم رضوی بیٹی کو ساری اونچ نیچ سمجھا رہے تھے۔

''لیکن ابی جان! آپ یہ بھی تو سوچیے کہ ملک حق نواز اگر میرے گھر تک پہنچ سکتا ہے تو وہ کہیں بھی پہنچ سکتا ہے، مومنہ بی بی نہ تو کسی دارالامان میں رہ سکتی ہے، نہ کسی ہاسٹل میں اور نہ ہی کسی ہوٹل میں، کیونکہ ان جگہوں پہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے گی اور رہی بات گھر میں رکھنے کی تو کوئی بھی اسے اپنے گھر میں نہیں رکھے گا، کیونکہ مومنہ بی بی کو اپنے گھر میں رکھنا اور پناہ دینا خطرے سے خالی نہیں ہے اور آج کل کسی اور کی وجہ سے کون خطرہ مول لیتا ہے بھلا؟'' انسپکٹر شہناز حقیقتاً پریشان ہو رہی تھی۔

''تو بیٹا! پھر چھوڑو اوروں کی بات، تم اسے رہنے دو، وہ یہیں رہے گی، ہم سمجھیں گے کہ ہماری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔'' عبدالقیوم رضوی نے بڑی فراخدلی سے کہا تھا وہ ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے، بہت بہادر، وسیع ظرف اور رحمدل بھی، پہلے دن جب انسپکٹر شہناز نے ان کو مومنہ بی بی کے متعلق بتایا تھا تو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مومنہ بی بی کو خوش آمدید کہا تھا اور اپنے گھر میں پناہ دی تھی، لیکن آج ملک حق نواز آڑے آگیا تھا۔

''نہیں ابی جان! اب مومنہ بی بی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ میں اور میرا گھر ملک حق نواز کی نظر میں آچکے ہیں، وہ مجھ پہ اور میرے گھر پہ چیک رکھے گا، اسی لیے مومنہ بی بی کو کہیں اور شفٹ کرنا پڑے گا، جہاں اس کی سوچ بھی نہ جا سکے۔''

انسپکٹر شہناز اس کے لیے کسی محفوظ جگہ کا سوچ رہی تھی اور اس کی سوچیں، نظریات اور پریشانی باہر کھڑی مومنہ بی بی کو ندامت کے کنویں میں دھکیل گئی تھیں، اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے تھے، وہ سب کے لیے مصیبت بن گئی تھی، کیوں اس نے اپنی وجہ سے دوسروں کو بھی آزمائش میں ڈال رکھا تھا؟ اس کی سوچیں اور خیالات اسے چپ کرا گئے تھے، اب اس نے چپ رہ کر بھی کچھ اور سوچنا تھا اور فیصلہ کرنا تھا، وہ دوسروں پہ بوجھ کب تک بنتی؟ آخر کب تک تک کرتی؟

♥

''عدیل عمر.....!'' سوچتے سوچتے اچانک ایک کپکپی کی سی صورت میں اس کا نام اس کے لبوں سے ادا ہوا اور وہ اس نام پہ خود ہی چونک گئی۔

''عدیل عمر.....؟'' اس نے اپنے آپ سے تصدیق کے لیے دوبارہ نام دہرایا اور دوبارہ بھی اسے یہی لگا کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہو..... اور دل سے ادا شدہ ''عدیل عمر'' مدیحہ حیات کو گم سم کر گیا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے؟ وہ اپنے آپ کو ٹٹول رہی تھی، اپنے دل کو کھوج رہی تھی، اور جو سمجھ آرہا تھا وہ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔

''تو کیا محبت.....؟'' یہ خیال ذہن میں آتے ہی دوسرے تھام کے بیڈ پہ بیٹھ گئی اور اس کی سماعتوں میں دور دور تک اس کی اپنی ہی ''نہیں نہیں'' کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

''کیا مدیحہ حیات کو کسی سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ خود اپنی ذات سے سوال کر رہی تھی اور جواباً پھر اسے وہی گم سم سی خاموشی سنائی دے رہی تھی، چپ چپ اور حیران پریشان۔

''مدیحہ! تم ابھی تک جاگ رہی ہو بیٹا؟'' فائزہ بیگم اس کے بیڈروم کی لائٹ جلتی دیکھ کر اندر آگئی تھیں اور مدیحہ کو بیڈ کی پائنتی کی طرف ایک کنارے پہ بیٹھے دیکھ کر انہیں اور بھی تشویش کا احساس ہوا تھا۔

''مدیحہ! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے قریب آتے ہوئے مدیحہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مدیحہ چونک گئی اس نے یکدم سر اٹھا کر فائزہ بیگم کو جیسے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

''مدیحہ تم ٹھیک تو ہو؟ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟'' انہوں نے مدیحہ کی آنکھوں سے گھبرا کر پوچھا۔

''کک..... کچھ نہیں ہوا مجھے۔'' اس نے یکدم نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اس کی پیشانی پہ محسوس سے پسینے کے قطرے تھے جو اس نے دونوں ہاتھوں سے پونچھ ڈالے تھے۔

''رات کے اس پہر اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ آخر کیا ہوا ہے تمہیں؟ تمہاری حالت اتنی غیر کیوں ہو رہی ہے؟'' فائزہ بیگم اس

کی حالت دیکھ کر دہل چکی تھیں ان کا دل مٹھی میں آ گیا۔

"مام! میں نے کہا نا کچھ نہیں ہوا مجھے، بس سوچتے سوچتے نہ جانے دھیان کہاں چلا گیا تھا کہ میری کیفیت کنٹرول سے باہر ہونے لگی تھی۔" مدیحہ نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن فائزہ بیگم کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھیں۔

"آر یو شیور.....؟"

"یس مام! ایم شیور، اینڈ پلیز لیو می الون۔"

اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا اور فائزہ بیگم اسے دوبارہ اس کے مزاج میں دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گئی تھیں اسی لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"او کے! تم آرام کرو، گڈ نائٹ" وہ مدیحہ کا گال تھپک کر چلی گئیں اور مدیحہ عدیل عمر سے محبت کا ادراک لیے جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔ اور پھر نہ جانے کتنی دیر گزر گئی کہ وہ یکدم سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ نہیں ہو سکتا، یہ..... یہ میرے دل کا پاگل پن ہے، یہ صرف میرے دل کا خلل ہے، ورنہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ میں کچھ بھی نہیں جانتی، محض ایک دو بار دیکھ لینے سے بھی کبھی محبت ہوئی ہے بھلا..... محبت کے لیے تو ایک عمر چاہیے ہوتی ہے، یہ ایک بار دو دیکھنے کا یا پھر اک بار ملنے کا کھیل تو نہیں ہے نا، یہ تو پوری زندگی کی بازی ہے اور بازی اتنی آسانی سے تو نہیں لگ جاتی؟ بس مجھے اس کا ورکشاپ میں کام کرنا اچھا نہیں لگا، اس سے زیادہ تو اور کچھ نہیں..... وہ میرے پاسپے میری بلا سے، مجھے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ عدیل عمر صرف عدیل عمر ہے اور کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" اس نے بُری طرح عدیل کی ذات کی نفی کرتے ہوئے سر دائیں بائیں جھٹکا تھا اور عدیل کا بھوت سر سے اُتار پھینکا تھا، وہ جب سے عدیل کو ورکشاپ میں کام کرتے دیکھ کر آئی تھی تب سے مسلسل سوچوں میں اور اپنے آپ سے جنگ میں پھنسی ہوئی تھی لیکن اب اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک ڈالا تھا اور اپنے چہرے کی کیفیت مٹانے کی غرض سے واش روم میں گھس کر چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارنے لگی تا کہ اس کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ سکیں اور پھر پانچ منٹ بعد وہ واش روم سے نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ابھی وہ تولیے سے اپنا چہرہ خشک کر رہی تھی جب اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی سرخ رنگ کی مخملی ڈبیہ پہ جا پڑی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈبیہ اُٹھالی اور پھر آہستگی سے اس ڈبیہ کو کھول بھی لیا تھا۔ اس ڈبیہ میں جگمگاتی ڈائمنڈ رنگ مدیحہ کے لیے حیرتی کی طرف سے ایک سوالیہ نشان تھا، ہاں یا نہ.....؟

اور مدیحہ فی الحال اس ہاں یا نہ کا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے اس نے تختی سے لب بھینچتے ہوئے وہ ڈبیہ دوبارہ بند کی اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں پٹخ دی تھی اور بیڈ روم کی تمام لائٹس آف کر کے بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی۔

سناٹا ہر سو پھیل چکا تھا، رات گہری سے بھی گہری ہو رہی تھی، اندھیرا بھیگ رہا تھا اور خیال بھٹک رہے تھے، جا بجا، دل سے دماغ تک، یہاں سے وہاں تک، ورکشاپ سے اس کے بیڈ روم تک، اس کی ذات سے اس کی محبت تک، ہر طرف، ہر سو، بس خیال ہی خیال تھے، صرف اور صرف عدیل عمر کے..... گویا وہ دماغ سے بھٹک دینے سے بھی جھٹک نہیں گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو منصور حسین.....؟" وہ کافی دیر سے روشنیوں میں ڈوبی حویلی کی مضبوط اور بلند عمارت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جب عارف نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔

"شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔" وہ واقعی دلہنوں کی طرح سجی حویلی کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھ رہا تھا۔

"حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو کل دیکھنا، کب علیزے بی بی کا برتھ ڈے ہو گا اور امیر کبیر لوگ اپنی بیگمات کے ساتھ یہاں وہاں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔"

عارف حویلی کا کافی پرانا ملازم تھا اس لیے حویلی کی شان و شوکت سے بھی کافی اچھی طرح واقف تھا جبکہ منصور حسین نیا تھا اور اس کے لیے حویلی کی شان و شوکت بھی نئی تھی۔

"ہونہہ..... حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو پرسوں دیکھنا، جب تمہیں یہاں وہاں کوئی بھی ٹہلتا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔"

منصور حسین نے کافی تمسخرانہ انداز میں کہا تھا جس پہ عارف کو کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

"کیا مطلب ہے منصور حسین.....؟"

"مطلب ہے کہ جب کوئی کنفیوژن ہوتا ہے تو بڑی رونق ہوتی ہے، بڑی روشنیاں ہوتی ہیں، بڑی چہل پہل ہوتی ہے، لیکن جب کنفیوژن ختم ہو جاتا ہے تو ہر طرف سناٹے چھا جاتے ہیں، ویرانی اور بے رونقی سی ہو جاتی ہے، تب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، اپنی شان و شوکت سے بھی بندہ اُکتا جاتا ہے۔" منصور حسین نے اسے وضاحت سے بتایا اور عارف کو سر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کرنا ہی پڑا تھا۔

"ہوں..... ٹھیک کہہ رہے ہو یار! ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ارے تم لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ اتنا نہیں سوچتے کہ آ کر میرا ہاتھ ہی بٹا دو۔" مبارک خان گیٹ کی طرف جاتے جاتے ان دونوں کو دیکھ کر رُک گیا۔

"کیا تم ہمارا ہاتھ بٹاتے ہو؟ کبھی عارف کی جگہ چوکیداری کی تم نے؟" کبھی میری جگہ ڈرائیوری کی تم نے..... کبھی تمہیں ہماری تھکن کا احساس ہوا..... نہیں نا؟ تو پھر ہم تمہارا احساس کیسے کریں؟ تمہارا ہاتھ کیوں بٹائیں ہم۔"

منصور حسین نے مبارک خان کو کھری کھری سنائی تھی اور مبارک خان جھنجلا گیا۔

"یار! تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے، نہ جانے کس مٹی سے بنے ہو تم، روکھے اور سڑیل، سامنے والے کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔" مبارک خان بہت بدمزا ہوا۔

"اس زمانے میں کوئی کسی کا لحاظ نہیں کر رہا مبارک خان صاحب..... یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے، کسی سے شکوہ کرنا سب سے بڑی غلطی ہے یہاں اور آئندہ اسی غلطی سے پرہیز کرنا، کیونکہ یہاں سب نے اپنا اپنا کام خود کرنا ہے۔ اس لیے ہاتھ بٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی بڑے صاحب کے خاص ملازم تم ہو، ہم نہیں، جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں بھلا؟" منصور حسین تو بندے کا دماغ دھو کے رکھ دیتا تھا مبارک خان تو شکوہ کر کے پچھتایا۔

"منصور حسین..... منصور حسین۔" رجو دور سے ہی آواز دیتی ہوئی آ رہی تھی اس نے گردن موڑ کر اپنی طرف آتی رجو کو دیکھا۔

"فرمایئے کنیز! کیا پیغام لائی ہیں؟" منصور حسین کا انداز استہزائیہ تھا جس پہ مبارک خان نے اسے گھور کے دیکھا۔

"بڑے صاحب نے بلایا ہے تمہیں۔" رجو نے اپنی سانس ہموار کرتے ہوئے کہا۔

"اور کچھ....."

"ان سے جا کر پوچھ لو، وہ بتا دیں گے اور کچھ۔" رجو نے خفگی سے کہا۔

"ارے کیا ہو گیا ہے تم سب کو..... سب مجھ پہ ہی اکڑ رہے ہو؟ میرا قصور تو بتاؤ؟" منصور حسین نے حیرت سے کہا۔

"اپنے قصور بعد میں پوچھنا پہلے بڑے صاحب کی بات سن لو جا کر، وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" مبارک خان کا لہجہ بھی خفگی لیے ہوئے تھا منصور حسین کندھے اچکاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور رجو پیغام دے کر خود کوارٹرز کی سمت بڑھ گئی۔

"پلیز آذر بھائی! آپ اس طرح نہیں جا سکتے، پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کس لیے ناراض ہیں۔" علیزے کی آواز پر منصور حسین کے قدم ٹھہر گئے اس کی آواز بائیں طرف والے لان کے کونے سے آ رہی تھی گویا اس کے ساتھ آذر بھی تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں یار! تم کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟" یہ نرمی سی آواز آذر کی تھی۔

"تو پھر آپ مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے؟ جہاں میں ہوتی ہوں آپ چلے جاتے ہیں؟ ابھی بھی میں آئی ہوں اور آپ اندر جا رہے ہیں؟ یہ ناراضی نہیں تو اور کیا ہے؟" علیزے کی آواز بھیگ رہی تھی اور لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"یہ ناراضی نہیں ہے میری جان! ضروری نہیں کہ انسان اسی وقت کترائے جب ناراض ہو، کسی سے کترانے کے لیے کچھ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں، میرا تم سے کترانا تمہارے حق میں ہی بہتر ہو گا۔" منصور حسین دیکھ رہا تھا آذر، علیزے کو سمجھانے کی خاطر اس کے دونوں ہاتھ تھام کے نرمی سے تھپک رہا تھا کیونکہ چھوٹے سے دل کی علیزے، آذر کی ذرا سی بے رُخی اور لاتعلقی پہ چھم چھم غم بہا رہی تھی وہ کب سے آذر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی لیکن وہ اسے میسر ہی نہیں آ رہا تھا اور جیسے ہی وہ اسے لان میں ٹہلتا ہوا دکھائی دیا وہ فوراً اس کے پیچھے لان میں آ گئی تھی۔

"مجھے میرے حق میں ایسی بہتری نہیں چاہیے جو آپ کی لاتعلقی اور بے رُخی کی وجہ سے آئے، آپ جیسے پہلے تھے آپ کو میرے ساتھ ویسا ہی رہنا ہے، میں کبھی کسی کی بھی ناراضی اور لاتعلقی برداشت نہیں کر سکتی، آپ تو پھر آپ ہیں۔" علیزے آنسوؤں کے درمیان جھنجلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور آذر اس کی بات پہ اس کی اتنی محبت پہ اور اس کی معصومیت پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"او کے او کے نہیں ہوتا میں تم سے لاتعلق بس تم اپنے یہ آنسو ختم کرو اور پیاری سی مسکراہٹ سے مسکرا دو۔" آذر نے پیار سے کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا اور علیزے روتے روتے مسکرا دی تھی، وہ دونوں لان میں کھڑے تیز روشنیوں میں صاف دکھائی دے رہے تھے منصور حسین نے ان سے نظریں ہٹا کر سر جھٹکا اور قدم دوبارہ اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔

♥

"السلام علیکم!" اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کافی دھیمی آواز میں سلام کیا کیونکہ ڈرائنگ روم میں چھائی خاموشی اسے پہلے قدم پر ہی محسوس ہو گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" عبدالقیوم رضوی نے اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی کہیے....." انسپکٹر شہباز کا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے جس کے لیے انہوں نے اسے فون کر کے وقت سے پہلے ہی گھر بلا لیا تھا۔

"یہ لیٹر ہے تمہارے لیے۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ بیٹی کی سمت بڑھا دیا۔

"میرے لیے لیٹر..... کس نے بھیجا ہے؟" انسپکٹر شہباز کو اچنبھا ہوا۔

"خود دیکھ لو۔" وہ خود سے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتے تھے اس لیے کاغذ ہی اسے تھمایا تھا اور اگلے پانچ سیکنڈ میں مختصر سی تحریر پہ نظر دوڑاتے ہوئے انسپکٹر شہباز یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"واٹ..... مومنہ بی بی چلی گئی؟" انسپکٹر شہباز کو مومنہ بی بی کا لیٹر پڑھ کر شاک لگا تھا۔

"لیکن ابی جان! آپ نے اسے جانے کیوں دیا ہے؟" انسپکٹر شہباز کا پریشانی کے مارے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"وہ ہمیں بتا کر جاتی تو ہم اسے روکتے نا..... اس نے ہمیں بتایا ہی نہیں، بس چپ چاپ بغیر کچھ بتائے اٹھ کر چلی گئی۔" عبدالقیوم رضوی خود بھی بے حد پریشان اور متفکر نظر آ رہے تھے۔

"تو چوکیدار کہاں مر گیا تھا؟ وہ تو اسے روک سکتا تھا، یا پھر اسی وقت مجھے بتا سکتا تھا؟" انسپکٹر شہباز کا غصہ عود کے آیا تھا وہ بھی کاغذ ہاتھ میں پکڑے دندناتی ہوئی باہر نکل آئی چوکیدار کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اسے پتا تھا کہ اس کی شامت ضرور آئے گی۔

"بی بی جی! مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ چلی جائیں گی، میں گیٹ بند کر کے نہانے کے لیے چلا گیا تھا، انہوں نے خود ہی گیٹ کھولا اور خود ہی چلی گئیں۔" چوکیدار نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"تو کیا چار گھنٹے تم نہاتے ہی رہے ہو کہ تمہیں پتا نہیں چلا؟"

انسپکٹر شہباز غصے سے بھڑک رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔

"نہیں بی بی جی! مجھے تو بس دس منٹ ہی لگے تھے اور دس منٹ بعد میں واپس آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔" چوکیدار اسے صفائی دے رہا تھا۔

"دس منٹ میں وہ کہاں تک جا سکتی تھی بھلا؟ تم نے اس کا پیچھا بھی نہیں کیا؟" انسپکٹر شہباز مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور چوکیدار پہ غرا رہی تھی وہ بیچارا بُرا پھنسا تھا۔

"ہمیں بتانے تک دس منٹ نہیں بلکہ بیس پچیس منٹ گزر چکے تھے اور بیس پچیس منٹ میں تم جانتی ہو کہ آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، اس لیے اس کا پیچھا کرنا فضول تھا، ہم نے ہی اسے اس کے پیچھے جانے سے روکا تھا۔" عبدالقیوم رضوی چوکیدار کے لیے ڈھال بن گئے تھے جبکہ انسپکٹر شہباز اپنے والد صاحب کی لاچگ پہ اپنا سر پیٹ کے رہ گئی تھی۔

"ابی جان! یہ کیا کر دیا آپ نے؟ وہ بیس پچیس منٹ میں بھی کہیں نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، نہ روپیہ پیسہ نہ جہاں بھی جانا تھا، پیدل جانا تھا اور پیدل چلنے والا اتنی دیر میں بھلا کہاں تک جا سکتا ہے؟" انسپکٹر شہباز جھنجلا رہی تھی اور عبدالقیوم رضوی بھی اپنی اس غلطی پہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

"اب..... اب میں اسے کہاں تلاش کروں؟ اور..... اور دل آور شاہ کو کیا جواب دوں گی کہ ایک پولیس آفیسر ہونے کے باوجود مجھ سے ایک لڑکی تک نہیں سنبھالی گئی؟" انسپکٹر شہباز بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پاؤں پٹختی ہوئی گاڑی کی سمت بڑھی اور ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی اور عبدالقیوم رضوی دیکھتے رہ گئے تھے۔

رات کے نو بجے کا ٹائم تھا، اندھیرے کا راج گہرا ہو چکا تھا اور اس اندھیرے کا غلام پورا شہر مصنوعی روشنیوں کے زیر اثر جگمگا رہا تھا، بے شک روشنیاں بہت تھیں لیکن رات بھی آخر رات تھی اور اس رات میں کسی کو ڈھونڈنا آسان کب تھا بھلا؟ لیکن انسپکٹر شہباز پھر بھی یہ مشکل کام کرنے کے درپے تھی اور اس کام میں وہ چاہ کر بھی پولیس کی مدد نہیں لے سکتی تھی کیونکہ ساتھ ساتھ ملک حق نواز کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا اس لیے اسے یہ کام خاموش رہ کر کرنا تھا۔

♥

رات کے سوا نو بجے کا وقت تھا جب اس نے ایک روڈ سے دوسرے روڈ پہ یوٹرن لیا تھا اور ساتھ ہی اسپیڈ بڑھا دی تھی، لیکن اگلے ہی پل اسے بریک پہ پاؤں رکھنا پڑ گیا اور گاڑی کے بریک زور سے چرچرائے تھے کیونکہ کوئی اس کی گاڑی سے ٹکرا کر یکدم دور جا گرا تھا جس پہ نبیل حیات کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"او مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے؟" نبیل حیات گھبرائے ہوئے انداز میں بہت عجلت کے ساتھ گاڑی سے نکل آیا تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن تھیں اس لیے اسے دور سے ہی پتا چل گیا تھا کہ گاڑی سے ٹکرانے والی لڑکی ہے، اس نے کافی بڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو اس ایکسیڈنٹ سے گرنے کی وجہ سے اس کے اوپر سے سرک گئی تھی۔

"آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" نبیل نے ذرا جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے سیدھا کیا لیکن وہاں اتنی ہمت اور اتنی سکت کہاں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دیا جاتا، وہ نیم بیہوشی کی حالت میں تھی کیونکہ اس کے سر پہ شدید چوٹ آئی تھی۔

"پلیز پلیز آنکھیں کھولیں۔" نبیل کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی سچویشن پہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"اوہ صاحب! بیچاری کے چوٹ لگی ہے، مر جائے گی، فوراً ہسپتال لے جاؤ، ورنہ تختے پہ چڑھا دیئے جاؤ گے۔" اس کے قریب سے دو آدمی گزرتے ہوئے ٹھہر گئے تھے انہوں نے نبیل کو اس حادثے کی سنگینی سے آگاہ کیا ورنہ کوئی اور لوگ ہوتے تو اتنا شور مچاتے کہ نبیل کی جان کو آ جاتے، یہ دونوں آدمی اچھے تھے اس لیے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

"تھینک یو! میں ابھی انہیں ہسپتال لے جاتا ہوں۔" نبیل نے اس پہ جھکتے ہوئے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے گاڑی کی سمت بڑھا گاڑی کا ڈور بند تھا اس لیے ان دو آدمیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کے ڈور کھولا اور اس لڑکی کو گاڑی میں ڈالنے کے لیے مدد دی تھی۔

"اور ہاں صاحب! آپ شکل سے شریف اور اس شہر سے انجان لگتے ہیں۔" اس لیے آپ کے لیے ایک اور مشورہ ہے۔" اس آدمی نے ڈور بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی کہیے....." نبیل فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے ذرا رائٹنگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔"

"اس لڑکی کی حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا، اس لیے ہسپتال میں ڈاکٹرز کی پوچھ پڑتال اور جھنجھٹ میں پڑنے سے بہتر ہے کہ آپ انہیں اپنے کسی پرسنل ڈاکٹر میرا مطلب ہے کہ فیملی ڈاکٹر سے ٹریٹ منٹ کروائیں، ورنہ ہسپتال والے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔" اس آدمی نے ایک اور مشورہ دیا جس پر نبیل واقعی اس آدمی کا مشکور ہوا اور ہاتھ گاڑی سے نکالتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

"تھینک یو سو مچ بھائی صاحب بہت مدد کی آپ نے میری۔"

"اٹس او کے سر! انسانیت کے ناتے یہ سب کچھ بھی نہیں ہے؟" اس آدمی نے انکساری سے کہا اور پھر قدم پیچھے ہٹا لیے۔

"اللہ حافظ۔" نبیل نے اللہ حافظ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن اب اس آدمی کے مشورے پہ اس کا ہسپتال جانے کا ارادہ بدل گیا تھا، اس کا رخ اب گھر کی طرف تھا اس نے اسپیڈ مزید بڑھاتے ہوئے ذرا کی ذرا گردن ترچھی کر کے پچھلی سیٹ پہ پڑی اس لڑکی کو دیکھا تھا وہ ہلکی ہلکی آواز میں کراہ رہی تھی شاید اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی اس لیے یقیناً اس کے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بیہوشی کے باعث وہ نہ تو کچھ دیکھ پا رہی تھی اور نہ ہی حرکت کر رہی تھی بس اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی جس

پہ نبیل کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی وہ کنفیوژن کا شکار ہونے لگا کہ اسے ہسپتال لے کر جائے یا پھر اپنے گھر؟

لیکن پھر اس آدمی کے مشورے کو ترجیح دیتے ہوئے اس نے گھر جانے کا ہی فیصلہ کیا اور اگلے پندرہ منٹ بعد وہ اپنے گھر کے پورچ میں گاڑی پارک کر چکا تھا اور گاڑی سے اُتر کر تیزی سے پچھلی سیٹ کی طرف آیا اور دُور کھول کر اس لڑکی کو گاڑی سے نکال کر اندر کی سمت قدم بڑھا دیئے تھے۔ وہ راہداری سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا جب سامنے سے سیڑھیاں اُترتی مدیحہ ٹھٹک کر رُک گئی تھی۔

''بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟ کون ہے یہ لڑکی.....'' مدیحہ پہلے رُکی تھی پھر تیزی سے قریب آ گئی لیکن نبیل کوئی بھی جواب دیئے بغیر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اس لڑکی کو صوفے پہ ڈال دیا تھا۔

''بھائی! کون ہے یہ؟'' مدیحہ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

''یار! مجھے خود نہیں پتا کہ یہ کون ہے؟ بس میں گھر آ رہا تھا اور لڑکی اچانک راستے میں میری گاڑی سے ٹکرا گئی، ابھی تو شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی ہے، ورنہ اس وقت کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔'' نبیل اپنے موبائل سے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے مدیحہ کو بھی بتا رہا تھا۔

''تو آپ اسے ہسپتال لے کر کیوں نہیں گئے؟''

''ہسپتال لے کر جانا خود مصیبت میں ٹانگ اڑانے کے مترادف ہے، اس لیے ڈاکٹر کو گھر بلا رہا ہوں۔'' نبیل اس وقت اپنی عقل سے نہیں کسی اور کی عقل سے کام لے رہا تھا مدیحہ کو بڑی اُلجھن ہوئی تھی کہ وہ ایک چلتا پھرتا پولیس کیس اُٹھا کر گھر لے آیا ہے کہیں کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے؟

''بھائی! مصیبت کیسی بھلا..... اس لڑکی کی جان بچ گئی ہے، دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک ہے، پھر ہسپتال سے کترانے کی وجہ؟'' مدیحہ کو جو بات اچھی نہیں لگی تھی وہ اس کی وضاحت چاہ رہی تھی۔

''وجہ یہ ہے کہ اس وقت رات کا وقت ہے اور یہ ایک لڑکی کا معاملہ ہے وہ لڑکی بیہوش تھی اور میں اسے بیہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو جب تک یہ لڑکی ہوش میں نہ آ جاتی ہاسپٹل والے مجھے وہاں سے ملنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتے تھے، مجھے اس کے ساتھ وہاں ہی بندھ کے رہنا پڑتا اور دوسری بات کہ پتا نہیں جب یہ ہوش میں آتی تو اس ایکسیڈنٹ کا سارا الزام مجھ پہ رکھ دیتی اور پولیس والے میرے سر ہو جاتے، اور تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ لڑکی بہت خستہ حال اور تھکی تھکی لگ رہی تھی، اپنا پورا جسم اور چہرا ڈھانپ رکھا تھا اس نے اور یہ خالی ہاتھ تھی اس کے پاس اپنے آپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے کسی مصیبت میں مبتلا تھی، ایسے میں اسے ڈاکٹر یا پھر پولیس والوں کے حوالے کر دینا بھی ٹھیک نہیں تھا لہٰذا سب کچھ سوچنے کے بعد میں اسے گھر لے آیا ہوں، دیکھنے سے ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ لڑکی بے ضرر ہے، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی ڈونٹ وری۔'' نبیل نے مدیحہ کو کافی اچھی طرح دلیل اور وضاحت سے سمجھایا تھا اور شکر تھا کہ وہ سمجھ گئی تھی اور سمجھنے کے ساتھ ہی اسے اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

''نبیل بیٹا! تم اتنے لیٹ کیوں.....'' فائزہ بیگم کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں لیکن صوفے پہ پڑی بیہوش حالت لڑکی کو دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے جیسے تھوڑی دیر پہلے مدیحہ کے ہوئے تھے۔

''مدیحہ! تم مام کو ساری بات بتاؤ، میں تب تک ڈاکٹر ہاشمی کو ریسیو کرتا ہوں۔'' نبیل مدیحہ کا کندھا تھپک کر باہر نکل گیا اور دس منٹ بعد ڈاکٹر ہاشمی ان کے گیٹ پہ موجود تھے، نبیل انہیں اپنے ساتھ لیے اندر آ گیا ڈاکٹر ہاشمی نے اس لڑکی کا تفصیلی چیک اپ کیا اور درد کے انجکشن اور کچھ ٹیبلٹس دینے کے بعد چلے گئے تھے، نبیل نے ان کے سامنے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ لڑکی ان کی کزن ہے اور اچانک سیڑھیوں سے گر گئی ہے اسی لیے ڈاکٹر ہاشمی کی تسلی ہو گئی تھی اور ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ نبیل حیات، دل آور شاہ کا دوست ہے اور اس حوالے سے قابل اعتبار بھی ہے، نبیل ان کو رُخصت کرنے کے بعد واپس آیا اور صوفے پہ پڑے گیا۔

''اُف! اتنی تھکن پورا دن اتنے کام نبٹاتے ہوئے نہیں ہوئی جتنی اس ایک گھنٹے میں ہو گئی ہے۔'' نبیل نے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے۔

''چائے لیں گے؟'' نہ جانے کیوں اور کیسے مدیحہ کو اس کی تھکن کا احساس ہوا تھا اور اس نے خود ہی اس سے چائے کا پوچھ

لیا تھا۔

''ضرور لوں گا، لیکن اگر تم خود بنا کر لاؤ تو۔'' نبیل نے آنکھیں کھولتے ہوئے ڈائریکٹ مدیحہ کی سمت دیکھا۔

''جی..... ابھی بنا کر لاتی ہوں۔'' مدیحہ اٹھ کر چلی گئی۔

''دیکھو بیٹا! اس لڑکی کا اس طرح ڈرائنگ روم میں پڑے رہنا مناسب نہیں ہے، تم اسے کسی روم میں شفٹ کر دو۔'' فائزہ بیگم کو اس لڑکی کا صوفے پہ پڑے رہنا کافی غیر مناسب اور معیوب لگا تھا اسی لیے کہہ بھی دیا۔

''گیسٹ روم میں شفٹ کر دوں؟''

''گیسٹ روم میں کیسے شفٹ کر دو گے، گیسٹ روم کے دروازے کا لاک خراب ہے، چار پانچ روز ہو گئے ہیں میں نے چیک کیا تھا لاک ہی نہیں کھل رہا۔'' فائزہ بیگم نے اسے پرابلم بتائی۔

''تو پھر کہاں شفٹ کرنا ہے اسے.....؟'' نبیل ماں سے پوچھ رہا تھا۔

''میرے بیڈ روم کے ساتھ والا بیڈ روم خالی ہے، اسے وہاں شفٹ کر دیں، میں رات کو اس کے پاس ہی رہ لوں گی۔'' مدیحہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ نبیل کو تھما دیا۔

''لیکن بیٹا! تم کیسے اس کے پاس رہ سکتی ہو؟ یہ پتا نہیں کون؟''

''اوہ کم آن ماما! ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن نہیں لینی چاہیے، کچھ نہیں ہوتا، یہ لڑکی خود زخمی ہے، بیمار حالت میں ہے اور ہمارے ہی رحم و کرم پہ ہے، یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ویسے بھی کسی نہ کسی نے تو اس کے پاس رہنا ہی ہے نا..... تو پھر یہیں بہتر ہے کہ میں ہی رہ لوں، مجھے تو ویسے بھی رات گئے تک نیند نہیں آتی، میں آسانی سے جاگتی رہوں گی، اب یہ کام نبیل بھائی تو نہیں کر سکتے؟ وہ خود تھکے ہوئے آئے ہیں اب آرام کریں گے اور آپ بھی ماشاء اللہ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ہوتی ہیں اس لیے آپ کے رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا گھوم پھر کے بات مجھ پر ہی آ جاتی ہے، سو میں حاضر ہوں۔'' مدیحہ کے جواب پہ وہ دونوں ماں بیٹا دیکھتے رہ گئے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے؟ کیا وہ اپنے علاوہ بھی دوسروں میں انٹرسٹ لے سکتی ہے؟

''او کے! میں اس لڑکی کو وہاں ہی شفٹ کر دیتا ہوں، تم وہ بیڈ روم کھلوا دو.....'' نبیل نے اس کی بات سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا اور اسے اجازت دیتے ہوئے چائے کے سپ لینے لگا۔

''ہوں..... چائے بہت اسٹرانگ ہے۔'' نبیل کو چائے کا کڑک ذائقہ پہلے سپ پہ ہی محسوس ہو گیا۔

''اسٹرانگ چائے اور اسٹرانگ چاہ۔ بندے کے دل و دماغ کے سارے کس بل نکال کے رکھ دیتی ہے، بندہ فریش ہو کے رہ جاتا ہے۔'' مدیحہ مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی۔

''یہ تو دل آورے والی سوچ ہے؟'' نبیل ہلکے سے مسکرایا۔

''بالکل..... سوچ انہی کی ہے، بس بیان میں کر رہی ہوں۔'' وہ بھی جواباً مسکرا کر بولی۔

''کیوں.....؟'' وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ وہ اسٹرانگ چائے اس کے اعصاب کو واقعی تقویت پہنچا رہی تھی۔

''کیونکہ ان کی سوچ میری سوچ سے ملتی ہے۔''

''ہوں..... یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔'' وہ کپ خالی کر کے رکھے ہوئے کھڑا ہو گیا اور مدیحہ باہر نکل گئی اس نے ملازمہ کو بلا کر کمرا کھلوایا تھا اور بستر وغیرہ ٹھیک کروا کے نیچے آ گئی پھر نبیل نے اس لڑکی کو اوپر مدیحہ کے ساتھ والے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا اور خود اپنے بیڈ روم میں چلا گیا، اب اس لڑکی کی ذمہ داری مدیحہ حیات پہ تھی۔ اب اس نے رات بھر جاگنا تھا اور اس لڑکی کی دیکھ بھال کرنی تھی۔

♥

''دانیال! کہاں جا رہے ہو تم.....؟'' آذر اندرونی مین روڈ کی سمت بڑھ رہا تھا لیکن انیکسی کی طرف سے نکل کر گاڑیوں کی سمت بڑھتے دانیال کو دیکھ کر قدم رک گئے۔

''مارکیٹ۔'' دانیال نے گاڑی کی چابی لہراتے ہوئے اسے اشارہ دیا۔

"کیوں..... اس وقت کیوں جا رہے ہو؟" آذر کو اچنبھا ہوا۔

"ارے یار! اس وقت کو کیا ہوا ہے؟ ابھی تو دس بجے ہیں۔" دانیال نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں..... لیکن تم جا کیوں رہے ہو؟" آذر نے بھی اپنی گھڑی سے ٹائم دیکھ لیا تھا اسی لیے حیرت قدرے کم ہو گئی تھی، آج کل دراصل سرما کی لمبی راتیں شروع ہو چکی تھیں اس لیے رات کے دس گیارہ بجے بھی آدھی رات کا سا گمان ہوتا تھا۔

"آ جاؤ، بتاتا ہوں پھر....." دانیال گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے بولا۔

"میں کیوں آ جاؤں؟ میرا کیا کام بھلا.....؟" آذر نے دور سے ہی انکار کر دیا۔

"ارے آ جاؤ یار! اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر بھی تو بور ہی ہونا ہے تم نے.....؟" دانیال نے ذرا ان خفگی سے کہا جس پہ نہ چاہتے ہوئے بھی آذر کو آنا ہی پڑا، دانیال نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور آذر آ کر اس کے برابر فرنٹ سیٹ پہ براجمان ہو گیا اور جیسے ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں چوکیدار نے فوراً گیٹ کھول دیا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ؟ کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟" گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی آذر نے سوال داغ دیا۔

"مارکیٹ جا رہا ہوں یار! علیزے کے لیے برتھ ڈے گفٹ لینے کے لیے۔" دانیال نے کافی سکون سے جواب دیا تھا جبکہ آذر اس کے جواب پہ چپ ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟" دانیال نے قدرے توقف سے اسے دوبارہ متوجہ کیا تھا۔

"نہیں..... کچھ نہیں۔" اس نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیا تم نے گفٹ نہیں لیا علیزے کے لیے؟" دانیال نہ جانے کیوں اسے کھوج رہا تھا۔

"میں اس کے لیے گفٹ لوں گا تو افسانہ بنے گا۔" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"کوئی افسانوی بات ہو تو افسانہ بنتا ہے نا؟" دانیال نے ہلکے سے چوٹ کی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" آذر نے یکدم دانیال کی سمت دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ ہمارے گفٹس کا افسانہ کیوں نہیں بنتا؟ صرف تمہارا ہی کیوں؟" دانیال کا سوال بھی بجا تھا۔

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ صرف میرا ہی افسانہ کیوں بنتا ہے؟" آذر جھنجلا رہا تھا۔

"کیونکہ تمہاری ساری حرکتیں افسانوی سی لگتی ہیں، تم اتنے ہینڈسم، ڈیشنگ اور ریزرو سے ینگ مین ہو، ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتے ہو، سب کزنز سے بڑے ہو، اس لیے کافی ذمہ دار اور سمجھدار بھی ہو، لیکن اس کے باوجود علیزے کی کیئر ایسے کرتے ہو جیسے تمہیں اور کوئی کام ہی نہ ہو، ایسے میں دیکھنے اور سننے والوں کو تھوڑا دال میں کالا تو لگے گا نا؟ آخر دیکھنے اور سننے والے بھی دماغ، عقل اور سوچ رکھتے ہیں؟ جس سے وہ کوئی بھی افسانہ بنا سکتے ہیں، اس لیے ان کی سوچ اور افسانے کا قصور نہیں ہے یار! بلکہ تمہارا اپنا قصور ہے۔" دانیال آج پھر اسٹارٹ ہو چکا تھا۔

"میرا قصور ہے؟" آذر نے حیرت اور اچنبھے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"قصور ہے نا، سارا قصور ہی تمہارا ہے، وہ بات، وہ راز، وہ جذبات جو تم نہ جانے کب سے دل میں دبائے پھر رہے ہو، وہ تمہیں بہت پہلے ظاہر کر دینے چاہیے تھے تاکہ دوسروں کو بھی تمہارے جذبات کا پتا چل جاتا اور کوئی تمہارے بارے میں سوچنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔" دانیال کا اشارہ کومل کی طرف تھا۔

"یار! ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم کہہ رہے ہو۔" آذر اب بھی انکاری تھا۔

"تو پھر قسم دو مجھے کہ ایسا کچھ نہیں ہے، تمہارے دل میں علیزے کا خیال تک نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھ میں اگر کومل کا ہاتھ تھما دیا جائے تو تم تھام لو گے؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہو گی؟" دانیال نے آذر کو بُری طرح گھیرے میں لے لیا تھا وہ نہ ہاں کر سکتا تھا، نہ نا کر سکتا تھا، وہ ایک آزمائش، ایک امتحان میں مبتلا ہو چکا تھا، جواب دینا بھی تو کیا دینا؟

"بتاؤ نا تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہو گی۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہیں اور تمہارے دل کو۔"

دانیال اسے آزما رہا تھا اور آذر گہری سانس کھینچتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر رہ گیا۔

"دانیال! مجھے اور میرے دل کو فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن ڈیڈ کو ضرور فرق پڑتا ہے، کیونکہ ڈیڈ نے ہمیشہ علیزے کے ساتھ

کو دیکھا ہے اور اسی چیز کا وہ کئی بار باتوں باتوں میں اظہار بھی کر چکے ہیں۔'' آذر نے دانیال کو ڈیڈ کے ارادے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں، لیکن یار اس وقت میں ڈیڈ کو فرق پڑنے کی نہیں، تمہیں فرق پڑنے کی بات کر رہا ہوں۔ تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر علیزے کو چاہتے ہو تو اس چاہت کو دل میں مت دباؤ، بلکہ اظہار کرو، صاف اور واضح اظہار۔'' دانیال اسے کسی ایک اور حتمی فیصلہ پہ اُکسا رہا تھا۔

''لیکن یار! کیسے اظہار کروں؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے وہ ابھی اس چیز کو نہیں سمجھتی۔ میں کیوں اس کی معصومیت کو داغدار کروں؟'' آذر خفگی سے کہہ رہا تھا۔

''کیا کہا؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے؟ واہ کیا کہنے ہیں تمہارے۔ ارے محترم! ذرا عقل پہ زور دو تو تمہیں احساس ہو کہ علیزے آئندہ آج رات بارہ بجے کے بعد پورے بیس سال کی ہو جائے گی۔ اور بیس سال کی لڑکی ہو یا لڑکا ایسے جذبات سے بے خبر نہیں رہتا، اٹھارہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہو جاتی ہے اور تم بیس سال کی لڑکی کو محبت کے قابل نہیں سمجھ رہے؟ یہ تو عمر ہوتی ہے محبت کا بیج بونے کے لیے اور بیس سال کی عمر تک یہ بیج پوری طرح سے پروان چڑھ جاتا ہے، اب تم خود سوچ لو کہ تم نے کیا کرنا ہے علیزے کو انجان رکھنا ہے؟ یا پھر خود کو کول سے انجان رکھنا ہے؟'' دانیال کی باتیں خاصی گہری تھیں، آذر سوچنے پہ مجبور ہو گیا۔

''تو پھر کیا کروں؟''

''اظہار کرو بھائی! اظہار کرو۔''

''مگر کیسے؟'' آذر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''ارے یار! کل اس کا برتھ ڈے ہے، موقع اچھا ہے، تم کوئی ایسا گفٹ لو اس کے لیے کہ وہ سب کچھ خود بخود ہی سمجھ جائے۔'' دانیال نے گاڑی شاپنگ مال کے سامنے پارک کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا گفٹ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟''

''اندر آجاؤ بتاتا ہوں تمہیں۔'' دانیال گاڑی سے اُتر گیا اور اس کے پیچھے آذر بھی گاڑی سے اُتر گیا تھا۔

♥

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں میرے ہے
لیکن وہ میرے خواب، میرے خواب، میرے خواب

''آپ کی بربات، بجائی بی جان! لیکن آپ اگر سوچیں تو بیٹیاں بھی تو انسان ہی ہوتی ہیں نا؟ ان کے سینے میں بھی بدقسمتی سے دل دھڑکتا ہے، اس دل میں ہزاروں حسرتیں ہوتی ہیں، ہزاروں خواہشیں، ہزاروں خواب ہوتے ہیں اور ان ہزاروں خوابوں اور خواہشوں کو ایک دم سے گلا گھونٹ کر مار دینا اتنا آسان نہیں ہوتا، ان کو مارتے مارتے انسان خود مر جاتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں بھی مر جاؤں گی، ایک دن ایسا ہو کے ہی رہے گا۔'' آج پھر زری کے لیے بی بی جان کا فون آیا ہوا تھا، وہ اس سے واپسی کا پوچھ رہی تھیں اس کے دل کی دھڑکنیں پھر سے لرزنے لگی تھیں، اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا خوف پھر سے اُمڈ آیا تھا۔

''خدا کا خوف کرو لڑکی! کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' بی بی جان دہل گئیں۔

''بی بی جان! اگر یہی بات میں آپ سے کہوں تو آپ لوگ خدا کا خوف کیوں نہیں کرتے۔ بیٹیوں کی زندگیوں سے بھی کھیلتے ہوئے دلوں سے بھی؟''

نہ جانے آج کیا بات تھی کہ زری سے ضبط نہیں ہو رہا تھا وہ رُخساروں پہ آنسوؤں کی طرح بکھر رہی تھی، اس کے حوصلے پگھل رہے تھے۔ آج کل اس کا دل بے وجہ ہی بے چین اور مضطرب رہنے لگا تھا۔ اس کے اندر اُبال اُٹھتے تھے، وہ اندر ہی اندر ہولنے لگتی تھی، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پاکستان جانے کے بجائے کہیں صحراؤں کی طرف نکل جائے، جہاں صرف وہ ہوتی، اس کا دل ہوتا، اس کی ذات ہوتی اور اس کا عشق ہوتا۔ کوئی دوسرا بھی اس کی ذات اور اس کے عشق میں مداخلت نہ کر پاتا۔

''ہیلو..... ہیلو..... ہیلو زری بیٹا؟'' ریسیور میں سے بی بی جان کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بے آواز روتی ہوئی زری انہیں جواب نہیں دے پائی تھی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا اور لاؤنج کی دہلیز میں کھڑا عبداللہ اندر آ گیا۔

''زری.....'' عبداللہ کی سنجیدہ پر تلی اور بھاری آواز زری کے بہت قریب سے اُبھری تھی، زری یکدم گڑبڑا گئی۔

''عبداللہ بھائی آ..... آپ؟'' وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔

''بیٹھو.....'' عبداللہ نے اسے اس کی سابقہ جگہ پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جج..... جی؟'' زری کی رنگت متغیر ہونے لگی تھی اس نے خود کو بمشکل کرسی پہ بیٹھنے کے قابل کیا تھا، ورنہ ٹانگوں کی جان تو پہلے مرحلے پہ ہی ٹوٹ چکی تھی۔

''کس کا فون تھا؟'' وہ جانتا تھا مگر اس کے منہ سے سننے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

''بی بی جان کا..... ذ زری کی آواز بے حسی ہو چکی تھی۔

''کیا کہہ رہی تھیں؟'' عبداللہ کے انداز پہ زری کی جان نکل رہی تھی کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے؟ نہ جانے اس نے کیا بات سنی ہے کہ وہ اس حد تک نیا تلا اور سرد سپاٹ نظر آ رہا ہے۔

''واپسی کا پوچھ رہی تھیں۔'' زری نے سر جھکا رکھا تھا۔

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''یہی کہ ہم واپس آ رہے ہیں۔''

''بس یہی کہا تم نے؟''

''جی.....'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر روئی کس بات پہ ہو؟'' عبداللہ اپنے مطلب کے سوال پہ آ گیا۔

''نن..... نہیں کسی بات پہ نہیں روئی۔'' اس نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔

''دیکھو زری! دل کی بات دل میں رکھنے والے لوگ خسارے میں رہ جاتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی خسارے میں رہو، اس لیے بہتر ہے کہ تم بولو اور بتاؤ مجھے کہ تم کیوں روتی ہو؟'' عبداللہ کو زری کی باتوں سے لگا تھا کہ اس کے دل میں کوئی ہے اور اس ''کوئی'' کو جاننے کے لیے وہ ساری نام نہاد عزت اور غیرت بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے پوچھنے کے لیے بیٹھ گیا۔

''اپنے نام کے ساتھ ملک حق نواز کا نام سن کر روئی ہوں اور اس لیے روئی ہوں کہ میری ماں کو بھی میرا احساس نہیں ہے، وہ بھی مجھے ملک حق نواز کے ساتھ رخصت کرنے پہ خوش ہیں۔'' زری کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

''بس یہی بات تھی یار کوئی اور.....؟'' عبداللہ اس کے جھکے ہوئے سر پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا زری نے گھبرا کر عبداللہ کی سمت دیکھا اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں زری! بس یہی بات تھی یا کوئی اور.....؟'' عبداللہ نے پھر اپنی بات پہ زور دیا۔

''جی! بس یہی بات تھی۔'' زری نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا۔

''ہوں ٹھیک ہے، یہ تو طے ہے کہ ملک حق نواز کا نام تمہارے نام کے ساتھ نہیں آئے گا، اس لیے اس بات پہ رونا فضول ہے۔ لیکن اگر کوئی اور بات ہے تو پھر یہ تمہارا مسئلہ ہے، بعد میں مجھے کوئی الزام مت دینا کہ عبداللہ بھائی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔'' عبداللہ نے زری کے کسی اور مسئلے سے واضح لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں عبداللہ بھائی! آپ کو الزام دینے کا میں کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی، آپ نے تو ہمیشہ میرا ہی ساتھ دیا ہے، اتنا تو کوئی ماں باپ بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، جتنا آپ نے میرا دیا ہے۔'' زری کا لہجہ بے حد دھیما ہو رہا تھا۔

''میں نے تم پہ کوئی احسان نہیں کیا، یہ سب تمہارا حق ہے، تم میرے لیے بہن بھی ہو اور بیٹی بھی، میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہاری خوشی اور بہتری کی خاطر ہی میں اپنے خاندان والوں سے ٹکر لے رہا ہوں، ورنہ اور تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے میرے اور ان کے درمیان۔ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تمہیں کوئی مسئلہ رہے تو یہ اچھی بات نہیں ہے، تمہیں اپنے اندر کی بات صاف صاف ہونی چاہیے، اگر نہیں بتاؤ گی تو ذمہ دار تم خود ہو گی۔'' عبداللہ اسے کرید رہا تھا۔

''نن..... نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' زری نے اپنے بے اختیار اور بے قابو دل کو دباتے ہوئے بمشکل اس حقیقت سے انکار کیا تھا، وقت سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کی عزت، غیرت اور انا کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ

اس وقت اس سے کچھ پوچھ رہا ہے تو اپنی رگوں میں دوڑتی غیرت کو اپنے پاؤں تلے کچل کر پوچھ رہا ہے، ورنہ کون ایسا بھائی تھا جو اپنی بہن سے اس کی پسند، اس کی محبت اور اس کے دل کی بات پوچھے اور اگر پوچھ رہا تھا تو یہ اس کا اچھا پن تھا، نیکی تھی، بڑائی تھی اس کی، ورنہ وہ نہ بھی پوچھتا تو وہ کیا کر سکتی تھی بھلا؟

''ٹھیک ہے پھر ختم کرو یہ رونا دھونا اور اپنی پیکنگ اور تیاری مکمل کرو، جو ہوگا چار دن بعد دیکھا جائے گا۔'' عبداللہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور زری کا سر تھپک کر باہر نکل گیا، زری جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔

آج سے چار دن بعد اٹھارہ نومبر کو ان کی فلائٹ تھی، سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، سارے بندوبست بھی ہو چکے تھے پھر بھی..... پھر بھی ایک وہ تھی کہ اس کا دل بس ڈوبتا ہی جا رہا تھا، اتنی تسلیاں، اتنے دلاسے، اتنے پختہ یقین کے بعد بھی وہ مایوس کی مایوس ہی تھی نہ جانے ایسا کون سا حوصلہ شکن احساس تھا جو اسے آس کی ڈوری نہیں تھامنے دے رہا تھا۔

♥

''مریم.....''

''جی امی۔'' عابدہ خاتون کی آواز پہ مریم بری طرح چونک کر متوجہ ہوئی۔

''دھیان کہاں ہے تمہارا؟'' عابدہ خاتون نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا جس پہ مریم یکدم سٹپٹا گئی اور اپنے اُڑے اور بکھرے ہوئے اعصاب کو یکجا کرنے کی فوری اور ناکام کوشش کی تھی۔

''کک..... کیا مطلب ہے آپ کا؟ میرا دھیان کہاں ہوتا ہے بھلا؟''

مریم، ماں کی نظروں کی کھوج سے بوکھلا گئی تھی وہ انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی، اگر جو دت آفندی کے متعلق انہیں پتہ بھی چل جاتی تو وہ ساری مجبوریاں اور گھر کے حالات بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے فوراً گھر بٹھا لیتیں، وہ ہر مشکل وقت میں صبر شکر کرتے ہوئے گزار کر سکتی تھیں، لیکن ان کی عزت پہ کوئی حرف آئے یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

''تم مجھے دو روز سے کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟ اور میں اسی انتظار میں ہوں کہ تم مجھے اپنی پریشانی بتاؤ گی، لیکن نہیں تم پریشانی بتانے کے بجائے اُلٹا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔'' عابدہ خاتون نے بیٹی کا صحیح جائزہ لیا تھا اور مریم ان کے اتنے درست اندازے پہ مزید محتاط ہو گئی تھی۔

''نہیں امی! پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے، بس میں یہ سوچ رہی تھی کہ فی الحال گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مجھے جاب کے لیے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟ ایسے میں مسز رزاق سے اپنی تنخواہ کے لیے کہوں بھی تو کیسے؟ وہ کیا سوچیں گی آخر؟ اور ادھر پورا مہینہ پڑا ہے ابھی..... اتنے دن گزارا کیسے ہوگا بھلا؟'' مریم نے جیسے تیسے ہی سہی کوئی بہانا بنا ہی لیا تھا اور اس کے جواب پہ عابدہ خاتون کی کھوجتی ہوئی جائزہ لیتی ہوئی نظریں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ ''اللہ مالک ہے بیٹا سب اس کی ذات پہ چھوڑ دو، گزارہ کیسے ہوگا یہ اس کی ذات بہتر جانتی ہے وہ مالک ہے ہمارا، ہم اس کے بندے ہیں، اسے ہماری فکر ہم سے بھی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ہمیں پریشان ہونے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے، جو بھی ہوگا اس کی مرضی اور اس کی رضا سے ہوگا، تم بس اس کا رحم اور اس کی رضا مانگو ان شاء اللہ ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' عابدہ خاتون نے مریم کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تھپکا اور اسے سمجھایا تھا، جس پہ حقیقتاً تھوڑی دیر کے لیے مریم کا دل سنبھل گیا تھا ورنہ تو اسے جودت آفندی کی طرف سے دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔

''بس امی! آپ ہمارے لیے دُعا کرتی رہا کریں۔'' اس نے ماں کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''ارے بیٹا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟'' عابدہ خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''ارے! یہ صبح صبح اتنا لاڈ پیار کیوں ہو رہا ہے؟ آج کوئی خاص دن تو نہیں؟ کوئی برتھ ڈے وغیرہ یا تہوار؟'' عدیل ناشتہ کرنے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف آیا تو دہلیز میں ہی ٹھہر گیا اور کافی حیرت کا اظہار کیا تھا جس پہ مریم اور عابدہ خاتون بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔

''اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے کیا کسی خاص دن یا تہوار کی ضرورت ہوتی ہے؟'' عابدہ خاتون نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آج کل زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ اپنی اولاد اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے بھی لوگوں کو خاص دن کی ہی ضرورت

ہوتی ہے، ورنہ عام دنوں میں تو وقت ہی نہیں ملتا۔" عدیل کا کہنا بھی بجا تھا لیکن غلط تو عابدہ خاتون بھی نہیں تھیں۔

"یہ امیر اور بڑے لوگوں کی باتیں ہیں بیٹا اور نہ ہم غریب لوگوں کے پاس اولاد اور بچوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے؟ ہم دولت کو نہیں اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینے والے لوگ ہیں کیونکہ ہماری جمع پونجی تو ہماری اولاد ہی ہوتی ہے۔" ان کے لہجے میں متانت رچی تھی عدیل آہستگی سے مسکرا دیا۔

"یہ تو آپ واقعی صحیح کہہ رہی ہیں، لیکن امی چند ایسے امیر اور بڑے لوگ بھی ہیں جو آج بھی دولت کو نہیں اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں، جن کی اولاد ہی ان کا سب کچھ ہے، ہمارے شہر کے بہت بڑے بزنس مین ہیں وقار آفندی، آفندی انڈسٹریز کے مالک، آج ان کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے، آپ اس برتھ ڈے کی ارینجمنٹ کا ہی سن لیں تو حیران رہ جائیں گی، ان کی بیٹی کے ڈرائیور سے ملاقات ہوئی تھی وہی ساری تفصیل بتا رہا تھا، وقار آفندی اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، لوگ تو محاورتاً کہتے ہیں نا کہ اولاد کو دیکھ دیکھ کر جیتا، لیکن وہ تو حقیقتاً اپنی بیٹی کو ہی دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔" عدیل کے ذہن میں منصور حسین کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

"بس بیٹا! ایسی محبت وہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ نوازا ہے، لیکن میں تو پھر بھی یہی سوچتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنی عاجزی میں ہی رکھے۔" عابدہ خاتون کافی عاجزی سے کہہ رہی تھیں اور عدیل ناشتہ کرنے کے لیے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا لیکن عدیل کے لیے ناشتہ گرم کرتی مریم کے ذہن میں ایک اور ریشم کا دھاگہ اُلجھ گیا تھا، وہ وقار آفندی اور جودت آفندی کی ایڈریس میں لگ گئی تھی، تو اس کا مطلب تھا کہ جودت آفندی اور وقار آفندی ایک ہی فیملی سے بی لانگ کرتے تھے؟ اور مریم سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ آخر وہ اتنے امیر کبیر فیملی اور اپر کلاس سے تعلق رکھنے والا لڑکا اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ اس کے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود تھی۔ ماڈرن، اسٹائلش، خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکیاں تو اسے بے شمار مل سکتی تھیں، پھر اس کی نظر انتخاب مریم پہ ہی کیوں ٹھہری تھی؟ وہ اسے ہی اس طرح کیوں دیکھتا تھا؟ اس کی نظریں اتنی بے باک ہوتی تھیں کہ مریم اندر ہی اندر سہم کے رہ جاتی تھی اور اب تو اسے اور بھی دھڑکا لگ گیا تھا کہ وہ جو ابھی ایک بار اس کے سامنے آیا ہے، اب وہ بار بار سامنے آئے گا اور بار بار اس کے راستے کی رکاوٹ بنے گا اور وہ جو اپنے گھر کے حالات بہتر کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلی تھی اس کا کیا بنے گا آخر اور اسی "آخر" پہ آ کر اس کی پریشانی اور تفکرات کے سائے شروع ہو جاتے تھے جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتے تھے۔

♥

تیرہ نومبر اور چودہ نومبر کی درمیانی شب لے کر اب تک سب کزنز اسے باری باری وش کر رہے تھے۔

سب سے پہلے رات کے بارہ بجے اسے آذر نے وش کیا تھا اور سب سے پہلا گفٹ بھی آذر نے ہی دیا تھا، اس کے بعد وقار آفندی اور آسیہ آفندی اسے وش کرنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آئے تھے، ان کے جانے کے بعد باقی سب نے مل کر بدھم تالیوں کی دھن پہ اسے اتنے خوبصورت انداز میں وش کیا تھا کہ علیزے خوشی سے چہک اٹھی تھی۔

حرمت نے اس کے لیے کیک بیک کیا ہوا تھا اور رات سوا بارہ بجے اس نے وہی کیک کاٹ کر سب کا منہ میٹھا کروایا تھا اور اسی طرح صبح وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تو ڈائننگ روم تازہ پھولوں سے سجا ہوا نظر آیا۔

"یہ میری طرف سے لولی، پرپٹی، سویٹی اینڈ ہیونلی فل ڈارلنگ علیزے کے لیے۔" جودت نے اچانک سامنے آتے ہوئے ایک سرخ رنگ کا تازہ گلاب اس کے سامنے پیش کیا یوں جیسے کوئی بوائے فرینڈ بڑے اسٹائل سے اپنی گرل فرینڈ کو پیش کر رہا ہو، علیزے کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اس کے انداز پہ مسکرا دیے تھے۔

"تھینک یو، جینٹم، چارمنگ، اینڈ ڈیشنگ برادر....." علیزے نے اسی کے سے اسٹائل میں کہتے ہوئے پھول اس کے ہاتھ سے تھام لیا جس پہ ڈائننگ روم میں موجود سبھی افراد یکدم قہقہہ لگا کر ہنسے تھے اور ان میں سب سے بلند قہقہہ وقار آفندی کا ہی تھا، وہ بیٹی کی شوخی و شرارت پہ بے پناہ خوش ہو رہے تھے اور ان سب کی انہی شوخیوں اور شرارتوں میں انہوں نے ناشتہ کیا اور پھر سب اپنے اپنے کاموں اور اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی کا سا سماں تھا ملازمین کی الگ دوڑ لگی ہوئی تھی مبارک خان سب کے سر پہ سوار اپنی نگرانی میں کام کروا رہا تھا تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے اور کمی کوتاہی نہ ہو، وقار آفندی، مبارک خان کے کام سے بہت خوش تھے، وہ اپنا ہر کام محنت، لگن اور پورے دھیان سے مکمل کرتا تھا اور اس طرح کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

شام کو جیسے ہی فنکشن اسٹارٹ ہوا دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ رہ گئی تھیں، کئی کنال پہ پھیلی ہوئی وسیع و عریض بڑی حویلی اس وقت روشنیوں کا ایک پورا جہان لگ رہی تھی اور روشنیوں کا یہ جہان اس وقت صرف اور صرف شہزادی علیزے کی خوشی میں آباد تھا اور آج یہاں اس خوشی میں شہر کے بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں نے شرکت کرنی تھی اور اس کی شروعات ہو چکی تھی، سب سے پہلے آسیہ آفندی کی دوست مسز بدر اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں عاصم، سائم، فاطمہ اور مسٹر بدر کمال بھی ساتھ تھے۔

"ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" فاطمہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی سے کافی شوق سے ملی تھی۔

"فائن بیٹا! آپ سناؤ کہاں ہوتی ہو بڑے عرصے بعد دیکھا ہے؟" آسیہ آفندی نے پیار سے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"بس یونیورسٹی کی وجہ سے بہت بزی ہوتی ہوں، لیکن آج سوچا کہ علیزے کو ہی دیکھ آؤں، آج کے دن تو علیزے کی چپ دیکھنے والی ہوتی ہے۔" فاطمہ نے کھلے دل سے تعریف کی اور اس کی اس تعریف میں کوئی مبالغہ آرائی بھی نہیں تھی کیونکہ ہمیشہ سادہ رہنے والی علیزے جب اپنی برتھ ڈے کے روز اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے ہلکا پھلکا میک اپ کرتی تھی اور نازک سی جیولری پہنتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہزاروں سنگھار کر کے سامنے آ گئی ہو۔

"بس بیٹا! یہ تو تمہاری محبت ہے، ورنہ تم خود اتنی خوبصورت اتنی پیاری ہو۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور فاطمہ مسکرا دی۔

"اچھا تو علیزے اب کہاں ہے؟" فاطمہ علیزے کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

"اپنے بیڈ روم میں ہے، تھوڑی دیر تک آ جائے گی۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

"اوکے لیکن کوئل اور حرمت بھی نظر نہیں آ رہیں؟"

"تم اندر چلی جاؤ تمہیں سب نظر آ جائیں گی۔" آسیہ آفندی نے مسکرا کر اندر کی سمت اشارہ کیا اور فاطمہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے سر ہلا کر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"ہوں تو آج کل کیا مصروفیت ہے آپ لوگوں کی؟" آذر، سائم اور جوت سے پوچھ رہا تھا جس پہ عاصم بے ساختہ مسکرا دیا کیونکہ اسے ان لوگوں کی مصروفیت کا تھوڑا بہت اندازہ پہلے سے ہی تھا اسی لیے چینٹ کی بیسیوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے ہلکے سے کھنکارا تھا۔

"ہماری مصروفیت وہی ہے جو پہلے تھی، یونیورسٹی، یونیورسٹی اور یونیورسٹی..... بس اور تو کچھ نہیں۔" جوت نے کندھے اچکاتے ہوئے ذرا لاپروائی سے جواب دیا تھا، جس پہ سائم نے چہرا جھکا لیا۔

"بس اور تو کچھ نہیں نا؟" آذر نے دہرا کے پوچھا کیونکہ آج وہ دونوں بڑے عرصے بعد اکٹھے نظر آئے تھے۔

"جی ہاں..... اور کچھ نہیں۔" دونوں نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں عاصم صاحب! کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟" آذر نے عاصم کو مخاطب کیا۔

"اتنے اچھے انداز میں کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے؟" عاصم نے بھی جواباً کندھے اچکائے تھے اور آذر بس دیکھ کے رہ گیا۔

"ارے آذر صاحب! جانے دیجیے، کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہیں؟ آج انہیں انجوائے کرنے دیں، یہ انوسٹی گیشن کل کے لیے رہنے دیں۔" عاصم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کی جان بخشی کروائی تھی اور وہ بڑی سہولت سے وہاں سے کھسک گئے تھے، اور اتنی سی دیر میں ہی ان کا پورا ان لوگوں سے بھر چکا تھا حویلی کے گیٹ سے لے کر اندر ڈرائنگ روم تک ریڈ کارپٹ بچھا ہوا تھا اور اس خوبصورت ارینجمنٹ کو مدھم سُروں میں بجتا میوزک اور بھی دلفریب اور سحر انگیز بنا رہا تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی لوگوں کی نظروں میں ستائش تھی اور کئی لوگوں نے باقاعدہ سراہا بھی تھا اور اس چیز کا سارا کریڈٹ مبارک خان کو جاتا تھا جس پہ وقار آفندی بھی خوش تھے اور مبارک خان بھی خوش تھا اتنے سارے لوگوں کی تعریف پہ اس کی ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔

"مبارک خان! کیک آ چکا ہے یا نہیں؟" آسیہ آفندی اچانک کچھ یاد آنے پہ اپنے قریب کھڑی خواتین سے ایکسکیوز کرتی ہوئی مبارک خان کی طرف آ گئی تھیں۔

"جی بیگم صاحبہ! کیک تو ایک گھنٹہ پہلے ہی منگوا لیا تھا میں نے۔" مبارک خان نے کافی احترام اور تابعداری سے جواب دیا

تھا۔

''ہوں شاباش! میں نے سوچا کہ کیسا آرڈر لیٹ نہ ہو جائے۔'' وہ نرمی سے بولی تھیں۔

''بڑی حویلی سے کوئی آرڈر ہو اور وہ لیٹ ہو جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ! میں کیک چیک کرنے کے لیے تین بار گیا ہوں، یوں سمجھیں کہ پاس کھڑے ہو کر تیار کروایا ہے، ان شاء اللہ سب مہمانوں کو پسند آئے گا۔'' مبارک خان کو جیسے پورا یقین تھا۔

اور آسیہ آفندی جواباً کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ احمد پاس آ گیا تھا۔

''آنی! وہ کچھ خواتین آپ کو یاد کر رہی ہیں۔'' احمد نے ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا اور آسیہ آفندی نے فوراً گردن موڑ کر دیکھا ان کی کچھ جاننے والی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں ثروت بیگم کمپنی دے رہی تھیں۔

''اچھا میں آ رہی ہوں اور مبارک خان ٹھیک ہے تم جاؤ اپنا کام کرو۔'' آسیہ آفندی کہتے ہوئے ان عورتوں کی سمت بڑھی تھیں۔ انہوں نے آج گرے کلر کی خوبصورت نفیس اور انتہائی قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس میں ان کی گریس فل شخصیت بہت متاثر کن لگ رہی تھی تھوڑی دیر پہلے وقار آفندی کے پہلو میں کھڑی بج رہی تھیں اور فوٹو گرافر نے ان کی کئی تصویریں بنا ڈالی تھیں۔

''زری..... زری بیٹا! ادھر آ جاؤ، چوٹ لگ جائے گی۔'' یہ آواز آسیہ آفندی کی سماعتوں سے اچانک ٹکرائی تھی اور ان کے قدم بے ساختہ تھم گئے تھے انہوں نے اس کی آواز کی سمت تڑپ کر دیکھا ایک عورت اپنی تین چار سالہ بچی کو پکار رہی تھی جو لان میں کھیلتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی، آسیہ آفندی اس پیاری سی بچی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''زری.....؟'' انہوں نے دھیمے اور کھوئے ہوئے انداز میں زیر لب دہرایا تھا اور یوں لگا جیسے ان کا دل مٹھی میں آ گیا ہو، زری کے نام پہ ان کے دل سے ہوک نکلی تھی۔

''آنی! دیکھیں علیزے آ گئی ہے۔'' ان کے قریب ہی انوشہ بے تحاشہ چہک کر بولی تھی اور آسیہ آفندی نے اس بچی سے نظریں ہٹا کر علیزے پہ مرکوز کر دیں، علیزے انہی کی سمت آ رہی تھی اور علیزے کے ایک ایک قدم پہ ہزاروں نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

بلیک کلر کے جدید تراش خراش کے انتہائی قیمتی اور خوبصورت لباس میں ملبوس علیزے آفندی اس وقت ہزاروں نگاہوں کے نیچے بسنے والے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گئی تھی اور آذر آفندی کے سینے میں تو کئی ہارٹ ریٹ مس ہوئی تھیں اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر آذر کے سینے میں دھڑکتے ایک جاندار نے کچھ بوکھلائی ہوئی حرکتیں سرزد کی تھیں۔ بے اختیار اور اچانک۔ شاید اس لیے کہ آج وہ پہلی بار سیاہ رنگ پہن کر آئی تھی یا شاید اس لیے کہ وہ پہلی بار اتنے دل سے تیار ہو کر آئی تھی لیکن جو بھی تھا سب کو مبہوت کرنے کے لیے کافی تھا، بلیک کلر کی لانگ شرٹ پہ بلیک دھاگے کا کافی نفیس کام کیا گیا تھا، سامنے دامن پہ اور بازوؤں کی پٹی پہ سلور کرسٹل کے نگ جڑے ہوئے تھے اور یہی رنگ اس کے دوپٹے کی چاروں اطراف میں نظر آ رہے تھے، چوڑی دار پاجامے کے نیچے بلیک پنسل ہیل والے سینڈل اس کے خوبصورت اور متناسب سراپے کو اور بھی نمایاں دکھا رہے تھے، اسٹائلش اور یونیک سے ہیر اسٹائل کے باوجود علیزے نے دوپٹہ کافی سلیقے سے سر پہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی وہ کبھی ننگے سر سامنے نہیں آئی تھی، البتہ اسے ننگے سر کسی نے دیکھا تھا تو وہ صرف منصور حسین تھا اسی لیے تو وہ اب کہیں نظر آ جاتا تھا تو وہ نظریں چرا جاتی تھی۔

''مما! کیا دیکھ رہی ہیں؟'' علیزے نے پاس آ کر ماں کے ہاتھ تھام لیے تھے آسیہ آفندی یکدم چونک گئیں۔

''دیکھ رہی تھی کہ میری بیٹی ماشاء اللہ اب جوان ہو چکی ہے، شادی کے قابل ہو چکی ہے۔'' انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے علیزے کی نظر اتاری اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا علیزے بری طرح بھیپ گئی۔

''مما.....'' اس نے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

''اچھا..... ادھر آؤ مہمانوں سے ملو، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' آسیہ آفندی اسے ساتھ لے کر مہمانوں سے ملوانے لگیں اور رفتہ رفتہ کیک کاٹنے کا ٹائم بھی آن پہنچا تھا بڑے سے کیک پہ اس کا نام اور برتھ ڈے لکھا ہوا تھا، چھوٹی چھوٹی کیک کینڈلز کو گل کرتے ہی فضا میں ایک دم سے ہیپی برتھ ڈے اور تالیوں کی آواز گونجنے لگی یہاں تک کہ حویلی کے در و دیوار بھی گنگنا اٹھے تھے۔

علیزے نے سب سے پہلے وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو کیک کھلایا تھا لیکن یہی کیک وقار آفندی کے حلق میں اٹک گیا تھا ان کے سیل پر ایک میسج موصول ہوا۔

''بیٹی کی سالگرہ مبارک ہو وقار آفندی! لیکن اتنا یاد رکھو آج تم اپنی بیٹی کی بیسویں اور آخری سالگرہ منا رہے ہو، آئندہ تمہیں

موقع نہیں ملے گا۔ ان شاء اللہ!"

وقار آفندی کے ہاتھ میں موبائل لرز کے رہ گیا اور ان کے چہرے کی رنگت یکلخت زرد پڑ گئی لیکن اتنے سارے لوگوں میں اور اس ہنگامے میں کوئی بھی ان کی سمت متوجہ نہیں تھا وہ مرے مرے بے جان قدموں سے چلتے ہوئے مرکزی حصے سے تھوڑا بہت گئے تھے، لیکن ان کی ایسی شکستہ سی حالت دیکھ کر گیٹ کے پاس کھڑا منصور حسین فوراً لپک کے ان کے قریب آیا۔

"ارے صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟" اس نے وقار آفندی کو تھام کر قریبی کرسی پہ بٹھایا تھا۔

"ایک گلاس پانی لا دو۔" انہوں نے اپنی کنپٹی اور سینے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"جی ابھی لایا۔" وہ فوراً گیا اور پانی لے آیا تھا۔ وقار آفندی ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئے تھے۔

"اب ٹھیک ہیں آپ؟" منصور حسین فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں ٹھیک ہوں۔" وہ ابھی بھی اپنا سینہ سہلا رہے تھے اور اپنی کیفیت کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس وقت یہاں ہزاروں لوگ جمع تھے اور اتنے لوگوں میں ان کی ذرا سی بات بھی اچھال سکتی تھی اور رسوائی کے بھی بے پناہ امکان تھے اسی لیے ضبط کر جانا اور خاموش ہو جانا ہی بہتر تھا، کیونکہ اس وقت کچھ بولنے کا یا ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ الٹا نقصان تھا۔

ان کی اپنی ہی جگ ہنسائی ہوتی تھی کہ کسی نامعلوم اور ان دیکھے دشمن نے ان کی نیندیں اور ان کی زندگی حرام کر رکھی تھی اور وہ کچھ نہیں کر پا رہے تھے بلکہ اس کے سامنے ہر طرح سے بے بس تھے۔

اور پھر فنکشن ختم ہونے تک وہ اسی طرح قدرے گم سم اور چپ چاپ سے رہے اور فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی ان سب نے پوچھا تو طبیعت خرابی اور سر درد کا کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے اس لیے باقی سب نے بھی خاموشی سے اپنے اپنے بیڈ روم کا رخ کیا تھا اور ویسے بھی سب تھکے ہوئے تھے سب کو نیند آ رہی تھی اس لیے کسی نے بھی اس مسئلے پہ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔

♥

"پپی..... برتھ ڈے..... ٹو یو
پپی..... برتھ ڈے..... ٹو یو
پپی..... برتھ ڈے..... ٹو یو
ہاپی ڈیئر علیزے ڈارلنگ۔"

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی جیولری اُتار رہی تھی جب کوئی دھیمے سے گنگنا کر اسے وش کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا، علیزے نے چونک کر آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھا اور پھر یکدم اسے کرنٹ چھو گیا وہ ایک سیکنڈ میں تڑپ کر سیدھی ہوئی تھی۔

"ڈرائیور! تم یہاں؟ میرے بیڈ روم میں؟" علیزے پہ تو جیسے حیرت اور اچنبھے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس کے اس پیراپنے بیڈ روم میں کسی ملازم کو اتنے استحقاق سے داخل ہوتے دیکھنا بھی تو سر پہ پہاڑ ٹوٹنے کے ہی برابر تھا۔

"جی ہاں..... میں یہاں شہزادی علیزے کی خواب گاہ میں۔" اس نے کہتے ہوئے انتہائی سکون اور کمولت سے دروازے کا لاک لگا کر بولٹ بھی چڑھا دیا۔

"ڈرائیور! یہ..... یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے بیڈ روم میں آنے کی۔" علیزے اسے دروازہ بند کرتے دیکھ کر پاگل ہوا تھی تھی لیکن ساتھ ہی اس پہ خوف بھی طاری ہو چکا تھا کیونکہ وہ مضبوط قدم اُٹھاتا اس کی سمت آ رہا تھا۔

"یہ جرأت میں ہزاروں بار کر چکا ہوں جان ڈرائیور! جرأت کا قصہ نہ چھیڑو۔" وہ سرد دلکشی سے کہتا ہوا عین اس کے سامنے آ رکا، علیزے اس کے تیور دیکھ کر برف کی مانند ٹھنڈی ہونے لگی تھی اس کی خوبصورت پیشانی پہ ٹھنڈے پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے کیونکہ منصور حسین آج منصور حسین نہیں کچھ اور ہی لگ رہا تھا صاف ستھرا، خوشبوؤں میں بسا ہوا، اس کی ڈریسنگ بھی بے تحاشہ قیمتی نظر آ رہی تھی اور علیزے کے چاروں اطراف خوف و خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں وہ یکدم کسی متوحش ہرنی کی مانند بدحواس ہو کر دروازے کی سمت بھاگی تھی لیکن دوسرے ہی پل اس کی کلائی جکڑ کر اسے بیڈ کی سمت دھکیل دیا گیا تھا وہ بُری طرح چکرا گئی تھی۔

"ڈرائیور....." وہ چیخ اٹھی تھی۔

''میں ڈرائیور نہیں ہوں تمہارا۔'' اس نے اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سکون سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر..... کک کون ہو تم؟'' علیزے یکدم بیڈ سے اُٹھ بیٹھی۔

''شوہر ہوں تمہارا۔'' اس کا سکون ہنوز برقرار تھا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی تھی۔

''شوہر کیا مطلب ہے تمہارا، کون ہو تم..... تم بتاتے کیوں نہیں۔'' علیزے خود میں بمشکل ہمت پیدا کرتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا تھا اور پھر گھرائش لے کر دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑ دیا تھا۔

''دل آور شاہ'' اس نے دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی اس کے چہرے پہ پھونک دیا تھا۔

''دل آور شاہ.....؟''

''ہوں..... دل آور شاہ..... اور تم دل آور شاہ کی بیوی ہو۔'' اس نے کہتے ہوئے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور پتھر کی مورتی کی طرح پتھرائی ہوئی علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

''ڈرائیور منصور حسین، دل آور شاہ، شوہر، بیوی یہ سب اس کے ذہن میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔

♥♥♥

PRIME URDU NOVELS

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

''بیوی؟'' ان سب لفظوں پہ اور ان سب ناموں پہ یہ ایک نام بھاری ہو گیا تھا اور اس لفظ کا یہ بھاری پن علیزے کے ناک دل و دماغ اور نازک اعصاب سے سہارنا مشکل ہو گیا، اس کے حواس اس کے ساتھ چھوڑنے لگے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر نیچے زمین پہ آ گرتی دل آور شاہ نے احتیاط سے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بیڈ پہ بٹھا دیا اور خود بھی اس کے بے حد قریب بیڈ پہ ہی بیٹھ گیا۔

''ایک شوہر اپنی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے کبھی اتنی جدوجہد اور اتنا صبر نہیں کرتا جتنا میں نے کیا ہے۔ انتظار ہی کرتا رہا کہ کب تم میں سال کی ہو گی اور کب میری دسترس میں آؤ گی؟ تمہیں پانے کے لیے تو میں نے رانجھا بننے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب دعا کرو کہ کوئی کیدو پیدا نہ ہو؟'' دل آور نے انتہائی سکون اور نرمی سے کہتے ہوئے اس کا نازک دودھیا مخملی سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتے ہوئے ہلکے سے دبایا تھا اور علیزے اس کے مضبوط ہاتھ کے دباؤ اور حدت سے یکدم جیسے پھر سے حواسوں میں آ گئی تھی، اسے گرفت چھوٹ گیا تھا۔

''چھوڑو میرا ہاتھ.....'' وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچتی ہوئی جھٹکے سے کھڑی ہو گئی لیکن دوسرے ہی پل وہ دل آور کے ہلکے سے جھٹکے سے ہی اس کے اوپر آ رہی تھی۔

''اتنا احتجاج کس لیے میری جان! احتجاج کرنے سے پہلے کم از کم یہ ضرور سوچ لینا چاہیے کہ ہم آخر کتنے پانی میں ہیں؟ ڈوب جائیں گے یا بہہ جائیں گے۔'' وہ اسے احتیاطاً سمیٹ چکا تھا وہ تڑپی تھی۔ ماہی بے آب کی مانند

''ڈرائیور پلیز..... چھوڑو مجھے، تم کون ہو؟ میں بالکل بھی نہیں جانتی پلیز.....'' علیزے کے حلق میں بے بسی کے مارے آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا۔

وہ اپنے ہی گھر میں، اپنے ہی بیڈ روم میں اتنی بے بس ہو چکی تھی کہ اپنے بہت اپنوں کو بھی مدد کے لیے نہیں پکار سکتی تھی کیونکہ بیڈ روم کی دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں اور علیزے بے بس.....

''جان ڈرائیور! میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ تم یہ سب جاننے لگو گی لیکن دو گھڑی پاس تو بیٹھو، جھڑکنوں کا دھڑکنوں سے تال میل تو ہونے دو، کچھ ڈرائیور کی سمجھو اور کچھ ڈرائیور کو سمجھاؤ، مسئلے تو تب ہی حل ہوتے ہیں جب باہمی مشورے اور مذاکرات کیے جائیں، اس طرح اٹھ اٹھ کر بھاگنے سے سوائے کھینچا تانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔'' دل آور نے اسے دوبارہ بیڈ پہ بٹھا دیا۔

اور سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو قالین پہ پھینکا اور اپنے بوٹوں تلے مسل دیا۔

''سوری! تمہارے بیڈ روم میں ایش ٹرے نہیں ہے نا اس لیے قالین کو زحمت پہنچانی پڑی۔'' اس نے ساتھ ساتھ معذرت کے آداب بھی پورے کیے تھے اور پھر ذرا سا ترچھے انداز میں بیٹھتے ہوئے پوری توجہ سے اس کی سمت متوجہ ہوا۔

''بتاؤ کیا جاننا چاہتی ہو؟ کیا بتاؤں تمہیں؟'' وہ جیسے اب اپنے اصل روپ اور اصل مزاج میں آ گیا تھا اس کے دیکھنے کا انداز اور بولنے کا لہجہ بدل گیا تھا علیزے چونک گئی اور ایک پل کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی اور خوف سے روح بھی کپکپا اٹھی۔

''خیر بابا پہ فائرنگ کروانے سے لے کر اب تک کیا کیا ہوا ہے؟ سب بتاتا ہوں تمہیں، اک بات بھی نہیں چھپاؤں گا پہلے یہ لفافہ کھول کر چیک کر لو، اس میں نکاح نامہ بھی ہے، اس کی بھی تسلی کر لو اور جان لو کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟'' دل آور شاہ نے بے تاثر سرد سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے اپنی پینٹ میں اڑسا ہوا لفافہ نکال کر علیزے کی گود میں رکھ دیا۔

یوں جیسے اسے منہ دکھائی پیش کی ہو اور علیزے کی رنگت متغیر ہو گئی، خیر و بابا پہ فائرنگ کا ذکر سن کر تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے اس لیے گود میں رکھا لفافہ اُٹھا کر کھولنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی، خوف لمحہ بہ لمحہ قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں پھیلتا جا رہا تھا اور اس خوف کی لرزش اس کے ہاتھوں سے نمایاں نظر آ رہی تھی، اس کے ہاتھ بُری طرح کپکپا رہے تھے لیکن پھر بھی اسے وہ لفافہ تو کھولنا تھا سو بڑی مشکل سے اپنی ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ اُٹھایا اور چاک کر دیا۔

♥

دھڑام کی آواز سے کچھ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا۔

اور ٹوٹ کر بکھرنے کی یہ آواز بہت دور تک گئی تھی اتنی دور تک کہ سننے والے دہل گئے تھے۔

''زری..... کچھ گرا ہے؟'' نگارش نے سیڑھیوں کی ریلنگ سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.....'' زری کی بے یقین اور سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کیا گرا ہے؟'' نگارش نے دوبارہ پوچھا۔

''میرا دل.....'' زری کی سہمی ہوئی سی آواز کو نگارش مذاق سمجھی تھی۔

''اچھا..... تو کیا ٹوٹ گیا؟''

''ہاں بھابی! ٹوٹ گیا..... ٹوٹ گیا میرا دل۔'' اب کی بار زری کی آواز میں آنسوؤں کا غلبہ تھا وہ شاید رو پڑی تھی اور نگارش ٹھٹک کر سیدھی ہوئی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی سیڑھیاں اُتر آئی زری لاؤنج میں لگے ریک کے پاس کھڑی تھی اور کافی شدت سے رو رہی تھی اور اس کے رونے کی وجہ نگارش کو لاؤنج کے فرش پہ ہی بکھری نظر آ گئی تھی جس پہ نگارش کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔

بلیک کلر کا کافی مگ بڑی بیدردی سے ٹوٹ کر ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا، یگ تین چار سال پرانا تھا، زری ایک بار مدیحہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی اور وہاں اسے یگ بہت پسند آئے تھے تب اس نے تین مگ ایک ساتھ خریدے تھے، دل آور شاہ، نبیل حیات اور عبداللہ کے لیے۔

اپنی پسند سے اس نے بلیک کلر کا مگ دل آور شاہ کے لیے سلیکٹ کیا تھا، جبکہ عبداللہ کا نیوی بلو کلر اور نبیل حیات کا چاکلیٹی کلر میں تھا۔ ان کے کلرز مختلف لیکن ڈیزائن اور شیپ ایک جیسے ہی تھے جو ان تینوں کو بہت پسند آئے تھے اور یہی وجہ تھا جس میں پہلی مرتبہ اس نے کافی بنا کر دل آور کو دی تھی اور وہ پہلی مرتبہ ہی چونک گیا تھا۔ اسے اس مگ سے لپٹی خوشبو اور چاہت کا احساس ہو گیا تھا اور پھر یہ احساس ہمیشہ بڑھتا ہی رہا۔ جب بھی وہ تینوں دوست ان کے گھر میں اکٹھے بیٹھتے تھے تو نگارش اور زری انہیں انہی میں کافی یا چائے بنا کر دیتی تھی اور جب سے دل آور اور نبیل پاکستان گئے تھے عبداللہ نے بھی اپنے مگ میں کافی پینا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے نگارش نے وہ تینوں مگ صاف کر کے لاؤنج کے ریک میں سجا دیے تھے اور آج زری کو خیال آیا کہ وہ یگ پیک کر کے دیگر سامان میں رکھ دے، تاکہ پاکستان جا کر وہ لوگ پھر اپنی کافی کی یاد تازہ کر لیتے، لیکن وہ مگ پیک کرنے کے بعد جب اس نے تیسرے کو اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے کیا ہوا، وہ بلاوجہ ہی اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ جس کا صدمہ اسے ہچکیوں سے نڈھال کر گیا۔

''زری پلیز..... کنٹرول میری جان، اب اتنی سی بات پہ کیا رونا؟ کانچ کی چیز تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہے۔'' نگارش نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بھابی! اس کانچ کی چیز میں میری محبت کا پہلا لمس، پہلا احساس بسا تھا، بکھر گیا وہ احساس، گر کر ٹوٹ گیا۔'' زری کا دل یوں تھا جیسے کسی نے اپنے ہاتھ کو دونوں مٹھیوں میں بڑے زور سے بھینچ رکھا ہو، جس سے اس کے دل کا دم گھٹ رہا تھا اور جان ٹوٹ رہی تھی۔

''ارے نہیں پاگل..... اب اپنی محبت کو اس بے جان چیز سے تو مشروط مت کرو، محبت کسی کی نشانیوں کی محتاج نہیں ہوتی۔'' نگارش نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے سہلایا۔

''محبت نشانیوں کی نہیں لیکن احساس کی محتاج تو ہے نا؟ اور اس کانچ کے مگ میں تو میری محبت کے کئی احساس پوشیدہ تھے! یہ احساس بکھرے ہیں تو میرا دل بھی تو بکھرے گا نا؟'' زری کے دل پہ چمکتے دکھ کے الہام اُتر رہے تھے اور اس کی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ جسے دیکھ کر نگارش کا دل بھرنے لگا۔

''پلیز زری! سنبھالو خود کو، کچھ نہیں ہوا، صرف گ ہی تو ٹوٹا ہے؟ ہم دل آور بھائی کے لیے نیا اور اس سے زیادہ اچھا گ لے آئیں گے، جو تمہاری طرف سے ان کے لیے گفٹ ہی ہوگا۔'' نگارش نے اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں بھابی! یہ صرف گ نہیں ٹوٹا، اس گ کے ساتھ تو بہت کچھ ٹوٹا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ جب کانچ کی کوئی چیز ٹوٹتی ہے تو سمجھو کوئی انہونی ہونے والی ہے اور آپ..... آپ جانتی ہیں کہ میرا دل کوئی بھی انہونی سہنے والا دل نہیں ہے، ادھر کچھ ہوگا، ادھر یہ مر جائے گا۔'' وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی اور نگارش اسے بچوں کی طرح سنبھال رہی تھی۔

''زری! صرف تین، چار روز کی بات ہے، ان شاء اللہ ہم پاکستان جائیں گے تو تمہارے سارے وہم اور وسوسے دور ہو جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نگارش اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی۔

لیکن آج کل نہ جانے کیوں زری کے دل کی اتنی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی کہ لاکھ سمجھانے اور بہلانے سے بھی نہیں بہل رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ چپ ہوئی تھی اور رو رو کر لاؤنج میں بکھرے کانچ کے ٹکڑے اٹھانے لگی، لیکن یہ کانچ کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا۔ مگر وہ بمشکل ضبط کرتی ہوئی کپڑے سمیٹ کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ یہاں اس وقت سوا نو بجے کا وقت تھا اور پاکستان میں رات کے سوا دو بج رہے تھے۔

پاکستان میں رات کے سوا دو بجے ایسا کیا ہوا ہے جس نے زری کے دل کو اپنی مٹھیوں میں لے کر بری طرح مسل ڈالا تھا؟ زری کے پاؤں کے تلوے زمین پہ نہیں لگ رہے تھے۔ وہ اضطراب کے مارے دائیں بائیں چکرا رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پہ بے کلی اور بے چینی سوار ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ فی الحال یہ معلوم نہیں کر سکی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ یوں بیٹھے بیٹھے اس کے دل کی حالت اتنی غیر کیوں ہو گئی ہے؟ صرف گ ٹوٹ جانے پہ تو ایسا نہیں ہو سکتا؟ زری ہر طرف سے بے بس ہو کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ باہر موسم بہت سرد ہو رہا تھا اور اس کے اندر آتش دہک رہا تھا، شعلے اگلتا ہوا اور زری اس ٹھنڈے اور گرم موسم کی زد میں کھڑی سب کچھ اپنے دل پہ سہار رہی تھی، بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ۔

♥

پندرہ نومبر کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

علیزے آفندی اور دل آور شاہ نے رات جاگ کے گزاری تھی۔ ایک ہی بیڈ پہ آمنے سامنے بیٹھ کر.....

آنکھوں، آنکھوں میں رات بیت گئی تھی اور اسی رات میں یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں کی ذات بیت گئی تھی۔ ایک سرا علیزے آفندی کے ہاتھوں میں تھا اور ایک سرا دل آور شاہ کے ہاتھ میں۔ وہ ساری باتیں اور سارے ثبوت اس پہ واضح کر چکا تھا جن کو جاننے اور دیکھنے کے بعد علیزے آفندی چپ ہو گئی تھی۔ بلکہ چپ لگ گئی تھی، چپ کا تالا لگ گیا تھا اور اس تالے کی کنجی اور اسے کھولنے کا اختیار اب صرف دل آور شاہ کے پاس تھا تو کیا اس ایک رات میں وہ سارے اختیار دل آور شاہ کو سونپ چکی تھی؟ اس نے اپنا سب کچھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا؟ وہ جو بھی چاہتا کر سکتا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ گزشتہ رات محض ایک رات نہیں تھی بلکہ قیامت کی رات تھی۔

اور اس قیامت کی رات نے علیزے آفندی کی ذات کے سارے غرور چھین لیے تھے۔ اس کی معصومیت کو دھجی دھجی بکھیر ڈالا تھا۔ اس رات کے بعد وہ علیزے آفندی کے قدموں کی خاک بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے سارے ناز، سارے غرور مٹی میں مل گئے تھے۔ وہ آج منہ کے بل گری تھی اور یہ گرنا اسے توڑ کے رکھ گیا تھا۔ وہ اٹھنے اور سنبھلنے کے قابل نہیں رہی تھی اور اسی گم سم حالت میں صبح ہوئی اور صبح کے انتظار میں بیٹھا دل آور شاہ آہستگی سے اس کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر گم سم بیٹھی علیزے کے سامنے اپنا مضبوط ہاتھ پھیلا دیا تھا۔ علیزے اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے چونکی تھی، بلکہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے اسے کے ہاتھ کا مفہوم سمجھتے ہوئے خاموشی سے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دل آور نے اپنے ہاتھ کے زور پہ اسے بیڈ سے اٹھنے میں مدد دی تھی۔

اور پھر بڑی احتیاط سے اسے اپنے ساتھ لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ علیزے اس کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہونے کا مطلب بھی سمجھ گئی تھی۔ یعنی وہ اسے فریش دیکھنا چاہتا تھا اور علیزے اس کے چاہنے کے مطابق اپنے چہرے کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے بالوں میں برش پھیرنے لگی اور یونہی بالوں میں پھیرتے ہوئے اچانک اس کی نظر ٹیبل پہ رکھے ان گفٹس کی سمت اٹھی تھی جو کل اسے سب لوگوں نے اور کزنز نے دیے تھے اور جو اس نے ابھی تک کھول کر دیکھے ہی نہیں تھے اور انہی گفٹس میں

گولڈن ریپر اور گولڈن ربن سے سجا ہوا آرٹ آفندی کا گفٹ بھی ہنوز پیکنگ میں بند پڑا تھا۔

''دیر ہو رہی ہے ہمیں۔'' دل آور شاہ نے کھڑی دیکھتے ہوئے اسے متوجہ کیا اور علیزے کو ان گفٹس سے نظریں چرانی پڑ گئیں۔ بال سمیٹ کر وہ اس کی سمت پلٹی۔ اس کی ڈریسنگ البتہ رات والی ہی تھی۔ وہی سیاہ سوٹ..... کسی کی قسمت سے بھی زیادہ سیاہ اسی ڈریس کے نیچے اس نے سیاہ سینڈل پہنے تھے اور سینڈلز کے اسٹریپس بند کرنے کے بعد وہ سیدھی کھڑی ہو چکی تھی۔

''چلیں.....؟'' وہ کافی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن علیزے کو جواب دینے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔

''ہوں..... چلیں۔'' اس کی آواز تھی یا ہوا کا دھیما جھونکا، جو غیر محسوس انداز میں چھو کے گزر گیا اور دل آور شاہ نے اس کے برابر کھڑے ہوئے اپنا دایاں بازو اس کے کندھوں کے گرد حمائل کر دیا اور وہ نازک کانچ کی گڑیا اس کے بازو کے حصار میں آ گئی تھی اور تب دل آور شاہ نے اپنے نمبر سے ایک کال ملائی تھی۔ اسی حویلی کے ایک نمبر پہ.....

♥

وقار آفندی ڈائننگ ہال میں بیٹھے اپنے الجھے بکھرے اور منتشر سے ذہن کو اخبار کی سرخیوں میں گم کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جب ٹیبل پہ رکھے ان کے سیل پہ رنگ بجی تھی اور اس قدر اچانک اور غیر متوقع انداز میں بجی تھی کہ اخبار ان کے ہاتھ میں لرز گیا۔ حالانکہ یہ لرزش تو ان کے ہاتھوں میں رات سے ہی ہو رہی تھی۔ اس وقت تو رنگ ٹیون کا کھل بہانا بنا تھا۔ انہوں نے جلدی سے سیل اٹھا کر دیکھا تھا۔ نمبر وہی رات والا تھا، جس سے انہیں وہ میسج موصول ہوا تھا اور وہ اسی نمبر سے کال دیکھ کر اندر سے ٹھٹھر کے رہ گئے۔ لیکن کال کرنے والے کو جاننے کے لیے کال ریسیو کرنا بے حد ضروری تھا۔ اس لیے انہوں نے فوراً کال ریسیو کر لی تھی۔

''ہیلو..... کون؟'' اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود وقار آفندی کے لہجے میں خوف بول رہا تھا۔

''تمہارا داماد.....'' جواب مختصر مگر کاٹ ڈالنے والا تھا

''کون ہو تم؟ اور کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وقار آفندی سے اس وقت مشتعل ہونے کی امید نہیں تھی، لیکن پھر بھی وہ مشتعل ہو رہے تھے۔

''میں وہی ہوں جسے تم اتنے عرصے سے اندر ہی اندر پاگلوں کی طرح تلاش کر رہے ہو اور تمہاری بیٹی مجھے پاگلوں میں لیے پھر رہی ہے۔'' اس آواز میں طنز تھا، تمسخر تھا، ایسا سب کچھ تھا جس سے وقار آفندی کی ہستی تڑپ اٹھتی۔

''یقین نہیں آتا تو اپنی بیٹی کے بیڈ روم میں آ کر دیکھو، میں تمہیں وہیں ملوں گا۔'' اتنا کہنے کے بعد کال ڈس کنیکٹ ہو گئی اور وقار آفندی پاگل ہو اٹھے تھے۔ علیزے کا خیال آتے ہی ان کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ سیل اور اخبار وہیں چھوڑ کے یکدم اٹھ کر کھڑے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں کرسی سے ٹھوکر بھی لگی تھی۔ وہ بمشکل گرنے سے بچے۔ کیونکہ بروقت دوسری کرسی کی بیک کا سہارا لے لیا تھا۔ لیکن وہ دو منٹ سنبھلنے کے لیے بھی نہیں ٹھہرے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے اندر اندر علیزے کے بیڈ روم تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن بڑی حویلی کے تین پورشنز کا طویل ترین زینہ طے کرتے ہوئے ان کی ساری ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ ان کا ہر قدم شکستگی کی سمت بڑھ رہا تھا اور اپنے بیڈ روم سے نکلتے آفر نے ان کو دیکھا اور وہ یہی سمجھا کہ ڈیڈ یقیناً علیزے کے بیڈ روم میں اسے جگانے کے لیے جا رہے ہیں۔ اس لیے ذرا لاپروائی سے کام لیتے ہوئے نیچے اتر آیا اور وقار آفندی اوپر علیزے کے بیڈ روم کے سامنے پہنچ گئے۔ بیڈ روم کے دروازے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

سامنے کا منظر قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس منظر میں حشر برپا تھے۔ کیونکہ علیزے جس کے بازو کے حصار میں کھڑی تھی وہ کوئی اور نہیں ان کے اپنے گھر کا ملازم اور علیزے کا ڈرائیور منصور حسین تھا۔

''منصور حسین.....؟'' وقار آفندی کے دماغ کی رگیں تن گئیں، جبکہ دل آور شاہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہلکورے لینے لگے تھے۔ غضب اس کے چہرے کے نین نقوش میں اتر آیا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جب علیزے اس کی تھی، اس کے ساتھ تھی، تو پھر یہ غیض و غضب بھلا کس لیے؟ اس نے اپنے اندر کے پھرے ہوئے زخمی شیر کو سلا دیا تھا، تھپک دیا تھا تھوڑی دیر کے لیے۔

''منصور حسین نہیں..... منصور حسین کا پوتا ہوں میں..... منصور حسین شاہ کا پوتا..... اور بابر شاہ کا بیٹا..... دل آور شاہ ہوں

میں..... دل آور شاہ۔" اس نے اپنی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چبا چبا کر اتنے ٹھوس اور دل اعداد میں تعارف کرا دیا کہ اس کے تعارف میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا اور وقار آفندی کھڑے کھڑے اس بڑی حویلی کے تین پورشن سے نیچے کرے اور حویلی کی مضبوط ترین عمارت کے ملبے تلے دب گئے تھے۔ جہاں سے نکلنا اب ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

"دل آور شاہ.....؟" یوں جیسے ان کے ہونٹوں نے اس کا نام لینے کی کوشش کی تھی ہلکی سی جنبش کے ساتھ۔

"ہاں دل آور شاہ! تمہاری بیٹی کا ڈرائیور نہیں، تمہاری بیٹی کا شوہر، جس کی تصدیق کے لیے تم نکاح نامہ بھی دیکھ سکتے ہو اور تسلی کے لیے اپنی بیٹی سے بھی پوچھ سکتے ہو، بلکہ یہاں ہی نہیں تم اسے اکیلے لے جا کر بھی پوچھ سکتے ہو، میری طرف سے اجازت ہے۔" دل آور شاہ نے وقار آفندی کی ملبے تلے دبی ہوئی لاش کو اور بھی زمین کے اندر دبا دیا تھا۔ لیکن اک لاش نما فنا شدہ وقار آفندی نے نہ جانے کس طرح علیزے کی سمت دیکھا تھا کہ ان کی سوالیہ نظروں کے سوال پہ علیزے نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔

"جی پاپا! یہ سچ ہے، میں اس سے شادی کر چکی ہوں، میرا اس کے ساتھ نکاح ہوا ہے، اب یہ میرا شوہر ہے، پہلے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کیونکہ مجھے آپ کے ری ایکشن کا پتا تھا لیکن آج اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں آج اپنی مرضی، اپنی رضا سے یہ حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر جا رہی ہوں، لہٰذا مجھے روکنے کی اور میرے سامنے رکاوٹ بننے کی کوئی بھی کوشش نہ کرے، آپ، نہ کوئی اور۔"

علیزے آفندی کی آواز پہ جہاں آذر آفندی کے قدم دروازے میں ہی رک گئے تھے وہیں وقار آفندی کی شریانوں میں گردش کرتا خون بھی رک گیا تھا۔ نبضیں تھمنے لگی تھیں اور دل بند ہو رہا تھا۔ چہرے پہ مرگ کا عالم تھا اور اسی عالم مرگ میں آذر آفندی بھی دم بخود اور ششدر سا کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی نیچے ڈائننگ ہال میں گیا تھا اور وہاں گرا ہوا اخبار اور ڈیڈ کا سیل دیکھ کر وہ چونک گیا اور جیسے ہی سیل چیک کیا تو رات والا میسج سامنے آیا تھا۔ تب ہی وہ پریشانی سے پلٹا اور ان کے پیچھے چلا آیا تھا لیکن علیزے کے بیڈ روم کے دروازے میں پہنچ کر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے اور اس میں کچھ بھی کہنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ آذر آفندی کی ساعتوں کے پر نچے اڑ گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی علیزے کو اور کبھی دل آور شاہ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی نظر میں اب بھی منصور حسین ہی تھا۔ البتہ منصور حسین کی اصلیت کیا تھی یہ تو صرف وقار آفندی ہی جانتے تھے۔

"چلیں.....؟" دل آور شاہ نے علیزے سے کہتے ہوئے وقار آفندی اور آذر کی سمت دیکھا۔

"ہوں....." علیزے نے آہستگی سے سر ہلایا اور پھر دل آور شاہ کے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ قدم ملانا پڑا۔

"منصور حسین....." آذر ان کو دروازے کی سمت بڑھتے دیکھ کر یکدم پھر گیا۔

"خبردار آذر آفندی! اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے بڑھے تو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔" دل آور شاہ نے یکدم ریوالور اور سامنے کرتے ہوئے اسے منجمد کر ڈالا۔ وہ ان سب کو بے بس کرنے کے پورے پورے انتظام کر کے آیا تھا۔ علیزے اس کے ریوالور کی زد میں آذر آفندی کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

"پلیز آذر بھائی! میں نے آپ سے کہا نا کہ کوئی بھی میرے راستے کی رکاوٹ نہ بنے تو پھر کیوں آپ خوامخواہ ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں، ہر لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ جاتی ہے۔ میں بھی جا رہی ہوں، پلیز آپ روکنے کی کوشش مت کریں۔" علیزے نے کافی سخت لہجے میں آذر کو منع کر دیا اور آذر ساکت و صامت رہ گیا تھا۔

"علیزے۔" وہ بے یقینی سے بولا۔

"مر چکی ہے آپ کی علیزے! میں اب آپ کی علیزے نہیں ہوں۔ نہیں ہوں میں آپ کی علیزے۔" وہ بھی یکدم بکھر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں امڈتے آنسو آذر نے واضح محسوس کیے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ دل آور شاہ اسے ساتھ لے کر بیڈ روم سے نکل گیا۔

"علیزے....." وقار آفندی کے منہ سے محض اس کا نام سنائی دیا تھا اور وہ کھڑے قد سے یکدم تیورا کے نیچے زمین پہ آ گرے۔

"ڈیڈ....." ان دونوں کے پیچھے نکلتا آذر یکدم آفندی کے گرنے کی آواز سن کر ان کی سمت لپکا۔

"علیزے! اپنی....." آذر دوزانو نیچے زمین پہ بیٹھتے ہوئے اپنی پوری قوت سے چیخا تھا۔

"علیزے..... ڈیڈ مر جائیں گے۔"

''آذر زور، زور سے چیخ رہا تھا اور اس کے چیخنے کی آواز باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اُترتی علیزے بھی سن چکی تھی، تب ہی دل آور شاہ کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ کانپا تھا اور قدم ٹھٹک کے رُکے تھے۔ لیکن دل آور شاہ نے اسے رُکنے نہیں دیا اور دوچار کر بھی رُک نہیں سکی تھی۔

اور ان دونوں کو سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر پورا گھر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ جودت، کومل، دانیال، احمد، آسیہ آفندی، ثروت دیگر اسرار آفندی سب کے سب اپنی اپنی جگہ پہ پتھر کے بت ہو گئے تھے اور اوپر سے آذر کے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دل آور شاہ سیڑھیاں اُتر کر کوریڈور کی سمت بڑھ گیا اور علیزے اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔

وہ اسے ساتھ لیے کوریڈور سے باہر روش پہ نکل آیا۔

''گلاب خان! گاڑی اندر لے کر آؤ۔'' اس نے محض دو سیکنڈ کی کال کی تھی اور گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا تھا، جیسے ہی عارف نے گیٹ کھولا اس کی چمچماتی ہوئی 'سرف' بڑی حویلی کی روش پہ آ کھڑی ہوئی، جس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ گلاب خان براجمان تھا، مستعد اور چوکس.....

''منصور حسین! یہ کیا کر رہے ہو تم؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' مبارک خان اپنے کوارٹرز سے نکل کر ادھر ہی آ رہا تھا لیکن دل آور شاہ کے ہاتھ میں دبوچا ہوا علیزے کا ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''خبردار..... زیادہ ہمدرد بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔'' دل آور شاہ نے اس کی سمت بھی ریوالور تان لیا اور مبارک خان کے ساتھ چوکیداری پہ معمور عارف بھی چوک گیا۔

''منصور حسین تم یہ سب کیوں؟'' مبارک خان نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں منصور حسین نہیں تمہاری علیزے بی بی کا شوہر ہوں۔ سمجھے تم؟'' دل آور شاہ نے جس انداز میں کہا تھا اس پہ مبارک خان اور عارف، کا بکا رہ گئے۔

''علیزے بی بی کا شوہر.....؟''

''ہاں..... اسی لیے تمہاری علیزے بی بی کو اب اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں۔'' اس نے کہتے ہوئے جن نظروں سے علیزے کی سمت دیکھا تھا وہ اپنے قدموں پہ کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ یکدم لڑکھڑا گئی۔ اس کا جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ وہ دل آور شاہ کے ہاتھ سے مٹھی میں دبی ریت کی مانند پھسلنے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جاتی، دل آور نے اسے بانہوں میں سنبھال لیا۔

''پاپا.....'' یہ شی کی وادی میں اُترتے ہوئے علیزے کے لبوں نے اپنے باپ کو ہی پکارا تھا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی، وقار آفندی بہت پیچھے رہ گئے تھے، بہت پیچھے۔

''گلاب خان! دروازہ کھولو۔'' دل آور شاہ نے اسے اشارہ کیا اور گلاب خان نے ایک سیکنڈ کی پھرتی سے دروازہ کھول دیا لیکن جیسے ہی دل آور شاہ، علیزے کو بانہوں میں اُٹھا کر گاڑی کی سمت بڑھا تھا عارف نے یکدم اس پہ بندوق تان لی۔

''میں تمہیں علیزے بی بی کو ایسے نہیں لے جانے دوں گا، تم یہاں سے ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔'' عارف ایک وفادار ملازم تھا۔ تب ہی تو اس کے سامنے ڈٹ گیا اور مبارک خان، عارف کی ذہانت پہ پہلے چونکا، پھر خوش ہوا تھا، دل ہی دل میں اسے شاباش دی۔

''اگر میں یہاں سے نہ گیا تو تمہاری علیزے بی بی کی یہاں سے لاش جائے گی۔'' دل آور شاہ نے گلاب خان کی سمت اشارہ کیا تھا۔ جس نے ریوالور علیزے کی کنپٹی پہ رکھ دیا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے منصور حسین۔'' مبارک خان، علیزے بی بی کے لیے تڑپا تھا۔

''اپنے مطلب کے لیے اگر میں خیرہ ہا پہ گولی چلا سکتا ہوں تو تمہاری علیزے بی بی کی کھوپڑی بھی اُڑا سکتا ہوں، میرے ملازم تم لوگوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں، ابھی اشارہ کروں تو تم اپنے قدموں پہ کھڑے بھی نہیں رہ سکو گے، تم گولی چلاتے ہوئے پھر بھی ڈر جاؤ گے، لیکن میرے ملازم نہیں ڈریں گے، میں خود نڈر ہوں تو میرے ملازم بھی نڈر ہیں۔'' دل آور شاہ کا ایک ایک لفظ سرد

ٹ اور زہر میں بجھا ہوا تھا، جسے سن کر وہ ساکت ہو گئے تھے۔

"خیر دبابا پہ کوئی تم نے چلائی تھی؟" مبارک خان پاگل ہو جانے کی حد تک حیرت زدہ ہو رہا تھا۔

"ہاں..... میں نے چلائی تھی، تم سب کو بیوقوف بنانے کے لیے۔" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا تھا اور ان دونوں کے چہروں پہ ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ صبح صبح ایسے انکشافات پہ عقل مفلوج ہو گئی تھی۔ دل آور نے آگے بڑھ کے علیزے کو گاڑی میں ڈالا اور پھر بھی گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ گلاب خان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ذرا سا ہارن بیک کیا۔

"میں نے کہا تھا نا عارف! پرسوں تمہیں اس حویلی میں دور، دور تک کوئی بھی ٹہلتا ہوا دکھائی نہیں دے گا، کوئی شان و شوکت میں رہے گی یہاں۔" دل آور نے کھڑکی کا شیشہ فولڈ کرتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے ان کو آخری سلام کیا۔ ہاتھ تک لے جا کر۔

"رب راکھا....." اور پھر اس کے بعد اس کی گاڑی پھسلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

مبارک خان اور عارف بے یقین سے کھڑے تھے۔ کیونکہ منصور حسین وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن اپنے پیچھے ایک قیامت چھوڑ گیا تھا، ایسی قیامت جو بڑی حویلی کے در و دیوار پہ پہلے کبھی نہیں اُتری تھی اور جب اُتری تھی تو بنیادیں بھی ہلا کے رکھ گئی تھی۔ وقار آفندی کی حالت پہ وہ علیزے والی حیرت اور بے یقینی بھی بھول گئے تھے۔ انہیں وقار آفندی کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ حویلی کے اندر شور مچا ہوا تھا۔ کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ فی الحال ان کی یہی کوشش تھی کہ وقار آفندی کو جلد از جلد ہسپتال پہنچایا جائے۔ اسی لیے مبارک خان کو پہلا آرڈر گاڑی نکالنے کا ہی ملا تھا اور اس کے پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی تیار تھیں۔

♥

مدیحہ نے رات جاگ کر گزاری تھی۔

بے شک وہ اس لڑکی کی خاطر ہی جاگنے کے لیے بیٹھی تھی، لیکن وہیں اس کا عدیل عمر کی طرف ہی بھٹکتا رہا تھا۔ اس کا دھیان بار بار پلٹ کر چانہ ورکشاپ میں کام کرتے عدیل عمر کی طرف جاتا اور وہاں جا کر بے بس ہو جاتا، کیونکہ اسے ورکشاپ سے نکالنا بے حد مشکل کام تھا۔ بے شک اس کی اس سے بہت مختصر اور کم ملاقاتیں ہوئی تھیں، لیکن پھر بھی وہ جان چکی تھی کہ وہ کتنا خوددار ہے؟ اور اس کی یہی خودداری مدیحہ کے ہر اندیشے کے آڑے آ رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اسے کبھی کچھ بھی نہیں کرنے دے گا۔ جبکہ وہ اسے نہ جانے کیوں اس ورکشاپ میں برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید اس کے اندر نکمتے جذبے کا پہلا تقاضا یہی تھا۔

محبوب کو حالت شہنشاہی میں دیکھنا، اپنے محبوب کو فقیرانہ حالت میں بھلا کون برداشت کر پاتا ہے؟ ہر صاحب محبت اور صاحب جذبہ اپنے محبوب کے لیے تاج محل کے خواب ہی دیکھتا ہے۔ سو وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ محبت کے وجود سے انکاری تو اب بھی تھی اور سوچ کی تان اسی پہلے پر آ کر ٹوٹتی تھی۔

"میں اور محبت..... وہ بھی عدیل عمر سے..... نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔" اور جہاں اس کی سوچ کی تان ٹوٹتی تھی وہیں اس کی محبت سے انکار مزید مضبوط سے بھی مضبوط تر ہوتا تھا۔ بے شک وہ اعتراف نہیں کرتی تھی، لیکن اس حقیقت کا ادراک تو اس پہ بھی ہو چکا تھا کہ عدیل عمر اس کے دل کا قلعہ تسخیر کر چکا ہے۔ چار، چھ ملاقاتوں میں ہی فتح پا گیا تھا۔ لیکن بس مسئلہ یہ تھا کہ ہر انسان کی طرح فطری طور پہ اس کے لیے بھی ہار ماننا بہت مشکل تھا۔ اس لیے وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ حالانکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ باقی تو کچھ نہیں رہا تھا۔ بس نام نہاد خودسری کے..... وہ خودسر تھی اور وہ خوددار تھا..... اور مسئلہ بھی بس یہی تھا۔ دونوں اپنی اپنی ذات میں سر بلند رہنا پسند کرتے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ محبت تو جھکی گردنوں کا ہار ہے۔ انہی پہ سجنا پسند کرتی ہے۔

"آہ....." اس لڑکی کی کراہ پہ اس نے یکدم چونک کر دیکھا۔ رات کی سیاہی دن کے سنہرے اُجالوں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اسے جو وقت جاگنے کا دیا گیا تھا۔ وہ لڑکی ہوش میں آ چکی تھی اور جیسے ہی اس نے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی اس کے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں، درد پھیلنے لگا تھا۔

"ہیلو..... گڈ مارننگ۔" مدیحہ نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اسے وش کیا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس لڑکی نے مدیحہ کی آواز پہ چونک کر دیکھا۔ اس کی خالی خالی آنکھوں میں حیرت اور اُلجھن کے تاثرات اُبھرنے لگے تھے، کیونکہ اس کمرے کا ماحول اور یہ چہرہ اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ وہ انجان تھی اور بے یقین تھی۔ اس کی بے یقینی مدیحہ کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟ کیا فیل کر رہی ہیں؟'' مدیحہ نے بڑی بردباری سے کام لیتے ہوئے پوچھا لیکن وہ لڑکی شاید جواب دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس کی چپ، اس کی بے یقینی، اس کی حیرت اور اس کی اُلجھن ہنوز تھی۔

''دیکھیے مس! میں آپ سے مخاطب ہوں، آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' مدیحہ نے اب کی بار کافی نپے تلے اور دوٹوک سے لہجے میں پوچھا اور وہ لڑکی پھر بھی جواب دینے کے بجائے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی، جس پہ مدیحہ کو خاصا غصہ آیا تھا۔

''اسٹاپ اٹ! میں نے آپ کو یہاں سے اُٹھنے کے لیے نہیں کہا، آپ کی طبیعت پوچھی ہے؟''

''میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا، ٹھیک ہوں، زندہ ہوں، آپ کو بھی نظر آ رہا ہے، بس رات گزر گئی، آپ کی بڑی مہربانی، اب مجھے جانے دیجیے۔'' اس لڑکی نے بول کر مدیحہ کو حیران پریشان کر دیا تھا۔ اتنی تگنی تھی اس کے لہجے میں کہ مدیحہ دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں نبیل بھی دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔

''گڈ مارننگ..... وہ بھی وقت سے پہلے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اسے بھی رات سے اس لڑکی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔

''ارے..... آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' نبیل اس لڑکی کو بیڈ سے اترتے ہوئے دیکھ کر چونک گیا۔

''اس شہر کی سڑکوں پہ اس شہر کی گلیوں میں..... وہ لڑکی اس حد تک تلخ ہو گی، ان دونوں، بہن، بھائی کو اندازہ نہیں تھا، اسی لیے اب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''کیوں؟ آپ کا گھر نہیں ہے کیا؟'' نبیل پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''میرا گھر ہوتا تو میں سڑکوں پہ یوں ماری ماری نہ پھر رہی ہوتی۔'' اس لڑکی کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اس کی ساری تلخی اس کے لہجے کی نمی میں چھپ گئی تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کا گھر کیوں نہیں ہے؟''

''میرا گھر اس لیے نہیں ہے، کیونکہ میرے پاس عزت نہیں ہے، عزت دار لڑکیوں والا غرور نہیں ہے، میرا ریپ ہوا ہے، میری عزت لوٹی گئی ہے، مجھے برباد کیا گیا ہے اور پھر بھی..... پھر بھی میرا مجرم ہر جگہ دندناتا پھر رہا ہے، کوئی اسے اس کے انجام تک پہنچانے والا نہیں ہے اور میں جب اس کے خلاف آواز اُٹھاتی ہوں تو بے گھر کر دی جاتی ہوں۔ میرے اپنے گھر والے مجھے اپنے گھر میں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور آپ جان سکتے ہیں جس لڑکی کا بوجھ اپنے گھر والے نہیں اُٹھا سکتے اس کا بوجھ دوسرے لوگ کیسے اُٹھا سکتے ہیں بھلا؟ میں تو ایسی مصیبت بن گئی ہوں کہ پولیس والوں سے بھی سنبھالی نہیں جا رہی اور آپ کے گھر سے اس لیے جا رہی ہوں کہ ساری حقیقت جاننے کے بعد آپ نے بھی تو مجھے اپنے گھر سے نکالنا ہی ہے؟ تو پھر کیوں نہ میں خود ہی چلی جاؤں؟'' اس لڑکی کی بیان کی گئی حقیقت اور اس کے سوال پہ ان دونوں کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ مدیحہ کا رنگ سفید لٹھے کی مانند ہو چکا تھا۔ وہ چکرا گئی تھی اور خود نبیل کے ماتھے پہ بھی پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

ماہ نومبر کی ایک سرد صبح میں ماتھے پہ چھلکتے پسینے کے قطرے دماغی انتشار کا نتیجہ اور باقاعدہ ثبوت دے رہے تھے۔ وہ اس لڑکی کی سمت دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ بھی تو ایک ''مرد'' تھا اور دوسرے کسی مرد کی درندگی اور ہوس پہ شرمسار اور نادم تھا۔ اس لڑکی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رہی تھی اور وہ ان دونوں کو خاموش اور گم سم سا دیکھ کر بمشکل بیڈ کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور نقاہت زدہ کمزور قدموں کو بڑی ہمت مجتمع کر کے زمین پہ جماتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی۔ وہ نبیل کی سائیڈ سے ہو کر گزری تھی اور دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دروازہ کھول لیا۔

''ٹھہریے.....'' نبیل کی آواز متوازن اور لہجہ مضبوط تھا۔ مدیحہ اس کے انداز پہ چونک گئی۔ اسے ادراک ہو چکا تھا کہ نبیل کوئی فیصلہ کر چکا ہے۔

''آپ یہیں رہیں گی، کہیں نہیں جائیں گی، میں دوں گا آپ کو تحفظ..... تب تک..... جب تک میں زندہ ہوں..... آپ کو اس گھر سے نہ کوئی نکالے گا، نہ آپ نکل سکتی ہیں، یہ میرا وعدہ ہے، نبیل حیات کا وعدہ۔'' نبیل کی زندگی کا یہ شاید پہلا وعدہ تھا جو اس نے کسی سے کیا تھا۔ وہ بھی اتنے مضبوط اور اٹل انداز میں..... وہ لڑکی اسے دیکھتی رہ گئی۔ دروازے کے ہینڈل پہ رکھا اس کا ہاتھ لرز گیا تھا، جبکہ مدیحہ نہ جانے کیوں وہاں سے روتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ حالانکہ نبیل حیات کے فیصلے پہ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے بھائی پہ

فخر ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ اسے اپنی دوست میری کا دکھ بھی رُلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی تو ریپ ہوا تھا۔ اس کی عزت بھی لوٹی گئی تھی۔ اسے بھی برباد کیا گیا تھا۔ مدیحہ روتی نہ تو اور کیا کرتی؟

♥

دل آور شاہ کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے آ کر رُکی تھی۔

اس کے ملازم زلفی نے فوراً گیٹ کھول دیا اور گلاب خان ایک جھٹکے سے گاڑی اندر دوش پہ لے آیا تھا اور گیٹ بند کر کے زلفی بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

''سلام صاحب.....'' اس نے آور کو گاڑی سے اُترتے دیکھ کر احتراماً سلام کیا۔

''والسلام! کیسے ہو زلفی؟'' دل آور نے کافی اپنائیت سے پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہوں صاحب! آیئے اندر آیئے نا۔'' زلف خان عرف زلفی، گلاب خان کی بیوی گل کا بھائی اور گلاب خان کا سالا تھا۔ عمر میں پندرہ سال کا، لیکن مزاج میں تیس سالہ سنجیدگی رکھتا تھا۔

دل آور شاہ کی غیر موجودگی میں گلاب خان پہ کافی ذمہ داریاں تھیں جن کی وجہ سے اسے اکثر و بیشتر گھر کے کام نمٹانے کی غرض سے گھر سے باہر بھی جانا پڑتا تھا اور گل کو گھر میں اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے دل آور شاہ کی پرمیشن پہ زلفی کو یہاں لایا گیا تھا۔ زلفی ایک، دو بار پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ اس لیے دل آور شاہ کو اس کے بارے میں پتا تھا۔ تب ہی اس کے آنے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور آج زلفی بھی اسے اتنے دنوں بعد دیکھنے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اسے دل آور شاہ کا مزاج، اس کی شخصیت، اس کا رہن سہن، سب بہت پسند تھا۔ وہ دل آور شاہ کو آئیڈیلائز کرتا تھا، لیکن دل ہی دل میں۔

''آ رہا ہوں یار! آ رہا ہوں۔'' دل آور گاڑی سے اُتر آیا۔ لیکن اس کے اُترنے کے بعد جیسے ہی زلفی کی نظر گاڑی کے اندر گئی دو ساکت اور مبہوت رہ گیا۔ وہ لڑکی تھی یا پھر سرتاپا حُسن کا مجسمہ؟ یا پھر ہوش رُبا قیامت؟ یا کسی ریاست کی شہزادی؟ یا..... یا پھر کوہ قاف کی راہ بھٹکی ہوئی پری؟ وہ جو کچھ بھی تھی دل آور شاہ نے اسے بڑی لاپروائی، بڑی بیدردی اور بڑی کمال بے نیازی سے اپنی گاڑی کی سیٹ پہ ڈال رکھا تھا۔

''گلاب خان! بیسمنٹ کا لاک کھول دو جا کر۔'' دل آور شاہ نے بیہوش پڑی علیزے کو گاڑی سے نکالتے ہوئے اپنا اگلا حکم جاری کیا۔

''بیسمنٹ.....؟'' گلاب خان ہچکچا، لیکن کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ تب ہی سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور دل آور شاہ اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ لیکن زلفی کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے تھے۔

''تو کیا صاحب اتنی خوبصورت لڑکی کو بیسمنٹ میں ڈالنے کے لیے لے کر آیا ہے۔'' زلفی کے ذہن میں آنے والا یہ سوال گل کے ذہن میں بھی آیا تھا۔ وہ کچن سے نکل کر دل آور شاہ کو سلام کرنے کے لیے سامنے آئی تھی لیکن اس کے حصار میں کسی بیہوش لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس لڑکی کا مکمل حُسن ان سب کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

''سلام صاحب!'' وہ بمشکل اسے سلام کر پائی تھی۔

''والسلام.....'' وہ اسے سنجیدگی سے جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پیچھے بیسمنٹ کے دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔

یہ بیسمنٹ نہیں علیزے آفندی کا قید خانہ تھا اور دل آور شاہ نے اس قید خانے میں آ کر علیزے کو بڑی بے رحمی سے اپنی بانہوں سے جھٹک دیا تھا۔ کسی انتہائی ناگوار بوجھ کی مانند..... اور یوں زور سے گرنے کی وجہ سے علیزے کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ جس پہ وہ بیہوشی کے باوجود کراہ اُٹھی تھی اور اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

''پاپا.....'' جیسے ہی اس کے ذہن میں سارا واقعہ تازہ ہوا اسے پہلا خیال وقار آفندی کا ہی آیا تھا۔

''ہونہہ پاپا.....'' وہ نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے سر جھٹک کر پلٹ گیا اور علیزے اس کے قدموں کی چاپ پہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی تھی۔ دل آور سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا۔

''ڈرائیور.....'' وہ اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھ کر چیخی۔

''ڈرائیور! ڈرائیور! میری بات سنو..... ڈرائیور پلیز۔'' علیزے نے چیختے ہوئے اسے روکنے کی اور خود زمین سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ دونوں کام ناکام ہو گئے تھے۔ نہ وہ خود اٹھ سکی تھی، نہ وہ رُکا تھا اور علیزے چیختی اور روتی بلکتی ہوئی رہ گئی۔ وہ بہت بلند آواز سے چیخ رہی تھی۔ لیکن یہاں سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چیختے ہی زندہ سلامت قبر میں اُتار دی گئی ہو اور اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کے لیے یہ قبر کھودی کس نے ہے؟ اگر پتا چل جاتا تو وہ واقعی مر جاتی۔

لیکن فی الحال وہ انجان تھی اور انجانے میں اور اندھیرے میں سر ٹکرا رہی تھی، باہر سب کے لیے صبح تھی، لیکن اس کے لیے ہر طرف رات ہو چکی تھی۔

♥

دل آور شاہ نے قید خانے کا دروازہ بند کر کے دروازے میں تالا ڈال دیا۔

اور اسی قید خانے کے دروازے میں تالا ڈالنے کے بعد واپس پلٹتے ہوئے دل آور شاہ کی چال بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس کی چال میں کیا کچھ نہیں تھا؟ فتح، شکستگی، سرشاری، اذیت، سرخروئی، ندامت، آزادی، لاچارگی یا پھر اعصاب پہ بوجھ کا احساس سب کچھ مل کر اس کی چال میں اُتر آیا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم کے کئی معنی تھے، کئی مفہوم تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے صوفے پہ آ کر بیٹھ گیا اور اپنا سر صوفے کی بیک سے ٹکا کر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کے گدی کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ ساری رات کی جاگی آنکھوں میں تھکن اور رتجگے کی جلن ہونے لگی تھی۔ حالانکہ پوری رات جاگ کر گزارنے کا تجربہ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن اس طرح کا جاگنا آنکھوں میں جلن چھوڑ گیا تھا۔

اگر اس ایک رات میں اس کی آنکھیں جل رہی تھیں تو پھر علیزے آفندی کی آنکھیں تو اس ایک رات میں کیا ہو رہی ہوں گی؟

''صاحب..... ناشتہ کریں گے؟'' اس کی بند آنکھوں کے پار زلفی کی آواز اُبھری تھی اور دل آور شاہ برسوں کی مسافت سے واپس پلٹ آیا۔

''ہوں..... کروں گا، لیکن اماں کے ساتھ، بس وہ لاہور پہنچنے ہی والی ہیں۔'' اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے صاحب! بتا دیتا ہوں گل باجی کو۔'' زلفی سر ہلا کر پلٹ گیا۔

''صاحب! میں نے سارا سامان کمرے میں پہنچا دیا ہے۔'' گلاب خان سیڑھیاں اُتر کر ڈرائنگ روم کی طرف آ گیا۔

''ہوں ٹھیک ہے اور وہاں تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہیں کیا تاکید کی تھی؟''

''جی صاحب! یاد ہے، بہت اچھے سے یاد ہے۔''

''زلفی اور گل کو بھی سمجھا دینا، میرے دوست، میرے کولیگز، میرے جاننے والے کبھی کوئی بھی آئے کسی کو بھی اس لڑکی کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے، آپ لوگوں کی کسی بھی حرکت سے یہ احساس نہ ہو کہ یہاں گل کے علاوہ کسی لڑکی کا کوئی وجود بھی ہے۔'' اس کی وارننگ واقعی وارننگ ہوتی تھی اور یہ بات اس کے سارے ملازم بخوبی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے۔

''جی صاحب! جو حکم۔'' گلاب خان نے سر خم کر دیا۔

''لو کے جاؤ اپنی ڈیوٹی سنبھالو، اماں پہنچنے والی ہی ہوں گی۔'' وہ اسے کہتے ہوئے خود صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر پہلے خود پہ غالب آ جانے والے تمام احساسات اور کیفیات کو پرے جھٹک دیا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے بوٹ اُتارے، اپنی جیبیں خالی کیں، گھڑی اُتار کر رکھی اور نئے پریس شدہ کپڑے لے کر شاور لینے کے لیے چلا گیا تھا، اپنے چہرے کو داڑھی سے آزاد کرنے کے لیے اس نے شیو کی، آفٹر شیو لگایا اور پھر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا تھا۔ منصور حسین والا رہا سہا چولا بھی اُتار پھینکا تھا۔ شاور لینے اور ڈریس اپ ہونے کے بعد وہ دل آور شاہ کی شاندار شخصیت کو پوری طرح سے اُجاگر کرتا ہوا نظر آیا تھا۔

وہی دل آور شاہ آن اور انا والا۔

وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی اپنی گھڑی اُٹھا کر اپنی مضبوط کلائی پہ باندھ رہا تھا۔ جب باہر گیٹ پہ بتول شاہ کی گاڑی کا ہارن

سنائی دیا اور گھڑی کا لاک بند کرتے ہوئے دل آور شاہ کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔

بائیس سال بعد بتول شاہ نے اپنے آبائی شہر لاہور میں قدم رکھا تھا اور بائیس سال بعد رکھے جانے والے اس قدم پہ لاہور کی زمین کا بھی کلیجہ شق ہو گیا تھا۔ دل آور شاہ کے ہاتھ کی طرح جیسے زمین بھی کانپ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ بتول شاہ کے دل سے اور دامن سے بندھا ہوا دکھ بہت عظیم اور اذیت ناک تھا۔ جس کا بوجھ صرف بتول شاہ سینے میں دبائے ہوئے پھر رہی تھیں۔ ورنہ یہ بوجھ تو زمین بھی نہیں سہار سکتی تھی جو انہوں نے سہارا ہوا تھا۔ ان کی ہمت اور ان کے حوصلے تو دل آور شاہ سے بھی کئی گنا بڑھ کے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک بہادر اور چٹان نما عورت تھیں۔ ان کی اتنی مضبوطی اور بہادری پہ تو دل آور شاہ بھی چند ثانیے کے لیے چپ ہو جاتا تھا۔

گاڑی کے ایک ہارن کے بعد دوسرے ہارن کی نوبت نہیں آئی تھی اور گیٹ کھل گیا تھا۔ اسی لیے دل آور ایک بار پھر اپنے ذہن سے سارے خیالات جھٹک کر بیڈ روم سے باہر آ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیڑھیاں بھی اُتر آیا۔ ان کے گاڑی سے اُترنے تک وہ گاڑی تک پہنچ چکا تھا۔

''السلام علیکم اماں.....'' اس نے بتول شاہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی سے اُترنے میں ہلکی سی مدد دی۔ اور بتول شاہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''میرے بچے، میرے جوان، جیتے رہو۔'' وہ اسے آغوش میں بھینچے ہوئے کافی گلوگیر لہجے میں بولیں اور ان کے دُکھ، ان کی اذیت پہ دل آور شاہ کا دل بھی بجھ گیا تھا۔ اس لمحے انہیں بابر شاہ کی یاد آ رہی تھی، کیونکہ اس لمحے انہیں بابر شاہ کی صورت دل آور شاہ میں نظر آ رہی تھی، انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے اس وقت بابر شاہ کھڑا تھا، سر اُٹھائے، سرخرو سا انداز لیے۔

''میں..... میں خوش نہیں ہوں اماں، میرے سینے کی آگ پہ ابھی..... بھی کوئی پانی نہیں پڑا، میں وقار آفندی کو زندہ چھوڑ آیا ہوں۔ مجھ سے..... مجھ سے یہ احساس برداشت نہیں ہو رہا کہ میں وقار آفندی کو زندہ چھوڑ آیا ہوں، وہ..... وہ ابھی تک جی رہا ہے؟ وہ سانس لے رہا ہے؟ وہ ابھی بھی زمین کے اندر نہیں، زمین سے باہر ہے، میں نے جب جب اسے دیکھا ہے، مر مر کے جیا ہوں، دل چاہتا تھا اپنے دونوں ریوالور اس کے سینے پہ خالی کر دوں، پرخچے اُڑا دوں وقار آفندی کے، مسمار کر دوں بڑی حویلی کو، ان کا بچہ بچہ زندہ درگور کر ڈالوں۔ یہ..... یہ علیزے آفندی میرے سینے کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے گی، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میرے اندر بھڑکتے شعلوں پہ اک بوند بھی نہیں ہے، یہ علیزے آفندی۔ میں پاگل ہو رہا ہوں اماں! میں بڑی حویلی والوں کو زندہ چھوڑ آیا ہوں۔''

دل آور شاہ کے اندر کا غبار انہیں دیکھتے ہی باہر اُمڈ آیا تھا اور بتول شاہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں سے تھپکے تھے۔

''غلط بھی ہے تمہاری..... کہ بڑی حویلی والے زندہ ہوں گے۔ ہونہہ..... ہو ہی نہیں سکتا..... مر چکے ہیں بڑی حویلی والے..... زندہ درگور ہو چکے ہیں اور وقار آفندی اب اپنی موت بھی مانگے گا تو رب سے اسے اپنی موت بھی نہیں ملے گی۔'' بتول شاہ اسے سمجھاتے ہوئے انتہائی نفرت اور حقارت سے بولی تھیں، ان کے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا۔

''لیکن میں اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا تاکہ حشر کے روز اپنے بابا کے سامنے سرخرو ہو پاتا کہ ان کا رہ جانے والا کام ان کے بیٹے نے کر دیا ہے۔'' دل آور شاہ کے لہجے میں عجیب سی اذیت اور عجیب سی شدت محسوس ہو رہی تھی۔

''بس کرو شاہ! میرے حوصلے بلند ہی رہنے دو، ورنہ تمہاری اماں ریت کی طرح بکھر جائے گی اور تم سمیٹ نہیں پاؤ گے۔'' بتول شاہ کے انداز میں تھکن اُتر آئی تھی اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی دل آور شاہ کو خود پہ کنٹرول کرنا پڑا اور ان کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے انہیں اپنے بازو کا سہارا دیے اندر آ گیا۔

''سلام بیگم صاحبہ.....'' گل بڑے احترام سے آگے بڑھی تھی۔

''والسلام! جیتی رہو۔'' انہوں نے اس کا سر تھپکا تھا۔

''السلام علیکم بیگم صاحبہ!'' زلفی بھی صوفے کی پچھلی سائیڈ سے نکل کر سامنے آ گیا۔

''والسلام! جیتے رہو، خوش رہو۔'' وہ کافی خوش مزاجی اور شفقت سے پیش آ رہی تھیں۔

''بیگم صاحبہ! کیا لیں گی آپ؟ میں کیا لے کر آؤں آپ کے لیے؟ آپ آج پہلی بار اپنے گھر آئی ہیں؟ آپ کو دیکھ کر، آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے ہمیں۔'' گل واقعی ان کی آمد پہ بہت خوش ہوئی تھی اور اس کی خوشی کا اظہار اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔

"مجھے بھی اپنے گھر آ کر اور تم لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے، اب آ گئی ہوں تو یہاں رہوں گی بھی اور تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے بھی کھاؤں گی۔" بتول شاہ نے بہت نرمی سے جواب دیا اور گل ان کی بات پہ خوش ہو گئی۔

"بہت شکریہ بیگم صاحب! مجھے تو آپ کے لیے کھانے بنا کر بھی بہت خوشی ہو گی، آپ یہاں ہی رہیں، ہم آپ کی خدمت کریں گے۔" دل آور شاہ نے ان کو بتایا تھا کہ گل بہت اچھی لڑکی ہے، سو بتول شاہ کو اس کے کہے پہ یقین آ گیا تھا۔ وہ واقعی اچھی لڑکی تھی، سمجھدار اور بردبار قسم کی۔

"صاحب! ناشتہ لگا دوں؟" وہ دل آور سے پوچھ رہی تھی۔

"ہوں..... لگا دو۔" اس کی اجازت ملتے ہی گل نے منٹوں میں ناشتہ لگا دیا اور وہ دونوں ماں، بیٹا ناشتہ کرنے بیٹھ گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان فی الحال خاموشی تھی اور اس خاموشی میں خلل نبیل حیات نے ڈالا تھا۔ اس کی کال آ گئی تھی۔ نبیل پر رکھے اس کے سیل پہ وائبریشن ہو رہی تھی اور دل آور نے نبیل کا نمبر بھی دیکھ چکا تھا۔

"کس کی کال ہے؟" بتول شاہ نے پوچھ ہی لیا۔

"نبیل کی....."

"ارے تو پھر ریسیو کرو نا۔" انہیں حیرانی ہوئی۔

"ہوں..... کرتا ہوں۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور سیل اٹھا کر کال ریسیو کر لی۔

"السلام علیکم۔" اس نے کافی سکون سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کہاں ہو؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم پندرہ کو واپس آ جاؤ گے۔" نبیل کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھے۔

"تو میں نے کب انکار کیا ہے کہ میں پندرہ کو واپس نہیں آ سکتا؟"

"تو پھر.....؟"

"تو پھر یہ کہ دراصل میں اس وقت اپنے گھر میں ہوں اور اماں کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کر رہا ہوں۔" دل آور نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اسے نبیل کے ری ایکشن کا پہلے سے اندازہ تھا۔

"کیا..... تم آ چکے ہو؟ تم ناشتہ کر رہے ہو..... اور تم نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔" نبیل تو جیسے دنگ رہ گیا۔

"یس یار! بھوک لگی ہوئی تھی، اس لیے سوچا کہ تمہارے آنے سے پہلے پیٹ پوجا کر لوں۔" دل آور نے اسے چھیڑا۔

"تو ٹھیک ہے پھر تم کھاؤ اور مرو، لیکن مجھ سے بات مت کرو۔" نبیل نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور دل آور بے ساختہ ہنس پڑا۔

"کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہا تھا نبیل؟"

"کہنا کیا ہے؟ بس گالیاں دے رہا ہے مجھے۔" دل آور ہنستے ہوئے دوبارہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نے اپنی واپسی کا اسے کیوں نہیں بتایا؟"

"ہاں تو بتا دیتے نا؟" انہوں نے نبیل کی سائیڈ لی۔

"اماں! کیسے بتا دیتا؟ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو آیا ہوں میں۔" وہ بھی درست کہہ رہا تھا۔ بتول شاہ سر ہلا کے رہ گئیں۔ اتنے میں نبیل کی کال دوبارہ آنے لگی۔

"اب اسے آپ کا خیال آیا ہے۔" دل آور نے پیشن گوئی کی۔

"السلام علیکم....." اس نے دوبارہ سلام کیا تھا۔

"تم نے کہا کہ تم اماں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر رہے ہو، تو اس کا مطلب ہے کہ آنٹی لاہور آئی ہوئی ہیں؟" نبیل کی ایرپیس سے سنائی دیتی آواز پہ بتول شاہ کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور دل آور یکدم قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے۔ تمہارے قہقہے سننے کے لیے نہیں۔" نبیل جل بھن گیا۔

"اوہ سوری سوری..... ہاں اماں لاہور آئی ہوئی ہیں، ابھی ابھی آئی ہیں ہم دونوں ماں، بیٹا تقریباً....." اس سے پہلے کہ دل

آذر کی بات مکمل ہوتی، نبیل نے پھر فون بند کر دیا تھا اور دل آور پھر ہنس دیا تھا۔

♥

وقار آفندی بیہوش تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ ان کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔

لیکن ان سے بھی زیادہ خراب حالت ان کی تھی جو ہوش میں تھے اور آئی سی یو کے باہر کھڑے تھے۔ بڑی حویلی کے ایک ایک فرد کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک چہرہ ایسا تھا جس پہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے خود مٹھیاں بھر بھر کے مٹی ڈال دی ہو اور اس مٹی کے ساتھ وہ چہرہ بھی مٹی ہو چلا تھا۔ وہ چہرہ وقار آفندی کا نہیں تھا۔ وہ چہرہ خون اور عدید کا بھی نہیں تھا۔ وہ چہرہ صرف اور صرف "آذر آفندی" کا تھا۔ جو پہلے قدم پہ ہی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا تھا اور چہرے کے سارے نقوش زخمی اور بدوضع ہو گئے تھے۔ جن کی اذیت اور درد اس کے دل میں ہی نہیں اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کسی سرطان کی طرح۔

"آذر! تم گھر چلے جاؤ۔" اس کی حالت ایسی تھی کہ دانیال کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا۔ جس پہ آذر نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا دانیال کو چپ ہونا پڑا۔ اس کی آنکھوں کا زخمی پن اور نظروں کی کاٹ دانیال کو خاموش کروانے کے لیے کافی تھیں۔

"ہاں دانیال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم گھر چلے جاؤ، تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی اور ویسے بھی حویلی میں اور کوئی نہیں ہے۔" اسرار آفندی نے بیٹے کی حالت کے پیش نظر اسے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن آذر کو کسی کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔ وہ ہسپتال کی راہداری میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھا نیچے چمکتے فرش پہ کسی نادیدہ نقطے کو پچھلے تین گھنٹے سے لگاتار گھورے جا رہا تھا۔ چہرہ مسلسل جھکا ہوا تھا۔ لب بھینچے ہوئے اور آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی۔ وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ کسی سے بات کرنے اور نظر ملانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بلکہ خودکشی کر لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ اتنی تذلیل کے بعد جینا بھی کوئی جینا تھا؟

آذر کے دل میں اُبال اُٹھ رہے تھے جن کو بھینچنے کے لیے وہ اپنے ہونٹ اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ باقی سب بھی کھڑے تھے۔ باقی سب بھی چپ تھے۔ باقی سب بھی پریشان تھے۔ لیکن جس طرح آذر اندر ہی اندر مر رہا تھا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ندیم اقبال باہر آ گئے اسرار آفندی اور اظہار آفندی کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی لپک کے ڈاکٹر کے قریب گئے۔

"ایم سوری مر! فی الحال ان کے بچنے کے چانسز بہت کم نظر آ رہے ہیں، کیونکہ ان پہ فالج کا شدید ترین اٹیک ہوا ہے۔ جس میں ان کا پورا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ اس لیے ان کا دل بند ہونے کا خطرہ ہے۔ کیونکہ لیفٹ سائیڈ پہ فالج کا اٹیک بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے اور ان کی لیفٹ سائیڈ بھی حد سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ ایسے کیسز میں مریض کے بچنے کے چانسز محض ناکین پرسنٹ ہوتے ہیں۔ اگر مسٹر وقار آفندی نیکسٹ فورٹی فور آورز میں اس اٹیک کو اپنی دل پاور پہ برداشت کر لیتے ہیں تو پھر ان کی زندگی کی کچھ اُمید کی جا سکتی ہے اور اُمید پہ تو دنیا قائم ہے۔ دعاؤں سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے، آپ سب ان کے لیے دعا کیجیے۔" ڈاکٹر ندیم اقبال کا کندھا تھپک کر ان کی ساعتوں پہ ایک اور بم گرا کر آگے بڑھ گئے تھے اور وہاں موجود تمام افراد دھواں دھواں ہو گئے تھے۔ سب کے سب دم بخود اور ششدر کھڑے تھے۔ یہ دن ان کے لیے کون کون سی قیامتیں لے کر طلوع ہوا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بڑی حویلی کے عروج کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ وقار آفندی کی تباہی بڑی حویلی کی تباہی تھی، ایک عظیم تباہی۔

♥

وہ ان میں بیٹھا بتول شاہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا جب اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی۔

"لگتا ہے آج سب کو خبر ہو چکی ہے؟" وہ سیل اُٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولا اور پھر اسکرین پہ نمبر دیکھا، جہاں نمبر کے بجائے انسپکٹر شہباز کا نام جگمگا رہا تھا۔

"السلام علیکم....." اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی اور بتول شاہ سے ایکسکیوز کر کے لان کی ایک سائیڈ پہ آ گیا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہیں شاہ جی؟" انسپکٹر شہباز کا لہجہ تھوڑا سنجیدہ اور بجھا بجھا سا تھا۔

"اللہ کا بڑا کرم، بڑا احسان ہے میڈم! لیکن کیا بات ہے آج شہر یاراں میں اس قدر اُداسیاں کیوں؟" دل آور اس کے لہجے کی سستی بھانپ چکا تھا۔

"شاہ جی! کہاں ہیں آپ؟ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں؟" انسپکٹر شہباز کی پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"کیوں..... خیریت؟"

"میں بہت پریشان ہوں شاہ جی۔"

"اللہ رحم کرے میڈم! آپ جیسے بہادر محافظ پریشان ہونے لگیں گے تو ہم جیسے شہریوں کا کیا بنے گا؟ دشمن نگل جائیں گے ہمیں....." دل آور نے اسے پریشانی سے نکالنے کے لیے کہا۔

"آگ لگے دشمن کو شاہ جی! آپ کی دھڑکنوں پہ تو ہماری نبض حرکت کرتی ہے۔" انسپکٹر شہباز کے بے ساختہ کہنے پہ دل آور بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ہوں..... اب لگا ہے کہ انسپکٹر شہباز ہی بات کر رہی ہیں۔" وہ خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر کب ملیں گے آپ؟"

"ارے میڈم! میں نے انکار کب کیا ہے؟ آپ جب چاہو بندہ ناچیز حاضر ہے۔"

"اچھا..... تو اس کا مطلب ہے کہ آپ واپس آ چکے ہیں کراچی سے؟"

"جی بالکل آ چکا ہوں۔"

"تو کیا میں آپ سے ملنے کے لیے آ سکتی ہوں؟" انسپکٹر شہباز کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"آ سکتی ہیں بالکل آ سکتی ہیں، گھر کے دروازے کھلے ہیں۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی! میں ابھی پہنچ رہی ہوں۔" انسپکٹر شہباز نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور اگلے دس منٹ میں وہ واقعی اس کے گھر کے گیٹ پہ پہنچ چکی تھی گلاب خان اسے پہچانتا تھا اس لیے فوراً گیٹ کھول دیا انسپکٹر شہباز کی گاڑی اندر روش پہ آ رکی۔ دل آور اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم۔" اس کے سامنے پہ دل آور نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ جبکہ انسپکٹر شہباز کی نظریں بتول شاہ پہ تھیں۔

"ان سے ملیے، یہ میری اماں جان ہیں، اور اماں جان یہ ہیں انسپکٹر شہباز، کرنل عبدالقیوم رضوی کی صاحبزادی....." دل آور نے بہت اچھے طریقے سے ان کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ بتول شاہ بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں کیونکہ انسپکٹر شہباز بھی انہی کی سمت بڑھی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" وہ آگے بڑھ کے ان سے گلے ملی تھی انہوں نے بھی شفقت سے گلے لگا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! میں ٹھیک ہوں، جیتی رہو، خوش رہو، بیٹھو یہاں۔" انہوں نے قریبی کرسی کی سمت اشارہ کیا۔

"تھینک یو آنٹی۔" وہ اس وقت یونیفارم کے بجائے پنک کلر کی خوبصورت اور نفیس سی ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کی پرسنالٹی بہت پُراثر لگ رہی تھی دل آور اسے ضرور سراہتا اگر بتول شاہ پاس نہ ہوتیں، کیونکہ وہ اپنی ماں کا بہت احترام اور عزت کرتا تھا اس لیے ان کے سامنے تو وہ مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

"شاہ جی! میں تو سمجھتی تھی کہ آپ ہی اپنے ماں باپ کا شاہکار ہیں، لیکن آنٹی کو دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ آپ کی پوری فیملی ہی شاہکار ہو گی۔" انسپکٹر شہباز نے بتول شاہ کی گریس فل پرسنالٹی اور خوبصورتی دیکھ کر دل میں آئی بات دل میں نہیں رکھی تھی لیکن اس کی بات پہ بتول شاہ کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرا گیا تھا جو دل آور کی نظروں سے چھپا ہوا نہیں رہ سکا تھا۔

"تھینک یو میڈم! یہ آپ کی نظر کا ذوق ہے، ورنہ آج کل شاہکاروں کی کمی نہیں ہے، خیر چھوڑیں اس بات کو آپ یہ بتائیں کہ آپ کس لیے اتنی پریشان تھیں کہ آپ کو اتنا ارجنٹ مجھ سے ملنا پڑا؟" دل آور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔

"وہ مجھے دراصل مومنہ بی بی کے سلسلے میں بات کرنا تھی۔" انسپکٹر شہباز بات کرتے ہوئے ہچکچا گئی اسے دل آور شاہ کو اپنی

کوتاہی کا بتاتے ہوئے شرمندگی ہو رہی تھی۔

"ہاں..... ہاں کہیے کیا بات ہے۔" انسپکٹر شہناز جھینپے والی نہیں تھی اسی لیے دل آور کو اس کی جھجک پہ حیرت اور اچنبھا ہو رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ انسپکٹر شہناز اپنی بات بتانا شروع کرتی اچانک گیٹ کھلا اور دو گاڑیاں آگے پیچھے اندر روش پہ آ رکی تھیں جن کو دیکھ کر دل آور فوراً کھڑا ہو گیا کیونکہ آنے والے اس کے عزیز از جان تھے..... مدیحہ اور نبیل.....

"بھائی....." مدیحہ بڑے والہانہ انداز میں قریب آئی اور دل آور کے کندھے سے لگ گئی۔

"آئی مس یو سو مچ بھائی۔" مدیحہ کے لہجے اور انداز سے محبت اپنائیت اور بے ساختگی جھلک رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح اتنے دنوں بعد ملنے پہ دل آور نے اپنی لاڈلی کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور اس کا سر تھپکا تھا۔

"آئی مس یو ٹو ڈارلنگ! آئی ریئلی مس یو۔" دل آور شاہ کے نرم اور پُرشفقت انداز پہ انسپکٹر شہناز اور بتول شاہ دیکھتی رہ گئی تھیں کیا یہ روپ بھی دل آور شاہ کا تھا؟ اتنا میٹھا کتنا شیریں کہ دیکھنے والی نظروں کے دل کو چھو گیا تھا بتول شاہ کی آنکھوں میں نمی جبکہ انسپکٹر شہناز کی آنکھوں میں رشک اتر آیا تھا۔

"ماں سے ملو۔" دل آور نے آبزرویشن سے کہتے ہوئے مدیحہ کو متوجہ کیا تھا۔

"اوہاں سوری! ہم انہی سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" وہ اپنی بے دھیانی پہ مسکراتی ہوئی بتول شاہ کی سمت آ گئی۔

"السلام علیکم مما!" وہ بڑی محبت سے کہتی ہوئی ان کے گلے لگ گئی۔ اور اس کے بعد کہیں نبیل کی باری آئی تھی۔

"میں یہاں صرف آپ کے لیے آیا ہوں، ورنہ یہ بے مروت اور ظالم شخص یہاں اکیلا ہوتا تو میں ہرگز نہ آتا۔" نبیل نے اپنی آمد کا مقصد فوراً ہی ظاہر کر دیا۔

"تم نہ بھی بتاؤ تو انہیں پتا ہے کہ تم ان کے لیے ہی آئے ہو، میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" دل آور نے مداخلت کی۔

"یہی تو تمہاری چالاکیاں ہیں۔" نبیل جل کر بولا تھا جس پہ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

انسپکٹر شہناز بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک پائی تھی۔

"انسپکٹر شہناز! ان سے ملیے یہ میرا بہت اچھا دوست، میرا جگر، میری جان نبیل حیات ہے، اس کی دوستی کے بغیر دل آور شاہ کچھ نہیں ہے۔" دل آور نے خفا خفا سے نبیل حیات کا تعارف بہت دل سے کروایا تھا۔

"اور یہ میری اکلوتی لاڈلی بہن ہے مدیحہ حیات۔" اس نے قریب کھڑی مدیحہ کا ایک بار پھر سر تھپکا تھا اور پھر انسپکٹر شہناز کا تعارف بھی کروایا۔ وہ سب ہی آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور خوش تو آج بتول شاہ بھی بہت زیادہ تھیں ان کے بیٹے نے آج بائیس سال بعد انہیں لاہور کی زمین پہ قدم رکھنے کے قابل کر دیا تھا۔

"بیٹا! تم لوگوں کی باتوں کا نائم اسٹارٹ ہو رہا ہے تم باتیں کرو، میں تمہارے لیے چائے بھجوا کر نماز پڑھ لوں، ظہر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" بتول شاہ نبیل کا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"لیکن جلدی آیئے گا، ہم آپ کے لیے ہی آئے ہیں۔" مدیحہ نے انہیں تاکید کی تھی۔

"اچھا بیٹا! نماز پڑھ کے آتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا گال سہلا کر اندر چلی گئیں۔ اور دل آور دوبارہ سے انسپکٹر شہناز کی سمت متوجہ ہو چکا تھا کیونکہ انسپکٹر شہناز کی بے چینی اسے واضح محسوس ہو رہی تھی۔

"جی میڈم! آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟ شاید مومنہ بی بی کے بارے میں۔" اس کے استفسار پہ انسپکٹر شہناز نے نبیل حیات اور مدیحہ کی طرف دیکھا تھا اور دل آور اس کے دیکھنے کا مفہوم بھی سمجھ گیا تھا۔

"ارے نہیں..... نہیں میڈم! ڈونٹ وری..... آپ بے فکر رہیں۔ جو بات کہنی ہے کھل کے کہیے؟" دل آور شاہ کی تسلی پہ انسپکٹر شہناز قدرے ریلیکس ہو گئی۔

"سوری سر! کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے اعتباری پہ آ جاتا ہے پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔" انسپکٹر شہناز نے نبیل سے معذرت کی تھی۔

"جی میڈم! سمجھ سکتا ہوں میں، آپ بے فکر ہو کر اپنا مسئلہ ڈسکس کر سکتی ہیں۔" نبیل نے کافی سنجیدگی اور تحمل سے جواب دیا۔

"تھینک یو۔" وہ نبیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دل آور کی سمت متوجہ ہوئی۔

''شاہ جی! وہ دراصل ملک حق نواز، مومنہ بی بی کی بُو سونگھتا ہوا میرے گھر تک پہنچ گیا تھا، اسے خبر ہو چکی تھی کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے اس لیے وہ کل صبح میرے گھر آ گیا تھا۔'' انسپکٹر شہباز کی بات پہ دل آور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

''تو پھر بچ کے نکل گیا۔''

''تو اور کیا کر سکتی تھی شاہ جی! میرے گھر میں اس وقت مومنہ بی بی موجود تھی میرے ذرا سے غصے اور ری ایکشن پہ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، مومنہ بی بی کو جان سے مارنا مشکل نہیں ہے اس کے لیے، اسے اگر بھنک بھی پڑ جاتی کہ وہ یہاں ہے تو اس وقت یقیناً سچویشن کچھ اور ہوتی۔ وہ تو میں تھی جس نے اس کے سامنے اعتماد کا دامن نہیں چھوڑا اور اسے صاف کہہ دیا کہ میرے گھر کی تلاشی لے لے، جس پہ وہ تھوڑا دھیما پڑ گیا اور اس کا یقین شک میں تبدیل ہو گیا کہ شاید اس کے پاس اطلاع غلط پہنچی ہو گی، حالانکہ اس کو ملنے والی اطلاع ہنڈرڈ پرسنٹ درست تھی وہ بالکل ٹھیک جگہ پہ پہنچا تھا اور اس کا یہ پہنچنا خطرے سے خالی نہیں جا سکتا تھا اگر میں نہ ہوتی..... لیکن شاہ جی! سب کچھ کور کر لینے کے باوجود ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔'' انسپکٹر شہباز پھر دھیمی پڑ گئی تھی۔

''کیسا مسئلہ.....؟'' دل آور کی سنجیدگی مزید پختہ تھی۔

''میں ڈیوٹی پہ تھی، امی اور ابی جان گھر پہ تھے لیکن انہیں پتا ہی نہیں چلا اور مومنہ بی بی انہیں بتائے بغیر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے یہ تحریر چھوڑ گئی تھی۔'' اس نے رقعہ نکال کر دل آور کی سمت بڑھا دیا تھا، جس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

''میں نے کل شام سے اب تک اسے بہت ڈھونڈا ہے، ساری رات سڑکوں پہ گزار دی لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملی۔'' انسپکٹر شہباز متفکر ہو رہی تھی اور دل آور سب بھینچے اس کی تحریر پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''نیروی رنگ کا سوٹ اور کالے رنگ کی چادر میں ملبوس تھیں۔'' نبیل کی لب کشائی پہ دل آور اور انسپکٹر شہباز نے یکدم چونک کر دیکھا۔

''آپ کو کیسے پتا نبیل صاحب؟''

''کیونکہ وہ مومنہ بی بی کل رات میری گاڑی سے ٹکرائی تھیں۔'' نبیل کے انداز میں اطمینان تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اب کہاں ہے وہ؟'' انسپکٹر شہباز کو بے چینی ہو چکی تھی وہ نبیل کی سمت بے صبری سے دیکھ رہی تھی۔

''اب وہ وہاں ہیں جہاں کوئی ملک حق نواز نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے مومنہ بی بی کو پورا پورا تحفظ کا وعدہ کیا ہے اور وہ میرے گھر میں ہی رہیں گی اور ان کی ہر ذمہ داری میں پوری کروں گا۔'' نبیل کہہ رہا تھا اور دل آور اسے ناسمجھی سے دیکھ رہا تھا کہ نبیل نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کیونکہ یہ فیصلہ کوئی عام اور معمولی فیصلہ نہیں تھا اور دل آور کے اس طرح دیکھنے پہ نبیل اسے کیا بتاتا کہ اس نے اپنے ضمیر پہ رکھے ایک بوجھ کو کم کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے، ایک ایسا بوجھ جو اس نے خود نہیں اس کے باپ نے اس کے ضمیر پہ ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے مدیحہ بھی اکثر روتی اور تڑپتی ہوئی بولائی بولائی پھرتی تھی۔

نبیل کو اپنے باپ کے کرتوتوں کا اندازہ تھا لیکن وہ ان کا مداوا نہیں کر سکتا تھا لیکن اب جب ایک ایسی لڑکی سامنے آ کھڑی ہوئی تھی جسے ان کے سہارے کی ضرورت تھی، جو ان کے باپ جیسے انسان کی ڈسی ہوئی تھی تو پھر وہ اسے سہارا کیوں نہ دیتا؟ کیوں مداوا نہ کرتا؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی پہ بیتی ساری حقیقت جان لینے کے بعد اس سے نظریں چرا لیتا۔ اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتا تو مدیحہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہی بوجھ مدیحہ کے ضمیر پہ بھی تو تھا۔ انتہائی ذہنی اور انتہائی اذیت ناک، جس کو تھوڑا سا کم کرنے کے لیے نبیل نے زندگی میں پہلی بار ایسا فیصلہ کر لیا تھا، جس میں کسی کی بھی پسند نہیں پوچھی تھی اور کسی سے مشورہ بھی نہیں مانگا تھا، اور اس کے اس فیصلے پہ مدیحہ کے سوا شاید اور کوئی خوش بھی نہیں تھا لیکن نبیل کو اس معاملے میں کسی کی خوشی کی پروا نہیں تھی، اسے پتا تھا کہ سب کا ردعمل وقتی ہو گا، اور وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔ اسی لیے وہ مطمئن تھا۔

''کیا بات ہے؟ تمہیں میرا فیصلہ اچھا نہیں لگا۔'' نبیل نے دل آور کو ٹٹولا۔

''بُرا کیوں لگے گا بھلا؟'' دل آور نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

''تو پھر خاموش کیوں ہو؟''

''میرا اور انسپکٹر شہباز کا مسئلہ تمہارے گھر پہنچ جانے پہ خاموش ہوں، اللہ انسان کو ٹھوکروں سے اُٹھا کر ٹھکانے پہ بھی پہنچا دیتا ہے اور ہم تم جیسے لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔'' دل آور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے پشت کرسی کی ٹیک سے لگا دی۔

''اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے، شاید کہ اس کام میں بھی ہو؟'' نبیل سکون سے کہہ رہا تھا۔

''بالکل ہوگی ضرور ہوگی بس اور اک بعد میں ہوتا ہے، جیسے اللہ کے اس کام میں مصلحت تھی کہ میں اس وقت شاہ جی سے ملنے ان کے گھر پہ آؤں اور وہاں آپ سے بھی ملاقات ہو اور آپ میری رات بھر کی پریشانی کو ایک پل میں دور کر دیں، اسی کو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کہتے ہیں، سبحان اللہ۔'' انسپکٹر شہباز نے صدق دل سے کہا تھا اور وہ تینوں بھی اتفاق کرتے ہوئے سبحان اللہ کہہ چکے تھے۔

نبیل میں گل چائے اور دیگر لوازمات لے کر حاضر ہو چکی تھی، نومبر کا مہینہ تھا، موسم بہت ہلکا پھلکا اور خوشگوار ہو رہا تھا دل آور نے اپنے مہمانوں کو آج خوب کمپنی دی تھی جس پہ انسپکٹر شہباز بھی بہت خوش تھی اور نبیل بھی بہت فریش نظر آ رہا تھا۔ پھر شام ڈھلے وہ لوگ وہاں سے اُٹھ کر واپس آ گئے تھے۔

♥

اس ڈسمنٹ کے گھر کے تاریک ماحول میں اس کی جان سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر کسی دیوار سے ٹیوب لائٹ کا بٹن ٹٹول کر لائٹ ہی آن کر لیتی، وہ اسے جہاں پھینک کر گیا تھا وہ صبح سے وہیں بیٹھی رو رہی تھی وہ جب بھی گھٹنوں سے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتی اسے اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ پھر سے گھٹنوں پہ چہرہ چھپا لیتی، رو رو کر اس کا حشر ہو چکا تھا، وقار آفندی کی لاپروائی کی آنکھیں آنسوؤں سے زخمی ہو رہی تھیں، مسلسل رو رہی تھیں اور وقار آفندی کو خبر ہی نہیں تھی وہ ہسپتال میں خود سے بھی بے خبر پڑے تھے۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کی علیزے پہ کیا بیت رہی ہے؟ رات بہت گہری ہو چکی تھی جب ہلکی سی آہٹ سے ڈسمنٹ کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

''ڈرائیور۔'' علیزے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اور آنے والے نے دروازے کے قریب ہی نصب کی سوئچ سے لائٹس جلا دی تھیں اتنے اندھیرے سے یکدم اتنی تیز روشنی ہو جانے پہ علیزے کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

''یہ کھانا کھا لیں بی بی جی۔'' یہ آواز اس کے ڈرائیور کی نہیں بلکہ گلاب خان کی تھی۔

''تت..... تم..... تم..... کون ہو؟'' علیزے کے پورے جسم میں نقاہت ہو رہی تھی۔

''میں صاحب کا ملازم ہوں، چوکیدار ہوں بی بی جی۔'' گلاب خان نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

''وہ..... وہ..... خود کہاں ہے، بلاؤ اسے۔'' علیزے کے بھیگے بھیگے لہجے میں وہی مالکوں والا رُعب در آیا تھا۔

''وہ نہیں آ سکتے بی بی جی! وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہیں اور کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ سگریٹ بھی بہت پی رہے ہیں۔'' گلاب خان نے اسے اس کی کیفیات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن علیزے پتا نہیں کیوں اور کیسے اتنی سرکش ہو رہی تھی کہ اپنی ہی کہے گئی۔

''میں کچھ نہیں جانتی وہ جہاں بھی ہے جس حالت میں بھی ہے اسے کہو وہ یہاں آئے۔ وہ مجھے میرا گناہ بتائے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سزا کس گناہ کے بارے میں دی جا رہی ہے مجھے؟'' وہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی۔ حالانکہ وہ دن بھر رونے کی وجہ سے بے حد نڈھال ہو رہی تھی۔

''بی بی جی! آپ میرا ایک مشورہ مانیں، آپ نے جو بھی کہنا ہے، کل صبح کہہ لیجیے گا، ابھی رہنے دیں، ابھی مت چھیڑیں۔'' گلاب خان نے بہتیرا روکا تھا اسے لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ خود یہاں آئے اور مجبوراً گلاب خان پیغام لے کر اس کے سامنے پہنچ گیا تھا جسے سن کر دل آور شاہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ، کام کرو، میں جاتا ہوں اس کے پاس۔'' دل آور نے نبیل کے قریب آ کر انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ ذرا سا جھٹکتے ہوئے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ اور پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے لب بھینچ کر کمرے سے نکل آیا۔

''شاہ..... زکو بیٹا۔'' بتول شاہ نے اسے سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس کے عزائم بھی بھانپ لیے تھے کیونکہ اس کے تیور بہت خطرناک ہو رہے تھے، لیکن وہ ان کے روکنے پر بھی نہیں رُکا تھا اور اگلے چند سیکنڈز میں وہ عین علیزے آفندی کے سامنے کھڑا تھا۔

علیزے ایک پل کے لیے ٹھٹک سی گئی وہ اسے دیکھ کر پہچان نہیں پائی تھی کیونکہ وہ اپنے چہرے کی داڑھی وغیرہ صاف کر چکا تھا اس کا پُرکشش چہرہ تیکھے کاٹ دار نقوش واضح ہو چکے تھے اب وہ مکمل دل آور شاہ کے روپ میں تھا اور وہاں اب منصور حسین کا شائبہ

تک نہیں تھا، وہ اس کے سامنے کھڑا ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور علیزے اس کی آنکھوں کے غضب سے نہ جانے کیسے بے خوف اور نڈر ہو گئی تھی۔

''کھانا بھیجا تھا، کھایا تم نے.....؟'' اس کا لہجہ تھا یا برف، علیزے ٹھٹھری تھی لیکن سہہ گئی۔

''نہیں کھاؤں گی۔'' ہٹ دھرم سا جواب موصول ہوا۔

''کیوں نہیں کھاؤ گی؟ کیا وجہ ہے آخر؟'' اس کے لفظ بے حد نپے تلے سے تھے۔

''اس لیے کہ تم مجھے زبردستی یہاں لے کر آئے ہو، تم نے مجھے یرغمال بنایا ہے، تم نے مجھ سے ناٹک کروایا ہے، جھوٹ بلوایا ہے مجھ سے، دھوکا دیا ہے مجھے اور میرے گھر والوں کو ڈرامہ کیا ہے تم نے۔ کیوں آخر کیوں؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں لے کر آئے ہو مجھے یہاں؟ آخر کیا گناہ ہے میرا؟'' وہ یکدم پھٹ پڑی تھی اور دل آور لب بھینچے اس کی سمت خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جس پہ علیزے اور بھی جذباتی ہو گئی اور آنسو تواتر سے بہہ نکلے تھے۔

''بولو..... تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ تم نے یہ سب کیوں کیا ہے آخر؟'' وہ روتے بلکتے ہوئے چیخی تھی جس پہ دل آور کا پارہ بھی ہائی ہو گیا تھا۔

''تڑاخ.....'' اس کے بھاری مضبوط ہاتھ کا تھپڑ علیزے آفندی کا دماغی نظام درہم برہم کر گیا تھا وہ توازن نہیں رکھ پائی تھی۔ سیدھی فرش پہ جا گری تھی۔

''یہ مجھ سے نہیں اپنے اس نکمے باپ سے پوچھو، جس نے مجھے آٹھ سال کی عمر میں لاوارث کر کے اس شہر سے نکلنے پہ مجبور کر دیا تھا، آٹھ سال کی عمر سے تمہارے باپ کا دیا ہوا ناسور سینے میں لیے پھر رہا ہوں اس ناسور کو پکنے میں بائیس سال لگے ہیں علیزے آفندی! بائیس سال اور بائیس سال میرے اندر یہ زہر پھیلا ہے۔ میرے جسم کی رنگت سفید سہی لیکن میرے دل کی رنگت نیلو نیل ہو رہی ہے، میرا سینہ اندر سے سیاہ ہے اور یہ سیاہی تمہارے باپ نے بخشی ہے، میں دل آور شاہ دنیا کے لیے ایک آئیڈیل شخصیت سہی لیکن اندر سے میں خاک ہوں خاک..... اور میں نے قسم کھائی ہے وقار آفندی کو بھی خاک میں ملا کر چھوڑوں گا، جیتے جاگتے اسے خاک میں ملا دوں گا یہ میرا میری ماں سے عہد ہے اور تمہیں یہاں لانا میرے عہد کا پہلا مرحلہ ہے، تم سمجھ ہی ہو سوچ سکتی ہو کہ اس وقت وقار آفندی کا کیا حال ہو گا جب اسے یہ پتا چلے گا کہ اس کی بیٹی دل آور کے پاس بغیر نکاح کے رہ کے آئی ہے، جس کا کوئی نکاح نہیں ہوا تھا، سب کچھ جعلی تھا، جھوٹ تھا، صرف وقتی طور پہ سب کو دکھانے کے لیے وہ جعلی نکاح نامہ تیار کروایا تھا تاکہ کوئی بھی اس کام میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

تمہارے باپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر میں منصور حسین کے نام سے شناختی کارڈ اور لائسنس بنوا سکتا ہوں تو نکاح نامہ بھی بنوا سکتا ہوں، تمہیں بغیر نکاح کے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں، تمہیں برت سکتا ہوں، تمہیں عرش سے اٹھا کر فرش پہ پٹخ سکتا ہوں، یہ سب باتیں تمہارا باپ کبھی نہیں سوچے گا کیونکہ اسے دل آور شاہ کے نام کی تکرار سے ہی فرصت نہیں ملے گی اور اگر ملے گی تو مر جائے گا۔ اس سوچ سے ہی مر جائے گا کہ اس کی علیزے، دل آور شاہ کی دسترس میں ہے اور اگر وہ اس سوچ سے بھی نہیں مرا تو میں تمہیں اس کے پاس بھیج کر مار دوں گا، وہ جب اپنی کنواری بیٹی کی واپسی کا حال دیکھے گا تو کیا کرے گا؟ یہ بھی سوچ لو تم..... تمہارے باپ کو مارنے کے بہت ہتھیار ہیں میرے پاس، اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کون سا ہتھیار فائدہ مند رہے گا؟

میں اگر چاہتا تو تمہیں کنڈیپ بھی کروا سکتا تھا بڑی آسانی سے، مگر کنڈیپ کرنے میں وہ مزا نہیں تھا جو تمہیں سب کے سامنے لے آنے میں تھا سو میں نے ایسا ہی کیا اور تم جانتی ہو میں کیا کیا کر سکتا ہوں؟ میری رسائی کہاں تک ہے؟ تم سے بہتر تو کوئی بھی نہیں جان سکتا جان ڈرائیور۔'' اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے علیزے کا بازو دبوچا اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا اس کے پھول سے چہرے پہ انگلیوں کے نشان ثبت تھے اور جہاں جہاں انگلیوں کے نشان ثبت تھے وہاں وہاں سے رخسار ابھر آیا تھا وہ سب کچھ جاننے کے باوجود اسے پتھرائی ہوئی اور ششدر سی دیکھ رہی تھی دل آور شاہ زہر اگل رہا تھا ایک ایسا زہر جو اب علیزے کا جسم نیلا کر رہا تھا۔

''لیکن اس سارے قصے میں مجھے بڑی تکلیف ہوئی ہے، بہت اذیت محسوس کر رہا ہوں، وقار آفندی کی بیٹی کو اپنی بیوی ظاہر کر کے خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں، اپنے مقام سے بہت نیچے آ گیا ہوں میں، مجھے یہ کب زیب دیتا تھا کہ جھوٹ میں ہی سہی مگر وقار آفندی کی بیٹی کو بیوی کا لقب دوں۔ سچ پوچھو تو بڑی توہین ہوئی ہے میری۔''

وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے چبا چبا کر کہہ رہا تھا اور علیزے کو اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی ایسی نفرت ایسی بے رُخی اور ایسی سفاکی کا عالم اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ پکار رہی تھی لیکن یونہی پکارتے سر کے ساتھ اس کی نظر اٹھی اور وسعت کی سیڑھیوں پہ کھڑی بتول شاہ پہ ٹھہر گئی تب ہی اس کے دیکھنے کے انداز پہ اس کی نظروں کے تعاقب میں دل آور نے بھی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور وہیں منجمد ہو گیا۔ دل پہ ایک عجیب حالت آن وارد ہوئی تھی۔

♥

یہ کیسا مقام تھا اس کی زندگی میں۔

اس کے ایک طرف بتول شاہ کھڑی تھیں اور ایک طرف علیزے آخندی۔

ایک کی طرف دیکھتا تو مر جاتا، ایک کی طرف دیکھتا تو مار دیتا۔

گویا اذیت اس کے دونوں طرف تھی؟ وہ کچھ کہنے اور کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فی الحال البتہ ان دونوں کی کیفیات اور تاثرات اس سے بالکل مختلف تھے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے انجانی، ناسمجھ اور خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ علیزے کو دیکھتے ہوئے بتول شاہ کی آنکھیں پتھریلی ہو گئی تھیں۔

ان کے چہرے پہ بائیس سال رقم تھے اور ان بائیس سالوں میں ایسا کچھ تھا جس کا کرب ناک احساس زہر کی طرح ان کی رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔ علیزے کی دلکش سی صورت ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھی اور ان کی پتھریلی سپاٹ آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس جلن سے ان کی آنکھیں سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ نمکین پانیوں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھنچے، مضبوط قدموں پہ کھڑی وہ صبر و ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی تھیں، یہ ان کا اللہ جانتا تھا یا پھر دل آور شاہ۔

لیکن اس سے پہلے کہ ان کے صبر کا پیمانہ چھلکتا اور وہ یہاں بائیس سالوں کی اذیت بچھا دیتیں، انہوں نے ایک بار پھر اپنے اندر کے غضب کو پچھلا اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔ یہاں ٹھہرنا ان کے اختیار سے باہر بھی ہو سکتا تھا، جبکہ وہ اپنے اختیار سے باہر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس لیے ان کا مڑ جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن وہ وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکھڑا سی گئیں وہ گرنے کو تھیں، لیکن بروقت دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"اماں..... " دل آور شاہ نے بے ساختہ تڑپ کے پکارا اور ایک دم علیزے کا بازو جھٹک کر ان کے پیچھے لپکا۔

"اماں..... پلیز رُکیں۔" لیکن وہ علیزے آخندی کی صورت دیکھنے کا عذاب دل پہ لیے وسعت کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں اور دل آور کے پہنچنے تک وہ اپنے بیڈ روم میں بند ہو چکی تھیں اور وہ ان کے بیڈ روم تک آ کر بھی بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ اس وقت بتول شاہ پہ کیا گزر رہی تھی وہ سب جانتا تھا۔ اسی لیے وہ دروازے پہ دستک دے کر انہیں مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا اور یونہی عجیب تھکے تھکے قدموں سے آ کر لاؤنج کے صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ وہ بند دروازے کے پار بتول شاہ کے گرنے والے آنسو اپنی روح پہ گرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا اور اس کی روح پہ بتول شاہ کے آنسوؤں سے آبلے پڑتے تھے، جن کی تکلیف دل آور شاہ کا رواں رواں تڑپا رہی تھی۔

"گلاب خان..... گلاب خان۔" وہ مٹھیاں بھینچے ہوئے دھاڑا۔

"جی صاحب! حاضر ہوں۔" وہ فوراً سامنے آ کھڑا ہوا۔

"بند کرو وسعت کا دروازہ اور تالا ڈال کے چابی کہیں دور پھینک دو۔" وہ شدت غضب سے کہہ رہا تھا اور گلاب خان کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں لیکن وہ اس کے غصے اور غضب کے پیش نظر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتا تھا کہ چابی کہاں پھینکے؟ لیکن پھر بھی گلاب خان دل میں افسوس لیے وسعت کا دروازہ بند کرنے چلا آیا تھا اور علیزے کے قید خانے کو ایک بار پھر تالا مار دیا گیا تھا۔

♥

"منصور حسین کے ساتھ اس کا چکر آج سے نہیں بہت پہلے سے چل رہا تھا۔" کومل کے زہر خند لہجے پہ آذر نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور کومل کا دل ٹھنڈک سے بھر گیا تھا۔

"کومل....." ثمرہ بیگم نے بیٹی کو سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا۔

''سوری گی! یہ صرف میرے منہ کی بات نہیں ہے۔ اس کا ایک منظر تو عائشہ پھوپھو بھی دیکھ چکی ہیں۔'' کومل نے سب کے چونکنے اور دیکھنے پہ بڑے سکون سے عائشہ آفندی کی سمت دیکھا جو بڑی حویلی کی بربادی پہ ماتم کناں سی بیٹھی تھیں اور وقار آفندی کو ملنے والے دکھ اور اذیت پر رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''بتایئے نا پھوپھو! وہ منظر جب مری میں ایک روز فجر کے وقت محترمہ علیزے بی بی کو اپنے ڈرائیور منصور حسین کے بیڈروم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ علیزے نے وہ رات منصور حسین کے بیڈروم میں ہی گزاری تھی۔ کیونکہ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔'' کومل نے جیسے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی تھی لیکن عائشہ آفندی کا ذہن پے در پے ملنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ٹھکانے پہ نہیں تھا وہ کومل کی اتنی سنگین اور گھٹیا بات کا مفہوم سمجھتیں یا پھر علیزے کے دفاع میں کچھ بولتیں۔ بلکہ انہوں نے تو شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے چپ کی چپ بیٹھی رہیں اور ان کی چپ پہ آذر کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے ایسی بات سن کر ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ احمد، حماد اور زین وغیرہ کی گردنیں اور نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن ان سب کے درمیان ایک فرد ایسا تھا جس کا دل یہ سب ماننے سے انکاری تھا۔

''علیزے ایسی نہیں تھی۔'' یہ مضبوط لہجہ اور دھونی دانیال کا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی بیک وقت دانیال کی سمت دیکھا تھا۔

''کوئی کچھ بھی کہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علیزے ایسی نہیں تھی۔ وہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے علیزے کی پاکیزگی پہ اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنے اللہ کے ہونے پہ یقین ہے۔'' دانیال مضبوط لب و لہجے میں بولتے ہوئے ان سب کی سوچوں کو ڈانواں ڈول کر گیا تھا۔

''یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں یا پھر علیزے پہ الزام لگا رہی ہوں۔'' کومل نے ناگواری سے کہا۔

''کبھی کبھی انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات بھی آ جاتے ہیں جو الزام نہ ہوتے ہوئے بھی الزام بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو؟ ورنہ میری نظر میں تو وہ اب بھی پاک اور صاف ہے، ہر غلطی اور گناہ سے دھلی ہوئی۔'' دانیال اب بھی علیزے کے خلاف نہیں اس کے حق میں تھا۔ اس کا یقین دیکھ کر آذر ہونٹ بھینچ کے رخ پھیر گیا۔

''میں علیزے پہ الزام لگا سکتی ہوں، لیکن آپ کی ماں تو علیزے پہ الزام نہیں لگا سکتی نا؟''

''جس روز میری ماں نے علیزے پہ الزام لگایا اس روز سمجھ لیجیے گا کہ انہوں نے الزام لگا دیا، کیونکہ ایک ماں اپنی بیٹی پہ کبھی الزام نہیں لگا سکتی۔'' کومل کی باتیں دانیال پہ اثر نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ علیزے کے حوالے سے اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔

''کیا اس طرح کرنے سے حقیقت چھپ جائے گی؟'' وہ طنزیہ ہوئی تھی۔

''تو کیا آپ اس طرح کر کے افسانہ بنائیں گی؟'' جواب دو بدو تھا۔

''آپ اسے غلط کہنے کے بجائے اتنا مجھے غلط کہہ رہے ہیں؟'' کومل کے چہرے سے ہلکا غصہ جھلک رہا تھا۔

''کیونکہ وہ غلط ہے یا نہیں ہے، لیکن آپ اسے غلط ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں۔ اس لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب ثابت کر کے کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟'' دانیال کے سوال پہ کومل سٹپٹا گئی۔ لیکن اپنے محاذ سے ہٹی نہیں۔

''میں یہ ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا دھرا علیزے کا ہے۔ اس کا چکر بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ منصور حسین کا یہاں آنا ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ انہوں نے ہم سب کو بیوقوف بنایا تھا۔ آپ کی نظر میں وہ جتنی پاکیزہ اور شفاف ہے، حقیقت میں وہ اتنی پاکیزہ اور شفاف نہیں ہے۔ اس کی پہلے سے ہی منصور حسین کے ساتھ کنٹنٹ تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم لوگ جب مری میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے تو علیزے گھنٹوں کا بہانا بنا کر بنگلے پہ ہی رک جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے نام نہاد ڈرائیور منصور حسین کو بھی بنگلے پہ ہی رکنا پڑتا تھا۔ اب ہمارے پیچھے بنگلے پہ کیا ہوتا تھا؟ یہ ہمیں کب پتا تھا؟ لیکن سچ کہتے ہیں ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہتیں۔ اک نہ اک دن سامنے آ جاتی ہیں اور دیکھ لیجیے اب تو سب کے سامنے آ گیا ہے سب کچھ..... اب تو کوئی شک اور شبہ بھی نہیں رہا..... آپ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے منصور حسین کا ہاتھ پکڑ کے چلی گئی ہے۔ کیا یہ بھی میرا الزام ہے؟ ہونہہ..... یہ کیوں

نہیں کہتے کہ آج بڑی حویلی کی بربادی اور رسوائی علیزے بی بی کی بے جا ڈاور پیار کا نتیجہ ہے۔ اب اس اکیلی کے کیے کا بھگتنا پوری حویلی کو بھگتنا پڑے گا۔ لوگوں کی باتوں اور انگلیوں کا نشانہ سب کو بننا پڑے گا۔ سب کی نظر جھکے گی، سب کا سر نیچا ہوگا، کیونکہ اس نے سب کی غیرت کا جنازہ نکالا ہے۔ اس لیے ماتم بھی تو سب نے کرنا ہے؟

اپنے آپ کو اور باقی گھر والوں کو محض جھوٹی تسلیاں دینے اور قیافے لگانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ ...ت کالا کر گئی ہے منصور حسین کے ساتھ جو نہ جانے کب سے اس کا عاشق تھا اور اس کے عشق میں یہیں بدل کر بھی آ گیا۔'' ماحول ...لے کی طرح گرم تھا۔ اس لیے کہ کوہل کے الفاظ کی ضربیں سب کے ذہنوں کے کس بل نکال سکتی تھیں۔ سو اس نے یہ ضربیں لگانے ...ں دل کھول کے نشتر نما الفاظ کا استعمال کیا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ٹھہری تھی۔

وہاں موجود سننے والے افراد کے ذہن کسی نہ کسی حد تک پراگندہ ہو ہی چکے تھے اور وہ ان سب کو اس حد تک متنفر کر دینا چاہتی ...ی کہ وہ سب مل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیزے پہ بڑی حویلی کے دروازے بند کر دیتے، اگر کبھی خدانخواستہ وہ بھولی بھٹکی آ بھی جاتی ...اسے یہاں کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ بلکہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جاتا اور اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سب ...کے سامنے بڑھ چڑھ کے بول رہی تھی اور اسے اب کسی کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔ جن کا ڈر تھا وہ ہسپتال کے بستر پہ بیہوش اور لاچار ...ے تھے اور یہ لاچاری اب ڈاکٹرز نے ان کی آئندہ زندگی کا حصہ قرار دے دی تھی۔ وہ اگر ٹھیک ہو بھی جاتے تو بستر سے اٹھ نہیں ...تے تھے۔ ان کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ بڑی حویلی کو قائم رکھنے والا ایک اہم ستون تھے اور یہ ستون گر چکا تھا۔ زمین بوس ہو چکا ...اور بڑی حویلی کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ مضبوط دیواروں کی اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور بنیادیں زمین میں دھنسنے کے امکان ...ف دکھائی دے رہے تھے اور یہیں تم تو آسیہ آفندی کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈروم میں نڈھال اور بے جان سی پڑی روئے جا ...ی تھیں۔ عون اور عدیہ اپنے باپ اور اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بے حال ہو چکے تھے۔ ان کے معصوم ذہنوں پہ برا اثر پڑا تھا لیکن ...اں بھلا کس کو پروا تھی کہ کس پہ کیا اثر ہوا ہے؟ حالات کی کروٹ بہت نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہاں تک ...اپنے بھی.....

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اسرار آفندی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ وہاں سب کے چہروں پہ سوچ ...ے جال بچھے ہوئے تھے۔

''جو بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔'' دانیال گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب کیا ہوا ہے؟'' وہ پہلے ہی پریشان تھے۔ دانیال کی سنجیدگی پہ تشویش ہونے لگی۔

''کچھ نہیں..... آپ تیار ہیں تو آیئے چلتے ہیں، کافی ٹائم ہو رہا ہے۔'' وہ بات ٹال گیا تھا۔

''آذر گھر پہ رہے گا؟'' انہوں نے صوفے پہ سر جھکا کر بیٹھے آذر کی سمت دیکھا۔

''نہیں..... میں بھی چلوں گا۔'' بالآخر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے ہسپتال جانا تھا۔ وہ لوگ گھر پہ کپڑے چینج کرنے آئے ...تھے اور ہسپتال میں مبارک خان، افتخار آفندی اور جودت کو چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے اب واپس ہسپتال جا رہے تھے۔ اس وقت رات ...کے ایک بجے کا وقت تھا جب وہ گھر سے نکل آئے تھے۔

♥

صبح ناشتے کی ٹیبل پہ ان دونوں ماں، بیٹے کے درمیان مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

بتول شاہ نے ساری رات بیڈ روم میں بند جلتے ہوئے گزار دی تھی تو سکون میں دل آور شاہ بھی نہیں رہا تھا۔ رات اس کی بھی ...آنکھوں پہ بسر ہوئی تھی۔ ساری رات ڈرائنگ روم میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے اس کے پاؤں کے تلوے بھی جلنے لگے تھے اور لگاتار ...ٹہلنے والے سگریٹوں کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں کی کڑواہٹ اس کی آنکھوں میں زہر ...بن کے اتر رہی تھی اور چہرے پہ شدت کرب کا عالم تھا۔

رات تھی کہ عذاب تھا؟ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس رات کو بیتنے میں ایک مدت لگ گئی تھی۔ تب جا کے سویرے کا ...کنارہ نظر آیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش شروع کی تھی اور اس کوشش میں پہلا کام اس نے نماز پڑھنے کا کیا تھا۔ ...سے پتا تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے شعلے وضو کے پانی سے ہی سرد ہوں گے۔ ورنہ اس کے اندر کا دہکتا لاوا اتنی آسانی سے ٹھنڈا پڑ

جاتا، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں حشر برپا کرتی نفرت زمین پہ پیشانی ٹکا کر اللہ کو کیے جانے والے سجدے سے ہی معدوم ہوگئی تھی اور نماز کے آخری سجدے تک وہ سر سے لے کر پاؤں تک قدرے شانت ہو چکا تھا۔ اشتعال دھیما پڑ گیا تھا اور رگوں میں بھرے ہوئے لہو میں ہموار ی آگئی تھی اور مسجد سے واپس گھر آتے ہوئے وہ رات کے مقابلے میں خاصا پُرسکون لگ رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو قدموں میں ایک توازن تھا اور ایسا ہی ایک توازن بتول شاہ کے مزاج میں بھی آچکا تھا۔ وہ رات کی اذیت رات کے ساتھ گزار آئی تھیں۔ اس لیے ان کا چہرہ بھی اس وقت ہر احساس اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ نماز پڑھ کے نیچے آئیں تو اتنے میں گل بھی آچکی تھی اور ان کے کہنے پہ فوراً ہی ناشتہ بنانے چلی گئی اور جب دل آور گھر آیا تب تک ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ جس پہ اسے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی، لیکن ڈائننگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھتی بتول شاہ کو دیکھ کر اسے سمجھ آگیا تھا کہ یہ جلدی بتول شاہ کے حکم پہ ہو رہی ہے۔ وہ متوازن قدموں سے چلتا وہیں آگیا۔

''السلام علیکم اماں جان!'' اس کی بھاری آواز پہ انہوں نے آہستگی سے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ کیونکہ ان کی توجہ اخبار پہ تھی۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو۔'' اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے نظریں دوبارہ اخبار کے صفحے پہ مرکوز کر دی تھیں اور نہ جانے کیوں دل آور مزید کچھ بول ہی نہیں سکا اور گل اتنے میں ناشتہ لگا گئی۔ سو ناشتے کے دوران بھی ان میں خاموشی حائل رہی تھی۔

اور جب وہ ناشتہ ختم کر چکا تو بتول شاہ فوراً ہی کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔'' بات مختصر تھی، لیکن دل آور چونک گیا تھا۔

''کیوں.....؟''

''کیا پوچھنے کی ضرورت ہے؟'' ان کے لہجے میں نامحسوس سی تلخی تھی۔

''لیکن اماں.....''

''فی الحال مجھے جانے دو، میں پھر آؤں گی۔ اپنی زری سے ملنے..... اس کی خاطر تو میں نے آنا ہی ہے؟'' ان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ انہیں دوبارہ روکنے پہ اصرار نہیں کر سکا تھا چپ رہ گیا۔

اس نے ڈرائیور سے گاڑی تیار کروائی اور انہیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آیا۔ گلاب خان، زلفی اور گل ان کی اتنی جلدی واپسی پہ اُداس ہوئے تھے۔ لیکن وہ انہیں دوبارہ آنے کا وعدہ دے کر رخصت ہوئی تھیں اور جاتے جاتے گل کی مٹھی میں چند ہزار ہزار کے نیلے نوٹ بھی تھما دیے تھے اور خود اپنی ذات پہ کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور دُکھ کی چادر اوڑھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور دل آور خود پہ ضبط کیے اندر چلا آیا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کے منشی قادر کا فون آگیا۔ وہ بیچارا کام سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اس لیے دل آور کو خود آفس جانا پڑا۔

♥

آج اس کا موڈ بہت فریش تھا۔

شاید اس لیے کہ آج وہ اپنے بستر سے ایک ارادہ لے کر اُٹھی تھی اور یہ ارادہ کچھ ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے سرشاری ہی پھوٹ رہی تھی۔ دل، دماغ میں اک تازگی آن بسی تھی۔ جس کے ہمراہ اس نے شاور لیا تھا۔ نئے کپڑے پہنے تھے۔ پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ بال سنوارے تھے۔ کلائیوں میں بریسلٹ اور پاؤں میں ہائی ہیل سینڈل پہننے کے بعد اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا تھا۔ کمی بیشی کہیں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مطمئن ہو کر گلے میں مفلر ڈالتی ہوئی اپنا بیگ اور سیل فون لے کر بیڈ روم سے نکل آئی اور یونہی سیڑھیوں کی سمت بڑھتے اس کا دھیان اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے بیڈ روم کی طرف چلا گیا اور بے ساختہ ہی وہ اس بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی مومنہ بی بی نظر آئی۔

''ہیلو گڈ مارننگ.....'' مدیحہ کافی فریش انداز سے کہتی ہوئی اندر چلی آئی اور مومنہ بی بی نے چونک کر دیکھا۔

''مدیحہ باجی.....!'' وہ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''ارے یار! میں نے کل بھی تمہیں کہا تھا کہ میرے نام کے ساتھ ''باجی'' وغیرہ کا ڈم چھلا لگا کر میرے نام کو وزنی مت کرو،

جیسے تم نے اچھی خاصی خوبصورت اور یونک سی مومنہ کو "بی بی" بنا کے رکھ دیا ہے۔ ویسے ہی مجھے "باجی" بنانا چاہتی ہو؟" مدیحہ نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا تھا اور مومنہ بی بی اسے دیکھ کے رہ گئی۔

"دیکھو یار! ظاہری بات ہے۔ کیا تمہاری اور میری عمر ہے "باجی یا بی بی" والی؟" آپ کے مدیحہ نے ذرا فرینڈلی سا انداز اپنایا اور مومنہ بی بی نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ بات تو اس کی بھی سچ تھی؟ لیکن وہ بیچاری کیا کہہ سکتی تھی؟ ان پڑھ، سیدھے سادے، دیہاتی ماں، باپ نے اسے بی بی بنا دیا تھا اور وہ بن گئی تھی۔ اس کے تو شناختی کارڈ پہ بھی مومنہ بی بی ہی لکھا ہوا تھا۔ نوے فیصد دیہاتی عورتوں کی طرح وہ بھی بی بی کے زمرے میں آئی تھی اور یہ بی بی اب اس کی پہچان بن چکا تھا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے مدیحہ باجی! یہ تو ماں، باپ کے سوچنے کی بات تھی۔ وہ مومنہ بی بی کے بجائے میرا پورا نام مومنہ محمد بخش بھی لکھ سکتے تھے۔ جیسے آپ کا نام مدیحہ حیات ہے لیکن یہ عقل پڑھے لکھے ماں، باپ کو ہوتی ہے۔ ان پڑھ ماں، باپ کو نہیں، جو کسی قسم کا بھی کوئی فارم لکھواتے ہیں تو اس میں خاوند یا باپ کے نام سے زیادہ وہ بی بی کو اہم بنا دیتے ہیں۔ اس لیے بی بی ہماری مہر بن جاتی ہے۔" مومنہ بی بی کے جواب پہ مدیحہ نے کافی دلچسپی اور حیرانی سے دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی مدیحہ کے تمام ڈاکومنٹس میں اس کا نام مدیحہ حیات ولد ممتاز حیات لکھا ہوا تھا۔ بی بی کا لفظ تو کہیں بھی نہیں تھا۔

"یعنی گاؤں میں سب لڑکیوں کے ناموں کے ساتھ بی بی ہوتا ہے؟" اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

"جی ہاں بالکل..... باپ کا نام ہو نہ ہو بی بی ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو گاؤں میں کئی بی بیاں ملیں گی، سکینہ بی بی، کوثر بی بی، رسولہ بی بی، مومنہ بی بی یا پھر صرف بی بی۔" مومنہ بی بی نے مدیحہ کو حیرت اور دلچسپی میں ڈال دیا۔

"ہوں..... اینیرنگ..... گویا یہ بی بی والے جراثیم بہت دور، دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے ختم کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔" اس نے پُرسوچ سے انداز میں کہا۔

"جی بالکل..... بہت مشکل کام ہے۔" مومنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ گاؤں کی تمام عورتوں کو نہ سہی، تمہیں تو صرف مومنہ کہا ہی جا سکتا ہے؟"

"ہو..... جیسے آپ کی مرضی باجی۔" مومنہ بی بی نے ہامی بھری تھی۔

"اُف..... پھر باجی؟" مدیحہ جھنجلا گئی تھی۔

"دیکھو آج سے تم مومنہ اور میں مدیحہ..... نو بی بی..... نو باجی..... او کے.....؟" مدیحہ نے اُنگلی اُٹھا کر جس انداز سے کہا تھا اس پہ مومنہ بی بی بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"جی..... او کے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہوں..... گڈ گرل۔" مدیحہ بھی جواباً مسکرائی تھی۔

"اور اب یہ بتاؤ کہ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو، واپسی پہ لے آؤں گی؟" مدیحہ نے کافی نرمی اور خلوص سے پوچھا تھا اور مومنہ بی بی ان دونوں بہن، بھائی کی اتنی ہمدردی، خدا ترسی، انسانیت اور وسیع ظرف پہ کل سے کئی مرتبہ انہیں حیران نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ اسے ان کے ماتھے پہ شکن تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بلا مبالغہ کھلے دل اور کھلے ظرف کے حامل تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو مومنہ.....؟" مدیحہ نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر ٹہوکا دیا۔

"کچھ نہیں..... میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے بھلا؟" مومنہ بی بی کے لہجے میں اپنی ذات کے لیے ہی تمسخر تھا جو مدیحہ کو اچھا نہیں لگا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی بھلا؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟ کیا تمہاری ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا پہننا اوڑھنا جرم ہے؟ یا پھر تم نے ایک ہی لباس میں عمر گزارنے کا عہد کر رکھا ہے۔" مدیحہ نے خفگی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن مدیحہ باجی! آپ جانتی ہیں کہ اس وقت میری ضرورت یہ چھت ہے۔ یہ چار دیواری ہے اور اس سے بڑھ کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے مجھے، تن پہ کپڑا بھی ہے اور معدے میں غذا بھی۔ اس لیے گزارا ہو ہی جائے گا۔ میں خوامخواہ آپ کے اخراجات بڑھاؤں یہ ضروری نہیں ہے۔" مومنہ بی بی کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی تھی۔

''ہم نے اپنے اخراجات اور اپنے وسائل دیکھ کر ہی تمہاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہ ہوتی تو شاید ہم تمہاری ذمہ داری بھی نہ اٹھاتے؟ اللہ نے کسی کی ذمہ داری اٹھانے کی توفیق دی ہے تو پھر گریز کیسا؟ شاید تمہارے صدقے اللہ ہماری بے سکون زندگی کو سکون بخش دے۔ شاید کسی کے گناہ کو دھوتے دھوتے ہمارے گناہ دھل جائیں۔'' مدیحہ کے لہجے میں بولتے بولتے کرب سا اُتر آیا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' مومنہ بی بی کو حیرت اور اُلجھن ہوئی تھی۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ گناہ سے پاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن گناہ سے پاک ہونے کی اور گناہ کو دھونے کی کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟'' مدیحہ کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی سر جھٹک دیا۔

''اپنی وے! تمہیں اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے بہت نوازا ہے۔ تمہارے استعمال کر لینے سے سر ختم نہیں ہو جائے گا اور ویسے بھی تمہاری ذمہ داری نبیل بھائی نے اُٹھائی ہے اور تمہارے اخراجات تمہاری ضرورتیں بھی وہی پوری کریں گے۔ کون سا میں اپنی جیب سے خرچ کروں گی؟ میں نے تو بس ان کو بتانا ہے اور ان سے کیش وصول کرنا ہے۔'' اس نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور مومنہ بی بی کے چہرے پہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیونکہ مدیحہ کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

''پھر کیا خیال ہے تمہارا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''فی الحال کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' مومنہ بی بی نے بیچارگی سے کہا۔

''اوکے..... ایز یو وش..... جب سمجھ میں آ جائے تب بتا دینا۔'' مدیحہ کہہ کے پلٹ گئی۔

''مدیحہ باجی.....'' اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا اور مدیحہ نے ایک دم پلٹ کر اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ مومنہ بی بی نے فوراً اپنی زبان دانتوں تلے دبا لی تھی۔ وہ پھر باجی کہنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے بات کے دوران اسے باجی کہا تھا۔ لیکن مدیحہ نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب.....

''میں معافی چاہتی ہوں مدیحہ باجی! لیکن سیانے کہتے ہیں کہ امیر اور غریب اتنی جلدی گھل مل نہیں سکتے۔ تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔ میں اتنی جلدی نہ تو آپ کے برابر آ سکتی ہوں اور نہ ہی آپ کو اپنے برابر لا سکتی ہوں۔ اس لیے تھوڑا برداشت کیجیے۔ رفتہ رفتہ باجی کہنا چھوڑ دوں گی۔'' مومنہ بی بی نے کافی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پہ مدیحہ نے مزید بحث میں اُلجھنے کے بجائے سر جھٹک دیا تھا۔

''اوکے..... تم یہ بتاؤ تم نے مجھے آواز کیوں دی ہے؟'' مدیحہ نے اس کے روکنے کی وجہ پوچھی تھی۔

''وہ میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

مومنہ بی بی کے اس سوال پہ نہ جانے کیوں مدیحہ پل بھر کے لیے جھجک سی گئی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے؟ کیا کہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

''کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟'' وہ اس کے سوال کا جواب گول کر گئی تھی۔

''نہیں..... بس یہ کہنا تھا کہ جہاں بھی جا رہی ہیں ذرا جلدی واپس آ جائیے گا۔''

''کیوں..... کیا تمہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں مدیحہ باجی! ڈر کیسا ڈر تو ان کو ہوتا ہے جن کے پاس کچھ ہو؟ میرے پاس کیا ہے بھلا؟ سب کچھ تو پہلے ہی گنوا چکی ہوں؟ بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ تنہا بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگتا ہے۔ آپ ہوتی ہیں تو دل کو ڈھارس رہتی ہے۔'' اس کی بات پہ مدیحہ چند ثانیے کے لیے چپ ہوئی پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''اوکے..... جلدی آؤں گی۔ لیکن اگر زیادہ گھبراہٹ ہو تو تم بیڈ روم سے باہر بھی آ سکتی ہو۔ مام کے ساتھ بیٹھ کے باتیں بھی کر سکتی ہو۔ گھر کی چار دیواری کے اندر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آزاد ہو یہاں۔'' مدیحہ نے اسے ریلیکس کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور مومنہ بی بی نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

''شکریہ بہت بہت شکریہ مدیحہ باجی۔''

"ہو کے گذ ہائے۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی۔ لیکن سیڑھیاں اُترتے ہوئے فائزہ بیگم سے سامنا ہوا تھا۔

"کہاں جارہی ہو؟" وہی ایک فطری سا سوال بار بار اس کے آڑے آرہا تھا۔

"بس ایک کام سے جارہی ہوں۔" مدیحہ کہہ کر ان کے سامنے ٹھہری نہیں تھی۔ بے شک جو بھی تھا لیکن وہ ایک ماں تھیں اور وہ ماں کی گہری نظروں کے سامنے عیاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے ذرا کترا کے جواب دیا تھا۔

"ماں! میری واپسی تک مومنہ کا خیال رکھیے گا، میں جلدی آجاؤں گی۔" سیڑھیاں اُترنے کے بعد اسے خیال آیا تو اس نے مڑ کر فائزہ بیگم کو تاکید کی تھی۔

"خوش قسمت ہے مومنہ بی بی جس کے خیال تمہیں ستا رہے ہیں۔" فائزہ بیگم نے رشک کا اظہار کیا اور مدیحہ مسکراتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی۔ ابھی اس نے گھر کے گیٹ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اُٹھا تھا۔

"ہیلو....." اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

"کیسی ہو؟" دوسری طرف جیزی تھا۔

"ایک دم فٹ تم سناؤ تم کیسے ہو؟" مدیحہ کے لہجے میں بے بناہ بشاشت تھی۔

"کیسا ہونا چاہیے مجھے؟ کیا تمہیں میری کچھ خبر ہے؟ کیا اس کو مہمان نوازی کہتی ہو کہ دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لو کسی کی؟" جیزی شکوہ کر رہا تھا۔ مدیحہ تو اسے سچ مچ بھولی ہوئی تھی۔

"سوری یار! ایم ریئلی سوری..... ان فیکٹ دو دن پہلے نبیل بھائی کا کسی لڑکی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کچھ مصروفیت تھی اور کل دل آور بھائی اپنے گھر آئے ہوئے تھے تو ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ تب ہی تم سے ملنے کا ٹائم نہیں ملا۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے اسے جواب دے رہی تھی۔

"اور اس وقت کہاں جارہی ہو؟" جیزی کے کہنے پہ مدیحہ چکرا گئی۔

"اُف..... کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟ میں کہیں جانے کے لیے کیا نکلی ہوں کہ شہر کا شہر پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی سوال سنائی دے رہا ہے۔ کہاں جارہی ہو؟ کہاں جارہی ہو؟" اس نے جیسے سر پیٹ لیا۔

"تو تم بتا دو کہ تم کہاں جارہی ہو؟" جیزی سکون سے کہہ رہا تھا اور مدیحہ ٹھہری گئی۔

"کسی سے ملنے جارہی ہو؟" یہ سوال جیزی چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکا تھا، کیونکہ مدیحہ کا دھیما لہجہ اسے ٹھٹکا گیا تھا اور وہ یہ سوال پوچھ کر اپنے وہم پہ یقین کی مہر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"ہیلو جیزی!" مدیحہ نے اس کی خاموشی پہ اسے پکارا تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

"ہوں..... سن رہا ہوں۔" اب اس کا لہجہ دھیما ہو چکا تھا۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو؟"

"کچھ کہنے کے لیے بھی تو نہیں ہے؟ اچھا وے..... تم جہاں جارہی ہو، جاؤ واپسی پہ تم سے بات ہو گی مگر بھولنا مت یہ بھی یاد رکھنا کہ میں منتظر ہوں۔" جیزی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور مدیحہ فون کو دیکھ کے رہ گئی تھی کیونکہ جیزی اپنی بات کا مفہوم واضح کر گیا تھا۔

♥

او ماڑا اے تے ماڑا سچی یار تو ہے
کج دی ہوے او ساڈا پیار تو ہے
کیوں ماہے دا، کیوں ڈھولے دا، گلہ کراں
میں تاں لکھ واری، بسم اللہ کراں.....
او بسم اللہ کراں.....

ورکشاپ کے گرد آلود برآمدے میں لکڑی کے بنچ پہ رکھے کالے رنگ کے ٹوٹے پھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں فل والیوم سے گونجتی ملکو کی آواز عدیل کے اعصاب پہ ٹینشن کی طرح سوار ہو رہی تھی وہ پہلے ہی کافی بیزار تھا، ملکو کے ان چونچلوں پہ اور بھی کوفت اور بیزاریت ہونے لگی تھی اس نے دو تین بار چھوٹے کو ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن وہ یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا

کیونکہ یہ ٹیپ ریکارڈر سالوں سے بند پڑا تھا اور دو دن پہلے چھوٹے نے اسے کاٹھ کباڑ سے دریافت کر کے اسے دس روپے کا نیا سیل لگا کر تقریباً پچاسی جھٹکے دیئے تھے اور تب جا کے وہ اسٹارٹ ہونے پہ آمادہ ہوا تھا اور چھوٹا خوشی سے بھاگتا ہوا جا کر ساتھ والے چائے کے ڈھابے سے یہ کیسٹ اُٹھا لایا حالانکہ اس نے جب یہ کیسٹ لا کر ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کیا تھا تو ٹیپ ریکارڈر نے اُبکائی کرنے والے انداز میں فوراً وہ کیسٹ باہر اُگل دیا تھا کیونکہ ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ڈالنے والے فریم ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے بغیر کسی فریم یا بغیر کسی سہارے کے کیسٹ کا ٹھہرنا مشکل تھا لیکن دوسری طرف ٹھہرانے والا بھی آخر "چھوٹا" تھا۔

اس نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں ڈال کے اس کے دائیں بائیں ماچس کی تیلیاں پھنسا دی تھیں اور اوپر سے ٹیپ ریکارڈر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور تب سے اب تک ملکوگاہ گا کر ہلکان ہو گیا تھا کیونکہ چھوٹے نے اسے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بس جب بجلی آف ہوتی تو اسے زوردم لینے کا وقفہ ملتا تھا ورنہ تو ہان اسٹاپ چلتا رہتا اور اگر کبھی درمیان میں ٹیپ ریکارڈر اٹکنے لگتا تو چھوٹا اسے تھپڑ مار کے پھر سے اس میں پھریری سے بھر دیتا اور اس پہ ستم کہ ٹیپ ریکارڈر کا والیوم بھی کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کا وہ والا بٹن ہی غائب تھا اور اس کا یہ اعصاب شکن مشغلہ عدیل کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ ضبط کیے اپنے کام میں مصروف رہا تاکہ اس کے کچھ سخت سست بولنے پہ کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو، لیکن چھوٹا تھا کہ باز ہی نہیں آ رہا تھا۔

اساں تاں چن کے یار بنایا شوقاں دا
ہورے کیہو اہل لگدا اے اینا لوکاں دا؟

چھوٹے نے شاید عدیل کو زچ کرنے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا کیونکہ اب وہ خود بھی ساتھ ساتھ گانا شروع ہو چکا تھا جس پر عدیل کو اور بھی تاؤ آ رہا تھا۔

"دیکھو چھوٹے یہ ہاتھ میں پکڑا ہوا رنچ تمہارے سر پہ دے ماروں گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے اپنا اور اس کا منہ بند کر ورنہ تم دونوں کو اُٹھا کر باہر پھینک آؤں گا۔" عدیل کی برداشت جواب دے چکی تھی اس نے خونخوار نظروں کے ساتھ چھوٹے کو اور اس کے دریافت شدہ دسکا اسٹارٹ ٹیپ ریکارڈر کو بیک وقت دیکھا تھا۔

"استاد! تم تو یوں غصہ کر رہے ہو جیسے ملکو تمہیں چھیڑ رہا ہو۔" چھوٹے نے چوٹ کی تھی جس پہ عدیل تلملا گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ارے استاد! مطلب والی باتیں ہمیں نہیں آتیں، ہم تو بغیر مطلب والی بات کرتے ہیں۔ ویسے استاد! آپ کی بات ہے جو پار ہوتے ہیں یہ ماڑے کیوں ہوتے ہیں؟" چھوٹے نے آخر معصومیت سے سوال داغ دیا اور عدیل نے اسے گھور کے دیکھا۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"اللہ کی قسم استاد! میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو لیکن کیا کریں؟ رنگ میں بھنگ تو وہ ولایت والا (حیری) ڈال گیا جب بھی یاد آتا ہے کھوپڑی گرم ہو جاتی ہے اچھا بھلا استاد کا کام سیدھا ہو رہا تھا لیکن وہ مٹ جانے کہاں سے بیچ میں آ گیا لیکن استاد کوئی بات نہیں تیری ٹانگ میں اگر دم ہوا تو وہ میڈم ضرور آئے گی کیونکہ یہ تو ایک فطری سی بات ہے کہ جس طرح دیسی کو ولایتی کی بڑی کشش ہوتی ہے اسی طرح ولایتی کو بھی دیسی میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے، خصوصاً ولایتی عورت تو دیسی مرد کی طرف کھنچی چلی آتی ہے اور تم بھی ماشاء اللہ دیسی مرد ہو، مشرقی مرد ہر لحاظ سے مکمل، کشش سے مالا مال، ممکن ہی نہیں کہ وہ ولایتی میڈم تمہارے سحر سے بچ نکلے۔" چھوٹے کی بات پہ عدیل نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تمہیں خوامخواہ ایشو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

"ہونہہ استاد! تمہارے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تو پھر دماغ میں یہ گرمی کس لیے ہے؟ جو تم ہم پہ نکال رہے ہو۔" چھوٹے کا انداز معنی خیز سا تھا۔

"تمہارے کرتوت ہی ایسے ہوتے ہیں کہ خوامخواہ دماغ گرم ہونے لگتا ہے۔"

"میرے کرتوت یا پھر....." چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور عدیل نے سمجھتے ہوئے یکدم اسے مارنے کے لیے رنچ گھمایا تھا چائے ورکشاپ کے احاطے میں ایک گاڑی جھٹکے سے آن رکی۔ سلور کلر کی چمچماتی ہوئی یہ گاڑی عدیل کے لیے اجنبی نہیں تھی اس کا ہاتھ یکدم نیچے پہلو میں آ گرا تھا۔

''مرد پہ دیسی شراب اور عورت پہ دیسی مرد بُرا کرتے ہیں استاد! آزمائش شرط ہے۔'' چھوٹا اس کے قریب سرگوشی سے کہتا ہوا پاس سے گزر کر ورکشاپ کی پچھلی سائیڈ پہ چلا گیا جہاں جیپوں اور سلوکی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے۔ وہ گاڑی سے اُتر کر اس کے قریب آ گئی۔

''ہیلو.....'' آواز تھی یا مٹھاس جس کا احساس عدیل کو روح تک محسوس ہوا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے بھی کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اس وقت وہ احساسات اور جذبات سے گندھی ہوئی ایک نارمل لڑکی نظر آ رہی تھی جس کے وجود میں بھڑکتا غصہ اس لمحے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سر سے پاؤں تک تسخیر پہ آمادہ تھی اور اس لمحے عدیل کو اس کی ذات کے آئینے میں اپنے آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا اسے اس کے وجود میں اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا، وہ اس وقت اس کے سامنے کھڑی ''مدیحہ حیات'' نہیں بلکہ ''عدیل عمر'' لگ رہی تھی شاید اسی لیے کہ عدیل عمر کے سامنے آنے کے لیے اسے مدیحہ حیات کو پیچھے چھوڑ کے آنا پڑا تھا شاید اپنے اسی بستر میں جہاں سے وہ عدیل عمر سے ملنے کا ارادہ لے کر اٹھی تھی اور اب اس کے سامنے کھڑی وہ مدیحہ ''مدیحہ'' ہی نہیں لگ رہی تھی جس کو دیکھ کر عدیل عمر کا دل بھی اپنی جگہ سے اس کی سمت ہمکنے لگا تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا رنچ ایک سائیڈ پہ ڈال دیا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیں کیسی ہیں؟'' عدیل کا دل اس کے لہجے پہ حاوی ہو رہا تھا، آنچ دے رہا تھا۔

''میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ میں کیسی ہوں؟'' وہ آج پہلی بار دل کی رضا سے آئی تھی اس لیے سب کچھ دل کی رضا پہ چھوڑ رکھا تھا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی چھوٹ پہ دل اپنی رضا سے کیا کیا کرتا ہے؟ کیا گل کھلاتا ہے؟ کون سا چاند چڑھاتا ہے؟ کہاں تک جاتا ہے؟ کتنا بہکتا ہے اور کتنا سنبھلتا ہے؟ یہی جاننے کے لیے اس نے دل کو خاصی ڈھیل دے رکھی تھی اور وہ عدیل عمر کے حضور آن پہنچا تھا کسی سدھائے ہوئے بے جان جانور کی طرح.....

''آپ اپنے فیصلے دوسروں پر بھی چھوڑتی ہیں؟'' عدیل کا سوال دلچسپی لیے ہوئے تھا۔

''اکثر نہیں..... کبھی کبھی۔'' وہ بھی خوشگواریت سے بولی۔

''کبھی کبھی کیوں؟''

''کیونکہ دل کبھی کبھی موج و مستی پہ آمادہ ہوتا ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''یعنی آپ اس وقت موج و مستی پہ آمادہ ہیں؟'' عدیل کے معنی خیز لہجے پہ مدیحہ بُری طرح چونکی تھی وہ اس کی بات کو ذومعنی ہرگز نہ دے چکا تھا۔

''نن..... نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔'' مدیحہ جیسی شعلہ صفت لڑکی کا یوں گڑبڑا جانا عدیل کو لطف دے گیا تھا اس کے دماغ کی گرمی دور ہو گئی تھی۔

''تو پھر کیسی بات ہے؟ کس موج میں ہیں آپ! اور کس مستی کی بات کر رہی ہیں؟'' اس کے رنگ اس کے انداز دیکھ کے عدیل خود مستی میں آ گیا تھا۔ اور مدیحہ نظریں چرا گئی۔

''کیا بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟'' اس نے عدیل کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔

''ارے کیوں نہیں..... سو بسم اللہ، سر آنکھوں پہ، آیئے بیٹھیے۔'' عدیل نے چوکتے ہوئے فوراً پلاسٹک کی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دی اور دوسری کرسی اپنے لیے کھینچ لایا۔

''ارے بے فکر رہیں کرسی گندی نہیں ہے بس حالات اور ماحول نے اسے بدوضع اور بے رنگ بنا دیا ہے۔'' عدیل نے اسے تسلی دی تھی اور مدیحہ جھل ہوتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''اب بتایئے کیا لیں گی آپ؟'' وہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور مدیحہ کو یوں اس کے روبرو بیٹھنے پر جھجک سی ہو رہی تھی۔

''نہیں..... کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

''کیا ناشتہ کر کے آئی ہیں؟''

''نہیں۔''

''ارے تو پھر انکار کس لیے ہے؟ یہاں ناشتہ کریں گرما گرم حلوہ پوری، پتنے اور لسی کے ساتھ دماغ کی خشکی دور ہو جائے گی۔'' عدیل نے اسے ناشتے پہ اصرار کیا تھا۔

''نہیں..... اتنا ہیوی ناشتہ میں نہیں کر سکتی۔'' وہ اتنا بھاری بھرکم ناشتہ کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

''اتنا بھی ہیوی نہیں ہے، بس آپ کو نام سن کر ایسا لگ رہا ہے اس نرم گرم سے موسم میں یہ ناشتہ بہت گرمائش دیتا ہے۔'' عدیل کا اصرار بنوز تھا۔

''ایم سوری! اتنا ہیوی ناشتہ تو نہیں لیکن چائے لے سکتی ہوں۔'' اس نے چائے پہ رضامندی ظاہر کی تھی اور مجبوراً عدیل کو اپنے اصرار سے ہٹنا پڑا۔

''او کے..... ابھی منگواتا ہوں۔'' اس نے کہتے ہوئے گردن موڑ کر سلو کو آواز دی تھی۔

''سلو..... اوئے سلو۔'' اس نے بلند آواز سے پکارا۔

''جی استاد!'' سلو فوراً ہاتھ جھاڑتا ہوا حاضر ہوا تھا۔

''دو کپ چائے بکز روڈ ھابے سے۔'' اس نے اشارہ کیا تھا۔

''استاد! سلام تو کر لینے دیں۔ سلام میڈم! کیسی ہیں آپ؟'' سلو نے عدیل کو خفگی سے کہا تھا اور ساتھ ہی مدیحہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے۔'' مدیحہ نے آہستگی سے کہا اور اس کے انگلش لب و لہجے میں ''اللہ کا شکر'' ادا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

''چلیں شکر ہے، اللہ اپنا کرم ہی رکھے، آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔'' سلو خوشدلی سے کہتا ہوا چلا گیا۔ عدیل کو پتا تھا کہ وہ تینوں لوفر اسے بہت تنگ کریں گے اسی لیے تو اس نے بڑے لوفر ''چھوٹے'' کو نہیں بلایا تھا جو صرف نام کا چھوٹا تھا، کام کا نہیں، کام تو اس کے بڑے بڑے تھے، خصوصاً اس کی عقل بہت بڑی تھی، کافی دور کی سوچ رکھتا تھا۔ اور اس کا اور اک عدیل کو کافی اچھی طرح سے ہو چکا تھا۔

''اور سنائیں کیسے آنا ہوا آپ کا؟ میرے لائق کوئی خدمت۔'' عدیل دوبارہ سے اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا اور مدیحہ کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اور کیا بتائے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ کیونکہ اس کے پاس کوئی وجہ ہی نہیں تھی یہاں آنے کی۔

''وہ دراصل میں نے آپ کے گھر جانا تھا، آپ کے فادر کی خیریت معلوم کرنے کے لیے لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتا نہیں تھا اس لیے یہاں آنا پڑا ہے۔'' مدیحہ کو بروقت ایک بہانا سوجھ ہی گیا تھا اور عدیل اس کا یہ گریز فوراً ہی سمجھ گیا۔

''اوہ اچھا اچھا..... تو آپ ابا جی کی عیادت کے لیے یہاں آئی ہیں؟'' اس نے اپنی ذومعنی سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے دور سے آتے سلو پہ نظریں جما دیں تاکہ مدیحہ سے نظروں کا تصادم نہ ہو۔

''آپ مجھے گھر کا پتا بتا دیں، میں چلی جاؤں گی۔'' وہ بھی بات کرتے ہوئے کافی جھجکی اور کترائی کترائی سی لگ رہی تھی اپنے سابقہ شعلہ جوالہ انداز سے قطعی مختلف نظر آ رہی تھی۔

''ارے نہیں نہیں۔ جب تک میں آپ کو اپنے گھر لے کر نہیں جاؤں گا آپ کیسے جائیں گی بھلا؟ آپ کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔'' عدیل کے جواب پہ اس نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر دیکھا اور عدیل اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے وار سے گھائل ہو کے رہ گیا تھا اس کی آنکھوں کی دھار بہت تیز تھی۔

''استاد! چائے۔'' سلو آنکھوں کی آنکھوں تک رسائی کا یہ منظر دیکھ چکا تھا اسی لیے گلا کھنکار کے متوجہ کیا۔

''ہوں..... لاؤ دوادھر۔'' عدیل نے نظروں کا دامن چھڑا کر سلو کے ہاتھ سے دونوں کپ تھام لیے تھے۔

''میں جاؤں استاد۔''

''ہوں..... جاؤ۔'' عدیل نے سلو سے نظر ملائے بغیر کہا تھا۔

''ٹھیک ہے استاد! اگر لو موجاں۔'' سلو آہ بھر کے کہتا ہوا واپس چلا گیا اور اس کی یہ سرگوشی نما آہ سن کر عدیل مسکراہٹ دبا گیا۔

"یہ لیجیے چائے۔" اس نے کپ مدیحہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"تھینکس۔" مدیحہ نے دودھیا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چائے کا وہ چھوٹا سا کپ تھام لیا اور عدیل اس کے ہاتھ کی خوبصورتی دیکھ کے رہ گیا۔ دودھ کی طرح سفید، ملائم اور گداز ہاتھ عدیل کی نظروں کو بھٹکا گئے تھے۔

"ہوں..... اچھی چائے ہے اور اسٹرانگ بھی۔" مدیحہ نے چائے کا سپ لینے کے فوراً بعد تعریف کی تھی۔

"اتنی زیادہ محنت اور تھکن کے بعد اسٹرانگ چیزیں ہی ہماری ترجیح ہوتی ہیں جو تھکے ہارے جسم سے ساری تھکن نچوڑ دیتی ہیں اور دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔" عدیل نے بھی چائے کا سپ لیا۔

"آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟" مدیحہ کے ذہن میں اٹکا ہوا سوال باہر آیا تھا۔

"کیونکہ میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں، پانچ بہنوں کا بھائی اور ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ اس لیے محنت تو مجھ پہ فرض ہے۔" وہ لاپروائی ظاہر کر رہا تھا۔

"لیکن آپ کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں؟" وہ فوراً بولی۔

"بہت کوشش کی تھی کرنے کی۔ یہاں تک کہ خودکشی بھی، لیکن اللہ کو خودکشی کرنا پسند نہیں ہے اس لیے اس نے مجھے خودکشی کے کام سے ہٹا کر یہاں بھیج دیا، شاید اسے میرے لیے یہی پسند تھا۔" اس نے کندھے جھٹکے تھے۔

"لیکن یہ کام آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔" وہ بے ساختگی سے بولی تھی۔

"ہمیں زندگی میں بہت سے کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو ہمیں سوٹ نہیں کرتے، جیسے آپ یہی دیکھ لیں کہ آپ کا یہاں آنا سوٹ نہیں کرتا لیکن پھر بھی آپ کو آنا پڑا ہے کیونکہ آپ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا بالکل اسی طرح میرے پاس بھی یہاں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔" عدیل کے لہجے میں ہلکی سی تلخی کی آمیزش تھی۔

"لیکن کام کا کوئی اسٹینڈرڈ تو ہونا چاہیے؟"

"دیکھیے میڈم! ایسی بات وہی بندہ سوچ سکتا ہے جو ہر لحاظ سے آزاد ہو، بے فکر ہو، حالات اور مشکلات میں پھنسا ہوا آدمی یہ سب نہیں سوچ سکتا اس کی عقل اور شعور تو مسائل سے ہی مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجبوری معیار نہیں دیکھتی۔ مجبوری یہ نہیں سوچتی کہ کیا معیاری ہے؟ اور کیا غیر معیاری ہے؟ مجبوری کہتی ہے کرو۔ وہ سب کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔ چاہے وہ معیاری ہے یا غیر معیاری، اچھا ہے یا بُرا حلال ہے یا حرام؟ بس تم نے کرنا ہے کیونکہ میرا نام مجبوری ہے اور محبت کی طرح مجبوری بھی اندھی ہوتی ہے کچھ بھی نہیں دیکھتی، مقام، مرتبہ، معیار بھی نہیں دیکھتی سب کروا لیتی ہے بلکہ وہ کام بھی کروا لیتی ہے جو کام انسان سے کبھی محبت بھی نہیں کروا پاتی اس لیے اور دیگر مجبوروں کی طرح میں بھی اس مجبوری کے ہاتھوں مجبور ہوں وہ سب کرنے کے لیے جو شاید میرے معیار کا نہیں ہے۔" عدیل کے تفصیلی اور تلخ سے جواب پہ مدیحہ چپ چاپ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لفظ لفظ میں سچائی اور چبھن تھی وہ اب کچھ کہتی بھی تو کیا کہتی؟

"خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔" عدیل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور چائے کا سپ لیتے ہوئے مدیحہ کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا.....؟" مدیحہ نے بھی چائے کا سپ لیتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔

"آپ اس وقت بہت "اچھی" سی لگ رہی ہیں۔" عدیل اظہار کے بنا نہیں رہ سکا اور مدیحہ نے یکدم پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ میں کئی رنگ تھے کئی معنی تھے۔ وہ نظر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔ عدیل اس کی حرکت پہ قہقہہ لگاتا، اگر اسے مدیحہ کا ڈر نہ ہوتا وہ کسی بھی وقت اپنا میچور لوز کر سکتی تھی اسی لیے وہ سنبھل گیا اور اپنا قہقہہ دبا گیا اور ہمیشہ اعتماد سے بات کرنے والی اچانک بوکھلا سی مدیحہ نے جانے کیوں اس لمحے نروس ہو گئی تھی۔

"اوکے..... میں اب چلتی ہوں۔" وہ چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"آئندہ کی اُمید بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟" وہ بلا ارادہ پوچھ بیٹھا۔

"کیا آئندہ بھی آنا چاہیے؟"

"یہ سوال تو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔"

''لیکن میں یہ سوال آپ سے کر رہی ہوں۔'' وہ عدیل پہ نظریں جما چکی تھی۔

''کیا میرے جواب کی اہمیت ہے آپ کی نظر میں۔''

''ہے تو پوچھ رہی ہوں نا۔''

''تھینک یو..... پھر میں تو کہوں گا آپ کا جب بھی دل چاہے آپ آئیں میرے گھر سے دل تک تمام دروازے کھلے ہوں ملیں گے آپ کو۔'' اس نے خوشدلی سے بازو پھیلا کر کہا۔

''وجہ؟ اتنی عنایت کس لیے؟'' وہ اسے کھوجنا چاہتی تھی۔

''آتی جاتی رہیں گی تو وجہ بھی پتا چل جائے گی۔'' وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

''او کے..... گڈ بائے۔'' وہ کہہ کے پلٹ گئی اور اپنے گاسز بالوں میں اٹکا لیے تھے اور گاڑی کے قریب جا کر دوبارہ پلٹ اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے روڈ تک لے گئی۔ عدیل اسے دور تک دیکھتا رہا جیسے ہی اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی وہ واپس پلٹا تھا لیکن یکدم پلٹ گیا کیونکہ وہ تینوں عین اس کے پیچھے کھڑے تھے اور عدیل کو گھر رہے تھے وہ جان بوجھ کر بال سہلاتا ہوا گیٹ کے ان کے پاس سے گنگناتا ہوا گزر کر آگے بڑھ گیا۔

''کیوں مارے دا کیوں ڈھولے دا گلہ کراں

او میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں.....

''استاد۔'' اس کے گنگنانے پہ چھوٹا یکدم چیخ اٹھا اور خونخوار انداز میں اس کی سمت لپکا تھا اور جواباً وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

♥

''پلیز بھابی! ایک منٹ میں کچھ بھول گئی ہوں۔'' زری گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے یکدم رک گئی۔ عبداللہ سامان گاڑیوں میں رکھوا رہا تھا دو گھنٹے بعد ان کی فلائٹ تھی۔

''کیا بھول گئی ہو؟'' نگارش بھی ٹھٹک کے رک گئی۔

''جائے نماز۔'' زری نے کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔

''جائے نماز.....'' نگارش کو حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں بھابی! میری جائے نماز جس پہ میں نماز پڑھتی ہوں۔''

''لیکن زری! جائے نماز تو پاکستان سے بھی مل جائے گی؟''

''یہ جائے نماز کہیں سے بھی نہیں ملے گی بھابی۔'' زری گھر کے کوریڈور میں داخل ہو چکی تھی۔

''کیا مطلب؟'' نگارش کو بھلا کیا پتا تھا۔

''مطلب آ کر بتاتی ہوں۔'' زری بغیر رکے اور بغیر پیچھے پلٹے کہتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی اور نگارش وہیں دہلیز میں کھڑی دیکھ رہ گئی۔

''نگارش! کھڑی کیوں ہو؟ گاڑی میں بیٹھو۔'' گاڑی کے قریب کھڑے عبداللہ نے آواز دی۔

''وہ زری آ جائے تو.....'' نگارش بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی۔

''کیوں؟ زری کہاں گئی ہے؟'' عبداللہ بھی زری کی غیر موجودگی پہ چونکا۔

''اندر گئی ہے کچھ بھول گئی تھی شاید۔''

''اسی لیے میں نے تم لوگوں سے کہا بھی تھا کہ سب کچھ دوبارہ چیک کر لینا تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔'' عبداللہ خفگی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سامان والی گاڑی اس نے خود ڈرائیو کرنی تھی اور جس گاڑی میں زری اور نگارش نے جانا تھا وہ گاڑی نگارش بھابی نے ڈرائیو کرنا تھی۔

''آپی! آپ بیٹھیں تب تک وہ بھی آ جاتی ہے۔'' شیراز (نگارش کا بھائی) نے آگے بڑھ کے نگارش کو بیٹھنے کا کہا۔ لیکن نگارش کو بے چینی ہو رہی تھی کہ کہیں زری دیر نہ لگا دے اور وقت کی کمی کی وجہ سے عبداللہ غصہ نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے وہ وہیں کی وہیں کھڑی

رہی تھی۔

"لیجیے بھابی! میں آ گئی۔" زری تیزی سے قدم اُٹھاتی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور تب جا کے نگارش کا سانس بحال ہوا تھا۔ اور دونوں نے قدم گاڑی کی سمت بڑھا دیے تھے شیراز ان کے پیچھے گھر کا دروازہ لاک کیا اور آ کر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"اب بتاؤ ایسا کیا ہے اس جائے نماز میں کہ عین ٹائم پہ تمہاری جان اٹک گئی تھی؟" گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی نگارش کا سوال بھی سامنے آ گیا۔

"اس جائے نماز میں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔" زری نے نیلے رنگ کی دیز روہوالی ویلوٹ کی مخملی جائے نماز پہ بڑی عقیدت اور محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"کیسا اثاثہ؟" نگارش کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"آج سے تین سال پہلے اسی جائے نماز پہ اس نے (دل آور شاہ) نماز پڑھی تھی، آپ کو یاد ہو گا عبداللہ بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، کافی چوٹیں آئی تھیں اور اس دن وہ اور نبیل ہمارے گھر ہی ٹھہر گئے تھے، آپ دوسرے بیڈ روم میں تھیں، جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگ رہی تھی دو، عبداللہ بھائی اور نبیل کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو میں کیسے سو سکتی تھی بھلا؟ اور جب ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ اُٹھ کر باہر نکل آیا، وہ نماز پڑھنا چاہتا تھا اور جائے نماز ڈھونڈ رہا تھا، اس نے پہلی بار کوئی چیز مانگی تھی اور وہ تھی جائے نماز۔ وہ وضو کر کے آیا تھا اور میں نے اسے اپنی جائے نماز دی، تب اس نے اس جائے نماز پہ عشاء کی نماز پڑھی تھی، اللہ کو سجدہ کیا تھا، وہ اللہ کے حضور جھکا تھا اور میرا دل اس کے حضور جھک گیا تھا، اس وقت ان لمحات میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جائے نماز بچھا کے نہیں۔ بلکہ میرے دل کو بچھا کے میرے دل پہ قدم جما کے کھڑا اپنے رب کو سجدہ کر رہا ہے، دل میرا تھا۔ قدم اس کے تھے اور سجدہ اللہ کا تھا۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے، وہ میرے دل پہ کھڑا اللہ کو سجدہ کر رہا تھا اور تب سے اب تک اس کے قدم میرے دل پہ ہیں، میرا دل نیچے ہے اور اس کے قدم اوپر۔ وہ جب جب قدم اُٹھا کے چلتا ہے میرا دل تب تب نیچے ہی نیچے دبتا چلا جاتا ہے، اس جائے نماز میں اور میرے دل میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اس کا رنگ نیلا ہے اور میرے دل کا رنگ سرخ۔" زری انتہائی مدھم، دھیمی اور سحر انگیز آواز میں بولتی ہوئی نگارش کو ششدر سا کر چکی تھی نگارش کے دل و دماغ سے دھواں نکل گیا تھا۔ یہ عشق اور جنوں کی کون سی منزل تھی جہاں پہ زری جا چکی تھی؟ اور اس منزل پہ پہنچنے کے بعد حاصل کیا تھا؟ ایک اور مسافت؟ یا ایک اور منزل؟ نگارش کا دل اس سوچ سے ہی دہل گیا تھا اسے جھرجھری سی آ گئی تھی۔

"یا اللہ! اس بچی پہ اپنا رحم فرمانا۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"آپ میرا اثاثہ پوچھتی ہیں، کیا یہ اثاثہ کم ہے کہ اس جائے نماز پہ اس کے سجدے کا لمس ہے، اس کی پیشانی کا غرور ہے اس میں۔ میرے ہزاروں سجدے اور اس کا ایک سجدہ ہے اس جائے نماز میں، اس سے بڑھ کر میرا اثاثہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ اور میں اسے ہی یہاں بھول جاتی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟" زری نے بڑی محبت، بڑی چاہ اور بڑے جذب سے کہتے ہوئے اس جائے نماز کو اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ میں رکھ لیا۔

"یہ بیگ ایئر پورٹ پہ جا کر میں نے اپنے ویزے میں رکھنا ہے تاکہ محفوظ رہے۔" وہ پہلے سے ارادہ باندھ رہی تھی اور نگارش کو یاد آ رہا تھا کہ زری نے یہ جائے نماز کبھی کسی کو نہیں دی تھی اس پہ صرف وہ خود نماز پڑھتی تھی اور آئندہ بھی اس نے اسی میں نماز پڑھنا تھی اسی لیے تو وہ ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

آدھے، پون گھنٹے میں وہ لوگ ایئر پورٹ پہنچے تھے، نگارش کے پیرنٹس اور بہن بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے بس شیراز ان کے ساتھ تھا، نگارش پہلی بار پاکستان جا رہی تھی اس لیے وہ سب ہی سی آف کرنے آئے تھے، فلائٹ میں ٹائم کم رہ گیا تھا اس لیے عبداللہ اور شیراز کو کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی سامان کلیئر کروا کے خود بھی ان ہونا تھا اس لیے کافی جلدی مچی ہوئی تھی اور سب کچھ اوکے ہوتے ہی وہ سب مل کر ایئر پورٹ کے اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئے تھے، زری بار بار انگیجنڈ کی فضاؤں میں دیکھ رہی تھی، انگیجنڈ اس کی محبت کی جائے پیدائش تھی، وہ انگیجنڈ کو کیسے بھول سکتی تھی بھلا؟ اور یونہی آنکھوں میں آنسو لیے وہ نگارش کا ہاتھ تھامے جہاز کا زینہ طے کر گئی لیکن اپنی سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پہ نظر پڑتے ہی وہ جم سی گئی۔ ملک اسد اللہ بھی اسی فلائٹ سے واپس پاکستان

جا رہے تھے، زری کو دیکھ کر ان کے چہرے پہ کرختگی آ گئی تھی اور رُخ پھیر لیا تھا۔

♥

وہ اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا ایک اہم کیس اسٹڈی کر رہا تھا جب اسٹڈی روم کے دروازے پہ کسی نے ناک کیا۔

''یس مم ان۔'' اس نے اپنے سامنے پھیلی فائل کو بند کرتے ہوئے اجازت دی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی گلاب خان دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔

''سلام صاحب۔'' گلاب خان نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام..... آؤ۔'' دل آور اپنی توجہ اس پہ مرکوز کر چکا تھا۔

''صاحب..... آپ سے کچھ کہنا تھا، اگر آپ غصہ نہ کریں تو۔'' گلاب خان کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھا اور دل آور شاہ ڈر بھی تھا۔ اس نے گلاب خان کو حیرت سے دیکھا تھا۔

''تمہیں پتا ہے گلاب خان جائز بات پہ میں غصہ نہیں کرتا۔'' اس نے گلاب خان کو آگاہ کیا۔

''صاحب! یہ بات بھی جائز بات ہی ہے۔''

''تو پھر بے فکر ہو کر کہو۔ کیا کہنا ہے؟'' اس نے اپنا پین بند کر کے کتاب کے درمیان رکھتے ہوئے کتاب بھی بند کر دی تھی۔

''صاحب! میرا اس بات سے کوئی تعلق تو نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی حق ہے کہ میں آپ کے کام میں مداخلت کروں، لیکن صاحب اللہ کا بندہ ہوں، انسان ہوں اور انسان کے دماغ میں خیال آتے دیر نہیں لگتی، اچھے بُرے سب خیال آتے ہیں، خیال آتا ہے تو احساس جاگتا ہے اور میرے دل و دماغ میں بھی یہ احساس جاگ رہا ہے کہ وہ لڑکی جسے آپ نے بیسمنٹ میں بند کر رکھا ہے وہ اگر بھوک پیاس سے مر گئی تو اللہ میری پکڑ ضرور کرے گا اور میرا ضمیر بوجھ تلے دب جائے گا کیونکہ وہ لڑکی آپ کی گناہگار اور مجرم ہے آپ کی اس سے نفرت اور دشمنی سہی، لیکن میری تو نہیں ہے نا؟ میں تو اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا نا؟ کیونکہ اس کے قید خانے کی چابی میری جیب میں ہے۔ میں اس کے لیے اس قید خانے کا دروازہ نہیں کھول سکتا کیونکہ مجھے آپ کا ڈر ہے اور جب مجھے آپ کا اتنا ڈر ہے تو کیا اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ آپ مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں تو اللہ بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ میں آپ کا نوکر اور اس کا بندہ ہوں، اس لیے آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ میں نہ تو آپ سے چھپ کے کچھ کر سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی ذات سے چھپ سکتا ہوں، اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں، بڑی مشکل میں ہوں، بُرے خیال آ رہے ہیں۔'' گلاب خان سر جھکائے کھڑا وہ سب کہہ چکا تھا جو وہ دل آور سے کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دل آور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ بالکل خاموش چند ثانیے وہ خاموش رہنے کے بعد گہری سانس کھینچتا ہوا اُٹھا اور اپنے اسٹڈی روم کی دیوار گیر کھڑکی کے تمام پردے ہٹا دیے تھے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا، باہر سیاہ اندھیرا تھا۔ اتنا سیاہ جتنا دل آور شاہ کے اندر تھا۔

''سگریٹ اور لائٹر دو۔'' اس کی بھاری آواز سپاٹ تھی۔

''جی صاحب!'' گلاب خان نے فوراً آگے بڑھ کے اس کی رائٹنگ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اُٹھایا اور اسے پیش کر دیا۔ دل آور نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پھر اسے لائٹر کا شعلہ دکھا دیا اور ایک گہرا کش لیتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر دوبارہ گلاب خان کی سمت بڑھا دیا تھا اور گلاب خان ان کو واپس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے دوبارہ اپنی سابقہ جگہ پہ جا کھڑا ہوا تھا۔

''تو تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اب کی بار تو دل آور کے لہجے میں بھی دھواں تھا۔

''اجازت! صاحب صرف اجازت۔'' وہ فوراً بولا تھا۔

''کس چیز کی اجازت؟''

''صاحب! اس لڑکی کو روٹی پانی دینے کی اجازت۔''

''صرف روٹی پانی؟''

''جی صاحب! صرف روٹی پانی۔'' گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر کل کو تمہیں اس کی کسی اور ضرورت کا خیال آ گیا تو؟'' دل آور نے سگریٹ کا کش جھاڑتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی نظریں گلاب خان کے بجائے اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبے سگریٹ پہ تھیں۔

''صاحب! روٹی اور کپڑے کے سوا انسان کی اور کوئی بڑی ضرورت نہیں ہوتی ہر چیز کے بغیر گزارا ہو جاتا ہے لیکن ان دو چیزوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ فی الحال اس لڑکی کو ان دونوں چیزوں میں سے روٹی کی ضرورت ہے۔'' گلاب خان کافی سوچ سمجھ کے بول رہا تھا۔

''ہوں..... ٹھیک ہے، جاؤ تم اور دے دو اسے روٹی پانی، شاید تم اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤ، اگر میری ایک اجازت سے تمہارا ضمیر سرخرو ہوتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس نے گلاب خان کی اکھڑی ہوئی سانس بحال کر دی تھی گلاب، ان کے کیے کا مان رکھ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے صاحب کا بہت وفادار اور تابعدار ملازم تھا کیونکہ وہ اسے بھی پروٹوکول دیتا تھا، ملازم کو ملازم سمجھ کے دھتکارتا نہیں تھا۔

''بہت بہت شکریہ صاحب! بہت زیادہ شکریہ، آپ کا یہ احسان ہے مجھ پر۔'' گلاب خان دل سے مشکور ہوا تھا۔

''میرا کوئی احسان نہیں ہے لیکن گلاب خان تمہیں کیا پتا، اس لڑکی پہ جو بیت رہی ہے تم صرف وہ دیکھ سکتے ہو، لیکن جو مجھ پہ بیت چکی ہے وہ تمہیں کبھی نظر نہیں آئے گی، تمہیں کبھی خیال نہیں آئے گا اور نہ ہی کبھی احساس جاگے گا۔ تمہیں صرف یہ لگے گا کہ تمہارا صاحب ظالم ہے اور یہ لڑکی مظلوم ہے۔ شاید یہ لڑکی مظلوم ہی ہو لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ وقار آفندی کی بیٹی ہے ایک ظالم انسان کی بیٹی مظلوم کیسے ہو سکتی ہے؟ میں اس پہ ترس کھانا بھی چاہوں تو نہیں کھا سکتا گلاب خان کیونکہ اس کی رگوں میں اس کے ذلیل باپ کا خون ہے جس سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ دل چاہتا ہے اب بھی ہسپتال جا کر ہسپتال کے بستر پہ اس کے مفلوج اور معذور جسم کو بھی اپنے ریوالور کی گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دوں۔ اک ریت کے ذرے بھتا بھی ترس نہ کھاؤں اس پہ اور ایسی عبرتناک موت دوں کہ ہر زمانے میں مثال دی جائے۔'' دل آور شاہ کا غضب اس کے لہجے میں بول رہا تھا اور گلاب خان بے یقین اور حیرت زدہ سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا وہ جواباً کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا اور پھر ذرا توقف سے ٹھٹکا اور وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

♥

''پانی..... پانی..... پاپا..... مما..... پانی..... مم..... مجھے..... پانی..... ڈ..... ڈرا..... ٹیور..... پپ..... پانی.....'' گلاب خان باتھ روم کا دروازہ کھول کے نیچے آیا تو اسے وہ لڑکی فرش پہ اوندھے منہ گری ہوئی نظر آئی اور اس کی حالت نیم بیہوشی کی سی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں بند اور یوں اوندھے منہ گرے ہونے کے باوجود اس کے منہ سے یہ کمزور، نڈھال اور نقاہت زدہ سے الفاظ نکل رہے تھے اس کی پیاس اور پانی کی طلب اتنی شدید تھی کہ وہ بیہوش ہو کر بھی بیہوش نہیں ہو پا رہی تھی اس کی زبان پہ ایک ہی فریاد تھی۔ پانی اور صرف پانی۔

اور اس کی یہ حالت اور اس کی پیاس کا یہ عالم دیکھ کر گلاب خان کانپ کے رہ گیا۔ اس کا دل مٹھی میں آ گیا، ذات کا پٹھان تھا، خالص پٹھان، اس لیے اس کے خمیر میں نرمی اور سختی کا تناسب برابر پایا جاتا تھا اور اس وقت اس کی ذات پہ نرمی اور خوفِ خدا کا سایہ تنا ہوا تھا اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔

''بی بی جی..... بی بی جی..... آنکھیں کھولیں بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں آپ کے لیے۔'' گلاب خان دو زانو اس کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھ گیا اور نیم بیہوش پڑی علیزے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی قبر میں دبی ہوئی ہے اور کوئی اسے قبر سے باہر کھڑا آوازیں دے رہا ہے جس کی بہت مدھم سی آواز اس کی سماعتوں تک بمشکل پہنچ رہی تھی اس کا چہرا فرش پہ تھا اس کے چہرے کی ایک سائیڈ فرش سے جڑی ہوئی یوں جیسے اس کے چہرے کا ایک حصہ اور فرش کی سطح آپس میں پیوست ہو چکے ہوں اور فرش کی ساری ٹھنڈک اس کے چہرے میں منتقل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت برف کی طرح سرد اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور وہی نیلے ہونٹ پیاس کی شدت سے لرز رہے تھے۔

''پانی..... پاپا..... پانی..... مم..... مجھے..... پانی..... و..... دو۔'' اس کے منہ سے نامحسوس سی آواز نکل رہی تھی جو بمشکل سنی جا سکتی تھی۔

''بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں نا آپ کے لیے۔ آپ اٹھیں پانی پی لیں۔'' گلاب خان نے دوبارہ کہا تھا لیکن اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہوتی تو وہ جواب دیتی نا اور خود سے اٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا جسم نقاہت سے بے جان ہو چکا تھا اور اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس فرش سے کروٹ بدل کر سیدھی ہو جاتی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟ بی بی جی کو دیکھو۔ وہ ہوش میں آ رہی ہیں شاید۔'' اس نے گلاب خان کو متوجہ کیا۔

''ہاں... ہاں تم ان کو یہ دودھ پلاؤ، ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔'' اس نے فوراً کہا تھا اور گل دوبارہ علیزے کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے چمچے کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کے منہ میں دودھ ڈالنا شروع کیا تھا دودھ نیم گرم تھا جس کی تراوٹ سے علیزے کے سن ہوئے حواس واپس آنے لگے تھے اور لگاتار دو گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد وہ مکمل ہوش میں آ چکی تھی۔ اب اسے خوراک کی ضرورت تھی کیونکہ معدہ خالی تھا۔

''آج زلفی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے لیے دال چاول بنائے تھے آپ کو اگر بھوک لگی ہے تو آپ کے لیے لے آؤں؟'' گل نے اسے تکیے کے سہارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھاتے ہوئے استفسار کیا تھا اور کھانے کے لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا وہ تین دن پہلے اس نے دل آور شاہ کی طرف سے بھیجا ہوا کھانا ٹھکرا دیا تھا اور کھانا سے منہ موڑ کر کبھی نہ کھانا کھانے کا عزم کیا تھا لیکن آج وہ اس نوبت اس حال کو پہنچ چکی تھی کہ کھانے کے سوا اور کسی چیز کی طلب یا ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

آج وہ کھانے کے لیے ترس رہی تھی، وہ جو بھی لے آتے وہ کھانے کے لیے تیار تھی، کیونکہ پیٹ کا دوزخ اگر بھرا نہ جائے تو بڑے بڑوں کو شکست خوردہ، نڈھال، کمزور اور بے جان کر ڈالتا ہے اور وہ تو تھی ہی نازک اندام سی موم کی گڑیا جس نے کبھی ایک منٹ بھی بھوک برداشت نہیں کی تھی جس کے ایک اشارے پر رجو کھانے کے تمام لوازمات اور تمام ڈائٹنگ ٹیبل پر سجا دیتی تھی، ایک وقت کے کھانے میں کئی ڈشز تیار ہوتی تھیں اور وہ محض برائے نام کھانا کھاتی تھی لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کے بے جان جسم میں پھر سے طاقت اور توانائی آ جائے کیونکہ وہ پیٹ کے دوزخ کا یہ عذاب سہار نہیں پا رہی تھی۔ ایک ایسا عذاب جو لوگوں سے قتل کروا لیتا تھا، چوری اور ڈاکے پر مجبور کر ڈالتا تھا، صرف اس لیے کہ پیٹ کا یہ دوزخ خالی نہ رہے، نہ انسان کا اپنا، نہ انسان کے اپنوں کا۔ پیٹ کی آگ ایسی آگ تھی کہ انسان ہر آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا، کیونکہ بھوک اللہ نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جس کے سامنے طاقتور اور کمزور انسان یکساں غیرت، عزت، غرور اور آن سب کچھ ڈھیر ہو سکتا تھا یہاں تک کہ انسان خود بھی۔

''لیجیے بی بی جی! کھانا کھا لیجیے۔'' گل نے کھانے کی ٹرے لا کر اسی کے سامنے نیچے فرش پر ہی رکھ دی تھی اور علیزے نے جھک کر زمین پر رکھی ٹرے اور ٹرے میں رکھے دال چاول کی پلیٹ دیکھی تھی اور علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔ گل نے پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور علیزے نے اپنی کم مائیگی کے باوجود بڑے بے صبرے سے انداز میں چاول کھانا شروع کر دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اس سے چمچہ نہیں پکڑا جا رہا تھا، ہاتھ میں پکڑی پلیٹ بھی لرز رہی تھی بلکہ یہاں تک اس کے حلق سے نوالہ بھی نیچے نہیں اتر رہا تھا مگر وہ پھر بھی پلیٹ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دینے پر آمادہ نہیں تھی یوں جیسے اس سے یہ کھانا بھی چھن جائے گا اور پھر تین چار نوالے کھانے کے بعد جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے جھک کے پلیٹ واپس نیچے فرش پر رکھ دی اور لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ روہ بے ساختہ اپنے حال اپنی کیفیت پہ رو پڑی اور کھانا چھوڑ کر اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے ہچکیوں بلک بلک کر روئی تھی کہ گل اور گلاب خان کے دل بھی کانپ گئے۔ گل کافی دیر اسے تسلی اور دلاسے دیتی رہی لیکن علیزے کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کئی خیال نڈھال کر رہے تھے جن میں یہ خیال سرفہرست تھا کہ وہ وقار سکندری کی بیٹی ہو کر کھانا کھانے کے لیے ترس رہی ہے؟ اس کے پاپا کو پتا چلے گا تو وہ مر جائیں گے۔ ان کی علیزے بھوکی تھی۔ ان کے لیے یہ احساس مر جانے کے برابر تھا۔ علیزے نہ جانے کتنی دیر تک یونہی روتی رہی اور پھر بہت بعد میں گل اور گلاب خان اسے تسلی دے کر چلے گئے تھے البتہ جاتے جاتے کھانا اور پانی وغیرہ پاس رکھ گئے تھے جس کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنی آسائشوں کے بعد غربت کا یہ وقت کاٹنا بے انتہا مشکل تھا۔ اس کا رونا ہلکا نہ ہوا تھا۔

♥

وہ فجر کی نماز پڑھ کے واپس گھر آیا تو بل ڈوگ نے اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے ٹھٹک کر دیکھا تھا بل ڈوگ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اتنے دن ہو گئے تھے اس نے بل ڈوگ پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی سوچ کر وہ اس کی جانب آ گیا اور بل ڈوگ اسے دیکھ کر بڑے لاڈ سے دم ہلانے لگا تھا۔ اس کے

ادھر اُدھر ٹہلنے کی چال بھی بدل گئی تھی۔

''کیسے ہو شیرو؟'' اس نے بل ڈوگ کے قریب آ کر اسے سہلایا تھا اور اس کی کھسیائی ہوئی سی غراہٹ سنائی دینے لگی کر اس موٹے سنگل سے آزاد ہونا چاہتا تھا کہ دل آور نے آگے بڑھ کر دیوار میں نصب کھونٹے سے اس کا سنگل کھول دیا تھا۔ ڈوگ خوشی کے اظہار کے طور پہ اذان کے ایک سرے سے بھاگتا ہوا دوسرے سرے تک چلا گیا۔

''صاحب! بل ڈوگ پہ جب آپ توجہ دیتے ہیں تو اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔'' زلفی مسکرا کر کہتا ہوا قریب اتنے دنوں سے زلفی ہی بل ڈوگ کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی بل ڈوگ کو اتنا خوش نہیں دیکھا جتنا اس وقت دیکھ رہا تھا۔

''اسے مجھ سے پیار ہی بہت ہے، اسی لیے تو اسے انگلینڈ سے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔'' دل آور مسکرایا تھا۔

''حالانکہ آپ کو انگلینڈ سے اسے لانے کے بجائے ایک میم لانی چاہیے تھی۔'' زلفی کی بات پہ دل آور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

''میم اس لیے لے کر نہیں آیا کہ شاید میم اتنی وفادار نہ ہوتی جتنا یہ وفادار ہے۔ وہ دوبارہ واپس جانے کی ضد کرتی، شور ہنگامہ کرتی جبکہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی ضد کرنی ہے اس ملک کا ہر سرد و گرم اس نے میرے ساتھ ہی سہنا ہے اور ذرا سی توجہ پہ یوں خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ جیسے پہلے کبھی خوش ہی نہ ہوا ہو۔'' دل آور کی دلیل پہ زلفی خوب متاثر ہوا تھا۔

''صاحب! آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ اسی لیے تو کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ کاش میں ''دل آور شاہ ہوتا؟'' زلفی کی خو من کر اس کا فلک شگاف قہقہہ گونجا تھا جس پہ قریب آتا گلاب خان کافی حیران ہوا تھا۔

''یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کاش میں ''زلف خان'' ہوتا؟'' دل آور نے ہنستے ہوئے دلچسپی سے زلفی سے کہا تھا۔

''صاحب! میں نے یہ تو نہیں کہا؟'' وہ کھسیانا ہوا تھا۔

''تو پھر اور کیا کہا ہے یار! اگر تم دل آور شاہ ہوتے تو ظاہری بات ہے کہ پھر میں زلف خان ہوتا۔ زلف خان نہ ہوتا تو گلاب خان ہوتا۔ لیکن جو بھی ہوتا یار! لیکن دل آور شاہ نہ ہوتا۔ دل آور شاہ ہونے میں بڑی اذیت ہے۔ تم نہیں جانتے۔'' کہتے کہتے دل کا لہجہ بجھ گیا اس کی زبان پہ تلخی آ گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تلخی بڑھتی اس کے سیل فون پہ ایسریشن ہونے لگی۔

''گلاب خان! بل ڈوگ کے لیے دودھ لے کر آؤ، اس کا بریک فاسٹ دو اسے۔'' دل آور نے اسے ہدایت دیتے کال ریسیو کر لی تھی زلفی بھی وہاں سے چپ چاپ پلٹ گیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام! گڈ مارننگ۔'' دوسری طرف کی آواز نبیل کی تھی۔

''صبح بخیر۔'' دل آور کا انداز سنجیدہ تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' نبیل نے کافی فریش لہجے میں پوچھا۔

''کیوں؟ کیا ہونا چاہیے؟'' دل آور نے اُلٹا اس سے سوال کر ڈالا تھا۔

''بے چینی۔'' نبیل کی آواز بھی کچھ مضطرب اور بے چین سی لگ رہی تھی۔

''بے چینی؟ مطلب؟'' دل آور سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''یار! کیا تمہیں نہیں پتا کہ آج عبداللہ آ رہا ہے؟'' نبیل خفگی سے جھنجلایا تھا اور دل آور کو ہر چیز سمجھ میں آ گئی تھی۔

''اوہ اچھا عبداللہ۔'' اس نے لفظ کو کافی لمبا کھینچا تھا۔

''ہاں یار عبداللہ! کیا تمہیں نہیں یاد تھا؟'' نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

''یاد تھا..... لیکن بے چینی نہیں تھی۔'' دل آور سکون سے بولا۔

''کیوں نہیں تھی؟''

''کیونکہ تمہیں جو ہے۔'' دل آور کے جواب پہ نبیل ٹھٹک گیا۔

''کیا تمہارا دوست نہیں ہے؟''

''صرف دوست ہے نا۔'' اس کا ہر جواب اُلٹا تھا۔

"تو میرا اور کیا ہے؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے جسے بے چینی ہو رہی ہے۔"

"اُف..... میں نے غلط کیا صبح صبح تمہیں فون کر کے۔" نبیل زچ ہو گیا۔

"تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اتنی صبح صبح فون کر کے مجھ سے میری بے چینی پوچھو؟ ویسے اگر میں نے تمہیں اپنی بے چینی بتا دی تو تمہاری ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔" دل آور کا لہجہ مبہم تھا نبیل کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

"اچھا خیر..... یہ بتاؤ کہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے گھر سے کب نکلنا ہے؟" نبیل نے اگلا سوال کیا۔

"نو بجے۔"

"ارے کیوں؟ نو بجے کیوں؟ آٹھ بجے نکلتے ہیں، نو بجے لیٹ ہو جائیں گے۔" نبیل کو جلدی اور بے چینی ایک ساتھ لاحق ہوئی تھی۔

"کیوں ایئر پورٹ پر جا کر میں نے پروازوں کی گنتی کرنی ہے جو آٹھ بجے ہی پہنچ جاؤں ہاں اگر تمہیں اتنی جلدی اور اتنی بے چینی ہے تو تم جا سکتے ہو، میں بعد میں آ جاؤں گا۔" دل آور کے جواب پہ نبیل بیچارا ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن اندر ہی اندر اس پہ تلملا بھی رہا تھا مگر افسوس کہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"او کے نو بجے ہی چلیں گے۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"گڈ..... جلدی عقل آ گئی تمہیں۔" دل آور مسکرا کے بولا تھا۔

"دل آور بے! تمہارا دماغ بڑا ڈیل ہے، اللہ کرے کہ تیرا حال بھی کبھی میرے جیسا ہو۔"

"کیوں..... تمہارے حال کو کیا ہوا ہے؟ کوئی خاص وجہ؟" اس کے انجان بن کے کہے جانے والے سوال پہ نبیل تڑپ اٹھا گیا۔

"نن..... نہیں..... کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی۔" نبیل ٹال گیا۔

"ٹھیک ہے پھر اللہ حافظ۔" دل آور نے بات سمیٹی تھی۔

"او کے گڈ بائے۔" نبیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا لیکن اندر راہداری کی سمت بڑھتے ہوئے دل آور نبیل کو ہی سوچ رہا تھا کیونکہ نبیل اس کو سوچ رہا تھا جو دل آور کو سوچ رہی تھی۔

♥

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے
یہ آج کن نظروں سے تو نے دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

زری کی نگاہیں تھیں اور دل آور شاہ مجسم تھا۔ یہ حقیقت تھی یا افسانہ تھا؟ وہ عالم تھے جو زری کی نگاہوں میں ایک ہو کر ٹھہر گئے تھے، پوری کائنات پر اسم محبت پھونک دیا گیا تھا۔ پوری کائنات اس اسم کے طلسم میں جکڑی گئی تھی جو جہاں تھا وہ وہیں رہ گیا تھا جہازوں کی پروازیں جہاں تھیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں، ایئر پورٹ پہ آنے جانے والے ہزاروں مسافر اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے، ایئر ہوسٹس، پائلٹ اور دیگر عملہ جامد ہو گئے تھے تمام ذی نفس اپنی سانسیں روک چکے تھے کیونکہ زری کا عشق ان سب کو اس وقت ویسے حال میں ہی تصور کر رہا تھا۔ گویا وہ وہاں اکیلی تھی اور اس کے سامنے وہ بھی اکیلا کھڑا تھا باقی ساری دنیا پتھر کی ہو گئی تھی۔ انسانوں سے مجسموں میں تبدیل ہو گئی تھی اور مجسموں کے سامنے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی دنیا سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتے ہوئے سیراب بھی ہو سکتی تھی حالانکہ وہ یہ بھول گئی تھی کہ پوری کائنات حالت حرکت میں ہے سوائے اس کے۔

وہ دوسروں کو پتھر کے مجسمے تصور کر رہی تھیں حالانکہ خود اس وقت پتھر ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا عشق دل آور شاہ کو اپنی آنکھوں سے چوم رہا تھا اس کی آنکھوں نے اس کے اک اک نقش پہ بوسہ دیا تھا اس کے پاؤں پہ، اس کے ہاتھوں پہ، اس کے ماتھے پہ، اس کے چہرے پہ، اس کے بالوں پہ، اک اک نقش کو چوم کر دل میں اتار لیا تھا اور دل کی دھڑکنیں جہاں تیز ہوئی تھیں وہیں انہیں اک قرار آ گیا تھا، رگ و پے میں طمانیت اتر گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھا، اس کی نظروں میں تھا، آنکھوں میں بسا ہوا تھا، دل میں

دھڑک رہا تھا، ایسے عالم میں زری کو اور کیا چاہیے تھا؟

اس کی محبت، اس کا عشق، اس کی چاہ بس ایک ہی تھی۔ دل آور شاہ..... اور..... دل آور شاہ.....

''السلام علیکم۔'' وہ عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ زری جو پتھر بنی کھڑی تھی اس کی آواز پہ، اس کے گمبھیر لہجے پہ، اس کے انداز پہ یکدم جیتے کے پتھریلے حواسوں سے ہوش میں آ گئی تھی اور اسے دیکھنے کے بعد اس کے دل کی حالت نازک تھی کیونکہ دل آور شاہ اس کے سامنے اس کے قریب کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کی نظریں زری کے چہرے پہ تھیں اور زری پر نزع کا عالم تھا۔

اس کی قوت گویائی سلب کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رواں رواں دل آور شاہ کی نظروں کی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کھڑے کھڑے اس کا پورا بدن خوشبودار ہو گیا ہو، وہ صندل کی طرح مہکتی تھی۔

لیکن خود اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ایک سیکنڈ سے بھی زیادہ اس کے چہرے کی سمت دیکھ پاتی۔ دل آور شاہ کی آنکھیں سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی دیوار جاں کی طرح اس کی پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔ وہ موم تھی۔ سرتاپا موم، اور دل آور شاہ کی نظر کی گرمی سے اس کے سامنے کھڑی پگھل رہی تھی۔ یونہی قطرہ قطرہ پگھلتے ہوئے شاید اس کی پوری ذات پگھل جاتی۔ اگر درمیان سے نبیل حیات نہ آ جاتا۔

''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' نبیل نے قریب آتے ہی سلام کیا تھا۔ جس پہ زری کے ساتھ دل آور شاہ بھی چونک گیا تھا۔ اپنے اس طرح چونکنے پہ خود دل آور کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ کیا وہ زری کو اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ پل بھر کے لیے سب فراموش کر بیٹھا تھا؟ یہاں تک کہ عبداللہ اور نبیل کو بھی؟ اُف..... یہ کیا کر بیٹھا تھا وہ۔

اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی تھی اور سر کو نفی میں طرح جھٹکا تھا۔ اس کی ذات پہ دبے پاؤں اک بے اختیاری کا لمحہ آیا تھا بیت گیا تھا۔ اب پھر وہ مشتاق تھی اور وہ بیزار۔ اسے تعلق سے اتعلق ہوتے ہوئے محض چند سیکنڈز لگے تھے۔ زری نے اسے اور قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پاس آ کے اسے خوشبوؤں میں بسا کے، بنا کچھ کہے واپس مڑ گیا تھا اور اس کا یوں واپس زری کی تڑپ اور پیاس کو اور بھی بڑھا گیا تھا۔ وہ بھلا کب سیراب ہو پائی تھی؟ دل آور شاہ صدیوں بھی اس کے سامنے کھڑا رہتا اس کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی۔ وہ عشق کا صحرا تھی۔ اتنی جلدی سیراب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تشنگی مٹانا آسان نہیں تھا وہ اس کی طرح ٹوٹ کر برستا تو کوئی بات بھی تھی۔

اور ادھر نبیل حیات تھا۔ دل کے کشکول میں محبوب کی نظر عنایت کے چند سکے اور فقیر راضی۔

زری اگر کبھی پہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ نبیل حیات اسے دیکھتا ہے تو نبیل حیات بھی کبھی یہ نہیں دیکھ پاتا تھا کہ وہ کسے دیکھتی دیکھ لیتا تو شاید تشکول اس کے قدموں میں توڑ دیتا۔

''لگتا ہے آپ ذہنی طور پہ ابھی تک انگلینڈ میں ہی ہیں؟'' نبیل نے اس کی طرف سے جواب نہ پا کر دلچسپی سے کہا تھا۔ زری نے ایک بار پھر چونک کر دیکھا تھا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟'' اس کے انداز میں الجھن سی تھی۔

''مطلب کہ نہ سلام کا جواب، نہ خیریت کی تسلی، یہاں ہو کر بھی یہاں نہیں لگ رہیں آپ؟'' نبیل نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ سادگی میں بھی بلا کا وقار تھا۔ نبیل کا وقت چاہا وقت ٹھہر جائے اور وہ یونہی کھڑا اسے بے نیاز ہو دیکھتا رہے۔

''تو پھر کہاں لگ رہی ہوں آپ کو؟'' زری نے بھی جواباً دلچسپی سے پوچھا تھا۔

''میرے دل میں.....'' نبیل کا دل چاہا کہہ دے۔ لیکن وقت اور جگہ مناسب نہیں تھے۔

''زری.....'' مدیحہ، نگارش اور عبداللہ سے مل کر لپک کے اس کے پاس آئی اور اس سے لپٹ گئی تھی۔

''مدیحہ تم؟'' زری اس کے اتنے شوخ اور فریش انداز پہ حیران رہ گئی تھی۔

''ارے..... کیوں، کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا؟'' مدیحہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

''ارے یقین کیسے آئے؟ کہاں تو تم پاکستان آنے پہ خوش ہی نہیں تھیں اور کہاں پاکستان آخراتنی خوش ہو کہ مسکراہٹ ہی نہیں رک رہی۔'' زری نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا جس پہ مدیحہ اور بھی ہنسی تھی۔

''ڈونٹ وری..... تم آگئی ہو تو یقین بھی آجائے گا۔'' مدیحہ نے مزید شرارت سے اس کا ہاتھ تھپکا تھا اور اس کی اس شرارت پہ نبیل بھی بے ساختہ ہنسا تھا۔

''کیا آپ لوگوں نے یہیں کھڑے رہنا ہے؟'' نگارش، دل آور کے پاس سے ہٹ کے ان لوگوں کے پاس آگئی تھی اور دل آور، عبداللہ کے ساتھ اس کے سامان کی طرف بڑھ گیا۔

''ارادہ تو یہی ہے۔'' نبیل نے نگارش کی بات پہ کافی دلچسپی سے جواب دیا تھا۔

''لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ آپ کے گھر کا لان نہیں ہے جہاں آپ کا مزید کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔ یہ پبلک پلیس ہے۔ یہاں کھڑے رہنا کافی معیوب لگتا ہے۔'' نگارش کے ٹوکنے پہ نبیل نے حیرت اور خفگی سے دیکھا تھا۔

''اوہ اچھا..... تو آپ نے بھی بھابیوں والے طور طریقے سیکھ لیے ہیں؟'' نبیل کے انداز پہ نگارش بے ساختہ ہنسی تھی۔

''ظاہر ہے بھئی بھابی ہوں تو بھابیوں والے طور طریقے بھی تو سیکھوں گی نا؟ ویسے سچ راستے میں کھڑے ہونا بھی کوئی اچھی بات ہے بھلا؟ جس پہ آپ لوگوں کو شاباش دوں؟'' نگارش کے لہجے میں مصنوعی خفگی تھی۔

''اف توبہ..... آپ تو واقعی بھابی بن گئی ہیں۔'' نبیل نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے اور نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور مدیحہ بھی ہنس پڑی تھیں۔

''نبیل.....'' عبداللہ کی آواز پہ نبیل نے فوراً پلٹ کر دیکھا تھا۔

''چلیں اب؟'' سامان گیٹر ہو کے باہر آچکا تھا۔ اس لیے اب وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار تھا۔

''چلیں بھابی! آپ کے سرتاج، آپ کے ملک صاحب بلا رہے ہیں۔'' نبیل نے نگارش وغیرہ کو چلنے کا اشارہ دیا۔

''ان کے بلانے پہ تو میں کہیں بھی جا سکتی ہوں۔'' نگارش بھی اس وقت کافی شرارتی اور فریش موڈ میں تھی۔

''ہو ہو..... بہت خوب۔'' نبیل نے بھی جواباً چھیڑا اور یونہی ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ لوگ ایئرپورٹ کے مرکزی حصے سے پارکنگ ایریا کی سمت بڑھے تھے۔

''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' دل آور نے عبداللہ کے ساتھ چلتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ سامان کافی زیادہ تھا۔ تین ٹرالیاں سامان سے لدی ہوئی تھیں اور وہ تینوں سامان کی یہ ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ ہی چل رہے تھے۔ اس لیے دل آور کے پوچھنے پہ نبیل کو چونکنا ہوا تھا۔

''کیا مطلب..... کہاں جانا ہے اس نے؟''

''اپنے گھر یا اپنی حویلی؟'' دل آور نے اپنا سوال واضح کیا تھا۔

''اوہ اچھا..... تو یہ پوچھ رہے ہو تم؟'' نبیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو؟'' عبداللہ کو چپ دیکھ کر دل آور کو اُلجھن ہوئی تھی۔

''میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں کیا کروں؟ اپنے گھر جاؤں یا حویلی۔'' عبداللہ بھی اس معاملے پہ آکر کافی اُلجھا ہوا تھا۔

''فیصلہ اتنا مشکل نہیں ہے۔'' دل آور نے نارمل سے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ تم کہہ سکتے ہو، مگر میں نہیں۔ یہ فیصلہ میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ مگر زری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ ایک مشکل ثابت ہوگا۔ زری کو لے کر سیدھا اپنے گھر جاؤں تو تب بھی بابا جان کو غصہ آئے گا کہ میں پہلے حویلی کیوں نہیں گیا؟ اور اگر یہاں سے سیدھا حویلی جاؤں تو تب بھی ان کا غصہ کہ میں نگارش کو حویلی لے کر کیوں آیا ہوں؟ اس لیے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟'' عبداللہ واقعی پریشانی اور کنفیوژن کا شکار تھا اور نبیل کو سن کر حیرت ہوئی تھی کہ زری کا کیا معاملہ ہے۔ آخر ایسا کون سا مسئلہ ہے جس کی اسے خبر ہی نہیں؟

''میں کچھ کہہ سکتا ہوں اس معاملے میں؟'' دل آور کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ معاملہ سنگین تھا۔ نبیل کو بے چینی ہونے لگی تھی۔

''ہوں..... کہو یار! میں تم سے ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا کروں؟'' عبداللہ نے فوراً اثبات میں جواب دیا تھا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے حویلی جاؤ، وہاں سب اچھے طریقے سے ملو، صلح جو انداز اپناؤ۔ تمہاری بی بی جان نے اتنے سال سے تمہیں نہیں دیکھا۔ وہ تم سے ملیں گی، تمہیں دیکھیں گی، تمہارے ساتھ ساتھ بھابی کو دیکھیں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس دیکھنے اور ملانے کے چکر میں ان کا دل کچھ نرم ہو جائے اور معاملہ سلجھ جائے اور جب تمہارا اپنا معاملہ سلجھ گیا تو تم بعد میں دوسرا معاملہ بھی سلجھا سکتے ہو۔'' دل آور شاہ کا مشورہ وہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا لیکن عبداللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اور اس کی فیملی کیا ہے؟ اس فیملی میں نرمی نام کو نہیں تھی۔ بس جو تھی وہ عبداللہ اور زری میں تھی۔ اسی لیے وہ اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف تھے۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے دل آور! لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر میں وہاں نہ رہ سکا تو وہاں سے نکل بھی نہیں سکوں گا۔ کیونکہ زری کو وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا اور وہ دوبارہ زری کو میرے ساتھ بھیجنے پہ تیار نہیں ہوں گے۔ اس بات پہ خون خرابا بھی ہو سکتا ہے۔'' عبداللہ نے اسے پہلے سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔

''اس کا انتظام بھی ہے میرے پاس، تم فکر مت کرو، بس حویلی جاؤ، تاکہ بعد میں وہ لوگ تم پہ یہ اعتراض نہ کریں کہ تم نہیں گئے۔'' دل آور اسے آئندہ کے لیے ایک پوائنٹ سمجھا رہا تھا۔

''دل آور! میں وہاں زری کو ایک پل کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ راتوں رات زبردستی زری کا نکاح پڑھوانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔'' عبداللہ کو صرف اور صرف زری کی فکر تھی اور اس فکر کے بارے میں جان کر نبیل گنگ سا ہو گیا تھا۔

''زری کا نکاح؟ مگر کس سے؟'' نبیل کی حیرانی عروج پر تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے اب واقعی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اور یہ سب کیا چکر ہے؟ بات زری کے متعلق تھی۔ اس لیے عبداللہ کے سامنے وہ مکمل استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دل آور ایک نظر میں اس کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھ چکا تھا۔ وہ نبیل کی کیفیت محض ایک میں ہی بھانپ گیا تھا۔

''میں نے کہا ہم فکر نہ کرو، تم لوگ جیسے جاؤ گے، ویسے ہی واپس آؤ گے، تم گاڑی میں بیٹھو، تمہیں ساری تفصیل سمجھا دیتا ہوں۔'' وہ لوگ گاڑیوں کے پاس آ کر ٹھہر گئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی گلاب خان گاڑی سے نکل آیا۔

''السلام علیکم صاحب!'' گلاب خان نے عبداللہ کو سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟'' عبداللہ دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ دل آور کا ملازم گلاب خان ہے۔

''ٹھیک ہوں صاحب! اللہ کا کرم ہے۔ لائیں سامان گاڑی میں رکھ دوں۔'' اب سامان رکھنے کی ذمہ داری گلاب خان کی تھی۔ وہ ذمہ داری پوری کرنے لگا۔

''ملک عبداللہ ہم سے نہیں ملو گے کیا؟'' دل آور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ جب اس آواز پہ ٹھہر گیا۔ وہ جو عبداللہ سے مخاطب تھا لیکن اس کی زہریلی نظریں اس پہ تھی۔ زری بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رُک گئی تھی۔ اس نے بھی جب مڑ کر دیکھا تو پتھری ہو گئی تھی۔ ملک اسد اللہ کے پہلو میں زری کی موت کا فرشتہ کھڑا تھا، جسے دیکھ کر وہ زرد پڑ گئی تھی اور اس پہ کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

''ملوں گا، ضرور ملوں گا، آپ سے ملنے کے لیے ہی تو آیا ہوں۔'' عبداللہ گاڑی سے پاؤں نیچے اُتارتا ہوا ان کے قریب تھا اور پھر خود ہاتھ آگے بڑھا کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

''آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں۔'' دل آور نے مدیحہ اور نگارش کو اشارہ کیا تھا۔

''دل آور بھائی.....'' نگارش سہم گئی۔

''ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوتا، آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں، یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں ہے۔'' دل آور کا لہجہ سخت تھا۔ لیے مجبوراً ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھنا پڑا اور دل آور نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

''مجھے ملک حق نواز کہتے ہیں۔'' یہ جملہ دل آور کی سماعتوں پہ کسی چابک کی طرح پڑا تھا۔ وہ یکدم دوبارہ پلٹا تھا۔ ملک حق نبیل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

''ملک حق نواز؟'' اس نے زیرِ لب دہرایا اور پھر نبیل سے ہاتھ ملاتے ملک حق نواز کو ایک قہر بھری نظر سے دیکھا تھا اور

قدم اٹھاتا ان کے قریب آ گیا۔

"اور مجھے دل آور شاہ کہتے ہیں۔" اس نے بھی ملک حق نواز کے سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا، جس پہ ملک حق نواز نے بُری طرح ٹھٹک کے دیکھا تھا۔ ملک حق نواز کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر عبداللہ اور نبیل کو بیک وقت حیرت ہوئی تھی۔ دل آور کے تعارف نے اس کے چہرے کے تاثرات بدل کے رکھ دیئے تھے، سارا تفاخر سرد پڑ گیا تھا۔

"مجھے اُمید نہیں تھی کہ ملک صاحب کہ آپ میرے تعارف کو یوں دل پہ لے لیں گے۔" دل آور، ملک حق نواز کو کافی گہری اور کاٹ دار نظروں سے دیکھتا چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"جو لوگ ہمارے دماغ میں گھڑی کی سوئیوں کی طرح ٹک ٹک کرتے رہتے ہیں وہ اگر سامنے آ جائیں تو ان کے تعارف کو دل پہ لینا ہی پڑتا ہے۔" ملک حق نواز نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اور دل آور سے ہاتھ ملایا تھا۔

"چلیں یہ بھی جان کر خوشی ہوئی کہ میں آپ کے دماغ میں ٹک ٹک کرتا رہتا ہوں یعنی ہر دم آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔" دل آور کا انداز استہزائیہ تھا۔ جو ملک حق نواز کو کافی ناگوار گزرا۔

"اور میں آج کل اس ٹک ٹک کو بند کرنے کی کوشش میں ہوں، اُمید ہے جلدی بند ہو جائے گی۔" ملک حق نواز کافی چبا کے بولا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے یہ ٹک ٹک بند نہیں ہو گی اور بڑھے گی، اتنی کہ ملک صاحب نیند کو ترسیں گے۔" دل آور کا لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا۔

"یہ تو وقت آنے کی بات ہے شاہ صاحب؟" ملک حق نواز کچھ جتا رہا تھا۔

"وقت آ چکا ہے ملک صاحب اور کس وقت کا انتظار ہے آپ کو؟ اپنا بندوبست کر رکھیں، بلاوا کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔" دل آور نے بھی اسے اشارہ دے دیا تھا۔

"یہ بلاوا جتنا میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا، اتنا آپ کے لیے بھی ہو گا۔" ملک حق نواز نے دھکی چھپی دھمکی دی تھی۔

"میں قاتل، زانی اور شرابی نہیں ہوں۔ میں غریبوں کا گوشت کھانے والا بھیڑیا نہیں ہوں، بلکہ میں تم جیسے بھیڑیوں کو دنیا کے سامنے لانے والا آدمی ہوں۔ تم جیسے دس بھی آ جائیں تو میرا نقصان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اوپر والا جانتا ہے، کون کتنا غلط ہے۔" دل آور کے چہرے پہ غصہ اُتر آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز کے ٹکڑے کر دے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر تو اس کا پارہ ویسے ہی ہائی ہو جاتا تھا اور ملک حق نواز تھا کہ اُلٹا اسے دھمکی دے کر اور رعب جما کر بات کر رہا تھا اور دل آور کا خون کھول اُٹھا تھا۔

"دل آور..... پلیز کول ڈاؤن! کیا مسئلہ ہے آخر؟" عبداللہ نے دل آور کا غصہ اُمڈتے دیکھا تو فوراً اس کا بازو تھام لیا تھا۔

"مسئلہ تم ان ہی سے پوچھنا کہ ان کے کرتوت اور کارنامے کیا ہیں؟" دل آور نے انتہائی غضب اور حقارت سے ملک حق نواز کو دیکھتے ہوئے عبداللہ کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

"حق نواز چلو تم گاڑی میں بیٹھو، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" ملک اسد اللہ نے ملک حق نواز کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔

"چلو..... تم بھی گاڑی میں بیٹھو۔" عبداللہ نے دل آور کو اشارہ کیا تھا۔

"جا رہا ہوں، میں بھی فی الحال کوئی بدمزگی نہیں چاہتا، لیکن ملک حق نواز اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری گردن اور انصاف کا پھندا ایک دوسرے سے دور نہیں ہیں۔" اس نے جاتے جاتے ملک حق نواز کو وارننگ دی تھی اور پھر پلٹ کر دوبارہ گاڑی تک آ گیا۔

"دل آور پلیز یار! کچھ بتاؤ تو سہی؟ آخر آپ لوگوں کے درمیان کیا مسئلہ چل رہا ہے؟" عبداللہ کو تجسس ہو رہا تھا۔

"بعد میں بتاؤں گا، ابھی تم گاؤں جاؤ۔" اس نے بتانے سے گریز کیا تھا۔

"ارے نہیں یار! تم سمجھ نہیں رہے، میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ملک حق نواز کے حوالے سے کوئی اور ویک پوائنٹ تو کم از کم مجھے حویلی جانے سے پہلے پتا تو ہو؟ تاکہ میں اس پہ کچھ بول تو سکوں۔" عبداللہ، ملک حق نواز کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتا تھا۔ دل آور نے اس کی بات پہ پہلے نبیل کو، پھر دوبارہ عبداللہ کو دیکھا اور گہری سانس کھینچی تھی۔

"اس نے ایک لڑکی مومنہ بی بی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آج سے تقریباً دس گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔ مومنہ بی بی انصاف چاہتی ہے۔ اس کا کیس میرے ہاتھ میں ہے اور مومنہ بی بی آج کل نبیل کے گھر میں رو رہی ہے۔ اس گھٹیا انسان سے چھپ

چھپ کے جی رہی ہے کہ کہیں یہ اس کے الزام سے بچنے کے لیے اس کا قتل ہی نہ کروا دے۔" دل آور نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بتایا تھا اور عبداللہ اور نبیل ششدر رہ گئے تھے۔

نبیل کے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا تھا کہ یہ وہی ملک حق نواز ہے جس کے بارے میں اس روز انسپکٹر شہباز بتا رہی تھی اور مومنہ بی بی کا مجرم تھا۔ جس نے مومنہ بی بی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔ وہ کتنے دھڑلے سے زندہ تھا پھر رہا تھا لیکن ایک اور تکلیف دہ تھی کہ وہ عبداللہ کا رشتہ دار تھا، بلکہ زری کا بھی۔

"دل آور! تم سچ کہہ رہے ہو؟" عبداللہ تو جیسے شرمندگی سے مر گیا تھا۔

"میرے سچ کی تصدیق کرنی ہے تو مومنہ بی بی کے پاس جاؤ، نبیل کے گھر پہ ملے گی۔" دل آور نے تلخی سے اشارہ کیا۔

"اف خدایا! میرے خاندان میں ذلالت اب اس حد تک بڑھ گئی ہے۔" عبداللہ کا دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔ اس نے سر لیا۔

"تم خاندان کی بات کرتے ہو، میرے تو اپنے گھر میں ہی ذلالت پائی گئی ہے۔" نبیل کا خیال اپنے باپ کی طرف گیا اور دل میں اک اذیت کا اُبال سا اٹھا تھا۔

"خیر چھوڑو اس مسئلے کو... میں نبٹ لوں گا، تم جاؤ اب۔" دل آور نے اپنے اعصاب کھانے پہ لاتے ہوئے عبداللہ کو تھپکا تھا۔

"لیکن یار! میں ان ظالم اور بے حس لوگوں میں زری کو لے کر کیسے جاؤں؟" وہ اس ندی میں پیر ہی نہیں ڈال رہا تھا۔

"یہ لو... یہ اپنے پاس رکھ لو، کام آئیں گے۔" دل آور نے ایک موبائل فون اور ایک ریوالور عبداللہ کو تھما دیا تھا۔

"اس موبائل میں میرے نمبر کے علاوہ گلاب خان، نبیل، انسپکٹر شہباز اور ایس پی کامران اور پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی ہے۔ تمہیں فوری طور پہ جس کی بھی مدد کی ضرورت ہو تم کال کر سکتے ہو اور یہ بھی لو ڈڈ ہے، اس کو استعمال کرنے کی نوبت آئے تو پیچھے پہ مت استعمال کرنا، سیدھا سیدھا قاتل کا کیس ہو گا، اس لیے استعمال کرنا پڑا تو کسی کی ٹانگ یا بازو پہ استعمال کرنا، جان نہ جائے، ہوش و حواس بے شک چلے جائیں۔" دل آور نے اسے ہر طرح سے سمجھا دینا ضروری سمجھا تھا اور عبداللہ اس پہ عمل کر گیا تھا۔

"ٹھیک ہے یار... تھینک یو سو مچ... اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ سب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔" عبداللہ بے ساختہ اس سے بغلگیر ہو گیا تھا اور دل آور نے قہقہہ جھٹک کر اس کو تسلی دی اور گلاب خان کو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

اور گاڑی میں بیٹھی زری کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے آنے والے وقت سے خوف آ رہا تھا کہ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ دل آور، عبداللہ اور نبیل گاڑی سے باہر کھڑے نہ جانے کیا کیا پلان بنا رہے تھے کہ نگارش کو بھی پریشانی اور بے چینی لگی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل آور ان کو گاڑی میں بٹھائے گیا تھا۔ اس لیے نہ تو وہ گاڑی سے نکل سکتی تھیں اور نہ ہی ان کو بلا سکتی تھیں۔ لیکن شاید اللہ کو ہی ان کی حالت پہ رحم آ گیا تھا کہ وہ تینوں گاڑی کے قریب آ گئے اور نبیل نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا تھا۔

"مدیحہ! تم اپنی گاڑی میں آ جاؤ، ان لوگوں نے گاؤں جانا ہے۔" نبیل کے کہنے پہ زری نے یکدم ہراساں سے نگارش کو دیکھا تھا۔

"گاؤں؟" اس کی سانسیں اٹکنے لگی تھیں۔

"کچھ نہیں ہو گا، یوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ ہی ہیں۔" نبیل نے تسلی دی تھی اور مدیحہ، زری اور نگارش گاڑی سے اتر آئی تھی۔

زری نے بے اختیار گاڑی سے باہر کھڑے عبداللہ سے بات کرتے دل آور کو دیکھا تھا۔ زری کے دل کی تو پیاس بجھی تھی اور وہ لوگ گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ زری کے دیکھتے ہی دیکھتے نبیل نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر سیٹ گلاب خان نے سنبھال لی تھی اور دل آور سے رخصت ہو کر عبداللہ بھی فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھا تھا۔ دل آور اور نبیل دونوں

تھے اور گلاب خان گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اس کے پیچھے مدیحہ بھی گاڑی نکال لے گئی تھی اور رفتہ رفتہ وہ دونوں بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔

♥

وہ نہا کر نکلا اور تولیے سے بال رگڑتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا تھا جہاں مریم پہلے سے موجود کمرے کی صفائی کرنے میں مصروف تھی۔ عدیل کو گنگناتے دیکھ کر اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔ وہ کل سے کافی خوش اور فریش لگ رہا تھا۔

"یہ گانا آپ نے سنا پہلی بار ہے؟ یا اچھا پہلی بار لگا ہے؟" مریم کے سوال پہ عدیل گنگناتے ہوئے رُک گیا۔

"کیا مطلب؟" عدیل نے تولیہ کھونٹی سے لٹکا کے اپنی شرٹ پہنتے ہوئے مریم کو تبھی سے دیکھا تھا۔

"مطلب کہ آپ کل سے جب سے کام سے واپس آئے ہیں یہی گانا گنگنا رہے ہیں۔ کیا یہ گانا زیادہ اچھا لگ رہا ہے آپ کو۔" مریم کے کہنے پر عدیل یکدم اک بے ساختہ سا قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔ تو گویا مریم کل سے اسے نوٹس کر رہی تھی۔

"یہی سمجھ لو کہ اچھا پہلی بار لگا ہے۔ ورنہ سنا تو پہلے بھی تھا۔" عدیل نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اوہ اچھا اچھا..... تو جس کی وجہ سے اچھا لگا ہے اس کا نام بتا سکتے ہیں؟" مریم جاننا چاہتی تھی۔

"میرے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود جانتی ہو اسے..... بلکہ مل بھی چکی ہو۔" عدیل اپنی خوشی اپنے دل کی کیفیت مریم سے نہیں چھپا سکتا تھا۔

"یعنی مدیحہ حیات!" مریم نے بستر کی چادر سے سلوٹیں دور کرتے ہوئے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ہوں..... وہی۔" عدیل اثبات میں جواب دیتا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

"سچ؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔" مریم چادر کا کونا چھوڑ کے پوری طرح سے عدیل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"کیوں..... اس میں ناقابل یقین کیا ہے؟ کیا اپنے بھائی کی پرسنالٹی پہ کوئی شک ہے؟" عدیل نے مریم کو چھیڑا تھا۔

"ارے نہیں..... نہیں مجھے اپنے بھائی کی پرسنالٹی پہ پورا یقین ہے۔ بس اس لیے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو شاید لندن پلٹ ہے اور تھوڑی اکھڑ مزاج بھی ہے۔ آپ کا اور اس کا یہ جوڑ میل؟ مریم بات ادھوری چھوڑ کے چپ ہو گئی تھی۔

"لندن پلٹ ہے تو کیا ہوا؟ کیا اس کے پاس دو آنکھیں اور ایک دل نہیں ہے؟ کیا وہ دیکھ کر محسوس نہیں کر سکتی؟ کیا وہ لوبی نہیں ہے؟ اور ہاں وہ اکھڑ مزاج اور ضدی ضرور ہے، لیکن اندر سے بہت حساس اور نرم ہے۔ اس کو آئینے کی طرح دیکھ چکا ہوں میں۔ اتنی شفاف تھی کہ مجھے اس میں اپنا آپ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ناریل کی طرح ہے، باہر کا خول بہت سخت سہی، لیکن اندر سے بچی کری (گیے ناریل) کی طرح ہے نرم اور میٹھی۔" عدیل نے مدیحہ کے حوالے سے دل کھول کے اظہار کیا تھا اور مریم اس کے اظہار پہ مسکرا اٹھی تھی۔

"یعنی آپ گئے کام سے؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"ہاں..... کہہ سکتی ہو۔" عدیل نے بھی جواباً شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنے بال سہلائے تھے۔

"تو کیا یہ گلاسز بھی اسی کے ہیں؟" مریم نے عدیل کے بیڈ کے نیچے رکھے گلاسز نکالے، جو کافی عرصے سے عدیل کے بیڈ کے نیچے ہی پائے جاتے تھے۔

"آف کورس..... اور کس کے ہو سکتے ہیں بھلا؟" عدیل یوں لاپروائی سے کہہ رہا تھا جیسے اس کا مدیحہ کے ساتھ صدیوں سے کوئی ریلیشن چلا آ رہا تھا۔

"اوہ..... مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ خیر آپ یہ بتائیں کہ آپ ان سے ہماری ایک پراپر طریقے سے مہذب اور پُرتکلف سی ملاقات کب کروا رہے ہیں؟" مریم نے فرمائش کی تھی۔

"جب مجھے سیلری ملے گی۔" عدیل کے چہرے سے ابھی تک مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

"اوہو..... سیلری ملنے میں تو ابھی دس، بارہ دن باقی ہیں؟" مریم نے بدمزا ہوتے ہوئے بُرا سا منہ بنایا۔

"تو کیا یونہی خالی گھر میں لے آؤں؟ آج کل کے دنوں میں تو گھر میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، کسی مہمان کو کیا کھلائیں گے بھلا؟" عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور مریم ذرا دیر کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

''میں کوشش کروں گی کہ مجھے جلدی سیٹری مل جائے، پھر انہیں انوائیٹ کروں گی۔'' مریم کے لہجے میں اک عجیب سی چاہ
وہ مدیحہ سے، جس رشتے کے حوالے سے ملنا چاہتی تھی اس کو سمجھتے ہوئے عدیل کے چہرے پہ نرمی بکھر گئی اور پھر مریم کے قریب
ہوئے اس کا سر تھپکا تھا۔

''ان شاء اللہ..... اللہ بہت بہتر کرے گا..... کبھی وہ وقت بھی آئے گا، جب مہمان جس وقت بھی آئے گا، ہمیں پریشانی
ہوگی کہ ہمارے پاس خاطر مدارات کے لیے چائے اور کولڈ ڈرنک کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جب تمہیں تمہارے لیے لایا ہوا
اور کوئیں دینا پڑے گا۔'' عدیل اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا اسے..... اور مریم اپنے آنسو ضبط کرنے
لیے سر جھکا گئی تھی۔

''عدیل! تمہارے بابا کو تیار کر دیا ہے میں نے۔'' برآمدے سے امی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ابا جی کے چیک اپ
لیے جانا تھا۔ اس لیے عدیل نے آج ورکشاپ سے چھٹی کی تو مریم بھی اکیڈمی جانے کے بجائے گھر پہ رہ گئی تھی۔ تاکہ عدیل
ساتھ ہسپتال جا سکے، کیونکہ عدیل اکیلا ان کے ساتھ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں ڈاکٹرز کے پیچھے بھاگنا
اپ کے لیے نیر فکرانا اور ساتھ ساتھ مریض کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے مریم، عدیل کی مدد کے خیال سے گھر پہ ہی
تھی اور اب ان دونوں، بہن، بھائی نے ساتھ ہی جانا تھا۔

''چلو..... جلدی کرو، تم بھی تیار ہو جاؤ، تب تک میں ٹیکسی لے آتا ہوں۔'' وہ زمی سے اس کا سر تھپک کے باہر نکل گیا
مریم ہاتھ میں پکڑے گاؤن دوبارہ اس کے بیگ کے نیچے رکھ کے بستر کی چادر درست کر کے باہر نکل آئی تھی۔ اور چادر اوڑھ کے
گئی تھی۔ اتنے میں عدیل واپس بھی آ گیا۔ ٹیکسی گلی کی نکڑ پہ کھڑی تھی۔ عدیل، ابا جی کو بازوؤں میں اٹھائے گاڑی تک لے گیا
کے پیچھے پیچھے مریم بھی ٹیکسی میں آ بیٹھی تھی۔

♥

اس کی گاڑی اپنے آفس کے سامنے ایک جھٹکے سے رکی تھی اور اس کے پیچھے نبیل کی۔
دل آور گاڑی سے اترا تو اس کے پیچھے نبیل بھی اتر آیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آفس روم میں داخل ہوئے تھے
''بتاؤ اب کیا مسئلہ ہے؟'' دل آور نے موبائل اور چابیاں ٹیبل پہ ڈالتے ہوئے نبیل کو دیکھا۔ نبیل کرسی کے ہتھوں پہ
سے ہاتھ ہٹائے بیٹھا تھا۔ اس کے سوال پہ فوراً ہی بے چینی سے کھڑا ہو گیا۔
''مسئلہ میں نے بتانا ہے تم نے بتانا ہے؟ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ملک حق نواز کا کیا مسئلہ ہے؟ اور وہ نکاح کی کیا
رہے تھے تم لوگ؟'' نبیل بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
''آرام سے بیٹھو گے تو بتاؤں گا نا؟'' دل آور اپنی چیئر دھکیل کر بیٹھ گیا تھا اور بے چین اور بے کل سے ٹہلتے نبیل کو سر
تھا۔ نبیل پہ کیا گزر رہی تھی دل آور بخوبی جانتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے اپنی بے چینیوں کو سینے کے سب سے سرد خانے میں
تھا۔ صرف ایک کا بے چین رہنا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ اگر دونوں ہی بے چین رہتے تو شاید ایک دوسرے کے دوست ہی نہ رہتے
اور اس وقت ان دونوں کے درمیان ٹینشن اور کنڈیشن کچھ اور ہوتی اور یقیناً ایک دوسرے سے نظر بھی نہ ملا پاتے۔
لیے دل آور شاہ بہت پہلے ان بے چین اور بے کل کر دینے والی راہوں سے قدم واپس موڑ چکا تھا۔ وہ اس منزل کو نہیں پانا چ
جس کو پانے کے لیے نبیل کے قدم بھی رواں دواں تھے۔ جس کو پانے کی چاہ نبیل کے دل میں بھی ہمکتی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر
خود وہ منزل پا لیتا اور نبیل کو نامراد ٹھہرا دیتا۔ اس کی مسافت رائیگاں کر دیتا، اسے مایوس لوٹنے پہ مجبور کر دیتا؟ وہ ایسا سوچ بھی
تھا، کیونکہ دل آور شاہ جیسا بھی تھا لیکن خود غرض نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ اسے یہ سارے رشتے اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز تھے۔
''ہوں..... بتاؤ؟'' نبیل اپنی بے چینی کنٹرول کرتا ہوا دوبارہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور دل آور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہو
سانس خارج کرتا خود بھی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔
''ملک حق نواز کو جانتے ہو..... وہ کون ہے؟'' دل آور نے آغاز سوال کرنے سے کیا تھا۔
''نہیں.....'' نبیل کا جواب حسب توقع تھا۔
''وہ ملک شرافت علی کا چچا زاد کزن ہے۔''

''ملک شرافت علی.....؟'' نبیل کا دماغ اس وقت آدھا حاضر.....آدھا غیر حاضر تھا۔

''عبداللہ کے بابا جان۔''

''واٹ.....؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے بدلا؟'' دل آور کے انکشاف پہ نبیل دنگ رہ گیا تھا۔

''مجھے بھی اسی طرح شاک لگا تھا۔ خیر آگے سنو۔'' دل آور نے بات کا سلسلہ جاری رکھا۔

''ملک حق نواز، ملک شرافت علی کا سب سے چھوٹا کزن ہے، عبداللہ سے آٹھ دس سال بڑا اور ملک اسد کا تقریباً ہم عمر ہی ہو گا۔ ملک حق نواز ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کے چاؤ چونچلے بھی کچھ زیادہ ہی تھے اور ان چاؤ چونچلوں میں بڑے بزرگوں نے بنا سوچے سمجھے عبداللہ کی بڑی بہن شہرین کو ملک حق نواز کے ساتھ منسوب کر دیا لیکن ملک حق نواز شروع سے ہی ایک خبیث انسان ثابت ہوا ہے اس نے جوانی کے منہ زور گھوڑے پہ سوار ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ شہرین کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دیا، پتا نہیں یہ شہرین کی خوش قسمتی تھی کہ بدقسمتی..... البتہ ملک حق نواز اپنے چچازاد..... کی بیٹی کے ساتھ بندھ کے نہیں رہنا چاہتا تھا حالانکہ بہت لوگوں نے اسے منانے کی کوشش بھی کی تھی یہاں تک کہ ملک شرافت علی نے خود بھی اسے راضی کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ ملک شرافت علی کی ملک حق نواز پہ نہیں اس کی جاگیر، اس کی جائیداد پہ نظر تھی، کیونکہ وہ اکلوتا جو تھا؟ مگر اکلوتا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ضدی، بدلحاظ اور ایک نمبر کا خبیثی آدمی تھا، وہ نہیں مانا اور اپنی من مانی کرتا رہا، شراب اور حرام کاری اس کا شوق بن چکے ہیں، وہ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا، آس پاس کے گاؤں والے اور اس کے اپنے گاؤں والے ہر وقت اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

''بار الیکشن میں بھی حصہ لے چکا ہے اور دونوں بار ہیت بھی چکا ہے۔ ملک شرافت علی کی بیٹی کو ٹھکرانے کے بعد بھی وہ ان کا منظورِ نظر ہے اور اب زری سے شادی کا خواہش مند ہے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے شہرین کو ٹھکرانے کا ازالہ کرنا چاہتا ہے اور عبداللہ مسلسل احتجاج کر رہا ہے کہ یہ ازالہ ہے یا ظلم؟ وہ اپنے گھر والوں کے اس فیصلے کے خلاف ہے۔ وہ زری کی شادی زری کی پسند سے کرنا چاہتا ہے، اس لیے یوں سمجھو کہ عبداللہ آج اپنے گاؤں، اپنی حویلی میں جنگ لڑنے گیا ہے۔ اب یہ جنگ کیا نتائج سامنے لاتی ہے یہ تو رات کو پتا چلے گا یا پھر کل؟'' دل آور نے نبیل کو ساری تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور نبیل دم بخود سا بیٹھا سن رہا تھا۔

''ملک حق نواز، زری سے شادی کا خواہشمند ہے؟'' یہ سوچ ہی نبیل کی رگوں کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھی نبیل کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز دوبارہ اس کے سامنے آجائے تو وہ اسے گولی سے اُڑا دے، اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو تھیں۔

''وہ..... وہ کیا کہتی ہے اس بارے میں.....'' نبیل کو زری کا خیال آیا تھا جس پہ دل آور کے دل و دماغ کا سکون منتشر ہو گیا تھا وہ اپنی کرسی چھوڑ کے اٹھ گیا۔

''مجھے کیا پتا کہ وہ کیا کہتی ہے؟ میں کون سا اس کے ساتھ ہوتا ہوں؟ یا پھر اس کے دل کی خبریں رکھتا ہوں؟'' دل آور کہتے ہوئے رُخ موڑ گیا تھا۔

''لیکن دل آور! تم جانتے ہو نا کہ میں.....'' نبیل کافی بے بسی سے بولا تھا لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ دل آور کا منشی دروازے پہ دستک دے کر اندر آگیا تھا۔

''سر! وہ آپ کے سیالکوٹ والے کلائنٹ آئے ہیں، قتل کے کیس والے..... آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔'' قادر اس کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

''پانچ منٹ بعد انہیں اندر بھیج دو۔'' دل آور نے قادر کو جانے کا اشارہ کیا اور نبیل کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ عبداللہ کچھ نہیں ہونے دے گا۔ اس لیے تم بھی یہ یقین اپنے ساتھ رکھو۔ ان شاء اللہ سب بہتر ہی ہو گا۔'' دل آور نے اپنا مضبوط ہاتھ نبیل کے کندھے پہ جماتے ہوئے اس تسکین دی تھی اور دل آور کے ایسے مضبوط لہجے اور انداز پہ نبیل کو کافی حد تک تسلی ہوئی تھی اسی لیے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا تھا، کیونکہ دل آور کے کلائنٹ اس کے انتظار میں تھے۔

♥

وقار آفندی پوری طرح سے ہوش و حواس میں آچکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ساکت و صامت سے لگ رہے تھے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے سارے ہی چہرے موجود تھے آذر، دانیال، جودت، احمد، حماد، زین، عون، عدید، اسرار آفندی اظہار آفندی سب چہرے باری باری ان سے ملنے کے لیے ان کے سامنے آتے رہے۔ لیکن جس چہرے پر ان کو ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھنا چاہتی تھیں وہ سامنے ہی نہیں آرہا تھا، وہ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے وجود کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی پتھرا گئی تھیں۔

"وقار....." ان کے قریب سے گلوگیر اور آنسوؤں کے بوجھ سے بھیگی اور بوجھل آواز ابھری تھی اور اس آواز کو سنتے ہی ان کے دل پر لرزا طاری ہو گیا تھا۔

"آسیہ....." ان کا دل زور سے دھاڑا تھا اور پھر دھاڑیں مار مار کے رویا تھا۔ زبان سے وہ پکار نہیں سکتے تھے اور دل سے پکارنے پر آسیہ آفندی سن نہیں سکتی تھیں۔ وقار آفندی کا دل بھر آیا تھا۔

"وقار! مجھے دیکھیں نا..... میں ہوں آپ کی آسیہ..... آپ..... آپ مجھ سے منہ موڑے یہاں ہسپتال میں کیوں پڑے ہیں آپ کو نہیں پتا آپ کے بغیر میرا کیا حال ہو گیا ہے؟ آپ کی آسیہ چار دن میں ہی بوڑھی لگنے لگی ہے۔ یقین کریں وقار، آسیہ آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے میں تو سب کچھ آپ پر وار چکی ہوں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیا کروں گی میں..... یہاں کوئی کام کا نہیں ہوتا۔ میرا کون ہو گا؟" آسیہ آفندی، وقار آفندی کا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے بے تحاشہ رو رہی تھیں اور ان کی طرح رونے پہ وقار آفندی کی پتھرائی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ ان کا پورا جسم بے جان تھا اور بے جان جسم کی پتھرائی آنکھوں سے آنسو بہہ کر خود بخود ہی ان کی کنپٹیوں سے لڑھک کر بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

"وقار! آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آتا؟ آپ ٹھیک کیوں نہیں ہو رہے؟ آپ..... آپ میرے لیے نہ سہی میرے بچوں کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میرے عون اور عدید کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میری..... میری علیزے کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ وقار آپ سن رہے ہیں نا؟ میں آپ سے کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ کو ہم سب کی خاطر ٹھیک ہونا ہے۔" آسیہ آفندی تڑپ تڑپ کے کہہ رہی تھیں۔ وقار آفندی کے آنسو خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ وقار آفندی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ان کے سوالوں کا، ان کے پاس ہر خاموشی تھی۔ لمبی اور گہری خاموشی، سوال کرنے والوں کو نڈھال کر دینے والی خاموشی۔ عمر بھر کی خاموشی۔

"آنی پلیز..... آپ باہر آجائیں۔" دانیال، آسیہ آفندی کو دونوں کندھوں سے تھام کے ان کے روم سے باہر لے آیا تھا۔ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

"ہم آپ کو اس لیے ساتھ لے کر آئے تھے کہ آپ ان کو تسلی دیں، دلاسہ دیں، ان کی ہمت بڑھائیں تاکہ ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب کر دیں۔" دانیال خفا ہو رہا تھا۔

"دانیال! عون اور عدید کو بھی آنی کے ساتھ واپس گھر بھیج دو۔" احمد نے عون اور عدید کو دانیال کی طرف بھیجا، دانیال تھوڑی آنی کو تسلی دلاسہ دینے کے بعد مبارک خان کے ہمراہ گھر بھیج کر دوبارہ روم میں آیا تو وقار آفندی کی حالت کافی تشویشناک پائی۔ ڈاکٹرز ایک دم سے پریشان نظر آنے لگے۔ اور ان کا ٹریٹمنٹ نئے سرے سے شروع ہو گیا تھا۔

"یہ اچانک کیا ہوا ہے ان کو؟" آذر پریشانی سے آگے بڑھا تھا۔

"انہوں نے کوئی گہری ٹینشن لی ہے، دل بہت کمزور ہو چکا ہے، سہہ نہیں پا رہا۔" ڈاکٹر پریشانی سے جواب دے رہا تھا۔

"یہ میڈیسن فوراً منگوائیں۔" ڈاکٹر نے تیزی سے کاغذ قلم تھام کے نسخہ لکھا اور کاغذ آذر کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"ہسپتال کی ڈسپنسری سے یہ میڈیسن ختم ہو چکی ہیں، اس لیے آپ کو کسی اور جگہ سے تلاش کرنا پڑیں گی۔" ساتھ ساتھ نرس نے بتا بھی دیا تھا اور آذر وہ نسخہ ہاتھ میں تھامے پرائیویٹ روم سے باہر نکل آیا تھا۔

"لائیے یہ میڈیسن میں لے آتا ہوں۔" جودت نے آذر کو روک دیا تھا اور وہ نسخہ خود تھام لیا تھا۔

"لیکن تم.....؟" آذر نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"میرے پاس بائیک ہے۔ میں جلدی لے کر آجاؤں گا۔" جودت نے اسے یقین دلایا تھا۔

"اوکے..... لے آؤ لیکن پھر وہی بات کہ جلدی پہنچنا ڈیڈ کی کنڈیشن خاصی سیریس ہے۔" آذر نے پھر بھی اسے تاکید ضروری سمجھا تھا۔

"اوکے..... جلدی پہنچوں گا۔" جودت اسے تسلی دے کر پلٹ گیا تھا۔

"چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" جودت کا دوست کامی بھی ڈیڈ کی عیادت کے لیے ہسپتال آیا ہوا تھا، جودت کو میڈیسن لانے کے لیے تیار دیکھا تو وہ بھی ساتھ ہی آ گیا۔

♥

"ڈاکٹر نے یہ میڈیسن اور انجکشن لکھ کر دیئے ہیں تم ابا جی کے پاس ٹھہرو میں یہ سب لے آؤں۔" عدیل ڈاکٹر کے روم سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سفید پرچی تھی وہ مریم کو بتا کر میڈیکل اسٹور پہ جانے والا تھا کہ مریم نے اسے روک دیا تھا۔

"ٹھہریں آپ ایسا کریں کہ ابا جی کو کچھ دیر کے لیے کسی وارڈ کے بیڈ پہ لٹا دیں، وہ زیادہ دیر اس وہیل چیئر پہ نہیں بیٹھ سکتے، تھک جائیں گے۔"

"لیکن مریم! کوئی خالی بیڈ ڈھونڈنے میں ٹائم لگے گا ڈاکٹر نے یہ انجکشن فوری منگوائے ہیں۔" عدیل پریشانی سے بولا۔

"لائیں یہ میڈیسن اور انجکشن میں لے آتی ہوں۔" اس نے عدیل کے ہاتھ سے پرچی تھام لی تھی اور پھر پلٹ کر ہسپتال کے اندرونی حصے سے باہر نکل آئی اور اپنی بے دھیانی میں وہ عدیل سے دوائیوں کے لیے پیسے لینا بھی بھول گئی تھی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ ہسپتال کے باہر بنے میڈیکل اسٹورز میں سے ایک سٹور کی طرف بڑھی تھی۔

"پلیز یہ میڈیسن دے دیں۔"

اس نے سفید پرچی پہ لکھا نسخہ میڈیکل سٹور کے سامنے والے کاؤنٹر پہ رکھا اور سیلز مین کو جلدی دوائیاں نکالنے کا کہا تھا، وہ اپنے دھیان میں تھی اپنے قریب کھڑے جودت کو بھی نہ دیکھ سکی البتہ جودت کے ساتھ کھڑے کامی نے اسے ضرور دیکھ لیا تھا۔

"جودت....." اس نے جودت کو پکارا دیا۔

"ہوں.....؟" پریشانی میں جودت کو بھی آس پاس کا کوئی دھیان نہیں تھا۔

"ادھر دیکھو۔" کامی نے اشارہ کیا تھا۔

اور جودت نے اپنی سائیڈ پہ دیکھا اس سے تین قدم کے فاصلے پر مریم کھڑی تھی جودت اس کو دیکھتے ہی چونک گیا تھا۔

"مریم....." اس نے خود کلامی کے سے انداز میں اس کا نام لیا تھا۔

"جانتے ہو اسے؟" کامی کو پتا تھا کہ یہ لڑکی جودت کی کمزوری ہے، وہ اپنی فیلنگز کا کئی بار سرعام اظہار کر چکا تھا۔

"نہیں..... بالکل نہیں ہے مجھے میڈیسن لے کر جلدی پہنچنا ہے۔" جودت کو پتا تھا کہ اگر ذرا بھی لیٹ ہو گیا تو آذر کے ہاتھوں اس کی شامت آ جائے گی۔

"کتنا بل ہے ان کا؟" مریم دوائیوں کا شاپر دیکھتی ہوئی بولی۔

"دو ہزار....." سیلز مین نے ذرا لاپروائی سے بتایا تھا۔

"دو ہزار؟" مریم بُری طرح ٹھٹکی تھی۔

اس کے پاس تو پیسے ہی نہیں تھے اس نے ذرا پریشانی اور عجلت میں اپنا پرس کھنگالا، پرس میں صرف پندرہ سو روپے تھے جو اس نے اپنے آئندہ آنے جانے کے کرائے کے لیے رکھے ہوئے تھے ان میں سے بھی پانچ سو روپے کم تھے، میڈیسن دو ہزار کی تھی۔

"سوری سر! میں پیسے بھول آئی ہوں، آپ یہ میڈیسن سیور رکھیں میں ابھی آ کر لے لیتی ہوں؟" مریم عجلت سے کہتی ہوئی پلٹ کر میڈیکل اسٹور سے نکل آئی تھی۔

"آپ میڈیسن لے جائیں بل میں پے کر دیتا ہوں؟" جودت اچانک اس کے راستے میں آ گیا مریم جہاں اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی وہیں چکرا بھی گئی تھی وہ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا۔

"دیکھیں..... میں اس وقت خود پریشانی میں ہوں، آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، بس آپ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہوں، آپ پلیز میڈیسن لے جائیں۔"

جودت کافی مہذب طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن مریم اس کی کسی بھی ہیلپ کے چکر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"تھینک یو سو مچ..... مجھے آپ کی کسی بھی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے، پیسے بھائی کے پاس ہیں اس لیے زیادہ پریشانی کی

بات نہیں ہے، یہ میڈیسن میں خود ہی آ کر لے جاؤں گی۔" مریم نے کافی سختی اور بیگانگی سے اس کی آفر مسترد کر دی تھی اور وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے جودت مزید کچھ کہے بغیر اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا، مریم تیزی سے سڑک کراس کر کے ہسپتال کے اندر چلی گئی اور جودت پلٹ کر میڈیکل سٹور کے اندر آ گیا تھا ان کی مطلوبہ میڈیسن بھی مل چکی تھیں میڈیسن کا بل کلیئر کروا کے وہ کافی کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا لیکن مریم جب پیسے لے کر وہاں پہنچی تو سر تھام کے رہ گئی تھی، جودت اس کی میڈیسن کا بھی بل پے کر گیا تھا اور مریم کو لگا وہ اسے مقروض کر گیا۔ لیکن وہ کسی بھی صورت اس کا یہ احسان نہیں رکھ سکتی تھی۔

♥

گاڑی مین روڈ سے گاؤں کی چھوٹی سڑک کی سمت مڑی تو زری کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک شاندار سا ڈیرہ نظر آتا تھا یہ ڈیرہ ملک شرافت علی کا ہی ڈیرہ تھا، یہاں ہر وقت پنچایت لگی رہتی تھی، آس پاس کے علاقے والوں، ملنے ملانے والوں، اور دوست احباب کا ہر وقت یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا، گاؤں کا غریب طبقہ اپنے مسائل حل کروانے، زمینوں اور لڑائی جھگڑوں کے معاملات طے کروانے کے لیے یہاں ہی پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس ڈیرے سے لوگوں کی محفل کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ آئے روز دور دراز کے علاقوں سے ان کے مہمان آتے رہتے تھے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کا انتظام بھی یہیں پہ ہوتا تھا، رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں اور اس وقت بھی یہی حال تھا گاڑی ڈیرے کے قریب سے گزری تو عبداللہ نے ڈیرے کے اندر نظر دوڑائی تھی۔

ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ یہاں ہی تھے اور یقیناً ابھی ابھی ہی پہنچے تھے۔ عبداللہ گہری سانس کھینچتا ہوا لب بھینچ کر سیدھا ہو بیٹھا تھا وہ اکیلا ہوتا تو یقیناً پہلے اس ڈیرے پہ ہی اترتا۔ لیکن فی الحال زری اور نگارش اس کے ساتھ تھیں وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا، گاڑی اگلے پانچ منٹ میں ان کی حویلی کے سامنے موجود تھی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ عبداللہ کو دیکھتے ہی حویلی کے دونوں چوکیداروں نے بڑا سا لکڑی کا پھاٹک وا کر دیا تھا۔ گلاب خان، عبداللہ کے اشارے پہ گاڑی اندر لے آیا تھا کشادہ اور طویل ترین ڈرائیو پہ سلو اسپیڈ سے چلتی گاڑی حویلی کے مرکزی برآمدے کے عین سامنے آ کر کی تھی اور عبداللہ گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا عبداللہ سب کے سامنے ہر طرح سے ڈٹ جانے کے لیے تیار تھا جبکہ زری اور نگارش اپنی اپنی جگہ پہ دونوں سہمی بیٹھی تھیں، زری کی حالت تو کچھ زیادہ ہی خراب تھی کہ اپنے ہی گھر میں قدم رکھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

"زری....." زری کو کسی سوچ میں گم پا کر عبداللہ نے متوجہ کیا تھا۔

"جج..... جی؟" وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور عبداللہ کو انتظار میں کھڑے دیکھ کر فوراً نیچے اتر آئی تھی۔

یہاں سب کو خبر تھی کہ عبداللہ اور زری دونوں بہن بھائی آج واپس پاکستان آ رہے ہیں لیکن پھر بھی حویلی یوں نظر آ رہی تھی جیسے صدیوں سے ویران پڑی ہو، ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ حالانکہ شام سے پہلے کا وقت تھا، شام بس ڈھلنے کو تھی، پنکھ پکھیرو اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے، وہ بھی اپنے آشیانے میں لوٹ کر آئے تھے مگر یہاں شاید کسی کو بھی ان کا انتظار نہیں تھا شام کے وقت حویلی میں خاصی چہل پہل ہوتی تھی لیکن آج ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور عبداللہ اس خاموشی "دیکم" کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا دیا تھا۔

"عبداللہ....." نگارش کی آواز پہ عبداللہ نے چونک کر نگارش کو دیکھا اور قدم ٹھہر گئے تھے۔

نگارش کی آنکھوں اور چہرے پہ ایک عجیب سا خوف ہلکورے لے رہا تھا اور یہ خوف عبداللہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا اور بے ساختہ ایسے حالات میں بھی مسکرا دیا تھا۔ زری نہ ہوتی تو شاید وہ نگارش کے اس انداز اس خوف زدہ سی ادا پہ اسے بانہوں میں بھر لیتا لیکن فی الحال اس کا ہاتھ تھپکنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"پاگل..... محبت کرتا ہوں تم سے اور محبت انسان کے قدم اکھڑنے نہیں دیتی۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ کہیں میں تمہیں چھوڑ نہ دوں؟"

عبداللہ کے انداز میں سرزنش تھی وہ کافی آہستگی سے اس سے مخاطب ہوا تھا اس لیے ذرا فاصلے پہ رخ پھیر کے کھڑی زری نہیں جان سکی تھی کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔

"بی بی جی! بی بی جی! چھوٹے ملک صاحب آ گئے۔ باہر دیکھیں..... چھوٹے ملک صاحب آ گئے۔"

ایک تو پھر ملازمہ برآمدے کی بائیں طرف سے نکل کر اپنے دھیان میں ادھر ہی آ رہی تھی جب عبداللہ اور زری کو دیکھتے ہی اس کے وجود میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ اور بی بی جان کو اطلاع دینے کی غرض سے زور زور سے چلاتی ہوئی ان سے پہلے ہی راہداری میں گم ہو گئی تھی۔

"چلو..... تم بھی چھوٹے ملک صاحب کی ملکانی ہو، صاحبہ ہو اندر جانا ہے؟" عبداللہ نے نگارش کو ٹینشن فری کرنے کی خاطر کافی شرارت سے کہا تھا اور پھر تینوں اندر آ گئے تھے۔

"میں بسم اللہ..... میں بسم اللہ! میں صدقے..... میں واری..... میرے کلیجے دی ٹھنڈک..... میری اکھاں دا چانن۔" بی بی جان بے تحاشہ ممتا سے مغلوب اپنے خالص پیار کا خالص پنجابی میں اظہار کرتیں اپنے شاہانہ تخت سے فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور قریب آتے عبداللہ کو آگے بڑھ کے سینے سے لگا لیا تھا۔

"کیسی ہیں بی بی جان؟" عبداللہ کا لہجہ بھی ماں کی ممتا کے سامنے نرم ہو گیا تھا۔

"تجھے دیکھ لیا ہے تو سمجھو کہ میں ٹھیک ہی ہوں۔" وہ عبداللہ کی پیشانی پہ بوسہ دیتی ہوئی بولی تھیں۔

"بی بی جان....." عبداللہ کے عقب سے زری کی آواز سنائی دی تھی اور بی بی جان نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے بازو وا کر دیے تھے اور زری بچوں کی طرح لپک کے ان کے سینے سے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی وہ آج اپنی ماں سے پانچ سال بعد مل رہی تھی اور ان پانچ سالوں میں یوں لگ رہا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا تھا اپنے بھی اپنے نہیں رہے تھے اور اپنوں کے پرائے ہونے کا دکھ ہی اسے یوں بے پناہ رُلا رہا تھا۔

"زری! کسی اور کو بھی ملنے دو گی یا نہیں؟" عبداللہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا اور پھر بی بی جان کو کندھوں سے تھام کے زری سے الگ کیا تھا۔

"بی بی جان! یہ آپ کی بہو ہے، نگارش۔" عبداللہ نے نگارش کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اور بی بی جان اتنی خوبصورت اور پیاری سی لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔ کافی باوقار سی لڑکی تھی عبداللہ کے پہلو میں کھڑی جچ رہی تھی۔

"السلام علیکم بی بی جان!" نگارش نے کافی جھجکے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

بی بی جان نے ایک نظر عبداللہ کو دیکھا اور پھر دوبارہ نگارش کو دیکھا تھا وہ اپنے دل کو پتھر نہیں بنا سکی تھیں انہوں نے نگارش کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بھی سینے سے لگا لیا تھا۔

"جیتی رہو..... خوش رہو..... اللہ سدا سہاگن رکھے۔" انہوں نے اسے دُعاؤں سے نوازا تھا اور نگارش کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ عبداللہ کے حوالے سے زری کے بعد یہ دوسرا رشتہ تھا جو اس سے اس طرح محبت سے پیش آیا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا دل کو سکون محسوس ہوا تھا۔

"آؤ بیٹھو تم لوگ تھک گئے ہو گے؟" بی بی جان نے تخت پہ رکھی تسبیح دوبارہ تھام لی تھی اور صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ان کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔" ملک شرافت علی کی کرخت آواز پہ صوفے کی سمت اُٹھتے عبداللہ کے قدم یکدم ٹھہر گئے تھے اس نے فوراً پیچھے پلٹ کے دیکھا تھا۔

"بابا جان....." عبداللہ بے ساختہ ان کی طرف بڑھا تھا۔

"بس..... اس کی ضرورت نہیں ہے جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔"

انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا اور عبداللہ دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان نے اسے اس طرح کہا ہے۔

بے شک ان لوگوں میں ہزاروں اختلافات سہی، ہزاروں رنجشیں اور گلے شکوے ہی سہی لیکن پھر بھی وہ ان کا بیٹا تو تھا؟ اتنے عرصے بعد واپس آیا تھا۔ کم از کم ان کو اس سے ایک بار ملنا تو چاہیے تھا؟ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی لیکن انہوں نے تو کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ چہرے پہ جاہ و جلال لیے دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے وہ عبداللہ کو بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ملک صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرا بچہ اتنے سالوں بعد آیا ہے آپ اسے دم تو لینے دیں۔" بی بی جان تڑپ اٹھیں۔

"اتنے سالوں بعد آیا ہے تو اسی طرح آتا نا جس طرح ہم نے کہا تھا؟" ملک شرافت علی کا اشارہ نگارش کی طرف تھا ان کی شرط تھی کہ عبداللہ جب بھی واپس آئے گا نگارش کو طلاق دے کر واپس آئے ورنہ اس حویلی میں عبداللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

"چھوٹے ملک صاحب نے پہلے کب آپ کی کوئی بات مانی ہے جو اب مانیں گے۔" ملک اسد اللہ کی آواز بھی داخلی دروازے کی سمت سے ابھری تھی آواز میں طنز اور تمسخر تھا۔ عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا دونوں باپ بیٹا برابر کھڑے تھے دونوں کی طرز زندگی قول و فعل ایک سے ہی تھے انیس بیس کا بھی فرق نہیں تھا دونوں میں اور کسی ایک سے بھی کسی قسم کی گنجائش کی امید رکھنا فضول تھا۔ کوئی بھی عبداللہ کا طرفدار نہیں تھا کیونکہ بی بی جان بھلا کب شوہر کے سامنے ٹھہر سکتی تھیں۔ اس لیے عبداللہ نے اس میدان میں اکیلے ہی اترنا تھا۔

"چلیں..... آج ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ جو میں منوانا چاہتا ہوں وہ آپ مان لیں جو آپ منوانا چاہتے ہیں وہ میں مان لوں ہوں جو اپنی بات سے ہٹ جائے وہ مرد نہیں کہلائے گا؟" عبداللہ کا لہجہ بھی ان جیسا ہی کرخت ہو چکا تھا اور آنکھوں رنگ بھی تیوروں میں بدل گیا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" اب کی بار ملک اسد اللہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

"بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ؟" عبداللہ کا لہجہ کاٹ دار اور دو ٹوک تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟" بابا جان سمجھ نہیں پائے تھے۔

"مطلب کہ ابھی قدموں پہ کھڑے کھڑے ملک اسد اللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو میں بھی ابھی یہیں کھڑے کھڑے بیوی کو طلاق دے دوں گا اور وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔" عبداللہ نے گویا ملک اسد اللہ کے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔ بابا جان، ملک اسد اللہ اور بی بی جان کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش بھی دنگ رہ گئی تھیں۔

"یہ کیسی شرط ہے بھلا؟" ملک اسد اللہ کو غصہ آیا تھا۔

"مجھ سے میری بیوی کو طلاق دلانے کے لیے میری یہی شرط ہے۔" عبداللہ کا انداز استہزائیہ تھا۔

"اس کا مطلب ہے تم طلاق دینے کے لیے تیار نہیں ہو؟" وہ کافی چبا کر بولے تھے۔

"میں تو تیار ہوں۔ بس آپ کے تیار ہونے کا انتظار ہے۔ کیا خیال ہے پھر گاؤں کے نکاح خواں سے دو طلاق نامے پیپر منگواؤں؟" عبداللہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بکواس بند کرواپنی اور زبان سنبھال کے بات کرو۔ تم اپنی بیوی سے میری بیوی کا مقابلہ کر رہے ہو؟" ملک اسد اللہ اٹھے تھے ان کے لہجے میں واضح حقارت تھی۔

"اگر نام نہاد رشتے کو دیکھا جائے تو آپ کی بیوی میری بھابی ہوتی ہیں اس لیے میں ان کے لیے کوئی غیر مہذب استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اتنا ضرور پوچھوں گا کہ کیا آپ کی بیوی کسی اعلیٰ قسم کے میٹریل سے تیار ہوئی ہیں جن کا کسی سے کوئی نہیں ہے؟ جتنا اعلیٰ حسب نسب ہے ان کا وہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

عبداللہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

"خبردار..... میری بیوی کے بارے میں کچھ کہا تو۔" ملک اسد اللہ یکدم دھاڑے تھے۔

"تو پھر آپ کون ہوتے ہیں میری بیوی کے لیے کچھ کہنے والے؟ جس روز میرے کہنے پہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے مجھ سے کوئی بات کیجیے گا کوئی حق نہیں ہے آپ کو میری بیوی کے بارے میں کچھ کہنے کا۔ اب ایک لفظ بھی کہا تو بہت برا ہوگا۔" عبداللہ نے رنگ بدل کے بات کی تھی اور ملک اسد اللہ اور بابا جان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"تم اس لڑکی کی خاطر ہم کو چھوڑ رہے ہو؟" بابا جان کے لہجے کی کرختگی ہنوز تھی۔

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس لڑکی کی وجہ سے آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں؟" عبداللہ کے جواب دو بدو ہوتے تھے۔

"ہم نے ہمیشہ اس لڑکی کی جگہ وجاہت علی کی بیٹی کو دیکھا ہے تمہاری دلہن وہی بنے تو اچھا ہے۔"

انہوں نے اپنے مرحوم بھائی وجاہت علی کا ذکر کیا تھا۔

"جانتا ہوں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ آپ کی بھتیجی ہے اسی لیے تو آپ اسے یہاں لانا چاہتے ہیں لیکن بابا جان آپ کو جانتا ہوں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ آپ کی بھتیجی ہے اسی لیے تو آپ اسے یہاں لانا چاہتے ہیں لیکن بابا جان آپ کو اس معاملے میں مجھ سے مایوسی ہوگی۔ میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ کسی کی اچھی بھلی زندگی تباہ کر کے رکھ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ چچا وجاہت علی کی بیٹی جہاں بھی ہوگی خوش ہوگی اور خوشحال زندگی گزار رہی ہوگی میں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرنا ہی ہوتا تو آج سے پانچ سال پہلے کر لیتا۔" عبداللہ کا طنز اور تلخی بابا جان کو طیش دلا گئے تھے۔

"تو پھر تم یہ بھی بھول جاؤ کہ ہم تمہاری لائی ہوئی اس دو ٹکے کی لڑکی کو قبول کریں گے۔ ہمارے گھر میں نہ تمہارے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے لیے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جن قدموں پہ کھڑے ہو انہی قدموں پہ واپس لوٹ جاؤ۔ تم ہمارے لیے مر گئے۔ ہم تمہارے لیے مر گئے۔" انہوں نے انتہا کر دی تھی۔

"جو انسان آپ کا مطلب پورا نہیں کرتا وہ آپ کے لیے مرہی جاتا ہے یہ بات بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہوں میں۔" عبداللہ طنز سا ہنسا تھا۔

"اسے کہو..... ہماری نظروں سے دور ہو جائے، چلا جائے یہاں سے نکل جائے اس حویلی سے۔" بابا جان غصے سے بی بی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز سے دھاڑے تھے اور ان کی اتنی بلند آواز پہ حویلی کے دیگر مکین بھی ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے جن میں ملک اسد اللہ کے بیوی اور بچے بھی تھے۔

"جا رہا ہوں اور اس ظلم کدے میں میں رہنا بھی نہیں چاہتا اور نہ ہی میں یہاں رہنے کے ارادے سے آیا تھا۔ یہ کمین گاہ آپ کو مبارک....."

وہ بھلا کب ہار ماننے والا تھا بابا جان کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"یعنی تمہارا پلان تھا کہ تم نے یہاں نہیں رہنا؟" بابا جان سے پہلے ملک اسد اللہ بول پڑے تھے۔

"بے شک میرا پلان تھا لیکن آپ میں دم ہے تو آپ میرا پلان بدل بھی سکتے ہیں میرے پلان کو نا کام بھی بنا سکتے ہیں بس ذرا سی ہمت اور حوصلے کا کام ہے آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں میں اپنی بیوی کو دے دیتا ہوں پھر آپ کی پسند کی بیوی لاؤں گا اور یہیں ٹک کے رہوں گا آپ کے ساتھ کے آپ کے شانہ بشانہ۔"

عبداللہ نے کہتے ہوئے اپنی بھابی کو ایک نظر دیکھا تھا وہ عبداللہ کی بات پہ سٹپٹا گئی تھیں۔

"اور ہاں..... میں جانتا ہوں کہ آپ کی ایک بیوی نہیں، کئی بیویاں ہیں کچھ ایسی جن سے آپ نے شادیاں کر رکھی ہیں اور کچھ ایسی جن سے شادیاں نہیں کیں لیکن میں نے ان کو طلاق دینے کا نہیں کہا، میں نے تو آپ کو اعلیٰ حسب نسب والی بیوی کو طلاق دینے کا کہا ہے تا کہ آپ کو پتا تو چلے نا کہ آپ نے کس کو طلاق دی ہے؟"

اب سٹپٹانے کی باری ملک اسد اللہ کی تھی وہ عبداللہ کو کھا جانے والی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ملک عبداللہ! بہت غلط کر رہے ہو تم بھائی، بھائی کا شریک ہوتا ہے اور تم شریک کو اور شریک (دشمن) بنا رہے ہو۔" ملک اسد اللہ کے لہجے میں عجیب سی دھمکی تھی۔

"میں برٹش ایمبیسی میں کیپلین لکھوا کے آیا ہوں کہ پاکستان میں قیام کے دوران مجھے، میری بیوی کو اور میری بہن کو اگر ذرا سا بھی نقصان پہنچے تو ذمہ دار ملک شرافت علی، ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز ہوں گے۔ اس لیے میرا شریک بننے سے پہلے سوچ لیجیے گا کہ آپ نے اگر شریک بننا ہے تو کس حد تک بننا ہے؟ کیونکہ میں نے اپنے نقصان کی کوئی بھی معافی نہیں لکھوائی، سیدھی سزا کی درخواست کی ہے۔" عبداللہ نے اسے وارن کر ہی دیا تھا کہ کہیں وہ اپنے ہی زعم اور غصے میں نہ رہیں۔ وہ سارا بندوبست کر کے آیا ہے۔ "بہن کے ساتھ اب تمہارا کیا علیک سلیک ہے۔ وہ گھر آ گئی ہے بس بات ختم۔" بابا جان چونک کے بولے تھے۔

"بات ختم کہاں ہوئی ہے بابا جان! جب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا تو میری بہن بھی نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ سب پہ اب کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں آپ راتوں رات اس کی شادی بھی کر سکتے ہیں اور بربادی بھی۔ آپ کے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔" عبداللہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا جبکہ ان کا سکون منتشر ہو گیا تھا اور زری کی جان جیسے مٹھی میں آ گئی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" بابا جان نے دانت پیس کر جتایا تھا۔

''آپ کی بیٹی ہے تو کیا آپ کو قتل کا اختیار دے دیا جائے؟'' وہ زیادہ سنجیدہ لہجے میں بولا تھا۔

''میں اس کا قتل بھی کروں تو مجھے کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خدا بن بیٹھے ہیں جس کو کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے، جو خود ہی اتنا بااختیار ہے کہ ہر کام کر دیتا ہے؟'' اس کے جواب پہ وہ لاجواب ہو گئے تھے مگر پیچھے تو کسی نے بھی نہیں ہٹنا تھا۔

''زری..... تم اندر جاؤ۔'' ملک اسد اللہ نے اشارہ کیا۔

''زری..... اندر نہیں جائے گی بلکہ میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔'' عبداللہ نے روک دیا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' وہ دونوں باپ بیٹا اور زیادہ بھڑک اٹھے تھے۔

''یہ بھی بڑے اچھے طریقے سے ہو گا کیونکہ میرے ساتھ اس وقت پولیس فورس ہے اور پولیس فورس کے ساتھ ایک دم الرٹ میڈیا جو آپ کے ذرا سے ہنگامے اور میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ اور اگلے دس منٹ میں آپ کے یہ سفاک اور بے رحم چہرے پوری دنیا کے سامنے ہوں گے اور آپ لوگوں کے وہ کرتوت بھی سامنے آئیں گے جو آج تک کسی کی بھی نظروں سے نہیں گزرے۔'' عبداللہ کی دھمکی پہ ان کے رنگ بدل گئے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' بابا جان پھر گرجے تھے۔

''ہاں..... پاگل ہو گیا ہوں۔ جب آپ کے پاس میرے لیے کوئی گنجائش کی رعایت نہیں ہے تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ جو انسان اپنوں کا اپنا نہیں بن سکتا وہ بیچاری غریب عوام کا اپنا کیسے ہو سکتا ہے؟'' عبداللہ بھی مکمل اجنبیت پہ اتر آیا تھا۔

''ملک عبداللہ! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' ملک اسد اللہ کا بس چلتا تو عبداللہ کو گولی مار دیتا۔

''آپ نے مجبور کیا ہے مجھے۔'' وہ کندھے اچکا کے بولا تھا۔

''اسد اللہ! گاؤں کی باہر والی سڑک پہ پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں کیا تمہیں پتا ہے کہ پولیس کی گاڑیاں یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

ملک حق نواز کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور ان سب پہ نظر پڑتے ہی خاموش ہو گیا تھا زری غیر محسوس طریقے سے نگارش کی اوٹ میں ہو گئی تھی کہ ملک حق نواز کی غلیظ اور گندی نظر اس پہ نہ پڑے جبکہ ادھر بابا جان اور ملک اسد اللہ حیرت زدہ سے رہ گئے تھے۔ عبداللہ انہیں محض دھمکی نہیں دے رہا تھا بلکہ سچ کہہ رہا تھا پولیس اور میڈیا ساتھ لے کر آیا تھا۔

''یہ پولیس کی گاڑیاں تو فی الحال ہماری سیکیورٹی کے لیے یہاں آئی ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں جس روز آپ کو گرفتار کر آئیں گی اس روز دو نہیں بلکہ چار گاڑیاں آئیں گی۔ آخر اللہ نے ایک روز مومنہ بی بی کا بھی تو انصاف کرنا ہے۔'' عبداللہ کا رخ ملک حق نواز کی طرف تھا بابا جان ٹھٹک گئے تھے کہ عبداللہ کو مومنہ بی بی کے معاملے کا بھی علم ہے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم یہ سب دل آور شاہ کی شہ پہ کر رہے ہو۔ اور دیکھ لینا مومنہ بی بی کے اس چکر میں کسی روز میری گولی سے دل آور شاہ مارا جائے گا۔''

''آہ.....'' ملک حق نواز کی بے رحم دھمکی پہ نہ جانے کیسے زری کے منہ سے ایک چیخ نما آہ نکل گئی تھی کہ نگارش نے یکدم گھبرا کے اسے دیکھا تھا۔

''اور اس روز میری گولی سے ملک حق نواز مارا جائے گا۔ کیونکہ آپ لوگ خود کہتے ہیں قتل کے بدلے قتل اور عزت کے بدلے عزت اور فی الحال تو آپ پہ کسی کی عزت کا قرض ہے۔ جو آپ سے دل آور شاہ ہی وصول کرے گا اور ایسا وصول کرے گا کہ کبھی کسی عورت کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے بلکہ اپنی بیوی کو بھی بہن سمجھو گے آپ۔'' عبداللہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا تھا۔

''ملک عبداللہ.....'' اس کی بات پہ ملک اسد اللہ یکدم غرا کے اس کی طرف بڑھا تھا لیکن ملک حق نواز نے اسے دبوچ کر روک لیا تھا۔

''چھوڑ دیں انہیں دیکھتا ہوں میں کہ کیا کرتے ہیں یہ؟'' عبداللہ نے جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے اس کا بولٹ چڑھایا تھا۔

اور اس کو ریوالور تانے دیکھ کر بی بی جان، زری، نگارش کے ساتھ ساتھ ملک اسد اللہ کے بیوی بچے بھی چیخ اٹھے تھے۔

"ملک حق نواز..... گھوڑے مجھے۔"

ملک اسد اللہ غرایا تھا۔

"عبداللہ! پلیز چلیں یہاں سے۔ پلیز عبداللہ! ہم لوگ اگر اور یہاں ٹھہرے تو اور زیادہ ہنگامہ ہوگا۔"

نگارش نے روتے ہوئے لپک کر عبداللہ کا بازو تھام لیا تھا۔

"جاؤ بیٹا! چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہارا یہاں رُکنا ٹھیک نہیں ہے۔" بی بی جان بھی رو پڑی تھیں۔

"جاؤ بیٹا! چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہارا یہاں رُکنا ٹھیک نہیں ہے۔" بی بی جان بھی رو پڑی تھیں۔

اور بی بی جان کو روتے دیکھ کر عبداللہ کا اشتعال دھیما پڑ گیا تھا اس نے ریوالور والا ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے جا رہا ہوں لیکن آپ سب لوگ ایک بات کان کھول کے سن لیں کہ زری کی شادی اس ورندے سے کبھی مر کے بھی نہیں ہوگی اس کے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں زری کو خود گولی مار دوں اس لیے آپ لوگ اس شادی کا خیال دل سے نکال دیں تو اچھا ہے باقی آپ کی مرضی۔"

عبداللہ نے جاتے جاتے ایک بار پھر وارن کیا تھا۔

"چلو....." اس نے زری اور نگارش کو چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں اور زری کو یوں لگا جیسے ملک حق نواز کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے ساتھ اس کے پیچھے تک آ گئی ہوں۔

"تم زری کو بچا کے کسی بھی کونے میں لے جاؤ لیکن شادی اس کی ملک حق نواز سے ہی ہوگی یہ ملک حق نواز کا وعدہ ہے۔ یاد رکھنا۔"

ملک حق نواز کی آواز پہ داخلی دروازے کی سمت بڑھتے عبداللہ کے قدم یکدم رُک گئے تھے۔

"ہر جس دن ایسا ہوگا وہ دن یا تو آپ کی زندگی کا آخری دن ہوگا یا میری زندگی کا یا پھر زری کی زندگی کا۔ یہ بھی یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" وہ کہتا ہوا سب پہ ایک طائرانہ سی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا تھا زری اور نگارش پہلے ہی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھیں عبداللہ کے آتے ہی گلاب خان نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

ہر سو اندھیرا پھیل چکا تھا شام سے رات ہو چکی تھی۔ وہ لوگ مسلسل سفر میں تھے۔ انگلینڈ سے لاہور اور لاہور سے اپنے گاؤں اور اب پھر گاؤں سے لاہور کا سفر جاری تھا۔ نیند، تھکن اور ذہنی دباؤ سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ عبداللہ نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔

گلاب خان ان کے آتے ہی ایس پی کامران کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ لوگ باخیریت حویلی سے نکل آئے ہیں تب ایس پی کامران نے ٹریفک فورس کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا یہ کام انہیں دل آور شاہ نے کہا تھا اور وہ دل آور شاہ کی بات ٹال نہیں سکتے تھے کیونکہ دل آور شاہ بھی ان کے ایسے ایسے کام نکلوا دیتا تھا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے یہ لین دین تو چلتا ہی رہتا تھا لیکن آج عبداللہ کو دل آور کی وجہ سے خاصی بیک سپورٹ حاصل ہوئی تھی وہ اس کی ذہانت اور داؤ پیچ کا معترف ہو گیا تھا۔

♥

وہ آج کافی لیٹ گھر آیا تھا۔

گاڑی کے ہارن پہ زلفی نے گیٹ کھولا تھا اور وہ گاڑی اندر لے آیا تھا۔ زلفی گیٹ بند کر کے بھاگتا ہوا اس کی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

"سلام صاحب!" زلفی کے انداز کی طرح اس کا سلام بھی بڑا پُر جوش قسم کا ہوتا تھا۔

"واسلام! کیسے ہو خیریت؟" دل آور گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

"جی صاحب! خیریت ہی ہے، وہ گلاب خان نہیں آیا آپ کے ساتھ؟" زلفی نے دل آور کو اکیلے دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"گلاب خان کسی کام سے گیا ہوا ہے اس نے فون پہ بتایا نہیں تھا تم لوگوں کو؟" وہ اپنا بریف کیس نکال کے اندر کی طرف بڑھا۔

"بتایا تو تھا لیکن میں سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی کام سے گیا ہوگا۔" زلفی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''نہیں..... میرے ساتھ نہیں، میرے دوست کے ساتھ گیا ہوا ہے۔''

''آپ کا دوست جو آج انگلینڈ سے آیا ہے؟'' زلفی کو دل آور سے باتیں کرنے کا شوق تھا اسی لیے بات کو طول دیتا تھا۔

''ہاں وہی.....'' دل آور کہہ کے سیڑھیوں کی سمت بڑھا تھا۔

''کھانا کھائیں گے؟ گل کو بلاؤں؟'' اس کے پوچھنے پہ دل آور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ٹھہر گیا تھا اور پلٹ کر زلفی کو جو سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔

''گل تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''جی..... بہن۔''

''تم سے بڑی ہے کہ چھوٹی؟''

''جی..... بڑی ہے۔''

''تو تمہیں اس کو کیا کہنا چاہیے؟''

''جی..... باجی!'' زلفی نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

''تو پھر.....؟''

''معافی چاہتا ہوں صاحب! غلطی ہو گئی ہے، میں انہیں گل باجی ہی کہتا ہوں بس ویسے ہی منہ سے پھسل گیا تھا۔'' اس کے انداز پہ دل آور مسکرا دیا تھا۔

''اوکے..... لیکن دھیان سے رہا کرو یار! اتنے بدحواس کیوں ہو جاتے ہو؟''

''پتا نہیں صاحب! مجھے کیا ہو جاتا ہے؟'' زلفی سر کھجا کے رہ گیا۔

''تھوڑے اور ذمہ دار ہو جاؤ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھا کروں گا؟''

دل آور پلٹ کے دوبارہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

''سچ کہہ رہے ہیں صاحب؟'' وہ پیچھے سے چیخا تھا۔

''اپنے دل کے سوا میں کسی کو جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا۔'' وہ سر جھٹک کر کہتا سیڑھیاں طے کر گیا تھا اور زلفی کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا گل سامنے ہوتی تو وہ اسے بھی ضرور بتاتا۔

♥

میرے بابل کا اونچا محل
میرے ساجن کی گلیاں تنگ
میں پھولوں کی رہنے والی
مجھے ملا ہے کانٹوں کا سنگ

وہ اپنے گھٹنوں کے اردگرد دونوں بازو لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی اور اس کے قریب فرش پہ بیٹھی گل اسے چپ کروانے اور تسلیاں دلاسے دینے میں مصروف تھی۔ گل آج ذرا فارغ تھی اس لیے شام سے ہی علیزے کے پاس آ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بیٹھنے میں کتنا ٹائم گزر گیا تھا اس کی دونوں کو ہی خبر نہیں تھی۔

''دیکھو بی بی جی! یہ وقت اللہ نے شروع سے ہی آپ کی قسمت میں لکھ دیا تھا، یہ وقت آپ نے دیکھنا ہی تھا اس سے اس طرح رونے دھونے سے کیا ہو گا؟ ہونا تو وہی ہے جو ازل سے لکھا جا چکا ہے۔'' گل بار بار اسے سمجھا رہی تھی۔

''لیکن مجھے کم از کم پتا تو چلے کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ مجھے کیوں اس قبر میں اتار گیا ہے؟ وہ مجھے بتاتا کیوں نہیں؟'' علیزے روتے روتے اچانک چیخ اٹھی تھی اور پھر اچانک ہی اس کی چیخ حلق میں ہی پھنس گئی اور وہ ایک پل کے لیے کانپ کے رہ گئی تھی، بیسمنٹ کی سیڑھیوں کے پاس ہی دل آور شاہ کھڑا تھا جس کو دیکھ کر گل کے ہاتھوں کے توتے بھی اڑ گئے تھے وہ بھی لرز اٹھی تھی اس کے تیور بہت سنجیدہ تھے۔

''سلام صاحب.....'' گل بمشکل ہمت مجتمع کرتی ہوئی اٹھی اور اسے سلام کرتے ہوئے سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی دل آور

محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا تھا اور کل دل ہی دل میں علیزے کی خیریت کی دعا مانگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

دل آور خاموشی سے اسے دیکھتا ہوا ذرا فاصلے پہ رکھی کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے لے آیا تھا اور اس کے سامنے کرسی رکھ کے اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سائے دیوار سے ٹیک لگائے نیچے زمین پہ بیٹھی ہوئی تھی دل آور کی کاٹ دار آنکھیں اسی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور علیزے سر سے پاؤں تک جل اٹھی تھی۔

اس کے چہرے کے ناگوار تیور دیکھتے ہوئے دل آور نے اپنی نظریں پھیر لی تھیں اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا تھا۔

"مگر میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ اور تمہیں کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم جس زمین پہ بیٹھی ہو اسی زمین میں سما جاؤ گی، جو اذیت میں سہہ رہا ہوں، وہی اذیت تم سہہ لو یہ بھی ہو ہی نہیں سکتا سنو کی تو مر جاؤ گی اور میں تمہیں وقت سے پہلے نہیں مارنا چاہتا۔" دل آور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا اور نظروں کا زاویہ یہ دوبارہ علیزے کی سمت بدل لیا تھا۔

"لیکن میرا کیا گناہ ہے آخر؟" اس کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

"بزدلی۔" اس کے سوال پہ دل آور نے ہنسا تھا۔

"اس دنیا میں تمہارا صرف ایک ہی گناہ ہے کہ تم وقار آفندی کی بیٹی ہو۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" اس کا فیصلہ دو ٹوک تھا کافی سکون اور اطمینان بھرا۔

"تمہاری میرے بابا کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟" وہ اس سے ڈری ہوئی تھی اتنی کہ دل آور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھانے کے لیے سیدھا ہوا تھا تو اس کی چیخ نکل گئی وہ اس کے ایک تھپڑ سے ہی خوفزدہ ہو چکی تھی۔

"وہ سوال نہ کرو کہ جن سے تمہارا اور میرا یوں آمنے سامنے بیٹھنا بھی محال ہو جائے۔" دل آور نے اسے ٹوکا تھا۔

"پلیز ڈرائیور..... میں..... میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز مجھے یہاں سے جانے دو مجھے میرے گھر جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں سو نہیں پاتی۔ پلیز مجھے جانے دو۔" علیزے کہتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ دل آور نے اس کے اس طرح رونے پہ خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"تو بھی چاؤ تمہیں روکا کس نے ہے؟ سارے دروازے کھلے ہیں تم جب چاہے جا سکتی ہو میں نے تمہارے پیروں میں بیڑیاں تو نہیں ڈال رکھیں؟" دل آور نے بڑی لاپروائی کا اظہار کیا تھا۔

لیکن علیزے اس کی لاپروائی کا مفہوم اچھی طرح سمجھتی تھی اسی لیے تو اپنی بے بسی پہ اور زیادہ رونا آیا تھا۔ وہ اور زیادہ روئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مزید کچھ کہتے اچانک دل آور کے سیل پہ ابیریشن ہونا شروع ہو گئی تھی یہ کال گلاب خان کے نمبر سے تھی۔

"السلام علیکم....."

"وعلیکم السلام صاحب! کافی دیر سے فون کر رہا ہوں مگر کال ہی نہیں مل رہی تھی۔" گلاب خان شاید ساتھ ساتھ ڈرائیو بھی کر رہا تھا۔

"میں لفٹ میں ہوں شاید اس لیے۔"

"آپ کی آواز نہیں آ رہی صاحب؟"

"مجھے تمہاری آواز صاف سنائی دے رہی ہے تم کہو کیا کہنا ہے۔"

دل آور سگریٹ بٹوں تلے مسل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہم لوگ واپس آ رہے ہیں۔"

"اچھا..... کون کون آ رہے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟"

"صاحب! کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" گلاب خان خاصی اونچی آواز میں بولا تھا۔

''ارے یار! میں پوچھ رہا ہوں کہ عبداللہ اور زری وغیرہ ٹھیک ہیں؟ سب خیریت ہے نا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟'' اب باقاعدہ نام لے کر اور دوہرا کے پوچھا تھا۔ جس پر علیزے نے روتے روتے چونک کر دیکھا تھا۔

''عبداللہ اور زری؟'' علیزے کہ ذہن میں جھماکا ہوا تھا یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یہ نام تو آسیہ آنٹی کی سے اس نے کئی بار سنے تھے۔

''ٹھہرو..... میں یمنٹ سے باہر جاتا ہوں۔'' دل آور کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے یکدم کسی سے آئی تھی۔

''ڈرائیور..... زکو میری بات سنو۔ ڈرائیور پلیز۔'' علیزے بمشکل گرتے پڑتے اٹھی اور اس کے پیچھے بھاگی تھی لیکن وہ باہر جا چکا تھا۔

♥

رات خاصی گہری اور تاریک ہو چکی تھی جب ان کی گاڑی دوبارہ لاہور کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔

زندہ دلانِ شہر جاگ رہا تھا اور زندہ دل شہر کے زندہ دل باسی جاگتے اور رتجگا دھوم دھام سے منانے میں مصروف تھے۔ رتجگے کی رونقیں ریڈ لائٹ ایریا سے شرفا کی گلیوں تک اپنے عروج پہ تھیں اور سڑکوں پہ جابجا بکھرے مناظر دیکھنے سے قبل تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو نگارش ان مناظر کو یقیناً دلچسپی سے دیکھتی اور انجوائے کرتی کیونکہ وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی اور یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت ان کے دل بے سکون اور دماغ منتشر سے تھے نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور بھی یہی حال تھا، سوچیں گہری اور اُلجھی ہوئی تھیں اور انہی سوچوں کے دوران ساری رونقیں اور سارے مناظر پیچھے رہ گئے کی گاڑی اپنے گھر کے سامنے آ رکی تھی، عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

یہ گھر دل آور نے پسند کیا تھا، اسی نے خریدا تھا اور اسی نے اس گھر کی حسب ضرورت تھوڑی بہت سیٹنگ وغیرہ کروائی ملازم بھی رکھے تھے، عبداللہ تو اس گھر کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور پہلی نظر دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح دل انتخاب بھی شاندار تھا، گھر کی خوبصورتی رات کے اندھیرے اور مصنوعی روشنیوں میں بھی اُجاگر ہو رہی تھی۔

عبداللہ نے دل ہی دل میں سراہا تھا اور اتنے میں گلاب خان کے ایک ہی ہارن پہ گیٹ فوراً کھل گیا تھا اور گاڑی سیدھے آگے بڑھتی اندر پورچ میں آ رکی تھی جہاں دل آور شاہ کی سرف پہلے سے موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ان کا انتظار کر رہا

''دل آور یہیں ہیں؟'' عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔ ''جی..... صاحب یہیں ہیں، وہ سامنے بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے گلاب خان نے ان کی بائیں طرف اشارہ کیا تھا جہاں ایک ٹیبل اور چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور انہی میں سے ایک کرسی آور شاہ براجمان تھا۔ ''اوہ ہماری وجہ سے وہ بھی بے آرام ہو رہا ہے۔''

عبداللہ شرمندگی اور افسوس سے کہتا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اُتر آیا تھا اور اس کے پیچھے زری اور نگارش بھی تھیں۔

''مبارک ہو بچ کے آ گئے ہو۔'' دل آور مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''تم نہ ہوتے تو نہیں آ سکتا تھا گھاگ شکاری تھے۔'' عبداللہ نے اعتراف کیا تھا۔

''ہاہا..... مجھے پہلے سے ہی پتا تھا کہ بڑے گھاگ شکاری ہیں، اسی لیے میں ہمیشہ ایسے گھاگ شکاریوں کو وہ شکار جن کو نگلنا بھی مشکل ہو جائے اور اُگلنا بھی اور آج تم بھی ان کے لیے ایسا ہی شکار ثابت ہوئے ہو۔ بڑی تکلیف ہوئی ہو گی دانت کچکچا کے رہ گئے ہوں گے؟'' دل آور، عبداللہ کے اعتراف پہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور زری کی جان لے گیا تھا وہ اس کے قہقہے سی گئی تھی اور نظریں نمانی پھر اس کے دیدار کے لیے اس کی ذات کی چوکھٹ پہ جا بیٹھی تھیں اور اپنا خالی اور حاجت مند دامن بھی تھا۔

وہ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس اونچے پورے قد سے کھڑا عبداللہ سے مخاطب زری کے دل کو اس کی دھڑکنوں سمیت سحر گیا تھا وہ دیکھتی رہ گئی تھی اس کے چہرے کی رنگت دمک رہی تھی وہ صاف ستھرا اور فریش نظر آ رہا تھا اس کی صحت بھی پہلے

اچھی محسوس ہو رہی تھی، وہ شلوار سوٹ بہت کم پہنتا تھا مگر جب پہنتا تھا اور اسے بہت سوٹ کرتا تھا، اس کی پرسنالٹی گریس فل اور شاندار لگنے لگتی تھی ایسے میں اس کے مقابل ٹھہرنا اور اسے دیکھنا زری کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا اس وقت بھی کچھ یہی حال تھا وہ بڑی مشکلوں سے دل کو لگام ڈالے، دل کڑا کے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس صورت پہ تو وہ قربان تھی۔ وہ آخر کیوں نہ دیکھتی؟ وہ اس کے سامنے ہی تو کھڑا تھا؟ دیکھ دیکھ کر دل ہی نہیں بھرتا تھا تو وہ کیا کرتی؟ مجبور تھی اسے دیکھنے پہ اسے چاہنے پہ اور مجبور کرنے والا اس کا عشق تھا۔ منہ زور اور بے لگام جو دل آور شاہ کی سمت ہی سرپٹ بھاگے جا رہا تھا جسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ اگر راستے میں ٹھوکر کھا کے گرا تو چوٹ کتنی گہری آئے گی۔ سنبھل بھی پائے گا یا نہیں اور زری بھی عشق کی رتھ پہ سوار تھی وہ جس طرف بھی لے جاتا اس نے تو جانا تھا۔ مجبور جو تھی لیکن زری کی سمت دیکھ کر اسے رُدیں نہیں کیا تھا بس اپنے دھیان میں بات کرتا رہا اور وہ اپنے دھیان میں کھوئی رہی تھی۔ ''زری!'' نگارش بھی اس کی محویت بھانپ چکی تھی اسی لیے اسے ٹہوکا دیا تھا۔

''اف..... مر جائے یہ زری۔ جب بھی کمبخت دل سیراب ہونے کی کوشش کرتا ہے زری کی یہ پکار ہمیشہ خلل ڈال دیتی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں جھنجلا کے رہ گئی تھی۔

''چلو ہم اندر چلتے ہیں۔'' نگارش نے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ عبداللہ اور دل آور بھی متوجہ ہوئے تھے۔

''ٹھیک ہے یار! آپ لوگ آرام کریں، میں بھی اب چلتا ہوں کافی ٹائم ہو رہا ہے۔'' دل آور نے اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

''ارے اتنی جلدی کیوں؟ کچھ دیر تو بیٹھو نا۔'' عبداللہ کو اس کے اجازت طلب کرنے پر اچنبھا ہوا تھا۔

''نہیں یار! صبح کورٹ بھی جانا ہے اور ابھی ایک فائل پہ کام بھی کرنا ہے اور ٹائم دیکھو رات کے بارہ بجے ہیں اس لیے اب چلنا چاہیے تم بھی تھک گئے ہو گے کھانا کھاؤ اور اب آرام کرو، باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔'' اس نے عبداللہ سے رخصتی ہاتھ ملایا تھا اور اسے تسلی دی تھی۔

''او کے..... جیسے تمہاری مرضی۔'' عبداللہ نے سر ہلایا تھا اور دل آور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گیا تھا لیکن زری اور نگارش کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹکے تھے، زری کے طلبوں سے اٹھتی ''ہائٹ فریز'' کی خوشبو نے اسے اپنا آپ یاد دلایا تھا۔ مگر دل آور وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر رُکے آگے بڑھ گیا تھا۔

''صاحب! میں بھی چلوں؟'' چوکیدار کے پاس بیٹھا گلاب خان اسے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔ ''عبداللہ!'' دل آور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رُک کر آواز دی تھی۔

''حکم جناب۔'' عبداللہ بھی جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

''مجھے اپنے ڈرائیور کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہے یا نہیں؟'' کافی عاجزی سے پوچھا گیا تھا۔

''تو میرے پاس کون رہے گا؟'' عبداللہ کو پریشانی ہوئی تھی۔

''اس پاس خواتین نہ ہوتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ تمہارے پاس کون رہے گا۔'' دل آور کا مسکراتا ہوا ذو معنی لہجہ عبداللہ کو اس کی بات کا مفہوم سمجھا گیا تھا جس پہ عبداللہ سٹپٹا گیا تھا۔

''دل آور..... بھی تو شرم کیا کرو۔'' اس نے سرزنش کی تھی۔

''شرم ہی تو کی ہے۔'' دل آور ہنسا تھا۔

''او کے او کے..... جاؤ اب اور اپنے ڈرائیور کو بھی لے جاؤ، لیکن گاڑی چھوڑ جانا۔'' عبداللہ نے جان چھڑائی تھی۔

''او کے جناب! اللہ حافظ۔'' دل آور مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اور گلاب خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی دو گاڑیاں تھیں سرف اور پراڈو۔ جن میں سے وہ اپنے استعمال میں زیادہ تر سرف ہی رکھتا تھا اور پراڈو بھی کبھار استعمال میں آتی تھی اس لیے اب جب عبداللہ آیا تھا تو اس کے پاس فی الحال کوئی گاڑی نہیں تھی اس لیے دل آور نے پراڈو اس کے لیے بھیج دی تھی کہ جب تک عبداللہ گاڑی نہ لے لیتا تب تک اسی کے استعمال میں رہتی جبکہ عبداللہ کا دل چاہ رہا تھا کہ گلاب خان بھی اسی کے پاس رہے جو کہ ناممکن سی بات تھی کیونکہ گلاب خان، دل آور کا بہت خاص آدمی تھا اس لیے وہ زیادہ دیر اسے

کہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا لہٰذا اپنے ساتھ لے کر ہی رُخصت ہوا تھا۔

♥

اوائل دسمبر کے دن تھے۔

موسم بھی لوگوں کے مزاج کی طرح دن بہ دن سرد ہوتا جا رہا تھا، راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہو چکے تھے لیکن بڑی حویلی کسی جمود کا شکار تھی جہاں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پندرہ نومبر کی صبح کا وقت ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا تھا جو نہ آگے بڑھ رہا تھا نہ پیچھے سرک رہا تھا، بس اس جمود میں یہ فرق آیا تھا کہ وقار آفندی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گئے تھے اور اب آسیہ آفندی آزمائش کا وقت شروع ہو چکا تھا کیونکہ وقار آفندی اب اللہ کی ذات کے بعد صرف آسیہ آفندی کے رحم و کرم پہ ہی تھے اور وہ دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ فالج کے مریض کو سردی میں زیادہ تکلیف ہوتی تھی اس لیے ان کا زیادہ خیال رکھنا پڑ رہا تھا اور آسیہ آفندی چار دن میں ہی تھکنے لگی تھیں شاید اس لیے کہ ان کے سینے پہ بہت زیادہ غم کا بوجھ تھا۔ بیٹی کا غم اور شوہر کا غم۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا، وہ وقار آفندی کے لیے چکن سوپ بنا کر لائی تھیں لیکن وہ بیڈ پہ لیٹے تھے اور آسیہ آفندی سے ان کو اُٹھانا اور تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بٹھانا مشکل ہو گیا تھا انہوں نے لاکھ کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی اور اسی بے بسی پہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ رو پڑی تھیں۔

''ارے بیگم صاحبہ! کیا کر رہی ہیں آپ؟ لائیے میں کر دیتا ہوں۔'' مبارک خان دروازے پہ دستک دے کر اندر داخل ہوا اور آسیہ آفندی کو نڈھال ہوتے دیکھ کر لپک کے قریب آیا تھا۔ آسیہ آفندی روتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی تھیں اور اپنے خاصے عمر مبارک خان نے خود ہی وقار آفندی کو سہارا دے کر تکیوں سے ٹیک لگا کے بٹھا دیا تھا۔

''پلیز بیگم صاحبہ! آپ روئیں مت صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ آپ حوصلہ رکھیں گی تو صاحب جی بھی ٹھیک رہیں گے طرح رونے سے تو آپ خود بھی بیمار پڑ جائیں گی اور آپ کو پتہ ہے کہ صاحب جی کو آپ کی ضرورت ہے آپ بیمار پڑ گئیں کون سنبھالے گا؟'' مبارک خان ایک تابعدار اور وفادار ملازم تھا اسے پتہ تھا کہ وقار آفندی پہ آج کل مشکل وقت تھا۔ اس کے اس مشکل اور کڑے وقت میں ان کا برابر کا شریک تھا ان کے ساتھ ایک ملازم کی طرح نہیں بلکہ ایک ساتھی کی طرح جس نے اس وقت بھی اسے کوئی کام نہیں تھا وہ صرف ان کی خاطر وہاں آیا تھا، لیکن آسیہ آفندی کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا اسی ایک شخص اور ہمدرد فیملی ممبر کی طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس سمجھانے میں بھی ایک عزت تھی، احترام تھا، اپنائیت جس کی وجہ سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ سر جھکائے بات کر رہا تھا۔

''مبارک خان! ان سے کہو جلدی ٹھیک ہو جائیں مجھ سے ان کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی، یہ..... یہ ٹھیک ہو جائیں مجھے کچھ ہو جائے گا۔'' آسیہ آفندی بمشکل بول پائی تھیں ان کا حلق آنسوؤں کے بوجھ سے جیسے بند ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ دُعا کریں بس۔'' مبارک خان نے آگے بڑھ کر ٹیبل پہ رکھا سوپ والا باؤل اُٹھایا اور ان کے بیڈ کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور انہیں خود سوپ پلانے لگا تھا اور ساتھ ساتھ ان کا منہ بھی صاف کرتا جا رہا تھا اور آسیہ آفندی اس کی اتنی اپنائیت پہ دیکھ کے رہ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ کام اس کی ملازمت نہیں تھا پھر بھی وہ یہ سب کر رہا تھا اسی لیے آسیہ آفندی کو اس کڑے وقت میں اگر کسی کی وضع داری اور خلوص پہ یقین آیا تھا تو وہ مبارک خان تھا۔

♥

وہ آج بہت دنوں بعد جیری سے ملنے کے لیے آئی تھی اور جیری اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

''واؤ میڈی؟'' اس نے اپنے روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اچانک خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ''کیسے ہو؟'' مدیحہ نے اندر آتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہوں یقیناً۔'' اس نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اپنے ٹھیک ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

''کیا ہو رہا تھا؟'' جیری نے لیپ ٹاپ کی سمت اشارہ کیا تھا جو صوفے کے سامنے ہی ٹیبل پہ رکھا تھا اور اس کی اسکرین آن تھی۔

"کس سے چیٹ ہو رہی تھی؟"

مدیحہ نے لیپ ٹاپ کا رُخ ذرا سا اپنی سمت موڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھ لو کس سے ہو رہی تھی۔" میجر می اور نج جوس کا ئن اُٹھا کر گھولتے ہوئے مدیحہ کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا اور ایک ٹن مدیحہ کی سمت بڑھا دیا تھا برائن، کرسٹینا اور مائیکل چاروں ہیک وقت آن لائن تھے مدیحہ انہیں آن لائن دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور پھر بے ساختہ ہی اس کی انگلیاں کی پیڈ پہ حرکت کرنے لگی تھیں اور فوراً ہی اسے ان کے اسٹیٹائی موصول ہونا شروع ہو گئے تھے۔

"کیسی ہو سیڈی؟ پاکستان کیسا لگا؟" یہ سوال کرسٹینا کی طرف سے آیا تھا۔

"میں بھی اچھی ہوں اور پاکستان بھی اچھا ہے۔" مدیحہ نے میسج کے جواب میں ایک اسمائل کا آئی کون بھی پاس کیا تھا۔

"اچھا..... سن کر حیرت ہوئی۔" فوراً ریپلائی آیا تھا جس کے اینڈ میں ایک حیرت زدہ سا آئی کون ایڈ تھا۔

"حیرت کس لیے ہوئی؟" مدیحہ نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ "کہ پاکستان اچھا کب سے ہو گیا ہے؟" کرسٹینا نے پھر استعجابیہ سا کریکٹر سینڈ کیا تھا۔

"جب سے محبت ہو گئی ہے۔" مدیحہ یہ جملہ ٹائپ کرتے ہوئے ذرا سا جھجکی تھی، لیکن پھر سینڈ کر ہی دیا تھا۔

"محبت..... " کرسٹینا نے اس لفظ کو کافی لمبا کھینچ کے لکھا تھا۔

"ہاں..... محبت....." مدیحہ نے اقرار کیا تھا۔

"کس سے..... میجر می سے؟" کرسٹینا کے اگلے سوال پہ مدیحہ ٹھہر گئی تھی۔ اس کی انگلیوں کی حیرت دیکھی پڑ گئی تھی۔ مدیحہ نے اک نظر اپنے قریب میجر می کو سراپا دیکھا، وہ اس وقت نائٹ ڈریس میں تھا، گھٹنوں تک شارٹ پر مڈ ٹراؤزر اور وائٹ سادہ سی کھلے گریبان کی ٹی شرٹ میں بلیوس ڈھلے ڈھالے لاپروا انداز میں بیٹھا جوس سے شغل فرما رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کی سکرین پہ عدیل عمر کی شبیہ لہرا گئی تھی، جو چند روز پہلے درکشاپ کے گرد آلود اور کانٹھ کباڑ والے ماحول میں بھی اس کے مقابل جمی پرانی کرسی پہ بیٹھا اس کے ساتھ چائے پیتے ہوئے بھی کافی دیانتدار اور پُرکشش لگ رہا تھا۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رنگ، سخن کا بھی اور اسٹیٹس کا بھی۔

اور مدیحہ نے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا اور یہ فیصلہ، یہ انتخاب اس کے لیے مشکل نہیں تھا، کیونکہ اس کا دل بہت پہلے ہی آنکھیں بند کر کے عدیل عمر کو انتخاب کر چکا تھا۔ بس مشکل یہ تھا اس انتخاب کا اظہار کرنا لیکن کبھی نہ کبھی تو کرنا ہی تھا؟ تو پھر کرسٹینا کے سامنے ہی سہی۔

مدیحہ نے گہری سانس کھینچی اور سامنے اسکرین کی سمت دیکھا تھا۔

"بتاؤ نا..... میجر می.....؟" کرسٹینا دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں....." اس نے سینڈ کر ہی دیا تھا۔

"تو پھر کس سے؟"

"ایک پاکستانی سے....."

"پاکستانی سے.....؟"

"ہاں..... پاکستانی، محنت اور مزدوری کرنے والا پاکستانی، اپنا تن من مارنے والا پاکستانی، محبت اور عزت کرنے والا پاکستانی....." مدیحہ نے فخر سے جواب لکھا تھا۔

"لیکن تم تو.....؟"

"میں غلط تھی۔" مدیحہ نے اعتراف کیا تھا۔

"تو پھر میجر می وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی یہاں آنا اور یہاں رہنا اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے اسے کوئی اُمید نہیں دلائی تھی اور ویسے بھی وہ یہاں مہمان ہے۔ میں اسے زبردستی یہاں سے واپس تو نہیں بھیج سکتی نا؟"

"لیکن وہ تو صرف تمہارے لیے تمہاری محبت میں وہاں رہ رہا ہے۔" کرسٹینا کو حیرت ہو رہی تھی۔

"وہ میرے ملک میں رہے، میرے شہر میں رہے، لیکن میری محبت میں نہ رہے، کیونکہ میں خود کسی کی محبت میں رہ رہی ہوں۔" مدیحہ کا جواب دوٹوک تھا۔

"اُف میڈی..... تم نے مجھے چکرا کے رکھ دیا ہے، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں؟"

"اوکے..... پھر بات ہوگی۔" مدیحہ نے بات سمیٹی تھی۔

"اوکے..... بائے۔"

کرسٹینا بھی آف لائن چلی گئی تھی اور مدیحہ نے بھی لیپ ٹاپ پیچھے سرکا دیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ اپنی جانب ذرا ترچھا کے رکھا ہوا تھا۔ اس لیے جیری نہیں دیکھ پایا تھا کہ ان کی آپس میں کیا بات ہوئی ہے۔

"کیا ہوا؟ پھر کرسٹی نے کچھ کہہ دیا؟" جیری نے مدیحہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"نہیں..... اس نے کچھ نہیں کہا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اوکے..... چھوڑو اس بات کو، یہ لو جوس پیو۔" اس نے مدیحہ کو دوبارہ جوس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"تو تھینکس..... موڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"کہیں باہر چلیں؟"

"نہیں..... پھر کسی وقت چلیں گے، ابھی میں گھر جا رہی ہوں۔"

مدیحہ کہہ کے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے موڈ کے پیش نظر جیری چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکا تھا۔ وہ تیز تیز قدم لیتی چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی اور جیری اُلجھا سا رہ گیا تھا۔

♥

مسلسل تین گھنٹے کی میٹنگ کے بعد نشست برخاست ہوئی تو رفتہ رفتہ سب ہی میٹنگ ہال سے باہر نکل گئے تھے۔ لیکن آذر تھا جو وہیں کا وہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر کرسی کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔ یوں جیسے تھک گیا تھا اور اس کو وہیں بیٹھے دانیال بھی وہاں سے نہیں جا سکا تھا۔

پورا میٹنگ ہال خالی ہو چکا تھا اور صرف وہ دونوں وہاں بیٹھے تھے اور ان کے درمیان مکمل خاموشی تھی۔ دانیال نے آذر کو دیکھا تھا اور پھر لب بھینچ لیے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بات کا اور الفاظ کا کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے دنوں سے ان لوگوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک تناؤ سا، ایک گریز سا حائل تھا، لیکن یہ مسئلے کا حل تو نہیں تھا۔ آخر کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی یہی سوچ کر دانیال بھی وہیں ٹھہر گیا تھا۔ لیکن آذر اسے بیٹھے دیکھ کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

"آذر پلیز..... زرا میری بات سنو۔" دانیال نے اسے روکا تھا۔

"ہونہہ..... تمہارے پاس کوئی بات ہوئی تو میں ضرور سنتا دانیال صاحب! لیکن افسوس کہ تمہارے پاس کوئی بات نہیں۔ صرف تسلیاں ہیں تسلیاں..... جھوٹی اور خوش فہم تسلیاں..... بے بنیاد تسلیاں..... جن کو میں پہلے بھی سن چکا ہوں، لیکن اب مزید سننا چاہتا..... اب جو کچھ جیسے چل رہا ہے اسے چلنے دو، کیونکہ اب کچھ کہنے سننے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

آذر کافی چبا کر بات کر رہا تھا، اس کا لہجہ کافی تلخ اور طنزیہ سا ہو رہا تھا۔

"آذر! ہمارے پاس کہنے سننے کے لیے بہت کچھ ہے، لیکن تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ اس سارے قصے میں ایسا کچھ ضرور ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ جو ہم سے چھپا ہوا ہے، جسے ہم نہیں جانتے، جسے علیزے جانتی ہے یا پھر ڈیڈ اور منصور حسین جانتے ہیں۔ خود پتا ہونا چاہیے کہ علیزے ایسا نہیں کر سکتی تھی اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو ضرور کوئی وجہ ہوگی؟ کوئی بڑی وجہ..... کوئی اہم وجہ؟" دانیال کے ذہن میں جو سوچیں کلبلا رہی تھیں، وہ ان سب کے سامنے لانا چاہتا تھا لیکن کوئی بھی سمجھنے اور غور کرنے ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"ہونہہ..... کہنا تمہارے پاس کوئی بات نہیں ہے، صرف تسلیاں ہیں، جھوٹی، خوش فہم اور بے بنیاد تسلیاں۔" آذر نے تلخ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"آذر، تم تو علیزے کے بہت قریب تھے۔ بہت خیال رکھتے تھے اس کا، بہت چاہتے تھے اسے۔ ہم سب سے زیادہ اندر انسیڈ کرتے تھے اس کو..... اور تم بھی اس کو سمجھ نہیں پائے؟ تم ہی سب سے زیادہ بدظن ہوئے پھر رہے ہو اس سے؟ کیا تمہیں اس پہ ذرا بھی اعتماد نہیں تھا؟" دانیال کے لہجے میں تاسف تھا۔ دکھ تھا اور بے یقینی بھی۔

"مجھے اس پہ سب کچھ تھا۔ اعتماد تھا، بھروسہ تھا، اس سے محبت تھی، اس سے پیار تھا، کیا کچھ نہیں تھا، اس سے..... لیکن اس نے سب ختم کر دیا..... خود..... خود ختم کیا اس نے..... میری آنکھوں کے سامنے، سب مٹا دیا اس نے..... اس کے جو الفاظ میں نے سنے ہیں، وہ میں جانتا ہوں، تم سنتے تو اس وقت اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ جاؤ دیکھو ویڈیو کو دیکھو، جو کچھ میں نے سنا تھا وہ سب ویڈیو نے بھی سنا تھا۔ میں سہہ گیا اور بچ گیا، وہ نہیں سہہ سکے، اس لیے بچ نہیں سکے۔ وہ ظاہر سے مفلوج ہوئے ہیں، میں باطن سے مفلوج ہوا ہوں، ان کا جسم پیرالائز ہوا ہے اور میرے دل و دماغ پیرالائز ہو گئے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ بستر سے لگ گئے ہیں اور میں چل پھر رہا ہوں..... وہ اپنے جسم سے کام نہیں لے سکتے اور میں اپنے دل و دماغ سے کام نہیں لے سکتا..... ناکارہ ہو گئے ہیں ہم لوگ..... ناکارہ..... سمجھتے ہو نا اس کا مطلب؟" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے دانیال کو دیکھا تھا۔

"آذر، علیزے اب بھی واپس آ جائے تو۔"

"بس دانیال بس..... اب اور نہیں..... عزت کوئی لباس نہیں ہے، جسے اُتار کر دھو کر پونچھ کر دوبارہ پہنا جا سکتا ہے۔ عزت، عزت ہی ہوتی ہے، اتر گئی تو اتر گئی، دوبارہ بحال نہیں ہو سکتی، اگر ایسا کرنے کی کوشش بھی کرو گے تو بھی دل میں آئینے کی طرح بال آ جائے گا اور جس چیز میں بال رہ جائے اسے جوڑنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" آذر نے دانیال کی بات کاٹتے ہوئے خفگی اور تلخی سے کہا تھا۔ اب تو اس کا لہجہ ہر وقت ہی تلخ رہتا تھا۔

"لیکن آذر علیزے کے ساتھ....."

"پلیز دانیال! میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میرے سامنے کسی کا نام مت لو۔" آذر نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا تھا۔

"کیوں نام نہ لیں کیا اتنے ہی لاتعلق اور بے حس ہو گئے ہو تم؟"

"ہاں..... ہاں..... ہو گیا ہوں بے حس اور کیا سننا چاہتے ہو تم۔ جو کچھ وہ کر کے گئی ہے کیا وہ بے حس ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ تم کہتے ہو اس کے ساتھ ضرور کچھ ہوا ہو گا۔ لیکن میں کہتا ہوں کیا ہوا ہو گا بھلا، کیا وہ منصور حسین اسے گن پوائنٹ پہ لے گیا ہے یا پھر وہ اسے بیہوش کر کے کڈنیپ کر کے لے گیا ہے؟ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی، ٹھیک ٹھاک حلیے میں تھی، وہ بھی اس کے ساتھ تھا، اس کے بیڈ روم میں تھا۔ وہ چاق و چوبند تھا، وہ بھی اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ اس کی کنپٹی پہ میں نے تو کوئی گن نہیں دیکھی تھی، جس کے دباؤ میں آ کر وہ اس کے ساتھ جاتی..... بلکہ وہ تو اعتراف کر رہی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہے۔ اگر وہ کسی کے دباؤ میں ہوتی تو ہمیں کوئی اشارہ بھی دے سکتی تھی، روک سکتی تھی، چلا سکتی تھی، اس منصور حسین کی بھی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں گھس کر اسے سب کے سامنے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا اور اس کی مرضی کے بغیر یہ سب کر لیتا۔ اگر اس نے زبردستی بھی اسے لے کر جانا ہوتا تو پہلے ہی اسے اپنے ساتھ لے جاتا، آخر وہ اس کے ساتھ آئی جاتی تھی۔ وہ اس کا ڈرائیور تھا، کر نا چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے کڈنیپ کر سکتا تھا، لیکن نہیں..... اس نے ایسا نہیں کیا..... کیونکہ یہ معاملہ زور زبردستی کا نہیں تھا، یہ جو کچھ بھی ہوا ہے دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوا ہے۔ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ علیزے آتشدگی پہ چڑھ اور پندرہ نومبر کی درمیانی شب کوئی آفت آئی تھی جو اسے منصور حسین کے ساتھ اڑا کر لے گئی ہے۔" آذر نے سختی سے کہتے ہوئے غصے سے کرسی کو ٹھوکر ماری اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کے اندر اُبال اُٹھ رہے تھے اور دماغ کی شریانیں پھٹنے کو تھیں۔ اس لیے وہ مزید آفس میں رُکے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور کافی رش ڈرائیو کرتا ہوا حویلی پہنچا تھا۔

"السلام علیکم....." سیڑھیاں اُترتی کومل کے چہرے پہ رنگ آ گئے تھے لیکن آذر نے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کافی عجیب اور غیر معمولی ہو رہے تھے جنہیں دیکھ کر وہ چونکی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کومل ایناہیت سے پیکر بنی آگے بڑھی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ روکھے سے انداز میں کہہ کر سیڑھیاں طے کر گیا تھا۔ اس کا رُخ علیزے کے بیڈ روم کی طرف تھا۔ کومل کو

دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

وہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ اک زوردار جھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور علیزے کا خوبصورت سجا سجایا کمرہ جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی، ویسا ہی جوں کا توں نظر آ رہا تھا۔ یوں جیسے علیزے ابھی ابھی بیڈ روم سے نکل کر باہر آ گئی ہو۔

آذر نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تھی اور پھر اسے دائیں سائیڈ کی دیوار سے لگے صوفے پہ اور صوفے کے سامنے والی علیزے کی برتھ ڈے کے قیمتی گفٹس بنوز پیکنگ میں بند پڑے نظر آئے تھے اور صوفے کے ساتھ والی چھوٹی کرسٹل ٹیبل پہ سب سے الگ تھلگ آذر کا دیا ہوا گفٹ رکھا تھا اور باقی سب کی طرح وہ بھی بنوز پیکنگ میں ہی تھا۔ گویا علیزے نے آذر آفندی کے گفٹ کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ بھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ گولڈن ریپر ہٹا کر ہی دیکھ لے کہ وہ اس ریپر کی اوٹ میں کیا چھپا رکھا ہے؟ محبت لایا تھا یا محبت کا اقرار لایا تھا۔

وہ اس بیچ پہ سوچتی تو تب نا؟ اور آذر گولڈن ریپر میں لپٹے اپنے جذبات کی ناقدری پہ مٹھیاں بھینچتا ہوا سرخ پڑتی آنکھیں لیے اس گفٹ کی طرف بڑھا تھا۔

"آئی لو یو علیزے..... آئی لو یو علیزے..... آئی لو یو علیزے....." سفید پتھر سے بنے تاج محل کے اندر سے مینجی کی آواز میں اظہارِ محبت کیا جا رہا تھا اور یہ اظہار آذر کو اور بھی کاٹ کے رکھ گیا تھا۔ وہ یہ گفٹ بڑے چاؤ سے بڑی مشکل سے کر کے لایا تھا۔ محبت کی علامت اور محبت کا نشان سمجھ کے ایک محبت کرنے والے کا محبت بھرا تحفہ سمجھ کے..... لیکن یہاں محبت کون تھا بھلا؟ ہونہہ محبت..... آذر تاسف سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور گفٹ کی پٹ کھول کر ہاتھ میں پکڑے سفید مرمر کے تاج محل کو اپنی پوری قوت سے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ حویلی کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ تاج محل کے احاطے سے باہر جا کے گرتا۔

لیکن جہاں گرا تھا وہیں دانیال کی گاڑی کے جا بجا چرچرائے تھے اور وہ فوراً گاڑی سے اتر آیا تھا اس نے کشادہ ڈرائیوے کے پتھروں بیچ سفید سنگ مرمر کے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھے تھے۔

"آئی لو یو علیزے..... آئی لو یو علیزے..... آئی لو یو علیزے....." ایک چھوٹے سے پرزے میں ریکارڈ یہ جملہ ابھی تک سے باز نہیں آ رہا تھا جس سے لگ رہا تھا کہ ٹوٹنے کے بعد بھی محبت ختم نہیں ہوئی، چاہے دل ٹوٹ جائے، چاہے تاج محل

دانیال نے وہ گنگناتا ہوا پرزہ اُٹھایا اور علیزے کے بیڈ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں آذر نے کھڑکی کے زور سے بند کیے تھے اور دانیال تاسف سے دیکھتا تُفی میں سر ہلاتا ہوا سفید سنگِ مرمر کے ٹکڑوں کو روندتا ہوا چپ چاپ آگے بڑھ گیا تھا، بڑی حویلی کے حالات کشیدہ ہو چکے تھے۔ رشتوں میں اچھی خاصی بدمزگی اور بدمگنی پیدا ہو چکی تھی۔

♥

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو میرے ہاتھوں میں
ایک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے؟
کس لیے بنایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں.....

علیزے کے قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ اس لیے اس کے گرنے کے ڈر سے گل نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا جو ان جہان لڑکی چند دن کی قید اور دو دن کے بخار سے خود چلنے پھرنے سے قاصر اور دوسروں کے سہاروں کی

تھی۔ وہ ایک قدم سیڑھی پر رکھتی تو دوسرا قدم اُٹھانے کے لیے اسے چند سیکنڈ اپنی ہمت مجتمع کرنی پڑتی تھی۔

اور یہ چند سیڑھیاں طے کرنے میں اسے یوں لگا جیسے گھنٹوں گزر گئے ہوں، ایک ہاتھ سے وہ دیوار کا سہارا لے رہی تھی اور ایک ہاتھ گل نے تھاما ہوا تھا اور ان دو سہاروں کی مدد سے وہ اس ٹھنڈی قبر نما یخمست کی سیڑھیاں طے کر کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی اور اس دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بھر آیا تھا۔

علیزے کو جب یہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کے تمام راستے انجان اور اَن دیکھے تھے۔

''بی بی جی! ادھر آ جائیں، صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو لان میں بٹھاؤں۔'' گل اسے سیڑھیوں کے پیچھے سے نکال کے راہ داری اور ڈرائنگ روم کے مرکزی حصے کی طرف لے آئی تھی۔

''لان میں؟'' علیزے نے بے یقینی کیا اور حسرت سے پوچھا تھا۔

''جی ہاں..... لان میں صاحب نے خود کہا ہے۔'' گل نے اسے یقین دلایا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے گل نے اسے زندگی کی نوید سنائی ہو۔ اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی وہ بمشکل گل کے سہارے راہ داری عبور کر کے باہر لان تک آئی تھی۔

علیزے نے پہلی بیتاب اور پیاسی نظر آسمان کی طرف اُٹھائی تھی، شفاف نیلا آسمان اور آسمان کے ماتھے پہ سجا سنہری سورج علیزے کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ ہمیشہ سورج کی دھوپ سے ذرا بچ کے رہتی تھی۔ وقار آفندی ہمیشہ احتیاط کرتے تھے کہ کہیں علیزے کی رنگت دھوپ کی وجہ سے سنولا نہ جائے، کہیں خراب نہ ہو جائے، کوئی انفیکشن نہ ہو اور آج وہی دھوپ علیزے کو اپنے جسم کے لیے ایک راحت محسوس ہو رہی تھی اور وہ پلکیں موندتے ہوئے رو پڑی تھی، اس کے آنسو رخساروں پہ بہہ آئے تھے۔

''بی بی جی! تھک جائیں گی، وہاں کرسی پہ بیٹھ جائیں۔'' گل نے لان میں بچھی کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا، لیکن علیزے وہیں لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی اور اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بخار سے تپتے ہوئے جسم اور دل و دماغ کو دھوپ کی وجہ سے سکون ملنے لگا تھا۔ یخمست میں بہت زیادہ ٹھنڈک تھی اور علیزے اتنی سردی برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے اسے ٹھنڈ کی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔ گل دو دن سے مسلسل اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور جب دل آور کو پتا چلا کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو وہ صبح آفس جانے سے پہلے خود اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس لیے وہ جاتے جاتے گل سے کہہ گیا تھا کہ باہر دھوپ نکلے تو وہ اسے تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں لے جائے، تاکہ اس کے جسم کو سورج کی تھوڑی حرارت مل سکے، اس لیے دل آور کے جانے کے تقریباً دو، تین گھنٹے کے بعد جب علیزے قدرے ہوش میں آئی تھی تو گل نے اسے یخمست سے باہر لانے میں جلدی کی تھی کہ کہیں صاحب کا یہ حکم پھر کسی غصے میں تبدیل نہ ہو جائے اور علیزے باہر آ کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے مرنے کے بعد دوبارہ اسے زندگی عنایت کر دی گئی ہو، جس کی ہر مرنے والے کی طرح اسے امید ہی نہیں تھی اور جب امید اور توقع سے بڑھ کر ملا تھا تو اس کی آنکھیں بار بار چھلک رہی تھیں، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یونہی عمر بھر اس آزاد اور کھلی فضا میں انہی سیڑھیوں پہ بیٹھی رہے اور اس کی عمر تمام ہو جائے۔ اس وقت علیزے کے لیے اس کھلی فضا اور قدرتی ماحول سے بڑھ کے اور کوئی بھی شے قیمتی نہیں تھی۔ علیزے کو چند ہی دن میں ان سب چیزوں کی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا تھا، جن کی اہمیت پہ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس سورج سے زیادہ اسے ہیٹر کی گرمائش اہم محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج احساس ہوا تھا کہ سورج بھی انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور اس نے اس نعمت پہ کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا اور آج جب دھیان دیا تھا تو اس کے سوا کوئی اور چیز اہم نہیں لگ رہی تھی۔

گل نے بارہا اسے سیڑھیوں سے اُٹھانے کی اور کرسی پہ بٹھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ لان کی سیڑھیوں کا رُخ مشرق کی طرف تھا۔ اس لیے مشرق کی طرف سے نکلنے والے سورج کی سنہری روپہلی دھوپ سیدھی علیزے پہ ہی پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کے نڈھال ہوئے جسم کو کافی تقویت مل رہی تھی۔ پہلے تو وہ کافی دیر لان کو دیکھتی رہی، پھر جب تھک گئی تو اپنا سر گھٹنوں پہ ٹکا دیا تھا اور پلکیں موند لی تھیں۔ اور یونہی گھٹنوں پہ سر رکھے اور پلکیں موندے ہوئے اسے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی جب گیٹ پہ کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ مگر بخار کی وجہ سے علیزے کا سر اور آنکھیں اتنی بھاری اور بوجھل ہو رہی تھیں کہ وہ ذرا سی ذرا سر اُٹھا کر اتنا بھی نہ دیکھ سکی کہ آنے والا کون ہے۔

پہلے گیٹ کھلا تھا۔ پھر گاڑی اندر آئی تھی، پھر گاڑی روک کر کوئی گاڑی سے نیچے اترا تھا اور پھر رفتہ رفتہ بھاری قدموں کی

چاپ اس کے قریب آتی چلی گئی تھی۔

''ہیلو..... کیسی ہو؟'' اس کی آواز علیزے کے بہت قریب سے ابھری تھی اور علیزے کا دل چاہا تھا وہ اپنی سماعتیں ہمیشہ کے لیے بند کر لے، تاکہ وہ کبھی اس کی آواز نہ سن سکے۔

''میں تم سے مخاطب ہوں جان وقار! کیسی ہو؟ کچھ اچھا فیل ہوا یا نہیں؟'' وہ اطمینان سے کہتا اپنی پینٹ ذرا سی گھٹنوں سے کھینچتا ہوا اس کے برابر ہی لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا تھا۔

اور اب کی بار نقاہت کے باوجود علیزے نے یکدم کرنٹ کھا کے دیکھا تھا، وہ اس کے ساتھ، اس کے بالکل برابر، بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے اس کے پورے جسم پہ کسی نے تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی ہو، اس کا رواں رواں جل اٹھا تھا۔ وہ یکدم پیچھے ہٹی تھی، لیکن اس کا ہاتھ دل آور کے ہاتھ کے نیچے دبا رہ گیا تھا۔

''بیٹھی رہو..... بُرا ہو سکتا ہوں لیکن بدنیت یا بدکردار نہیں ہو سکتا۔'' دل آور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر اسے روکا تھا اور علیزے نے اسے سرخ آنکھوں سے بڑے زخمی انداز سے دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے دل آور نے آنکھوں کی زخمی تحریر بڑے واضح حروف میں پڑھی تھی۔

''جس چیز کو تم میری بدنیتی سمجھ رہی ہو وہ بھی میری بدنیتی نہیں تھی، وہ سب بھی میں نے بڑی ایمانداری سے کہا تھا ایمانداری سے کہ.....'' اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تھی اور علیزے کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔ وہ دل آور ادھوری بات کے آگے خاک ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لینے کا سارا غرور مٹی میں مل گیا تھا۔

سیڑھیوں کے فرش پہ علیزے کا ناک سا ہاتھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپر دل آور کے ہاتھ کا بوجھ تھا، لیکن علیزے اب ہاتھ کھینچنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔

''اوہو..... تمہیں تو ابھی بھی بخار ہے۔'' اس کو علیزے کے ہاتھ کی حدت ذرا دیر بعد محسوس ہوئی تھی۔ اس نے علیزے کی کلائی چھو کر دیکھی تھی۔

''ٹیبلٹ لو گی؟'' اس نے علیزے کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں..... علیزے نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔ لیکن دل آور نے اس کے پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور گل کو پکار لیا تھا۔

''جی صاحب! کہیے؟'' گل دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی سامنے آئی تھی۔

''میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز سے بخار کی ٹیبلٹ اور دو کپ چائے کے ساتھ ایک گلاس پانی لے کر آؤ..... منٹ کے اندر اندر.....'' اس نے حکم جاری کیا تھا اور گل ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔

''جی صاحب! ابھی لے کر آئی۔'' وہ فوراً پلٹ گئی تھی۔ لیکن پلٹنے سے پہلے اس کی نظریں علیزے کے ہاتھ پہ ٹھہری تھیں، اس وقت دل آور کے ہاتھ میں تھا اور یہ منظر گل کے لیے ایک ناقابل یقین اور قابل فراموش منظر تھا۔ جس پہ وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی اندر چلی گئی تھی۔

''آج میرے ایک اہم کیس کی ڈیٹ تھی اور مجھے اس میں کچھ پراسیکیوٹر نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اللہ کی مدد سے اس کیس کا رزلٹ میرے حق میں ہی نکلا ہے۔ اس لیے کورٹ سے نکلتے ہوئے میں بہت خوش تھا اور میرا ارادہ اپنے دوستوں کی طرف جانے کا تھا کہ نہ جانے پھر کیوں تمہارا خیال آ گیا کہ تم بیمار ہو، اس لیے دوستوں سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے گھر آ گیا ہوں۔ صرف تمہارے لیے، صرف تمہاری خاطر.....'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے یوں نرمی اور اپنائیت سے بتا رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان پیار و محبت کا بہت مضبوط رشتہ قائم ہو یا پھر یوں جیسے وہ اس کی بیوی ہو یا محبوبہ۔

''ایک سوال پوچھوں تم سے۔ جواب دو گے؟'' علیزے نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا، بھیگی آنکھیں سوالیہ ہو رہی تھیں۔

''اسی طرح تو جان بھی مانگو گی تو دے دوں گا۔ سوال کا جواب تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' دل آور نے نثار ہو جانے والے انداز میں کہا تھا۔

''کیا تم واقعی لوگوں کو انصاف دلاتے ہو؟'' علیزے کے لہجے اور سوال میں بے یقینی تھی اور دل آور علیزے کے سوال پہ ٹھہر سا گیا تھا۔

"کوشش تو یہی کرتا ہوں لیکن کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہوں، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"تو پھر یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے؟" علیزے بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتی اس سے سوال و جواب کر رہی تھی۔

"تمہارے بارے میں میرا انصاف جو کہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا اور مجھے اللہ سے ڈر بھی لگتا ہے۔" دل آور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے گہری سانس خارج کی تھی اور اس کے جواب پہ علیزے کی روح فنا ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور پورے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

"صاحب..... چائے۔" اتنے میں گل چھوٹی سی ٹرے لیے حاضر ہو گئی تھی۔

"ہوں..... لاؤ ادھر ہی رکھ دو۔" دل آور نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی صاحب۔" گل نے آگے بڑھ کے ٹرے سیڑھی پہ رکھ دی تھی۔

"اوکے..... تم جاؤ اب۔" اس کے کہنے پہ گل اندر چلی گئی تھی اور دل آور نے ہاتھ بڑھا کے پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ اٹھا کے علیزے کی سمت بڑھا دی تھیں اور علیزے میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ٹیبلٹ لینے سے انکار کرتی۔ اس لیے چپ چاپ دل کڑا کر کے اس کے ہاتھ سے گلاس اور ٹیبلٹ لے لیے تھے بڑی مشکل سے ٹیبلٹ نگلنے کے بعد اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"ڈونٹ وری..... کچھ نہیں ہوتا، تم یہ چائے پیو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھا کر علیزے کی سمت بڑھایا تھا۔

"میں..... میں..... چائے نہیں پیتی۔" اس نے بمشکل کہا تھا، کیونکہ اسے ٹیبلٹ کی وجہ سے ابکائی آ رہی تھی۔

"تم تو کبھی فرش پہ بھی نہیں سوئی تھیں، لیکن پھر بھی سو رہی ہو۔" اس نے مثال دی تو علیزے نے مجبوراً اس کے ہاتھ سے کپ تھام لیا تھا۔

"ہوں گڈ..... کافی سمجھدار لڑکی ہو۔ بات کو کافی جلدی انڈر اسٹینڈ کر لیتی ہو۔" دل آور نے اسے سراہا تھا اور چائے کا کپ اٹھا کر خود بھی چائے کے سپ لینے لگا تھا۔

علیزے کو اپنا آپ، اپنا دل مار کے وہ کام کرنا پڑ رہے تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔ لیکن وقت تھا کہ اس سے سب کروا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے دل آور کے پہلو میں بیٹھ کر چائے پلوا رہا تھا اور وہ پینے پہ مجبور تھی۔

"آور آنجہانی کیسا لگتا ہے تمہیں؟" چائے پیتے ہوئے دل آور نے ایک غیر متوقع سوال کیا تھا اور علیزے چونک گئی تھی۔

"آور بھائی؟" علیزے نے حیرت اور ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہوں..... تمہارا آور بھائی..... وہی..... اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" علیزے کو اس کے عجیب سے سوال پہ الجھن ہوئی تھی۔

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو..... سوال مت کرو۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا تھا۔

"کیا مطلب تھا تمہارا، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" علیزے ٹھٹک گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ایموشنل ٹینڈوا اس کے حوالے سے۔" دل آور نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اپنی سمت دیکھتی علیزے کی آنکھوں میں دیکھا تھا جس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

"ڈ..... ڈرائیور..... یہ..... یہ..... تم کیا..... کہہ رہے ہو..... تت..... تم نے..... یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ.....؟" علیزے حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

"ہونہہ..... مجھے کیا ضرورت ہے ایسا فضول سوچنے کی۔ یہ سوچ تو تمہارے آور بھائی کی ہے، جو اب اپنی سوچ پہ پچھتا رہا ہے۔" دل آور نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"آور بھائی کی سوچ....." علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پہ اور دل آور کے کہے الفاظ پہ یقین نہیں آ رہا تھا لیکن اسے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ اس کے قریب بیٹھا یہ آدمی مذاق نہیں کر سکتا۔

"ہوں..... آور بھائی کی سوچ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''مم..... مگر..... یہ..... یہ..... کیسے ہوسکتا ہے بھلا وہ..... وہ میرے بارے میں..... ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں۔'' علیزے کے دل و دماغ اس حقیقت کو قبول کرنے پہ تیار نہیں ہوئے تھے۔

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیسے سوچ لیا اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا۔'' وہ بھی لاپروائی سے کام لے رہا تھا۔

''تت..... تم مجھے میٹھی ڈسٹرب کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو نا؟'' اس نے دل آور کو مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔

''میں تمہیں دنیا کی تمام حقیقتوں سے روشناس کرانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، میرے پاس رہو گی تو تمہیں زندگی کی ہر اونچ نیچ کا پتا چل جائے گا۔ بڑی حویلی میں رہ کر دنیا کو پتا تھا کہ تم کیا ہو اور اب یہاں میرے گھر میں رہ کر تمہیں پتا چلے گا کہ دنیا کیا ہے، دنیا جنت بھی ہے اور دوزخ بھی..... پہلے تم نے جنت کا رخ دیکھا ہے اب دوزخ کا رخ دیکھو گی۔'' کہتے کہتے دل آور کا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور علیزے دل تھام کے رہ گئی تھی۔ وہ روح تک لرز گئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس کے سیل پہ بتول شاہ کی کال آگئی تھی اور وہ وہاں سے اُٹھ گیا تھا۔ لیکن علیزے کے پاس ہمیشہ کی طرح اُلجھنیں اور سوال چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ زندگی ریشم کی ڈوریوں کی طرح اُلجھ چکی تھی، کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

♥

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب کسی نے ان کے گھر کا دروازہ انتہائی زور سے دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا تھا۔

عدیل کے ساتھ ساتھ باقی گھر والے بھی گہری نیند سے جاگ گئے تھے۔ وہ اپنے اوپر سے گرم لحاف ہٹا کر بڑی تیزی سے اپنے بستر سے اُٹھا تھا اور زیرو پاور بلب کی روشنی میں جوتے پہن کر کمرے کا سوئچ بورڈ اور لائٹ جلا کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ اتنے میں مریم اور عابدہ خاتون بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئی تھیں۔

''عدیل..... باہر کون ہے بیٹا؟'' عابدہ خاتون پریشان ہو چکی تھیں۔

''پتا نہیں کون ہے، دیکھتا ہوں ابھی۔'' عدیل کہہ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

''کون ہے؟'' اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً پوچھا تھا۔

''استاد..... میں ہوں شہریار..... دروازہ کھولو۔'' عدیل کو باہر سے چھوٹے کی آواز سنائی دی تھی اور دماغ میں کسی انہونی کا الارم بجا تھا۔

''شہریار.....'' اس نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

''کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا؟'' عدیل پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

''خیریت نہیں ہے استاد! ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے، سب تباہ ہو گیا ہے۔ ہم..... ہم سب برباد ہو گئے ہیں۔'' شہریار نے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا اور عدیل کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

''ورکشاپ میں آگ.....'' عدیل کو اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ رات کے تین بجے اچانک گہری نیند سے جگا دیا گیا تھا اور پھر خبر سنتا دماغ کو ہوا کے رکھ گیا تھا۔

''استاد! تم یہاں سے چلے جاؤ، تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

شہریار نے اسے آنے والے وقت کی سنگینی سے بچاؤ کا راستہ بتایا تھا اور عدیل دم بخود رہ گیا تھا۔

''شہریار! یہ کیا کہہ رہے ہو تم، تمہارا مطلب ہے کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں۔'' عدیل کا لہجہ بے یقین سا تھا۔

''وقت کی نزاکت یہی کہہ رہی ہے استاد کہ آپ گھر سے چلے جاؤ۔ کچھ دن بعد میں آ جانا۔'' شہریار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''مگر کیوں شہریار! میں کیوں بھاگ جاؤں، میں نے کیا کیا ہے بھلا۔'' عدیل کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ شہریار کی بات سمجھنے اور ماننے پہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔

''بے شک آپ نے کچھ نہیں کیا استاد! لیکن وہ ورکشاپ دی ذمہ داری تو آپ ہی پہ تھی نا، اب اگر ورکشاپ میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو ذمہ دار بھی تو آپ کو ہی ٹھہرایا جائے گا۔''

''ورکشاپ میں تین گاڑیاں جل گئی ہیں تو کیا ان کا نقصان باؤ امتیاز پورا کرے گا، ہونہہ ہرگز نہیں..... وہ یہ نقصان آپ

ٹھاتے میں ڈال دے گا اور آپ یہ نقصان کیسے پورا کریں گے؟ اگر نقصان پورا نہ ہوا تو آپ کو جیل جانا پڑے گا اور اگر خدانخواستہ آپ جیل چلے گئے تو وہاں سے نکلو گے کیسے اور پیچھے گھر والوں کا کیا ہو گا؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جاؤ۔" شہریار، عدیل کے ہر مسئلے پہ سوچ رہا تھا اور عدیل چکرا گیا تھا۔

"کیسے چلا جاؤں، کہاں چلا جاؤں، کیا کہیں جانا اتنا آسان ہے بھلا۔ میرے گھر میں ماں ہے، بہنیں ہیں، معذور اور لاچار باپ ہے، انہیں کس کے سہارے پہ چھوڑ جاؤں ادھر میں گھر سے باہر قدم رکھوں گا ادھر وہ بے سہارا ہو جائیں گے۔ لوگ گدھ کی طرح ان کے گان کی بوٹیاں نوچنے کے لیے آ جائیں گے ان کو..... میری عزت، میری بہنیں غیر محفوظ ہو کے رہ جائیں گی۔ کون تحفظ دے گا ان کو، کون حفاظت کرے گا ان کی ہو..... میرا گھر سے بھاگنا آسان نہیں ہے یار! میں چھپا چھپا نہیں ہوں کہ بھاگ جاؤں۔ میرے گھر میں میری عزت ہے۔ کل کو میں بھاگ جاتا ہوں تو کیا میرے گھر پہ پولیس نہیں آئے گی، کیا میرے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے، میری ماں، بہنوں سے پوچھ پڑتال نہیں کریں گے، دھمکیاں نہیں دیں گے، تنگ نہیں کریں گے، کیا آئے روز میرے گھر کی کنڈی نہیں کھڑکے گی۔ اگر یہ سب ہو گا تو کیا عزت رہ جائے گی میری اور کیا فائدہ میرے بھاگنے کا۔ اس لیے اس سے بہتر ہے کہ میں سامنے جا کر حالات کا مقابلہ کروں کہ آخر ہوتا کیا ہے۔"

"پھر تم اگر دوست ہو تو اس برے وقت میں میرا ساتھ دو، مجھے تم لوگوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔" عدیل نے اپنی جگہ سے ہلنے کے بجائے ہم جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ حالات کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لو استاد۔" شہریار نے آخری کوشش کی تھی۔

"تم نے سوچنے کا وقت کب دیا ہے چھوٹے، نیند بھی تو ڑ دی اور خواب بھی۔"

عدیل شکوہ گلہ بھی کہتا تلخی سے سر جھٹک کر اندر آ گیا تھا۔ مریم اور عابدہ خاتون اس کے پیچھے کمرے تک آئی تھیں۔

"بھائی اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ بس ایک دوست پہ پولیس کیس بن گیا ہے، اس کے لیے جا رہے ہیں، آپ دعا کیجیے گا کہ زیادہ مسئلہ نہ بنے۔" عدیل نے اپنی گرم چادر اٹھا کر کندھوں پہ پھیلائی تھی۔

"اللہ خیر..... اللہ خیر..... جلدی گھر آ جانا۔" وہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولی تھیں۔

"ان شاء اللہ جلدی گھر آ جاؤں گا، آپ ذرا مریم کو اندر بھیج دیں۔" اس نے بوٹ پہنتے ہوئے کہا تھا اور عابدہ خاتون باہر نکل گئیں اور وہ بوٹ پہننے کے بعد کھڑا ہوا ہی تھا کہ مریم اندر آ گئی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" مریم کا لہجہ سنجیدہ اور خاصا تھا اور عدیل اس کے سوال پہ رک گیا تھا اور پھر اس کے سامنے آ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"دیکھو مریم! مجھے پتا ہے کہ تم بہت بہادر ہو، نیک ہو، عزت دار ہو، میرے لیے ہمیشہ بہن نہیں بلکہ بھائی ثابت ہوئی ہو، تمہارے صبر اور ہمت کی داد دیتا ہوں، تم نے کبھی اپنا یا ہمارا حوصلہ گرنے نہیں دیا اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا تم اپنا بھی حوصلہ بلند رکھو گی اور باقی سب کو بھی ہمت اور حوصلہ دو گی، خصوصاً امی اور ابا جی کو۔"

عدیل نے اسے سمجھانے کے لیے تمہید باندھی تھی اور مریم کا دل کانپ گیا تھا۔

"آپ..... یہ..... یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں آپ، ہوا کیا ہے؟" مریم کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور تفکر کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"مریم پلیز..... تم نے پریشان نہیں ہونا، اگر تم پریشان ہو گئیں تو سمجھو کہ ہمارا پورا گھر پریشان ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہمارے گھر کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ ہے تمہاری ہمت، بہادری اور سمجھداری اور مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ سنبھال کے رکھو گی اور سب کا خیال بھی رکھو گی، یہ گھر اور اس گھر کی عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سنوار بھی سکتی ہو اور بگاڑ بھی سکتی ہو۔ یہ وقت شاید ہم دونوں، بہن، بھائی کے لیے آزمائش کا وقت ہے۔ دعا کرو اللہ ہمیں اس آزمائش میں سرخرو کرے۔" عدیل نے کہتے ہوئے مریم کا ہاتھ تھام کے تھپکا تھا۔

"لیکن آپ یہ کیوں نہیں بتا رہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں، کیا ہوا ہے؟" مریم جھنجلا گئی تھی۔ اس کی جان مٹھی میں آئی ہوئی تھی اور عدیل تھا کہ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

"وہ دراصل ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے۔ کافی نقصان ہوا ہے اور یقیناً اس نقصان کا ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرایا جائے گا۔ اس لیے اس نقصان کی وجہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں جا رہا ہوں، اگر کل دوپہر تک واپس نہ آیا تو سمجھ لینا کہ مجھے جیل ہو گئی ہے۔ خیر جو بھی ہو گا میرا وکیل ہے ایک، شہریار نام ہے اس کا، وہ آ کر آپ لوگوں کو ساری بات بتا دے گا۔"

عدیل کو بتانا ہی پڑا تھا اور مریم کے تو پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"کیا..... آپ جیل جا رہے ہیں۔" مریم کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر سے سائبان چھین کر اسے تپتے صحرا میں دھکیل دیا ہو۔ چکرا گئی تھی۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا، ابھی جاؤں گا تو پتا چلے گا کہ میرے لیے کیا سزا ہے۔" عدیل نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

"لیکن عدیل بھائی آپ....." مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن عدیل نے اسے روک دیا تھا۔

"بس..... زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ شہریار باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ اب جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا، تم دعا کرنا اور سب کو دینا۔" عدیل نے کہہ کر اس کا سر تھپکا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ مریم تڑپ کے اس کے پیچھے لپکی تھی۔ لیکن عدیل کی عابدہ خاتون سے مل کر گھر کی دہلیز عبور کر گیا تھا۔

"استاد! ایک بار پھر سوچ لو۔ ایسے معاملے لمبے چوڑے ہو جاتے ہیں۔ جتنا بھی سمجھانے کی کوشش کرو الٹا اور الجھتے آپ کے پیچھے تو اور کوئی بھی نہیں ہے جو آپ کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا۔" چھوٹے نے ٹیکسی سے اترنے سے پہلے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"میرے لیے اللہ تو ہے نا، سب کچھ کرنے والا۔ میری کوئی غلطی، میرا کوئی قصور نہیں ہے، اس لیے میرا انصاف وہی کرے گا جو سب سے بڑا عادل ہے۔" عدیل نے پورے یقین اور بھروسے سے کہا تھا اور ٹیکسی سے اتر آیا تھا۔

ورکشاپ کے باہر پولیس اور فائر بریگیڈ والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں، چند آس پاس کی دکانوں والے لوگ بھی تھے۔ لوگوں کے ہجوم میں امتیاز کاشمیری (باؤ امتیاز) کھڑے تھے۔ عدیل مضبوط قدموں سے چلتا ہوا قریب آ گیا تھا۔

"باؤ عدیل آ گیا۔" سب سے پہلے اس پہ چائے کے ڈھابے والے بھٹی صاحب کی نظر پڑی تھی اور پھر پورا ہجوم اس کی سمت متوجہ ہو گیا تھا جبکہ باؤ امتیاز تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

"یہی ہے میری بربادی کا ذمہ دار۔" باؤ امتیاز دھاڑ اٹھا تھا اور چھوٹے، جیدی اور سلو کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔ پولیس لپک کے عدیل کو گھیر چکے تھے اور پھر وہی ہوا تھا جس سے بچنے کے لیے چھوٹے نے اسے بارہا سمجھایا تھا۔ عدیل عمر کو گرفتار ہوتا تھا اور سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

♥

"او کے..... میں جلدی آ جاؤں گی۔ اللہ حافظ....." وہ چادر اوڑھ کر بیگ لیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی تھی لیکن جانتی تھی کہ گھر سے ایک پریشانی ساتھ لے کر نکل رہی ہے تو آگے ایک اور پریشانی اس کی منتظر ہے۔

وہ بھی اسٹاف روم میں پہنچ کر اپنی بڑی سی چادر اتار کے اپنے سوٹ کا پینٹنگ دوپٹہ نکال رہی تھی جب ان کا پیون یہ پیغام حاضر ہوا تھا۔

"میڈم! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے، کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔" پیون نے کافی مؤدب سے انداز میں اطلاع پہنچائی تھی۔

"کون..... شہریار....." مریم چونک گئی تھی اس کا خیال بے ساختہ شہریار کی طرف ہی گیا تھا کیونکہ اسے اس وقت شہریار کا انتظار تھا۔

"سوری میڈم! نام نہیں بتایا انہوں نے....." پیون نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اچھا..... میں خود دیکھ لیتی ہوں۔" مریم اپنا بیگ اور چادر لا کر میں رکھتے ہوئے سٹاف روم سے نکل آئی تھی، اس کا وزیٹنگ روم کی طرف تھا وہ خاصے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں تک آئی تھی لیکن وزیٹنگ روم میں پہنچ کر اس کے قدم اپنی جگہ جیسے جم کے رہ گئے تھے کیونکہ سامنے ہی صوفے پہ جو بہت آخدی براجمان تھا جو اسے دیکھتے ہی فوراً صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہائے..... کیسی ہیں آپ؟" جودت آج جیسے بڑی فراغت نکال کے بڑے اطمینان سے اس سے ملنے آیا تھا اسی لیے بڑے سکون سے اس سے مخاطب تھا جبکہ مریم کے چہرے کی رنگت بدل چکی تھی، جودت آفندی کا اس سے ملنے کے لیے اکیڈمی آنا اس کے لیے کوئی بھی سکینڈل کھڑا کر سکتا تھا اور فی الحال کوئی بھی سکینڈل افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی، جودت آفندی کی آمد مریم کی ریپوٹیشن پہ ایک دھبا ثابت ہو سکتی تھی اور وہ مر کے بھی یہ دھبا نہیں لگوانا چاہتی تھی۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ آپ یوں مجھے نظروں کے رستے سے دل میں اُتارنے کھڑی ہو جائیں گی؟ پتا ہوتا تو میں پہلے ہی آ جاتا؟"

جودت کا لہجہ اور انداز خاصے معنی خیز تھے جس پہ مریم سر سے پاؤں تک سلگ اُٹھی۔

"جسٹ شٹ اپ..... زبان سنبھال کے بات کریں، مجھے ایسی بکواس پسند نہیں ہے۔" مریم پہلے ہی کافی پریشان تھی اس لیے جودت کی معنی خیزی پہ اس کا دماغ اور زیادہ گرم ہو گیا تھا۔

"لیکن مجھے تو بہت پسند ہے چاہے وہ بکواس آپ کریں یا میں....." جودت نے ہنوز معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" مریم نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بمشکل سوال کیا تھا۔

"پیاسا کنویں کے پاس کیوں آتا ہے؟" اُلٹا جودت کا سوال مریم کو پٹخنا کے رکھ گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"اُف..... حیرت کی بات ہے، آپ ایک ٹیچر ہو کر مطلب مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ وہ بھی اتنے آسان سوال کا؟"

جودت بھنویں اچکاتے ہوئے ذرا سا مسکرایا تھا اور چار قدم کا فاصلہ طے کر کے دو قدم کے فاصلے پہ اس کے بے حد قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

"سیدھی ظاہری بات ہے کہ پیاسا کنویں کے پاس اپنی پیاس بجھانے کے لیے آتا ہے، جیسے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

جودت سے بے باک سے انداز پہ مریم نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو تھپڑ مارنے سے روکا تھا ورنہ اس کا جی چاہا تھا کہ جودت آفندی کے منہ پہ ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کرے کہ اس کے چہرے پہ زندگی بھر کے لیے ایک یادگار سا نشان رہ جائے، لیکن مریم کے لیے آج کا دن اذیت اور برداشت کا دن تھا۔ وہ جودت آفندی پہ ہاتھ اُٹھا کے اسے اشتعال نہیں دلانا چاہتی تھی کیونکہ اگر وہ مشتعل ہو جاتا تو اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہو سکتا تھا اور وہ ایک تھپڑ کے عوض مزید پریشانی نہیں خریدنا چاہتی تھی۔

"دیکھیے جودت صاحب! آپ کی گھٹیا گفتگو مجھ پہ اثر انداز نہیں ہو سکتی آپ خوامخواہ اپنا ٹائم ویسٹ کر رہے ہیں۔ اس لیے پلیز آپ کسی ایسی لڑکی کا ایڈریس لیں جو آپ کے ٹائپ کی اور آپ کی ضرورت کے مطابق ہو، جس پہ ٹائم ویسٹ کرنے سے آپ کو نفع ہو، نقصان نہیں۔" مریم نے ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کو کیا پتا مریم جی! اس وقت آپ کو دیکھنا، آپ سے بات کرنا ہی میرا اصل نفع ہے، صبح صبح اُٹھنے کا بستر چھوڑنے کا مسئلہ حل ہو گیا ہے، طبیعت پہ بڑا اچھا اثر پڑا ہے، دل بڑی خیزی سے حرکت میں ہے۔" جودت نے بڑے سرشار سے انداز میں اپنے دل پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"جودت صاحب پلیز..... میری آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ آپ کے دل میں میرے حوالے سے جو بھی خیال ہے پلیز آپ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیں، کیونکہ میرے متعلق آپ کا انتخاب بہت غلط ہے، میں ایسی نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔

میری ذات اور آپ کی ضرورت کا کوئی جوڑ میل نہیں ہے، میری ذات کچھ اور ہے، آپ کی ضرورت کچھ اور ہے..... آپ کی ضرورت تو آپ کی اپنی کلاس سے ہی پوری ہو سکتی ہے، آپ اپنی کلاس سے نیچے کیوں آ رہے ہیں؟" مریم بہت زیادہ برداشت سے کام لے رہی تھی۔

"کیونکہ میں میک اپ سے سجے چہروں اور رنگین بالوں سے اُکتا چکا ہوں، میرا دل آپ کی نیچرل بیوٹی کا ہو کر رہ گیا ہے، جب سے آپ کو دیکھا ہے، ایک دن بھی آپ کی طلب کے بغیر نہیں گزرا، سوچتا ہوں آپ کو دو قدم دور سے دیکھنے پہ میرا یہ حال ہے تو دو قدم اور قریب سے دیکھنے پہ کیا حال ہو گا؟" جودت نے اپنے خیالات اور جذبات کا کھلے عام اظہار کیا تھا اور مریم کے صبر و

برداشت جواب دے گئے تھے۔

''آپ یہاں سے خود جائیں گے یا مجھے چپڑاسی کو بلانا پڑے گا؟'' وہ زچ ہو چکی تھی۔

''مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے چپڑاسی کو بلانے کی کیا ضرورت ہے بھلا..... آپ خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گیٹ سے نکال دیں، میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔'' جودت نے بڑی معصومیت سے اسے حل بتایا تھا اور مریم مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی تھی۔

''ارے..... جودت تم یہاں؟'' اچانک وزیٹنگ روم کے داخلی دروازے سے مسز رزاق کی آواز ابھری تھی جو اس اکیڈمی کی پرنسپل اور اونر تھیں، مریم ان کی آواز پہ چونک گئی تھی۔

''السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟'' جودت ان کی سمت پلٹتے ہوئے پوری طرح ان کی طرف ہی متوجہ ہو چکا تھا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! تم یہاں کیسے؟ اکیلے ہی آئے ہو؟ سائم کہاں ہے؟'' وہ اپنی سازھی سنبھالتی ہوئی اندر ہی آ گئی تھیں مریم ان کی آمد میں جان پہچان پہ حیران رہ گئی تھی کہ گویا وہ جودت آفندی کو اپنی مرضی سے اس اکیڈمی سے نکال بھی نہیں سکتی تھیں۔

''جی..... وہ دراصل مجھے مس مریم سے کوئی کام تھا اس لیے یہاں آیا ہوں اور سائم تو شاید یونیورسٹی چلا گیا ہے۔'' جودت کافی لاپروائی سے بتایا تھا جبکہ مریم اس کے جواب پہ سلگ اٹھی تھی اس نے جودت آفندی کو خاصی خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

''مریم سے کام تھا؟'' مسز رزاق کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ مریم اس ٹائپ کی نہیں ہے۔

''جی میڈم! وہ دراصل چند روز پہلے میرے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی، ہم انہیں ہسپتال لے گئے تھے، تب یہ سے میڈیسن لیتے ہوئے میں بل کے پیسے اپنے بھائی کے پاس ہی بھول گئی تھی اور اس وقت اتفاق سے جودت صاحب بھی ہو تھے اور میڈیسن کا بل انہوں نے پے کر دیا تھا اس لیے ان کا اُدھار تھا میری طرف، یہ وہی لینے آئے ہیں، پلیز..... جودت صا ٹھہریے آپ، میں ابھی پیسے لے کر آتی ہوں۔''

مریم نے بڑی حاضر دماغی سے بات کا رُخ پلٹ دیا تھا جس پہ مسز رزاق حیران اور جودت ہکا بکا رہ گیا تھا۔

مسز رزاق کو تعجب ہوا تھا کہ جودت محض کچھ پیسوں کے لیے وہاں آیا ہے؟ حالانکہ اتنے پیسے تو یقیناً اس کے لیے کوئی نہیں رکھتے تھے۔ جبکہ دوسری طرف جودت کا بھی بُرا حال تھا، مریم کی بات پہ وہ مسز رزاق کے سامنے شرمندہ ہو کے رہ گیا تھا۔

''لیجیے جودت صاحب! یہ آپ کے پیسے..... پورے دو ہزار روپے ہیں، چیک کر لیں..... اینڈ تھینکس اگین آپ نے وقت میں میری ہیلپ کی، میں آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گی۔'' مریم نے کافی سلیقے اور سمجھداری سے سارا معاملہ کلیئر کر دیا تھا جودت ہاتھ میں پکڑے ہزار ہزار کے دو نوٹ دیکھتا رہ گیا تھا۔

''او کے میڈم! میں چلتا ہوں اب..... اینڈ نس بھی لگوانی ہے، کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اللہ حافظ.....'' مریم انتہائی بد اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی جودت کی سمت دیکھے بغیر وہاں سے چلی گئی تھی اور مسز رزاق کے پاس کھڑا جودت کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔

''ارے بیٹا! تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو نا..... مس رزاق نے سر جھٹکتے ہوئے آداب میزبانی نبھائے تھے۔

''تھینکس آنٹی! میں بھی اب چلتا ہوں، جس کام کے لیے آیا تھا وہ تو ہوا نہیں..... خیر پھر سہی.....'' اس نے کندھے اچکا تھے۔

''کیا مطلب..... کس کام کے لیے آئے تھے؟'' وہ چونکی تھیں۔

''نہیں..... کچھ نہیں..... او کے اللہ حافظ.....'' وہ لگی میں سر ہلاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے باہر نکل آیا تھا لیکن روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا تھا۔

''ادھر آؤ.....'' اس نے سامنے کرسی پہ بیٹھے پیون کو اشارہ کیا تھا۔ ''جی صاحب.....'' وہ فوراً اس کے قریب آیا تھا۔

''یہ لو..... یہ تمہاری ٹپ ہے۔'' جودت نے ہاتھ میں پکڑے دو ہزار روپے اسے تھما دیے اور پیون اس کی اتنی عنایت اور حیران ہوا تھا۔ ''مہربانی صاحب! بہت بہت مہربانی.....'' پیون اس کا بے حد مشکور ہو رہا تھا۔

''مہربانی بعد میں پہلے میرا پیغام پہنچا کے آؤ۔''

''پیغام.....؟''

''ہاں پیغام..... مس مریم کے لیے۔''

"جی صاحب! کہیے ابھی پہنچا دیتا ہوں۔" بیون جی جان سے الرٹ ہوا تھا آخر وہ ہزار کا تازہ تازہ نوٹ کا لگا تھا اسے۔

"وہ کہ..... ان سے کہو آپ سے آج کی ملاقات اچھی رہی، میں آپ سے ملنے پھر آؤں گا۔" جودت نے انتہائی اطمینان سے پیغام دیا تھا اور بیون نے وہی پیغام جوں کا توں مریم تک پہنچا دیا تھا جس پہ مریم ایک بار پھر پریشان ہوا تھی تھی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

♥

آج موسم بے حد سرد اور ابر آلود ہو رہا تھا۔ فضا میں گہری دھند کی ایک دبیز تہہ چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں بادل بھی جھکے آ رہے تھے۔ سیاہ بادلوں نے دن میں بھی رات کا سماں باندھ دیا تھا اور ایسے موسم میں زلفی کا بچکانہ من بچکانہ سی خواہش کرنے لگا تھا۔

"گل باجی..... گل باجی..... کہاں ہیں؟" زلفی گل کو پکارتا ہوا اندر آ گیا تھا کیونکہ گیٹ پہ اس وقت گلاب خان موجود تھا۔

"کہو..... کیا بات ہے؟" گل کچن میں برتن دھو رہی تھی زلفی کی آواز سن کر وہیں سے جواب دیا تھا اور زلفی سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"گل باجی..... وہ..... وہ باہر بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔" زلفی نے جیسے اطلاع دی تھی۔

"ہوں..... وہ تو میں جانتی ہوں..... کوئی نئی بات کرو، کرنی ہے تو.....؟" گل نے برتن دھو کر پانی کا نل بند کر دیا تھا اور برتن خشک کرنے لگی تھی۔

"وہ باجی! وہ بارش بھی ہونے والی ہے۔" زلفی کچھ کہنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا یہ بات گل فوراً ہی بھانپ گئی تھی۔

"ہوں..... میں یہ بھی جانتی ہوں اس کے علاوہ کچھ.....؟" وہ سارے برتن باری باری خشک کر کے ایک سائیڈ پہ رکھتی جا رہی تھی۔

"وہ باجی! باہر ٹھنڈ بھی ہے، بارش بھی بس ہونے ہی والی ہے، تو ایسے موسم میں....." وہ پھر کچھ کہنے سے رُک گیا تھا اور گل اپنے بھولے بھائی کی اس جھجک پہ بے ساختہ نرمی سے مسکرا دی تھی۔

"ہوں..... بولو کیا کھاؤ گے؟ سموسے، پکوڑے یا کچھ اور چیز؟" وہ برتن سمیٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آج باجی تمہیں پتا چل گیا؟" زلفی خوشی سے چہکا تھا۔

"پگلو..... بھائی کا دل کچھ کھانے کو چاہ رہا ہے تو بہن کو پتا نہیں چلے گا تو اور کس کو چلے گا؟" گل نے اس کے کندھے پہ چپت لگائی تھی۔

"اچھا..... تو پھر تم بنا رہی ہو نا باجی؟" زلفی نے یقین کرنا چاہا تھا۔

"ہاں..... ہاں..... بناتی ہوں، لیکن اپنے کچن میں، یہ صاحب کا کچن ہے، وہ آ گئے تو کیا سوچیں گے کہ ہم ان کے جانے کے بعد اس طرح عیاشی کرتے ہیں؟" گل کچن سے نکل آئی تھی۔

"لیکن صاحب ایسے نہیں ہیں گل باجی، وہ تو کھانا کھا رہے ہوں تو گلاب خان کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔" زلفی، گل سے متفق نہیں تھا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور زلفی! لیکن ہم کما اپنا رہے ہیں تو کھانا بھی اپنا ہی چاہیے تاکہ ضمیر زندہ رہے۔" اس نے دلیل دی تھی۔

"ہاں..... تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ ضمیر کو مارو دو، تم اپنے کچن میں ہی بنا لو، لیکن بناؤ تو سہی۔" زلفی کو شاید بھوک لگی ہوئی تھی اسی لیے زیادہ ہی اتاولا ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بناتی ہوں، سب کچھ بناتی ہوں، لیکن پکوڑوں اور چٹنی کے ساتھ نان بازار کے ہونے چاہئیں۔ میرے بنانے تک تم بازار سے جا کر نان لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے وہ تو میں لے آتا ہوں، لیکن کیا وہ پری بھی نان پکوڑے کھائے گی؟" زلفی جاتے جاتے ٹھہر گیا تھا۔

"پگلو! پریاں نان پکوڑے نہیں کھاتیں، بچے۔" گل سمجھ گئی تھی کہ وہ علیزے کی بات کر رہا ہے۔

"لیکن باجی! مجبور اور قید پریاں سب کچھ کھا لیتی ہیں، کوڑے بھی اور پکوڑے بھی....." زلفی کی بات بھی بجا تھی گل کو اتفاق کرنا

پڑا تھا۔

"ہاں..... یہ بھی ٹھیک کہا تم نے..... مجبوری، مفلسی اور قید سب کچھ کروا لیتی ہے، پرستان کی پریاں بھی خاک میں رُل رہی ہیں۔" گل کا لہجہ دُکھی سا ہو گیا تھا۔

"خیر چھوڑو باجی! اب رونے مت بیٹھ جانا، آج موسم اچھا ہے، آج اس پری کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔" زلفی نے کہا تھا۔

"دُکھ دل کو جکڑ کے بیٹھے ہوں تو ہونٹ ہنسنے کا سلیقہ بھول جاتے ہیں میرے بھائی....." گل نے ایک گہری سانس لی، افسردہ اور اُداس سی۔

"گل باجی! رہنے دو، ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔" زلفی بھی دھیما پڑ چکا تھا۔

"ارے نہیں نہیں..... ہم اپنے ساتھ ساتھ تمہیں اُداس نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ گلاب خان سے پیسے لے کر نان لے آؤ۔" گل نے فوراً اُداسی کا حصار جھٹک دیا تھا اور پھر اس کے اصرار پہ زلفی نان لینے چلا گیا تھا اور خود وہ کچن میں آ گئی تھی۔

♥

دل آور شاہ کورٹ سے فارغ ہوتے ہی سیدھا شوروم آیا تھا۔

یہ شوروم دل آور اور نبیل کی پارٹنر شپ پہ چل رہا تھا اس شوروم پہ دونوں نے برابر کے شیئرز انویسٹ کیے تھے، دونوں ہی حقدار تھے، لیکن دل آور کی کورٹ کی مصروفیت کی وجہ سے نبیل ہی شوروم کو زیادہ ٹائم دے رہا تھا اور دل آور کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔ لیکن آج کسی کام کے سلسلے میں نبیل کو اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا اس لیے دل آور کو شوروم آنا پڑا تھا اور وہ شوروم پہنچتے ہی سامنے موجود کسٹمر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور ایسی ہی حیرانی اس کسٹمر کو بھی ہوئی تھی۔

"شاہ جی..... آپ.....؟" انسپکٹر شہباز کو اچنبھا ہوا تھا۔

"ہاں جی..... میں ہی ہوں..... لیکن آپ یہاں کیسے؟ کہیں کوئی چھاپہ وغیرہ تو نہیں مار دیا ہمارے شوروم پہ.....؟" دل آور نے بریف کیس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے حیرت اور پریشانی کا مصنوعی اظہار کیا تھا۔

"یہ آپ کا شوروم ہے؟"

"جی..... یہ چھوٹی سی گاڑیوں کی دکان ہماری ہی ہے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح اتنے بڑے شوروم کو دکان کا نام دیا تھا۔

"لیکن شاہ جی! آپ نے کبھی بتایا تو نہیں؟"

"فرصت ہی کب ملی ہے انسپکٹر صاحب۔"

"ہوں..... اوکے تو پھر میں چلتی ہوں۔" انسپکٹر شہباز نے کرسی پہ رکھا اپنا بیگ اُٹھا لیا تھا۔

"کیوں انسپکٹر صاحب! دکان پسند نہیں آئی؟" دل آور کے ذومعنی لہجے پہ انسپکٹر شہباز کے قدم تھم گئے تھے وہ اس کی بات تھی۔

"ایمان سے شاہ جی! دکان بھی پسند ہے اور "دکاندار" بھی..... لیکن افسوس کہ اس دکاندار کا بھاؤ بہت مہنگا ہوتا ہے، اس دکان سے خریدی ہوئی گاڑی کی قیمت افورڈ نہیں کر پائے گا۔" انسپکٹر شہباز نے مایوسی اور بیچارگی سے سر ہلایا تھا۔

"ہاہاہا..... اگر دکاندار آپ سے یہ کہہ دے کہ پوری دکان ہی آپ کی ہے تو پھر.....؟" دل آور انسپکٹر شہباز کی بات پہ ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"تو پھر یہ دکاندار کی کوئی نئی چال ہوگی، مجھ جیسے سادہ اور کمزور دل کسٹمر کو پھانسنے کے لیے۔" انسپکٹر شہباز نے اپنے شکوک شبہات کا اظہار کیا تھا۔

"چال..... آپ دکاندار کے اتنے خلوص اور اتنی محبت کو بھی چال سمجھ رہی ہیں۔ افسوس کہ آپ کے ذہن سے شک کے وہم نہیں جاتے۔" دل آور نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

"افسوس اور شک بھی تو اسی بات پہ ہے ناں شاہ جی کہ یہ دکاندار خلوص سے پیش آتا ہے، محبت سے نہیں..... محبت سے آئے تو یہ گھوڑی اپنی پوری زندگی کا ہی سودا نہ کر ڈالے؟" انسپکٹر شہباز نے آہ بھری تھی۔

"ارے..... اس دلکا بھاؤ اتنا مہنگا بھی نہیں ہے کہ بدلے میں گاہک کو اپنی پوری زندگی کا ہی سودا کرنا پڑ جائے۔" وہ

مسکرایا تھا۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں نا شاہ جی! کیونکہ آپ میری جگہ پہ نہیں ہیں، میری جگہ سے اپنے آپ کو دیکھیں تو....." انسپکٹر شہباز نے

بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"لگتا ہے موسم کا اثر ہے؟" دل آور نے دلچسپی سے کہا تھا۔

"آپ کسی موسم سے کم تو نہیں ہیں آپ کا ہی اثر ہے اور جس پہ آپ اثر کر جاتے ہیں پھر اس پہ کوئی اور موسم اثر نہیں کرتا۔"

"وردی والوں کے منہ سے شاعرانہ باتیں؟ حیرت ہوتی ہے بھی بھی۔" دل آور نے مذاق کیا تھا وہ جان بوجھ کر انسپکٹر شہباز کو

چھیڑ رہا تھا۔

"وردی والوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے شاہ جی!" انسپکٹر شہباز نے آہستگی سے کہا تھا۔

"کون سا دل..... دل آور شاہ والا دل یا پھر محض سینے میں قید دھڑکنے والا دل.....؟" اس نے پھر دلچسپی سے سوال کیا

تھا۔

"جانے دیجیے شاہ جی! موسم پہلے ہی ابر آلود ہو رہا ہے۔" انسپکٹر شہباز نے سر جھٹکا تھا۔

"جانے دیا انسپکٹر صاحب! اور کوئی حکم۔" اس نے بڑی شرافت اور تابعداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

"بلی جان کے لیے گاڑی پسند کی تھی۔" انسپکٹر شہباز نے شوروم کے چمچماتے فلور پہ کھڑی گاڑیوں کو اک نظر دیکھا تھا۔

"موسٹ ویلکم..... آپ گاڑی پسند کریں، گاڑی آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔" دل آور نے ہاتھ سے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا

تھا۔

"مجھے وہ آف وائٹ گاڑی پسند آئی ہے۔"

"اوکے..... وہی گاڑی آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔" دل آور نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"لیکن اس گاڑی کی قیمت..... اس کی کیا ڈیل ہے آپ کی طرف سے؟" انسپکٹر شہباز نے جاننا چاہا تھا۔

"میں عورتوں کے ساتھ ڈیل نہیں کرتا۔" دل آور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔

"تو پھر....." انسپکٹر شہباز کو حیرانی ہوئی تھی۔

"پھر یہ ڈیل آپ کو اس شوروم کے مینیجنگ اونر نبیل حیات کے ساتھ کرنا پڑے گی، کیونکہ فی الحال ہمارے پاس نیفرز وغیرہ کی

بہت نہیں ہے، اس لیے زیادہ تر ڈسٹنگو ہمیں خود ہی کرنا پڑ رہی ہے لیکن آپ تسلی رکھیں آپ کے بجٹ کا پورا پورا خیال رکھا جائے

گا۔"

آخر میں دل آور نے اسے تسلی دی تھی۔

"یقین تو نہیں آتا کہ آپ میرے بجٹ کا خیال رکھیں گے لیکن خیر مان لیتی ہوں۔" انسپکٹر شہباز نے مایوسی سے کہتے ہوئے

کندھے اچکائے تھے۔

"پھر وہی شک....." دل آور کے شکوے پہ انسپکٹر شہباز بے ساختہ کھلکھلا کے ہنسی تھی۔

"آپ کے کام ہی شک والے ہوتے ہیں شاہ جی! آپ کے کیس کی فیس ہی اتنی بھاری ہوتی ہے کہ لوگوں کو آپ کے پاس

آتے ہوئے سو بار سوچنا پڑتا ہے، پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ آپ میرے بجٹ کا خیال رکھیں گے اور مجھے کچھ ڈسکاؤنٹ دیں گے۔"

انسپکٹر شہباز جانتی تھی کہ دل آور کی فیس کلائنٹ کے کانوں سے دھواں نکال دیتی ہے وہ شہر کا مہنگا ترین وکیل تھا۔

"دیکھیے انسپکٹر صاحبہ! میں اگر لوگوں سے بھاری فیس لیتا ہوں تو ان کو مایوس بھی نہیں کرتا، میرے ہاتھ میں دیے گئے کیس کی

جیت بھی یقینی ہوتی ہے اور شاید آپ مومنہ بی بی کے کیس کو بھول گئی ہیں جس کی میں نے کوئی فیس نہیں لی بلکہ خود اس کیس پہ پیسہ لگا

یا ہوں تا کہ کسی غریب کو انصاف مل سکے اور ایسے انصاف میں کئی غریبوں کو دلا چکا ہوں بس میری فیس ان ہی لوگوں کے لیے بھاری

ہوتی ہے، جن کے والٹ میں روپے کم اور کریڈٹ کارڈز زیادہ ہوتے ہیں۔" دل آور نے انسپکٹر شہباز کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تھی۔

"ارے شاہ جی! میں تو مذاق میں کہہ رہی تھی ورنہ آپ کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے بھلا..... مجھے پتا تھا کہ آپ اوپن ہارٹڈ ہیں

اس لیے تو موصنہ بی بی کو میں نے آپ کے پاس بھیجا تھا، ورنہ کسی اور کا خیال تو نہیں آیا مجھے.....؟" انسپکٹر شہباز نے بھی اپنی وضاحت کی تھی۔

"پھر میری بھاری فیس کی شکایت کیوں کرتی ہیں؟" دل آور نے خفگی سے کہا تھا۔

"میں نہیں کرتی لوگ کرتے ہیں۔" وہ مسکرائی تھی۔

"یعنی..... آپ کے لیے لوگ اہم ہیں۔"

"لوگ جائیں بھاڑ میں شاہ جی! میرے لیے آپ اہم ہیں، میری بلا سے اس سے بھی زیادہ بھاری فیس لیں۔ مجھے ہے بھلا۔" انسپکٹر شہباز خفگی سے جھنجلا کے بولی تھی اور دل آور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں..... ایسی ہی ایک فیلڈ میں آپ خود بھی تو ہیں نا؟ آخر زیرو میٹر گاڑیاں ایسے ہی تو نہیں جاتیں۔" دل آور کا اشارہ رشوت کی طرف تھا جس کو سمجھتے ہی انسپکٹر شہباز نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"توبہ شاہ جی! اب یہ الزام تو نہ دیں، ہماری حق حلال کی کمائی ہے۔"

"ہوں..... ایسے ہوتی ہے تکلیف..... جب کوئی ہماری حق حلال کی کمائی کو کوئی الزام دیا جاتا ہے۔" دل آور نے کہا تھا۔

"او کے ایم سوری....." انسپکٹر شہباز نے معذرت کی تھی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے آپ بیٹھیے میں چائے منگواتا ہوں۔"

"نو تھینکس..... چائے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے فی الحال کسی کام سے جانا ہے اور بارش شارٹ ہونے سے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"او کے..... جیسے آپ کی مرضی..... باقی گاڑیوں کی کاغذی کارروائی اور پیپر ز وغیرہ آپ کل خود آئیں گی تو نہیں البتہ گاڑی پر میں سیل ٹیک لگا دیتا ہوں۔" دل آور نے وہ گاڑی اس کے لیے بک کروا دی تھی لیکن شہباز کی موجودگی میں ہی پیسل کا ٹیک لگا دیا گیا تھا اور پھر وہ وہاں سے نکل آئی تھی اور ابھی وہ انسپکٹر کو رخصت کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیل بج اٹھا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو سکرین پہ عبداللہ کا نمبر نظر آیا تھا جس پہ اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم....." وہی کال ریسیو کرنے کا مخصوص اسٹائل۔

"وعلیکم السلام..... کہاں ہو؟" عبداللہ نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"شوروم میں۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"اور نبیل صاحب! وہ کہاں ملیں گے اس وقت؟" عبداللہ کا لہجہ طنزیہ ہو رہا تھا۔

"اسلام آباد میں۔" اس کا دوسرا جواب بھی مختصر تھا۔

"کیوں..... اسلام آباد میں کیوں؟" عبداللہ کو حیرانی ہوئی تھی۔

"کام کے سلسلے میں۔" اس کا تیسرا جواب بھی مختصر ہی موصول ہوا تھا۔

"اُف یار! ایک تو میں تم لوگوں کے کام سے تنگ آ گیا ہوں کام کام ہر وقت کام یار کبھی کام کے علاوہ بھی کچھ کیا کرو۔"

"مثلاً..... کیا کریں۔" دل آور نے الٹا اس سے پوچھا تھا۔

"محبت کرو یار محبت! قسم سے یار مزا آ جاتا ہے محبت کر کے..... محبت کرنے والے کام کرنا بھول جاتے ہیں۔ محبت ہی کام ہے۔" عبداللہ نے جھٹ سے مشورہ دیا تھا مفت اور مفید۔

"ہونہہ ملک صاحب! آپ ٹھہرے جدی پشتی رئیس اور جاگیردار آپ کا گزارہ صرف محبت کر کے بھی ہو جاتا ہے گزارا، صرف محبت سے نہیں ہو سکتا ہمیں کام کرنا پڑتا ہے۔ آپ اب یہی فرق دیکھ لیں آپ محبت کر کے شادی رچا کر بیوی بڑے سکون سے گھر پہ آرام فرما رہے ہیں اور انتہائی اطمینان اور تسلی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے یہ ابر آلود موسم، یہ دن اور یہ بھیگا دوپہر انجوائے کر رہے ہیں جبکہ ہم دونوں چھڑے چھانٹ بیچارے صبح صبح گھروں سے نکل کر کام کے لیے

ہیں۔ کورٹ کچہری اور آفسز کے دھکے کھاتے پھر رہے ہیں، وہ اسلام آباد میں ٹھہر رہا ہے اور میں لاہور میں..... کیونکہ آپ نہ بھی کام کریں گے تو گزارا ہو جائے گا، لیکن کام کیے بغیر ہمارا گزارا نہیں ہوگا۔"

دل آور کی بات پہ عبداللہ اپنا بے ساختہ اُمڈنے والا قہقہہ نہیں روک پایا تھا۔

"بابا..... اسی لیے تو کہا ہے کہ تم لوگ بھی ایسا موسم گھر بیٹھے انجوائے کرنے کا سامان کر لو یعنی محبت کر لو۔"

"بس بس..... رہنے دو..... جب ہمارا دل چاہے گا ہم کر لیں گے تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔" دل آور نے مصنوعی غصے سے کہا تھا۔

"اوکے..... نہ کرو محبت لیکن انجوائے تو کر لو۔" عبداللہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

"وہ کیسے.....؟"

"وہ ایسے کہ نگارش آج کچن میں ہے اور وہاں سے طرح طرح کی خوشبوئیں آ رہی ہیں، میں نے سوچا اکیلے حلق سے نہیں اترے گا۔ اس لیے تم لوگوں کو بھی بلا لیتا ہوں....." عبداللہ نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی تھی۔

"تو تھینکس یار! تم اکیلے ہی انجوائے کرو، مجھے یہاں کام ہے۔" دل آور نے بڑی سہولت سے انکار کر دیا تھا۔

"ایسی کیسی تمہارے کام کی اس نے تناسب کچھ آکوشی تم دونوں کے لیے بنوایا ہے سب ضائع چلا جائے گا۔ کم از کم تم تو آ سکتے ہو نا؟" عبداللہ غصے سے بھنا گیا تھا۔

"دل آور بھائی! میں نے یہ سب کچھ اس لیے بنایا ہے تاکہ آپ لوگ ہمارے گھر آ سکیں ورنہ گھر میں یہ سب کچھ تو ہم روز ہی بناتے رہتے ہیں۔"

عبداللہ کے قریب سے نگارش بھابی کی آواز اُبھری تھی جو دل آور کو سیل فون کے اسپیکر میں سے صاف سنائی دی تھی اور دل آور کے پاس مزید انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"اوکے..... میں آ رہا ہوں۔" اس نے ہامی بھری تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ مت آؤ تم میرے بلانے پہ نہیں اپنی بھابی کے بلانے پہ آ رہے ہو۔" عبداللہ کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

"ظاہر ہے بھابی نے ہمارے لیے اتنی محنت کی ہے، اتنا کچھ بنایا ہے تو انہی کے لیے آئیں گے نا؟" دل آور نے جواباً اسے اور چڑایا تھا اور عبداللہ نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا جس پہ دل آور بے ساختہ ہنسا تھا۔

♥

"علیزے بی بی..... علیزے بی بی....."

وہ فرش پہ بچھے میٹرس پہ بیٹھی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی اور اپنے ہاتھ پاؤں کمبل میں چھپانے اور گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب زلفی کی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا تھا۔

"جی..... تم کون۔" اس کی آواز بھی ٹھٹھری ہوئی تھی۔

"میں..... میں گل باجی کا بھائی ہوں بی بی جی! زلف خان نام ہے میرا مگر سب زلفی کہتے ہیں۔" وہ پری اس سے مخاطب تھی زلفی خود کو بڑا گیا تھا۔

"گل کہاں ہے؟" علیزے اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ جی..... وہ کچن میں ہے۔ باہر بارش ہو رہی ہے اور بہت ٹھنڈ بھی ہے اس لیے ہم لوگوں نے گھر پہ سموسے اور پکوڑے بنائے تھے، باجی نے کہا کہ آپ کو بھی دے آؤں یہ آپ کے لیے ہیں۔" زلفی نے چھوٹی سی ٹرے نیچے فرش پہ علیزے کے قریب ہی رکھی تھی حالانکہ وہ یہ بات گول کر گیا تھا کہ یہ سموسے اور پکوڑے دینے کے بہانے اسے دیکھنے کے لیے آیا ہے، کیونکہ وہ جب سے آئی تھی زلفی نے اسے دوبارہ دیکھا جو نہیں تھا اور اب اسے دیکھ کر وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے اپنے صاحب پہ حیرت ہوئی تھی، پھر سے کوفی میں رول رہا تھا۔

"گل سے کہنا میرے پاس آئے۔" اس نے زلفی کو پیغام دیا تھا۔

"جی..... ابھی بھیجتا ہوں۔" زلفی فوراً سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔

اور علیزے کی نظریں اس ٹرے پہ ٹھہر گئی تھیں ایک پلیٹ میں سموسے تھے ایک پلیٹ میں پکوڑے تھے، ساتھ ہی چھوٹے باؤل میں چٹنی اور کیچپ تھا اور ایک پلیٹ میں اخبار میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی وہ چیز کیا تھی یہ تو علیزے کو نہیں پتا تھا البتہ اس اخبار کے ٹکڑے پہ علیزے کی نظریں جمی گئی تھیں۔

"وقار آفندی....." اس نے اخبار کی سرخی میں نظر آتے نام کو زیر لب دہرایا تھا اور جب یقین ہو گیا کہ یہی نام لکھا ہوا ہے اس نے پلیٹ میں سے وہ اخبار کا ٹکڑا جھپٹ کر اٹھایا تھا جس میں سے دو تین نان پلیٹ میں گرے تھے اس اخبار میں نان لپیٹے تھے جو زلفی جلدی میں یونہی اٹھا لایا تھا۔

"شدید ترین فالج کے شکار وقار آفندی کو کل صبح ہاسپٹل سے ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا جائے گا۔" علیزے کی آنکھیں پھیلی رہ گئی تھیں۔ وہ بار بار اس سرخی کو پڑھ رہی تھی اور پھر پتھرا رہی تھی۔

"جی بی بی جی..... آپ نے بلایا تھا مجھے؟" گل کی آواز پہ علیزے نے یکدم چونک کر دیکھا تھا۔

"گل! یہ اخبار..... یہ اخبار کہاں سے آیا ہے کس ڈیٹ کا ہے یہ....." علیزے تڑپ کے کھڑی ہو گئی تھی اس نے اخبار کا چھوٹا سا ٹکڑا گل کے سامنے لہرایا تھا۔

"مجھے کیا پتا یہ اخبار کس ڈیٹ کا ہے بی بی جی! اس میں تو زلفی نان لپیٹ کر لایا تھا بازار سے....." گل نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"مجھے..... مجھے یہ پورا اخبار لا دو کہیں سے پلیز گل مجھے یہ پورا اخبار لا دو۔" علیزے اس اخبار کے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے رو پڑی تھی۔

"ارے بی بی جی! کیا ہو گیا ہے؟ ایسا کیا ہے اس اخبار میں؟" گل اس کو یوں تڑپ تڑپ کے روتے دیکھ کر پریشان ہوئی تھی۔

"میرے پاپا پہ فالج کا اٹیک ہوا ہے اور..... اور مجھے پتا ہی نہیں۔" علیزے روتی ہوئی فرش پہ دوزانو ہو گئی تھی اور وہ اخبار کا ٹکڑا مٹھیوں میں دبوچ رکھا تھا جس پہ نہ ڈیٹ تھی اور نہ ہی اس سرخی کے نیچے دیا گیا حوالہ یا تفصیل تھی..... کیونکہ نیچے اخبار سے پھٹا ہوا تھا بلکہ چاروں اطراف سے پھٹا ہوا تھا اور علیزے اس ٹکڑے کو دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی وہ بھی بے بس تھی اخبار کا وہ پھٹا ہوا ٹکڑا بھی بے بس تھا۔

"فالج کا اٹیک....." گل بھی سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

"گل! مجھے یہ اخبار لا دو..... پلیز گل..... یہ اخبار لا دو....." علیزے بلک رہی تھی۔

"بی بی جی! مجھے پتا تو نہیں کہ یہ اخبار کون سا ہے؟ لیکن ایک خبر مجھے پتا ہے تقریباً سارے ہی اخباروں میں آئی ہے صاحب کے پرانے اخباروں میں سے دیکھ لیں..... شاید مل ہی جائے؟" گل کا آئیڈیا برا نہیں تھا علیزے نے تڑپ کے دیکھا تھا۔

"پرانے اخبار؟ گل..... کہاں ہیں؟" وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔

"وہ کونے میں رکھی الماری میں پڑے ہیں اس سال کے سارے اخبار مل جائیں گے آپ کو۔" گل نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور علیزے لپک کے اس الماری کی طرف بھاگی تھی اور پھر اگلے چند سیکنڈز میں وہ اخبارات سے بھری الماری فرش پہ انڈیل چکی تھی، اسے پندرہ اور سولہ نومبر کے اخبار کی تلاش تھی اور اس تلاش میں اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا چودہ نومبر سے چودہ دسمبر تک کے سارے اخبار اس کے سامنے تھے۔ اس کے برتھ ڈے سے لے کر وقار آفندی کے پیرالائز ہونے تک کی تمام خبریں اخبار کی سرخی کی زینت بنی ہوئی تھیں اور علیزے سولہ نومبر کا اخبار ہاتھ میں آتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع ہو گئی تھی۔

"پاپا..... یہ..... یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" علیزے روتے روتے فرش پہ ہی دوہری ہو گئی تھی اس کے آنسو اخبار کے ڈھیر پہ رہے تھے اور اخبارات کے کاغذ گیلے ہوتے جا رہے تھے۔

"بی بی جی! سنبھالیے اپنے آپ کو..... اس طرح رونے سے تو کچھ نہیں ہو گا نا؟" گل نے فرش پہ جھکی تڑپ تڑپ کے روتی علیزے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن علیزے کا دل غم سے چور تھا..... اتنی جلدی کیسے سنبھل جاتی۔

ملیں ہم کبھی تو ایسے کہ حجاب بھول جائے
میں سوال بھول جاؤں ، وہ جواب بھول جائے
وہ کسی خیال میں ہو اور اسی خیال میں ہی
کبھی میرے رستے میں وہ گلاب بھول جائے
تیری سوچ پر ہو حاوی میری یاد اس طرح سے
کہ تُو اپنی زندگی کا یہ نصاب بھول جائے

بارش دیوانہ وار برس رہی تھی۔ اور زری اندرونی مین ڈور کے سامنے والے حصے میں بڑے سے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی بارش کی یہ دیوانگی بڑے دل سے، بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھی اور اس دیوانی بارش میں بھیگتے سبز لان، سبز پودے اور رنگین پھول بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر پا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی وجد میں کھڑی ہو وہاں ہو کر بھی وہاں نہیں لگ رہی تھی۔

اس کے دھیان، اس کے گیان اس کی روح پہ دل آور شاہ کی حکمرانی تھی اور وہ اسی حکمران کے تابع کھڑی تھی۔ اسے بس اتنی خبر تھی کہ بارش ہو رہی ہے، اب اس بارش میں کیا کیا ہو رہا ہے؟ اسے ذرا بھی خبر نہیں تھی لیکن جیسے ہی اس دھواں دھار برستی بارش میں ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا اس کا عشق جی اٹھا تھا۔

کیونکہ آنے والا دل آور شاہ تھا اور زری کو لگا یہ دیوانی بارش اس پہ برس گئی ہو، اس کا من بھیگ بھیگ گیا تھا۔

گاڑی پورٹیکو میں پارک کر کے وہ گاڑی سے اتر آیا تھا اور پورٹیکو سے مین ڈور تک آتے آتے وہ دھواں دھار بارش کی تیز بوچھاڑ سے اچھا خاصا بھیگ گیا تھا اور مین ڈور کے سامنے والے حصے کی چھت کے نیچے آتے ہی اس نے اپنی شرٹ اور اپنے بالوں پہ پڑنے والی بارش کی بوندوں کا پانی جھاڑنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اس دھیان اور گیان میں وہ ستون کے قریب کھڑی زری کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ اور وہ تھی کہ اس کی اک اک حرکت اک اک جنبش پہ واری جا رہی تھی۔

دل چاہا اس کے چہرے، اس کے بال، اس کی شرٹ پہ گرنے والے بارش کے قطروں کو اپنے دوپٹے میں جذب کر لے اور دوپٹے کو مقدور کر ڈالے اپنی قسمت پہ اور اپنی اوقات پہ..... لیکن دل نے تو بس چاہا تھا..... اور چاہت کس کی پوری ہوتی ہے بھلا.....

اندر کی طرف بڑھتے دل آور شاہ کے قدم اپنے پیچھے اُبھرنے والی آواز پہ ٹھٹک کر رُک گئے تھے اس نے چونک کر اس آواز کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر وہ تھم سا گیا تھا۔

آج وہ بھی کچھ اور سے کچھ اور لگ رہی تھی دل آور شاہ کی نظریں حیران رہ گئی تھیں، وہ ریڈ کلر کے خوبصورت، دیدہ زیب اور جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس بلیک کلر کی لانگ جرسی پہنے، خوبصورتی اور نفاست سے دوپٹہ اوڑھے سرخ گلاب کے پھولوں سی زری اس کے بالکل سامنے ہی تو کھڑی تھی اور دل آور شاہ اسے دیکھنے کی تاب نہیں لا پایا تھا اور بے ساختہ نظریں جھکائی تھیں، دل آور شاہ کی تیس سالہ زندگی میں ایسی کوئی عورت اور ایسا کوئی مرد نہیں تھا کہ جس کے سامنے اس کی نظریں جھکی ہوں، سوائے ایک زرین فلک کے.....

اس کی زندگی میں زری وہ واحد ہستی تھی جس کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ ہی اس کی نظریں جھک جاتی تھیں جس طرح وہ اپنی کاٹ دار آنکھوں سے باقی سب کو دیکھتا اور گڑبڑا کے رکھ دیتا تھا اس طرح وہ اسے نہیں دیکھ پاتا تھا اس کے سامنے تو وہ ہمیشہ نظریں چرا کے اور کترا کے بات کرتا تھا، بلکہ زری کے سامنے تو اس کا سر بھی جھک جاتا تھا اور گردن بھی.....

بالکل ایسے جیسے اس وقت ہوا تھا دل آور نے سر بھی جھکا لیا تھا اور نظریں بھی، کیونکہ اگر اس لمحے وہ نظریں اُٹھا کر اسے دیکھ لیتا تو یقین کامل تھا کہ یا تو دل آور شاہ..... دل آور شاہ نہ رہتا..... یا زری..... زری نہ رہتی..... اس مختصر سے لمحے میں سب کچھ بدل سکتا تھا۔ دل بھی اور دنیا بھی..... بس اک ذرا دیکھنے کی دیر تھی..... اور وہ اس دیکھنے سے کترا گیا تھا..... دامن بچا گیا تھا۔

"السلام علیکم..... کیسی ہیں آپ؟" دل آور کو نظریں جھکانے کے باوجود ملاقات کے آداب نبھانے پڑے تھے۔

"اگر آپ دل کے طریقے سے پوچھتے تو میں آپ کو بتاتی کہ میں کیسی ہوں؟ لیکن آپ دنیا داری کے طریقے سے پوچھ رہے ہیں تو بتانا پڑے گا کہ اچھی ہوں، ٹھیک ہوں، خوش ہوں....." زری کے لہجے اور الفاظ میں شکوے تھے، شکایتیں تھیں، گلے تھے، لیکن

اس نے تو جیسے سنے ہی نہ تھے۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ اچھی ہیں، ٹھیک ہیں، خوش ہیں، انسان کو اور کیا چاہیے بھلا....." دل آور نے کسی لہجے میں کہا تھا۔

"ہونہہ..... انسان کو اور کیا چاہیے بھلا..... یہ بھی بتا دوں یا سمجھ جائیں گے؟" زری ہنوز ستون کے ساتھ پشت لگائے ہاتھ اپنی جری کی جیبوں میں پھنسائے انتہائی سکون سے کھڑی اپنے سامنے کھڑے دل آور شاہ جیسے مجرم کو دیکھ رہی تھی جو اس کی عدالت میں کھڑا تھا اور اقبال جرم پہ تیار نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ بہت ٹھنڈ ہے یہاں، ہمیں اندر چلنا چاہیے؟" دل آور اس کا سوال نظر انداز کر گیا تھا کیونکہ وہ جواب دینا چاہتا تھا۔

"وکیل صاحب! ٹھنڈ لگ رہی ہے؟ یا ڈر لگ رہا ہے؟" زری تو آج اس کے لیے دل آور شاہ ثابت ہو رہی تھی۔

اہل۔

"ڈرا اچھا ہوتا ہے۔" شعلے اگلنے والے دل آور کا لہجہ اس سے بہت دھیر تھا۔

"بے وقت لگے تو ڈر بھی ہوتا ہے۔" زری اپنے انداز و بیان پہ قائم تھی۔

"ڈر کا دوسرا نام عزت ہے..... اس لیے آپ کے دل میں اور نظر میں یہ ڈر ہونا ہی چاہیے، دوسرے لفظوں میں میرا ہے کہ عزت ہونی چاہیے، جب ہم اپنے دل و نظر کا یہ ڈر اتارتے ہیں تو سمجھیں کہ عزت اتارتے ہیں..... اور عزت اتارنا نہیں..... اس نے دلیل دی تھی۔

"ہونہہ..... صفائی دینا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" زری کے انداز میں خفگی تھی۔

"کیا کروں؟ میرا تو کام ہی یہی ہے؟" دل آور کے لہجے میں تھکن کا رس تھا۔

"جانتی ہوں آپ کا تو کام ہی یہی ہے، پھر بھی الجھ رہی ہوں۔" زری نے سر جھٹکا تھا۔

"الجھنے سے بہتر ہے کہ کوئی کام کر لیں۔" اس نے مشورہ دیا تھا۔

"میں کام نہیں کرتی۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں آپ کام نہیں کرتیں، آپ محبت کرتی ہیں۔" وہ سوچ کے رہ گیا تھا۔

"یہ بھی (چھا کرتی ہیں۔" اس نے لاپروائی کا جواب لاپروائی سے ہی دیا تھا۔ "گویا جانا چاہ رہے ہیں؟" وہ اسے نظر انداز جانچ رہی تھی۔

"ہوں..... عبداللہ انتظار کر رہا ہوگا۔" دل آور نے وہاں سے جانے کا جواز ڈھونڈا۔

"جائیے..... ضرور جائیے..... وکیل صاحب ویسے بھی یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔ آپ کو لگ جائے گی۔" زری نے اسے تھا۔

"تھینک یو۔" دل آور نے مزید کچھ بھی کہے بغیر اور بات کو طول دیئے بغیر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قدم دوبارہ سمت موڑ لیے تھے یوں جیسے اسے کٹہرے سے رہائی ملی ہو۔

"سنیے وکیل صاحب۔" اس نے پھر پیچھے سے آواز دی تھی اور اس کے قدم دوبارہ رک گئے تھے۔

"اگر کوئی آپ کو اپنے دل کا وکیل کر لے تو کیا خیال ہے۔ کیس جیت جائیں گے یا ہار جائیں گے؟" اس پگلی کے پگلے تھے لیکن دل آور اس کے اس پگلے سوال پہ اس کی سمت پلٹا نہیں تھا بلکہ اس کی سمت پشت تھی۔

"ہار جاؤں گا۔" اس کا جواب دو ٹوک تھا۔

"کیوں..... وکیل صاحب کیوں؟ میں نے تو سنا ہے آپ کوئی کیس نہیں ہارتے۔" زری تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"وہ دنیاوی کیس ہوتے ہیں۔ میں کسی دل کا کیس نہیں لڑ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہار جاؤں گا اس لیے کوئی بھی پگلے دل کا وکیل نہ کرے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے حقیقت سے آگاہ کیا تھا اور زری چپ کی چپ رہ گئی تھی اور دل آور نے قدم بڑھا دیے تھے۔

"وکیل صاحب! آپ ایک بار کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟" اس کی کانپتی ہوئی آواز پھر اس کے قدموں کی زنجیر بنی تھی۔

"میں کوشش نہیں کرتا عمل کرتا ہوں۔"

"میں کوشش نہیں کرتا عمل کرتا ہوں۔"

"میں عمل کریں اور ہار جائیں۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا نا؟"

"آپ عمل کریں اور ہار جائیں۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا نا؟"

"ہماری زندگی میں کچھ کیس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہم ہر صورت میں ہار جاتے ہیں، کوشش کر کے بھی اور عمل کر کے بھی..... کیونکہ یہ ہار مقدر میں لکھی ہوتی ہے جو ہمیں مل کر ہی رہتی ہے، چاہے جتنی بھی تیاری کرو، چاہے جتنی بھی تدبیر کرو....." دل آور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اس کی سمت پلٹ کر دیکھے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

زری کے قدم بے ساختہ پیچھے ہٹے تھے اور وہ ستون سے لگ گئی تھی وہ بے یقین سی ہوئی تھی تو بے چین وہ بھی ہو چکا تھا۔

نگارش بھابی اور عبداللہ کے پاس ہو کر بھی وہ ان کے پاس نہیں تھا وہ تو باہر ہی ستون کے پاس کھڑا رہ گیا تھا۔ دل و جان سمیت۔

♥

مغرب کا وقت تھا جب باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

مریم اور عابدہ خاتون تو صبح سے ہی اس دستک کے انتظار میں تھیں، لیکن جیسے ہی یہ دستک ہوئی تھی ان دونوں ماں بیٹی کے دل دھڑکنا بھول گئے تھے، کسی انہونی کے خیال سے ہی جسم کانپ گیا تھا، کیونکہ وہ دونوں ہی پہچان چکی تھیں کہ یہ دستک عدیل کی نہیں ہے۔

"آپ ٹھہریے..... میں دیکھتی ہوں۔" مریم نے عابدہ خاتون کو چارپائی سے اُٹھتے دیکھ کر روک دیا تھا اور عابدہ خاتون تو پہلے ہی اندر سے نڈھال تھیں مریم کے روکنے پہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھیں۔

"کون ہے؟" اس نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا تھا۔

"میں ہوں شہریار! عدیل صاحب نے بھیجا ہے۔" باہر سے شہریار کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی تھی۔

"شہریار....." مریم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

"السلام علیکم!" شہریار نے احتراماً نظریں جھکاتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! عدیل بھائی کہاں ہیں؟" مریم کے انداز میں بے چینی تھی۔

"وہ..... وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہیں، باؤ امتیاز نے انہیں جیل بھجوا دیا ہے، ہم صبح سے انہی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے لیکن مارشل کی وجہ سے کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہو سکا اور کل پھر سنڈے ہے، کل بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔" شہریار اسے سمجھانے اور تسلی دینے کے لیے تفصیل سے بتا رہا تھا اور مریم بمشکل اپنے قدموں پہ کھڑی رہ سکی تھی۔

"اب..... اب کیا ہوگا؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں، بس دُعا کریں، اللہ سب بہتر کرے گا، ہم سب باؤ امتیاز کو منانے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر وہ مان گئے تو عدیل صاحب فوراً باہر آ جائیں گے، ان شاء اللہ! مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ بہتر سبب نکالے گا۔" شہریار اسے تسلی دے رہا تھا لیکن مریم کا دل اتنی آسانی سے کیسے بہل سکتا تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے چند منٹس چند سیکنڈز، چند گھنٹوں کی ضرورت تھی کچھ وقت درکار تھا، یونہی قدموں پہ کھڑے کھڑے کیسے سنبھل جاتی؟

"مریم..... مریم کیوں کھڑی ہو؟ کون ہے؟" وہ عابدہ خاتون کی آواز پہ چونک کے متوجہ ہوئی تھی۔

"جی امی! آ رہی ہوں۔" اس نے اپنے اعصاب تھکانے پہ لاتے ہوئے پلٹ کر انہیں جواب دیا تھا۔

"اچھا..... میں اب چلتا ہوں دوبارہ کوئی خبر ہوئی تو دوبارہ آؤں گا، بلکہ جب تک عدیل صاحب گھر نہیں آتے میں آپ کی خیر خبر لینے کے لیے آتا ہی رہوں گا، آپ کو باہر کا کوئی بھی کام ہو مجھ سے کہیے گا، میں کر دوں گا، آپ عدیل صاحب کی بہن ہیں تو میری بھی بہن ہیں۔ آپ کی عزت آپ کا احترام سر آنکھوں پہ۔" شہریار نے اپنی خدمات پیش کی تھیں اور مریم اس کی مشکور ہو کر رہ گئی تھی۔

"تھینک یو..... تھینک یو سو مچ! ایم سوری امی اور باقی گھر والوں کو ابھی اس مسئلے کا علم نہیں ہے اس لیے فی الحال آپ کو اندر نہیں بلا رہی، جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔" مریم نے شہریار کے باہر کھڑے ہونے پہ معذرت چاہی تھی۔

"نہیں..... نہیں..... میں اندر نہیں آ سکتا یہ مناسب نہیں ہے عدیل صاحب گھر پہ ہوتے تو اور بات تھی، لیکن ان کی غیر

موجودگی میں کہیں۔ "شہریار نے مجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی انکار کر دیا تھا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے
اور مریم دروازہ بند کر کے اندر آ گئی تھی، عابدہ خاتون اسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں، اسے واپس آتے دیکھ کر ان کی نگاہ
سوال اُمڈ آئے تھے اور مریم کو اب ان سوالوں کے بہت محتاط اور مناسب طریقے سے جواب دینے تھے، ان کو سنبھالنا بھی تھا
بھی تھا جو کہ بہت مشکل کام تھا۔

♥

صبح گھر سے نکلتے ہوئے وہ بہت فریش تھا۔ لیکن اس وقت واپسی پہ وہ بہت ڈسٹرب اور بوجھل لگ رہا تھا، اس کے
تھکے تھکے سے لگ رہے تھے، یوں جیسے کوئی طویل مسافت طے کر کے آیا ہو اور اس کی یہ تھکاوٹ گلاب خان اور گل نے بھی
تھی۔

"سلام صاحب!" گل نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" وہ بریف کیس اور موبائل ٹیبل پہ ڈالتے ہوئے خود صوفے پہ ڈھیر ہو گیا تھا۔

"صاحب جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" گل اسے دیکھ کر متفکر ہی ہوئی تھی اسی لیے بے ساختگی سے پوچھ لیا تھا

"ہوں ٹھیک ہوں بس ایک کپ چائے لا دو۔" اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ کھولتے ہوئے شرٹ کا سب سے اوپر
کھول دیا تھا۔

"جی..... ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ فوراً پلٹ کر چلی گئی تھی اور دل آور نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے
سلگا لیا تھا۔

"وکیل صاحب! آپ ایک بار کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟" زری کی لرزتی کانپتی سی آواز اس کی سماعتوں پہ نقش ہی ہو
اس کے سامنے تو اس سے دامن چھڑا لیتا تھا لیکن اس کے بعد اس سے دامن چھڑانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

اس نے اپنے ذہن کو مصروف کرنے کے لیے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا تھا اور ٹی وی کا والیوم اتنا ہی کھل چھوڑ دیا تھا
"چائے صاحب جی!" گل ایک کپ چائے منٹوں میں بنا کر لے آئی تھی لیکن ٹی وی کے کھل والیوم میں اس کی آواز
دی تھی۔

"صاحب جی! یہ چائے لے لیں۔" گل صوفے کے قریب آ گئی تھی اور اس پہ نظر پڑتے ہی دل آور نے ٹی وی بند کر
"صاحب جی!" گل اس کے موڈ کے پیش نظر کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"کہو..... کیا کہنا ہے؟" وہ سمجھ چکا تھا کہ گل کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن اس کی وجہ سے چپ ہو گئی ہے۔

"صاحب جی! وہ..... وہ ملیز بے بی بی بلا رہی تھیں آپ کو..... انہوں نے کہا تھا آپ گھر آ جائیں تو آپ کو پیغام
کہ آپ ایک بار ان سے مل لیں۔" گل نے اس کا پیغام پہنچایا تھا۔

"ہونہہ..... اس سے کہو..... آج تو اپنے آپ سے بھی ملنے کو دل نہیں چاہ رہا..... تم سے کل ملوں گا۔" دل آور نے
تھا۔ اور گل اس کا انکار لے کر چلی گئی تھی لیکن ملیز سے آج پھر پہلے کی طرح بچھری ہوئی تھی اس نے دل آور شاہ کے انکار
کانوں پہ نہیں دھرا تھا۔

بیسمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ میں تھا دل غم سے بوجھل اور دماغ سے مشتعل ہو رہا تھا اور وہ
سے پاگل ہوتی یونہی اخبار ہاتھ میں لیے بیسمنٹ کے کھلے دروازے سے دندناتی ہوئی باہر نکل آئی تھی اس وقت اس کا سارا ڈر
نجانے کہاں جا سویا تھا۔

وہ اس لمحے بہت نڈر اور بے خوف لگ رہی تھی وہ دل آور شاہ کے ہاتھوں مر جانے یا مار دینے کے درپے ہو رہی تھی
تیور بہت جارحانہ تھے اور قدموں کا رُخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

"ڈرائیور....." وہ اسی طرح دندناتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اور اپنی ذات کے بھنور میں ڈوبتے اُبھرتے
شاہ نے یکدم چونک کر دیکھا تھا وہ اس وقت صوفے پہ براجمان اپنی ہی سوچوں میں غلطاں سگریٹ پینے میں مصروف تھا جب
اس کی سوچوں میں خلل ڈالتی ہوئی شیشے کی ٹیبل کے اس پار عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی دل آور بیٹھا ہوا تھا لیکن

اپنے سامنے کھڑی علیزے آفندی کو سرسری نظر سے مگر سرتاپا دیکھا تھا، اس کے سفید کوتر سے پاؤں ننگے تھے وہ بغیر جوتوں کے بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اس کا سر بھی ننگا تھا تیز رفتاری اور بے دھیانی میں دوپٹہ سر سے ڈھلکا ہوا تھا، دل آور نے ایسی لاپروائی اس کے سراپے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، وہ بڑا خیال رکھتی تھی اپنے دوپٹے وغیرہ کا۔ لیکن آج سارے خیال اور سارے خوف نجانے کہاں دبک کر آئی تھی۔

"کیوں آئی ہو؟" دل آور کی آواز گمبھیر اور لہجہ بوجھل ہو رہا تھا لیکن لہجے اور آواز میں ٹھہراؤ حد سے زیادہ تھا۔

"تم نہیں آئے اس لیے آئی ہوں۔" اس نے کافی چبا کر کہا تھا۔

"میں نے کہا تھا تم سے کل ملوں گا؟" اس نے اپنی بات دہرائی تھی۔

"کل تک اگر تم مر گئے تو؟" وہ غم و غصے سے یکدم چیخ اٹھی تھی۔

"تو کل تمہارے لیے جشن آزادی کا دن ہوگا۔" دل آور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن مجھے پتا ہے تم کل تک مرنے والے نہیں ہو۔" علیزے کبھی بھی اتنی سفاک نہیں تھی لیکن اس وقت حد درجہ سفاک ہو رہی تھی جی چاہ رہا تھا اسے ابھی کے ابھی موت کے گھاٹ اتار دے۔

"تم دعا کرو، شاید مر ہی جاؤں، تمہاری ہی دعا قبول ہو جائے۔" جس طرح علیزے حد درجہ سفاک ہو رہی تھی اسی طرح وہ حد درجہ عجیب ہو رہا تھا۔

"میری دعا میں اثر ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔" وہ غصے سے پھٹ رہی تھی۔

"اوہ یعنی یہ بھی آزما چکی ہو۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

"ہاں سب آزما چکی ہوں لیکن اللہ تم جیسے انسان کو موت بھی نہیں دیتا۔"

"ہمم..... سچ کہہ رہی ہو۔" دل آور نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"تم اپنی بکواس بند رکھو..... میں تمہاری بکواس سننے نہیں آئی۔ میں صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ میرے پاپا اتنے شدید بیمار ہیں؟ ان پہ فالج کا اٹیک ہوا ہے؟ وہ پیرالائز ہو گئے ہیں؟ بتاؤ مجھے آخر کیوں نہیں بتایا مجھے؟" وہ اس پہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اور وہ ہنوز ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا بغیر کچھ کہے، کسی ریسپانس کے اسے دیکھ دیکھ بھی رہا تھا اور اسے سن بھی رہا تھا۔

حالانکہ اس کا صرف ایک تھپڑ یا صرف ایک بات ہی اس کا سارا غصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر کے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دیتے تھے۔ مگر نہیں اس نے ایسا نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ اس وقت واقعی ڈسٹرب تھا اور اس موڈ میں نہیں تھا کہ اس کے غصے کے جواب میں غصہ ہوتا..... یا پھر اس کی اتنی بدتمیزی اور زبان درازی پہ اس کی زبان کھینچ لیتا یا اسے مارتا پیٹتا اور سزا دیتا۔

بلکہ وہ تو الٹا ڈسٹرب اور بوجھل تھا کہ آج علیزے آفندی کی ساری بدتمیزیاں اور ساری باتیں سنی ان سنی کر گیا تھا جیسے سر کے اوپر سے گزر گئی ہوں اور یہ علیزے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت ڈسٹربنس اور بوجھل پن کا شکار تھا۔ ورنہ روجل میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا یہ بتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

"بیٹھو..... بیٹھ جاؤ..... آرام سے بیٹھ کے بات کرو۔" اس نے سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کافی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا کہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ یہ سب پڑھنے کے بعد بھی میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر آرام سے بات کر سکتی ہوں؟" علیزے نے ہاتھ میں پکڑا اخبار شدت غضب سے دل آور کے چہرے پہ دے مارا تھا، جو سیدھا اس کے چہرے پہ ہی لگا تھا اور یہ دل آور شاہ کی ڈسٹربنس، بوجھل پن اور شکستگی کی انتہا تھی کہ وہ اس کی اس حرکت پہ مشتعل نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ بھی سہہ گیا تھا۔

"دیکھو..... ایک کام کرو۔ یا بیٹھ جاؤ یا چلی جاؤ۔ لیکن مجھے تنگ مت کرو۔" دل آور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اتنے ظلم کیوں کیے ہیں؟ کیوں ہمارے گھر کو برباد کر دیا ہے؟ میرے پاپا کو پیرالائز کر دیا ہے تم نے..... مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے میں کسی اور کو تو کیا اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ صرف تمہاری وجہ سے تمہارے کیے کی وجہ سے، آخر کیوں؟ کیوں بلیک میل کیا مجھے استعمال کیا مجھے آخر کیوں؟

ڈرائیور کیوں؟ تم بتاتے کیوں نہیں؟" علیزے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔

"کل پوچھنا..... کل بتاؤں گا۔" اس کا وہی ایک جواب تھا علیزے سے زچ ہو گئی تھی اس کے کل سے اور وہ اطمینان سے سگریٹ سلگا چکا تھا جس سے ایک گہرا کش لیتے ہوئے اس نے دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا اور علیزے کی نظروں کے سامنے کے مرغولے اڑتے ہوئے پورے ڈرائنگ روم میں پھیل گئے تھے۔

"کل نہیں آج ابھی اس وقت بتاؤ مجھے۔" اس نے ضد کی تھی۔

"کیا چاہتی ہو؟" اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کا کل جھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں اپنے تمام سوالوں کے جواب چاہتی ہوں میں اپنا اور اپنے پاپا کا گناہ جاننا چاہتی ہوں۔" وہ اپنی بات پہ زور دے رہی تھی اور اس کی اسی ایک تکرار سے تنگ آ کر اس نے گل کو بلا لیا تھا۔

"جی صاحب کہیے؟" وہ فوراً حاضر ہوئی تھی۔

"دیکھو گل! اس سے کہو تنگ مت کرے۔ کل کا انتظار کرے اس کی ہر بات فرصت سے سنوں گا بس آج ٹھہر جائے آور نے جیسے درخواست کی تھی اور گل بیچاری سر ہلا کے رہ گئی تھی۔

"جی صاحب! کہہ دیتی ہوں۔"

"مگر میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" وہ چلائی تھی۔

"گل! اسے یہاں لے جاؤ۔" دل آور کے ضبط اور برداشت بھی بلا کے تھے، گل کو حیرت اور اچنبھا ہوا تھا کہ صاحب برداشت سے بھی زیادہ برداشت کیسے کیا ہے؟

"میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی بلکہ ڈٹ گئی تھی۔

"اوکے..... میں چلا جاتا ہوں۔" دل آور اپنا سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر، موبائل اور بریف کیس اٹھا کر سیڑھیوں کی سمت تھا۔

"ڈرائیور..... ڈرائیور..... پلیز میری بات کا جواب دے کر جاؤ۔" وہ پیچھے چیختی چلاتی رہ گئی تھی اور وہ اس کے سامنے سیڑھیاں طے کر کے چلا گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد بے بسی کے مارے وہ دھاڑیں مار مار کے روتی ہوئی نیچے قالین پہ ڈھیر ہو گئی تھی اور گل ایک بار پھر اسے سمجھانے بجھانے میں لگ گئی تھی۔

آج اس کا غم حد سے سوا تھا۔ آج اپنے پاپا کی تکلیف بھلائے نہیں بھول رہی تھی اسی لیے تو وہ صبح سے تڑپ رہی تھی اور کر پاگل ہو رہی تھی لیکن اتنا رونے کے بعد بھی کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا..... گہرا اور گہرا اندھا اور پاگل کر دینے والا اندھیرا..... اور دل آور شاہ تھا کہ اس گہرے اندھیرے میں آگہی کی ذرا سی کون بخشنے پہ بھی تیار نہیں تھا وہ پوچھ پوچھ کے ہار گئی تھی۔

♥

"کیا دل آور شروع سے ہی ایسا ہے؟" نبیل نے سامنے ٹیبل سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب؟ شروع سے ہی؟" بتول شاہ نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے ناسمجھی سے دیکھا تھا۔

"مطلب کہ سخت، ضدی، غصیل اور ذہین بھی؟" نبیل یہ سوال دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں..... ضدی اور ذہین تو وہ اس وقت سے ہے جب سے پیدا ہوا ہے لیکن سخت..... نجانے کیوں وہ بتاتے بتاتے رہ گئی تھیں۔

"لیکن....." نبیل نے اس لیکن سے آگے بھی جاننا چاہا تھا۔

"لیکن سخت اور غصیل وہ تب ہوا تھا جب اس کے بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔" بتول شاہ چائے کے کپ پہ نظریں جمائے جواب دے پائی تھیں۔

"اوہ..... ایم رئیلی سوری آنٹی! میں نے انجانے میں آپ کو اداس کر دیا۔" نبیل نے بے ساختہ معذرت کی تھی اسے افسوس ہوا تھا۔

"اُف اوکے بیٹا! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اُداسی اور غم کے ساتھ تو بائیس سال پرانا رشتہ ہے اب تو احساس ہی نہیں ہوتا؟"
انہوں نے افسردگی سے سر جھٹکا تھا اور نبیل چپ سا ہو گیا۔
"کیا بات ہے بیٹا! چپ کیوں ہو گئے ہو؟ باتیں کرو نا، اتنا اچھا لگ رہا ہے، میرے لیے تو آج تم نہیں، سمجھو کہ میرا دل اور گھر آیا ہوا ہے۔" انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نبیل کو شرمندگی اور افسوس کے حصار سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔
"اور میرے لیے بھی آپ اس کی ماں نہیں، میری ماں ہیں۔" نبیل نے بھی جواباً مسکرا کے کہا تھا۔
"ارے..... یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بیٹا! میں تم دونوں کی ماں ہوں، بلکہ تینوں کی، عبداللہ بھی تو ہے وہ بھی تو میرا بیٹا ہی ہے نا؟" انہوں نے کافی خوشدلی سے کہا تھا اور نبیل مسکرا دیا تھا۔
"بیٹے تو آپ کے تین ہیں اور پوتے، پوتیاں ابھی ایک بھی نہیں..... کبھی اس طرف غور کیا آپ نے؟" نبیل نے ایک اور چھپ سوال ڈھونڈا تھا۔
"پاگل..... غور ہی غور ہے۔ بس اب وہ فرصت سے ملے تو اس سے بات کروں گی۔"
"کیسی بات.....؟"
"یہی کہ مجھے بس ایک پوتے پوتیوں کی ضرورت ہے، تم تین بیٹے ہو، سات سات بچے بانٹ لو مل کر ایک ہو جائیں گے اور ان شاء اللہ اگلے سات سالوں میں میرا گھر ایک بھرا پرا گھر ہو گا ساری تنہائی، اکیلا پن اور اُداسی ختم ہو جائے گی۔" ان کے جواب پر نبیل قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔
"ہاہاہا..... آنٹی پہلے ہمارے لیے بیویوں کا تو انتظام کر لیں، تبھی آپ ہمارے بچوں کا یہ پولٹری فارم قائم کر سکیں گی۔" نبیل ان کی بات پہ خاصا محظوظ ہوا تھا۔
"انتظام میں نے کیا کرنا ہے؟ انتظام تو تم لوگ خود کرتے ہو عبداللہ نے کر لیا ہے۔ اب تم دونوں کی باری ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھیں۔
"ان شاء اللہ یہ باری بھی جلدی آ جائے گی۔" اس نے انہیں تسلی دی تھی۔
"کس کی؟" انہوں نے بے ساختہ پوچھا۔
"ہماری....." نبیل نے شرارت سے کہا تھا۔
"ارے واہ، لیکن کب؟" انہیں خوشی اور حیرانی ہوئی تھی۔
"خدا نے چاہا تو بہت جلد..... نہ چاہا تو کبھی نہیں..... بس ابھی سوچ میں ہوں، ارادے باندھ رہا ہوں کہ پیش قدمی کیسے کروں؟"
"گڈ گڈ..... بہت اچھی بات ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے سن کر اللہ تمہیں زندگی دے، خوش رکھے اور تمہاری مراد پوری کرے۔ آمین....." انہوں نے اسے دُعا دی تھی۔
"آنٹی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟" نبیل کے لب و لہجے میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔
"سو بار پوچھو بیٹا! اجازت کی کیا ضرورت ہے؟"
"آپ اسے کتنا جانتی ہیں؟" نبیل کا سوال بہت عجیب تھا۔
"جتنا اپنے آپ کو جانتی ہوں۔" ان کا جواب بہت مضبوط تھا۔
"تو پھر آپ اس کی کیفیت اس کے جذبات سے بھی واقف ہوں گی؟"
"آف کورس بیٹا! جانتی ہوں سب جانتی ہوں۔" ان کے انداز میں یقین تھا۔
"اس کے دل میں کیا ہے؟ کس سے محبت ہے اسے؟" نبیل کے سوال میں تجسس تھا وہ دل آور کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر کبھی بھی جان نہیں پایا تھا۔
"تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے خود تو اسے جانتے ہی نہیں؟" بتول شاہ نے ذرا سے تعجب کا اظہار کیا تھا۔
"جی آنٹی! یہی سچ ہے وہ ہم سب کو جانتا ہے، لیکن ہم اسے نہیں جانتے، اس کے اندر کیا ہے؟ ہمیں علم نہیں ہے وہ ہم سے تو

ہماری ساری سن لیتا ہے لیکن ہمیں اپنی ایک بھی نہیں بتاتا۔" نبیل سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"یہ تمہاری کمزوری ہے یا اس کی۔"

"یہ ہماری کمزوری ہے، کیونکہ ہم اس کے دوست ہو کر بھی اسے کبھی نہیں جان پائے، حالانکہ جاننا چاہیے تھا۔" "آپ پہ شکوہ ہوا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! کبھی کبھی کچھ نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے کچھ باتوں کی پوشیدگی میں ہی بھلائی ہوتی ہے، لیکن تم پریشان وہ جس سے بھی محبت کرتا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ وہ تم سے محبت کرتا ہے، تم بہت اہم ہو اس کے لیے، وقت آنے پر کہ دے گا، تم لوگوں کو نہیں بتائے گا تو اور کس کو بتائے گا بھلا؟" بتول شاہ نے اسے سمجھایا تھا اور کسی بھی طرح کی بدگمانی دل سے باز رکھا تھا۔

"جی آنٹی! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے یا ہم اس کے لیے کتنے اہم ہیں اور کتنی محبت کرتے ہیں، خلوص اور اس کی محبت تو ناقابل بیان ہے اور کبھی کبھی تو مجھے فخر اور غرور ہوتا ہے وہ میرا دوست ہے۔" نبیل نے دل کی گہرائی اظہار کیا تھا۔

"اللہ یہ دوستی سلامت رکھے اور نظر بد سے بچائے۔"

"آمین....." وہ مسکرائی تھیں۔

"اچھا آنٹی میں چلتا ہوں اب کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" نبیل چائے کا خالی کپ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج یہیں رُک جاتے تو اچھا تھا۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"جی ضرورت رُک جاتا..... لیکن مجھے کسی آدمی کے ساتھ ضروری کام ہے، ملنا ہے اس سے اور اس نے سارے ہوٹل میں ملنے کا ٹائم دیا ہے اس لیے میں نے اسی ہوٹل میں روم بک کروا لیا ہے رات وہیں ٹھہروں گا۔" اس نے معذرت کی۔

"تو پھر صبح ناشتہ یہیں سے کرنا۔" انہوں نے دعوت دی تھی۔

"نو تھینکس آنٹی! صبح صبح ہی واپسی کے لیے نکل جاؤں گا، ان شاء اللہ ناشتہ لاہور جا کر ہی کروں گا۔" اس نے وجہ بتانا چاہی تھی۔

"کیوں..... اتنی جلدی کیوں؟"

"بس وہ دل آور آج کل کورٹ کے کاموں میں بزی ہے اور ہمارے پاس منیجر بھی نہیں، اس لیے سارا کام خود ہی کرنا ہے۔"

"اوکے..... ٹھیک ہے پھر۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور نبیل ان سے مل کر واپس ہوٹل میں آ گیا۔ آدھے گھنٹے اس کی اس آدمی کے ساتھ میٹنگ تھی اور یہ میٹنگ اگلے ایک گھنٹے کے بعد ختم بھی ہو گئی تھی، نبیل فارغ ہو چکا تھا، اس نے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے تھوڑی دیر ریسٹ کرنے کا سوچا تھا لیکن ابھی وہ اپنے روم میں جانے لیے سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے قدم سیڑھیوں پہ ہی جمے رہ گئے تھے اس کی نظریں سامنے والی سیڑھیوں کی سمت تھیں سیڑھیوں کی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی کھڑے کھڑے سیڑھیوں سے نیچے گر جائے۔

♥

"یس مم ان....." وہ اپنے کچھ ضروری سامان کی پیکنگ کر رہا تھا جب بیڈ روم کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی کہ خدمت ہو گی، کیونکہ اس نے تھوڑی دیر پہلے خدمت کو چائے لانے کا کہا تھا۔

"چائے۔" وہ اپنا تولیہ، شیونگ کٹ اور پرفیوم وغیرہ اٹیچی کیس میں رکھ رہا تھا جب کومل کی آواز پہ یکدم کرنٹ کھا کے

"آپ..... آذر کو اپنے بیڈ روم میں کومل کی آمد کچھ عجیب لگی تھی کیونکہ اس کی اپنی فی میل کزنز کے ساتھ کبھی بھی اتنی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں آتیں یا پھر بلا جھجک ان کے بیڈ روم میں جاتا۔

وہ سوائے علیزے کے باقی سب کے ساتھ ایک حد تک رہنے کا اور فاصلہ رکھنے کا عادی تھا اور اسے کومل کی یہ حد کراس کی بے تکلفی سخت ناگوار گزری تھی۔

"آپ کیوں آئی ہیں؟ میں نے تو حرمت کو چائے لانے کا کہا تھا۔" آذر نے مروتاً بھی اپنی ناگواری چھپانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"میں دیبی حویلی میں اپنے چچازاد کزن کے بیڈروم میں آئی ہوں کسی منصور حسین ڈرائیور کے بیڈروم میں نہیں گئی کہ آپ کو ناگوار گزرے۔"

"کومل....." آذر نے یکدم غصے اور غضبناکی سے دھاڑتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن ایک لمحے کے ہزارویں حصے کی سوچ تھی جس نے اس کا ہاتھ فضا میں ہی روک دیا تھا، وہ اسے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتا اگر اس پہ یہ خیال حاوی نہ ہو جاتا کہ وہ ایک عورت پہ ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ اور عورت بھی وہ جس پہ اس کا کوئی حق تھا نہ اختیار..... کیونکہ وہ ماں تھی نہ بہن..... بیوی تھی نہ بیٹی..... اس لیے وہ صرف کزن ہونے کے ناتے اس پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن کومل کو اس ادھورے تھپڑ کا لمس اور درد اپنے گال پہ بڑی شدت سے محسوس ہوا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے آذر کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس کے چہرے پہ نقش ہو گئی ہوں اور گہرا نشان چھوڑ گئی ہوں۔

"مجھے خوشی ہوتی اگر آپ کے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے کی زینت بن جاتا اور میرے چہرے کو رنگ بخش دیتا۔" کومل نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"ایم سوری..... آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بھینچتے ہوئے ہاتھ پہلو میں گرا لیا تھا۔

"اوکے..... میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ مگر اتنا بتا دیں کہ آپ کو اتنی تکلیف کس بات پہ ہوئی ہے؟ میرے سچ بولنے یا پھر منصور حسین کے نام پہ؟" اس نے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"دیکھیے کومل اس وقت آپ اپنی لمٹس کراس کر رہی ہیں اور مجھے یہ چیز سخت ناپسند ہے، یہ بات آپ بھی جانتی ہیں۔"

"جانتی ہوں بہت اچھی طرح جانتی ہوں، آپ کی ان تمام لمٹس کو بھی جانتی ہوں جو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی روندی جا چکی ہیں۔" کومل نے کاٹ چبا کر کہا تھا اور آذر اس کا لحاظ کرتے ہوئے چپ ہو گیا تھا۔

"میں آپ کے بیڈروم میں نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن مجبوراً آنا پڑا۔" اس نے تمہید باندھی اور آذر نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔

"مطلب آپ فرار ہو رہے ہیں؟" کومل کے لہجے اور الفاظ کی کاٹ ہنوز تھی۔

"کومل پلیز..... اسٹاپ اٹ..... اور برداشت نہیں کروں گا۔" آذر نے سختی سے اسے وارننگ دی تھی لیکن وہ باز آنے والی کہاں تھی۔

"یعنی کہ میں نے سچ کہا ہے؟" اس نے آذر کی سمت دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا تھا۔

"دیکھیے کومل..... میں اپنے کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں، وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لیے اور سب کو بتا کر جا رہا ہوں، اچانک چوری چھپے نہیں جا رہا۔ اس لیے پلیز آپ کو بلاوجہ خود سے مفروضے قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" آذر نے اب بھی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

"بلاوجہ.....؟" اس نے بے ساختہ انجھے سے کہا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ جواباً آذر کچھ کہتا اسی میں دانیال دروازہ دھکیل کر اندر چلا آیا تھا۔

"آذر! یہ دونوں فائلز بھی ساتھ رکھ لو، تمہیں بعد میں مسئلہ....." دانیال کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا مگر کومل کو وہاں دیکھ کر بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"ایم سوری..... میں نے بے وقت مداخلت کی....." دانیال معذرت کرتے ہوئے واپس پلٹا تھا۔

"رکیے دانیال بھائی!" کومل نے اسے پیچھے سے آواز دی تھی اور پھر اس کے قریب آ کر چائے کے کپ کی چھوٹی سی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

"یہ چائے دیجیے ان کو..... انہیں چائے کی طلب ہو رہی تھی اور ساتھ میں ان سے یہ بھی کہیے کہ کسی کا غم منانا ہے تو حویلی میں منائیں، کسی انگلینڈ یا امریکہ جانے کی ضرورت نہیں ہے، غم ہمیشہ غم ہی رہے گا چاہے کہیں بھی چلے جائیں۔" وہ کافی طنز اور تلخی سمیٹے وہاں سے چلی گئی تھی اور آذر نے غصے سے دانیال کے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی ٹرے کپ سمیت دیوار کے ساتھ دے

ماری تھی۔

♥

آج ملک حق نواز کے ڈیرے پہ کسی جشن کا سا سماں تھا۔ کیونکہ آج ملک اسد اللہ صوبائی اور ملک حق نواز قومی اسمبلی کے لیے نامزد ہوئے تھے اور یہ خوشی ان کے لیے بہت بڑی خوشی تھی اور اس خوشی میں آج ملک حق نواز کے ڈیرے کی رونقیں تھیں ہر طرف عیش و عیاشی اور موج و مستی کا جہان آباد تھا کھانے پینے سے لے کر رت جگا منانے تک کا انتظام کیا تھا۔ آنے جانے کا اور مبارکباد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ملک حق نواز اپنے علاقے کے کچھ دوستوں سے مبارک باد وصول کر رہا تھا جب ڈیرے کے احاطے میں ایک گاڑی کرز کی تھی اور وہ چونک گیا تھا۔

"ملک حق نواز کہاں ہیں؟" ایس ایچ او جمال احمد نے ڈیرے کے کمی کو قریب بلایا تھا۔

"جی..... وہ سامنے کھڑے ہیں۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کیا تھا لیکن اتنے میں ملک حق نواز خود ہی قریب آ گئے۔

"ایس ایچ او صاحب! آج کیسے زحمت کی آپ نے؟" اس نے ایس ایچ او جمال احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔

"ملک صاحب! آپ کے وارنٹ گرفتاری ہیں میرے پاس....." جمال احمد نے وارنٹ نکال کر دکھائے تھے۔

"وارنٹ گرفتاری..... مگر کس جرم میں.....؟" ملک حق نواز کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"موضعہ بی بی کے ریپ کے جرم میں۔" جمال احمد کے بتانے پہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا اس کے ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

♥

دن ڈوب رہا تھا اور شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ دن بھر کھیتوں پہ کام کرنے والے کسان اپنے بیوی بچوں مویشیوں کے ساتھ اس وقت واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، لیکن واپسی کے اس سفر میں دن بھر کی تھکن بہت واضح رہی تھی، سب کے قدم سست اور تھکے تھکے سے لگ رہے تھے یہاں تک کہ صبح سے اپنے کھونٹے سے جدا رہنے والے مویشی لگ رہے تھے اور اپنے مالک کے چھڑی سے ہانکنے پہ بڑی سستی سے قدم اٹھا رہے تھے، جس پہ ان کے مالکوں کا خسارہ اتر رہا تھا ایک دو چھڑی ان کی پیٹھ پہ پڑتی تو ان کے قدموں میں تیزی آ جاتی تھی اور اس تیزی میں وہ اپنے سے آگے مویشیوں کو دھکیلتے ہوئے خود آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کوشش اور حکم بجا لانے میں ان کے گلے میں جھولتی گھنٹیاں تھیں اور شام ڈھلے فضا میں کسانوں کی مویشیوں کو ہانکنے کی مخصوص آوازیں اور مویشیوں کے گلے کی گھنٹیوں کا مخصوص شور بیٹھے افراد کو بہت دور سے ہی ان کی واپسی کا پتا دے رہے تھے۔

انسانوں اور جانوروں کے اس قافلے میں وہ بھی شامل تھی اور آہستہ قدموں سے گھر کی سمت گامزن تھی۔ کیونکہ دن بھی کام کیا تھا۔ وہ بھی تھکی ہوئی تھی۔ اس کے قدم بھی سست تھے۔ بلکہ اس کی تھکن تو سب سے زیادہ تھی کیونکہ وہ کھیتوں کام کرنے کی عادی نہیں تھی اور اسی لیے اس قافلے میں سب سے پیچھے تھی۔

پچھلے دو روز سے اس کے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی انہیں بہت تیز بخار تھا اس لیے آج اماں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی چھوٹے تینوں بھائی سکول چلے گئے تھے سو مجبوراً اماں کی تاکید پہ اسے کام پہ آنا پڑا تھا، حالانکہ اسے کھیتوں میں آنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا وہ ہمیشہ گھر پہ ہی رہتی تھی اور گھر کے کام کرنے کی عادی تھی لیکن آج اس کی سیاہ بختی اسے کھیتوں میں لے گئی تھی۔

ان کا قافلہ بڑی موج میں رواں تھا جب بڑی دور سے آگے پیچھے تین گاڑیاں دھول اڑاتی ہوئی مغرب کی سمت آ رہی تھیں اور اس قافلے کی موج بھگدڑ سی مچ گئی تھی سارا قافلہ منتشر ہو گیا تھا، سب کسانوں نے بڑی پھرتی سے اپنے اپنے کو بیچ راستے سے ہٹا کر راستہ صاف کر دیا تھا سارے قافلے والے دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور اسے گاڑیاں بھی قریب آ گئی تھیں اور آگے پیچھے تینوں گاڑیاں دھول اڑاتی ہوئی زناٹے سے گزر گئی تھیں لیکن اتنی تیز رفتاری سے ملک حق نواز کی نظر پیچھے رہ گئی تھی وہ اپنی گاڑی کے پاس سے گزرنے والی لڑکی کو دیکھ چکا تھا اور دھول مٹی کا غبار چھٹنے تک

PRIME GREEN NOVELS

کا دل
رکا شیشہ سرد میں آپکا تھا اس نے بے ساختہ گاڑی کو بریک لگوائے تھے اور گاڑی بیک کرنے کا اشارہ کیا تھا۔
"یہ لڑکی کون ہے اچھو.....؟" اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے ملک حق نواز نے گاڑی کے سائیڈ ویو مرر سے دیکھتے ہوئے
ڈرائیور سے پوچھا تھا۔
"وہی ہے ملک صاحب! چاچا بخشو کی بیٹی۔ جس نے آپ کو دیکھ کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا۔" اچھو نے اسے یاد دلایا
تھا۔
"مومنہ بی بی ولد محمد بخش....." ملک حق نواز نے خاصے مبہم لہجے میں اس کا نام لیا تھا۔
"جی..... جی..... پورا نام یہی ہے۔" اچھو نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"گاڑی سے اتر کر جاؤ اور اسے روک کر پوچھو کہ مومنہ بی بی آج کون سا دروازہ بند کرو گی؟ کہاں چھپو گی آج اس کھلے آسمان
تلے یا زمین کے اندر؟" ملک حق نواز کے لہجے میں بے رحمی اور ظلم کی لپک تھی۔
"کیا مطلب ہے ملک صاحب! کیا کوئی ارادہ ہے آج؟" اچھو ٹھٹکا تھا کیونکہ ملک حق نواز کی آنکھوں کے رنگ ہی بدل چکے
تھے۔
"ہاں یار! ارادہ تھا تو نہیں مگر بن گیا ہے۔ آج بڑی تھکن ہو رہی ہے۔" ملک حق نواز نے اپنی گردن کو بل دیتے ہوئے تھکن کا
اظہار کیا تھا۔
"ملک صاحب! تھکی ہوئی تو وہ بھی لگ رہی ہے؟" اچھو نے آنکھ دباتے ہوئے کافی کمینگی سے کہا تھا۔
"ساری تھکن اتار دوں گا، تم ایک بار اسے لے کر تو آؤ۔" ملک حق نواز نے اسے اشارہ کیا تھا۔
"جی..... جی..... ملک صاحب! ابھی بس ابھی لے کر آیا ہوں۔ تھکن آپ کی ہو اور میں سامان نہ کروں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے
بھلا؟" ملک حق نواز کو کر اس سے بھی زیادہ خبیث تھا اور ایسی خباثت اور حرام کاریوں پہ بٹخارے لینا تو اس کی پرانی عادت تھی وہ
گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور مومنہ بی بی کی سمت بڑھا تھا۔
"سنو....." اس نے پیچھے سے آواز دی تھی اور مومنہ بی بی کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔
"مومنہ بی بی....." اب کی بار اس نے ذرا بلند آواز سے پکارا تھا اور مومنہ بی بی کے نام کی اس پکار پہ جیسے پورا قافلہ لرز اٹھا
تھا کیونکہ اس پکار پہ ہر متعدد گاؤں کا بچہ بچہ جانتا تھا وہ کسی بھی جانتی تھی۔ اسی لیے تو اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔
"واپس آؤ..... تمہیں ملک صاحب بلا رہے ہیں۔" اتنے میں اچھو اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔
"کیوں..... وہ کیوں بلا رہے ہیں؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔
"تمہارے حسن کو خراج پیش کرنے کے لیے۔" اچھو نے مسکراتے ہوئے اسے سر تا پا ذومعنی نظروں سے دیکھا تھا اور مومنہ بی
بی کا رنگ فق ہو گیا تھا اسے یوں لگا جیسے وہ کسی جنگل میں کھڑی ہو اور اس کے چاروں اطراف بھیڑیے غرا رہے ہوں، وہ ان کے
نرغے میں آ جاتی تو وہ اسے ایک جھپٹے میں ہی چیر پھاڑ ڈالتے، لیکن ان سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ زمین شگاف
ہو سکتی تھی نہ آسمان اسے اپنی وسعتوں میں سمیٹ کر محفوظ کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ قافلے والے اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کر
سکتے تھے جو آسمان اور زمین کی طرح بے بس اور لمحہ بہ لمحہ قدم قدم پہ اس سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اپنے پیچھے دھول چھوڑتے جا
رہے تھے، وہی دھول جو بس کچھ ہی دیر میں اس کی عزت پہ پڑنے والی تھی اور اس کا صاف ستھرا دامن گرد آلود ہونے والا تھا۔
"میں نہیں جاؤں گی۔" اس نے ایک اور ہمت کی اور انکار کر دیا تھا۔
"اچھا..... تو پھر کہاں جاؤ گی؟" اچھو نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے بھنویں اچکائی تھیں اور مومنہ بی بی نے بے ساختہ
شرق کی سمت بڑھتے قافلے کی طرف دیکھا تھا۔
"اپنے گھر....." اس کی آواز جیسی مگر لہجہ ذرا مضبوط تھا جس پہ اچھو قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جیسے اس کی خوش فہمی کا مذاق اڑایا ہو۔
"مگر کل صبح..... یا پھر پرسوں صبح..... وہ بھی اگر ملک صاحب کا دل بھر جائے تب۔" اچھو کی خباثت سے کپکپا کے رہ گئی تھی۔
اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور پورے جسم پہ چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔
"دیکھو مومنہ بی بی! خوامخواہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہونا تو وہی ہے جو ملک صاحب سوچ چکے ہیں اس لیے

آرام سے چل کر خود ہی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" اچھو نے بڑی بے حسی اور لاپروائی سے اسے مشورہ دیا تھا لیکن اس کی آنکھیں اس انسان ہے جو جیتے جی خود جا کر قبر میں بیٹھ جائے اور اپنے اوپر منوں مٹی ڈال لے؟ اور وہ بھی ایک انسان تھی۔ جو نہ خود بیٹھ سکتی تھی اور نہ ہی اپنے اوپر منوں مٹی ڈال سکتی تھی۔ اسے زندگی بھی پیاری تھی اور عزت بھی۔ جس کے لیے اسے ہاتھ ہی تھے، سو اس نے پوری کوشش کی تھی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

"لو..... یہ اب اور تھکائے گی۔" اچھو نے خفگی سے سر جھٹکا تھا اور گاڑی میں بیٹھے باقی آدمیوں کو اشارہ کیا تھا جو اس اشارے پر دندناتے ہوئے گاڑی سے اُترے تھے، معونہ بی بی کے تعاقب میں ان کے قدموں کی دھمک اور بھاگنے کی آواز تھی۔

"ماسی برکتے! چاچا شرفو! ارکو..... خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔" معونہ بی بی نے اس بے بس قافلے میں موجود اپنے برکتے اور چاچا شرفو کو آوازیں دی تھیں، جو صبح اماں اور ابا کو کہہ کر آئے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں ہم ساتھ ہی تو ہیں معونہ کون سا اکیلی کھیتوں پہ جا رہی ہے؟ آپ کی بیٹی ہے تو ہماری بھی بیٹی ہے سانجھی ہوتی ہے۔" لیکن وہ اب اماں ابا کو کیسے بتاتی کہ عزت سانجھی نہیں ہوتی بلکہ عزت اپنی اپنی ہوتی ہے، سانجھی عزت کے یونہی سر عام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؟

"ماسی برکتے..... رُک جاؤ..... خدا کے واسطے مجھے بچالو۔" وہ پیچھے سے چلا رہی تھی، چیخ رہی تھی، پکار رہی تھی اور وہ رہے تھے۔ سب جان رہے تھے لیکن رُک نہیں رہے تھے اس پہ کیا بیت رہی ہے؟ یا کچھ دیر بعد کیا بیتے گی؟ سب جانتے تھے پتا تھا۔

ماسی برکتے کو بھی پتا تھا وہ بھی جانتی تھی مگر مجبور تھی کیونکہ ماسی برکتے کے گھر میں خود دو جوان بیٹیاں تھیں اور معونہ بی بی کرنے کی صورت میں خود اس کی بیٹیاں ملک حق نواز کے زیرِ عتاب آسکتی تھیں کیونکہ ملک حق نواز پہلے بھی ایسے ایک دو معاملے مدد کرنے والوں کو کڑی سزا سے نواز چکا تھا جس کے بعد سب نے کسی دوسرے کی مدد کرنے سے توبہ کر لی تھی اور اسی لیے معونہ کی چیخ و پکار کی طرف سے کان بند کرتے ہوئے اپنے میلے کچیلے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ماسی برکتے آگے بڑھتی رہی اور وہ پیچھے تڑپتی رہی تھی، معونہ بی بی کے قدموں کے بھاگنے کی آواز اور اس کے پیچھے ان خونخوار درندوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دے رہی تھیں لیکن آخر کب تک؟ وہ کتنا اور کب تک بھاگ سکتی تھی؟ قدم ہار گئے تھے۔

بلکہ اس کے قدم نہیں اس کی قسمت ہار گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی چپل ٹوٹ گئی تھی اور پاؤں ٹوٹی ہوئی چپل میں پھنس گیا تھا اور وہ لڑکھڑا کے زمین پہ آگری تھی، دھول مٹی میں ہاتھ پاؤں اور کپڑے بھی اٹ گئے تھے اور ابھی وہ اُٹھنے کی کوشش کرتی کہ درندوں کا وہ گروہ اس پہ حاوی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے دبوچا اور گاڑی میں لا پھینکا تھا اور اس کی چیخوں سے وہ شام، وہ کھیت، وہ مویشی اور وہ قافلے والے سب لرز اُٹھے تھے۔

سنا ہے..... جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے۔

سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو

وہ حملہ نہیں کرتا،

سنا ہے..... جب کسی ندی کے پانی میں

بنے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے تو

ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو

پڑوسی مان لیتی ہیں

ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو بلاتے ہیں

تو بیا اپنے گھر کو بھول کر

کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے

سنا ہے..... گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو

سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باز آ جائے
یا کوئی پتی ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں،
نا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوند جلیل و معتبر، دانا و بینا، منصف و اکبر
ہمارے شہر میں بھی اب
جنگلوں کا سا کوئی دستور نافذ کر.....

"ملک صاحب ..... ملک صاحب! ہوش میں آیئے ملک صاحب! ابھی آپ اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئے، ابھی آپ اپنے پیچھے پوری موجود ہیں، ابھی آپ نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی تو ہم نے آپ کو بہت کچھ دکھانا ہے۔ بڑے حساب کتاب چکانے ہیں آپ نے۔ ابھی تو صرف بلاوا آیا ہے آپ کے لیے۔ رخصت تو آپ کو بڑے اہتمام سے کیا جائے گا۔" ایس پی کامران مہدی نے ایس ایچ او جمال احمد کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے کسی گہرے خیال میں ڈوبے ملک حق نواز کو اس خیال کی گہرائی سے باہر کھینچا تھا اور ملک حق نواز بُری طرح چونک گیا تھا۔

"ایس پی کامران مہدی آپ.....؟" ملک حق نواز مزید ٹھٹکا تھا۔

"جی ملک صاحب! میں ہی ہوں، ایس پی کامران مہدی..... دراصل جس روز آپ جیسی کسی معزز شخصیت کو اپنا مہمان بنانے کی زحمت دینا ہوتی ہے اس روز ہمیں خود خدمت میں حاضر ہونا پڑتا ہے، اب یہی دیکھ لیں آپ کو اریسٹ کرنے کے لیے محض ایک ایس ایچ او کو بھیجنا بھی تو مناسب نہیں تھا نا؟ اسی لیے آپ کا احترام کرتے ہوئے میں خود آیا ہوں اور میرے ساتھ آپ کے احترام میں پولیس فورس کی پوری پلاٹون آئی ہیں اور آپ کے ڈیرے کو چاروں اطراف سے کور کر گیا تھا ہے، حالانکہ بتا بھی ہے کہ آپ کہیں بھاگنے والے نہیں ہیں، کیونکہ معزز لوگ بھاگا نہیں کرتے، مقابلہ کرتے ہیں، لیکن کیا کریں ملک صاحب مجبوری ہے، ڈیوٹی بھی تو نبھانی ہے آخر۔" ایس پی کامران مہدی نے ملک حق نواز کو باتوں باتوں میں سب باور کروا دیا تھا کہ اس کی کسی چال یا کسی حرکت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

"لیکن میرے خلاف تو ایسا کوئی کیس نہیں تھا۔" ملک حق نواز نے انجان بننا چاہا تھا۔

"آپ تھانہ" کو چھوڑیں ملک صاحب!" بے" می بات کریں۔ آپ کے خلاف کیس ہے تو بس ہے اسی لیے تو کورٹ سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں۔" ایس پی کامران مہدی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن جب تک کسی تھانے میں کیس درج نہ ہو تب تک کورٹ سے وارنٹ کیسے آ سکتے ہیں؟" ملک حق نواز اُلجھ رہا تھا۔

"تو آپ سے کس نے کہا کہ تھانے میں کیس درج نہیں ہے؟" ایس پی کامران مہدی نے دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"میں خود کہہ رہا ہوں کہ میرے خلاف کسی بھی تھانے میں ایسا کوئی کیس درج نہیں ہے، میں پوری چھان بین کر چکا ہوں۔" ملک حق نواز اپنے اصلی رنگ اور اصلی حالت میں واپس لوٹ رہا تھا۔

"ملک صاحب! آپ سمجھتے ہیں کہ سیاست آپ جیسے جاگیرداروں اور رئیس زادوں سے شروع ہو کر آپ پہ ہی ختم ہو جاتی ہے، سیاست کے ساتھ تو آپ ایسے کھیلتے ہیں جیسے آپ کے ڈیرے کی باندی ہو، حالانکہ آپ یہ نہیں جانتے کہ جہاں آپ کی سیاست ختم ہوتی ہے وہاں سے ہم پولیس والوں اور وکیلوں کی سیاست شروع ہوتی ہے، آپ کے ڈیرے کی باندی کو ہم اپنی جیب میں لیے پھرتے ہیں اور آپ کو کیا پتا کہ جب وردی والے اور کالے کوٹ والے ایک ساتھ ہو جاتے ہیں تو بڑے بڑے بادشاہوں اور خداؤں کا تختہ الٹ دیتے ہیں آپ تو کوئی چیز ہی نہیں ہیں، اس لیے آپ اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لیں کہ پچھلی دس

جنوری سے تھانے میں یہ کیس درج ہے اور اب جنوری سے دسمبر آ گیا ہے۔ اس لیے آپ کا بلاوا بھی آ گیا ہے، لہٰذا آپ کو لبادہ اوڑھتے ہوئے ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا، وگرنہ بصورت دیگر ہمیں خود لے جانا بھی آتا ہے۔'' ایس پی کامران نے اپنا اصل روپ دکھا دیا تھا تاکہ وہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہے۔

''اس کیس کی پیروی کون کر رہا ہے؟'' ملک حق نواز کا لہجہ سرد ہو چکا تھا۔

''میر سٹرول آور شاہ.....'' ایس پی کامران مہدی کا جواب بھی سپاٹ تھا۔

''دل آور شاہ؟'' ملک حق نواز جانتا تو پہلے سے تھا مگر اس وقت ایس پی کامران مہدی کے منہ سے دل آور شاہ کا نام سن کر کا خون کھول اُٹھا تھا۔

''ہوں..... تو یہ کارنامہ اس کا ہے۔'' ملک حق نواز نے دانت پیسے تھے۔

''جی..... یہ کارنامہ انہی کا ہے اب ہو گئی تصدیق؟ اب چلیے۔ خوامخواہ ٹائم ویسٹ ہو رہا ہے۔'' ایس پی کامران مہدی تھا۔

''ایس پی کامران مہدی آپ مجھے گرفتار کریں گے..... مجھے.....؟'' ملک حق نواز نے غصے سے اپنی سمت اشارہ کیا تھا

''کہا تو ہے ملک صاحب! مجبوری ہے لیکن آپ بے فکر رہیں، میں آپ کو ہتھکڑی نہیں لگاؤں گا اور نہ ہی آپ کو آگے چلنے کا کہوں گا بلکہ بہت ہی باعزت طریقے سے لے کر جاؤں گا، آپ چلیے تو سہی۔'' ایس پی کامران مہدی نے اپنے جمال احمد اور دیگر پولیس اہلکاروں کو اشارہ کیا تھا جو ملک حق نواز کے دائیں بائیں آ کر الرٹ کھڑے ہو گئے تھے گویا انہیں حق نواز کو چلنے کا سگنل دیا تھا اور اسے چلنا ہی پڑا تھا اور جاتے جاتے ایس پی کامران مہدی کے قدم تھم گئے تھے دائیں طرف ذرا ٹھہر کے دیکھا تھا۔

''ادھر آؤ۔'' اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے آدمی کو اشارے سے پاس بلایا تھا۔

''جی ایس پی صاحب!'' وہ بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' ایس پی کامران اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جی..... اشرف محمود.....'' اس نے سر جھکاتے ہوئے بتایا۔

''عرف اچھو..... ہے نا؟'' ایس پی کامران نے غضبناکی سے پوچھا تھا۔

''جج..... جی..... عرف اچھو۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔

''افسر علی! کرو اس کی چھترول اور بٹھاؤ اسے گاڑی میں۔'' ایس پی کامران نے سیدھا اس کے منہ پہ گھونسا رسید کرتے اسے پولیس کانسٹیبل کے قدموں میں پھینکا تھا اور دو تین پولیس کانسٹیبل اس کی تواضع میں لگ گئے تھے جس پہ اچھو کی آوازیں بہت دور تک گئی تھیں اور پولیس کانسٹیبلوں نے اسے مارتے مارتے یونہی گاڑی میں لا پھینکا تھا اور اس کے مکے چل سوار کر لیا تھا، پولیس کی گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی ڈیرے پہ اور پورے گاؤں میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔

♥

''اب کیا ہوگا؟'' ایمن اور ایمان دونوں عابدہ خاتون کی سمت دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی تھیں لیکن عابدہ خاتون ان کے ''اب کیا ہوگا'' کا کوئی جواب نہیں تھا وہ خود اس حقیقت کو جاننے کے بعد ایک سوالیہ نشان کی مانند بت بنی بیٹھی تھیں تو یہ سن کر پھٹ گیا تھا کہ ان کا بیٹا ور کشاپ میں کام کرتا رہا ہے، وہ بیٹا جسے اس کے باپ نے اتنی محنتوں اور مشقتوں سے پڑھا اچھی تعلیم دلوائی تھی تو کیا اس اچھی تعلیم کے بعد بھی اس شہر کے کسی بھی آفس میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی؟

''بتائیے نا مریم آپی! اب کیا ہوگا؟ عدیل بھائی جیل سے باہر کیسے آئیں گے؟ ہم کیا کریں گے؟ ہمارا تو ان کے بھی نہیں ہے۔'' ایمان کا لہجہ روہانسا سا ہو رہا تھا وہ عدیل، مریم اور ایمن سے چھوٹی تھی، ابھی بچپنا تھا، اسی لیے اتنی بڑی زیادہ گھبرا گئی تھی۔

''پلیز ایمان! آہستہ بولو..... ساتھ والے کمرے میں ابا جی ہیں، انہوں نے سن لیا تو وہ یہ سب نہیں سہہ پائیں گے'' نے ایمان کو اونچی آواز میں بولنے سے روکا تھا۔

"لیکن آپی" اب کی بار ایمان نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"لیکن ویکن کو چھوڑو..... بس دُعا کرو کہ اللہ ہماری مدد کرے اور کوئی بہتر حل نکالے۔" مریم کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"لیکن ویکن کو چھوڑو..... بس دُعا کرو کہ اللہ ہماری مدد کرے اور کوئی بہتر حل نکالے۔" مریم کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم کہاں جا رہی ہو؟" مریم کو چادر اوڑھتے دیکھ کر ان تینوں ماں بیٹی نے چونک کر دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟ تم کہاں جا رہی ہو؟" مریم کو چادر اوڑھتے دیکھ کر ان تینوں ماں بیٹی نے چونک کر دیکھا تھا۔

"باطمہ کے گھر جا رہی ہوں۔ کیونکہ کوئی اور کرے نہ کرے وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد ضرور کرے گی۔" مریم چادر اوڑھ کر پرس اُٹھا چکی تھی۔

"باطمہ کے گھر جا رہی ہوں۔ کیونکہ کوئی اور کرے نہ کرے وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد ضرور کرے گی۔" مریم چادر اوڑھ کر پرس اُٹھا چکی تھی۔

"لیکن بیٹا! تم اکیلی....." عابدہ خاتون مزید پریشان ہوئی تھیں۔

"لیکن بیٹا! تم اکیلی....." عابدہ خاتون مزید پریشان ہوئی تھیں۔

"امی اب ہم نے جو بھی کرنا ہے، اکیلے ہی کرنا ہے، یہ دُنیا دار اور محلے دار آپ کی مدد کرنے کے لیے ہرگز نہیں آئیں گے، اس لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ گھر سنبھالیں اور میں باہر سنبھالتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر رُکی نہیں تھی اور ان تینوں پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور وہ تینوں ماں بیٹی دُعا کرتی رہ گئی تھیں۔

"امی اب ہم نے جو بھی کرنا ہے، اکیلے ہی کرنا ہے، یہ دُنیا دار اور محلے دار آپ کی مدد کرنے کے لیے ہرگز نہیں آئیں گے، اس لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ گھر سنبھالیں اور میں باہر سنبھالتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر رُکی نہیں تھی اور ان تینوں پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور وہ تینوں ماں بیٹی دُعا کرتی رہ گئی تھیں۔

♥

وہ گھر نہیں آیا تھا، اس کی لاش گھر آئی تھی، کیونکہ وہ اندر سے مر چکا تھا۔ وہیں اسلام آباد کے اس ہوٹل کی سیڑھیوں پہ جہاں اس نے اپنے باپ ممتاز حیات کو ایک لڑکی کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے دیکھا تھا اور وہ اس لڑکی کے ساتھ کس طرز کی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے، یہ دیکھ کر نبیل حیات چلتے چلتے ہی مر گیا تھا اور مرنے کے بعد اس نے ان سیڑھیوں پر سے اپنی زندہ لاش کیسے ہٹائی تھی؟ یہ صرف وہ جانتا تھا یا پھر اس کی جان کا مالک رب جانتا تھا۔

اسی ہوٹل میں جہاں وہ رات ٹھہرا ہوا تھا اس کا باپ ایک لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ یہی سوچ اور یہی بات اس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو رہی تھی اسے اپنی رگوں میں دوڑتا خون اپنی ہی رگوں کو کاٹتا ہوا محسوس ہوا تھا، اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہوئی تھیں، وہ اپنے ہونٹوں اور اپنے ہاتھوں کو بھینچتا ہوا بمشکل ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن یہ بھی تو ضبط و برداشت سے باہر تھا کہ وہ بھی اسی ہوٹل میں قیام کرتا اور رات گزارتا۔ اسی لیے جب اس کے اختیار سے باہر ہوا تو وہ سب کچھ سمیٹ کے رات کے بارہ بجے ہوٹل کا بل پے کر کے باہر نکل آیا تھا اور پھر باقی کی رات یونہی اسلام آباد کی سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ اس شہرِ بے مہر میں پُرسکون تھا لیکن اس وقت اسے نہ یہ شہر پُرسکون لگ رہا تھا اور نہ اپنا آپ..... اندر باہر ایک اذیت سی اذیت تھی، ایک عذاب سا مسلط تھا، سکون کا تو کہیں شائبہ تک نہیں رہا تھا۔

اور ابھی بے سکونی اور اذیت کی آغوش میں آ کر اسے احساس ہوا تھا کہ مدیحہ کیوں تڑپتی تھی؟ کیوں رات دن کسی ان دیکھی آگ میں جلتی تھی؟ کیوں اسے کہیں چین نہیں آتا تھا؟ کیوں وہ بے کل پھرتی تھی؟ یہاں تک کہ وہ ضدی اور باغی ہو گئی تھی اور ہمہ وقت اس کے سر پہ سرکشی سوار رہتی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی ممتاز حیات کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور آج ایسی ہی حالت اور کیفیت نبیل حیات کی ہو رہی تھی آج وہ بھی ممتاز حیات کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ آج مدیحہ کی طرح اسے بھی اپنے باپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ انتہا درجے کی نفرت..... آج وہ بھی چاہتا تھا کہ زندگی میں کبھی دوبارہ اسے ممتاز حیات کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہ ہو کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یقیناً وہ اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں کر پائے گا جیسے اس وقت اپنے آپ کو سنبھالنا اور کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا اور بالآخر تھک ہار کے اس نے گاڑی کا رُخ لاہور کی سمت موڑ دیا تھا اور اسلام آباد سے لاہور تک کا سفر کیسے کٹا تھا؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ وہ اسلام آباد میں بھی اذیت میں تھا اور لاہور آ کر بھی اس کی اس اذیت میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا وہ اپنی زندہ لاش کو گھسیٹتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ صبح چھ بجے کا وقت تھا، ماحول میں خنکی حد سے سوا تھی، دسمبر کا مہینہ تھا، دھند روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہ دھند اور ٹھنڈ لوگوں کو بے حد ٹھٹھرا رہی تھیں لیکن نبیل ایسی آگ میں جل رہا تھا کہ اسے یہ ٹھنڈ ذرا بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ گاڑی سے باہر نکلا تو بھی اپنے آپ سے لاتعلق سا لگ رہا تھا۔

"سلام صاحب جی!" گھر کا مالی لپک کے پاس آیا تھا۔

"والسلام....." نبیل آہستگی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔

"لائیے صاحب جی! میں کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے نبیل کی تھکن کا خیال کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کوٹ اور بریف کیس لینا چاہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے صاحب! جیسے آپ کی مرضی۔" مالی فوراً تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا اور نبیل بازو پہ ڈالے، بریف کیس ہاتھ میں پکڑے بڑے تھکے تھکے اور شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر آ گیا تھا اور ابھی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھا ہی تھا کہ اس کے قدم دوبارہ زمین نے جکڑ لیے تھے اور قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا جہاں پہ تھے وہیں پتھر بن جانا چاہتے تھے کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے اللہ نے اس کے مُردہ قالب میں روح پھونک دی ہو اس کی زندہ لاش، زندہ وجود میں تبدیل ہو گئی ہو۔

کیونکہ اس کی بے سکون اور بے آرام ساعتوں کو قرآن پاک کی تلاوت کی آواز نصیب ہوئی تھی اور یہ روح کو شانت کر دینے والی آواز مومنہ بی بی کے کمرے سے آتی ہوئی سنائی دی تھی اور نبیل کو لگا تھا کہ اس کی ذات پہ ایک سرور سا طاری ہو گیا ہو۔ وہ جو صحرا میں جل رہا تھا وہ تن من سے ٹھنڈک کے رہ گیا تھا، اس کی رگ رگ میں ٹھنڈک اتر گئی تھی اور وہ مومنہ بی بی کے کمرے کے دروازے سے نظر آتے اس تسخیر کر لینے والے منظر کو اپنی نظروں میں اتارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ سامنے قالین پہ قبلہ رخ جائے نماز بچھائے رحل میں قرآن پاک رکھے تلاوت کرنے میں مشغول تھی، بڑا سا ململ نے اپنے چہرے اور سر کے گرد ایک ہالے کی صورت میں باندھ کر دو پٹہ پورے جسم پہ پھیلا رکھا تھا وہ اپنے آپ کو کافی حد سے اور سلیقے سے ڈھانپے ہوئے تھی نبیل کو محسوس ہوا جیسے قرآن پاک کے مقدس صفحات سے روشنی اور نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں جو مومنہ بی بی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں اور مومنہ بی بی کا چہرا نور برسا رہا تھا جس پہ نبیل حیات کی نظر نہیں ٹھہر رہی تھی، وہ اسے دیکھے جا رہا تھا اور اس دیکھنے میں اسے یہ بھی پتا نہ چلا کہ تلاوت ختم ہو گئی ہے۔

جبکہ مومنہ بی بی قرآن پاک جزدان میں لپیٹتے ہوئے جھک گئی تھی، اسے خود پہ کسی کی نظروں کا احساس ہوا تھا اور اسی کے تحت اس نے گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور نظروں کے اس تصادم پہ دونوں ہی ٹھٹک گئے تھے، نبیل ہوش میں واپس لوٹ آیا تھا۔

"نبیل صاحب آپ؟" وہ یونہی رحل اور قرآن پاک سینے سے لگائے، جائے نماز سے اتر کے ننگے پاؤں کمرے میں آ رکی تھی۔

"ایم سوری..... میں ابھی اسلام آباد سے آیا ہوں، اپنے بیڈ روم میں جا رہا تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کو سن کے رک گیا۔" نبیل نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے وضاحت دی تھی۔

"آپ شرمندہ کیوں ہو رہے ہیں نبیل صاحب! میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جس پہ آپ کو شرمندگی اور کچھ خفت ہو جس پہ ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے تو میں ایک سال پہلے ہی گنوا چکی ہوں۔" مومنہ بی بی نے ذرا سی تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"پلیز..... آپ ایسا تو مت کہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔" نبیل نے اسے منع کیا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی رات بھر کا جلا ہوا تھا۔

"ہوں..... معافی چاہتی ہوں، آپ خود تھکے ہوئے آئے ہیں، میں نے خوامخواہ آپ کو پریشان کر دیا۔" مومنہ بی بی معذرت کی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ بس جو آپ کہہ رہی ہیں، وہ غلط ہے۔" نبیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"چھوڑیں نبیل صاحب! اس قصے کو رہنے دیں کہ کیا غلط ہے اور کیا نہیں؟ آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے، آپ آرام کریں، زندگی کے یہ جھمیلے تو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔" اس نے نبیل کو آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

"سنیے....." اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا شاید اس لیے کہ وہ نبیل حیات کے قدموں کی تھکن بھانپ چکی تھی۔

"جی....." وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے میں جا کے پلٹا تھا۔

"چائے پئیں گے؟" نبیل کو اس لمحے وہ رحمدل شناس لگی تھی۔

"مل جائے تو انکار نہیں۔" نبیل کو واقعی چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی، لیکن وہ اپنی ذہنی اذیت میں اس طلب اور درد کو بھی فراموش کیے ہوئے تھا۔

PRIME URDU NOVELS

"میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اندر کمرے کی طرف چلی اور قرآن پاک احتیاط سے الماری میں رکھ کر کچن میں آ گئی تھی۔ وہ پچھلے چند دنوں سے خود ہی ملازمہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ حالانکہ فائزہ بیگم اور مدیحہ نے اسے منع بھی کیا تھا لیکن وہ ایک دیہاتی اور محنتی لڑکی تھی، گھر میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتی تھی اور یہی کہہ کر اس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ دو وقت کچن کے کاموں میں بھی حصہ لے رہی تھی اور فائزہ بیگم اس کے سگھڑاپے اور طریقے سلیقے کی معترف ہو گئی تھیں۔ وہ ہر چیز میں ماہر تھی۔ اسی لیے انہیں اس کے ہاتھ کا کام پسند آیا تھا، اس کے ہاتھ میں لذت تھی، ذائقہ تھا، ہر چیز میں ماہر تھی وہ، کھانے سے لے کر چائے بنانے تک..... اور اس کا اعتراف ان سب نے کیا تھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آتے ہی اپنا کوٹ اور بریف کیس صوفے پہ ڈال کے خود بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا اور ابھی آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ رات کا منظر پھر سے آنکھوں کے پردے پہ تازہ ہو گیا تھا اور اس منظر میں اسے ممتاز حیات اس لڑکی کے چہرے سے بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے نظر آئے تھے اور نبیل نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں اور اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے بیٹھا تھا جب دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔

"کم ان....." اس نے دستک پہ سر اٹھاتے ہوئے آہستگی سے اجازت دی تھی۔

"چائے....." اس نے پاس آ کر چھوٹی سی ٹرے میں رکھا کپ اس کی سمت بڑھایا تھا۔

"تھینک یو....." نبیل نے قدرے بوجھل انداز میں کہتے ہوئے کپ اٹھا لیا تھا۔

"کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" وہ واپس پلٹتے ہوئے رکی۔

"ہوں..... ہے ضرور....." نبیل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"جی کہیے؟" وہ متوجہ ہوئی تھی۔

"مجھے نیند کی گولیوں کی ضرورت ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔" نبیل کی ضرورت سن کر معصومہ بی بی چونک گئی تھی۔

"نیند کی گولیاں؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"ہوں..... نیند کی گولیاں..... تاکہ میں سکون سے سو سکوں۔" وہ اپنی کنپٹیوں کو مسل رہا تھا۔

"لیکن نبیل صاحب! آپ تو تھکے ہوئے آئے ہیں، آپ کو تو خود بخود ہی نیند آ جائے گی، گولیاں کھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟"

"میں جانتا ہوں نیند نہیں آئے گی، آپ بس مجھے کچن سے گولیاں لا دیں۔" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"جی بہتر....." وہ اس کے موڈ کے پیش نظر فوراً پلٹ گئی تھی اور پھر اسے کچن سے گولیاں لا کر دی تھیں، جن کے بعد وہ فوراً ہی سو گیا تھا۔

♥

مریم نے کافی ڈرتے دل کے ساتھ دروازے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ کیونکہ وہ آج پہلی بار یوں اکیلی فاطمہ کے گھر آئی تھی۔ ورنہ پہلے جب بھی اس نے فاطمہ سے ملنے کے لیے آنا ہوتا تھا، عدیل اسے خود چھوڑنے جاتا تھا یا پھر فاطمہ خود ان کے گھر آ جاتی تھی۔ اس لیے مریم کو کبھی بھی یوں اکیلے آنے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن آج مجبوری اور حالات نے یہ بھی کروا ہی لیا تھا اور وہ یہاں آنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم میڈم!" چوکیدار نے پہلی بیل پہ ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

"وعلیکم السلام..... کیا فاطمہ بی بی گھر پہ ہیں؟"

"سوری میڈم جی..... فاطمہ بی بی تو بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ دبئی گئی ہوئی ہیں شاپنگ کے لیے۔" چوکیدار نے معذرت کی تھی۔

"وٹ....." مریم کے تو جیسے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ اس کی نظر میں تو یہی واحد اُمید اور آس تھی جس کے سہارے وہ عدیل کے لیے کچھ بھاگ دوڑ کر سکتی تھی، لیکن اب وہی واحد سہارا میسر نہیں تھا، تو وہ کہاں جا سکتی تھی؟ کیا کر سکتی تھی؟ اس کے اختیار میں اس کے بس میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے سب کو تسلی دے کر نکلی تھی، لیکن اب.....

"جی ہاں..... وہی....." چوکیدار نے دھیرے سے بتایا تھا۔

"کب گئی ہیں؟" اس نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی..... ایک ہفتہ پہلے۔"

"اور واپس کب آئیں گی؟" اس نے پھر ذرا سی اُمید باندھی تھی۔

"جی..... ایک ہفتہ اور لگ جائے گا۔ دو ہفتے کے لیے گئی ہیں۔" چوکیدار کے جواب پہ مریم کا رو دینے کو دل چاہا تھا۔ اس کی آس ٹوٹی تھی، آگے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، ایسے میں اسے رونا نہ آتا تو اور کیا ہوتا، وہ وہاں سے قدم گھسیٹتی ہوئی واپس پلٹی تھی۔

♥

گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور وہ گاڑی اک جھٹکے سے اندر لے آئی تھی۔ سامنے روش پہ کار کے پیچھے بنا تھا۔ ورنہ یقیناً گاڑی کے جھٹکے سے دور جا گرتا۔

"بھائی گھر پہ ہیں؟" اس نے گاڑی سے اترتے ہی استفسار کیا تھا۔

"جی میڈم! صاحب گھر پہ ہی ہیں۔" زلفی نے اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اوکے..... تھینک یو....." وہ سر ہلا کر کہتی ہوئی تیز تیز گھماتی اندر کی سمت بڑھی تھی، لیکن پھر جاتے جاتے رُکی پیچھے مڑ کے دیکھا تھا۔ زلفی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مدیحہ کے پلٹ کر دیکھنے پہ سٹپٹا گیا تھا۔

"سوری..... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی بالکل سامنے کھڑا ہوگا۔ شکر ہے تم بچ گئے۔" وہ شرارت سے مسکراتی کہتی گئی تھی اور پیچھے زلفی ایسی حسیناؤں اور ان کی اداؤں کو سوچتا اور دیکھتا رہ گیا تھا۔

"السلام علیکم بی بی جی۔" گل کچن سے نکل رہی تھی۔ مدیحہ کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو گل رانی؟" مدیحہ نے مسکرا کے پوچھا تھا۔

"جی میں ٹھیک ہوں، اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

"ہوں..... اچھی بات ہے، بھائی کہاں ہیں؟ کہیں نظر نہیں آ رہے؟" مدیحہ نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ گل نے کچن کی طرف خاموشی تھی۔

"جی..... وہ اپنے بیڈ روم میں ہیں، آپ بیٹھیے، میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔" گل نے کہتے ہوئے ذرا سا اشارہ کیا تھا۔

"تھینک یو..... تم بیٹھو، میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔" مدیحہ دلچسپی سے کہہ کر سیڑھیوں کی سمت آ گئی تھی اور اسے اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دے رہی تھی۔

"یس کم ان....." اندر سے اس کی سنجیدہ سی آواز سنائی دی تھی۔

"گڈ مارننگ....." وہ آہستگی سے دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی تھی اور وہ جو بڑے مصروف سے انداز میں تیار ہو رہا تھا، مدیحہ کی آواز سے چونک گیا تھا۔

"ارے مدیحہ! میری جان، میری گڑیا، تم یہاں۔" وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی سمت بڑھا اور بڑے والہانہ اس کا سر اور اس کے گال تھپکے تھے۔ اسے حقیقتاً مدیحہ کی آمد پہ بہت خوشی ہوئی تھی۔

"جی ہاں..... آپ کو خود تو کبھی خیال نہیں آ سکتا، اسی لیے میں نے سوچا کہ آج سنڈے ہے، آج چھاپہ مار کے پکڑے جائیں گے۔" مدیحہ کی بات پہ اس کا بجھا بجھا، بوجھل سا ذہن ایک دم فریش ہو گیا تھا اور وہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"ویسے تمہیں دیکھ کر میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ تمہیں پولیس لائن میں ہونا چاہیے تھا۔ آئے روز لوگوں کی شامت ہے۔" وہ دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔

"اُف..... ایسا سمجھتے ہیں مجھے؟" مدیحہ نے مصنوعی خفگی سے دیکھا تھا۔

"ارے..... اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں، آخر بہن ہو میری، میں اگر لوگوں کے ساتھ رعایت نہیں برتتا تو تم سے رعایت برتتی تھی؟" دل آور نے اسے وضاحت دی تھی۔

"ہاں ... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، بڑے لوگوں کو تو میرا بھی معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل چاہتا ہے سولی پہ لٹکا
"اوہ ... مدیحہ نے دانت پیسے تھے۔
"نہیں ... میں بھی یہی چاہتا ہوں، خیر چھوڑو، یہ بتاؤ ناشتہ کرو گی؟" وہ اپنے کف لنکس بند کرتے ہوئے بولا تھا۔
"اوں کوں ... اپنے بیڈ روم سے نکل کے سیدھی یہیں آئی ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔
"اوں کوں ... پھر آجاؤ نیچے، ناشتہ کرتے ہیں۔"
"چلو ... میں اپنا بیڈ روم تو دیکھنے دیں۔" مدیحہ اب بیڈ روم کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
"ضرور جائیں ابھی، مجھے اپنا بیڈ روم تو دیکھنے دیں۔" مدیحہ اب بیڈ روم کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
"میری جان! میرے بیڈ روم میں کیا رکھا ہے بھلا؟ سادہ سا تو ہے۔"
"ابھی تک اس بیڈ روم کی مالکن نہیں آئی؟ اس لیے سادہ ہے، جب وہ آئے گی تو سج جائے گا، چار چاند لگ جائیں گے

"اس بیڈ روم کی مالکن؟" وہ زیر لب دہرا کے رہ گیا تھا۔
"جی ہاں ... اس بیڈ روم کی مالکن ... میری بھابی اور آپ کی بیوی۔" مدیحہ چہک کر بولی تھی۔
"یوں ... ویسے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو دل کی مالکن ہو، وہی بیڈ روم کی بھی مالکن ہو۔" دل آور نے سر جھکا دیا۔
"وٹ ... یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" مدیحہ کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کے بیڈ روم سے نکلتے نکلتے رک گئی تھی۔
"لیکن آصل بات ہے میری جان! اندر اور باہر کے مالک الگ الگ ہوتے ہیں اور یہ ریت تو شروع سے چلی آرہی ہے، ... کے حکمران اور دلوں کے حکمران، کسی کا تن پہ اختیار اور کسی کا من پہ اختیار، مقدر کے سکندر ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے اندر اور ... ایک ہوتا ہے، صرف ایک، ورنہ بڑے بڑے بادشاہوں اور فقیروں کو بھی اس اندر اور باہر کی تقسیم میں رہتے ہوئے دیکھا ... اور یہ تقسیم انسان کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی، انسان نہ اندر کا رہتا ہے، نہ باہر کا، اور نہ ہی اپنے آپ کا ... کیونکہ کبھی من حاوی ہو جاتا ہے اور کبھی تن، کبھی من فقیر ... کبھی من بادشاہ، کبھی تن فقیر ... کبھی من بادشاہ اور اس بادشاہی اور فقیری کے چکر میں انسان نڈھال ہو جاتا ہے کیونکہ انسان بھی آخر کیا کرے؟ تن بھی اس کا اپنا اور من بھی اس کا اپنا، لیکن ان دونوں میں سے خوش کس کو رکھے؟ اندر کو ... کو فیصلہ بہت مشکل ہے یار۔" دل آور کے لہجے میں سنجیدگی اور بات میں گہرائی تھی۔ مدیحہ ٹھٹک کر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔
"باباصاحب! کیا دیکھ رہی ہو؟ ایسا کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔" دل آور نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔
"اوں ... نہیں ... کچھ نہیں۔" اس نے چونکتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔
"تو پھر چلیں ناشتہ تیار ہو چکا ہوگا۔" دل آور نے کافی بشاشت کا مظاہرہ کیا تھا۔
"چلیے ..." وہ بمشکل ہی کہہ سکی اس کے ساتھ نیچے ڈائننگ روم میں آگئی تھی اور دل آور نے خود کرسی پہ بیٹھنے سے پہلے مدیحہ کی سائیڈ پہ آکر اسے کرسی نکال کے پیش کی اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود جا کر اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔
"اس گھر میں آج دوسری بار میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر رہا ہوں، پہلے اماں کے ساتھ اور آج تمہارے ساتھ، ورنہ ہمیشہ کیلئے ہی اپنی تنہائی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا ہے۔" دل آور کا لہجہ عجیب سا اور بجھا بجھا تھا، مدیحہ نے ذرا ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔
"تو آپ ماں کو کیوں نہیں لے آتے؟ وہ بھی اکیلی رہ رہی ہیں اور آپ بھی۔"
"مدیحہ! اماں ہے بے شک ہمارا آبائی شہر ہے، لیکن پھر بھی یہ شہر ہمیں کبھی راس نہیں آیا اور وہ یہاں آکر مزید کچھ کھونا نہیں

"بھئی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟" مدیحہ نے بمشکل خود کو یہ سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا تھا۔
"ہاں ... پوچھو۔" اس نے سنجیدگی سے اجازت دی تھی۔
"ڈیا کی ڈیا تھی کیسے ہوئی تھی؟ مرڈر سے یا ...؟" مدیحہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا اور سوال بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا لیکن ... یہ سوال دل آور کی پوری ہستی کو دھواں دھواں کر کے رکھ گیا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت پہ لہو رنگ حاوی ہو گیا تھا۔ لیکن ... مدیحہ تھی اور اسے خود کو کنٹرول کرنا ہی تھا اور اس کے سوال کا جواب بھی دینا تھا۔ کیونکہ وہ سب کو ٹال سکتا تھا، لیکن اسے نہیں۔
"سوسائڈ سے ..." اس نے صرف اتنا سا لفظ ادا کرنے کے لیے بمشکل اپنے جبڑے کو حرکت دی تھی۔

''سوسائٹ سے.....'' مدیحہ ششدر سی رہ گئی تھی، کیونکہ وہ شروع سے ہی یہ سمجھتی آ رہی تھی کہ دل آور بھائی کے مزاج سے ہوئی تھی۔ سوسائٹ کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی کبھی یہ سوال پوچھنے کی ہمت کر پائی تھی، مگر آج شاید بلا ارادہ ہی یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

''خیر چھوڑو اس بات کو..... تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ کوئی خاص ریزن۔'' دل آور نے بڑی جلدی خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''میں یہاں کیوں آئی ہوں؟'' مدیحہ نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں یاد آیا میں یہاں کسی خاص ریزن سے آئی ہوں۔'' مدیحہ بھی دل آور کی خاطر اس موضوع سے نکل آئی تھی۔

''ہاں بولو..... میں سن رہا ہوں۔'' وہ پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا۔

''وہ ان فیکٹ میں جب سے پاکستان آئی ہوں، میں نے ایک بار بھی ٹھیک سے شاپنگ نہیں کی، اس لیے میں نے میں ہمیشہ نبیل بھائی کی جیب سے شاپنگ کرتی ہوں، کیوں نہ آج یہ شاپنگ آپ کی جیب پہ ڈال دوں؟'' مدیحہ نے شرارت تھا۔

''ہوں..... شاپنگ..... ویسے کتنے میں ہوگی یہ شاپنگ؟ پانچ، دس ہزار کافی ہیں نا؟'' دل آور نے سنجیدگی سے استفسار

''واٹ..... پانچ، دس ہزار؟ اس سے زیادہ تو آل ریڈی میرے بیگ میں موجود ہیں۔'' مدیحہ چیخ اٹھی تھی۔

''بھائی صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں صرف سیٹھ نبیل حیات کی بہن نہیں ہوں، بلکہ بیرسٹر دل آور بھی بہن ہوں اور اس لحاظ سے میرے بیگ میں رقم بہت کم ہے۔ میرے بیگ کو تھوڑا اور وزنی ہونا چاہیے، مجھے بہلانے کی مت کریں۔'' وہ تنک کر بولی تھی۔

''اوکے..... اوکے..... نہیں بہلاتا، یہ بتاؤ کہ کتنے پیسے لو گی؟ بلکہ میرے ساتھ طے کر لو، میں تمہیں ماہانہ پاکٹ منی جیسے نبیل دیتا ہے اور ان شاء اللہ نبیل سے زیادہ ہی دوں گا، تمہیں کبھی مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔'' دل آور نے آفر دی تھی۔

''نہیں..... میں نے پیسے نہیں لینے، میں نے شاپنگ کرنی ہے بس۔'' مدیحہ اس کی آفر پہ بھڑک گئی تھی۔

''ارے، بس کیوں؟ تم پیسے بھی لو اور شاپنگ بھی کرو، تم مجھ سے مانگا کرو، مجھ سے چھینا کرو، مجھے خوشی ہوگی مدیحہ کوئی اپنا ہے، مجھ پہ حق جتانے والا اور میری کمائی کو خرچ کرنے والا میں مہینے میں لاکھوں کماتا ہوں، لیکن انہیں خرچ کرنے بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔'' کہتے کہتے وہ پھر سے افسردہ اور بوجھل سا ہو گیا تھا، لیکن مدیحہ نے اسے زیادہ دیر اداس نہیں تھا۔

''ارے..... کیوں نہیں بھائی! میں ہوں نا آپ کے پیسے خرچ کرنے والی، بس آپ میرے ساتھ چلیں۔''

''ساتھ؟'' دل آور چونک گیا تھا۔

''ہاں ساتھ..... میں آج یہ شاپنگ آپ کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں، آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' صاف انکار کر دیا تھا۔

''تو..... میں شاپنگ کے لیے پیسے دے سکتا ہوں، مگر ساتھ نہیں جا سکتا۔'' دل آور نے بس گردن ہلائی تھی۔

''تو ٹھیک ہے آپ اپنے پیسے بھی اپنے پاس رکھیں، میں نہیں لوں گی، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے پیسوں کی نہیں صرف پیسے ہی لے کر شاپنگ کے لیے جانا ہوتا تو مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اکیلی بھی جا سکتی تھی۔'' وہ خفا ہوتی کرتے ہی کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''سوری میری جان! میں فارغ نہیں ہوں، مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے، تمہارے ساتھ پھر کبھی چلا جاؤں گا۔'' نے بچنا چاہا تھا۔

''اوکے..... آپ جائیں اپنے ضروری کام سے، میں آپ کو روک تو نہیں رہی۔'' اس نے کندھے اچکائے تھے۔

''مدیحہ پلیز..... سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''سمجھ چکی ہوں، سب سمجھ چکی ہوں، آپ بے فکر رہیں، دوبارہ نہیں کہوں گی آپ کو۔'' اس نے یونہی ناراضی سے کہتے

چکا تھا۔

"لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟" دل آور نے جلدی جلدی ناشتہ ختم کیا اور نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"واپس اپنے گھر۔" اس کے لہجے میں ہنوز ناراضی تھی اور دل آور اس کی ناراضی نہیں سہہ سکتا تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"اچھا، چلتا ہوں۔" وہ اسے کہہ کر اپنا موبائل اور والٹ لینے کے لیے چلا گیا تھا اور مدیحہ پیچھے کھڑی اپنی فتح مندی پہ مسکرا رہی تھی۔

♥

"کیا بات ہے ثروت! کیوں پریشان ہو؟" اسرار آفندی بیوی کے چہرے کی پریشانی بھانپ چکے تھے، وہ کافی دیر سے بیڈ سے ٹیک لگائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ٹی وی دیکھتے اسرار آفندی نے پوچھ لیا تھا۔

"میں اپنے بیٹوں کی طرف سے پریشان ہوں، جن پہ آپ نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا، کبھی غور ہی نہیں کیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں؟" ثروت بیگم تو جیسے ان کے پوچھنے کے ہی انتظار میں تھیں، فوراً شروع ہو گئی تھیں۔

"کیا مطلب کہ بیٹوں کی طرف سے پریشان ہوں؟ کیا ہوا ہے آخر؟" انہوں نے ٹی وی کا والیوم کم کر دیا تھا۔

"آذر کو دیکھا ہے آپ نے؟ عجیب قنوطی سا ہو گیا ہے۔ سیدھے طریقے سے بات ہی نہیں کرتا۔ جب سے حویلی میں منصور حسین اور وہ طیبہ والا مسئلہ ہوا ہے، تب سے یوں دیوانہ بنا پھر رہا ہے، اس کے کہیں آنے کی خبر ہے، نہ جانے کی، پہلے تو وہ کبھی کبھی کہتا تھا۔" ثروت بیگم کے لہجے میں پریشانی ہلکورے لے رہی تھی اور اسرار آفندی گہری سانس کھینچ کے رہ گئے تھے۔

"ہوں... جانتا ہوں، وہ بہت اپ سیٹ لگ رہا ہے آج کل..... لیکن ہم سب کیا کر سکتے ہیں اب؟ وہ مسئلہ ہی کچھ ایسا رونما ہوا ہے کہ سب کے سب ڈسٹرب ہو کے رہ گئے ہیں۔" اسرار آفندی کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا۔

"سب کے سب نہیں۔ وہ کچھ زیادہ ہوا ہے، اس نے زیادہ اثر لیا ہے، باقی سب روٹین پہ آ گئے ہیں، صرف وہی ہے جو ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا ہے، سب کام کرتا ہے پھر بھی لگتا ہے کہ وہ اندر سے منجمد ہے، پگھل نہیں رہا۔" اسرار آفندی خود بھی فکر مند ہو رہے تھے لیکن ثروت بیگم کی پریشانی دیکھتے ہوئے انہیں انہیں ان کی ہمت بندھانی پڑی تھی۔

"ایسا پریشان مت ہو۔ ان شاء اللہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت خود بہت بڑا مرہم ہے۔ گہرے سے گہرا زخم بھی مندمل کروا دیتا ہے۔ اس حویلی کی عزت و غیرت پہ زخم ابھی تازہ ہے اور تازہ زخم ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے درد دیتا ہے، تکلیف دیتا ہے اور آذر بھی آج کل اسی تکلیف سے گزر رہا ہے، جودت، زین اور حماد وغیرہ ابھی نا سمجھ اور لاابالی دور سے گزر رہے ہیں، وہ اس زخم کی گہرائی کو اور اس زخم کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن آذر بہت حساس اور سمجھدار لڑکا ہے، وہ اس زخم کی گہرائی سے نکل ہی نہیں رہا مگر ہے فکر رہو وقت خود بخود ہی اسے ذمہ داری کی طرف موڑ دے گا۔ نارمل ہو جائے گا وہ بھی..... مگر وقت لگے گا، بس تم حوصلہ رکھو۔" اس نے ثروت بیگم کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"لیکن اسرار! ہمیں اب اولاد کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے، یوں سب کچھ وقت کے دھارے پہ چھوڑ دینا بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا؟" ثروت بیگم خاصی متفکر اور پریشان ہو رہی تھیں۔

"کیا سوچنا چاہیے؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ اب پوری طرح سے متوجہ ہو چکے تھے۔

"آذر کی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"آذر کی شادی؟ مگر ثروت یہ سب کیسے ممکن ہے؟ حویلی کے حالات تو تم خود ہی جانتی ہو، ایسے حالات میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" اسرار آفندی کو ان کی بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔

"حویلی کے حالات اب کبھی پہلے جیسے نہیں ہو سکتے اسرار! اب جو بھی کرنا ہے ہم نے انہیں حالات میں کرنا ہے، جوان اولاد کو ان کو اپنے اپنے کھونٹے سے باندھ دینا چاہیے، میں نے کومل کے لیے سوچا ہے۔ آذر کی دلہن وہی بن سکتی ہے، گھر کی بیٹی ہے، دیکھی

بھائی ہے، اس کے ساتھ کھڑی اچھی لگے گی، آپ کا کیا خیال ہے؟" ثروت بیگم نے اپنی بھائی اور ان کی بیٹی کا نام سنا لیکن اسرار آفندی سوچ کے رو گئے تھے۔

"ہمارے خیال اللہ نے رد کر دیے ہیں، ہم اب کیا کر سکتے ہیں بھلا؟" اسرار آفندی کے خیال میں علیزے کی شبیہ ان کے ذہن میں جب بھی بہو کا خیال آتا تھا تو علیزے کا تصور ہی ذہن کے پردے پہ اُجاگر ہوتا تھا لیکن اب وہ کیا کر سکتے سب کچھ آئٹ ہو گیا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں اسرار! کیا آپ کو اچھا نہیں لگا؟"

"نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔ بس کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے آدرے ضرور پوچھ لینا، زندگی اس کی ہے، کرنی ہے، آخری فیصلہ بھی اسی کا ہونا چاہیے۔" اسرار آفندی نے گہری سانس کھینچتے ہوئے ٹی وی آف کر کے ریموٹ ثروت بیگم شوہر کی اُداسی اور دلگرفتگی دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

♥

"مدیحہ..... دل آور نے شاپنگ بال کی پارکنگ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالتے ہوئے اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی پکارا تھا اور وہ چونک گئی تھی۔

"جی بھائی.....؟" وہ اس کی اتنی زیادہ سنجیدگی پہ ذرا پریشانی سے متوجہ ہوئی تھی۔

"مجھے ایک بات تو بتاؤ" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

"جی پوچھیے۔" مدیحہ کا دل بُری طرح سے دھڑک اُٹھا تھا۔

"تم نے آج مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے۔" دل آور کا اشارہ آج کی شاپنگ کی طرف تھا اور مدیحہ اس کی بات سمجھتے ہی کھلکھلا اُٹھی تھی۔

"یہ سزا ہے؟" وہ شرارت سے چھیڑنے والے انداز میں پوچھ رہی تھی، کیونکہ اس نے واقعی آج اسے خوب تنگ کیا تھا۔

"یہ سزا نہیں تو اور کیا ہے؟ صبح ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلے تھے اور اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں۔" دل آور نے اپنی گھڑی سامنے کی تھی۔

"اُفف بھائی! ایک گھنٹہ تو آئس کریم کھانے اور لنچ کرنے میں ہی لگ گیا تھا۔" وہ خفگی سے جھنجلا کے بولی تھی۔

"اور باقی کے ساڑھے چار گھنٹے....." دل آور نے گھور کے دیکھا تھا۔

"ڈونٹ وری بھائی! آج آپ یہی سوچیے گا کہ آپ نے آج کا دن میرے نام کر دیا ہے۔" وہ لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے چہکی تھی۔

"وہ تو کر ہی دیا ہے اب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھلا؟" دل آور نے تپ کے کہا تھا۔

"بھائی....." مدیحہ اس کے انداز پہ چیخ اُٹھی تھی اور دل آور بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔ بے شک مدیحہ نے اسے آج ساتھ بہت خوار کیا تھا لیکن پھر بھی مدیحہ کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور باتوں میں اس کا دن اچھا گزر گیا تھا۔ حالانکہ مدیحہ نے والٹ اچھا خاصا خالی کیا تھا، لیکن اسے پھر بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ مدیحہ کے ساتھ اتنے عرصے بعد ٹائم گزار کے اسے بہت اچھا لگا تھا اور یونہی اس کی کسی بات پہ ہنستے ہوئے دل آور کی نظر چائنہ ورکشاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے چونک گئی تھی اور اس نے اسپیڈ کم کرتے ہوئے ایک سائیڈ پہ بریک لگا دیے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ گاڑی کو بیک کرتے ہوئے ورکشاپ کے عین سامنے روکا تھا۔

"ارے..... یہاں کیا ہوا ہے؟" وہ تشویش سے کہتا گاڑی سے نیچے اُتر آیا اور اس کو نیچے اُترتے دیکھ کر مدیحہ بھی چونک گئی تھی، کیونکہ چائنہ ورکشاپ کے بورڈ پر اس کی اب نظر پڑی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے اور دھواں نظر آ رہا تھا، مدیحہ کو یہ سب دیکھ کر بہت زیادہ پریشانی ہوئی تھی اور پریشانی تو دل آور کو بھی ہوئی تھی جو گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

"السلام علیکم! کیا ہوا ہے یہاں؟" دل آور کی آواز پہ ایس ایچ او جمال احمد اور وہاں کھڑے باقی افراد نے چونک کے

PRIME URDU NOVELS

"وعلیکم السلام شاہ صاحب! آپ یہاں؟" ایس ایچ او جمال احمد نے سب کو چھوڑ چھاڑ کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

"میں یہاں سے گزر رہا تھا تو لوگوں کا یہ ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ کیا ہوا ہے آخر؟" اس نے ورکشاپ کی تباہ کن حالت دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"اس وہ تین روز پہلے ورکشاپ میں آگ لگ گئی تھی، تین گاڑیوں کا نقصان ہوا ہے۔ اس لیے گاڑیوں کے مالکوں نے ہنگامہ کھڑا کیا ہے اور ادھر باؤ امتیاز کا شیری سب کچھ ایک لڑکے پہ ڈال کے خود صاف دامن بچا رہے ہیں۔" ایس ایچ او جمال احمد نے اسے ساری پوزیشن بتائی تھی اور دل آور لڑکے کے ذکر پہ ٹھٹکا تھا۔

"کس لڑکے پہ.....؟"

"وہی جسے باؤ امتیاز نے سارے ورکشاپ کا انچارج بنا رکھا تھا۔ عدیل عمر نیازی....." ایس ایچ او جمال احمد نے اس کا پورا نام بتایا تھا۔

"اوہ..... عدیل عمر؟" دل آور کو سن کر افسوس ہوا تھا۔ عدیل کے ساتھ تو اس کی دو، تین مرتبہ ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

"کہاں ہے وہ؟" دل آور نے مزید استفسار کیا تھا۔

"تھانے میں..... وہ تو اسی رات گرفتار ہو گیا تھا۔ ایس ایچ او جمال احمد کو بھی جیسے اس کی گرفتاری کا افسوس تھا۔

"کون سے تھانے میں؟" اس کا لہجہ پُرسوچ تھا۔

"سٹی تھانے میں....." ایس ایچ او جمال احمد چھوٹے (شہریار) سے عدیل کے حالات کا سارا قصہ سن چکے تھے اسی لیے وہ باؤ امتیاز کے اس اقدام کے خلاف تھے اور اس وقت اپنی نگرانی میں ساری انکوائری دوبارہ کروا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے کار ایس ایچ او صاحب! اس وقت چلتا ہوں میں، آپ سے تھانے میں ہی ملاقات ہو گی اب۔" مدیحہ کا خیال آتے ہی دل آور کو مزید وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور ایس ایچ او جمال احمد سے ہاتھ ملا کر وہاں سے پلٹ آیا تھا لیکن اس کو واپس جیپ کی طرف آتا دیکھ کر وہ لڑکا جسے پکڑے چھوٹے کا ستکہ ٹوٹ گیا تھا، وہ حواسوں میں لوٹتے ہی دل آور کے پیچھے بھاگا تھا اور جب تک دل آور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"سر..... سر..... بات سنیے پلیز۔" وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔ دل آور چونک کے پیچھے پلٹا تھا۔

"اوہ..... تم؟" دل آور کو اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔

"سر..... میں..... لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو تب..... تو آپ شاید منصور حسین.....؟" چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ دوانتے ہوئے آدمی کے سامنے بے ربط سا ہو گیا تھا وہ غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ کافی دیر سے دل آور کو بار بار دیکھ رہا تھا اور بار بار غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو بہو منصور حسین تھا۔ بس چہرے پہ داڑھی اور عام سے سادہ سے لباس کی کمی تھی، کیونکہ اس وقت جو آدمی اس کے سامنے موجود تھا اس کا چہرہ داڑھی وغیرہ سے صاف تھا اور لباس بھی قیمتی تھا۔ البتہ چال ڈھال تو پہلے بھی شاہانہ تھی اور اب بھی شاہانہ تھی۔

"نہیں..... تم غلطی پر نہیں ہو۔ میں ہی منصور حسین ہوں..... لیکن میرا اصل نام دل آور شاہ ہے..... البتہ کورٹ کچہریوں میں لوگ مجھے دل آور شاہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس لیے اب تم بتاؤ کہ تم نے کس نام سے جانا ہے؟" وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا اور چھوٹے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"یہ سٹرل آور شاہ؟" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔

"خیر چھوڑو..... یہ وقت نہیں ہے زیادہ باتوں کا..... یہ میرا کارڈ رکھ لو، کل مجھ سے ملنا، ان شاء اللہ عدیل جلدی باہر آ جائے گا۔" دل آور نے اپنے والٹ سے کارڈ نکال کر اسے تھمایا تھا اور چھوٹے کے چہرے پہ خوشی اور بے یقینی کے رنگ دوڑ گئے تھے۔

"تھینک یو سر! تھینک یو سو مچ۔" چھوٹے نے بڑے پُرجوش انداز اور ممنون لہجے میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"ہوں..... لگتا ہے کہ تم بھی صرف باہر کے منصور حسین ہو..... ورنہ اندر سے تم بھی کچھ اور ہی ہو؟" دل آور کا اشارہ اس کے ہاتھ لکھے ہونے پہ تھا۔

"سر! آپ کو تو پتا ہی ہو گا کہ کوئی بھی منصور حسین نہیں بنتا۔ دُنیا بنا دیتی ہے۔" چھوٹے کا لہجہ خاصا گہرا تھا۔

''گڈ..... تمہاری اس بات پہ انعام ہونا چاہیے تھا، لیکن میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں، میرے ساتھ میری کزن گھر ڈراپ کرتا ہے، اس لیے تمہارا انعام اُدھار رہا، ان شاء اللہ جلدی دوں گا، میں کسی کا اُدھار نہیں رکھتا۔ پھر ملاقات ہو گی حافظ۔''

دل آور نے چھوٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اُمید دلائی تھی اور پھر گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر جھانکتا اور یونہی دل آور کو دیکھتے دیکھتے چھوٹے کی نظر فرنٹ سیٹ کی سمت اٹھی تھی اور وہ مدیحہ کو دیکھ کر ایک بار پھر ششدر رہ گیا تھا۔

''وہ دل آور شاہ کی بہن ہے؟'' یہ انکشاف ہی اس کا دماغ ہلا کے رکھ گیا تھا اور دوسری طرف مدیحہ کا بھی بُرا حال تھا۔ دن بھر کی خوشی غارت ہو چکی تھی۔ عدیل عمر جیل میں ہے؟ یہ احساس اسے بے چین و بے کل کر گیا تھا۔

''کیا بات ہے میری جان! تم کیوں چپ ہو گئی ہو؟'' اس نے موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں، بس تھک گئی ہوں۔'' اس نے چہرہ جھکا لیا تھا اور پھر دل آور نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا تھا اور اسپیڈ تھی۔

♥

''زری..... زری..... تمہارے لیے گڈ نیوز ہے یار۔'' نگارش اندر سے تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی اور باہر لان چیئر زری نگارش کے اتنے جوش و خروش پہ یکدم چونک گئی تھی۔

''میرے لیے گڈ نیوز؟'' زری نے ذرا حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''ہاں..... ایک نہیں بلکہ دو، دو گڈ نیوز ہیں۔'' نگارش تو جیسے کھلی پڑ رہی تھی۔

''بتائیں نا؟ کیسی گڈ نیوز ہیں؟'' زری کو تجسس ہوا تھا۔

''پہلے اپنے ان خوبصورت ہاتھوں سے یہ تازہ تازہ مالٹے چھیل کر نمک لگا کر پلیٹ میں سجا کے پیش کرو تو پھر سنائی گڈ نیوز۔'' نگارش اسے تنگ کرنے کے لیے اطمینان سے کہتی اس کے مقابل چیئر پہ بیٹھ گئی تھی اور زری اس کی فرمائش پہ حیرت دیکھنے لگی تھی۔

''ایسی بھی کیا بات ہے کہ پہلے میں آپ کی خوشامد کروں اور پھر بات سنوں؟'' اس نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔

''بس ایسی ہی کوئی بات ہے اور اس بات کے لیے تمہیں میری یہ خوشامد کرنا ہی پڑے گی۔'' نگارش اپنی فرمائش سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی اور زری چند سیکنڈز یونہی دیکھتی رہی، پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں سامنے ٹیبل پہ رکھی باسکٹ میں سے مالٹے چھیلنے لگی تھی، پھر ان کو کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کے نگارش کے سامنے پیش کر دیا تھا اور نگارش اپنے سامنے رکھی پلیٹ دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

''تو میری پیاری نند اور پیاری بہن تمہارے لیے گڈ نیوز یہ ہے کہ تمہاری بتول آنٹی لاہور آ رہی ہیں، وہ بھی صرف تمہارے لیے، تم سے ملنے کے لیے، ابھی ابھی ان کا فون آیا تھا۔'' نگارش کی بات پہ زری کے چہرے پہ ایک پل کے لیے خوشی کا رنگ معدوم پڑ گیا تھا۔

''کیا بات ہے زری! تمہیں خوشی نہیں ہوئی سن کر۔'' نگارش کو زری کی طرف سے کوئی بھی ردعمل نہ پا کر حیرت ہوئی تھی۔

''خوشی؟ کیسی خوشی بھابی! جب بتول آنٹی کا بیٹا ہی مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوتا تو مجھے بتول آنٹی سے مل کر کیسے خوشی کس رشتے کے حوالے سے؟ آخر خوش ہونے کے لیے کوئی رشتہ یا کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے نا؟ بلاوجہ خوش ہونا بیوقوفی ہی تو ہے۔'' زری کافی تلخ ہو رہی تھی اور نگارش چونک گئی تھی۔ اسے دل آور اور زری کی ملاقات کا تو پتا تھا، لیکن ملاقات میں ہونے والی بات نہیں پتا تھا۔

''کیوں..... بتول آنٹی کا بیٹا کیوں خوش نہیں ہوتا؟ اسے کیا ہوا ہے؟'' نگارش اُلجھن بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''ہونہہ..... یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ وہ زری سے مل کر خوش کیوں نہیں ہوتا؟'' زری کے لہجے کی تلخی ہنوز تھی۔

''ارے نہیں یار! اب وہ اپنی خوشی کا اظہار سب کے سامنے صاف کھل کر تو نہیں کر سکتا نا؟'' نگارش کی وہی تسلیاں تھیں۔

''سب کے سامنے نہ سہی، مگر میرے سامنے تو کرے نا؟'' زری اس کی تسلیوں پہ جھنجلا گئی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہی بار اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے قابل ہوں؟" پھر ایک تسلی اور پھر ایک خوش فہمی۔" زری نے سر

"چھوڑیں..... آپ دوسری گڈ نیوز سنائیں؟ وہ کیا ہے؟" زری نے اس بات کو سمیٹ دیا تھا۔

"نہیں پہلی پہ خوشی نہیں ہوئی تو دوسری پہ کیا ہوگی؟" نگارش کا جوش بھی دھیما پڑ چکا تھا۔

"یہ تو گڈ نیوز پہ ڈپینڈ کرتا ہے کہ وہ کس کو کتنا خوش کرتی ہے؟ اگر کوئی نیوز سن کر کوئی خوش ہو جائے تو سمجھ جائیں کہ وہ واقعی گڈ نیوز ہے۔" زری نے اسے گڈ نیوز کی پہچان بتائی تھی۔

"او کے..... مان لیتی ہوں۔ البتہ دوسری گڈ نیوز یہ ہے کہ ملک حق نواز کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ معوذہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں جیل جا چکا ہے۔" یہ گڈ نیوز نگارش نے بہت نارمل سے انداز میں سنائی تھی، جبکہ زری اُچھل کے رہ گئی تھی۔

"واٹ..... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" اسے تو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم سن چکی ہو؟" نگارش نے کندھے اچکائے تھے۔

"لیکن بھابی! اسے..... اسے اریسٹ کس نے کروایا ہے؟" زری کو اشتیاق ہو رہا تھا یہ جاننے کا کہ یہ سب کس کا کارنامہ ہے؟

"ہمی نے جو زری سے مل کر خوش نہیں ہوتا۔ وہی بتول آنٹی کا بیٹا۔" نگارش نے لاپروائی سے بتایا تھا۔

"ایسا کارنامہ بتول آنٹی کا بیٹا ہی کر سکتا ہے بھابی! اور کوئی نہیں۔" زری کو پل بھر کے لیے اس پہ فخر ہوا تھا۔

"او..... تو اب اچھا لگ رہا ہے؟" نگارش نے اسے گھورا تھا۔

"اچھا نہیں بھابی! پیارا کہو..... پیارا لگ رہا ہے۔" زری کو ملک حق نواز کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

"اور اگر ملک حق نواز پھر جیل سے باہر آ گیا تو؟" نگارش نے چھیڑا تھا۔

"تو جس نے ایک بار اسے جیل بھجوایا ہے وہ دوبارہ بھی بھیج سکتا ہے۔" زری کا موڈ کچھ بہتر ہو چکا تھا۔

"تو تم لوگ اسے جیل ہی بھیجتے رہو گے؟" نگارش نے مذاق اُڑایا تھا۔

"وہ ہے ہی جیل بھیجنے کے لائق..... ساری عمر جیل کی چکی میں بند رہے تو بھی کم ہے۔" زری غصے اور نفرت سے مٹھیاں بھینچے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اور عبداللہ اسی فیملی سے ہو جس فیملی سے ملک حق نواز یا پھر ملک اسد اللہ ہیں، مجھے تم لوگوں کے علاوہ باقی ساری فیملی سے بہت خوف آتا ہے، بہت بے رحم لگتے ہیں سب۔" نگارش نے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، لیکن اپنے خیالات کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

"ہم جیسا کوئی اور بھی تھا بھابی! جو اس فیملی سے نہیں لگتا تھا، جو بے رحم اور سنگ دل نہیں تھا، جو عیاش اور بدکردار نہیں تھا، جو اس فیملی میں سب سے اچھا تھا اور وہی اس فیملی کو سب سے پہلے چھوڑ گیا۔" زری کا خیال اور سوچیں بہت پیچھے چلے گئے تھے اور دل سے ایک ٹھنڈی آہ اُبھری تھی۔

"کون..... کس کی بات کر رہی ہو؟" نگارش نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"چچا جاہت علی کی بات کر رہی ہوں، بس اب تو ان کے دھندلے دھندلے سے نقش بھی ذہن کی سلیٹ سے مٹ گئے ہیں۔ تقریباً بیس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا، اس وقت تو میں تھی بھی چھوٹی سی، لیکن مجھے یاد ہے وہ بہت پیار کرتے تھے ہم سے..... مجھ سے بھی اور عبداللہ بھائی سے بھی۔" زری کا لہجہ پرانی یادوں کے ذکر سے بوجھل ہو گیا تھا۔

"انکل کے اپنے کتنے بچے تھے؟" نگارش بھی سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"تین..... دو بیٹے اور ایک بیٹی۔" زری آہستگی سے بولی تھی۔

"تو تم لوگ ان سے ملتے کیوں نہیں ہو؟ وہ کزن ہیں تمہارے، خون کا رشتہ ہے ان سے۔" نگارش نے تعجب سے کہا تھا۔

"وہ جب ہم سے بچھڑے تھے تو بابا جان نے ان پہ واپسی کے اور ان سے ملنے کے سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ سب کچھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا انہوں نے۔" وہ اُداس ہو چکی تھی۔

"انہوں نے تو تم لوگوں پہ بھی واپسی کے دروازے بند کر دیے ہیں اور میرا خیال ہے اب چچا جاہت علی کے بچوں کو اور تم

لوگوں کو مل کر ایک ساتھ ہو جانا چاہیے۔'' نگارش نے ایک نیا مشورہ دیا تھا۔

''ہمیں کیا پتا کہ اب وہ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں اور وہ ہمارے بارے میں کیسا سوچتے ہیں؟'' فرشتہ نے سر ہلایا تھا۔

''کیوں..... تمہاری چچی نے کیا دوسری شادی کر لی تھی؟'' نگارش سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کچھ پتا نہیں، ان کی بعد کی لائف کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، انہوں نے شادی کی یا نہیں کی؟ کچھ علم نہیں۔'' زری نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

''لیکن یار! یہ سب جاننا کچھ مشکل تو نہیں ہے؟ آج کل انٹرنیٹ کے دور میں گھر بیٹھے ہی سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔'' نگارش کے کہنے پہ زری محض سر ہلا کے رہ گئی تھی اور دل بے طرح اُداس ہو چکا تھا۔

♥

اس کے چہرے پہ دو آنکھیں نہیں تھیں، دو زخم تھے۔ ایسے زخم جن سے آنسوؤں کی جگہ خون رس رہا تھا اور اب تو وہ بھیگی بھیگی تھی تو درد ہوتا تھا اور اس درد کی اذیت سے بچنے کے لیے وہ پلکیں جھپکنے کے بجائے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی اور دایاں بازو کلائی اپنے چہرے پہ رکھی ہوئی تھیں کہ اس کی آنکھیں کہیں غلطی سے بھی جھپکنے کی اور حرکت کرنے کی گستاخی نہ کریں، آخر وہ کب سے مسلسل رو رہی تھی اور آنکھوں کا حشر ہو چکا تھا۔ کل بھی کافی دیر سے نہیں آئی تھی اور وہ خود بھی کافی دیر سے یونہی بے حس سی پڑی ہوئی تھی۔ یوں سیدھے لیٹے لیٹے پورا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ نیچے فرش پہ بچھے فوم کے گدے کے باوجود فرش کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی، مگر پھر بھی وہ وہاں سے اُٹھی نہیں تھی۔

لیکن ایک خیال تھا..... بہت منہ زور..... اور بہت تیز رفتار..... ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا اور وہ یکدم اُٹھ کر بیٹھی اور پھر اس سے اس قدر سمت میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ننگے پیر باہر کو بھاگی تھی۔ اس کے لیے ایک آسانی تھی کہ لیونگ کا دروازہ اکثر کھلا ہی رہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل آور کو پورا یقین تھا کہ وہ کبھی بھی کہیں بھاگ نہیں سکتی۔ شک وہ اپنے گھر کا گیٹ بھی کھلا چھوڑ کے چلا جائے تو وہ نہیں بھاگے گی اور یہ بھی سچ ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ بھاگ نہیں رہی تھی بس یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش کے لیے اسے چند سیکنڈز میں ہی بہت زیادہ محنت کرنی پڑی تھی۔

وہ بڑے تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی اور دل ہی دل میں دُعا کر رہی تھی کہ کسی سے بھی سامنا نہ ہو اور ایسا ہی ہوا۔ وہ گل وغیرہ کی نظروں سے بچتی ہوئی اوپر آ گئی تھی۔ اسے دل آور شاہ کے بیڈ روم میں جانا تھا، لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا بیڈ روم کون سا ہے؟ اس نے سامنے نظر آنے والے بیڈ روم کے دروازوں کے ہینڈل گھما کے دیکھے تھے جو کہ لاک تھے اور رشتہ ازدواج سے لاسٹ والے بیڈ روم کا لاک اوپن ملا تھا۔ اس نے آہستگی سے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا تھا۔ جس پہ علیزے کا کالی بلی میں دھڑکنے لگا تھا اور ماتھے پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ وہ پہلی بار..... زندگی میں پہلی بار ایسی چوروں والی حرکت کر رہی تھی تب ہی اس کا بُرا حال تھا۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے لیکن اب وہ واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اب اسے دل آور شاہ کے آنے سے پہلے کچھ تلاش کرنا تھا۔ جس کے لیے اسے مزید ہمت کرنا پڑی اور وہ اندر آ گئی تھی۔

نفاست سے سجا خوبصورت اور نسبتاً سادہ سا بیڈ روم اس کے سامنے تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی تیزی سے الماری کی طرف بڑھی تھی اور الماری کے پٹ اس نے چوپٹ کھول دیے تھے اور کافی عجلت میں اس کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرنے لگی تھی۔ پھر اس کی نظر اس کے بریف کیس کی سمت اُٹھی تھی اور اس نے اک جھٹکے سے وہ بریف کیس بھی الماری سے نکال لیا تھا اور اسے بیڈ پہ رکھ کر اس کے نمبر پریس کرنے لگی تھی، لیکن وہ کھل نہیں ہو رہے تھے۔ وہ بار بار کوشش کر رہی تھی، لیکن ہر بار ناکامی ہی ہو رہی تھی۔

''ون زیرو ون پریس کرو۔ کھل جائے گا۔'' علیزے کا اس کی آواز پہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ دل آور کی آواز نے اس کی روح کھینچ لی تھی۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

♥

اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ اور وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت سی اپنی جگہ پہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

دل کی رگوں میں دوڑتا لہو بھی جیسے منجمد ہو چکا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک برف کی مانند ٹھنڈی پڑنے لگی تھی۔ کیونکہ خود سے سرزد ہونے والی خطا اور دل آور شاہ کی طرف سے ملنے والی سزا کے بارے میں سوچ کر ہی اس کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

"بولو نا کیا ہوا؟ کھولو نا..... نمبر بالکل کریکٹ بتایا ہے میں نے..... پریس کرو..... فوراً کھل جائے گا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ کھولو نا..... نمبر بالکل کریکٹ بتایا ہے میں نے..... پریس کرو..... فوراً کھل جائے گا۔"

وہ اس کی حالت سے بے خبر لاپروائی سے کہتا اپنے پیچھے دروازے کا بولٹ چڑھا کر قدم پہ قدم چلتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور وہ اسے دروازے کا لاک لگا کر اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر اور زیادہ خوفزدہ ہو گئی تھی، وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بمشکل قدم اٹھاتی اس سے دور رہنے کے لیے پیچھے ہٹنے لگی تھی، وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور وہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ بیڈ روم کی کشادگی ان دونوں کے قدموں میں سمٹ گئی تھی اور علیزے پیچھے ہٹتے ہٹتے الماری سے جا لگی تھی اور وہ اس کے بے حد قریب آ چکا تھا اور اس کی نظریں علیزے کے گلابی رخساروں کو چھونے لگی تھیں۔

"تم آج پہلی بار میرے بیڈ روم میں آ ہو رہی اور میں تمہارا مہمان نواز بندہ..... مہمانوں کی خوب خاطر داری کرتا ہوں..... سر آنکھوں پہ بٹھاتا ہوں..... اور اگر مہمان تمہارے جیسا ہو تو دل میں جگہ دیتا ہوں..... اس لیے آج ایسا کرو..... یہیں رہو..... میرے پاس..... میرے بیڈ روم میں..... تمہاری جان کی قسم خاطر داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔"

دل آور کی نظریں ہی نہیں لہجہ بھی بہکا ہوا سا لگ رہا تھا اور علیزے کی جان فنا ہو گئی تھی، اس کے پورے جسم کے ایک ایک رونگٹے سے پسینہ پھوٹا ہوا محسوس ہوا تھا اور اس کی خوبصورت پیشانی پہ پھوٹنے والے ننھے ننھے کانچ کے موتیوں جیسے پسینے کے قطرے بھی دل آور کی نظروں سے چھپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے، وہ اسے بڑے غور سے اور بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔

"بولو..... کونسی مہمان؟" اس نے کافی گمبھیر لہجے میں پوچھا تھا، اس کی آواز خمار آلود ہو رہی تھی اور علیزے کے دل و دماغ کی حرکت جیسے بند ہونے لگی تھی۔

"مم..... مجھے جانے دو..... پپ..... پلیز..... ڈرائیور..... مجھے جانے دو۔" علیزے بمشکل اپنی قوت گویائی کا استعمال کر پائی تھی، وہ تو جیسے اپنی ساری ہمتیں اور ساری قوتیں ہی کھو بیٹھی تھی۔

"جانے دوں؟ کہاں جانے دوں؟ رات بہت کالی اور موسم بہت سرد ہے ایسے جان لیوا لمحات میں تمہیں اگر جانے دوں تو خود کو معاف کیسے کروں؟" اس کی آواز اس کی آنکھیں اور اس کا لہجہ دھڑکتی خواہشوں اور بھٹکتے جذبات کے بوجھ سے بوجھل ہو رہے تھے اور علیزے کو لگا تھا کہ وہ گر جائے گی۔

"مجھے غلطی ہو گئی ڈرائیور! مجھے معاف کر دو..... پلیز..... مجھے جانے دو..... میں آئندہ تمہارے بیڈ روم میں نہیں آؤں گی۔" علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

اور پگھرل آور کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے نرم و گداز اور گلابی گلابی سے رخسار آنسوؤں کے نمکین پانیوں سے بھیگتے چلے گئے تھے۔ دل آور نے آج پہلی بار اپنی آنکھوں کے سامنے گلابی پھولوں پہ شبنم گرنے کا منظر دیکھا تھا اور اس دلفریب منظر کا فسوں اس کے چہار سو پھیل گیا تھا اور وہ اس فسوں خیزی کے ہاتھوں مخمور سا ہونے لگا تھا۔

"جانتی ہو اس وقت تم جس کی کنڈیشن میں ہو، یہ کنڈیشن مردوں کو کتنا اپیل کرتی ہے؟"

دل آور نے اپنے دونوں ہاتھ علیزے کے دائیں بائیں الماری پہ جماتے ہوئے علیزے کے بچاؤ کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے اور اس کے اس طرح دائیں بائیں ہاتھ جما کر کھڑے ہونے سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پورے کی پوری اس کی بانہوں کے حصار میں آ گئی ہو، فرق بس اتنا تھا کہ اس حصار میں وہ اس کے سینے سے نہیں بلکہ الماری سے لگی کھڑی تھی، لیکن دل آور کی بات پہ اس نے یکدم کرنٹ کھا کے اسے دیکھا تھا اور اس کی گولڈن براؤن آنکھوں کے متپش سے تاثر پہ دل آور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"روتی بلکتی ہوئی عورت مرد کے جذبات کی آگ پہ تیل کا کام کرتی ہے اور آگ پہ تیل کا اثر تو تم جانتی ہی ہو گی؟ سب کچھ جلا کے راکھ ہو جاتا ہے۔" دل آور کے لہجے اس کی باتوں اور اس کے تیوروں سے علیزے بری طرح خائف ہو چکی تھی اور اس کے دونوں گھٹنے ہی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں۔

"مجھے معاف کر دو..... پلیز ڈرائیور..... مجھے معاف کر دو..... مجھے جانے دو....." علیزے نے بے بسی سے ایک بار پھر التجا

کی تھی۔

''تم وہ واحد لڑکی ہو جس نے میرے بیڈ روم تک آنے کی جرأت کی ہے اور تمہاری اس جرأت کو خراج تحسین تو تمہیں جانے دوں؟ یہ بھی تو مناسب نہیں لگتا نا؟ کچھ تو ہونا چاہیے آخر؟'' دل آور کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے۔

''نن..... نہیں..... پلیز ڈرائیور نہیں..... میں مر جاؤں گی۔'' علیزے کا خون خشک ہو چکا تھا وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''اُف یار امر تو میں جاؤں گا اگر میرے سامنے اس طرح کھڑی التجائیں کرتی رہو گی اور تمہاری ان التجاؤں پہ میرا ہی دل سے ٹھن جائے گی، دشمن ہو جائیں گے ہم ایک دوسرے کے۔'' دل آور نے بھی بے بسی کا اظہار کیا تھا اور علیزے کے مارے رو رہی تھی اس کے آنسو زار و قطار بہے چلے جا رہے تھے۔

''لگتا ہے کہ آج تم دل آور شاہ کو ڈبو کر ہی چھوڑو گی؟'' دل آور نے اپنا دایاں ہاتھ الماری سے ہٹا کر اپنی انگلی سے ٹھوڑی کو اٹھا کر اس کا چہرہ اونچا کیا تھا اور اس کی انگلی کا ذرا سا لمس بھی علیزے کے لیے بجلی کے کسی ننگے تار سے کم نہیں تھا سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگی تھیں اور جان لبوں پہ آ گئی تھی جیسے اب نکلی کہ تب نکلی۔

''تم اور تمہاری ذات کورے کاغذ کی طرح ہے، بالکل سادہ، بالکل صاف، اندر باہر سے ایک جیسی پانی جیسی شفاف اور بے ریا..... کبھی کبھی بہت اچھی لگتی ہو..... تم پہ رحم بھی آتا ہے۔ دل چاہتا ہے تمہاری کورے کاغذ جیسی ذات پہ پورے دل آور شاہ کو چھاپ دوں، اپنا حرف حرف، لفظ لفظ لکھ ڈالوں، رنگ ڈالوں تمہاری ذات کو۔'' دل آور نے انتہائی گمبھیر آواز میں ہوئے اسے خاصی گہری نظروں سے دیکھا تھا اور اس کی نظروں کے مفہوم سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ضرور کچھ ٹھان رکھی ہے دیکھ کر علیزے کو اپنے اعصاب مفلوج ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

''لیکن پھر سوچتا ہوں کہ تم وقار آفندی کی بیٹی ہو۔'' دل آور نے وقار آفندی کے نام پہ نفرت سے سر جھٹکا تھا اور علیزے اتنی نفرت پہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''البتہ آج یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ تم بڑے بڑے زاہدوں کو بھی رد کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہو، آج اس جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہوتا، دانتوں پسینہ آ جاتا ہے تمہیں دیکھتے ہوئے۔ تمہیں دیکھنا اور اپنے آپ میں رہنا صرف دل آور شاہ کا حوصلہ ہے، ورنہ ممکن ہی نہیں کہ اپنے آپ میں رہا جائے۔''

دل آور نے اس کی خوبصورتی کے سحر کو برملا تسلیم کیا تھا، کیونکہ وہ لگی لپٹی بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔

''مجھے جانے دو ڈرائیور..... پلیز..... تمہیں خدا واسطہ..... مجھے جانے دو..... کبھی بھی تمہارے بیڈ روم میں نہیں آؤں گی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ پلیز مجھے معاف کر دو..... میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں پلیز.....''

علیزے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے رو پڑی تھی اور اب کی بار اس دھواں دھار روئی تھی کہ سب کچھ جل تھل لیکن اس سے پہلے کہ دل آور مزید کچھ کہتا اچانک اس کی جیب میں موبائل کی وائبریشن ہونے لگی تھی اور اس نے فوراً موبائل سے نکال لیا تھا اور عبداللہ کا نمبر دیکھتے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

''السلام علیکم.....'' اس کا لہجہ، اس کا انداز، اس کے تیور بدل چکے تھے بالکل پہلے جیسے ہو گئے تھے جن میں نہ کوئی نرمی تھی نہ ہی کسی قسم کا کوئی بوجھل پن تھا۔ چند منٹ پہلے کے لمحات کا تو شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟'' عبداللہ نے کافی بشاشت سے پوچھا تھا۔

''اکیلا ہوں..... تنہا ہوں..... تڑپ رہا ہوں۔'' دل آور نے افسردگی سے کہا تھا اور جواباً عبداللہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''ہاہاہا..... تم تنہا ہو سکتے ہو..... مگر کبھی تڑپ نہیں سکتے۔'' عبداللہ کے لہجے میں یقین تھا۔

''کیوں؟ کیا تم مجھے مُردہ تصور کرتے ہو؟ کیا میرے سینے میں دل اور جسم میں جان نہیں ہے کہ میں تڑپ نہیں سکتا؟ رگوں میں جذبات نہیں دوڑتے؟ یا پھر تم سمجھتے ہو کہ میں انسان نہیں بجلی سے بنا روبوٹ ہوں کوئی؟''

دل آور نے جل کے کہا تھا اور موبائل کے ایئر پیس سے عبداللہ کے مسلسل قہقہوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

''یہ جتنی حماقتیں تم نے گنوائی ہیں نا..... ان میں سے صرف پہلی حالت چھوڑ کے باقی سب پرفیکٹ ہیں، میں تمہیں ہی سمجھتا ہوں کہ تمہارے سینے میں دل اور جسم میں جان نہیں ہے، اس لیے تم تڑپ نہیں سکتے اور تمہاری رگوں میں جذبات

دل کی
خون بڑھتا ہے اور یہ بھی کہ تم واقعی بچگی سے بنے روبوٹ ہو اور بس اپنے کام نبٹاتے پھر رہے ہو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔'' عبداللہ کی شکایت دل آور بنا دیکھے بھی محسوس کر سکتا تھا۔

''میں اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہوں ملک صاحب۔''

''یہ روبوٹ کتنا رومانٹک ہے۔ یہ بات میری شادی کے بعد میری بیوی سے پوچھنا۔'' دل آور نے کافی معنی خیزی سے کہا تھا اور عبداللہ کا ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا تھا۔

''ہاہاہا۔۔۔ یہ بات تو ہم پوچھے بغیر بھی جانتے ہیں کہ تمہاری بیوی کے کانوں سے دن رات دھواں نکلا کرے گا آخر تمہاری باتیں جو ایسی ہوتی ہیں۔'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اس وقت صرف باتیں نہیں ہوں گی جناب! عمل بھی ہوگا۔'' دل آور نے ایک اور معنی خیز پوائنٹ بتایا تھا اور عبداللہ کا حشر ہو گیا تھا اس کی پسلیوں میں درد ہونے لگا تھا اتنا زیادہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کی وجہ سے۔

اور علیزے اس کو باتوں میں مصروف دیکھ کر آہستگی سے الماری سے ہٹ کے دروازے کی سمت بڑھی تھی اور دل آور کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے نکل جانا چاہا تھا لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی اس کے قدم رک گئے تھے کیونکہ اس کی کلائی دل آور کے مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں آچکی تھی اور علیزے کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

''ماری جائے گی۔'' دل آور نے علیزے کو جن نظروں سے دیکھ کر کہا تھا ان پہ تو علیزے کو پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر دوسری طرف عبداللہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''کون؟''

''جو بھی آئے گی۔'' دل آور بات تو عبداللہ کے ساتھ کر رہا تھا لیکن مفہوم علیزے کو سمجھا رہا تھا۔

علیزے کی کلائی ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی، کیونکہ وہ ایک غلطی پہ ایک اور غلطی کرنے چلی تھی پہلی کی ابھی معافی نہیں ملی تھی کہ اب ایک اور سزا کا اضافہ ہو گیا تھا۔

''بہت سفاک ہو یار۔۔۔'' عبداللہ نے تاسف کا اظہار کیا تھا۔

''ہاں! لوگوں کے ساتھ سفاک لوگ ہی سوٹ کرتے ہیں ملک عبداللہ صاحب! ورنہ نازک لوگ تو جان کو آجائیں۔'' اس نے ذرا طنزیہ لہجے میں کہا تھا لیکن اب کی بار علیزے سے اس کی بات پہ نہیں بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والے نام پہ چونکی تھی۔

''ملک عبداللہ صاحب؟'' اس نے اس نام کو بے ساختہ زیر لب دہرایا تھا، لیکن دل آور کا ذہن حد سے زیادہ کوشاں تھا۔

اور علیزے کے ہونٹوں کو جنبش دی تھی اور ادھر اس کے ذہن نے کام دکھایا تھا، اس سے پہلے کہ علیزے اس نام کو دوبارہ ذرا بلند آواز سے دہراتی دل آور نے اس کی کلائی چھوڑ کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا تھا تاکہ عبداللہ کو اس کی آواز سنائی نہ دے، کیونکہ وہ اگر اس کی آواز سن لیتا تو اور سوال کرتا اور دل آور اپنی ریپوٹیشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے علیزے کی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا جبکہ علیزے تڑپی تھی، پھڑپھڑائی تھی، روئی تھی۔۔۔ مگر دل آور شاہ کی مضبوط چوڑی ہتھیلی اپنے منہ سے نہیں ہٹا سکی تھی اور اس کوشش میں پیچھے ہٹتے ہوئے وہ دوبارہ الماری سے جا ٹکرائی تھی۔

''ویسے تمہارے ساتھ کوئی نرم و نازک سی لڑکی نہیں بلکہ اچھی خاصی سخت اور دھانسو قسم کی لڑکی ہونی چاہیے۔''

عبداللہ نے چڑنے والے انداز میں دانت چکچپا کے کہا تھا اور اب کی بار دل آور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''ٹینشن یار! جیسی بھی ملی، چلے گی۔ کیونکہ اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنا مجھے آتا ہے۔ نرم و نازک سی ملی تو اسے سخت بنا دوں گا اور سخت ملی تو اسے نرم و نازک کر دوں گا۔ یہ مسئلہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بس خود میں صلاحیت ہونی چاہیے۔''

اس نے علیزے کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور وہ ایک بار پھر بے بس کونج کی طرح پھڑپھڑائی تھی۔

''دل آور۔۔۔ باز آجا۔'' عبداللہ نے اسے متنبہ کیا تھا۔

''او کے۔۔۔ آگیا باز۔۔۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے فون کیوں کیا ہے؟'' دل آور اصل سوال کی طرف آگیا تھا۔

''کہ تمہاری بیوہ گفتگو میں یہ بھی بھول گیا کہ فون کیوں کیا ہے؟'' عبداللہ نے جیسے اپنے سر پہ ہاتھ مارا تھا۔

''ٹھیک ہے میں فون بند کر دیتا ہوں تم یاد کر لو کہ تم نے فون کیوں کیا ہے؟'' اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

نظریں جھکا گئی تھی۔

"کہاں جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟" دل آور کے اگلے سوال پہ علیزے کے چہرے کا رنگ سرخ پڑ گیا تھا اور اس نے بے ساختہ قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے تھے، لیکن دروازے کے قریب جا کر اس کے قدم رُک گئے تھے اور اس نے دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"ایک بات کہوں تم سے؟" وہ اس سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

"کہو....." اس نے ذرا سا جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے اسے اجازت دی تھی۔

"کیا تمہیں اب بھی لگتا ہے کہ میں باعزت ہوں؟ کیا میری کوئی عزت باقی رہ گئی ہے تمہاری نظر میں؟" علیزے کی آنکھیں اور لہجہ رنجی ہو رہے تھے اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکنے لگا تھا۔

"ہاں..... مجھے اب بھی لگتا ہے کہ تم باعزت ہو۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ صرف میری نظر میں ہو، دُنیا کی نظر میں نہیں۔ حالانکہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا، لیکن تمہارے بیکے والے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ہو چکا ہے اور میرا مقصد بھی یہی ہے، ان کو یقین دلانا کہ سب کچھ ہو چکا ہے، مگر حقیقت کیا ہے یہ تو صرف تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں بُری نظر سے بھی نہیں دیکھا، میں نے تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے، اپنی کسی طلب کے لیے نہیں۔ ہاں یہ افسوس کی بات ہے کہ وقار آفندی کی صرف ایک ہی بیٹی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اسے ٹارگٹ بنا لیتا اور تمہیں چھوڑ دیتا، لیکن یہ سب کچھ سہنا اور برداشت کرنا اب تمہاری مجبوری اور بے بسی ہے۔

بلکہ یہ بھی نہیں کہ یہ تمہاری برداشت، مجبوری اور بے بسی کی حد تو اس وقت شروع ہو گی جب تم یہاں سے نکلو گی اور واپس اپنی دنیا میں جاؤ گی اور تمہارا باپ تمہیں دیکھ دیکھ کر مرے گا اور مر مر کے جیئے گا، تب میں تمہارے باپ سے پوچھوں گا کہ اذیت کیا ہوتی ہے اور اس اذیت کے ناسور کو دل میں دبا کر جینا کیسا لگتا ہے؟ زندگی، موت اور موت زندگی لگنے لگتی ہے، یہ جیتی جاگتی دُنیا انسان پہ قبر کی طرح تنگ ہو جاتی ہے اور میں یہ دُنیا وقار آفندی پہ تنگ کر دینا چاہتا ہوں۔" دل آور کا لہجہ سخت اور بے رحم ہو چکا تھا اور علیزے ہمیشہ کی طرح دم بخود رہ گئی تھی جبکہ وہ مزید وہاں رُکے بغیر واش روم میں چلا گیا تھا۔

وہ آج علیزے کے ساتھ جس طرح پیش آیا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یقیناً وہ آئندہ بھی عذر ہو کر اس کے بیڈ روم میں آنے کی جرأت کر سکتی تھی، لیکن دل آور نے اپنے تیور بدل کر اسے خائف کر دیا تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ اسے خائف کرنا لیکن علیزے اس کے برعکس سمجھی تھی اسی لیے سر سے قدم اُٹھاتی واپس اپنے قید خانے میں آ گئی تھی۔

♥

عبداللہ گہری نیند سو رہا تھا جب گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ ہونے لگی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں، کمرے میں مدھم سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کے لیمپ جلا دیا تھا اور کال ریسیو کر لی تھی۔

"ہیلو....." اس کا لہجہ نیند سے بوجھل ہو چکا تھا، لیکن دوسری طرف کا لہجہ حد درجہ کرخت تھا، عبداللہ کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"تم لوگوں نے ہماری نیندیں برباد کرنے کے بعد یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ تم لوگ سکون کی نیند سوئے رہو گے؟"

ملک اسد اللہ کی آواز اس کی سماعتوں کے لیے ایسے ہی ثابت ہوئی تھی جیسے کسی نے صور پھونک دیا ہو، عبداللہ اپنی کہنی پہ زور ڈالتے ہوئے فوراً ذرا سا اونچا ہوا تھا۔

"یہی بات ملک حق نواز، بابا جان اور آپ خود کیوں نہیں سوچتے؟ آپ نے بھی تو آج تک ہزاروں لوگوں کی نیندیں برباد کی ہیں۔ ہزاروں پہ ظلم کیے ہیں۔ ہزاروں کو ستایا ہے آپ نے۔ تو اب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو کسی کی آہ نہیں لگے گی؟ آپ کو بھی مکافاتِ عمل سے نہیں گزرنا پڑے گا..... اور آپ کی نیندیں بھی برباد نہیں ہوں گی؟ ہونہہ..... یہ بھول ہے آپ کی..... آپ کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ اب آپ کی باری ہے اب آپ نے جاگنا ہے اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے گناہ گننے ہیں۔ جن کی تعداد لاتعداد ہے۔" عبداللہ نے بھی ان کو دندان شکن جواب دیا تھا جس پہ ملک اسد اللہ اور بھڑک اُٹھے تھے۔

"ہم اپنے گناہ گنیں گے یا نہیں لیکن تم دل آور شاہ کی زندگی کے دن گننا شروع کر دو، اسے بتا دینا کہ اس نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالا ہے۔" ملک اسد اللہ نے انتہائی غضبناکی سے انتہائی سفاک لہجے میں چبا کر کہا تھا۔

''یہ بات تو ایسے ہی ہو گئی ملک اسد اللہ صاحب! کہ جیسے میں اپنی زندگی کے دن گننا شروع کر دوں۔ آپ نہیں جانتے آور شاہ کی موت آپ کے لیے ملک عبداللہ کی موت ثابت ہو گی۔ اسے مارنے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے مار دیں۔'' عبداللہ تڑپ کے رہ گیا تھا۔

''ضرورت پڑی تو تمہیں مارنے سے بھی گریز نہیں کریں گے ہم۔ تمہارا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے ہمارے لیے تمہارے ساتھ اس طرح پیش آ سکتے ہیں تو دل آور شاہ تو کچھ بھی نہیں ہے ہماری نظر میں۔'' ملک اسد اللہ خاصے تحقیر بھرے لہجے میں بولے تھے اور عبداللہ ان کی بے خبری اور خوش فہمی پہ استہزائیہ سا ہنسا تھا۔

''دل آور شاہ کو عبداللہ مت سمجھیں ملک صاحب! جو آپ کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت برت دے گا۔ دل آور شاہ آور شاہ ہے۔ رعایت کی گنجائش نہیں نکلتی اس کے پاس..... وہ تخت یا تختہ والے محاورے کا پابند ہے۔ اور آپ اگر یہ سمجھتے ہیں نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالا ہے تو آپ سچ سمجھتے ہیں کیونکہ شیر کی کچھار میں شیر ہی ہاتھ ڈال سکتا ہے، یہ آپ کو آگے جا کر چل جائے گا۔'' عبداللہ بھی اتنی آسانی سے دینے والا نہیں تھا۔

''آگے جا کر کس کو پتا چلتا ہے اور کس کو نہیں یہ تو وقت آنے کی بات ہے نا..... ابھی تو ہم نے یہ اطلاع دینے کے لیے ہے کہ ملک حق نواز کو اریسٹ کر دو اکر اس نے اچھا نہیں کیا، اسے اب بھی کہہ دو کہ باز آ جائے ورنہ کسی کو انصاف دلاتے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو جائے؟'' ملک اسد اللہ نے صاف کھلے لفظوں میں دھمکی دی تھی اور فون بند کر دیا تھا اور عبداللہ ہیلو ہیلو میں پکڑے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا تھا، نجانے انہوں نے عبداللہ کے گھر کا نمبر کیسے اور کہاں سے حاصل کیا تھا کہ فوراً فون کر دیا حالانکہ اس کے گھر کا نمبر کوئی بھی نہیں جانتا تھا، لیکن پھر عبداللہ نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا تھا کہ واقعی ان سے کسی بھی قسم کی توقع کی جا سکتی ہے، وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں، کیونکہ بغیر کسی ایڈریس اور بغیر کسی اتے پتے کے وہ انگلینڈ جا کر اس کے گھر پہنچ گئے تھے تو یہ میں رہ کر اس کے گھر کا نمبر حاصل کرنا کون سا مشکل کام تھا ان کے لیے۔ عبداللہ نے سوچتے ہوئے ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا اور اپنا موبائل اٹھا کر اس کی سکرین سے ٹائم دیکھا تھا، صبح کے نو بج رہے تھے۔

''ارے..... میں اتنی دیر تک سویا رہا؟ اور نگارش نے بھی آج نہیں جگایا؟'' عبداللہ حیرانی سے کہتے ہوئے فوراً بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، لیکن پھر کسی احساس کے تحت اس نے پلٹ کر بیڈ کی دوسری سائیڈ کی طرف دیکھا تھا اور چونک گیا تھا۔ بیڈ سیدھ پڑی تھی حالانکہ وہ اس وقت تک اٹھ کر ہزاروں کام نبٹا لیتی تھی، زری تو پھر بھی فجر کی نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے بعد آرام کر لیتی تھی، لیکن نگارش نے تو آرام کرنا سیکھا ہی نہیں تھا وہ نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے بعد ناشتے کی تیاری میں جت جاتی تھی، لیکن آج اسے ہوش ہی نہیں تھا جبھی عبداللہ پریشانی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

''نگارش..... نگارش..... کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ آ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے تھا، لیکن جیسے ہی اس نے نگارش کے رخسار کو تھپکا تھا وہ ٹھٹک گیا تھا کیونکہ وہ بہت تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔

''اُف..... اسے اتنا تیز بخار ہے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔'' عبداللہ پریشانی سے اس کی کلائی اور ماتھے کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔

''نگارش.....'' اس نے نگارش کے قریب جھکتے ہوئے پکارا تھا۔

''ہوں.....'' نگارش نے آنکھیں کھولنے کی اور ذرا سا بولنے کی کوشش کی تھی، مگر نقاہت کی وجہ سے نہ وہ آنکھیں کھول سکی اور نہ ہی وہ کچھ بول سکی تھی۔

''میں زری کو بلاتا ہوں، پھر ہم تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔'' وہ اس کا رخسار تھپک کر اس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے اٹھ کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا تھا اور نیچے آتے ہی اسے زری ڈرائنگ روم میں بے چین سی ٹہلتی ہوئی ملی تھی وہ بھی پریشان تھی۔ عبداللہ کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھی تھی۔

''بھائی..... بھائی کہاں ہیں؟ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ وہ ابھی تک اٹھیں کیوں نہیں۔'' زری نے خاصی تشویش سے پوچھا تھا۔

''وہ بیڈ روم میں ہے، اسے بہت تیز بخار ہے، ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔'' عبداللہ کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

''اوہ..... مجھے تو پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ ضرور ان کی طبیعت خراب ہے، اسی لیے وہ ابھی تک نہیں اٹھیں۔''

پریشان اور فکر مند ہو گئی تھی۔

"آپ فریش ہو کر ناشتہ کر لیں، پھر بھابی کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں، اتنی صبح تو کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔"

زری کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف آ گئی تھی اور پھر دونوں بہن بھائی آگے پیچھے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر بیڈ روم میں آ گئے تھے۔

"بھابی..... کیسی ہیں آپ؟" زری نے اس کے پاس آ کر بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

"زری.....؟" نگارش جیسے نیم بیہوشی کی سی حالت میں تھی اس کے ہونٹ غیر محسوس سے انداز میں ہلے تھے۔

"جی بھابی! میں ہوں زری..... یہ آپ نے راتوں رات اتنی طبیعت کیسے خراب کر لی؟ ہم کو بتایا بھی نہیں؟" زری نے اس کے بخار سے تپتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبایا تھا۔

"زری..... پانی....." نگارش کا حلق اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے اسی لیے اس نے پانی مانگا تھا بخار کی وجہ سے پیاس سے بُرا حال تھا۔

"جی بھابی! میں ابھی پانی لے کر آتی ہوں۔" زری فوراً وہاں سے اُٹھ گئی تھی کیونکہ ان کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا پانی کا جگ خالی تھا اس لیے اسے نیچے کچن میں آنا پڑا تھا اور پانی لا کر بمشکل اسے سہارا دے کر پانی پلایا تھا اور اتنے میں عبداللہ شاور لے کر کپڑے چینج کر کے واش روم سے باہر نکل آیا تھا۔

"بھابی ہسپتال نہیں جائیں گی، ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے، باہر سردی ہے، آپ ایسا کریں کہ ڈاکٹر کو گھر بلا لیں۔" زری کو اندازہ ہو چکا تھا کہ نگارش اٹھ کر چل نہیں سکے گی اس لیے اس کی سہولت کی خاطر ڈاکٹر کو گھر بلانے کا مشورہ دیا تھا۔

"لیکن میں کس ڈاکٹر کو بلاؤں؟ مجھے تو کسی کا پتا ہی نہیں ہے۔" عبداللہ اس معاملے میں انجان تھا کیونکہ ابھی شہر میں اجنبی جو تھا۔

"تو آپ کسی سے پوچھ لیں نا؟"

"کس سے پوچھوں؟ دل آور تو اس وقت کورٹ میں ہوگا اور نبیل تو خود اس شہر میں میری طرح انجان ہے۔ خیر پھر بھی میں اسے ٹرائی کرتا ہوں۔" عبداللہ ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ ڈال کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اُٹھاتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کر چکا تھا۔

بیل..... دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"کہاں ہو؟" عبداللہ نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"راستے میں ہوں..... شوروم جا رہا ہوں۔" نبیل گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

"کسی ڈاکٹر کا کانٹیکٹ نمبر ہے تمہارے پاس۔"

"کیوں..... خیریت..... کون بیمار ہے؟" نبیل چونک گیا تھا۔

"نگارش کی طبیعت خراب ہے۔ اسے بخار ہے اسے لے کر جانا مشکل ہے اس لیے سوچا ہے کہ ڈاکٹر کو یہیں بلا لیتے ہیں۔" عبداللہ ذرا فاصلے پہ ہی کھڑا تھا اس کی باتیں زری کافی آسانی سے سن رہی تھی۔

"میں آ جاؤں؟" نبیل نے عبداللہ کی پریشانی کے خیال سے کہا تھا۔

"نہیں..... تھینک یو یار! اس کی ضرورت نہیں ہے، تم آرام سے آفس جاؤ اور مجھے ڈاکٹر کا نمبر سینڈ کر دو۔" عبداللہ نے نبیل کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"یار اتنی غیریت کیوں برت رہے ہو؟ اگر ضرورت ہے تو میں آ جاتا ہوں اور ہم بھابی کو ہسپتال لے جاتے ہیں؟" نبیل نے بھی اصرار ہی کیا تھا۔

"ایسے نہیں یار! اب اتنی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے، صرف بخار ہی تو ہے، تھوڑی دیر میں اتر جائے گا، تم بس ڈاکٹر کا نمبر بھیجو بعد میں اگر ضرورت پڑی تو بلا لوں گا تمہیں۔" عبداللہ نے ذرا تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

"اوکے..... میں تمہیں سینڈ کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ہاشمی نام ہے ان کا دل آور کے جاننے والے ہیں۔ اس کا حوالہ دو گے تو فوراً آ

جائیں گے۔" نبیل نے اسے تفصیل سے بتایا تھا، لیکن دل آور کے حوالے کے ذکر پہ عبداللہ کو صبح صبح موصول ہونے والی ملک کی کال یاد آ گئی تھی۔

"وہ کورٹ سے فارغ کب ہوتا ہے۔" اس نے دل آور کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"عموماً تو بارہ ایک بجے تک کورٹ سے فری ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی پہلے بھی فری ہو جاتا ہے، کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" نبیل کے بیک گراؤنڈ میں گاڑی کی آواز بند ہو چکی تھی، گویا وہ شوروم کی پارکنگ میں پہنچ چکا تھا۔

"مجھ اس سے ملنا ہے، ایک ضروری بات ڈسکس کرنی ہے، تم سے بھی اور اس سے بھی، اس لیے دو بجے اس کے آفس میں ملتے ہیں۔ اوکے؟" دل آور اور نبیل کو اس کال کے بارے میں بتانا بہت ضروری تھا، اسی لیے اکٹھے ملنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب نبیل بیک وقت اس کی بات پہ چونک گئے تھے ایک فون کے اس پار اور ایک فون کے اس پار۔

"خیر تو ہے نا! ایسی کون سی ضروری بات ہے جو ایک ساتھ مل کر ڈسکس کرنی ہے؟" نبیل نے دور رہ کر زری کے ذہن میں ابھرنے والا سوال دہرایا تھا۔

"یار! اب ساری بات فون پہ ہی تو نہیں بتائی جا سکتی۔ میں فون بند کر رہا ہوں دو بجے ملتے ہیں اللہ حافظ۔" عبداللہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور نبیل اور زری بے چین سے ہو کر رہ گئے تھے۔

بعد میں پھر عبداللہ نے ڈاکٹر ہاشمی کو بلایا، نگارش بھابی کا چیک اپ کروایا، خود ناشتہ کیا، نگارش کو سوپ وغیرہ پلایا۔ سب کچھ ہوتا رہا لیکن زری کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ عبداللہ کی مہم ہی بات میں اُلجھی ہوئی تھی۔

نگارش بھابی کو سنبھالتے ہوئے ان کے ماتھے پہ بل پڑے رہتے ہوئے اور ان کے سارے کام کرتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پہ حاضر رہی تھی، کیونکہ آج تو وہ نگارش سے بھی شیئر نہیں کر پا رہی تھی، آخر وہ خود بیمار تھی اسے مزید پریشان کیا کرتا بھلا؟

♥

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

مدیحہ نے اپنے سامنے کھڑے شہریار سے سنجیدگی سے کہا تھا جس پہ شہریار بُری طرح ٹھٹک گیا تھا۔

"آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں؟ مگر کیسے؟ وہ تو پولیس اسٹیشن میں ہیں؟" شہریار کو حیرت ہوئی تھی۔

"تو کیا میں پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتی؟" مدیحہ نے اس سے زیادہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"نہیں میڈم! آپ کا پولیس اسٹیشن جانا مناسب نہیں ہے۔" شہریار نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں..... مناسب کیوں نہیں ہے؟" مدیحہ نے اسے تیکھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"دیکھیے میڈم! یہ کورٹ کچہری اور تھانے وغیرہ جیسی جگہوں پر مرد ہی آتے جاتے اچھے لگتے ہیں، کیونکہ یہ مرد ہی کی جگہ ہیں، یہاں عورتوں کا آنا جانا معیوب سمجھا جاتا ہے، خصوصاً شریف گھرانے کی عورتوں کا، آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔" شہریار نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا تھا، لیکن مدیحہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی اسے بس عدیل عمر سے ملنے سے غرض تھی۔

"تو پھر میں اس سے مل کیسے سکتی ہوں؟" وہ جھنجلائی تھی۔

"بس آپ دُعا کریں کہ وہ جلدی باہر آ جائے، میری صبح صبح بات ہوئی ہے دل آور صاحب سے۔" قدرے جھنجلا کر دیکھتی مدیحہ نے چونک کر شہریار کو دیکھا تھا۔

"کیا..... دل آور بھائی سے بات ہوئی ہے؟ کیا کہا انہوں نے؟" اسے تجسس ہوا تھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ عدیل صاحب کی بیل کروانے کے لیے انہیں کچھ ضروری کاغذات اور معلومات کی ضرورت ہے، جو صرف میں ہی لا کر دے سکتا ہوں، اس لیے مجھے ان کے آفس ٹائمنگ کے بعد ان سے ملنا ہوگا اور عدیل صاحب سے بھی کروانی پڑے گی اور ان شاء اللہ ایک دو روز تک کام ہو جائے گا، کیونکہ انہوں نے اس کیس کی کچھ جانچ پڑتال بھی تو کرنی ہے۔" شہریار نے تفصیلی جواب دیا تھا۔

"اوہ..... تو تم اب ان سے ملو گے؟" مدیحہ نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"ظاہر ہے ملنا تو ہے ان سے نہیں ملنا تو اور کس سے ملنا ہے؟ ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا

بھی بغیر کہے اور بغیر کسی فیس کے ورنہ عدیل صاحب کا تو کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں تھا۔" شہریار نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

"ہوں۔۔۔ کوئی نہ بھی ہو اوپر والا تو ہے نا؟ اور یہ مدد کبھی دل آور بھائی نہیں اوپر والا ہی کر رہا ہے۔ کیونکہ کسی کو کسی کا وسیلہ بنا کر وہی بھیجتا ہے، کبھی شہریار کی صورت میں، کبھی دل آور شاہ کی صورت میں۔ اپنی وے تم میرا یہ نمبر رکھ لو، بھائی سے ملاقات میں جو بھی بات ہو مجھے بتا دینا، ورنہ میں واقعی اس سے ملنے کے لیے چلی جاؤں گی۔"

عدیبہ نے اپنا نمبر لکھ کر اس کی سمت بڑھایا تھا اور اسے جیسے دھمکی بھی دی تھی جس پہ شہریار بے ساختہ مسکرا دیا تھا اور وہ پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ "خدا حافظ" وہ اسے ہاتھ ہلا کر گاڑی اُڑا لے گئی تھی۔

♥

"یس مما؟ آپ نے بلایا تھا۔" عون دروازے پہ دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا اور سوالیہ نظروں سے آسیہ آفندی کی جانب دیکھا تھا۔

"ادھر آؤ۔۔۔ میرے ساتھ بیٹھو۔" آسیہ آفندی نے آہستگی سے الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے عون کو اشارہ کیا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی تھیں اور عون ان کی تقلید کرتے ہوئے ان کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا، وہ خاصا چپ اور سنجیدہ تھا اور یہ چپ اور سنجیدگی تب سے چلی آ رہی تھی جب سے علیزے حویلی چھوڑ کر گئی تھی، وہ دونوں بھائی ہر وقت کبوتر کی طرح اُڑنے والے اور غٹرغوں، غٹرغوں کرنے والے، پھولوں کی طرح چپ ہو کر مرجھا گئے تھے، ان کی باتیں اور شرارتیں سب ختم ہو کے رہ گئی تھیں۔

اور اپنے بچوں کو چپ اور اُداس دیکھ کر آسیہ آفندی کا دل اندر ہی اندر کٹ کر رہتا تھا، شوہر کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی نارمل نہیں دے پا رہی تھیں اور وہ بھی ان کو ڈسٹرب کیے بغیر اپنی روٹین پہ سکول آ جا رہے تھے، نیشن پڑھ رہے تھے اور اپنا قرآن پاک کا سبق بھی دہرا رہے تھے مولوی صاحب کے پاس، کیونکہ پہلے وہ ایک ایک مرتبہ قرآن پاک کا سبق پورا پڑھ چکے تھے، اب دوبارہ سے شروع کیا ہوا تھا اور آسیہ آفندی اس سب پہ بہت زیادہ خوش ہوتیں اگر یہ سب روٹین پہ کرتے ہوئے ان کی پہلے والی شرارتیں اور شرارتیں بھی زندہ ہوتیں اس لیے تو ان کو بجھا بجھا سا دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔

"عدیبہ کہاں ہے؟" انہوں نے اپنے قریب سر جھکائے عون کی طرف رُخ پھیرا تھا۔

"جی۔۔۔ وہ اپنے بیڈ روم میں ہے۔" اس نے یونہی سر جھکائے ہوئے جواب دیا تھا۔

"وہ کھیں نہیں آیا؟" انہوں نے عون کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور استفسار کیا تھا۔

"آپ نے صرف مجھے بلایا تھا شاید۔۔۔" عون نے اپنے بچپنے کے برعکس جواب دیا تھا، سمجھداری لیے ہوئے۔

"پہلے بھی تو میں صرف ایک کو بلاتی تھی اور تم دونوں آ جاتے تھے۔" وہ ماں تھیں، لاجواب کرنا آتا تھا۔

"لیکن پہلے پاپا بیمار نہیں تھے نا۔ اب ان کو ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگتا۔" عون نے پھر بھی معقول جواب ڈھونڈا تھا۔

"عون تمہارے پاپا پہلے بیمار نہیں تھے اور انہیں تم لوگوں کا بیڈ روم میں آنا، باتیں کرنا، شرارتیں کرنا اچھا لگتا تھا، لیکن اب وہ بیمار ہیں، اس لیے انہیں تم لوگوں کا بیڈ روم میں آنا، باتیں کرنا اور شرارتیں کرنا زیادہ اچھا لگے گا کیونکہ وہ اکیلے ہو گئے ہیں، تنہا ہو گئے ہیں، بیڈ روم سے باہر کی دُنیا مر گئی ہے ان کے لیے ختم ہو گئی ہے کیونکہ وہ دُنیا کے لیے مر گئے ہیں ختم ہو گئے ہیں۔ زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہیں۔ یہ بیڈ روم ان کے لیے ایک لگژری قبر کی مانند ہے اور تم نہیں جان سکتے بیٹا! قبر جتنی بھی لگژری ہو جائے، آخر قبر ہی ہوتی ہے اور اس میں پڑے ہوئے بے جان مُردہ انسان پہ جب بھی کبھار اس کے اپنے دو حرف فاتحہ کے پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو وہ سب جان مُردہ جیسے جی اُٹھتا ہے، اپنی موت اور بے بسی کی ساری تکلیفیں بھول کر اس پہ خوشی اور سکون کی لہر دوڑ جاتی ہے، بالکل ایسے ہی تم دونوں آؤ گے تو تمہارے پاپا پہ خوشی اور سکون کی لہر دوڑ جائے گی، کیونکہ تم دونوں نہیں آؤ گے تو اور کون آئے گا؟ اور ان کے پاس بیٹھے گا۔ دیکھو بیٹا! فاتحہ اپنی اولاد ہی آ کر پڑھتی ہے، کوئی اور نہیں پڑھتا آ کر۔" آسیہ آفندی نے انتہائی سفاک اور بے رحم الفاظ میں کہتے ہوئے اپنے ضبط اور اپنی آنکھوں میں اُمڈنے والے زہریلے اور تلخ آنسوؤں کو بڑی مشکل سے اندر ہی اندر پینے کی اور اپنے ضبط کو دائرے میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"پلیز مما! ایسا تو مت کہیں۔" عون ابھی بچہ تھا، ضبط نہیں کر سکا تھا، اس کے آنسو نرم رُخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا! یہی سچ ہے اور سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے، اور تم لوگوں کو اس کڑوے سچ اور تلخ حقیقت کا سامنا کرنا

ہی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں آیا کرو، اپنے پاپا کے پاس بیٹھا کرو، باتیں کیا کرو، ان کے بے جان جسم میں جان پڑ جائے گی، کچھ پل کی خوشی اور راحت مل جائے گی، دل بہل جائے گا ان کا۔" آسیہ آفندی نے عون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہا تھا اور عون بے ساختہ ان سے لپٹ گر رو پڑا تھا۔

"ایم سوری مما! اب ایسا نہیں ہوگا، ہم روز آیا کریں گے اور پاپا کے ساتھ باتیں کیا کریں گے۔ ایم ویری سوری مما سوری....." عون آسیہ آفندی سے لپٹا ہچکیوں سے رو رہا تھا اور ان کے سر کو اس کے بالوں کو چومتے ہوئے آسیہ آفندی کے آنسو اس کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"ریلیکس بیٹا! رونے سے کچھ نہیں ہوگا میں بھی بہت روئی ہوں مگر اب کوشش کر رہی ہوں کہ نہ رویا کروں تم بھی مت روؤ۔" انہوں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے چپ کرایا تھا اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

"یہ لو پانی پیو۔" انہوں نے صوفے کی سائیڈ والی چھوٹی ٹیبل سے پانی کے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھایا تھا اور عون نے بمشکل پانی کے دو گھونٹ لیے تھے اور گلاس پیچھے ہٹا دیا تھا۔

"میں نے تمہیں رُلانے کے لیے یہاں نہیں بلایا تھا، بلکہ کسی کام کے لیے بلایا تھا۔" انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"جی مما کہیے میں سن رہا ہوں۔" اس نے آہستگی سے سر جھکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تمہارے پاپا کے لیے کچھ شاپنگ کرنی ہے، ان کے ڈاکٹرز، نرسز اور ضرورت کی کئی اور چیزیں بھی لینی ہیں، میڈیسن بھی ختم ہو رہی ہیں ان کی۔ اس لیے میں دانیال کے ساتھ ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں دیر بھی ہو سکتی ہے، تمہارے پاپا سو رہے ہیں اس لیے تمہیں میری واپسی تک یہیں ان کے پاس رہنا ہوگا۔ کیونکہ انہیں کسی بھی وقت کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور اگر وہ ٹیک لگانا چاہیں تو مبارک خان کو بلا لینا۔" آسیہ آفندی نے اسے ہدایات دی تھیں اور اس نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا تھا جس پر وہ اس کا ہاتھ سہلا کر اٹھ گئی تھیں۔

"السلام علیکم آنی!" دانیال آہستگی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! لو دانیال بھی آ گیا میں اب چلتی ہوں۔ جلدی لوٹنے کی کوشش کروں گی۔ اپنے پاپا کا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔" آسیہ آفندی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اپنا بیگ اٹھا کر دانیال کے ساتھ باہر نکل گئی تھیں اور ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

عون ان کے جانے کے بعد چند سیکنڈ یونہی صوفے پہ بیٹھا رہا اور پھر آہستہ قدموں سے اٹھ کر چلتا ہوا وقار آفندی کے پاس آ گیا تھا اور ان کو بغور دیکھتے ہوئے ان کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

وقار آفندی کی پلکیں بند تھیں، لیکن نجانے کیوں بند پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔

"پاپا! مما کہتی ہیں کہ ہمارے آنے سے، باتیں کرنے سے اور پاس بیٹھنے سے آپ کے بے جان جسم میں جان پڑ جائے گی کچھ پل کی خوشی اور راحت مل جائے گی، دل بہل جائے گا آپ کا لیکن پاپا! مما شاید بھول گئی ہیں کہ ان لوگوں کے آنے سے بے جان جسم میں جان پڑتی ہے جن کو انسان اپنی جان سے بڑھ کے چاہتا ہے، انہی کو دیکھ کر خوشی اور راحت ملتی ہے اور انہی کے پاس بیٹھ کر دل بہلتا ہے اور آپ کی جان تو وہی ہیں نا؟ جو آپ کو بے جان کر کے چلی گئی ہیں، چھوڑ گئی ہیں۔

ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ؟ ان کی کمی ہم کیسے پوری کر سکتے ہیں بھلا؟ ان کی کمی تو بس وہی پوری کر سکتی ہیں آپ کے بے جان جسم میں تو صرف انہی کے آنے سے جان پڑ سکتی ہے اور..... اور ہم انہیں کہیں سے لا بھی نہیں سکتے؟ وہ کھو گئی ہیں پاپا۔" عون کہتے کہتے بھیگ گیا تھا۔

"کاش..... وہ کہیں سے آ جائیں اور..... اور آپ کو پھر سے ٹھیک کر دیں۔ آپ بالکل پہلے جیسے ہو جائیں کیونکہ آپ کی حال میں دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے ہمیں، اسی لیے..... اسی لیے تو ہم یہاں نہیں آتے..... اپنے بیڈ روم میں بیٹھے رہتے ہیں کی اور علیزے آپی کی باتیں کرتے رہتے ہیں..... وہ..... وہ..... کیوں ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں؟ وہ ایسی تو نہیں تھیں؟ پاپا میرے ہے میری آپی ایسی نہیں ہیں ان سب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ علیزے آپی منصور حسین کے ساتھ نہیں گئیں، منصور حسین انہیں زبردستی کر گیا ہے۔ پاپا یہ..... یہ..... سب، بہت بُرے ہیں، بہت گندے ہیں، علیزے آپی کے لیے گندہ سوچتے ہیں۔ مجھے بہت بُرا لگتا

ہوئے تھے۔"

عون، وقار آفندی کے سینے پہ سر رکھے بے تحاشہ رویا تھا اور اپنے دل کا غبار جی کھول کے نکالا تھا یہاں تک کہ وقار آفندی کی بند پلکوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور قطار در قطار بہنے والے آنسوان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

"آپ بھی چپ ہو گئے ہیں کسی سے کچھ نہیں کہتے..... ہم سے بھی نہیں..... پاپا پلیز کچھ تو بولیے..... میں جانتا ہوں کہ آپ جاگ رہے ہیں، آپ مما کی بھی باتیں سن رہے تھے اور آپ میری بھی باتیں سن رہے ہیں۔ لیکن آپ ہم سے بات نہیں کر رہے..... کیوں؟" عون کی بات پہ وقار آفندی کا دل کانپ گیا تھا مگر دکھ تو اس بات کا تھا کہ وہ اپنے سینے سے لگ کر روتے اپنے بیٹے کو بازو میں سمیٹ کر اپنے ہونے کا احساس بھی نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ ان کے بازو بے جان تھے اور وہ خود بے بس۔

پھر بعد میں عون جتنا بھی رویا، جتنا بھی تڑپا لیکن خود ہی سنبھلا تھا۔ کیونکہ سنبھالنے والا جواب کوئی نہیں تھا اور اپنے بچوں کو اس قدر تنہا محسوس کر کے وقار آفندی بھی آج بہت روئے تھے۔

♥

وہ کوٹ سے اور اپنے چند دیگر کاموں سے فارغ ہو کر اپنے آفس پہنچا تو پارکنگ لاٹ میں نبیل اور عبداللہ کی گاڑیاں دیکھ کر چونک گیا تھا اور یونہی حیران ہوتے ہوئے وہ اندر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم سر!" اس کا منشی قادر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! اندر کون ہے؟" اس نے اپنے آفس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ کے دوست ہیں سر! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب! کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" قادر کے لہجے میں احترام تھا۔

"کچھ بھیجا اندر چائے وغیرہ؟" اس نے ان کی خاطر تواضع کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

"جی سر! چائے وغیرہ بھجوائی ہے۔" اس کے منشی نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"اوکے جاؤ تم اپنا کام کرو۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود اندر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے باآواز بلند سلام کیا تھا اور وہ دونوں چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

"وعلیکم السلام! مل گئی فرصت؟" عبداللہ نے خفگی سے کہا تھا۔

"مل گئی کہیں؟ کیا آپ کو چاہیے؟" دل آور نے اپنا بریف کیس اور گاڑی کی چابی ٹیبل کی بائیں سائیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"الحمدللہ ہمارے پاس تو آل ریڈی ہے۔" عبداللہ نے ہاتھ جھاڑے تھے۔

"لیکن افسوس کہ ہمیں کبھی کبھی ملتی ہے، بلکہ ڈھونڈنی پڑتی ہے؟" اس نے اپنے بریف کیس سے اپنا موبائل اور سگریٹ نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"اور تم ہمیں کبھی کبھی ملتے ہو، بلکہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔" عبداللہ نے طنز کیا تھا۔

"لگن سچی ہو تو بندہ مل ہی جاتا ہے۔" دل آور نے سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر ان دونوں کو پیش کیے تھے لیکن عبداللہ نے ہمیشہ کی طرح سگریٹ نکال کر سلگانے کے بجائے ڈبیہ ایک سائیڈ پہ رکھ دی تھی۔

"لگن سچی ہو تو حق نواز بھی مل جاتا ہے۔" عبداللہ نے جان بوجھ کر اس کا ذکر کیا تھا۔

"وقف کورس! مل جاتا ہے۔" دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

"لیکن اگر مل جائے تو آگے کا حل بھی سوچ لینا چاہیے۔" عبداللہ کی بات پہ دل آور ٹھٹکا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟ آگے کا حل کیا سوچنا چاہیے تھا۔" اس نے عبداللہ اور نبیل کے روبرو اپنی چیئر پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آگے کا حل یہ کہ جو اباً وہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں مجھے آج صبح کال بھی موصول ہوئی ہے ملک اسد اللہ کی اور میں تب سے بہت پریشان ہوں۔" عبداللہ نے اپنی پریشانی اور یہاں آمد کی وجہ بیان کی تھی۔

"اور..... تو یہ کہو نا کہ میرے قتل کی دھمکیاں موصول ہوئی ہیں تمہیں۔" دل آور نے ہونٹ سکیڑتے خود ہی ساری بات سمجھ لی

تھی۔

''یہ صرف دھمکیاں نہیں ہیں یار! ان کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ان سے کسی بھی قسم کی توقع کی جا سکتی ہے۔'' عبداللہ نے دی تھی۔

''تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے مجھے؟ ملک حق نواز کو جیل سے نکال کر اس سے معافی مانگ کر، اسے اس کے گھر چھوڑ کر آنا چاہیے یا پھر مومنہ بی بی کے پاس جا کر سر جھکا کر اس سے معذرت کر لینی چاہیے کہ میں معافی چاہتا ہوں مومنہ بی بی آپ کا کیس نہیں لڑ سکتا، میں آپ کو انصاف نہیں دلا سکتا، میں حق نواز سے ٹکر نہیں لے سکتا، کیونکہ وہ خطرناک آدمی ہے، سامنے آنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس لیے پلیز آپ کسی اور کی طرف رجوع کریں، کوئی اور دروازہ کھٹکھٹائیں، مجھے تو قتل ہے اور میں تو ڈر گیا ہوں۔'' دل آور نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے آگے کا نقشہ کھینچا تھا۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم ایسا کرو تم اگر انا پرست اور غیرت مند ہو تو بے غیرت میں بھی نہیں ہوں کہ کیوں کہ مومنہ بی بی کے کیس سے پیچھے ہٹ جاؤ؟'' عبداللہ نے ذرا سخت لہجے کا استعمال کیا تھا۔

''تو پھر کیا مطلب ہے تمہارا کیا چاہتے ہو تم؟'' دل آور نے سگریٹ کی ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور اسے آگ کا شعلہ دکھاتے ہوئے ایک گہرا کش لیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم احتیاط کرو اور اپنے لیے سیکیورٹی کا انتظام کرو، گارڈز رکھو اپنے ساتھ، ورنہ نقصان بھی ہو سکتا ہے۔'' عبداللہ حقیقتاً دل آور کے حوالے سے پریشان تھا اور یہ جاننے کے باوجود کہ ذرا سی کی ہڈیوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا، پھر بھی جانے والی احتیاطی تدابیر دہرا رہا تھا، کیونکہ وہ اپنے فکرمند دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

''کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ سیکیورٹی، یہ گارڈز، یہ پہرے کیا میری موت کو روک لیں گے، بچا لیں گے مجھ کو؟ کیا کر نہیں دیں گے؟ ہونہہ..... غلط فہمی ہے تمہاری، موت اور مقدر سے بچنا ناممکن بات ہے یار! کیونکہ یہ دونوں ازل سے لکھے ہیں اور جو لکھی جا چکی ہے وہ ٹل نہیں سکتی، اگر میری موت ملک خاندان کے ہاتھوں لکھی ہے تو ان ہی کے ہاتھوں ہوگی، کسی اور میں لکھی ہے تو حادثے سے ہوگی اور اگر رضائے الٰہی سے لکھی ہے تو ان شاء اللہ رضائے الٰہی سے ہی ہوگی۔ حالانکہ ہر موت رضائے الٰہی سے ہی ہوتی ہے لیکن ہر موت میں الٰہی کی رضا الگ الگ ہوتی ہے، اس لیے میری موت کے لیے الٰہی کی کیا رضا ہے، یہ ہی جانتا ہے۔ میں اور تم کچھ بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی سیکیورٹی کام آ سکتی ہے۔''

دل آور نے اسے ایک معقول اور مضبوط جواب سے نوازا تھا، جس پہ عبداللہ نے اک نظر اپنے برابر والی چیئر پہ بیٹھی حیات کو دیکھا تھا جو ان دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش بیٹھا سب سن رہا تھا۔

''لیکن اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے نا کہ انسان کو اپنی زندگی، اپنی جان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مشکل وقت آ جائے تو بچانے کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔'' عبداللہ کے بجائے نبیل نے لب کشائی کی تھی۔

''اوکے..... جب یہ مشکل وقت آئے گا تب میں کچھ بھی کر لوں گا، لیکن فی الحال مجھ پہ ایسا کوئی مشکل وقت نہیں آیا، اپنی ہی ذات پہ پہرے لگواؤں اور زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنے دائیں بائیں فرشتے کھڑے کر لوں، ایسا وہ لوگ کرتے ہیں، جو موت سے ڈرتے ہیں، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میرے تمام دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہے آ سکتی ہے۔ موسٹ ویلکم، بٹ آئی ڈس۔'' اس نے ذرا سے بازو پھیلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور اب کی بار نبیل نے اک نظر اپنے برابر والی چیئر پہ بیٹھے کو دیکھا تھا۔

وہ دونوں جو صبح سے اس کے لیے پریشان اور فکرمند ہو رہے تھے۔ اس کی باتیں سن کر خاموش سے ہو گئے تھے۔ اس کے مزید کچھ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ اس لیے عبداللہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے گہری سانس خارج کرتا ہوا کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''نبیل! میرا خیال ہے کہ مجھے اب گھر چلنا چاہیے۔'' عبداللہ کا لہجہ سخت اور نپا تلا سا ہو رہا تھا۔

''اتنی جلدی؟'' دل آور اس کے لہجے کو محسوس کر چکا تھا۔

''نگارش کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے میڈیسن لکھ کر دی ہیں۔ وہ لے کر گھر جانا ہے۔ خدا حافظ۔

ہوا اسی لہجے میں کہتے ہوئے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے نگارش بھائی کو؟" دل آور نے فوراً پوچھا تھا، لیکن عبداللہ رُکا نہیں اور نہ ہی اس نے جواب دیا تھا۔

"عبداللہ..... وہ پیچھے سے اسے پکارتا رہ گیا تھا لیکن عبداللہ سنی ان سنی کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

"دیکھ رہے ہو نبیل! اس نے میری بات تک نہیں سنی؟" دل آور مارے جھنجلاہٹ کے اپنی چیئر سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم نے کون سا سننی ہے؟" نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

"نبیل! تم بھی پلیز یار تم دونوں میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو، میں اگر ایسا کروں گا تو ملک حق نواز مجھ پر حاوی ہو جائے گا۔ وہ صاف سمجھے گا کہ میں نے اس کے ڈر سے اور اس سے بچاؤ کے لیے یہ حفاظتی اقدامات کیے ہیں، جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ زندگی، موت، عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جب بھی، جو بھی دے گا، مجھے منظور ہوگا، لیکن یہ سب نہیں۔"

اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور نبیل بھی چپ سا ہو گیا تھا، کیونکہ وہ ان کا کہا ماننے کو تیار نہیں تھا اور وہ پریشان تھے۔

♥

عبداللہ وہاں سے سیدھا مارکیٹ آیا تھا۔

میڈیکل سٹور سے میڈیسن لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ زری نے اسے کچھ فروٹ اور جوسز لانے کا بھی کہا تھا، کیونکہ نگارش کو ڈاکٹرز نے فی الحال کسی ہیوی غذا سے منع کیا تھا۔ اس لیے اس نے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ ہلکی پھلکی چیزیں لے کر آئے، کیونکہ فریج خالی پڑا ہوا تھا، جب ہی عبداللہ کو میڈیسن لینے کے بعد ایک بڑی سی فروٹ شاپ کی طرف آنا پڑا تھا۔

اس شاپ سے فروٹ بہت مہنگا ملتا تھا۔ لیکن اس فروٹ کی یہ خاصیت تھی کہ فریش، صحت مند اور صاف فروٹ ہوتا تھا۔

عبداللہ پہلے بھی ایک بار اس شاپ پہ آ چکا تھا۔

تین کھجوریں، تین گلوسیب، چار درجن کیلا اور چار درجن کینو..... شاپ کیپر نے چیزوں کی تعداد کا حساب کر کے اس گریس فل سی خاتون کو ان کا بل بتایا تھا جو عبداللہ سے ذرا آگے کھڑی فروٹ خرید رہی تھیں اور وہ اپنی باری کا منتظر تھا۔

"یہ لیجیے۔" انہوں نے اپنے پرس سے پیسے نکال کر شاپ کیپر کو تھمائے تھے اور فروٹ کے چار شاپر بمشکل ہاتھوں میں لے کر وہ واپسی کے لیے پلٹی تھیں لیکن ابھی صرف دو قدم ہی آگے بڑھی تھیں کہ کینوؤں والے شاپر سے جھانکتی ایک سبز ٹہنی سے سیبوں والا شاپر ہٹ گیا تھا اور شاپر میں موجود سارے کے سارے سیب نیچے زمین پہ بکھر گئے تھے اور وہ آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئی تھیں۔

"اوہ....." عبداللہ کے منہ سے بے ساختہ افسوس کا لفظ ادا ہوا تھا، کیونکہ وہ بیچاری پہلے ہی اتنے وزنی بیگ اُٹھائے ہوئے تھیں اوپر سے یہ نئی مصیبت۔

"ٹھہریے میں سمیٹ دیتا ہوں، عبداللہ نے انہیں نیچے بیٹھنے سے روک دیا تھا اور جلدی جلدی شاپ کیپر سے نیا شاپر لے کر سارے سیب چن کر شاپر میں ڈالنے لگا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھ پایا تھا کہ اس کی آواز سن کر آسیہ آفندی کو یوں لگا تھا جیسے وہ بائیس سال پیچھے چلی گئی ہوں اور ان کی سماعتوں میں بالکل ایسی ہی آواز گونجنے لگی ہو۔

"مجھے سارے اس میں ڈال دیے ہیں۔" عبداللہ جو نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا سارے سیب شاپر میں ڈالنے کے بعد یکدم اُٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن اس خاتون کو یک ٹک اپنی سمت دیکھتے پا کر ذرا سا ٹھٹک گیا تھا۔

"آیئے..... میں آپ کو گاڑی تک چھوڑ آتا ہوں۔" عبداللہ نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے ان کے ہاتھ سے باقی شاپر بھی تھام لیے تھے اور نہ جانے کیا وجہ تھی کہ آسیہ آفندی نے بھی بغیر کسی تامل کے اسے شاپر تھما دیئے تھے اور وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا اور ابھی وہ گاڑی کے قریب آئے ہی تھے کہ گاڑی کے ساتھ کھڑا کسی کا فون سنتا دانیال، آسیہ آفندی کو کسی اور کے ساتھ آتے دیکھ کر فوراً فون بند کر کے ان کی طرف لپکا تھا۔

"دانیال بیٹا! ان سے یہ بیگ پکڑ کر گاڑی میں رکھ لو۔" آسیہ آفندی نے انتہائی آہستگی سے کہتے ہوئے ایک بار پھر عبداللہ کے چہرے کو دیکھا تھا، جس کا اک اک نقش ان کے کلیجے کو کھینچ رہا تھا، لیکن اس کھچاؤ کی وجہ کیا تھی؟ یہ انہیں خود بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

"لیکن آنی..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟" دانیال پریشان ہو گیا تھا۔

"ہاں..... میں ٹھیک ہوں بیٹا! بس یہ بیگ زیادہ وزنی تھے۔ اس لیے انہوں نے ہیلپ کروا دی۔" آسیہ آفندی نے عبداللہ کی

طرف اشارہ کیا تھا۔

''اُف آنی! آپ کم از کم میرے فون سننے کا ہی انتظار کر لیتیں، میں نے کہا بھی تھا کہ میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔ آذر کی کال تھی اس لیے بات کرنا پڑ گئی۔'' دانیال خفگی سے کہتا ہوا عبداللہ کے ہاتھ سے بیگ لے کر گاڑی میں رکھ چکا تھا۔ اس کی طرف پلٹا تھا۔

''تھینک یو سیر! آپ نے اتنی ہیلپ کی۔'' اس نے عبداللہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔

''اٹس اوکے تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کی آنی ہیں تو میری بھی آنی ہیں۔'' عبداللہ نے کافی خلوص سے نبھائے تھے اور آسیہ آنٹی نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا، حالانکہ اس نے تو محض محاورتاً اور اخلاقاً کہا تھا، لیکن ان کے تو پر اثر ہوا تھا۔

''اوہ شیور! اینڈ تھینکس اگین سر۔'' دانیال نے خوشدلی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

''اوکے! یو وِیلکم۔'' عبداللہ نے ذرا سا مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا اور دو قدم پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا تھا، کیونکہ آسیہ نے گاڑی میں بیٹھنا تھا اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی دانیال نے ان کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں، لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی انہوں نے عبداللہ کی طرف دیکھا تھا اور عبداللہ اب بھی ان کے دیکھنے پہ چونک گیا تھا۔ گاڑی کی بار شیشے کے پار نظر آتی شکل وصورت اور کچھ کھوجتی ہوئی اُداس آنکھیں عبداللہ کو ٹھٹکا گئی تھیں۔ وہ یکدم اُلجھ گیا تھا۔

اتنے میں دانیال اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا، مگر عبداللہ اپنے دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے اُلجھتا ہوا رہ گیا تھا۔

''آنی..... دانیال؟''

''دانیال..... آنی؟''

آنی..... آنی..... آنی! آسیہ پھوپھو؟

عبداللہ کے ذہن میں ان دو ناموں کی تکرار ہو رہی تھی اور یہ تکرار ایک نام پہ آ کر اٹک گئی تھی اور اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ دانیال اور آسیہ پھوپھو؟ یہ..... یہ وہ دونوں تھے؟ عبداللہ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا اور پھر بے ساختہ گاڑی کے پیچھے لپکا تھا۔

''دانیال..... دانیال..... رکو پلیز..... گاڑی روکو۔'' لیکن اب کے پکارنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا، کیونکہ گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بہت دور جا چکے تھے وہ لوگ اور عبداللہ تاسف سے ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

تو کیا اتنے سالوں بعد آنی بھی اسے بار بار دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں اور اتنی دیر میں عبداللہ نے بھی انہیں شناخت کر لیا تھا۔

بہت بڑی کوتاہی ہو گئی تھی اس سے، وہ اپنے سگے خون کے رشتوں کو اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھا تھا۔

♥

مان لے اب بھی میری جانِ ادا ، درد نہ چن
کام آتی نہیں ، پھر کوئی دُعا ، درد نہ چن
میں تیرے لمس سے محروم نہ رہ جاؤں کہیں
آخری بار مجھے خود سے لگا ، درد نہ چن
کچھ نہ دے گا یہ مسائل سے اُلجھتے رہنا
چھوٹ سب کچھ میری بانہوں میں سما ، درد نہ چن

نبیل اپنے موبائل پہ بجنے والی زری کی کال دیکھ کر اپنے دل کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا، وہ اسے کال کر رہی تھی۔ اور اس کے لیے تو یہ احساس ہی ہر احساس پہ بھاری تھا کہ وہ اس کے نمبر پہ اسے کال کر رہی ہے اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس احساس اور خوشی کے مارے وہ اپنے ہی موبائل کو سینے سے لگا لے اور سینے سے لگا دھڑکتا رہے اور وہ اسے محسوس کرتا رہے۔ مگر یہ ممکن نہ

بھلا وہ اُسے اس کی اجازت کے بغیر نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی گستاخی نہیں کر سکتا تھا، سینے سے لگانے کی بات تو قیامت کی بات تھی
یہ اس تصور بھی مشکل تھا۔
اور شکر کے اس تصور میں اس کے دل پہ حقیقتاً ایک قیامت گزر گئی تھی کیونکہ کال بجتے بجتے بند ہو گئی تھی۔
"شوٹ۔" نبیل نے بے اختیار اسٹیئرنگ پہ مکا مارا تھا حالانکہ غلطی اس کی اپنی ہی تھی کیونکہ اس کے موبائل پہ زری کی کال کافی دیر سے بج رہی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتا دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے اسکرین پہ نظر آتے زری کے نام کو ہی دیکھے جا رہا تھا اور اس دیکھنے دیکھنے میں ہی کال مسڈ کالز میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ کف افسوس ملتا رہ گیا تھا لیکن یہ افسوس زیادہ دیر نہیں رہا تھا بلکہ ذرا دیر بعد پھر شاری میں بدل گیا تھا، اس کی کال دوبارہ آ گئی تھی۔
"ہیلو۔" نبیل نے فوراً کال ریسیو کر لی تھی اور گاڑی کی اسپیڈ کو بھی کم کر دیا تھا۔
"السلام علیکم! میں زری بات کر رہی ہوں۔" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔
"وعلیکم السلام آجی میں آپ کا نمبر دیکھ چکا ہوں۔" نبیل کا لہجہ اس سے بھی زیادہ نرم ہو چکا تھا۔
"مجھے لگتا ہے کہ آپ ڈرائیو کر رہے ہیں۔" زری نے گاڑی کی آواز محسوس کر لی تھی۔
"جی..... آپ کو لگ رہا ہے تو صحیح ہی لگ رہا ہوگا، میں واقعی گاڑی ہی ڈرائیو کر رہا ہوں۔" وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔
"تو میں کال بند کر دیتی ہوں، آپ آرام سے ڈرائیو کر لیں میں بعد میں کال کر لوں گی۔" زری نے کال بند کرنا چاہی تھی۔
"نہیں..... نہیں..... کال بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ بات کریں، میں سن رہا ہوں۔" نبیل نے فوراً سے
تھا۔
"ٹھیک ہوا نبیل آپ جا کہاں رہے ہیں؟" وہ بات شروع کرنے سے پہلے تمہید کا سہارا لے رہی تھی۔
"آفس..... شوروم۔" اس نے نارمل سے انداز میں بتایا تھا۔
"لیکن اس وقت؟" زری نے جان بوجھ کر حیرانی ظاہر کی تھی۔
"جی..... دراصل کسی کام کے سلسلے میں دل آور کے آفس جانا پڑ گیا تھا، ابھی وہیں سے واپس آ رہا ہوں۔"
"زیادہ ضروری کام تھا؟" زری کرید رہی تھی۔
"ہاں..... کہہ سکتی ہیں۔" نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔
"کیا جان سکتی ہوں کہ کیا کام تھا؟"
"کیوں خیریت..... آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" نبیل نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔
"وہ..... دراصل صبح عبداللہ بھائی آپ کو کوئی بات ڈسکس کرنے کے لیے دل آور شاہ کے آفس میں بلا رہے تھے اس لیے مجھے تب سے پریشانی ہو رہی تھی کہ نجانے ایسی کون سی بات ہے جسے ڈسکس کرنے کے لیے وہ آپ کو وہاں بلا رہے ہیں؟" زری نے اپنی پریشانی کہہ ہی ڈالی تھی اور نبیل اس کی پریشانی سن کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔
"او..... تو یہ بات ہے اس پریشانی نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور کیا ہے؟" نبیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔
"جی..... میں واقعی بہت پریشان تھی، بلکہ اب بھی ہوں، کیا بات تھی؟ کیا وجہ تھی آخر؟" اس کا لہجہ اب بھی متفکر سا تھا۔
"او..... آپ پریشان نہ ہوں، آپ کے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں تھی، بس وہ دل آور کا ایک مسئلہ تھا اس پہ بات کرنی تھی۔" نبیل نے لاپروائی سے کہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جس مسئلے کو وہ اتنی لاپروائی سے لے رہا تھا وہی مسئلہ زری کی پریشانی کا اصل سرچشمہ تھا۔ اور اس کے لیے تو وہ ہلکان ہو رہی تھی۔
"کیا مسئلہ؟" زری کو پھر پوچھنا پڑا تھا۔
"ملک حق نواز کا مسئلہ تھا، وہ جیل میں ہے، اس لیے ملک اسد اللہ آپ کے بڑے بھائی صاحب کی کال عبداللہ کو موصول ہوئی تھی، دل آور کو بھی کسی سے نواز رہے تھے اور عبداللہ نے یہی بات ڈسکس کرنے کے لیے مجھے بھی دل آور کے آفس بلایا تھا، لیکن وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ کچھ سننے کو ہی تیار نہیں ہو رہا تھا، کہتا ہے ہونے کو دو جو ہوتا ہے، دیکھی جائے گی اس لیے ہم دونوں بھی اُٹھ کر آ گئے۔ ہم نے بھی کہا دیکھی جائے گی۔" نبیل کہے جا رہا تھا اور زری چکرا کے رہ گئی تھی۔

ملک اسد اللہ کی کال اور دھمکی کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی، یہ تو زری جانتی تھی یا عبدالرحمٰن محض ڈرانے کے لیے دھمکیاں نہیں دیتے بلکہ کوئی بازنہ آئے تو عمل بھی کرتے ہیں، لیکن دل آور کو یہ بات کون سمجھاتا؟

"ہیلو..... زری..... ہیلو۔" نبیل ایک دم خاموشی چھا جانے پہ بار بار اسے پکار رہا تھا۔

"ایم سوری..... میرا خیال ہے کہ عبداللہ بھائی آ گئے ہیں میں کال بند کرتی ہوں اس وقت، آپ سے پھر بات کروں گی۔" زری نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا، لیکن نبیل کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ اس نے زری کی آواز سن لی تھی، وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

♥

اور ٹھیک تین روز بعد شہریار کی مدد سے وہ عدیل عمر کی ضمانت کے کاغذات تیار کروا کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تو وہاں ایس ایچ او جمال احمد اپنی سیٹ سے کھڑے ہو گئے تھے، وہ ذرا کم ہی پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتا تھا اس لیے ایس ایچ او جمال احمد احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔

"السلام علیکم شاہ صاحب! آج کیسے راستی بھول گئی اس ستم خانے کو؟" ایس ایچ او جمال احمد نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ایک عزیز قید کاٹ رہے ہیں آپ کے اس ستم خانے کی..... سوچا ہمارے چند کاغذوں کے عوض آپ جان بخشتے ہیں تو ایسے ہی سہی..... ہمارا کیا جائے گا؟ بس چند کاغذ اور ایک بے گناہ آزاد ہو جائے گا۔"

دل آور نے ایس ایچ او جمال احمد کی پیش کی ہوئی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"چند بے گناہ تو آپ نے بھی قید کر رکھے ہیں شاہ جی! ابھی ان کو آزاد کرنے کے بارے میں تو نہیں سوچا آپ نے۔" اپنے عقب سے ابھرنے والی انسپکٹر شہناز کی آواز پہ دل آور نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا کیونکہ انسپکٹر شہناز کا پہلا خیال ہی علیزے کی طرف گیا تھا کیونکہ اس کے پاس تو صرف وہی قید تھی۔

"مثلاً.....؟" دل آور، انسپکٹر شہناز کو دیکھ کر احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مثال آپ کے سامنے کھڑی ہے شاہ جی۔" انسپکٹر شہناز اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور ایس ایچ او جمال احمد تھے۔

"آپ کو شاید پتا نہیں ہے انسپکٹر صاحبہ! کہ میرا ایک اصول ہے، میں کسی کو قید نہیں کرتا، بلکہ آزاد چھوڑ دیتا ہوں بات ہے کہ لوگ پھر بھی خود کو قید میں ہی سمجھتے ہیں۔" اس نے انسپکٹر شہناز کو ذرا سہم سا جواب دیا تھا۔

"جانے دیجیے میڈم! کن سے بات کر رہی ہیں بھلا؟ بیرسٹر صاحب ہیں آخر۔" ایس ایچ او جمال احمد نے مسکرا کر کہا۔

"یہ اگر بیرسٹر صاحب ہیں تو ہم بھی اس وقت فل یونیفارم میں ہیں ایس ایچ او صاحب! کیا خیال ہے آپ کا؟" انسپکٹر شہناز نے ایس ایچ او جمال احمد کی سمت دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"ہمارے خیال تو ہمیشہ اچھے ہوتے ہیں میڈم!" ایس ایچ او جمال احمد ان لوگوں کی ٹوک جھونک پہ ہنس رہے تھے۔

"ذرا سوچیے شاہ جی! اگر ہم آپ کو اٹھا کر حوالات میں بند کر دیں تو آپ کی ضمانت کرانے کے لیے کون آئے گا؟" انسپکٹر شہناز کے سوال پہ دل آور شاہ یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا کیونکہ اس کا سوال ہی اتنا دلچسپ سا تھا۔

"ہاہاہا..... میری ضمانت کرانے کے لیے پورا شہر آئے گا میڈم! پورا شہر۔" وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔

"مطلب؟" انسپکٹر شہناز اس کی استہزائیہ سی ہنسی پہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"مطلب کہ پورا شہر میرا دشمن ہے، کوئی بھی مجھے دیکھنا نہیں چاہتا، اس لیے میری ضمانت کرانے کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا۔" دل آور کا لہجہ نجانے کیوں اچانک ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ پورا شہر ہی آئے گا پورا شہر آپ کا دشمن ہے تو پورا شہر آپ کا دوست بھی ہے شاہ جی! ابھی حوالات میں بند کر کے تو دیکھیں؟" انسپکٹر شہناز نے خاصے سچے دل سے کہا تھا کیونکہ اسے واقعی یقین تھا۔

"فی الحال تو میں کسی کو چھڑوانے کے لیے یہاں آیا تھا، آپ یہ پیپرز چیک کر لیں۔" اس نے بات بدل دی تھی

کارروائی کے بعد عدیل عمر کو آزاد کر دیا گیا تھا، جو شہر کو دیکھنے اور ملنے کے بعد دل آور شاہ کو حیرت زدہ سا دیکھ رہا تھا۔

"کیسے ہو یار اور؟" دل آور نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ذرا بشاشت سے پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں..... مگر آپ؟" عدیل کچھ کہہ نہیں پایا تھا اور شہریار عدیل کی کیفیت سمجھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

"ٹھیک ہوں..... فی الحال یہاں سے نکلو۔" دل آور نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔

"جیسے یار! باقی کے سوال بعد میں..... اور انسپکٹر شہناز کی طرف پلٹا تھا۔

"یہ تھا اور خواجہ انیس انچ کا ہو صاحب! بہت بہت شکریہ آپ کا..... اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔" وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا تھا۔

"ہو کے انیس انچ کا ہو صاحب! بہت بہت شکریہ آپ کا..... اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔" وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا تھا البتہ انسپکٹر شہناز اسے چھوڑنے کے لیے گاڑی تک آئی تھی۔

"ٹھیک ہے اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا تھا البتہ انسپکٹر شہناز اسے چھوڑنے کے لیے گاڑی تک آئی تھی۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! اتنے پروٹوکول کے لیے بہت شکریہ....." دل آور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پلٹ کر اسے

"ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! اتنے پروٹوکول کے لیے بہت شکریہ....." دل آور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پلٹ کر اسے

دیکھا تھا۔ عدیل اور شہریار بھی انہیں دیکھ رہے تھے۔

"شرمندہ کر رہے ہیں ہمیں؟" انسپکٹر شہناز سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میری اتنی مجال کہاں کہ آپ کو شرمندہ کروں۔" اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ٹھیک اور شرمندہ کرنے والی بات۔" انسپکٹر شہناز نے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"اوکے نہیں کرتا شرمندہ کرنے والی بات..... اب خوش؟" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور انسپکٹر شہناز مسکرا دی تھی۔

"اللہ حافظ....." وہ بھی مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی میں سوار ہو گیا اور عدیل کے لیے فرنٹ ڈور اور شہریار کے لیے بیک ڈور کھول دیے تھے اور ان کے بیٹھتے ہی گاڑی سٹارٹ کر دی تھی لیکن گاڑی کو بیک کرتے کرتے ایک بار پھر انسپکٹر شہناز کے قریب رُک گیا تھا اور گاڑی کا شیشہ نوٹ کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ہماری قید میں رہیں تو ہی اچھا لگتا ہے اور انسان کبھی بھی انہیں آزاد چھوڑنے کے بارے میں نہیں سوچتا اور یہ بے گناہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ جو ہم سے محبت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو ہم ہمیشہ قید میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔" دل آور کی بات انسپکٹر شہناز کے ساتھ ساتھ عدیل اور شہریار کے بھی دل کو لگی تھی، انسپکٹر شہناز دو قدم اور قریب آ گئی تھی۔

"مطلب؟" اس نے دل آور کے سے انداز میں کہا تھا۔

"مثال میرے سامنے ہی تو کھڑی ہے انسپکٹر صاحبہ؟" وہ دلچسپی سے کہہ کر انسپکٹر شہناز کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا اور وہ اپنی جگہ پہ جھنجلا کے رہ گئی تھی جبکہ دل آور گاڑی روڈ پہ ڈالتے ہوئے بھی مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو..... کیا دیکھ رہے ہو؟ دل آور شاہ یا منصور حسین؟" اس نے گم سم سے بیٹھے عدیل کو مخاطب کیا تھا۔

"منصور حسین۔" عدیل کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔

"منصور حسین میرے ایک کیس کا حصہ تھا، کیس ختم ہوا تو وہ بھی ختم ہو گیا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن وہ..... وہ..... وقار آفندی کی بیٹی کا ڈرائیور..... وہ گاڑی..... وہ حلیہ..... وہ سب؟" عدیل بے ربط سا ہونے لگا تھا

سے رفتہ رفتہ سب یاد آ رہا تھا۔

"وہ سب بھی اسی کیس کا حصہ تھا۔ بھول جاؤ اسے اور یہ یاد رکھو کہ تمہارے سامنے اب کون ہے؟"

دل آور نے رائٹ سائیڈ پہ ٹرن لیتے ہوئے خاصے دوٹوک لہجے میں کہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس منصور حسین والے قصے کو دوبارا نہیں چاہتا تھا اسی لیے عدیل چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"جاب کرو گے؟" دل آور نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد خود ہی سوال کیا تھا اور وہ دونوں چونک گئے تھے۔

"جاب....." عدیل حیرت اور بے یقینی سے گنگ ہو گیا تھا۔

"ہاں..... میں نے جب تمہیں ورکشاپ میں دیکھا تھا تو تب بھی تمہاری جاب کے بارے میں سوچا تھا لیکن تب میں فارغ نہیں تھا اس لیے سوچا تھا کہ فارغ ہو کر تمہیں جب کی آفر دوں گا، لیکن بعد میں بھی اتنی مصروفیت رہی کہ پھر خیال ہی نہیں آیا۔ اپنی ٹیم کے لیے تم دوسرے لیے جاب کرو گے یا کہیں اور ارادہ ہے؟" وہ ڈرائیونگ میں مصروف عدیل کی سمت دیکھے بغیر پوچھ رہا تھا اور

عدیل کے پاس تو جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے وہ اللہ کی اس قدر مہربانی اور نوازش پہ کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

"دیکھو..... یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہاری صفائت کروائی ہے، تمہارے لیے کچھ بھاگ دوڑ کی ہے تو بدلے میں ساتھ کوئی ڈیل کر رہا ہوں یا پھر اس میں میرا کوئی مفاد شامل ہے۔ نہیں..... ہرگز نہیں..... ایسا سوچنا بھی مت میں صرف ذمہ اُٹھاتا ہوں تو اپنا نفع نقصان اور اپنا مفاد نہیں دیکھتا، ہاں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ کسی دوسرے کا فائدہ ہو جائے۔ اگر اس طرح سے آزاد ہو، خود فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟ میرے پاس مینیجر کی جاب ہے، کرنا چاہو تو کرو نہیں چاہو تو زبردستی نہیں۔" دل آور نے کہتے ہوئے گاڑی شوروم کی پارکنگ میں پارک کر دی تھی۔

"مینیجر کی جاب؟" عدیل نے زیرِ لب دہرایا تھا اور دل آور گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اُتر آیا تھا اور اس کے پیچھے بھی اُتر آئے تھے۔

"ہاں..... مینیجر کی جاب..... اس شوروم میں۔" اس نے کافی سکون سے شوروم کی شاندار سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"اس شوروم میں؟" شہریار نے کافی اشتیاق سے کہا تھا۔

"ہاں..... اس شوروم میں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تھینک یو سر! تھینک یو ویری مچ۔" عدیل کا لہجہ بے حد ممنون ہو رہا تھا اس کی آنکھیں، اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی، اللہ نے اسے ایک مشکل، ایک آزمائش میں ڈالنے کے بعد اسے اس کے صبر کا صلہ بھی دیا۔ اچھا صلہ کہ وہ اللہ کے حضور جتنے بھی شکرانے ادا کرتا، وہ کم تھے۔

"آپ..... آپ..... تو واقعی میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں سر۔" عدیل حد سے زیادہ شکر گزار ہو رہا تھا۔

"ارے چھوڑو یار! کوئی انسان کبھی فرشتہ نہیں ہو سکتا اور کوئی فرشتہ کبھی انسان نہیں ہو سکتا، کیونکہ فرشتے کے لیے مشکل ہے اور انسان کے لیے فرشتہ بننا، اس لیے جو جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنے دو۔" دل آور نے سر جھٹکا تھا۔

"مجھے اب کیا کرنا ہوگا؟" عدیل نے اسے وہیں کھڑے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"تمہیں اب کچھ نہیں کرنا، تم اس وقت بس اپنے گھر جاؤ اور اپنے گھر والوں سے ملو، اپنے ماں باپ سے، اپنی بہن سے، اپنے دوستوں سے، اس کے بعد فریش ہونے کے لیے ریسٹ کرو اور کل صبح فل تیاری سے آ کر اپنی سیٹ جوائن کر لینا۔ میں کہ باقی اسٹاف پہ تمہارا اچھا امپریشن پڑے، اس لیے اس وقت اس حلیے میں تمہیں متعارف کروانا مناسب نہیں ہو طرح امپریشن اچھا نہیں پڑے گا۔" عدیل اتنے دنوں سے جیل میں تھا، اس کے کپڑے خاصے میلے اور شکن آلود ہو پہ سیاہ رواں بھی عجیب سا حلیہ پیش کر رہا تھا، سو دل آور کا مشورہ سو فیصد درست اور مفید مشورہ تھا، عدیل نے فوراً اثبات میں تھا۔

"او کے سر! جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے دل آور سے ہاتھ ملاتے ہوئے تابعداری سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے میرا مقصد اس وقت تمہیں شوروم دکھانا تھا، تم اب گھر جا سکتے ہو، تم سے کل ملاقات ہوگی۔" دل آور تھپک کر پلٹ گیا تھا لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد پھر ان کی سمت پلٹا تھا۔

"اور سنو..... یہ جو تمہارا دوست ہے نا..... شہریار..... یہی تمہارا اصل دوست ہے۔" سچا، کھرا اور مخلص..... اس کا مت چھوڑنا، ورنہ زندگی کی جیل میں اکیلے رہ جاؤ گے اور کوئی بیل بھی نہیں کروائے گا۔" دل آور نے شہریار کی سمت ہوئے عدیل کو تاکید کی تھی اور وہاں سے چلا گیا تھا جبکہ عدیل نے اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے شہریار کو گلے لگا لیا تھا کیونکہ واقعی اس کا دوست ہونے کا حق ادا کیا تھا جس کی گواہی دل آور شاہ نے بھی دے دی تھی۔

♥

پندرہ جنوری.....

اپنے لیپ ٹاپ پہ پندرہ جنوری کی ڈیٹ دیکھ کر نجانے کیوں آذر کے ہاتھ وہیں کے وہیں رُک گئے تھے اور اس کا اتھاہ گہرائی میں ڈوب کے اُبھرا تھا۔ ایک گہرا خوف آیا تھا اور آذر کو یوں لگا کہ دم نکل گیا ہو۔

"وہاہ..... اُف علیزے! کو دیکھے ہوئے دو ماہ گزر گئے؟" آذر کے دل و جان پہ یہ خیال قیامت کی طرح

ریل
پیک لڑکی چھوڑ گیا تھا۔ کہاں تو اس کے بغیر دو پل نہیں گزرتے تھے اور کہاں دو مہینے گزر گئے تھے کہ اس کی آواز تک نہیں سنی تھی۔
"تو کیا اب وہ عمر بھر نہیں ملے گی؟ تو کیا اب عمر یونہی تمام کرنی پڑے گی؟ بے کار، بے معنی اور خالی؟"
آذر سوچتے سوچتے مضطرب سا ہو گیا تھا۔
"وہ..... دور سے لگا کر رکھنے والی صورت کبھی نظر نہیں آئے گی؟ کبھی پاس نہیں بیٹھے گی؟ کبھی بات نہیں کرے گی؟ تو اس کا سفر ہے کہ دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا؟" وہ یونہی اضطراب کے عالم میں لیپ ٹاپ وہیں بیڈ پہ چھوڑ کے بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اتنی شدید سردی کے باوجود کھڑکی کے شیشے کھول دیے تھے، باہر پورا واشنگٹن بارش میں بھیگا ہوا تھا، لیکن زندگی پھر بھی سڑکوں پہ رواں دواں تھی اور سفر جاری تھا۔
یہاں نہ کوئی آذر تھا اور نہ کوئی علیزے تھی۔ نہ کسی سے بچھڑنے کا غم تھا اور نہ کسی سے ملنے کی خوشی تھی۔
یہاں تو بس انسان تھے اور ان کی ضرورتیں تھیں۔ اس سے آگے، اس سے بڑھ کے تو کچھ تھا ہی نہیں۔
وہ کس دیس آ گیا تھا؟ وہ کیوں آ گیا تھا؟ صرف علیزے کا غم چھپانے کے لیے یا بے حسوں کے شہر میں خود کو بے حس کرنے کے لیے۔ لیکن یہ بھی تو نہیں ہو رہا تھا نہ غم چھپ رہا تھا، نہ وہ بے حس ہو رہا تھا بلکہ وہ تو کچھ اور زیادہ ہی شدتوں سے یاد آنے لگی تھی۔
"آذر..... زندگی اس طرح نہیں گزرے گی۔ کب تک بھاگو گے اور کب تک منہ چھپاؤ گے؟ مرد بنو یار! یہاں سب کو تمہاری ضرورت ہے۔ ڈیڈ کو علیزے نے نہیں تم نے اکیلا کر دیا ہے۔ ان کو تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ آنٹی بھی کمزور ہو گئی ہیں۔ عون اور عدید اپنے بیڈ رومز کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پورے گھر کا شیرازہ بکھر گیا ہے یار! سنبھالو آخر ڈیڈ کے بعد اس گھر کا جو کچھ تم ہو، ڈیڈ کو بہت مان تھا تم پہ، بہت بھروسہ تھا تمہاری ذات پہ..... پلیز تم تو ایسا مت کرو..... واپس آ جاؤ یار..... واپس آ جاؤ۔" فون کے ایئر پیس سے اُبھرنے والی داجیال کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے رُخسار بھیگے ہوئے تھے، اس نے جھک کر اپنے رُخساروں کی نمی کو ہاتھ سے محسوس کیا تھا یعنی وہ رو رہا تھا۔
"کس کے لیے..... ڈیڈ کے لیے..... آنٹی کے لیے..... عون اور عدید کے لیے؟ یا پھر..... یا پھر علیزے کے لیے؟"
اس نے خود سے سوال کیا تھا اور اپنے اندر سے اس سوال کا جواب موصول ہوتے ہی اس نے اپنا چہرا پونچھ کر سر جھٹک ڈالا تھا۔
"نہیں..... اب اور نہیں..... اب اسے یاد نہیں کرنا..... نہیں کرنا..... نہیں کرنا..... کبھی نہیں کرنا....." وہ پُرعزم اور مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلاتا ہوا کھڑکی کے شیشے بند کر کے پلٹا اور لانگ کوٹ اور شوز پہن کر اپنے ضروری ڈاکومنٹس لے کر ہوٹل کے روم سے باہر نکل آیا تھا، اس نے آج ہی پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ کنفرم کروانا تھا کیونکہ وہ اب اور یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔

♥

"مسز گل....." اس نے کھانے کی ٹرے لے کر ہیمنٹ کی طرف جاتی گل کو آواز دی تھی۔
"یہ کیا ہے؟ کہاں جا رہی ہو؟" وہ ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا جب اس کی اچانک گل پہ نظر پڑی تھی۔
"سائی صاحب! یہ کھانا ہے..... علیزے بی بی کے لیے لے کر جا رہی ہوں۔" گل نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔
"ہوں..... علیزے بی بی کے لیے کھانا؟" اس نے دو سیکنڈ کے لیے سوچا پھر ریموٹ صوفے پہ اُچھال کر صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"گل..... آج تمہاری علیزے بی بی کے لیے کھانا میں لے کر جاتا ہوں۔" اس نے قریب آ کر گل کے ہاتھوں سے ٹرے تھام لی تھی اور گل بیچاری سر ہلا کر پیچھے ہٹ گئی تھی، وہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی؟
"تم اپنا کوئی اور کام نبٹا لو۔" وہ گل سے کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا، اس کا رُخ ہیمنٹ کی طرف تھا، سیڑھیوں کے پیچھے بنے ہوئے میں کوئی تالا لگا تھا نہ زنجیر..... بس جو کچھ بھی تھا علیزے کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا، تالا بھی اور زنجیر بھی..... جو اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے اور وہ ہیمنٹ کی دیوار سے لگ کر بیٹھی دیوار ہو گئی تھی اور وہ ٹرے اُٹھائے سیڑھیاں اُتر آیا تھا۔

اب میری تاک میں رہتے ہیں کوہ قاف کے جن
میں پرستان کی ملکہ اُٹھا لایا ہوں

چھپا لو..... سب سے چھپا لو..... پلیز ڈرائیور..... مجھے چادر دے دو..... مجھے ڈھانپ دو..... میں ننگے سر کھڑی ہوں..... میری عزت خاک میں مل جائے گی..... نکاح کر لو مجھ سے۔" وہ روتے ہوئے اس قدر تڑپ رہی تھی کہ اگر اس لمحے وہ دل آور شاہ سے اس کی عمر بھر کی کمائی، اس کی عزت، اس کی آبرو، اس کے گھر بار سمیت اس کی جان بھی مانگتی تو وہ یقیناً دے دیتا۔

تمام تر جنونی اور اس کے گھر بار سمیت اس کی جان بھی مانگتی تو وہ یقیناً دے دیتا۔

لیکن اس لمحے جو کچھ وہ اس سے مانگ رہی تھی وہ دینا تو دل آور شاہ کے لیے جان دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی عاجز اور بے بس سوالی کا سوال سن کر دل آور شاہ کی مٹھی میں اسے دینے کے لیے خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس "کچھ نہیں" کا احساس ہوتے ہی دل آور شاہ کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات بھی ایک دم منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔ جس کے باعث اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنا رو رہی ہے؟ کتنا تڑپ رہی ہے؟ اور کتنا گڑگڑا رہی ہے؟

اپنی جلد کیفیت، احساسات اور دل و دماغ کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور قدم واپسی کے لیے موڑے اور علیزے اس کی واپسی اور اس کے قدموں کی واپسی پہ یوں تڑپی تھی کہ جیسے دل آور شاہ نے چپ چاپ قدم واپس نہیں موڑے تھے بلکہ اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور وہ اس شہ رگ کے کٹنے جانے کے درد سے بلبلا کر اک جھٹکے سے زمین سے اُٹھی اور تیزی سے اک سائیڈ سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے اس کے راستے میں حائل ہو گئی تھی۔

"نہیں ڈرائیور اس طرح نہیں..... تم ایسا نہیں کر سکتے..... تم اس طرح نہیں جا سکتے..... تمہیں کچھ تو کہنا ہو گا..... تمہیں کچھ تو کرنا ہو گا..... تم مجھ پہ ظلم کرنا چاہتے ہو نا؟ تو کرو، جتنا مرضی ظلم کرو، جتنا تمہارا دل چاہتا ہے، اتنا کرو، مگر خدارا اسطے مجھے ٹھکرا دو مت۔ کچھ تو تم نے اگر مجھے ٹھکرا ہی تو میرا کہیں بھی کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا..... میں..... میں دو جہان سے ٹھکرا دی جاؤں گی..... پلیز ڈرائیور..... پلیز....." اس نے بے تحاشہ روتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور دل آور شاہ کے قدم ایک بار پھر زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ علیزے کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے اور جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر سر جھکانے پہ مجبور ہو گیا تھا اور علیزے اس کے سر جھکانے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ سر انکار میں جھکا ہے اقرار میں نہیں اور اس کے جھکے ہوئے سر نے علیزے کو اور بھی تڑپا دیا تھا جبکہ دل آور نے اس کے سامنے سے ہٹ کر وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔

مگر اب کی بار اس کے قدم زمین نے نہیں بلکہ کسی اور نے جکڑ لیے تھے اور دل آور شاہ اپنی جگہ پہ جم کے رہ گیا تھا اس کے حواس اور فرض کانپ گئے تھے اس کی پوری ہستی لرز اُٹھی تھی وہ بُری طرح وہل گیا تھا، آخر بڑی حویلی کی عزت اور آن و وقار آفندی کی بیٹی اس کے قدموں میں جھک گئی تھی اس نے اپنے ہاتھ اس کے پیروں پہ رکھ دیئے تھے تو گویا اس نے آج اپنی انا، اپنا غرور اور اپنی ذات دل آور شاہ کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ تو گویا اب اس کے پاس باقی کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ خالی ہو چکی تھی..... ہار چکی تھی..... لٹا چکی تھی..... سب کچھ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا۔

لوگ محبت یا نفرت کی جنگ میں دل ہارتے تھے لیکن وہ اپنا آپ ہار گئی تھی اپنی انا، اپنا غرور، اپنی ذات ہار گئی تھی، صرف اور صرف اپنی عزت کی خاطر اس نے سب کچھ ہار دیا تھا۔ وہ بے بس اور بے بسی ہو چکی تھی اور اس کی اسی بے بسی اور بے بسی کا خیال آتے ہی اس کے ہاتھوں کا لمس دل آور کو پیروں پہ کسی کرنٹ کی طرح محسوس ہوا تھا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے۔ مگر علیزے نے پھر بھی اس کے پاؤں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

وہ اپنے اس عمل کے دوران کس پل صراط سے گزر رہی تھی؟ دل آور شاہ اس چیز کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا، مگر وہ اس کے اس عمل کے دوران کس پل صراط سے گزر رہا ہے؟ علیزے آفندی اس چیز کا کبھی بھی اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ علیزے کی حالت سے باخبر تھا جبکہ علیزے اس کی کیفیت سے بے خبر تھی وہ بس تڑپے جا رہی تھی اور تڑپائے جا رہی تھی۔

"پلیز ڈرائیور..... آج..... آج جو جی چاہے کر لو..... مگر پلیز انکار مت کرو..... آج تم مجھے عزت دو گے، تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے پہ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہو گا تم میری عزت اور میرے عیب ڈھانپ دو خدا کے لیے ہمیں ڈھانپ دو اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا پلیز ڈرائیور! مجھ سے نکاح کر لو۔"

اس کے کانوں میں جیسے سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی اور دل پہ جیسے اک لرزا سا طاری ہو گیا تھا۔

اس کی ایسی حالت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب اس کی اماں اس کے بابا کی لاش چارپائی پہ گھر آتے دیکھ کر تڑپی تھی [illegible] اور بھائی نہیں کرائی تھیں۔ [illegible] روتے ہوئے اس کے بابا کی لاش سے لپٹ گئی تھیں اور اس قیامت خیز منظر

نے دل آور شاہ کی معصومیت اور بچپن کو مار کر اسے اتنا سخت اور سفاک بنا دیا تھا کہ وہ آج اس مقام کو پہنچ گیا تھا کہ جہاں
اس کے قدموں میں جنگلی اس سے عزت و آبرو کی بھیک مانگ رہی تھی اور وہ اسے یہ عزت اور آبرو دینے سے قاصر تھا۔

کیونکہ علیزے کو دینے کے لیے اس کے پاس دُکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اس کے معاملے میں اس سے زیادہ
لاچار تھا کیونکہ اس کی اماں کا درد اور بابا کی لاش اسے اپنے عزم اور ارادوں سے پیچھے نہیں ہٹنے دیتے تھے کیونکہ یہ باتیں اس کے
ارادے اس کے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ سوئے تھے۔ اس کے ساتھ جاگے تھے۔ اس کی زندگی کا
وہ دل آور شاہ کی ہڈیوں اور خون میں رچ بس چکے تھے اس کے دماغ میں لاوے کی طرح پکتے تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد
ترجیح ہی یہ عزم اور ارادے تھے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان سے پیچھے ہٹ جاتا؟ یا پھر اپنے قدموں سے اکھڑ جاتا؟

ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ انسان تھا اس کے سینے میں دل تھا اور دل میں ایک کونا ضمیر کا بھی تھا..... جو اس وقت اس
سے شرمندہ ہو رہا تھا اور اسے بھی کر رہا تھا اور دل آور شاہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح پتھر ثابت کرتا ہوا اس کی گرفت سے
آزاد کروا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

''ڈرائیور.....'' اور وہ وہیں فرش پہ بیٹھی ذلت، اذیت اور بے بسی کے احساس سے چیخ اٹھی تھی مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

♥

اس کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی
بٹی کا یہ کھیل کافی دیر سے جاری تھا جس کو کھیلتے کھیلتے وہ بالآخر تھک گئے تھے اور وہیں لان چیئرز پہ بیٹھ گئے تھے جبکہ وہ
ڈھونڈتی ڈھونڈتی گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ لیکن اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ گھر سے باہر نکل آئی ہے اور کس راستے پہ کس طرف
ہے؟ وہ بس ہاتھوں سے ہوا میں راستے کی سمت ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور جس راستے پہ وہ آگے بڑھ رہی تھی وہ
کی طرف جا رہا تھا، اتنی اونچائی کی طرف کہ جس کو دیکھ کر ہی خوف آ جائے اور وہ تھی کہ دیکھ ہی نہیں رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھ
پٹی بندھی ہوئی تھی اسے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا وہ تو بے خبری میں موت کے منہ میں جا رہی تھی۔

''پاپا..... پاپا..... بولیں نا..... کہاں ہیں آپ؟ آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں کچھ بولتے کیوں نہیں؟ پلیز آپ سامنے
نا..... میں آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔'' وہ اپنی دھن اور بے خبری میں انہیں پکارتی ایک بہت ہی اونچائی پہاڑی کی طرف آ گئی
کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف کھائی تھی ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور گہری کھائی اسے نگلنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور وہ
سے انجان اپنے پاپا کو ہی پکار رہی تھی۔

''پاپا.....'' اب کی بار اس نے انتہائی زور سے پکارا تھا اور تھوڑی دیر سانس بحال کرنے کی غرض سے بیٹھنے والے
کے لیے یہ پکار دل دہلا دینے والی ثابت ہوئی تھی وہ یکدم گھبرا کے اٹھے تھے اور اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر آ گئے تھے وہ
آگے بڑھ رہے تھے ان کے جسم سے جان ختم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ انہیں یاد تھا کہ علیزے کی آنکھوں پہ سیاہ پٹی بندھی ہونے
کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور اس کا نہ دیکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا اسی لیے وہ زیادہ ہی بوکھلا رہے تھے۔

''پاپا..... علیزے کی پکار بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ بے ساختہ اس طرف کو بھاگے تھے جس طرف سے آواز آ رہی تھی اور وہ اس طرف آ ہی گئے تھے اور وہاں آ کر
محسوس ہوا تھا کہ جیسے جسم میں رہی سہی جان بھی کسی نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر نکال دی ہو اور وہ جہاں تھے وہیں کے ہو کے
گئے تھے کیونکہ ان کے کلیجے کا ٹکڑا..... ان کی زندگی..... ان کا سرمایہ حیات..... ان کی علیزے موت کے منہ میں کھڑی تھی
دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ بے بس اور لاچار کمزور اور عاجز..... کچھ کرنے کی تو سکت ہی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اختیار تھا۔

''پاپا پلیز ہیلپ می..... مجھ سے یہ..... یہ پٹی نہیں کھل رہی..... پاپا..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... پلیز یہ کھول دیں
پلیز ہیلپ می۔'' وہ سختی سے بندھی پٹی کو کھولنے کی کوشش میں کبھی ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی اور کبھی پیچھے ہٹ رہی تھی
زندگی بس اسی ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے کے درمیان ڈول رہی تھی۔ اگر ذرا جو تیسرا قدم اٹھا لیتی تو یقیناً موت کی
پہنچ جاتی اور وقار آفندی اسے اسی تیسرے قدم سے باز رکھنا چاہتے تھے اسے پکارنا چاہتے تھے اسے بچانا چاہتے تھے
جانے کیا ہوا تھا کہ ان کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہیں پا رہے تھے اور وہ

کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اسے روکنے سے اور پکارنے سے قاصر تھے اور یہی سوچ کر وقار آفندی کی رگوں میں اک سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی اور پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ ان کے سامنے تھی لیکن وہ ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی بہت دور بہت دور فاصلے پر تھی اتنے فاصلے پہ جتنے فاصلے پہ زندگی سے موت تھی۔ یا تو لمحہ بھر کا فاصلہ یا پھر عمر بھر کا فاصلہ..... اور ادھر علیزے آفندی اپنی آنکھوں پہ بندھی پٹی سے الجھ رہی تھی اور بے بس ہو رہی تھی۔

"پاپا..... پاپا..... پلیز کہاں گئے ہیں آپ؟" علیزے کی پریشان اور بھرائی ہوئی آواز انہیں یہاں تک سنائی دے رہی تھی لیکن ان کی اپنی آواز اور قوت گویائی سلب ہو چکی تھی اور اس کشمکش اور پریشانی کے عالم میں انہوں نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار اور منہ زور جھونکا علیزے کے قدم اکھاڑ گیا تھا اور وہ اتنی نازک تھی کہ ہوا کے سر پھرے جھونکے سے ہی لڑکھڑا گئی تھی اور اس کا یہ لڑکھڑانا اسے موت سے قریب کر گیا تھا اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ سیدھی ہزاروں فٹ نیچے گہری کھائی میں جا گری تھی اور اس کی دلخراش چیخیں پوری وادی میں گونج رہی تھیں۔

"پاپا..... اس کی آخری چیخ اور آخری پکار بھی یہی تھی اور وہ وقار آفندی تھرا اٹھے تھے۔

"علیزے..." انہوں نے اپنی پوری قوت سے اسے پکارا تھا اور ان کی اس پکار سے بھی پوری وادی گونج اٹھی تھی۔ ان کی علیزے ان کی آنکھوں کے سامنے مر گئی تھی اور وہ اسے بچا بھی نہیں سکے تھے اور اسی خیال اور اسی درد کے ہاتھوں وہ سر تا پا پسینے میں شرابور ہو گئے تھے اور ان کا جسم برف کی مانند ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ جس کے باعث ان کے ساتھ بیڈ پہ سوئی آسیہ آفندی کی بھی آنکھ کھل گئی تھی انہوں نے فوراً آنکھ کے لیمپ جلا دیے تھے۔

"وقار! کیا ہوا ہے آپ کو..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" آسیہ آفندی نے کافی تشویش سے پوچھا تھا کیونکہ ان کے جسم کو ہلکے ہلکے سے جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"وقار! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کی حالت تو بہت خراب لگ رہی ہے؟"

"ع..... ع..... لیز..... ے..... ع..... عل..... علیزے۔" ان کی فالج زدہ زبان سے بمشکل علیزے کا نام ادا ہوا تھا اور آسیہ آفندی ساکت و صامت سی رہ گئی تھیں۔

"علیزے.....؟" انہوں نے یہ نام زیرِ لب خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تھا۔ دو ماہ بعد ان کی مفلوج زبان نے پہلی بار حرکت کی تھی تو علیزے کے نام پہ وہ خیران نہ ہوتیں تو اور کیا ہوتا؟

یعنی ان کا لاچار و مفلوج اور بے بس جسم علیزے کے نام پہ اور علیزے کی تکلیف پہ اب بھی تڑپ اٹھتا تھا؟ تو اس کا مطلب تھا کہ ان کی یہ حالت علیزے کی "وجہ" سے نہیں بلکہ علیزے کے لیے ایسی ہوئی تھی؟ انہیں بس علیزے کے دکھ کا دکھ تھا انہیں بس علیزے کی تکلیف کی تکلیف تھی وہ آج بھی اپنے درد پہ نہیں علیزے کے درد پہ تڑپے تھے۔ جیسے اس وقت تڑپ رہے تھے اور رات کے اس پہر ان کی ایسی حالت اور ایسی تڑپ دیکھ کر آسیہ آفندی گھبرا گئی تھیں کیونکہ ان کی حالت رفتہ رفتہ مزید بگڑ رہی تھی۔

"ع..... ع..... علیز..... ے..... لیز..... ے..... ع..... عل..... لیز..... ے....." وہ بمشکل ہانپتی ہوئی سانسوں کے درمیان لڑکھڑاتی زبان سے اس کا نام مکمل کر پا رہے تھے اور ان کا لہجہ جیسے بھیگ رہا تھا۔

"اس وقت علیزے آپ کو کیوں یاد آ گئی؟ کیا آپ نے اسے خواب میں دیکھا ہے؟ کیا ہوا ہے اس کو؟" آسیہ آفندی کا انداز بالکل درست تھا۔ وہ جان گئی تھیں کہ ضرور انہوں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے لیکن ان کا یہ سوال کہ "کیا ہوا ہے اس کو؟" انہیں دوبارہ سے کچھ دیر پہلے کی منظر کی یاد دلا گیا تھا اور وہ منظر پھر سے ان پہ لرزا سا طاری کر گیا تھا اور ان کی روح بھی کپکپا گئی تھی۔

"وقار..... وقار..... آپ پلیز سنبھالیں اپنے آپ کو..... میں..... میں ابھی دانیال کو بلاتی ہوں۔" آسیہ آفندی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ تیزی سے موبائل اٹھا کر دانیال کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھیں۔ عائشہ آفندی کی فیملی ایکسی میں رہتی تھی اور اپنے بیڈ روم سے نکل کر ایکسی تک جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا بھی کسی دوسرے گھر جانے اور آنے کے برابر لگتا تھا اور اس جانے اور آنے میں کافی ٹائم بھی لگ جاتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ فون کال کا سہارا لے لیتیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

"ہیلو..." دانیال کی آواز نیند کی وجہ سے کافی بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

"صاحب! آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟" اس نے پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

"ہوں... تم گیٹ کھولو۔" اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا اور گلاب خان اس کا موڈ دیکھتے ہوئے پلٹ کر گیٹ تک چلا گیا اور گیٹ کھول دیا تھا اور وہ اپنی گاڑی زناٹے سے نکال لے گیا تھا۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا اور وہ گھر سے نکل کر سڑکوں پہ آ گیا تھا۔ اس کے اندر ابال اُٹھ رہے تھے وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور اسی بے کل اور مضطرب کیفیت کو ضبط کرتے کرتے اس نے اسٹیئرنگ پہ مکا دے مارا تھا۔

"میں دنیا کا بے بس ترین انسان ہوں..... میں کبھی کچھ بھی نہیں کر پایا..... کسی کو محبت نہیں دے سکا اور کسی کو عزت نہیں دے سکا بلکہ یہ سب تو دور کی بات ہے، میں تو اپنی ماں کو اس کی محنت کا صلہ بھی نہیں دے سکا میں بہت بدقسمت انسان ہوں، مجھ سا بدقسمت دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا، کوئی بھی نہیں۔" وہ انتہائی رش ڈرائیو کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پہ اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھوں کی رگیں اُبھر آئی تھیں اور دل و دماغ میں ایک محشر برپا تھا اور ایسے عالم میں تو اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی گاڑی کا رخ کس طرف ہے؟

♥

"شہ... تم یہاں..... اس وقت؟"

صبح کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا اور وہ تیار ہو کر ناشتہ کرنے کے لیے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں کہ اچانک گھر کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے دل آور شاہ کو دیکھ کر ان کے رواں رواں قدم سیڑھیوں پہ ہی رک گئے تھے۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کر ذرا سے توقف کے بعد ان کے قدموں میں پھر سے روانی آ گئی تھی اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب رکی تھی۔

"شہ... تم بول کیوں نہیں رہے؟ کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟" بتول شاہ نے اس کا چہرا اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں اماں زندہ سلامت ہوں، آپ کے سامنے ہوں، آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟"

"شہ... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" انہوں نے اسے اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اماں پلیز... آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہی ہے، میں یہاں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں، آپ کو پریشان کرنے کے لیے نہیں آیا۔" دل آور نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پر رکھے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"تم اس وقت اتنی دور سے مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو؟ مگر کیوں؟ خیریت؟" وہ بھی آخر دل آور کی ماں تھیں، اس کے جواب پہ مطمئن ہونے والی نہیں تھیں جیسے وہ خود نہیں ہوتا تھا۔

"یہاں آنے سے پہلے جو آخری خیال آیا وہ آپ کا تھا اور اس خیال کے ساتھ ساتھ میں بھی آپ کی طرف آ گیا۔" وہ ان کے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھپکتے ہوئے بولا تھا اور بتول شاہ نے چونک کر خاصی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"پہلا خیال کس کا تھا؟" ان کا سوال مختصر اور دو ٹوک تھا۔ جس پہ دل آور کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر ان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"تمہیں زری کے خیال آتے ہیں اور زری کو تمہارے خواب آتے ہیں تم یہ خواب و خیال کے سلسلے جوڑ کیوں نہیں دیتے؟" انہوں نے اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کافی مضبوط لہجے میں پوچھا تھا اور صوفے کی سمت بڑھتے دل آور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ گویا وہ پہلے خیال تک جا پہنچی تھیں۔

"کیونکہ مجھے اور بھی بہت سے خیال آتے ہیں۔" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"کیسے خیال؟" وہ عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"کل کچھ دوستوں کے اور کچھ دشمنوں کے۔" اس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں، جبکہ بتول شاہ نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"دوستوں کا خیال آنا تو محبت کی علامت ہے مگر دشمنوں کا خیال آنا کس چیز کی علامت ہے؟" ان کا لہجہ قدرے تیکھا سا محسوس

ہو رہا تھا۔

''انسانیت کی۔'' دل آور کے اگلے جواب پہ وہ اور زیادہ چونکی تھیں۔

''تو کیا تمہاری انسانیت کو اس کا خیال آتا ہے جو انسان ہی نہیں ہے؟'' بتول شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

''پلیز اماں! میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے وقار آفندی کا خیال آتا ہے؟'' وہ جھنجلا گیا تھا۔

''تو پھر.....؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''مجھے اس کی بیٹی کا خیال آتا ہے۔'' دل آور کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

''اس کی بیٹی کا؟'' انہیں ایک اور جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں..... اس کی بیٹی کا..... علیزے کا؟'' اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''مگر کیوں؟'' ان کے سوال کافی مختصر سے تھے اور لہجہ بھی بدل چکا تھا۔

''گزشتہ رات میں اسے کھانا دینے گیا تھا۔'' وہ بتاتے ہوئے مختصر سا گیا تھا۔

''پھر.....؟'' انہوں نے اسے بولنے پہ اُکسایا تھا۔

''پھر میں نے وہ سب دیکھا جو میرے پلان میں نہیں تھا۔'' دل آور کہتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا اور بتول شاہ اس سے مزید بولنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''وہ..... وہ..... وہ میرے قدموں میں جھک گئی تھی۔'' وہ بڑے کرب سے بتا رہا تھا اور بتول شاہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی اور سینے کے اندر سانسوں سے رکھا پتھر بھی کانپ گیا تھا وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھے دل آور کو دیکھ کے رہ گئیں۔

''تم اپنی بتاؤ..... تم جھکے یا نہیں؟'' وہ اس کا جواب سننا چاہتی تھیں۔ ''میں کیسے جھک جاتا اماں؟ یہ..... یہ میرے لیے مقام نہیں ہے۔ یہاں دل آور شاہ جھکے تو بے غیرت کہلائے گا۔'' وہ بے ساختہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''جس انسان نے جھکنا ہو وہ ''در'' نہیں دیکھتا دل آور شاہ! چاہے وہ در زری کا ہو، چاہے علیزے کا..... جب جھک جانا ہے تو پھر یہ در کیا؟ اور وہ در کیا؟'' وہ عجیب تلخ سے لہجے میں بولی تھیں۔

''مگر میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا اماں! ہرگز نہیں..... مر بھی جاؤں تب بھی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

''نکاح.....؟'' بتول شاہ نکاح کے لفظ پہ جیسے سناٹے میں آ گئی تھیں۔

بے شک یہ انہی کا ظرف تھا کہ وہ اسے جھکنے کا کہہ رہی تھیں، مگر نکاح کا لفظ سن کر ایک بار تو انہیں یوں لگا تھا کہ جیسے ان کے جسم اور ان کے دل پہ کسی نے جلتے دہکتے کوئلے انڈیل دیئے ہوں اور ان کے جسم کے ساتھ ساتھ ان کے دل کے بھی پرخچے اڑ گئے ہوں اور وہ کھڑے کھڑے دھجیوں میں بکھر گئی تھیں ان کی ذات پہ سیاہ تاریکی کے سائے لہرا گئے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے ہزاروں فٹ کی اونچائی سے پھینکے جانے والے شیشے کی ہوتی ہے۔ چکنا چور..... ریزہ ریزہ..... ٹکڑوں میں تقسیم۔

اور ان تقسیم شدہ ٹکڑوں کو دوبارہ جمع کر کے ایک شکل میں لانا انتہائی ناممکن سی بات تھی مگر وہ واقعی ایک مضبوط اور پتھریلی نما عورت تھیں وہ ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی ہمت اور حوصلہ رکھتی تھیں ان کی حالت شیشے کے ٹکڑوں جیسے تو ہو سکتی تھی مگر ان کی طرح شیشے جیسی کمزور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہادر خاتون تھیں اور انہوں نے بہادر ہی رہنا تھا وہ اپنی زندگی کو ایک جنگ سمجھتی تھیں اور یہ جنگ انہوں نے اپنے آخری دم تک لڑنی تھی اور اس جنگ مسلسل کا انہوں نے کبھی اپنے رب سے شکوہ بھی نہیں کیا تھا اور وہ شکوہ کرنے والوں میں سے تھیں بھی نہیں، بلکہ وہ تو صبر و شکر کرنے والوں میں سے تھیں..... ورنہ انہوں نے آج تک اللہ نے جو انہیں عطا کیا تھا اس پہ شکر کیا تھا اور جو ہوا تھا اس پہ صبر کیا تھا اور آج بھی ان کی آزمائش کی گھڑی تھی، آج پھر اللہ نے انہیں آزمایا تھا اور وہ آزمائش کا پیالہ پی گئی تھیں۔

''وقار آفندی مت بنو دل آور شاہ۔'' بتول شاہ پیالہ پی چکی تھیں اور دل آور شاہ دم بخود سا رہ گیا تھا وہ اپنے سامنے کھڑی عورت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ واقعی ایک عورت ہیں یا پتھریلی چٹان؟ اتنا حوصلہ اتنا ظرف اتنا صبر تو اس نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج اپنے سامنے کھڑی عورت میں دیکھ رہا تھا۔

''اماں.....؟'' دل آور کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا یہ لفظ بھی کپکپا رہا تھا کیونکہ وہ بے یقینی کی انتہا پہ تھا۔

میں ایک کہہ رہی ہوں دل آور شاہ! وقار آفندی مت بنو، تمہاری رگوں میں دوڑتا بابر شاہ کا خون اور اس خون میں بہتی بتول شاہ کی محبت کبھی بھی یہ اجازت نہیں دیتی کہ تم بے رحمی اور سفاکی کے راستے پہ چلو۔ یا پھر تم کسی وحشت یا درندگی کا مظاہرہ کرو، میں ایک انسان دیکھنا چاہتی ہوں، حیوان نہیں۔" بتول شاہ کا لب و لہجہ اچھا خاصا بے لچک نظر آ رہا تھا۔

"اماں..... آپ..... آپ..... یہ سب کیا کہہ رہی ہیں؟" دل آور نے ان کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے انہیں دونوں آنکھوں سے تمام لیا تھا اور ان کے احساسات سے عاری اور سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، میں جو کہتی ہوں وہ ایک ہی بار کہتی ہوں اور مجھے بھی پتا ہے کہ تم ایک بار میں ہی سمجھ جاتے ہو۔" بتول شاہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ سب کرنا انتہائی مشکل، بلکہ ناممکن سی بات تھی۔ اس لیے وہ آہستگی سے نفی میں سر ہلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"نہیں اماں! میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ آپ..... آپ مجھے حکم دو کہ میں اپنا سر کاٹ کے آپ کے قدموں میں رکھ دوں، تو قسم سے اس پر ذرا بھی میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ لیکن..... یہ..... یہ سب نہیں کر سکتا۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر اس کو اس نوبت پہ پہنچانے والے بھی تو تم ہو..... کہ وہ تمہارے قدموں میں جھکنے پہ مجبور ہو گئی ہے پہلے اس نے اپنے باپ کے کیے کا بھگتان بھگتا ہے اور اب تمہارے کیے کا بھگتان بھگتے گی..... کیوں؟ کس لیے آخر؟ وہ عورت ہے اس لیے یا پھر تم مرد ہو اس لیے؟ حالانکہ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تم ایسا کوئی کام مت کرنا کہ میں زندگی میں کبھی تمہیں معاف نہ کر سکوں۔ مگر تم نے میری ایک نہیں سنی..... تم نے تب بھی اپنی مرضی کی..... اور تم آج بھی اپنی مرضی کر رہے ہو؟ کیا اس سب کے بعد بھی تم مجھ سے معافی کی توقع رکھو گے۔" وہ خاصے سخت لہجے میں بولتے ہوئے دل آور کے چہرے کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

"مگر اماں! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ مجھے کبھی معاف ہی نہ کر پائیں..... وہ جیسی تھی..... ویسی ہی ہے..... میں نے اس کے اور اپنے درمیان مرد اور عورت والی "ہوس و نفس" کو جگہ نہیں دی..... وہ تو اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی۔" دل آور نے ماں کے سامنے گویا ہی دی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی، مگر یہ بات تم کس کس کو بتاؤ گے؟ اور کون کون اس بات کو مانے گا کہ وہ ابھی بھی ویسی ہی ہے۔ یہ بات تو یا تم جانتے ہو یا پھر تمہارا خدا جانتا ہے لیکن خدا کی خدائی نہیں جانتی..... کیونکہ خدائی وہی کچھ جانتی ہے جو سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے..... اب سامنے نظر آنے والی چیز کے پیچھے کیا ہے یہ کوئی بھی جاننے کی زحمت نہیں کرتا۔" بتول شاہ نے اپنی ٹھوڑی کو سے لگتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اماں! آپ کی ہر بات اور ہر حکم سر آنکھوں پہ..... لیکن میں اس کے لیے بس اتنا کر سکتا ہوں کہ اسے واپس بڑی حویلی چھوڑ آؤں..... اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا..... میں مر تو سکتا ہوں..... مگر وقار آفندی کی بیٹی کو بیوی نہیں بنا سکتا..... چاہے میرے لیے اس دنیا میں رہ جانے والی وہ آخری لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔" دل آور کا لہجہ بتول شاہ سے بھی زیادہ سخت اور پتھریلا ہو رہا تھا۔

"آخر تم نے اسے واپس ہی چھوڑنا تھا تو لائے ہی کیوں تھے؟" وہ دونوں ماں، بیٹا ایک دوسرے کو دو بدو جواب دے رہے تھے۔

"میں وقار آفندی کو سزا دینے کے لیے اسے لایا تھا اور وہ یہ سزا بھگت بھی رہا ہے..... یہ دیکھیے..... یہ میرا موبائل دیکھیے..... اس میں وقار آفندی پہ دورہ پڑنے کی اطلاع ہے..... جو اسے آج رات ہی پڑا ہے..... اور وہ اس وقت ہسپتال میں ہے..... یہ ہے اس کی سزا..... عبرتناک سزا..... جب جب سوچے گا، مرے گا..... اور میں اسے اس طرح ماروں گا..... تڑپا تڑپا کر..... ورنہ میں چاہتا تو اسے کوئی بھی مار سکتا تھا..... اس کا ایکسیڈنٹ کروا کر اسے اپاہج بھی بنا سکتا تھا مگر اسے پھر بھی اتنی اذیت نہیں پہنچ سکتی تھی..... جتنی اب پہنچ رہی ہے..... صرف اس خیال سے اس سوچ سے کہ اس کی بیٹی دل آور شاہ کے پاس ہے..... بابر شاہ کے بیٹے کے پاس..... آپ خود بھی نہیں کر سکتیں کہ میری طرف سے ملنے والی یہ سزا وقار آفندی کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی..... اور رہی بات عبیرہ آفندی کی بے بی کی تو وہ میں ایک دو دن میں ختم کر دوں گا..... واپس بھیج دوں گا اسے۔" اس نے کہتے ہوئے بات ہی ختم کر دی تھی اور ان کے سامنے سے ہٹ کر باہر نکل گیا تھا اب اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا اور بتول شاہ ڈرائنگ روم کے

بچوں بیچ کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

♥

وہ گھر کیا آیا تھا کہ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی ماں بھی خوش تھی اور بہنیں بھی آگے پیچھے دوڑتی پھر رہی تھیں۔ اس کی رہائی کی خوشی اور دوسری اس کی جاب کی خوشی نے انہیں اپنی ساری تکلیفیں بھلا ڈالی تھیں، اللہ نے واقعی انہیں صبر کا پھل دیا تھا اور وہ تب سے اب تک دل آور شاہ کے لیے دعائیں کر رہی تھیں جس نے ان غریبوں پر اتنا بڑا احسان کیا تھا۔

''کیا بات ہے آخر..... آج بڑی دل لگا کر تیاری کی جا رہی ہے؟ آپ نے آفس ہی جانا ہے یا کسی ڈیٹ کا پلان ہے؟'' اس کا کمرا صاف کرنے کی غرض سے دوبارہ اس کے کمرے میں آ چکی تھی مگر وہ ابھی تک آئینے کے سامنے کھڑا تیار ہو رہا تھا۔ نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل مسکراتا ہوا اس کی سمت پلٹا تھا۔

''اُف یار..... پہلی بار تو نہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں اور آپ لوگوں کو پہلی بار ہی نکلنے لگا ہے؟'' اس نے معصومیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ مریم حیران رہ گئی تھی۔

''اوہ..... تو آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو کھلی چھوٹ دے دیں۔ آپ پہ نظر بھی نہ رکھیں اور آپ ایک روز اچانک ہی بھرجائی گھر لے آئیں..... وہ بھی ہمیں خبر کیے بغیر؟'' مریم نے اسے بغور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر حیرت اور تعجب کا مظاہرہ کیا تھا۔

''یہ بھی خوش فہمی ہے تمہاری..... ورنہ اچانک تمہاری بھرجائی کو گھر لے آنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ جتنا تم تصور کر رہی ہو کام امیر لوگوں کے ہیں..... ہم غریب لوگوں کے نہیں..... اچانک شادیاں وہی ارینج کر سکتے ہیں۔'' عدیل نے کندھے اچکائے اور چارپائی کے پائے پہ پاؤں رکھ کے ذرا سا جھکتے ہوئے جوتوں کے تسمے باندھنے لگا تھا۔

''ایسی کرم نوازیاں بھی کبھی کبھی غریبوں پہ بھی کر دیتا ہے..... بس مایوس نہیں ہونا چاہیے..... اس کا کرم کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔'' مریم کہتے ہوئے اس کے کپڑے اور جوتے وغیرہ اُٹھا کر سمیٹنے لگی تھی لیکن ابھی عدیل نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ باہر دروازے پہ دستک ہونے لگی تھی اور عدیل جلدی جلدی تسمے باندھ کے سیدھا ہو گیا تھا۔

''ارے آج صبح صبح کون آ گیا؟'' وہ برآمدے میں لگے وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے باہر دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

''کون.....؟'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے یونہی پوچھا تھا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھول دیا تھا مگر دروازہ کھول کے بعد وہ حیران پریشان اور بے یقین سا دیکھتا رہ گیا تھا اس کے سامنے مدیحہ حیات کھڑی تھی اور وہ حیرت زدہ سا کھڑا تھا۔

''السلام علیکم.....'' مدیحہ نے اس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے سلام کیا تھا۔

''ہوں..... ہاں..... وعلیکم السلام۔'' وہ بمشکل اپنی حیرت اور پریشانی کے گھیرے سے باہر آتے ہوئے متوجہ ہوا تھا۔

''کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' اس نے خود ہی اندر آنے کے لیے اجازت مانگی تھی اور عدیل اپنی بدحواسی اور کوتاہی پہ سر ڈنش کرتا ہوا سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

''ایم سوری..... آیئے آپ اندر آیئے۔'' اس نے اسے راستہ دیا تھا اور مدیحہ اندر آ گئی تھی حالانکہ اندر قدم رکھتے ہوئے دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور وہ اندر سے جھجک بھی رہی تھی آخر وہ عدیل عمر کے گھر پہلی بار آئی تھی جس پہ عدیل کی بھی جان ہی تھی جیسی اس کی ہو رہی تھی۔

''ارے مدیحہ آپ؟'' مریم عدیل کے کمرے سے نکلتے ہوئے مدیحہ کو دیکھ کر بے ساختگی چیخی تھی اور لپک کے اس کے پاس آئی تھی۔

''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' مدیحہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے اس کی سمت ہاتھ بڑھایا تھا جبکہ مریم اس کے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی تھی۔

''رشتہ قریب کا ہو تو قریب سے ملنا چاہیے۔ اس طرح دور سے نہیں۔'' مریم نے ذومعنی لہجے میں کہتے ہوئے عدیل اور مدیحہ دونوں کو کن انکھیوں سے دیکھا تھا اور عدیل بال کھجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''امی..... امی..... باہر آئیں..... دیکھیں کون آیا ہے؟'' مریم نے عابدہ خاتون کو آواز دی تھی اور وہ فاروق

سے ملنے آئی تھیں مگر مریم اور عدیل کے ساتھ کھڑی تھیں اور لیکچر نوٹ میں مگن تھیں انہوں نے بھی ان کو نہیں دیکھا تھا۔

"السلام علیکم" مدیحہ نے ہی سب کو سلام کرنے میں پہل کی تھی۔

"ای ایز ویل آور شاہ کی بہن ہیں..... مدیحہ حیات، جب ابا جی کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو یہی ہمیں اپنی گاڑی میں ہسپتال لے کر گئی تھیں۔" مریم نے اس کا تعارف کروایا تھا اور عابدہ خاتون کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، انہوں نے مدیحہ سے ملنے سے پہلے اک نظر عدیل کی سمت بھی دیکھا تھا وہ ان کی اک نظر سے ہی خجل سا ہو گیا تھا کیونکہ عابدہ خاتون اسے اک نظر میں ہی "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" کا احساس دلا چکی تھیں۔

"آؤ بیٹا..... اندر آ جاؤ..... باہر کیوں کھڑی ہو؟" وہ اسے اپنے ساتھ لیے فاروق نیازی کے کمرے میں آ گئی تھیں دراصل وہ اسے فاروق نیازی سے ملوانا چاہتی تھیں۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا بھائی صاحب؟" مریم نے ان کے اندر جانے کے بعد عدیل کو چھیڑا تھا اور عدیل بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"ارے یار! میں نے واقعی آفس جانا ہے، میرا کوئی پلان نہیں ہے۔"

"آپ کا نہ ہو، ان کا تو ہے نا؟ اور ویسے بھی اب آپ نے آفس کیا جانا ہے بھلا؟ اب تو وہ متھے لگ چکی ہیں وہ بھی پہلے ہی روز۔" مریم نے آج پورا پورا ارادہ باندھ رکھا تھا اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا جس پہ عدیل بار بار ہنس رہا تھا اور انجوائے کر رہا تھا۔

"ارے..... ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ متھے لگنا میری قسمت ہی سنوار دے؟" عدیل نے اپنے فائدے کا پہلو تلاش کیا تھا جس کو سن کر مریم بھی اس کی چالاکی اور ذہانت پہ ہنس پڑی تھی۔

"صبح صبح دیدار ہو گیا ہے، قسمت تو آپ کی ویسے ہی سنور گئی ہے۔" مریم نے پھر چھیڑنے والے انداز میں دیکھا تھا۔

"ہاں..... اتنے دنوں بعد ہوا ہے یہ دیدار بھی....." عدیل نے جیسے آہ بھری تھی۔

"بھائی....." مریم نے حیرت سے چلا کے پکارا تھا۔

"چھوڑو یار..... اندر جاؤ..... وہ امی اور ابا جی کے پاس اکیلی ہو گی۔" عدیل نے اسے اندر بھیجا تھا۔

"اور آپ.....؟" مریم نے جاتے جاتے اسے دیکھا۔

"میں بھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا لیکن ابھی اسے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مریم، مدیحہ کو لے کر اس کے پیچھے ہی آ گئی تھی۔

"آپ یہاں بیٹھیں..... بھائی سے بات کریں..... میں تب تک چائے بنا کر لاتی ہوں۔" مریم اسے چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

مدیحہ کمرے کی تنہائی میں نروس سی ہو گئی تھی اور اس کا یہ نروس سا انداز عدیل کی خواہشوں کو کروٹیں بدلنے پہ مجبور کر گیا تھا اس کا دل اس خواہش پہ تو بہ کرنا زیادہ ہی مچلا تھا کہ وہ اسے کندھوں سے تھام کے اپنے بے حد قریب کر لے۔ مگر خواہش تو آخر خواہش ہی ہوتی ہے نا؟ پوری ہو جائے ضروری تو نہیں..... سو مجبوراً ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنی اس خواہش کو دبا کر خود پہ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔

"بیٹھیے....." عدیل نے اسے کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر وہ بڑے اہتمام سے کرسی پہ بیٹھنے کے بجائے عدیل کے بستر پہ ہی بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد وہ خود کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ عین اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

"کیا آج بھی آپ میرے ابا جی کی خیریت ہی پوچھنے کے لیے آئی ہیں؟" اس نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے والا سوال کیا تھا۔

"آف کورس..... اور کس لیے آنا تھا میں نے؟" لیکن اس بار مدیحہ نے بھی اپنے مزاج کے مطابق جواب دیا تھا کیونکہ جس طرح ٹاٹ کے وہ اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے مزید نروس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس کے ارادے کو ارادہ ہی رہنے دیتی۔

"رئیلی....." عدیل نے اور زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

"اپنی ڈاؤٹ....." مدیحہ نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی جیسے مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں..... ڈاؤٹ تو ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"کیا؟" مدیحہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔" عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب..... کیا سمجھ رہے تھے آپ؟" مدیحہ ناسمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہی کہ آپ خیریت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ خیریت دیکھنے کے لیے آئی ہیں۔" عدیل نے دیکھنے پہ زور دیا تھا اور مدیحہ کا اشارہ سمجھتے ہوئے اپنی مسکراہٹ روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آخر وہ ٹھیک ہی تو سمجھا تھا وہ اسے دیکھنے ہی تو آئی تھی۔ کن دنوں سے دیکھا جو نہیں تھا۔

"اوہ..... تو یعنی میں ٹھیک ہی سمجھا تھا؟" عدیل اس کی مسکراہٹ سے باغ و بہار ہو گیا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ آپ ٹھیک ہی سمجھے تھے؟" مدیحہ اب اسے خفا کرنے کے موڈ میں تھی۔

"آپ کے چہرے کے اک اک نقش نے..... آپ کی آنکھوں نے..... آپ کے ہونٹوں نے آپ کی مسکراہٹ نے" عدیل نے وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے در پیچے میں بھی جھانکا تھا جہاں آپ عدیل کو اپنا آپ ہی بسا ہوا نظر آیا تھا۔

"غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے آپ کی؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"اگر یہ غلط فہمی ہے تو پھر میں اس غلط فہمی میں ہی خوش ہوں..... مجھے اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیں۔" وہ دلکش ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"لیجیے..... آپ کے لیے گرما گرم چائے اور ساتھ میں قیمہ اور پراٹھے....." مریم بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر آ گئی تھی۔

"قیمہ اور پراٹھے؟"

"کل بھائی کے آنے کی خوشی میں امی نے ان کی پسندیدہ ڈش بنائی تھی، امی کو پتا تھا کہ بھائی ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ قیمہ ہی کھائیں گے۔" مریم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

"اوہ..... تو یہ ان کا ناشتہ ہے؟ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ کہیں مجھے نہ کھانا پڑ جائے۔" مدیحہ قدرے ریلیکس ہو گئی تھی اور اس بات پہ وہ دونوں بہن، بھائی ہنس پڑے تھے۔

"ارے..... کھانا تو آپ کو پڑے گا..... کیونکہ یہ صرف ان کا ناشتہ نہیں ہے..... یہ آپ دونوں کا ناشتہ ہے آپ کو پڑے گا ان کے ساتھ۔" مریم نے شرارت سے دونوں کو دیکھا تھا۔

"تو..... میں پہلے بھی ایک بار ان کو بتا چکی ہوں کہ میں اتنا ہیوی ناشتہ نہیں کرتی، مجھے عادت نہیں ہے۔" مدیحہ نے نفی میں سر ہلایا تھا اور مریم نے اس کے انکار پہ عدیل کی سمت دیکھا تھا کہ اب کیا کرے؟

"ڈونٹ وری..... یہ آج ناشتہ میرے ساتھ ہی کریں گی..... کیونکہ یہ ناشتہ کسی ہوٹل کا نہیں، بلکہ میری امی کے ہاتھ کا بنا ہے۔" عدیل نے مریم کو تسلی دی تھی اور وہ مطمئن ہو کر مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی تھی مریم کو بھی اکیڈمی جانا تھا۔ اس لیے وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔

"مگر میں یہ....." مدیحہ کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی اور عدیل نے ناشتہ شروع بھی کر دیا تھا۔

"جب کسی کے ساتھ چلنا ہو تو اس کے ہر کام میں اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ چاہے وہ ناشتہ ہی کیوں نہ ہو۔" عدیل نے پرسکون سے کہتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھ چکا تھا انداز بہت لاپروا سا تھا اور مدیحہ مزید کوئی انکار نہیں کر سکی تھی اور اس کے ساتھ ناشتہ کرنے میں شریک ہو گئی تھی، جس پہ عدیل ناشتہ کرنے کے دوران ہی مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلنا چاہتا ہے اور اس کی خاطر وہ اپنے آپ کو بدل بھی سکتی ہے اور یہ بات عدیل کے لیے ایک خوش آئند بات تھی۔

"تھینک یو....." عدیل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"فار واٹ....." مدیحہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ٹھہر گئی تھی اور حیرانی سے سوال کیا تھا۔

ساتھ دینے کے لیے۔" عدیل کا لہجہ اور جواب دونوں ہی مبہم اور متبسم سے ہو رہے تھے۔

"میرا ساتھ دینے کے لیے کیا ہے کہ یہ آپ کی امی نے بنایا ہے۔" مدیحہ بھی اتنی آسانی سے اسے خوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں نے یہ ناشتہ اس لیے کیا ہے کہ یہ آپ کی امی نے بنایا ہے۔" عدیل بھی اتنی آسانی سے اسے خوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"جس لیے بھی کیا ہے..... جس لیے بھی کیا ہے..... مگر ساتھ تو میرا ہی دیا ہے نا؟ اس لیے تھینکس اگین۔" عدیل چائے کے سپ لیتے ہوئے مطمئن سے انداز میں کہہ رہا تھا اور جواباً مدیحہ خاموش ہو گئی تھی۔

"اوکے میں اب چلتی ہوں..... کافی ٹائم لے لیا آپ کا۔" مدیحہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی عدیل بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

"ٹائم کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ لے لیا ہے آپ نے۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"کیا کہا.....؟" مدیحہ چونکی تھی۔

"کچھ نہیں کہا..... بس ریکوئسٹ کر رہا ہوں کہ ابا جی کی خیریت پوچھنے کے لیے آتی رہا کریں..... دل بہلا رہے گا۔" عدیل نے آج پھر اسے تاکید کی تھی۔

"اس کا....." مدیحہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے رکی تھی۔

"دل کون ابا جی کا..... اور کس کا بہلا؟" عدیل کہتے ہوئے شرارت سے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدیحہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بیگ لے کر باہر نکل آئی تھی اور پھر سب سے مل کر وہاں سے رخصت ہوئی تھی جبکہ عدیل گھر سے نکل کر گلی میں اسے گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔

"ویسے ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گیا کہ آپ کو گھر کا پتا کیسے چلا؟" عدیل کو اس سوال کا خیال اب آیا تھا۔

"آپ کے کچھ دوست احباب بھی ہوتے ہیں شاید۔" مدیحہ مسکرائی تھی۔

"اوہ اچھا..... تو یہ چھوٹے کا کمال ہے۔" وہ فوراً سمجھ گیا تھا اور مدیحہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"جی..... بہت اچھا دوست ہے یہ آپ کا۔" مدیحہ بھی آخر دل آور شاہ کی بہن تھی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا، بلکہ کھل کے سراہا تھا۔

"جانتا ہوں..... اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے ورکشاپ کی جاب کے عوض ایک مخلص دوست عطا کر دیا ہے بلکہ مجھے سب کچھ ہی ورکشاپ سے ہی ملا ہے۔" عدیل اللہ کا شکر گزار ہو رہا تھا۔

"ہوں..... اچھی بات ہے۔" مدیحہ بیگ سے چابی نکال کر لاک کھولنے لگی تھی اور لاک کھول کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پلٹ کر عدیل کو دیکھا تھا۔

"تھینکس..... آپ نے اتنا اچھا اور مزیدار سا ناشتہ کروایا..... بہت اچھا لگا مجھے۔" مدیحہ نے شکریہ ادا کیا تھا اور یہ سچ بھی تھا کہ ناشتہ بہت مزیدار لگا تھا۔

"یہ ناشتہ میں آپ کو روز بھی کروا سکتا ہوں..... اگر آپ چاہیں تو؟" عدیل اسے سرتاپا گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو..... میں آ جایا کروں گی۔" مدیحہ اس کی بات گول کر گئی تھی اور وہ سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔

"اوکے..... گڈ بائے۔" وہ کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور دروازہ بند کرنے کے بعد شیشہ نولڈ کر دیا تھا اور گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے بیک کرنے لگی تھی۔

"اور ہاں آپ سے ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گئی۔" وہ گاڑی کو ذرا ذرا پیچھے سرکاتے ہوئے بولی تھی۔

"کیا بات؟" وہ مٹی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

"یہ کہ آج آپ بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں..... آج مجھے لگا کہ میں غلطی پر نہیں تھی۔" وہ کہہ کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر گاڑی اڑا لے گئی تھی اور عدیل وہیں کشادہ سی گلی میں کھڑا مسکراتا رہ گیا تھا اس کے آج کے دن کی صحیح واقعی بہت اچھی ثابت ہوئی تھی خوشیوں کی لہروں میں ہاتھ پھنسائے کافی مسرور سے انداز میں چلتا ہوا واپس گھر آ گیا تھا۔ جہاں عابدہ خاتون اور مریم اس کی منتظر تھیں۔

''میں بھی تمہارے ساتھ لاہور چلوں گی۔'' وہ اگلی صبح سو کر اُٹھا تو وہ پہلے سے فیصلہ کیے بیٹھی تھی اور وہ ڈرائنگ روم کا چھوٹا سا اٹیچی کیس دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کی تیاری پکی ہے مگر نہ جانے کیوں دل آور کو ان کا فیصلہ اچھا نہیں لگا تھا۔ نہیں ہوا تھا۔

''آپ لاہور کیوں جانا چاہتی ہیں؟'' دل آور نے نہ چاہتے ہوئے بھی استفسار کر ہی لیا تھا۔

''کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' بتول شاہ نے خفگی سے دیکھا تھا۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ فی الحال لاہور جائیں۔'' اس نے برملا اظہار کیا تھا۔

''مگر کس لیے..... کچھ بتاؤ تو سہی؟'' وہ جھنجلائی تھیں۔

''اس لیے کہ ابھی میرے بہت سے ادھورے کام بنانے والے ہیں، ابھی بہت کچھ باقی ہے ابھی آپ مداخلت نہ وہ انہیں روکنا چاہتا تھا۔

''تم فکر مت کرو..... تمہارے سارے ادھورے کام بنانے میں تمہارا ساتھ دوں گی، مدد کروں گی تمہاری۔'' آور کو بہلایا تھا۔ مگر وہ اُلجھ رہا تھا اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ لاہور جائیں۔

''مجھے آپ کی مدد کی نہیں..... بلکہ دُعا کی ضرورت ہے اور وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں پلیز اماں، آپ ابھی مت جائیں آپ کو بعد میں آ کر لے جاؤں گا۔'' وہ انہیں مسلسل روک رہا تھا۔

''دیکھو شاہ از زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کب ہے اور کب نہیں ہوگی، یہ بھلا کس کو خبر؟ میں نے چند روز پہلے زری سے اور لاہور آنے کا وعدہ کیا تھا مجھے وہ وعدہ تو پورا کرنے دو..... کہیں ساتھ لے کر ہی نہ مر جاؤں..... اور میری زندگی کی ہر پہ بھی کوئی بوجھ پڑا رہے؟'' بتول شاہ کی بات پہ دل آور بے ساختہ چپ سا ہو گیا تھا لیکن زری کا خیال آتے ہی اس نے سمت دیکھا تھا۔

''زری سے کیوں ملنا ہے آپ نے؟'' وہ تجسس سے پوچھ رہا تھا البتہ چہرے پہ اُلجھن تھی۔

''کیونکہ اس کی زندگی بھی بتول شاہ کی زندگی سے مختلف نہیں ہے درد سانجھا نہ سہی..... مگر تنہائی کا سفر سانجھا ہی کا..... ہاؤں دیکھو تو آبلے ہی آبلے ہیں۔'' کہتے ہوئے لہجہ بھرا گیا تھا ان کا، مگر پھر وہی حقیقت کہ اپنے آپ کو سنبھال گئیں اور مزید کچھ کہے بغیر لاہور جانے کے لیے تیار ہونے لگا تھا اب کچھ اور کہنے کی تو گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

♥

دانیال کو اس کی فلائٹ کا پہلے سے ہی پتا تھا۔ اسی لیے وہ کسی ڈرائیور کو ایئرپورٹ بھیجنے کے بجائے خود ہی اسے کے لیے آ گیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف آور کو بھی ڈرائیور کی ہی اُمید تھی لیکن ڈرائیور کی جگہ دانیال کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی وہ خفا بھی تھا لیکن پھر بھی اس نے نورا ہی اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا..... بلکہ دبا گیا تھا۔

''السلام علیکم! کیسے ہو؟'' آور نے ہی آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملانے اور حال احوال پوچھنے میں پہل کی تھی جبکہ اپنی جگہ پہ خاموش کھڑا تھا۔

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے تم اپنی سناؤ کیسے ہو؟'' دانیال نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سلیقے دیا تھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں..... مجھے کیا ہونا ہے بھلا؟'' آور نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور قدم سمت بڑھا دیئے تھے۔

''ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کون سی دیر لگتی ہے؟'' دانیال نے استہزائیہ سے لہجے میں کہتے ہوئے سے اٹیچی کیس کا ہینڈل تھام لیا تھا اور اٹیچی کیس کو گھسیٹتے ہوئے اس کے ساتھ اس کے برابر چلنے لگا تھا۔

''ہونہہ..... واقعی کچھ بھی ہونے میں دیر نہیں لگتی۔'' آور نے آہستگی سے اعتراف میں سر ہلایا تھا۔

''ہاں..... انسان آخر واپس لوٹ ہی آتا ہے تم سناؤ واپسی کا سفر کیسا رہا؟'' دانیال سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا نظریں چونک کر دانیال کے چہرے پہ جا ٹھہری تھیں۔

"واپسی کا سفر.....؟"

"واپسی کا سفر..... اور شاید علیزے سے کول تک کا سفر....." دانیال عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے لگا تھا جبکہ آذر اس کی بات پہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

"ہاں..... واپسی کا سفر..... اور شاید علیزے سے کول تک کا سفر....." دانیال عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے لگا تھا جبکہ آذر اس کی بات پہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

"ڈرائیو کر لیتے ہو؟ گاڑی میں بیٹھو واپس تو تم آ ہی گئے ہو دوبارہ کہاں جاؤ گے؟" دانیال نے اپنی کیس گاڑی کی ڈگی میں رکھے بیگ دیکھ کیا رہ

پہ غور کرتا رہ گیا تھا۔

♥

اس ایک خواب میں آج تک
میں بندھا ہوں آس کے جال میں
کوئی شہر یار وفاؤں کا
کبھی آئے عشق کے تخت پر
کہیں دور شہر جمال میں
میرے سرد جسم کو ڈھانپ دے
وہ سلگتی سانسوں کی شال میں
جہاں میں ہوں اس کے جواب میں
جہاں وہ ہو میرے سوال میں
نہ ہو ایک سانس کا فاصلہ
جہاں اس کے میرے وصال میں.....

آج بہت ٹھنڈ تھی اور وہ تازہ تازہ شاور لے کر باہر آئی تھی اسی لیے ٹھنڈ سے بچنے کی خاطر اس نے ٹی وی لاؤنج کا ہیٹر دیا تھا اور ذرا سی دیر میں ہی پورے لاؤنج کا ماحول گرمائش کی لپیٹ میں آ گیا تھا رفتہ رفتہ اس کی کپکپی کم ہوتی گئی اسی لیے ہو کر صوفے پہ نیم دراز سی ٹی وی دیکھنے لگی تھی اور یونہی ٹی وی دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اور آنکھ لگے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی، چاپ بھی ایسی لگے..... اور دل جاگ جائے اور جب انسان کا دل جاگ جاتا ہے تو اس کی دنیا سو جاتی ہے۔

اور اس وقت زری کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا..... اس کا دل جاگ چکا تھا اور دنیا سو چکی تھی۔

اس کے دل کی بستی کی ہر گلی میں بس اک ہی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور یہ چاپ اس کی پوری ذات پہ حاوی ہوتی گئی۔

اس چاپ کی چاہ میں سرتاپا سماعت بن گئی تھی اور جہاں وہ چاپ ٹھہری تھی وہیں اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔

اس کی دھڑکنیں اور سانسیں بھی ٹھہر گئی تھیں۔

دل آور شاہ اس کے پاس کیا ٹھہرا تھا کہ اس کی ذات کیا، کائنات بھی ٹھہر گئی تھی۔ بس صرف احساسات اور جذبات بے چین تھے باقی سب کچھ تو ٹھہرا ہوا تھا اور اسی ٹھہرے ہوئے احساس کے اثر نے زری کو بھی نیند سے جگا دیا تھا۔

وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے یکدم گردن موڑ کر صوفے کی دائیں سائیڈ کی طرف دیکھا تھا اور پھر دیکھتی رہ گئی کیونکہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں زری کے سیاہ دراز کھلے بالوں پہ تھیں نم آلود بال اس کے تازہ تازہ شاور کی گواہی دے رہے تھے اور دل آور شاہ ان ظالم گواہوں کی گواہی جھٹلا نہیں پا رہا تھا بلکہ وہ تو پورے کا پورا ان کے حق میں نظر آ رہا تھا۔

اور زری اسے ان گواہوں کے حق میں دیکھ کر صوفے سے کھڑی ہو گئی تھی اس کا ٹھہرا ہوا دل پھر سے حرکت میں آ گیا تھا۔

دل کی اس حرکت کے آگے اس کے قدم بے اختیار و بے بس ہو گئے تھے وہ بنا سوچے سمجھے ہی اس کے قریب اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دل آور نے اسے دیکھ کر نظریں جھکائی تھیں اور نہ سر جھکایا تھا بلکہ وہ تو اسے نظر بھر کر دیکھ رہا تھا حالانکہ اس طرح دیکھنا اس کا شیوہ نہ تھا وہ ساری دنیا کو اس طرح دیکھ سکتا تھا مگر زری کو نہیں۔

لیکن آج اس وقت وہ جس طرح زری کو دیکھ رہا تھا اس طرح تو اس نے کبھی کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا آج نظر کی تھیں..... انداز بھی اور تھا..... اور سامنے کا منظر بھی اور تھا۔

جب سب کچھ اور تھا تو ظاہری بات تھی کہ وہ دونوں بھی کچھ اور ہی لگ رہے تھے۔ اس لیے تو ایک دوسرے کے نظر آ رہے تھے، اتنے قریب کہ دھڑکنوں کو دھڑکنیں سنائی دینے لگی تھیں ایک کا دل، دوسرے کے دل کی دھڑکنیں بآسانی زری نے اس کے دل کی پُرشور دھڑکنوں کو شانت کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے دل کی سمت

"زری....." ابھی اس کا ہاتھ اس کے سینے پہ اس کے دل تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس پکار پہ لرز کر رہ گیا تھا اک مانوس سی آواز تھی ہوا سے دل آور شاہ کے دل تک پہنچنے سے روک گئی تھی ورنہ فاصلہ تو بس اک ہاتھ بھر کا رہ گیا تھا۔

اور زری اس ہاتھ بھر کے فاصلے کے رہ جانے پہ ششدر سی رہ گئی تھی اس کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"زری....." اب کی بار پکارنے کے ساتھ ساتھ اس کا دایاں گال بھی تھپکا گیا تھا اور وہ سٹپٹا کے ہوش میں آ گئی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور آنکھ کھلتے ہی جیسے سب کچھ سامنے آ گیا تھا اس کی کچی نیند کا خواب حقیقت کی تصویر نظر آیا البتہ یہ اور بات تھی کہ اس حقیقت میں کوئی اور چہرا بھی موجود تھا اسی آواز کی طرح مانوس سا.....

"لگتا ہے میری جان بڑی گہری نیند سو رہی تھی؟" انہوں نے بڑی اپنائیت اور نرمی سے کہتے ہوئے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا اور زری حقیقت میں مجسم انہیں اپنے سامنے دیکھ کر تڑپ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بتول آنٹی!" وہ ہوش و حواس میں آتے ہی ان کو پہچان گئی تھی حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلی بار روبرو دیکھ رہی تھیں۔

"اوہ..... تو پہچان ہی لیا تم نے؟" بتول شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا اور زری بھی بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

"اپنوں کو پہچاننے میں وقت نہیں لگتا..... ان کو تو ان کے قدموں کی چاپ سے ہی پہچان لیا جاتا ہے۔" زری مسکرا کر کہتی ہوئی ان سے الگ ہوئی تھی اور ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دل آور شاہ گاڑھا کھنکھارتے ہوئے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے پہ مجبور ہو گیا تھا اور زری یکدم کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی تھی وہ نظریں اور سر جھکائے ہوئے اس کی طرف سے تقریباً رخ موڑے کھڑا تھا۔

یہ اشارہ تھا کہ وہ بغیر دوپٹے کے ننگے سر کھڑی ہے اور وہ اسے اس طرح اس حلیے میں نہیں دیکھ سکتا اور کبھی ہو بھی تو نہیں سکتا۔ یہ مردوں کے سامنے اپنی نظروں کو گستاخ ہونے دینا جبھی ہمیشہ نظریں جھکی ہوئی ہی رہتی تھیں اور زری بھی ہمیشہ کی طرح اس کا گریز سمجھتے ہوئے سنبھل گئی تھی اور اس نے فوراً سر پہ دوپٹا اوڑھ لیا تھا۔

"السلام علیکم....." اس نے اچھی طرح دوپٹہ اوڑھ لینے کے بعد اسے سلام کیا تھا اور دل آور نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا وہ دوپٹہ اوڑھ چکی تھی اور اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام! عبداللہ کہاں ہے؟" وہ سلام کا جواب دیتے ہی بات عبداللہ تک لے گیا تھا۔

"وہ بھائی کے ساتھ مارکیٹ تک گئے ہیں، آپ لوگ بیٹھیں، وہ بس آتے ہی ہوں گے۔" زری نے اسے اور بتول شاہ کو ایک ساتھ بیٹھنے کا کہا تھا اور خود سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"ارے..... تم کہاں جا رہی ہو بیٹا؟" بتول شاہ نے صوفے کی سمت بڑھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"بس عبداللہ بھائی کو فون کرنے لگی ہوں کہ وہ ذرا جلدی گھر آ جائیں۔" وہ کہتے ہوئے فون سیٹ کے پاس آ گئی تھی کیونکہ اس کا موبائل اوپر اس کے بیڈ روم میں رکھا ہوا تھا۔

"ارے..... رہنے دو بیٹا! آ جائیں گے وہ لوگ بھی..... ابھی تم تو ہمارے پاس بیٹھو۔" بتول شاہ نے اسے فون کرنے سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن دل آور کی موجودگی میں وہ انہیں ٹھیک طرح سے کمپنی بھی نہیں دے سکتی تھی اس لیے نگارش بھابی اور عبداللہ بھائی کی موجودگی ضروری تھی اور اس نے انہیں فون بھی کر دیا تھا اور پھر ملازمہ کو چائے وغیرہ کا کہہ کر دوبارہ ان کے پاس آ گئی تھی۔

"ادھر آؤ..... ادھر میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے زری کو اپنے قریب بیٹھنے کا کہا تھا اور وہ نجانے کیوں دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اندر سے نروس ہو رہی تھی، شاید اس لیے کہ عین سامنے والے صوفے پہ دل آور شاہ بیٹھا ہوا تھا یا پھر اس لیے کہ وہ دل آور شاہ کی ماں کے بالکل برابر میں بیٹھی ہوئی تھی، لیکن جو بھی تھا اس کا دل اندر ہی اندر کپکپا رہا تھا اور چہرا جھکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے اس طرح چپ کیوں بیٹھ گئی ہو؟ کیا ہمارا اچانک آنا اچھا نہیں لگا؟" بتول شاہ نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نرمی اور دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"نن..... نہیں آنٹی..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے..... بس وہ میں سو کے اٹھی ہوں شاید اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" اس نے بمشکل سے جواب دیا تھا اور بتول شاہ اس کی بات پہ مسکرا دی تھیں۔

"تو پھر ایسا کرو..... ہم دونوں بیٹھے ہیں تم دوبارہ سو جاؤ نیند پوری ہو جائے گی تو سب سمجھ آ جائے گا۔" بتول شاہ کی بات پہ دل آور اور زری کے چہرے پہ بیک وقت مسکراہٹ ابھری تھی اور دونوں نظروں کا تصادم بھی ہوا تھا کیونکہ دونوں نے ایک دوسرے کو

بیک وقت دیکھا تھا اور اس مسکراہٹ کا منظر ان دونوں کے ہی دل میں اُتر گیا تھا۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ آئیں اور میں آرام سے سو جاؤں؟'' زری بڑی معصومیت اور سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''مذاق کر رہی ہوں بیٹا! ورنہ مجھے پتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس کے گال اور ان کی اتنی والہانہ محبت اور محبت کے اس اظہار پر زری کے چہرے پہ سرخی بکھر گئی تھی اس کا چہرا لال ہو گیا تھا اور وہ سیدھے ہاتھوں کو مسلنے لگی تھی اور دل آور اس کی کنفیوژن سمجھ گیا تھا اسی لیے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''آپ لوگ بیٹھیں باتیں کریں، میں تب تک ایک کال کر لوں۔'' وہ اپنا سیل فون نکالتے ہوئے زری کی مشکل کو بہانہ بنا کر وہاں سے نکل آیا تھا۔

اور پھر باہر لان میں آ کر اس نے واقعی نبیل کا نمبر ڈائل کر لیا تا کہ وہ اتنی دیر میں اس سے کام کے متعلق کچھ اندازہ لگا لیتا اور دوسری طرف نبیل بھی جیسے اس کے فون کے ہی انتظار میں تھا اس نے دوسری رنگ پہ ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

''ہیلو۔۔۔'' نبیل نے کافی بے تابی سے ہیلو کہا تھا کیونکہ دل آور کل سے دستیاب جو نہیں رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' دل آور نے کافی سنجیدگی سے اور نپے تلے انداز میں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! کہاں ہو تم؟ میں کل سے تمہارے نمبر پہ ٹرائی کر رہا ہوں مگر تمہارا نمبر آف جا رہا تھا پھر میں نے گھر میں کال کی تو گلاب خان سے پتہ چلا کہ تم شاید اسلام آباد چلے گئے ہو اسی لیے مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ سب خیریت تو ہے واقعی بے حد پریشان لگ رہا تھا۔

''ہاں خیریت تھی۔۔۔ بس اماں سے ملنے گیا تھا۔۔۔ آج واپس آ گیا ہوں۔'' دل آور ہنوز سنجیدگی سے جواب دے رہا تھا نبیل نے ابھی تک اس کی سنجیدگی کو نوٹس نہیں کیا تھا۔

''اچھا۔۔۔ تو پھر آنٹی کا سناؤ وہ کیسی ہیں؟ تم انہیں ساتھ ہی لے آتے؟'' نبیل کو حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

''ہم لوگ اس وقت عبداللہ کے گھر پہ ہیں اماں عبداللہ کی فیملی سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔''

''اوہ اچھا اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے؟ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو؟'' نبیل کا دھیان اس کی طرف ہو ہی چکا تھا۔

''نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوا اتنی دور سے ڈرائیونگ کر کے آیا ہوں اس لیے تھکا ہوا ہوں۔'' دل آور نے اسے ٹال دیا تھا۔

''مائنے والی بات تو نہیں ہے کہ تم ڈرائیونگ سے تھک گئے ہو۔۔۔ لیکن پھر بھی کوئی بات نہیں مان ہی لیتا ہوں۔'' بڑی سعادتمندی سے اس کے ٹالنے سے ٹل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں اس وقت کال بند کرتا ہوں، میرا خیال ہے کہ عبداللہ آ گیا ہے۔'' دل آور نے کال بند کرنی چاہی تھی جیسے مچل گیا تھا۔

''اوکے۔۔۔ پھر میں بھی آ رہا ہوں، اللہ حافظ۔'' اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا جہاں سے عبداللہ کی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔

عبداللہ اور نگارش دونوں ہی آگے پیچھے گاڑی سے اُتر آئے تھے لیکن عبداللہ نے اس کی طرف کوئی بھی دھیان دیے بغیر گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے جس پہ دل آور کو پہلے تو حیرانی ہوئی تھی لیکن پھر وہ اگلے ہی پل اس کی اس اجنبیت اور لاتعلقی کو سمجھ گیا تھا، یعنی وہ ابھی تک اس سے ناراض تھا اسی لیے اتنی سنجیدگی کے باوجود وہ اس کی ناراضی کا سوچ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

''السلام علیکم دل آور بھائی! کیسے ہیں آپ؟'' نگارش، عبداللہ کو اندر جاتے دیکھ کر حیران ہوئی تھی لیکن وہ دل آور کو اس کے پیچھے اندر نہیں جا سکی تھی بلکہ لان میں کھڑے دل آور کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام بھابی! میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' دل آور نے گیٹ بند کرتے چوکیدار کو دیکھتے ہوئے بڑے نارمل سے انداز میں پوچھا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے، میں اب ٹھیک ہوں لیکن آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ لوگوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہوا ہے کہ آپ

ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔" نگارش دل میں اُٹھنے والا سوال زبان پہ لائے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور دل آور اس کے سوال پہ ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔

"نہیں..... میری طرف سے تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے..... بس وہ خود ہی کسی بات پہ ناراض ہے لیکن ڈونٹ وری جلد ہی مان بھی جائے گا۔" دل آور نے لاپروائی سے سر جھٹکا تھا اور نگارش دل آور کو نارمل دیکھ کر ذرا ریلیکس ہو گئی تھی۔

"اوکے..... وہ ناراض ہیں نا..... ہم تو نہیں؟ اس لیے پلیز اب اندر چلیے..... میں آپ کو چائے پلواتی ہوں۔" نگارش نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور دل آور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے اور نگارش بھی اس کے پیچھے ہی اندر چل آئی تھی۔

"زری! دل آور بھائی بھی چائے پئیں گے۔" نگارش نے عبداللہ اور بتول شاہ کو چائے سرو کرتی زری کو متوجہ کیا تھا اور زری نے ان دونوں کی طرف سے فارغ ہو کر دل آور کے لیے بھی ایک کپ اُٹھا لیا تھا۔

"نہیں..... میں چائے نہیں پیتوں گا۔" دل آور نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔

"کیوں..... چائے کیوں نہیں پئیں گے؟" جہاں اس کے انکار پہ نگارش ٹھٹکی تھی وہیں زری کے قدم بھی رُک گئے تھے کیونکہ وہ اسے چائے دینے کی غرض سے ٹیبل کی دوسری سائیڈ سے ہو کر اسی کی طرف آ رہی تھی لیکن اس کے انکار پہ اس کے قدم وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔

"جہاں گھر آئے مہمان کو سلام تک نہیں کیا جاتا میں وہاں چائے نہیں پی سکتا یہ میرا اصول ہے۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور اس کا یہ اشارہ کس کی طرف ہے؟ یہ بات عبداللہ بھی سمجھ چکا تھا اور نگارش بھی۔

"اچھا..... تو لائیں "تزی" بھی تم ہی دکھا رہے ہو؟" عبداللہ کو اس کی بات سن کر مزید تاؤ آیا تھا اور وہ چائے کا کپ لیتے لیتے رُک گیا تھا جس پہ دل آور اپنی مسکراہٹ دبا گیا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر عبداللہ نے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ لی تو وہ غصے سے اور زیادہ تپ اُٹھے گا لیکن زری کی نظروں سے یہ مسکراہٹ مخفی نہیں رہ سکی تھی اس کی بے تاب نظریں دل آور شاہ کے چہرے کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔

"مجھے کیا ضرورت ہے تزی دکھانے کی؟ میں یہاں اماں کو چھوڑنے کے لیے آیا ہوں کوئی تزی دکھانے نہیں آیا۔" دل آور نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ عبداللہ دانت کچکچا کے رہ گیا تھا۔

"دل آور ہے! مجھے غصہ مت دلاؤ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔" عبداللہ بمشکل اپنے غصے پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور بتول شاہ اور نگارش ان کی اس خفگی اور ناراضی کا منظر دیکھ کر ہنس پڑی تھیں۔

"کیا اچھا نہیں ہو گا؟ کیا کر لو گے آخر۔" دل آور جان بوجھ کر اسے چھیڑ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ورنہ یہیں چائے تمہارے اوپر انڈیل دوں گا آرام سے خود ہی پی لو یہی بہتر ہے۔" عبداللہ نے دھمکی دی تھی۔

"یہ چائے تو میری ہے۔" زری اپنے حصے میں چائے کا کپ پکڑے کھڑی تھی جو اچانک اندر آنے والے نبیل حیات نے اچک لیا تھا وہ بھی اس لیے کہ وہ عبداللہ اور دل آور کی بات سن چکا تھا بلکہ اس کے مسئلے کی نوعیت بھی سمجھ چکا تھا جبکہ زری ہکا بکا سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"شاباش..... بڑی دبنگی انٹری ماری ہے تم نے، یہ چائے اسے ملنی بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ یہ انکار کر چکا ہے۔" عبداللہ نے اسے داد دی۔

"یہ انکار کر چکا ہے نا؟ لیکن ہم میں انکار کا حوصلہ نہیں ہے جو بھی ملے صبر و شکر کر کے گزارا کر لیتے ہیں۔" نبیل اطمینان سے کہتا بتول شاہ کی سمت بڑھ گیا تھا البتہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں ہی تھا جس پہ تقریباً سبھی ہنس بھی رہے تھے۔

"بھابی! مجھے تو آپ نے چائے پلوانے کا کہا تھا۔" دل آور نے نگارش کو یاد دلایا۔

"اوہ ہاں ہاں..... کیوں نہیں میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" نگارش فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب وہ کپ لے کر آئے گا جو میری قسمت میں ہو..... یہ میری قسمت میں نہیں تھا۔"

دل آور نے جاتے جاتے تاکید کی تھی جسے سن کر نگارش، زری اور بتول شاہ تینوں ہی چونکی تھیں لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے

کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کے بعد تینوں اپنی اپنی جگہ پہ خاموش ہو گئی تھیں اور دل آور سر جھٹک کر عبداللہ اور نبیل کے ساتھ باتوں میں شریک ہو گیا تھا حالانکہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ زری کے چہرے کی ساری خوشی بجھ سی گئی ہے لیکن پھر بھی اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ چیز اس کی قسمت میں ہی نہیں تھی اس پہ دھیان دینے کا فائدہ ہی کیا تھا بھلا۔

اور ادھر وہ تھی جو اپنے خواب کے سچے ہونے پہ پچھتا رہی تھی کیونکہ ایسی حقیقت سے تو وہ خواب ہی بہتر تھا جس میں دل شاہ کے دل آور شاہ اس کے سامنے، قریب اور اکیلا کھڑا تھا جس میں وہ ہاتھ بڑھا کے ایک دوسرے کو چھو بھی سکتے تھے اور ان کے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کا ڈر تھا اور شاید اسی لیے اس کا پچھتاوا بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اسے یہ خواب شدت سے یاد آ رہا تھا۔

♥

ان لوگوں نے انہیں رات کے کھانے کے بعد ہی واپس آنے دیا تھا۔

حالانکہ دل آور نے وہاں سے اٹھنے کی بار بار کوشش کی تھی لیکن عبداللہ اور نگارش ہر بار ہی آڑے آ گئے تھے، صرف یہ کہہ کر بتول آنٹی آج پہلی بار ان سے ملنے ان کے گھر آئی ہیں اور وہ وہاں سے اُنہیں کیے بغیر چلی جائیں یہ بھی تو ممکن نہیں تھا۔

سو مجبوراً ان لوگوں کے اتنے اصرار کے بعد انہیں رُکنا ہی پڑا تھا اور اب وہ تقریباً دس بجے واپس آ رہے تھے۔ دل آور کے ساتھ بتول شاہ کو دیکھ کر گلاب خان اور گل بہت خوش ہوئے تھے بلکہ زلفی بھی اس خوشی میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

"جیتے رہو..... خوش رہو..... اللہ عمر دراز کرے۔" انہوں نے زلفی اور گلاب خان کے کندھوں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دُعا دی تھی اور گل سے باقاعدہ گلے ملی تھیں انہوں نے کبھی بھی ملازموں کے ساتھ مالکانہ انداز نہیں اپنائے تھے۔ ملازموں کے ساتھ بھی اپنائیت اور خلوص سے پیش آتی تھیں بلکہ یہ عادت تو ان دونوں ماں بیٹے کی مشترکہ تھی۔

"گل! اماں کا بیڈ روم صاف کیا تم نے؟" دل آور کا ارادہ اپنے بیڈ روم میں جانے کا تھا لیکن وہ جانے سے پہلے ان کے روم کی طرف سے تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔

"جی صاحب! صبح جب گلاب خان کو آپ کا میسج آیا تھا تو میں نے اسی وقت بیڈ روم صاف کر دیا تھا بیگم صاحبہ آرام سے آرام کر سو سکتی ہیں۔" گل نے فوراً اثبات میں جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں! آپ بھی جا کر آرام کریں اور میں بھی کچھ دیر ریسٹ کرتا ہوں پھر مجھے ایک کیس پہ کام بھی کرنا ہے ڈیٹ ہے۔" وہ اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتا ہوا بتول شاہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"او کے بیٹا! آرام کرو تم..... میں بھی اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں..... گل تم میرے ساتھ آؤ بیگ سے میرے کپڑے نکالو میں نے عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنا ہے۔" وہ دل آور کو گڈ نائٹ کہہ کر اس کے اثبات میں گل سے کہتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ گئی تھیں اور دل آور ان کے بیڈ روم میں جانے کے بعد ایک گہری سانس کھینچتا ہوا اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا۔ روم میں آ کر اسے نجانے کیسی تھکن اور بوجھل پن محسوس ہوا تھا کہ وہ آتے ہی اپنے بیڈ پہ چاروں شانے چت ڈھیر ہو گیا تھا۔ ہاتھ اپنے سر کے نیچے تکیے کی صورت میں رکھتے ہوئے بیڈ روم کی چھت پہ نظریں جما دی تھیں۔

وہ جب سے علیزے کے پاس سے اُٹھ کے گیا تھا تب سے اپنے دل پہ ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا اور بوجھ بھی ایسا تھا کہ اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر دن بھر گپ شپ کرنے کے بعد بھی دل سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹا تھا، جہاں پہ تھا وہیں پہ ڈھیر ہوا تھا۔

اور جب انسان کا دل کسی بوجھ تلے دب جائے وہ انسان خود بھلا کب اُٹھ سکتا ہے..... اور اس وقت دل آور کے ساتھ یہی صورتحال تھی، اس کے دل پہ بوجھ تھا تو خود بھی کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

مگر مجبوری تھی، کام تو اس نے کرنا ہی تھا، اپنے دل کے مسئلے میں وہ کسی اور کے لیے مسئلہ کھڑا تو نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا مجبوراً وہ اُٹھا اس نے شاور لیا، کپڑے چینج کیے اور اپنے اسٹڈی روم میں آ گیا تھا۔ حالانکہ اس کا ذہن یکسوئی سے عاری تھا مگر وہ سگریٹوں کے سہارے ضروری کیس کی فائل پہ کام کرتا رہا اور رات کے پونے تین بجے وہ سب کچھ مکمل کر کے اپنی چیئر

کمرا بوجھل تھکن اور بوجھل پن سے یوں لگ رہا تھا جیسے پورا جسم اکڑ کے رہ گیا ہو اس لیے اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن بیڈ روم میں آکر اپنی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے نجانے کیوں اور کس سوچ کے تحت اس کے ہاتھ وہیں کے وہیں رُک گئے تھے اور اس کا دل جہاں سے اس کے دل پہ بوجھ رکھا گیا تھا اور وہ بے ساختہ دوبارہ اس بوجھ کو ساتھ لیے اپنے بیڈ روم سے نکل آیا اس کے قدم بیسمنٹ کی طرف اُٹھ رہے تھے، اس کے قدم بوجھل تھے..... یا اس کا دل بوجھل تھا؟ یہ فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن بوجھل پن کا یہ احساس تھا ان کا بیسمنٹ کی طرف ہی تھا وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگیا تھا۔

رات کے تین بجے دُنیا موت کی سی گہری نیند سوئی ہوئی تھی ہر طرف سناٹا تھا، گہرا اور گمبھیر سناٹا اور اتنا ہی گہرا اور گمبھیر اندھیرا بھی جن کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا وہ بیسمنٹ کے دروازے تک جا پہنچا تھا ادھ کھلے دروازے کو اپنے دائیں ہاتھ سے دھکیل کر وہ اندر گیا تھا اور بیسمنٹ کی کشادہ سیڑھیاں بے آواز قدموں سے طے کرتا ہوا اس سائیڈ کی طرف آگیا تھا جس سائیڈ پہ علیزے آفندی نظروں کی طرح بیٹھی تھی، جس کو دیکھ کر دل آور کو ایک دھچکا سا لگا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس وقت سو رہی ہوگی، لیکن اپنے یقین کو بے یقین ہوتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ پہ حق دق سا رہ گیا تھا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں کے وہیں رُک کے رہ گئے تھے وہ علیزے سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑا بے حد کم سم اور ساکت و صامت سا ہو چکا تھا اس کی اُمید اس کی توقع اور اس کی سوچ تھرا اُٹھی تھی۔

کیونکہ اسے تو اس بات کا رتی برابر بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس پہر بھی جاگ رہی ہوگی۔ اسے تو اس بات کا یقین خاکم بدہن اس پہر دُنیا کا ہر ذی نفس نیند کی آغوش میں تھا۔

چند لمحے لے کر اشرف الخلوقات تک پوری کائنات گہری نیند سو رہی تھی، پورا شہر سو رہا تھا، کیونکہ یہ وقت ہی سونے کا تھا، سب سو رہے تھے۔

لیکن صرف وہ دو نفوس تھے..... جو ابھی تک اس وقت اس پہر بھی جاگ رہے تھے۔

آخر کیوں..... کیا وجہ تھی آخر..... صرف وہ دونوں ہی کیوں..... ایسا کیا مشترکہ تھا ان میں جس نے ان دونوں کو جگا رکھا تھا؟ دل یا دل کا بوجھ؟

عجیب عجیب سوچیں تھیں اور عجیب عجیب خیالات تھے جو دل آور کے دل و دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔ اک کھلبلاہٹ سی تھی ہر سوچ اور ہر خیال میں اُتر کر دل آور کے دل و دماغ کو بھی عجیب سا بنا رہی تھی اور وہ بمشکل اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتا ہوا سر تک کر آگے بڑھ آیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے قریب آکر کافی آہستہ آواز میں سلام کیا تھا۔

اور علیزے کو یوں لگا تھا کہ جیسے اسے کسی نے قبر میں دفن کر دیا ہو اور باہر سے پکارنے والوں کی آواز اسے بہت دور سے سنائی دے رہی ہو جس کو سن کر اس نے بمشکل زانو پہ رکھا سر اُٹھا کر اپنے سامنے کھڑے صیاد کو دیکھا تھا ایک ایسا صیاد جو اسے ہمیشہ کے لیے رکھنے کو بھی تیار نہیں تھا۔

حالانکہ وہ اس کی اس قید میں رہنے کے لیے بھی تیار تھی۔ وہ بھی محض ایک نام کے عوض..... مگر وہ مانتا تب نا؟ جبھی اس نے تنگ کر دوبارہ اپنا سر زانو پہ ٹکا دیا تھا کیونکہ اب تو اپنی گردن پہ اپنے ہی سر کا بوجھ نہیں اُٹھایا جا رہا تھا، دل چاہتا تھا کہ کوئی اسے بھی تن سے جدا کر دے..... اور اس کی اٹکی ہوئی جان کو ایک ہی دفعہ ہر قید سے رہائی مل جائے اور وہ ہر دُکھ اور ہر غم کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔

لیکن وہ کیا کرتی؟ ایسا بھی تو نہیں ہو رہا تھا اسے تو جیسے موت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھی اور اپنی ذات کی ایسی ناقدری پہ وہ گنگ سے اپنی پنڈلیٹ کے پائنچے اوپر کھینچتے ہوئے پنجوں کے بل فرش پر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"علیزے....." دل آور نے آج پہلی بار اس طرح نارمل طریقے سے اس کو اس کے نام سے پکارا تھا جس پہ دل آور کو خود بھی بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا، لیکن یہ وقت یہ سچوئیشن ایسی تھی کہ اسے پکارے بغیر اور اسے مخاطب کیے بغیر کوئی چارا نہیں تھا۔

"مجھ سے بات نہیں کرو گی کیا؟" اس کا لہجہ دھیما اور آواز گمبھیر تھی اور ساتھ ساتھ دل کا بوجھل پن چہرے سے بھی جھلک رہا تھا اور انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا بوجھل بوجھل..... تھکا تھکا سا..... علیزے کو بھی محسوس ہوا تھا شاید..... اس نے ایک بار پھر سر اُٹھا کر اپنے

سامنے دیکھا تھا وہ اس کے قریب ہی دو قدم کے فاصلے پہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور دیکھ بھی اسے ہی رہا تھا۔

''میرے پاس بات کرنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا ہے کیا؟'' علیزے کا لہجہ بوجھل رہا تھا اور لفظ زخمی ہو رہے تھے۔ بھی کچھ ایسا ہی حال تھا رو رو کر اس کا رو رو کر انگارے بن گئی تھیں، جن کی جلن سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

''تمہارے پاس بات کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا اور میرے پاس کچھ بھی کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟'' دل آور اسے بغور گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا اور اس کے پوچھنے پہ ایک گھونسا سا پڑا تھا اس کی روح تک تڑپ گئی تھی۔

''میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہو ڈرائیور؟'' اس کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا تھا۔

''کسی کی بے بسی کا مذاق اڑانے والا میں کون ہوتا ہوں بھلا؟ میں خود ایک بے بس انسان ہوں۔'' اس نے کہتے سے سر جھکا تھا۔

''دوسروں کو بے بس کرنے والا خود کیسے بے بس ہو سکتا ہے بھلا؟'' علیزے ماننے کو تیار نہیں تھی اور دل آور کے ایک انتہائی تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''ہونہہ..... تم نہیں سمجھو گی اپنی وے آؤ میرے ساتھ تمہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ اس کی نازک کلائی پکڑتا ہوا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے کو تو سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا وہ اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی اور وہ اس کی کلائی پکڑے سیڑھیاں چڑھ گیا تھا حالانکہ دل آور کے قدموں کی رفتار بہت دھیمی اور بہت متوازن تھی۔

لیکن پھر بھی اس کے ساتھ چلتے ہوئے علیزے کی سانس پھول گئی تھی۔ اس کے قدم بھی تھک گئے تھے اور وہ ہانپنے لگی تھی پہ دل آور ٹھہر گیا تھا اور اس نے مڑ کے اندھیرے میں اپنے ساتھ کھڑی علیزے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اسے علیزے نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی ہانپتی ہوئی سانسوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی جس کو سننے کے بعد دل آور نے ڈرائنگ روم بیڈ روم کی طرف جانے کے بجائے کچن کی طرف قدم بڑھا دیے کچن کا دروازہ کھول کر کچن کی تمام لائٹس جلا دیں اور علیزے کو دیکھا تھا جو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی وہ اسے سرتاپا دیکھ کے رہ گیا۔

کیونکہ اس وقت وہ علیزے..... علیزے ہی نہیں لگ رہی تھی۔

کہاں وہ شہزادیوں کے سے رہن سہن والی علیزے..... اور کہاں یہ قیرانہ حلیے کی مالک لڑکی..... جس کے تن پہ کپڑے کے اپنے نہیں بلکہ دل آور شاہ کے گھر کی ملازمہ کے تھے، جن کو دیکھ کر دل آور کی نظریں جھک گئی تھیں کیونکہ اس کا یہ حال آ پاس آ کر ہی ہوا تھا اور اسے اس نوبت تک پہنچانے والا بھی وہی تھا۔

لہٰذا اسے دیکھ کر نظریں نہ جھکاتا تو اور کیا کرتا؟

''آؤ ادھر بیٹھو۔'' اس نے کچن میں لگی ٹیبل کے قریب آ کر اس کے لیے کرسی کھینچی تھی اور علیزے نے اپنے لیے کی والے اس شخص کو عجیب بے یقین سی نظروں سے دیکھا تھا جو ہمیشہ اس کے سامنے نفرت، حقارت، غصے اور انتقام کا پیکر بنا آیا آج اس نے غور کیا تھا کہ وہ شخص بھی..... وہ نہیں لگ رہا تھا شاید اسی لیے وہ خود میں ہمت پیدا کرتی آگے بڑھ آئی تھی اور پیش کی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

''کھانا کھایا تم نے؟'' وہ کرسٹل ٹیبل کی دوسری طرف رکھی کرسی کے پیچھے کھڑا اپنے سامنے کرسی پہ بیٹھی علیزے سے تھا۔

''نہیں۔'' اس نے جھکے ہوئے سر کو نفی میں ہلایا تھا۔

''اوکے..... میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں وہی کھانا جو اس روز وہیں رہ گیا تھا۔'' وہ کرسی کی بیک سے ہاتھ ہوئے خود بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''نہیں..... مجھے بھوک نہیں ہے۔'' علیزے نے فوراً انکار کر دیا تھا مگر دل آور نے اس کے کسی بھی انکار پہ کوئی توجہ نہیں اور فریج سے کھانا نکال کر اس کے لیے گرم کرنے لگا اور اس دوران ان دونوں کے درمیان مکمل خاموشی چھائی رہی تھی۔

لیکن پانچ منٹ بعد وہ سب کچھ گرم کر کے اس کے سامنے رکھ چکا تھا اور اس کے مقابل والی کرسی کھینچ کے خود بھی

ہوتے بیٹھ گیا تھا۔

"کھانا کھاؤ۔" اس نے کافی تحمل سے اسے کھانا کھانے پہ آمادہ کیا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے پھر انکار کر دیا تھا لیکن اکثر وہ انکار نہیں سنتا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا پڑے گا؟" اسے پتا تھا کہ اس کا یہ حربہ کارآمد ثابت ہوگا اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا، علیزے کے ہاتھ خود بخود کھانے کی طرف بڑھ گئے تھے اور اس نے بمشکل لرزتے کانپتے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر منہ میں رکھا تھا اور دل آور کی نظریں آج بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں اس کے حال پہ اور اس کے حلیے پہ۔

جن کو آج غور سے اور گہرائی سے دیکھا تھا تو "اندر" کچھ ہوا تھا..... کچھ ایسا جو بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا، جو دل آور شاہ کے دل میں پان کی طرح چبھنے لگا تھا اور یہ چبھن اسے بار بار علیزے کی طرف متوجہ کر رہی تھی جس کی کمزوری اور نقاہت زدہ چالت، بکھرا گرگ رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو اس کے گولڈن براؤن بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹیں اس کی پونی سے نکل کر اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں اور اس کے چہرے کی گلابیاں بکھیرتی ہوئی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی رنگین شیشے کی طرح چمکتے ہوئے شفاف ہونٹ بے رنگ ہو چکے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے جن کی وجہ سے پورا چہرا ہی بے رونق ہو چکا تھا، کھانا کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس سے ٹھیک طرح سے روٹی کا نوالہ بھی نہیں نگلا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ کھانے پر مجبور تھی..... اور وہ اسے مجبور کرنے پہ مجبور تھا کیونکہ وہ اسے کچھ کہنے سے پہلے ریلیکس کرنا چاہتا تھا۔

"چائے بناؤں تمہارے لیے؟" وہ اس پہ نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی۔

"بہت غصہ ہو رہی ہے اس وقت، چائے پیو گی تو ریلیکس ہو جاؤ گی، میں بناتا ہوں، اپنے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔" وہ کہہ کر کرسی دھکیل کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ بڑے اطمینان سے چائے بنانے میں مصروف ہو چکا تھا علیزے نے آہستگی سے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے وہ صرف اس کے ڈر کی وجہ سے کھا رہی تھی ورنہ کھانے کو دل کب چاہ رہا تھا بھلا؟

"چائے کے ساتھ کچھ لو گی؟" وہ اپنے کام میں مصروف اس کی سمت دیکھے بغیر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں....." اس کا جواب توقع کے عین مطابق تھا۔

"کھانا تو تم نے برائے نام ہی کھایا اور چائے بھی خالی ہی پیو گی تو پھر بھوک کیسے مٹے گی؟" وہ جیسے بڑے تحمل اور بڑی نرمی سے استفسار کر رہا تھا۔

مگر علیزے نے اسے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا کیونکہ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی کہ وہ اس کے انکار کے باوجود بھی اپنی مرضی ہی کرے گا اس لیے انکار کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا بہتر تھا کہ وہ چپ ہی رہتی۔

"لو کے..... کچھ بھی نہ کھاؤ مگر چائے تو پی لو بہت اچھی بنی ہے۔ یقیناً تمہیں بھی اچھے لگے گی ٹرائی کرو۔" دل آور نے لاپروا سے انداز میں کہتے ہوئے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور اپنا کپ یونہی ہاتھ میں پکڑے دوبارہ اس کے مقابل والی کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گیا تھا۔

اور اطمینان سے چائے کے سپ لیتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے دوبارہ وہی استفسار کیا تھا اور علیزے اس کے استفسار پہ لب بھینچ گئی تھی۔

"کیا اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟" وہ چائے کا سپ لے کر ٹیبل پہ رکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور وہ اس کے اس نئے سوال پہ یکدم چونک گئی تھی۔

"گھر.....؟" اس کے لب کپکپائے تھے اور اس نے بغور دل آور کے چہرے کو دیکھا جس پہ واقعی سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔

"ہاں گھر..... تمہارا گھر بڑی حویلی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور علیزے کا دل جیسے کسی نے اپنے ہیروں تلے دبا کر کچل دیا تھا۔

"نہیں..... میں نہیں جانا چاہتی میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتی۔" وہ اُلٹا نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"کیوں..... کیوں نہیں جانا چاہتیں آخر ایک نہ ایک دن تو تم نے واپس جانا ہی ہے تو اب کیوں نہیں۔" دل آور بغور اس کے

چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔

''نہیں ڈرائیور! میں کہیں نہیں جاؤں گی..... کبھی نہیں جاؤں گی جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے میں اس گھر کے سوچ بھی نہیں سکتی..... بے شک تم مجھے دھکے دے کر نکال دو، میں کسی گاڑی کے نیچے آ کر مر جاؤں گی مگر واپس بڑی ہو گی گی کیونکہ اس طرح اپنا آپ لے کر واپس جانے سے بہتر ہے کہ میں واقعی مر جاؤں۔'' علیزے کا کہتے ہوئے لہجہ بھر آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے تھے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا علیزے! یہ سب ممکن نہیں ہے میں تم سے شادی نہیں کر سکتا لیکن تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کے یہ کام میں بہت جلد کر دوں گا شاید ایک یا دو روز میں یا پھر کچھ روز میں..... لیکن فی الحال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

اس نے آج علیزے کے سامنے بھی انکار کر ہی کر دیا تھا اور علیزے اس کا جواب سن کر گنگ سی رہ گئی۔ وہ اسے ایک میں واپس گھر چھوڑنے کی بات کر رہا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟ وہ اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کر سکتی تھی؟ مان اقرار سب کچھ تو وہ توڑ آئی تھی اب انہیں جوڑنے کے لیے کیا رہ گیا تھا اس کے پاس؟ سب کچھ تو وہ خود روند آئی تھی باقی کیا رہ گیا تھا۔

''ڈرائیور! ایک اور سزا مت دو مجھے..... میں، میں نہیں سہہ پاؤں گی مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے پلیز ڈرائیور! مجھے کہیں نہیں جانا مجھے، مجھے یہیں رہنے دو بس مجھ سے نکاح کر لو۔'' علیزے ہمیشہ کی طرح کہتے کہتے یکدم بلک بلک کر اور دل آور اس کی کیفیت پہ ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر اسے سمجھانے کے لیے اپنی چپ کو توڑنا پڑا تھا۔

''دیکھو علیزے! تمہارے اور میرے راستے الگ ہیں تم میری منزل نہیں ہو، بلکہ تم میری منزل کے راستے میں بھی نہیں میری زندگی میں بھی کہیں نہیں ہو میں تمہیں کیسے اپنا سکتا ہوں؟''

''صرف نکاح کر لینے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوتا تو تبھی ہے جب دل و دماغ کسی کے ساتھ آمادہ ہوں لیکن جب دل آمادہ نہیں ہیں تو نکاح کا تصور کرنا بھی فضول ہے اس لیے تم یہ بات ذہن سے نکال دو اور صرف یہ سوچو کہ تم نے اپنے تمہاری زندگی وہاں ہے تمہاری خوشیاں وہاں ہیں تمہارے اپنے وہاں ہیں یہ تو تم ایک مجبوری کا سودا کر رہی ہو..... اور سودے انسان کو تھکا دیتے ہیں اور کبھی کوئی فائدہ نہیں دیتے اُلٹا ہمارا نقصان ہی ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں اس سے بچ جائیں اور کوئی صحیح کا راستہ نکال لیں جو نہ تمہارے لیے مشکل ہو اور نہ میرے لیے جس پہ چلتے ہوئے ہمارے دل پہ آبلے نہ پڑیں۔'' دل آور نے اسے سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی تھی، لیکن وہ کیا سمجھی تھی اور کیا نہیں یہ وہ نہیں جانتا تھا اسے اپنی طرف سے پوری طرح سے سمجھا چکا تھا وہ بس یہی جانتا تھا۔

''لیکن ڈرائیور.....'' اس نے بے ساختہ کچھ کہنا چاہا تھا مگر دل آور نے اسے ٹوک دیا تھا۔

''بس علیزے! میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، جو سمجھانا تھا سمجھا دیا اب یہ تمہارے سوچنے اور سمجھنے پہ ڈپینڈ کرتا ہے کہ تم کیا ہے؟ کس فیصلے پہ آمادہ ہوتی ہے؟ اور کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ یہ بھی تم اچھی طرح سوچ سکتی ہو دو دن ہیں تمہارے پاس وقار آفندی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے لیکن اُمید ہے کہ دو روز تک ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا جائے گا جیسے ہی اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جائے گا میں فوراً ہی تمہیں واپس حویلی چھوڑ آؤں گا اس لیے تم اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کہ تم نے دو روز بعد اپنے گھر جانا ہے، ہر صورت میں اور ہر حال میں۔''

وہ اسے اپنے ارادے اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ علیزے وہیں کی وہیں بیٹھی تھی اب تو اس کے پاس کہنے کے لیے الفاظ بھی باقی نہیں رہے تھے۔ کتنی بار منتیں کرتی اور کتنی بار پاؤں پکڑتی؟ آخر ہونا وہی تھا جو قسمت میں لکھا جا چکا تھا اور وہ ناچیز قسمت کے اس لکھے کو کیسے مٹا سکتی تھی؟ جب تک کہ وہ اوپر والا نہ چاہتا۔

''میں اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں..... اس لیے اب تم بھی جا کر آرام کرو..... فجر ہونے والی ہے۔'' وہ کہہ کر وہاں سے گیا تھا اور علیزے کے پاس سناٹے چھوڑ گیا تھا اسے اپنے آس پاس ویرانی ہی ویرانی نظر آ رہی تھی اور ان ویرانیوں میں وہ تنہا بیٹھی رہ گئی تھی۔

لیکن آخر کب تک؟

کب تک وہ یونہی بیٹھی رہتی؟ بالآخر اسے وہاں سے اُٹھنا ہی تھا اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اب یہ تھا کہ اس سے قدم

لڑکھڑاتا ہوا وہ مرے مرے قدم اٹھاتی پاؤں گھسیٹ کے چلتی ہوئی بمشکل اپنے آپ کو حواسوں میں رکھ کر وہاں سے نکل آئی تھی اس کے جان قدم دھیمے کی طرف اٹھ رہے تھے جب کسی آواز پہ ٹھٹک کر اسے ٹھہرنا پڑا تھا۔

"سونیا کی..... آواز دل آور شاہ کی نہیں تھی، لیکن دل آور شاہ کی آواز جیسی با رعب ضرور تھی۔ وہی دبدبہ، وہی طنطنہ، وہی طمطراق۔ بنا دیکھے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہیں۔

علیزے بغیر پلٹے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہیں۔

"میرا شاہ تمہارے باپ جیسا نہیں ہے وہ تم سے نکاح کرے گا اور ضرور کرے گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" بتول شاہ متوازن لہجے میں کہی گئی بات بھی اس کی سماعتوں میں گونجی تھی۔

تو تم اٹھاتی سائیڈ سے ہو کر اس کے سامنے آ گئی تھیں۔

"یہ..... یہ..... کک..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ..... یہ..... کیسے ہو سکتا ہے؟" علیزے کی بے یقینی سے آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس کی زبان بھی لڑکھڑا گئی تھی اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ سب صحیح سنا ہے دل آور شاہ کی ماں خود نکاح کے لیے وعدہ کر رہی تھیں اور اسے یقین دلا رہی تھیں کہ وہ یہ نکاح ضرور کرے گا تو علیزے نے تو حیران ہونا ہی تھا۔

"یہ ہو سکتا ہے ضرور ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک آزمائش ہے اور میرا بیٹا اس آزمائش پہ ضرور پورا اترے گا، آخر وہ کسی وقار آفندی کا نہیں بلکہ بتول شاہ کا بیٹا ہے باہر شاہ کا سپوت ہے وہ، اتنا کم ظرف نہیں ہے کہ کسی عورت کے سر پہ چادر بھی نہ دے سکے تم بے فکر رہو جب تک بتول شاہ زندہ ہے تمہاری عزت پہ آنچ نہیں آنے دے گی تم لاکھ وقار آفندی کی بیٹی سہی لیکن وہ بھی آخر میرا بیٹا ہے یہ بھی پتا چل جائے گا صرف میری خاطر۔"

بتول شاہ نے انتہائی سخت اور پتھریلے لہجے میں کہتے ہوئے علیزے کو ایک زہر آلود نظر سے سر تا پا دیکھا تھا اور پلٹ کر قدم وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا دیئے تھے۔

"آنٹی....." علیزے کے منہ سے بے ساختہ یہ پکار نکلی تھی اور بتول شاہ اپنی پوری ہستی سے ہل کے رہ گئی تھیں ان کے قدم لڑکھڑائے تھے لیکن صورتحال ایسی تھی کہ ٹھہرنا بھی محال تھا اور وہاں سے چلے جانا بھی مشکل تھا اور وہ ہمیشہ سے مشکل کام ہی کرتی آئی تھیں اس لیے پیچھی کر گزری تھیں اور علیزے ان کی پشت دیکھتی رہ گئی وہ پلٹ کر اسے دیکھے بغیر اور اسے جواب دیئے بغیر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھیں البتہ علیزے کے پاس ایک تسلی ایک آس اور ایک یقین ضرور چھوڑ گئی تھیں۔

♥

وہ صبح کورٹ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے موبائل پہ نبیل کی کال آئی تھی اور وہ اپنی ٹائی کی ناٹ لگاتے لگاتے رک گیا تھا۔

"السلام علیکم....." اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔

"وعلیکم السلام..... کیسے ہو؟" نبیل کافی فریش موڈ میں لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں تم سناؤ صبح صبح کیسے یاد کر لیا۔" دل آور یونہی موبائل ساتھ لیے دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"یار ہم تو ہر وقت تمہیں یاد کرتے ہیں تم صبح صبح کی بات کر رہے ہو؟" نبیل نے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

"جانتا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن پھر بھی صاف صاف بتاؤ کہ کس لیے فون کیا ہے آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں، مجھے کورٹ بھی پہنچنا ہے۔" دل آور نے اک نظر گھڑی کی سمت دیکھتے ہوئے اسے اصل مقصد بتانے پہ اکسایا تھا۔

"اوے یار تم تو ہر وقت ہی کہیں نہ کہیں پہنچنا ضروری ہوتا ہے، بس ہم ہی پاگل ہیں کہ جو تمہیں بار بار فون کر کے ڈسٹرب کرتے رہتے ہیں۔" نبیل خفگی سے جھنجلا گیا تھا۔

"نبیل! کچھ اس مت کرو تمہیں خود پتا ہے کہ مجھے اس وقت کورٹ پہنچنا ہوتا ہے۔" دل آور نے اسے جھڑک دیا تھا۔

"تو میں تمہیں کب منع کر رہا ہوں کورٹ پہنچنے سے؟ اوکے تم جاؤ کورٹ پہنچو لیٹ ہو رہے ہو تم۔" نبیل نے فون بند کر دیا تھا اور اب کی بار دل آور کو تاؤ آیا تھا اس نے اسے خود کال بیک کی تھی۔

"ہیلو۔" نبیل نے چار پانچ مرتبہ رنگ بجنے کے بعد کال ریسیو کی تھی۔

"نبیل! علیزے یار کیوں ٹینشن دے رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟" دل آور نے نجانے کیوں اپنے غصے کو نرمی میں بدل دیا تھا اور نبیل اس کے انداز پہ مسکرا دیا تھا اور اسے مزید زچ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

"ارے یار! آج جنوں آنٹی کی آمد کی خوشی میں ممانے تمہاری فیملی کو اور عبداللہ کی فیملی کو ڈنر پہ انوائیٹ کیا ہے تم لوگ آ
پہ ہماری طرف انوائیٹڈ ہو بس یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اب تم آنٹی کو بھی بتا دینا۔" نبیل نے بالآخر اسے بتا ہی دیا تھا۔

"نہیں یار! آج نہیں، میں ذرا میطلی اپ سیٹ ہوں میں تمہاری اس دعوت کو انجوائے نہیں کر پاؤں گا اس لیے تم یہ دعوت
پہ اٹھا رکھو پلیز میری بات کو مائنڈ مت کرنا۔"

دل آور نے اسے ذرا سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر نبیل بھی مجبور تھا۔

"کل..... نہیں یار کل تو بہت مشکل ہے کیونکہ میں نے اور عبداللہ نے کراچی بھی جانا ہے، ہم نے تو سیٹس بھی ریز
ہیں اسی لیے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے یہ دعوت بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے پھر ہماری واپسی میں بھی دو تین دن لگ جائیں گے
ہو سکتا ہے کہ آنٹی بھی واپس اسلام آباد چلی جائیں۔ اس لیے یہ دعوت آج رات کے لیے ہی بہتر ہے تم اپنے آپ کو فریش کرنے
کوشش کرو ویسے بھی میں نے آج تم سے کچھ شیئر کرنا ہے رات کو ڈنر کے بعد فرصت سے بیٹھیں گے دنیا داری تو ہوتی ہی رہے گی
دل داری بھی کر لیں آخر کیا خیال ہے۔"

نبیل نے آخر میں شرارت سے پوچھا تھا اور دل آور لہجے کے ہزاروں جملے میں ہی اس کی بات کا اور دل داری کا مفہوم سمجھ
تھا اور اس نے اپنے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے پھر..... یہ دعوت اور یہ دل داری آج ہی سہی۔" دل آور نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے ہامی بھر لی تھی
لیکن نبیل حیات اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا اور خوشی خوشی فون بند کر دیا تھا۔

لیکن دل آور شاہ، اس کی اس دعوت اور دل داری پہ گم سم سا ہو کے رہ گیا تھا۔ ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ
ہائی کی ناٹ لگاتا پھر موبائل آف کر کے واپس ٹیبل پہ رکھتا کہ وہ تو جہاں تھا وہیں کا وہیں پتھر ہو گیا تھا۔ دل کسی اتھاہ گہرائی میں
ڈوبا تھا اور اس کی دھڑکنیں دیکھتے ہی دیکھتے مدھم سے مدھم تر ہوتی چلی گئی تھیں اور سانسوں میں "دعوت اور دل داری" جیسے الفا
گونجتے رہ گئے تھے اور اب واقعی لگ رہا تھا کہ دل آور دنیا پہ نزع کا عالم وارد ہو چکا تھا، اب بس چار سو قیامت کے آثار تھے اور
قیامت سے فرار کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا۔

اسی لیے اسے اس قیامت کے سامنے ڈٹ جانے کے لیے دل آور شاہ بننا ہی پڑا تھا جو کسی بھی قیامت یا کسی بھی طوفان کے
سامنے ڈھے نہیں سکتا تھا بلکہ ساری قیامتیں خود پہ سہہ لینے کی پوری طاقت اور حوصلہ رکھتا تھا اور اسی حوصلے کا ثبوت دیتے ہوئے
ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سیدھا کورٹ جا پہنچا تھا جہاں اس کے ایک کیس کی ڈیٹ تھی اور اسے یہ کیس جیتنا ہی تھا کیونکہ ہار
کا شیوہ نہیں تھا۔

اس کی نیت اور ایمان سچے تھے اور یہ اس کا اللہ جانتا تھا اس لیے وہ کبھی ہار بھی نہیں سکتا تھا۔

♥

"ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟"

وہ اکیڈمی سے نکل کر بس سٹاپ کی طرف جا رہی تھی جب اچانک اس آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے لیکن اس نے
پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اف..... یہاں تو پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے یہ جان سے پیارے لوگ۔" جودت بڑی تڑنگ سے کہتا ہوا
بائیک اس کی سائیڈ پہ اس کے برابر لے آیا تھا اور مریم اسے دیکھ کر اب بھیچ گئی تھی۔

"بس تھوڑا بزی ہو گیا تھا ڈیڈ بیمار تھے ہاسپٹل کے چکر کاٹنا پڑ رہے تھے اور کچھ اپنی یونیورسٹی کے "وخت" بھی تھے اس لیے
اتنے دن درشن کے لیے حاضری نہیں دے سکا لیکن اب آپ بے فکر رہیں یہ حاضری روز دیتا رہوں گا صبح، دوپہر، شام۔" وہ ڈھٹائی
سے کہتا شرارت سے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اس کی سمت جھکا تھا جبکہ مریم اس کی حرکت پہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور وہ
بائیک اس کے قریب لے آیا تھا۔

"آپ کیا کبھی تھیں کہ جودت آفندی جان چھوڑ گیا؟" وہ آنکھوں پہ بلیک گلاسز چڑھائے متبسم سے لہجے میں کہتا اسے
گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مریم کو اس کی نظریں اپنے جسم پہ انگاروں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں اور ان انگاروں کی جلن کو

...ان کے لیے حال ہو رہا تھا وہ بڑے ضبط سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

...ہیں راستہ چھوڑیں۔" مریم نے پھر بھی ذرا تحمل سے کام لیا تھا۔

"تم اپنے تئیں آنے کا راستہ دے دو میں یہ راستہ چھوڑ دوں گا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے اور مریم کا پارہ ہائی ...ہو گیا تھا وہ تنگ راستے میں اس کی ایسی بیہودہ باتیں اور حرکتیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھی اس کے آس پاس اکیڈمی کی سٹوڈنٹس بھی ...ہی تھیں تھوڑی دیر پہلے ہی چھٹی ہوئی تھی۔ اس لیے ابھی سٹوڈنٹس کا رش چھٹ رہا تھا۔

"شٹ اپ جوت آفندی! میرا راستہ چھوڑو..... تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم آخر چاہتے کیا ہو؟" مریم دبے لہجے میں چیخی تھی اور ...ت اس کی برہمی پر لطف اندوز ہوتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

زندہ رہنے کے لیے تیری قسم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم

اس نے جواباً گانا گنگناتے ہوئے خاصے لوفرانہ انداز میں اسے آنکھ ماری تھی اور مریم سر سے لے کر پاؤں تک جل اٹھی تھی ...ں کا حال چاہ رہا تھا کہ جوت آفندی کے منہ پہ اک زوردار طمانچہ دے مارے مگر پھر بھی اپنے آس پاس کا خیال رکھتے ہوئے اس ...نے جذبات کو بھی اپنے کنٹرول میں ہی رکھا تھا۔

"کیا ارادہ ہے؟ کرو گی ایک ملاقات صرف ایک، وہ بھی جیسی تم چاہو۔" جوت نے خباثت کی حد کر دی تھی اور مریم ...خباثت کی بھی حد ہو گئی تھی اب کی بار وہ اپنے ہاتھ کو کنٹرول میں نہیں کر سکی تھی مگر اس کا ہاتھ اپنے چہرے پہ پڑنے سے پہلے ہی ...جوت نے اپنی گرفت میں سنبھال لیا تھا جس کو چھڑانے کے لیے مریم نے اپنی طرف سے ایک بھرپور سعی کی تھی مگر جوت نے اس کا ...ہاتھ جھٹکنے کے بجائے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا اور مریم یکدم جیسے پتھر کا بت بن گئی تھی وہ ششدر سی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ...دیکھ رہی تھی۔

"یہ بوسہ تمہاری جرأت کا خراج ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم آئندہ کسی بھی جرأت سے پہلے اس خراج کو ضرور یاد رکھو گی۔" وہ ...اسے ایک بار پھر خباثت سے آنکھ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

لیکن پیچھے سے دل آور شاہ کی گاڑی نے اسے بائیک سمیت ٹھوکر مار کر کئی فٹ دور اُچھالتے ہوئے اس کی ساری خباثت اور ...رومانس ہرن کر دیا تھا جس پہ مریم بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئی تھی جبکہ دل آور شاہ اپنی گاڑی سے غضبناک کی علامت بنا نیچے اُتر آیا تھا کیونکہ ...وہ جوت آفندی کی حرکت دیکھ چکا تھا اور اس کا میٹر گھوما ہوا تھا اس وقت۔

اور مریم کو اس افتاد پہ اپنی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان چکراتے ہوئے نظر آئے تھے۔

♥

کیونکہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔

وہ آدمی کون تھا اور کون نہیں؟ مریم یہ نہیں جانتی تھی مگر وہ جو بھی تھا اس وقت اس کے عزائم بہت خطرناک لگ رہے تھے وہ ...بنا چار جانہ تیزوں سے جوت کی طرف بڑھا تھا اور اس نے نیچے زمین پہ گرے ہوئے جوت کو اس کی شرٹ کے کالر سے دبوچ ...کر اک جھٹکے سے اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

"جوت آفندی! تم نے آج ثابت کر دیا ہے کہ تم واقعی ایک ذلیل اور گندے گھرانے کی اولاد ہو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری ...یہ گندگی اگر کسی اور کے گھر تک پہنچی تو تمہارے اس جوانی کے نشے میں ڈوبے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈال دوں گا اور ...تمہارے گھر والوں کو تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔" اس نے جوت کو اس کی شرٹ کے گریبان سے پکڑ کر ذرا سا جھنجھوڑتے ...ہوئے انتہائی غضبناک لہجے میں اسے وارننگ دی تھی اور جوت اپنے اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی اس کی دھمکی پہ نہیں بلکہ اس کی شکل ...مبہوت دیکھ کر ہم خود سا رہ گیا تھا۔ اسے اپنی چوٹ اور افتاد بھول گئی تھی۔ وہ بس آنکھیں پھیلائے بے یقین سے انداز میں اس کے ...حسن کی سحر کو دیکھ رہا تھا۔

"مہ جبین اتت..... تم؟" جوت کی زبان لڑکھڑا گئی تھی اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے

ان کی حویلی کو برباد کرنے والا علیزے کا ڈرائیور منصور حسین کھڑا ہے۔

''ہاں..... میں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو لیکن اگر نہیں بھی جانتے تو کوئی بات نہیں تمہارے ڈیڈ تو جانتے ہی ہیں لیے بہت جلد تم لوگ بھی جان جاؤ گے اور یہ بھی جان جاؤ گے کہ کسی دوسرے کی عزت نہ سمجھنے والے کا میں کیا حال کرتا ہوں بہن یا بیٹی پہ بُری نظر ڈالتے ہوئے تمہیں شرم بھی آئے گی اور تمہیں بُرا بھی لگے گا لیکن یہ شرم تمہیں تب ہی آئے گی جب تم کسی اور کی عزت کا خیال آئے گا اور جہاں تک میرا انداز کہتا ہے تو وہ یہی ہے کہ تمہیں یہ خیال کبھی نہیں آئے گا اس لیے یہ سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آئندہ کبھی تم مجھے اس لڑکی کو یا پھر کسی بھی لڑکی کو چھیڑتے ہوئے یا تنگ کرتے ہوئے نظر آئے تو حشر کروں گا کہ پورا شہر تماشہ دیکھے گا اور تم اپنی شناخت پہ منہ چھپاتے پھرو گے اور اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنی حرکتوں سے ورنہ آج جس گاڑی سے میں نے تمہیں ٹھوکر ماری ہے کل میں تمہیں اس گاڑی سے روند کر بھی گزر سکتا ہوں۔ یہ ٹھوکر تو تم محض ایک اشارہ تھی تاکہ تم سنبھل جاؤ ورنہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آ سکتا ہوں تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے اور میں بھی وہی ہوں جو کسی نے سوچا بھی نہیں ہوتا اور اس کی ایک مثال تو تم دیکھ ہی چکے ہو گے؟'' دل آور نے غصے سے بھری آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ باور کروا دیا تھا اور پھر اسی ایک جھٹکے سے اس کی شرٹ کو چھوڑتے ہوئے اسے پیچھے دھکیل دیا تھا اور خود واپسی کے لیے قدم موڑ لیے تھے۔ جبکہ جوڈت کا دھیان یکدم علیزے کی طرف تھا جو ان لوگوں کے درمیان شناسائی کا ایک حوالہ تھی۔

''علیزے..... علیزے کہاں ہے منصور حسین؟ تت..... تم نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ کیوں دھوکا دیا ہے کیوں؟'' جوڈت پیچھے سے بلند آواز میں چلایا تھا۔ دل آور نے مریم کے قریب پہنچ کر ذرا کی ذرا پلٹ کر جوڈت کی سمت چہرے پہ تکلیف اور اُلجھن کے آثار لیے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''جو دوسروں کی علیزے کے ساتھ ایسا کرتے ہیں ان کی اپنی علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔'' دل آور نے اور پھنستے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے مریم کی طرف اشارہ سے اسے کچھ جتایا تھا اور پھر مزید اسے دیکھے بغیر دوبارہ مریم کی طرف ہو گیا تھا۔

''اگر آپ کو مسئلہ نہ ہو تو آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اس نے مریم کو دیکھتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف تھا اور مریم اپنے سامنے کھڑے اس آدمی کی شاندار پرسنالٹی اور اتنی بڑی گاڑی دیکھ کر اندر سے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی کرے؟ انکار کر دے یا اقرار کر لے؟ آخر وہ آدمی جو بھی تھا اس کے لیے تو بالکل اجنبی ہی تھا وہ اتنی آسانی سے کیسے اس میں بیٹھ جاتی۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ میری بھی ایک بہن ہے اس لیے دوسروں کی بہنوں کی عزت کرنا کافی اچھی طرح جانتا ہوں میں آپ سے زیادہ اصرار نہیں کروں گا اگر آپ جانا چاہیں تو ٹیکسی سے بھی جا سکتی ہیں، میں آپ کو ٹیکسی ہائر کر دیتا ہوں۔'' اس کے لیے اپنی گاڑی کا بیک ڈور کھولتے کھولتے رُک گیا تھا اور مریم اس کی بات پہ سنبھل گئی تھی اس نے اپنے آپ کو ذرا تھا۔

''نن..... نہیں ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے دل آور کو ٹیکسی کرنے سے روک دیا تھا۔ جس کا مطالبہ تھا کہ وہ ساتھ جانے کو تیار تھی اس لیے دل آور نے اس کے روکنے کا مفہوم سمجھتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ اپنی گاڑی کا بیک ڈور کھول مریم دھڑکتے دل کے ساتھ حوصلہ بلند کرتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کے اندر بیٹھ گئی تھی اور دل آور نے اس کے بیٹھنے کے ڈور بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور اگلے دو منٹ میں وہ جوڈت کے سامنے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا گاڑی کی بیک سیٹ پہ بیٹھی مریم چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

آج جو کچھ ہو چکا تھا وہ واقعی بہت غلط اور چپ ہو جانے والا تھا اسی لیے اس کے ذہن کو خاموشی کیا ملی تھی کہ سوچوں شور مچا دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے تمام محسوسات بیدار ہو گئے تھے اور اس کے ہاتھ پہ ثبت جوڈت آفندی کے ہونٹوں انگارے کی طرح دہکنے لگا تھا۔ جلن دینے لگا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ کی جلد پہ کسی تیزاب کی سی تکلیف کا احساس ہونے لگا احساس کے تحت وہ لاشعوری طور پہ ہی اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے ملنے لگی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کی

سے کاٹ کے پھینک دے جہاں پہ اس کے ہونٹوں کا لمس سلگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کا وہ حصہ وہ جگہ اور وہ نقش اسے اذیت دے رہے تھے، وہ اندر ہی اندر جل رہی تھی کڑھ رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور اس سارے چکر میں اس کے ذہن سے یکسر نکل گیا تھا کہ وہ اس وقت ایک اجنبی کی گاڑی میں سوار ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ وہ بے خبری میں تھی اس وقت مگر اگلے ہی پل وہ چونکی تھی اس نے اک جھٹکے سے سر اُٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے اس آدمی کو دیکھا تھا جو اب اپنا تعارف کروانے کے بعد کسی سے بات کر رہا تھا۔

"ایس پی کامران مہدی بات کر رہا ہوں۔" ایس پی کامران مہدی نے کسی لینڈ لائن نمبر سے کال کی تھی اسی لیے اسے بھی اپنا تعارف کروانا پڑا تھا۔

"اوہ..... ایس پی صاحب کیسے ہیں آپ؟" دل آور کی ساری توجہ اب ایس پی کامران مہدی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

"شکر ہے اللہ کا بیرسٹر صاحب! آپ سنائیں کیا چل رہا ہے آج کل؟" ایس پی کامران مہدی نے بھی کافی فریش لہجے میں جواب دیا تھا۔

"وہی سب کچھ جو آپ کی طرف چل رہا ہے۔ کام کام اور صرف کام۔" دل آور نے ہلکے سے کندھے اچکائے تھے۔

"چلیں بیرسٹر صاحب! اچھے کی اُمید رکھتے ہیں۔ اللہ بھی ہمیں بھی تو فرصت دے گا، ہم بھی کام کے علاوہ کچھ اور انجوائے کر پائیں گے۔" ایس پی کامران مہدی نے ٹھنڈی آہ بھری تھی اور دل آور اس کے انداز پہ بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"سنا تھا کہ اُمید پہ دنیا قائم ہے، مگر آج تو اس محاورے پہ یقین بھی آ گیا ہے۔ کیونکہ ایس پی صاحب بھی اسی محاورے پہ قائم ہیں۔" دل آور نے ایس پی کامران مہدی کی بات کو خوب انجوائے کیا تھا۔

"تو پھر اور کیا کریں؟ دل کو کچھ تو تسلی دینی ہی ہے بیرسٹر صاحب۔" ایس پی کامران مہدی نے بھی مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"خیر..... یہ تسلیاں تو ہم اپنے آپ کو دیتے ہی رہیں گے آپ یہ بتائیں کہ آج یاد کیسے کر لیا؟ کوئی نئی تازہ؟" دل آور نے اس سے اصل بات کے لیے استفسار کیا تھا۔

"نئی تازہ بھی ہے کہ ملک حق نواز کی بیل کے لیے کچھ سرگرمیاں نظر آ رہی ہیں۔ ملک اسد اللہ اور ملک شرافت علی اس سے ملاقات کے لیے بھی آئے تھے اور اس کی بیل کی بات بھی ہو رہی تھی آخر ان کا اپنا اثر و رسوخ بھی بہت ہے۔ بیل تو وہ کروا ہی لیں گے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کیس میں میڈیا کو بھی انوالو کر لیں تا کہ یہ مسئلہ جن لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہے ان کے سامنے بھی آ جائے اور ملک حق نواز کی بیل ناممکن ہو جائے ورنہ وہ بہت آسانی سے بچ کے نکل جائے گا۔"

ایس پی کامران مہدی نے اسے مسئلہ بتانے کے ساتھ ساتھ مسئلے کا حل بھی بتا دیا تھا جس پہ دل آور کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

"میں ایس پی صاحب! ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اس ذلیل انسان کو سزا دینے کے لیے مومنہ بی بی کو میڈیا والوں کے ننگے سوالوں کے سامنے کھڑا نہیں کر سکتا۔ میں اس کو سزا دلاؤں گا تو اپنے طریقے سے یہ طریقہ میرے معیار کا نہیں ہے۔ میں اس مظلوم لڑکی کا استعمال نہیں کر سکتا۔" دل آور نے کافی سختی سے نفی میں سر ہلایا تھا کیونکہ وہ اس مسئلے کے ایسے حل پہ تیار نہیں تھا۔ وہ مومنہ بی بی کو پوری دنیا کی نظروں کے سامنے نہیں لا سکتا تھا وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر ایس پی کامران مہدی اس کی اس سوچ کو اتنی جلدی کچھ نہیں سکا تھا اسی لیے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن بیرسٹر صاحب! یہ مسئلہ یہ کیس بھی تو اسی لڑکی کا ہے نا؟ آپ اسے کون سا کسی اور کیس میں انوالو کر رہے ہیں؟ وہ اس کیس میں انوالو نہیں ہو گی تو کیس مضبوط کیسے ہو گا؟ اور اگر ملک حق نواز کی بیل ہو گئی تو سب سے زیادہ یہ مسئلہ آپ کو ہو گا۔ وہ اب آپ کا اپونینٹ اور اپنا دشمن سمجھ رہا ہے۔ اس کا پہلا حملہ آپ پر ہی ہو گا۔" ایس پی کامران مہدی بھی اپنی جگہ پہ درست تھا۔

مگر دل آور کی بھی اپنی ہی منطق ہوتی تھی وہ ایسی باتوں کے ذرا کم ہی نوٹس لیتا تھا کیونکہ اس نے کرنا وہی ہوتا تھا جو اس کی

اپنی مرضی ہوتی تھی اس لیے ادھر اُدھر کے مشوروں پہ دھیان دینا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا اور اس وقت بھی اس کا ایسا ہی رویہ تھا کسی بھی مشورے پہ دھیان دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ایس پی صاحب! اس لڑکی پہ ظلم ہوا ہے زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ اسے بے چادر اور بے آبرو کیا گیا ہے کہ زیادتی اور آبرو ریزی سے بلبلا کر اس نے انصاف کے لیے آواز اُٹھائی ہے، احتجاج بلند کیا ہے یہاں تک کہ اس انصاف کے لیے اپنے گھر اور گھر والوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ گھر سے بے گھر ہو گئی ہے وہ اور آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کسی لڑکی کے آبرو ہونا اور بے گھر ہونا کتنی بڑی اذیت ہو گی؟ کتنا بڑا عذاب ہو گا؟ اور اس لڑکی نے تو یہ دونوں اذیتیں دیکھی ہیں دونوں عذاب اُٹھائے ہیں اور ایسے میں، میں ہی اس کے اس احتجاج کو اس کے لیے مشکل بنا دوں تو آپ کا کیا خیال ہے کہ پھر کبھی کوئی بھی عورت انصاف کے لیے آواز اُٹھا پائے گی؟ یا کبھی کسی زیادتی پہ احتجاج کر پائے گی؟ ہونہہ..... نہیں ایس پی صاحب ایسا کبھی نہیں پھر ہر مظلوم عورت ظلم کو انصاف سے بہتر سمجھنے لگے گی، پھر کبھی کوئی عورت احتجاج نہیں کرے گی اور نہ ہی کبھی انصاف کے لیے آواز اُٹھائے گی اور میں لوگوں کو انصاف دلانے والا ایسا کبھی نہیں چاہ سکتا میری وجہ سے کوئی انسان انصاف سے محروم رہ جائے انصاف کی طلب سے دور ہو جائے۔ اسی لیے آپ یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ میں اس معاملے میں میڈیا سے کوئی ہیلپ لوں بے شک ملک حق نواز بیل کروا کے لاک اپ سے باہر آ جائے، مجھے کوئی پروا نہیں ہے، اس کی بیل سے بھلا کیا ہو گا؟ میں ایسے لوں گا اس کی بیل کا پوائنٹ تو پہلے روز سے ہی میرے ذہن میں تھا وہ لوگ اس کی بیل تو کسی بھی وقت کسی بھی طرح کروا لیں گے بہر حال میں کوشش کروں گا کہ اس کی بیل کی اپیل ریجیکٹ ہو جائے۔ اس لیے آپ بھی بے فکر رہیں اور آگے کے دیکھیے گا لیکن پھر بھی میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے انفارم کیا ہے اور اُمید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح میرے انفارم کے بغیر کسی بات کو مائنڈ کیے۔"

دل آور نے ایس پی کامران مہدی کو کافی اچھے طریقے سے اپنے پوائنٹ آف ویو سے آگاہ کیا تھا اور ایس پی کامران مہدی نے اس پوائنٹ آف ویو کو اچھی طرح سے سمجھ بھی لیا تھا۔ اسی لیے اسے مزید کچھ بھی سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور سارا معاملہ دل آور کے پوائنٹ آف ویو پر چھوڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے یور سٹر صاحب! جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں، آپ ویسا ہی کریں کیونکہ آپ اگر بغیر کسی غرض کے ایک مظلوم لڑکی کا ساتھ دے رہے ہیں تو اس اچھے کام میں ہم کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں، ہم ان شاء اللہ ہمیشہ ایسے معاملے میں آپ کا ساتھ دیتا رہیں گے۔ آپ جو بھی کہیں گے ہماری طرف سے آمین ہے۔" ایس پی کامران مہدی نے اسے اپنی طرف سے پوری طرح سے مطمئن کیا تو دل آور کو اس کی بات پہ خوشی ہوئی تھی کہ چلو کسی اور نے تو اس جیسا سوچا۔

"ٹھینک یو ایس پی صاحب ٹھینک یو سو مچ! مجھے آپ سے یہی اُمید تھی، بہر حال میں اس وقت فون بند کرتا ہوں دیر ہو گئی وقت کہیں جانا ہے، آپ سے پھر فرصت میں بات ہو گی۔" دل آور نے مریم کے خیال سے گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے ایس پی کامران مہدی سے اجازت چاہی تھی کیونکہ آخر اس نے اس لڑکی سے اس کا ٹھکانہ بھی تو پوچھنا تھا۔

"او کے یور سٹر صاحب! اللہ حافظ۔" ایس پی کامران مہدی نے جلدی ہی فون بند کر دیا تھا اور دل آور فون بند ہوتے ہی سیٹ پہ بیٹھی حیرت سے گنگ مریم فاروق نیازی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ نے کس طرف جانا ہے؟ کہاں ڈراپ کروں؟" دل آور نے بغیر اس کی طرف دیکھے ڈرائیری سے دریافت کیا تو مریم اس کے پوچھنے پہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔

"جج..... جی..... کیا کہا آپ نے؟" اس نے غیر حاضر دماغ سے دوبارہ استفسار کیا تھا۔

"آپ نے کس طرف جانا ہے؟ کہاں ڈراپ کروں آپ کو؟" دل آور نے دوبارہ دہرایا تھا اور مریم نے آہستگی سے اپنے گھر کا ایڈریس بتا دیا تھا کیونکہ وہ جس آدمی کو اجنبی اور نجانے کیسا سمجھ رہی تھی وہ آدمی ہی اصل اعتماد کے قابل ہے یہ تو وہ جانتی ہی تھی۔ اسی لیے اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اپنے گھر کا ایڈریس بتا دیا تھا اور دل آور نے ٹھیک پانچ منٹ کے بعد گاڑی اس مظلوم ایڈریس پہ جا روکی تھی۔

"آگے گلی تنگ ہے؟" دل آور نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

اترنے کے لیے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

"جی آگے لگی تھی ہے۔" مریم کی آواز دھیمی تھی اور دل آور نے اب کی بار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا کیونکہ مریم نیچے

"دیکھیے ــــ مجھے غلط مت سمجھیے گا، دراصل آپ کو اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں لانے کا صرف یہی مقصد تھا کہ جو دت آفندی کو کم

ہی گرفتار کرے، کیونکہ آپ تو نہیں لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور اس طرح آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر اور بھی جان جائے گا

ہے بھی آپ کو کسی سے بھی بھیج سکتا تھا بس اسی وجہ سے میں نے آپ کو اپنے ساتھ آنے کی آفر کی تھی۔"

دل آور نے اس کے جانے سے پہلے بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھا تھا تاکہ وہ لڑکی اسے غلط نہ سمجھے اور اس کا ذہن کسی

بھی ایسے ویسے خیال سے پاک ہو جائے حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کا ذہن تو اس کا نام سن کر ہی ایسے ویسے خیال سے پاک

ہو چکا تھا وہ اسے اس کے نام سے ہی پہچان گئی تھی۔

"نہیں سر! آپ ایسا مت سوچیے آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کر کے مجھ پہ احسان کیا ہے جس کے لیے میں آپ کی شکر

گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ آئی ایم رئیلی تھینکس ٹو یو اور رہی بات آپ کو جانے کی تو یہ سچ ہے کہ میں بھی آپ کو اچھی طرح

جان چکی ہوں کیونکہ آپ پہلے ہی ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ میری ماں، میری بہنیں اور میں خود آپ کے لیے خدا کے حضور دعا گو ہو

چکی ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے ہمارے واحد سہارے کا ہمارے اکلوتے بھائی کا ساتھ دیا ہے۔ ہمیں بے سروسامان ہونے سے بچایا

ہے۔ عدیل عمر نیازی کی ضمانت کروائی ہے اور اسے آزادی دلائی ہے اور عدیل عمر نیازی کی بہن ہونے کے ناتے میں ایک بار پھر

آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی سر ــــ تھینک یو سو مچ ــــ آپ واقعی ایک اچھے انسان ہیں، مجھے آپ سے مل کر اور آپ کو دیکھ کر واقعی

بہت خوشی ہوئی ہے۔ اللہ آپ کو کامیابیاں و کامرانیاں عطا کرے اور آپ کی عمر دراز کرے آمین۔"

مریم نے بھی جواباً کھل کے جواب دیا تھا اور جو دل میں تھا سب کہہ دیا تھا جبکہ دوسری طرف دل آور خود بھی اس لڑکی کی بات

پہ اور اس کے تعارف پہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ عدیل عمر کی بہن تھی یہ تو اسے پتا ہی نہیں تھا۔ ہنسے جان کر اسے واقعی بہت حیرانی ہوئی

تھی۔

"اللہ حافظ سر۔" وہ دل آور کو اسی طرح حیران چھوڑ کر گاڑی سے نیچے اتر گئی تھی اور وہ چند سیکنڈ یونہی اس لڑکی کو بھلی مزتے دیکھ

کر گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

♥

"السلام علیکم سر!" وہ ابھی شوروم کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے گاڑی سے نیچے اترا ہی تھا کہ اچانک عدیل عمر اس کے

سامنے آ گیا تھا۔

"ہے ــــ وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" دل آور نے جواباً خاصی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا جس پہ عدیل کو کافی تسلی ہوئی تھی کہ اس

کا موڈ خوشگوار ہے۔

"جی اللہ کا احسان ہے، میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیں کہاں تھے اتنے دنوں سے؟ میں اتنی بار آفس آیا مگر ہر بار آپ کی غیر

موجودگی کا سن کر مجھے واپس جانا پڑا، آج بھی مجھے امید نہیں تھی کہ آپ سے ملاقات ہو گی لیکن پھر بھی اپنے آپ کو تسلی دے کر چلا آیا

کہ شاید آج مایوس نہ لوٹنا پڑے اور دیکھ لیں آج اللہ نے مایوسی کا منہ دیکھنے سے بچا لیا ہے۔ آج آپ سے ملاقات ہو ہی گئی ہے۔"

عدیل نے اس سے ملاقات ہو جانے پہ خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا جبکہ دل آور اس کی بات پہ اور اس کے انداز پہ مسکرا دیا تھا۔

"مسٹر عدیل! میں تو آپ کو خاصا سمجھدار سمجھ رہا تھا لیکن آپ تو پہلے قدم پہ ہی سمجھداری سے دستبردار ہو گئے ہیں بہت افسوس

ہوا جان کر۔" دل آور نے جیسے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور عدیل نے اس کے افسوس پہ اُلجھی ہوئی اور ناسمجھ

سی نظر سے اسے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب سر! کیا کیا ہے میں نے جس پہ آپ کو اتنا افسوس ہو رہا ہے؟"

"ابھی بھی تم پوچھ رہے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟ ارے واہ کمال کی بات ہے یار! اتنے دن ہو گئے ہیں نے تمہیں کہا تھا کہ تم

سیدھا جا کر آفس میں ہوتا ہوں یا نہیں ہوتا تمہیں بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بے شک آفس میں، میں نہیں تھا لیکن میرا

پارٹنر تو ہے نا اور نبیل حیات تو میرا پارٹنر ہی نہیں میرا بھائی بھی ہے اور میرا دوست بھی۔ اس کے سامنے تم میرا نام ہی لے لیتے تمہیں جاب پہ رکھ لیتا اتنے دن مس کر دیئے تم نے آخر کیا فائدہ؟ اتنے دنوں میں تو تم یہاں ایڈجسٹ ہو سکتے تھے کچھ کام لیتے تب نا۔"

دل آور نے اسے جیسے سرزنش کی تھی جس پہ عدیل کو کافی شرمندگی ہوئی تھی۔

"سر! مجھے اس طرح منہ اٹھا کے ان کے سامنے جانا اچھا نہیں لگا کیونکہ میرے پاس نہ سیل فون ہے اور نہ ہی آپ کا کوئی کہ میں آپ سے بات ہی کروا دیتا تاکہ ان کو یقین آ جاتا کہ مجھے آپ نے ہی بھیجا ہے اور جب میرے پاس ایسا کوئی ثبوت تھا تو مجھے لگا کہ میرا جانا فضول ہے اسی لیے میں باہر سے ہی واپس لوٹ جاتا تھا۔" عدیل نے اسے اپنی سوچ اور اپنی عقل بتائی تھی جس پہ دل آور ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

"یہ تمہاری سوچ اور تمہاری عقل کی بات ہے ناور نہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم میرے پارٹنر کے پاس جاتے اور وہ اپنے سے میرا نمبر ڈائل کر کے مجھ سے ہی پوچھ لیتا کہ میں نے کسی کو بھیجا ہے یا نہیں؟ تمہارے سیل فون اور نمبر کی تو ضرورت ہی پیش آ سکتی تھی؟" دل آور کے جواب پہ عدیل کو لاجواب ہونا پڑا تھا بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑا تھا کہ وہ ایک وکیل سے بات کر رہا ہے جتنا آسان کام نہیں تھا۔

"سوری سر! میں سمجھ گیا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔" عدیل نے بلا جھجک اعتراف کر لیا تھا۔

"ارے نہیں یار! سوری کی ضرورت نہیں ہے، میں نے تو تمہیں اس لیے تمہاری غلطی کا احساس دلایا ہے کہ تم نے مس کر کے اپنا اور ہمارا نقصان کیا ہے، اتنے دنوں میں تم سب کچھ سیکھ سکتے تھے، سمجھ سکتے تھے اور آج تم اس وقت تک ویٹ کرنے کے بجائے اندر آفس میں اپنی سیٹ پہ ہو سکتے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا آؤ میرے ساتھ میں خود ہوں اپنے پارٹنر نبیل حیات سے۔" دل آور اس کا گندھا تھپک کر خود بھی اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا اور عدیل اس کے ساتھ چلتا ہوا شوروم کے اندر آ گیا تھا۔

"نبیل صاحب کہاں ہیں؟" اس نے کسی ورکر سے استفسار کیا تھا۔

"سر! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب آفس روم میں ہیں، شاید آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔" ان کا دو ورکر جواب دے وہاں سے ہٹ گیا تھا اور دل آور عدیل کو ساتھ لیے نبیل کے روم کی طرف آ گیا تھا اور باہر زک کر دروازے کو ناک کیا تھا۔

"یس کم ان۔" اندر سے نبیل کی ہی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم!" دل آور دروازہ دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! شکر ہے کہ آپ کو بھی اس شوروم کا خیال آیا۔" نبیل نے اسے دیکھتے ہی خفگی کا اظہار کیا تھا اور دل آور کی کسی بھی خفگی کا کوئی نوٹس لیے بغیر عبداللہ سے ہاتھ ملانے کی طرف دھیان دیا تھا۔

"لگتا ہے کہ کوئی خاص میٹنگ ہو رہی ہے؟" دل آور نے عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا۔

"جی جناب! میٹنگ تو ہو ہی رہی ہے اور ارادہ تھا کہ آپ کو بھی اس میٹنگ میں شریک کیا جائے مگر آپ جناب کو نہ جانے کہاں کہ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھ کر کچھ ضروری مسئلے مسائل ہی ڈسکس کر لیں۔ اس لیے مجبوری تھی یہ میٹنگ ہمیں خود ہی کرنا پڑی۔" عبداللہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے شکوہ بھی کیا تھا اور اپنی مجبوری بھی بتائی تھی۔

"خیر چھوڑو یہ مسئلے مسائل بھی ڈسکس ہوتے ہی رہیں گے۔ تم ان سے ملو یہ ہیں عدیل عمر نیازی ہمارے اس شوروم کے منیجر اور عدیل عمر یہ ہیں ہمارے جگر کے ٹکڑے ملک عبداللہ صاحب ان کی دوستی اور ان سے یاری کی وجہ سے ہی ہماری زندگی چل رہا ہے ورنہ زندگی ہمارے لیے بالکل بیکار ہوتی۔" دل آور نے خاصا تفصیلی تعارف کروایا تھا جس پہ عبداللہ نے اٹھ کر ہوئے عدیل عمر سے ہاتھ ملایا تھا۔

"اور یہ رہے شوروم کے اونر اور ہمارے پارٹنر نبیل حیات! یہ اگر نبیل حیات نہ ہوتے تو ضرور ہماری محبوبہ ہوتے کیونکہ سے اتنا ہی پیار ہے جتنا کسی انسان کو اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے۔ ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا پورا پورا خیال رکھوں کر کامیاب ہوتا بھی ہوں یا نہیں۔ بہر حال نبیل صاحب یہ ہیں آپ کے منیجر عدیل عمر نیازی ان کے بارے میں میں

ہوں اب خود ہی آپس میں دُعا سلام بڑھالیں اور مجھے ریسٹ دیں۔" دل آور نے تعارف کروانے کی بھی فارمیلٹی نبھا دی تھی
ہر ایک کو اپنی گرمجوشی سے ہاتھ ملانا پڑا تھا۔
"کیسے ہو یار! میر صاحب کے منہ سے تمہاری کافی تعریف سنی ہے، انہیں یقین ہے کہ تم اپنا کام اچھے طریقے سے ہینڈل
کرو گے۔" نبیل نے اس کی تعریف کا برملا اظہار کیا تھا جس پہ عدیل نے ذرا نروس ہوتے ہی سر جھکا لیا تھا اور پھر اک نظر دل آور کی
سمت دیکھا تھا۔
"سر! ان کے الفاظ صرف تعریف نہیں ہیں بلکہ میرے لیے تو اعزاز ہیں کہ انہوں نے میرے لیے ایسا کہا ہے اور مجھے اس
کا پورا پورا پاس بھی ہے ورنہ میں کہاں اور یہ کہاں۔"
"اوہ یار! ہم لوگوں کے ساتھ رہنا ہے تو یہ ڈائیلاگ "میں کہاں اور وہ کہاں" نہیں چلے گا، ہم لوگ تو یاروں کے یار ہیں، یہ
رسمی بات، اونچ نیچ اور امیری غریبی کے چکر ہمیں نہیں آتے بس ہم بندہ دیکھتے ہیں اور بندے کا دل دیکھتے ہیں۔" عبداللہ نے
بے تکلفی انداز میں عدیل کو تینوں دوستوں کے مزاج سے اور خیالات سے آگاہ کیا تھا جس پہ عدیل کو واقعی کافی ڈھارس اور تسلی
ہوئی تھی۔
"عجیب یوسر! یہ تو آپ لوگوں کا بڑا پن ہے، ورنہ آج کل لوگ ایسا نہیں سوچتے یہاں سارا ان چکر ہی امیری غریبی کا چل رہا
ہے یار! طبقاتی کشمکش کا دور ہے، کسی کو کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہے اور نہ ہی کسی سے کوئی غرض ہے اور ایسے میں اگر آپ لوگ ایسی
باتیں کرتے ہیں تب آپ لوگوں کو دل سے سلام پیش کرتا ہوں۔" عدیل نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے جیسے سلام کیا تھا اور دل آور نے
اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔
"بیٹھو۔ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" دل آور خود بھی اس کے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔
"تھینک یو۔" عدیل شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔
"کیا بات ہے؟ تم کس سوچ میں ہو؟" دل آور کے سوال کا رُخ نبیل کی طرف تھا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے انہیں پہلے کہاں دیکھا ہے؟" نبیل اپنی سوچ سے اُلجھ رہا تھا۔
"آپ نے مجھے وہاں دیکھا ہے جہاں آپ سے ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔" عدیل پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا تھا اسی
لیے اس نے فوراً ہی نبیل کی اُلجھن بھی دور کر دی تھی۔
"اوہ اچھا اچھا تو آپ وہی ہیں جنہوں نے مجھے اس لڑکی کو ہسپتال لے جانے سے منع کیا تھا۔" نبیل کو بھی یاد آ گیا تھا۔
"لو جی! یہاں تو پرانی جان پہچان نکل آئی ہے۔" عبداللہ اور دل آور ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے ہنس پڑے تھے۔
"ویسے ایکسیڈنٹ کس لڑکی کا ہوا تھا؟" عبداللہ نے نبیل کو شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
"ارے یار! موسنہ بی بی کی بات کر رہے ہیں، اس روز اسی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔" نبیل نے فوراً صفائی پیش کی تھی۔
"اوہ تو اس ایکسیڈنٹ کی بات ہو رہی ہے۔" عبداللہ اور دل آور دونوں دھیمے پڑ گئے تھے۔
"تو اور کیا ورنہ ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہمارا ایکسیڈنٹ کسی ایسی جگہ پہ ہو جہاں ہم جانا چاہتے ہوں۔" نبیل نے جیسے اُداسی
سے سر جھٹکا تھا اور دل آور اس کی اس سرد آہ سے نجانے کیوں چپ سا ہو گیا تھا۔
"تم ایکسیڈنٹ کہاں جانا چاہتے ہو؟" عبداللہ نے نبیل کو خاصی گہری، ذو معنی اور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا جس پہ نبیل
کچھ بول نہیں پایا تھا۔
"ابھی تیاری میں ہوں بہت جلدی بتا دوں گا تمہیں۔" نبیل نے ریلیکس انداز میں کندھے جھٹکے تھے۔
"تیاری؟ واقعی؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں دل آور یہ کسی ایکسیڈنٹ کی تیاریوں میں ہے اور ہمیں پتا ہی نہیں۔" عبداللہ نے ایک
خفگی بھرا اچنبھے کا اظہار کیا تھا مگر دل آور نے پھر بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا بلکہ وہ بات ہی بدل گیا تھا۔
"تم ایکسیڈنٹ کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ کام کی تیاری کہاں تک پہنچی ہے؟ کیا پروگرام بنایا ہے تم لوگوں نے؟" وہ ڈائریکٹ کام کی
طرف آ گیا تھا۔
"پروگرام وہی ہے جو تمہیں بتایا ہے ہم دونوں کل کراچی جا رہے ہیں اس لیے اب وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کہ آگے کیا

کرنا ہے۔'' نبیل بھی کام کی بات کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

''کچھ اندازہ ہے کہ کتنے دن لگیں گے۔'' دل آور مزید سوال پوچھ رہا تھا۔

''فی الحال تو کچھ اندازہ نہیں ہے یار! اسی لیے تو رات کو تم لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے کہ نجانے کتنا ٹائم لگے، فرصت ملنے میں اس لیے بہتر ہے کہ ہم پہلے ہی تھوڑا بہت انجوائے کر لیں۔'' نبیل نے اسے دعوت کی وجہ بتائی تھی۔

''ہوں..... بہتر ہے تم یہ بتاؤ کہ فیجر کی سیٹ کے لیے کچھ انتظام کرنے کو کہا تھا میں نے؟'' دل آور نے عدیل کی بات کرتے ہوئے نبیل سے کچھ استفسار کیا تھا۔

''ہاں..... کر دیا ہے انتظام..... یہ لو۔'' نبیل نے کہتے ہوئے نبیل کا لاک کھولا اور ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے جسے ہاتھ بڑھا کے دل آور نے اُٹھا لیا تھا۔

''عدیل عمر! آج سے اس شوروم کے فیجر ہو اور اس شوروم کے فیجر کے لیے ہم نے کچھ سہولیات فراہم کرنی ہیں کیونکہ ان کے بغیر نہ ہمارا کام چل سکتا ہے، نہ تمہارا اس لیے یہ سہولتیں بہت ضروری ہیں باقی اس جاب کے حوالے سے جو کاغذی کارروائی رہتی ہے وہ بھی تھوڑی دیر تک کمپلیٹ ہو جائے گی، پہلے تم یہ چیک کرو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے عدیل کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''لیکن سر! یہ کیا ہے؟'' عدیل لفافہ اُٹھانے سے پہلے ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

''خود چیک کر لو۔'' دل آور نے اشارہ کیا تھا۔

اور مجبوراً عدیل کو وہ لفافہ خود ہی کھولنا پڑا تھا اور کھولنے کے بعد وہ حیران سا دیکھتا رہ گیا تھا کیونکہ اس کی نظروں سے ایک پن پیک سیل فون، ایک چابی اور کچھ ہزار ہزار کے نوٹوں پہ مشتمل رقم تھی جس کی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اور اس کی تسلی کرنے کے لیے دل آور کو ایک بار پھر بولنا پڑا تھا۔

''یہ تمہارے لیے موبائل ہے، تم آج ہی نیا نمبر لو اور سیل کو آن کرو، اس طرح کسی بھی کام کے حوالے سے تم ہمارے رابطے میں رہو گے، نہ تمہیں مسئلہ ہوگا، نہ ہمیں اور یہ بائیک کی چابی ہے، تم جب تک اس جاب پہ رہو گے، یہ بائیک تمہارے میں رہے گی اور اگر اس جاب پہ نہیں رہو گے تب بھی یہ تمہاری ملکیت رہے گی اور یہ ہے تمہاری پہلی ایڈوانس سیلری۔ اس بارے کسی کو تمہیں کوئی اعتراض ہو تو، تم بلا جھجک بتا سکتے ہو، کیونکہ ہر انسان کو اپنے رائٹ کے لیے بولنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ باقی کسی کو کوئی ڈیمانڈ ہو تو وہ بھی بتا دو، ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ ڈیمانڈ پوری کر سکیں۔'' دل آور نے اس کی پوری تسلی کروائی تھی سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا، جس کے بعد عدیل کے پاس بولنے کے لیے الفاظ بھی نہیں رہے تھے، وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

''ارے یار! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تم پہ کوئی احسان نہیں ہے؟ بلکہ یہ سب تو تمہاری جاب کا حصہ ہے، ہاں تم اچھا کام کرو گے تو پرموشن بھی ہو سکتی ہے۔''

اب کی بار نبیل نے مداخلت کی تھی اور عدیل حقیقتاً دل آور شاہ کے سامنے اس کا دل سے مشکور ہوا تھا۔ حالانکہ عدیل کو پتا تھا کہ دل آور شاہ اس وقت اس کی عزت اس کی بہن کو بھی باحفاظت گھر پہنچا کے آیا ہے، جس کا مطلب تھا کہ وہ اس پہ ایک احسان کر کے آیا ہے، مگر دل آور ایسا نہیں تھا کہ اسے اس احسان کے متعلق بھی بتاتا۔

بس جو بات ڈھکی چھپی تھی وہی اچھی تھی، ورنہ ہو سکتا تھا کہ عدیل اپنی بہن پہ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی ہی لگا دیتا تھا کہ عدیل کو نہ ہی بتایا جاتا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ البتہ ان لوگوں کی باتیں اور کاروباری مسئلے مسائل کافی دیر تک چلتے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں نے کام کے سلسلے میں کراچی جانا تھا، اس لیے بہتر تھا کہ سب کچھ پہلے سے ہی طے کر لیا جاتا۔

♥

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اسرار آفندی تیار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹے ہی تھے کہ ثروت بیگم سوال کر چکی تھیں۔

''آفس اور کہاں؟'' انہوں نے تعجب سے جواب دیا تھا۔

''اور ہسپتال بھی جائیں گے۔'' ان کا اگلا سوال سامنے آیا تھا۔

"ظاہر ہے بھئی ہسپتال بھی جانا ہی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے پھر..... اگر ہسپتال جائیں تو اپنے صاحبزادے سے کہیے گا کہ ذرا گھر کا بھی چکر لگا لے، ہمارے لیے تو وہ ابھی بھی ویسے ہی ہے جیسے امریکہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ کسی اور کا تو اسے خیال ہی نہیں ہوتا سوائے بھائی صاحب کی فیملی کے۔" ثروت بیگم نے اپنی خفگی کا اظہار کیا تھا اور اسرار آفندی سمجھ گئے تھے کہ وہ آذر کی بات کر رہی ہیں۔

"آجائے گا، آجائے گا، بس بھائی صاحب بھی دو روز میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے، تم فکر نہ کرو، دانیال بھی تو ہے نا، اسے بھی تو بھاگ دوڑ کرنا ہے۔" اسرار آفندی نے بیوی کو ریلیکس کرنا چاہا تھا۔

"پتا ہے سب پتا ہے، وہ اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتا ہے؟ یہ بھی جانتی ہوں، لیکن مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے، میں تو بس اپنے بیٹے کی بات کر رہی ہوں کہ وہ اتنی بھاگ دوڑ کیوں کر رہا ہے آخر؟ اسے کیا مطلب ہے بھلا؟ جتنا بھائی صاحب کے ساتھ اس کا میل ہے اتنا ہی باقی سب کا بھی تو ہے نا؟ اسے ان کی اتنی فکر ہے اور اپنی پروا ہی نہیں ہے۔" ثروت بیگم خاصی برہم ہو رہی تھیں، اسرار آفندی ان کے تیور دیکھ کر جز بز سے ہو گئے تھے کہ اب ان سے کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔

"لیکن خیر..... جو بھی ہے، جیسے ہی بھائی صاحب ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آتے ہیں، میں فوراً ہی آذر اور کومل کے رشتے کا اعلان کر دوں گی اور کچھ عرصے میں ہی شادی بھی کر دیں گے، آخر اور کتنا انتظار کروانا ہے بچوں کو؟ یہی تو عمر ہوتی ہے ہلی خوشی رنگ سمر کرنے کی۔ آپ کو نہ سہی، لیکن مجھے تو بہت فکر ہے اس کی، آخر سب بہن، بھائیوں سے اور کزنز سے بڑا ہے وہ۔ بس یہ کام اب ہو ہی جانا چاہیے۔" انہوں نے اپنی طرف سے پکا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ جو کہ اسرار آفندی کو کچھ مناسب نہیں لگا تھا جس کا انہوں نے اظہار بھی کر دیا تھا۔

"دیکھو ثروت! تم جو بھی چاہے کرو، مگر ابھی نہیں، ابھی ان دنوں میں ایسا کچھ بھی کہنا اور کرنا ہماری خود غرضی ہوگی، جو مجھے پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسا چاہتا ہوں، بھائی صاحب کچھ بہتر ہو گئے تو پھر سب کچھ سیٹ ہو جائے گا، ہم کومل اور آذر کی شادی ان شاء اللہ بہت دھوم دھام سے کریں گے۔ بس تھوڑا اور صبر کر لو، بھائی صاحب نے ہمیشہ ہمارے لیے اتنا کچھ کیا ہے، ہماری بیٹیوں کو سنوار دی ہیں، ہمارے اور ہمارے بچوں کے مستقبل بنا دیے ہیں، تو کیا ہم ان کے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتے؟ کیا ہم سے اتنا انتظار بھی نہیں ہو سکتا؟" اسرار آفندی نے اور سنجیدگی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی اور آخر میں سوال کرتے ہوئے بات انہی پر چھوڑ دی تھی، بس کے بعد ثروت بیگم ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

"ثروت آنٹی وہ....." کومل اچانک کچھ کہتی ہوئی دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھی، لیکن ان دونوں کو جدے سنجیدہ موڈ میں دیکھ کر اسے سامنے کھڑا دیکھ کر وہیں کی وہیں رک گئی تھی۔

"ایم سوری..... میں سمجھی کہ آنٹی اکیلی ہوں گی۔" کومل بے ساختہ معذرت کرتے ہوئے پلٹ رہی تھی۔

"ٹھہرو بیٹا!" اسرار آفندی نے اسے روک دیا تھا۔

"جی انکل؟" کومل کے قدم رک گئے تھے۔

"تم اپنی آنٹی سے بات کر لو، میں آفس جا رہا ہوں۔" وہ بریف کیس اٹھا کر کومل کا سر تھپکتے ہوئے باہر نکل گئے تھے اور کومل ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہ گئی تھی۔

"کیا بات ہے آنٹی! کیا ہوا ہے آپ لوگوں کو؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟" کومل ثروت بیگم کے قریب چلی آئی تھی۔

"نہیں..... کوئی مسئلہ نہیں ہے، سب ٹھیک ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہاں سے ہٹ کے اپنے بیڈ پہ بیٹھ گئی تھیں، لیکن کومل کو پتا تھا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو آنٹی کے موڈ پہ اچھی ثابت نہیں ہوئی، ورنہ اس طرح وہ چپ نہیں ہوتی تھیں۔

"کیا آپ بتانا نہیں چاہتیں؟" اس نے پھر کریدنے کی کوشش کی تھی۔ "میں چھپانا بھی نہیں چاہتی بیٹا! مگر جب تک کوئی بات فائنل نہ ہو جائے تب تک کچھ کہنا بھی تو فضول ہے۔" وہ کافی عجیب سے انداز میں بول رہی تھیں۔

"کیا بات فائنل نہ ہو جائے؟" کومل کو تجسس ہو رہا تھا کہ آخر بات کیا ہوئی ہے۔ کیونکہ جب وہ اندر داخل ہوئی تھی تو ان دونوں میاں، بیوی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسی کے متعلق کوئی بات ہو رہی تھی یا ہوئی تھی، بات اسی کے متعلق ہو رہی تھی اس لیے اس کا تجسس بھی ایک فطری عمل تھا، اس نے تو کریدنا ہی تھا۔

''تمہارے اور آذر کے رشتے کی بات۔'' ثروت بیگم نے بھی پردہ اُٹھا ہی دیا تھا۔

''کیا..... رشتے کی بات؟'' کومل کو اپنی سماعتوں پہ جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں میں چاہتی ہوں کہ جلدی سے جلدی تمہاری اور آذر کی انگیج منٹ ہو جائے اور پھر کچھ عرصے بعد ہم لوگ شادی بھی کر دیں گے۔''

''آپ..... آپ سچ کہہ رہی ہیں آنٹی؟'' کومل کے چہرے پہ تو خوشیوں کے ہزاروں رنگ بکھر گئے تھے۔ اس پہ تو جیسے مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

''ہاں بیٹا! سچ کہہ رہی ہوں مجھے بھلا کیا ضرورت ہے مذاق کرنے کی، مگر تمہارے انکل کہتے ہیں کہ تھوڑا صبر کر لو بیٹ صاحب کو ٹھیک ہونے دو، پھر جو چاہے کر لینا، ابھی ایسا کچھ کرنا مناسب نہیں ہو گا، بس اسی لیے چپ ہو گئی ہوں۔''

وہ آخر میں کافی دھیمے سے لہجے میں بولی تھیں، لیکن فی الحال کومل کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ اس کے اور آذر کے رشتے کی بات تو چل نکلی ہے نا اور اب اُمید تھی کہ یہ بات ہو کر ہی رہے گی، اسی لیے اسے ایک دم عجیب سی سرشاری کا سا احساس تھا۔

''اوکے..... اس میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ڈیڈ کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی ایسا ہو سکتا ہے، بس چند دن سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ انتظار کر لیں۔'' کومل نے بڑے سکون اور بڑی شائستگی سے انہیں مشورہ دیا تھا۔

''وہ تو کرنا ہی پڑے گا، لیکن خیر کوئی بات نہیں، میری بڑی بہو تو تم ہی بنو گی، بھلا تمہارے علاوہ کوئی اور اچھی لگ سکتی میرے شہزادے کے ساتھ۔''

انہوں نے پاس بیٹھی کومل کا چہرہ تھام کے اس کے ماتھے پہ پیار کیا تھا اور کومل کی بے ساختہ نظریں جھک گئی تھیں، اس لمحے میں ایک عجیب سی ہلچل ہونے لگی تھی۔ آج تک جو کچھ وہ چاہتی تھی، وہی ہونے والا تھا، اس لیے اسے اور کیا چاہیے تھا بھلا، خوشیاں ہونے لگے تھے۔

♥

''جودت.....'' آذر کافی دیر سے جودت کو ہسپتال کے ویٹنگ روم کے صوفے پہ مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر آذر کو خاصی تشویش بھی ہوئی تھی، کیونکہ وہ ایک ہی جگہ پہ ٹک کر بیٹھنے والا نہیں تھا اور اگر بیٹھ گیا تھا تو ضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ بھی تھی، اسی لیے آذر اس کے قریب چلا آیا تھا اور اسے مخاطب بھی کیا تھا، لیکن جودت متوجہ نہیں ہوا تھا۔

''جودت! میں تم سے مخاطب ہوں، کیا ہوا ہے تمہیں؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟'' آذر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے متوجہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا تھا، جس پہ جودت کو متوجہ ہونا ہی پڑا تھا۔

''بس ایسے ہی طبیعت کچھ فریش نہیں ہے۔'' جودت عجیب کشمکش کی سی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا اور ذہن طرح طرح کی سوچوں سے اُلجھ رہا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ کیونکہ اس کے ذہن پہ صرف اور صرف ''منصور حسین'' سوار تھا اس وقت سے لے کر اب تک صرف اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ تذبذب کا بھی شکار تھا کہ باقی سب کو منصور حسین کے متعلق بتائے یا نہ بتائے؟ کیونکہ یہاں کی پوزیشن بھی ایسی تھی کہ یہاں کوئی بات کرنا بھی نئے سرے سے کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ چپ ہی رہے۔ مگر جو اندر اُبال اُٹھ رہے تھے وہ چپ بیٹھنے ہی نہیں دے رہے تھے، منصور حسین کو دیکھ کر اس کا ذہن ضبط کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''طبیعت خراب ہے کیا؟'' آذر اسے بغور دیکھتے ہوئے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''نہیں..... خراب نہیں ہے، بس فریش نہیں ہے، ذہن کچھ اپ سیٹ سا ہو رہا ہے، سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟'' جودت کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ خاصا پریشان اور اُلجھا ہوا ہے، جس پہ آذر کو مزید تشویش ہوئی تھی۔

''صاف صاف بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنے اپ سیٹ ہو رہے ہو؟'' اب تو آذر کو بھی پریشانی ہونے لگی تھی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی! آپ پریشان نہ ہوں، ایسا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے، جس پہ اتنا پریشان ہوا جائے۔

نے آذر کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں مسئلہ ہے تو سہی نا؟" آذر جھنجلا گیا تھا۔

"نہیں ہے کہ کوئی مسئلہ ہے مگر جب مناسب ہوا تب بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے کہ کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا، جبکہ اس کے نہ بتانے پہ آذر کی تشویش اور بھی بڑھ رہی تھی، کیونکہ اس نے جودت فی الحال آذر کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا، جبکہ اس کے نہ بتانے پہ آذر کی تشویش اور بھی بڑھ رہی تھی، کیونکہ اس نے جودت کو اس قدر اُلجھے ہوئے اور متفکر انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟" آذر اس ہی نتیجے پہ پہنچا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔

"نہیں۔" اب کی بار اس نے خاصا مختصر سا جواب دیا تھا۔

"جودت۔" آذر نے ذرا غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی سمت دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔

مگر جودت اس کی سمت دیکھنے کی بجائے تکلیف سے "آہ" کر کے رہ گیا تھا، کیونکہ جہاں سے آذر نے اس کا بازو پکڑا تھا، وہاں پاس کے چوٹ لگی ہوئی تھی اور جودت اس چوٹ پہ بینڈیج بھی کروا کے آیا تھا، مگر تکلیف تو ہنوز تھی، جس کو وہ ضبط کے صرف ہر صرف "منصور حسین" کو سوچے جا رہا تھا، لیکن اب اس تکلیف سے بھی پردہ اُٹھ گیا تھا، آذر نے بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتے ہوئے "آہ" سے چونکتے ہوئے اس کے بازو کو ایک بار پھر چھو کر ٹٹولا تھا، جودت کو پھر تکلیف ہوئی تھی۔

"یہ سب کیا ہے جودت؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" آذر کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے بھائی! بس میری بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بائیک سے گرنے کی وجہ سے یہ چوٹیں آئی ہیں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا، کافی بچت ہو گئی ہے۔" جودت نے پھر بھی اسے تسلی ہی دی تھی۔

"صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے یا کچھ اور بھی؟" آذر اسے ہر طرح سے کریدر ہا تھا۔

"نہیں اور کچھ نہیں ہوا، بس ایکسیڈنٹ ہی ہوا ہے۔" جودت اسے مطمئن نہیں کر پا رہا تھا، کیونکہ آذر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ جودت اس ذرا سے ایکسیڈنٹ اور ذرا سی چوٹ سے اتنا اپ سیٹ سا بیٹھا ہے، اسے یقین تھا کہ ضرور کوئی اور وجہ ہے جس سے وہ اتنا اضطراب لگ رہا ہے۔

"آذر بیٹا تم یہاں بیٹھے ہو، تمہیں ڈاکٹر اندر بلا رہے ہیں۔" آسیہ آفندی، آذر کو ڈھونڈتی ہوئی ویٹنگ روم میں آ گئی تھیں تو آذر ان کو دیکھتے ہی ایک نظر جودت کو دیکھتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میر۔۔۔ جو بھی ہے تم اس وقت گھر جاؤ، باقی بات بعد میں ہو گی۔" اس نے جودت کا کندھا تھپک کر اسے وہاں سے جانے کا کہا اور خود آسیہ آفندی کے ساتھ ڈاکٹرز کے پاس چلا آیا تھا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ ضرور وہ ڈیڈ کے ٹیسٹ کی رپورٹس آئی ہوں گی، جب ہی ڈاکٹر نے اسے خاص طور پہ بلایا ہے، اسی لیے اس نے آسیہ آفندی کو اپنے ساتھ ڈاکٹرز کے روم میں جانے سے منع کر دیا تھا اور خود اکیلا ہی کمرے میں داخل ہو گیا تھا، آسیہ آفندی باہر ہی کھڑی رہ گئی تھیں اور انہیں پتا تھا کہ آذر نے انہیں ساتھ آنے سے کیوں منع کیا ہے۔

♥

"چلیں؟" وہ کافی بجھے بجھے سے انداز میں تیار ہو کر نیچے آیا تھا اور ڈرائنگ روم میں دائیں بائیں ٹہلتی بتول شاہ کو چلنے کا سگنل دیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ چلو۔" انہوں نے اک نظر ٹھہر کر اسے سر تا پا گہری نظر سے دیکھا تھا اور پھر اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور دل آور کی طرف سے جواب ملتے ہی باہر کی سمت قدم بڑھا چکا تھا۔ پھر گاڑی نکالنے تک وہ دونوں ماں، بیٹا خاموش ہی رہے تھے، لیکن آخر کب تک، کب تک بتول شاہ اس کی یہ خاموشی برداشت کر سکتی تھیں؟ انہوں نے کچھ تو بولنا ہی تھا۔

"کیا بات ہے، اتنے خاموش کیوں ہو؟" انہوں نے دل آور کی سمت گردن موڑتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"تو اور کیا کروں؟" دل آور نے اُکتا کر ان سے پوچھ لیا تھا۔

"جو میں نے کیا ہے وہ کرو۔" بتول شاہ بھی جواباً پتے کے سے انداز میں بولی تھیں۔

"کر تو رہا ہوں، جو بھی، جو کچھ کہہ رہا ہے، چپ چاپ سب کر رہا ہوں۔"

"تمہارے اور آذر کے رشتے کی بات۔" ثروت بیگم نے بھی پردہ اٹھا ہی دیا تھا۔

"کیا..... رشتے کی بات؟" کومل کو اپنی سماعتوں پہ جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں میں چاہتی ہوں کہ جلدی سے جلدی تمہاری اور آذر کی انگیج منٹ ہو جائے اور پھر کچھ عرصے بعد ہم لوگ شادی بھی دیں گے۔"

"آپ..... آپ سچ کہہ رہی ہیں آنٹی؟" کومل کے چہرے پہ تو خوشیوں کے ہزاروں رنگ بکھر گئے تھے۔ اس پہ تو جیسے مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

"ہاں بیٹا! سچ کہہ رہی ہوں مجھے بھلا کیا ضرورت ہے مذاق کرنے کی، مگر تمہارے انکل کہتے ہیں کہ تھوڑا صبر کر لو پہلے صاحب کو ٹھیک ہونے دو، پھر جو چاہے کر لینا، ابھی ایسا کچھ کرنا مناسب نہیں ہوگا، بس اسی لیے چپ ہو گئی ہوں۔"

وہ آخر میں کافی دھیمے سے لہجے میں بولی تھیں، لیکن فی الحال کومل کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ اس کے اور آذر کے رشتے کی بات تو چل نکلی ہے، اور اب امید تھی کہ یہ بات ہو کر ہی رہے گی، اسی لیے اسے ایک دم عجیب سی سرشاری کا احساس ہوا تھا۔

"اوکے..... اس میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ڈیڈ کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی ایسا ہو سکتا ہے، بس چند دن سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ انتظار کر لیں۔" کومل نے بڑے سکون اور بڑی شائستگی سے انہیں مشورہ دیا تھا۔

"وہ تو کرنا ہی پڑے گا، لیکن خیر کوئی بات نہیں، میری بڑی بہو تو تم ہی ہو گی، بھلا تمہارے علاوہ کوئی اور اچھی لگ سکتی میرے شہزادے کے ساتھ۔"

انہوں نے پاس بیٹھی کومل کا چہرہ تھام کے اس کے ماتھے پہ پیار کیا تھا اور کومل کی بے ساختہ نظریں جھک گئی تھیں، اس میں ایک عجیب سی ہلچل ہونے لگی تھی۔ آج تک جو کچھ وہ چاہتی تھی، وہی ہونے والا تھا، اس لیے اسے اور کیا چاہیے تھا، خوش ہونے لگے تھے۔

♥

"جوت....." آذر کافی دیر سے جوت کو ہسپتال کے ویٹنگ روم کے صوفے پہ مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر آذر کو خاصی تشویش بھی ہوئی تھی، کیونکہ وہ ایک ہی جگہ پہ ٹک کر بیٹھنے والا نہیں تھا اور اگر وہ گیا تھا تو ضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ بھی تھی، اسی لیے آذر اس کے قریب چلا آیا تھا اور اسے مخاطب بھی کیا تھا، لیکن جوت متوجہ نہیں ہوا تھا۔

"جوت! میں تم سے مخاطب ہوں، کیا ہوا ہے تمہیں؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟" آذر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے متوجہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا تھا، جس پہ جوت کو متوجہ ہونا ہی پڑا تھا۔

"بس ایسے ہی طبیعت کچھ فریش نہیں ہے۔" جوت عجیب کشمکش کی سی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا اور ذہن طرح طرح کی سوچوں سے اُلجھ رہا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ کیونکہ اس کے ذہن پہ صرف اور صرف "منصور حسین" ہی اس وقت سے لے کر اب تک صرف اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ تذبذب کا بھی شکار تھا کہ باقی سب کو منصور کے متعلق بتائے یا نہ بتائے؟ کیونکہ یہاں کی پوزیشن بھی ایسی تھی کہ یہاں کوئی بات کرنا بھی نئے سرے سے کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ چپ ہی رہے۔ مگر جو اندر اُبال اُٹھ رہے تھے وہ چپ بیٹھنے ہی نہیں دے رہے تھے، منصور حسین کو دیکھ کر اس کا ذکر ضبط کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

"طبیعت خراب ہے کیا؟" آذر اسے بغور دیکھتے ہوئے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"نہیں..... خراب نہیں ہے، بس فریش نہیں ہے، ذہن کچھ اپ سیٹ سا ہو رہا ہے، سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟" جوت کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ خاصا پریشان اور اُلجھا ہوا ہے، جس پہ آذر کو مزید تشویش ہوئی تھی۔

"صاف صاف بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنے اپ سیٹ ہو رہے ہو؟" اب تو آذر کو بھی پریشانی ہونے لگی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی! آپ پریشان نہ ہوں، ایسا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے، جس پہ اتنا پریشان ہوا جائے۔

نے آذر کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن مسئلہ ہے تو سہی نا؟" آذر جھنجلا گیا تھا۔

"لیکن ہے کہ کوئی مسئلہ ہے مگر جب مناسب ہوا تب بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے کہ کوئی بھی بتانا نہیں چاہتا تھا، جبکہ اس کے نہ بتانے پہ آذر کی تشویش اور بھی بڑھ رہی تھی، کیونکہ اس نے جودت فی الحال آذر کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا، جبکہ اس کے نہ بتانے پہ آذر کی تشویش اور بھی بڑھ رہی تھی، کیونکہ اس نے جودت کو اس قدر الجھے ہوئے اور متفکر انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جودت کو اس قدر الجھے ہوئے اور متفکر انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟" آذر بس اسی نتیجے پہ پہنچا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔

"نہیں۔" اب کی بار اس نے خاصا مختصر سا جواب دیا تھا۔

"جودت۔" آذر نے ذرا غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی سمت دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔

مگر جودت اس کی سمت دیکھنے کی بجائے تکلیف سے "آہ" کر کے رہ گیا تھا، کیونکہ جہاں سے آذر نے اس کا بازو پکڑا تھا، وہاں پاس کے چوٹ لگی ہوئی تھی اور جودت اس چوٹ پہ بینڈیج بھی کروا کے آیا تھا، مگر تکلیف تو ہنوز تھی، جس کو وہ ضبط کے صرف ہر صرف "منصور حسین" کو سوچے جا رہا تھا، لیکن اب اس تکلیف سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا، آذر نے بے ساختہ اس کے منہ سے نکلنے والی "آہ" سے چونکتے ہوئے اس کے بازو کو ایک بار پھر چھو کر ٹٹولا تھا، جودت کو پھر تکلیف ہوئی تھی۔

"یہ سب کیا ہے جودت؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" آذر کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے بھائی! بس میری بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بائیک سے گرنے کی وجہ سے یہ چوٹیں آئی ہیں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا، کافی بچت ہو گئی ہے۔" جودت نے پھر بھی اسے تسلی ہی دی تھی۔

"صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے یا کچھ اور بھی؟" آذر اسے ہر طرح سے کریدر ہا تھا۔

"نہیں اور کچھ نہیں ہوا، بس ایکسیڈنٹ ہی ہوا ہے۔" جودت اسے مطمئن نہیں کر پا رہا تھا، کیونکہ آذر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ جودت اس ذرا سے ایکسیڈنٹ اور ذرا سی چوٹ سے اتنا اپ سیٹ سا بیٹھا ہے، اسے یقین تھا کہ ضرور کوئی اور وجہ ہے جس سے وہ اتنا اضطراب لگ رہا ہے۔

"آذر بیٹا تم یہاں بیٹھے ہو، تمہیں ڈاکٹر اندر بلا رہے ہیں۔" آسیہ آفندی، آذر کو ڈھونڈتی ہوئی ویٹنگ روم میں آ گئی تھیں اور ان کو دیکھتے ہی اک نظر جودت کو دیکھتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"فیر۔۔۔ جو بھی ہے تم اس وقت گھر جاؤ، باقی بات بعد میں ہو گی۔" اس نے جودت کا کندھا تھپک کر اسے وہاں سے جانے کا کہا اور خود آسیہ آفندی کے ساتھ ڈاکٹرز کے پاس چلا آیا تھا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ ضرور وہ ڈیڈ کے ٹیسٹ کی رپورٹس آئی ہوں گی، جب ہی ڈاکٹر نے اسے خاص طور پہ بلایا ہے، اسی لیے اس نے آسیہ آفندی کو اپنے ساتھ ڈاکٹرز کے روم میں جانے سے منع کر دیا تھا اور خود اکیلا ہی ڈاکٹرز کے روم میں داخل ہو گیا تھا، آسیہ آفندی باہر کی باہر ہی کھڑی رہ گئی تھیں اور انہیں پتا تھا کہ آذر نے انہیں ساتھ آنے سے کیوں منع کیا ہے۔

♥

"جلیں؟" وہ کافی بجھے بجھے سے انداز میں تیار ہو کر نیچے آیا تھا اور ڈرائنگ روم میں دائیں بائیں ٹہلتی بتول شاہ کو چلنے کا سگنل دیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ چلو۔" انہوں نے اک نظر ٹھہر کر اسے سرتاپا گہری نظر سے دیکھا تھا اور پھر اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور دل آور کی طرف سے جواب ملتے ہی باہر کی سمت قدم بڑھا چکا تھا۔ پھر گاڑی نکالنے تک وہ دونوں ماں، بیٹا خاموش ہی رہے تھے، لیکن کب تک، کب تک بتول شاہ اس کی یہ خاموشی برداشت کر سکتی تھیں؟ انہوں نے کچھ تو بولنا ہی تھا۔

"کیا بات ہے، اتنے خاموش کیوں ہو؟" انہوں نے دل آور کی سمت گردن موڑتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"تو اور کیا کروں؟" دل آور نے اکتاہٹ سے پوچھا تھا۔

"جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔" بتول شاہ بھی جواباً پتے سے انداز میں بولی تھیں۔

"کر رہا ہوں، جو بھی، جو کچھ کہہ رہا ہے، چپ چاپ سب کر رہا ہوں۔"

دل آور آج نبیل کی دعوت پہ جاتے ہوئے خوش نہیں ہو رہا تھا، شاید اس لیے کہ اس کے ذہن میں صبح سے نبیل سے ملنے کے [illegible] رہے تھے اور دل آور صبح سے اسی "دعوت اور دل داری" کے گھیراؤ میں پھنسا ہوا تھا، حالانکہ اس نے دن میں ہزاروں کام نپٹائے تھے سب سے بات چیت بھی کی تھی، مگر پھر بھی اس کے دل و دماغ پہ وہی دعوت اور دل داری والا قصہ سوار رہا تھا اور اس وقت بھی کی اسکرین پہ یہی سب کچھ چل رہا تھا۔

"لیکن جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، وہ تم سمجھ نہیں رہے۔" بتول شاہ نے اسے یاد دلانا چاہا تھا۔

"میں سب سمجھ رہا ہوں اماں! پہلے مجھے زہر کا ایک پیالہ تو پی لینے دیں، دوسرے کی باری تو بعد میں آئے گی نا اور پھر تک سے پینے میں پھیا کا فرزندہ بھی رہے گا یا نہیں۔" دل آور نے خفگی اور افسردگی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا اور بتول شاہ اس کا مفہوم سمجھتی رہ گئی تھیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ فیصلہ تو تم پہلے سے ہی کر چکے ہو، اب زہر پینے کی بات کہاں سے آ گئی ہے؟" وہ اس کو دیکھتے ہوئے الجھ پڑی تھیں کہ وہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

"ایک انسان زہر پینے کا فیصلہ کر چکا ہو تو اس کا کیا مطلب ہے کہ اسے زہر پیتے ہوئے تکلیف بھی نہیں ہوگی؟" دل آور خاصے تلخ سے انداز میں سوال کیا تھا۔

"تکلیف تو انسان کو اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کسی بھی قسم کا زہر پینے کا فیصلہ کرتا ہے اور جب فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر [illegible] "تکلیف کیسی؟ مجھے دیکھو، کتنے فیصلے کیے ہیں زندگی میں؟ مگر جب کر لیے تو کر لیے؟ پھر نہ درد..... نہ تکلیف..... اور نہ ہی [illegible] زندگی میں ایسا کرو گے تو کبھی کسی بات پہ اور کسی کام میں مایوسی نہیں ہوگی اور ہمیشہ ثابت قدم رہو گے اور میں تم سے ایسی [illegible] رکھتی ہوں۔" بتول شاہ اسے اپنے جیسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ "آپ نہیں سمجھیں گی اماں کہ دل کے معاملے اور دل کے لیے پیچیدہ ہوتے ہیں؟ یہاں درد بھی ہوتا ہے، تکلیف بھی ہوتی ہے اور پچھتاوا بھی ہوتا ہے۔" دل آور کا لہجہ جیسے تھی سے رس رہا تھا، چاہتی اس کے اک اک لفظ سے محسوس ہو رہی تھی۔ "صرف دل کے معاملے اور دل کے فیصلے ہی پیچیدہ نہیں ہوتے ہیں، کبھی [illegible] کرنا ہی پڑتے ہیں، تم کو بھی کرنا ہی پڑیں گے۔ بس سب کچھ اللہ کی ذات پہ چھوڑ دو، سب کچھ ہی بہتر ہو جائے گا۔"

بتول شاہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکے سے اس کا کندھا دبایا تھا، جیسے اس کا حوصلہ اور اس کی ہمت [illegible] کی کوشش کی ہو۔ "چھوڑ دیا ہے، سب کچھ چھوڑ دیا ہے، زری کو چھوڑ دیا تو سمجھ لیں کہ سب کچھ چھوڑ دیا، آج میں نبیل کی [illegible] زری کو چھوڑنے ہی تو چار ہا ہوں اور نبیل کی یہ دعوت میں زندگی بھر بھول نہیں سکوں گا، دل پہ لکھی رہے گی۔" دل آور کا لب [illegible] دل آور کا نہیں لگ رہا تھا اور بتول شاہ اس کی کیفیت دیکھ کر چپ ہو گئی تھیں، اتنے میں اس نے نبیل کے گھر کے سامنے گاڑی [illegible] لگا دیئے تھے۔

♥

چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھتے ہی گیٹ پورے کا پورا وا کر دیا تھا۔ اور دل آور اپنے اندر کے غبار کو اندر ہی دبائے [illegible] ایک گہری سانس کھینچتا ہوا گاڑی اک جھٹکے سے اندر لے آیا تھا اور گاڑی باہر روش پہ پارک کرنے کے بعد گاڑی سے نیچے [illegible] اور اس کے پیچھے بتول شاہ بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں ان دونوں کا رخ اندر کی طرف تھا لیکن نبیل انہیں ریسیو کرنے کے لیے [illegible] چکا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" نبیل بے ساختہ ان کے سامنے ذرا جھک گیا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی ہوں۔" بتول شاہ نے بہت فریش موڈ میں جواب دیا تھا۔

"اچھا..... وہ کیوں بھلا؟" نبیل نے بھی کافی فریش موڈ میں استفسار کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی بہت خوش تھا۔

"وہ اس لیے کہ تم بہت خوش ہو اور کیا ایک ماں کے لیے یہ خوشی کافی نہیں ہے کہ اس کا بیٹا بہت خوش ہے۔" بتول [illegible] نبیل کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پھر اس کے گال کو پیار سے چھو چکا تھا۔

"صرف ایک بیٹا خوش ہے نا؟ دوسرے کو کیا ہوا ہے؟ چہرے سے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کسی دعوت میں نہیں، بلکہ کسی [illegible] آیا ہے۔" نبیل نے دل آور کے چہرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا اور بتول شاہ کا کلیجہ دہل گیا تھا۔

"ایسے نہیں بیٹا! ایسا نہیں بولتے ہمیشہ اچھا بولنا چاہیے۔" انہوں نے نبیل کو سرزنش کی تھی۔

"اوکے..... ایم سوری لیکن یہ تو بتا دیں کہ اسے آخر ہوا کیا ہے؟ صبح جب فون کیا تو تب بھی اس کا موڈ کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا پھر دوپہر کو جب شوروم میں دیکھا تھا تب قدرے بہتر تھا یعنی کام کے وقت موڈ آن اور آگے پیچھے آف۔" نبیل کو دل آور کے موڈ سے الجھن ہو رہی تھی۔

"...تمہیں میرے موڈ کے آن اور آف ہونے سے کیا پرابلم ہے آخر؟ تمہارا موڈ آن ہے نا؟ بس یہی کافی ہے۔ آج کے دن تمہیں بس تمہارا ہی ہونا چاہیے ہماری خیر ہے تم اپنی فکر کرو۔"

دل آور کو اپنی ذات پہ وہ خول چڑھانا ہی پڑا تھا جو کبھی کسی کو نظر نہیں آیا تھا اور جس کو چڑھا کر وہ اپنے دل کو بھی روند جاتا تھا اور دیکھنے والوں کو خبر ہی نہیں ہوتی تھی یہاں تک کہ عبداللہ اور نبیل کو بھی نہیں۔

"یہ تو تم مجھے ٹالنے کے لیے کہہ رہے ہو نا؟ ورنہ تمہیں پتا ہے کہ ہمیں اپنی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی ایک دوسرے کی فکر ہوتی ہے تمہارا موڈ آن یا آف ہونے سے مجھے پرابلم نہیں ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ یا پھر اس بات سے بھی انکار ہے تمہیں؟" نبیل تو آج بغور اس کا معائنہ کرنے پہ تلا ہوا تھا اور دل آور اس کی خاطر اپنے دل پہ پاؤں رکھ کے مسکرا دیا تھا۔

"اوکے..... اوکے..... مان لیا کہ تمہیں پرابلم ہے لیکن تم بھی تو یہ مان لو کہ تمہارا موڈ آج واقعی آن ہے۔" دل آور نے بات کو شرارت اور خوشگواریت کا رخ دے دیا تھا۔

"اوکے..... اوکے..... میں نے بھی مان لیا کہ میرا موڈ آج واقعی آن ہے پھر؟" نبیل نے بھی شرارت سے پوچھا تھا۔

"پھر تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا، تم یہ بتاؤ کہ تیسرا کہاں ہے؟ اس کی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔" دل آور کا اشارہ عبداللہ کی طرف تھا جس کو نبیل نے فوراً ہی سمجھ لیا تھا۔

"...کسی کام سے گیا ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا، ڈونٹ وری..... اپنی فیملی یہیں چھوڑ گیا ہے، بس تمہاری کمی تھی۔" نبیل آج حقیقتاً چہک رہا تھا اور یہ بات کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی یہاں تک کہ مدیحہ، مونسہ بی بی اور فائزہ بیگم نے بھی محسوس کی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے بھی کیے تھے جس پہ نبیل بس مسکرا کے رہ گیا تھا۔

"چلو..... یہ کمی بھی پوری ہو گئی ہے اب اور کیا کرنا ہے۔" دل آور اس سے آگے کا پروگرام پوچھ رہا تھا۔

"اب اور کچھ نہیں کرنا، بس اندر چلنا ہے۔ ہم نے خوامخواہ اپنے ساتھ ساتھ آنٹی کو بھی کھڑا کر رکھا ہے۔" نبیل نے کہتے ہوئے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا اور ساتھ ہی قدم بھی آگے بڑھا دیے تھے۔

"اگر میرے کھڑے ہونے سے تم لوگوں کے موڈ ٹھیک ہو جائیں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔" بتول شاہ ان دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر قدرے ریلیکس ہو گئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی اندر آ گئی تھیں۔

مگر ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی ان تینوں کے قدم رک گئے تھے کیونکہ ان کے قدم زری کی آواز نے جکڑ لیے تھے۔

اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
اک شخص کو دیکھا تھا
تاروں کی طرح ہم نے
اک شخص کو چاہا تھا
اپنوں کی طرح ہم نے
اک شخص کو سمجھا تھا
پھولوں کی طرح ہم نے
وہ شخص قیامت تھا
کیا اس کی کریں باتیں
دنیا اس کے لیے پیدا

اور اس کی ہی تھیں راتیں
کب ملنا کسی سے تھا
ہم سے ہی تھیں ملاقاتیں
رنگ اس کا شہابی تھا
زلفوں میں تھیں مہکاریں
آنکھیں تھیں کہ جادو تھا
پلکیں تھیں کہ تلواریں
دشمن بھی اگر دیکھیں
سو جان سے دل ہاریں

یونہی اپنی دھن میں نظم سناتے سناتے زری کی نظریں ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت اٹھی تھیں اور پھر وہیں ٹھہر گئی تھیں دل آور کو لگا کہ وہ اب خاموش ہو جائے گی لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا تھا وہ نجانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے نظم کا سلسلہ پھر بھی جاری ہی رکھا تھا اور غیر محسوس طریقے سے نظم کے مصرعوں کا نشانہ بھی اسے ہی بنا رکھا تھا۔

کچھ تم سے وہ ملتا تھا
باتوں میں شباہت میں
ہاں تم سا ہی لگتا تھا
شوخی میں شرارت میں
لگتا بھی تم ہی سا تھا
دستورِ محبت میں

پھر بولتے بولتے نجانے کیوں اس کی آواز میں لرزش آ گئی تھی اور آنکھوں کی زمین نم لگنے لگی تھی اور دل آور کے دل کا حال تھا مگر وہ چپ نہیں ہوئی تھی۔

نجانے کیوں آج اس نے نظم مکمل کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

وہ شخص ہمیں اک دن
اپنوں کی طرح بھولا
تاروں کی طرح ڈوبا
پھولوں کی طرح ٹوٹا
پھر ہاتھ نہ آیا وہ
ہم نے تو بہت ڈھونڈا
تم کس لیے چونکے ہو
کب ذکر تمہارا ہے
کب تم سے تقاضا ہے
کب تم سے شکایت ہے
اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

زری کی یہ نظم دل آور کے لیے ایک تازہ حکایت نہیں تھی بلکہ ''اک تازہ شکایت'' تھی اور کسی کی تازہ شکایت سن کر سنتے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بے چین ظاہر نہ ہونے دینا بھی صرف دل آور شاہ کا ہی کمال تھا۔

"واؤ زری آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ ویری ویری نائس۔" مدیحہ نے کافی بھرپور انداز میں سراہا تھا اور زری چہچہا گئی تھی۔

"ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... بہت ہی عمدہ ذوق ہے میری بیٹی کا۔ بہت اچھا لگا سن کر..... ویلڈن۔"

نیلی اور دل آور کے ساتھ اندر داخل ہوتی بتول شاہ نے بھی کافی کھلے دل سے تعریف کی تھی اور زری اپنے لہجے کی لرزش اور آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تھینک یو آنٹی۔" اس نے ان کے گلے ملتے ہوئے ان کی تعریف پہ شکریہ ادا کیا تھا۔

"نگارش سے سنا تو تھا کہ تمہیں شاعری سے لگاؤ ہے مگر اس لگاؤ کے ساتھ ساتھ اتنی گہری اور اتنا اثر بھی ہے یہ مجھے اندازہ نہیں تھا مگر آج ہو گیا ہے۔" بتول شاہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں اور ان کی بات پہ تقریباً سبھی مسکرا دیئے تھے خصوصاً نیلی تو کچھ زیادہ ہی مسکرا رہا تھا۔

"اس کا ذوق تو شروع سے ہی عمدہ رہا ہے ہمیشہ ہر معاملے میں۔" فائزہ بیگم نے بھی بتول شاہ سے ملتے ہوئے زری کی ہی تعریف کی تھی، پھر وہ نگارش، مدیحہ اور مومنہ بی بی سے ملی تھیں اور مومنہ بی بی سے مل کر اسے پہچاننے کی کوشش کی تھی انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟

"یہ مومنہ بی بی ہیں۔ ہمارے اسلام آباد والے گھر میں آئی تھیں آپ کو یاد ہو گا۔"

دل آور ان کی نظروں کی اُلجھن بھانپ گیا تھا اسی لیے ان کی مشکل آسان کر دی تھی کہ کہیں وہ اس اُلجھن میں نہ اُلجھتی رہیں اور اس کے یاد دلانے پہ انہیں بھی فوراً ہی سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

"اوہ..... اچھا..... اچھا یہ مومنہ بی بی ہے اتنے عرصے بعد دیکھا ہے میں اسی لیے پہچان نہیں سکی شاید....."

انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا اور پھر فائزہ بیگم کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی تھیں۔

"السلام علیکم! میں لیٹ تو نہیں ہو گیا؟" عبداللہ نے کافی عجلت میں اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا کیونکہ وہ باہر ڈرائیور سے پہلے آدھی گاڑی دیکھ آیا تھا اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ دل آور ابھی ابھی آیا ہے یا پھر کافی دیر سے آیا ہوا ہے؟ تبھی اسے اپنے لیٹ ہو جانے کی فکر ہوئی تھی۔

"نہ لیٹ ہوئے ہو یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں پتا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ تمہارے آ جانے سے بھابی کے چہرے پہ بہار آ گئی ہے۔ رنگ آ گئے ہیں۔ رونق آ گئی ہے۔ یقین نہیں آتا تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔"

دل آور نے اپنے موڈ میں پھینچ لانے کے لیے تو یوں کا رُخ عبداللہ اور نگارش کی سمت موڑ دیا تھا، شاید اس لیے کہ وہ زری کی نظم کا اثر زائل کرنا چاہتا تھا البتہ یہ اور بات تھی کہ سبھی نے اس کی بات پہ خوب انجوائے کیا تھا اور سب کا دھیان بھی عبداللہ اور نگارش کی طرف ہی ہو گیا تھا اور نگارش جھینپ گئی تھی۔

"چلو..... کوئی تو ہے جس کے چہرے پہ ہمارے آ جانے سے بہار آ جاتی ہے، رنگ آ جاتے ہیں، رونق آ جاتی ہے، تم لوگوں کی طرح میرا چہرا تو نہیں ہوں نا کہ جن کے آنے اور جانے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عبداللہ بڑے اطمینان سے ان کو جتانے والے انداز میں کہتا بتول شاہ سے مل کر نگارش کے برابر جا بیٹھا تھا اور اس کے اس طرح بیٹھنے پہ مدیحہ، زری، بتول شاہ اور فائزہ بیگم بھی ہنس پڑی تھیں کیونکہ اس کا اندازہ ہی کچھ ایسا تھا کہ سب کو ہنسی آئی تھی جبکہ نگارش شرم سے سٹ کے رہ گئی تھی۔

"نہ ہے گا فرق..... ضرور پڑے گا۔ ہمارے آنے اور جانے سے بھی فرق پڑے گا۔ تم چار دن صبر تو کرو کہ آگے ہوتا کیا ہے؟" دل آور کے جواب پہ نیلی بے ساختہ مسکرایا تھا اور زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا جس پہ لاپروائی اور شرارت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"یعنی کہ ارادہ ہے..... فرق لانے کا۔" عبداللہ نے بھی جواباً ذومعنی لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیا ابھی بھی چاہتے ہو کہ ارادہ نہ بنے؟" دل آور بھی لطف اندوز ہونے والے موڈ میں تھا۔

"اے..... نہیں..... نہیں میں کیوں نہیں چاہوں گا بھلا؟ بناؤ، بناؤ ضرور بناؤ اس میں میرا ہی فائدہ ہے آخر بھابیاں بھی ملیں گی گھر بھتیجے، بھتیجیاں بھی، واہ کیا کمال کا سین ہو گا وہ بھی ہر طرف رونق ہی رونق ہو گی۔" عبداللہ نے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیتے

ہوئے بڑے شاہانہ انداز میں انہیں اجازت دی تھی اور اس کی اس اجازت پہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

''ہوں..... واقعی عبداللہ بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کو یہ ارادہ ضرور بنانا چاہیے۔ مجھے بھی بھابیوں کی کمی محسوس ہوتی ہے ابھی تو صرف ایک بھابی ہے دو اور آ جائیں گی تو رونق ہو جائے گی اور پھر اتنی بوریت بھی نہیں ہوگی۔ نہ ہمیں اور نہ آپ کو مما..... کیا خیال ہے آپ کا؟''

مدیحہ نے کہتے کہتے بتول شاہ سے بھی مشورہ مانگ لیا تھا اور وہ بھلا اس نیک کام میں کون سا پیچھے تھیں انہوں نے بھی فوراً ہی ہاں ملائی تھی۔

''ارے ہاں بھئی..... میرا خیال تم لوگوں سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ میں بھی خیر سے یہی چاہتی ہوں کہ یہ ہماری جلد اپنی اپنی بیویاں لے آئیں آخر کچھ ہمیں بھی تو مصروفیت ملے۔'' بتول شاہ بھی اس کام میں راضی تھیں اور نبیل اور دل آور ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے رہ گئے تھے۔

''بیگم صاحبہ! کھانا تیار ہے نبیل پر لگا دیا ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ کہتے مومنہ بی بی ان سب کو بلانے آ گئی تھی۔

''چلو جی..... اب بقیہ کانفرنس کھانے کی میز پہ.....'' عبداللہ کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے کسی کا بھی انتظار کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کانفرنس یا کبڈی.....'' دل آور اور نبیل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور عبداللہ کو جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔

''کبڈی.....'' عبداللہ کو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے۔

''ارے بھئی..... کھانے کی میز پہ کانفرنس نہیں ہوتی بلکہ کبڈی ہوتی ہے اور ہر طرف کبڈی کبڈی کی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس لیے تمہیں اٹھتے دیکھ کر ہی احساس ہو رہا ہے کہ تم بھی کھانے کے ساتھ کبڈی کبڈی ہی کرنے جا رہے ہو۔ عزائم خطرناک لگ رہے ہیں۔'' دل آور کے نشانے پہ آج شاید صرف عبداللہ ہی تھا لیکن عبداللہ کو بھلا کیا پروا تھی وہ چاہے کچھ بھی کہتا رہتا۔

''جناب دل آور شاہ صاحب! بیک گراؤنڈ کے لحاظ سے دیکھو گے تو پنجاب کا ہی اور ذات کا جٹ ہوتا ہوں۔ کھانے کے ساتھ کبڈی تو کروں گا ہی۔ اب میں نبیل حیات تو ہوں نہیں کہ کھانا بھی کھاؤں تو بڑے طور طریقے اور سلیقے کے ساتھ۔'' عبداللہ اپنے ساتھ ساتھ نبیل کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔

''اف..... جہاں یہ تینوں موجود ہوتے ہیں وہاں کسی چوتھے کی کیا گنجائش۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کوئی اور بھی ہے یہاں نہیں؟'' فائزہ بیگم خفگی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بتول شاہ کے ساتھ اٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں اور وہ سب اٹھ کر ہنستے ہوئے ان کے پیچھے ہی آ گئے تھے۔

لیکن جب کرسی پہ بیٹھنے کی باری آئی تھی تو دل آور کے قدم ٹھٹک گئے تھے کیونکہ وہ اش میس پہ ہاتھ دھونے کے بعد سب سے آخری نبیل کی طرف آیا تھا اور تب تک سب اپنی اپنی کرسیوں پہ بیٹھ چکے تھے لیکن عبداللہ اور نبیل کے ساتھ والی کرسی خالی تھی اور کرسی کے عین سامنے والی کرسی زری کی تھی۔

گویا وہ بیٹھتا تو وہ دونوں آمنے سامنے آ جاتے کیونکہ عبداللہ کے مقابل والی کرسی پہ نگارش تھی اور نبیل کے مقابل والی کرسی پہ مدیحہ بیٹھی ہوئی تھی اس طرح دل آور کے مقابل والی کرسی پہ زری نظر آ رہی تھی اور مشکل یہ تھی کہ وہ جگہ چینج بھی نہیں کر سکتا تھا اور کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

''ارے..... کیا بات ہے؟ اس طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟'' نبیل نے گردن موڑ کر دل آور کی سمت دیکھا تھا۔

''بس..... دیکھ رہا ہوں کہ آج تم دونوں نے مجھے سائیڈ پہ کیوں کر دیا ہے؟ حالانکہ تم لوگوں کو پتا ہے کہ مجھے تم دونوں کے درمیان والی جگہ پسند ہوتی ہے۔'' دل آور کا ذہن اپنے مطلب کا نقطہ نکال ہی لایا تھا لیکن زری اس کے اس نقطے پہ چونک گئی تھی یعنی وہ اس کے سامنے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

''لو جی..... اس میں بھلا کیا مسئلہ ہے؟ یہ لو..... ہو گئی تمہاری پسند کی جگہ خالی۔'' نبیل لاپروائی سے کہتے ہوئے اپنی کرسی

الماری کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور دل آور نے مدیحہ کے سامنے والی کرسی سنبھال لی تھی۔

"تھینک یو"..... اس نے آہستگی سے نبیل کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"تھینکس تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے۔" نبیل نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا جسے صرف دل آور ہی سن چکا تھا اور اس "حالانکہ تھینکس تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے۔" نبیل نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا جسے صرف دل آور ہی سن چکا تھا اور اس کی بات کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ زری کی طرف ہے۔

جبکہ دوسری طرف زری کا تن من دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ اسے دل آور شاہ کا اتنا کریز اور اس طرح کا بے مہر رویہ اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دل آور کا یہ انداز اسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے کھوکھلی ہو جائے گی۔ اس کے دل کے گوشے وقفے وقفے سے بھیگنے لگے تھے رم جھم باہر نہیں، لیکن اندر چھڑ گئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے کھانے کا لقمہ حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ورنہ اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا حلق بھی بند ہو گیا ہو۔

اور ادھر نبیل سمجھ رہا تھا کہ وہ شرم کی وجہ سے سر جھکائے بیٹھی ہے اور اس سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا۔ لیکن اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی انجان تھا۔

♥

اپنے گھر کے دروازے کے باہر گلی میں بائیک رُکنے کی آواز پہ مغرب کی نماز کے بعد دُعا مانگتی مریم نجانے کیوں بُری طرح چونک گئی تھی اور اس کا دل بھی کسی انجانے خیال سے بے قابو ہو کر دھڑک اُٹھا تھا اور وہ جلدی جلدی چہرے پہ ہاتھ پھیر کر جائے نماز سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن ابھی وہ جائے نماز تہ کر ہی رہی تھی کہ اتنے میں دروازے پہ زور سے دستک ہوئی تھی اور مریم کا دل اُچھل حلق میں آ گیا تھا اور ہاتھ پیر کانپنے لگی تھیں۔

اس کا خیال اور وہم، وسوسے جو دت آندی کی سمت ہی گھوم رہے تھے۔ اسے ہر آہٹ پہ اس کا ہی خدشہ ستا رہا تھا اور دل کو طرح طرح کے خوف جکڑے جا رہے تھے کیونکہ دل آور شاہ کے ایکشن کے بعد وہ کوئی بھی، کسی بھی قسم کا ری ایکشن دے سکتا تھا اور مریم کو اس کی کمینگی پہ پورا یقین تھا کہ وہ بدلے کے طور پہ کچھ اُلٹا سیدھا ضرور کرے گا مگر اتنی جلدی؟ یہ اسے اُمید نہیں تھی۔

"کون ہے؟" دروازے پہ دوبارہ دستک ہوئی تو عابدہ خاتون کچن سے نکل آئی تھیں۔

"امی! دروازہ کھولیں۔ میں ہوں عدیل۔" باہر سے عدیل کی آواز سنائی دی تھی اور مریم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا مٹھی میں پکڑا ہوا دل ایک دم سے آزاد چھوڑ دیا ہو اور اسے ایک گہری اور سکھ کی سانس ملی ہو اور وہ اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شناخت سی ہو گئی تھی۔

"عدیل....." اٹھنے میں عابدہ خاتون نے حیران ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا کیونکہ عدیل نے کبھی بھی اس طرح زور دار دستک نہیں دی تھی۔

"جی..... میں ہی ہوں..... آپ کو یقین کیوں نہیں آ رہا؟" عدیل کے دونوں ہاتھ چیزوں سے بھرے پھندے تھے اور وہ ہنستا ہوا ان کی حیرانی کو انجوائے کرتا ہوا اندر آ گیا تھا۔

"تم نے پہلے کبھی اس طرح دستک جو نہیں دی۔" انہوں نے اپنی حیرانی کی وجہ بتائی تھی۔

"اوہ..... تو آپ اس لیے حیران ہو رہی ہیں؟ وہ دراصل میرے دونوں ہاتھ میں شاپرز تھے بڑی مشکل سے دستک دے پایا ہوں اس لیے میری دستک روٹین سے ہٹ گئی تھی۔"

عدیل نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپرز صحن میں رکھی چارپائی پہ ڈال دیے تھے۔

"اوے واؤ..... اتنی ساری چیزیں۔" ایمان کمرے سے نکلتے ہی چہک اٹھی تھی۔

"ہوں..... اور یہ سب تم لوگوں کے لیے ہیں۔" عدیل نے اس کا گال تھپکا تھا۔

"تھینک یو بھائی..... آپ کتنا خیال رکھتے ہیں سب کا۔" ایمان اس کی مشکور ہوئی تھی۔

"پاگل..... یہ سب تم لوگوں کی دُعائیں ہیں اور کچھ نہیں اور ویسے بھی تم سب کا خیال میں نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔" عدیل نے ایمان کے سر کو ہلاتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا تھا جو برآمدے میں ہنوز ایک ہی پوزیشن میں کھڑی تھی۔

"ارے..... تم اس طرح چپ کیوں کھڑی ہو؟ کیا ہو گیا ہے بھئی؟ ادھر آؤ میرے پاس۔"

عدیل کو مریم کے اس طرح چپ کھڑے رہنے پہ حیرت ہوئی تھی اور اسی حیرت کے مارے اسے اپنے قریب
اپنے وہم اور خدشوں سے چونک کر اپنے دل میں چھپے خوف کو ذرا دیر کے لیے پرے جھٹکتی ہوئی جائے نماز برآمدے
کے عدیل کی سمت آ گئی تھی۔

"جی....." وہ آ کر عدیل کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

"لگتا ہے تم میری دستک پہ اور اتنی ساری چیزوں پہ حیران نہیں ہوئیں۔ اس لیے اب میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی
دوں تو بہتر ہے۔" عدیل کو سب سے زیادہ مریم کے تاثرات اور اس کی خوشی دیکھنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔

"آپ حیران کرنا چاہتے ہیں..... وہ کیسے؟" مریم نے اس کی بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی۔

"وہ کیسے..... ابھی بتاتا ہوں۔" وہ مریم کے کندھے کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اسے دروازے کے عین سامنے
خاتون اور ایمان بھی نا سمجھی سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے؟ کام سے آتے ہی عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا ہے
پہلے تو ایسا کبھی نہیں کیا اس نے۔

وہ اس کو کھڑا کر کے خود باہر نکل گیا تھا اور دو منٹ بعد وہ بڑی احتیاط سے دروازے کے باہر بنے سیڑھی نما چوڑے
پر سے بائیک کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا تھا اور وہ سب حیران کی حیران رہ گئی تھیں۔

"ارے..... بائیک..... یہ کس کی ہے؟" اب کی بار مریم کو بھی شدید حیرت ہوئی تھی۔

"میری....." عدیل نے بائیک لا کر صحن کے بیچوں بیچ کھڑی کر دی تھی۔

"سچ بھائی.....؟" ایمان یکدم چہکتے ہوئے اُچھل پڑی تھی اور مریم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا وہ عدیل کو حیران اور
نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں سچ..... یہ میرے باس نے مجھے دی ہے اور یہ بائیک اب ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گی، میری جاب بھی
ہے آج..... اور یہ بائیک بھی اسی جاب کا حصہ ہے۔"

عدیل آج حقیقتاً بہت خوش لگ رہا تھا اور اس نے ان سب کو بھی خوش کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"کیا واقعی آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" مریم کو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ارے میری جان! مجھے تم لوگوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بھلا..... مجھے دل آور شاہ کے شوروم میں نیکری
مل گئی ہے اور انہوں نے جاب کے ساتھ ساتھ جو ضروری سہولیات تھیں وہ بھی مہیا کی ہیں یہ دیکھو۔" عدیل نے جیب سے
موبائل نکال کر ان کے سامنے کر دیا تھا اور مریم دل آور شاہ کے نام پہ ٹھہر ہی گئی تھی اس کا خیال پھر سے دن والے واقعے کی طرف
گیا تھا اور اسے اندر سے بے چینی ہوئی تھی کہ کہیں دل آور شاہ نے عدیل کو کچھ بتا نہ دیا ہو؟ لیکن پھر دوسرے ہی سیکنڈ اسے
کر اپنے آپ کو ڈھارس دینی پڑی تھی کہ اگر عدیل کو کچھ پتا ہوتا تو وہ اس وقت اتنا خوش نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کے
تسلی کافی تھی فی الحال سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے بھی عدیل کی خوشی اور کامیابی پہ خوش ہونا چاہ رہا تھا اور اس نے عدیل کے ہاتھ
موبائل تھام لیا تھا جسے وہ بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگی تھی اور عابدہ خاتون دل آور شاہ کو دعائیں دیتی ہوئی فاروق نیازی کو بتانے
دی تھیں۔

♥

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔" ڈنر کے ایک گھنٹے بعد عبداللہ نے وال کلاک سے ٹائم دیکھتے ہوئے نبیل سے
اجازت چاہی تھی۔

"اتنی جلدی.....؟" نبیل نے بھی بے ساختہ کلاک کی سمت ہی دیکھا تھا۔

"یار! ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں۔ یہاں سے نکلنے اور گھر پہنچنے تک ساڑھے بارہ، پونے ایک بجے کا ٹائم ہو جائے گا
ویسے بھی تمہیں پتا ہے کہ گھر صرف ملازموں کے رحم و کرم پہ ہے، حالات اتنے خراب ہیں کہ کسی پر بھی بھروسہ کرنا فضول ہے اور
تم لوگ ابھی بیٹھو..... انجوائے کرو..... بس ہم چلتے ہیں۔" عبداللہ کہتے ہوئے صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ارے بیٹا! تھوڑی دیر اور بیٹھیے نا؟ پھر دوبارہ کب فرصت ملتی ہے بھلا۔ ابھی تو ہم نے مکمل کے باتیں ہی نہیں کیں۔"

نے عبداللہ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

"واقعی آنٹی! یہ تو آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ ہم نے ابھی تک ٹھیک طرح سے فرصت سے بیٹھ کر باتیں ہی نہیں کیں لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ زندگی رہی تو ضرور بیٹھیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ ابھی رات بھی کافی ہو رہی ہے، گھر جانے میں بھی ٹائم لگے گا میرے ساتھ یہ دونوں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ ہی جاتا، مگر اب ان کو بھی تو لے کر جانا ہے، ویسے بھی مجھے لگ رہا ہے کہ زری کو نیند آ رہی ہے، کھانا کھانے کے بعد سست ہو گئی ہے۔"

عبداللہ نے زری کے بجھے بجھے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا جس پہ باقی سب نے بھی بے ساختہ زری کی سمت دیکھا تھا مگر دل آور نے اپنی نظروں کو اس بے ساختگی سے بھی روک لیا تھا۔ اس نے باقی سب کی طرح زری کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔ بس سر درد کر رہا ہے۔ اس لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔" زری نے اپنی سستی کی وجہ بتائی تھی اور اس بتانے میں بھی اس کا لہجہ کافی سست سا تھا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ اور آرام کرو۔ ان شاء اللہ پھر بات ہو گی۔ تم سے تو باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں۔" بتول شاہ نے پھر دوبارہ انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اور وہ تینوں ان سب سے ملنے کے بعد باہر آ گئے تھے۔ نبیل اور فائزہ بیگم انہیں گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آئے تھے اور پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد فائزہ بیگم، بتول شاہ، مدیحہ اور مومنہ بی بی چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں جبکہ نبیل دل آور کو ساتھ لیے باہر لان میں نکل آیا تھا۔

"آج موسم واقعی بہت اچھا ہو رہا ہے۔" نبیل نے آسمان پہ ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے بڑے موڈی ٹرننگ میں کہا تھا۔

"ہوں..... شاید....." دل آور کا لہجہ دھیما تھا۔

"شاید نہیں یار! سچ مچ موسم بہت خوبصورت ہو رہا ہے، اتنا خوبصورت کہ کسی حسینہ کے سامنے اپنے دل کے سارے جذبات کھول کے رکھ دینے کو چاہ رہا ہے۔ مگر افسوس کسی حسینہ گھر چلی گئی ہے۔" نبیل آج اپنے سارے راز کہہ دینے اور سارے اظہار کر دینے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب..... گھر چلی گئی ہے؟" دل آور نے انجان بننے کے لیے تھوڑی سی کوشش کی تھی۔

"دل آورے....." نبیل نے بڑے دل سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں....." وہ بمشکل بول پایا تھا۔

"تمہارے خیال میں زری کیسی لڑکی ہے۔" نبیل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سوال کیا کرے۔

"کیا مطلب..... کیسی لڑکی ہے؟ یہ کیسا سوال ہے آخر؟" دل آور نے خفگی سے پوچھا تھا۔

"یار! میرا مطلب ہے کہ میرے لیے کیسی رہے گی؟ میرے ساتھ..... میری لائف پارٹنر بن کر؟"

نبیل کے حواس عجیب بہکے بہکے سے محسوس ہو رہے تھے اور دل آور کو اپنے جیتے جاگتے دل کو کسی سرد خانے میں رکھنا پڑا تھا تاکہ وہ کسی بھی احساس اور جذبات سے عاری ہو جائے اور اسے کچھ بھی محسوس نہ ہو۔

"ہوں..... اچھی ہے اور تمہاری لائف پارٹنر بن کر تو اور بھی اچھی رہے گی۔"

نبیل اس کا دوست تھا، اس کا یار تھا اور یار کے لیے کچھ تو کہنا ہی تھا چاہے اس کہنے کہنے میں ہی خود پہ قیامت گزر گئی۔

"دل آورے! میں..... میں..... اس سے بہت محبت کرتا ہوں یار! بہت زیادہ..... اب تو مجھے لگتا ہے کہ میری محبت پہ خاموش عشق حاوی ہو گیا ہے۔ اسے بس ایک نظر دیکھ لوں اور مہینوں خوش رہتا ہوں لیکن نجانے کیا وجہ ہے کہ کبھی کسی کو بتانے کا اور اس کے سامنے اظہار کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا مجھے؟ بس اتنے سالوں سے اتنی خاموشی سے اور اتنے دل سے اسے اور صرف اسے چاہے جا رہا ہوں۔"

نبیل بہت ٹھنڈا اور پُرسکون بندہ تھا۔ لیکن آج اس کا اظہار اس کا انداز اور اس کے الفاظ بتا رہے تھے کہ اس کے اندر کتنی

شدت اور کتنی اٹل ہے۔ دل آور گردن موڑ کر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''لیکن دل آورے! اب اسے چاہنے کے ساتھ ساتھ دل چاہتا ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی زندگی میں لے آؤں۔ بے رنگ زندگی کو اس موسم کی طرح خوبصورت بنا دوں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک تم میرا ساتھ نہیں دو گے تب تک زندگی، زندگی نہیں بنے گی۔ اس کا ہاتھ عبداللہ سے صرف تم مانگ سکتے ہو ورنہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں خود ایسا کر سکوں پھر اپنے گھر والوں سے کچھ کہوں۔ یہ بات صرف تم کر سکتے ہو کیونکہ عبداللہ وغیرہ فیملی سے باہر شادی نہیں کرتے اور اس لیے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

نبیل نے بالآخر اپنا مدعا بیان کر ہی دیا تھا اور دل آور اس کا یہ مدعا تو بیان کرنے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو کسی سرد خانے میں ڈال دیا تھا تاکہ نبیل کے دل پہ کچھ نہ گزرے۔

''نہیں..... ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبداللہ تمہارے لیے کبھی انکار نہیں کرے گا مجھے یقین ہے۔'' دل آور نے نبیل کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دبایا تھا۔

''عبداللہ انکار نہ کرے مگر زری..... وہ..... وہ تو انکار کر سکتی ہے نا؟'' اب اس کے دل میں کیا ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' نبیل کو اب زری کے دل کی بھی فکر ہو رہی تھی۔

''ہاں..... دلوں کے حال تو صرف اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے لیکن پھر بھی اللہ سے بہتری کی ہی اُمید رکھنی چاہیے۔ ایسا ہو جو بھی ہو گا بہتر ہی ہو گا۔'' دل آور نے اسے مایوس کرنے کے بجائے تسلی دی تھی اور دل آور کے اس حوصلے اور تسلیوں کی خوگر اس نے یہ کام اسے سونپا تھا۔

''تو پھر تم عبداللہ سے مانگو گے نا زری کا ہاتھ.....'' نبیل یہ بھی تسلی کرنا چاہتا تھا۔

''ہوں..... مانگوں گا..... ضرور مانگوں گا۔ تمہاری خاطر تو بھیک بھی مانگ سکتا ہوں۔ یہ تو پھر بھی زری کا ہاتھ ہے۔'' اس نے بڑے حوصلے اور بڑے ضبط سے کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تھینک یو دل آورے! تھینک یو ویری مچ..... مجھے پتا تھا کہ جب تمہیں پتا چلے گا تو تم میرا ساتھ ضرور دو گے۔'' نبیل ہوئے دل آور کے گلے لگ گیا تھا اور خوشی کے مارے اس کی پشت تھپکی تھی۔

''تمہارا ساتھ نہیں دوں گا تو اور کس کا دوں گا؟ دن میں بتایا تو تھا کہ تم نبیل حیات نہ ہوتے تو ضرور میری محبوبہ ہوتے۔'' دل آور نے اپنے لہجے اور انداز کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''بہت شکریہ جناب! بہت بہت شکریہ..... یہ بھی اعزاز کی بات ہے میرے لیے۔'' نبیل مسکراتے ہوئے اس سے الگ ہوا تھا۔

''ارے واہ..... یہاں تو کچھ اور ہی سین چل رہا ہے؟ خیر تو ہے نا؟''

مدیحہ نے باہر نکلتے ہوئے ان کا گلے ملنے کا منظر دیکھ لیا تھا اور اسے واقعی دلچسپ حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں جی..... خیر ہی ہے بس تمہاری فرمائش پہ تمہاری بھابی لانے کا سوچ رہے ہیں۔'' نبیل نے مدیحہ کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''صرف ایک بھابی..... میں نے تو دو کے لیے کہا تھا۔'' مدیحہ خفا ہو گئی تھی۔

''وہ بھی ہو جائیں گی ابھی تم شروعات تو ہونے دو۔'' نبیل مسکرا رہا تھا۔

''اوکے..... کریں شروعات اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں اور مجھے کیا چاہیے..... دو بھابیاں.....'' مدیحہ نے کندھے اچکائے اور اتنے میں فائزہ بیگم اور بتول شاہ بھی باہر آ گئی تھیں اب بتول شاہ کا ارادہ بھی گھر چلنے کا تھا۔

لیکن جب سب کو اللہ حافظ کہنے کے بعد دل آور اپنی گاڑی کی سمت بڑھا تھا تو نبیل نے اسے ایک بار پھر روک لیا تھا۔

''تو پھر کب کرو گے بات؟'' اسے بے چینی سی بے چین ہو رہی تھی۔

''ابھی نہیں..... ابھی تم لوگ کراچی سے واپس تو آ جاؤ۔ جس روز مناسب لگا، بات کر لوں گا اور تم آنٹی سے کہنا کہ بھابی سے بات کریں پھر بات کرنے کے بعد باقاعدہ پرپوزل لے جائیں گے۔'' دل آور نے اسے اتنی جلدی کرنے سے

کے..... جیسا تمہیں مناسب لگے۔" نبیل کو ماننے ہی بنی تھی اور وہ لوگ ان سب سے مل کر واپسی کے لیے نکل آئے تھے۔ نبیل دل پہ بہت سا بوجھ لے کر آئے تھے۔

♥

رات خاصی گہری اور سیاہ ہو رہی تھی جب وہ دونوں ماں بیٹا گھر پہنچے تھے۔

جبل شاہ بنا کہے دل آور کے اندر کی کیفیت جانتی تھیں اسی لیے انہوں نے گاڑی میں بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور گھر پہنچ کر بھی اپنے آپ کو اس کام سے باز رکھا تھا اس لیے گاڑی سے اُترتے ہی وہ خاموشی سے اندر چلی گئی تھیں جبکہ دل آور بھی زیادہ وقت گاڑی سے اُترا ہی نہیں سکا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے اور پلکیں موندے نجانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔

مگر اس کے گاڑی سے نہ نکلنے پہ اس کے پالتو بل ڈوگ کو بے چینی ہو رہی تھی اور اس نے ذرا آہستہ اور متوجہ کرنے والے انداز میں بھونکنے کی دوبارہ کوشش کی تھی اور عجیب عجیب خیالوں میں بھٹکتا دل آور اس کی اس کوشش پہ جہاں بھی تھا واپس لوٹ آیا تھا۔ اور جھٹکے سے دروازہ کھول کے نیچے اُتر آیا تھا اس کے قدم اندر کی سمت اُٹھ رہے تھے لیکن مین ڈور کے کھلنے والی سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ اسے نیلگے سے اندھیرے میں لان کی سیڑھیوں پہ کسی کا سایہ نظر آیا تھا اور یہ سایہ کس کا تھا؟ یہ اسے سمجھنے کے لیے زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور دل آور شاہ کے قدم اس کی سمت "مڑ" گئے تھے۔ وہ لمبے لمبے تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر آ بیٹھا تھا اور علیزے نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرا آہستگی سے دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا دل آور کا چہرا اٹھا ہوا تھا، وہ نیچے سیڑھیوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"تم جانتی ہو علیزے..... مرد کتنا بے بس ہوتا ہے؟ رو بھی نہیں سکتا۔" دل آور کا لہجہ بے حد بوجھل اور بے حد گمبھیر ہو رہا تھا اس کی آواز میں توازن نہیں تھا ہوا میں پتوں کی طرح بکھری جا رہی تھی۔

"تم رو رہی ہو اور مجھے تم پہ رشک آ رہا ہے۔" دل آور کی حالت ہی عجیب سی ہو رہی تھی اور حالت کے ساتھ ساتھ باتیں بھی عجیب لگ رہی تھیں۔ علیزے کو ایک پل کے لیے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ آخر اسے ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ اتنا بے بس لگ رہا ہے اور اسے رو لینے والوں پہ رشک آ رہا ہے اور یہ اس کی حیرت ہی تھی کہ وہ اپنا رونا بھول کر اس کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہوئی تھی اس نے چہرا دل آور کی طرف موڑ لیا تھا لیکن اندھیرا اتنا تھا کہ وہ اس کے چہرے کو واضح نہیں دیکھ پائی تھی تو پھر چہرے کے تاثرات کیسے دیکھ سکتی تھی۔ مگر اتنا ضرور نظر آ گیا تھا کہ وہ اس کے برابر سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

اور اس کا سر جھکا کر بیٹھنا علیزے کے لیے ایک اور حیرت تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے ڈرائیور؟" آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے نے خود اس سے کچھ پوچھا تھا۔ وہ بھی صرف اس کے حلق..... یوں جیسے دونوں میں بڑے دوستانہ سے تعلقات ہوں۔

"میں ہمیشہ ہر عدالت میں ہر کیس جیت کے گھر آتا تھا علیزے! مگر آج..... آج میں محبت کی عدالت میں دل کا کیس ہار کے گھر آیا ہوں..... سب کچھ ہار آیا ہوں..... سب کچھ چھوڑ آیا ہوں..... علیزے..... میں..... میں دوستی پہ محبت وار آیا ہوں..... آج..... آج سب کچھ ختم کر آیا ہوں۔"

اتنا تلخ بے بس انداز میں کہتے کہتے اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا تھا اور علیزے دم سادھے آنکھیں پھیلائے بے یقین اور حیران و پریشان نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

اسے ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ساری باتیں ڈرائیور کہہ رہا ہے۔

"لیکن..... تم تو آج اپنے دوست کی طرف دعوت پہ انوائٹ تھے تم تو وہاں گئے تھے؟"

علیزے کو پتا تھا کہ وہ اپنے دوست کے گھر دعوت پہ گیا ہوا ہے۔ اسے یہ انفارمیشن گل نے دی تھی۔

"ہوں..... وہ میرے دوست کی طرف سے دعوت نہیں تھی۔ دل لگی تھی۔ دل داری تھی، جس میں اس نے اپنے داغ کا بوجھ اُٹھا کر مجھ سے دل پہ ڈال دیا ہے اور کہتا ہے کہ اب اس بوجھ کو خوشی خوشی اُٹھاؤ اور خوش نظر آؤ..... لیکن..... تم بتاؤ علیزے جس دعوت میں اپنے ہی دل کا خون پینا پڑے کیا وہ دعوت ہوتی ہے؟"

دل آور کی عجیب بہکی بہکی باتیں علیزے کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ اسے بھلا کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہیں۔

"بتاؤ نا علیزے! کیا وہ عورت ہوتی ہے؟" اس نے علیزے کی سمت گردن موڑتے ہوئے اسے بولنے پہ اکسایا تھا جواب دینے پر اصرار کیا تھا مگر وہ کیا بولتی؟ کیا جواب دیتی آخر؟ اس کے کچھ پلے پڑتا تب نا۔

"خیر..... میں بھی پاگل ہوں..... تم سے پوچھ رہا ہوں..... تم سے..... جس کا کبھی دل سے اور دل کے کسی کیس سے واسطہ نہیں پڑا۔ جسے پتا ہی نہیں ہے کہ عدالت کون سی ہے؟ جرم کس کا ہے؟ کیس کون سا ہے؟ مجرم کون ہوتا ہے اور مدعی کون کہلاتا ہے۔" اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا جیسے علیزے پہ مسکرا رہا ہو۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو علیزے! بہت اچھی..... ان ساری باتوں سے کوسوں دور ہو..... انجان ہو..... آزاد ہو..... کاش کہ یہ سب کیا ہوتا ہے؟ رئیلی علیزے! بہت خوش قسمت ہو تم....." دل آور کہتے کہتے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور دوبارہ اپنے قدم اندر کی سمت موڑ دیے تھے۔

"ڈرائیور....." اس نے پیچھے سے بے ساختہ اسے پکارا تھا اور دل آور کے قدم ایک پل کے لیے رُک سے گئے تھے۔

"سوری یار! میں نے تمہیں خوامخواہ ڈسٹرب کر دیا..... پلیز کیپ اٹ اپ۔"

وہ اس سے معذرت کر کے مزید کے بغیر اندر چلا آیا تھا اور علیزے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

♥

"گڈ مارننگ آذر بھائی۔" آذر صبح صبح تیار ہو کر سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ رہا تھا جب انوشہ اور کومل اچانک ہی سامنے آ گئی تھیں۔

"گڈ مارننگ....." جواباً آذر نے بھی اسے وش کیا تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" یہ سوال کومل کی طرف سے آیا تھا اور آذر آگے بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں..... اللہ کا کرم ہے..... آپ سنائیں۔" اسے بھی آخر فارمیلٹی تو نبھانی ہی تھی۔

"ہوں..... میں بھی ٹھیک ہوں۔ ڈیڈ کیسے ہیں؟ گھر کب آئیں گے؟" کومل جان بوجھ کر بات کو طول دے رہی تھی آخر دنوں بعد دیکھا تھا اور موڈ بھی فریش تھا۔

"اُمید ہے آج شام تک ڈسچارج ہو جائیں گے۔ آپ سب بس دُعا کریں ان کے لیے۔"

"لیکن آذر بھائی! ممانو آج ہسپتال جانے کے لیے تیار ہیں۔ دانیال سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے بھی ساتھ لے جانا۔ ڈیڈ کے ڈسچارج ہونے کا سن کر عائشہ آنٹی کا خیال آیا تھا۔

"ارے نہیں..... نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ آرام سے گھر پہ رہیں ڈیڈ آج ضرور گھر آ جائیں گے۔ وہ گھر پہ خیال رکھ لیں گی ان سے۔" آذر نے ان کے جانے کا سن کر نفی میں سر ہلایا تھا۔

"یہ بات اب ممانو کون سمجھائے۔" انوشہ نے کندھے اچکائے تھے۔

"اوکے..... میں بات کرتا ہوں ان سے..... ابھی ناشتہ کر لوں۔" وہ کہہ کر ڈائننگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔

"گڈ مارننگ....." اس نے اسرار آنٹی اور ثروت بیگم کو وش کیا تھا۔

"گڈ مارننگ..... جیتے رہو..... خوش رہو..... بیٹھو یہاں۔" وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"تھینک یو....." وہ ان کے برابر ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"آفس جا رہے ہو؟" انہوں نے اس کی تیاری دیکھ کر بڑی نرمی اور پیار سے پوچھا تھا۔

"نہیں..... ہسپتال جا رہا ہوں۔" اس نے جوس کا جگ اُٹھاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں..... آج تو شاید بھائی صاحب ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے۔"

"جی..... ہو جائیں گے..... تو کیا ان کو پورے دن کے لیے اکیلا چھوڑ دیں؟ اور ہسپتال کے جو بلز وغیرہ ہیں وہ کس نے ادا کرنے ہیں؟" وہ جوس کا گلاس اُٹھاتے ہوئے اُلٹا ان سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں..... میں تو بس اس لیے پوچھ رہی تھی کہ دانیال بھی شاید ہسپتال ہی جا رہا ہے اس لیے تم آفس جاؤ گے۔" وہ جیسے

کی تھی کہ آذر کو ان کا سوال بُرا لگا ہے اسی لیے انہوں نے جواباً وضاحت پیش کی تھی۔

"میں آفس نہیں جاؤں گا دانیال آفس جائے گا۔ پہلے ہسپتال جا کر ڈیڈ اور آنی سے ملے گا پھر آفس جائے گا البتہ میں ڈیڈ کے پاس ہی رہوں گا۔" آذر نے انہیں ذرا سمجھا کے بتایا تھا اور وہ سمجھ بھی گئی تھیں۔

"ہوں..... اچھی بات ہے تمہارا جانا ضروری ہے تم انہیں ساتھ لے کر ہی گھر آنا۔ آفس کی فکر مت کرو، میں بھی آفس ہی جا رہا ہوں۔" مبارک آفندی کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اسرار آفندی کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"عون اور عدید سکول چلے گئے۔" آذر نے رجو سے استفسار کیا تھا آج کل آسیہ آفندی کی غیر موجودگی میں عون اور عدید کی ذمہ داری رجو پہ ہی تھی اور ان کے سارے کام وہی سرانجام دے رہی تھی۔

"جی..... چلے گئے ہیں..... مبارک خان لے گیا ہے ساتھ۔" رجو نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"ہوں..... ٹھیک ہے میرے ناشتہ ختم کرنے تک تم آنی کا ناشتہ لے آؤ، میں ساتھ لے جاؤں گا البتہ احمد اور زین گھر آ کر ناشتہ کریں گے۔" آذر نے ناشتہ شروع کرنے سے پہلے رجو کو ہدایت دی تھی اور وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئی تھی۔

"کب چلنا ہے تم نے؟" آذر کے عقب سے دانیال کی آواز اُبھری تھی۔

"بس یہ ناشتہ ختم کر لوں..... کیوں؟ تمہیں کیا جلدی ہے؟" آذر نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے جلدی نہیں ہے امی کو جلدی ہے وہ تیار کھڑی ہیں۔" دانیال نے بیچارگی سے کہا تھا۔

"لیکن دانیال عائشہ پھوپھو کیوں جا رہی ہیں؟ ڈیڈ آج گھر تو آ ہی جائیں گے۔ پھر جانے کا کیا فائدہ۔" آذر نے خفگی سے

فائدے اور نقصان کا مجھے نہیں پتا۔ بس وہ جانے پہ بضد ہیں اس لیے میں انہیں منع نہیں کر سکتا ہمیں کیا؟ ابھی چلی جائیں ڈیڈ اور آنی کے ساتھ ہی واپس آ جائیں گی۔"

دانیال نے کندھے اچکائے اور آذر اس کی بات پہ چپ ہو گیا تھا۔ پھر انہیں عائشہ آفندی کو ساتھ لے کر ہی ہسپتال جانا پڑا تھا۔

♥

تم کس لیے چونکے ہو
کب اگر تمہارا ہے
کب تم سے شکایت ہے
اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

دھندلکے میں چہرا چھپائے بیڈ پہ اوندھے منہ پڑا تھا لیکن رات سے اب تک ذہن میں بس یہی الفاظ بار بار چکرا رہے تھے اور ان کا اثر اس حد تک پر ہجوم ہو رہا تھا کہ اس کا اپنے بیڈ سے اُٹھنے اور باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ وہ اتنی دیر تک بستر میں پڑے رہنے کا عادی نہیں تھا، وہ تو صبح سویرے ہی بستر چھوڑ کے اُٹھ جاتا تھا مگر آج پہلی بار وہ اتنا بے دل ہوا تھا کہ دنیا کو دیکھنے کو بھی دل نہیں مان رہا تھا۔ بہت دیر اسے یونہی پڑے پڑے گزر گئی تھی۔

اور جب بے چینی حد سے سوا ہوئی تو وہ یکدم کمبل ہٹا کر اُٹھ بیٹھا تھا اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اُٹھا کر سگریٹ سلگایا تھا، یونہی سگریٹ پھونکتے ہوئے موبائل پہ نظر پڑی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ عبداللہ کو کال کرے مگر موبائل سکرین پہ دو بجنے کو دیکھ کر اس نے کال کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیونکہ یہ میسجر عبداللہ اور نبیل کے تھے وہ دونوں کراچی جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے جانے سے پہلے انہوں نے باقاعدہ اسے میسجز کیے تھے اس لیے اب راستے میں انہیں کال کرنا فضول تھا۔

"دل آور..... دروازہ کھولو بیٹا!" وہ اپنے دھیان میں گم موبائل ہاتھ میں پکڑے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا جب بتول شاہ کی پریشان آواز کے ساتھ دروازے پہ دستک بھی سنائی دی تھی۔

دل آور نے بے ساختہ چونکتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا تھا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

"جی..... السلام علیکم....." اس نے کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں سلام کیا تھا۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟" بتول شاہ کافی پریشان اور عجلت میں لگ رہی تھیں۔

"کیوں..... خیریت....." اب کی بار دل آور بھی ٹھٹک گیا تھا وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھیں۔

"ہوں..... خیریت ہے بھی اور نہیں بھی..... وہ دراصل ہمارے کالج کی ایک ٹیچر ہیں مسز وقاص آفریدی..... آج کل آتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں، اس لیے مجھے بھی ہسپتال پہنچنا ہے۔ ان کی بیٹی کی کال آئی انہیں پتا تھا کہ میں لاہور آئی ہوئی ہوں۔" انہوں نے کافی گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا تھا اور دل آور کے تنے ہوئے اعصاب سے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"تو اس میں آپ کو اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ گلاب خان کو اپنے ساتھ لیں اور ہسپتال پہنچ جائیں۔"

"نہیں بیٹا! گھبرانے والی بات نہیں ہے نا..... وہ دراصل پشاور کی رہنے والی ہیں۔ یہاں لاہور میں ان کا اور کوئی جاننے نہیں ہے اور اس مشکل وقت میں ان کی بیٹی نے مجھے آواز دی ہے۔ اس لیے میرا فرض بنتا ہے کہ میں فوراً سے پیشتر ان کے پہنچوں۔"

انہوں نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی تھی اور پھر دل آور کو بھی ان کی عجلت کی سمجھ آ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے آپ گلاب خان کے ساتھ چلی جائیں۔ مجھے فی الحال آفس جا کر ایک کلائنٹ سے ملنا ہے اور فارغ ہو کر میں بھی وہیں ہسپتال ہی آ جاؤں گا۔"

دل آور نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے انہیں تسلی دی تھی اور ہلکے سے مسکرا اٹھی تھیں۔ "جیتے رہو، سدا آباد رہو۔" اور ان کی پیشانی چوم کر باہر نکل گئی تھیں اور دل آور کا دل نہ جانے کیوں لرز گیا تھا۔ وہ جب بھی کبھی انہیں اس طرح گہری نظر سے دیکھتا تو اس کے دل پہ اسی طرح ایک سایہ لہرا جاتا تھا۔

"اماں....." وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ سیڑھیاں اترتے اترتے ٹھہر گئی تھیں۔

"ہاں کہو؟" وہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے اس کی سمت مڑی تھیں۔ وہ اپنے بیڈروم کے دروازے کی چوکھٹ میں ٹھہرا تھا۔

"میں آ جاؤں آپ کے ساتھ؟" اچانک ہی اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہا تھا۔

"ارے نہیں میری جان! تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹ سے ملو، پھر بعد میں آ جانا۔"

"لیکن اماں! میرا دل بہت اداس ہے۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں باتیں کرنا چاہتا ہوں، کلائنٹ سے پھر مل لوں گا۔" دل آور نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

"بری بات بیٹا! کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت پہ کام کرنے کے عادی ہو۔ یہ تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔ شاباش تم آفس جاؤ، پھر وہاں سے ہسپتال آ جانا۔" وہ کہہ کر اس کو نرمی سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر سیڑھیاں اتر گئی تھیں اور دل آور ایک بار پھر لپک کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب آیا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" اس نے عجیب بے کل سے انداز میں بے تکا سا سوال کیا تھا۔

اور بتول شاہ راہداری کی سمت بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر رک گئی تھیں اور سر اٹھا کر سامنے سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہاں..... جا رہی ہوں..... کیوں کوئی کام ہے کیا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ "ہاں، کام تو بہت سے ہیں فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتہ کیا ہے یا نہیں؟" اس نے دھیمے، مگر سنجیدہ انداز میں پوچھا تھا اور بتول شاہ اس قدر فکرمندی پہ دیکھ کے رہ گئی تھیں۔

"نہیں..... میں نے ناشتہ نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے، لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔" انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہلایا تھا۔

"ہوں..... ٹھیک ہے، میں بھی ناشتہ نہیں کرتا۔ لیکن ڈونٹ وری لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے اوکے؟"

اس نے بھی جواباً اثبات کے سے انداز میں جواب دیا تھا۔ جس پہ بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔

"شاہ! یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گے یا نہیں؟" وہ کافی خفگی سے بولی تھیں۔

اور دل آور کو ذرا دیر کے لیے سنبھلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔

"اوکے..... اب کچھ نہیں کہتا، جائیں آپ۔" اس نے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔

"تھینک یو ویری مچ۔ اب آرام کرو اور اپنی فکر چھوڑ دو۔ اللہ حافظ۔" وہ پھر اسے اللہ حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل آور پھر سے مضطرب ہو اٹھا تھا۔ اس کا دل بھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔

اور تیزی سے دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس کے قدم بتول شاہ کے پیچھے پیچھے ہی اٹھ رہے تھے اور وہ باہر راہداری تک آ گیا تھا۔ جبکہ بتول شاہ گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

"اماں....." اس نے مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتے ہوئے پھر پکارا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھولتی بتول شاہ خفگی سے جھنجلا کر واپس مڑی تھیں۔

"ہوں..... اب کیا ہوا ہے؟" وہ دل آور کو سرتاپا دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"پلیز اماں اور کچھ نہیں کہنا، بس صرف اتنی سی بات کہنی ہے کہ آپ مجھے آج ایک کام کی اجازت دے دیں صرف ایک کام کی اجازت۔ پلیز۔"

وہ ان کے قریب مین ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور بتول شاہ اس کی اتنی سنجیدگی پہ ٹھٹک گئیں۔

"کیسی اجازت؟ کس کام کی اجازت؟" وہ کافی الجھے ہوئے اور ناسمجھ سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"علیزے کو بڑی حویلی چھوڑنے کی اجازت، پلیز اماں، آپ صرف ایک بار اجازت دے دیں۔ بس پھر سارا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میں اسے آج ہی بڑی حویلی چھوڑ آؤں گا۔ پلیز پھر آپ جو بھی کہیں گی میں کروں گا، کبھی آپ کے سامنے انکار نہیں کروں گا۔ بھی کی بات پہ "اف" بھی نہیں کروں گا۔ پلیز ایک بار اسے چھوڑنے کی اجازت دے دیں۔"

دل آور نے انہیں کندھوں سے تھامتے ہوئے جیسے التجا سی کی تھی۔ وہ آج کے دن ان سے یہ بات منوا لینا چاہتا تھا۔ تاکہ وقار آخری بار کے لیے سہی اس کے ساتھ ہی وہ اسے بھی بڑی حویلی چھوڑ آتا۔

لیکن بتول شاہ اس کی بات سن کر چپ سی ہو گئی تھیں۔ وہ آخر کیسے یوں کھڑے کھڑے اجازت دے دیتیں کہ چلو ٹھیک ہے، جا کر علیزے کو چھوڑ آؤ۔ آخر انہیں بھی تو کچھ وقت چاہیے تھا۔ کچھ سوچنے کے لیے۔ کچھ سمجھنے کے لیے جبکہ وہ تھا کہ ہتھیلی پہ سرسوں جما رہا تھا۔

"میری واپسی کا انتظار کرو، آج شام تک یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔" وہ اپنے کندھوں سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے خاصے نرم لہجے میں بولی تھیں اور پھر آگے بڑھ کے گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گئی تھیں۔ گلاب خان پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ تیار بیٹھا تھا اور بتول شاہ کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی سٹارٹ کر لی تھی۔

اور دل آور کے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی آہستہ آہستہ پیچھے سرکتی ہوئی گیٹ سے نکلی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

بتول شاہ، دل آور کی باتوں میں الجھ کر مطلوبہ ہسپتال کا نام ہی بھول گئی تھیں۔

اور اپنے اندازے کے مطابق ہی وہ، تین ہسپتالوں کے چکر کاٹ لیے تھے۔ مگر مسز وقاص آفریدی کا انہیں کہیں بھی پتا نہیں چلا تھا۔ اور جس نمبر سے ان کی بیٹی کی کال آئی تھی وہ نمبر بار بار ٹرائی کرنے پر بھی بند جا رہا تھا۔ بتول شاہ گاڑی میں بیٹھی بری طرح جھنجلا رہی تھیں اور ان کے ساتھ گلاب خان بھی خوار ہو رہا تھا۔ وہ بھی تقریباً ہر ہسپتال میں اس نام کی خاتون کا پتا کرتا پھر رہا تھا مگر پتا ندارد۔

"بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے آپ گھر چلی جائیں اور نام و پتا مجھے دے دیں، میں اور بھی ہسپتالوں میں جا کر پتا کر لیتا ہوں۔ سب معلوم ہو گیا تو بعد میں آپ کو بھی لے آؤں گا۔"

گلاب خان نے بتول شاہ کی پریشانی کے خیال سے انہیں گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔

مگر بتول شاہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مایوس ہو کر واپس نہیں جا سکتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت ان کی کولیگ کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اس طرح یہ کام اپنے گھر کے ملازم کے ذمے لگا کر خود گھر جانے کو ہرگز تیار نہیں تھیں۔

"فی الحال یہ جو سامنے ہسپتال ہے۔ تم وہاں گاڑی روکو..... میں خود پتا کرتی ہوں۔" انہوں نے سامنے نظر آتے ایک بڑے

سے ہسپتال کی بلند و بالا عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا اور گلاب خان دیکھ کے رہ گیا تھا۔

"بیگم صاحب! ایکسیڈنٹ کے زخمی کو اتنے بڑے ہسپتال میں کبھی بھی نہیں لایا جاتا یا تو لوگ اُٹھا کر سرکاری ہسپتال میں ہیں یا پھر کسی چھوٹے موٹے پرائیویٹ ہسپتال لے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ہسپتالوں میں تو قدم رکھنے کی بھی فیس ادا کرنی پڑتی ہے اس لیے ادھر کا کوئی بھی رُخ نہیں کرتا۔"

گلاب خان نے واقعی ایک سمجھدار ملازم ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا، مگر وہ بھی سمجھتیں تب نا؟

"لیکن..... پتا کر لینے میں کیا حرج ہے بھلا؟" انہوں نے اپنی کہی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔" گلاب خان نے تابعداری سے کہتے ہوئے گاڑی ہسپتال کی پارکنگ میں اور تیزی سے نیچے اُتر کر بیک ڈور کھول دیا تھا اور وہ بھی گاڑی سے اُتر آئی تھیں۔ ہسپتال کی وسیع و عریض پارکنگ کا ڈرائیوے کا طویل راستہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی وہ سیدھی ہسپتال کے ریسپشن تک جا پہنچی تھیں۔

وہاں پہلے سے ہی بہت رش تھا۔ کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن پھر بھی بتول شاہ سے لوگوں سے راستہ بناتی ہوئی ریسپشن پہ کھڑی لڑکی تک پہنچ ہی گئی تھیں۔ جو پہلے ہی اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے گھبرائی ہوئی تھی۔

"مسز و قاص آفریدی نام کی پیشنٹ کا پتا کرنا ہے۔ کیا وہ اسی ہسپتال میں ہیں؟"

بتول شاہ نے اس لڑکی کو بڑی مشکل سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور اس لڑکی نے بے دھیانی سے سر ہلا دیا تھا۔

"یس میڈم! وہ اسی ہسپتال میں ہیں۔" اس نے اک نظر سامنے رکھے رجسٹر کو دیکھا تھا۔ "کہاں ہیں وہ؟" بتول شاہ کو ایک دم سے کچھ تسلی اور ڈھارس مل گئی تھی۔

"جی..... روم نمبر ایک سو تین..... سیکنڈ فلور۔" اس لڑکی نے جلدی جلدی بتا کر رجسٹر بند کر دیا تھا اور دوسرے ہنگامی لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ حالانکہ پہلے اس ریسپشن پہ تین لڑکیاں آن ڈیوٹی ہوتی تھیں۔

لیکن اس وقت وہ بیچاری اکیلی پھنسی ہوئی تھی اور اتنے زیادہ لوگوں کو گائیڈ کر کے اس کے حواس اُڑے ہوئے تھے۔ بتول شاہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی اپنی جلد بازی اور عجلت کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کی یہ بے دھیانی اور اُڑے حواس انہیں کہاں سے کہاں لے جائیں گے؟

زندگی کا ایک ایسا مقام اور ایک ایسا لمحہ، جس سے بچتے ہوئے اور جس سے بھاگتے ہوئے ایک زندگی ہو گئی تھی۔ زندگی کا وہی مقام اور وہی لمحہ ان کے سامنے آ گیا تھا۔

وہ اپنی عجلت میں سیکنڈ فلور کے روم نمبر ایک سو تین کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں اور سامنے بیڈ پہ نظر آتے دو وجود انہیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔ حالانکہ سامنے نظر آتا وجود بھی پتھر کا ہی تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ وجود بستر پہ پڑا تھا اور بتول شاہ اپنے پتھر سے وجود کو لیے اپنے قدموں پہ کھڑی تھیں۔ مگر کس طرح کھڑی تھیں؟ یہ شاید وہ بھی نہیں جانتی تھیں۔

"ز..... ز..... ہر..... ہ.....؟" وقار آفندی پہ جیسے نزع کا وقت آن پہنچا تھا۔ ان کی زبان اور ان کے جسم پہ ایک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا اور نشو سے ان کا منہ صاف کرتی آسیہ آفندی نے یکدم چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تھا اور اپنے پیچھے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"زہرہ؟" آسیہ آفندی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے لپک کر ان کے قریب آئی تھیں۔

"زہرہ..... یہ..... یہ..... میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ یہ..... تم ہی ہو نا؟ تم..... تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

آسیہ آفندی نے بتول شاہ کے پتھر وجود کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا، لیکن بتول شاہ جو بالکل کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھیں تو جیسے بے حس و حرکت سی کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم۔" اتنے میں دانیال اور آذر عائشہ آفندی کا چیک اپ کروا کر وہیں آ گئے تھے۔ لیکن ان کے وہاں آنے تک آفندی کے روم کا منظر بدلا ہوا تھا۔ وہاں جو چہرا نظر آ رہا تھا۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابل یقین تھا۔ خصوصاً عائشہ آفندی کے لیے۔

"زہرہ؟" عائشہ آفندی بے ساختہ خوشی اور اشتیاق کے مارے بتول شاہ کے گلے لگ گئی تھیں اور عائشہ آفندی کا یہ

بتول شاہ کو بیس سال پیچھے لے گیا تھا اور وہ یکدم کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹی تھیں۔ مگر عائشہ آفندی نے ان کا اس طرح پیچھے ہٹنا نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔

"زہرہ! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا؟ کہاں کہاں نہیں گئی میں؟ میں پاگل ہو گئی تھی تمہارے لیے۔ مگر تم کہیں نہیں ملیں، کہیں بھی نہیں کیا اس طرح گم ہو جاتے ہیں؟ کہ اپنوں کو خبر بھی نہ دیں؟ کیا تمہیں کبھی میرا خیال بھی نہیں آیا؟ کیا تم نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری عائشہ پہ کیا گزری ہوگی؟"

عائشہ آفندی بتول شاہ کو دونوں کندھوں سے تھامتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

اور بتول شاہ نے چھلکتی ہوئی نظروں سے پہلے وقار آفندی کو، پھر آسیہ آفندی کو، پھر عائشہ آفندی کو اور پھر آذر اور دانیال کو دیکھا۔ ان سب کی نظریں بھی بتول شاہ پہ ہی تھیں۔

"کس پہ کیا گزری؟ میں سب جانتی ہوں، مگر مجھ پہ کیا گزری، یہ کوئی بھی نہیں جانتا..... تم بھی نہیں۔" انہوں نے عائشہ آفندی سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹا دیے تھے اور وقار آفندی کے منہ سے خاصی بلند قسم کی کراہ نکلی تھی۔ انہوں نے اٹھنا چاہا تھا مگر بے بسی آڑے آ گئی تھی۔ وہ زہرہ بتول شاہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔

"ز..... ہر..... م..... معا..... ف..... ی۔"

وقار آفندی کے منہ سے نکلنے والے ٹوٹے بکھرے الفاظ تھے جو بتول شاہ کو بھی توڑ کے رکھ گئے تھے اور وہ یکدم اک جھٹکے سے اپنی جان کے لیے مری تھیں۔ لیکن انہیں واپس مڑتے دیکھ کر وہ سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔

"زہرہ آنٹی! پلیز رکیے، کہاں جا رہی ہیں آپ؟" آذر یکدم ان کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔

"پلیز آنٹی! آپ بیٹھ کر بات کریں۔ آخر ہوا کیا تھا؟" دانیال بھی سامنے آ گیا تھا۔

لیکن بتول شاہ کا یہاں رُکنا انگاروں پہ لوٹنے کے برابر تھا اور وہ انگاروں پہ کیسے ٹھہر سکتی تھیں؟ اس لیے وہاں موجود سبھی نے انہیں راستے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہ وہاں رُک نہیں سکی تھیں اور دیکھتے دیکھتے ہی وقار آفندی کی حالت ایک دم سے ابتر ہو گئی تھی۔ آسیہ آفندی اور آذر وغیرہ ان کی طرف لپکے تھے اور ادھر عائشہ آفندی تھیں جو زہرہ بتول شاہ کے پیچھے انہیں پکارتی ہوئی سیڑھیوں اتر آئی تھیں۔ مگر بتول شاہ کی سماعتوں میں گونجتی چیخوں کے سوا انہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کسی آندھی طوفان کی طرح ہسپتال کے احاطے سے باہر نکلی تھیں۔

"زہرہ پلیز..... رکو تو سہی، مجھے بتاؤ تو سہی، کیا ہوا تھا۔ تم کیوں چلی گئی تھیں؟ پلیز رکو، زہرہ خدا کے لیے میری بات تو سنو۔"

عائشہ آفندی ان کے پیچھے پیچھے انہیں پکارتی ہوئی آ رہی تھیں اور بتول شاہ ان کی دھندلی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جانے کے بجائے باہر روڈ کی سمت آ گئی تھیں۔ ان کا چہرا بھیگا ہوا تھا۔ آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ سماعتوں میں اپنی ہی چیخوں کا شور گونج رہا تھا اور سامنے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ اور کس طرف جا رہی ہیں؟ لیکن پیچھے عائشہ آفندی ہانپ گئی تھیں۔ ان کو پکار پکار کر تھک گئی تھیں۔ مگر جو وہ ٹھان چکی تھیں وہ تو قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کو سڑک کی طرف بھاگتے دیکھ کر گلاب خان بھی گاڑی وہیں چھوڑ کر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔

لیکن جب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور فضا میں ان کی چیخ کی آواز اور ٹائر چرچرانے کی آواز گونجتی رہ گئی تھی۔ گاڑیوں کے اتنے اژدھام میں دو گاڑیاں آپس میں ٹکراتے ٹکراتے بچی تھیں اور تیسری گاڑی بتول شاہ کو روندتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مگر ہر طرف یکدم سناٹا سا بچھ گیا تھا۔

گلاب خان اور عائشہ آفندی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

♥

وہ اپنے آفس میں بیٹھا بتول شاہ کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ جب اچانک ہی اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے کارپٹ پہ جا گرا تھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ہی اماں کا لفظ ادا ہوا تھا۔

گرتے ہی بڑا اپ سیٹ تھا۔ اس لیے موبائل کے یوں ہاتھ سے چھوٹنے پہ اور زیادہ مضطرب ہو گیا تھا اور اس نے فوراً جھکتے ہوئے موبائل اٹھا کر دوبارہ ان کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ مگر ان کے نمبر پہ کوئی رنگ نہیں جا رہی تھی۔ وہ تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے

گلاب خان کے نمبر پہ ٹرائی کیا تھا۔

اور تین، چار مرتبہ رنگ بجنے کے بعد گلاب خان نے کال ریسیو کر لی تھی۔ لیکن پیچھے بہت زیادہ شور سنائی دے رہا تھا۔ شور کے درمیان کھڑا گلاب خان رو رہا تھا۔

''گلاب خان! کہاں ہو تم؟ اماں کہاں ہیں؟'' دل آور کو عجیب سی بے چینی ستا رہی تھی۔

''صاحب..... وہ..... وہ بیگم صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ صاحب آپ جلدی پہنچو، ورنہ دیر ہو جائے گی۔'' گلاب خان نے روتے ہوئے بڑی مشکل سے اسے بتایا تھا اور دل آور یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی اور وہ روح تک کانپ گیا تھا۔

''گلاب خان! اماں کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟'' یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کی آواز لرز رہی تھی کہ مبادا اسے کچھ اور کو نہ مل جائے۔

''بہت چوٹیں آئی ہیں صاحب! بہت چوٹیں آئی ہیں۔ بس اللہ سے ان کی زندگی کی خیر مانگیں۔''

گلاب خان دکھ اور اذیت سے بتاتے ہوئے بلک رہا تھا اور دل آور کو یوں لگا تھا کہ جیسے اس کے دل و دماغ کا ہر حصہ ہوا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا ہو۔ پھر اس کے بعد اسے نہیں خبر تھی کہ اس کے ہاتھ سے موبائل کب گرا تھا؟ اسے غش آنے لگی؟ وہ گاڑی تک کیسے پہنچا تھا اور اس نے یہ سارا سفر کب اور کیسے طے کیا تھا؟ اس کا دماغ بس گھوم رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے تاریکی چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

♥

وہ ہسپتال کی راہداری میں بلبلائے ہوئے شیر کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی تھی۔ لیکن جتول شاہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ وہ آئی سی یو میں مسلسل زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ لیکن نہ زندگی جیت رہی تھی اور نہ موت ہارنے کو تیار تھی۔

اور دل آور شاہ کی حالت ایسی تھی کہ جیسے جان نزع پہ آئی ہوئی تھی۔ جیسے اب نکلی کہ تب نکلی۔ وہ صبح سے اب تک راہداری میں چکر کاٹ کاٹ کر پاگل ہو گیا تھا۔ گلاب خان اور اس کے سوا کسی تیسرے کو ابھی تک اس ایکسیڈنٹ کی خبر نہیں تھی۔ ابھی وہ نبیل اور عبداللہ کو فون کر کے بتانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک ڈاکٹر اور نرس آئی سی یو کا دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے اور دل آور تیزی سے ان کے قریب آیا تھا۔

''مبارک ہو آپ کی مدر ہوش میں آ چکی ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے ان سے مل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت وزیٹ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی تھی اور دل آور کے ساتھ ساتھ گلاب خان نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی سمت بڑھ گیا تھا۔

''اماں.....'' دل آور کی دبنگ قسم کی آواز اس وقت بے حد دھیمی اور بے جان سی لگ رہی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا ان کے بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ ان کا پورا جسم سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ، وہ ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ چوٹ کے نشان نظر آ رہے تھے اور انتہائی اذیت سے بند پلکوں کو انہوں نے بڑی مشکل سے کھولتے ہوئے دل آور کی سمت دیکھا تھا۔

اور چہرے پہ ایک درد سے گندھی ہوئی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

''تمہیں پتا تھا نا، آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس لیے مجھے جانے سے روک رہے تھے؟ اور..... اور مجھے پتا چلا کہ میرا بیٹا کیا چاہ رہا ہے؟ کیوں بے چین ہو رہا ہے؟ ہونہہ..... اور میں سمجھ ہی نہیں سکی۔'' جتول شاہ بڑی مشکل سے ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ورنہ درد اور تکلیف اتنی تھی کہ ''اف'' بھی کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

''پلیز اماں! ایسا مت کہیں۔ آپ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ نے ہر حال میں ٹھیک ہونا ہے، صرف میرے لیے، میرے لیے جینا ہے آپ نے، ورنہ اکیلا ہو جاؤں گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اکیلا۔'' دل آور نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما تھا۔ اس کی آواز کافی بھیگی ہوئی لگ رہی تھی۔

کیسے ہو سکتا ہے؟ میں..... میں..... تمہیں اکیلا چھوڑ کے کیسے جا سکتی ہوں بھلا؟ اب تک جو زندہ ہوں، تو تمہارے لیے ہی
پتہ نہیں تم جانتے ہو کہ نہ جانے کب کی مر گئی ہوتی؟"
بتول شاہ کے آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی کنپٹیوں تک بہہ نکلے تھے اور دل آور کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔
"لیکن اماں! آپ کو اب بھی جینا ہے، اب بھی زندہ رہنا ہے، میری خاطر، صرف میرے لیے، میری زندگی میں اور ہے کون،
ہے آپ کے سوا؟ آپ کے بغیر تو میرے لیے زندگی کا تصور بھی سوہانِ روح ہے۔" دل آور نے کہتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے
اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تھے۔ مگر اب ان آنسوؤں کو رستہ مل گیا تھا۔ وہ تھم ہی نہیں رہے تھے۔
"نہیں بیٹا! زندگی میں کوئی بھی ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا..... نہ ماں، باپ..... نہ اولاد..... اور نہ ہی دوست احباب..... ایک نہ
ایک دن سب کو ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی بس چلتی ہی رہتی ہے۔" بتول شاہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے
رکیں تب ان کی سانس اُکھڑنے لگی تھی۔ "میں جانتی ہوں رشتوں کے حوالے سے تمہارا دامن بالکل کورا ہے، بالکل
خالی ہے۔ نہ بہن، بھائی، نہ کزن، نہ کوئی اور رشتہ دار..... کچھ بھی تو نہیں ہے تمہارے پاس..... تم نے ساری زندگی میرے ساتھ،
میری طرح تنہا گزار دی، زری کو چاہا اور وہ چاہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ میرے لیے اس سے بڑی دُکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرے
بیٹے کے بغیر زندگی کا تصور بھی سوہانِ روح ہے۔ ہونہہ..... تم زری کے بغیر رہ سکتے ہو تو پھر بتول شاہ کے بغیر بھی رہ سکتے ہو۔
لیکن مجھے پتا ہے کہ تمہارا بہت بڑا جگرا ہے۔ تم اپنے دل سے ٹکرا سکتے ہو تو پوری دُنیا سے ٹکرا سکتے ہو اور تمہارے ان ہی حوصلوں کو
دیکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پلیز علیزے سے نکاح کر لو۔ اس کی زندگی داغ دار ہونے سے بچا لو۔ مجھے سرخرو کر دو، میری قبر پہ
علیزے کی آنسوؤں کا بوجھ مت ڈالو۔ ورنہ مجھے قبر کا سکون بھی نصیب نہیں ہوگا۔"
بتول شاہ نے بالآخر اسے کہہ ہی دیا تھا۔ مگر تب تک ان کا تنفس تیز ہو چکا تھا اور ان کی سانسوں کی یہ رفتار دیکھ کر نرس نے یکدم
تمام ڈاکٹرز کی ٹیم کو الرٹ کر دیا تھا۔
"اماں! آپ ٹھیک تو ہیں نا، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اِدھر میری طرف دیکھیں۔"
ان کی ایسی حالت دیکھ کر دل آور کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے زمین و آسمان چکراتے ہوئے نظر
آنے لگے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ سے بتول شاہ کا ہاتھ چھڑا لیا تھا اور دل آور کو لگا جیسے انہوں نے اس کے ہاتھ سے زندگی کا دامن
چھڑا لیا ہو۔
"سر پلیز..... آپ فی الحال تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیں؟" ڈاکٹر نے کافی پریشانی اور عجلت میں اسے باہر جانے کا کہا
تھا۔ مگر دل آور کیسے جاتا۔ اس کا دل بتول شاہ کی طرف کھنچ رہا تھا۔
"آیئے سر! آپ باہر آ جایئے۔" نرس اسے زبردستی چھوڑنے کے لیے باہر دروازے تک آئی تھی اور پھر دروازہ بند کر دیا گیا
تھا۔
"شاہ....." بتول شاہ نے جیسے تڑپ کے پکارا تھا۔ انہوں نے آئی سی یو سے باہر نکلتے دل آور کی پشت دیکھی تھی اور انہیں یوں
لگا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔ اسی لیے وہ تکلیف کے باوجود تڑپی تھیں۔ مگر ڈاکٹرز نے ان کی
توجہ کھینچنے کے لیے انجکشن دینے شروع کر دیے تھے
مگر وہ اب زندگی کے اس سنگین اسٹیج پر تھیں۔ جہاں ان پہ بیہوشی اور غنودگی کا انجکشن بھی اثر نہیں کر رہا تھا اور وہ اپنی کراہوں
کے درمیان ڈاکٹرز سے التجا کر رہی تھیں۔
"پلیز ڈاکٹر صاحب..... صرف..... صرف..... ایک بار..... میرے شاہ کو بلا دیں..... مجھے صرف ایک بار دیکھ لینے
دیں۔" بتول شاہ کی بات سے ڈاکٹرز کا دل بھی جیسے دُکھ سے بھر گیا تھا اور انہوں نے ساری ٹریٹ منٹ کچھ دیر کے لیے ترک کرتے
ہوئے دل آور شاہ کو اندر بلا لیا تھا۔
"اماں! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں۔" وہ لپک کے پاس آیا تھا۔

"تکلیف کم ہو سکتی ہے۔ یہ اگر تم کرو تو؟" بتول شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

"ہاں ہاں میں کروں گا ضرور کروں گا۔ آپ کہیں کیا بات ہے؟" اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"میں میں نے آج وہ وقار آفندی کی حالت دیکھی ہے وہ وہ اپنے اسی دنیا میں بھ بھگت چکا ہے تت تم اب علیزے کو مرا مت میرے خدا گواہ ہے میں نے آج وقار آفندی کو معاف کیا۔ معاف کیا میں نے۔" بتول شاہ کے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل آور شاہ تو جیسے کھڑے قد سے ڈھے گیا تھا۔

اس کی ماں زندگی کی تلخیوں کا آج ایک اور پیالہ پی گئی تھی اور وہ زندگی اور موت کے پل صراط پہ جھولتی بتول شاہ کو دیکھ رہ گیا تھا۔ دل آور کی سرخ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ انہی آنسوؤں کے درمیان انہیں ہی دیکھتا جا رہا تھا۔

"دیکھو مجھے میری قبر کی اذیت سے آزاد کر دو پُر سکون کر دو مجھے کو تو تم چھوڑ ہی چکے ہو علیزے کو اپنا لو میری خاطر نکاح کر لو اس سے ہی ابھی میری نظروں کے سامنے پھر پھر کوئی دُکھ کوئی اذیت نہیں رہے گی سکون میں آجاؤں گی اور کچھ نہیں تو میرے ہاتھوں کی لاج رکھ لو۔"

انہوں نے انتہائی مشکل سے اٹک اٹک کر ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی تھی اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ دیئے تھے اور دل آور نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔ پھر ان کے ہاتھوں کو بڑے حفاظت سے یکدم پلٹا اور آگ سی بو سے باہر نکل گیا تھا اور اسے اس طرح باہر نکلتے دیکھ کر گلاب خان بڑی تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

"کیا بات ہے صاحب! سب ٹھیک تو ہے نا؟ بیگم صاحبہ کیسی ہیں اب؟ زیادہ پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا؟" گلاب خان خاصا متفکر اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ دل آور کی حالت ہی کچھ ایسی دکھائی دے رہی تھی۔ "گلاب خان اتم گھر جاؤ علیزے کو لے کر آؤ، اسے بتاؤ جا کر کہ میں نکاح کی تیاری کیے بیٹھا ہوں۔" اس نے جواباً جو کچھ کہا تھا وہ گلاب خان کو حیران پریشان کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتا۔ اس لیے فوراً سر جھکا کر حکم کی تعمیل کرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

♥

وہ بیسمنٹ کے فرش پہ لگے بستر پہ لیٹی، چہرے پہ کلائی رکھے اپنے گھر کی چار دیواری میں موجود اپنے تمام رشتوں کو سوچتی ہوئی ان کے درمیان سانس لے رہی تھی ان کو محسوس کر رہی تھی، ان کے ساتھ جی رہی تھی جب اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پہ چونک سی گئی تھی اور اپنے ہنستے بستے گھر کی چار دیواری سے ایک پل میں دل آور شاہ کے بیسمنٹ میں آ پہنچی تھی اور اس نے اپنے چہرے سے کلائی ہٹا کر فوراً سائیڈ دیکھا تھا۔ اس کے سامنے گلاب خان سر اور نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا اور زبان سے چپ علیزے کو اس وقت اس کی چپ بھی کافی انہونی سی چپ لگ رہی تھی کیونکہ گلاب خان کا انداز ہی کچھ ایسا تھا اور اس کے انداز سے علیزے کی سماعتوں میں عجیب سی خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی اور وہ یکدم پریشان سی ہو کر اُٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے گلاب خان! سب ٹھیک تو ہے نا؟" علیزے کے اپنے چہرے پر بھی تفکر کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ صبح سے ہسپتال میں ہیں۔ مجھے صاحب نے بھیجا ہے میں آپ کو لینے کے لیے ہوں۔"

گلاب خان اس کے سامنے صاف صاف نہیں کہہ سکا تھا کہ وہ اسے نکاح کے لیے لینے آیا ہے۔

"ڈرائیور کی مما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟ اوہ مائی گاڈ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا ہے۔" علیزے نے اپنا دل تھام لیا تھا۔ اسے واقعی بہت صدمہ ہوا تھا۔ دل آور شاہ بے شک اسے جتنا بھی بُرا لگتا تھا مگر بتول شاہ اسے کبھی بھی بُری نہیں لگی تھیں نہ جانے کیا بات تھی کہ علیزے کا ہمیشہ دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے بات کریں اور اسے کچھ دیر اپنے پاس اپنے ساتھ بیٹھنے

PRIMEURDUSOCIETY.COM

چیز ہی ایسی ہوتی تھی کہ اسے کبھی بھی یہ موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ ''ٹرے سے بھی زیادہ بُرا ہوا ہے بی بی جی لیکن اس وقت زیادہ بحث کرنے کا وقت نہیں ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔ آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں۔''

گلاب خان نے اسے پھر چلنے کے لیے کہا تھا اور علیزے ٹھٹک گئی تھی۔

''میں چلوں..... میں.....؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

''جی..... آپ..... صاحب نے آپ کو ہی بلایا ہے۔'' گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''لیکن..... مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرا کیا کام؟'' علیزے کو اتنے مہینوں کے بعد اپنے کہیں جانے کا سن کر سچ مچ یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گلاب خان اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہو۔

گلاب خان نے اب کی بار اس کے سر پہ بم پھوڑا تھا اور علیزے یکدم بدک کے رہ گئی تھی۔

''نکاح؟'' اس کے منہ سے ایک اور ناقابل یقین لفظ ادا ہوا تھا۔

''جی ہاں..... نکاح۔'' گلاب خان اسے بس یقین دلانے جا رہا تھا اور وہ بے یقین ہوتی جا رہی تھی۔

''مگر وہ ڈرائیور کی ممی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے..... وہ تو ہسپتال میں.....؟'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''جی..... بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور یہ نکاح بیگم صاحبہ کی خواہش پہ ہی ہو رہا ہے اور ہونا بھی ہسپتال میں ہی اس لیے اس وقت آپ کو میرے ساتھ ہسپتال ہی چلنا ہے۔''

گلاب خان نے اسے ساری سچوایشن بتا دی تھی اور علیزے سن کر چپ کی چپ بت بن گئی تھی۔

آخر اس کے پاس کہنے کے لیے تھا ہی کیا؟ سب کچھ اس مقام پہ آ کر ختم ہو گیا تھا۔ اب تو وہ اپنی ذات سے بھی دستبردار ہونے والی تھی۔

لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے اُٹھ کر گلاب خان کے ساتھ چل پڑتی۔ بلکہ اس کا تو یہ سوچ کر ہی جسم ٹھنڈا پڑ جاتا تھا کہ وہ اپنا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ''ڈرائیور'' کو سونپ رہی ہے جو اس کا، اس کے باپ کا اور اس کے پورے خاندان کا قاتل ہے اور جس سے علیزے کو خود بے پناہ نفرت ہے جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی جس کو وہ جان سے مار دینا چاہتی ہے۔

لیکن کیا کرتی؟ اس ڈرائیور کے سوا کوئی اس کی عزت بھی تو نہیں ڈھانپ سکتا تھا۔

اور پھر سوچ کر اس کے قدم زمین سے اُٹھے اور آگے بڑھنے لگے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے گلاب خان بھی ویسٹ سے باہر آ گیا تھا۔ باہر گاڑی کھڑی تھی اسے دیکھ کر قریب آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی سیاہ رنگ کی شیشے جڑی دھاگے کی کڑھائی والی چادر تھی۔ یہ چادر گل نے اپنے بیگ سے خاص طور پہ علیزے کے لیے منگوائی تھی اور آج علیزے کو نکاح کے لیے جاتے دیکھ کر وہ جلدی سے وہ چادر اُٹھا لائی تھی۔

''علیزے بی بی! آپ نے کہا تھا جب آپ کو ضرورت ہو گی تو آپ یہ چادر لے لیں گی اور میرا خیال ہے کہ آج سے زیادہ آپ کو اس چادر کی ضرورت پھر کبھی نہیں ہو گی۔'' گل نے وہ چادر اس کے سامنے پھیلائی تھی اور علیزے نے وہ چادر چپ چاپ اس کے ہاتھ سے لے کر اوڑھ لی تھی اور کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی تھی لیکن گل اور گلاب خان ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔

♥

گاڑی سے اُترتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اور جسم و جان برف کی مانند سرد پڑ چکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا وہ کسی بھی وقت کہیں بھی لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ مگر نہ جانے کیسے اور کس طرح وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی گلاب خان کی معیت میں چلتی اندر ہسپتال کی راہداری تک آ گئی تھی۔ جہاں دل آور شاہ زندگی میں پہلی بار فقیرانہ انداز میں لاچار، بے بس اور مفلس نظر آ رہا تھا۔ دیکھ کر لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ دل آور شاہ ہے۔

''صاحب جی!'' گلاب خان نے قریب آ کر اسے متوجہ کیا تھا اور دل آور نے اس کی آواز پہ چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا تھا اور گلاب خان کے قریب ہی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی علیزے نے بھی اسے ہی دیکھا تھا۔ دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا اور دونوں کی نظریں ہی جھک گئی تھیں کیونکہ دونوں ہی بے بس تھے۔ نظریں نہ جھکاتے تو اور کیا کرتے؟ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نظروں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے مقام پہ دونوں کی ذات بھی جھک گئی ہے۔ حالات نے انہیں ہرا دیا تھا اور دو ہارے ہوئے لوگ

زندگی کی جنگ کی شروعات کرنے جا رہے تھے۔

اور اس شروعات سے پہلے اک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کے دل میں ہی عجیب عجیب سے اُبال اُٹھے تھے۔ مگر یہ وقت تھا کہ دل میں اُٹھنے والے کسی اُبال یا کسی درد پہ دھیان دیا جاتا۔ بلکہ یہ وہ وقت تھا جس میں اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو کھل بہتر تھا اور ان دونوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ بھول گئے تھے سب کچھ..... سب ہی کچھ۔

''گلاب خان..... اندر آجاؤ۔'' دل آور آہستگی سے کہہ کر پلٹ گیا تھا اور گلاب خان اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے علیزے کو ساتھ لیے اس کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔ حالانکہ آئی سی یو میں جانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ لیکن محض بتول شاہ کی خوشی کی خاطر ڈاکٹرز نے یہ چھوٹ بھی دے دی تھی۔

''آئی..... آئی۔'' علیزے بے ساختہ تڑپ کر ان کی سمت بڑھی تھی اور انہوں نے اپنی درد سے ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے مشکل بڑی وقت سے پلکیں اُٹھا کر علیزے کو دیکھا تھا۔ مگر علیزے کا چہرا ان کی آنکھوں میں دھندلا گیا تھا۔ ''آئی! یہ سب کیا کیوں ہو گیا ہے؟ آپ تو صحیح تک بالکل ٹھیک تھیں؟'' علیزے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے رو ہانسی سی ہو گئی تھی۔

''مم..... میں..... نے کہا تھا کہ آج..... شام..... تک..... تمہارے..... حوالے..... سے..... کوئی..... فیصلہ ہو جائے گا..... اور..... دیکھ لو..... شام..... بھی..... ہو گئی..... ہے..... اور..... اور..... فیصلہ بھی۔''

وہ اپنی آخری سانسوں سے بھی جنگ لڑ رہی تھیں اور علیزے کا دل ڈوب ڈوب گیا تھا۔

''پلیز آئی! ایسا مت کہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔'' علیزے نے پہلی بار کسی کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''علیزے..... میرے..... دل آور..... کا..... اب..... اس..... دُنیا..... میں..... اور کوئی..... نہیں ہے..... سوا..... اس..... کا ہمیشہ..... ساتھ..... نبھانا..... وہ بھی..... تمہارا ہی..... بن کے رہے گا..... بلکہ..... اب..... وہ ہے ہی تمہارا..... اس نے..... میری..... لاج..... رکھی..... ہے..... تم..... بھی..... میری..... بات کی..... لاج..... رکھنا..... زندگی..... بھی..... موڑ پر..... وہ..... تمہیں نہیں..... چھوڑے گا..... تم..... بھی..... اسے..... کبھی..... مت..... چھوڑنا..... چاہے..... میں..... کچھ..... بھی..... ہو جائے۔''

بتول شاہ کا ہاتھ علیزے کے ہاتھ میں تھا اور علیزے کے اپنے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایسی سنگین اور جان لیوا صورتحال پہلے کب دیکھی تھی بھلا؟

''آیئے مولوی صاحب اندر آ جایئے۔'' بتول شاہ کے سرہانے کی سائیڈ میں کھڑا دل آور ان کی باتوں کا جواب دل مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایس پی کامران مہدی اور ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ کیونکہ وقت بطور گواہ بلایا گیا تھا اور وہ بخوشی آ بھی گئے تھے۔ مگر افسوس کہ صورتحال بے حد اذیت ناک اور رنج سے بھرپور تھی۔

جو بھی دیکھ رہا تھا اس دُکھ کو دل سے محسوس کر رہا تھا۔ خوشی کے یہ لمحات غم کے لبادے میں لپٹ جائیں گے یہ بھلا کب کسی نے سوچا تھا؟ نہ وقار آفندی نے..... اور نہ بتول شاہ۔

جس طرح وقار آفندی کو اپنی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا شوق تھا۔ اسی طرح بتول شاہ کے دل میں بھی اپنے شادی کے حوالے سے بہت ارمان تھے۔ مگر اللہ کو کیا منظور تھا؟ یہ کون جانتا تھا بھلا؟ قبولیت کا وقت آیا تو علیزے نے اپنے کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

''ہاں..... قبول ہے۔'' علیزے نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کا ہاتھ بتول شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ جیسے ہمت بندھا رہی ہوں اور بتول شاہ کا ہاتھ دل آور کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے انہیں اپنے پاس رکھ لینا چاہتا ہو۔ آمنے سامنے کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو باآسانی دیکھ بھی سکتے تھے۔ مگر دل آور نے پھر بھی اسے ایک بار بھی دیکھا تھا۔ حالانکہ علیزے نے اسے تین بار دیکھا تھا۔

''ہاں قبول ہے..... ہاں قبول ہے۔'' تیسری دفعہ کہتے ہوئے علیزے کی آنکھوں کے قیدی تیزی سے باڑ بھلانگ گئے اور اس کا ضبط بکھر گیا تھا۔ جس پہ گلاب خان نے آگے بڑھ کے بے حد شفقت سے اور بے حد مان سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا اور جب یہی لمحہ دل آور پہ آیا تو اس کی بھی جیسے پوری کائنات ٹھہر گئی تھی اور دل میں اک لہر اُٹھی تھی۔ زری

PRIME URDU NOVELS

...سے صدمے سے پکارا۔ مگر جب اس نے اس پکار پہ یکدم سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو سامنے اسے صرف اور صرف علیزے کا ...چہرہ نظر آیا جو اسے قبول کر چکی تھی اور جس کے ماتھے پہ اب اسی کا نام قسمت بن کر تحریر ہو چکا تھا اور اس چہرے کو دیکھنے کے بعد ...کچھ دیکھنا اور سوچنا ہی بے معنی سا ہو گیا تھا۔

"آہ....." بتول شاہ، دل آور کی ہاں کی منتظر تھیں۔ ان کی کراہ اسے واپس کھینچ لائی تھی اور اس نے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے ...سر جھکا کر قبول کر لیا تھا اور ساتھ ہی سائن بھی کر دیئے تھے۔

"مبارک ہو بیرسٹر صاحب! مبارک ہو..... بہت بہت مبارک ہو۔" ایس پی کامران مہدی، ڈاکٹرز اور مولوی صاحب اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ مگر دل آور کو بھلا کب ہوش تھا؟ اس کا دھیان تو بس بتول شاہ کے ہاتھ کی طرف تھا جو ایک دم سے بے جان ہو گیا تھا اور علیزے کا ہاتھ بھی ان کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ جس پہ وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ مگر بتول شاہ کے کلمہ پڑھتے ہوئے ساکت ہو چکے تھے اور دل آور کا دل بند ہو گیا تھا۔

"ماں....." اس نے بڑی مشکل سے اٹھ کر ان کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر پکارا تھا۔ مگر وہ کیسے جواب دیتیں؟ ...موت بازی لے گئی تھی اور زندگی چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں ہار گئی تھی۔ مات کھا گئی تھی۔

♥♥♥

اور زندگی کی اس بات پہ دل آور شاہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بے دم سے ہو کر پہلو میں آ گرے تھے اور بے یقین، پتھرائی ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھیں بتول شاہ کے ایک دم سے پُرسکون ہو جانے والے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں اور وہ وہیں ساکھڑا بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

''دل آور صاحب! آپ باہر آ جائیں پلیز.....'' اس کی حالت کے پیش نظر ایس پی کامران مہدی نے تیزی سے اٹھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لیے آئی سی یو سے باہر نکل آئے۔

ادھر علیزے بھی ساکت و صامت سی بھیگی آنکھیں پھیلائے ہوئے بے یقین سی نظروں سے بتول شاہ کے بے جان جسم کو دیکھ رہی تھی، کیونکہ اسے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بعد حقیقتاً اس دنیا کو خیر باد کہہ چکی ہیں۔

''علیزے بی بی! آپ بھی باہر آ جائیں۔ ڈاکٹرز کو اپنا کام کرنے دیں۔'' ڈاکٹر صاحب کے اشارے پہ گلاب خان نے علیزے کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چونک گئی تھی۔

''اور آنٹی.....؟'' علیزے جیسے باہر جانے کو تیار نہیں تھی۔

''پلیز میم! بس چند منٹ ویٹ کریں، پھر آپ کو ڈیڈ باڈی مل جائے گی، آپ پریشان نہ ہوں۔'' ڈاکٹر نے علیزے کی پریشانی دیکھتے ہوئے خود اسے تسلی دی تھی اور وہ اس تسلی پہ بڑے ضبط سے محض سر ہلا کر وہاں سے اٹھ کر گلاب خان کے ساتھ آئی سی یو کے دروازے تک آ گئی تھی، لیکن دروازے تک آ کر اس کے دل کو جانے کیا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ پلٹ کر بتول شاہ کے بیڈ کے قریب آ گئی اور بے اختیار بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ جھک کر ان کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔ عزت..... عقیدت..... اور محبت بھرا بوسہ۔

''آئی مس یو آنٹی..... آئی رئیلی مس یو..... اینڈ اینڈ..... آئی رئیلی لو یو.....'' علیزے اپنے جذبات اور محسوسات کو بیان کر رہی تھی اور اس کے ایسے اظہار پہ گلاب خان کی آنکھیں بھی بے ساختہ پانی میں بھیگ گئی تھیں، البتہ آئی سی یو کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے اس منظر کو دل آور نے محض خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا، مگر کچھ محسوس نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ واقعی اس وقت اتنے گہرے صدمے سے پتھر کا ہو چکا تھا۔

''علیزے بی بی.....'' گلاب خان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر متوجہ کیا تھا اور علیزے تیزی سے آنکھ کر آئی سی یو سے باہر نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے گلاب خان بھی باہر نکل آیا تھا۔

♥

عائشہ آفندی نے زہرہ بتول شاہ کا ایکسیڈنٹ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ اپنی نظروں کے سامنے ایسا ہولناک منظر دیکھ کر برداشت نہیں کر پائی تھیں اور کھڑے قد سے تیورا کر نیچے زمین پہ آ گری تھیں اور تھوڑے فٹ کے فاصلے پہ ان کے پیچھے آنے والے دانیال کے بھی ان کو اس طرح نیچے گرتے دیکھ کر حواس اڑ گئے تھے اور وہ آگے پیچھے کچھ دیکھے بغیر بے ساختہ ان کی طرف بھاگا تھا اور ان کے قریب پہنچ کر ان کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا، اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پہ کس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟ لوگوں کا اتنا ہجوم کیوں جمع ہے؟ اور آخر عائشہ آفندی اس طرح اچانک بیہوش ہو کر کیوں گری ہیں؟

اسے اس وقت بس ان کی فکر ہو رہی تھی، باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ زہرہ آنٹی کے پیچھے ہسپتال سے نکلی تھیں تو پھر زہرہ آنٹی کہاں ہیں؟ اور انہیں اچانک کیا ہوا ہے؟

اس کا تو ذہن بس عائشہ آفندی کی طرف تھا۔ اس نے انہیں اُٹھا کر صرف ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی تھی ان کی ایسی حالت دیکھ

کر اس کے اپنے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے، وہ بڑی ہمت اور بڑی عجلت میں ہسپتال پہنچا تھا، جہاں آذر بھی ایسی صورتحال دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اور فوراً ڈاکٹرز کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ ڈاکٹرز نے وقتی طور پہ عائشہ آفندی کی کنڈیشن دیکھتے ہوئے انہیں ایمرجنسی میں ایڈمٹ کر لیا تھا جس پہ آذر، دانیال اور آسیہ آفندی تینوں ہی بے حد پریشان ہوئے تھے کیونکہ ابھی ابھی وقار آفندی کی حالت اچانک اتنی بگڑ گئی تھی کہ مجبوراً ڈاکٹرز کو انہیں نیند کا انجکشن دینا پڑا تھا اور محض چند منٹ میں ہی وہ انتہائی گہری اور پُرسکون نیند سو گئے تھے۔ ان کی پریشانی سے نکلے تھے تو عائشہ آفندی کی پریشانی نے آگھیرا۔

اسی پریشانی پریشانی کے چکر میں انہیں یہ بھی احساس نہ ہوا کہ آج ان کی علیزے واقعی ان کے لیے "پرائی" ہو گئی ہے۔ اتنی پرائی کہ اس کا نکاح بھی ان کے لیے "پرائی" ہو گیا تھا۔

پرائی بےفکر دل آور شاہ پرایا تھا۔

وقار آفندی کے لیے بھی اور آذر آفندی کے لیے بھی.....

آج سے ان کا علیزے پہ نہ کوئی حق تھا اور نہ کوئی اختیار.....

اور اس چیز کا اگر انہیں پتا چلتا تو یقیناً جیتے جی مر جاتے.....

کیونکہ اصل نکاح تو آج ہی ہوا تھا نا؟ اور اس اصل اور نقل کی حقیقت واقعی مار دینے کے لیے کافی تھی۔

♥

فجر کی پہلی اذان ہو رہی تھی جب علیزے اور دل آور شاہ، بتول شاہ کی ڈیڈ باڈی لے کر گھر پہنچے تھے اور ان کی ڈیڈ باڈی دیکھتے ہی بھی اور کل بھی بےبس سے رونے لگے تھے۔

لیکن دل آور کو کچھ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ کون رو رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے؟ کون چپ ہے اور کون تڑپ رہا ہے؟

خاموشی سے کسی روبوٹ کی طرح ایمبولینس سے اسٹریچر اُتار رہا تھا اور اسی ایمبولینس کی آواز پہ آس پاس کے کئی لوگ پریشانی کی کیفیت میں اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور پھر جس جس کو بھی بیرسٹر دل آور شاہ کی والدہ ہونے کے ناتے بتول شاہ کی ڈیتھ کا پتا چلا تھا سبھی نے بے حد افسوس کا اظہار کیا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے سب کے تعزیتی کلمات سن رہا تھا، حالانکہ مجھ کچھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ وہ سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ تو بس سن رہا تھا۔ سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی اس میں۔

اسی لیے ہسپتال میں بھی ساری بھاگ دوڑ گلاب خان نے اور ایس پی کامران مہدی نے ہی کی تھی، کیونکہ دل آور تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ وہ خود یہ ساری بھاگ دوڑ کر پاتا۔ اس لیے ہسپتال کی ساری کاغذی کارروائی ایس پی کامران مہدی نے خود مکمل کروائی تھی اور باقی کا چھوٹا موٹا کام گلاب خان نے سنبھال لیا تھا۔

"علیزے بی بی! میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں سب کے سامنے ٹھہرنا مناسب نہیں ہے، آپ فی الحال کمرے میں چلی جائیں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" گلاب خان نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے جو مشورہ دیا تھا وہ اتنا بُرا بھی نہیں تھا، کیونکہ خود علیزے نے بھی محسوس کیا تھا کہ کئی لوگ اسے بار بار دیکھ رہے تھے اور اسے اس چیز سے اُلجھن بھی ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے..... میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" علیزے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"گل! جاؤ علیزے بی بی کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔" گلاب خان نے گل کو آواز دی تھی، لیکن اندر کی سمت چلتی علیزے کے قدم رُک گئے تھے۔

"صاحب کے کمرے میں.....؟" علیزے کو بیسمنٹ کے بجائے بیڈروم کا سن کر حیرت ہوئی تھی اور کچھ عجیب بھی لگا تھا، کیونکہ یہ لفظ "صاحب" کا تھا۔

"جی..... بی بی جی! اب آپ اس گھر کی اور صاحب کے بیڈروم کی مالکن ہیں اور میں اس گھر کی مالکن کو بیسمنٹ میں بھیجنے کی گستاخی تو نہیں کر سکتا نا؟ لہٰذا اب آپ کی جگہ صاحب کے بیڈروم میں ہے، اس لیے اب آپ کو وہیں جانا ہوگا۔" گلاب خان نے بات کر کر ہلکا سا گھبرایا تھا، اس لیے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی اس کا دل آور شاہ کے بیڈروم میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا، اسے وہاں جانے کا حوصلہ ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

"لیکن پہلے تو.....؟" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"سمجھیے بی بی جی! آپ خود سیانی ہیں۔ خود سمجھ سکتی ہیں کہ پہلے کی بات اور تھی اور اب کی بات اور ہے پہلے وہ آپ کے لیے

غیر بھی تھے اور نامحرم بھی، لیکن اب وہ آپ کے مالک بھی ہیں اور محرم بھی، اب آپ ان کی عزت ہیں اور ان کی عزت آپ کا وہی مقام ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں اور یقیناً آپ سمجھ بھی گئی ہوں گی۔'' گلاب خان نے اسے سمجھانے کی پوری ایک دلیل دی تھی اور وقت کچھ ایسا تھا کہ مجبوراً علیزے کو سمجھنا ہی پڑا تھا اور چپ چاپ گل کے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ پھر یہ گلاب خان ہی تھا جس نے نبیل اور عبداللہ کو فون کر کے یہ ہولناک خبر سنائی تھی اور دونوں گہری اور پُرسکون نیند سے کراٹھے تھے بلکہ ان کے تو کانوں سے دھواں نکل گیا تھا وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ان کی کچھ ہو گیا ہے اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی؟

♥

بتول شاہ کی وفات کی خبر نبیل اور عبداللہ کی فیملی پہ بھی کسی بم کی طرح گری تھی۔

فائزہ بیگم، مدیحہ، مومنہ بی بی، نگارش اور زری کے ساتھ ساتھ اسکندر شہباز کی آنکھیں بھی بتول شاہ کی ناگہانی موت پہ پتھر تھیں بلکہ یہاں تک کہ نبیل اور عبداللہ بھی خود پہ اختیار نہیں رکھ سکے تھے، ان کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک آئے تھے اور دل مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے کر دونوں ہی رو پڑے تھے۔

کیونکہ بتول شاہ کی اچانک موت کا دُکھ انہیں دل آور سے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ دُکھی کر رہا تھا، مگر دل آور کی ہنوز پتھر بنا بیٹھا تھا۔

اس کی آنکھ سے تو ایک بھی اشک نہیں ٹپکا تھا۔ وہ آخر پتھر ہو چکا تھا اور پتھر سے اشک کیسے ٹپکتا؟ اس کے سامنے سب رو رہے تھے، مگر وہ خود کسی کے بھی سامنے نہیں رویا تھا..... لیکن اس کے آنسو کہاں گر رہے تھے یہ بات بھی جانتا تھا۔

سب کو معلوم تھا کہ غم کی شدت نے اسے پتھرا کے رکھ دیا ہے۔ اسی لیے تو ان سب کو زیادہ دُکھ ہو رہا تھا۔ مگر وہ سب اس کے دُکھ کو کم بھی تو نہیں کر سکتے تھے نا؟

حالانکہ دل آور شاہ کے اس دُکھ میں پورا شہر برابر کا شریک تھا، اس کے تمام کولیگز، سب جاننے والے اور تمام دوست احباب یہ خبر سنتے ہی اظہارِ تعزیت کے لیے پہنچ گئے تھے اور اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے واقعی پورا شہر وہاں امڈ آیا ہو۔ مگر دل آور کی نظر سے کوئی دیکھتا تو احساس ہوتا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ بس اتنے سارے لوگوں میں وہ اکیلا ہے۔ تنہا ہے۔ اپنا نہیں ہے سب پرائے ہیں سب غیر ہیں۔ سب دُعا سلام کے ساتھی ہیں۔

اس دُنیا میں اس کا صرف ایک خون کا رشتہ تھا اور آج وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور اسی ایک رشتے کے ختم ہونے کے غم نے اسے بنا دیا تھا اور وہ حقیقتاً کسی بت کی مانند جوں کا توں بس ایک ہی جگہ پہ بیٹھا ہوا تھا۔

♥

''لیکن پھوپھو! آپ کو ہوا کیا تھا؟ آپ اس طرح اچانک بیہوش کیسے ہو گئیں؟'' آذر کے ہوش میں آتے ہی آذر نے انتہائی تشویش بھرے انداز میں سوال کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ عائشہ آفندی کی آنکھوں کے سامنے پھر سے وہ منظر تازہ ہو گیا تھا اور بے ساختہ سسک اٹھی تھیں۔

''کیا بات ہے پھوپھو! آپ بتا کیوں نہیں رہیں؟ کیا ہوا تھا آخر؟'' آذر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

''مم..... میری زہرہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس وقت..... وہ..... وہ میرے آگے آگے روتی ہوئی مجھ سے دور جا رہی تھی لیکن..... پیچھے سے آنے والی گاڑی نے اسے..... بب..... بُری طرح کچل دیا تھا۔ اور وہ میری آنکھوں کے سامنے..... دیکھتے دیکھتے خون میں نہا گئی تھی اور..... لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا تھا۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا؟ اور کیا نہیں؟ مجھے تو کچھ خبر نہیں ہوا۔'' عائشہ آفندی بتاتے ہوئے رو رہی تھیں جبکہ آذر اور دانیال ششدر سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے

''زہرہ آنٹی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟ اوہ مائی گاڈ..... ہم لوگوں کو پتا بھی نہیں چلا۔'' آذر نے پریشانی سے سر تھام لیا تھا، ایسا ہی حال دانیال کا بھی ہوا تھا۔

''ہمیں کبھی بھی وقت پر کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ ہم ہمیشہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔'' عائشہ آفندی کا لہجہ ایک

کا سا ہو گیا تھا ان کے اندر شدید دُکھ اور آنسوؤں کا اُبال سا اُٹھ رہا تھا اور وہ انتہائی اونچی آواز میں تڑپ تڑپ کر رونا چاہ رہی تھیں مگر یہ ہسپتال تھا اور یہاں وہ اپنی یہ بے بس سی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھیں، انہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی صبر و ضبط سے ہی کام لینا تھا۔

"پلیز..... آپ..... آپ پریشان نہ ہوں پھوپھو! میں ابھی پتا کرواتا ہوں کہ کل اس روڈ پہ جس خاتون کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، وہ کہاں ہیں؟ اور کس ہسپتال میں ہیں؟ میں کوشش کرتا ہوں کہ ساری انفارمیشن مل جائے..... بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔" آذر ان کا کندھا تھپکتے ہوئے فوراً وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" دانیال نے اسے اُٹھتے دیکھ کر بے ساختہ پوچھا تھا۔

"مبارک خان کی طرف جا رہا ہوں۔ اسے بھیجتا ہوں آس پاس سے کچھ پتا کرنے کے لیے..... تمہیں پتا ہے نا اسی روڈ پہ تین چار اور ہسپتال بھی ہیں شاید انہیں وہاں ایڈمٹ کروا دیا گیا ہو۔" آذر اپنے قیاس کا گھوڑا دوڑاتے ہوئے واقعی زہرہ آئی کے ایکسیڈنٹ کے متعلق تمام معلومات لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"ہوں..... ٹھیک ہے جاؤ لیکن خود کہیں مت جانا..... تمہیں پتا ہے نا ڈیڈ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور ادھر امی بھی بیمار ہیں۔" دانیال نے اسے تاکید کی تھی اور آذر جواباً سر ہلا کر باہر نکل گیا تھا اور دانیال گردن موڑتے ہوئے دوبارہ عائشہ آفندی کی سمت متوجہ ہوا تھا کیونکہ وہ ابھی تک رو رہی تھیں۔

"امی پلیز..... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اور کتنا روئیں گی آپ؟ اس طرح تو آپ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔ پلیز سنبھالیں اپنے آپ کو ان شاء اللہ زہرہ آئی کے بارے میں ابھی پتا چل جائے گا۔" دانیال نے انہیں تسلی دی تھی مگر عائشہ آفندی کو اس وقت کوئی بھی ان تسلیوں پہ چپتے ہوئے۔ آخر اور کتنا صبر کرتیں؟

"کب پتا چلے گا اور کس کس چیز کا پتا چلے گا؟ مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ زہرہ مجھ سے دور کیوں ہو گئی تھی؟ اس نے پلٹ کر بھی خبر کیوں نہیں لی؟ وہ اگر مجھ سے خفا ہے تو کیوں خفا ہے؟ وہ میری آواز کیوں نہیں سنتی؟ وہ مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے؟ ایسا کیا ہے اس کے دل میں جس کا مجھے پتا نہیں ہے؟ آخر ایسا کیا ہے دانیال؟" وہ کہتے کہتے یکدم ہچکیوں سے رو پڑی تھیں اور دانیال نے انہیں اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر ان کا کندھا سہلایا تھا وہ آج خاصی نڈھال ہو رہی تھیں۔

♥

نہ خلاؤں میں مجھے ڈھونڈ تُو ، نہ ہی مقبروں میں تلاش کر
جو سجے ہوئے ہیں صلیب پر مجھے ان سروں میں تلاش کر
یہ الگ کہ خواہش زر نہیں ، میرا گھر نہیں ، میرا در نہیں
یہ تونگری ، یہ سکندری ، میری ٹھوکروں میں تلاش کر
وہ جو ایک کانچ کا شخص تھا اسے موسموں نے بدل دیا
اسے آئینوں میں نہ ڈھونڈ تُو ، اسے پتھروں میں تلاش کر

ذرا سا جھک کر بتول شاہ کے جنازے کو کندھے پہ اُٹھاتے ہوئے دل آور شاہ کے دل میں اک ہوک سی اُٹھی تھی اور پھر اس نے باہر کی سمت بڑھا دیئے تھے اس کے ساتھ بتول شاہ کے جنازے کو کندھا دینے والوں میں نبیل حیات، ملک عبداللہ اور عدیل قریشی سرِفہرست تھے۔ بتول شاہ کی سرخ پھولوں سے سجی ڈولی کے چاروں پائے انہوں نے اپنے کندھوں پہ تھام رکھے تھے۔ اور آہستہ آہستہ باہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

شام گہری ہو چکی تھی اور مغرب کی نماز کے بعد تدفین کا وقت تھا۔ اس لیے مغرب کی نماز ادا کرتے ہی لوگ بتول شاہ کی نماز جنازہ کے لیے جمع ہو گئے تھے لہٰذا اب ذرا دیر کے لیے بھی ٹھہرنا بہت مشکل تھا حالانکہ دل آور کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر قدم بھی رکھے لیکن کیا کر سکتا تھا آخر؟ انہیں روک بھی تو نہیں سکتا تھا نا؟

"کہاں....." وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ سیڑھیاں اُترتے اُترتے ٹھہر گئی تھیں۔

"کہاں کہو؟" وہ یونہی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ہوئے اس کی سمت مڑی تھیں اور وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کی چوکھٹ میں

کھڑا تھا۔

''میں آجاؤں آپ کے ساتھ؟'' اچانک اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہا تھا۔

''ارے نہیں میری جان! تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹ سے ملو، پھر بعد میں آجانا۔''

''لیکن اماں! میرا دل بہت اُداس ہے، میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں، باتیں کرنا چاہتا ہوں، کلائنٹ سے پھر مل لوں گا۔'' دل آور نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

''تمری بات بیٹا! کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت پہ کام کرنے کے عادی ہو، تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔ شاباش تم آفس جاؤ۔ پھر وہاں سے ہسپتال آجانا۔'' وہ کہہ کر اس کو زمی سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر ریسٹ ہیوس گئی تھیں اور دل آور ایک بار پھر لپک کر ریسٹ ہیوس کی ریلنگ کے قریب آیا تھا۔

''آپ جا رہی ہیں؟'' اس نے عجیب بے کل سے انداز میں بے تکا سا سوال کیا تھا اور بتول شاہ راہداری کی سمت بڑھتے ایک بار پھر رُک گئی تھیں اور سر اُٹھا کر ریسٹ ہیوس کی ریلنگ کے قریب کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

''ہاں..... جا رہی ہوں..... کیوں..... کوئی کام ہے کیا؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہاں..... کام تو بہت سے ہیں، مگر فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتہ کیا ہے یا نہیں؟'' اس نے دبے سنجیدہ انداز میں پوچھا تھا اور بتول شاہ اس کی اس قدر فکرمندی پہ اسے دیکھ کے رہ گئی تھیں۔

''نہیں..... میں نے ناشتہ نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے، لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔'' انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہلایا تھا۔

''ہوں..... ٹھیک ہے میں بھی ناشتہ نہیں کرتا، لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔ اوکے؟'' اس نے بھی جواب کے سے انداز میں جواب دیا تھا، جس پہ بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔

''شاہ..... یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گے یا نہیں؟'' وہ کافی خفگی سے بولی تھیں اور دل آور کو ذرا پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔

''اوکے..... اب کچھ نہیں کہتا جائیں آپ۔'' اس نے ان کے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔

''لیجیے آ کر ناشتہ کر لو اور آفس جاؤ، اللہ حافظ۔'' وہ پھر اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل آور پھر سے مطمئن تھا۔ اس کا دل پھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔

''اماں.....'' دل آور کے ہونٹ بے ساختہ ذرا سے کپکپائے تھے اور دل پہ جیسے کربلا کا عالم چھا گیا تھا۔ کیونکہ گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی اس کا دل دھاڑیں مار مار کے رویا تھا اور اِدھر علیزے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی بہت تڑپی تھی۔ اس نے کئی بار بتول شاہ سے ملنے کی اور ان کا چہرا دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اس کی اس کوشش کے آڑے گل آ گئی تھی۔ اس نے اسے نکلنے سے روک دیا تھا۔

''نہیں بی بی جی! آپ کا اس طرح سب کے سامنے باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے ہی گھر پہ قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ آپ سب کے سامنے جائیں گی تو سب طرح طرح کے سوال کریں گے اور صاحب تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ کس کس کو جواب دیں گے؟'' گل نے خود بھی سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن گل وہ..... وہ جا رہی ہیں..... میں..... ان سے پھر کبھی نہیں مل سکوں گی۔ پلیز..... مجھے ایک بار..... صرف ایک بار سے مل لینے دو۔ میں چادر اوڑھ لیتی ہوں۔ چہرا ڈھانپ لیتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ پلیز گل! کی کوشش کرو۔'' علیزے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تڑپی تھی۔ کیونکہ سب مرد حضرات جنازہ لے کر گیٹ سے جا چکے تھے۔ لیکن کچھ عورتیں، کچھ لڑکیاں تھیں جو گیٹ کے قریب کھڑی ابھی بھی رو رہی تھیں۔ علیزے کے لیے بے شک وہ سب چہرے تھے۔ لیکن گل انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی لیے وہ نارمل تھی۔

''بی بی جی! میں سب سمجھتی ہوں۔ بس آپ کے سمجھنے کی ضرورت ہے اور ویسے بھی اب وہ لوگ جا چکے ہیں۔ آپ اس طرح ہلکان مت کریں۔ آپ آرام کریں میں باہر جا رہی ہوں۔ ابھی مہمانوں کو بھی دیکھنا ہے۔ آپ کے پاس بعد میں

مدیحہ نے روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے دل آور کا کندھا ہلایا تھا اور دل آور نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور پھر سر جھکائے بیٹھا آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ تھپکنے لگا تھا جیسے اسے تسلی دے رہا ہو، لیکن زبان سے پھر بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے گا تو اس کے سارے ضبط ٹوٹ جائیں گے اور سارے حوصلے بکھر جائیں گے اور پھر وہ سب کی لاکھ کوششوں سے بھی سمٹ نہیں سکے گا۔ اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ وہ اپنے صبر و ضبط پہ قائم رہتا اور اپنے حوصلے بکھرنے نہ دیتا اور اب اس سوچ پہ دنگ تھے کہ وہ بکھرا کیوں نہیں؟ اور وہ ٹوٹا کیوں نہیں؟ آخر یہ غم کی انتہا تھی یا پھر غم کے صبر کی انتہا تھی کہ اس نے اپنی زبان کے لفظ اور آنکھوں کے آنسو پتھر کر دیئے تھے اس کی زبان سے یہ لفظ نکلے تھے اور نہ آنکھ سے آنسو۔

بس سب کچھ بے حس اور جامد ہو چکا تھا سب کی کوشش تھی کہ اس کی چپ کو توڑا جائے۔

"بھائی! کیا آپ نے بھی نہیں بولنا، کیا اب بھی کچھ نہیں کہنا؟ کیا میری خاطر بھی نہیں؟" مدیحہ کے کہتے کہتے آنسو بہہ نکلے تھے اور دل آور نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اپنے بائیں پہلو میں بیٹھی سسکیوں سے روتی مدیحہ کی طرف دیکھا تھا وہ صبح سے مسلسل رو رو کر حال ہو چکی تھی اور چہرا بھی کافی مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا جسے دیکھ کر دل آور کا دل بھی پگھل گیا تھا وہ واقعی اس وقت اس کے آنسوؤں برابر کی شریک لگ رہی تھی۔ اسی لیے دل آور نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگایا تھا اور مدیحہ پچکیوں سے رو پڑی تھی۔

"بس کرو مدحو! چپ ہو جاؤ اور کتنا روؤ گی؟ پلیز مجھے تکلیف مت دو، میں ہینڈل کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" دل آور نے مدیحہ کا سر تھپتھپاتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کی تھی اور لاؤنج سے نکل کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی زرمی کے قدم ٹھٹک کر رہ گئے تھے اس نے صبح سے لے کر اب تک دل آور کو کچھ بولتے یا کچھ کہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن اب وہ کچھ کہہ رہا تھا تو صرف مدیحہ سے اور مدیحہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"مدحو پلیز..... چپ ہو جاؤ ورنہ..... ورنہ میں ایسا بکھر جاؤں گا کہ کوئی سمیٹ بھی نہیں سکے گا۔ پلیز مجھے میرے اختیار میں رہنے دو۔" دل آور کا لہجہ بہت کمزور ہو رہا تھا اور زرمی اس کے کمزور لہجے پہ خود بکھرنے لگی تھی، اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ شاید یہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا، لیکن جو بھی تھا آج واقعی دل آور شاہ کے دکھ پر ہر آنکھ پرنم تھی، ہر آنکھ میں آنسو تھے، ہر دل میں درد تھا۔ کیونکہ اس کا درد سب نے گہرائی میں جا کر محسوس کیا تھا۔

"سر! ہمیں بھی اب اجازت....." عدیل اور شہریار اچانک ہی زرمی کے ساتھ اندر آ گئے تھے لیکن اندر کا روتا بلکتا منظر دیکھ کر قدم وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور انہیں شرمندگی ہوئی تھی کہ وہ غلط وقت پہ آ گئے ہیں۔

"اندر آ جاؤ عدیل باہر کیوں رک گئے ہو؟" دل آور ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اسی لیے انہیں آنے کا کہا تھا اور مجبوراً عدیل اور شہریار کو اندر آنا ہی پڑا تھا۔

"سر! کافی ٹائم ہو چکا ہے، ہمیں اب اجازت دیں آپ سے ان شاء اللہ صبح ملاقات ہو گی۔" عدیل نے دل آور کے کندھے سے لگ کے روتی ہوئی مدیحہ کو پھٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر نظریں جھکا لی تھیں۔ آخر وہ دل آور شاہ کے سامنے اس کے نظر نیچی کی جرأت کیسے کر سکتا تھا؟

"کھانا وغیرہ کھایا؟" دل آور نے مختصر سے انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں سر! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب نے تو بہت اصرار کیا ہے، مگر ہمیں فی الحال بھوک نہیں ہے اس لیے کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" عدیل نے نفی میں سر ہلایا تھا اور خود دل آور بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ وہ مزید اصرار کرتا اور کھانا کھانے کے لیے کہتا۔ اس لیے اس کی حالت کے پیش نظر ہی عدیل وغیرہ نے اس سے جلدی اجازت چاہی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔

اسی طرح رفتہ رفتہ سبھی مہمان باری باری رخصت ہو گئے تھے، البتہ نبیل اور عبداللہ نے آج رات اس کے پاس ہی ٹھہرنے کی پیشکش کی تھی، لیکن دل آور نے انہیں منع کر دیا تھا۔

کیونکہ وہ دونوں بے حد تھکے ہوئے تھے، پہلے نبیل کے گھر دعوت، پھر صبح اٹھ کر کراچی جانا، پھر پورے دن کی بھاگ دوڑ، پھر

ہوٹل میں رات گزارنے کے بعد افراتفری میں دوبارہ لاہور واپسی اور پھر یہاں آکر بھی ان دونوں نے ہی سب سنبھالا تھا۔ اب ضروری تھا کہ وہ دونوں اپنے گھر جاتے اور سکون سے آرام کرتے۔ کیونکہ بے سکونی اور نیند پوری نہ ہونے سے کسی کی بھی طبیعت خراب ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور نے انہیں یہاں رُکنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ یہاں رہ کر وہ بھی اس کی وجہ سے سکون کی نیند نہیں سو سکتے تھے، لہٰذا یہی بہتر تھا کہ وہ گھر چلے جاتے۔

''عبداللہ چلا جاتا ہے، لیکن میں رُک جاتا ہوں، ڈونٹ وری۔ مام اور مدیحہ آسانی سے رو لیں گی اور ویسے بھی اب تو سونیا بی بھی ہے ان کے ساتھ۔'' نبیل اسے تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''عبداللہ پلیز یار! سمجھاؤ اسے کتنی دیر اور کتنے دن رُکو گے میرے ساتھ؟ آج..... کل..... پرسوں..... ہفتہ..... دو ہفتے..... مہینہ..... دو مہینے..... سال..... دو سال..... آخر کب تک رُکو گے؟ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میں نے تنہا ہی رہنا ہے کوئی بھلا کب ساتھ دے سکتا ہے؟ اور جب کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر صرف ایک دن کے لیے یا پھر ایک رات کے لیے کیوں؟ یہ رات بھی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے ابھی تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی اور بس.....'' دل آور نبیل کی ضد پہ جھنجلا کر اتنا تلخ ہو گیا تھا کہ نبیل نے دوبارہ کچھ بھی نہیں کہا تھا اور اس سے ہاتھ ملا کر عبداللہ وغیرہ کے ساتھ ہی وہاں سے چلا گیا تھا، لیکن نبیل اس طرح جانا بھی دل آور کے دل پہ بوجھ چھوڑ گیا تھا اور اس کا ذہن اور زیادہ اپ سیٹ ہو گیا تھا اور وہ وہیں کاؤچ کے پاس ہی کھڑا رہ گیا تھا جسے کافی دیر بعد گلاب خان نے آکر متوجہ کیا تھا۔

''صاحب! باہر کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے آپ یہ چادر اوڑھ لیں موسم اچھا نہیں ہے آپ بیمار پڑ جائیں گے۔'' گلاب خان اس کے کالے رنگ کی گرم چادر لے کر اس کے قریب آ گیا تھا اور چادر کی تہ کھول کر اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دی تھی اور دل آور نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے قدم اندر کی سمت موڑ لیے تھے اور گلاب خان نے گیٹ بند کر دیا تھا۔

''صاحب! آپ کے لیے چائے لے کر آؤں؟'' وہ اندر آ کر ڈرائنگ روم کے پٹوں سے ٹیک لگا کر کھڑا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جب گل اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے کل سے کھانے کا ایک ذرہ بھی زبان پہ نہیں رکھا اتنے گھنٹوں سے مسلسل بھوکا بھی ہے اور پیاسا بھی اور اس کے سب دوست وغیرہ بھی جا چکے ہیں۔ ایسے میں اسے کھانے کے لیے بھلا کون کہے گا؟ اور کون پوچھے گا اس سے؟ اس لیے یہ ہمت گل نے خود ہی کر لی تھی۔

لیکن دل آور کو آج بھلا کسی چیز کی کب طلب تھی آج تو جیسے اس کی پوری ہستی اور پوری ذات ہی مر چکی تھی۔ وہ تو بس خالی کھوکھلا اور خواہشوں سے عاری وجود لیے ہی کھڑا تھا اور تو کچھ بھی باقی نہیں تھا۔

''آپ کہتے ہیں تو کافی بنا لیتی ہوں۔'' گل نے پھر سوال بدل کر دہرایا تھا۔

''نہیں..... کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔ تم جاؤ آرام کرو جا کر تم بھی تھک گئی ہو گی۔''

دل آور نے آہستگی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے اسے جانے کا کہا تھا اور خود جتوں شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ گل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے، دل آور کو یوں تھکے تھکے اور خالی خالی سے انداز میں تنہا جتوں شاہ کے بیڈ روم میں جاتے دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آ گیا تھا اور وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور دل آور جتوں شاہ کے بیڈ روم میں آ گیا تھا جہاں سب کچھ ابھی ابھی تازہ تھا جیسے وہ بیڈ روم سے ابھی ابھی تیار ہو کر باہر نکلی ہوں اور ان کے لیڈی پرفیوم کی فریب سی مہک بیڈ روم کی فضا میں ابھی بھی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''شاہ! کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟'' اک سرگوشی نما سرسراہٹ دل آور کی سماعتوں کو چھو کے گزر گئی تھی اور اس نے بے ساختہ پورے بیڈ روم میں ادھر اُدھر دیکھا تھا اور بیڈ روم کو خالی پا کر پھر سے دل بھر آیا تھا۔

''صاحب! اب آپ بھی آرام کر لیں نا دیکھیں بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔'' گلاب خان بھی اس کی خاطر ابھی تک جاگ رہا تھا کیونکہ جب تک وہ نہ سو جاتا، ان لوگوں کو بھی بھلا کب سکون تھا؟ اور دل آور نے بڑے حوصلے اور ضبط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپن پیچھے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

''صاحب! ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کا دکھ، آپ کا غم بہت بڑا ہے اور اس دکھ کا اور اس غم کا کوئی مداوا بھی نہیں ہے لیکن یہ دکھ اور یہ غم ایسا ہے کہ ہر کوئی اپنے سینے میں لیے پھر رہا ہے، زندگی میں ہر کسی کو یہ چوٹ لگتی ہے، ہر کسی کو یہ درد سہنا پڑتا ہے،

ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے اور ماں باپ کے مر جانے سے اولاد مر نہیں جاتی یہ زندگی ہے اور زندگی چلتی ہی رہتی ہے کسی کے چلے جانے سے زندگی رُک نہیں جاتی، ہاں دل میں دُکھ ضرور رہ جاتا ہے اور دُکھ تو ہمیشہ انسان کی زندگی کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ بس انسان کو حوصلہ رکھنا چاہیے اور مجھے پتا ہے کہ آپ کا حوصلہ اور آپ کا صبر بہت بلند ہے۔ آپ بہت مضبوط ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن آپ کو اپنا بھی خیال رکھنا چاہیے کیونکہ آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟'' گلاب خان نے بڑے مدبرانہ اور دوستانہ سے انداز میں دل آور کو سمجھانے کی اور ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی جس پہ دل آور محض سر ہلا کر چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

''صاحب! آپ اس وقت اپنے کمرے میں جائیے، آرام کیجیے، یہ دُکھ تو اب ہمیشہ ساتھ ہی رہے گا۔'' گلاب خان آگے بڑھ کے کندھے سے تھام کے باہر لے آیا تھا اور بتول شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

''آپ دو گلاب خان! میں خود چلا جاؤں گا۔'' اس نے سیڑھیوں کے قریب آ کر گلاب خان کے سہارے کے بجائے ریلنگ تھام لی تھی۔

''ٹھیک ہے آپ جائیں آرام کریں۔'' گلاب خان آہستگی سے پیچھے ہٹ گیا تھا اور دل آور بمشکل قدم اُٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

''صاحب جی! وہ..... وہ آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' گلاب خان کو اچانک کچھ یاد آیا تھا اور دل آور کے قدم رُک گئے تھے اس نے پلٹ کر گلاب خان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''صاحب جی! مجھے نہیں پتا کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ اور آپ کے دماغ میں کیا ہے؟ لیکن جو میرے دل میں تھا اور جو میرے دماغ میں تھا میں نے وہی کیا ہے اگر آپ کو ناگوار گزرے تو معافی چاہتا ہوں، لیکن میں نے علیزے بی بی کا اور آپ کا رشتہ کبھی ہوس انہیں دسمبر میں بھیجنے کے بجائے صبح آپ کے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا کیونکہ میرے خیال اور میری عقل کے حساب سے دیکھا جائے تو اب وہی ان کی اصل جگہ ہے۔ اور اصل مقام ہے جس میں آپ کی بھی عزت ہے اور ان کی بھی عزت ہے۔ اس لیے علیزے بی بی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے اگر کچھ کہنا ہے تو مجھے کہیں..... میں آپ کی ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔'' گلاب خان نے دل آور کے بیڈ روم میں جانے سے پہلے علیزے کی وہاں موجودگی کا مسئلہ کلیئر کر دینا بہتر سمجھا تھا۔

''سزا.....'' دل آور نے زیر لب دہرایا تھا۔

''جی ہاں صاحب جی سزا..... کیونکہ آپ مالک ہیں اور میں ملازم ہوں اور میں نے ایک ملازم ہو کر آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت کیا ہے۔ آپ کی اجازت کے بغیر یہ قدم اُٹھایا ہے حالانکہ میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ میں ایسا کچھ کروں۔ اس لیے آپ کو پورا حق ہے کہ آپ مجھے سزا دیں یا مجھ پہ غصہ کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں حاضر ہوں۔'' گلاب خان اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا جبکہ دل آور کے دل و دماغ پہ کچھ اور ہی چل رہا تھا۔

کہاں اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں؟'' وہ لپک کے پاس آیا تھا۔

تکلیف..... کم ہو سکتی ہے..... اگر..... اگر..... تم..... کرو..... تو.....'' بتول شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی خواہش کی تھی مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

''ہاں..... ہاں..... میں کروں گا..... ضرور کروں گا..... آپ کہیں کیا بات ہے؟'' اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا اور ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

''میں..... میں..... نے..... آج..... وقار..... آفندی..... کی حالت..... دیکھی ہے..... وہ..... وہ..... اپنی..... اسی..... دُنیا..... میں..... بھ..... بگت..... چکا..... ہے..... تت..... تم..... اب..... علیزے..... سے..... کو..... میرا..... دو..... میرا..... خدا..... گواہ..... ہے..... میں نے..... آج..... وقار..... آفندی..... کو معاف کیا..... معاف کیا میں نے.....''

بتول شاہ کے الفاظ سے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل آور شاہ تو جیسے کھڑے قد سے ڈھے گیا تھا اور کھڑے قد سے گرنے والے دل آور شاہ کے دل و دماغ پہ اب یہی آواز بار بار بازگشت کر رہی تھی۔

''میرا..... خدا..... گواہ..... ہے..... میں نے..... آج..... وقار..... آفندی..... کو..... معاف کیا..... معاف کیا میں نے.....''

''معاف کیا میں نے.....''

''معاف کیا میں نے.....''

وہ گلاب خان سے کچھ بھی کہے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا، لیکن ذہن میں وہ الفاظ مسلسل تکرار کر رہے تھے۔

اس کے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے اور ایک ایک سیڑھی ایک ایک صدی کی مسافت پہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی سیڑھیاں چڑھتے نیچے گر جائے گا کیونکہ اس کے قدموں میں ذرا بھی توازن نہیں تھا وہ کسی بھی وقت اپنا توازن کھو دیتا تھا اور اس کے قدم کسی بھی وقت لڑکھڑا سکتے تھے اسی لیے تو اس نے سیڑھیوں کی ریلنگ تھام رکھی تھی اور اسی لیے تو گلاب خان پیچھے کھڑا اسے چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

♥

کل کا پورا دن گزر گیا تھا اور کل کی پوری رات گزر گئی تھی۔

آج کا پورا دن گزر گیا تھا اور آج کی آدھی رات گزر گئی تھی اور وہ دل آور کی طرح مسلسل بھوکی اور پیاسی بیٹھی ہنوز جاگ رہی تھی اور جل رہی تھی، چین ایک پل نہیں تھا۔

وہ بیڈ سے کھڑکی تک اور کھڑکی سے بیڈ تک نجانے کتنے ہی چکر کاٹ چکی تھی، جن سے یوں لگ رہا تھا جیسے پاؤں کے تلوے بھی شل ہو گئے ہوں اور آخر کار یہ شل ہوئے تلوے بھی جواب دے گئے تھے اور وہ تھک ہار کے نڈھال سی ایک بار پھر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ انور ابھی اسے بیڈ پہ بیٹھے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اچانک دروازے پہ آہٹ سی سنائی دی اور اگلے چند سیکنڈ میں دروازے کا ہینڈل گھما کر وہ اندر داخل ہوا تھا اور علیزے اسے دیکھ کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔

بے شک جو بھی تھا۔ دن جیسے بھی گزر گیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اسے اپنے سامنے اور اپنے ساتھ ایک ہی بیڈ روم میں دیکھ کر ''خاک'' ہو گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ برف کی مانند سرد پڑ چکے تھے اور وہ بوجھل اور مضمحل سے دل آور کو اپنی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بڑی بے تاثر اور سپاٹ سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے غیر متوازن اور ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے اس سے نظریں چراتے ہوئے سر جھکا لیا تھا جبکہ اس کے سامنے کھڑا مضبوط پہاڑ نما دل آور شاہ اپنے اندر کے دکھ کی دیمک سے بھربھری ریت کی طرح بکھر گیا تھا۔

''علیزے.....'' وہ ہارے ہوئے انداز میں علیزے کے سامنے قالین پہ دوزانو بیٹھے ہوئے اس کی گود میں منہ چھپا کر رو پڑا تھا اور علیزے جو پہلے ہی خاک ہوئی بیٹھی تھی اس کے اس طرح بکھرنے پہ خود بھی بکھر گئی تھی۔

وہ ساکت و صامت سی اپنی گود میں منہ چھپائے انتہائی شدت سے روتے ہوئے دل آور شاہ کو دیکھ رہی تھی، کیونکہ اس نے دل آور شاہ کو اتنے ہارے ہوئے اور اتنے شکستہ روپ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مگر آج اس کا دکھ واقعی اتنا بڑا تھا کہ وہ ٹوٹ گیا تھا..... بکھر گیا تھا..... اور وہ ٹوٹ کے بکھرا بھی تھا تو کس کے پاس؟ علیزے، دل آور شاہ کے پاس..... جو اسے سمیٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ جو اسے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔

''علیزے! آج دل آور شاہ مر گیا..... مر گیا آج دل آور شاہ..... آج میں زہرہ بتول شاہ کو نہیں، دل آور شاہ کو دفن کر کے آیا

PAKISTAN URDU NOVELS

...آج تمہیں دل آور شاہ کو قبر میں اُتار آیا ہوں۔ مٹی ڈال آیا ہوں دل آور شاہ پہ..... آج مٹ گیا دل آور شاہ آج سچ مچ مٹ گیا۔"

وہ بہت بُری طرح رو رہا تھا اور علیزے اتنے مضبوط اور اونچے پورے مرد کو اپنی گود میں منہ چھپا کے روتے ہوئے دیکھ کر عجیب سی ہونے لگی تھی۔ اس کا دل بھی رونے لگا تھا۔ کچھ اس کے دُکھ پہ..... کچھ اپنے دُکھ پہ.....

"میری تمہیں سالہ زندگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور باپ کیا ہوتا ہے؟ بس مجھے اتنا پتا ہے کہ زہرہ جون شاہ کیا ہوتی ہے؟"

"علیزے! وہ صرف میری ماں ہی نہیں تھیں۔ بلکہ..... وہ..... وہ تو میرے لیے باپ بھی تھیں..... وہ میری زندگی..... اور میری کل کائنات تھیں..... میرا سب کچھ وہی تو تھیں..... میں جو کچھ بھی تھا صرف انہی کے دم سے تھا..... اب وہ نہیں ہیں تو میں بھی اب کچھ نہیں ہوں..... مگر دُکھ اس بات کا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی کوئی سکھ نہیں دیکھا..... کوئی خوشی نہیں پائی..... پہلے زندگی نے انہیں برسر کر دی..... اور اب قبر کو گھر بنا لیا ہے..... اور میں..... ہمیشہ کا بدنصیب..... ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکا..... کچھ بھی نہیں؟"

ہمیشہ سب کے لیے آن بان اور شان سے رہنے والا آج علیزے کے سامنے یوں بکھر رہا تھا، یوں ٹوٹ رہا تھا جیسے وہ اس کی ذات کا آئینہ تھی، اس کی ذات کا عکس تھی، اس کی ذات کا حصہ تھی جس کے سامنے ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے اسے کوئی شرم نہیں تھی اور نہ کوئی عار نہیں تھا۔ پورا دن کسی کے بھی سامنے اس کی آنکھ سے آنسو تک نہیں ٹپکا تھا اور یہاں وہ یوں لگ رہا تھا جیسے پوری زندگی کی کسر پوری کر دے گا۔

"ڈرائیور....." علیزے اس کی ایسی حالت اور ایسی کیفیت برداشت نہیں کر پا رہی تھی اس نے بے حد آہستگی سے اور رندھی ہوئی آواز سے اسے پکارا تھا۔ اس کے اپنے آنسو بھی بہہ رہے تھے اور کچھ نہ سہی، لیکن جتول شاہ کا دُکھ تو اسے بھی تھا وہ بھی کل رات سے ان کے لیے بہت زیادہ روئی تھی۔ اس کا دل بھی موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

"علیزے! وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہیں مجھے..... مجھے کر گئی ہیں مجھے، میں تنہا ہو گیا ہوں آج، بالکل تنہا اتنی بڑی دُنیا میں اور اتنے سارے دوستوں میں بھی تنہا ہو گیا ہوں۔ آج میرے سارے رشتے ختم ہو گئے ہیں..... سارے رشتے....." دل آور کی آواز حد سے زیادہ بھاری ہو رہی تھی۔

علیزے کو تو یہ سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کوئی حرف تسلی کہے بھی تو کیسے؟ وہ سدا کی معصوم اور سدا کی نادان..... اسے تو سمجھ ہی نہیں تھا کہ ایسی رنجیدہ اور دلخراش صورتحال میں کیا کہنا چاہیے؟ اور کیسے پیش آنا چاہیے؟ اس جھلتے ہوئے وقت اور احساس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اتنا کیا تھا کہ اپنا لرزتا کپکپاتا ہوا ہاتھ اُٹھا کر بڑے حوصلے اور بڑے صبر کے ساتھ دل آور کے بالوں پہ رکھ دیا تھا۔

"ڈرائیور! پلیز مت رو۔ بس کرو اس روز میں رو رہی تھی اور تمہیں مجھ پہ رشک آ رہا تھا لیکن آج نجانے کیا بات ہے کہ تم رو رہے ہو اور مجھے تم پہ رشک نہیں آ رہا بلکہ رونا آ رہا ہے کیونکہ میں جانتی ہوں تم اس وقت تنہا ہو، واقعی تنہا ہو اور تنہائی انسان کے لیے بہت اذیت ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن مار دیتی ہے۔ جیسے مجھے مار دیا ہے اس تنہائی نے۔" علیزے خاصے بھرائے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی اور اس کے آنسو دل آور کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ انہی بالوں میں جن میں علیزے کے ہاتھ کی دو دھیا نازک قوسیں انگلیاں دل آور کے لیے ایک تسلی بن کے سرک رہی تھیں اور دل آور اس تسلی کے باوجود بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا اس کے ذہن میں جتول شاہ کا ہی خیال بھٹک رہا تھا۔ اس کی سوچ وہیں پہ اٹکی ہوئی تھی۔ وہ وہیں پر منجمد ہوا لگ رہا تھا۔

"علیزے! اگر تنہائی کا یہ زہر تمہیں یا مجھے مار سکتا ہے تو پھر سوچو کیا یہ زہر انہیں نہیں مار سکتا تھا؟ انہوں نے بھی تو پوری زندگی تنہا گزاری ہے، اک عمر تنہائی کاٹی ہے انہوں نے..... اور آج بھی وہ تنہائی چلی گئیں اور..... اور مجھے بھی تنہا کر گئی ہیں..... علیزے..... تمہیں نہیں پتا کہ میں کتنا تنہا ہوں؟ کتنا تنہا....."

دل آور نے علیزے کے ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پہ رکھ لیے تھے اور اس کے رُخساروں پہ آنسوؤں کی نمی اور شیو کی چبھن علیزے کو اپنی ہتھیلیوں میں محسوس ہوئی تھی اور اس نے کسمسا کر اپنے ہاتھ پیچھے ہٹانے چاہے تھے، مگر دل آور کی گرفت اب اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ ہاتھ چھڑاتی اور اس سے ہاتھ چھوٹ جاتے۔

''تم..... میں تمہارے لیے چائے بناؤں ڈرائیور؟'' علیزے کو اس کے سامنے سے اٹھنے کا اور کوئی بہانا نہیں سوجھا تھا۔

''نہیں..... مجھے کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔ نہ بھوک ہے، نہ پیاس ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اپنے چہرے سے نیچے کر لیے تھے اور پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑے چھوتے ہوئے انہیں یوں جوڑ دیا تھا جیسے وہ دُعا مانگ رہی ہو اور اس دُعا کے انداز میں جوڑے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ غریب سی لڑکی مسکرا دیا تھا۔

''کاش..... تم نے میرے مرنے کی دُعا دل سے کی ہوتی علیزے! تو آج شاید میں مر ہی چکا ہوتا؟'' اس نے علیزے کے ہاتھ آہستگی سے جھٹک دیے تھے اور علیزے کا چہرا اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''لیکن..... بگڑا اب بھی کچھ نہیں۔ دُعا تو تم اب بھی کر سکتی ہو۔ میرے پاس بھی اب کچھ نہیں رہا جینے کے لیے۔ ہاں اب میرے مرنے سے اب یہ فرق پڑے گا کہ تم بیوہ کہلانے لگو گی۔ ''دل آور شاہ کی بیوہ'' اور مجھے پتا ہے تمہیں اس لفظ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ خوشی محسوس ہو گی اور میں تمہیں خوش ہی تو کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا اور علیزے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس کے حواس واقعی اڑے ہوئے تھے اس کی باتوں میں بے ربطی آ گئی تھی۔

''ڈرائیور..... یہ..... یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو؟'' علیزے کو حیرت ہوئی تھی۔

''ہونہہ..... کچھ نہیں.....'' وہ سر جھٹک کر اس کے سامنے سے اٹھ گیا تھا اور علیزے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہاتھوں کو اور اپنے دامن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ وہاں سے اٹھ کر راکنگ چیئر پہ جا بیٹھا تھا اور پلکیں موند کر پھر سے بتول شاہ کے لیے پھیلنے لگا تھا اور علیزے راکنگ چیئر جھولتے دل آور کو چند سیکنڈ یونہی دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر وہاں سے باہر آ گئی۔ اس گھر میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے سے پہلے اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ کچن کہاں ہے وہ سیدھی کچن میں جا پہنچی۔

اس کا ارادہ چائے بنانے کا تھا حالانکہ اس نے آج تک کبھی بھی چائے نہیں بنائی تھی، لیکن آج دل آور کی حالت کو مدنظر رکھ کر بے ساختہ ہی اس نے چائے بنانے کا سوچا تھا اور وہ اس سوچ پہ عمل پیرا بھی ہو گئی تھی۔

اس نے چند روز پہلے گل کو چائے بناتے ہوئے دیکھا تھا وہ دیکھتا ہی اس کے کام آ گیا تھا اور اس نے سب کچھ اندازے کے آخر کار چائے بنائی تھی اور پھر واپس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ جس طرح ہوا کے جھونکے کی طرح گئی تھی۔ اسی طرح واپس بھی آ گئی تھی۔

''ڈرائیور.....'' اس نے قریب آ کر آہستگی سے پکارا تھا، لیکن وہ یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا تھا۔

''ڈرائیور.....'' اس نے دوبارہ اسے پکارا۔

''ہوں.....'' اس نے بمشکل ''ہوں'' میں جواب دیا تھا۔

''چائے.....'' علیزے کی آواز رندھی پڑ گئی تھی جبکہ دل آور نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں وہ اس کے سامنے چھوٹی سی ٹرے میں چائے کا کپ لیے کھڑی تھی اور اس کو اس روپ میں دیکھ کر دل آور اپنی پوری ہستی سے ششدر سا رہ گیا تھا اور اس کے ہونٹ آہستگی سے کپکپائے تھے۔

''بیوی.....'' اس کے اعصاب یکدم جھنجھنا اٹھے تھے۔

♥

کیونکہ یہ لفظ اور یہ خیال اس کے دماغ پہ کسی چابک کی طرح پڑا تھا اور وہ جیسے بلبلا کے رہ گیا تھا۔

نجانے کیوں اسے اس لمحے بڑا عجیب سا لگا تھا اور بڑی تکلیف بھی ہوئی تھی۔

شاید اپنے آپ پہ..... یا شاید علیزے کی ذات پہ.....

لیکن جو بھی تھا یہ ان کی زندگی کا ایک بہت ہی عجیب ترین موڑ تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے بے بس و بے اختیار کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ان کی اتنی ''نفرت اور نہیں'' کے باوجود

ہی ہوئی چکا تھا اس لیے اب کچھ کہنے اور کرنے کے لیے تا تھا ہی نہیں۔
بس اب تو وہ دونوں تھے اور ان کی اجنبیت تھی۔
اور اب جو بھی کرنا تھا اسی اجنبیت کی دیوار کے آر پار رہ کر ہی کرنا تھا۔ ورنہ اور تو کوئی حل ہی نہیں تھا زندگی کو سہل کرنے کے

شاید اسی لیے دونوں کو شعور آ گیا تھا کہ اب زندگی گزرنے کی طرز کیا ہوگی؟ اور طریقہ کیا ہوگا؟ دُکھ کی بھٹی میں دونوں ہی جلے تھے اس لیے صبر بھی دونوں کو ہی آ چکا تھا، دونوں ہی صابر ہو چکے تھے اور آج اس لمحے سے دونوں پہ ہی اور اک ہو چکا تھا کہ اب زندگی "یہی" ہے اور اسے ہی قبول کرنا ہے۔
چاہے دل مانے..... چاہے نہ مانے.....
"ویٹر ایئر! چائے۔" اس نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا تھا۔
"ہوں..... رکھ دو۔" وہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے آگے بڑھ کے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور خود پلٹ گئی تھی۔
"تھینک یو....." دل آور کی نظریں ٹیبل پہ رکھے چائے کے کپ پہ تھیں اور شکریہ علیزے کا ادا کر رہا تھا۔ علیزے نے ٹھٹک کر گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا وہ بیری خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا اور علیزے اسے اک نظر دیکھ کر صوفے پہ جا بیٹھی تھی کیونکہ اب اس میں اتنی ہمت اور اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے دوبارہ جا کر بیڈ پہ بیٹھ جاتی۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی اس بیڈ سے بڑی مشکل سے اٹھی تھی اب دوبارہ جا کر بیٹھنا تو ممکن ہی نہیں تھا۔
"سو جاؤ۔" اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے گمبھیر اور بوجھل سے لہجے میں کہا تھا۔
"نیند نہیں آ رہی۔" علیزے نے اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے انتہائی آہستگی سے جواب دیا تھا۔
"کیوں..... تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی؟" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"نرم بستر پہ سونے کی عادت نہیں رہی۔" علیزے کے جواب پہ وہ ٹھہر سا گیا تھا اور پھر گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ بڑے لاپروا اور لاتعلق سے انداز میں گردن جھکائے بیٹھی اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔
"عادت تو تمہیں میرے ساتھ رہنے کی بھی نہیں ہے؟ پھر کیا کرو گی؟" دل آور کا لہجہ عجیب بے تاثر سا ہو رہا تھا اور اب کی بار اس کے اس لہجے اور سوال پہ علیزے نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تو دونوں نے ہی نظریں جھکا لی تھیں۔
"میری عادتوں کو تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ مجھے فرش پہ سونے کی عادت ہو سکتی ہے تو پھر....." علیزے نے یونہی اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اسے جواب سے نوازا تھا، لیکن اس ادھورے جواب کا مفہوم دل آور بہت گہرائی سے اور بہت آسانی سے سمجھ چکا تھا۔
"ہوں..... تو پھر میرے ساتھ رہنے کی عادت بھی ہو سکتی ہے یعنی اس فرش میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے؟" دل آور نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں خود کو جیسے کچھ باور کروایا تھا اور پھر خاموشی سے دوبارہ چائے کا کپ اٹھا کر چائے پینے لگا تھا۔
علیزے کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے جو اس نے زندگی میں پہلی بار بنائی تھی اور وہ بھی صرف اس کے لیے بنائی تھی اور علیزے اسے چائے پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ اپنے دھیان میں چائے پی رہا تھا۔
رات بہت حد تک بیت چکی تھی اور وہ دونوں ہنوز اپنی اپنی جگہ پہ اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے جا رہے تھے، وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور وہ صوفے پہ بیٹھی ہوئی تھی اور یونہی بیٹھے بیٹھے دونوں کی پہلی رات گزر گئی تھی۔ دُکھ، درد اور دلیلوں کے بوجھ تلے دبی پہلی رات..... یعنی ان دونوں کی سہاگ رات.....

♥

دُکھ کی رات ڈھل چکی تھی اور دلیلوں کا دن شروع ہو چکا تھا اور ان ہی دلیلوں کے سہارے وہ بھی اپنے آپ کو ذرا سا سنبھال

لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علیزے فجر کی نماز پڑھ رہی تھی جب دل آور راکنگ چیئر سے اُٹھ کر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں جا کر کھڑا تھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا تھا۔

باہر کی تازہ ہوا اس کے بوجھل اعصاب کو تھپکیاں دے رہی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح دُعا مانگتے ہوئے علیزے کے ہاتھ کو تھپکیاں دے رہے تھے، اسے شاید کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ دُعا میں اللہ سے اگر کچھ مانگے تو کیا مانگے؟ کیونکہ اپنے لیے تو کچھ مانگنے کے لیے تھا ہی نہیں..... تو پھر کس کے لیے مانگے؟ اور اسی مانگنے اور نہ مانگنے کی کشمکش میں بیٹھی علیزے کی دُعا کی خاطر پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر دل آور کے دل میں دُعا کی طلب بیدار ہوئی تھی۔ اک بلا ارادہ اور بے ساختہ سی طلب۔

"علیزے! میں نے تمہیں بے سکون کیا ہے، دُکھ دیا ہے تمہیں، دل دُکھایا ہے تمہارا، تنہا کر دیا ہے تمہیں اور..... اور..... اب خود تنہا ہو گیا ہوں، خود بے سکون ہو گیا ہوں، اب اپنا دل دُکھ سے بھر گیا ہے، اب مجھے دُعا کی ضرورت ہے اور یہ دُعا تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا صرف تم کر سکتی ہو۔ پلیز علیزے! میرے لیے دُعا کرو۔ دُعا کرو اللہ مجھے سکون دے اور صبر عطا کرے اتنا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو جاؤں۔" وہ علیزے سے التجائیہ سے انداز میں کہتا وہاں سے ہٹ کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

علیزے اپنے خالی اور پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھتی رہ گئی تھی اس میں اتنا حوصلہ اور اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ اس شخص کے لیے دُعا کرتی جو اس کے خاندان کو اور اس کے دل کو برباد کرنے کا باعث بنا تھا جس نے اسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا جو اس کی ذات کو کوڑی کا کر کے رکھ چکا تھا۔

آخر وہ اس کے لیے دُعا کرتی بھی تو کیسے؟

یہ ممکن ہی کب تھا بھلا؟

وہ اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچی ہوئی اپنے ہونٹوں کو سیے ہوئے جائے نماز سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں پہ بند باندھتی ہوئی اسی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی جہاں وہ کھڑا رہا تھا۔

♥

وہ آج بھی اسی جائے نماز پہ بیٹھی تھی جس پہ اس کے دل آور شاہ نے سجدہ کیا تھا، نماز ادا کی تھی اور دُعا مانگی تھی۔

البتہ اس نے تو پتا نہیں کون سی دُعا مانگی تھی اور کس کے لیے مانگی تھی؟ مگر زری کی تمام دُعائیں تو بس اسی کے لیے ہوتی تھیں۔ حرف اول سے لے کر حرف آخر تک صرف اس کا نام ہوتا تھا۔

اس کے دل سے نکلنے والا لفظ لفظ جیسے دل آور شاہ کی ہی امانت تھا۔

کسی اور کا تو گزر بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کی دُعاؤں میں شریک ہو جاتا۔

صرف وہی وہ تھا..... کل بھی..... آج بھی..... آئندہ بھی..... اور اس وقت بھی..... اور وہ تھی کہ اس کے لیے دُعائیں مانگے جا رہی تھی کیونکہ کل وہ سب اس کا جو حال دیکھ چکے تھے اسے واقعی دُعاؤں کی ہی ضرورت تھی دل سے اُٹھنے والی بے لوث اور شدت آمیز دُعائیں، جو اس کے لیے صرف اور صرف زری ہی کر سکتی تھی۔ زری کے سوا کوئی اور ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

♥

"انوشہ..... انوشہ..... کہاں ہو بھئی؟ ممی کہاں ہیں؟"

دانیال انیکسی میں داخل ہوتے ہی عائشہ آفندی کے بیڈ روم کی طرف جاتا تھا اس وقت بھی یہی ہوا تھا وہ سیدھا ان کے بیڈ روم میں ہی گیا تھا، لیکن انہیں وہاں نہ پا کر اس نے انوشہ کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔

"جی بھائی! کیا بات ہے؟ خیریت؟" انوشہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب دانیال کی آواز پہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے باہر نکل آئی تھی۔

"بات کیا ہو گی بھلا؟ تم سب ہی غائب ہو، ممی کہاں ہیں؟ وہ بھی نظر نہیں آ رہیں؟" دانیال، عائشہ آفندی کی طبیعت کی وجہ سے ہر وقت ہی تشویش زدہ سا رہتا تھا اسے ان ہی کی طرف سے پریشانی گھیرے رکھتی تھی۔

"ہم نے کہاں غائب ہونا ہے بھلا؟ زین شاید جودت اور حماد کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ میں یہاں اسٹڈی میں بزی ہوں اور ممی کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہوا ہے اور رہی بات آپ کی تو آپ اپنے آپ سے خود ہی پوچھ کر بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں

نے انوشہ نے بھی اسے اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا جبکہ دانیال اس کے جواب پہ ذرا سا ٹھٹکا تھا۔

"بھی کب سے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہے مگر کیوں؟" اس نے مزید تشویش سے پوچھا تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا البتہ یہ ضرور پتا ہے کہ آج کی میٹنگ بہت خاص میٹنگ ہے، سبھی حکمران وہیں جمع ہیں۔" انوشہ نے اسے اطلاع دی تھی اور دانیال کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔

"خاص میٹنگ؟ ہوں..... سمجھ گیا....." اس نے فوراً قدم واپس موڑ لیے تھے اس کا ارادہ اب وہیں جانے کا تھا۔

"کیا سمجھ گئے ہیں؟ کچھ مجھے بھی سمجھا دیں؟" انوشہ پیچھے سے مچل کے بولی تھی۔

"ہیں سمجھ جائے گا پتا..... صبر رکھو۔" اس نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔

"مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"وہیں جہاں سبھی حکمران جمع ہیں۔" دانیال بڑے سکون سے کہتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا تھا اس کے قدموں میں روانی آگئی تھی وہ جلد از جلد میٹنگ میں پہنچنا چاہ رہا تھا اور اسی عجلت میں وہ کوریڈور مڑتی ہوئی حرمت سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

"خیر خیر..... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" حرمت نے خفگی سے کہتے ہوئے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔

"سوری..... میں نے دھیان نہیں دیا۔" دانیال خود بھی مچل ہو گیا تھا۔

"تو دھیان کہاں ہے آپ کا؟" اس نے بے ساختہ سوال داغ دیا تھا اور دانیال نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا چہرے سے ہی خفت زدہ سی لگ رہی تھی۔

"دھیان بھی بس یہیں کہیں تھا۔" دانیال نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"دھیان کو بس یہیں کہیں نہیں ہونا چاہیے، صرف ایک ہی جگہ پہ ہونا چاہیے۔ ورنہ یہیں کہیں دھیان رکھنے والے ٹھوکر کھا لیتے ہیں۔" حرمت نے اسے جیسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اک سائیڈ سے کترا کے گزر گئی تھی۔ جبکہ دانیال وہیں کھڑا اس کی بات کا مفہوم سمجھتا رہ گیا تھا۔

"کیا بات ہے دانیال بھائی! یہاں کیوں کھڑے ہیں آپ؟" جویریہ لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں جا رہی تھی جب دانیال کو کوریڈور کے کونے پہ کھڑے دیکھ کر رُک گئی تھی۔

"ہوں..... کچھ نہیں بس ایسے ہی رُک گیا تھا۔" وہ چونک کر سر جھٹکتا ہوا ڈیڈ کے بیڈ روم کی طرف آ گیا تھا حالانکہ اس کے دل میں کچھ ضرور ہو رہی تھی کہ حرمت آخر ایسی بات کیوں کہہ کر گئی ہے؟ ورنہ وہ تو کبھی کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔

"عائشہ! تم کیوں چپ ہو گئی ہو تم بھی تو کچھ کہو نا؟ تمہاری کیا رائے ہے؟"

ثروت بیگم کی آواز پہ دانیال دروازے پہ دستک دیتے رُک گیا تھا ثروت بیگم عائشہ آفندی سے مخاطب تھیں۔

"آپ نے بات ہی چپ کروانے والی کر دی ہے، کچھ کہنے کے لیے کیا ہے اب؟ فیصلہ تو آپ لوگ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب اس میں ہماری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے بھلا۔" عائشہ آفندی کا دھیما اور بجھا بجھا سا لہجہ بتا رہا تھا۔ انہیں کچھ اچھا نہیں لگا۔ اب کیا اچھا لگنا تھا یہ تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

"کیوں..... تمہاری رائے کیوں اہمیت نہیں رکھتی؟ تمہیں کچھ بھی کہنے کا پورا پورا حق ہے تم کہہ سکتی ہو۔ ہم سب سن رہے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ تمہاری رائے کا احترام کریں۔" اسرار آفندی نے وقار آفندی کی جگہ بولنے کا حق ادا کیا تھا اور باہر کھڑے دانیال کو جیسے جھٹکا سا لگا تھا کہ اب اس کی ماں نجانے کیا کہنے والی ہیں کہ سب کو انتظار ہو گیا ہے۔

"نہیں بھائی صاحب! میں اپنی رائے زبردستی کسی پہ مسلط نہیں کرنا چاہتی سب کی اپنی اپنی اولاد ہے اور اپنا اپنا اختیار، ہر کوئی اپنی مرضی ہی کرنا چاہتا ہے۔ آپ لوگوں نے اپنی اولاد کے بارے میں سوچا ہے تو کچھ بہتر ہی سوچا ہو گا۔" عائشہ آفندی کافی آہستگی سے بول رہی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے سن پا رہا تھا۔

"ارے نہیں عائشہ! کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ ہماری اور تمہاری اولاد میں کوئی فرق ہے کیا؟ ہماری اولادیں ہم لوگوں میں بٹی ہوئی تھوڑی ہیں؟ یہاں سب کچھ ایک ہی تو ہے؟" اسرار آفندی نے بڑی اپنائیت اور بڑے خلوص سے اپنی بہن کو مان بخشنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی نہ رکھ لیں بلکہ دل میں جو بھی ہے وہ صاف کہہ دیں۔

"نہیں بھائی صاحب! یہاں سب کچھ ایک ہی تو نہیں ہے نا؟ ہوا دونوں میں فرق تو آپ کے اس فیصلے سے ہی آ
آپ نے اپنے بچوں کے بارے میں سوچ لیا ہے، لیکن ہمارے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں سوچا۔ آپ کو آذر اور احمد وغیرہ
فیصلہ یاد ہے، لیکن دانیال اور زین وغیرہ کی زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا ان کے لیے بھی کچھ سوچا ہے آپ نے؟ کیا
کوئی فیصلہ کیا ہے آپ نے؟ یا پھر لاوارث سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔" عائشہ آفندی پہلے ہی زہرہ جتول شاہ کے قہر میں جل بھن
اوپر سے اپنے دونوں بھائیوں کے اس نئے فیصلے نے انہیں اور بھی جلا کر رکھ کر دیا تھا اور دانیال زندگی میں پہلی بار اپنے
سخت لہجے میں بات کرتے سن کر حیران رہ گیا تھا بلکہ حیران تو وہ بھی رہ گئے تھے کہ آخر عائشہ کو ہوا کیا ہے؟

"عائشہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ سب کیا کہہ رہی ہو تم؟" اسرار آفندی اور اظہار آفندی دونوں ہی تڑپ گئے تھے۔
بہن نے آج تک ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ کومل آپ کو آذر کے لیے پسند آ گئی ہے اور حرمت احمد کے لیے
سمجھی جا رہی ہے تو پھر دانیال کے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟ اس کے لیے کسے پسند کیا گیا ہے آخر؟ بتائیے مجھے دانیال کو
بھلا؟"

عائشہ آفندی دُکھ کے مارے پھر جانے کو تھیں اور دانیال کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ حرمت اور احمد کے نام پر
دماغ چکرا گیا تھا۔ اسے اچھا خاصا جھٹکا سا لگا تھا۔

تو گویا حرمت کے لہجے کی تلخی کی اصل وجہ یہی تھی اور اسی لیے وہ قدرے اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی تھی۔

"دانیال کے لیے؟" وہ سب عائشہ آفندی کی بات پہ جیسے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"ہاں..... دانیال کے لیے۔" انہوں نے بڑے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"دانیال کے لیے بھی ان شاء اللہ اچھا ہی ہو گا۔ وہ بھی ہمارا ہی بیٹا ہے اس کی شادی بھی اسی گھر میں ہو گی تم فکر کیوں کرتی
بھلا؟" انہوں نے عائشہ آفندی کو تسلی دینی چاہی تھی۔

"کیوں فکر نہ کروں؟ میں ماں ہوں اس کی۔ اس کے دل کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے بھلا؟ آپ کا کوئی فیصلہ میرے
کے دل پہ گراں گزرے میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟" عائشہ آفندی آج چپ ہونے والی نہیں تھیں۔ جبکہ دانیال گویا
تھا کہ اس کی ماں اپنے بھائیوں سے اس طرح لڑ جھگڑ کر اس کی پسند یا اس کا حق حاصل کرے۔ بلکہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ
اور اپنے دل میں پنپنے والی محبت سے ہی دستبردار ہو جاتا۔

"تو بتاؤ نا عائشہ! ایسا کیا ہے جو اس طرح تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا؟" وہ لوگ اسرار کرنے لگے
گئے تھے اور اس سے پہلے کہ عائشہ آفندی بھی تھک ہار کے زبان سے کچھ کہہ دیتیں۔ دانیال یکدم دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا
سب اس کے اس طرح اچانک اندر چلے آنے پہ حیران رہ گئے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے سب کو ہی سلام کیا تھا۔ البتہ آپی آفندی کے چہرے پہ
پڑتے ہی اس کی نظر ٹھٹک گئی تھی۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا اور اپنے اس بھیگے ہوئے چہرے کو چھپانے کی کوشش میں وہ ذرا سا سر جھکائے
ہوئے بیٹھی تھیں۔

"وعلیکم السلام! تم یہاں؟" عائشہ آفندی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔ کیونکہ دانیال کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ
تھے۔

"جی ہاں..... آپ کے لیے ہی آیا ہوں۔ آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے نا۔ اگر میڈیسن وقت پہ نہ
کتنا مسئلہ ہو جاتا ہے پھر؟ اس لیے آپ ابھی اٹھیں اور میرے ساتھ چل کر میڈیسن لیں اپنی۔" دانیال نے بڑے اپنے
طریقے سے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں صوفے سے اٹھا لیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! ابھی رہنے دو اسے، کچھ ضروری بات کرنی ہے اس سے۔" اظہار آفندی نے روکا تھا۔

"نہیں ماموں ان کی صحت سے زیادہ ضروری بات تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور ویسے بھی آپ سب ہیں نا۔ آپ بات کر
بس انہیں فی الحال آرام کرنے دیں۔" دانیال پہلی بار کسی بڑے کے سامنے اپنی من مانی کرتا ہوا ماں کو ساتھ لیے ڈیڈ اور آنٹی کو

کر وہاں سے نکل آیا تھا اور عائشہ آفندی اسے روکتی رہ گئی تھیں مگر اس نے واپس انیکسی میں آ کر ہی دم لیا تھا۔

♥

"صاحب! باہر کچھ مہمان آئے ہیں۔" زلفی اسے اطلاع دینے کے لیے اندر بھاگا آیا تھا۔

"کون مہمان ہیں؟" دل آور نے اپنے پاس بیٹھے عبداللہ اور نبیل وغیرہ سے توجہ ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ آئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کی تعزیت کے لیے۔" اب کی بار زلفی نے پورا نام لے کر ان کی آمد کی وجہ بتائی تھی۔ جبکہ وہاں بیٹھے سبھی افراد چونک گئے تھے کیونکہ اس نے ان لوگوں کا نام لیا تھا جن کی انہیں اُمید ہی نہیں تھی۔

"صاحب! کیا کروں، انہیں اندر لے آؤں یا پھر....." زلفی نے اسے خاموش دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"نہیں..... نہیں ایسا نہیں کرنا، تم انہیں اندر لے آؤ۔" دل آور نے کافی تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے ان لوگوں کو اندر لانے کا اشارہ دیا تھا اور زلفی تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے پلٹ کر واپس چلا گیا تھا۔

"گل....." عبداللہ نے گل کو آواز دی تھی۔

"جی صاحب جی!" گل ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئی تھی۔

"زری اور نگارش بی بی سے کہو اس طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ مہمان آئے ہیں، اس لیے فی الحال اندر ہی رہیں۔" عبداللہ نے گل سے کہہ کر زری اور نگارش کو اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ تاکہ ان دونوں کا ان سے سامنا نہ ہو اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔

"جی..... ابھی کہہ دیتی ہوں۔" گل فوراً پیغام لے کر پلٹ گئی تھی اور راستے میں وہ لوگ بھی اندر آ گئے تھے۔

"السلام علیکم!" ملک اسد اللہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی بلند اور رعب قسم کی آواز میں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" دل آور لاکھ شکستہ حال سہی، لیکن اب بھی دشمن کے سامنے ڈٹ جانے کی پوری پوری طاقت رکھتا تھا۔ اسی لیے اپنی شکستگی اور بے دلی کے باوجود انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آخر وہ اس کی ماں کے اظہارِ تعزیت کے لیے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔

"کیسے ہیں دل آور صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟" ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس سے حال چال دریافت کیا تھا۔ حالانکہ اس کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ کس قدر ڈھے چکا تھا یہ تو صاف نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" دل آور نے بڑی مشکل، بڑے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کسی سے کچھ بھی کہنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"بیٹھیے..... تشریف رکھیے۔" نبیل نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لیے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہوں..... شکریہ۔" وہ دونوں باپ، بیٹا ان سے مل کر صوفے پہ بیٹھ گئے تھے اور ان کے بیٹھنے کے بعد وہ تینوں بھی بیٹھ گئے تھے اور پھر ملک شرافت علی نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے سبھی افراد نے ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھی اور ان کی مغفرت کے لیے دُعا کی تھی اور آمین کہتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیر لیے تھے۔

"جس گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا کیا اس کے بارے میں کوئی پوچھ پڑتال نہیں کی آپ نے؟" ملک اسد اللہ، دل آور سے مخاطب تھا جو چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"پوچھ پڑتال کیسی؟ یہ سب تقدیر تھی اور تقدیر میں جو کچھ ہو وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔" دل آور کا جواب بہت ٹھہرا ہوا اور بہت سپاٹ تھا۔ ملک اسد اللہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے کہ تقدیر کا لکھا ہو کر ہی رہتا ہے۔ لیکن اب کوئی ہمارے سامنے ہمارے کسی اپنے کو قتل کر کے چلا جائے تو کیا ہم تقدیر کا لکھا سمجھ کہ چپ کر کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جانا چاہیے یا پھر اس کی کوئی پوچھ پڑتال بھی کرنی چاہیے۔" ملک اسد اللہ سنجیدہ تحریر سے لہجے میں سوال کیا تھا اور دل آور چند ثانیے کے لیے لب بھینچ کے رہ گیا تھا۔

قتل، خودکشی اور رب کی رضا سے آئی موت میں بڑا فرق ہوتا ہے ملک صاحب! قتل اور خودکشی کی وجہ سے آنے والی موت پہ صبر نہیں آتا جبکہ رب کی رضا سے آنے والی موت پہ انسان کو خود بخود صبر آ جاتا ہے جیسے مجھے صبر آ گیا ہے۔ البتہ آپ اگر یہ سمجھ رہے

ہیں کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور جان بوجھ کر میری ماں جی کو گاڑی سے ٹکر مار کر چلا گیا ہو گا تو ایسا بھی نہیں ہے۔ آخر اس ٹیکسی ڈرائیور کی ماں جی سے کیا دشمنی ہے۔ اس لیے مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں خوامخواہ پوچھ پڑتال کروں اور لوگوں کو سزائیں دوں۔ سزا اور بخشش والی تو اوپر والے کی ذات ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔" دل آور کا لہجہ بے حد بوجھل اور مضمحل سا ہو رہا تھا۔ بے ساختہ اس کے برابر بیٹھے عبداللہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دبایا تھا اور دل آور اس کے ہاتھ کے دباؤ پہ سر ہلا کے رہ گیا تھا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو، جو بھی ہوا ہے، ہمیں اس پہ بے حد افسوس ہے۔ ماں، باپ کا ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور جن کو ہوتا ہے، بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ..... لیکن وہ اس خوش قسمتی کی قدر نہیں کرتے..... بہرحال اللہ کا شکر ہے باپ کا سایہ سب پہ سلامت ہی رکھے تو اچھا ہے۔ ورنہ اولاد ذلیل ہو جاتی ہے۔" ملک شرافت علی نے بھی کچھ بولنے کا فرض نبھانا تھا ورنہ وہ مسلسل چپ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ تو واقعی صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔" نبیل نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اتنے میں زلفی ان کے لیے چائے وغیرہ لے آیا تھا۔ جس کے دس، پندرہ منٹ بعد وہ دونوں باپ، بیٹا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اچھا دل آور صاحب! اجازت دیجیے اب، فی الحال اتنا ہی کافی ہے، آپ سے ملاقات کا ارادہ تو ہے، لیکن ذرا فرصت سے کیونکہ اس وقت تو آپ کا اپنا غم بھی تازہ ہے اور وقت بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے باقی کا قصہ پھر کسی وقت پہ اٹھا رکھتے ہیں اللہ حافظ۔" ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے مطلب کا اشارہ بھی دے دیا تھا اور پھر وہاں سے رخصت بھی ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے جانے کے بعد دل آور پھر تھک ہار کے شکستہ سا صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

♥

آج بتول شاہ کا سوئم تھا۔ اس لیے آج وہ سب ہی ذرا جلدی گھر سے آ گئے تھے البتہ طبیعت کچھ خراب ہونے کی وجہ سے مدیحہ ذرا لیٹ پہنچی تھی۔ اسی لیے اس کے پہنچنے تک مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ابھی وہ باہر روڈ پہ گاڑی پارک کر کے گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ اس کی گاڑی کے قریب ہی عدیل نے بھی بائیک کو لا کر بریک لگا دیے تھے اور مدیحہ اس اچانک بریک لگنے پہ چونک گئی تھی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟" وہ بائیک کو لاک لگا کر بائیک سے اتر آیا تھا۔

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں میں، آپ سنائیں؟" مدیحہ نے کافی دھیمے سے لہجے میں پوچھا تھا اور عدیل اس کی طبیعت کی اس قدر اور سستی اس کے لہجے سے ہی محسوس کر گیا تھا۔

"اللہ کا احسان ہے، سب ٹھیک ہے، البتہ آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" عدیل نے اسے سرتاپا گہری نظروں سے جانچا تھا۔ اس کی نظروں کو بڑی تقویت ملی تھی۔ کیونکہ آج مدیحہ کسی الگ ہی روپ میں نظر آ رہی تھی اور عدیل کو آج اس کے سامنے اپنا اپنا سا اور اپنی نظریں بے اختیار ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ مغربی طور و اطوار کی لڑکی اس وقت مشرقی حلیے میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے آج شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور گلے میں دوپٹہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آج پہلی بار اس لباس میں دیکھ کر عدیل کا دل لگی گیا تھا۔ لیکن دل پہ دھیان کون دے؟ وہ تو کسی بھی وقت کہیں بھی مچل سکتا ہے۔

"بس ایسے ہی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔ رات سے سر میں بہت درد ہے۔" مدیحہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے کنپٹی کو سہلایا تھا۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔ آپ گھر پہ آرام کر لیتیں۔" عدیل کو پریشانی ہوئی تھی۔

"یہ آرام کا دن نہیں ہے نا۔ اس لیے آرام نہیں کر سکتی تھی۔ بتول شاہ میری پھوپھی یا میری خالہ نہیں تھیں۔ بلکہ میری ماں تھیں اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد آرام کیسے آتا ہے۔" مدیحہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"اوہ ایم سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں تو محض آپ کی طبیعت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کے لیے کتنی اہم تھیں اور مائیں تو ہوتی ہی اہم ہیں۔ اسی لیے تو ان کے بچھڑنے پہ اتنا دکھ ہوتا ہے اور آپ کے اسی دکھ کو تو ہم سب کر دکھ ہو رہا ہے، بے حد افسوس بھی ہے مگر اب ہم سب ان کی مغفرت کی دعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں بھلا؟" عدیل نے

سے تڑپتے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تھی، لیکن تب تک مدیحہ کے آنسو اس کے رخساروں تک بہتے تھے اور عدیل بیچارا بے جان سا ہو گیا تھا۔

"پلیز..... آپ اس طرح روئیں مت، رونے سے کوئی واپس نہیں آجاتا۔ بلکہ اس رونے سے بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے اللہ پاک کے حضور میں بلند درجات کی دعا کریں۔ جس سے انہیں بھی فائدہ ہو اور آپ کو بھی خوشی اور سکون حاصل ہو۔ یہ رونا دھونا چھوڑ دیں پلیز۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" عدیل اسے اب ذرا سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا اور مدیحہ بالآخر ٹشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ حد تک سنبھل سی گئی تھی۔

"ٹھیک ہو! میں فی الحال اندر جاتی ہوں۔ آپ بھائی وغیرہ سے مل لیں۔ مرد حضرات کے لیے انہوں نے شاید سامنے گراؤنڈ میں انتظام کیا ہوا ہے۔" مدیحہ لوگوں کی آمد و رفت دیکھ کر عدیل کو گراؤنڈ کی طرف اشارہ کرتی خود آگے بڑھ گئی تھی۔

"مدیحہ! سنیے پلیز۔" عدیل نے اسے پیچھے سے پکارا تھا اور مدیحہ کے قدم روڈ کراس کرتے کرتے ٹھہر گئے تھے۔ اس نے آج پہلی بار اس کے نام سے پکارا تھا۔ اسی لیے وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کے رہ گئی تھی۔

"پلیز اب روئیے گا مت ورنہ میرے دل کو پورا دن بے چینی ہوتی رہے گی۔" عدیل جیسے التجا کر رہا تھا اور مدیحہ اس کی اس بات پہ اپنے دل کو دھڑکنے سے روک نہیں پائی تھی اور وہ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ آخر وہ دونوں گراؤنڈ کے بیچوں بیچ ہی کھڑے تھے اس لیے وہ بھی ہٹ گئی تھی۔

♥

ہیم ہو چکی تھی اور بتول شاہ کے سوئم کا دن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سب لوگ، سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اب صرف رشتہ داروں کی فیملیز تھیں جو یہاں اس کے پاس موجود تھیں اور وہ ان لوگوں کے درمیان اکیلا اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تم خود سمجھدار ہو تمہیں ہمارے سمجھانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں ایک ماں ہونے کے ناتے اتنی نصیحت ضرور کروں گی کہ بے شک میں نے اپنی کوکھ سے صرف نبیل کو پیدا کیا ہے لیکن میری نظر میں تم میں اور نبیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میرے لیے نبیل ہی ہو اس لیے کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا مت سمجھنا۔ نبیل اور مدیحہ تمہارے بہن، بھائی ہیں تو میں ماں ہوں ہی۔ تم ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ نہ آج، نہ کل، نہ پھر کبھی۔ ہاں تم اگر ماں سمجھ کر مجھ سے کچھ کہو گے تو مجھے خوشی ہو گی کہ تم نے مجھے پرایا نہیں سمجھا۔" دل آور کے قریب ہی بیٹھی فائزہ بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پہ دل آور محض سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

وہ اسے اس حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ اس کا دل، اس کا شاہ، دکھی تھا۔ اسے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اسے یہ حال کیسے اس کا یہ حال اور اس کا یہ حلیہ برداشت کر رہی تھی ورنہ اس پہ کیا بیت رہی تھی، یہ تو صرف وہ جانتی تھی یا پھر اس کا خدا جانتا تھا۔ کیونکہ دل آور کے اس حال پہ، اس حلیے پہ اور اس دکھ پہ اس کا دل کس طرح کٹ رہا تھا، یہ صرف خدا ہی جان سکتا تھا، کسی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں تھی۔

"صاحب! آپ کے لیے فون ہے کسی کا۔" وہ سب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح زلفی پیغام لے کر آیا تھا اور دل آور نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کس کا فون ہے؟"

"صاحب! شاید جسٹس احمد کریم نام بتایا ہے انہوں نے، انگلینڈ سے فون کیا ہے۔" زلفی نے نام یاد رکھنے کے لیے ذہن پہ زور دیا تھا اور کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

"ہوں..... ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تھا اور کرسی دھکیل کر آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، جبکہ زلفی سے پہلے ہی واپس پلٹ گیا تھا کیونکہ فون ہولڈ پہ رکھا ہوا تھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں تب تک میں فون کال سن لوں۔"

"کرنے نہیں یار! چائے کی ضرورت نہیں ہے تم فون کال سن لو، پھر بات کرتے ہیں۔" عبداللہ نے اسے منع کیا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

سے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تھی، لیکن تب تک مدیحہ کے آنسو اس کے رخساروں تک پہنچ چکے تھے اور عدیل بیچارا بے جان سا ہو گیا تھا۔

"پلیز..... آپ اس طرح روئیں مت، رونے سے کوئی واپس نہیں آ جاتا۔ بلکہ اس رونے سے بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے مغفرت میں بلند درجات کی دعا کریں۔ جس سے انہیں بھی فائدہ ہو اور آپ کو بھی خوشی اور سکون حاصل ہو۔ یہ رونا دھونا چھوڑ دیں پلیز۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" عدیل اسے اب ذرا سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا اور مدیحہ بالآخر ٹشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے خود کو سنبھالنے کے لیے سنبھل ہی گئی تھی۔

"ٹھیک ہے! میں فی الحال اندر چلتی ہوں۔ آپ بھائی وغیرہ سے مل لیں۔ مرد حضرات کے لیے انہوں نے شاید سامنے گراؤنڈ میں انتظام کیا ہوا ہے۔" مدیحہ لوگوں کی آمد و رفت دیکھ کر عدیل کو گراؤنڈ کی طرف اشارہ کرتی خود آگے بڑھ گئی تھی۔

"مدیحہ! سنیے پلیز۔" عدیل نے اسے پیچھے سے پکارا تھا اور مدیحہ کے قدم روڈ کراس کرتے کرتے ٹھہر گئے تھے۔ اس نے آج اس کے نام سے پکارا تھا۔ اسی لیے وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کے رہ گئی تھی۔

"پلیز اب رویے گا مت ورنہ میرے دل کو پورا دن بے چینی ہوتی رہے گی۔" عدیل جیسے التجا کر رہا تھا اور مدیحہ اس کی اس التجا پہ اپنے دل کو دھڑکنے سے روک نہیں پائی تھی اور وہ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ آخر وہ دونوں گراؤنڈ کے بیچوں بیچ ہی کھڑے تھے اس لیے وہ بھی ہٹ گئی تھی۔

♥

تمام ہو چکی تھی اور بتول شاہ کے سوئم کا دن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سب لوگ، سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اب صرف عدیل اور نبیل کی فیملیز تھیں جو یہاں اس کے پاس موجود تھیں اور وہ ان لوگوں کے درمیان اکیلا اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تم خود سمجھدار ہو تمہیں ہمارے سمجھانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں ایک ماں ہونے کے ناتے اتنی تو ضرور کہوں گی کہ بے شک میں نے اپنی کوکھ سے صرف نبیل کو پیدا کیا ہے لیکن میری نظر میں تم میں اور نبیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میرے لیے نبیل ہی ہو اس لیے کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا مت سمجھنا۔ نبیل اور مدیحہ تمہارے بہن، بھائی ہیں تو میں ماں ہوں نا۔ تم سے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں کوئی بھی روک ٹوک نہیں ہے۔ نہ آج، نہ کل، نہ پھر کبھی۔ ہاں تم اگر ماں سمجھ کر مجھ سے کہو گے تو مجھے خوشی ہو گی کہ تم نے مجھے پرایا نہیں سمجھا۔" دل آور کے قریب ہی بیٹھی فائزہ بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پہ دل آور محض سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

وہ اسے اس حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ اس کا دل، اس کا شاہ، دکھی تھا۔ اسے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اپنے ضبط کیے اس کا یہ حال اور اس کا یہ حلیہ برداشت کر رہی تھی ورنہ اس پہ کیا بیت رہی تھی، یہ تو صرف وہ جانتی تھی یا پھر اس کا خدا جانتا تھا۔ کیونکہ دل آور کے اس حال پہ، اس حلیے پہ اور اس کا دل کس طرح کٹ رہا تھا، یہ صرف خدا ہی جان سکتا تھا، کسی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں تھی۔

"صاحب! آپ کے لیے فون ہے کسی کا۔" وہ سب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح زلفی پیغام لے کر آیا تھا اور دل آور نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کس کا فون ہے؟"

"صاحب! شاید جسٹس احمد کریم نام بتایا ہے انہوں نے، انگلینڈ سے فون کیا ہے۔" زلفی نے نام یاد رکھنے کے لیے ذہن پہ زور ڈالا تھا اور کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

"اوہ..... ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تھا اور کرسی دھکیل کر آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، جبکہ وہ اس سے پہلے ہی واپس پلٹ گیا تھا کیونکہ فون ہولڈ پہ رکھا ہوا تھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں تب تک میں فون کال سن لوں۔"

"کسے نہیں یار! چائے کی ضرورت نہیں ہے تم فون کال سن لو، پھر بات کرتے ہیں۔" عبداللہ نے اسے منع کیا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتا آگے بڑھ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں بھی اب واپس چلنا چاہیے۔ دل آور بھائی بھی خاصے تھکے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں نے جو بھی بات کرنی ہے کل کر لیجیے گا، ابھی مناسب نہیں ہے۔'' نگارش نے ان لوگوں کو مزید کوئی بھی بات کرنے سے روک دیا تھا اور عبداللہ، نبیل اور فائزہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ان کی رائے لینا چاہتی ہو۔

''ہاں..... کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی ہے۔ فی الحال اسے آرام کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔'' فائزہ بیگم نے بھی نگارش کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر تم لوگ بھی چلنے کی تیاری کرو۔'' عبداللہ نے نگارش اور زری کو اشارہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ان کے بیگ وغیرہ اندر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی اندر آ گئی تھیں۔ نگارش اس سے آگے تھی اس لیے وہ زری سے پہلے ہی آگے بڑھ کے لاؤنج میں داخل ہو گئی تھی۔

جبکہ نگارش کے پیچھے آنے والی زری کے قدم ڈریسنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے بے ساختہ ہی وہیں کے وہیں رک گئے تھے۔ کیونکہ اندر سے فون پہ بات کرتے دل آور کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی اور اس کی آواز سن کر زری وہاں سے ہل نہ جاتی۔ یہ بھی تو ایک ناممکن سی ہی بات تھی نا؟ اور دل آور جو انتہائی مختصر سی بات کر رہا تھا چند سیکنڈز بعد بات کو سمیٹتے ہوئے فون بند کر کے اچانک ڈریسنگ روم سے باہر نکل آیا تھا اور ڈریسنگ روم کے داخلی دروازے کے عین سامنے کھڑی زری کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

''خیریت.....'' دل آور نے ذرا تشویش سے پوچھا تھا۔

''جی خیریت۔'' زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''آپ نے اندر جانا ہے کیا؟'' دل آور نے قدرے الجھ کر استفسار کیا تھا۔

''نہیں۔'' زری نے نفی میں جواب دیا تھا۔

''تو پھر.....'' اب اس کی اُلجھن اور بھی بڑھ گئی تھی۔

''مجھے بتول آنٹی کے حوالے سے کچھ کہنا ہے۔ مگر اب جب کچھ کہنا چاہ رہی ہوں تو میرے پاس یوں لگ رہا ہے کہ سب سارے الفاظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ جیسے کچھ کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ختم ہو گیا ہے۔'' زری واقعی بہت کوشش کر رہی تھی کچھ کہنے کی، مگر اس سے کچھ بھی کہا نہیں جا رہا تھا۔

''ہاں..... یہ تو سچ ہے، سب ختم ہو گیا ہے، باقی تو کچھ بھی نہیں رہا۔'' وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولا تھا اور اس کے انداز پہ زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ختم ہو گیا ہے؟ اور کیا باقی نہیں رہا کچھ بتانا پسند کریں گے آپ۔'' اب کی بار زری کو اُلجھن ہو رہی تھی اور اس نے دل آور کو سرتاپا بے چین اور مضطرب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

''پلیز..... راستہ چھوڑیں باہر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔'' دل آور نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے جانا چاہا تھا۔

''میں بھی سراپا انتظار ہوں وکیل صاحب! آپ کو میرا انتظار نظر کیوں نہیں آتا؟'' زری اس کی سرد مہری پہ بپھر گئی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر جھنجوڑ ڈالے۔ مگر وہ ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی نا۔ آخر وہ اس کا اپنا دل تو نہیں تھا جیسا بھی تھا۔

''پلیز زرین! راستہ چھوڑیں۔'' دل آور نے پھر التجا کی تھی۔

''آپ کا راستہ چھوڑ دوں تو پھر کس کا راستہ لوں وکیل صاحب! کوئی تو راستہ دکھائیں؟'' زری اس سے زیادہ بے بس اور نڈھال لگ رہی تھی اور اس کا لہجہ بھی روہانسا سا ہو رہا تھا۔

''زرین! میں نے آج تک آپ سے کبھی کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن آج اگر کچھ کہوں گا تو آپ کو چاہیے کہ آپ میرے اس رویے سے ہی سمجھ جائیں اور میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ''دل آور شاہ مر چکا ہے۔'' ''بس اور کچھ نہیں۔'' دل آور کے بے تاثر اور سفاک لہجے میں کہے گئے اس جملے نے زرین ملک کی روح کھینچ لی تھی اور اس کا کلیجہ جیسے منہ کو آ گیا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے دل آور کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ یہ سب کیا اور کیوں کہہ رہا ہے؟ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

ل..... آ..... و..... ر..... شا..... و..... مر..... چکا..... ہے؟'' زری کی زبان بے ربط ہوگئی تھی اور حرف بکھر گئے تھے
..... حروف جوڑنا بھی چاہتی تو نہیں جوڑ سکتی تھی، کیونکہ اس میں سکت ہی نہیں تھی۔
..... مگر..... وکیل صاحب! دل آور شاہ مر چکا ہے، تو پھر زری کیوں زندہ ہے؟'' اس نے بڑی دیر بعد کھوئے ہوئے لہجے

میں کچھ نہیں جانتا زرین! میں نے جو کہنا تھا، کہہ دیا ہے، پلیز اب راستہ چھوڑیں۔'' دل آور اس کی سمت دیکھے بنا راہداری
..... سمت دیکھنے لگا تھا جبکہ وہ بُری طرح تڑپ اٹھی تھی۔
''راستہ چھوڑ دوں، کیوں وکیل صاحب! کیوں راستہ چھوڑ دوں؟ اک عمر آپ کے راستے میں گزاری ہے وکیل صاحب! اور
..... ہے ہیں کہ راستہ چھوڑ دوں؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ آپ اتنے دنوں سے مجھے اپنے کیوں نہیں لگ رہے تھے؟ مجھے اتنے
..... کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ میرے نہیں رہے؟ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ دل آور شاہ نظریں پھیر چکا ہے اور زرین
..... چکی ہے۔ میں جب جب آپ کو دیکھ رہی ہوں تو مجھے کیوں احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک اجنبی، غیر اور پرائے مرد
..... ہوں۔ وکیل صاحب میں آپ کو دیکھوں اور مجھے شرمندگی ہو، ایسا کیوں ہے آخر، کیوں بتایئے مجھے وکیل صاحب! جواب
..... زری ہذیان دھار روتے ہوئے مسلسل ایک ہی تکرار کیے جا رہی تھی اور اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ
..... کوئی اندر آگیا تو کیا سوچے گا۔
''میں آپ کو اجنبی، غیر اور پرایا لگ نہیں رہا، بلکہ میں ہوں، اجنبی بھی ہوں، میں غیر بھی ہوں اور میں پرایا بھی ہوں، آج سے
..... دل سے ہوں اور ابد تک ایسا ہی رہوں گا۔ اس لیے آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ دل آور شاہ مر چکا ہے۔'' اس نے
..... اک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر لب بھینچتے ہوئے اس کی اک سائیڈ سے ہو کر گزر گیا تھا اور زری اس کے اس طرح
..... پہ تڑپ تڑپ گئی تھی۔
''وکیل صاحب! یہ کیا کہہ دیا ہے آپ نے؟'' وہ پیچھے سے چیخی تھی، لیکن دل آور راہداری عبور کر کے جا چکا تھا۔
''وکیل صاحب!'' وہ پھر زور سے چیخی تھی۔ مگر تب تک نگارش اس کے قریب آ چکی تھی۔
''زری پلیز! سنبھل جاؤ، بس کرو اب۔'' نگارش کا اپنا لہجہ بھی بھیگ رہا تھا۔ وہ زری کی تڑپ پہ تڑپ جاتی تھی۔
''بھابی! وہ..... وہ..... کیا کہہ گیا ہے۔ سنا آپ نے..... اس نے..... کک..... کیا کہا ہے؟'' وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے
..... دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
''ہاں ان چکی ہوں، سب سن چکی ہوں، اسی لیے تو رو رہی ہوں کہ سب سن لیا ہے۔'' نگارش لاؤنج سے نکل کر ادھر ہی آ رہی
..... ان دونوں کو راہداری میں کھڑے دیکھ کر وہیں کی وہیں رُک گئی تھی۔
''بھابی!'' زری بُری طرح روتے ہوئے نگارش کے کندھے سے لگ گئی تھی۔
''نگارش، زری چلنا نہیں ہے کیا۔'' عبداللہ کی آواز پہ دونوں ہی ٹھٹک گئی تھیں۔
''جی..... آ رہے ہیں۔'' نگارش، زری کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی اور عبداللہ ان دونوں کو بتول آنٹی کی وجہ سے اُداس
..... چپ چاپ ان کے آگے آگے چل پڑا تھا۔
..... آج اس گھر سے جاتے ہوئے نہ جانے کیوں زری کا دل رو رہا تھا اور بڑی شدت سے رو رہا تھا۔
نگارش نے اسے بمشکل لا کر گاڑی میں بٹھایا تھا اور عبداللہ نے گاڑی سٹارٹ کر دی تھی۔ نبیل ان سے پہلے ہی گاڑی نکال لے
..... تھا۔ بس عبداللہ کی باری تھی اور وہ بھی اک جھٹکے سے گیٹ عبور کر گیا تھا اور گیٹ سے نکلتے ہوئے سامنے ڈرائیو وے پہ
..... اور کو دیکھ کر گاڑی میں بیٹھی زری گھٹ گھٹ کر رو پڑی تھی۔
..... باز تھا جو رہا نہیں
..... خیال تھا جو کہا نہیں
..... آرزو تھی دبی دبی
..... مدعا جو تھا جو بتا نہیں

کسی موڑ پر تو وہ ملے مجھے
کوئی موڑ ایسا بنا نہیں

♥

وہ سب چلے گئے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اب وہ تھا یا اس کی تنہائی تھی اور اس کی اس تنہائی میں صرف سگریٹوں کا دھواں تھا جو اسے اپنی آغوش میں لپیٹ رہا تھا اور وہ اس دھویں میں خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا، کیونکہ انسان کا دل جل رہا ہو تو انسان دھواں ہی ہو جاتا ہے اور دل آور کے ساتھ بھی اس وقت ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا اور وہ سگریٹ کا دھواں بجھ رہا تھا۔ اس کا سورج کی طرح دہکنا اور چراغ کی طرح روشن ہونا بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ اب پیچھے جا کر سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اب جو کچھ پیچھے رہ گیا تھا، وہ بس پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

بالکل ایسے جیسے زری پیچھے رہ گئی تھی۔

اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کی طرف سے آنکھیں، کان اور دل بند کر کے وہاں سے چلا آیا تھا اور چھوڑ آیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور عمر بھر کے لیے۔

اب اسے آگے کو سفر کرنا تھا۔ وہ سفر جو اس کی اماں اس کے پاؤں سے باندھ گئی تھیں اور جس سے ہٹنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ اب وہی اس کا سفر تھا اور اب وہی اس کی منزل تھی اور اپنی منزل سے کوئی کب تک دور رہ سکتا ہے آخر کو لوٹنا نہیں۔

اور یہ سچ تھا کہ دل آور اگر سفر تھا تو علیزے اس کی منزل تھی۔

اور علیزے اگر سفر تھی تو دل آور اس کی منزل تھا۔

ان کا تو سفر اور منزل کا سا ساتھ تھا۔

جو شروع سے چلا آ رہا تھا اور جس نے ہمیشہ رہنا تھا۔

یہ پل دو پل کی دوری بھی کوئی دوری تھی بھلا۔

اس نے پلٹنا تو آخر منزل کی طرف تھا سو وہ پلٹ گیا تھا۔

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب وہ آخری سگریٹ اپنے بوٹ تلے مسل کر گہری سانس کھینچتا ہوا لان سے پلٹ کر اندر آیا تھا۔ گل، گلاب خان اور زلفی تو مہمانوں کے جاتے ہی اپنے اپنے کوارٹرز میں چلے گئے تھے۔ اب بس اسی کے لیے اندر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے اندر آتے ہی مین ڈور بند کر دیا تھا اور قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیے تھے۔

بے شک اس کا رُخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا، لیکن پھر بھی اپنے بیڈ روم کے حوالے سے اس کا ذہن بالکل صاف اور سفید کی مانند تھا۔ کہیں کونے کھدرے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس کے بیڈ روم میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ البتہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوتے ہی وہ یکدم ٹھٹک سا گیا تھا اور اس کا صاف سلیٹ کی مانند ذہن پھرتے طرح طرح کے سوچوں اور طرح طرح کے خیالوں سے بھر گیا تھا۔ لیکن اب اور کتنا سوچتا، تنگ آ کر سوچوں اور خیالوں کو ذہن سے جھٹکتا ہوا لاک کر کے آگے بڑھ آیا تھا اور صوفے کے قریب آ کر قدم رُک گئے تھے اور نظریں علیزے پہ ٹھہر گئی تھیں۔

ورنہ جانے کب یونہی صوفے پہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اس کا سر اور بازو دائیں طرف لڑھک چکے تھے۔ نیند گہری تھی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی بے ترتیب ہوئی پڑی ہے اور دل آور کی نظریں اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی ہیں۔

شاید اسے احساس ہوتا تو وہ یکدم تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوتی۔

مگر بات پھر وہی تھی کہ نیند گہری تھی۔

اور اس کی اس گہری نیند کا دل آور کو بھی احساس ہو چکا تھا۔ اسی لیے دو قدم اور بڑھا کے سوئی ہوئی علیزے کے پاس صوفے پہ بیٹھ گیا تھا اور انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کا مرمریں سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کو اپنے ہاتھ میں دبانے لگا تھا۔ جیسے اسے نرمی سے سہلا رہا ہو اور علیزے اس سہلانے پہ کسمسا سی گئی تھی۔

سلیجے۔۔۔۔'' اس کے کسمسانے پہ دل آور نے آہستگی سے اسے پکارا تھا لیکن نیند گہری تھی۔ اسی لیے وہ نہ سن سکی تھی اور نہ محسوس کر سکی تھی۔ البتہ دل آور اس کے ہاتھ کے لمس کو بڑے بوجھل دل سے محسوس کر رہا تھا۔

علیزے! بات سنو میری..... میں تمہارا ہوں..... سنبھالو مجھے..... نہیں سنبھالو گی تو پچھتاؤ گی..... آج وقت ہے تمہارے آج میں تمہاری مٹھی میں ہوں..... آج مجھے قید کر لو..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لو..... میری ہو جاؤ..... اور مجھے علیزے! آج دل آور شاہ کسی کا بھی نہیں تمہارے سوا..... آج غافل مت رہو..... جاگ جاؤ علیزے! غفلت کی نیند اچھی نہیں ہوتی۔ آج مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ میرے ساتھ جاگو..... میرے ساتھ بات کرو..... میرے سینے پہ ہاتھ رکھو..... مجھے قرار دے دو علیزے! میں بے سکون ہوں مجھے سکون دو..... دُعا دو مجھے..... علیزے مجھے دُعا دو۔'' اس نے انتہائی بوجھل اور گمبھیر آواز میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھ کو اپنے دُکھ کی شدت اور اپنے رشتے کی عقیدت تک جاتے ہوئے علیزے کا وہی مرمریں سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا اور جہاں اس کے ہونٹوں کی مہر سے علیزے کے کا وجود معتبر ہوا تھا وہیں علیزے کے ہاتھ کے پاکیزہ لمس سے دل آور شاہ کے ہونٹ بھی معتبر ہو گئے تھے۔

علیزے کا ہاتھ اور دل آور کے ہونٹ ایک دوسرے کو چھو کر جیسے مہک اُٹھے تھے۔

کیونکہ یہ ان کا ایک دوسرے کے لیے زندگی کا پہلا لمس تھا۔ جس سے ان کا رشتہ مزید پائیدار ہوا تھا اور ان کی ایک دوسرے پہ گرفت بھی تھی۔

ہاں یہ اور بات تھی کہ علیزے اس مہر سے، اس لمس سے اور اس احساس سے انجان تھی، بے خبر تھی۔ وہ اس پہ اپنے حق اور اپنے استحقاق کی پہلی مہر ثبت کر چکا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں تھی۔

اور اس کی اسی بے خبری میں دل آور نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر آہستگی سے اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بے حد احتیاط سے اُٹھا لیا تھا اور صوفے سے بیڈ تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ذرا سا جھک کر اسے بیڈ پہ لٹا دیا تھا۔ کیونکہ وہ اتنے دنوں سے صوفے پہ ہی سو رہی تھی لیکن اگر گہرائی سے سوچا جائے تو وہ آخر کب تک صوفے پہ سو سکتی تھی؟

جب ایک رشتہ بن چکا تھا، سب کچھ قبول کیا جا چکا تھا، تو پھر اس رشتے کی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بھلا کیا قباحت تھی؟ وہ صوفے پہ سوئی یا بیڈ پہ، بات تو ایک ہی تھی، رشتہ تو وہی تھا۔ سو وہ بیڈ پہ ہی سوئی تو بہتر تھا، کیونکہ بیڈ پہ اب اس کا اور دل آور کا برابر کا حق تھا اور وہ اسے یہ حق خود اپنے ہاتھوں سے سونپ چکا تھا۔ اسے بیڈ پہ لٹا کر کمبل پھیلا کے اس کے اوپر اوڑھا دیا تھا اور خود دوبارہ سے صوفے کی طرف چلتا ہوا راکنگ چیئر تک چلا آیا تھا جہاں پچھلے کئی دنوں سے اس کی کئی راتیں تمام ہو رہی تھیں اور آج کی رات بھی تمام ہو گئی تھی۔

♥

علیزے سو رہی تھی، جب گل کی آواز پہ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بے ساختہ چھت کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی اور خود کو صوفے کے بجائے بیڈ پہ پا کر اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی تھی اور سامنے ہی راکنگ چیئر پہ بیٹھے دل آور پہ نظر پڑی تھی۔ وہ گل کی طرف متوجہ تھا جو اس کے لیے ٹیبل پہ ناشتہ لگا رہی تھی، کیونکہ دل آور کو ناشتے کی طلب ہو رہی تھی اور اس نے گل سے کہہ کر ناشتہ یہیں منگوا لیا تھا۔ اس لیے اس وقت اس کا دھیان ناشتے کی طرف ہی تھا۔

جبکہ علیزے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی، لیکن گل کی موجودگی کی وجہ سے اسے تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہی رہنا پڑا تھا۔ جس پہ وہ مزید پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

''ارے علیزے بی بی! آپ اُٹھ آئیں۔ کیا آپ کے لیے بھی ناشتہ لے آؤں؟'' گل واپس پلٹتے ہوئے اسے دیکھ کر رُک گئی تھی۔

''نہیں..... نہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔'' علیزے نے بے دھیانی میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

''ٹھیک ہے، آپ فریش ہو جائیں، میں بعد میں ناشتہ بنا دوں گی۔'' گل، علیزے کو صاحب کے بیڈ پہ سوئے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی تھی۔ اسی لیے اب اسے بڑے آرام سے فریش ہونے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں بیڈ روم میں رہ گئے تھے۔

علیزے جو اتنی دیر سے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی، اب تنہائی ملتے ہی چپ سی ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے اور کیا کہے؟ اک عجیب سی جھجک تھی جو اس کے کچھ کہنے کے آڑے آ رہی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ وہ تو ڈرائیور سے ہر بات بلا جھجک کہہ جاتی تھی۔ شاید پہلے وہ ڈرائیور کو اپنی پراپرٹی سمجھتی تھی اس لیے اور اب خود کو ڈرائیور کی پراپرٹی سمجھ رہی تھی اس لیے اس سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ کچھ پوچھنے کی کوشش کے باوجود بھی اس سے کچھ نہیں پائی تھی۔

"گڈ مارننگ۔" بالآخر دل آور نے ہی بولنے میں پہل کی تھی مگر علیزے نے پھر بھی اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"ناشتہ کرو گی؟" دل آور بھی آخر بتول شاہ کا ہی بیٹا تھا زندگی نبھانے والا۔

"نہیں۔" اور وہ بڑی حویلی کی بیٹی تھی کچھ بھی نہ سمجھنے والی، سب کچھ ملیامیٹ کر دینے والی۔

"ہوں..... میں جانتا ہوں، تم اس وقت کس سوچ پہ ٹھہری ہوئی ہو۔" دل آور نے اک نظر اسے دیکھتے ہوئے کہا اور جوس کا گلاس اُٹھایا تھا اور ذرا تو قف سے کہا ہوا تھا۔

"تم رات کو سو رہی تھیں، تمہیں صوفے سے اُٹھا کے بیڈ تک میں لے کر آیا تھا۔" اس نے انتہائی مضبوط اور تحمل آمیز لہجے میں اس کے ان کہے سوال کا جواب دیا تھا، تاکہ وہ اُلجھتی نہ رہے۔

"مگر میرے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس کے حوالے سے تم مجھے صوفے سے بیڈ تک لے کر آئے ہو؟" علیزے ذرا اور جھجک کے باوجود بالآخر کہہ ہی گئی تھی اور دل آور جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے لگاتے یکدم ٹھہر سا گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا۔" دل آور نے جیسے اس کی بات پہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزے نے وہی بات دوبارہ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ یونہی چپ کی چپ بیٹھی رہی تھی۔

"ہوں..... تو تمہارے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس کے حوالے سے میں تمہیں صوفے سے بیڈ تک لے کر جا سکوں؟" اس نے پُرسوچ سے انداز میں کہتے ہوئے جوس کا گلاس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور آہستگی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو پھر اتنے دنوں سے تم کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں قیام پذیر ہو؟ کیوں میرے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہ رہی ہو؟ کیوں میرے سامنے میرے لیے ایک تسلی، ایک دلاسہ بن کر بیٹھی ہوئی ہو؟ آخر کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے؟" دل آور کو علیزے کی بات بُری لگی تھی اور اسے اس بات پہ غصہ بھی آیا تھا۔

"کیونکہ میری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ ہے۔ مگر تمہاری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ کچھ بھی نہیں ہے اس لیے تو میں پہلے بھی قید تھی اور میں آج بھی قید ہوں۔ بس فرق صرف اتنا آیا ہے کہ وہ تہہ خانہ تھا اور یہ بیڈ روم ہے۔ وہاں فرش کا بستر تھا یہاں نرم و گداز بستر ہے۔ وہ سخت تھا یہ نرم ہے۔ کھانا وہاں بھی ملتا تھا کھانا یہاں بھی ملتا ہے۔ میں تب بھی جی رہی تھی، میں اب بھی جی رہی ہوں، لگی تم مجھ پہ حاوی تھے، تم آج بھی مجھ پر حاوی ہو۔ اور میں کل بھی تمہارے سامنے بے بس تھی آج بھی بے بس ہوں اور ہمیشہ اسی طرح بے بس ہی رہوں گی۔ میرا وجود، میری ذات اور میرا غرور نہ کل تھے، نہ آج ہیں، نہ آئندہ ہوں گے۔" علیزے بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور دل آور جن قدموں پہ کھڑا تھا انہی قدموں پہ دم بخود سا کھڑا رہا تھا۔

تو علیزے کے اندر یہ غبار تھا کہ وہ بیسمنٹ سے نکل کر بیڈ روم میں کیوں قید ہے؟ اور دل آور کو خبر ہی نہیں تھی۔

"یہ تعلق یہ رشتہ تمہارا احسان نہیں ہے مجھ پہ۔ یہ احسان ہے تو صرف تمہاری مما کا جنہوں نے میری عزت کو عزت سمجھا اور مرنے سے پہلے میرا ننگا سر ڈھانپ دیا میری خاطر، میری عزت کی خاطر تمہاری منت کی، منایا تمہیں اس لیے زندگی میں اگر کبھی میں مر کے خاک بھی ہو گئی تو ان کا یہ احسان تب بھی یاد رکھوں گی اور انہیں ہمیشہ دل سے دُعا دوں گی مگر تم..."

علیزے بولتے ہوئے آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگی تو بے ساختہ اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی اور دل آور باہر کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
"کون ہے؟" اس نے ہیئر برش بالوں میں پھیرتے ہوئے آہستگی سے اندر آنے کی اجازت دی تھی اس کے خیال میں انوشہ یا زین ہوں گے لیکن ان دونوں کے بجائے آذر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر دانیال خود بھی قدرے حیران ہوا تھا۔
"ہیلو۔ گڈ مارننگ۔" آذر نے ہلکے پھلکے سے انداز میں اسے وش کیا تھا۔
"ہوں سیم ٹو یو۔" دانیال ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ ڈال کر اس کی سمت پلٹا تھا۔
"کیسے ہو؟" آذر، دانیال کو بغور دیکھ رہا تھا۔
"اچھا بھلا ہوں، نظر نہیں آ رہا؟" دانیال نے کندھے اچکائے تھے۔
"نظر ہی تو نہیں آ رہا؟" آذر نے کسی اور ہی لہجے میں کہا تھا۔
"کون نظر نہیں آ رہا؟" اس نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔
"دانیال وجاہت علی۔" آذر نے اس کے نام پہ زور دیا تھا۔
"مجھے بھی کہیں نظر نہیں آ رہا، مگر اب ارادہ ہے کہ اسے تلاش کروں کیونکہ جب تک اسے تلاش نہیں کروں گا تب تک اپنی پہچان اور اپنی شناخت نہیں ہو گی اور اس دنیا میں شناخت بہت ضروری ہے۔" دانیال کا لہجہ استہزائیہ سا ہو رہا تھا اور آذر نے اس کا یہ استہزائیہ پن کافی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔
"کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟" آذر کھٹک چکا تھا۔
"کیا ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا ہی آپ سے کچھ کہے۔ کبھی کبھی انسان کا اپنا آپ ہی اس سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔" دانیال نے سر جھٹکا تھا۔
"انسان کا اپنا آپ بھی اس سے بے وجہ کچھ نہیں کہتا کہ پیچھے بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اس لیے تم بتاؤ کہ تمہارے ایسا کہنے کے پیچھے کیا وجہ ہے آخر؟ اور ویسے بھی تم دو روز سے کہیں بھی نظر نہیں آ رہے نہ گھر میں نہ آفس میں اور موبائل بھی آف مل رہا ہے، خیریت تو ہے نا؟"
آذر کو بھی دو دن سے تشویش ہو رہی تھی اسی لیے وہ آج صبح صبح ہی اس کی خبر لینے کے لیے انیکسی میں چلا آیا تھا۔
"ہاں یار! سب خیریت ہے۔ تم پریشان مت ہو اور یہ بتاؤ کہ آج ادھر کا رستہ کیسے بھول گئے؟" دانیال نے مرسری سے انداز میں کہا تھا۔
"تمہارا پتا کرنے کے لیے آیا تھا کہ تمہیں کیا ٹینشن ہے؟ کیوں کترائے کترائے سے پھر رہے ہو؟ آخر ہوا کیا ہے؟ تم کچھ بتا کیوں نہیں رہے؟" آذر نے کافی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔
"ارے یار! مجھے چھوڑو۔ مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہی کچھ ہوا ہے تم اپنی کہو آخر تم کومل کے ہو ہی گئے نا؟ کومل تو بہت خوش ہو گی آج کل؟" دانیال نے بڑی خوش اسلوبی سے بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔
"دانیال....." آذر اسے دیکھ کے رہ گیا تھا۔
"تو کیا کچھ غلط کہہ رہا ہوں میں؟" دانیال نے حیرت سے پوچھا تھا۔
"تم صحیح بھی تو نہیں کہہ رہے نا۔" اب کی بار آذر نے سر جھٹکا تھا۔
"وہ کیسے؟" اس نے آذر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
"وہ ایسے کہ میں اپنے بڑوں کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوں، مجھے ان کے دونوں فیصلے ہی پسند نہیں آئے، نہ مجھے اپنے لیے کومل پسند ہے اور نہ مجھے حرمت کے لیے احمد پسند ہے، میں نے ان سے کچھ سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے ابھی کچھ بھی فائنل نہیں ہوا بات ابھی میرے اختیار میں ہے۔" آذر نے بڑے سکون سے اسے آگاہ کیا تھا اور دانیال ٹھٹک سا گیا تھا اسے آذر کی بات پہ حیرت ہوئی تھی۔
"کیوں..... تمہیں یہ دونوں فیصلے کیوں پسند نہیں آئے؟"
"کیونکہ حرمت کے لیے مجھے دانیال وجاہت علی پسند ہے اور اپنی بہن کا ہاتھ میں اسی کے ہاتھ میں دینا چاہوں گا، اس کے

لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں یہ کر کے ہی رہوں گا۔" آذر نے اچانک اسے اپنی پسند اور اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور دانیال جیسے سکتے میں سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا وہ دانیال کے سامنے بیٹھ کر اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا اس لیے دانیال کے لیے تو واقعی یہ ششدر ہونے کی ہی بات تھی۔

"مگر آذر....." اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر مگر کچھ نہیں..... بس میں نے جو سوچ رکھا ہے، میں وہی کروں گا۔ البتہ تمہارے ذہن میں کوئی اعتراض ہے تو تم کہہ سکتے ہو۔ جھجکنے کی اور ہچکچانے کی ضرورت نہیں ہے اور رہی بات کومل کی اور میری تو اس کے بارے میں ابھی میں سوچوں گا تو ہی کوئی فیصلہ کروں گا فی الحال ایک ہی فیصلہ کیا ہے اور وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔" آذر کہہ کر صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لیکن آذر! وہ سب تو بات طے کر....." دانیال نے پھر بولنے کی کوشش کی تھی مگر آذر نے ٹوک دیا تھا۔

"جو میں طے کر چکا ہوں، تم اس کی فکر کرو، باقی سب کو چھوڑو، مجھے کوئی پروا نہیں ہے، یہ میرا مسئلہ ہے میں ہینڈل کر لوں گا۔ بس تم خوش رہو اور اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھو، میں ہر میدان میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ملک وجاہت علی کے بیٹے ہو تو عائشہ آفندی کے بھی بیٹے ہو اور بہت اہم ہو ہمارے لیے۔" آذر نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا اور پھر اس کے بیڈروم سے باہر نکل گیا تھا۔

جبکہ دانیال ہنوز حیران پریشان سا کھڑا اپنے بیڈروم کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ آذر نے اس کے کچھ کہنے کے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی سب کچھ تو وہ خود ہی طے کر گیا تھا تو گویا آذر بھی میرے دل کی بات سے باخبر تھا؟

حالانکہ میں نے کبھی کسی کو کچھ محسوس تو نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی..... پھر بھی..... ممی بھی جان گئیں اور آذر بھی؟ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتا ہوا پرفیوم اسپرے کر کے خود بھی بیڈروم سے باہر نکل گیا تھا۔

♥

"زلفی....." دل آور کی آواز پہ زلفی جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

"جی صاحب جی..... حکم.....؟"

"گل کہاں ہے؟"

"جی..... وہ تو کوارٹر میں ہے شاید۔" زلفی نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا تھا کہ گل کہاں ہے آخر؟

"اچھا ٹھیک ہے پھر تم ہی چلے جاؤ۔" دل آور نے اظہار کہتے ہوئے کہا۔

"کہاں صاحب جی؟" زلفی نے استفسار کیا تھا۔

"اوپر بیڈروم میں علیزے بی بی سے کہو صاحب نیچے بلا رہے ہیں۔" دل آور نے اسے پیغام دیا تھا۔

"بس اتنا ہی کہنا ہے؟" زلفی جاتے جاتے رُک گیا تھا۔

"ہوں..... اتنا ہی کہنا ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا اور زلفی خوشی خوشی پلٹ کر اوپر چلا آیا تھا۔

مگر صاحب کے بیڈروم کے دروازے پہ دستک دیتے ہوئے بیچارے کا دل دھڑک دھڑک گیا تھا آخر اتنی خوبصورت لڑکی کے سامنے جانا بھی تو آسان نہیں تھا نا؟

ہاں یہ الگ بات تھی کہ اندر سے اس کی دستک کا کوئی بھی رسپانس موصول نہیں ہوا تھا۔ جس کے بعد اس نے دوبارہ دستک دی تھی، مگر پھر بھی اندر سے چپ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ تب مجبوراً زلفی نے ذرا سا دروازہ دھکیل کر اندر جھانکا تھا اور وہ دلکش سی حسینہ اسے بیڈ پہ بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی اس لیے زلفی سارا دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا۔

"سلام بی بی جی!" اس نے بڑے اچھے طریقے سے سلام عرض کیا تھا۔

مگر علیزے نے اسے سرخ روئی روئی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کہا تھا۔

"سوری بی بی جی! میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ وہ دراصل مجھے صاحب جی نے بھیجا ہے، وہ آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔" زلفی اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ غلط وقت پر آیا ہے۔ اسی لیے اس نے فوراً معذرت بھی کر لی تھی۔

"کیوں..... کیوں بلایا ہے نیچے؟" علیزے کی آواز بھی خاصی بھیگی ہوئی تھی۔

"جی..... یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیوں بلایا ہے، مگر ان کے بلانے کے انداز سے لگتا ہے کہ کسی کام سے ہی بلایا ہے۔" زلفی نے

PRIME URDU NOVELS

دل آور کے سنجیدہ اور بے لچک سے انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا اور علیزے اس کی بات سن کر انکار میں جواب دیتے دیتے رُک گئی تھی۔

"ہوں..... ٹھیک ہے، تم جاؤ میں آ رہی ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور پھر بیڈ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اچھا بہتر....." زلفی سر خم کر کے کہتا ہوا پلٹ کر باہر نکل گیا تھا اور اس کے پیچھے ہی دو چار منٹ کے وقفے سے علیزے بھی نیچے آ گئی تھی، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا علیزے ڈرائنگ روم میں آ کر رُک گئی تھی البتہ زبان سے کچھ نہیں کہا تھا، مگر دیکھ سوالیہ نظروں سے رہی تھی۔

"چادر لے لو اور میرے ساتھ چلو۔" وہ کہتے ہوئے صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں..... کہاں جانا ہے؟" علیزے کا سوال بے ساختہ سا تھا۔

"مارکیٹ جانا ہے۔" دل آور بھی مختصر سے جواب دے رہا تھا۔

"مگر کس لیے؟" علیزے کو مارکیٹ کا سن کر حیرانی ہوئی تھی۔

"تمہاری شاپنگ کے لیے۔" دل آور نے آہستہ سے کہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی اس نے یکدم سر اُٹھا کر دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا، مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا نجانے ان دونوں کو کیا ہوا تھا کہ وہ صبح سے اک دوسرے سے اجنبی اور کھنچے کھنچے سے نظر آ رہے تھے۔

"میری شاپنگ کے لیے؟" اس نے آہستگی سے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔

"ہوں..... تمہاری شاپنگ کے لیے۔ تم چادر لے کر آؤ، میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھا تھا۔

"مگر مجھے کسی بھی شاپنگ کی اور کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے کچھ نہیں لینا، مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔ میں جیسی ہوں، جہاں ہوں، بس ٹھیک ہوں، تم میری فکر مت کرو۔" علیزے نے دبے دبے لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا اور علیزے کی بات پہ اس کے قدم رُک گئے تھے وہ جاتے جاتے دوبارہ اس کی سمت پلٹا تھا۔

"تمہاری فکر میرا فرض بن چکا ہے مسز علیزے شاہ! اور یہ فرض نبھانے والی تم خود ہو یہ رشتہ تمہاری ڈیمانڈ تھا، اب اگر ڈیمانڈ پوری ہوئی ہے تو رونا دھونا کس بات کا ہے؟ مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کسی قسم کے عہد و پیمان کا چکر تھا کہ جس کے پورا نہ ہونے پہ ہمیں کوئی افسوس یا رنج ہوگا، بلکہ ہمارا تعلق تو مجبوری کا تعلق ہے جسے اب تم نے بھی نبھانا ہے اور میں نے بھی نبھانا ہے۔ چاہے اس کو نبھانے میں ہمارے دل پہ کچھ بھی گزرے۔ الزام ایک دوسرے کو نہیں دینا۔ بس نبھانا ہے بہر صورت اور ہر حال میں نبھانا ہے۔ نہ تم شکوہ کرو نہ میں شکوہ کرتا ہوں۔ بس جیسے چل رہا ہے ویسے چلنے دو البتہ جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے لیکن آج کے بعد میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اس تعلق کو اور اس رشتے کو اچھے طریقے سے اور پوری ایمانداری سے نبھاؤں کیونکہ مجھے اس تعلق اور رشتے میں میری ماں نے باندھا ہے اور اس لحاظ سے میں اس رشتے کا ہمیشہ احترام کروں گا اور ہمیشہ عزت بھی دوں گا۔ زندگی کے ہر مقام پہ اور زندگی کے ہر موڑ پہ، اس معاملے میں تم کبھی بھی مجھے پیچھے نہیں پاؤ گی۔ جو تمہارا حق ہے اور جو تمہارا مقام ہے وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ البتہ اس معاملے میں تمہاری کیا سوچ ہے اور کیا نظریہ ہے یہ میں نہیں جانتا مگر پھر بھی باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں پندرہ منٹ کا ٹائم ہے آنا چاہو تو آ جاؤ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، میری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔" وہ اب سب کچھ صاف صاف بتا کر اک جھٹکے سے پلٹا اور باہر نکل گیا تھا اور پیچھے کھڑی علیزے گم سم سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

♥

اب عروج پر ہے تمہارا موسم، خزاں میں تم کو خرید لیں گے
مانگو گے ہم سے رحم کی طلب، نہ تم کو مہلت مزید دیں گے
وفا کی لاج میں ہم نے صدیوں سے خون اپنا سکھا دیا ہے
فریب و سستی کے بدلے تم کو سزا بھی سن لو شدید دیں گے

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد علیزے چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی اور اسے گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے تھے اسے وہ دن یاد آ گیا تھا جب وہ پہلی بار بڑی حویلی کے کوریڈور سے نکل کر باہر آئی تھی اور وہ اسی طرح اس کی گاڑی کے قریب کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

مگر کوئی علیزے کے دل سے پوچھتا کہ تب اور اب میں کتنا فرق تھا اور اس نے تب اور اب کے درمیان کیا کچھ گنوایا تھا؟

"دروازہ کھلا ہے آیئے بی بی جی!" گلاب خان نے مداخلت کرتے ہوئے ان دونوں کو ہی چونکا دیا تھا کیونکہ دل آور کسی اور ہی خیال میں پیچھے چلا گیا تھا جس خیال کے تحت علیزے کے قدم ذرا فاصلے پہ ہی رُک کے رہ گئے تھے اور وہ چاہ کر بھی آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔

مگر گلاب خان انہیں حال میں کھینچ لایا تھا اور وہ سر جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور گلاب خان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"آیئے صاحب جی! بی بی جی انتظار کر رہی ہیں۔" گلاب خان نے اسے بھی متوجہ کیا تھا اور دل آور گہری سانس کھینچ کر اپنی سوچوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی پھر گلاب خان نے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا اور دل آور گاڑی نکال کے روڈ پہ لے آیا تھا۔

البتہ اس کا دھیان علیزے کی طرف ہی تھا۔ یعنی وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس نے بھی "نبھانا" ہی ہے۔

اس نے ایک نظر اپنے برابر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی علیزے کو دیکھا اور پھر جانے کیوں لب بھینچے ہوئے جیب سے موبائل نکال کر عبداللہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا اور دوسری طرف عبداللہ نے فوری کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم! کیسے ہو عبداللہ۔" دل آور کے لہجے میں بے پناہ ٹھہراؤ اور بے پناہ صبر کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ خیریت سے ہو؟" عبداللہ کو اس کی فکر تھی۔

"ہاں..... خیریت سے ہوں تم لوگ آج آئے کیوں نہیں؟" دل آور اپنے مطلب کی بات کرنا چاہ رہا تھا۔

"بس آج سوچا کہ تم ریسٹ کر لو ہم کل مل لیں گے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"کل نہیں..... آج ملنا ہے تم اور نبیل شام کو میری طرف آ رہے ہو وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ۔" دل آور نے ملنے پہ زور دیا تھا۔

"کیوں..... خیریت؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" عبداللہ کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔

"ہاں..... سب ٹھیک ہے، بس تم لوگوں کو کسی سے ملوانا ہے آج۔" دل آور تو جیسے بلا کا پُرسکون نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے برابر بیٹھی علیزے بُری طرح چونک گئی تھی اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"واقعی کسی سے ملوانا ہے کیا؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں..... واقعی ملوانا ہے کسی سے، تم بھابی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آ جانا، میں نبیل کو بھی کہہ دیتا ہوں اوکے؟" دل آور نے بات سمیٹی تھی۔

"ہوں..... اوکے۔" عبداللہ نے پُرسوچ سے انداز میں کہا تھا اور پھر فون بند ہو گیا تھا جبکہ علیزے ابھی بھی اسے کچھ حیران اور کچھ بے یقین نظروں سے دیکھ رہی تھی، مگر وہ اس سے بے نیاز اب نبیل کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

♥

"مریم! کیا بات ہے؟ تم پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل پریشان نظر آ رہی ہو مگر بتا نہیں رہیں؟ کیا وجہ ہے آخر؟ کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

وہ کافی بے دلی سے اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب عابدہ خاتون کمرے میں اس کے پاس چلی آئی تھیں اور اس کی بات پر چونک کر متوجہ ہوئی۔

"ارے نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے بھلا؟" اس نے ذرا سا جھک کر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اپنی چادر اٹھائی اور ان کے سامنے لاپروا نظر آنے کی کوشش کی۔

"پریشانی نہیں ہے مگر کچھ تو ہے نا، جس نے تمہیں اس قدر اپ سیٹ کر رکھا ہے؟ تمہارا کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں ہے

...ف توجہ کی طرف دھیان رکھتی تھیں سب کا خیال ہوتا تھا تمہیں؟ مگر پچھلے کچھ دنوں سے تو میں ایسا کچھ بھی نہیں دیکھ رہی۔ تمہیں تو جیسا آپ کی بھی خبر نہیں ہے۔ عدیل بھی اسی بات کو نوٹ کر رہا تھا۔ مگر اس نے تم سے کہا نہیں کیونکہ وہ سمجھ رہا ہے کہ تم شاید جاب کی وجہ سے تھک گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو تم جاب چھوڑ دو ہمارا گزارا ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اپنے رب تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ آئندہ دو سے بھی اچھا اور بہتر گزارا ہو گا تم اپنے ذہن پہ کوئی بھی پریشانی سوار مت کرو۔"

عابدہ خاتون نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اسے تسلی دی تھی اور مریم چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے رک گئی۔ "امی پلیز آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ میں نے کہا نا میں بالکل ٹھیک ہوں بس یہ موسم کی وجہ سے کچھ سستی سی ہو رہی ہے ورنہ اور تو کچھ نہیں ہے اور جاب کا کیا ہے؟ میں کون سا پہاڑ توڑتی ہوں جا کر؟ اکیڈمی میں جا کر پڑھاتی ہوں اور واپس آ جاتی ہوں، بس اتنی سی جاب ہے میری اور آپ کہتی ہیں کہ وہ بھی چھوڑ دوں؟ ہونہہ یہ تو خود گھر آئی روزی، رزق کو ٹھکرانے والی بات ہے۔"

مریم نے انہیں پوری پوری تسلی دینے کی کوشش کی تھی اور عابدہ خاتون اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے اس کی بات کا اور اس کے لہجے کا ڈھونڈتی رہ گئی تھیں۔

"آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں بس آپ کی دعا کے ساتھ ساتھ اب اجازت بھی چاہیے میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہی ہوں پلیز۔"

مریم ان کو کندھوں سے تھام کے ایک بھرپور تسلی دیتے ہوئے بولی اور پھر وال کلاک کی سمت دیکھا وہ واقعی کافی لیٹ ہو رہی تھی۔

"ہوں ٹھیک ہے خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر اسے رخصت کی اجازت دی تھی اور مریم کے دل کا بوجھ اور پریشانی قدرے کم ہو گئے تھے اس لیے وہ گھر سے رخصت ہوئی تھی اور بڑے سکون سے بس سٹاپ تک پہنچی تھی مگر بس سٹاپ تک پہنچتے ہی اس کا سارا سکون رخصت ہو گیا تھا۔

کیونکہ سامنے ہی جوہت آفندی چمچماتی ہوئی کار سے ٹیک لگائے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا اور جس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہے اور جس کو سوچ کر ہی مریم کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی، جسم کانپ گیا تھا اب وہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

کیونکہ اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال تھا آخر یہ سٹاپ ان کے گھر اور محلے سے دور ہی کتنا تھا بھلا اور اگر وہ یہاں کوئی تماشہ کرتا تو مریم کو اندازہ تھا کہ اس کے باپ اور بھائی کی عزت چند سیکنڈ میں ہی مٹی میں رُل سکتی تھی اور اس کا صاف ستھرا بے داغ دامن پل میں غلیظ اور داغدار ہو سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھنے کی اور عقل اور تحمل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور خود کو لاتعلق اور اپروا ظاہر کرتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر جانا چاہا تھا مگر وہ اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر گاڑی سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

"سنو....." اس نے پیچھے سے اسے آواز دی تھی اور مریم کے قدم جہاں کے تہاں جم گئے البتہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ تو بہرحال نہیں ہوا تھا۔

"میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو مجھے بس تمہارا تھوڑا سا ٹائم چاہیے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

جوہت نے شاید پہلی بار سکون اور تحمل سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار مریم نے بے ساختہ پلٹ کر اسے دیکھا کیونکہ اسے اس لوفر اور آوارہ شخص کی بات کا ذرا بھی یقین نہیں تھا۔

"دیکھو..... مجھے غلط مت سمجھو میں اس وقت یہاں تمہیں تنگ کرنے کے ارادے سے نہیں آیا میں واقعی کسی کام سے آیا ہوں۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو در نے مجھے زیادہ نہ سہی مگر تھوڑا بہت تو تم جانتی ہی ہو گی؟ شرافت کی زبان کے علاوہ بھی مجھے ایک اور زبان آتی ہے جس کو سمجھ نہ آئے اسے وہی سمجھانی پڑتی ہے اور اس چیز کو تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تم شرافت کی زبان ہی سمجھ جاؤ تو بہتر ہے کیونکہ یہ ایریا تمہارا ہے اور یہاں مجھ سے کچھ اُلٹا سیدھا ہو گیا تو یقیناً تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے بہت بُرا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو خود بدنام کرو گی اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ بات ختم

ہوتے ہی تم جہاں کہو گی میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ تم سے وعدہ، پکا والا وعدہ، پلیز ٹرسٹ می۔"

جودت نے اتنی لمبی چوڑی بات پہلے کبھی نہیں کی تھی اور جب کی تو مریم دیکھنے اور سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

"لیکن میں تمہارا یقین کیسے کر لوں؟" مریم نے زبان کھولی بھی تھی تو ذرا سخت لب و لہجے میں۔

"جیسے بھی کرو کرنا تو تمہیں پڑے گا ہی کیونکہ اگر نہیں بھی کرو گی تو مجھے کیا فرق پڑے گا بھلا، نقصان اُلٹا تمہارا ہی ہے۔ ہاں زبردستی کرنا مجھے آتا ہے تمہیں ہاتھ سے پکڑ کر یا بانہوں میں اُٹھا کر گاڑی میں بٹھانا مشکل نہیں ہے میرے لیے سو پلیز ڈونٹ میک اٹ ہارڈ آن۔"

اس نے بڑے لاپروا اور غیر سنجیدہ سے انداز میں کہتے ہوئے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول دیا تھا جو مریم کے لیے گاڑی میں بیٹھنے کا ایک اشارہ تھا، ایک ایسا اشارہ جس پر عمل کرنے کا وہ کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ لیکن اس اشارے سے انکار بھی اسے مزید کھڑے رہوا کر سکتا تھا، اور وہ یہ رسوائی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

سو اس نے اپنی نگہبانی رب کو سونپتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے اور جودت آفندی کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور جودت اس کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا اور پھر محض چند سیکنڈ میں ہی اس کی گاڑی وہاں سے فراٹے بھرتی ہوئی ہوا ہو گئی تھی۔

اس نے گاڑی فی سپیڈ پر چھوڑ رکھی تھی لیکن وہاں سے بہت دور آ کر اس نے گاڑی کی سپیڈ کم کر دی اور گردن موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھی مریم کو دیکھا وہ بالکل سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی۔ "کتنی اچھی لگ رہی ہو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی۔" جودت نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال صاف کہہ دیا تھا اور مریم کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی کیونکہ جودت کا لہجہ بدل رہا تھا کہ مریم کو اپنے آس پاس خطرے کا الارم بجتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ اب جو بھی تھا وہ برداشت کرنا اور چپ رہنا تھا۔

"دل چاہ رہا ہے، تمہیں دور بہت دور لے جاؤں شہر سے بھی دور جہاں تمہارے اور میرے سوا کوئی بھی نہ ہو۔ جہاں میرا عشق اور میری دیوانگی اور تمہارا حسن اور تمہاری پاکیزگی ایک ہو جائیں جہاں سارے فاصلے اور ساری دوریاں مٹ جائیں۔" جودت بڑے دلبرانہ انداز اور لہجے میں اپنے دل کا حال کہہ رہا تھا اور مریم چپ چاپ سب سن رہی تھی اور اندر ہی اندر ضبط کے گھونٹ پی رہی تھی۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟ چلو گی میرے ساتھ جنت کی سیر کو؟" جودت نے اب کی بار اسے باقاعدہ مخاطب کیا تھا۔

"دیکھو جودت آفندی! تم نے جو وعدہ کیا ہے اس پر غور کرو ادھر اُدھر کی باتیں مت کرو ورنہ اسی گاڑی سے کود کر میں اپنی مجھے اپنی عزت سے زیادہ اپنی جان پیاری نہیں ہے۔"

مریم کا لہجہ اور الفاظ انتہائی سخت تھے اور جودت بے ساختہ اس کی دھمکی پر مسکرا دیا تھا۔

"اونہوں..... کیسی باتیں کرتی ہو سویٹ ہارٹ ایسے بھلا مرنے دوں گا تمہیں، تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے نہ دنیا دیکھی ہے، نہ دیوانہ دیکھا ہے اور بنا دیکھے تم مر جاؤ یہ تو مجھے اور بھی دیوانہ کرنے والی بات ہو گی، ہے نا۔"

وہ مریم کو بڑی گہری اور مستانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور لبوں کی مسکراہٹ اور بھی مستی بھری ہو گئی تھی۔

"مگر تم نے وعدہ....." مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر جودت نے بات کاٹ دی تھی۔

"ہاں..... میں جانتا ہوں کہ میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے اور اسی وعدے پہ تم نے مجھ پہ ٹرسٹ کیا ہے اسی لیے، اسی لیے ابھی تک دل کے مجبور کرنے کے باوجود بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگایا اور اس پہ بھی غور نہیں کیا کہ تم میرے کتنے قریب بیٹھی ہو حالانکہ بہت عرصے سے شوق تھا کہ تمہاری سانسوں کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کر کے دیکھوں مگر شکر ادا کرو کہ تم سے وعدہ کر بیٹھا ہوں۔"

جودت نے جیسے آہ بھری تھی اور مریم اس کی بات پہ قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔

"لیکن تمہیں اتنا بتا دوں کہ لوفر، آوارہ، دیوانے کے وعدے کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کسی وقت بھی توڑ سکتے ہیں کیونکہ ان کا خود پہ اختیار جو نہیں ہوتا۔"

جودت نے اگلی بات کہہ کر اسے پھر سے پل میں ہراساں کر دیا تھا اور مریم کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

بریک بھی لگا دیئے تھے۔
"سوری ڈونٹ وری یار! آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ گاڑی کا ڈور کھول کر نیچے اتر آیا تھا، لیکن مریم لاہور کے سب سے مہنگے ترین ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی پارک دیکھ کر وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔
"نہیں..... تم نے جو بھی بات کرنی ہے یہیں کرو، میں اندر نہیں جاؤں گی۔" وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں تھی۔
"اوکے یار! جہاں اتنا بھروسہ کر لیا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی تمہاری قسم میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنے والا اور نہ ہی میں تم پر کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے والا ہوں۔ بس میں نے تم سے بات کرنی ہے اور تو کچھ نہیں۔"
وہ آخر میں خاصے معنی خیز لہجے میں بولا تھا اور مریم شرم سے کٹ کے رہ گئی تھی۔
"اچھا یار! اور نہ مجھے ٹیبل یہیں روڈ پہ لگوانی پڑے گی۔" جودت نے جھنجلا کر اصرار کیا تھا۔
"تو پھر ہم لوگ فیملی ہال میں بیٹھیں گے۔" مریم نے شرط رکھی تھی۔
"اوکے..... لیکن فیملی ہال کہاں ہے؟" جودت نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کے لیے آگے پیچھے دیکھا اور وہ اگنور ہوئے گاڑی سے اتر آئی اور پھر جودت اپنے وعدے کے مطابق کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر اسے اپنے ساتھ لیے فیملی ہال میں آ گیا تھا۔
"اف..... اتنے بڑے ہال میں بیٹھ کر بات نہیں کرنی چاہیے بلکہ میچ کھیلنا چاہیے قسم سے مزا آ جائے گا۔"
جودت نے ریسٹورنٹ کے فیملی ہال میں داخل ہو کر اسے گھوم پھر کر دیکھتے ہوئے خاصے دلچسپ اور انجوائے کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
"یس سر!" ویٹر نے اسے متوجہ کرتے ہوئے اسے کرسی پیش کی تھی۔
"ہوں..... تھینکس۔" وہ سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پلٹ کر کرسی پہ بیٹھ گیا تھا کیونکہ مریم اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔
"کیا لو گی؟" جودت اس سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان دونوں میں یہ سلسلہ برسوں سے چلا آ رہا ہو۔
"تھینکس! میں گھر سے ناشتہ کر کے آئی ہوں۔" اس نے حسب توقع نفی میں جواب دیا اور مجبوراً جودت نے محض جوس آرڈر کیا تھا جس کے بعد ویٹر وہاں سے چلا گیا اور وہ دونوں اس ہال میں اکیلے بیٹھے رہ گئے تھے کیونکہ یہ صبح کا وقت تھا اس لیے فیملی ہال ابھی رش نہیں تھا البتہ سیمپل کیبن اس وقت بھی آباد تھے۔
"ہوں تو ڈیئر مریم بات در اصل یہ ہے کہ میں ایک اُلجھن میں ہوں جس کو سلجھانے کے لیے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن پلیز تم سچ سچ جواب دو تو۔" اس نے مریم کو سنجیدگی سے کہتے ہوئے مخاطب کیا۔ اور مریم نے جواباً اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور اس کی اُلجھن اور سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے جودت کو بات کا سلسلہ جاری رکھنا پڑا۔
"وہ میں در اصل منصور حسین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ بس مجھے اس کے بارے میں ساری معلومات چاہئیں۔" اس نے اپنی اُلجھن آخر کہہ ہی ڈالی تھی مگر مریم کی اُلجھن ابھی بھی دور نہیں ہوئی تھی۔
"کون منصور حسین؟" مریم کا سوال جودت کو چونکا گیا تھا۔
"کیا مطلب..... کیا تم منصور حسین کو نہیں جانتیں؟" جودت کو حیرت ہوئی تھی۔
"مجھے کیا پتا تم کس کا پوچھ رہے ہو؟ کون منصور حسین؟" مریم کو جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔
"وہی منصور حسین جس نے اس روز میری بائیک کو اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور تمہیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کے لے گیا تھا۔" جودت نے اسے یاد دلایا تھا اور مریم بُری طرح چونک گئی تھی۔
"وہ..... وہ تو....." اس کے منہ سے بے ساختہ دل آور شاہ کا نام نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے فوراً لب بھینچ لیے تھے کیونکہ اسے یاد ہو چکا تھا کہ جودت آفندی اس کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا اور اس کے ذریعے معلومات لینا چاہتا ہے لیکن مریم بروقت خود کو سنبھال گئی تھی۔
"کیا وہ تو..... کون ہے وہ؟" جودت نے اس کے لفظوں پہ غور کیا تھا اور بڑی تیزی سے استفسار کیا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ تو مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میرے لیے تو وہ اتنا ہی اجنبی تھا جتنے کہ تم۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے میری عزت کو عزت سمجھا تھا اور میری ہیلپ کی تھی اسی لیے وہ میرے لیے اہم تھا۔ لیکن میرے نزدیک بہرحال وہ اچھا انسان تھا وہ۔'' مریم نے بڑے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس کی تعریف کی تھی جبکہ جودت تپ اٹھا تھا۔

''جتنا اچھا انسان ہے وہ، یہ ہم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ بس تم اتنا بتاؤ کہ تم اسے کتنا جانتی ہو؟'' جودت نے یہ جاننے پہ زور دیا تھا اور مریم تھی کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

''میں کب جانتی ہوں اسے..... مجھے کیا پتا کہ وہ کون تھا اور کون نہیں؟ اس نے مجھے میرے گھر کے قریب ڈراپ کیا اور چلا گیا..... نہ اس نے میرا نام پوچھا..... نہ میں نے اس کا نام پوچھا بس اتنا جانتی ہوں اس کو اب مجھے کیا پتا اس کا نام منصور تھا یا کچھ اور۔'' وہ خاصے خفگی بھرے انداز میں بولی تھی اور جودت جتانے کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

''دیکھو..... وہ ہمارا بہت بڑا دشمن ہے۔ ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے اس نے..... اس کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے میرے لیے..... پلیز ہیلپ کرو میری۔'' جودت نے زچ ہو کر التجا کی تھی مگر مریم دل آور شاہ کو چھوڑ کر اس کی ہیلپ کیسے کر سکتی بھلا؟ اس کی نظر میں جو دل آور شاہ کا مقام تھا وہ جودت آفندی کا کبھی مر کے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''اگر وہ اتنا ہی بڑا دشمن ہے تمہارا تو تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟'' مریم نے نقطہ اٹھایا تھا۔

''کیسا دھوکا؟'' مریم اس سے اصل مسئلہ اگلوانا چاہتی تھی۔

''یہی تو مسئلہ ہے کہ بتا نہیں سکتا..... اس نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ ہم اپنے آپ سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہے۔'' جودت کچھ بھی پتا نہ چلنے پہ خفگی اور جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

''علیزے کون ہے؟'' اچانک مریم کے ذہن میں علیزے کا نام گونجا تھا اس نے بے ساختہ پوچھ بھی لیا تھا لیکن جودت اس کے سوال پہ ٹھٹک گیا تھا۔

''علیزے..... تت..... تم علیزے کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟''

''میں علیزے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اس روز تم نے ہی اس آدمی سے علیزے کے بارے میں پوچھا تھا تبھی خیال آیا کہ علیزے کون ہے؟ جس کا تم پوچھ رہے تھے؟'' مریم نے اسے وضاحت دی تھی اور وہ پھر سے کچھ دھیما پڑ گیا تھا۔

''نہیں..... کوئی نہیں چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔'' وہ عجیب الجھے ہوئے اور بے چین سے انداز میں کہتا کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اس کے لہجے اور اس کے انداز سے جھلکتی کچھ دیر پہلے والی شوخی و شرارت کہیں غائب ہو چکی تھی۔ وہ واقعی اس حوالے سے لے کر بہت سیریس نظر آ رہا تھا جس پہ مریم حیران ہوتی ہوئی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے گاڑی تک چلی آئی تھی۔

''کہاں ڈراپ کروں؟ گھر یا اکیڈمی؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''اکیڈمی.....'' اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

اور جودت نے اپنے وعدے کے مطابق گاڑی کا رخ اکیڈمی کی طرف موڑ دیا تھا۔

♥

وہ خود گاڑی سے اترنے کے بعد اس کی سائیڈ پہ آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور علیزے بمشکل اپنی تمام حسیں مجتمع کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور اس نے گاڑی کا ڈور بند کر دیا تھا۔

علیزے نے بڑی عجیب اور کھوئی ہوئی نظروں سے شاپنگ مال کی بلند و بالا عمارت کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر چند لمحے دیکھنے کے بعد نظروں کا زاویہ اپنے آس پاس کی طرف موڑ دیا پارکنگ لاٹ میں بہت گہما گہمی تھی، بہت رش تھا، نئی سے نئی گاڑیاں تھیں، نئے سے نئے لوگ تھے۔ اور ان لوگوں کے ہنستے مسکراتے تازہ دم چہرے تھے جو علیزے کی نظروں کو بہت بھلے لگ رہے تھے وہ ان چہروں کو، ان لوگوں کو، ان گاڑیوں کو اور اس آزاد اور کھلے ماحول کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اور رش یونہی رفتہ رفتہ بڑھتا رہے اور وہ یونہی حسرت سے کھڑی دیکھتی رہے کیونکہ اس کے لیے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا ایک خواب بن گیا تھا۔ اور آج جبکہ وہ یہ خواب واقعی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی تو اسے اپنی آنکھوں پہ ہی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''چلو.....'' دل آور نے چند سیکنڈ اس کے چلنے کا انتظار کیا تھا مگر جب وہ ایک ہی جگہ پہ کھڑی رہی تو اسے مجبوراً اس کو مخاطب

PAKSOCIETY.COM

اور وہ چونک کر متوجہ ہوئی اس کو اپنے انتظار میں کھڑے دیکھ کر آہستگی سے سر جھکاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔
وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاپنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتیک کا رخ کیا تھا۔ اندازہ تھا کہ لڑکیوں کا شاپنگ کا آغاز ہی ذرا سوٹ وغیرہ سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔
مگر علیزے کے لیے یہ کام بہت ہی مشکل تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا لے؟ دل آور کی موجودگی میں اسے اپنا آپ بہت بے بس لگ رہا تھا۔ وہ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر اس کی پرابلم سمجھ گیا اس لیے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔
"دیکھو..... تمہیں کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ تم اپنی پسند اور مرضی سے جو بھی چاہو خرید سکتی ہو۔ تمہارا کام ہے چیز پسند کرنا اور میرا کام ہے چیز کی قیمت ادا کرنا آگے پیچھے کی سوچیں تم مت سوچو، بس اپنی چیزوں کی طرف متوجہ رہو۔" دل آور نے اسے پیسوں کی طرف سے بے فکر رہنے کے لیے تسلی دی تھی۔ "مم..... مگر..... مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا نہیں؟ میں نے اکیلے تو کبھی کچھ بھی نہیں لیا۔ پہلے تو مما یا پھر جویریہ کر دیتی تھیں۔" علیزے نے خاصی ہچکچاہٹ سے کہا اور دل آور کو اس کی یہ پرابلم بھی حل کرنی پڑی تھی۔
"ہوں..... ڈونٹ وری یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ ذرا توقف سے کہتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور پھر پندرہ سوٹ اس نے ٹرائل روم میں علیزے کے ساتھ مل کر خریدے اور پسند کیے تھے، جن کے ساتھ میچنگ نیدر ویئر بیگز اور میچنگ سینڈلز اور شوز بھی تھے اسی طرح ایک سے اب کپڑوں اور جوتوں کے بعد باقی دیگر چیزیں رہ گئی تھیں۔
"اور کیا کیا لینا ہے؟ ساتھ ساتھ بتاتی جاؤ۔" وہ ایک لیڈی کاسمیٹکس شاپ کے سامنے رک گیا اور علیزے ٹھٹک گئی اب وہ کیا بتاتی کہ اس نے کیا کیا لینا ہے۔ اس لیے چپ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔
"میں نے کچھ کہا ہے شاید؟" دل آور نے پھر اسے متوجہ کیا تھا۔
"ہوں..... ہاں وہ انٹیکٹ اپنے لیے کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ بھی لینے کا مجھے ذرا بھی سینس نہیں ہے، میرے لیے تو جویریہ ہی چیزیں پسند کر کے لے کر جاتی تھی۔ اس لیے مجھے نہیں پتا کہ کیا کیا لینا ہے۔"
علیزے نے جواب گول مول کر دیا تھا، مگر وہ جو آج گھر سے سب کچھ لے کر آنے کا ارادہ کر کے نکلا تھا وہ کوئی بھی چیز مس کر ہونے والا نہیں تھا اس لیے علیزے کے معذوری ظاہر کرنے کے باوجود اس لیڈیز کاسمیٹکس شاپ میں داخل ہو گیا تھا اور مجبوراً اسے بھی اس کے پیچھے اندر آنا پڑا اور جیسے جیسے وہ اس کے لیے میک اپ اور دیگر ضرورت کی اشیا اٹھواتا جا رہا تھا علیزے کے گھڑے پانی ہوتی جا رہی تھی، اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ پھوٹ آیا تھا اور سیلز گرل علیزے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
"کیا یہ آپ کی وائف ہیں؟" جیسے ہی دل آور نے کاسمیٹکس سے بھرے ہوئے دونوں بیگ اٹھائے تھے تو ایک سیلز گرل سے رہا نہیں گیا تھا۔
"کیا آپ کو میری شاپنگ دیکھ کر نہیں لگ رہا کہ یہ میری وائف ہیں؟" اس نے شاپنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"ہوں..... لگ تو یہی رہا ہے سر اس لیے تو پوچھا ہے۔" وہ سیلز گرل مسکرائی تھی۔
"تو پھر ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ یہ میری وائف ہیں۔" دل آور نے لاپروا اور سرسری سے انداز میں بتایا تھا۔
"مجھ کو واقعی بہت خوش قسمت ہیں یہ۔ ایسا کیئرنگ ہزبینڈ کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔"
اس سیلز گرل نے خاصے رشک آمیز لہجے میں کہا تھا اور اس کی بات پہ جہاں دل آور کے قدم رُکے تھے وہیں علیزے کے دل کو بھی ایک دھچکا سا لگا تھا اور پھر دل آور کی سمت دیکھے بغیر اس شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔
"تھینک یو۔" دل آور بے حد آہستگی سے کہتا ہوا پلٹ کر شاپرز اٹھا کر اس کے پیچھے ہی نکل آیا تھا، علیزے کا رخ باہر کی طرف تھا مطلب تھا کہ وہ اب مزید ٹھہرنا نہیں چاہتی اس لیے دل آور بھی سر جھٹک کر لب بھینچتا ہوا اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ قدم گاڑی کے قریب آ کر ہی تھمے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان بات پھر بھی نہیں ہوئی تھی اور واپسی کا سفر ہنوز خاموشی میں طے ہوا تھا۔

♥

"کیا جاگ رہی ہو؟" نگارش اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دیتی ہوئی اندر آ گئی۔ جبکہ زری کی طرف سے کوئی بھی

جواب موصول نہیں ہوا تھا، وہ بستر پہ جس کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے وجود میں ذرا بھی حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی اس سے پہلے کہ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب بیڈ پہ ہی آ بیٹھی۔

''زری!'' نگارش کو پتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے اور جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہی۔

''زری! میں جانتی ہوں کہ تم جاگ رہی ہو لیکن پھر بھی جواب نہیں دے رہیں لیکن اس طرح چپ رہنے سے کیا ہوگا میری طرف دیکھو تو سہی جواب تو دو۔'' نگارش نے زری کو کندھے سے پکڑ کر اس کا رُخ اپنی طرف موڑنا چاہا تھا لیکن اسے لگاتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔ اسے بہت تیز بخار تھا اور نگارش کو خبر ہی نہیں تھی۔

''زری! تمہیں اتنا تیز بخار ہے اور تم نے بتایا ہی نہیں۔'' نگارش پریشانی اور تشویش سے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھنے لگی۔

''کوئی بخار نہیں ہے مجھے ٹھیک ہوں میں۔'' زری نے سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

''مگر زری! یہ کیا پاگل پن ہے؟ اپنے آپ سے کیا دشمنی ہے بھلا؟ خود کو کیوں سزا دے رہی ہو؟'' نگارش نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور خاصی خفگی کا اظہار کیا۔

''اپنے آپ سے ہی تو دشمنی ہے اور اب اپنے آپ کو ہی تو سزا دینی ہے۔ زری کو مار ڈالنا ہے جیتے جی مار ڈالنا ہے۔ زندگی جینے کا کوئی سبب بھی تو نہیں ہے نا؟'' زری تکیے کے سہارے اٹھ کر ذرا سی نیم دراز ہوگئی تھی اور اپنے ہاتھوں کو دیکھتی ڈبڈباتی آنکھوں کے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

''زری! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ زندگی جینے کا یہ کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے نا؟ بچھڑنے والوں کے ساتھ کوئی بچھڑ نہیں جاتا اور مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ مقدر میں جو کچھ ہے، جو انسان کے نصیب میں ہوتا ہے۔ تمہیں جو نہیں مل رہا اس پہ صبر کرو، تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پُرسکون ہو جاؤ گی۔ تمہیں اپنے نصیب پہ صبر آ جائے گا بس ایک بار اپنے آپ کو تسلی تو دو اپنے دل کو سمجھاؤ تو سہی۔''

نگارش نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے سمجھانے کی ہی کوشش کی تھی مگر اب وہ سمجھنے والی اسٹیج پہ نہیں تھی۔ اب اس کا دامن دلاسوں، صبر کی حدود سے نکل چکا تھا۔ اب اس کے دُکھ کے دامن میں محض بے صبری تھی، آنسو تھے اور آہیں تھیں۔

اب تو اسے تسلی بھی ایسے لگتی تھی جیسے گولی لگ گئی ہو اور اسی لیے وہ نگارش کی تسلی پہ بلبلا اٹھی تھی۔ اسے بہت درد ہوا تھا۔

''کیسے سمجھاؤں بھابی! کیسے سمجھاؤں؟ اور کب تک تسلیاں دوں اپنے آپ کو؟ کب تک بہلاؤں اپنے دل کو؟ کچھ بھی اب نہیں بہلایا جاتا مجھ سے..... اور..... اب صبر بھی نہیں ہوتا۔ اب کی بار کوئی مگ نہیں ٹوٹا کوئی دل نہیں ٹوٹا اب کی بار میں خود ٹوٹ گئی ہوں، بکھر گئی ہوں۔ میرا صبر اور میرا ضبط سب کچھ بکھر گیا ہے بھابی! میرے بس میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہو چکے ہیں، بالکل خالی۔'' زری اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتی ہوئی تڑپ تڑپ کر رو پڑی تھی۔

''پلیز زری! بس کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس طرح رونے سے تو تمہاری طبیعت مزید خراب ہوگی۔ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو..... اس طرح پاگل بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' نگارش نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''بھابی! جس شخص کی محبت کو آپ نے اپنے تن کا اوڑھنا بچھونا، اپنے من کا ہنسنا، رونا اور اپنا دین و ایمان سمجھ لیا ہو، اپنی دنیا اس کی خاطر تیاگ دی ہو، اپنا دل اس کے قدموں کی خاک پہ بھی وار دیا ہو۔ اور وہی شخص ایک روز اگر آپ سے یہ کہہ دے کہ میں مر گیا ہوں بھول جاؤ مجھ کو، میں تمہارا تھا ہی نہیں، میں پرایا ہوں، راستہ چھوڑ دو میرا..... تو پھر..... تو پھر آپ انصاف کریں بھابی! تو ایسے میں آپ کیا گزرے گی؟ کیسے تڑپیں گی آپ؟ اور کیسے روئیں گی آپ؟ کیا سمجھ جائیں گی؟ یا صبر آ جائے گا کیسے ہوگا یہ سب؟ بتائیں مجھے۔''

زری نے نگارش کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے متواتر رو رہی تھی مگر نگارش کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا وہ بیچاری خود بے بس ہو چکی تھی۔

''بھابی! بولیے نا..... آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ یا پھر اس کی طرح آپ کے پاس بھی میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے؟'' اس نے نگارش کے ہاتھوں کو ایک بار پھر اپنے گرم ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر متوجہ کیا تھا۔

''دیکھو زری! تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ تم فی الحال آرام کرو۔ میں تمہارے لیے چائے اور کھانے کے لیے کچھ ہوں۔ اس ٹاپک پہ پھر بات ہوگی۔'' نگارش نرمی سے کہتی اس کے ہاتھوں کو تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

مجھے کچھ مت دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اور نہ ہی مجھے کچھ لینا ہے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ خیلث نہ لیجئے
نہیں جاؤں گی۔ زندہ رہوں گی، دیکھ لیجیے گا مرنے والی نہیں ہوں میں۔"
زری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چائے اور خیلث سے انکار کر دیا تھا۔
زری! تم خود سوچو، اگر عبداللہ کو تمہاری اس حالت کا پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ کیا خیال کریں گے وہ؟ اس لیے پلیز
اس مسئلہ پر پردے میں ہے اسے پردے میں ہی رہنے دو۔ ورنہ بہت شاک لگے گا ان کو۔ کیونکہ ایسا کوئی مسئلہ تو ان کے خواب و
پر بھی نہیں ہوگا۔"
خاور اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ سمجھتی بھی تو تب نا؟
"بھائی! مرنے والا کبھی یہ نہیں سوچتا کہ میرے مرنے کے بعد کون کیا سوچے گا؟ اور کون کیا خیال کرے گا؟ وہ اس وقت بس
ہوتا ہے کہ وہ مر رہا ہے، وہ مٹ رہا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہا ہے اور اس ختم ہونے کا غم اسے کچھ بھی سوچنے
نہیں دیتا۔ اس لیے مجھے بھی اس وقت یہی سوچ کھائے جا رہی ہے کہ میں اندر ہی اندر مر رہی ہوں مٹ رہی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے ختم ہو رہی ہوں اور میرے ساتھ ساتھ میرا دل بھی مر رہا ہے اور اس دل میں پلنے والی محبت بھی مر رہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ خبر
نہیں کہ کون کیا سوچ رہا ہے؟ یا پھر کون کیا سوچے گا؟ بس آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ مجھے تنہا رہنے
دیں۔"
وہ بے تحاشہ روتے ہوئے نگارش کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور نگارش چند سیکنڈ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر
کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی گئی حالانکہ وہ زری کو بتانے آئی تھی کہ دل آور بھائی نے آج شام کو ان لوگوں کو اپنی طرف انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں
یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے کسی سے ملوانا ہے۔
"اب کس سے ملوانا ہے؟" وہ لوگ یہی سوچ سوچ کر تو حیران ہو رہے تھے۔
لیکن زری کی کنڈیشن دیکھ کر نگارش خاموشی سے چپ چاپ کچھ بھی کہے بغیر واپس چلی گئی اور زری اس کے جاتے ہی تکیے
پر منہ چھپائے اور زیادہ تڑپ تڑپ کے رونے لگی تھی۔

♥

خاور آفندی کے بیڈ روم میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ تینوں نفوس اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے خیال میں گم بیٹھے
ہوئے تھے۔ اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی طرف سے کچھ کہنے کے منتظر تھے۔ مگر کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان میں
سے کوئی کچھ بھی تو کیا کہتا؟
دیوار پر لگی کلاک کی سوئیوں کی ٹک ٹک تھی جو متواتر سنائی دے رہی تھی اور اسی ٹک ٹک کے دوران ہی اچانک موبائل کی رنگ
بجی تھی اور آذر نے بے ساختہ چونکتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور پھر یونہی ہاتھ بڑھا کے ٹیبل پر رکھے موبائل پہ بجتی کال
کو ریسیو کر دی تھی اور ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔ مگر اب کچھ کہنے کے ارادے سے سر جھکایا تھا اور تمہید
باندھنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔
"کہیں کبھی کبھی بُرے وقت میں اچھے دوستوں کی طرح الفاظ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، تب انسان کو اپنی مدد آپ کے
تحت سب کچھ خود سنبھالنا پڑتا ہے، سو اس وقت آذر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے بھی سب کچھ خود ہی سنبھالنا تھا۔
"ڈیڈ! ان ٹیکسٹ میں آپ کو اپنی فیلنگز اور اپنے اموشنز بیان کر کے نہیں بتا سکتا اور نہ ہی آپ لوگوں میں سے کوئی اس چیز کو سمجھ
سکتا ہے۔ اس لیے پلیز میری آپ سے یہی ریکوئسٹ ہے کہ آپ مجھے مجبور مت کریں۔ میں کومل سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے دل و
دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ میں اس معاملے میں خود کو بہت بے بس پا رہا ہوں۔ پلیز آپ ممی پاپا سے بھی کہہ دیں وہ مجھے
میرے حال پہ چھوڑ دیں۔" بالآخر اس نے جو دل و دماغ میں تھا وہ کہہ ہی دیا۔
اس کی بات پہ وقار آفندی نے نظروں کا زاویہ بدل کر آسیہ آفندی کی سمت دیکھا تھا جیسے ان سے کچھ کہنے کی التجا کی ہو اور
تبھی آسیہ آفندی جو ان کی نظروں کے زاویے بھی سمجھتی تھیں۔
"بیٹا! تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ دینا اس مسئلے کا کوئی حل بھی تو نہیں ہے نا؟ کومل اس گھر کی بڑی بیٹی ہے۔ اچھی ہے۔

خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات کہ تمہاری ہم عمر بھی ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا؟ جائیداد وغیرہ تو ہیں ہی اس سے چھوٹے اور دانیال کے لیے تو تم پہلے ہی حرمت کا کہہ چکے ہو اس لیے تم خود سوچ لو پھر کل کی نہ کہنا کہ کسی نے سمجھایا نہیں۔" آسیہ آفندی نے اسے ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"امی! یہ میرا مسئلہ نہیں ہے میرا مسئلہ اپنی ذات ہے، میں دوسروں کو دیکھوں یا اپنے آپ کو دیکھوں؟" آذر کا لہجہ بے زار ہو رہا تھا اور آسیہ آفندی کے ساتھ ساتھ وقار آفندی بھی اسے دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں بیٹا! اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مارنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنوں کی خاطر انسان کو اپنے کئی بھی قربانی دینی پڑ جاتی ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات وغیرہ کو دبا کر دوسروں کے جذبات اور احساسات کی قدر کرنی پڑتی ہے اپنے آپ کے بجائے دوسروں کو دیکھنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے انسان کے اندر حوصلہ، ظرف، صبر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ہر کوئی ایسی قربانی نہیں دے سکتا اور مجھے پتا ہے کہ تمہارے اندر حوصلہ بھی ہے ظرف بھی ہے اور صبر بھی ہے تم اپنے اور اپنی ذات کو مار سکتے ہو تم یہ قربانی دے سکتے ہو ورنہ یہ گھر جو پہلے ہی اتنا بکھر چکا ہے تمہارے اس انکار سے مزید بکھرتا ہوا اور بڑی حویلی کی تباہی پورا شہر دیکھے گا۔"

آسیہ آفندی اس کو ہر ممکن طریقے سے سمجھانا چاہ رہی تھیں اور آذر کے دل پہ اک سایہ سا لہرا گیا تھا (اور آذر آفندی کے دل کی تباہی کون دیکھے گا؟) آذر دکھ کی شدت سے محض سوچ کے رہ گیا تھا۔

"امی! مجھے کچھ وقت چاہیے، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے خاصے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"کیا کچھ وقت کے بعد تمہاری فیلنگز اور تمہارے اموشنز بدل جائیں گے؟ یا پھر..... یا پھر تم بدل جاؤ گے؟" آسیہ آفندی یہ مسئلہ حل کر کے ہی اٹھنا چاہتی تھیں اسی لیے آذر کو دیکھتے ہوئے ذرا توقف سے پھر گویا ہوئی تھیں۔

"دیکھو بیٹا! یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ کچھ وقت کے بعد بھی نہ تمہاری فیلنگز اور اموشنز بدلیں گے اور نہ ہی تم بدلو گے اور جب سب کچھ وہی رہنا ہے تو پھر کچھ وقت کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے فیصلہ ہی کرنا ہے نا؟ کل بھی اور آج بھی تو یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ فیصلہ تم آج ہی کر لو؟" انہوں نے ڈائریکٹ آذر کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا اور آذر نے اس کی سانس کھینچتے ہوئے سر اٹھا کر آسیہ آفندی اور وقار آفندی کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں امی! کہ میں یہ شادی کر لوں؟" اس نے جیسے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔

اور اس کے سوال پہ آسیہ آفندی نے وقار آفندی کو دیکھا تھا جن کے چہرے پہ اقرار نظر آ رہا تھا۔

"ہوں..... تو پھر ٹھیک ہے یہ فیصلہ میں آپ لوگوں پر چھوڑتا ہوں میرے لیے جی پاپا سے بڑھ کر آپ اور ڈیڈ ہیں آپ لوگ ہی فیصلہ کریں کے مجھے قبول ہو گا اگر میری ذات کی تباہی سے بڑی حویلی تباہی سے بچ سکتی ہے تو آپ لوگ بتائیں میں قربانی کے لیے حاضر ہوں۔" آذر یکدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان دونوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا ہوا پلٹ کر بیڈ روم سے نکل گیا تھا۔

"آذر!" آسیہ آفندی نے بے ساختہ پکارا مگر وہ اب تھم نہیں سکتا تھا اور وہ وقار آفندی کی طرف دیکھ کے رو دی تھیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں کیونکہ آذر کو انہوں نے اپنے سگے بیٹوں سے بھی بڑھ کے چاہا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت پہ خاص توجہ دی تھی۔

اس لیے آذر کی شخصیت اور ذہانت کا سہرا وقار آفندی کے سر ہی جاتا تھا اور آذر کی بھی سب سے زیادہ اٹیچ منٹ اور انڈرسٹینڈنگ ہی ان کے ساتھ تھی اسی لیے آذر کے انکار پہ اسرار آفندی اور ثروت بیگم نے یہ مسئلہ ان ہی کے سامنے رکھا تھا اور وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو اسے بلا کر سمجھانا پڑا تھا حالانکہ اس کے جذبات سے وہ دونوں بھی بہت اچھی طرح واقف تھے لیکن وہ بھی کر سکتے تھے بھلا۔

انہوں نے بھی سارے حالات مدنظر رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں یہ ہوا تھا کہ آذر نے اپنی زندگی کا فیصلہ ان پہ چھوڑ گیا تھا اور انہوں نے اللہ کا نام لے کر یہ فیصلہ کومل کے حق میں سنا دیا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ پوری حویلی کے تمام افراد ہی بہت خوش ہوئے تھے اک سوائے آذر آفندی کے۔

کے قریب زری کا بخار قدرے کم ہو چکا تھا۔ اسی لیے نگارش اسے باہر لان میں بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس ہی چلی آئی

اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" نگارش نے قریب آ کر باقاعدہ اس کی پیشانی اور کلائی کو چھو کر دیکھا تھا اس کا جسم پہلے کے مقابلے اب ذرا ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اس لیے وہ تھوڑی ریلیکس ہو گئی تھی۔

کچھ کھاؤ گی؟ لے کر آؤں تمہارے لیے۔" نگارش کو پتا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔

نہیں۔۔۔ ضرورت نہیں ہے۔" زری کا جواب تلخ سا محسوس ہو رہا تھا نگارش اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔

ہمارے ساتھ چلو گی اس کے گھر؟"

کس کے گھر؟" نگارش کے عجیب سے لب و لہجے پہ زری نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

تمہارے وکیل صاحب کے گھر۔"

کیوں۔۔۔ اس وقت کیوں؟" اسے حیرانی ہوئی تھی۔

یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اس وقت کیوں جانا ہے؟ بس اتنا پتا ہے کہ اس نے صبح فون کر کے ہمیں اور نبیل بھائی کی فیملی کو بلایا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں کسی سے ملوانا ہے اب وہ "کسی" کون ہے؟ یہ ہم میں سے کسی کو بھی خبر نہیں ہے۔"

اپنے ذہن میں ایک ایک سوالیہ نشان لیے گھوم رہے تھے۔

کچھ حال جو بھی ہے، جانا تو ہے ہی۔ اس لیے میں ذرا فریش ہونے کے لیے جا رہی تھی مگر سوچ رہی ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو تو زیادہ بہتر رہے گا کہ وہ کس سے ملوانا چاہ رہا ہے؟"

نگارش نے بات کرتے کرتے زری کو بھی چلنے کا اشارہ کیا تھا حالانکہ زری اس کی بات سن کر الجھ سی گئی تھی اور باقی سب کی طرح اسے بھی حیرانی ہوئی تھی کہ وہ آخر کس سے ملوانا چاہ رہا ہے اور ایسا کون سا رشتہ ہے اس کا جس کو وہ لوگ نہیں جانتے۔

کیا خیال ہے تمہارا چلو گی ہمارے ساتھ؟" نگارش نے الجھی ہوئی زری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

نہیں۔۔۔ میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ آپ لوگ چلے جائیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے جانے سے انکار کر دیا

تو کیا تم اب کبھی بھی اس کے گھر نہیں جاؤ گی؟ اور اگر نہیں جاؤ گی تو باقی سب کو کیا جواب دو گی کہ تم اس کے گھر کیوں نہیں گئیں پریشان ہو جائیں گے، میں جانتی ہوں، نبیل بھائی اور عبداللہ جاتے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں جاتیں؟ کیا وجہ بتاؤ گی سب کو؟" نگارش نے اس سے پوچھا تھا اور زری چپ ہو گئی تھی۔

لیکن بلایا تو اس نے آپ لوگوں کو ہے نا تو آپ لوگ جائیں، میرا جانا ضروری تو نہیں ہے۔" اس نے پھر ذرا توقف سے کہا تھا۔

اس نے تمہیں بھی بلایا ہے۔" اس کے جواب پہ نگارش جھنجلا کر بولی تھی۔

کچھ بھی؟" اب کی بار وہ الجھی تھی۔

ہاں۔۔۔ تمہیں بھی کیونکہ اس نے عبداللہ سے کہا ہے کہ بھابی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آ جانا اس لیے اب اس کی اس بات کا مطلب تو خود ہی سمجھ سکتی ہو کہ بھابی تو چلو میں ہو گئی تو پھر بھابی کے ساتھ یہ "وغیرہ" کون ہے؟ ورنہ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ بھابی کو ساتھ لے آنا۔" نگارش نے دل آور کی بات کا مفہوم اخذ کیا تھا اور زری کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔

تو کیا اب میں اس کی باتوں سے اس کے لفظوں کے مطلب ڈھونڈ کر اس کے گھر جاؤں گی؟" زری کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔۔ آخر وہ وکیل صاحب ہیں تمہارے۔ صاف بات کہنے کا تو پیشہ ہی نہیں ہے ان کا۔" نگارش ذرا غصہ ہوئی تھی اور زری پھر سے بپھر گئی۔

کیوں وہ میرے وکیل صاحب! وہ وقت اور تھا جب مجھے اس کو اس کے نام سے بلاتے ہوئے شرم آتی تھی، میں جھجکتی تھی اس کو اور شاہ کہتے ہوئے۔ اس لیے اسے اس کے پیشے کے حوالے سے بلاتی تھی مگر اب۔۔۔۔ اب وہ مر چکا ہے تو زندہ میں بھی ہو گئی ہوں وہ بھی میرے لیے کچھ اور نہیں صرف دل آور شاہ ہے جیسے سب کے لیے ہے، ویسے ہی میرے لیے بھی ہے۔ وہ جو

اک "خاص" بات تھی وہ ختم ہو چکی ہے اب یہاں کچھ بھی نہیں رہا۔"

زری بھرے ہوئے لہجے میں کہہ کر رو پڑی تھی اور نگارش، عبداللہ کی گاڑی گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

کیونکہ عبداللہ نے اسے گھر آنے سے پہلے کال بھی کی تھی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے تیار ہو جائیں لیکن وہ تیار ہونے کے بجائے یہاں زری کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اس لیے اسے اندازہ تھا کہ اب عبداللہ غصہ ضرور کرے گا کیونکہ ٹائم کافی زیادہ ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے تم لوگ ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو؟ تیار نہیں ہوئیں؟" عبداللہ کو اُلجھن ہوئی تھی۔

"وہ بس میں تیار ہونے کے لیے جا ہی رہی تھی کہ زری کو دیکھ کر رُک گئی تھی، زری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کہتی ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں میں نہیں جا رہی۔" نگارش نے زری کے سنبھلنے تک بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"ارے کیوں..... کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔" عبداللہ خاصی فکرمندی سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ہاں..... صبح بہت تیز بخار تھا اسے، لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ پہلے سے بہتر ہے۔" نگارش نے اسے تسلی دی تھی۔

"لیکن پھر بھی ایک بار ڈاکٹر کو تو دکھا لینا چاہیے تھا۔ اٹھو زری ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں بعد میں کہیں اور چلیں گے۔" عبداللہ نے اسے فوراً اُٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نن..... نہیں بھائی! اس کی ضرورت نہیں ہے، میں اب کافی ٹھیک ہوں۔" زری نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیا واقعی سچ کہہ رہی ہو؟" عبداللہ نے پورا یقین چاہا تھا۔

"جی..... سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ اثبات میں بولی تھی۔

"ہوں تو پھر جلدی سے اٹھو اور چینج کر کے آجاؤ ہمیں بس پانچ منٹ میں نکلنا ہے۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"مگر بھائی!" زری التجائیہ سے لہجے میں بڑبڑائی تھی۔

"اگر مگر کچھ نہیں، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے تمہیں گھر پہ اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو گی یہ بات ختم۔" عبداللہ نے جاتے جاتے پلٹ کر جواب دیا اور اندر چلا گیا تھا اور زری نگارش کو دیکھ کے رہ گئی تھی جو عبداللہ کے پیچھے اندر کی سمت قدم بڑھا چکی تھی۔

♥

علیزے کی شاپنگ کا سارا سامان گل نے ہی شاپنگ بیگز سے نکال کر وارڈ روب، ڈریسنگ ٹیبل اور باتھ روم میں سیٹ کیا تھا اور یہ کام کرتے ہوئے گل بھی اندر سے بہت خوش ہوئی تھی کہ چلو شکر ہے کہ علیزے بی بی کی زندگی بھی رفتہ رفتہ اپنے اصل نہج پہ سیٹ ہو رہی ہے، ورنہ وہ لوگ تو اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہتے تھے، لیکن اب انہیں بھی تسلی ہو گئی تھی کہ ان شاء اللہ اک دن علیزے بی بی بھی اپنے شایانِ شان زندگی بسر کرے گی اور گزشتہ تمام دُکھ، تمام اذیتیں اور تمام تکلیفیں بھول جائے گی اور یہ اللہ کی خاص رحمت ہو گی اس کی ذات پہ۔

کیونکہ اس کے صبر و برداشت کا پیمانہ بہت وسیع تھا اور اک نہ اک دن اللہ انسان کو اس کے صبر و برداشت کا صلہ ضرور دیتا ہے سو اسے بھی یہ صلہ ضرور ملے گا ان لوگوں کو پورا پورا یقین تھا۔

"گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کچھ دیر میں کپڑے چینج کر کے تیار ہو جائیں میرے کچھ مہمان آ رہے ہیں ان سے ملنے کے لیے۔" گل وارڈ روب بند کر کے پلٹ رہی تھی جب اندر داخل ہوتے دل آور کی آواز پہ ٹھٹک کر رُک گئی تھی کیونکہ علیزے سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی گل کو مخاطب کر کے پیغام دے رہا تھا اور گل کے لیے تو یہ بھی ایک حیرت کا مقام ہی تھا۔

"گل! اپنے صاحب جی سے کہو میں جانتی ہوں۔ اس لیے آپ فکر نہ کریں، میں کچھ دیر میں کپڑے چینج کر کے تیار ہو جاؤں گی۔" علیزے نے بھی جواباً اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا اور گل ان کے سوال و جواب پہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔

"گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کہ میں نیچے انتظار کر رہا ہوں جب بلاؤں تو وہ نیچے آ جائیں۔" اس نے ایک اور پیغام دیا تھا۔

"گل! اپنے صاحب جی سے کہو آپ جب بھی بلائیں گے میں آ جاؤں گی۔" اس نے فوراً پیغام کا جواب دیا تھا۔

"ہوں..... شکریہ۔" وہ کہتے ہوئے لب بھینچ کر پلٹا اور بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور علیزے گہری سانس خارج کر کے

"آپ کیا کرنا ہے بی بی جی! مہمان تو بس آتے ہی ہوں گے، گل کو بھی پتا تھا کہ نبیل اور عبداللہ اپنی فیملی کے ساتھ آ رہے ہیں۔

"تم میرے لیے کپڑے نکال دو، میں شاور لے لوں۔" علیزے سنجیدگی سے کہتی بیڈ سے اٹھ گئی تھی اور گل اثبات میں سر ہلا کر وارڈروب سے اس کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

♥

آج کوئی ہنر، کوئی روش، کوئی طریقہ تو بتاؤ
کہ دل ٹوٹے بھی نہ، وہ ملے بھی نہ اور چین آ جائے

ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے آ کر اس کے گھر کے ڈرائیوے پہ رکی تھی اور زری کے دل سے پھر ایک سایہ سا گزرا تھا کیونکہ وہ بنگلے بھی ڈرائیوے پہ عین ان کی گاڑی کے سامنے کھڑا تھا اور عبداللہ گاڑی کا انجن بند کر کے گاڑی سے نیچے اترا آیا اور ان کے ساتھ ہی تینوں عورتیں بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

"السلام علیکم دل آور بھائی! کیسے ہیں آپ؟" نگارش بھی اس کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔

"ویلکم السلام اللہ کا شکر ہے، میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیں آپ سب کیسے ہیں؟" اس نے بڑے تحمل اور سکون سے جواب دیا تھا زری اسے اک نظر دیکھ کر رخ پھیر گئی تھی کیونکہ وہ اسے آج بھی پرایا ہی نظر آیا تھا اور اس سے پہلے کہ نگارش کچھ کہتی اچانک ہی ڈرائیو وے میں ایک اور گاڑی آ کر رکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا تھا اور نبیل کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

"لو جی! وہ لوگ بھی آ گئے۔" عبداللہ نبیل کی گاڑی دیکھ کر مسکرایا۔

"بڑے وقت پہ پہنچے ہو دونوں۔" دل آور کا دل اندر سے بے حد افسردہ سا ہو رہا تھا کیونکہ وہ آج اپنے جان سے عزیز اور شہ رگ سے بھی قریب تر دوستوں کو ایک ناقابل یقین دھچکا دینے جا رہا تھا، جس کا اسے بے پناہ افسوس تھا اور پھر اس افسوس کے باوجود بھی اسے اپنے آپ کو کمپوز بھی کرنا پڑ رہا تھا اس لیے جس اذیت کا وہ شکار تھا وہ اسے اپنے چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا تھا اور یہ بھی اس کے لیے ایک اذیت ہی تھی۔

"کیا خیال ہے بھائی! ہم لوگ واپس چلیں؟ دل آور بھائی تو راستہ دینے والے نہیں لگ رہے؟" مدیحہ نے نبیل اور عبداللہ کو مخاطب کیا تھا اور دل آور بے ساختہ چونک گیا تھا۔

"ارے نہیں..... نہیں یار! آؤ آپ لوگ اندر آ جاؤ میں کافی دیر سے آپ لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" دل آور فوراً رستے سے ہٹ گیا تھا اور پھر وہ سب اس کے ساتھ چلتے اندر آ گئے تھے۔

"ارے بیٹا! میں تمہارے اس طرح اچانک سب کو ایک ساتھ بلانے پہ پریشان ہو گئی تھی صبح سے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ تم نے ہمیں بلایا ہے اور آخر کس سے ملوانا ہے؟ میں تو تم سے فون پہ ہی پوچھنے والی تھی لیکن نبیل نے ہی منع کر دیا تھا۔" فائزہ بیگم نے آج پہلی بار کچھ بولنے میں پہل کی تھی اور دل آور نے بمشکل مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی تھی ورنہ اس سے نہ تو مسکرایا جا رہا تھا اور نہ ہی ہنسے کچھ کہا جا رہا تھا مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا ان کو گھر بلا کر خود چپ ہو کر تو نہیں بیٹھنا تھا نا۔

"ہوں..... ابھی آپ بیٹھیں کھانا کھائیں کچھ ریلیکس کریں پھر آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے آپ کو کس سے ملوانا ہے۔" دل آور نے بات کو فی الحال سنجیدگی سے ٹال لیا تھا۔

"لیکن بھائی! اس طرح تجسس کے مارے تو کھانا بھی نہیں کھایا جائے گا۔" مدیحہ ذرا سا جھنجلائی تھی۔

"لیکن اس طرح تجسس ختم ہو جانے کے بعد بھی تم سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔" دل آور کو ان سب کے ردعمل کا پہلے سے ہی کچھ اچھی طرح سے اندازہ تھا۔

"ارے! ایسا کون سا تجسس ہے جس کی دونوں صورتیں ہی خطرناک ہیں، جاننا بھی اور نہ جاننا بھی؟" مدیحہ جان بوجھ کر دل آور کو موڈ خوشگوار کرنے کے لیے بے حد زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔

"ایس ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اپنی وے آپ لوگ فی الحال کھانا کھائیں کھانا تیار ہے یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی

رہیں گی۔ زلفی! زلفی! گل سے کہو کھانا لگا دے۔'' دل آور، مدیحہ سے کہتے ہوئے زلفی کو پکارنے لگا۔

''جی صاحب جی! ابھی کہہ دیتا ہوں۔'' وہ سر ہلا کر فوراً چلا گیا۔

اور پھر ٹھیک دس منٹ کے بعد گل نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا تھا اور وہ سب ڈائننگ روم میں آ گئے تھے۔

سبھی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران ٹھیک ٹھاک طریقے سے کھانا کھا رہے تھے لیکن ایک صرف وہ تھا یا زری تھی جس سے کھانے کا نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا کہ اک بے ارادہ ہی نظر اٹھی تھی اس کی طرف اور پھر وہی نظر اس کی مرمجائی ہوئی صورت پر کرب و درد سے کراہ کے جھک گئی تھی۔

اور یہی حال زری کا بھی ہوا تھا اس کی نظر بھی بے اختیار اس پر جا پڑی تھی اور اس کو یوں چپ چپ اور بوجھل سا دیکھ کر اس کی نظر بھی پانیوں سے دھندلا گئی تھی۔

''کیا بات ہے دل آور بے! تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟'' نبیل نے اس کے سامنے کھانا جوں کا توں رکھے دیکھا تو خاصی تشویش ہوئی تھی۔

''بس یار! ایسے ہی..... دن میں کھانا کافی لیٹ کھایا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے۔'' دل آور نے اسے ٹالنے کے لیے اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیے تھے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' عبداللہ کو بھی فکر ہوئی تھی۔

''ہوں..... بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تم لوگ کھانا کھاؤ پھر بات ہوتی ہے۔'' اس نے انہیں ریلیکس کیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد کھانے سے فارغ ہو کر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تھے۔

''تمہاری کیسی طبیعت ہے بیٹا! بخار کم ہوا؟'' فائزہ بیگم نے زری کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے اس کی کلائی کو چھو کر دیکھا تھا۔

''جی پہلے سے بہتر ہوں میں تو گھر پہ ہی رہنا چاہ رہی تھی، لیکن بھائی اور بھابی نے ہی نہیں رُکنے دیا، بخار کی وجہ سے ماتھا تھکن ہو رہی ہے۔'' زری کی آواز اور لہجہ بھی خاصا خدشہ حال لگ رہا تھا دل آور اس کی بات سن کر رُخ پھیر گیا تھا تاکہ نظر وہ اسے دیکھنے کی غلطی نہ کرے۔

''ہاں..... تو اچھا کیا ہے نا انہوں نے، بخار کی حالت میں تمہیں گھر پہ کیسے چھوڑ آتے؟'' فائزہ بیگم نے ان کی جانب دیکھ کر جواب دیا تھا اور ذرا فاصلے پہ بیٹھے دل آور کو مزید شرمندگی ہوئی تھی۔

''ایم سوری! میری وجہ سے آپ کو زحمت اُٹھانا پڑی ہے، لیکن مجبوری تھی آپ سب کو یہاں بلانا اور بتانا بھی ضروری تھا کیونکہ آپ لوگ میرے لیے پریشان تھے آپ کو فکر تھی کہ میں اکیلا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میری فیملی ہے اور میرا اکیلا پن شیئر کرنے کے لیے کوئی اور بھی ہے ایک ایسا رشتہ جو انسان کے ہر اچھے اور بُرے وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہے ساتھی کہلاتا ہے اس لیے اپنے اسی رشتے سے ملوانے کے لیے میں نے آپ سب کو یہاں بلایا ہے۔ اُمید ہے کہ اگر آپ لوگوں کو یہ اچھا نہ لگا تو زیادہ بُرا بھی نہیں لگے گا۔'' دل آور کو زندگی میں پہلی بار کچھ کہتے ہوئے اتنی پریشانی اور پریشانی کا سامنا ہو رہا تھا۔ وہ بات کہتے ہوئے ڈرنے اور جھجکنے والا آدمی نہیں تھا اس کی تو ہر بات کھری اور دو ٹوک ہوتی تھی۔

''دل آور بے! تم کیا کہہ رہے ہو ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟'' عبداللہ کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اُلجھے ہوئے بیٹھے تھے۔

''ہوں..... مجھے پتا ہے کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں سمجھو گے اور نہ ہی میں تم لوگوں کو سمجھا پاؤں گا، لیکن پھر بھی بتانا تو ہے ہی۔'' اس نے کہتے ہوئے سب کو چائے سرو کرتی گل کی طرف دیکھا تھا۔

''جاؤ گل! علیزے بی بی کو اپنے ساتھ لے آؤ۔'' اس نے علیزے کو سب کے سامنے لانے کا حکم دے ہی دیا تھا اور وہ سب حیران پریشان سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے؟ اور ہو کیا رہا ہے۔

''جی صاحب! ابھی لے آتی ہوں؟'' گل ٹرے اک سائیڈ پہ رکھ کے پلٹ کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی اور پھر کچھ ہی منٹ لگے تھے گل کی واپسی کو اور ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہونے کو، کیونکہ گل کے ساتھ علیزے بھی تھی جو ان سب کے سامنے کسی مرمر کی مورت کی طرح آ کھڑی ہوئی تھی۔

''السلام علیکم!'' علیزے اندر سے بہت کنفیوژ بھی تھی مگر کیا کرتی زندگی کا یہ لمحہ بھی تو اک دن فیس کرنا ہی تھا سو اپنے اندر

گئی تھی اور وہ لے ہی آئی تھی۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے بمشکل اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور دل آور اپنے آپ کو کنٹرول کرتا ہوا صوفے سے اٹھا اور ان کے قریب اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔

"علیزے! ان سے ملو یہ میرے بہت ہی گہرے دوست نبیل حیات کی مدر ہیں۔ فائزہ آنٹی اور میرے لیے بھی بالکل میری طرح ہیں اور فائزہ آنٹی! یہ علیزے میری بیوی سنرول آور شاہ۔"

اس نے علیزے کو فائزہ بیگم سے متعارف کرواتے ہوئے باقی تمام افراد پہ جیسے انتہائی تباہ کن بم پھوڑ دیا تھا اور بیٹھے بیٹھے ان کے دل و دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے اور آس پاس سب کچھ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"سنرول آور شاہ۔" زری کے ہونٹ ذرا سا کپکپائے تھے اور پھر وہیں کے وہیں ساکت و صامت بھی ہو گئے تھے۔

"دل آور! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم ہوش میں تو ہو نا؟" عبداللہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں وہ آپ سب سن رہے ہیں یہ کوئی مذاق نہیں ہے یہ ایک سچ ہے ایک ٹھوس حقیقت ہے یہ میری بیوی ہے میں آپ سب کو اپنی بیوی سے خود ملوا رہا ہوں آج سے چار دن پہلے ہی ہمارا نکاح ہوا ہے اور یہ نکاح صرف نکاح ہی نہیں ہے اسے لو میرج بھی کہتے ہیں اس لیے مجھے یہ بتانے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ یہ میری اور علیزے کی لو میرج ہے اور اس لو میرج کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اماں نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور یہ لو میرج ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی آخری سانسوں کے دوران ہوئی ہے حالانکہ اماں میری شادی کہیں اور کرنا چاہتی تھیں انہوں نے کسی اور کو پسند کر رکھا تھا۔

مگر..... مجھے..... علیزے پسند تھی اس لیے اس وقت علیزے آپ سب کے سامنے میرے دل آور شاہ کے روپ میں موجود ہے۔" دل آور نے اپنی طرف سے انہیں بہت سکون، ٹھہراؤ اور تفصیل سے جواب دیا تھا اور اس کے جواب پہ وہ سب اپنی جگہ کھڑے ہونے پہ مجبور ہو گئے تھے لیکن ان سب میں صرف زری تھی جس سے اپنے قدموں پہ کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا مگر اس نے ابھی تک ایک ہی لفظ پہ اٹکے ہوئے تھے۔

"سنرول آور شاہ۔" اس کے منہ سے یہ نام، یہ حوالہ اک سسکی کی طرح برآمد ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا سے گئے تھے۔

"زری....." ان سب نے بے ساختہ چونک کر زری کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ عشق کا پیکر عرش سے فرش پہ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا تھا اور وہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

زری اپاہج کھڑے قد سے تیورا کے گری تھی اور منہ کے بل گرنے کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لت پت سی ہو گئی تھی جس پہ ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کیونکہ سامنے کا منظر ناقابل یقین تھا۔

"زری....." عبداللہ تڑپ کے اس کی طرف لپکا تھا اور بڑی تیزی سے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر سیدھا کیا تھا اس کی خوبصورت ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جو عبداللہ کے ہاتھوں کو بھی رنگین کر گیا تھا۔

"زری....." عبداللہ نے اسے جھنجوڑا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا ہو اور دوسری طرف دل نبیل حیات اپنی رگوں سے زندگی کے خون کی طرح بہتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جبکہ نبیل حیات عشق کے اس انکشاف پہ جہاں کا تھا وہیں پتھر ہوا کھڑا تھا۔

♥

اور یہ بات صرف زری کی ہی بات نہیں تھی کہ صرف وہ ہی منہ کے بل گری تھی۔

بلکہ دیکھا جائے تو وہاں موجود سبھی افراد ہی منہ کے بل گرے تھے۔

چوٹ بھی سبھی کو آئی تھی اور درد بھی سبھی کو ہوا تھا۔

فرق صرف اتنا تھا کہ زری کا خون بہہ نکلا تھا اور ان سب کے دل و دماغ اندر ہی اندر لہولہان ہو گئے تھے لیکن اس چوٹ، خون خرابے کا سلسلہ تو دل آور شاہ کے گھر سے لے کر ہسپتال پہنچنے تک ہنوز جاری ہی رہا تھا، جس کے باعث وہ سب اپنی اپنی ذات کی اپنی اپنی اذیت میں گم ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے انجان کھڑے تھے کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں تھا سب

اپنی ہی تکلیف میں مبتلا تھے۔

دل آور کا درد اور تھا..... نبیل کی چوٹ اور تھی، عبداللہ کے رنج اور تھے۔

وہ تینوں ہی خود کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں سمجھ رہے تھے اور اس کرب انگیز عالم میں اچانک ہی آئی سی یو روم کا دروازہ کھول کر باقی ڈاکٹرز اور نرسوں کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔

''مسٹر ملک!'' ڈاکٹر لودھی نے سامنے کھڑے عبداللہ کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چونک گیا تھا۔

''ہوں..... ہاں..... ڈ..... ڈاکٹر صاحب..... اب..... اب کیسی ہے وہ؟ اسے..... اسے ہوش آ گیا؟ وہ..... وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟''

عبداللہ کی آواز جیسے لرز رہی تھی اور اس نے اپنی پریشانی اور بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے ساختہ اک اضطراب کی سی کیفیت میں ڈاکٹر لودھی کا بازو پکڑ لیا تھا اور اپنے اس اضطراب اور بے چینی میں اس نے ڈاکٹر کا مایوس چہرہ بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔

''بتائیں نا ڈاکٹر صاحب! اسے ہوش آیا، یا نہیں؟ وہ..... وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟'' ڈاکٹر کی خاموشی پہ عبداللہ نے کافی گھبرا کے پوچھا تھا اور جواباً ڈاکٹر لودھی نے اپنا بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''پلیز ملک صاحب! آپ اللہ پہ بھروسہ اور تسلی رکھیں، وہ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ڈاکٹر لودھی نے اس کے ہاتھ کو تھپکا تھا۔

''وہ..... وہ ٹھیک ہو جائے گی؟ مطلب وہ..... وہ اب ٹھیک نہیں ہے؟'' عبداللہ کو مزید جھٹکا لگا تھا اور تشویش کے مارے اس کا دل تو جیسے مٹھی میں ہی آ گیا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا دھیما اور سست سا لہجہ ہی بتا رہا تھا کہ بات غیر معمولی ہے۔

''ہوں..... اوکے..... آیئے میرے ساتھ..... بتاتا ہوں آپ کو۔'' ڈاکٹر کہہ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گئے تھے، اور عبداللہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے ہلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

''عبداللہ! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ جایئے نا..... ڈاکٹر کے پاس جایئے۔'' نگارش اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی اس کے قریب آ گئی تھی۔

''ہوں..... جا رہا ہوں۔'' وہ نگارش کے متوجہ کرنے پہ ایک بار پھر ہمت باندھنے پر مجبور ہو گیا تھا اور جانے سے پہلے بے ساختہ گردن موڑ کر دل آور اور نبیل کی سمت دیکھا جس پہ وہ دونوں چپ چاپ آگے بڑھ کے اس کے ساتھ ڈاکٹر لودھی کے روم میں گئے تھے۔

''پلیز..... تشریف رکھیے۔'' ڈاکٹر نے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

''تھینک یو۔'' عبداللہ نے بے حد آہستگی سے شکریہ ادا کیا تھا۔

''مس زرین ملک آپ کی سسٹر ہیں؟'' ڈاکٹر لودھی کو پہلے ہی پتا تھا لیکن انہوں نے ایک بار پھر کنفرم کرنا چاہا تھا۔

''جی..... '' وہ بمشکل کہہ پایا تھا۔

''او یہ؟'' ڈاکٹر لودھی نے نبیل اور دل آور کی طرف دیکھا تھا۔

''میرے دوست بھی کہہ سکتے ہیں اور میرے بھائی بھی۔'' عبداللہ نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔ ''مس زرین ملک کے ہزبینڈ یا فیانسی وغیرہ؟'' ڈاکٹر کے اگلے سوال پہ عبداللہ نے لب بھینچ لیے تھے اور اس وقت اس کی کنڈیشن کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ دل آور نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھ کے اس کا کندھا ہلکے سے دبایا تھا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ تسلی اور یہ ڈھارس عبداللہ کے لیے کتنی کھوکھلی سی ہے

''مسٹر ملک!'' ڈاکٹر لودھی نے اسے جواب کے لیے اکسایا تھا۔

''نہیں..... ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ان میرڈ ہے۔'' عبداللہ نے بڑے صبر اور ضبط سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کے دل و دماغ کو ایسا کون سا صدمہ پہنچا ہے کہ وہ کوما میں چلی گئی ہیں۔'' ڈاکٹر لودھی کے اگلے سوال پہ ان تینوں کو یوں لگا تھا کہ جیسے ہسپتال کی بلند و بالا عمارت کی چھت ان کے سروں پہ ہی آ گری ہو۔ اور انہوں نے تقریباً جھٹکے سے سر اٹھا کر ڈاکٹر کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"کوما میں..... یہ..... کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" عبداللہ نے زیرِ لب دہرا کے پوچھا تھا مگر ان دونوں میں تو اتنی سی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ زبان سے کوئی لفظ ہی دہرا لیتے۔

"جی ہاں..... وہ کوما میں چلی گئی ہیں، اور یہ سب کچھ کسی گہری چوٹ اور کسی گہرے صدمے کی وجہ سے ہوا ہے۔"

ڈاکٹر لودھی نے اپنے پورے تجربے اور پورے وثوق سے چیک اپ اور ٹیسٹ کروانے کے بعد انہیں یہ ہولناک خبر سنائی تھی۔

"مم..... مگر..... یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ..... وہ کوما میں کیسے جا سکتی ہے؟ اسے تو بہت معمولی سی چوٹ آئی ہے اور..... اور نہ تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔" عبداللہ رہ رہا کے لہجے میں پوچھ رہا تھا اور ڈاکٹر لودھی اس کی کم عقلی پہ افسوس سے سر جھٹک کر رہ گئے تھے۔

"آپ سے کس نے کہا کہ انہیں بہت معمولی سی چوٹ آئی ہے؟" ڈاکٹر کا لہجہ کافی استہزائیہ سا ہو چکا تھا۔

اور ذرا سے توقف کے بعد دوبارہ سے بات کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔

"مسٹر ملک! آپ نہیں جانتے۔ آپ کبھی اندازا بھی نہیں کر سکتے کہ انہیں کتنی گہری چوٹ آئی ہے اور کتنا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اس وقت صدمے کی اس اسٹیج پر ہیں کہ جہاں انسان کا جسم، اس کا دل و دماغ اور اس کی عقل بیک وقت مفلوج ہو کے رہ جاتے ہیں اور پھر اس اسٹیج سے واپس آنا مریض کے اور ڈاکٹرز کے اختیار میں نہیں رہتا، بلکہ اللہ کی طرف سے ایک معجزہ بن جاتا ہے، اور اب آپ کو بھی اس معجزے کا انتظار کرنا ہوگا، کیونکہ مس زرین ملک کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے وہ بھی گہرے اور بہت بڑے شاک میں ہیں، ورنہ اتنی سی چوٹ یا اتنے سے صدمے سے کوئی بھی پوسٹ کوما میں نہیں جا سکتا۔ بس آپ لوگوں کی دعا اور اللہ کی نظرِ کرم ہی ہیں جو یہ طبیعت کر سکتی ہے، جس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دو دن میں ہی ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آئیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں دو مہینے بھی ہوش نہ آئے۔"

ڈاکٹر لودھی نے انہیں پوری تفصیل سے آگاہ کیا تھا اور وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پہ دم بخود سے بیٹھے رہ گئے اور عبداللہ کو تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بیٹھے بیٹھے وہ خود بھی مفلوج ہو گیا ہو، اور اس کی عقل بھی پتھرا گئی ہو، کیونکہ اب ان دونوں کے سامنے وہ ڈاکٹر کو کیسے بتاتا کہ اسے کیا صدمہ پہنچا ہے؟ اور اسے کیسی چوٹ لگی ہے؟ وہ تو اتنی دیر سے خود اپنی سوچوں اور اپنے خیالات کی نفی کرتا پھر رہا تھا، لیکن ڈاکٹر لودھی نے اس کی سوچوں اور خیالات پہ تصدیق کی مہر لگا دی کہ وہ جو سوچ رہا ہے، وہ سچ ہے۔

زری بہ کے بل گری..... بلکہ پاش پاش ہو گئی ہے..... ٹوٹ گئی ہے..... بکھر گئی ہے..... لٹ گئی ہے..... صرف اور صرف دل شہر شاہ کی خاطر۔

صرف اس کی چاہ میں، اس کی محبت میں اور صرف اس کے عشق میں اور اس کی اس چاہ اور اس عشق نے عبداللہ جیسے آدمی کو بھی تڑوا لیا تھا اور ڈاکٹر لودھی کے روم سے اپنے قدموں پہ اپنی لاش گھسیٹتا ہوا باہر آیا تھا۔

♥

کچھ ماہ بعد.....

باہر موسم بے حد اچھا ہو رہا تھا، ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور اس تیز اور ٹھنڈی ہوا میں بھی ہلکی سی نمی محسوس ہو رہی تھی اور بارش کے آثار بھی صاف دکھائی دیتے تھے اسی لیے موسم کا ایسا موڈ اور ایسے تیور دیکھ کر علیزے جلدی سے چھت پہ دھو کر پھیلائے ہوئے اپنے اور دل آور کے کپڑے اتار کر نیچے لے آئی تھی لیکن نیچے آتے آتے بھی ہوا میں رچی نمی کی بدولت اس کا اپنا چہرہ بھی نم آلود سا ہو گیا تھا، اور وہ اپنے دوپٹے سے یہ نمی پونچھتی ہوئی کپڑے بازو پہ اٹھائے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

حالانکہ پہلے کام کل کی ذمہ ہوتے تھے مگر جب سے علیزے کو اس گھر میں بیوی کا درجہ ملا تھا اس نے خود بخود ہی اس گھر کی تمام ذمہ داریوں میں شریک ہونا شروع کر دیا تھا، وہ بیڈ روم اور کچن سے باہر لان تک تمام کام خود کرنے لگی تھی اور یونہی کرتے کرتے ان چند دنوں میں وہ ہر کام میں طاق ہو گئی تھی۔ برتن دھونے سے کپڑے دھونے تک اور چولہا جلانے سے لے کر دل جلانے تک وہ سب کچھ سیکھ گئی تھی آخر زندگی میں اور کچھ نہیں سیکھا تھا تو پھر یہ تو سیکھنا ہی تھا نا۔

"ارے علیزے بی بی! لائیے یہ کپڑے میں رکھ آتی ہوں۔" گل میرس سے کرسیاں بنا کر ادھر ہی آ رہی تھی کہ علیزے کو اتنے سارے کپڑے اٹھائے ہوئے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔

"نہیں..... تم رہنے دو۔ میں خود رکھ لوں گی۔ بس تم ایسا کرو کہ ڈنی یا گلاب خان سے کہو بل ڈوگ کو اس کے کمرے میں لے جائیں، باہر بارش شروع ہونے والی ہے۔" علیزے نے گل کو نیچے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی ٹھیک ہے کہہ دیتی ہوں۔" گل سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ کے سیڑھیاں اُتر گئی تھی اور اتنے میں دل آور بھی سیڑھیاں طے کر آیا تھا۔

"السلام علیکم!" علیزے نے اس پہ "سلامتی" بھیجی تھی اور وہ محض سر ہلا کے اس کے پاس سے گزر کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ علیزے نے بھی بیڈ روم میں ہی آنا تھا سو مجبوراً ڈھیلے ڈھالے قدم اُٹھاتی ہوئی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔ دل آور اپنا بریف کیس اور کوٹ صوفے پہ ڈال کر بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا، وہ کپڑے لے کر وارڈ روب کی سمت بڑھ آئی تھی اور وارڈ روب کے درمیانی دونوں پٹ کھول کر اپنے اور اس کے کپڑے تہہ کر کے الگ الگ خانوں میں رکھنے لگی۔

"کپڑے نکال دوں؟ چینج کرنے ہیں؟" علیزے نے بیڈ پہ چاروں شانے چت لیٹے دل آور کو ایک نظر دیکھتے ہوئے وارڈ روب کا تیسرا پٹ کھولا تھا جس میں اس کے تمام پریس شدہ کپڑے ہینگ کیے ہوئے تھے۔ "ہوں نکال دو۔" اس نے بے حد آہستگی سے کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے۔ علیزے اس کا وائٹ شلوار سوٹ نکال کر واش روم میں رکھ آئی اب اس کا رُخ کچن میں جانے کا تھا، لیکن دل آور کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹکے تھے۔

"گل سے کہو میرے لیے ایک کپ چائے لے آئے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے پیغام دیا تھا اور علیزے کچھ کہے بغیر بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی اور یہ تو چھ ماہ سے ہو رہا تھا، دل آور نے جو بھی کام کہنا ہوتا تھا وہ گل کا نام لیتا تھا اور وہی وہ علیزے کر کے اس کے سامنے رکھ دیتی تھی۔

اس وقت بھی وہ خود ہی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"ڈرائیور۔" اس نے قریب آ کر آواز دی تھی۔

"ہوں۔" دل آور نے چونک کر دیکھا تھا۔

"چائے۔" علیزے نے کپ سامنے کیا تھا اور وہ بے ساختہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔ اور علیزے اسے کپ تھمانے کے بعد واپس جانے پلٹ گئی تھی۔

"زری سے مل کر آئے ہو؟" علیزے کے اچانک سوال پر دل آور نے بھی اچانک سر اُٹھا کر دیکھا تھا اس کے چہرے کی رنگت اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ علیزے چونکی تھی۔

"نہیں....." اس نے ہمیشہ کی طرح نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیوں..... تم تو کہہ کر گئے تھے کہ اس سے مل آؤ گے۔" اسے تعجب ہوا تھا۔

"یہ تو میں ہمیشہ کہہ کر جاتا ہوں۔" دل آور کے لہجے میں استہزا کا رنگ تھا۔

"تو پھر ملتے کیوں نہیں؟" وہ جھنجھلائی تھی۔

"کیونکہ میں ملنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مجھ میں حوصلہ نہیں ہے، کیونکہ میں اس قابل نہیں رہا۔" وہ اس سے بھی زیادہ جھنجھلایا تھا۔

"مگر وہ تو تم سے ملنا چاہتی ہے نا۔" علیزے نے زری کے چاہنے پہ زور دیا تھا۔

"ہونہہ..... پھر تو وہ اور بھی بہت کچھ چاہتی ہے؟" دل آور کا لہجہ بھنکارا تھا۔

"تو کر دو نا پوری اس کی چاہت، جو وہ چاہتی ہے۔" وہ بہت سپاٹ اور بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"علیزے پلیز..... جاؤ یہاں سے، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" دل آور نے اپنی فرسٹریشن سے زچ ہو کر بہت بے بسی سے علیزے سے کہا تھا اور علیزے چند سیکنڈ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

ابھی وہ بیڈ روم سے نکل کر نیچے ڈرائنگ روم میں آئی ہی تھی کہ لینڈ لائن فون کی رنگ بجنے لگی اور علیزے نے گل کی غیر حاضری

...ر کو دیکھا۔

"گل... گل کہاں ہو؟ فون بج رہا ہے۔" اس نے گل کو آوازیں دی تھیں مگر وہ شاید آس پاس کہیں نہیں تھی اس لیے مجبوراً ...ے کو خود ہی کال اٹینڈ کرنا پڑی حالانکہ وہ فون کالز بہت کم اٹینڈ کرتی تھی۔

"ہیلو..." اس نے بہت دھیمی آواز میں ہیلو کہا تھا۔

"السلام علیکم میڈم! میں قادر بات کر رہا ہوں صاحب کا منشی۔" دوسری طرف سے چھوٹتے ہی اپنا تعارف کروایا گیا تھا اور ...ے نے پہلے بھی ایک دو بار اس کا نام سن رکھا تھا اس لیے قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔

"وعلیکم السلام! کیسے کیسے فون کیا آپ نے؟" علیزے کا لہجہ تھوڑا نارمل ہو چکا تھا۔

"بس میڈم! مجھے پوچھنا تھا کہ صاحب گھر پہنچ گئے؟" وہ کافی جھجک کے بات کر رہا تھا۔

"جی پہنچ گئے ہیں۔ کیوں خیریت؟ کوئی پیغام وغیرہ ہے ان کے لیے۔" علیزے نے خود ہی اندازا لگانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں... کوئی پیغام وغیرہ نہیں ہے۔ بس میں صرف ان کی طبیعت کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا دراصل وہ جب یہاں سے ...لے تو انہیں بہت تیز بخار تھا اور اس بخار کی حالت میں وہ ڈرائیو کر کے گئے ہیں، اس لیے مجھے پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچے ہیں یا نہیں؟" قادر اپنی پریشانی بتا رہا تھا اور علیزے اپنی بے وجہ پریشانی میں تھی۔

"ڈرائیور کو بخار ہے اور اس نے بتایا بھی نہیں۔" ڈریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ کے رہ گئی۔

"ہیلو۔" اس کی طرف سے خاموشی پا کر قادر کو تصدیق کرنے کے لیے ہیلو کہنا ہی پڑا تھا کہ وہ لائن پہ ہے یا نہیں۔

"جی ہاں... سن رہی ہوں۔ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے ان کے لیے اتنی زحمت کی تھینک یو سو مچ۔ میں ان کو بتا دوں گی کہ آپ کی کال آئی تھی۔"

علیزے نے ایک سمجھدار اور سلجھی ہوئی بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے قادر کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر اللہ حافظ کہنے کے بعد ...ن بند کر دیا تھا۔

اس نے اگر اپنی طبیعت کا نہیں بتایا تو مجھے انوالو ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ بخار ہوتا ہے تو ہوتا رہے، بلکہ میری طرف سے مر ہی جائے۔ اتنے سے بخار سے کون سا مر جائے گا۔

وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی اپنے دل میں آنے والی پریشانی کو سر جھٹک کر پیچھے دھکیلتی ہوئی کچن میں آ گئی تھی اور پھر واقعی وہ اپنے کام میں لگ کر اس کی پریشانی بھول گئی تھی۔

♥

ضبط کرتا ہوں تو
ہر زخم لہو دیتا ہے
آہ کرتا ہوں تو
اندیشہ رسوائی ہے
دیکھتا ہوں تو
ہزاروں ہیں میرے دوست مگر
سوچتا ہوں تو
وہی عالم تنہائی ہے

وہ نبیل حیات جو ہمیشہ بہت ہی فریش اور رومانٹک موڈ میں رہتا تھا۔
جس کی ڈیسنٹ پرسنالٹی اپنی جگہ ایک متاثر کن اثر رکھتی تھی۔
جس کا سکون اور تحمل قابل رشک سمجھا جاتا تھا۔
جس کی محبت میں بھی ایک ٹھہراؤ تھا، صبر تھا، قناعت تھی۔
جس نے زری کو ہمیشہ چاہا، دل کی گہرائیوں اور شدتوں سے چاہا تھا۔

PRIME URDU NOVELS

لیکن اسے جب بھی، جہاں بھی دیکھا۔ ٹھہر ٹھہر اور ڈر ڈر کر دیکھا تھا۔
مگر یہ بات بھی سچ تھی کہ اسے دل میں سجایا بہت تھا۔
کبھی دل کے اس کونے میں رکھا کبھی دل کے اس کونے میں رکھا۔ اور پھر ایک دن آخر اسے اپنا دل ہی بنا ڈالا تھا۔
مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ دل دھڑکے گا بھی تو کسی اور کے لیے۔
طلب کرے گا تو کسی اور کو۔
تڑپے گا تو کسی اور کے لیے۔
اور نبیل حیات اپنے سینے میں اک خلا لے کر رہ جائے گا۔
اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا، بالکل خالی ہاتھ ہو جائے گا۔
اس کی محبتیں، اس کی چاہتیں، اس کے خواب اور اس کی خواہش سب کچھ دل کے طاق پر رکھے رہ گئے تھے، اور اسے اک عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔
اس کی خاموش محبت نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر ڈالا تھا۔
سارے اظہار اور ارمان دل میں ہی دم توڑ گئے تھے اور ان مردہ خواہشوں اور مردہ ارمانوں کا زہر اس کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے جسم و جان کو بھی زہر آلود کر رہا تھا۔
وہ دن بہ دن مر رہا تھا۔ زردی سے بھی زیادہ نازک حالت اس کی تھی کیونکہ زردی تو گو مامی تھی اور سکون میں تھی مگر وہ ہوش میں تھا، لیکن حواسوں میں تھا اور اسی وجہ سے درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، چوٹ بھی گہری ہوتی جا رہی تھی اور زخم ہر دن اور ہر رات کے بعد ناسور بن رہا تھا۔
اور ان سب کیفیات کی اذیت سے نبیل کو اکثر اپنی سانس اپنے ہی سینے میں گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور وہ اپنی اس حالت پہ بے بس سا ہو کر اکثر پاگلوں کی طرح سڑکوں کی خاک چھاننے نکل کھڑا ہوتا اور جب بُری طرح تھک جاتا تو دوبارہ واپس لوٹ آتا تھا۔
مگر یہ تو فائزہ بیگم اور مدیحہ ہی جانتی ہیں کہ وہ واپس لوٹ کر بھی واپس نہیں لوٹتا بلکہ باہر ہی کہیں راہوں میں، بھٹکتا رہتا سفر اس منزل کے غم میں جو کسی کا بھی نصیب نہیں تھی۔
جو خود بھی نامراد ٹھہری تھی اور اس کو چاہ کر نبیل حیات بھی بامراد نہیں ہوا۔
وہ اگر عشق کا پیکر تھی تو وہ بھی محبت کا مجسمہ تھا۔
وہ اگر ٹوٹ کر بکھری تھی تو وہ بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔
وہ بھی کرچیوں کی صورت کئی حصوں میں بٹ گیا تھا اور اس سے بھی اپنا آپ سمیٹا اور سنبھالا نہیں جا رہا تھا کیونکہ وہ یہ سوچ کر ہی مر جاتا تھا کہ وہ زری کو چاہتا رہا۔ اور زری دل آور کو چاہتی رہی۔ لیکن اپنی اپنی چاہ اور اپنی اپنی طلب میں کسی کو بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ کون کس کو چاہتا ہے اور کس کے لیے پاگل ہے؟
مگر اس چاہ اس طلب اور اس محبت کی دھن میں اب ادراک ہوا تھا وہ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ کیونکہ ان تینوں کی دوستی کے بیچ اب محبت کی جگہ ندامت حائل ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے سے مسکرا کر اور قہقہے لگا کر نہیں ملتے تھے بلکہ اب تو وہ نظریں اور سر جھکا کر ملتے تھے۔
اور اپنی جھکی ہوئی نظروں اور جھکے ہوئے سروں کا بوجھ وہ اپنے اپنے دل پہ اُٹھائے پچھلے چھ ماہ سے بمشکل سب کچھ نبھاتے آ رہے تھے حالانکہ اندر سے وہ تینوں ہی کھوکھلے ہو چکے تھے۔
"..... آپ نے گھر نہیں جانا کیا؟" عدیل نے بڑی مشکل سے اتنی دیر سے اپنے دھیان میں گم بیٹھے نبیل کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور نبیل بُری طرح چونک کر متوجہ ہوا تھا۔
"ہاں..... ہاں گھر تو جانا ہی ہے۔" نبیل عجیب سے لہجے میں خود کلامی کے سے انداز میں کہتا اپنی چیئر سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" عدیل کو اس کی کیفیت دیکھ کر تشویش ہوئی تھی۔

"ہوں..... سب ٹھیک ہے یار سب ٹھیک ہے ڈونٹ وری۔" نبیل کافی تمسخرانہ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنی چیئر کی بیک پہ [illegible] اٹھا کر واپسی کے لیے دروازے کی سمت قدم بڑھا چکا تھا اور عدیل وہیں کا وہیں اس کے پیچھے کھڑا اس کی پشت دیکھتا [illegible]

"سنو....." نبیل دروازے کے قریب جا کر پھر پلٹا۔

"جی کہیے؟" عدیل پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا۔

"سب کو بیلری پہنچ گئی؟" اس نے تمام ورکرز کے بارے میں پوچھا تھا۔

"جی پہنچ گئی ہے۔" عدیل نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

"اور تمہاری بیلری؟"

"جی مجھے بھی مل گئی ہے؟"

"کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے نا؟ اگر ہے تو بتا سکتے ہو۔" نبیل ہمیشہ ہر سیشے اس سے یہ سوال پوچھتا تھا اور اسے تسلی بھی [illegible] نبیل عدیل کی تنخواہ ماشاء اللہ اتنی تو تھی ہی کہ عدیل کی پریشانیاں کافی حد تک کم ہو گئی تھیں اور وہ پُرسکون رہنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے سر! اللہ کا احسان اور مہربانی ہے آپ کی۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

عدیل نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور نبیل جواباً سر ہلا کر دوبارہ پلٹ گیا۔ مگر عدیل جانتا تھا کہ وہ یہ ساری [illegible] کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پہ سیٹ نہیں ہے کیونکہ وہ ایسی چوئیشن میں تو پچھلے کئی مہینوں سے نظر آ رہا تھا اور عدیل بہت چاہ [illegible] نبیل کی ایسی کیفیت اور ایسی حالت کے متعلق نہ نبیل سے کوئی سوال کر سکا تھا اور نہ مدیحہ سے کچھ کہہ سکا تھا، کیونکہ اسے یہ سب [illegible] نہیں لگتا تھا اس لیے اس وقت بھی وہ اپنے سارے تجسس اور اپنے سارے سوال اپنے ہی ذہن میں لے کر رہ گیا تھا اور نبیل [illegible] تھکے تھکے قدموں سے چلتا دروازہ کھول کر اپنے آفس سے باہر نکل گیا تھا۔

♥

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ رویا تو مر جائے گا

عبداللہ کی خوبصورت بادامی آنکھیں اب ہمہ وقت سرخ ہوئی رہتی تھیں یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے خون [illegible] آئے گا..... کیونکہ.....

چھ ماہ کا کرب تھا..... اور چھ ماہ کا دکھ اس کی آنکھوں کو زخم زخم کر چکا تھا۔

اس نے چھ ماہ کی راتیں زری کے سرہانے بیٹھ کر اور جاگ کر گزاری تھیں، وہ زری کو دنیا و جہان سے بے خبر پڑے ہوئے [illegible] تھا تو دل ہی دل میں روتا تھا۔

اس نے اس کے لیے کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اس کی پسند سے اس کا رشتہ طے کرے گا۔ اس کی دھوم دھام سے شادی [illegible] کرے گا۔ ہر چیز اور ہر بات میں اس کی مرضی اس کی پسند کو فوقیت دے گا، جو وہ چاہے گی وہی کرے گا لیکن یہاں تو سب کچھ ہی مٹی [illegible] گیا تھا۔

وہ اس شخص کو چاہ بیٹھی تھی جس کے سامنے عبداللہ اپنا دامن پھیلا کر بھیک بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ جس کے پاس دینے کے لیے [illegible] کچھ نہیں رہا تھا، خود اپنا بھی نہیں رہا تھا، بلکہ کسی اور کا ہو چکا تھا اور جو پہلے ہی کسی اور کا ہو چکا تھا وہ زری کا کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟

اور بے بسی کی حالت میں اکثر وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں اور اپنے لب بھینچ کے رہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کی [illegible] کی رگیں اُبھر آئی تھیں اور نگارش اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں کیونکہ ایسی اذیت بھری صورتحال میں تو [illegible] تسلیاں بھی عبداللہ کے دل کو سکون نہیں دے سکتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو دن بات کیے بغیر ہی گزر جاتے تھے [illegible] تو عبداللہ دو دو دن بھی ہسپتال سے گھر نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی نگارش کے دن اور راتیں زری کے پاس بیٹھے بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ دونوں میاں بیوی بھی ایک [illegible] کے لیے اجنبی سے ہو کے رہ گئے تھے۔ ان کا ذہن زری کے غم سے اور اس کی اذیت سے ہٹ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ان کے دل

وہ دماغ تو اس غم نے دیمک کی طرح چاٹ ڈالے تھے۔ ان کی سوچ، ان کے خیال، ان کی فکر زری کے گرد ہی گھومتے تھے۔ عالم میں وہ باقی سب کچھ بھول کر پس پشت ڈال دیتے تھے کیونکہ ان کے سامنے زری کا بے جان وجود پڑا ہوتا تھا۔

وہ وجود جو عشق کی علامت تھا۔

وہ وجود جو محبت کی کہانی تھا۔

وہ وجود جو اجر کا آئینہ تھا۔

جسے دیکھ کر جسے سوچ کر، جسے چھو کر بادصبا بھی مہک مہک جاتی تھی اور آج وہی وجود کسی شجر سے ٹوٹے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح نظر آتا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

"نگارش۔" نگارش عین زری کے سامنے بیٹھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے نم نظروں سے اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی جب عبداللہ دروازہ کھول کے اچانک اندر آ گیا تھا۔

"آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" رات گہری ہو رہی تھی اور موسم بھی کچھ اچھا نہیں تھا اس لیے عبداللہ نے سوچا تھا کہ نگارش کو وقت پہ ہی گھر چھوڑ آئے۔

"مگر میرا دل نہیں چاہ رہا گھر جانے کو۔ میں آج زری کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ کیوں زری تم بھی یہی چاہتی ہو نا کہ میں آج یہیں رک جاؤں؟" نگارش نے عبداللہ سے بات کرتے کرتے گردن موڑ کر بے ساختہ زری کو مخاطب کیا تھا اور اس کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ اس کے جسم و جان میں کرب کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

"بتاؤ نا زری! تم بھی یہی چاہتی ہو نا کہ میں آج یہاں ہی رک جاؤں؟" نگارش نے جان بوجھ کر زری کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات میں انوالو کرنے کی کوشش کی تھی۔

"نگارش پلیز! بس کرو چلو میرے ساتھ میں تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔" عبداللہ تکلیف سے جھنجلایا تھا۔

"کیوں بس کروں عبداللہ! آپ..... آپ مجھے بات کیوں نہیں کرنے دیتے؟ یہ..... یہ اتنی لاپروا کیوں ہو گئی ہے۔ کیا اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں کتنی اکیلی ہو گئی ہوں، میں کتنی تنہا ہوں اس کے بغیر۔ میری کوئی بہن، کوئی کزن، کوئی دوست نہیں ہے، یہاں اس کے سوا اور یہ..... یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان پڑی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ میں گھر میں اکیلی تنہا ہوں تو روتی ہوں۔ اس کی ڈائری، اس کی شاعری اس کے پرفیومز دیکھتی ہوں تو دل کٹ جاتا ہے میرا۔ دن میں کئی مرتبہ اس کے بیڈ روم کے چکر لگاتی ہوں اور ہر مرتبہ بیڈ روم خالی دیکھ کر مایوس لوٹ آتی ہوں۔ دل چاہتا ہے پھر سے کوئی نظم پڑھے اور میں اس کے سامنے بیٹھ کر وہ نظم سنوں۔ یہ پھر سے کسی بات پہ تڑپ کر روئے اور میں پھر سے اسے خود سے لگا کر بچوں کی طرح چپ کراؤں، یہ پھر سے بے یقین ہو جائے اور میں پھر سے اسے یقین دلا دلا کر تھک جاؤں کہ زری ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تم نے جو سنا ہے وہ جھوٹ تھا۔ تم نے جو دیکھا وہ خواب تھا اور جھوٹ اور خواب پہ یقین نہیں کرتے۔ تم بھی مت کرو۔ زری پلیز! ہوش میں آ جاؤ۔ لوٹ آؤ کسی اور کو نہ سہی ہمیں ضرورت ہے تمہاری۔"

نگارش اس کے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے ہچکیوں سے رو پڑی تھی اور عبداللہ بمشکل اپنی آنکھوں سے امڈتے ہوئے پانیوں کو ضبط کرتے ہوئے مزید آگے بڑھ آیا تھا۔

"نگارش پلیز! چلو میرے ساتھ۔ وہ تمہاری کوئی بات نہیں سنے گی۔" عبداللہ نے نگارش کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور زری کی پلکیں اس کی بات پہ لرز کر رہ گئی تھیں۔

مگر افسوس کہ اس کی پلکوں کی یہ لرزش نہ عبداللہ دیکھ سکا تھا اور نہ نگارش کو نظر آئی تھی۔ اگر دیکھ لیتے تو انہیں بھی یہ پتا چل سکتا تھا کہ اسے بھی ان کی تکلیف پہ تکلیف ہوتی ہے، اسے بھی دکھ ہوتا ہے وہ بھی اندر ہی اندر روتی ہے مگر اس کی تکلیف اس کا دکھ اس کے آنسو کسی کو نظر نہیں آتے۔

وہ سب اپنے اندر کا غبار نکال لیتے ہیں، اور وہ چپ پڑی بس سنتی رہتی ہے۔ اگر سننے کے بجائے بول سکتی تو یقیناً نگارش کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیتی۔ مگر افسوس کہ وہ لاچار تھی بے بس تھی، بے جان تھی۔ عشق نے اسے مار ڈالا تھا اور وہ مر گئی تھی۔

عبداللہ نگارش کے انکار کے باوجود بھی اسے گھر چھوڑنے چلا گیا تھا۔ اور زری اسے روک بھی نہ سکی تھی اور اس بات پہ اس کا

شام ہوتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی اور بارش بھی ایسی طوفانی اور موسلا دھار برسی تھی کہ دیکھنے اور سننے والوں کے دل ہوا ٹھے
تھے۔ بجلی کی کڑک اتنی زور دار تھی کہ کچن میں کھڑی روٹیاں بناتی علیزے کے ہاتھ اس کی کڑک دار اور خوفناک
آواز پر کانپ گئے تھے اور وہ بمشکل روٹی توے پہ ڈالنے میں کامیاب ہو سکی اور دل ہی دل میں دعا پڑھنے لگی۔

"کیا بات ہے علیزے بی بی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" علیزے کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش سے ہی گل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ
کچھ کہہ رہی ہے۔

"میں کہہ نہیں رہی بلکہ دعا پڑھ رہی ہوں، درود شریف کا ورد کر رہی ہوں۔ سچ ایسی بارش سے تو خوف آ رہا ہے۔" علیزے
کے اندر سے دہل چکی تھی اور اس کا دہلنا اس کے چہرے سے ہی نظر آ رہا تھا۔

"ہوں..... بی بی جی! ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ مجھے بھی بہت ڈر لگ رہا ہے۔" گل بھی بجلی کی کڑک سے سہم چکی تھی۔

"میرا خیال ہے جلدی جلدی کام ختم کر کے ہم بھی اپنے اپنے بیڈ روم میں جاتے ہیں جاذ فی کو بلاؤ اور اسے کہو کہ صاحب کو
کھانا تیار ہے۔" ان چھ ماہ میں اتنا فرق آیا تھا کہ علیزے نے گھر کے ملازموں کے سامنے اسے "صاحب" کہنا سیکھ لیا تھا
ورنہ اس کے سامنے وہ اب بھی اسے "ڈرائیور" کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی اور دل آور نے اسے کبھی منع بھی نہیں کیا تھا کیونکہ اسے اس
لفظ پر کچھ کہنا برا نہیں لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ واقعی اپنے آپ کو اس کا ڈرائیور ہی سمجھتا تھا۔

"جی..... ابھی کہہ دیتی ہوں۔" گل باہر نکل گئی تھی اور گل کی طرف سے پیغام ملتے ہی زلفی دل آور کو بلانے چل دیا تھا، مگر
کچھ دیر بعد وہ یونہی واپس لوٹ آیا تھا۔

"کیوں..... کیا کہا صاحب نے؟" علیزے سب کاموں سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھ چکی تھی۔

"سر کہہ گیا تھا وہ تو کچھ بولے ہی نہیں۔ بہت گہری نیند میں ہیں۔ میں دو چار آوازیں دینے کے بعد واپس آ گیا۔" زلفی نے
کندھے اچکائے تھے اور علیزے سر ہلا کے رہ گئی کیونکہ وہ واقعی بھول چکی تھی کہ اسے بخار ہے اور اس کے منہ قادر نے اسے فون کر
کے بتایا بھی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ کھانا کھاؤ۔ میں پھر دروازہ بند کر کے چلی جاؤں گی۔" علیزے کو اندرونی دروازہ بند کرنے کی فکر تھی
جبکہ دل آور رات کو یہ دروازہ بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے بند کر کے سونے کا عادی تھا۔

"آپ نے کھانا نہیں کھانا کیا؟" گل نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔

"نہیں..... ابھی بھوک نہیں ہے بعد میں کھا لوں گی۔ فی الحال تم لوگ کھاؤ۔" وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی اور کچھ دیر بعد وہ لوگ
کھا پی کے تو علیزے نے تمام دروازے اور تمام لائٹس بند کرنے کے بعد اوپر اپنے بیڈ روم کی طرف رخ کیا تھا لیکن بیڈ روم میں
قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے کیونکہ بیڈ روم کی تمام لائٹس آف تھیں اور ہر طرف گہرے اندھیرے کے سوا کچھ
بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اور اس اندھے ماحول میں بارش کا شور، بادلوں کی گرج اور آسمانی بجلی کی کڑک دار آوازیں حقیقتاً اک بھیانک سا تصور پیدا کر
رہی تھیں جس کی وجہ سے علیزے کے دل میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی اور اس نے بے ساختہ کافی عجلت سے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا تھا
مگر اچانک بیڈ روم میں کھٹا کھٹ کئی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں اور اس نے بڑی بے تابی سے بیڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں وہ
شخص بے سدھ پڑا نظر آیا۔

"ڈرائیور۔" وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی تھی۔

"ڈرائیور۔" اس نے ایک بار پھر اسے پکارا تھا مگر وہ ایسا بے سدھ پڑا تھا کہ اس پہ کوئی بھی آواز اثر نہیں کر رہی تھی۔

"ڈرائیور پلیز اٹھو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" علیزے نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی کیفیت بتائی تھی، مگر وہ کچھ سنتا بھی تو۔

"ڈرائیور پلیز اٹھو۔" مجبوراً علیزے کو اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنا پڑا تھا لیکن اس کے جسم کی حدت سے علیزے کے خوفزدہ
حواس ٹھکانے پہ آ گئے تھے اور وہ بدک کے رہ گئی اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا اور اس آگ نے اسے بے سدھ کر رکھا تھا۔

اتنا تیز بخار؟ وہ اسے اس طرح بخار میں پھنکتے دیکھ کر پشیمان سی ہوئی تھی، کیونکہ اسے تو عصر کے وقت ہی قادر نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ صاحب کو بہت تیز بخار ہے لیکن علیزے نے ہی پلٹ کر اس کی کوئی خیر خبر نہیں لی۔

''کیوں..... میں کیوں لیتی اس کی خبر؟ اسے بخار کی بجائے کچھ بھی ہو میری بلا سے۔'' اس کے اندر کی نفرت پھر سے عود آئی تھی۔

تمہارے خیال میں اگر اس طرح تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا وہ کہہ سکتا تھا کہ اسے بخار کے بجائے کچھ بھی ہو میری بلا سے۔ انسان کے سینے کے اندر موجود دل بنیادی طور پہ سرخ خون سے بنا گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو انسان کے جذبات احساسات اور حالات سے گرم کے اثر سے جمتا اور پگھلتا ہے اور وہ اس جمنے اور پگھلنے میں بھی صدیوں اور سالوں کا نہیں بلکہ سیکنڈز کا وقت لیتا ہے۔ یہ پگھل بھی سکتا ہے اور پل میں جم بھی سکتا ہے۔

اور کبھی کبھی یہ کام انسان کے کسی ایک خیال، کسی ایک سوچ سے بھی ہو جاتا ہے۔

ادھر کوئی خیال ذہن کو چھو کے گزر جائے اور ادھر دل جیسا لوتھڑا پگھل جائے۔ علیزے کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہوا تھا۔ ادھر اس کی نفرت پکاری تھی اور ادھر ذہن کے اک خیال اور خیال میں لپٹے سوال نے اس کے دل کو پگھلا کے رکھ دیا۔ آخر وہ ایک موم کی گڑیا تھی۔ اس کا دل پتھر کیسے ہو سکتا تھا؟

وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہونے پہ مجبور ہو گئی تھی اور اسے متوجہ ہونے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ اس وقت اسے طیبے میں چھوڑ کر گئی تھی وہ ابھی تک اس طیبے میں تھا یہاں تک کہ وہ چینج بھی نہیں کر سکا تھا حالانکہ وہ اس کے کپڑے نکال کے رکھ گئی تھی لیکن پھر بھی وہ بیڈ سے اٹھ نہیں سکا اور اسی چیز کا علیزے کو افسوس ہو رہا تھا اور اس کے اس افسوس اور پشیمانی نے اسے اندر تک قریب کر دیا۔

''ڈرائیور۔'' اس نے دوبارہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے پکارا تھا۔ البتہ اب اس پکار میں خوف نہیں تھا بلکہ فکر و تشویش تھی، پریشانی تھی۔

''اف اب کیا کروں۔ اسے تو کچھ ہوش نہیں ہے۔'' علیزے کو کچھ سجھ نہیں آ رہا تھا وہ اندھا پڑا تھا اور اسے سیدھا کرنا اس کے لیے محال تھا، آخر وہ اتنی ہمت اور اتنی طاقت کہاں سے لاتی مگر اس وقت اپنی ہمت اور اپنی طاقت آزمانے کے سوا اس کے پاس چارا بھی تو نہیں تھا۔

اور یہ اس کی ہمت ہی تھی کہ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کے دل آور کے گال کو تھپکا تھا، اسے چھوا تھا، اور اسے ہوش میں لانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

''ڈرائیور! پلیز ہوش میں آؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز..... پلیز آنکھیں کھولو۔''

علیزے نے اس کے چہرے کو اس کے بازو کو اس کے کندھے کو ہلا کے دیکھا تھا مگر جواب ندارد۔ اور جب وہ کسی طرح بھی ہوش میں نہ آیا تو اس نے اپنی ہمت کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت بھی آزمانا ڈالی تھی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پہ جما کے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اور کندھے کو پیچھے کی طرف دھکا لگنے پہ دل آور گہری غنودگی میں ذرا سا کسمسایا تھا اور اس کی اس کسمساہٹ سے اندازہ لگاتے ہوئے علیزے نے اسے فوراً سیدھا کر لیا تھا۔

جس سے اسے کافی تسلی ہوئی تھی حالانکہ اس تسلی کے چکر میں وہ خود اچھی خاصی ہانپ گئی تھی۔ ''ڈرائیور پلیز! کچھ تو بولو، کسی طرف دیکھو تو سہی۔ میں اکیلی ہوں کیسے سنبھالوں تم کو؟'' علیزے اس کے مضبوط ہاتھوں اور کشادہ پیشانی کو چھو چھو کر بولا کی تھی محسوس کرتی مزید پریشان ہو رہی تھی، کیونکہ اس کا جسم حقیقتاً بہت تیز بخار میں جھلس رہا تھا۔

''ڈرائیور! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آنکھیں کھولو پلیز۔ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟ پلیز.....'' اس نے دل آور کی ایک بے خبری حالت پہ روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

''اف میرے اللہ! میں کیا کروں اب؟'' وہ بیڈ پہ اس کے پہلو میں بیٹھی اپنا سر تھام کے رہ گئی تھی۔

''بیٹا! جب بہت تیز بخار ہونا تو پھر برف کی ٹھنڈی پٹیاں بھگو کر رکھتے ہیں اس سے بخار کی شدت کم ہو جاتی ہے۔'' کی سماعتوں میں آسیہ آفندی کی آواز گونجی تھی بہت عرصہ پہلے بچپن کو بخار ہوا تھا اور آسیہ آفندی اس کے سرہانے بیٹھی برف کی

پیشانیاں بھگو بھگو کر رکھ رہی تھیں جب علیزے نے حیرت سے سوال کیا تھا اور اس سوال کا جواب آج اس کے کام آ گیا تھا۔

"فریج کی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں۔" اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا تھا اور وہ یکدم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی تیزی سے بیڈ روم کے اٹیچڈ کچن میں آئی اور فریج سے برف کے کیوبز نکال کر ایک بڑے سے باؤل میں ڈال کے کپڑے کی دو تین پٹیاں بنا کر لے آئی تھی اور اپنے پیچھے بیڈ روم کا دروازہ بند کر ڈالا۔ لیکن اس کے ماتھے پہ پٹیاں رکھنے سے پہلے علیزے کی نظر دل آور کے جلے ہوئے ہاتھ پہ پڑی تو اسے بڑی اُلجھن کا احساس ہوا تھا اس کی شرٹ کے بٹن گریبان تک بند تھے، پینٹ کا بیلٹ بھی ہنوز بندھا ہوا تھا اور اس کی جرابیں بھی اس کے پیروں میں جوں کی توں موجود تھیں۔

اور اسے بخار کی حالت میں اس طرح ہر طریقے سے جکڑے ہوئے دیکھ کر علیزے سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ اور اس نے خود پہ ضبط کرتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا باؤل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر اپنا لرزتا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی شرٹ کی طرف بڑھا دیا تھا اور بے انتہا ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اس کی شرٹ کا پہلا بٹن کھولا تھا، مگر اس ایک بٹن کو کھولتے کھولتے اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

بے شک وہ دونوں میاں بیوی ہونے کے باوجود بھی نازک اور گداز جذبات سے ابھی کوسوں دور تھے، لیکن شرم و جھجک سے تو وہ بھی آشنا تھی اور اس شرم کے ہاتھوں ایسی پوزیشن بھی علیزے پہ اک عذاب آن وارد ہوا تھا جس کو عبور کرنا اس کے لیے ایک اور بڑا کٹھن مرحلہ تھا اور اس مرحلے کو طے کی بغیر اور کوئی چارا بھی نہیں تھا۔

سو علیزے نے اس آزمائش کا بیڑہ بھی اپنے کندھوں پہ اُٹھاتے ہوئے ایک ایک کر کے اس کی شرٹ کے سارے بٹن کھول دیے تھے مگر اس کے اوپر تقریباً جھک کر اس کی پینٹ سے بیلٹ کا ہک کھولتے ہوئے اسے دانتوں پسینہ آ گیا تھا، شرم اور جھجک نے اسے پیچھے کھینچ لیا تھا اور اور دل تھا کہ بُری طرح دھڑک اُٹھا تھا کیونکہ اسے آج وہ کام کرنا پڑ رہے تھے جو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے کر ہی لیے تھے، ہمت نہیں ہاری تھی اور ضبط سے کام لیا تھا۔ ورنہ دل آور کے ایسے کام وہ کرتی؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر کیا کرتی سینے کے اندر بیٹھا سرخ خون کا لوتھڑا اس وقت پگھلا ہوا تھا اور اسے وہ کام بھی کرنا پڑے تھے جو اس کے لیے شرم کا باعث تھے۔

اور وہ بڑی ہمت اور بڑی مشکل سے اس کی پینٹ سے بیلٹ کھینچ کر نکالنے میں کامیاب ہو سکی تھی، اور پھر ہانپتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔

لیکن پھر بھی اس کی مشقت کا وقت ختم نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی اس کے پیروں سے جرابیں اُتارنا باقی تھا، اس لیے وہ اپنی دھڑکنوں اور اپنی سانسوں کو ہموار کرتی ہوئی اس کے پیروں کی سائیڈ پہ آ گئی تھی، اور پھر ذرا سا جھک کر اس کی پینٹ کے پائنچے اوپر کرتے ہوئے اس کی جرابیں اُتارنے لگی۔

اور اس کی جرابیں اُتارتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اس کے پیروں سے بھی چُھ ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسے دل آور کے پیروں سے بخار کی شدت سے اک بھاپ سی نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور بخار کی شدت اور گرم بھاپ کے احساس کو کم کرنے کے لیے بے ساختہ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں کی جان افزا راحت اس کے پیروں کو سونپ دی تھی جس سے دل آور کے جسم میں ایک لہر سی دوڑتی ہوئی اس کے دل و دماغ اور اس کی روح تک جا پہنچی تھی وہ انتہائی گہری غنودگی سے بھی کسمسا گیا تھا۔

"علیزے ..... ے ....." اس کے ہونٹوں سے اس کا نام ادا ہوا تھا، غنودگی میں بھی وہ اس کا لمس پہچان گیا تھا۔

"گریٹ۔" علیزے اس کے پیروں کو سہلاتے سہلاتے اس کی آواز پہ فوراً اس کے قریب آئی تھی مگر وہ اس کے پکارنے پہ بھی کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

اس لیے علیزے باقی سارے کام چھوڑ چھاڑ کے اس کے قریب بیڈ پہ اس کے پہلو میں ہی بیٹھ گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر رکھنے لگی۔ اور اس کے اس عمل کو ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ہی لائٹ چلی گئی تھی۔ گھپ اندھیرے اور گھپ اندھیرے میں علیزے اپنی جگہ پہ جیسے جوں کی توں بم کے رہ گئی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اندھیرے میں ہی ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ شاید کوئی ایسی چیز نظر آ جائے جس سے وہ کوئی تو لائٹ روشن کر سکے۔

یا اللہ کو اس پہ ترس آ گیا تھا کہ اگلے دو سیکنڈ میں دل آور کے موبائل پہ کسی ایس ایم ایس کی مدھم سی بپ کے ساتھ سائیڈ

ٹیبل پہ رکھا موبائل روشن ہو گیا تھا۔ اور علیزے کو امید کی کرن نظر آ گئی تھی، اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کا موبائل اٹھا لیا تھا۔ اور اس موبائل کی روشنی میں اس نے کینڈل اسٹینڈ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا جو اسے سائیڈ ٹیبل کے سب سے نچلے حصے سے دستیاب ہوا اور پھر اس کے سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ رکھے لائٹر سے موم بتی جلا دی تھی جس کی مدھم سی لو بیڈ روم میں لرزنے لگی اور اس لرزتی ہوئی لو میں وہ دوبارہ دل آور کی طرف متوجہ ہوئی وہ ہنوز بے سدھ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"ڈرائیور! آنکھیں کھولو پلیز دیکھو لائٹ بھی نہیں ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے اور..... اور باہر بارش بھی بہت تیز ہے۔ اتنی خوفناک سی آوازیں آ رہی ہیں۔"

علیزے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھپک رہی تھی اور موم بتی کی لو کی طرح دل آور کی پلکوں پہ بھی کی لرزش محسوس کی تھی جس سے علیزے کو مزید حوصلہ ہوا تھا۔

"ڈرائیور پلیز! اب بس کرو ٹھیک ہو جاؤ۔ دیکھو میں تھک گئی ہوں تمہیں بلا بلا کے ایک بار میری آواز تو سنو میری طرف دیکھو سہی۔"

اس نے ایک بار پھر اس کے گالوں کو تھپکا تھا اور اپنے چہرے پہ اس کے نرم ہاتھوں کی تھپک سے دل آور کی پلکوں پہ ہلکی سی جنبش ہوئی تھی اور اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کوشش میں بھی اس کی آنکھوں میں چبھن بے تحاشا تیز ہو گئی تھی۔ موم بتی کی مدھم سی روشنی میں علیزے اس کے بے حد قریب اور عین اس کے سینے کے اوپر جھکی آنکھوں میں نمی لیے بڑی تشویش اور بڑی فکر سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"علیزے..... تم....." دل آور کے ہاتھوں میں بھی حرکت ہوئی تھی اور اس نے اپنے چہرے پہ رکے علیزے کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر اس کے ٹھنڈے لمس کو محسوس کیا تھا۔

"ہاں..... میں ہی ہوں پلیز ڈرائیور آنکھیں کھولو مجھ سے بات کرو میں، میں بہت پریشان ہوں تمہارے لیے تم اس طرح کیوں پڑے ہو؟ کیوں تھک گئے ہو؟ تم..... تم اس طرح بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے۔ تم اتنے سے بخار سے ہار گئے ہو یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔" علیزے نے پھر اس کے چہرے کو تھپکا تھا اور دل آور کے چہرے پہ غنودگی کے باوجود ایک استہزائیہ سے احساس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"میں ہار گیا علیزے! میں سب سے ہار گیا میں تم سے بھی ہار گیا۔" اس نے انتہائی بوجھل آواز میں کہتے ہوئے دوبارہ سے پلکیں موند لی تھیں اور علیزے بے چین ہو گئی تھی۔

"ڈرائیور۔" اس نے بڑے بے چین سے لہجے میں پکارا تھا اور دل آور نے پھر سے آنکھیں کھول دی تھیں اور ایک بار پھر قرب کی انتہا کو چھوتی علیزے کو دیکھا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہیں اس طرح چھوڑ کر مروں گا نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ آج تم بھی مجھے مرنے نہیں دو گی۔ آج تو میری موت کے فرشتے کو بھی سوچ سمجھ کر آنا ہو گا۔" دل آور نے عجیب دیکھے بھالے اور بے ربط سے لہجے میں کہتے ہوئے علیزے کے چہرے سے دائیں بائیں جھولتے بالوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹایا تھا۔

"پلیز ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے پہلے ہی بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔

"اور مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے اور پیاس بھی لگ رہی ہے۔" دل آور کی نظریں اس کے وجود کی ہوشربا خوبصورتی کو چھو کر رہی تھیں اور علیزے اس مدھم اور ہلکی سی روشنی میں بھی اس کی نظروں کی حدت سے دہک اٹھی تھی اور فوراً ہی اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔

"پانی پیو گے؟" اس نے خود کو اس سنسناتے ہوئے احساس سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

"پلا دو۔" اس نے بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تھا اور علیزے بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی گلاس میں پانی انڈیلنے لگی اور بڑی مشکل سے اسے پلایا بھی تھا۔

"شکر ہے کہ بخار پہلے سے کم ہو چکا ہے۔" علیزے کو اس کے جسم کی تپش میں ذرا کمی محسوس ہوئی تھی۔

"افسوس کہ کیوں کم ہوا ہے۔" دل آور نے تھک کر اپنا سر دوبارہ تکیے پہ ڈال دیا تھا اور علیزے کی رات یونہی اس کے سرہانے

بیتے گزر گئی تھی۔
بہت دل آور کی رات ہوش اور بیہوشی کے درمیان ڈولتے ہوئے گزری تھی اور اس لیے علیزے کو رات بھر جاگنا پڑا اور اس کی
ی کرنا پڑی۔ لیکن فجر کی اذان ہوتے ہی وہ ان کے پاس سے اُٹھ گئی تھی اور اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

♥

رات بہت اندھی بارش برسی تھی۔ اس لیے آج کی صبح بہت ٹھنڈی اور بہت تازہ محسوس ہو رہی تھی۔
لیکن اس کے باوجود بھی نجانے کیوں علیزے کو نہ ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی اور نہ تازگی۔ وہ دل آور کے ساتھ صرف اس کی
ت کے لحاظ سے اندر آتے ہی اس کا دم گھٹ گیا تھا اس لیے ذرا سنبھلتے ہی وہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے لے کر ٹیبل کی طرف بڑھی تھی اور
ٹیبل پر رکھنے کے بعد دل آور کے قریب آ گئی، وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا سگریٹ پھونکنے میں مشغول تھا۔
"گڈ مارننگ سر۔" بس کرو تم یہ سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" اس نے آج دوسری بار دل آور کے ہونٹوں سے سگریٹ
ٹیبل پر رکھا اور اس کا نکوٹین زدہ ایش ٹرے میں مسل ڈالا تھا۔
دل آور نے بیڈ کے قریب کھڑی علیزے کو دیکھتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ دوبارہ اُٹھا لیا تھا
جس پر علیزے کو مزید جھنجلاہٹ ہوئی تھی۔
"دل آور۔۔۔ سگریٹ اس لیے نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ یہ میرے ساتھ ساتھ جلتا رہتا ہے، سلگتا رہتا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے
سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا تھا اور اسے ابھی لائٹر سے شعلہ دکھا ہی رہا تھا کہ علیزے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
"پلیز۔۔۔ چھوڑ دو۔" علیزے کا لہجہ اور انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ دل آور نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔
"چھوڑ دوں۔" وہ اس سے جیسے آخری بار اجازت چاہ رہا تھا۔
"ہاں۔۔۔ چھوڑ دو۔" اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔
"تو چھوڑ دیا۔" دل آور نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے کہہ کر سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر دو ٹکڑے کر کے ایش ٹرے
میں ڈال دیا تھا اور پھر لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ اپنی ہتھیلی پہ رکھ کے اس کے سامنے کر دیا علیزے نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کی
ہتھیلی پہ رکھا لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا کر پلٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔
"اور کچھ۔" وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"مانیں گے؟" علیزے نے بھی جواباً اسے سوالیہ نظروں سے ہی دیکھا تھا۔
"منت ہوئی تو مانوں گا۔ وعدہ نہیں کرتا۔" اس نے کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تھا۔
"پھر ایک بات کہوں تم سے؟" وہ آہستگی سے چلتی ہوئی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے تھے
دل آور نے اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکاتے ہوئے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے کہ نجانے اب وہ کیا بات کہنے والی ہے کہ
اس سے پہلے وہ اس طرح تمہید باندھ رہی ہے۔
"ایسا کرو زری کے ہو جاؤ۔" علیزے نے بے حد آہستگی سے اور بے حد دھیمے لہجے میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ دل آور
کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا مگر وہ اس کی سمت پشت کیے کھڑی تھی اس لیے اس کی نظروں کو ناکامی کا سامنا کرنا
پڑا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں میری بات عجیب لگے گی کہ پہلے میں ہی کہتی تھی کہ مجھے اپنا لو اور اب میں ہی کہہ رہی ہوں کہ زری کو
اپنا لو۔ میرا یہ کہنا کیا سچ ہے۔۔۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مجھے تمہاری نہیں صرف تمہارے نام کی ضرورت تھی۔ جو مجھے مل چکا ہے۔ جبکہ
مجھے تمہارے نام کی نہیں بلکہ تمہاری بھی ضرورت ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی ایموشنل فیلنگز ہیں تمہارے لیے۔۔۔ مگر پھر
بھی میں محض ایک رات صرف ایک رات تمہیں اس طرح بیہوشی کی حالت میں دیکھ کر میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ میں رات بھر سو

نہیں سکی۔ میں کھانا نہیں کھا سکی، یہاں تک کہ اپنے آپ کو تم سے دور بھی نہیں رکھ سکی۔

اور تم..... تم تو زری کو چاہتے بھی ہو، تمہیں اس سے محبت ہے، اور تمہارے دل میں اسپیشل فیلنگز بھی ہیں اس کے لیے پھر..... تو پھر تم اسے بیہوشی کی حالت میں کیسے دیکھتے ہو گے؟ کیسے برداشت کرتے ہو گے؟ کیسے اپنے آپ کو اس سے دور رکھتے ہو گے؟ میرا تم سے نفرت میں یہ حال ہو گیا ہے تو تمہارا اس سے محبت میں کیا حال ہوتا ہو گا؟ سے نا ڈرائیور میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" علیزے عجیب بے چین سے لہجے میں کہتی ہوئی اس کی سمت پلٹی تھی۔ مگر دل آور چپ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

"پلیز ڈرائیور! چپ مت رہو کچھ کہو۔ میں تمہارے منہ سے تمہاری زبان سے اور تمہارے الفاظ سے کچھ سننا چاہتی ہوں پلیز جانتے ہو کہ اس وقت چپ نہیں رہنا چاہیے جب کچھ کہنا ضروری ہو؟"

علیزے نے اسے کچھ کہنے پہ اکسایا تھا۔

"میں تمہارا ہوں علیزے۔" دل آور کا لہجہ اور الفاظ انتہائی دو ٹوک سے تھے البتہ آواز کافی گمبھیر ہو رہی تھی۔

"مگر میں تمہاری نہیں ہوں ڈرائیور۔" اس کا جواب برجستہ تھا۔

"ہو نہہ کون میرا ہے اور کون نہیں؟ یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ میں کس کا ہوں اب صرف یہ سوچتا ہوں۔" دل آور کے لہجے میں استہزا کی آمیزش تھی۔

"تو پھر تم بہت بڑی غلطی پر ہو۔" علیزے کا لب و لہجہ بھی استہزائیہ ہوا تھا۔

"میں جب بھی ہوتا ہوں "غلطی" پر ہی ہوتا ہوں، اور میں نے آج تک زندگی میں غلطیاں ہی کی ہیں، بہت بڑی غلطیاں ہی ہیں اس لیے سمجھ لو کہ ایک غلطی اور سہی۔"

اس نے بڑی لاپروائی سے کہتے ہوئے دوبارہ اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"مگر تم کس کے ہو اور کس کے نہیں ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" علیزے اس کی ذات کی نفی کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔

"لیکن میں کس کا ہوں اور کس کا نہیں ہوں۔ مجھے اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔" وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔

"ہاں..... سچ کہہ رہے ہو تم۔ فرق پڑتا ہے، تمہیں فرق پڑتا ہے۔ اس لیے تو یہ حال بنائے بیٹھے ہو ورنہ یہ سگریٹ یہ الکحل حلیہ کس لیے ہے آخر؟ فرق کے لیے نا، کیونکہ تم کسی کے ہو اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے زری کو فرق پڑتا ہے۔ کل دونوں کے فرش میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بیہوش بستر پہ پڑی ہے اور تم ہوش و حواس میں ہو کر بھی بستر پہ پڑے ہو۔" علیزے نے کرتے کرتے بھی جیسے چبھتی گئی تھی اور اس کی بات پہ بے ساختہ حیران ہوتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہوں۔ تو تمہارا خیال ہے کہ میں زری کا غم منا رہا ہوں؟" دل آور نے براہ راست نظریں اس کے چہرے پہ جما دی تھیں اور علیزے خود پہ ضبط کر کے اس کی نظروں کو نظر انداز کرتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی مگر دل آور نے اپنی مضبوط گرفت سے اس کی نازک کلائی دبوچتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا اور اس اقدام میں علیزے یہ بھی محسوس نہ کر سکی کہ اس کے ہاتھوں کی گرفت اب بھی کتنی گرم ہے۔

"جواب دو۔" اب وہ اسے جواب پہ اکسا رہا تھا۔

"میرا خیال نہیں میرا یقین ہے۔" وہ اپنے بیان پہ قائم تھی۔

"تو پھر اس بار تم خود بہت بڑی غلطی پر ہو۔ میں کسی کا بھی کوئی غم نہیں منا رہا۔" اس نے اپنے الفاظ پہ زور دے کر کہا تھا۔ علیزے کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ہاں..... یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تم غم نہیں مناتے۔ تم جشن مناتے ہو۔" اس نے ایک بھرپور طنز کیا تھا اور اس نے اس کے طنز پہ لب بھینچتے ہوئے اس کی کلائی چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھام لیا تھا اور ایک بار پھر بے اور است گولڈن براؤن آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"آج تک تمہاری ذات پہ تو کوئی جشن نہیں منایا میں نے؟ منایا ہو تو بات کرو۔"

دل آور نے بھی جواباً طنزیہ لہجے میں خاصا چبا کر پوچھا تھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے آج تک کس کس کی ذات پہ جشن نہیں منایا؟ نہ منایا ہو تو بات کرو؟" علیزے نے اس کی

کے اسے ہی جواب دیا تھا اور دل آور اس کے جواب پہ جھنجلا گیا تھا۔

"علیزے پلیز! اپنی بات کرو، صرف اپنی بات۔ میں نے کسی کے ساتھ کبھی کچھ نہیں کیا۔ جو بھی کیا ہے، تمہارے ساتھ کیا ہے، تمہارے ساتھ کیا ہے، تمہارے لیے کیا ہے، تو تمہاری ذات کا مناؤں گا۔ غم مناؤں گا تو تمہارا مناؤں گا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو اس نظر سے دیکھا ہے، جس نظر سے تمہیں دیکھا ہے۔ کسی کو اس لمس سے چھوا ہے تو تمہیں چھوا ہے۔ میں تم سے چھپا ہوا نہیں ہوں جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ میں مجرم ہوں تو بھی تمہارا ہوں۔ میں مظلوم ہوں تو بھی تمہارا ہوں۔ مجھے سزا دینی ہے تو تم دو۔ مجھے بخشنا ہے تو تم بخشو۔ دوسروں کی بات کیوں کرتی ہو؟ دوسروں کی بات مت کرو۔ میں تمہارا ہوں اور صرف تمہارے سامنے جوابدہ ہوں۔"

اس نے کافی بُری طرح جھنجلاتے ہوئے علیزے کو ٹوک دیا تھا اور علیزے نے جواباً اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"تو تم صرف میرے سامنے جوابدہ ہو؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھتے ہوئے دل آور کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیئے تھے۔

"ہاں..... صرف تمہارے سامنے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر جواب دو مجھے کہ زری کے ساتھ یہ کیوں کیا تم نے؟" علیزے نے آج اسے اپنی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ کٹہرے میں کھڑے مجرم نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

♥

مگر اس کے اس دیکھنے میں بھی ایک عجیب سا تاثر تھا۔ اک عجیب سی کیفیت تھی۔

جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا ہو اور اسے یہ الفاظ ذرا دیر کے بعد میسر آنے ہوں۔

"کیا کیا ہے میں نے زری کے ساتھ.....؟" وہ علیزے کے سوال کے بعد چند سیکنڈز کے توقف سے گویا ہوا تھا۔

"کوئی وعدہ کیا ہے اس کے ساتھ؟ کوئی قسم کھائی ہے اس کے لیے؟ محبت کا اظہار کیا ہے اس کے سامنے؟ کوئی امید دلائی ہے اسے؟ یا حوصلہ افزائی کی ہے اس کی؟ ہوں بتاؤ مجھے کیا کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔" دل آور اس معاملے میں بالکل کھرا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر رہا تھا۔

"تو کیا واقعی تم نے زری کے ساتھ کچھ نہیں کیا؟" وہ بھی اسے بغور تنقیدی، جانچتی ہوئی اور بے یقین سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں..... میں نے واقعی زری کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ کبھی وعدہ کیا ہے نہ کبھی قسم کھائی ہے۔ نہ اظہار کیے ہیں اس سے..... اور نہ ہی اُمیدیں دلائی ہیں اسے..... محبت کے اس سفر میں وہ یہاں تک پہنچی ہے تو اکیلی پہنچی ہے..... میں تو کہیں تھا ہی نہیں میں نے زری سے کبھی بات تک نہیں کی..... کبھی میسج نہیں کیا..... کبھی کال نہیں کی..... آج تک اس سے نظر نہیں ملائی..... آج تک اسے اشارہ تک دیا۔ جب بھی کی ہے اس کی عزت ہی کی ہے..... جب بھی کیا ہے اس کا احترام ہی کیا ہے ہمیشہ فاصلے سے ہی دیکھا ہے اسے..... اور ہمیشہ فاصلے پہ ہی رہا اس سے مگر پھر بھی وہ اس حال کو پہنچی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے آخر؟" دل آور بات کرتے کرتے بے بس سا ہونے لگا۔

"تو کیا تم نے محبت بھی نہیں کی اس سے؟" علیزے آج پتا نہیں کن کن سوالوں کے جواب طلب کر رہی تھی اور دل آور اس کے سوالوں پہ بار بار ٹھٹک رہا تھا، بار بار ٹھہر رہا تھا۔

"بتاؤ نا ڈرائیور! تو کیا تم نے محبت بھی نہیں کی اس سے؟" اس نے پھر اپنے سوال پہ زور دیا تھا۔

"اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

"کیوں ضروری نہیں ہے؟" وہ بضد ہوئی۔

"کیونکہ یہ میرا اور میرے دل کا معاملہ ہے، میں کس سے محبت کرتا ہوں اور کس سے نہیں کرتا، میں نے اس چیز کو لے کر کبھی کسی کو ڈسٹرب نہیں کیا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس چیز کو لے کر کوئی مجھے بھی ڈسٹرب نہ کرے اس محبت میں، میں جیا ہوں، میں مرا ہوں، میں نے ہمیشہ اپنے دل کی بات اپنے دل تک ہی رکھی ہے، کبھی دماغ تک نہیں لے کر گیا۔ کبھی دل کو دماغ پہ سوار نہیں کیا کبھی دنیا یہ ظاہر ہونے دیا ہے کہ اس دل پہ اور اس دماغ پہ کیا بیت رہی ہے؟ تو پھر..... تو پھر..... وہ..... وہ کیوں ٹوٹ گئی

سب کے سامنے؟ کیوں بکھر گئی وہ؟ اس نے اگر محبت کی تھی تو اسے یہ بھی پتا ہونا چاہیے تھا کہ محبت صرف وصال کا اور پھولوں سے سجی سیج کا نام نہیں ہے، بلکہ محبت تو ہجر اور کانٹوں سے پروئے ہوئے بستر کا نام ہے۔ محبت تو شروع ہی موت سے ہوتی ہے..... اور محبت کرنے والوں کو شیشے کا نہیں بلکہ پتھر کا ہونا چاہیے..... تاکہ محبت کے علاوہ اور کچھ بھی اثر نہ کرے، نہ کوئی سرد و گرم، نہ کوئی ہجر و وصال..... نہ کوئی زری اور نہ کوئی علیزے، بس پتھر کے ہو جاؤ اور بے فکر رہو۔"

دل آور نے خاصے بے لچک سے لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا اور رُخ کھڑکی کی سمت موڑ لیا تھا۔

جبکہ اس کے سامنے کھڑی علیزے اس کے جواب پہ اور اس کے اطمینان پہ اسے دیکھتی رہ گئی اور اس لمحے اسے واقعی یہ لگا تھا کہ اس کے سامنے کوئی انسان نہیں بلکہ پتھر کھڑا ہے، جس پہ واقعی اب کچھ بھی اثر نہیں کر سکتا۔

"کیا بات ہے؟ کہاں کھو گئی ہو؟ دیکھنا کہیں محبت کے اس چکر میں پڑ کر تمہیں بھی محبت نہ ہو جائے؟" دل آور نے گردن موڑ کر استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے اس کا گال تھپکنا چاہا تھا اور وہ اس کے اتنے اچانک لمس پہ چونک گئی تھی اور اسے خاصی ناگوار نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں اور تم سے محبت؟ ہونہہ کوئی عقل والی بات کرو ڈرائیور۔" اس نے انتہائی زہر خند سے لہجے میں کہہ کر سر جھٹکا تھا اور اس کی بات پہ دل آور عجیب سے انداز میں مسکرا اٹھا تھا۔

"افسوس..... جب سے تم زندگی میں آئی ہو ساری عقلیں دھری کی دھری رہ گئی ہیں، زنگ کھا گئی ہیں، مانج میں۔" اس نے اپنی کنپٹی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بات کو نالو مت..... میں تم سے زری کی بات کر رہی ہوں اور تم مجھ سے میری بات کر رہے ہو۔ یہ کیا طریقہ ہے بھلا؟" وہ جھنجلائی تھی۔

"یہی تو اصل طریقہ ہے اور تم اس طریقے کو سمجھ ہی نہیں رہیں، زری غیر ہے میرے لیے، اس کی بات کیسے کروں اور کیوں کروں؟ جبکہ تم میری ہو۔ اس لیے ساری باتیں تمہاری ہی کرتا ہوں صرف تمہاری۔"

وہ کہتے ہوئے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا جہاں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ہلکورے لے رہے تھے۔

"مجھ سے غلط بات مت کیا کرو ڈرائیور! میں تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" اس نے چبا کر کہا۔

"میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ تم سے کبھی کوئی غلط بات نہ کروں، میں تمہارے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہوں اور تم ہو کہ سمجھتی ہی نہیں ہو۔ مگر پھر بھی دعویٰ کرتی ہو کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھتی ہو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تم مجھے اچھی طرح سمجھتیں تو مجھ سے یہ تھوڑی دیر پہلے والے اِدھر اُدھر کے سوال نہ کرتیں۔" دل آور نے بڑے عجیب سے اور تمسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"ہونہہ..... تو تم بھی تو کھلی کتاب کی طرح نہیں ہو نا؟" علیزے نے بھی چوٹ کی تھی۔

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں تمہارے سامنے کھلی کتاب کی طرح نہیں ہوں۔ مگر مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں سچ مچ کھل جاؤں تو کیا کرو گی؟ کیا اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عمل بھی کر سکو گی یا نہیں؟" اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہونہہ..... مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ پھر زہر خند ہوئی تھی۔

"ہوں..... تو پھر یہ طے ہے نا کہ میں واقعی ایک کھلی کتاب ہوں لیکن تم مجھے پڑھنے کا شوق ہی نہیں رکھتیں؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"دیکھو میں بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتی میں بات کو سمیٹنا چاہتی ہوں۔ بلکہ سب کچھ سمیٹنا چاہتی ہوں۔"

"کیا سب کچھ؟" وہ پھر سوالیہ ہوا۔

"سب کچھ جیسے زری اور تم۔" وہ کہتے ہوئے پُرسکون تھی۔

"مطلب....." دل آور نے علیزے کے چہرے کو جانچا۔

"مطلب وہی ہے کہ زری کو اپنا لو۔" وہ اپنے کہے پہ قائم تھی۔

"اور تمہیں؟" دل آور کا یہ سوال بھی برجستہ تھا۔

گلاب کی بار علیزے برجستگی سے کام نہیں لے سکی تھی بلکہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی تھی اور پھر اس نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو..... طلاق دے دو مجھے میری فکر مت کرو میری زندگی گزر ہی جائے گی۔ لیکن تمہارے بغیر وہ مر جائے گی جو تمہیں چھوڑ دوں..... اور زری کو اپنا لوں، واہ کیا کمال کا آئیڈیا ہے میری جان! یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہیں آیا؟" دل آور نے علیزے کا مذاق کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں..... مجھے چھوڑ دو..... مگر..... مگر اسے اپنا لو..... پلیز ڈرائیور وہ تکلیف میں ہے اسے....."

"بس علیزے بس..... وہ تکلیف میں ہے تو اس سے زیادہ تکلیف میں، میں خود ہوں، تم سب کو یا تو اپنی اپنی تکلیفیں نظر آتی ہیں یا پھر ایک دوسرے کی تکلیفیں نظر آتی ہیں مگر میری تکلیف..... دل آور شاہ کی تکلیف آج تک کبھی کسی کو نظر نہیں آئی..... کبھی کسی کو اس کا احساس نہیں ہوا، نہ کسی زری کو، نہ کسی علیزے کو اور نہ ہی کسی دوست کو، سب کو ہمیشہ اپنا آپ ہی نظر آیا ہے۔ اپنی تکلیف ہی تکلیف دی ہے، میرا درد، میری چوٹ، میرا زخم کسی کو دکھائی نہیں دیا، چاہے وہ تم ہو، چاہے وہ زری ہو اور چاہے عبداللہ یا نبیل ہوں سب کو اپنی پروا ہے سب کو اپنی اپنی فکر ہے..... میرے بارے میں، میری تکلیف کے بارے میں کبھی کسی نے نہیں سوچا کبھی کسی کو احساس نہیں ہوا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے..... موسم اور محبت اس پہ بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں افسوس اس بات کا نہیں کہ کسی کو میری فکر نہیں ہے کسی کو میری تکلیف کا احساس نہیں ہے، بلکہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ سب کی تکلیف پہ میں کیوں تڑپتا ہوں؟ میں کیوں روتا ہوں؟ مجھے کیوں چین نہیں آتا؟ اور اس کے باوجود سب کی نظر میں برا بھی میں ہی بنتا ہوں۔" وہ علیزے کی بات پہ یکدم سے پھر گیا تھا اور علیزے اس کی اس قدر بلند دھاڑ پہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی، اسے دل آور کے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر خوف آ گیا تھا اس کے سامنے سے جاتے جاتے پھر ٹھہر گیا تھا۔

"اور ہاں..... اب جو تم بار بار کہہ رہی ہو نا کہ مجھے چھوڑ دو یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے کہنے پہ میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں، مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، تم کوئی سگریٹ نہیں ہو جس کو تمہارے کہنے پہ اتنی آسانی سے چھوڑ دوں، تم جیتی جاگتی انسان ہو، بیوی ہو، عزت ہو میری، سگریٹ کا ٹکڑا نہیں ہو جسے میں فوراً اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دوں، آج ایسی بات کہی ہے مجھ سے آئندہ کبھی مت کہنا، ورنہ میرا خود پہ اختیار نہیں رہے گا اور انجام تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"

اس نے انگلی اٹھا کر اسے خاصے غضبناک طریقے سے وارننگ دی تھی اور علیزے چپ کی چپ رہ گئی۔ جبکہ وہ پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا غصے سے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

♥

وہ جذبوں کی تجارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
اسے بننے کی عادت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
مجھے اس نے کہا تھا آؤ نئی دنیا بساتے ہیں
اسے سوجھی شرارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
ہمیشہ اس کی آنکھوں میں دھنک سے رنگ ہوتے تھے
یہ اس کی عام حالت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

اک بے بسی تھی، اک اضطراب تھا جو نبیل حیات کو کہیں بھی بیٹھنے نہیں دے رہا تھا وہ کئی گھنٹے مسلسل سڑکوں پہ گاڑی بھگانے کے بعد تھک ہار کے گھر واپس آیا تو اس کا دماغ پھر سے اڑ گیا تھا۔ کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ جسم سے لے کر جان تک جل اٹھا تھا اس کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔

"پاپا....." نبیل پوری قوت سے چیخ اٹھا تھا کیونکہ ممتاز حیات کے ہاتھ میں مومنہ بی بی کا دوپٹہ دیکھ کر اس کا دماغ ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

جبکہ ممتاز حیات نے فوراً سے پیشتر اس کا دوپٹہ چھوڑ دیا تھا اور مومنہ بی بی ان کی گرفت سے اپنا دوپٹہ آزاد ہوتے دیکھ کر بڑی

بیتابی سے لپک کے نیبل کے پیچھے چھپ گئی تھی یوں جیسے وہ کسی آسمانی آفت سے بچنے کے لیے پہاڑ کے پیچھے چھپ گئی ہے۔

''صاحب! وہ..... وہ بڑے صاحب.....'' مومنہ بی بی کی حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اس کے حلق میں کانٹوں کا سا پھنس گیا تھا اور نیبل کے چہرے کی رنگت غصے اور غضب کے مارے نیلی پیلی ہونے لگی تھی اور اس کی آنکھوں کا رنگ بھی سرخ ہو گیا تھا وہ تیر کی طرح ممتاز حیات کی سمت بڑھا تھا۔

''یہ کیا کر رہے تھے آپ؟ آپ کو جرأت کیسے ہوئی اس پہ بُری نظر ڈالنے کی؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ یہ پہلے ہی آپ کے زہریلے سانپ کی ڈسی ہوئی ہے، پہلے بھی ایک درندہ اس کی ذات پہ اپنی درندگی آزما چکا ہے، آپ..... آپ جیسے کی زہریلے سانپ کی ڈسی ہوئی ہے، پہلے بھی ایک درندہ اس کی ذات پہ اپنی درندگی آزما چکا ہے، آپ..... آپ پھر بھی..... پھر بھی جانتے بوجھتے بھی باز نہیں آئے، آپ کو ذرا خیال نہیں آیا کہ آپ کیا حرکت کر رہے ہیں؟ آپ کو ذرا شرم نہیں آئی کہ یہ آپ کی بیٹی کے برابر کی ہے؟'' نیبل نے انہیں گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

''تو خود اسے اپنے گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے؟ کیا اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہو؟ خوبصورت بھی تو بہت ہے آخر؟'' ممتاز حیات نے نیبل کو طعنہ دے مارا تھا اور وہ اس طمانچے پہ کرنٹ کھا گیا تھا۔

''بابا.....'' وہ جیسے گنگ سا ہو گیا تھا۔

''ہاں..... ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں آخر اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنے کا مقصد کیا ہے؟ کیوں اتنے مہربان ہو اس پہ؟ آخر کار ہی مظلوم ہے تو اسے کسی دارالامان میں کیوں نہیں چھوڑ آتے؟ اپنے گھر میں اپنی نظروں کے سامنے کیوں بسا رکھا ہے اسے؟'' ممتاز حیات نے تو کمینگی کی حد کر ڈالی تھی اور نیبل یہ سب سن کر ششدر سا ہو گیا تھا۔

''بولو..... بتاؤ مجھے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟'' ممتاز حیات کو نیبل کی چپ پہ اور بھی شہ ملی تھی۔

''اس نے اسے اپنے گھر میں اس لیے رکھا ہوا ہے کہ اس میں انسانیت ہے، لیکن تم میں انسانیت نہیں ہے تم نے تو اپنے گھر کی بھی بُری نظر ڈالنے سے گریز نہیں کیا، تم جانور ہو جانور..... گوشت نوچنے والے جانور تمہیں جہاں گوشت نظر آتا ہے، رجھ گئے کیے، غرانے لگتے ہو، تمہاری آنکھوں کے آگے ہوس کی چربی چڑھ جاتی ہے، تم اندھے ہو جاتے ہو، تمہارا نفس تمہیں ذلیل کرتے کرتے، کرواتا ہے اور میں ایک ذلیل انسان کے ساتھ اب مزید کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی، لہٰذا میرا فیصلہ یہی ہے کہ مجھے آج اور ابھی طلاق دے دو۔ اور اس گھر سے دفع ہو جاؤ..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

فائزہ بیگم ان کی اور نیبل کی باتیں سن چکی تھیں اور ساری سچویشن سمجھ بھی چکی تھیں اس لیے انہوں نے لگے لگائے والا فیصلہ سنا دیا تھا جس سے وہ ساری زندگی ڈرتی ہی آئی تھیں اور آج جب یہ ڈراؤنا سپنا پھٹا تھا تو وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا جو وہ کہنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

''مام.....'' نیبل کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

''بس..... اب اور نہیں نیبل اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔ ساری زندگی برداشت کیا ہے، اب میری برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے، اب میں مر گئی ہوں جیتے جی مر گئی ہوں مجھے اک عمر ہو گئی ہے اس شخص کے ذلالتوں کے ساتھ جیتے ہوئے اب میرا حق بنتا ہے کہ میں مر جاؤں۔'' فائزہ بیگم غصے و نفرت اور دکھ سے کہتی ہوئی رو پڑی تھیں۔

''مگر مام!'' نیبل کی زبان ہی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی، وہ کچھ کہنے کی کوشش کے باوجود بھی کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''اگر مگر کچھ نہیں..... کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا اور اگر چل بھی گیا تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے، میں کسی ملک حق نواز کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' انہوں نے ممتاز حیات کو ملک حق نواز کا لقب دے دیا تھا اور نیبل ان کا گریبان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''مجھے طلاق دے دو ممتاز حیات..... مجھے اپنے نام کے ساتھ اب تمہارا نام بھی گوارا نہیں ہے۔'' فائزہ بیگم کافی سیاہ ہو رہی تھیں۔

''دے دوں گا تمہیں طلاق..... مل جائے گی تمہیں..... تھوڑا انتظار کرو۔'' ممتاز حیات کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھے تھے۔

''یہ گھر میرا ہے..... آپ یہاں نہیں رہ سکتے۔'' نیبل کی آواز پہ ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رُکے تھے۔

کیوں نہیں رہ سکتا..... صرف اس لڑکی کی وجہ سے؟" انہوں نے کافی چبھتی ہوئی نظروں سے مومنہ بی بی کی طرف دیکھا

"ہاں..... صرف اس لڑکی کی وجہ سے، کیونکہ اب یہ گھر اس لڑکی کا گھر ہوگا، کیونکہ اب یہ ممکن ہوگی کیونکہ اگلے چند لمحوں میں میں اسے شادی کرنے والا ہوں تاکہ دوبارہ کوئی آپ جیسا ملک حق نواز اس پہ بُری نظر نہ ڈالے۔" نبیل نے فائزہ بیگم سے بھی انہیں دھاکا کیا تھا۔ جس پہ وہاں موجود تینوں نفوس ساکت و صامت سے ہو گئے تھے۔

"نبیل....." فائزہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔

"صاحب....." مومنہ بی بی کے ہونٹ بھی لرز گئے تھے۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کسی کو کوئی اعتراض ہو مجھے پروا نہیں ہے۔ البتہ مومنہ بی بی کو اعتراض ہے تو وہ انکار کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔ میں اس کے انکار کا احترام کروں گا۔" نبیل کہہ کر وہاں سے نکل گیا تھا اور پیچھے وہ تینوں دیکھتے رہ گئے تھے۔

♥

کچھ خاص نہیں بس اتنی سی محبت ہے تم سے
ہر رات کا آخری خیال ہر صبح کی پہلی سوچ ہو تم

ٹھیک ایک ماہ بعد آذر اور کومل کی شادی تھی، ہر طرف رونق ہی رونق تھی ہر طرف ہنگامے ہی ہنگامے تھے مگر آذر کو دیکھا جاتا تو لگتا تھا جیسے دنیا کا جمود صرف اس کی ذات پہ ہی چھا گیا ہو، کوئی بھی رونق، کوئی بھی ہنگامہ اس پہ اثر نہیں کر رہا تھا وہ جہاں بیٹھا تھا اسے وہاں بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر جاتے۔ اس کے آس پاس کیا ہوتا رہا ہے اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا اور اس کی یہ حالت دیکھ کر کسی کو مگر دانیال کو بہت تکلیف تھی۔

وہ جب بھی اسے اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھتا تھا اسے غصہ آجاتا مگر آج نجانے کیا بات تھی کہ اسے آذر پہ غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اس پہ ترس آیا تھا، رحم آیا تھا اور وہ دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔

"کیسے ہو؟" دانیال کے لہجے کے ساتھ ساتھ سوال بھی بہت دھیما سا تھا۔ مگر آذر اپنے ہی کسی خیال میں گم اس کی آواز، اس کا سوال نہیں سن سکا تھا اور دانیال اس کی کیفیت سمجھ گیا تھا۔

"آذر....." اب اس نے اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔

"ہوں..... ہاں....." وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا اور اپنے قریب صوفے پہ بیٹھے دانیال کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔

"میرا خیال ہے تم اس وقت اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہو، جہاں اس وقت تمہارے علاوہ پانچ دس لوگ اور بھی ہیں، جن کی آوازیں بھی ہیں، شور بھی ہے، ہنگامے بھی ہیں، مگر تمہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا، کچھ سنائی نہیں دے رہا، تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ تم بیٹھے کہاں ہو؟ ایسا کیوں ہے بھلا..... کچھ پوچھ سکتا ہوں تم سے؟ کیا اس لائق سمجھتے ہو مجھے؟" دانیال نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا اور آذر اس کے سوال پہ اس کی صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ بتاؤ نا، میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟" دانیال نے پھر اسے جواب دینے پہ اُکسایا تھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی کس قدر انجان بن رہے ہو؟" آذر نے خاصے تلخ اور چبھتے ہوئے سے انداز میں کہا تھا۔

"میں انجان نہیں بن رہا بلکہ تم سے سننا چاہ رہا ہوں۔" دانیال نے تم پہ زور دیا تھا۔

"کیا جاننا چاہ رہے ہو؟" آذر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"تمہارے اندر کا حال۔" اس نے آذر کے سینے کی سمت اشارہ کیا۔

"میرے اندر کا حال تو غالباً تم سے بہتر کوئی نہیں جانتا؟" آذر نے جیسے اپنے حال پہ طنز کیا تھا۔

"اسی لیے تو سب سے زیادہ پریشانی بھی مجھے ہی ہوتی ہے۔" دانیال واقعی متفکر ہو رہا تھا۔

"پریشانی..... مگر کس چیز کی؟" اس نے جان بوجھ کر تعجب ظاہر کیا تھا۔

"تمہارے حال کی....." دانیال نے اسے سرتاپا اور تاسف زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہونہہ..... میرے حال کو کیا ہوا ہے بھلا؟ ٹھیک ہی تو ہے بہت خوش ہوں میں، آخر میری شادی ہو رہی ہے، ایک سے ہونے جا رہا ہوں۔ اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی میرے لیے؟'' آذر کے لہجے میں طنز تھا ایک گہرا طنز۔ دانیال چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

''دیکھو آذر! اب طنز کر دیا چوٹ..... حال بتاؤ یا حلیہ..... فیصلہ تو ہو چکا ہے، شادی تو تم نے کرنی ہی ہے تو پھر اسی طرح اس طرح اُداسی کا اشتہار بننے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ اس طرح کرو گے تب بھی شادی ہوگی اور اگر نارمل رہو گے تو تب بھی شادی ہوگی، مگر اس سے فرق یہ آئے گا کہ سیکنڈ طریقے سے سب کچھ اچھا نظر آئے گا اور سب خوش رہیں گے، جبکہ تم فرسٹ طریقے پر چلتے ہوئے ہو۔''

''پلیز دانیال پلیز..... یہ ساری باتیں صرف کہنے کے لیے ہی ہوتی ہیں، ان پہ عمل کرنا پڑ جائے تو جان عذاب میں آ جاتی ہے، گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے، انسان چکی کے دو پاٹوں میں پس کے رہ جاتا ہے امیدیں ختم ہو جاتی ہیں دل و دماغ کی مگر حاصل کچھ بھی کچھ نہیں ہوتا، اٹھا اپنے ہی دل کی لاش اُٹھانا پڑ جاتی ہے اور اپنے دل کی لاش اپنے کندھوں پہ اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ صرف میرا ہی المیہ نہیں ہے سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے، کبھی تم پہ گزرتی تو تمہیں احساس ہوتا مگر خوش قسمت ہو..... اس معاملے میں مطمئن ہو..... اور اللہ تمہیں مطمئن ہی رکھے آمین۔'' آذر نے کہتے ہوئے آخر میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دانیال کو ایک بار پھر چپ ہونا پڑا۔

''مگر پھر بھی یار! میں یہی چاہوں گا کہ تم خوش رہو۔'' دانیال نے ذرا توقف سے دوبارہ کچھ بولنے کا ارادہ کیا تھا، اس کی بات پہ بے ساختہ نفی میں سر جھٹکتے ہوئے طنزیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔

''ہونہہ..... خوش تو بہرحال نہیں رہ سکتا البتہ خوش نظر آنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہوں۔''

''لیکن آذر۔'' دانیال نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

''ایم سوری دانیال! میں اس وقت کچھ سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، جو جیسا چل رہا ہے، چلنے دو۔ بس گہرائی میں مت جاؤ، گہرائی میں جانے سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔'' آذر اسے ہاتھ اُٹھا کر روکتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تم دونوں میں کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟ وہ بھی اتنے سنجیدہ موڈ میں۔'' عائشہ آفندی ان دونوں کے قریب ہی آئی تھیں۔

''کچھ نہیں پھوپھو! ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس آپ کے بیٹے کو ہر بار گہرائی میں جانے کی عادت پڑ گئی ہے، ایسے نہیں ذرا نہ سوچا کرے شادی کے دن قریب ہیں اس لیے اپنے ذہن پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔'' آذر ہلکے پھلکے انداز میں کہتا عائشہ آفندی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''کیسا بوجھ؟'' اس کی بات پہ عائشہ آفندی کو اُلجھن ہوئی تھی۔

''عجیب الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہتا ہے، بڑا فارغ نائم ہے اس کے پاس۔'' آذر کے انداز پہ غور کرنے کے بعد عائشہ آفندی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے، تب انہوں نے کچھ ریلیکس ہو کر دانیال کی طرف دیکھا تھا۔

''فارغ نائم تو تم سب کے پاس ہی ہے، سوچتے تو تم بھی رہتے ہو۔ اب یہ پتا نہیں کہ کیا سوچتے رہتے ہو؟'' وہ جواباً مسکرائی تھیں اور آذر کچھ دیر بعد وہاں سے اجازت لے کر باہر نکل گیا تھا اور دانیال پھر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ آج کل مسلسل آذر کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

♥

''مجھے ایک بار..... صرف ایک بار..... بس آخری بار..... اور..... اور شاید پہلی بار..... اس سے اظہار تو کرنا چاہیے نا! اس دل میں اس نامراد دل میں یہ خواہش، یہ حسرت تو نہ رہے کہ بنا اظہار کے ہی مر گیا؟ نہ اس کے در پہ پہنچا نہ سجدہ کیا، بس پتھر کی جیسے بت بنا رہ گیا۔ ہرگز نہیں کبھی نہیں اس جیسی کو ایک بار اس کے در پہ تو ضرور لے کر جاؤں گا۔ بلکہ آج ہی جاؤں گا اور ابھی ہی جاؤں گا آج کے بعد کل کس نے دیکھا ہے بھلا؟ کل پہ رہ جانے والے لوگ خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں اور میں، میں تو ہوں ہی خالی ہاتھ، مجھے خالی ہونے کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے اب اس کے در پہ اس کے دل کے در پہ جانا ہی بہتر ہے اور آج میں جاؤں گا ابھی میں جاؤں گا ابھی جاؤں گا اور اسی وقت جاؤں گا۔'' اس نے اندھا دھند سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اچانک گاڑی کا رخ

PRIME URDU NOVELS

طرف موڑ دیا تھا۔ اور گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی۔

مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یوں پاگلوں کی طرح ڈرائیو کرتے ہوئے نبیل حیات کے رُخساروں پہ کتنے آنسو بے آواز بہے اور دل کتنی بار صحرا میں بھٹکے مسافر کی طرح بولایا تھا۔

وہ بھی تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا مگر اس وقت دو دل و دماغ کی یورش سے سچ مچ جنونی سا ہو رہا تھا اس کے اندر چھپی سالوں کی پیاس کے روئیں روئیں سے نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ آج کچھ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا، جیسے وہ اپنے اختیار میں ہی نہ رہا ہو، اس کا اپنی ذات سے ہی اختیار اُٹھ چکا تھا، وہ بے بس تھا اور اس بے بسی اور جنونی سی حالت میں وہ سیدھا ہسپتال جا پہنچا تھا۔

"نبیل بھائی آپ؟ خیریت تو ہے نا؟" نگارش جو زری کے بیڈ کے قریب ہی کرسی پہ بیٹھی ہوئی تھی نبیل کو یوں اچانک بغیر بیل کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرانی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں زری سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ نگارش ٹھٹک کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"زری سے بات کرنا چاہتے ہیں؟" اسے مزید حیرت ہوئی تھی۔

"جی ہاں..... زری سے بات کرنا چاہتا ہوں کیا اجازت ہے؟" اب کی بار اس نے اجازت طلب کرنے کی فارمیلٹی نبھائی تھی۔

"جج..... جی..... کر سکتے ہیں۔" نگارش نے اپنے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی زری کی ڈائری زری کے سرہانے رکھی اور اک سائیڈ پہ ہو گئی۔

"جو بھی بات کروں گا یہ سنے گی نا؟" نبیل نے جیسے تسلی چاہی تھی۔

"ہونہہ..... یہی تو افسوس ہے صرف سنتی ہے، بولتی کچھ بھی نہیں۔" نگارش کے لہجے میں دُکھ کی چبھن تھی۔

"میں بھی نہیں بولتا تھا، صرف سنتا تھا، مگر آج یہاں سننے کے لیے نہیں آیا، صرف بولنے کے لیے آیا ہوں، تاکہ میں بولوں اور یہ سنے۔"

نبیل نے زری کی سمت اشارہ کیا تھا مگر نگارش اس کے تیور دیکھ کر لرز گئی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اک اور محبت کا انکشاف پہ آمادہ تھی اور انکشاف جب بھی ہو، جس چیز کا بھی ہو ہمیشہ دہلا ہی دیتا ہے اور اس لیے نگارش بھی دہل گئی تھی اور اس کا دل بھی۔

"نبیل بھائی کیا یہ سہہ پائے گی؟" نگارش کو شروع سے ہی شک تھا کہ نبیل زری کو چاہتا ہے اس سے محبت کرتا ہے، ایموشنل اٹیچمنٹ رکھتا ہے۔ مگر کہتا کچھ بھی نہیں اظہار نہیں کرتا ڈرتا ہے سمجھتا ہے لیکن آج وہ سارے ڈر اور ساری جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے اندر کا جنون اُٹھائے، اپنے لفظوں کے موتی لیے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور نگارش کا شک یقین کے سانچ میں ڈھل گیا تھا۔

"میں بھی تو نہیں سہہ پا رہا اس لیے تو آج، آج سب کچھ کہہ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

"تو آپ آزاد ہونے کے لیے آئے ہیں؟" نگارش نے بھی ذرا توقف سے سوال کیا تھا۔

"ہاں..... دل پہ بوجھ اُٹھا اُٹھا کر تھک گیا ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر یہ بوجھ وہ کیسے اُٹھائے گی..... آپ جانتے ہیں نا یہ ایک ایسا بوجھ ہے جو زمین بھی نہیں سہار سکتی، اس کے دُکھ میں، اس کے ہجر میں بنجر ہو جاتی ہے اور آپ ایک بنجر زدہ زمین کو مزید عذاب میں مبتلا کرنا چاہ رہے ہیں۔" نگارش نے دُکھ سے کہا تھا۔

"نہیں..... میں اسے مزید عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہ رہا بلکہ یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ یہ اکیلی بنجر زدہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ اکیلی بنجر زدہ ہے، ہم جیسے لوگ بھی اس عذاب کا شکار ہیں، ہم بھی اک عذاب جھیل رہے ہیں اور اس عذاب کو جھیلنے کے بعد جی بھی رہے ہیں اسی کی طرح دل سے اور دنیا سے غافل نہیں ہوئے۔"

نبیل کی ہر بات میں اور ہر لفظ میں دُکھ تھا، درد تھا، چبھن تھی نگارش سے مزید سنا نہ گیا اور اس روم سے باہر نکل گئی تھی اور نبیل، زری کے بیڈ کے پاس کرسی کی طرف کھڑا رہ گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ تھا۔ اور کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔
زری بیہوش پڑی تھی اور نبیل ہوش و حواس میں کھڑا تھا۔
اور سوچ رہا تھا کہ بیہوش پڑی زری سے کیا کہے..... کہاں سے بات شروع کرے۔ اور کہاں پہ بات ختم کرے؟
جبکہ زری مضطرب سی ہو رہی تھی کہ نبیل کیا کہنے والا ہے آخر ایسی کون سی بات ہے جس کو بتانے کے لیے اور بتانے سے ہی نکاش اتنی پریشان ہو گئی تھی اور ان دونوں کے لہجوں میں دُکھ جھلکنے لگا تھا۔
''نبیل پلیز! بولیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ کیوں اتنے پریشان ہیں؟ کیوں آئے ہیں یہاں؟'' زری آنکھ نہیں سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی سوال نہیں کر سکتی تھی مگر اندر ہی اندر پریشان تو ہو سکتی تھی نا..... بے چین تو ہو سکتی تھی نا؟
''زری.....'' نبیل کو شاید اس کی بے چینی اور اضطراب کا احساس ہو ہی گیا تھا۔ مگر زری جو پہلے ہی بے جان سی پڑی تھی اس کی اس پکار پہ دھک سے رہ گئی تھی۔
''یہ کیا؟ یہ تو محبت کی آواز ہے؟ یہ تو عشق کا لہجہ ہے؟''
یہ پکار تو قیامت کی پکار ہے..... اس سے کون بچے؟ اور اس کو کون بچائے؟
وہ کوئی دل آور شاہ تھی جس کا کلیجہ محبت کی آواز، عشق کے لہجے اور قیامت کی پکار پہ بھی نہ کانپتا؟ وہ تو موم کا وجود تھی، لیکن پتھر ہو کے رہ گئی تھی۔
''سنا ہے محبت کی رمز، محبت کا دُکھ تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا، کسی کو محسوس ہی نہیں ہوتا اس لیے محبت کی رمز اور محبت کا دُکھ لے کے آیا ہوں، بتا کہ تم سنو اور مجھے علاج بتاؤ، حل نکالو میرے درد کا، میری بے بسی کا اور میری اس مفلوج عجیب محبت کا جو تمہارے ساتھ پچھلے چھ ماہ سے اس بستر پہ پڑی ہے اور کوما کا شکار ہے۔''
نبیل کی آواز بے حد گمبھیر ہو رہی تھی اور لہجہ جھکنے لگا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیڈ کی پائنتی والے اسٹینڈ پہ جما دیے تھے جیسے وہ بے بسی کی انتہا پہ کھڑا ہو۔
''زری پلیز..... اور کچھ نہیں تو مجھے صرف اتنا ہی بتا دو کہ اگر کسی کی محبت کوما میں چلی جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟'' اس کا یہ سوال ہی جان لیوا تھا اور زری اس کے ہر سوال کے ساتھ مر رہی تھی۔
''بولو زری! بتاؤ مجھے کسی کی محبت کوما میں چلی جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس انسان کو مر جانا چاہیے؟ یا پھر کسی کا پتھر کا ہو جانا چاہیے؟''
نبیل نے زری کے چہرے کی سمت دیکھا جو بظاہر تو بہت پُرسکون تھا مگر اندر کہیں طوفان اُٹھ رہے تھے اور اندر کے اس طوفان کو باہر تک آنے میں ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ مگر نبیل کو اس وقت کا انتظار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ وقت اور انتظار کے اس جملے سے نکل آیا تھا اور اپنے آس پاس کی ہر ذی شعور کو جھنک رہا تھا جھنجلا رہا تھا۔
''ہونہہ..... مجھے پتا ہے کہ تمہارا جواب کیا ہو گا؟ یہی نا کہ انسان کو پتھر کا ہو جانا چاہیے؟ بالکل ایسے جیسے تم ہو گئی ہو جیسے دل اور ہو گیا ہے، ویسے ہی بالکل ویسے ہی مجھے بھی ہو جانا چاہیے کیونکہ ہم تینوں کا آپس میں رشتہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم تینوں ایک دوسرے سے محبت کریں اور پتھر کے ہو جائیں تو پھر..... تو پھر تم خود سوچو زری کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم دونوں محبت کر کے پتھر کے ہو جاؤ اور نبیل حیات محبت کر کے بھی موم کا ہی رہ جائے؟
ہونہہ..... نہیں ہرگز نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا وہ پتھر لوگوں میں ایک موم کا انسان نہیں رہ سکتا اگر رہنا ہے تو اسے بھی ان کے جیسا پتھر بن کے رہنا ہو گا اور میں آج یہاں یہی بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں بھی آج سے تم لوگوں کی طرح پتھر ہی ہوں اور پتھر کہلاؤں گا۔ مگر اس پتھر ہونے سے پہلے اک اعتراف کرنا تھا اک حسرت پوری کرنی تھی۔
سو اس کے لیے تمہاری خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا اور وہ ہو گیا ہوں۔'' نبیل نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور ذرا توقف کے لیے ٹھہرا تھا۔
''زری! اعتراف یہ ہے کہ نبیل حیات کے دل و جان کو ہی نہیں، روئیں روئیں کو بھی محبت ہے تم سے ہے اور حسرت یہ ہے کہ میں اپنا حال کہوں اور تم سامنے بیٹھ کے سنو اور یہ حیرت اور یہ اعتراف تب سے اس دل میں لیے پھر رہا ہوں جب تم نے چلنا بولنا

سرزمین پہ قدم رکھا تھا، لیکن اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ تم نے انگلینڈ کی سرزمین پہ قدم نہیں رکھا بلکہ میرے دل پہ قدم رکھا ہے۔ تمہارے آنے سے بہار آ گئی تھی۔ جہاں تمہارے قدم رکھنے سے ہی محبت کا پودا اُگ آیا تھا مگر میں نے اس پودے کو ہمیشہ سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا، سوچا..... عبداللہ نے تمہیں اسٹڈی کے لیے یہاں بلوایا ہے، اب اگر میں اظہار کرتا، اپنی محبت کا تو ہو سکتا ہے پھر اپنی مام کے ذریعے پرپوزل دیتا تو یقیناً عبداللہ تم سے بدظن ہو جاتا کہ اس کے یہاں آتے ہی یہ سب بھی شروع ہو گیا ہے۔ اسی لیے تمہاری خاطر میں نے اپنے دل کو گونگا بہرہ اور اندھا بنا دیا۔ کبھی کچھ بولا نہ کبھی کچھ سنا اور نہ ہی کبھی کچھ دیکھا۔ میں اس پودے کو پالنے میں لگا رہا جو صرف تمہارے ایک قدم کی مرہون منت میرے دل کی سرزمین پہ اُگا تھا اور اس دشمن کو بھی پتا نہ چلا کہ تمہارے دل کی سرزمین پہ کس کی محبت کے پھول کھل چکے ہیں؟ اگر اس بات کا علم ہو جاتا تو میں اپنے دل کے اس پودے کو بہت پہلے ہی جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا۔

مگر افسوس کہ پتا اس وقت چلا ہے جب اس پودے کی جڑیں میری نس نس میں پھیل گئیں اور اس کا درد میری رگ رگ میں سما گیا ہے۔

میں بیمار ہو چکا ہوں، میں مر رہا ہوں، میں چیخ رہا ہوں، چلا رہا ہوں، تڑپ رہا ہوں، جھلا رہا ہوں، مگر سنبھل نہیں رہا، بچ نہیں رہا، مر رہا ہوں، مگر جینا چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اور پتھر ہونے سے پہلے تمہاری محبت سے اور اس پودے کی جڑوں سے آزاد ہو جاؤں اور یہاں آزاد ہونے کے لیے ہی آیا ہوں اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ آج سے نیل حیات بھی پتھر اور اس کے جذبات بھی پتھر کے ہو گئے ہیں۔

اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں وہی نیل حیات ہوں اک اچھا سا موم کا پتلا۔ اب میں چلتا پھرتا پتھر کا انسان ہوں اور پتھر پہ کچھ اثر نہیں کرتا، چاہے ہجر ہو، چاہے وصال ہو، چاہے زری ہو، چاہے مومنہ بی بی۔'' وہ کہتے کہتے ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔

''مومنہ بی بی؟'' زری کا دل روتے روتے چونکا۔

''مومنہ بی بی! کیا مومنہ بی بی؟ نیل آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں بتائیے نا، مومنہ بی بی کا ذکر کیوں کیا؟'' زری کی خاموشی ویران تھی۔

''ہاں..... مومنہ بی بی۔'' نیل نے اثبات میں سر ہلایا تھا جیسے زری کی خاموشی کی زبان بھی بآسانی سمجھ رہا ہو۔

''زری! میں نے سوچا ہے کہ جب ہم لوگ ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے تو پھر کیوں نہ ہم لوگ ان کے ہو جائیں جن کو ہماری ضرورت ہے، جن کی زندگی ہمارے نام سے ہی جُڑ جائے گی۔ جن کو سہارا مل جائے گا۔ جو سنور جائیں گے۔''

''نیل پلیز..... آگے بولیں۔'' زری کا دل چیخا۔

''سو اسی لیے آج میں نے مومنہ بی بی سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے، میں اسے اپنا نام دے رہا ہوں، اپنے گھر میں جگہ دے رہا ہوں، مقام دے رہا ہوں، بالکل ایسے ہی جیسے دل آور نے علیزے بھابی کو دیا ہے۔''

نیل نے اچانک اور بے ساختہ ہی وہ بات کہہ دی تھی جو بے جان پڑی زری کو بھی ہلا کے رکھ گئی تھی۔

''ہاں زری! یہ سچ ہے اور یہی حقیقت ہے وہ کہے یا نہ کہے، وہ مانے یا نہ مانے لیکن وہ بے وفا نہیں ہے میں کہتا ہوں میرا دل کہتا ہے اور بے وفا نہیں ہے، نہیں ہے وہ بے وفا اس نے وہی کیا ہے جو آج میں کرنے کے لیے آیا ہوں پتھر ہو گیا ہے وہ..... مر چکا ہے اس کا احساس ختم ہو چکا ہے اپنی..... جیسے اب میں گھسیٹوں گا جیسے تم گھسیٹو گی، جیسے عبداللہ گھسیٹ رہا ہے ہم سب اپنی اپنی لاشیں گھسیٹ رہے ہیں زری اور یہی ہمارا مقصد تھا اور اب اس مقدر کے ساتھ ہم نے جینا بھی ہے اور زندگی بھی گزارنی ہے۔''

نیل کا لہجہ بھیگنے لگا تھا اور زری کی ہستی تہس نہس ہو گئی تھی۔

''زری! اگر میری مانو تو واپس آ جاؤ..... واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ یہاں ہوش و حواس میں رہ کر بھی جیا جا سکتا ہے۔ ہاں پتھر بن کے بھی جیا جا سکتا ہے یہاں کسی اور کا ہو کر بھی جیا کا سکتا ہے ضروری نہیں ہے کہ محبت نہ ملے تو بستر سے لگ جاؤ۔ البتہ ضروری تو یہ ہے کہ تم پھر سے اُٹھو، پھر سے حوصلہ کرو اور پھر سے محبت نبھاؤ۔ کیونکہ محبت میں ہمت ہارنا بہت آسان ہوتا ہے محبت میں حوصلہ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جیسے میں نے رکھا ہے جیسے دل آور نے رکھا ہے ویسے ہی تم بھی رکھو۔

آخر تمہاری محبت کی شدت تو ہماری محبت سے بھی زیادہ ہے، تمہیں تو اور زیادہ حوصلہ رکھنا چاہیے ہم سے بھی زیادہ، جو کچھ من میں تھا وہ سب کہتا جا رہا تھا۔

''مجھے دیکھو میں بھی تو ہوں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے دل پہ دل آورے کی دسترس ہے پھر بھی تم سے محبت کرنا کم نہیں کر سکتا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اب کسی اور کا ہونے جا رہا ہوں، مگر پھر بھی تم سے دل کا تعلق نہیں توڑ سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم مل نہیں سکتے، پھر بھی جینے کے لیے تیار ہوں، مر نہیں سکتا شاید اس لیے کہ جیوں گا تو تم سے محبت کرتا رہوں گا، مر گیا تو تم آنکھ سے اوجھل ہو جاؤ گی پھر کیسے دیکھوں گا؟ کیسے چاہوں گا؟ اور کس سے محبت کروں گا؟''

وہ بے ساختہ کہتے ہوئے بپھر گیا تھا اور زری کی سانسوں میں اک ہلچل سی ہوئی تھی۔

''خیر..... میں جو بھی کروں یہ میرا مسئلہ ہے اور تم جو بھی کرو یہ تمہارا مسئلہ ہے، ہم ایک دوسرے کو سمجھانے کا اور کسی چیز سے روکنے کا کوئی حق یا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ سب کی اپنی اپنی زندگی ہے اور سب کا اپنا اپنا اختیار ہے میرے بس میں جو ہے میں وہ کرنے جا رہا ہوں، تمہارے بس میں جو ہوگا تم وہ کر لینا۔

بس میں آج سے آزاد ہوا۔ میرے دل سے بوجھ اتر گیا کہ میں تمہارے ورتک نہیں پہنچا۔ لیکن دیکھو آج پہنچا بھی ہوں، دستک بھی کر دیا، اعتراف بھی کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ زندگی تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی زندگی بسر تو کرنی ہی ہے اور وہ چاہے میرے بی بی کے ساتھ ہو جائے، چاہے کسی اور نسوانی وجود کے ساتھ..... انسان کی محبت کا پیکر ہی اس کے پہلو میں سجا ہو یہ ضروری تو نہیں۔'' نبیل نے کہتے ہوئے تلخی سے سر جھٹکا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے بیڈ کی پائنتی سے ہٹا لیے تھے اور واپسی کے لیے ارادہ باندھ لیا تھا۔

مگر اس کے قدم واپسی کا سوچ کر ہی لرز رہے تھے اور دل سینے کی قید میں بے قراری سے تڑپا تھا۔

''آئی لو یو زری! آئی لو یو سو مچ۔'' نبیل کے ہونٹوں پہ یہ اک جملہ مچلا اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے مگر پھر وہ وہاں رکا نہیں تھا اور اک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

''نبیل!'' زری کا من اس کے پیچھے بلند آواز سے چیخا تھا کیونکہ وہ نبیل حیات کے درد کو بہت آسانی سے اور بہت قریب سے سمجھ سکتا تھا اور اس درد کو سمجھتے ہوئے اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور سب کچھ کنٹرول سے باہر ہو گیا تھا۔

''زری.....'' نگارش اس کی حالت دیکھ کر چیخ اٹھی تھی اور ہسپتال کا پورا اسٹاف جمع ہو گیا تھا۔

♥

''مم..... مگر نبیل صاحب! آپ..... آپ تو..... وہ زری بی بی کو؟'' مومنہ بی بی نے ڈرتے ڈرتے زری کا نام لیا تھا اور بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ہاں..... مگر اب نہیں، اب میں اپنی محبت اس کے قدموں میں رکھ آیا ہوں۔ وہ اس کی امانت تھی، اسے ہی دے دی۔ اس کے علاوہ کوئی مسئلہ ہے تو بات کرو۔''

نبیل نکاح سے پہلے مومنہ بی بی کی مرضی جاننے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آیا تھا اور مومنہ بی بی نے سب سے پہلے زری کا نام لیا تھا۔

''صاحب! میری اتنی اوقات نہیں ہے، آپ میری وجہ سے اپنے گھر میں مسئلہ اٹھا رہے ہیں۔'' مومنہ بی بی نے کانپتی ہوئی اور بیچارگی سے کہا تھا۔

''نہیں..... تم غلط سوچ رہی ہو، یہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو مسئلے کا حل ہے، اپنے باپ سے سارے تعلق ختم کر رہا ہوں اور تم سے تعلق جوڑ رہا ہوں، اس سے بڑا مسئلے کا حل اور کیا ہوگا بھلا؟'' نبیل بڑے آرام اور پُرسکون انداز میں بات کر رہا تھا اور مومنہ بی بی اس کے سکون کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

''لیکن نبیل صاحب!'' اس نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا۔

''آپ کی طرف سے میں ہاں سمجھوں یا نا؟'' وہ دوٹوک انداز پہ اتر آیا اور مومنہ بی بی بے ساختہ کسی خیال کے تحت رو پڑی تھی اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

"آپ کیا ہو گیا؟" نبیل کو اُلجھن ہوئی تھی۔

"نبیل صاحب! آ..... آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ میرے لیے کسی مہربان فرشتے سے کم نہیں ہیں، میں اس گھر میں رہ کر آپ کی بھی خدمت کروں وہ بھی میری نظر میں کچھ نہیں ہے مگر میں نے کبھی بھی اپنے لیے اس مقام کا نہیں سوچا جو آپ مجھے دے رہے ہیں۔ لیکن آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی بھی شریف آدمی مجھے اپنی بیوی بنائے، بیویاں تو بہت پاک صاف اور بے داغ ہوتی چاہئیں..... جبکہ میں تو ناپاک ہو چکی ہوں، داغ دار ہو چکی ہوں، میں آپ کے قابل نہیں ہوں نبیل صاحب! میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔" مومنہ بی بی کہتے کہتے یکدم ہچکیوں سے رو پڑی تھی اور نبیل چند ثانیے کے لیے چپ سا ہو گیا۔

"مومنہ پلیز..... چپ ہو جائیے..... کسی کی عزت لٹ جائے یا محبت..... حالت دونوں کی ہی ایک جیسی ہو جاتی ہے، میرا دل بھی آپ سے کچھ کم نہیں ہے، دل داغ دار ہو یا جسم..... بات ایک ہی ہے، آپ میرے جسم کے ساتھ گزارا کر لیجیے گا، میں آپ کی روح کے ساتھ گزارا کر لوں گا۔ زندگی بسر ہو جاتی ہی ہے، سو ہو جائے گی، مگر وعدہ کرتا ہوں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ بیوی بنا لوں تو ہمیشہ بیویوں والا مقام ہی دوں گا، عزت کروں گا اور دوسروں سے بھی عزت ہی کرواؤں گا..... وہی عزت جو آپ کا اصل حق ہے۔"

نبیل نے اسے ہر طرح سے یقین دہانی کروا دی تھی اور مومنہ بی بی نے بالآخر روتے ہوئے اس کے سامنے سر جھکا دیا تھا اور نبیل اس کی رضامندی لے کر باہر آ گیا تھا۔

♥

"بھائی....." مدیحہ حیات بڑی عجلت بھرے انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی، مگر سامنے ہی ڈائننگ روم کے صوفے پر تین چار لوگوں کو دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے تھے اور نبیل اسے دیکھ کر فوراً اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا تھا۔

"ادھر باہر آؤ میرے ساتھ۔" نبیل اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے بولا۔

"لیکن بھائی! یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ یہ سب کیا ہے آخر؟" مدیحہ روہانسی سی ہو رہی تھی کیونکہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ختم ہو رہا ہو۔

"مدحو! میرے ساتھ باہر آؤ پلیز بتاتا ہوں تمہیں۔" وہ اسے اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم سے نکل آیا تھا۔

"بھائی پلیز..... نہ کریں ایسا..... پلیز نہ کریں میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی دُکھ سے۔" مدیحہ نے نبیل کی شرٹ کالر میں دبوچ لی تھی وہ صبح سے ہی گھر پہ نہیں تھی، پہلے شاپنگ کے لیے نکلی تھی پھر عدیل کے گھر چلی گئی تھی، وہاں فاروق نیازی اور دو خواتین کے ساتھ بیٹھے وقت کا پتا ہی نہ چلا تھا کہ اچانک فائزہ بیگم کی کال آ گئی تھی اور جو کچھ انہوں نے بتایا تھا اس کے بعد اس کا دماغ ہی ماؤف ہو گیا تھا، وہ انتہائی عجلت میں رش ڈرائیو کرتی ہوئی گھر پہنچی تھی۔

"نہیں..... اب نہیں مدحو! اب فیصلہ ہو چکا ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"مگر بھائی! وہ زری؟" مدیحہ کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا اس کا بڑا ارمان تھا کہ زری اس کی بھابی بنے، حالانکہ اس کا یہ ارمان دل کے حوالے سے تھا مگر جب سے دل آور کے نکاح کا پتا چلا تھا تب سے یہ ارمان نبیل سے جوڑ لیا تھا شاید اس لیے کہ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ نبیل بھی زری کو چاہتا ہے۔

"اس کے دل کا در بند ہے میرے لیے اور میں اس در پہ لاکھ دستک دوں..... یا عمر بھر چوکھٹ پہ بیٹھ کے انتظار کرتا رہوں وہ میرے لیے کبھی بھی نہیں کھلے گا کبھی بھی نہیں..... اس لیے میں پلٹ آیا ہوں، بنا دستک دیے ہی پلٹ آیا ہوں، ہاں فریاد ضرور کی تھی دستک نہیں دی۔" نبیل نے مدیحہ کو کندھوں سے دباتے ہوئے بتایا تھا۔

"کیوں..... کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟ پلیز بھائی! یہ ستم نہ کریں، زری کا انتظار کریں، وہ ہوش میں آئے گی، ضرور آئے گی، پہ جلد بازی مت کریں، مومنہ کی شادی ہم کہیں اور کروا دیں گے۔" مدیحہ نے روتے ہوئے التجا کی تھی اور نبیل کے چہرے کے تاثرات یکلخت بگڑ گئے تھے۔

"دیکھو مدحو! اگر مجھ ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ زری میری ہے تو تم یقین کرو کہ میں ساری زندگی بھی اس کے انتظار میں گزار نے

سے گریز نہ کرتا مگر مدحو مجھے یقین ہے کہ زری میری نہیں ہے وہ تو اپنے آپ کی بھی نہیں ہے تو پھر..... تو پھر میں انتظار کس کا کروں اور کیوں کروں؟ وہ آج ہوش میں آئے یا دس سال بعد ہوش میں آئے، میں جانتا ہوں وہ تب بھی نیل حیات کو قبول نہیں کرے گی کیونکہ جس دل پہ دل آور کی چھاپ ہو، وہاں نیل حیات اثر کر جائے یہ ایک ناممکن سی ہی بات ہے۔

اور ویسے بھی جس دل پہ دل آور کی چھاپ ہو وہاں نیل حیات اثر کرنا بھی نہیں چاہتا، وہ اس کے لیے دھڑکتا ہے، وہ اس کے لیے دھڑکے..... مجھے کوئی افسوس، کوئی غم نہیں ہے، اس لیے اب تم بھی یہ غم چھوڑو اور دعا کرو، میری نئی زندگی کی بہتری اور سکون کے لیے..... اوکے؟'' نیل نے اسے کافی نرمی سے سمجھاتے ہوئے اس کے گال تھپکے تھے اور پھر قدم ڈرائنگ روم کی سمت بڑھا دیئے تھے جہاں ایس پی کامران مہدی کے ساتھ ساتھ دو تین اور لوگ بھی مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھے نیل کا انتظار کر رہے تھے۔

اور نیل زری کا خیال ڈرائنگ روم سے باہر چھوڑتے ہوئے اندر آ گیا تھا۔ جبکہ مدحیہ وہیں راہداری میں دو زانو بیٹھے اور بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

♥

سر! مبارک ہو..... بہت بہت مبارک ہو، مس زرین ملک ہوش میں آ گئی ہیں۔'' ڈاکٹر لودھی نے آئی سی یو سے باہر نکلتے ہی سامنے کھڑے عبداللہ کو بڑی گرم جوشی سے یہ خبر سنائی تھی اور نگارش کے ساتھ ساتھ عبداللہ کی بھی بے چینی سے آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' عبداللہ نے ہنوز بے یقینی کا ہی مظاہرہ کیا تھا۔

''جی ہاں..... میں سچ کہہ رہا ہوں اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعائیں سن لی ہیں اللہ نے نواز دیا ہے آپ کو، کرم دیا ہے آپ پہ.....؟'' ڈاکٹر لودھی خود بھی بہت خوش تھے اور عبداللہ نے بے ساختہ آگے بڑھ کے ڈاکٹر لودھی کو گلے سے لگا لیا تھا۔

''تھینک یو ڈاکٹر..... تھینک یو سو مچ۔'' عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور لہجہ آنسوؤں کے بوجھ سے بھیگنے لگا تھا۔

''اللہ یہ خوشی آپ کو مبارک کرے اور مس زرین جلدی سے صحت یاب ہو جائیں۔'' ڈاکٹر لودھی نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا پھر کسی کام کے لیے اپنے سٹاف کی طرف بڑھ گئے۔

جبکہ عبداللہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے وہیں فرش پہ ہی سجدے میں جھک گیا تھا۔ اور نگارش بھی اللہ کا شکر بجا لائی تھی۔

''نگارش! یہ..... یہ..... سب کیسے ہو گیا؟ مجھے..... مجھے یقین نہیں آ رہا..... جب ہماری ساری امیدیں ہی دم توڑ چکی تھیں تب..... تب وہ ہوش میں آ گئی؟ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ کون آیا تھا اس سے ملنے؟ وہ..... وہ نرس بتا رہی تھی کہ کوئی آیا تھا'' عبداللہ اچانک ہی نرس کی بات یاد آئی تھی اور نگارش عبداللہ کے اس سوال پہ ٹھٹک گئی تھی کہ اسے کیا جواب دے کہ کون آیا تھا؟

''کیا سوچ رہی ہو نگارش! کہاں کھو گئی ہو؟ بتاؤ نا کیا بات ہوئی ہے؟ کون آیا تھا بھلا؟'' عبداللہ نے گم سم سی نگارش کو کندھوں سے پکڑ کے متوجہ کیا تھا۔

''نیل بھائی آئے تھے۔'' اس نے بے حد مدھم آواز میں بتایا تھا۔

''نیل؟'' اب کی بار عبداللہ کو حیرت کا سنگین جھٹکا سا لگا تھا۔

''جی.....'' نگارش نے بمشکل ہی کہا تھا۔

''کیا کہا اس نے زری سے؟'' عبداللہ کا اپنا لہجہ دھیما پڑ چکا تھا اور آواز کہیں جب چکی تھی۔

''یہ بات آپ زری سے پوچھ لیجیے گا۔'' نگارش کترائی تھی اور عبداللہ کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کندھوں پہ ڈھیلی پڑتی گئی۔ اور وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا پلٹ کر کاریڈور میں لگے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی، وہ باتیں اور وہ چیزیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سمجھی تھیں اب وہی باتیں اور وہی چیزیں لمحے کے ہزارویں حصے میں ہی سمجھ آ جاتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اب احساسات، حالات کی چوٹ اور ضربیں کھا کھا کے وہ بے حد زیادہ حساس اور نرم ہو گئے تھے۔ نیل یہاں کیوں آیا تھا؟ کس وجہ سے آیا تھا؟ کیا کہا تھا؟ کیوں کہا تھا؟ وہ یہ سب نہیں جانتا تھا مگر نیل کے جانے کے بعد زری کی مجذوب حالت کسی منہ زور طوفان کی طرح بگڑ گئی تھی اور اس کی طبیعت کا بگڑنا سب کچھ واضح کر گیا تھا۔ اب خود سوال و جواب کرنے کی یا پھر کچھ جاننے کی تو ضرورت ہی نہیں رہی تھی، اسی لیے تو اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکا لیا تھا۔

♥

دل سے دور دراز
دل سے دور دراز بسے ہے
دنیا دور دراز
اشک لہو میں گھل مل جائیں
سینہ سسک سسک سہلائیں
آنسو بے آواز
دور دور تک روح میں گونجیں خاموشی کے ساز
نہ جانے کس نقطے پہ جا کے کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آغاز امڑی، ابھی تو ہے آغاز
دنیا در نہ جانے امڑی، دل سے دور دراز

آج نجانے کیا وجہ تھی کہ اس کا دل اُداس تھا۔ اور اس اُداسی کی وجہ سے طبیعت میں خاصی سستی گھلی ہوئی تھی وہ بے وجہ ہی ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں ٹہلتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا اور علیزے بچن سمیٹ کر باہر نکلی ہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں مضطرب سے ٹہلتے دل آور کو دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے تھے اور عین اسی وقت دل آور کی بھی اس پہ نظر پڑی تھی اور وہ ٹھہر گیا تھا۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو؟ ادھر آجاؤ۔" اس نے علیزے کو ڈرائنگ روم میں آنے کا اشارہ کیا تھا اور علیزے بھی نجانے کس موڈ کے تحت اس کے ایک اشارے پہ ہی چلتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

"بیٹھو۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد دل آور خود بھی اس کے برابر اور اس کے بے حد قریب بیٹھ گیا تھا اور اپنا سر جھکا لیا تھا، جس پہ علیزے نے سر اُٹھا کر اپنے دائیں طرف بیٹھے دل آور کو دیکھا تھا وہ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس ڈارک براؤن چادر کندھوں پہ پھیلائے، سر جھکائے بیٹھا عجیب ہی کیفیت کا شکار نظر آرہا تھا۔ مایوسی اور یاسیت اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ اور علیزے لاشعوری طور پہ ہی یہ جاننے کی منتظر ہو گئی تھی کہ آخر اسے ہوا کیا ہے؟ وہ کیوں اتنا اُداس اور مضطرب لگ رہا ہے۔ مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اسے بنا پوچھے ہی سب کچھ بتا دے گا۔

اپنی اُداسی اور اپنا اضطراب سب کچھ کھول کے سامنے رکھ دے گا، سوائے زری اور بتول شاہ سے جڑے ماضی کے اور علیزے نے کبھی چاہ کر بھی اس سے اس کے ماضی کے متعلق نہیں پوچھ سکی تھی۔ ہمیشہ سوال ہونٹوں پہ آ کے دم توڑ دیتے تھے، حالانکہ اس کا بہت جانتا تھا کہ وہ زری کے متعلق پوچھے اور بتول شاہ کے متعلق سوال کرے، اس کو جانے، مگر اس نے کبھی اتنی جرأت نہیں کی تھی کہ اپنی زبان پہ چلتے سوال اس کے سامنے رکھ دیتی۔ دل آور نے ہمیشہ جو بھی اس سے کہا تھا، جو بھی شیئر کیا تھا خود اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے کیا تھا۔ علیزے نے کبھی کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس وقت بھی ان کے درمیان یہی کیفیت چل رہی تھی، علیزے سب کچھ سننا چاہتی تھی اور دل آور بھی خاموش تھا مگر کچھ کہنا چاہتا تھا اور اسی کہنے اور سننے کے چکر میں کئی پل یونہی سرک گئے تھے اور بات گھوم پھر کر دل آور کی طرف سے ہی آغاز ہوا تھا۔

"علیزے! انسان جب اُداس ہوتا ہے تو اس کے احساسات اور جذبات اتنے نرم کیوں ہو جاتے ہیں؟ کیوں انسان پگھلے ہوئے موم کی طرح ہو جاتا ہے؟ کیوں اسے کسی اپنے کے سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے؟ کیوں دل چاہتا ہے کہ کوئی سینے سے لگائے اور دل پہ ہاتھ رکھے؟ کیوں نرم لمس کی طلب ستانے لگتی ہے؟ اور کیوں انسان پھر بھی اکیلے کا اکیلا ہی رہتا ہے۔"

اس نے ذرا سی گردن موڑتے ہوئے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔

"کیونکہ اُداسی میں انسان کی ذات پہ چڑھے سارے خول اُتر جاتے ہیں۔" علیزے نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تھا اور دل آور اس کے جواب پہ دیکھتا رہ گیا تھا اس کی بات واقعی سو فیصد درست تھی۔

"کبھی تمہارے ساتھ ایسا ہوا؟" اس نے مزید سوال کیا۔

"میرے ساتھ تو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے، میں تو جیسے گھنٹوں میں نہیں گھنٹے اُداس ہی رہتی ہوں، اس لیے میری ذات پہ خول

بھی ذرا کم ہی رہتا ہے۔'' وہ ذرا تھنکی سے مسکرائی تھی اور ایک بار پھر دل آور پہ نظر ڈالی تھی۔

''البتہ تمہاری بات الگ ہے تمہاری ذات پہ بیس گھنٹے خول ہی چڑھا رہتا ہے، صرف چار گھنٹے ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں اگر تم صرف تم ہی نظر آتے ہو اور ان چار گھنٹوں میں تم اگر مجھے بلاؤ بھی تو میں چپ چاپ آ کر تمہارے برابر صوفے پہ بیٹھ جاؤں گی کیونکہ مجھے پتا ہوتا ہے کہ اداسی کے ان چار گھنٹوں میں تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہوگا، اور تم انا کے نہیں بلکہ پسپائی کے گھیرے میں ہو گے اور پسپا ہوئے شخص کی آنکھوں میں ایسا اثر ہوتا ہے کہ مقابل گھائل ہو جاتا ہے، کسی بات سے انکار نہیں کر پاتا فوراً مان جاتا ہے۔ جیسے اکثر میں مان جاتی ہوں۔ یعنی تمہارے دیکھنے سے ہی گھائل ہو جاتی ہوں۔'' علیزے کی باتیں اب گہرائی لیے ہوئے تھیں اور دل آور شاہ سو چنارہ جاتا تھا کہ یہ سب علیزے کہہ رہی ہے؟ وہ علیزے جسے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، وہ علیزے ہر وقت خوف کے حصار میں رہتی تھی، وہ علیزے جسے بات کرنا ہی نہیں آتی تھی جو معصومیت اور ناسمجھی کا پیکر تھی۔

''تم اداس ہوتی ہو تو کیا دل چاہتا ہے تمہارا؟ کیا کرنے کی خواہش ہوتی ہے؟'' دل آور ابھی بھی گردن ترچھی کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''دل چاہتا ہے تمہیں جان سے مار دوں۔'' علیزے نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے علاوہ؟'' وہ بڑے سکون سے پوچھ رہا تھا۔

''اپنے پاپا سے ملنے کو دل چاہتا ہے، دل چاہتا ہے ان کے سینے سے لگ کے بہت زیادہ روؤں۔'' وہ بھی جو اس کے دل میں تھا سب صاف صاف بتا رہی تھی۔

''ہونہہ..... یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے نا جب تم مجھے جان سے مار دو؟''

''اسی لیے چاہتی ہوں نا کہ تمہیں جان سے مار دوں، تمہیں مار دوں گی تو ان سے ملوں گی نا؟''

''تو پھر مار کیوں نہیں دیتیں؟'' دل آور نے بے چینی سے کہا تھا۔ مگر علیزے جواباً چپ رہی تھی وہ بہت کچھ کہہ دینا مگر کہنے کا دل نہیں چاہا تھا۔

''بولو نا علیزے! تو پھر مار کیوں نہیں دیتیں؟'' دل آور نے پاس بیٹھی علیزے کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا مگر وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''علیزے.....'' دل آویز نے اسے پیچھے سے آواز دی تھی لیکن وہ پھر بھی رکی نہیں بلکہ ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ گئی تھی اور اس کا رُخ بیڈ ریوم کی طرف نہیں اوپر چھت کی طرف تھا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے بیڈ روم میں ضرور آئے گا اس لیے وہ اوپر چھت پہ آ گئی تھی۔ اور دل آور چند لمحے کے لیے یونہی جوں کا توں بیٹھا رہ گیا تھا۔

پھر اچانک نجانے من میں کیا سمائی تھی کہ ایک جھٹکے سے وہ خود بھی اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا تھا لیکن اس کا رُخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا، جہاں آ کر اس نے اپنے بریف کیس سے اپنا ریوالور نکالا اور اس میں سے گولیاں چیک کرتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر اوپر چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''علیزے.....'' اس نے چھت پہ پہلا قدم رکھتے ہی علیزے کو پکارا تھا اور ریلنگ پہ دونوں ہاتھ جمائے گھر کی پیک سائیڈ کی طرف دیکھتی علیزے نے اس کی آواز پہ ایک گہری سانس کھینچی تھی مگر پلٹ کر اسے دیکھا نہیں تھا

''علیزے! بات سنو میری۔'' دل آور نے قریب آ کر اسے بازو پکڑ کر جھٹکے سے اپنی سمت موڑا تھا۔

''تمہارا دل چاہتا ہے نا کہ تم مجھے جان سے مار دو؟ یہ لو..... یہ پکڑو..... اور مار دو مجھے.....'' اس نے علیزے کے ہاتھ پکڑ کر ریوالور اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا اور علیزے ہکا بکا سے اندھیرے میں بھی اپنے ہاتھ پر رکھے ریوالور کو دیکھ کر کانپ گئی تھی۔

''علیزے! دیکھ کیا رہی ہو؟ اپنا شوق پورا کرو اور مجھے زندگی کے عذاب سے آزاد کر دو، اور..... اور..... خود بھی آزاد ہو جاؤ۔'' دل آور نے اسے کندھوں سے تھام کے جھنجھوڑا تھا۔

''علیزے..... سو چو مت، میرا ریوالور لوڈڈ ہے، خالی کر دو اسے، میرا سینہ حاضر ہے۔'' اس نے اسے ہر طرح سے اکسانے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزے اسے تھپڑ یا کوئی مکا تک نہیں مار سکتی تھی، گولی مارنا تو بہت دور کی بات تھی۔

''ہونہہ..... ضروری نہیں ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ کر بھی لیں، چاہت جیسی بھی ہو کب پوری ہوتی ہے بھلا؟'' اس نے

سے انداز میں کہہ کر سر جھکا تھا۔
میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ پہ وار کرو۔'' دل آور نے عجیب جنون خیزی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی
نے پہ رکھ لی تھی۔
میں اپنے ہاتھ تمہارے خون سے نہیں رنگنا چاہتی، تمہارا قتل میرے سر ہوگا۔''
میں اپنا قتل تمہیں معاف کرتا ہوں، تم مجھے جبری رضا سے مار دو۔'' وہ تو جیسے ابھی کھڑے کھڑے اس کے ہاتھوں مر جانے
تا تھا۔
میں تمہیں اپنی دعا سے مارنا چاہتی ہوں، میں دعا کرتی ہوں کہ تم مر جاؤ۔'' علیزے نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔
ہونہہ۔۔۔ علیزے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے مارنے کے لیے تم میں حوصلہ نہیں ہے، ہمت نہیں ہے تم میں۔۔۔۔ تمہیں بھی اس
ور صیاد سے محبت ہوگئی ہے، اب اُڑنا تم بھی چاہو تو اُڑ نہیں سکتیں؟'' دل آور نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کے اس کے
س کے اندر کی کیفیت بیان کی تھی مگر علیزے اس کی بات پہ نظریں چرا گئی تھی۔
میری مجبوری اور میری بے بسی کو میری محبت مت سمجھو ڈرائیور! مجھے اس پنجرے سے محبت ہو سکتی ہے لیکن اس صیاد سے
س نے زہر خند سے لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور دل آور نے اس کے انکار پہ اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔
میں بھی نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے محبت کرو۔'' اس نے بے حد بوجھل سے انداز میں کہتے ہوئے علیزے کو اپنے دونوں
ے حصار میں لے لیا تھا۔ اور علیزے اس کے حصار پہ لرز اٹھی تھی۔ اس کا ایسا لمس علیزے کے لیے بالکل نیا تھا۔
مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم میرے قریب رہو، میرے اتنے قریب کہ تمہارے دل کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکن لگنے
ے۔'' رفتہ رفتہ اپنے بازوؤں میں بھینچ رہا تھا اور اس کے بازوؤں میں لپٹ کر علیزے بالکل ہی چھپ گئی تھی، دل آور کے
ں اور بازوؤں پہ پھیلی چادر علیزے کو بھی ڈھانپ چکی تھی۔
میں نہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں، میرے آس پاس رہا کرو۔'' دل آور کی آواز بھیگنے لگی تھی اور علیزے نے اسے پیچھے ہٹانے
کوشش ہی نہیں کی تھی۔
ڈرائیور علیزے! بس کچھ دیر۔۔۔۔'' وہ جیسے التجا کر رہا تھا۔ وہ کسی احساس میں ڈوب رہا تھا، وہ پگھل رہا تھا۔
مگر ابھی وہ چار منٹ ہی گزرے تھے کہ گھر کے گیٹ پہ نبیل کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ اور دل آور کے بھیگے بھیگے اور بے بس
ب پھر سے ٹھوکر کھانے پہ آ گئے تھے۔ وہ چونک گیا تھا۔
نبیل۔۔۔ اس وقت؟'' وہ بے ساختہ علیزے سے الگ ہوا تھا۔

♥

ور علیزے بھی یکدم چونک گئی تھی۔
نبیل بھائی؟'' اسے بھی کافی حیرت ہوئی تھی۔
ہوں۔۔۔ وہی ہے۔۔۔۔ تم نیچے بیڈ روم میں چلو، میں اسے دیکھتا ہوں۔'' دل آور اسے کہتے ہوئے بڑے پُرسوچ اور پریشان
ر میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔ مگر نہ جانے کس خیال کے تحت وہ جاتے جاتے پھر رُک گیا اور پلٹ کر دوبارہ علیزے کی
ف چلا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں دل آور نے اسے خود سے الگ کیا تھا۔ اس لیے دوبارہ پلٹا تھا اور اس کے قریب آ گیا اور
سے سامنے رُکتے ہوئے اس کا خوبصورت اور دلنشین چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
میرے اندر کی اُداسی اور میری ذات کی تنہائی کو میرے نفس کی کمزوری مت سمجھنا۔ میں نفس کے ہاتھوں مجبور اور مجبور ہونے
والی نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی حاصل کیا بھی تمہاری مرضی، تمہاری رضا اور تمہاری اجازت سے کروں گا۔ تمہاری اجازت
کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو، اتنا بے لگام بھی نہیں ہوں۔ اپنے نفس کو لگام ڈالنا اور اسے کھینچ کے رکھنا مجھے اچھی طرح
آتا ہے اس لیے جو بھی کروں گا، تمہاری چاہ سے اور رضا سے کروں گا۔ فی الحال ریلیکس رہو یو ڈونٹ وری او کے۔'' وہ بڑے تحمل
سے اس کا چہرہ چھوڑ کے اسے ایک بھرپور تسلی سے نواز کر اس کے دونوں رُخساروں کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپا ہوا پلٹ گیا لیکن چند قدموں
کے بعد جا کے پھر ٹھہر گیا اور ایک بار پھر علیزے کی طرف پلٹا اور اس کے انتہائی قر
ب آ کر کا۔

''اور ہاں..... اپنے ذہن میں یہ بات، یہ سوچ کبھی مت لانا کہ میں شاید کسی اور کے تصور یا کسی اور کی طلب میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ بلکہ یہ سوچنا کہ میں تمہیں اپنی ذات کا حصہ سمجھ کر تمہارے قریب آتا ہوں۔ کیونکہ کسی بھی انسان کی ذات سے ہوئے حصے اچھے نہیں ہوتے، اس طرح انسان بکھر کے رہ جاتا ہے۔ اسی لیے میں بھی یہ حصے سمیٹنا چاہتا ہوں، سمجھا ہوا چاہتا ہوں اس طرح بکھرا ہوا نہیں رہنا چاہتا اور سمیٹنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہارے قریب آؤں۔ میاں، بیوی کی قربت ایک دوسرے کے لیے کالے جادو کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا عمل تسلسل سے ہوگا، اتنا ہی اثر شدید ہوگا۔ لہٰذا میاں، بیوی کا ایک دوسرے کی قربت میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

اس وقت ان دونوں کے درمیان یہ لمحہ بہت ہی نازک لمحہ تھا۔ اس لیے دل آور نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے اس لڑکی کی انا کو ٹھیس لگے۔ ناک سے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچتی یا اس کی سوچ کسی غلط سمت میں جاتی۔ اسی لیے وہ اتنی پریشانی اور عجلت بھرے احساس کے باوجود جاتے جاتے بھی بار بار ٹھہر رہا تھا۔

''تو پھر تم اداس کیوں تھے؟'' علیزے کا سوال بہت زیادہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔

''اپنی تنہائی کی وجہ سے، اپنے اکیلے پن کی وجہ سے، اپنی بالکل خالی اور سپاٹ زندگی کی وجہ سے، مگر جب تم پہ نظر ٹھہرائی تو خیال آیا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں اور میری زندگی بالکل خالی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں تم میرے ساتھ ہو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اسی لیے دل چاہا کہ تمہارے وجود میں اپنے آپ کو تلاش کروں۔ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چھو کر اور جیے میں محسوس کروں کہ تمہارے دل میں، میں بھی دھڑکتا ہوں یا نہیں۔ مگر ابھی دل کی دھڑکن دھڑکنا شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک دم سے الگ ہونا پڑ گیا۔'' دل آور کو جیسے افسوس ہوا تھا۔ مگر علیزے اسے ہنوز یک ٹک کھڑی دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے عجلت میں بھی سوال کر ڈالا تھا اور علیزے چہرے پر استعجاب لیے کہہ رہی تھی۔

''بتاؤ نا؟''

''ہونہہ..... بس یہ دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت واقعی تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہے یا میری غلط فہمی ہے؟'' علیزے نے اس طنز سے اندھیرے میں بھی بغور دیکھ رہی تھی۔

''یہ تمہاری غلط فہمی نہیں ہے بلکہ یہ وہی چار گھنٹے ہیں جن میں کسی بھی انسان کی ذات پہ کوئی خول نہیں ہوتا اور اس وقت ہر ایک ذات پہ بھی کوئی خول نہیں ہے۔'' دل آور نے واقعی اسے سچ بتایا تھا اور علیزے اس کے سچ پہ چپ ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ دل آور کچھ اور کہتا اتنے میں گل سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آ گئی۔

''صاحب! وہ نبیل صاحب اور مومنہ بی بی آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' گل نے آ کر اطلاع دی تھی اور نبیل کے ساتھ ساتھ مومنہ بی بی کا سن کر دل آور تشویش سے ٹھٹکا تھا۔

''مومنہ بی بی بھی ساتھ آئی ہیں؟'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا ہوا پھر علیزے کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹھیک ہے، تم نیچے چلو، میں بھی آ رہا ہوں۔ گل تم علیزے بی بی کے ساتھ آ جاؤ۔'' وہ گل کو اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر کے نیچے چلا گیا تھا اور علیزے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

♥

''السلام علیکم!'' بہر حال جو بھی تھا وہ ڈرائنگ روم میں بڑے سکون سے داخل ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' نبیل جو ڈرائنگ روم کی مغربی دیوار پہ لگی ایک بہت ہی خوبصورت، مگر انتہائی اداس سا منظر پیش کرتی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ دل آور کی آواز پہ فوراً اس کی طرف پلٹا اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔

''آج بڑا دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں گلے لگا کے ملوں۔ اس لیے دیکھ لو بے وقت چلا آیا ہوں۔'' نبیل نے دل آور کے بغل گیر ہونے کے لیے خود ہی بازو پھیلائے تھے اور دل آور اس کی بات پہ حیران ہوتا اس کے گلے لگ گیا۔

''آج ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ تمہارا گلے لگنے کو دل چاہ رہا تھا؟ اور تمہیں بے وقت آنا پڑا؟'' دل آور نے بھی یہی سوال کیا۔ اتنے میں گل اور علیزے بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی تھی۔

''ذرا زور سے بھینچو، تاکہ مجھے پتا تو چلے کہ میں دل آور سے گلے مل رہا ہوں۔'' نبیل کی باتیں ہی عجیب تھیں

ے فوراً ہی محسوس کیا۔
ے کیوں ویسے یقین نہیں آرہا کہ تم دل آور کے گلے مل رہے ہو۔'' دل آور نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور نبیل
ے مسکرا دیا۔
ے یقین ہے یار! سب یقین ہے، تم پہ ہی تو یقین ہے۔'' نبیل نے اس کا ہاتھ تھپکا۔
ے کس بات کا؟'' دل آور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
اس بات کا صرف تم ہی تو ہو جو نبیل حیات کو سچے دل سے چاہتے ہو، اپنا سمجھتے ہو اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہو، لیکن
کچھ میں بھی کچھ کر گزرا ہوں۔'' نبیل نے مومنہ بی بی کی طرف اشارہ کیا اور دل آور اس کے اشارے پہ چونک گیا۔
ے کیا مطلب..... کیا کیا ہے تم نے؟'' اس کے اتنے تشویش بھرے انداز پہ نبیل ایک بار پھر طنزیہ سا مسکرایا۔
ے ارے ڈونٹ وری یار! ایسا بھی کچھ نہیں کیا میں نے، صرف نکاح کیا ہے اور نکاح کرنا کوئی بُری بات تو نہیں ہے نا؟'' نبیل
ے ریلیکس سے انداز میں کہتے ہوئے لاپروائی ظاہر کی تھی۔
ے کیا..... نکاح؟'' دل آور کے دماغ پہ چوٹ پڑی تھی اور اس نے گردن گھما کے نبیل کی طرف دیکھا تھا۔
ے ہاں..... نکاح..... میں نے مومنہ بی بی سے نکاح کر لیا ہے۔ گھر بسا لیا ہے تمہاری طرح، مبارک دو مجھے۔'' نبیل کی بات پہ
کا چہرہ تاریک پڑ گیا اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پورا جسم نیلو نیل ہو گیا ہو اور اس کی ذات کھڑے کھڑے ریت کے ڈھیر میں
ہو گئی ہو۔ وہ دھیمے جانے کو تھا جب علیزے آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی اور اس کا کندھا دل
ے بازو سے مَس ہوا تھا۔ جس پہ اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے علیزے کی سمت دیکھا۔ علیزے بھی نبیل کی بات پہ بہت
نظر آ رہی تھی۔
''نبیل؟'' دل آور کے ہونٹ ذرا سے ہلے تھے۔
ے ارے..... اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو میں نے تمہیں ایک اور گڈ نیوز دینی ہے۔'' نبیل بہت ہی ہلکے پھلکے اور
ہوا میں نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''گڈ نیوز؟'' دل آور کے بس ہونٹ ہل رہے تھے۔ البتہ سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا۔
''ہاں گڈ نیوز..... عبداللہ کے حوالے سے۔'' نبیل نے بے حد آہستگی سے کہا۔
''نبیل یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟ میرا..... میرا..... دماغ..... پھٹ رہا ہے۔'' دل آور کی حالت اس
بہت ہی عجیب سی ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی دلدل پہ کھڑا ہو اور لمحہ بہ لمحہ اس دلدل میں دھنس رہا ہو
کے پاس اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔
''میں مشکل زبان میں تو نہیں بتا رہا، آسان سی اردو ہے یار میری طرف سے گڈ نیوز تھی کہ میں نے آج چند گھنٹے پہلے مومنہ
نکاح کر لیا ہے اور عبداللہ کی طرف سے یہ گڈ نیوز ہے کہ زری کو ہاسپٹل میں ہوش آ گیا ہے۔ وہ اب ٹھیک ہے۔'' نبیل نے یکے
ے دھماکے کر ڈالے تھے اور دل آور اس کے ان دھماکوں سے دھچکی بھی نہ سنبھل پایا تھا جبکہ علیزے بُری طرح چونک گئی۔
''کیا زری ہوش میں آ گئی؟'' علیزے کے چہرے پہ بے پناہ خوشی امڈی تھی اور اس نے بڑے بے ساختہ اور بڑے بیتاب
انداز میں پوچھا تھا۔ جس پہ اکتا نبیل نے علیزے کو حیرانی سے دیکھا کہ وہ اتنی خوش کیوں ہو رہی ہے؟ اور علیزے بھی اس کے یہ
تاثرات بھانپ گئی تھی کہ وہ اسے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں کیا سوال ہلکورے لے رہا ہے؟ اسی
ہی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے بے اختیار ہو گئی تھی۔
''زری میری دشمن نہیں ہے اور نہ ہی میرے لیے غیر ہے۔ زری میری اپنی ہے، میری کزن ہے، میرے ماموں کی بیٹی ہے۔
ہے میری اور..... اور عبداللہ بھائی، میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ میں ان کی پھوپھی آسیہ آفندی کی بیٹی ہوں۔ مجھے..... مجھے
ہر مصیبت کی خوشی نہیں ہو گی تو اور کس کو ہو گی؟ اس کے درد، اس کی تکلیف کی تڑپ مجھے نہیں ہو گی تو کیا آپ دونوں کو ہو گی؟ آپ
جو اپنے اپنے جذبات میں جل کر اپنے دلوں کی تسکین کے لیے نہ جانے کیا، کیا کرتے پھر رہے ہو۔ ہونہہ..... کبھی
اخراج کر لیتے ہے اور کبھی کوئی کورٹ میرج اور پھر بھی دونوں کے دونوں پاک صاف اور نیک کے نیک..... کمال ہے ہمیں تو پتا

ی نہیں تھا کہ محبت اس طرح بھی ہوتی ہے؟ ایسی محبت تو بندہ زندگی میں کئی بار کر لے اور پھر بھی ٹینشن فری رہے۔ آپ دونوں کی طرح آئندہ اگر کسی نے محبت کرنی ہوئی تو ان کو آپ دونوں کا ایڈریس میں دوں گی اور کہوں گی کہ محبت سے نبھانے کے لیے سے انو کھے طریقے سیکھنے کے لیے آپ کے پاس کلاسز لیں اور ماہر ہو جائیں، محبت کسی اور سے اور نکاح کسی اور سے کرنے میں کیا ہے نا بچی بات؟ کرنا چاہیے نا ایسا؟" علیزے نے نبیل کی حیرت دور کرتے کرتے ان دونوں کو اک ایسے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جہاں ان دونوں کے پاس چپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"کیوں نبیل بھائی! کچھ غلط کہا میں نے؟ غلط کہا ہے تو میں اپنی غلطی تسلیم کروں گی۔" علیزے نے نبیل پہ سوال اٹھاتی ساتھ ہی اک نظر اپنے برابر کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہونہہ..... آپ لوگوں نے محبت نہیں کی بس محبت کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ اس کوشش میں ناکام ہوئے ہیں اس لیے اپنی اپنی جگہ پہ چپ سادھ کے بیٹھ گئے ہیں۔ البتہ جو اس کوشش میں کامیاب ہوئی ہے وہ اس وقت ہسپتال کے بستر پہ پڑی آپ کی طرح نئی زندگی کے مزے نہیں لوٹ رہی۔" علیزے کے لہجے میں طنز، تمسخر اور کاٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں حقیقتاً کچھ نہیں بول پائے اور اپنی جگہ پہ کھڑے رہ گئے تھے۔

"بہر حال پھر بھی آپ کی اس کوشش پہ میں آپ کو داد دیتی ہوں اور کچھ نہ سہی، آپ نے کوشش تو کی ہے ورنہ میرے گھر والوں جیسے لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔" آج علیزے وہ لہجہ اور وہ زبان بول رہی تھی جس کا اسے ڈھنگ سے ہی نہیں آتا تھا اور سننے والے حیران ہو رہے تھے۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ جس نے برباد ہونا تھا وہ تو ہو گئی۔ آپ بیٹھیے نبیل بھائی آپ کی نئی زندگی کی شروعات کی خوشی میں میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنی چائے پلواتی ہوں اور آپ کا منہ میٹھا کرواتی ہوں۔" علیزے کہتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی۔

"نہیں بھابی! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کافی وقت ہو رہا ہے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔" نبیل کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

"ٹائم..... ہوں ٹائم تو واقعی کافی ہو رہا ہے مگر اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھیے بھی، اتنی سی دیر میں کیا ہو جائے گا بھلا؟ صرف چائے ہی تو تیار کرنی ہے۔"

علیزے نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے مگر نبیل بھلا اس وقت چائے پینے کی پوزیشن میں کب تھا؟ اس کی تو ہوا۔ پیاس علیزے نے اڑا کے رکھ دی تھی۔

"نہیں..... ہم چلتے ہیں اب۔ بس یہ بے خبر تھا میں اسے خبر دینے کے لیے آیا تھا کہ کل کو یہ اعتراض نہ کرے کہ میں نے اسے بتایا نہیں۔ اب بتا دیا ہے اس لیے امید ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لہٰذا اب اجازت چاہتا ہوں، آپ بھی آرام کریں اللہ حافظ۔" نبیل، دل آور کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوا مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل گیا اور وہ دونوں وہیں کھڑے دیکھتے رہ گئے۔

"مبارک ہو! نبیل حیات آپ کا دوست ہی نکلا۔" علیزے ایک اور طنزیہ تشنہ چھوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور قدرت کی اس ستم ظریفی پہ دھواں دھواں ہونے والا دل آور شاہ وہیں کا وہیں صوفے پہ ڈھے گیا تھا۔

♥

عدیل ابھی سونے کی نیت سے اپنے بستر پہ لیٹا ہی تھا کہ اس کی موبائل رنگ بجنے لگی اس نے سرہانے رکھا موبائل نکال کر دیکھا اس کی اسکرین پہ مدیحہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"مدیحہ؟" اسے اس وقت مدیحہ کی کال دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی تھی۔ مگر اس حیرانی کے باوجود اسے فوراً کال بھی ریسیو کرنی پڑی۔

"ہیلو....." اس کا ہیلو بھی حیرت لیے ہوئے تھا۔

"السلام علیکم!" مدیحہ نے بڑی مشکل سے سلام کی رسم نبھائی۔

"وعلیکم السلام! مدیحہ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" عدیل اپنے بستر پہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"ہاں..... میں ٹھیک ہوں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" مدیحہ کی آواز کافی رندھی ہوئی سی لگ رہی تھی جس پہ عدیل کو مزید تشویش

اس وقت؟" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا جہاں رات کے ساڑھے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔
"ہاں اس وقت اور ابھی۔" مدیحہ نے کبھی بھی اس سے اس طرح کی کوئی ضد نہیں کی تھی اور اگر کی تھی تو بہت ہی دو ٹوک اور
سے انداز میں کی تھی جس پہ عدیل جز بز سا ہو گیا۔
"نہیں مدیحہ! ٹائم....."
عدیل پلیز..... میں اس وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں، صرف تم سے اگر نہیں مل سکتے تو پھر زندگی بھر نہ ملنا۔" مدیحہ نے کہہ کر
کر دیا تھا اور عدیل پریشان ہو اٹھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کس طرح کی جذباتی اور جنونی قسم کی لڑکی ہے اگر وہ واقعی نہ گیا تو
یا کر بیٹھے؟ کیونکہ اس کے جنون کی ایک دو جھلک تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔
اف خدایا..... نجانے کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو؟ اللہ خیر کرے سب خیریت ہی ہو۔" عدیل مجبوراً کمبل ہٹا کر اٹھا اور جوتے
رکھ ہو گیا۔
موبائل جیب میں ڈالا اور جرسی پہن کر بائیک کی چابی اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔
"کون ہے؟" باہر کھٹکے کی آواز پہ عابدہ خاتون نے فوراً اندر سے آواز دی تھی۔
"جی امی ہوں۔ میں ذرا کام سے باہر جا رہا ہوں کچھ دیر میں آ جاؤں گا۔" عدیل کافی عجلت میں لگ رہا تھا اور اس کی آواز
پہنچی کمرے سے باہر آ گئی۔
"اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟" مریم پہلے کی ڈری ہوئی تھی اسے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب پہلے بھی ایک بار یونہی عدیل
بڑھ جانے کا کہہ کر گیا تھا مگر ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔
میں ایک کام سے جا رہا ہوں جلدی آ جاؤں گا۔" وہ بائیک نکالنے کی غرض سے بائیک کی طرف بڑھا۔
کیا کون سا کام ہے؟ جو آپ کو یوں آدھی رات کو یاد آ گیا ہے؟" مریم بھی اس کے پیچھے صحن میں نکل آئی تھی۔
مریم! میں آ کر بتاؤں گا پلیز۔" اس نے عجلت میں نکل جانا چاہا تھا۔
نہیں — آپ اس طرح بتائے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔ جہاں بھی جانا ہے بتا کر جانا ہے۔" مریم نے انتہائی ضدی لہجے
تھا اور عدیل کو عجلت کے باوجود رکنا پڑ گیا تھا۔
مجھے مدیحہ کی کال آئی تھی۔ وہ کچھ پریشان ہے، اس نے بلایا ہے اس لیے جا رہا ہوں۔" اسے آخر بتانا ہی پڑا تھا۔
"مدیحہ کی کال..... وہ بھی اس وقت؟" مریم بھی چونکی تھی۔
"ہاں..... مجھے بھی تو اس بات کی پریشانی ہے کہ اس نے اس وقت کال کیوں کی اور کیوں بلایا ہے؟" عدیل کہہ کر بیرونی
کا لاک کھولنے لگا۔
"ہوں..... ٹھیک ہے آپ جائیے لیکن پلیز گھر کے نمبر پہ میسج یا دو تین منٹ کی کال کر کے خیریت ضرور بتا دیجیے گا۔" مریم نے
کھول کر بائیک باہر نکالنے عدیل کو تاکید کی۔ اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
ٹھیک ہوں..... امی کو بھی بتا دینا، وہ بھی پوچھ رہی تھیں۔" وہ کہہ کے دروازہ عبور کر گیا تھا اور مریم دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔

♥

وہ گاڑی کے اسٹیئرنگ پہ سر رکھے بے آواز رو رہی تھی جب اچانک اس کے موبائل پہ رنگ بجی تھی اور اس نے چونک کر موبائل
اٹھایا تھا۔
ہیلو....." اس نے بے حد آہستگی سے ہیلو کہا تھا۔
کہاں ہیں آپ؟ میں آ رہا ہوں۔" عدیل شاید بائیک پہ تھا اس لیے ہینڈ فری کے ماؤتھ پیس سے اس کی آواز کے ساتھ ہوا
کی سنسناہٹ دے رہا تھا۔
میں روڈ پہ ہوں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر سے ذرا فاصلے پر۔" مدیحہ نے اپنے آنسوؤں پہ تھوڑا سا کنٹرول کرتے ہوئے

"کس سائیڈ پہ؟" عدیل نے اپنی بائیک کو بریک لگا دیئے تھے۔

"لیفٹ سائیڈ پہ۔" مدیحہ اسے جگہ کا بتاتی گئی اور عدیل نے سیدھا اس کی گاڑی کے قریب آ کر بریک لگائے۔ تیزی سے اپنی بائیک سے اُتر آیا۔ اور اتنے میں مدیحہ بھی اسے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اُتر آئی تھی۔

"مدیحہ! آپ ٹھیک تو ہیں رات کے اس پہر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔" عدیل کے لہجے میں بے پناہ تشویش تھی اور مدیحہ بار بار اپنے آنسوؤں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے اتنے پریشان کن اور اپنائیت آمیز سوال پہ بے ساختہ سر کھلتے مجبور ہو گئی۔

"مدیحہ....." عدیل کو لمحہ بہ لمحہ مزید پریشانی اور تشویش ہو رہی تھی کیونکہ مدیحہ کا ایسا انداز، ایسا رویہ، ایسا روپ وہ کبھی نہیں دیکھ رہا تھا اس نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی تجسس کری ایٹ نہیں کیا تھا۔ اور آج اگر گیا تھا تو اسے واقعی پریشانی گھیرے میں لے رہی تھی۔

"عدیل! ہم..... ہمارا..... گھر برباد ہو گیا ہے..... تباہ ہو گیا ہے..... ہمارے گھر میں تو پہلے ہی کوئی سکون اور کوئی خوشی نہیں تھی مگر اب..... اب تو اور بھی ویرانی چھا گئی ہے..... منحوس ہو گیا ہے ہمارا گھر۔" مدیحہ اس کے پکارنے پہ اس کی طرف گھومی ہوئی تھی اور عدیل نے اسے تاسف بھری سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"مدیحہ پلیز..... کیا ہوا آخر؟ آپ صاف صاف کیوں نہیں بتا رہیں؟ میرا پریشانی کے مارے دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔" کچھ ذرا جھنجلا کے بولا تھا۔

"کیا بتاؤں؟ اور کس طرح بتاؤں؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا مجھے۔ میرے..... میرے..... پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنے گھر کی تباہی کا قصہ بیان کر سکوں۔ اور بتا سکوں کسی کو کہ یہ ہوا ہے ہمارے ساتھ۔" مدیحہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے تحاشہ رو رہی تھی۔

"نبیل صاحب اور آنٹی تو ٹھیک ہیں نا؟" عدیل کا پہلا خیال ان کی طرف ہی گیا تھا۔

"ہاں..... ہاں سب ٹھیک ہیں مگر سب کی قسمت خراب ہے اور جن کی قسمت خراب ہو وہ لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے..... کبھی سکون سے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہم لوگ بھی کبھی خوش نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کبھی سکون سے رہ سکتے ہیں۔ سوچا تھا میں آپ کے حوالے سے کوئی خوشی ملے گی مگر انہوں نے اپنی پسند سے بنا بتائے نکاح کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیرت میں ڈال دیا ہے ہم سے ساری امیدوں کا رخ نبیل بھائی کی طرف موڑ دیا تھا اور باقی رہ جانے والی امیدیں ان سے وابستہ کر لی تھیں مگر آج انہوں نے بھی سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالا ہے آج انہوں نے بھی وہی جھنڈا لہرا لیا ہے جو دل آور بھائی نے لہرایا تھا۔ آج انہوں نے بھی طلاق کر لیا ہے۔" مدیحہ دکھ سے کہتے کہتے سسک رہی تھی، بلک رہی تھی اور عدیل دم بخود سا رہ گیا۔

"نبیل صاحب نے نکاح کر لیا؟ اتنا اچانک کیوں؟" عدیل کو واقعی دھچکا لگا تھا۔

"ہاں نکاح کر لیا ہے۔ وہ بھی ملک حق نواز کی ستائی ہوئی مومنہ بی بی کے ساتھ جس کو انہوں نے پچھلے کافی عرصے سے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اور آج انہوں نے وہی گھر مومنہ بی بی کو سونپ دیا ہے، اپنا سب کچھ اسے دے دیا ہے سب کچھ..... اپنا آپ بھی۔ زری کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا، اس کا انتظار بھی نہیں کیا اور زری آج ہوش میں بھی آ گئی ہے، اور..... اور..... میں اس سے ملنے بھی نہیں جا سکی آخر..... کس منہ سے جاتی اس کے سامنے؟ ہم لوگوں نے اسے دیا ہی کیا ہے بھلا؟ ہمیں اس کی پروا ہی کب ہے؟ ہم سب نے تو اسے جیتے جی مار ڈالا ہے۔ مار ڈالا ہے اسے۔" مدیحہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی اور عدیل بے ساختہ گھبرا گیا۔

"مدیحہ پلیز..... بس کریں۔ ہم لوگ اس وقت روڈ پہ کھڑے ہیں، لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے پلیز صبر سے اور حوصلے سے کام لیں۔" عدیل نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔

"صبر..... کیسے کروں صبر۔ کس چیز کا صبر..... بات صرف اتنی سی ہوتی تو شاید صبر بھی آ جاتا مگر یہاں تو کوئی ایک نہیں، ہمارا گھر برباد ہوا ہے۔"

مدیحہ کا صبر و برداشت آج جواب دے چکے تھے اور وہ بات بات پہ بپھر رہی تھی، بلک رہی تھی۔

"پورا گھر..... کیا مطلب..... کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی اور بھی مسئلہ ہے؟"

عدیل! مسئلہ نہیں ہوا۔ مسئلے کی حد ہو گئی ہے۔ مما اور بابا میں ڈائیورس ہو گئی ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے ہیں۔ چھوڑ دیا ہے۔" وہ یونہی گاڑی سے ٹیک لگائے روتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اور عدیل ایک اور انکشاف پہ دم بخود سا رہ گیا۔

ڈائیورس؟" اس کی سماعتوں پہ یہ لفظ ہتھوڑے کی طرح برسا تھا اور اس پہ مدحیہ کی سسکیاں اور ہچکیاں الگ ضربیں لگا رہی

گئے ہوئے..... یہاں کیا سین چل رہا ہے؟ سو رومینٹک یار۔" قریب سے ہی تین چار لڑکوں کی آوازیں ابھریں معنی خیز ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور عدیل کو جیسے کرنٹ چھو گیا اس نے یکدم پلٹ کر ان لڑکوں کی طرف دیکھا تھا۔

کیا بات ہے یار! کیا مان نہیں رہی؟" وکی نے آنکھ دباتے ہوئے انتہائی خباثت سے کہا اور عدیل کے تن بدن میں خون کی

اوپر سے پاؤں تک غصے اور غضبناکی سے سلگ اٹھا تھا۔

شٹ اپ! تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو؟ کون کیا کر رہا ہے تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے آخر؟ اپنے کام سے کام رکھو اور دفع ہو جاؤ

ے۔ عدیل نے مدحیہ کے خیال سے ذرا ضبط سے کام لیتے ہوئے انہیں مناسب الفاظ میں وہاں سے جانے کا کہا تھا۔

مرے یار! غصہ کیوں کرتے ہو؟ ہم تو بس اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ اگر نہیں مان رہی تو ہم حاضر ہیں، پوری پوری ہیلپ

ے تمہاری حصہ آدھا آدھا۔" کامی نے وکی سے بھی زیادہ خباثت کا مظاہرہ کیا تھا اور عدیل کی برداشت کی حد ختم ہو گئی

تم گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے مدحیہ کو انتہائی سختی اور آہستگی سے گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تھا۔

عدیل! آپ....." مدحیہ بھی اس کے تیور دیکھ کر رونا دھونا بھول گئی تھی لیکن عدیل اتنے میں ان لڑکوں کی طرف پلٹ چکا

عدیل پلیز اسٹاپ اٹ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ پلیز کوئی اور پریشانی کری ایٹ مت کریں۔" مدحیہ پیچھے سے

ز میں چیخی اور عدیل کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے تھے کیونکہ اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ مدحیہ حقیقتاً خوفزدہ اور اپ سیٹ ہے۔ اس کے کسی بھی جذباتی اقدام پر کوئی بھی نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے رک جانے پہ ان لڑکوں نے اور قہقہے لگاتے ہوئے ہوٹنگ کرنا شروع کر دی۔

واؤ..... بڑا اثر رکھتی ہے یار تھوڑا سا ہم پہ بھی کبھی کیوں جودت؟ کیا خیال ہے تمہارا؟" وکی نے اپنے خبیث خیالات میں

ریک اور خبیث دوست کو شامل کیا تھا جو ان لوگوں سے بیزار اور اکتایا ہوا سا ذرا دور ان سے ہٹ کے کھڑا تھا۔

وکی پلیز..... چھوڑیہ تماشہ چل یہاں سے۔" جو جدت نشے کے باوجود خاصی اکتاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

جودت..... چھوڑنے کو دل ہی تو نہیں چاہ رہا۔ چیز ہی کچھ ایسی ہے، مل بانٹ کے کھانے والی۔" اس کا اشارہ مدحیہ کی طرف

عدیل کا ضبط جواب دے گیا وہ یکدم غصے سے پاگل ہوتا تیزی کی تیزی سے ان لڑکوں کی طرف لپکا اور اس وکی نامی لڑکے کو

بال سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

گندی تو۔" اس نے عدیل کو کوئی گالی دینا چاہی تھی لیکن عدیل کے زوردار گھونسے نے اس کے منہ سے پھوٹنے والی گالی کو

سلسلے میں ہی گھسا دیا تھا۔

ے یار! چوری اوپر سے سینہ زوری ایک تو رات کے اس پہر اتنی خوبصورت لڑکی کو ساتھ لے کر سڑکوں پہ رومینس کرتا پھر رہا

ے کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرتا۔" کامی بھی وکی کی خاطر اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتا ہوا میدان میں کود پڑا تھا۔

کیا تم لوگ اپنی مگنیتروں، اپنی بیویوں اور اپنی ماں بہنوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرتے ہو؟" عدیل نے اپنی طرف

آتے کامی کو بھی انتہائی زوردار دھکے سے نیچے پٹخ دیا تھا۔

سے غیرت گھروں کے بے غیرت لوگ ہو تم۔" عدیل ان کو مارتے ہوئے دھاڑ رہا تھا اور اس کی بات پہ جودت کا میٹر بھی

ہو گیا تھا وہ تینوں تھے اور ان سے نبٹنے کے لیے وہ اکیلا تھا۔

چھوڑ دو اسے عدیل پلیز بس کرو۔" مدحیہ لپک کے پاس آئی تھی اور اس نے عدیل کے شکنجے میں دبوچے جودت کو

ہ کشمکش کی تھی۔

جوت کی گردن کے گرد عدیل کا بازو کسی پھندے کی طرح لپٹا ہوا تھا اور جوت کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔

"اور کسی معاملے میں نہیں، صرف اتنی سی بات پہ تمہاری غیر جاگ اُٹھی ہے؟ حالانکہ غیرت نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے میں۔" عدیل جو منہ میں آرہا تھا وہ انہیں بکتا جا رہا تھا۔

"دیکھو چھوڑ دو اسے ورنہ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔" وکی نے خونخوار سے لہجے میں کہتے ہوئے جھٹ کر مدیحہ کا بازو پکڑا اور عدیل مدیحہ کا بازو اس خبیث لڑکے کی گرفت میں دیکھ کر بے بس ہو گیا اور مجبوراً اس نے جوت کی گردن کو پرے جھٹک دیا تھا۔

"اب چپ چاپ جہاں سے آئے ہو وہاں چلے جاؤ۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی یہی تمہاری سزا ہے۔" وکی اور اکی نے مدیحہ کے دونوں بازو اپنی اپنی گرفت میں دبوچ رکھے تھے اور عدیل کو وہاں سے چلے جانے کی وارننگ دی تھی مگر اس سے پہلے کہ عدیل کوئی طریقہ آزماتا اتنے میں دور سے ہی پولیس کی جیپ کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی اور مدیحہ نے ان لڑکوں کو پولیس کے خیال سے یکدم چونکتے دیکھ کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور ان دونوں نے فوراً اس کے بازو چھوڑ دیئے تھے کیونکہ سائرن کی آواز اور بھی قریب آتی جا رہی تھی۔

"جوت! چلو نکلو یہاں سے۔" وکی نے لپک کے جوت کو سنبھالا تھا۔

"وہ تو ہم نکل ہی رہے ہیں۔ مگر مسٹر عدیل اتنا پار رکھنا غیرت اور بے غیرتی کا بڑا لمبا چوڑا حساب لگتا ہے تمہاری طرف، ایسا رہنا ہم ایک چکر پھر لگائیں گے۔" جوت نے جاتے جاتے اسے وارننگ دی تھی اور عدیل نے ان کی طرف سے نظر ہٹا کر مدیحہ کو دیکھا تھا اور ان کے جاتے ہی پولیس جیپ بھی ان کے پاس سے زناٹے سے گزر گئی تھی۔ جبکہ مدیحہ اس نئے ہنگامے اور اس نئی مصیبت سے چکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی ہوئی عدیل سے لپٹ گئی تھی۔

"مدیحہ۔" عدیل اس کی اس بے بس اور بے اختیاری حرکت پہ دھک سے رہ گیا تھا۔

"عدیل پلیز..... یہ دنیا، یہ لوگ، یہ ماحول سب بہت گندے ہیں، بہت غلیظ ہیں مجھے نفرت ہو گئی ہے سب سے۔ ہر طرف ہوس ہی ہوس ہے، ہر کوئی نفس کا ستایا ہوا پھر رہا ہے۔ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں ہے پلیز مجھے اپنا لو، مجھے چھپا لو اپنی بانہوں میں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ جانا چاہتی ہوں۔" وہ اس کے سینے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور عدیل اس کی خواہش پہ سر سے پاؤں تک دھڑک اُٹھا تھا اور اسی دھڑکن کی شدت سے ڈر کے اس نے مدیحہ کو فوراً بہت نرمی اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ خود سے الگ کر دیا تھا۔

"اس وقت بہت رات ہو رہی ہے مدیحہ! اور رات کے وقت گھر سے باہر رہنا لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا اس لیے اب تم گھر چلو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہارے گھر والے بھی پریشان ہوں گے۔" عدیل نے اس کے کندھوں کو تھپکتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور مدیحہ نے اس کی بات کے جواب میں سر جھکا دیا اس لیے عدیل نے گاڑی کا دروازہ کھول کے اسے فرنٹ سیٹ پہ بٹھایا کچھ دور ایک جنرل سٹور تھا وہاں اس نے اپنی بائیک پارک کی اور مدیحہ کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پہ آبیٹھا تھا۔

♥

نبیل سخت بے چینی کے عالم میں گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔

آج کا دن بہت ہی ہنگامہ خیز اور تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ بہت کچھ دیکھتے ہی دیکھتے پلٹ کے رہ گیا تھا اور وہ سب خطا ہا تھا وہ رہ گئے تھے۔ ہر کسی پہ کوئی نہ کوئی قیامت ٹوٹی تھی اور کوئی نہ کوئی انکشاف پیش آیا تھا جس کی وجہ سے سب کے دل و دماغ ہی ڈرائے کی زد میں تھے اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا؟

فائزہ بیگم اپنے بیڈ روم میں بند تھیں۔

مومنہ نبیل کے بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی اپنی قسمت پہ حیران پریشان ہو رہی تھی۔

مدیحہ نجانے کب سے گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اور نبیل لان میں ٹہلتا ہوا ہر طرف سے سوچوں میں گھرا قطرہ قطرہ موم کی طرح پگھل کر ختم ہو رہا تھا لیکن ابھی پوری طرح سے گھل کر ختم نہیں ہوا تھا کہ باہر گیٹ پہ مدیحہ کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ نبیل نے بے ساختہ اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا رات کے ساڑھے 3 بجے کا ٹائم ہو رہا تھا نبیل کو ٹائم دیکھ کر سخت خفگی محسوس ہوئی اور وہ چوکیدار کے گیٹ کھولنے تک خود بھی ڈرائیوے کے قریب آگیا تھا لیکن

کے بجائے کسی اور کو ڈرائیونگ سیٹ پہ دیکھ کر نبیل کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ اور اترتے میں گاڑی عین اس کے سامنے آ رکی اور اگلے لمحے اس کے شوروم کا منیجر عدیل عمر نیازی مدیحہ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم! سر کیسے ہیں آپ؟" عدیل نے بے حد شائستگی سے سلام کرتے ہوئے نبیل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔ نبیل نے بہت مرے مرے انداز میں تھام کر سلام کی رسم نبھائی تھی۔

"ہوں..... ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ اور اس کی آواز بھی جیسے کہیں دب چکے تھے۔

"سر! میں آپ کی فیلنگز اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میرے گھر میں بھی بہنیں ہیں۔ ایک نہیں بلکہ پانچ پانچ بہنیں ہیں اس لیے میں اچھی طرح اندازہ ہے کہ بہنوں کے معاملے میں آدمی کی فیلنگز اور سوچیں کیا ہوتی ہیں؟ کتنی فکر ہوتی ہے ان کے حوالے سے۔ میں آپ کی پوزیشن کو بہت ہی حساس سمجھتا ہوں، لیکن پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی بہن، آپ کی امانت ہے ہر طرح سے محفوظ ہے۔ آپ کی عزت سر آنکھوں پہ میں جتنا آپ کا احترام کرتا ہوں اتنا ہی مس مدیحہ کا احترام بھی کرتا ہوں، اس لیے پلیز آپ اس وقت کچھ بھی غلط مت سوچیے گا۔ مس مدیحہ کچھ پریشان تھیں، ڈیپریشن کا شکار تھیں، رو رہی تھیں کہ وہیں کچھ آوارہ قسم کے لڑکوں سے ٹکراؤ ہو گیا اور مجبوراً بڑی مشکل سے بچاؤ کے بعد مجھے ان کو گھر ڈراپ کرنے کے لیے آنا پڑا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے انہیں بحفاظت ان کے گھر پہنچا دیا ہے اور بچے اور کھرے طریقے سے کی جس پہ نبیل کے دل و دماغ پہ اترا ہوا بوجھ خود بخود ہی کہیں دور ہٹ گیا اور وہ اندر ہی اندر ریلیکس ہو گیا تھا۔

"تھینک یو ویری مچ..... تمہارے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے..... اگر ہر مرد ایسی ہی سوچ رکھنے لگے تو یہ دنیا عورت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گی پھر میرے جیسے کسی بھی بھائی کو اس طرح کی کوئی ٹینشن نہیں سہنا پڑے گی۔" نبیل نے عدیل کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے سراہا تھا اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اوکے سر! مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔ میرے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔" عدیل نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔

"لیکن گھر جاؤ گے کیسے؟ تمہارے پاس تو نہ گاڑی ہے نہ بائیک اور اس وقت تو کہیں سے کوئی سواری بھی نہیں ملے گی؟" نبیل کو فکر ہوئی تھی۔

"ڈونٹ وری سر! کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جائے گا۔" عدیل نے اسے ریلیکس کرنا چاہا۔

"سبب بنائیں تو بتا نا؟ تم ٹھہرو میں ڈرائیور سے کہتا ہوں وہ تمہیں ڈراپ کر دیتا ہے۔" نبیل کہہ کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف لپک گیا اور عدیل اسے روکتا رہ گیا، مگر وہ نہیں رکا تھا۔

"تھینک یو!" عدیل اپنے دھیان میں سر جھکائے کھڑا تھا جب مدیحہ آہستگی سے گاڑی سے اتر کر اس کے برابر ہی آ کھڑی ہوئی اور عدیل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اس کا سر جھا ہوا تھا۔

"تھینکس..... مگر کس لیے؟" عدیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مجھے بحفاظت گھر پہنچانے کے لیے۔" وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہونہہ..... آپ کو کیا پتا کہ میں نے کس کو بحفاظت گھر پہنچایا ہے؟ آپ کو یا اپنے آپ کو؟" وہ کہتے ہوئے مبہم سا مسکرایا اور مدیحہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بات بدل گئی تھی۔

"آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟" اسے اندازہ تھا کہ جتنی چوٹیں ان لڑکوں کو آئی تھیں اتنی ہی عدیل کو بھی آئی تھیں۔ آخر وہ ان سے لڑتے اور وہ اکیلا۔

"آئی تو ہے مگر اب مرہم کون لگائے؟ آپ سے تو مرہم کی امید بھی نہیں کر سکتا کیونکہ آپ نے تو پہلی بار گھر آئے مہمان کو پانی کا بھی نہیں پوچھا اور اتنی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے گھر بھیج رہی ہیں۔" عدیل نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے شکوہ کیا تھا۔ مدیحہ اپنی اس کوتاہی پہ یکدم سر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل اس کے اس طرح دیکھنے پہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"تھینک یو! میں نے پی لی چائے۔" اس نے مدیحہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذو معنی بات کہی اور مدیحہ نے شرم سے جھجکتے ہوئے پلکیں جھکا لی تھیں۔

''لو ڈرائیور آ گیا ہے۔'' نبیل ڈرائیور کو اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا اور نجانے کیوں مدیحہ اور عدیل کو ایک ساتھ دیکھ کر نبیل کے قدم ذرا سے توقف کے لیے ٹھہرے تھے اور اک خیال تھا جو اس کی عقل کو چھو کے گزر گیا تھا مگر وہ اس پہ کچھ بول نہ سکا بس دل ہی دل میں سوچتا رہ گیا۔

''او کے سر! اللہ حافظ۔'' عدیل اس سے ہاتھ ملانے کے بعد ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا تھا مگر نبیل کے لیے اک نئی سوچ چھوڑ گیا تھا۔

♥

وہ ابھی سو کر اُٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ اس نے فون اُٹھا کر دیکھا کوئی اجنبی سا نمبر تھا اس لیے مجبوراً اسے کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے بڑے شائستہ لہجے میں سلام کیا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔

''ملک اسد اللہ بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے بہت ہی نپی تلی سی آواز سنائی دی تھی اور دل آور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اس نے کال کیوں کی ہے۔

''کہیے بات میں سن رہا ہوں۔'' دل آور کا لہجہ اس سے بھی زیادہ سخت اور سپاٹ ہو چکا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ کل ملک حق نواز کے کیس کی آخری پیشی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم کل عدالت نہ جاؤ۔'' ملک اسد اللہ نے وہی بات کہی تھی جس کی دل آور کو امید تھی۔

''وجہ؟'' اس نے یک لفظی سوال داغا۔

''وجہ یہ ہے کہ تمہارے جانے سے ملک حق نواز کو سزا ہو گی۔''

''پھر تو مجھے کل ہر حال میں جانا چاہیے نا؟ کیونکہ آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔'' دل آور نے تمسخر سے کہا تھا۔

''دیکھو دل آور شاہ! ہم چاہتے تھے کہ تم سے بات کر کے معاملہ سلجھا لیں مگر لگتا ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں سلجھے گا ہمیں اپنے رنگ میں آ کر اپنا آپ دکھانا ہو گا۔'' ملک اسد اللہ کے لہجے میں سراسر دھمکی تھی اور وہ تھا کہ دھمکیوں سے ڈرتا ہی نہیں تھا۔

''آپ نے میرا رنگ بھی نہیں دیکھا ملک اسد اللہ صاحب! میں نے مومنہ بی بی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے انصاف ضرور دلاؤں گا اور میں اسے یہ انصاف دلا کر ہی رہوں گا چاہے مجھے اپنی جان پہ کیوں نہ کھیلنا پڑے۔'' دل آور بھی اپنی بات کا اور اپنی انا کا پکا تھا یہ ملک اسد اللہ بھی اچھی طرح جانتے تھے اسی لیے ذرا نرمی اختیار کر لی تھی۔

''دیکھو..... ہم مومنہ بی بی کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ملک حق نواز کا نکاح پڑھوا دیں گے اس کے ساتھ۔'' ملک اسد اللہ نے نیا راستہ اختیار کیا تھا اور اک نئی چال چلی تھی۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مومنہ بی بی کا نکاح ہو چکا ہے اور اس کا شوہر اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہے کہ آپ لوگوں سے ٹکر لے سکے اس لیے ملک حق نواز کی بخشش کا خیال دل سے نکال دیں۔ وہ ذلیل انسان اب تمام عمر جیل میں ہی سڑے گا کیونکہ اس نے ایک مومنہ بی بی کی نہیں بلکہ کئی اور عورتوں اور لڑکیوں کی عزت بھی تباہ کی ہے اور ا[illegible]ت ہے کہ خدا کی طرف سے اس پہ عذاب نازل ہو۔'' دل آور خاصا چبا چبا کے بول رہا تھا اور ملک اسد اللہ اس نئے انکشاف پہ دنگ۔

''اللہ حافظ ملک صاحب! کل عدالت میں ملاقات ہو گی۔'' دل آور نے فون بند کرنا چاہا تھا۔

''ٹھہرو دل آور شاہ۔'' ملک اسد اللہ نے یکدم اسے روکا تھا۔

''کہیے؟'' وہ رُک گیا۔

''تمہاری آخری فیصلہ کیا ہے؟'' ملک اسد اللہ نے اس کا حتمی فیصلہ جاننا چاہا تھا۔

''میرا آخری فیصلہ ملک حق نواز کی سزا ہے، میرا آخری فیصلہ مومنہ بی بی کا انصاف ہے اور میرا آخری فیصلہ کل عدالت جانا ہے اور اس کام سے مجھے اللہ کی پاک ذات کے علاوہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور امید ہے کہ میری یہ بات آپ لوگوں کے ذہن میں کافی اچھی طرح بیٹھ چکی ہو گی۔ اس لیے اب اللہ حافظ۔'' اس نے پھر فون بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

''رُکو دل آور شاہ! دیکھو ایک بار پھر سوچ لو، ہمارے پاس فیصلے کی گھڑی بس یہی ہے، اس کے بعد نہ ہم تم سے کچھ کہیں گے

نہیں سننے کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" ملک اسد اللہ نے اسے وقت دینا چاہا تھا۔
میں نے جو کچھ بھی کہا ہے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے۔ اس لیے اب آپ بھی سمجھ جائیے۔" وہ ہنوز دوٹوک بات کر رہا تھا۔
اوکے دل آور شاہ! رب راکھا۔" ملک اسد اللہ نے کہہ کر خود ہی فون بند کر دیا اور دل آور نے اپنا موبائل بند ہوتے ہی بیڈ پہ
یا اور خود اٹھ کر وارڈ روب کھول لی تھی۔
کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" اپنا موڈ آف ہونے کے باوجود اسے وارڈ روب میں موجود کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر علیزے
ہی تھی اور بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔
وائٹ شلوار سوٹ۔" دل آور بہت بیزار کن لہجے میں بولا تھا۔
شلوار سوٹ کیوں؟ تم نے کورٹ نہیں جانا؟" علیزے کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ صبح کے وقت شلوار سوٹ ذرا کم
کیوں۔۔۔۔ شلوار سوٹ کیوں؟
تھا۔
نہیں مجھے کہیں اور جانا ہے۔" اس نے ذرا ٹھہرتے ہوئے جواب دیا تھا۔
کہاں؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔
قبرستان۔" دل آور کا جواب چونکا دینے والا تھا۔
کیا۔۔۔۔ قبرستان؟ مگر کیوں؟" علیزے ٹھٹک گئی تھی اور دل آور اس کے سوال پہ دھیما پڑ گیا تھا۔
اپنے ماں باپ سے ملنے اپنوں سے ملنے۔" اس کا لہجہ بہت ہی نرم اور بہت ہی پگھلا ہوا سا لگنے لگا تھا۔
کیوں۔۔۔۔ یوں صبح صبح اٹھتے ہی کیسے خیال آ گیا ان کا؟" علیزے کا نجانے کیوں بار بار اس سے سوال کرنے کو دل چاہ رہا
رات کو خواب میں دیکھا تھا ان کو اماں بہت رو رہی تھیں اور بابا بھی اداس تھے اس لیے آج میں نے سب سے پہلا کام یہی
کرنے کا ان سے ملنے کے لیے جانا ہے۔ باقی کے کام بعد میں ہوتے رہیں گے۔" دل آور کا اپنا لب و لہجہ بھی کافی اداس لگ رہا تھا
علیزے کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر وہ بھانپ چکا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔
کہو۔۔۔۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟" دل آور نے اسے کہنے پہ اکسایا۔
نہیں۔۔۔۔ کچھ نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ آئی اور وارڈ روب کے لاسٹ والے حصے سے دل آور کا آف
ہن کلر کا سوٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔
پلیز علیزے! جو کہنا چاہتی ہو وہ صاف صاف کہہ دو میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔" وہ بہت اداس، مایوس اور ملول سا
لگ رہا تھا۔ علیزے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔
کیا میں بھی تمہارے ساتھ قبرستان جا سکتی ہوں؟ تمہارے بابا وغیرہ کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کے لیے؟" علیزے نے بہت
جھجکتے ہوئے پوچھا اور اس کا سوال ایسا تھا کہ دل آور اسے منع نہیں کر سکتا تھا۔
کیوں۔۔۔۔ تم کیوں جانا چاہتی ہو؟"
کیونکہ آج مجھے بھی اپنے مما اور پاپا بہت یاد آ رہے ہیں۔ آج اگر وہ نہیں مل سکتے تو تمہارے اماں اور بابا سے مل لیتی ہوں
شاید کے لیے تو وہ بھی مما اور پاپا جیسے ہیں نا؟ علیزے کی بات پہ دل آور نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
مما اور پاپا جیسے؟" اس نے زیر لب بڑبڑا کے کہا تھا۔
ہاں۔۔۔۔ مما اور پاپا جیسے کیونکہ وہ تمہارے مما اور پاپا ہیں، اس لیے میرے لیے بھی تو وہ مما اور پاپا ہی ہیں نا۔" اور علیزے کی
بات پہ دل آور اسے دیکھتا رہ گیا تھا کہ اس نے کتنی اپنائیت بھری اور کتنی گہری بات کہی تھی۔
کیا بات ہے؟ کیا میں نہیں جا سکتی؟" اس نے دل آور کو چپ دیکھ کر دوبارہ پوچھا تھا۔
نہیں۔۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے، میرے کپڑے چینج کرنے تک تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔" دل آور
ہا کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور علیزے کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔
اسے دل آور کے بابا اور بتول شاہ کی قبروں پہ جانے کا سوچ کر بہت اچھا فیل ہوا تھا۔ اسی لیے وہ جلدی سے چینج کر کے بڑی

سی سیاہ رنگ کی چادر اوڑھ کر فوراً تیار ہو گئی اور وہ دونوں باقاعدہ باوضو ہو کر گھر سے نکلے تھے۔

''کیا قبروں پہ چڑھانے کے لیے پھول بھی مل جائیں گے؟'' علیزے نے ذرا ئیو کرتے ہوئے دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

''ہاں مل جائیں گے۔'' اسے اس کی تسلی کے لیے جواب دینا ہی پڑا تھا۔

''کیا زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے بھی پھول مل جائیں گے؟'' اس نے اک اور تیر پھینکا۔

''علیزے۔'' دل آور نے لب بھینچ لیے تھے۔

''تو اس میں غلط کیا ہے بھلا؟ زری بھی تو تقریباً مر ہی چکی ہے؟ کیا ہوا جو وہ بیہوشی سے ذرا ہوش میں آ گئی ہے؟'' علیزے بڑی ریلیکس نظر آ رہی تھی۔

''تم مجھے ٹارچر کرنا چاہتی ہو نا؟'' دل آور نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

''نہیں..... میں زری کو اس کا حق دلانا چاہتی ہوں، تم سے اس معاملے کو لے کر علیزے اور زری میں انصاف کروانا چاہتی ہوں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے انصاف پرست آدمی ہو۔'' علیزے نے اسے چیلنج کیا تھا اور دل آور نے ایک گہری سانس کھینچی تھی جیسے اس نے بھی کوئی ارادہ باندھ لیا ہو۔

''ٹھیک ہے آج تمہیں جس چیز کا یقین نہیں ہے، اس چیز کا یقین دلاتا ہوں، لیکن یہ یقین تمہیں زندگی میں پہلی بار اور آخری بار دلاؤں گا اس کے بعد زندگی میں بھی بھی مجھ سے کسی ایسے یقین کی امید مت رکھنا آؤ میرے ساتھ۔'' دل آور نے بہت ہی پتھریلے اور سپاٹ سے انداز میں کہتے ہوئے قبرستان کے باہر والے ایریا میں اک جھٹکے سے گاڑی کو بریک لگائے تھے اور گاڑی سے اترتا آیا مجبوراً اس کے پیچھے علیزے کو بھی اترنا پڑا اور دل آور اس کے اترتے ہی پھول خریدنے میں لگ گیا۔ تازہ پھولوں کے دو الگ الگ شاپر لینے کے بعد وہ واپس اس کی طرف پلٹ آیا۔

''یہ لو یہ زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے اور یہ اماں اور بابا کی قبروں پہ چڑھانے کے لیے ہیں۔'' اس نے دونوں شاپر علیزے کو تھما دیے اور علیزے نے چپ چاپ تھام بھی لیے تھے۔

''آؤ۔'' وہ کہتے ہوئے قبرستان کے چھوٹے سے جالی دار سبز رنگ کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مگر ابھی قبرستان کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا ایس پی کامران مہدی کی کال تھی۔ مگر وہ قبرستان میں گزرے ہو کر فون نہیں سننا چاہتا تھا اس لیے اس نے ایس پی کامران مہدی کی کال ڈس کنیکٹ کر دی مگر اس کے ڈس کنیکٹ کرنے کے باوجود ایس پی کامران مہدی نے دوبارہ کال کی تھی اور دل آور نے دوبارہ ڈس کنیکٹ کر ڈالی تھی بلکہ اور تو اور موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر واپس جیب میں رکھ لیا تھا اور علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اونچی نیچی جگہوں سے گزرتا ہوا تقریباً قبرستان کے وسط میں آ گیا اور ایک ساتھ ہی تین قبروں کے پاس رُک گیا۔

''یہ ہے میرے بابا کی قبر۔'' اس نے سب سے پہلی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

''بابر شاہ ولد منصور حسین شاہ۔'' علیزے نے ان کا نام پڑھا تھا اور منصور حسین کے نام پہ دل آور کے چہرے کی طرف دیکھا جو دکھ اور اذیت سے دھوئیں کی طرح ہو رہا تھا۔

''یہ ہے میری اماں کی قبر۔'' اس نے دوسری قبر کی طرف اشارہ کیا۔

''بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔'' علیزے بتول شاہ کا نام پڑھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

''بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔'' اس کے لب بار بار ہل رہے تھے مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''ڈرائیور!'' وہ جیسے کسی پاتال سے بولی تھی۔

''ہاں..... یہ سچ ہے، یہ حقیقت ہے، بتول شاہ میری ماں سہی لیکن قبر کے اس کتبے پہ آ کر میری پھوپھی بن جاتی ہیں کیونکہ وہ میرے بابا کی سگی بہن تھیں۔ لیکن میرے لیے میری ماں تھیں۔ آج بھی کل بھی اور قیامت کے روز بھی وہ میری ماں ہی رہیں گی۔ وہ میری ماں کی حیثیت سے اور میں ان کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانا جاؤں گا۔'' دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اعتراف کیا تھا۔ علیزے کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"تو کیا ڈرائیور کے ماں باپ دونوں ہی نہیں تھے؟ وہ محض اپنی پھوپھی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔" علیزے کے دل پہ کچھ ہوا تھا اور پہلی بار..... زندگی میں پہلی بار اسے "اپنے ڈرائیور" سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اتنی ہمدردی کہ آنکھوں کے گوشے نم ہونے محسوس ہوئے تھے۔

"اور یہ ہے میری امی کی قبر!" اس نے بابر شاہ کی قبر کی دائیں سائیڈ والی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

"فردوس شاہ زوجہ بابر شاہ۔" علیزے نے دل آور کی ماں کا نام پڑھا اور پھر گم سم سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے لیے یہ انکشاف کچھ نہیں تھا کہ بتول شاہ دل آور کی ماں نہیں بلکہ پھوپھی تھیں۔

"یہ ان تین افراد کی قبریں ہیں جو میرے اپنے تھے جو میرے سگے تھے جن سے میرا خون کا رشتہ تھا اور جن کے سوا میرا کوئی نہیں تھا ان کے بعد اس دنیا میں کسی کو اپنا سمجھا تو وہ صرف عبداللہ اور نبیل تھے اور جب عبداللہ اور نبیل سے دوستی ہوئی تو تب زری بھی نہیں تھی۔ ہماری اس دوستی کے درمیان زری کا کوئی وجود نہیں تھا، وہ بہت بعد میں آئی تھی۔ میرے لیے وہ سب سے اہم اور سب سے پہلے تھے۔ ہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زری کو دیکھا و اچھی لگی تھی، پسند آئی تھی، اس سے محبت بھی ہوئی تھی، اسے چاہتا بھی تھا مگر ابھی اسے پانے کا خیال بھی دل سے نہیں گزرا تھا کہ مجھ پہ ادراک ہوا کہ نبیل اسے مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے، مجھ سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے، وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے اور وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ پسند ہے اور جب کسی ایک انسان کو دوسرے انسان کی پسند کا ادراک ہوتا ہے تو پہلا انسان کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ اپنی پسند کو حاصل کر لے یا وسیع ظرف دار ہو جائے، اپنے دل کو رغدالے یا اپنے دل کی سچ سجائے؟ ایک بات..... صرف ایک بات..... تم خود سوچو علیزے اور انصاف کرو اگر تم دل آور ہوتے تو تمہیں وہاں کوئی چیز پسند آجائے اور تم اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہو لیکن وہی چیز تمہاری بہن یا تمہارے کسی بھائی کو پسند آجائے اور وہ بھی اسے چھوڑنا نہ چاہے تو تم کیا کرو گی؟ وہ چیز خود لے لو گی؟ یا اپنے بہن یا بھائی کے لیے چھوڑ دو گی؟" دل آور نے اپنی سمجھ کے مطابق اسے سمجھایا تھا۔ اور خود کو دل آور کی جگہ رکھتے ہوئے علیزے کا دل کانپ گیا تھا اور ہونٹوں پہ ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

"چھوڑ دوں گی۔" جواب بہت مختصر سا تھا مگر اعتراف بہت بڑا تھا آخر جو کرنا تھا۔

"جس چھوڑ دینے میں تمہاری بزدلی ہو گی؟ یا تمہاری فراخدلی ہو گی۔" انصاف کے اس ترازو پہ اس کے سوال مسلسل جاری تھے۔

"فراخدلی ہو گی۔" علیزے نے اک اور اعتراف کیا۔

"کیا تمہارے دل میں اس چیز کو دوبارہ پا لینے کی کوئی تمنا رہے گی یا نہیں رہے گی؟" اس کا تیسرا سوال بھی بنوز سنجیدگی اور انصاف کے ترازو میں جھولتا ہوا سامنے آیا تھا۔

"نہیں رہے گی۔" علیزے بھی اس انصاف کے معاملے میں انصاف سے ہی کام لے رہی تھی۔

"تو پھر اب اس بات کا بھی انصاف کرو کہ کیا میں زری کو اپنا سکتا تھا؟ جبکہ مجھے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ نبیل اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟" ایک اور سوال تھا۔

"نہیں..... " وہ بھی منصفی سے کام لے رہی تھی۔

"کیا کوئی عزت دار اور غیرت مند مرد یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی کو اس کا دوست دل ہی دل میں چاہتا رہے؟ اور یہ بات جاننے کے باوجود بھی اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہے؟" دل آور نے علیزے کے سامنے امتحان اور انصاف کا ہر سوال کھول کھول کر رکھا تھا۔

"نہیں..... " علیزے کے ذہن اور عقل کے در وا ہوتے جا رہے تھے اور وہ دل آور کے احساسات کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

"تو پھر میں زری کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا تھا؟ کیسے اس کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اس سے شادی

میں کروں اور اسے چاہے نہیں؟ جب ہم اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کی ہوئی چیز خود استعمال کر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو پھر اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کے جیون ساتھی کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتے ہیں بھلا؟ اور یہ صرف میری ہی بات نہیں ہے بلکہ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب بھی دیکھ لو اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس نے مومنہ بی بی سے شادی کر کے زری کی طرف جانے والے تمام راستے بند کر دیئے ہیں تاکہ اسے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہونا پڑے۔ لیکن تم میری اس بات کو غلط مت سمجھنا میں نے زری سے بھاگنے کے لیے یا اس سے دور رہنے کے لیے تم سے شادی نہیں کی۔ میں نے صرف اپنی اماں کی خوشی کی خاطر تم سے شادی کی تھی۔ ورنہ دنیا میں خدا کی پاک ذات کے علاوہ ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو مجھے علیزے آفندی سے شادی کے لیے مجبور کر سکتی۔ میں مجبور ہوا تو صرف اپنی اماں کی وجہ سے..... ورنہ شادی کرنا ہوتی تو میں کسی اور سے بھی کر سکتا تھا تم سے شادی کرنا ضروری نہیں تھا مگر جب قسمت میں ہی یہی لکھا تھا تو پھر ضروری بھی ہو گیا اور جب قسمت میں لکھا یہ ضروری کام ہو ہی گیا ہے تو اسے پورے دل سے اپنایا ہے بغیر کسی کھوٹ اور بغیر کسی ملاوٹ کے..... اب دل میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے علیزے! کچھ بھی نہیں۔" دل آور نے اپنے دلی جذبات کا اور دلی کیفیات کا بہت ہی کھل کے اظہار کیا تھا۔

"اور زری؟" علیزے نے اسے آخری بار ٹٹولنا چاہا تھا۔

"علیزے! میں آج یہاں کھڑے ہو کے قسم کھاتا ہوں کہ زری کو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں وہیں انگلینڈ کی فضاؤں میں۔ چند سال پہلے اتنا پیچھے کہ اب مڑ کے دیکھنا بھی چاہوں تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ میرے آس پاس کہیں بھی نہیں ہے، نہ دل میں، نہ دماغ میں اور نہ ہی سوچ میں، ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اسے چاہا تھا اس سے محبت کی تھی مگر اسے حاصل کیے بغیر اسے وہیں چھوڑ آیا، اسے وہیں بھول آیا تھا یہ سوچ کر کہ میں کسی اور سے محبت کروں گا اور کسی اور سے شادی کروں گا۔ وہ "کسی اور" تم ہو گی یہ تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر یقین کرو تمہارے سوا اور تمہارے بعد نہ کوئی اور علیزے ہو سکتی ہے اور نہ کوئی زری! میں تمہارے سامنے میں بالکل کھرا ہوں اس لیے مجھے کسی چیز کا کوئی ڈر نہیں ہے اور زری کے معاملے میں میری نیت اور میرا ضمیر بالکل صاف ہیں اس لیے میرے دل پہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔ باقی اگر میں کسی معاملے میں قصوروار ہوں تو میں خدا کی عدالت میں حاضر ہوں وہ مجھے جو بھی سزا دے مجھے قبول ہو گی۔" دل آور نے آج ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ علیزے کے پاس جواباً کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا اور وہ چپ کی چادر اوڑھ کے رہ گئی تھی۔ جبکہ دل آور اس کی طرف سے رُخ موڑ کر اپنی جیب سے رومال نکال کر سر پہ باندھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ خوانی کے لیے بلند کر چکا تھا اور علیزے کی نظروں نے اسے پہلی بار بڑے دھیان سے یوں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار اسے سامنے کھڑا اپنا "ڈرائیور" برا نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھنے کے بعد چہرے پہ ہاتھ پھیرا علیزے بے ساختہ چونک گئی اور فوراً سنبھلتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں پھول نکال کر قبروں پہ چڑھانے لگی اور دونوں شاپر خالی کرنے کے بعد اس نے بھی تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھی اور پھر آہستگی سے سر جھکا کر دل آور کے برابر آ کھڑی تھی۔

"سارے پھول ان قبروں پہ چڑھا دیئے۔ زری کی قبر پہ چڑھانے والے پھول کہاں گئے؟" دل آور نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بچے لے کر زری سے ملنے کے لیے جاؤں گی۔ کیا مجھے لے کر جاؤ گے؟" علیزے نے ذرا ہچکچاتے ہوئے موڈ میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں..... ضرور لے کر جاؤں گا بلکہ آج ہی لے کر جاؤں گا۔" اس نے فوراً ہامی بھری تھی اور علیزے اس کے مان جانے پہ بہت خوش ہوئی تھی۔

"تھینک یو!" اس نے بڑے ریلیکس انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ویلکم!" وہ بھی دھیمے سے لہجے میں کہتا واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی چل پڑی، لیکن ابھی وہ قبرستان سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ انہوں نے سامنے سے مبارک خان آتا ہوا دکھائی دیا تھا اور علیزے مبارک خان کو دیکھ کر چونک گئی۔

"مبارک خان۔" علیزے نے زیرِ لب اس کا نام دہرایا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی! السلام علیکم صاحب! کیسے ہیں آپ؟" مبارک خان نے علیزے کو سلام کرنے کے بعد دل آور کی

ہاتھ بڑھایا تھا اور اس سے حال چال بھی پوچھا تھا۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیوں؟" دل آور کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔

"میں بہت دیر سے آپ کے نمبر پہ کال کر رہا ہوں مگر آپ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے، تب مجھے گلاب خان کے نمبر پہ کال کرنا پڑی اور اس سے پتا چلا کہ آپ علیزے بی بی کے ساتھ قبرستان آئے ہوئے ہیں اور اس وقت خالی ہاتھ ہیں۔ سو مجھے مجبوراً آپ کے پیچھے آنا پڑا۔"

مبارک خان کیا کہہ رہا تھا۔ علیزے کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا وہ تو بس ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ ان دونوں کا اتنا دوستانہ انداز دیکھ رہی تھی اور ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" دل آور کو الجھن ہوئی تھی۔

"کیونکہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کے بندے مسلسل آپ کی تاک میں ہیں۔ وہ کسی بھی وقت آپ پہ حملہ کر سکتے ہیں اور یہ حملہ آپ کے لیے خطرناک اور نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔" مبارک خان اس کے لیے متفکر ہو رہا تھا اور علیزے پاگل ہو جانے کو تھی، اسے غش آ رہے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔

"صاحب! آپ کا بندہ ہوں، آپ کا نمک کھاتا ہوں، آپ کے اچھے بُرے کی خبر نہیں رکھوں گا تو اور کیا کروں گا؟ آپ کی فکر ہے تو آپ کا دھیان رکھنا میرا فرض بنتا ہے اور میں یہ فرض ضرور نبھاؤں گا آپ بس یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ ایس پی کامران بھی بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔" مبارک خان واقعی اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔

اور علیزے یہ جان کر ششدر سی رہ گئی تھی کہ اس کے ڈیڈ کا اور بڑی حویلی کا بہت ہی خاص اور بہت ہی بااعتبار ملازم مبارک خان کوئی اور نہیں بلکہ دل آور شاہ کا خاص آدمی تھا جس نے ہمیشہ دل آور شاہ کے لیے ہی کام کیا تھا یہاں تک کہ بڑی حویلی میں بھی۔

"کیا مطلب..... کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟" دل آور بھی چونک گیا۔

"میرا مطلب ہے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں ہر طرف خطرے کی بُو محسوس کر رہا ہوں آپ بس علیزے بی بی کو لے کر یہاں سے جلدی نکلیں ورنہ کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔" مبارک خان کی ٹینشن گوئی کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور بھی علیزے کے خیال سے ایک دم الرٹ ہو گیا اور سر پہ بندھا رومال اُتار کر جیب میں رکھتے ہوئے علیزے کا ہاتھ کافی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"چلو علیزے! جلدی اٹھو یہاں سے....." اس نے علیزے کو اپنے ساتھ کھینچا۔

"مم..... مگر..... یہ..... یہ مبارک خان..... یہ سب کیا ہے؟" علیزے مبارک خان کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔

"یہ سب تمہیں بعد میں بتاؤں گا، ابھی چلو۔" دل آور کو اپنے بجائے علیزے کی فکر تھی اسی لیے علیزے کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے اپنا اسلحہ چادر کے نیچے چھپائے مبارک خان بھی باہر آ گیا تھا۔ دل آور کو تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر بڑے سے درخت کے پیچھے چھپے ایک آدمی نے یکدم فائرنگ کر ڈالی تھی اور فائرنگ کی خوفناک آواز سے دہشت زدہ سی علیزے بے ساختہ دل آور سے لپٹ گئی تھی اور اس کے لپٹنے کی وجہ سے جو گولی دل آور کے سینے میں آ کر پیوست ہونی تھی وہ علیزے کے کندھے میں جا گھسی تھی اور علیزے کی چیخوں سے پوری فضا گونج اٹھی تھی اور دوسری گولی مبارک کے بازو کو چھید کے رکھ گئی تھی۔

"ڈرائیور۔" علیزے اس کے بازوؤں میں لہرائی تھی۔

"علیزے۔" دل آور کی اس افتاد پہ آنکھیں پھٹ گئی تھیں وہ اسے خون میں لت پت دیکھ کر پاگل ہو اٹھا اور علیزے کو بچوں کی طرح اپنی بانہوں میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"علیزے..... علیزے۔" وہ زور زور سے پکار رہا تھا مگر علیزے ہر چیز سے غافل ہو چکی تھی اور دوسری طرف مبارک خان ملک حق نواز کے بندوں کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا لیکن دل آور کو علیزے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کا بہتا خون نظر آ رہا تھا۔

''جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ لہو رنگ ہو گئے تھے اور وہ پھر نے لگا تھا۔

''مبارک خان..... مبارک خان..... گاڑی کا دروازہ کھولو..... جلدی کرو۔''

دل آور خود بے بس تھا وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ علیزے اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ اس لیے وہ مبارک خان پر دھاڑا تھا۔

اور مبارک خان نے اسی دہشت زدہ اور افراتفری کے ماحول میں انتہائی تیزی اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لپک جھپک آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔

''صاحب! جلدی کریں۔'' مبارک خان نے پلٹ کر زور سے اسے آواز دی اور دل آور گاڑی کا دروازہ کھلا دیکھ کر علیزے کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر تیزی سے گاڑی کی سمت لپکا اور اسے گاڑی کی بیک سیٹ پر لٹا کر خود انتہائی عجلت سے دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

''مبارک خان تم یہاں اکیلے'' گاڑی نکالتے نکالتے وہ اک پل کے لیے ٹھہرا تھا۔

''صاحب! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں نبٹ لوں گا ان لوگوں سے آپ علیزے بی بی کو ہسپتال لے کر جائیں۔ کہیں کوئی نقصان نہ ہو جائے، پلیز جلدی جائیں آپ۔''

مبارک خان اسے تسلی دیتے ہوئے اس کی گاڑی کا دروازہ ہاتھ سے بجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا اور دل آور اس کی تسلی پہ سر ہلا کر گاڑی بڑھا لے گیا تھا۔

پھر پیچھے کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے خبر تھی تو صرف علیزے کی۔

''علیزے.....'' اس نے بچوں کی طرح پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے پکارا تھا۔

مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ پڑی تھی اور اس کے جسم سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم سے بہتے خون کو دیکھ کر دل آور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اپنے جسم سے خون بہہ رہا ہو اور اس کے وجود کی رگیں لمحہ بہ لمحہ خالی ہوتی جا رہی ہوں۔ اس خیال سے اس نے گاڑی کی سپیڈ اور زیادہ بڑھا دی تھی اور اپنی اس بدحواسی اور افراتفری کے عالم میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا کہ وہ علیزے کو کس ہسپتال لے کر جا رہا ہے۔

کیونکہ اس کے حواس ہی ٹھکانے پہ نہیں تھے۔ وہ ہسپتال کے احاطے کے اندر گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے تیزی سے نیچے اترا اور گاڑی کا بیک ڈور کھولتے ہی بیتابی سے علیزے کی نبض ٹٹولی تھی۔

نبض رواں تھی مگر بہت ہی مدھم رفتار سے۔ اور اس کی ڈوبتی نبض کے احساس نے دل آور کو اور بھی پاگل کر ڈالا۔ وہ اسے بانہوں میں اٹھا کر اندھا دھند ہسپتال کے اندر کی طرف بڑھا تھا۔

اور سامنے سے آتا عبداللہ حیران رہ گیا تھا۔ مگر دل آور کے بازوؤں میں خون سے لت پت علیزے کو دیکھ کر اس کی حیرانی، پریشانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ لپک کے دل آور کی طرف بڑھا۔

''دل آور ے! یہ..... یہ کیا ہوا ہے علیزے بھابی کو؟'' عبداللہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔

مگر دل آور کے پاس ایک سیکنڈ ٹھہرنے کا بھی وقت نہیں تھا اور نہ ہی جواب دینے کے لیے ذہن حاضر تھا۔ وہ وہاں رکے بغیر اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے عبداللہ بھی اسٹاف بھی جمع ہو گیا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے علیزے کو اسٹریچر پہ ڈالا گیا اور فوراً ہی اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا اور دل آور وہیں کاریڈور میں ہی رہ گیا تھا۔

''دل آور ے! بتاؤ نا کیا ہوا ہے علیزے بھابی کو؟ ان کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے؟''

عبداللہ کے دل کو نہ جانے کیوں اک عجیب سی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا دل علیزے کا خون دیکھ کر خود بخود ہی اس کی سمت کھنچ رہا تھا۔

اور وہ بار بار دل آور سے استفسار کر رہا تھا جبکہ دل آور سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔

''دل آور ے! تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے علیزے بھابی کو کس نے یہ.....''

"کیا بتاؤں تمہیں؟ کیا بتاؤں آخر..... کیا سننا چاہتے ہو؟ یہ کہ علیزے کی حالت تمہارے بھائی ملک اسد اللہ کی کمینگی کا نتیجہ ہے..... اس نے کروایا ہے سب کچھ..... اس نے مجھ پہ قاتلانہ حملہ کروایا ہے مگر نشانہ وہ بن گئی۔ اس کی گولی کا شکار ہو گئی ہے وہ..... مار ڈالا ہے اس نے علیزے کو..... جان لے لی ہے اس کی۔" دل آور اس کے پوچھنے پہ پھٹ پڑا تھا اور عبداللہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

وہ ساکت و سنسار ہ گیا تھا اور اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔

"یہ..... یہ..... کیا کہہ رہے ہو تم؟" عبداللہ کی آواز بے ربط سی ہو گئی تھی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں، وہ غلط نہیں ہے مگر عبداللہ میری بات ایک یاد رکھنا کہ اگر علیزے کو کچھ ہوا تو میں اسی علیزے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ کو بیچ چوراہے میں باندھ کر گولیوں سے چھلنی نہ کروں تو سمجھ لینا کہ میں بابر شاہ کا بیٹا ہی نہیں تھا۔"

دل آور کی آنکھوں میں غضبناکی کے لال ڈورے تیر رہے تھے اور اس نے وہ قسم کھائی تھی جس کو سن کر عبداللہ بھی سر سے لے کر پیر تک کانپ گیا تھا۔

کیونکہ اسے دل آور کے مزاج کا بخوبی پتا تھا۔ وہ اپنے غیض و غضب اور اپنے انتقام میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ چاہے اس کے لئے پھانسی ہی کیوں نہ چڑھنا پڑ جاتا۔

"دل آور صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" ایس پی کامران مہدی فل یونیفارم میں ملبوس بہت ہی متفکر سے انداز میں کہتے دل کے قریب آ رکا تھا۔

"میں کتنا ٹھیک ہوں..... آپ میرے حلیے سے دیکھ سکتے ہیں۔" دل آور نے اپنے خون سے رنگے کپڑوں اور اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی ہاں..... مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ آپ کی واقف کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ اب کہاں ہیں وہ؟ زیادہ سیریس تو نہیں ہے۔"

ایس پی کامران مہدی کو خاصی تشویش ہو رہی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ دل آور پہلے بھی ایک عظیم دکھ اٹھا چکا ہے۔ اب مزید دکھ سہنے کی یقیناً اس میں بھی ہمت نہیں ہو گی۔ "آپ دعا کریں کہ زیادہ خطرے کی بات نہ ہی ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی کے بھی حق میں اچھا نہیں ہو گا۔" دل آور کے ذہن میں بار بار ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ ہی گردش کر رہے تھے۔ وہ انہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"سوری سر! ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک پولیس کیس ہے آپ پہلے اپنا اسٹیٹمنٹ ریکارڈ کروا دیں۔"

ایک کمپاؤڈر نے آ کر دل آور کو اطلاع دی اور دل آور کے پہلے سے گھومے ہوئے دماغ سے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے کمپاؤڈر کو یکدم گریبان سے دبوچ لیا تھا۔

"کیا کہا؟ ڈاکٹر نے آپریشن سے انکار کر دیا ہے۔" وہ دانت پیستے ہوئے غرایا تھا۔

"پلیز دل آور ایہ کیا کر رہے ہو تم؟ یہ کیا پاگل پن ہے آخر، بس کرو، سنبھالو اپنے آپ کو۔" عبداللہ نے جھنجلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اس کمپاؤڈر کا گریبان چھڑا کے دل آور کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا۔

"پلیز ایس پی صاحب! آپ ڈاکٹر سے بات کریں۔ ان سے کہیں کہ آپریشن جلدی شروع کریں بھابی کی حالت بہت خراب ہے۔ کسی طرح لیٹ کرنے سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔"

عبداللہ نے دل آور کو سنبھالتے ہوئے ایس پی کامران مہدی سے ریکویسٹ کی تھی۔

"او کے..... میں بات کر لیتا ہوں، آپ ان کا خیال رکھیں پلیز۔ اسی مصیبت اور نقصان کے ڈر سے ہی تو میں بار بار ان کے لئے کال کر رہا تھا، مگر انہوں نے میری کال ہی ریسیو نہیں کی۔ کیونکہ مجھے ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ کے عزائم کی خبر ہو چکی

ایس پی کامران مہدی افسوس کا اظہار کرتا وہاں سے ہٹ کے آپریشن تھیٹر کی طرف آ گیا اور پھر اگلے دس منٹ میں علیزے آپریشن سٹارٹ ہو گیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ اور دعا کرو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔" عبداللہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پہ بٹھایا۔

"عبداللہ! علیزے کو کچھ ہو گیا تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کچھ بھی نہیں یا میں خود کو مار ڈالوں گا یا باقی سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ بس علیزے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور ملک حق نواز کی اس جنگ کی سزا علیزے کو نہیں ملنی چاہیے وہ بے قصور ہے۔ اسے میں نے سزا نہیں دی تو کوئی کیسے دے سکتا ہے۔ آخر کیسے؟ میری زندگی ہے وہ..... اسی کی وجہ سے تو جی رہا ہوں میں۔ ورنہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ سب بیکار ہے، سب فضول ہے، صرف وہی وہ ہے اور اس کی وجہ سے میں ہوں۔" علیزے کی موت کے خیال نے دل آور کو حقیقتاً جیسے پاگل کر ڈالا تھا۔

اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بولتا جا رہا تھا۔ لیکن کیا، کیا بول رہا ہے اسے خود احساس ہی نہیں تھا۔

مگر عبداللہ کو اس کے بولنے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے علیزے سے کتنی محبت ہے اور اس کی اس محبت میں کتنی شدت ہے۔ کیونکہ اس کی شدت اور اس کی محبت تو اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ بلکہ اس محبت اور شدت میں تو اس کا رواں رواں تڑپ رہا تھا۔

جس کو سوچ کر اور محسوس کر کے عبداللہ نے بے ساختہ اک گہری سانس کھینچی تھی اور دوبارہ سے اسے تسلی دینے لگ گیا کیونکہ اس وقت دل آور کو تسلی اور سہارے کی ہی ضرورت تھی۔

♥

"عبداللہ! اتنی دیر سے کہاں تھے آپ؟ میں اور زری کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ زری نے مدیحہ کو کال کرنی تھی مگر موبائل ہی آپ کے پاس تھا۔"

نگارش عبداللہ کے ہاتھ کی دستک سنتے ہی پرائیویٹ روم سے باہر نکل آئی کیونکہ اس کے خیال میں زری سو چکی تھی لیکن اسے کیا خبر تھی کہ زری تو محض پلکیں موندے لیٹی ہے۔

"بس دل آور کے ساتھ تھوڑا بزی ہو گیا تھا۔" دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس لیے دونوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔

"دل آور بھائی! کہاں تھے وہ؟" نگارش چونکی تھی اور زری اس کے نام پہ جیسے سناٹے میں آ گئی تھی۔

"اسی ہسپتال میں۔" عبداللہ کا انداز بہت دھیما تھا، جس پہ نگارش اب مزید تشویش کا شکار ہوئی۔

"اسی ہسپتال میں مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے نگارش، دل آور پہ اسد اللہ بھائی نے قاتلانہ حملہ کروایا ہے اور اس وقت علیزے بھابی دل آور کے ساتھ تھیں، جس گولی کا نشانہ دل آور کو بننا تھا، اس گولی کا نشانہ علیزے بھابی بن گئیں اور وہ اس وقت اسی ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے۔"

عبداللہ نے نگارش کی سماعتوں پہ بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر ششدر سی رہ گئی تھی اور یہی حال اندر بیڈ پہ پڑی زری کا بھی ہوا تھا۔

"نگارش! مجھے نہیں لگتا تھا کہ دل آور علیزے بھابی سے محبت کرتا ہے۔ مگر آج علیزے بھابی کی تکلیف پہ وہ کس طرح پاگل اور دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے احساس ہو گیا ہے کہ وہ واقعی علیزے بھابی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔"

عبداللہ نے نگارش کے سامنے اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن دیا تھا لیکن اندر بیڈ پہ ویران اور اُجاڑ پڑی زری کے من میں (دور تک اور بھی سناٹے چھا گئے تھے۔ اور آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر اس کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"محبت" زری کے لب کپکپائے تھے۔

"زری سے کہو وہ دل آور کو اپنی محبت سے آزاد کر دے ہمیشہ کے لیے کیونکہ وہ اس کا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دے..... نکال دے اپنے دل سے..... بھول جائے اسے، بھول جائے۔" عبداللہ نے زری کے اس معاملے میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔ مگر وہ بھی بے بسی اور مایوسی کی انتہا کو چھونے کے بعد۔

اور عبداللہ کے لہجے اور انداز کی اس بے بسی اور مایوسی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے زری نے یونہی لیٹے لیٹے گہری سانس خارج کی تھی اور پلکیں کھول دی تھیں۔

"بھائی! میں نے دل آور شاہ کو اپنی محبت سے آزاد کر دیا۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ میرا نہیں ہے کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دی ہے۔ نکال دیا ہے اسے اپنے دل سے۔ بھول گئی ہوں اسے، بھول گئی ہوں، بھول گئی ہوں۔" زری نے زیر لب کپکپاتے لہجے اور کپکپاتے ہونٹوں سے کہتے ہوئے اپنے لرزتے، کانپتے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کرنے لگے تھے۔ اور اسے یوں لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔ ہمہ وقت دل آور شاہ کی محبت سے بھرا رہنے والا دل خالی ہو گیا ہو۔ بالکل ایسے جیسے کوئی خالی برتن ہو۔ اب یہ خالی برتن ٹوٹتا یا سلامت رہتا۔ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اسے آزاد کر کے، خود بھی آزاد ہو گئی تھی، ریلیکس ہو گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پُرسکون ہو جاتا ہے۔

خود تم سے ملنے آئی بھی
اور آ کر بہت پچھتائی بھی
اب جھیلوں گی خاموشی سے
یہ دوری بھی تنہائی بھی
اک کھیل تھا سو میں ہار گئی
اس کھیل میں تھی رسوائی بھی

♥

تحقیق ہو تو روح دو عالم تڑپ اٹھے
اتنا تیرے بغیر پریشان رہا ہوں میں

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ یکدم لپک کے تیزی کی سی تیزی سے دروازے کے قریب آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیسی ہے وہ؟ وہ..... وہ زندہ تو ہے نا؟" اس نے ڈاکٹر سے بہت ہی ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"آپ فی الحال اس سوال کو چھوڑیں اور ان کے لیے بلڈ کا انتظام کریں۔ ان کے لیے بہت زیادہ بلڈ کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نے دل آور کے سوال کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے علیزے کے لیے ایک اہم ضرورت کا اعلان کیا تھا اور دل آور اس اہم ضرورت کا سن کر ساکت و صامت سا رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ علیزے کا بلڈ گروپ جانتا تھا۔

"بلڈ....." اس نے بے حد آہستگی سے دہرایا تھا۔

"جی ہاں..... بلڈ ہی کہا ہے۔" ڈاکٹر نے بھی دہرا کے جواب دیا تھا۔

"لیکن اس کا گروپ تو او نیگیٹو ہے۔" دل آور کے دماغ سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بیچ منجدھار میں گھر گیا ہو اور اس کا ہاتھ علیزے کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہو۔

"جی ہاں..... ان کے بلڈ گروپ کی رپورٹ آ چکی ہے۔ اسی لیے ہمارے ساتھ ساتھ اب آپ کو بھی اس کام کے لیے کوشش کرنی ہوگی۔ ورنہ ان کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔" ڈاکٹر نے کہتے ہوئے جیسے دل آور کے دل پہ ہاتھ ڈالا تھا۔

"لیکن ڈاکٹر آپ کو پتا ہے کہ او نیگیٹو تو بہت....." اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"ہاں..... مجھے پتا ہے۔ لیکن آپ ان کی فیملی سے رجوع کریں۔ آئی ہوپ کسی نہ کسی کا بلڈ گروپ ضرور میچ کرے گا۔" ڈاکٹر نے اسے ایک اور مشورہ دیا تھا۔

"فیملی....." دل آور کے ذہن میں بڑی حویلی کا نقشہ گھوم گیا تھا لیکن وہاں جانا یا پھر ان لوگوں سے اب کسی اچھے کام کی یا کسی مدد کی امید رکھنا سراسر فضول تھا۔

"اور ہاں..... فیملی سے یاد آیا..... آپ کی مسز کے پیرنٹس کہاں ہیں؟ انہوں نے اتنی تکلیف اور بیہوشی کے باوجود اپنے پاپا کو یاد کیا ہے۔ اگر ممکن ہے تو پلیز..... آپ ان کے فادر کو یہاں بلا لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فادر یا مدر سے مل کر یا ان کی آواز سن کر

ذرا جلدی کور کرلیں۔ میں نے ان کے منہ سے دو تین بار پاپا کا لفظ سنا ہے۔"

ڈاکٹر کی اس نئی اطلاع پہ دل آور دم بخود رہ گیا اور اس کے آس پاس ایک عجیب سی سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی۔

"پیرسٹر صاحب! زیادہ سوچنے کا ٹائم نہیں ہے۔ آپ کی وائف کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ نے جو بھی کرنا ہے، پلیز ہری اپ۔" ڈاکٹر اس کا کندھا تھپک کر پلٹ گیا۔

"یسیے ڈاکٹر صاحب۔" عبداللہ کی آواز پہ ڈاکٹر کو گلٹ کے باوجود رُکنا پڑا۔

"میرا دوست اس وقت صدمے کی حالت میں ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ میرا بلڈ گروپ بھی او نیگیٹو ہی ہے۔" عبداللہ نے ذرا سا مسکرا کے کہا تھا اور دل آور نے بُری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

اور عبداللہ کی مسکراہٹ پہ اسے یاد آیا تھا کہ ان تینوں نے انگلینڈ میں اپنے بلڈ گروپ چیک کروائے تھے اور تینوں کے گروپ الگ الگ تھے۔ کسی ایک کا بھی ایک دوسرے سے میچ نہیں ہوا تھا۔

"ارے..... یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے لیکن صرف ایک بیگ سے کام نہیں چلے گا۔ مزید بلڈ کی ضرورت پھر بھی رہے گی۔" ڈاکٹر کو سن کر خوشی ہوئی تھی۔

"آپ کو جتنی ضرورت ہے آپ لے لیں۔" عبداللہ نے دل آور کی خاطر اپنا آپ حاضر کر دیا۔

"نو سر..... ہم ایک وقت میں صرف ایک ہی بیگ لے سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

"ڈاکٹر پلیز....." ایک نرس نے آپریشن تھیٹر سے نکلتے ہی ڈاکٹر کو پکارا تھا اور ڈاکٹر ان دونوں کو جلدی کا اشارہ کر کے آپریشن تھیٹر میں گھس گیا تھا۔

"دیکھو دل آور جی! پلیز ہوش سے کام لو۔ ہوش میں آؤ اس طرح بت بنے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ علیزے بھابی کو تمہاری ضرورت ہے۔ سنبھالو اپنے آپ کو جاؤ جیسے بھی سہی، ان کی فیملی سے کانٹیکٹ کرو۔ اس وقت علیزے بھابی کو ان کی بھی ضرورت ہے، پلیز سمجھو یار۔"

دل آور جوں کا توں کھڑا تھا۔ جب عبداللہ نے اپنے مخصوص مردانہ اسٹائل میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دل آور نے کچھ سوچتے ہوئے ہی پُرعزم انداز میں گردن موڑ کر عبداللہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"علیزے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں عبداللہ اس کی خاطر آج وہ کام کروں گا، جو میرا سر بھی کٹ جاتا تو میں نہ کرتا۔" دل آور نے کہتے ہوئے عبداللہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔

"کیا مطلب؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی۔

"مطلب بعد میں پتہ چلے گا۔ ابھی میں کہیں جا رہا ہوں۔" دل آور نے ایک پُرعزم سی سانس کھینچتے ہوئے کہا اور اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

"لیکن..... تم جا کہاں رہے ہو؟" عبداللہ ایک بار پھر لپک کے اس کے سامنے آ گیا۔

"میں آج تم سب کا مقروض ہونے جا رہا ہوں۔ میں آج بادشاہ سے فقیر ہونے جا رہا ہوں۔ میں آج بھیک مانگنے جا رہا ہوں اب دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔" دل آور اس کا کندھا تھپک کے آگے بڑھ گیا تھا اور عبداللہ پیچھے کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

"سر پلیز..... آپ میرے ساتھ آیئے۔" نرس نے قریب آ کر عبداللہ کو متوجہ کیا تھا اور عبداللہ سر جھٹک کر نرس کے ہمراہ اسپتال کی لیبارٹری میں آ گیا تھا۔

♥

شام ڈھل رہی تھی۔ سب اپنے اپنے کام سے واپس آ چکے تھے۔ حویلی میں روزانہ کی طرح آج بھی کہا سُنی زوروں پہ تھی اور کچن میں کھانے کی تیاریاں بھی عروج پہ تھیں۔ بڑی حویلی میں بہت عرصے بعد زندگی کا احساس دوبارہ محسوس ہوتا نظر آ رہا تھا اور آذر ان سب کو ایک نظر دیکھ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

اور ابھی وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لان میں آیا ہی تھا کہ اس کے پُرسکون ہوتے ذہن پہ اک اور پتھر آ پڑا تھا اور بڑی مشکل سے ٹھہرنے والی سوچ کی لہریں ایک بار پھر منتشر ہو گئی تھیں۔

کیونکہ ان کی حویلی کے گیٹ کے اندر ڈرائیوے پہ ایک پراڈو آکر رکی تھی اور اس پراڈو سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر
ہ بھلا پُرسکون دماغ گھوم گیا تھا۔
منصور حسین....." آذر نے زیرلب دہرایا تھا۔
ہیں..... منصور حسین....." اپنے کسی کام سے باہر نکلتی رجوع بھی اپنی جگہ پہ ساکت وصامت سی ہو گئی تھی۔ بلکہ اسے جو بھی
تھا وہ بھی اپنی جگہ پر منجمد ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے انہوں نے کسی آفت کو دیکھ لیا ہو۔ جبکہ وہ کسی کی بھی سمت دیکھے بغیر آگے بڑھتا جا

لیکن ہر بار یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے پاس سے گزر جاتا اور وہ لوگ یونہی ساکت وصامت سے کھڑے رہتے۔
آذر نے جب اسے اندرونی مین ڈور کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر بہت تیزی سے اس کے قریب

روک جاؤ منصور حسین! تمہارا ایک قدم بھی آگے بڑھا تو اچھا نہیں ہوگا۔" آذر نے یکدم اس کے سامنے آکر اسے روک دیا
دل آور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔
دیکھو آذر آفندی! مجھے اپنی موت کا خوف ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔ لیکن افسوس کہ مجھے علیزے کی موت کا خوف یہاں
لایا ہے اور اگر علیزے کی موت کے خوف سے میں یہاں آ گیا ہوں تو پھر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو
ہٹا سکتا ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت مرنے کفن باندھ کے آیا ہوں۔ اس لیے پلیز میرے راستے کی رکاوٹ مت بنو اور مجھے وقار آفندی
کے پاس جانے دو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ علیزے مر جائے گی۔"
دل آور نے بہت ہی دوٹوک سے انداز میں آذر آفندی کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ آذر شاید اس کی سمجھتا یا نہ سمجھتا مگر
اس کے خون سے رنگے کپڑے دیکھ کر اس کی نظریں پتھرا گئی تھیں۔ یعنی اس کے کپڑے علیزے کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔
مگر اسے ہوا کیا؟ اور اگر ہوا بھی تھا تو بڑی حویلی کا اس سے کیا تعلق۔
آخری خیال نے آذر کو پھر سے پتھر بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر تب تک وہ آذر کو سائیڈ پہ دھکیل کر خود آگے بڑھ گیا تھا۔
"منصور حسین! زگو میری بات سنو، میں تمہارے کسی نئے ڈرامے یا کسی نئی چال میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں تمہیں گولی سے
اڑا دوں گا۔" آذر پکارتا ہوا، دھاڑتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔ اتنے میں بڑی حویلی کے کئی افراد شور کی آواز سن چکے تھے اور منصور
حسین نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ مگر وہ سیدھا وقار آفندی کے بیڈروم میں جا
گھسا۔ آذر کے چلانے کی آواز پہ وقار آفندی یکدم مخدوشی سے ہڑبڑا گئے اور وارڈ روب بند کرتی آسیہ آفندی بھی دہل گئی تھیں۔
"منصور حسین۔" آسیہ آفندی کی چیخ نکل گئی تھی، جبکہ وقار آفندی کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔
اور دل آور کے پیچھے اپنا ریوالور لے کر آنے والا آذر، وقار آفندی کے منہ سے نکلنے والے اس ٹوٹے پھوٹے سے نام پہ ٹھٹک

"ہاں..... میں دل آور شاہ! بابر شاہ کا بیٹا اور منصور حسین شاہ کا پوتا زندگی میں ایک بار پھر تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔
وقار آفندی اس دل آور شاہ میں اور اس دل آور شاہ میں بہت فرق ہے۔ تب میں تمہارا دشمن تھا اب میں تمہارا داماد ہوں۔ اس
رشتے میں تم سے انتقام لینے آیا تھا لیکن آج میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ آج میں شاہ نہیں ہوں، آج میں گدا ہوں۔ آج میری
زندگی کا سوال ہے۔ وہ اس وقت ہسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو
ہے اور میں اس ایمرجنسی میں کہیں سے بھی یہ گروپ ارینج نہیں کر پا رہا۔ مجھے اس کے لیے بلڈ کی ضرورت ہے، مجھے او نیگیٹو کی
ضرورت ہے۔"
وہ کہتے ہوئے واقعی بہت بے بس اور شکست خوردہ سا لگ رہا تھا۔
"م..... مگر..... میری..... علیزے کو..... ہوا کیا ہے؟" آسیہ آفندی تڑپ کے اس کے سامنے آ گئی تھیں اور دل آور نے وقار
آفندی سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کزن ملک حق نواز نے مجھ پر حملہ کروایا لیکن فائرنگ کے دوران گولی علیزے کو لگی۔ جس سے وہ شدید زخمی ہوئی ہے اور اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا ہے۔ اس لیے ڈاکٹرز بہت زیادہ پریشان بھی ہیں کیونکہ یہ بلڈ کسی بلڈ بینک سے بھی ارینج نہیں ہو رہا۔"

دل آور دھماکے پہ دھماکہ کر رہا تھا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ اپنے منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے اور مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کزن ملک حق نواز نے؟ یہ..... یہ..... کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ پاگل ہو جانے کو تھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور وہ کیا، کیا انکشاف کر رہا تھا۔ ان سب کے دماغ سمجھنے سے قاصر ہو گئے تھے۔

اور وہاں موجود آذر، دانیال، عائشہ آفندی اور ثروت بیگم بھی ہکا بکا سے اس کی صورت دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں بھی سن رہے تھے۔

"مسز آفندی! میرا پورا نام بیرسٹر دل آور شاہ ہے۔ میرے پاس ایک کیس آیا تھا، جس میں ملک حق نواز نے ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی اور اس کے نتیجے میں، میں نے اسے جیل بھجوا دیا تھا لیکن اب اسے سزا ہونے والی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں کیس سے پیچھے ہٹ جاؤں کیونکہ کل اس کیس کی آخری سماعت ہے۔ اسی لیے میرے انکار پہ انہوں نے مشتعل ہو کر مجھ پہ حملہ کروایا اور گولیوں کا نشانہ علیزے بن گئی اور میں علیزے کی خاطر آپ لوگوں کے پاس آنے پہ مجبور ہو گیا ہوں۔ پلیز اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ بہت مفلس ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پلیز خدا کے لیے علیزے کی زندگی بچا لیں۔ وہ بے قصور ہے۔ بے گناہ ہے وہ..... آپ اسے غلط مت سمجھیں..... غلط تو میں تھا اور میں اپنی غلطی تسلیم کروں گا..... سب کے سامنے کروں گا..... لیکن ابھی نہیں..... ابھی وقت بہت کم ہے۔"

دل آور نے کہتے ہوئے سچ مچ ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور وہ سب بے یقین سی نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"میرا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے۔ میں بلڈ دینے کے لیے تیار ہوں۔" دانیال وجاہت علی ان سب کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ آیا تھا اور دل آور کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے وجود میں روح پھونک دی ہو۔

"دانیال....." آسیہ آفندی زیر لب دہرا کے رہ گئی تھیں۔

"آئی! علیزے کو اس وقت ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ضرور پوری کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور آپ کے گھر بیٹی آئے چاہے داماد، انہیں مایوس اور خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہیے۔ یہ بات مجھے ڈیڈ نے سکھائی تھی اور میں آج اس بات پہ ضرور عمل کروں گا۔"

دانیال کے عزم کے سامنے سب کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔

"چلو..... کہاں چلنا ہے؟" اس نے دل آور کو متوجہ کیا تھا۔

"ہسپتال....." دل آور نے کافی آہستگی سے کہا اور قدم آگے بڑھائے تھے۔

"سنو....." عائشہ آفندی کی لرزتی ہوئی، آواز پہ دل آور کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

"جی....." وہ ان کے پکارنے سے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا سوال کرنے والی ہیں؟

"تت..... تم..... زہرہ..... بتول..... شاہ کے....." وہ سوال مکمل نہیں کر پائی تھیں۔

"جی ہاں..... میں بابر شاہ کا بیٹا اور زہرہ بتول شاہ کا بھتیجا ہوں۔ دل آور شاہ! وہی دل آور شاہ جو آپ کی محبت کا ذائقہ اور آپ کی گود کا لمس آج بھی نہیں بھولا، سب یاد ہے اور اذیت بھی اسی چیز کی ہے کہ سب یاد ہے، میں بھولا کیوں نہیں ہوں۔"

وہ دُکھ سے کہتا ان سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈال کر وقار آفندی کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور اس کے پیچھے پوری حویلی میں ایک بار پھر اک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ جبکہ دانیال تو اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں آ گیا تھا لیکن باقی سب بھی رہ نہیں سکے تھے۔ باری باری سبھی اپنی اپنی گاڑیاں نکالتے چلے گئے تھے۔

عبداللہ ہلکا دینے کے بعد روم سے نکل ہی رہا تھا کہ اتنے میں دل آور بھی وہاں آن پہنچا لیکن اس کے ساتھ دوسری شخصیت کو دیکھ کر عبداللہ ذرا سا جھکا اور اس نے فوراً ہی اپنے ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچا تھا کہ اس نے اس شخصیت کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟ جبکہ اس کی شکل وصورت بہت ہی مانوس سی لگ رہی تھی۔

"یہ میرا دوست ہے ملک عبداللہ۔" دل آور نے عبداللہ کا تعارف کروایا۔ لیکن دانیال بُری طرح چونک گیا تھا۔ اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"اور عبداللہ یہ علیزے کا کزن۔" دل آور نے دانیال کا تعارف کروانا چاہا تھا۔ مگر دانیال نے اسے روک دیا تھا۔

"خبر ہے میں اپنا تعارف خود کرواتا ہوں۔" اس نے دل آور کو کچھ بولنے سے باز رکھا۔

"اور میں علیزے کا کزن ہوں ملک دانیال وجاہت علی۔ علیزے میری پھوپھی زاد اور ماموں زاد کزن ہے اور میں اس وقت علیزے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں کیونکہ علیزے کا اور میرا بلڈ گروپ سیم ہی ہے۔" دانیال نے کہتے ہوئے عبداللہ کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جبکہ عبداللہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"گروپ تو میرا اور علیزے کا بھی سیم ہی ہے یعنی ہم لوگ اجنبی نہیں، ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں، ایک ہی گھر کے فرد ہیں اور ایک ہی نسل اور خاندان کا خون ہیں۔ نہ علیزے غیر ہے نہ تم غیر ہو تو پھر یہ ہاتھ کیوں بڑھا رہے ہو گلے ملو یار! یہ کندھا یہ سینہ حاضر ہے تمہارے لیے۔"

عبداللہ نے کہتے ہوئے بازو پھیلا دیئے تھے اور دانیال کو اس کے گلے لگنا ہی پڑا کیونکہ اس کے انداز میں بڑی چاہ تھی، بڑا مان تھا۔

"یار! اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ آج علیزے نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔" عبداللہ، دانیال سے مل کر بے انتہا خوش ہوا تھا اور خوش تو دانیال بھی ہوا مگر اس کے ذہن پہ ماضی کا غبار بھی حاوی تھا جو رفتہ رفتہ ہی چھٹ سکتا تھا۔

"دانیال! میرے علیزے کہاں ہے؟" آذر کے ساتھ آسیہ آفندی بھی گرتی پڑتی وہاں آ پہنچی تھیں اور دانیال بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

"تائی! ان سے ملیں، یہ عبداللہ ہیں۔ عبداللہ بھائی آپ کے بڑے بھائی کے صاحبزادے۔" دانیال نے اپنے کندھے سے ذرا ہلکے کمرے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"عبداللہ۔" آسیہ آفندی نے حیرت سے دل آور کی طرف دیکھا تھا کہ وہ تو کہہ رہا تھا ملک اسد اللہ نے اس پہ حملہ کروایا ہے تو یہ عبداللہ یہاں کیسے؟

"جی ہاں یہ عبداللہ ہے۔ میرا دوست، اور میرا بھائی! ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ سے بالکل مختلف۔" دل آور نے خود اس کا تعارف کروایا تھا اور آسیہ آفندی کے اعصاب قدرے ریلیکس ہو گئے۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟" عبداللہ نے ذرا سا آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ بھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔

"مسز علیزے شاہ کی کنڈیشن آؤٹ آف کنٹرول ہوتی جا رہی ہے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو آئی سی یو میں بلایا ہے۔" نرس قریب آ بھی گئی دل آور کے قریب آئی تھی اور دل آور کے چہرے کی ہوائیاں اُڑ گئی تھیں وہ بے ساختہ سب کو پیچھے ہٹا کر آئی سی یو کی طرف بھاگا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی بھاگے چلے آئے تھے۔

♥

"میڈی میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ سو کر اٹھی ہی تھی کہ اپنے سیل پہ جیری کا میسج دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی اور فوراً سے بھی پیشتر اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

دوسری طرف بھی فوراً ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم!" مدیحہ جو دوسری طرف سے جیری کے ان پرانے اسٹائل اور ہیلو ہائے کی توقع کر رہی تھی جیری کے منہ سے السلام علیکم سن کر بے ساختہ ہی چونکی تھی۔

''وعلیکم السلام! حیری کہاں تھے تم؟ اتنے مہینے ہو گئے ہیں، تمہاری کہیں سے کوئی خبر ہی نہیں مل رہی تم نے کوئی کانٹیکٹ ہی نہیں کیا؟ کہاں چلے گئے تھے آخر؟'' مدیحہ سلام کا جواب دینے کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔

''میں مری چلا گیا تھا۔'' حیری نے اب بھی کافی سکون سے ہی جواب سے نوازا تھا۔

''مری! کیا مطلب؟ تم ابھی تک پاکستان میں ہی ہے؟'' مدیحہ کو سن کر شاک لگا تھا۔

''ہاں..... میں پاکستان میں ہی تھا، جب میں پاکستان سے کچھ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا تو حاصل کیے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟'' اس کی لینگویج انگلش سے اردو میں ڈھل چکی تھی۔ اور مدیحہ کو مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''واٹ ڈو یو مین حیری! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' مدیحہ کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ پائی تھی۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، تمہیں سب پتا چل جائے گا، بس ایک بار تم مجھ سے ملو تو سہی۔''

حیری ملنے پہ زور دے رہا تھا اور مدیحہ چند لمحے کے لیے چپ سی ہو گئی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

''حیری! ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں تم سے یہ بتاؤ کہ ملو گے کہاں؟''

مدیحہ کافی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''وہیں..... اسی ہوٹل میں۔'' حیری بھی حد درجہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ مدیحہ کو بے چینی تو ہوئی لیکن پھر اپنا تجسس دبا گئی۔

''او کے..... ایک گھنٹے بعد میں تمہیں وہیں ملتی ہوں۔'' مدیحہ نے کال بند کرنا چاہی۔

''اللہ حافظ۔'' حیری نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور مدیحہ اپنے موبائل کو دیکھتی رہ گئی۔

''اللہ حافظ۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔ لیکن ایک حتمی نتیجہ پھر بھی اخذ نہیں کر سکی کیونکہ وہ بس چونک رہی تھی، ٹھٹک رہی تھی مگر اپنے خیالات پہ یقین کی مہر نہیں لگا رہی تھی۔

♥

رات گزر چکی تھی، صبح کا سورج اپنی کرنیں پوری طرح سے پھیلا چکا تھا۔

علیزے کے گھر والے اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں پوری رات آنکھوں میں بسر کر چکے تھے لیکن وہ تھی کہ ہوش ہی نہیں پڑی تھی اور ڈاکٹرز ابھی بھی اس کی زندگی سے مایوس نظر آتے تھے اور دل آور مسلسل سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''دل آور ے! ناشتہ کر لو..... پلیز..... تم نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' عبداللہ نے قریب آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کر لوں گا ناشتہ بھی ناشتہ کیے بغیر مر نہیں جاؤں گا۔ علیزے زندہ ہے تو سمجھ لو کہ دل آور شاہ بھی زندہ ہے۔'' وہ عبداللہ کو تسلی دے کر آگے بڑھا مگر عبداللہ کی آواز نے اسے روک دیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' عبداللہ کھٹک گیا تھا۔

''گھر.....'' اس نے بے حد آہستگی سے جواب دیا تھا۔

''گھر..... مگر کیوں؟'' عبداللہ کو حیرت ہوئی۔

''کیونکہ میں نے کورٹ جانا ہے۔'' اس کا لہجہ انتہائی سرد و سپاٹ سا ہو رہا تھا۔ عبداللہ کے اعصاب جھنجھنا اٹھے اس نے یکدم کرنٹ کھا کے دل آور کی طرف دیکھا تھا۔

''کورٹ..... مگر دل آور ے! تمہاری اپنی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو تم۔'' عبداللہ کو اس کی طرف سے فکر ہوئی تھی لیکن دل آور کو اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔

''میرا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، اب مجھے ان کی طرف سے کوئی ڈر، کوئی خوف نہیں ہے، میں نے انصاف کی یہ جنگ لڑنی ہے اور ہر حال میں لڑنی ہے۔ اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے پروا نہیں۔'' وہ کہہ کر ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم سے باہر نکل گیا اور عبداللہ کے ساتھ ساتھ آذر، دانیال، عائشہ آفندی اور آسیہ آفندی سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ ایس پی کامران مہدی اور انسپکٹر شہباز نے اس کے لیے تھی ہائٹ سیکیورٹی کا انتظام کر رکھا ہے۔

ہسپتال سے لے کر اس کے گھر تک اور اس کے گھر سے ہائی کورٹ تک وہ سیکیورٹی کے گھیرے میں تھا۔ اسی لیے وہ ہسپتال کی

اس اور پُرعزم طریقے سے اپنے وقت پہ ہائی کورٹ پہنچ گیا تھا۔

♥

اس نے اپنے بیڈروم سے نکلنے سے پہلے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے دراز سے جیری کی دی ہوئی انگوٹھی والی ڈبیا نکال کر اپنے بیگ میں رکھی اور اپنا سیل فون اُٹھا کر بیڈروم سے باہر نکل آئی۔

"مدیحہ! کہاں جا رہی ہیں آپ؟" مومنہ بچن سے نکل کر فائزہ بیگم کے بیڈروم میں جا رہی تھی، جب مدیحہ کو دیکھ کر اس نے اختیاری پوچھ لیا تھا۔

"میں اپنے ایک فرینڈ سے ملنے کے لیے جا رہی ہوں کیوں خیریت؟ کوئی کام ہے آپ کو۔" مدیحہ جاتے جاتے رُک گئی تھی۔

"نن..... نہیں..... مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔" مومنہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا تھا۔

"آپ کو پتا ہے آج سے کچھ عرصہ پہلے جب آپ نئی نئی اس گھر میں آئی تھیں تو ایک روز آپ نے اسی طرح مجھے روک کر مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور میرے پوچھنے پہ آپ نے یہی کہا تھا کہ آپ کو کوئی کام نہیں ہے۔ آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے بھلا اور مجھے اس بات پہ حیرت ہوتی ہے کہ آپ کو کوئی کام کیسے نہیں ہو سکتا؟ آپ بھی انسان ہیں آخر۔ آپ کی بھی ضروریات ہوں گی۔ آپ کی بھی خواہشات ہوں گی۔ لیکن آپ کہتی کیوں نہیں ہیں؟" مدیحہ کو مومنہ کی چپ اچھی نہیں لگتی تھی۔ اسی لیے وہ آج بول ہی پڑی تھی۔

"لیکن مدیحہ! مجھے ضرورت ہوگی تو میں کہوں گی نا؟" مومنہ آہستگی سے مسکرائی۔

"ضرورت سب کو ہوتی ہے اور ضرورت ہر چیز کی ہوتی ہے۔ اینی وے کل آپ تیار رہیے گا۔ میں آپ کو اپنے ساتھ شاپنگ پہ لے کر جاؤں گی اور اپنی پسند سے شاپنگ کرواؤں گی کیونکہ آپ کو چاہے احساس ہو یا نہ ہو لیکن مجھے احساس ضرور ہے کہ آپ کی بہت سی ضروریات ہیں، جو لازمی پوری ہونی چاہئیں۔ میں بھائی سے بھی بات کروں گی، لیکن ابھی میں جلدی میں ہوں۔ ابھی مجھے کہیں جانا ہے اور کے بائے۔"

مدیحہ کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی پلٹ گئی تھی لیکن کچھ یاد آنے پر فوراً رُک بھی گئی تھی۔

"نیل بھائی....." اس نے مومنہ کو بے ساختہ اس کے رشتے سے پکارا اور مومنہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی وہ بھلا اپنے آپ کو اس کا نیل کہاں سمجھتی تھی۔

"جی....." اس نے بمشکل ہی کہا تھا۔

"میں آپ کو اپنے پارلر لے کر بھی جاؤں گی۔ میرے بھائی کو ایک فریش فیس نظر آنا چاہیے۔" مدیحہ کے اس نئے آئیڈیے پہ مومنہ قدرے جھینپ گئی۔

"نہیں..... اسے پارلر لے کر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔" نیل پیاریاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔

"نو تھینکس..... آپ اپنے خیالات اپنے تک ہی رکھیں۔ میں انہیں ضرور لے کر جاؤں گی۔" مدیحہ نے ضد کی اور نیل نے سر جھٹک دیا۔

"اوکے یہ بات تو بعد کی ہے۔ فی الحال ہم کورٹ جا رہے ہیں۔ دل آور بھی کورٹ پہنچ چکا ہے۔" نیل نے گھڑی دیکھی تھی۔

"کورٹ..... مگر کیوں؟" مومنہ یکدم سہم گئی تھی۔

"آج ملک حق نواز کے کیس کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ آج فیصلہ سنایا جائے گا۔ آج اس کی سزا کا حکم جاری ہوگا۔" نیل کا لہجہ پُریقین تھا۔

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ وہ بری بھی ہو سکتا ہے نا؟ اس کی ضمانت بھی تو ہو سکتی ہے نا؟" مومنہ اندر سے خوفزدہ ہو چکی تھی اور نیل اس کا خوف بھانپ گیا تھا۔

"مجھے اللہ تعالیٰ کے انصاف پہ اور دل آور کی صلاحیت اور اس کی محنت پر پورا یقین ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور انصاف کرے گا اور دل آور کی محنت اور کوششوں کا صلہ ضرور دے گا۔ آپ بھی اللہ پہ بھروسہ رکھیں اور میرے ساتھ کورٹ چلیں۔ میں باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ آپ چادر لے کر آ جائیں کہیں لیٹ نہ ہو جائیں۔" نیل کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور مومنہ بے بسی سے

مدیحہ کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ مدیحہ نے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تھی۔

''ڈونٹ وری بھابی! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری اب بھائی پہ ہے۔ وہ میں نا پریشان ہونے کے لیے اور وہاں تو دل آور بھائی بھی ہوں گے۔ سیکیورٹی بھی ہوگی۔ پلیز آپ بے فکر ہو جائیں اور گھوم جانے کی تیاری کریں۔ بھائی آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔''

مدیحہ کی تسلی پہ مومنہ نے بمشکل اپنی ہمت مجتمع کی تھی اور فائزہ بیگم سے اجازت لے کر چادر اوڑھتی ہوئی باہر چلی گئی تھی اور ان کے پیچھے مدیحہ بھی اپنی گاڑی نکال لے گئی تھی۔

♥

الف اللہ نال ربا دل میرا
مینوں ''ب'' دی خبر نہ کائی
''ب'' پڑھیوں حد یاں مینوں سمجھ نہ آوے
لذت ''الف'' دی آئی
''ع'' دتے ''غ'' وافرق نہ جاناں
ایہہ گل ''الف'' سمجھائی
بلھیا قول ''الف'' دے پورے
جیہڑے دل کی کرن صفائی

''میرا نام اب محمد جہاں زیب ہے۔ میرا مذہب اب اسلام ہے۔ میرا ملک اب پاکستان ہے۔ مجھے عشق اب اس کی پاک ذات سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور مجھے سیدھی راہ دکھائی۔ مگر میں احسان مند ہوں تمہارا جس کی وجہ سے آج ''جیہڑی'' نہیں۔ ''محمد جہاں زیب'' ہونے کا اعزاز پا چکا ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس لڑکی کا جس نے مجھے ایک انسان سے ایک مسلمان ہونے کا فرق سمجھایا اور میرا ساتھ دیا۔ مجھے جنت اور دوزخ کی تمیز سکھائی اور مجھ جیسے بُرے اور بد انسان کو کلمہ پڑھا کر پاک کر دیا اور میرے اپنے ہی ضمیر کے سامنے معتبر بھی بنا دیا ہے مجھے۔''

وہ بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی اور جیسے جیسے سن رہی تھی اس کے چودہ طبق روشن ہوتے جا رہے تھے۔ اپنے گھر سے تو وہ جیہڑی سے ملنے کے لیے نکلی تھی، لیکن ملاقات محمد جہاں زیب سے ہو گئی تھی۔ جس سے ملنے کے بعد وہ مسلسل حیرتوں کی زد میں تھی۔

''کیا بات ہے مدیحہ! کیا تمہیں یہ سب جان کر خوشی نہیں ہوئی؟'' اس نے گم سم سی بیٹھی مدیحہ کو خود ہی متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''جیہڑی! مجھے خوشی.....'' مدیحہ کچھ کہتے کہتے یکدم رُک گئی اور وہ اس کے چپ ہو جانے پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کیوں چپ ہوئی ہے۔

''اٹس اوکے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے میرا نام اس لیے محمد جہاں زیب رکھا ہے کہ جیہڑی کہنے والوں کو کوئی پرابلم نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود میں یہی چاہتا ہوں کہ سب مجھے محمد جہاں زیب کہہ کر ہی مخاطب کریں۔ جیہڑی میں کچھ نہیں رکھا لیکن محمد بہت کچھ ہے۔ بہت میٹھا نام ہے یہ۔ صرف نام لینے سے ہی منہ میں لذت آ جاتی ہے۔ اک مٹھاس سی ہے اس نام میں۔''

وہ بہت عقیدت اور بہت محبت سے اپنی فیلنگز بیان کر رہا تھا اور مدیحہ محض سر جھکائے رہ گئی تھی۔

''خیر..... اب بولو..... کیا کہنے والی تھیں تم؟ میں نے تمہاری بات ٹوک دی۔''

اس نے مدیحہ کو دوبارہ سے بات کرنے پہ اُکسایا تھا۔

''محمد جہاں زیب میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھے خوشی ہوئی ہے اور بہت زیادہ ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ افسوس بھی ہو رہا ہے کہ یہ کام اللہ نے میرے نصیب میں نہیں لکھا اور اس لڑکی پہ رشک آ رہا ہے جس کے نصیب میں اللہ نے بہت نیک کام کی سعادت لکھ دی۔ اور میری نظر میں وہ لڑکی بہت ہی خوش نصیب ہے محمد جہاں زیب اور اللہ اسے ہمیشہ خوش نصیب ہی رکھے، آمین۔'' مدیحہ نے صدق دل سے دعا کی تھی اور اپنے دل سے اک بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

...وہ خوش نصیب ہی نہیں، بہت اچھی بھی ہے۔ اتنی اچھی کہ اللہ سے پہلی دعا اسی کے لیے کی ہے اسی کو مانگا ہے اور مجھے اللہ پہ ...پورا بھروسہ کہ وہ میری پہلی دعا کبھی بھی رد نہیں کرے گا۔" محمد جہاں زیب کے لہجے میں ایک بھرپور یقین تھا اور مدیحہ اس ...لیکن پھر ذرا توقف سے کچھ خیال آنے پہ اس نے آہستگی سے محمد جہاں زیب کو مخاطب کیا۔ "کیا نام پوچھ سکتی ہوں اس خوش ...کا؟" اس نے کسی اور ہی خیال کے تحت پوچھا تھا۔

"ہوں..... کیوں نہیں..... فاطمہ نام ہے اس کا..... فاطمہ بدر....." محمد جہاں زیب اس کا نام لیتے ہوئے بھی جیسے خوش ہو رہا ...تھا۔

"ہوں..... بہت پیارا نام ہے..... بہت خوبصورت بھی۔" مدیحہ نے تعریف کو سراہا تھا اور وہ اس کے سراہنے پہ بے ساختہ مسکرا ...دیا۔

"تھینک یو....." اس نے باقاعدہ شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ بھی یوں جیسے مدیحہ نے اس کی تعریف کی ہو یا اسے سراہا ہو۔

"تھینکس کی ضرورت نہیں ہے، ہاں البتہ اسے اس چیز کی ضرور، ضرورت ہے، یہ اس کی امانت ہے۔ تم اسے دے دو۔" مدیحہ نے اپنے بیگ سے وہ مخملی سی ڈبیا نکال کر محمد جہاں زیب کی طرف بڑھا دی تھی اور اس نے بے ساختہ مدیحہ کے چہرے کی طرف دیکھا ...تھا۔

"نہیں محمد جہاں زیب! تم یہ مت سمجھو کہ میں نے یہ رنگ واپس کرنے کا فیصلہ ابھی کیا ہے، حالانکہ تم نے جب مجھے یہ رنگ دیا تھا تم نے کہا تھا کہ تم جب واپس لوٹاؤ گی تو میں تم سے وجہ نہیں پوچھوں گا لیکن تمہارے بغیر پوچھے بھی میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ ...میں رنگ اس لیے لوٹا رہی ہوں کہ مجھے اس سے کئی گنا زیادہ قیمتی ہیرا مل چکا ہے۔ بلکہ مجھے اس کو قیمتی نہیں انمول کہنا چاہیے جن کی ...قیمت ہی نہیں ہے، جو میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، سب سے الگ ہے، میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔ اس سارے قصے ...میں اس نتیجے پہ ضرور پہنچتی ہوں کہ انسان کسی سے کم نہیں ہوتا کبھی کسی دکان پہ کھو جائے کہ کر واپس لوٹا دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی ...کسی دکان پر کھرا سمجھ کر پاس رکھ لیا جاتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرنے والی نظر الگ الگ ہوتی ہے۔ ...میں نے تمہیں کھوٹا سمجھ کر واپس لوٹا دیا اور فاطمہ بدر نے تمہیں کھرا سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ شاید اس لیے کہ اسے تم جیسے سکے کا انتظار ...تھا مجھے عمر جیسے سکے کی تلاش تھی اور زندگی کے اس موڑ پہ دونوں کا انتظار اور دونوں کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ وہ اپنے سکے کو پا ...گئی ہے اور میں اپنے سکے کو حاصل کر کے خوش ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس رب کی جس نے کسی کو بھی مایوس نہیں کیا اور کسی ...کو بھی خوش ہونے دیا۔" مدیحہ کی آواز بھرا گئی تھی اور محمد جہاں زیب نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان ...کے بیچ کوئی بوجھ نہیں رہن

PRIME URDU NOVELS

مدیحہ نے بہت اچھے طریقے سے اپنی فیلنگز کا اظہار کیا تھا جس پہ فاطمہ بھی بہت خوش ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بات چیت کے بعد ان دونوں سے اجازت چاہی تھی۔

"ارے..... اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں آپ؟ ابھی بیٹھیں میں تو محمد جہاں زیب کو یہ گڈ نیوز دینے کے لیے آئی تھی کہ ممانا پاپا شادی کے لیے مان گئے ہیں اور انہوں نے آج اسے ملنے کے لیے اسے ہمارے گھر بلایا ہے۔ اس لیے میں اسے سرپرائز پہ انوائیٹ کرنے کے لیے آئی ہوں۔" فاطمہ نے مدیحہ کو روکنے کے ساتھ ساتھ محمد جہاں زیب کو اک نئی اطلاع دی تھی جسے سن کر محمد جہاں زیب تو خوش ہوا ہی تھا لیکن مدیحہ بھی اطلاع پہ بے پناہ خوش ہوئی تھی۔

"ارے واہ..... پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ دونوں کو....." مدیحہ نے کھل کے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"نو..... صرف مبارک ہی نہیں چلے گی۔ تمہیں اس سارے سلسلے میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میری شادی میں میری مدد کرنی ہوگی ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔"

محمد جہاں زیب نے مدیحہ سے اس کی مدد چاہی تھی اور مدیحہ نے اس کام کے لیے فوراً ہامی بھر لی۔ "جسے مخصوص ہے تمہاری شادی کی تمام تیاری اور تمام ذمہ داری میری لیکن ابھی اس وقت مجھے اجازت چاہیے آپ لوگ بیٹھیں..... بات کریں..... اور انجوائے کریں..... گڈ بائے۔" مدیحہ ان سے اجازت لے کر محمد جہاں زیب کے روم سے نکل آئی تھی۔

نجانے کیوں اسے اس وقت عدیل سے ملنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ لیکن اندر سے وہ محمد جہاں زیب اور فاطمہ کے لیے بھی بہت خوش تھی۔

اسے حقیقتاً شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس انتہائی سادہ سے انداز والی فاطمہ بہت پسند آئی تھی۔ مگر اسے یہ انداز نہیں تھا کہ یہی انتہائی سادہ سی نظر آنے والی فاطمہ بھی بہت ہی ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی ہوا کرتی تھی۔ مگر اللہ نے اس کے قدم سیدھی راہ کی طرف موڑ کر اسے بہت ہی سادہ، نرم دل، خوش اخلاق اور باحیا لڑکی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

♥

"مبارک ہو سر! بہت بہت مبارک ہو۔ ہمیں شروع سے ہی امید تھی کہ یہ کیس آپ کے ہی حق میں جائے گا۔" ایڈووکیٹ اویس اختر نے عدالت سے باہر نکلتے ہی دل آور سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے مبارکباد پیش کی تھی۔

"تھینک یو..... تھینک یو سو مچ۔" دل آور تمام کاغذی کارروائی نبٹا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ اسے سنگ حق نواز کی سزائے موت کا حکم سن کر بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اس وقت اس کے ذہن پہ علیزے کی بیہوشی کا غم سوار تھا اور اسے ہاسپٹل پہنچنے کی جلدی تھی اور اس عجلت میں وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی گاڑی کے قریب آ گیا تھا۔

"مبارک ہو بیرسٹر صاحب! کہاں جا رہے ہیں۔" ایس پی کامران مہدی بھی کافی خوشگوار موڈ کے ساتھ اس کے قریب آیا تھا۔

"ہاسپٹل....." اس نے کافی مختصر جواب دیا تھا۔

"ہاسپٹل..... مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟" ان دونوں کے پیچھے آنے والا نبیل بھی وہیں ان کے پاس ہی رک گیا اور اس کے ساتھ چادر میں لپٹی ہوئی مومنہ بی بی کو بھی رکنا پڑا۔

"ارے..... آپ کو نہیں پتا؟ کل صبح مسز علیزے شاہ، ملک حق نواز کی طرف سے کروائے گئے حملے میں شدید زخمی ہوئی ہیں۔ دو گولیاں لگی تھیں جنہیں آپریشن سے نکال لیا گیا ہے لیکن وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئیں۔" ایس پی کامران مہدی نے حیرت سے نبیل حیات کی طرف دیکھا تھا کہ وہ ابھی تک انجان ہے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اتنا سنگین مسئلہ ہو گیا ہے اور مجھے خبر ہی نہیں کسی نے بتایا ہی نہیں؟" نبیل کو حقیقتاً بہت بڑا شاک لگا تھا اور مومنہ کے تو قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"اسی لیے تو نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو گے اور تمہارے ساتھ ساتھ بھابی کو بھی پریشانی اٹھانا پڑے گی؟" دل آور نے سرسری سا جواز پیش کیا تھا۔

تیری بات نہیں ہے دل آور ہے! تم نے مجھے سچ مچ خود سے الگ کر دیا ہے۔ غیر بنا دیا ہے مجھے اسی لیے..... اسی لیے نہیں ہیں تو ہنوز دکھ اور شاک کی سی کیفیت میں تھا۔

ٹھیک ہے..... تم یونہی سمجھ لو..... لیکن میں اس وقت مزید کوئی بھی صفائی پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مجھے اس جہاں میں ہاسپٹل پہنچنا ہے۔"

دل آور کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا اور پھر بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

"لیکن پلیز..... میری آپ سب سے ریکویسٹ ہے کہ میری علیزے کے لیے دعا ضرور کریں صرف یہ دعا کہ وہ بچ جائے، وہ میرے لیے، میری خاطر۔"

دل آور کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی نکال لے گیا تھا۔

جبکہ نبیل اور مومنہ وہیں کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے تھے، ایس پی کامران مہدی تو ان کی باتوں کے دوران ہی اپنی ایک کال سننے کے لیے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

♥

وہ بہت ہی رش ڈرائیو کر کے ہاسپٹل پہنچا تھا لیکن ہاسپٹل کے سامنے پہنچ کر اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ..... یہ تو وہی ہاسپٹل ہے جہاں زری ایڈمٹ تھی؟ تو کیا میں علیزے کو بھی وہیں لے آیا؟"

"اف..... تو اس لیے عبداللہ پہلے سے ہی وہیں تھا؟ اوہ نو یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟"

دل آور نے اپنے آپ کو بے طرح سے کوسا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا بھلا جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا اب اس طرح پریشان ہونے سے اور اپنے آپ کو کوسنے سے کیا حاصل تھا۔ اسی لیے وہ مجبوراً اپنے پچھتاوے کو کنٹرول کرتا ہوا گاڑی سے اتر آیا تھا۔

اور اس کے پیچھے ہی نبیل کی گاڑی بھی آ رکی تھی۔ وہ خود کو دل آور کی مصیبت اور پریشانی سے دور نہیں رکھ سکا تھا لیکن ہاسپٹل پہنچ کر اسے بھی اس احساس نے گھیرے میں لیا تھا جس احساس کی لپیٹ میں خود دل آور شاہ بھی آ چکا تھا۔

لیکن اس وقت اس کے لیے پوری دنیا سے زیادہ اہم صرف علیزے شاہ تھی اور وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا اور اسی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

جبھی سارے احساسات کو جھٹک کر اندر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" آسیہ آفندی اور دانیال کے علاوہ کسی نے بھی سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔

"کیسی ہے وہ؟" اس نے آذر جودت اور اسرار آفندی وغیرہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے آسیہ آفندی کو ہی مخاطب کیا جو مسلسل کوئی ورد پڑھ رہی تھیں۔

"اسی حال میں ہے جس حال میں چھوڑ کر گئے ہو۔" وہ کہتے ہوئے پھر سے روہانسی ہو گئیں اور ان کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"ڈاکٹرز نے وزٹ کیا؟" اب کی بار دانیال سے سوال کیا گیا تھا۔

"جی ہاں..... کیا ہے اور مزید آدھا گھنٹہ ویٹ کرنے کا کہا ہے۔ اگر وہ آدھے گھنٹے تک ہوش میں نہ آئی تو خطرہ بڑھ بھی سکتا ہے۔" دانیال نے بہت ہی نارمل طریقے سے اسے جواب دیا تھا۔

"سر..... سر! مبارک ہو آپ کو، آپ کی مسز ہوش میں آ گئی ہیں۔"

دانیال کی بات ابھی ختم ہوئی ہی تھی کہ اچانک نرس بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی اس اطلاع پہ وہاں موجود تمام افراد کے وجود میں جیسے روح پھونک دی گئی تھی۔

"سچ..... علیزے ہوش میں آ گئی ہے؟" آسیہ آفندی فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور پھر تقریباً سبھی وہاں سے بھاگتے ہوئے باہر نکلے تھے۔

لیکن ڈاکٹر نے سبھی کو ملنے سے روک دیا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ایک گھنٹے تک وہ مکمل طور پہ ہوش میں آ جائے گی اور اسے

آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔

تب ان سب کو دوبارہ انتظار کرنا پڑا جبکہ دل آور جو پہلے ہی باوضو ہو کر کورٹ میں کیس لڑنے گیا تھا۔ علیزے کے ہوش میں آنے کی اطلاع سنتے ہی وہ وہیں ہاسپٹل کے روم میں بچھے ایک جائے نماز پہ سجدہ ریز ہو گیا اور شکرانے کے نفل ادا کیے۔

"دل آور ے۔" نبیل کے ساتھ عبداللہ اچانک اس روم میں داخل ہوا تھا مگر سامنے سجدے میں جھکے اور شکرانے کی حالت میں موجود دل آور شاہ کو دیکھ کر ان دونوں کے ہی قدم اپنی اپنی جگہ پہ جم سے گئے اور ان دونوں نے ہی بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اور انہیں اس لمحے اپنی نظروں کے سامنے دل آور شاہ نہیں بلکہ اس کی محبت خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئی دکھائی دی تھی اور اس کا دل انہیں جائے نماز کی طرح بچھا ہوا نظر آیا تھا۔

"ماشاءاللہ..... مبارک ہو..... علیزے بھابی ہوش میں آ گئی ہیں۔" سلام پھیرنے کے بعد وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا کہ نبیل بے ساختہ چیخ میں ہی بول پڑا اور دل آور اس کی شرارت سمجھ گیا کہ وہ اسے چھیڑنے کے لیے بولا ہے۔

اسی لیے دل آور دعا مانگنے کے فوراً بعد ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف پلٹا تھا۔

"خیر مبارک....." وہ کہتے ہوئے ان دونوں کے قریب آ گیا تھا۔

"اتنا پیار کرتے ہو علیزے بھابی سے؟" نبیل جان بوجھ کر ماحول کی سنجیدگی اور اداسی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب تو مجھے خود بھی نہیں پتا کہ کتنا پیار کرتا ہوں اس سے؟ لیکن اتنا احساس ہو رہا ہے کہ جتنا تم سے کرتا ہوں، اس سے بھی کئی گنا زیادہ پیار علیزے سے کرتا ہوں۔"

دل آور نے اعتراف کیا تھا اور نبیل نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا اور عبداللہ نے ان دونوں کے کندھے تھپکے تھے۔

"یعنی علیزے بھابی کو میرا رقیب بنا دیا ہے تم نے؟" نبیل مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔" دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

"ویسے یار! تمہارے سسرال والے بہت عجیب سے لگے ہیں مجھے..... کسی کا بھی موڈ سیدھا نہیں ہے ایک دوسرے سے ہی خفا خفا سے لگ رہے ہیں۔ یہ کن لوگوں میں شادی کر لی ہے تم نے؟"

نبیل نے بہت ہی رازدارانہ انداز اپناتے ہوئے دل آور سے سوال کیا تھا جبکہ دوسری طرف عبداللہ نے گلا کھنکھارتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کی سسرال کے بارے میں ذرا انڈر کنٹرول رہ کر بات کرنا کیونکہ اس کی سسرال میری پھوپھی کا گھر ہے۔ علیزے کوئی غیر نہیں میری کزن ہے۔ پھوپھی زاد بہن ہے میری اور میرے چچا ملک وجاہت علی کی فیملی بھی ساتھ ہی ہے۔"

عبداللہ نے نبیل پہ اک نیا دھماکہ کیا تھا اور نبیل اپنی جگہ پہ حیران رہ گیا۔

"ہیں..... یہ کیا چکر ہے بھلا؟" اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔

"بس یار! یہ اور کچھ نہیں..... قسمت کا چکر ہے۔" عبداللہ نے کندھے اچکائے تھے۔

"تو کیا پہلے پتا نہیں تھا اس چکر کا.....؟" نبیل کی حیرانی ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"نہیں..... بس آج ایک دوسرے سے تعارف ہوا ہے تو پتا چلا ہے یہ شاید پہلے بھی وقار آفندی کا یا بڑی حویلی کا نام لے لیتا تو میں پہچان جاتا مگر ہمارے درمیان کبھی اس ٹاپک پہ بات ہی نہیں ہوئی تو پھر پتا کیسے چل سکتا تھا؟"

"تو اب وہ لوگ کیسے مان گئے؟ اس نے تو علیزے بھابی سے لو میرج کی تھی نا۔"

نبیل مارے حیرت کے سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

"علیزے کو بلڈ کی ضرورت تھی، اس لیے دل آور ے کو ان کی فیملی کے پاس جانا پڑا۔"

اس کے سارے سوالوں کے جواب عبداللہ دے رہا تھا اور دل آور چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

کو ..... تو یہ ماجرا ہے؟" اب نبیل کے کچھ پلے پڑا تھا اور وہ سراثبات میں ہلانے لگا البتہ دل آور عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا

ٹھیک یو یار! تھینک یو ویری مچ ..... آج تم نے علیزے کو بلڈ ڈونیٹ کر کے مجھے اپنا مقروض کر لیا ہے، تمہارے اس خون کا قرض کبھی نہیں اُتار سکتا۔"

اس نے عبداللہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

نہیں یار! میرا تم پہ کوئی قرض نہیں ہے اور نہ ہی کوئی احسان ہے تم پہ بلکہ آج علیزے کو بلڈ ڈونیٹ کر کے میں نے تم پہ ثابت کیا ہے کہ علیزے میری بہن ہے۔ میرے لیے زری کی طرح ہی ہے اور اس کے ساتھ میرا پہلے بھی خون کا رشتہ تھا اور اب بھی یہی رشتہ ہے۔ اس لیے تم اب یہی سمجھنا کہ تمہاری شادی میری بہن سے ہوئی ہے۔ جس کا تم نے ہمیشہ ہمیشہ بہت خیال رکھنا اور محبت کرنی ہے اس سے۔" اگلا عبداللہ نے دل آور کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور نبیل قسمت کے اس ہیر پھیر کو دیکھتا رہ گیا

تم بہت اچھے ہو عبداللہ! میری سوچ سے بھی زیادہ اور میری دوستی سے بھی بڑھ کے۔" دل آور نے اسے بے ساختہ اپنے سے لگایا تھا۔

"جب تم سے دوستی ہوئی تھی تو کہا تھا نا کہ اس دوستی سے بڑھ کے کبھی کچھ بھی نہیں ہو گا؟ تو دیکھ لو آج واقعی اس دوستی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔" عبداللہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچتے ہوئے اس کے کندھے پہ تھپکی دی اور پھر تینوں ہی مسکرا

تھے

تھے میں نرس دوبارہ اندر آ گئی اور ان تینوں کو روم سے باہر بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی علیزے کو لا کر روم میں شفٹ کر دیا گیا

علیزے ....." آسیہ آفندی کی آواز پہ علیزے نے بے ساختہ چونک کر دیکھا لیکن ان کے ساتھ ساتھ باقی سب کو دیکھ کر

ں آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

مما آپ؟" اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"جی میری جان! میں تمہاری مما ....." انہوں نے آگے بڑھ کے علیزے کا ماتھا چومتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا

"آذر بھائی! دانیال بھائی! عائشہ پھوپھو! اسرار انکل! آ ..... آپ ..... یہ سب ....."

علیزے کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ سب سے مل کر خوش ہو رہی تھی، سرشار ہو رہی تھی اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے تو جیسے کوئی گمشدہ دولت مل گئی تھی۔ لیکن ایک کمی پہ آ کر وہ بے ساختہ تڑپ سی گئی تھی۔

"پاپا ....." اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیٹا! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں علیزے جلدی سے ٹھیک ہو جائے پھر تم لوگ اسے گھر لے آنا۔" آسیہ آفندی علیزے کے بال سنوارتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن مما! پاپا ....." علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا رونا نہیں ہے۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہونا ہے پھر تمہارے پاپا بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ اسے بہلا پھسلا تسلیاں دے رہی تھیں لیکن علیزے کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ وقار آفندی کے لیے متفکر ہو رہی تھی۔

"دانیال بھائی! آپ بتائیں نا پاپا کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟" علیزے نے قریب کھڑے دانیال کو مخاطب کیا تھا۔

"گڑیا کی طبیعت خراب ہے علیزے! وہ یہاں نہیں آ سکتے لیکن بہت جلد ہم تمہیں ان کے پاس لے جائیں گے۔" دانیال نے اسے تسلی دی اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

پرامس ....." اس نے وعدہ لیا۔

گڑیا کے پرامس ....." دانیال کو وعدہ کرنا ہی پڑا تھا۔

''ثروت آنٹی کہاں ہیں؟ کومل آپی، حرمت آپی اور جودت بھائی بھی نہیں آئے۔ زین بھی نہیں ملا مجھ سے اور..... اور میرے عون اور عدید کہاں ہیں مما؟'' علیزے بڑے اشتیاق و بے قراری کے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور تقریباً سبھی کا ہی پوچھا تھا۔

اور علیزے کی اس لاپروائی، اس لاتعلقی اور اس اجنبیت پہ دل آور کا تھوڑی دیر پہلے خوشی کی لے پہ تھرکنے والا دل کسی طرح اُداس ہوا تھا اور ایک دم سے جیسے بجھ کے رہ گیا تھا۔

کیونکہ وہ اس کمرے میں ہونے کے باوجود بھی علیزے کو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

شاید اس لیے کہ آج اسے سب اپنے نظر آ رہے تھے اور ان سب اپنوں میں وہ اپنے آپ کو بہت اپنے کو بھول جنہی تھی، یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔

لیکن جو بھی تھا۔ مگر دل آور شاہ کا دل کر چی کر چی کر گیا تھا۔

وہ علیزے کی ذرا سی لاتعلقی اور ذرا سی لاپروائی بھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔ سہہ نہیں سکا تھا اسی لیے تو فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا اور اب کمرے میں یا علیزے تھی یا علیزے کے اپنے تھے..... اور بس.....

♥

''بھابی.....''

''ہوں۔''

''گھر چلیں۔'' اس نے بڑی معصومیت سے اور بڑی حسرت سے پوچھا تھا۔

''کیوں..... خیریت ہے؟'' نگارش اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے رُک گئی۔

''میں گھر جانا چاہتی ہوں بھابی! مجھے گھر لے چلیں پلیز..... مجھے گھر لے چلیں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں مجھے..... مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس کمرے سے..... پلیز خدا کے لیے مجھے گھر لے چلیں۔ میں اب اور یہاں نہیں رہ سکتی، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہاں سے لے چلیں۔''

زری التجائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی تھی اور نگارش اس کی ایسی بے بسی اور لاچارگی کیفیت پہ دنگ رہ گئی کہ زری اندر سے کتنی گھبرائی ہوئی اور ستائی ہوئی لگ رہی ہے۔ اتنی کہ وہ آخر نہیں سکی اور اپنی بے بسی اور اذیت بیان کر ڈالی ہے۔

''بھابی پلیز..... مجھے گھر لے چلیں۔'' اس نے بے چینی سے اور بے بسی سے کہتے ہوئے نگارش کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نگارش اپنے تعجب کے حصار سے نکل آئی تھی۔

''اوکے..... اوکے..... میں عبداللہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں گے تو پھر ہم تمہیں گھر لے چلیں گے ڈونٹ وری میری جان ڈونٹ وری۔'' نگارش نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا۔

''نہیں بھابی! ڈاکٹر اگر اجازت نہ بھی دیں تو بھی مجھے یہاں سے لے جائیں ورنہ..... ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا مر جاؤں گی میں۔'' زری کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا اور آنکھیں بھی پانیوں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔

''اوکے لے چلیں گے۔'' نگارش نے اسے ایک بھرپور تسلی دی تھی اور اتنے میں ڈاکٹرز اور ان کے ساتھ دو نرسیں بھی وزٹ پہ آ گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے عبداللہ بھی اندر چلا آیا تھا۔

''ہیلو مس زرین کیسی ہیں آپ؟'' ڈاکٹر سلطان نے کافی نرم اور فریش انداز میں اسے مخاطب کیا تھا، لیکن وہ نظریں چرا گئی تھی۔

''ہیلو مس زرین! کیا ہوا؟ کیا ناراض ہو گئی ہیں ہم سے؟ جواب بھی نہیں دے رہیں۔'' ڈاکٹر سلطان کافی خوش مزاج آدمی تھے اور زری جب سے ہوش میں آئی تھی وہ اس کے ساتھ بھی اسی طرح بہت فرینڈلی سے انداز میں پیش آتے تھے۔

''وہ آپ سے ناراض نہیں ہے، وہ اس ماحول سے اُکتا چکی ہے، گھر جانا چاہتی ہے۔''

زری کے بجائے نگارش نے ان کو جواب دیا تھا اور ڈاکٹر سلطان نے کافی اچنبھے سے زری کی طرف دیکھا تھا۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے مس زرین گویا آپ ہم لوگوں سے اُکتا چکی ہیں خیر کوئی بات نہیں اب ہم اتنے بھی بُرے نہیں ہیں کہ آپ کو زبردستی اس ہسپتال کا مہمان بنائے رکھیں گے۔'' ڈاکٹر سلطان..... زمصنفہ خنگی کا نات [illegible]

بوت کی طرف دیکھا تھا، بی پی نارمل تھا۔

ی مطلب؟" زری نے فوراً پوچھا۔

مطلب یہ کہ آپ ناراض نہ ہوں آپ کے کچھ ٹیسٹ باقی ہیں وہ ہو جائیں تو پھر آپ کو جانے کی اجازت ہے، ہم آپ کو ں گے۔" ڈاکٹر سلطان نے جیسے زری کی ڈوبتی نبضوں کو روانی بخش دی تھی اس نے بے اختیار ان کے چہرے کی طرف یقین بے یقین نظروں سے۔

آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟" زری نے بہت ہی اشتیاق سے پوچھا تھا۔

معاف کرے مس زرین میں جھوٹ کیوں بولوں گا بھلا؟" ڈاکٹر سلطان نے تعجب سے کہا اور زری ان کی طرف سے ایسی تسلی ملنے پہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

ہوں..... گڈ گرل بس اسی طرح ہنستی مسکراتی رہیں شاباش۔" ڈاکٹر سلطان نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے چند ٹیسٹ لکھ کر دیئے اور دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ روم سے باہر نکل گئے تھے۔

تعجب یو بھابی! اتھینک یو ویری مچ۔" زری نے ان کے جاتے ہی نگارش کا شکریہ ادا کیا اور اب کی بار نگارش مسکرائی تھی۔

ارے اس کام کے لیے تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ کام تو میں نے اپنے بھلے کے لیے کیا ہے۔ میں بھی اس ہسپتال اپنے خالی گھر سے اُکتا چکی ہوں کیوں عبداللہ آپ کا کیا خیال ہے؟" نگارش نے اپنے قریب کھڑے عبداللہ کو بھی اپنی گفتگو میں شامل کیا تھا۔

جی جناب تم دونوں سے زیادہ تو میں اُکتا چکا ہوں۔ جس کو دن رات بس یہی فکر ستائے رکھتی ہے کہ گھر جانا ہے۔ ہسپتال ہے گھر جانا ہے۔ ہسپتال جانا ہے۔"

عبداللہ کی بات پہ وہ دونوں ہی ہنس پڑی تھیں کیونکہ وہ بیچارا سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ اسی لیے زری کے ٹیسٹ کروانے میں عبداللہ نے زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔

♥

نبیل ہوسٹل کو گھر چھوڑ کر دوبارہ ہسپتال آیا تھا لیکن داخلی دروازہ عبور کر کے وہ راہداری کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے قدم رک گئے اسے ہسپتال کے بڑے اور کشادہ سے ویٹنگ روم میں کسی کا شک گزرا تھا اسی لیے وہ انہی قدموں پہ واپس پلٹا اور ویٹنگ روم میں جھانک کر دیکھا اس کے ذہن سے گزرنے والا شک یقین میں ڈھل گیا تھا اور وہ اس یقین پہ دل ہی دل میں جھنجھلا کر اندر آ کر اس کے بالکل برابر بیٹھ گیا تھا۔

حیرت..... یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" نبیل نے گردن موڑتے ہوئے اپنے برابر سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے دل آور کو بڑی سے مخاطب کیا لیکن اس کی طرف سے جواب ندارد۔

ہیلو..... مسٹر دل آور شاہ میں آپ سے مخاطب ہوں۔" اس نے اس کا پورا نام لیتے ہوئے اپنی بات پہ زور دیا جس پہ بیٹھے دل آور کو اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے مجبوراً اس کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔

جی..... کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" دل آور نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے پوچھا۔

یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" نبیل نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

کیا تھا، اس لیے یہاں آ کر بیٹھ گیا۔" اس کا جواب بہت نارمل اور بہت نپا تلا سا تھا۔

کیسے کیوں تھے علیزے بھابی کہاں ہیں؟" نبیل کھٹک گیا۔

انہوں کے ساتھ۔" اس کا دوسرا جواب پہلے سے بڑھ کے تھا۔

تو پھر تم کیا ہو؟" اس وقت نبیل اسے ٹٹول رہا تھا۔

ایک اجنبی۔" دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا جواب دے رہا ہے۔

میں تو سمجھا تھا کہ تم شوہر ہو؟" نبیل نے جان بوجھ کر اسے کریدا۔

لڑکیوں کے لیے شوہر سے زیادہ اجنبی اور کوئی نہیں ہوتا۔" دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنا تجربہ بیان کیا تھا۔

''وہ کیسے؟'' نبیل نے جاننا چاہا تھا۔

''وہ ایسے کہ بیویاں اپنے ماں باپ سے اپنے بہن بھائیوں سے اور اپنی دوستوں سے دل کی ہر بات شیئر کر لیتی ہیں، اپنا دُکھ رو لیتی ہیں، لیکن شوہر کے سامنے دل کی بات کو دل میں ہی رکھتی ہیں، شوہر چاہے جتنی بھی محبت کرے، بیوی خود بھی چاہے جتنی بھی محبت کرے مگر دل کی بات کو ہمیشہ دل کی بات ہی رکھتی ہے، شوہر تک نہیں جانے دیتی۔'' دل آور کے لفظوں میں اس کا بہت گہرا مشاہدہ بول رہا تھا۔

''تو کیا بیوی کبھی بھی شوہر سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی؟''

''کرتی ہے۔ ضرور کرتی ہے مگر اس اظہار کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرتی۔''

''یار! عجیب بات ہے میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا اپنی وے چھوڑ ان باتوں کو، آؤ علیزے بھابی سے مل لو۔'' نبیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابھی نہیں ابھی اسے اپنے گھر والوں سے مل لینے دو۔'' دل آور نے انکار کر دیا۔

''ارے چھوڑو یار! مل چکے ہیں وہ لوگ بھی اور کتنا ملنا ہے بھلا؟ اٹھو اب تم ملو جا کر ویسے بھی تمہارا ملنا اور ہے اور گھر والوں کا ملنا اور.....'' نبیل نے اسے وہاں سے اُٹھانے کی کوشش کی۔

''نبیل..... پلیز یار تنگ نہ کرو میں لوں گا بعد میں۔'' دل آور جھنجلا گیا تھا۔

''کیا بھابی کے ساتھ کوئی خفگی چل رہی ہے؟'' نبیل مسکرایا۔

''ہوں..... یہی سمجھ لو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ..... تو یہ مسئلہ ہے اس لیے روٹھے روٹھے سرکار نظر آتے ہیں چلو کوئی بات نہیں ہم صلح صفائی کروا دیتے ہیں، تم آؤ جی۔'' نبیل نے پھر اس کا کندھا تھپکا تھا۔

''نبیل! مجھے اکیلا چھوڑ دو جاؤ، عبداللہ کے پاس چلے جاؤ۔'' دل آور نے خفگی اور جھنجلاہٹ سے کہا۔ نبیل اسے ہر طرح سے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''نبیل ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ یار۔'' دل آور نے اسے گھورا تھا۔

''انڈر اسٹینڈ کر رہا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں آؤ میرے ساتھ آؤ، علیزے بھابی سے مل کر آتے ہیں۔'' نبیل نے بھی اپنی بات کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور دل آور نہ چاہتے ہوئے بھی ضبط کر گیا۔

''بہت ذلیل ہو تم۔'' دل آور بڑبڑاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور نبیل مسکرا دیا۔

''تھینک یو۔'' وہ اس نوازش پہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُٹھ کر اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔

''ایکسکیوزمی! کیا ہمیں بھی تھوڑی فرصت مل سکتی ہے یا نہیں؟'' نبیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دروازے پہ دستک دی تھی اور ان سب نے بے ساختہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''پلیز..... بس تھوڑی دیر۔'' نبیل کا اشارہ ان سب کو یہاں سے پیچھے کی طرف تھا جس کو کوئی اور تو نہ سمجھا لیکن آسیہ آفندی ضرور سمجھ گئی تھی۔

آخر ماں تھیں اور مائیں ہمیشہ ہر اولاد کو سب سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتی ہیں وہ بھی دل آور کی خاموشی اور بجھے ہوئے سر کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی تھیں اسی لیے انہوں نے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''دانیال بیٹا! آؤ ہم لوگ باہر چلتے ہیں، اتنی دیر میں وہ لوگ مل لیں۔'' آسیہ آفندی کہتی ہوئی خود بھی پلٹ گئی تھیں۔

''مما.....'' علیزے نے نجانے کس خدشے کے تحت انہیں بے اختیار پکارا تھا۔

''ڈونٹ وری علیزے! ہم یہیں ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتے ہیں۔'' دانیال نے اسے تسلی دی اور آذر وغیرہ کے ساتھ باہر نکل گیا اس لیے اب کمرے میں صرف وہ تینوں ہی رہ گئے تھے جس پہ نبیل نے گلا کھنکارتے ہوئے کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

''السلام علیکم بھابی! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' نبیل بیڈ کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"ہوں..... ٹھیک ہوں اب..... آپ کیسے ہیں؟" علیزے پہلی بار کسی کے منہ سے "بھابی" کا لفظ سن کر قدرے جھینپ گئی تھی

جس کی اس نے محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

"میں بھی اللہ کا شکر ہے کہ ٹھیک ہی ہوں، اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور پھر سے اپنی جنت بسا

لیں۔" نبیل کی شرارت پر علیزے نے بلا ارادہ ہی دل آور کی طرف دیکھا تھا اور اتفاقاً دل آور نے بھی عین اسی لمحے علیزے کی طرف

دیکھا تھا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ جنت بسانے سے پہلے آپ لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" نبیل مزید

شرارت والے انداز میں کہتا پلٹ گیا مگر دروازے کے قریب جا کر ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔

"اور ہاں بھابی! یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ چپ ہے تو اسے آپ کی تکلیف پہ کوئی دکھ نہیں ہے یہ بہت گہرا آدمی ہے، سمندر سے بھی

گہرا، اس کو سمجھنا ہے تو گہرائی میں اترنا سیکھیں ورنہ اس نے آپ کی زندگی کے لیے اللہ سے جتنی دعائیں مانگی ہیں اور شکرانے

کے بھی سجدے کیے ہیں وہ آپ کو کبھی بھی نظر نہیں آئیں گے اور کبھی بھی احساس نہیں ہوگا۔ اس لیے ایک بار پھر ایک بار میری

بات پہ غور ضرور کیجیے گا۔" نبیل علیزے کو آگاہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور علیزے اس کی بات پر غور کرتی اس کے پیچھے دیکھتی

رہی۔

لیکن چند سیکنڈ مسلسل خاموشی کے احساس نے اسے چونکا دیا تھا اور اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے دل آور کی سمت

نظر اٹھائی جو اسی پر نظر جمائے ہوئے کھڑا تھا۔

"کیسے ہو ڈرائیور؟" علیزے نے بڑے تحمل سے اس کا حال احوال پوچھا تھا جیسے ان کے تعلقات بڑے دوستانہ رہے ہوں۔

دل آور نے بے ساختہ سر اٹھا کر علیزے کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"میں نے تم سے تمہارا حال پوچھا ہے۔" علیزے نے اپنے سوال پہ زور دیا۔

"حال سے بے حال کر کے لوگ حال ہی پوچھا کرتے ہیں۔" دل آور ہلکے اور استہزائیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

"حال سے بے حال تو میں ہو گئی ہوں، دیکھ نہیں رہے۔" علیزے بے حد سنجیدگی سے اور مدھم آواز میں بول رہی تھی حالانکہ

درد نے اسے زیادہ بات کرنے سے منع کیا مگر وہ آج سب اپنوں کو دیکھ کر تکلیف کے باوجود بھی چپ نہیں ہو پا رہی تھی اس کا دل

چاہ رہا تھا کہ وہ بولتی رہے، بولتی رہے اور دل کے سارے غبار نکال دے۔

"دیکھ بھی رہا ہوں اور محسوس بھی کر رہا ہوں کہ کاش یہ تکلیف مجھے آئی ہوتی، کاش یہ گولیاں مجھے لگی ہوتیں کاش اس بستر پہ میں

ہوتا مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی تمہیں دیکھ کر ہو رہی ہے۔"

دل آور نے آگے بڑھ کے اس کے نازک سے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اپنے جذبات اور احساسات کی گرمی کا احساس دلایا

تھا۔

"لیکن میں اپنی اس تکلیف پہ بھی بہت خوش ہوں ڈرائیور کیونکہ مجھے اس تکلیف کے عوض میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی

اور سب سے بڑی دولت مل گئی ہے، میرے اپنے..... میرے گھر والے۔" علیزے نے بڑے دل سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"تمہاری زندگی اور تمہاری خوشی کے لیے ہی تو یہ بیالہ پیا ہے ورنہ ان حالات میں میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا

کیونکہ ایسا کرنے کے لیے کسی کے پاس اتنا حوصلہ ہی نہیں ہو سکتا۔" دل آور نے نفی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

"یہ سب کچھ کیا بھی تو تم نے تھا نا؟" علیزے شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

"یہ سب کچھ کیوں کیا میں نے، تم یہ نہیں جانتی نا جب جان جاؤ گی تو پھر تم سے پوچھوں گا کہ تم کیا کہتی ہو؟ اور تمہارا انصاف

کیا کہتا ہے؟"

دل آور کا لہجہ دھیما اور تلخ ہو چکا تھا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے نا لیکن فی الحال میں تمہاری بہت زیادہ شکر گزار ہوں اور تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم میری خاطر

یہاں تک آ گئے اور میرے گھر والوں کو لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے میں آج اپنی تکلیف بھی بھول گئی ہوں تھینک یو سو مچ ڈرائیور

تھینک یو سو مچ۔"

علیزے نے اپنی طرف سے اس کے احسان کا شکریہ ادا کیا تھا مگر نجانے کیوں دل آور کو یوں لگا جیسے علیزے نے اسے اپنے آپ سے الگ کر دیا ہو، اسے کھڑے کھڑے اجنبی اور غیر بنا دیا ہو۔

"میں نے یہ سب تمہارے اس شکریے کے لیے نہیں کیا علیزے! بلکہ میں نے یہ سب تمہارے لیے کیا ہے، صرف تمہارے لیے۔" دل آور نے اس کی ذات کے لیے زور دیا تھا۔

"میں نے شکریہ بھی تو اسی لیے ادا کیا ہے نا کہ تم میری خاطر میرے گھر گئے ہو۔"

"اس وقت تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتا تھا علیزے! کچھ بھی۔ چاہے مجھے تمہاری خاطر کسی کا قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔" دل آور کے اک اک لفظ میں شدت بول رہی تھی اور علیزے ٹھٹکنے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"کیوں..... میری خاطر کیوں؟ ہمارے درمیان تو ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے جس کے بل بوتے پہ تم کچھ بھی کر گزرو؟" علیزے نظر اٹھانے سے رہ نہیں سکی تھی۔

"کل تک میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں کوئی جذبہ ہی نہیں ہے لیکن جیسے ہی تم سے جدا ہونے کا خیال گزرا سمجھو روح پہ ایک عذاب گر رہا ہے۔ اک ایسا عذاب جس پہ جان لیوا ادراک ہوا کہ سارے جذبے ہمارے درمیان نہیں تو ہیں باقی ساری دنیا میں تو کچھ ہے ہی نہیں ساری دنیا جذبات سے عاری ہے سوائے ہمارے۔"

دل آور کے گمبھیر لہجے میں سچ مچ اس کے بوجھل بھیگے اور مہکتے ہوئے جذبات ہمک رہے تھے۔

"وہ نفرت کرنے والوں کے درمیان ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" علیزے اس کے جذبات سے انکاری تھی۔

"کل میں تمہارے لیے تڑپا ہوں نا تو مجھ پہ میرے جذبات کا ادراک ہو گیا ہے اب جب تم میرے لیے تڑپو گی تو تم پہ بھی تمہارے جذبات کا ادراک ہو جائے گا بس اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کب تڑپتی ہو میرے لیے کیونکہ تڑپ میں انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا کھل کے سامنے آ جاتا ہے۔ میں سب کے سامنے آ چکا ہوں اب تمہاری باری ہے۔"

دل آور نے چیلنج سے کہا اور تھوڑا سا علیزے کے اوپر جھک آیا جس پر علیزے قدرے سٹپٹا گئی۔

"ڈرائیور!" اس نے احتجاجاً اسے پکارا تھا کیونکہ ہاتھ پاؤں تو وہ ہلا ہی نہیں سکتی تھی۔

"آج تمہیں یہ بوسہ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں بوسہ دوں اور تمہیں اس سے احساس ہو کہ تم صرف میری ہو اور تم پہ صرف میرا حق ہے لیکن اس کے بعد اگلی بار یہ بوسہ تمہیں تب دوں گا کہ جب تمہارا دل چاہے گا کہ تمہارا ڈرائیور تمہیں بوسہ دے اور تمہیں احساس ہو کہ تم واقعی صرف میری ہو اور تم پہ صرف میرا حق ہے۔"

دل آور بہت بوجھل اور بھیگے سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ ذرا اور جھکا تھا اور علیزے مارے بے یقینی کے کل بھی نہیں سکی۔

"ڈ..... ڈرائیور۔" اس کے ہونٹ کپکپائے مگر دل آور نے اس کے ہونٹوں کو کپکپانے کے لیے بھی مہلت نہیں دی اور علیزے کے پورے ہوش و حواس سمیت اپنے ہونٹوں کی ایک بھرپور استحقاق آمیز مہر ثبت کر دی تھی اور علیزے کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ بے جان پڑی حق دق رہ گئی تھی کہ دل آور نے یہ کیا کر دیا ہے آخر۔

آج سے پہلے تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ تو پھر آج کیوں؟ وہ بھی اس حالت میں۔ اور اس بے باکی سے۔

علیزے سوچ سوچ کر پاگل نہ ہوتی تو اور کیا کرتی لیکن دل آور پیچھے ہٹتے ہوئے بہت مسرور نظر آیا۔ مگر علیزے تو اب کچھ کہنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔

"ایم سوری علیزے! میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں مگر نجانے کیوں آج خود یہ حرکت کرنے پہ مجبور ہو گیا ہوں، شاید اس لیے کہ مجھے تمہارے دور چلے جانے کا وہم ستا رہا ہے اور میں ایسی ویسی حرکتیں کر کے تمہیں یہ جتا رہا ہوں کہ اب تم پہ صرف میرا حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی نہیں، تم جہاں بھی ہو، جس حال میں بھی ہو، صرف میری ہو میری زندگی ہو میری جان ہو۔" دل آور اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اسے اپنے دل کے تمام اظہار بخش رہا تھا اور علیزے بڑے گم سم سے انداز میں سب سن رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی لیکن اس پہ عمل بھی کرے گی یا نہیں یہ پتا نہیں تھا۔

PRIME URDU NOVELS

"دیکھو علیزے! یہ تمہارے اور میرے رشتے کی آزمائش کا وقت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں اس رشتے کی آزمائش پہ پورے اتریں تم میرا ساتھ دو اور میں تمہارا ساتھ دوں کیونکہ زندگی کے اس موڑ پہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی ہی تو ضرورت ہے تم میری عزت اور میرا بھرم رکھنا ہے اور میں نے تمہاری عزت اور تمہارا بھرم رکھنا ہے کیونکہ یہی ہمارے رشتے کا تقاضا ہے اور یہی ہماری محبت ہے ورنہ سب کی نظروں میں نہ تمہارا کوئی مقام رہے گا اور نہ میرا اس لیے اگر معتبر رہنا چاہتی ہو تو خود کو مجھ سے الگ مت کرنا اور کبھی بھی جذباتی سوچ سوچنے سے پہلے مجھے اور میری ذات کو ضرور سوچ لینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہم دو نہیں ہیں بلکہ ایک ہیں اور ایک ہی رہنا چاہیے اور یہ بات میں تمہیں زندگی میں پہلی بار اور آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ اس کے بعد کبھی کچھ بھی نہیں سمجھاؤں گا اور نہ ہی یہ سمجھتا ہوں گا تمہیں خود ہی سمجھنا ہوگا بس یہ کوشش دوبارہ نہیں کروں گا کیونکہ میں واقعی زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں اس لیے اگر تم نے میری محبت کے اس نازک اور اہم موڑ پہ اب ہر فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" دل آور اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہہ رہا تھا اور علیزے اس کے چہرے کو دیکھتی اس کی باتوں پہ غور کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور ابھی ٹھیک سے غور بھی نہیں کر پائی تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

"اوکے..... میں ابھی چلتا ہوں تم اپنے گھر والوں سے مل اور خوش رہو لیکن ان کے درمیان یہ بھی یاد رکھو کہ تم میری بیوی ہو۔" دل آور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا اور علیزے نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آئی مس یو..... آئی رئیلی مس یو۔" دل آور کا علیزے کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور علیزے محض پلکیں جھکا کے رہ گئی۔

"مجھے تو شاید تم سے ملنے کا موقع ہی نہ ملتا اور نہ ہی میں خود کوشش کرتا مگر نبیل نے یہ کوشش کر کے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ تو میں اس کے بدلے اس کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔" دل آور کہتے ہوئے آہستگی سے مسکرایا تھا اور اتنے میں دوبارہ دستک ہوئی تھی دل آور اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

♥

"زری.....؟" اسے سہارا دے کر ابھی وہیں چیئر پہ بٹھایا ہی گیا تھا کہ اتنے میں آسیہ آفندی دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھیں اور زری نے بڑی اجنبی ہوئی نظروں سے ان کے چہرے کی سمت دیکھا مگر ذہن پہ زور ڈالنے کے باوجود بھی وہ اس آشنا سی صورت کو پہچان نہیں پائی تھی۔

"آسیہ پھوپو۔" عبداللہ نے آہستگی سے نام لیا اور زری کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تو اسی لیے اس ہسپتال سے دستبردار ہونا چاہ رہی تھی کہ اس کا کسی سے بھی سامنا نہ ہو اور وہ چپکے سے یہاں سے چلی جائے مگر آسیہ آفندی اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"زری! میری جان کیسی ہو؟ یہ..... یہ کس تکلیف کو جھیل رہی ہو تم؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" آسیہ آفندی نے آگے بڑھ کر زری کی پیشانی چوم لی تھی اور اس کے قریب بھیٹتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"شاید کسی گناہ کی سزا جھیل رہی ہوں۔" زری استہزائیہ سا بولی۔

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" آسیہ آفندی تڑپ گئی تھیں۔

"جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ کچھ گناہوں کی سزا انسان کو موت کے بعد ملتی ہے اور کچھ گناہوں کی سزا موت سے پہلے اس لیے ہی سمجھ لیں کہ میں موت سے پہلے گناہوں کی سزا جھیل رہی ہوں وہ بھی ایک ایسے گناہ کی سزا جس میں، میں خدا کے علاوہ کسی کو جانتی نہیں تھی سو مجھے سزا تو ملنی ہی تھی سنگین سزا۔" زری کا لہجہ انتہائی سخت ہو رہا تھا اور عبداللہ سر جھکا کر رہ گیا۔

"بیٹی وے آپ سنائیں علیزے کیسی ہے کچھ بہتر ہوئی؟" زری نے سر جھکا کر بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

"ہاں بیٹا! اللہ کا شکر ہے کہ وہ اب پہلے سے ٹھیک ہے کافی بہتر ہے اب ہم سب کو دیکھ کر تو وہ پہلے روز ہی ٹھیک ہو گئی تھی۔" آسیہ آفندی بیٹی کی محبت پہ مسکرائی تھیں۔

"اللہ اسے ہمیشہ ٹھیک رکھے، خوش رکھے، آباد رکھے، سدا سہاگن رہے آمین۔" زری نے علیزے کے لیے دعا کی تھی اور عبداللہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا اس نے چونک کر عبداللہ لب بھینچ کر رخ موڑ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے آنی! ہم لوگ چلتے ہیں آج ہم گھر جا رہے ہیں بہت عرصے بعد گھر میں قدم رکھنا نصیب ہوگا۔ ان شاء اللہ آپ سے بعد میں بات ہوگی۔'' ان دونوں کو گم سم دیکھ کر زری نے خود ہی بات سمیٹی تھی اور آسیہ آفندی سر ہلاتے ہوئے اک سایڈ پہ ہو گئی تھیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم لوگ جاؤ اب تم سے ملاقات تمہارے گھر پہ ہی ہوگی ہم سب آئیں گے تم سے ملنے کے لیے۔'' انہوں نے بہت نرمی اور شفقت سے اس کا سر تھپکا۔

''تھینک یو آنی!'' زری نے سر جھکا لیا اور پھر عبداللہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا ہسپتال کے روم سے باہر نکل آیا اور زری اس روم سے نکلتے ہوئے دعا کر رہی تھی کہ کاش میرا کسی سے بھی سامنا نہ ہو مگر دعا کبھی کبھی مستجاب نہیں بھی ہوتیں۔

ابھی وہ سیکنڈ فلور سے گراؤنڈ فلور پہ آئے ہی تھے کہ سامنے سے آتے نبیل حیات اور دل آور کے قدم وہیں کے وہیں جم گئے اور عبداللہ اور نگارش کے چہرے پہ بھی تاریکی کا اک سایہ سا گزرا تھا لیکن پھر بھی عبداللہ نے وہاں سے گزر جانا چاہا تاکہ زری کی صحت پہ کوئی برا اثر نہ پڑے یا پھر وہ دوبارہ وہ کسی صدمے کے حصار میں نہ آ جائے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا اب یہ زری، وہ زری نہیں رہی، اب اس زری کو اور اس دل کی محبت کو ہسپتال کے اسی بستر پر کوما میں چھوڑ کے جا رہی ہے جس بستر سے خود اٹھ کر آئی ہے۔ اب زندگی میں سب کے چہروں کے رنگ بدلیں گے صرف اس کے چہرے کا رنگ نہیں بدلے گا صرف ایک ہی رنگ رہے گا سکون کا رنگ، صبر کا رنگ اور بے خبری کا رنگ۔ جیسے اس وقت رہا اور اس نے عبداللہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

''ٹھہریں بھائی! کہاں جا رہے ہیں آپ؟ ان سے نہیں ملیں گے۔'' زری نے عبداللہ کو روکا۔

''زری! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔'' نگارش نے ایک کمزور سا بہانہ پیش کیا۔

''گھر میں کون سا میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہیں جن کی وجہ سے لیٹ ہونے کا ڈر ہوگا؟'' زری نے نگارش کا بہانہ ٹال دیا اور نگارش جز بز سی ہو گئی تھی جبکہ زری ان دونوں کی طرف خود ہی متوجہ ہوئی تھی۔

''السلام علیکم! نبیل صاحب کیسے ہیں آپ؟'' آپ کی بھابی ٹھیک ہوئیں یا نہیں؟'' زری نے بڑی برداشت اور بڑی بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا احسان ہے کہ بھابی بھی ٹھیک ہیں اور آپ کو بھی مبارک ہو اللہ نے آپ کو صحت بخشی ہے اور نئے سرے سے زندگی عطا کی ہے۔'' نبیل نے بھی بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس طرح اپنا نارمل کیپ کر لیا تھا کہ اسے اپنے آپ کو ہی داد دینے کو دل چاہا تھا۔

''تھینک یو نبیل صاحب! تھینک یو ویری مچ۔ آپ سب کی دعاؤں سے ہی تو ٹھیک ہوئی ہوں میں۔'' زری نے آج تک اپنے آپ کو پتھر بنانے کی انتہا کر ڈالی تھی اور آج سب کے سامنے ثبوت بھی دے دیا تھا۔

''اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے بھلا؟'' نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

''خیر..... آپ سنائیں مسٹر دل آور شاہ! آپ کی مسز کیسی ہیں؟ وہ کب ڈسچارج ہو رہی ہیں ہسپتال سے؟'' زری کا رخ اب دل آور کی طرف تھا اور دل آور جو ہمیشہ زری کے سامنے اپنا سر اور اپنی نظریں جھکا کر بات کرتا تھا آج علیزے کے ذکر پہ سر اٹھا کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

کیونکہ آج زری کے سامنے علیزے کا ذکر یوں سر جھکا کر کرتا تو شاید علیزے کبھی بھی یوں معتبر نہ ہو پاتی جیسے اس کے سر اٹھا کر بات کرنے سے ہو گئی تھی۔

''الحمد للہ! میری مسز اب کافی بہتر ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد ہسپتال سے ڈسچارج بھی ہو جائیں گی بس آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' دل آور کا لہجہ انتہائی مضبوط تھا گویا وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پہ ''وہ'' نہیں رہے تھے جو وہ ''پہلے'' تھے۔

''ہاں کیوں نہیں بس اک دعا کا رشتہ ہی تو ہے جو سب کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مردہ نہیں ہونے دیتا۔'' زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تھینک یو۔'' دل آور نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور زری نے اپنے قریب کھڑی نگارش کی طرف دیکھا۔

''چلیں بھائی! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔'' زری پھر بات کو وہیں پہ لے گئی تھی اور عبداللہ اس کی بات پہ چپ چاپ وہیل چیئر پہ بیٹھ گیا تھا لیکن نبیل حیات اور دل آور شاہ وہیں کھڑے وہیل چیئر پر بیٹھی زری کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

کیونکہ اب حقیقتاً ان تینوں کے دل کچھ اور ہو چکے تھے اور دلوں کے دھڑکنے کی طرز بھی کچھ اور ہو چکی تھی آج وہ اک دوسرے کے پاس سے گزر گئے تھے اور احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آخر یہ بھی زندگی کا ایک حیران کن مقام تھا۔

''چلو علیزے کے چیک اپ کا ٹائم ہو رہا ہے ڈاکٹرز آ چکے ہوں گے۔'' دل آور کھڑی دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے نبیل حیات بھی۔

♥

اس کی بائیک انتہائی فل سپیڈ پہ جا رہی تھی جب اس کے سیل فون کی رنگ بجنا شروع ہوئی تھی اور مجبوراً اسے بائیک روک کر سیل فون جیب سے نکالنا پڑا تھا۔ نمبر وکی کا تھا۔

''ہیلو؟'' اس نے مخصوص اسٹائل میں ہیلو کہا۔

''سائم کے فلیٹ پہ پہنچو۔'' وکی نے اتنا سا پیغام دے کر فون بند کر دیا اور جوت فون کو گھورتا رہ گیا تھا۔

''سائم کے فلیٹ پہ پہنچو یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھلا؟ پوری بات بھی نہیں بتائی۔'' جوت بیزاری سے کہتے ہوئے بڑبڑایا تھا کیونکہ وہ علیزے سے ملنے ہسپتال جا رہا تھا اس لیے اب اسے علیزے سے ملنے کا ارادہ بدلنا پڑ گیا تھا۔

اور وہ بائیک کو دوبارہ سے سٹارٹ کرتا ہوا ہو گیا تھا اور ٹھیک دس منٹ میں سائم کے فلیٹ پہ پہنچ گیا تھا۔

''ہاں بولو..... کیا بات ہے؟ اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے؟'' جوت آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ''میٹھو'' وکی نے بڑے موڈ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''او کے بیٹھ گیا اب بولو۔'' جوت نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دوبارہ سوال داغا۔

''تمہارے سالے کا پتا لگا لیا ہے ہم نے۔'' وکی نے بڑی خباثت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ''سالے کا؟ مطلب؟ میرے تو اس شہر میں بہت سے سالے ہوں گے۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' جواباً اس نے خود بھی حد کر ڈالی تھی۔

''جو تمہیں آج کل مطلوب ہے اور جس کی بہن کے تم دیوانے ہوئے پھر رہے ہو مگر وہ تمہارے ہاتھ نہیں آ رہی۔'' وکی نے اگلا شوشا چھوڑا۔

''کون؟'' جوت ٹھٹکا۔ ''دیوانے کس کے ہو؟'' کامی نے بھی مداخلت کی تھی۔ ''مریم'' اس نے جھٹ سے پوچھا۔ ''اور وہ ہمیرا مریم فاروق نیازی کا بھائی، عدیل عمر نیازی۔'' وکی نے انتہائی حیران کن انکشاف کیا تھا اور جوت صوفے سے دو فٹ اوپر اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''کیا..... عدیل، مریم کا بھائی ہے؟'' جوت کو جیسے بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔

''جی جناب! عدیل عمر نیازی آپ کی مریم کا اکلوتا بھائی ہے اور تمہارے تو دونوں بہن بھائی کی طرف ہی بڑے حساب نکلتے ہیں؟'' وکی نے جوت کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔

''حساب تو واقعی بڑے نکلتے ہیں یار! میں نے اس سے بڑی شرافت سے اور بڑے شریفانہ انداز میں ایک بات پوچھی تھی مگر اس نے نہیں بتائی بلکہ میرے سامنے جھوٹ بول دیا اب اسے اس جھوٹ کا حساب بھی دینا ہو گا۔'' جوت کو اس وقت مریم کا وہ جھوٹ بھی یاد آ گیا تھا جو وہ دل آور شاہ کی خاطر بول گئی تھی۔

''کیسی بات؟ اور کیسا جھوٹ؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟'' کامی نے تجسس کے مارے اسے کریدا تھا۔

''یار کیا بتاؤں؟ مجھے ایک آدمی کے بارے میں پوچھنا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔

''کون آدمی؟'' کامی اور وکی بات کا پیچھا کب چھوڑتے بھلا۔

''ہے ایک آدمی، دل آور شاہ نام ہے اس کا۔ اس کے متعلق پوچھا تھا مگر وہ صاف مکر گئی تھی۔'' جوت کو تاؤ آ رہے تھے کیونکہ وہ اب تک دل آور شاہ کو منصور حسین ہی سمجھ رہا تھا اور مریم نے پوچھنے کے باوجود بھی اس کی غلط فہمی دور نہیں کی تھی۔

''ارے اسی دل آور شاہ کے شوروم میں ہی تو عدیل عمر نیازی بطور منیجر کام کر رہا ہے۔'' وکیل نے ایک اور بم پھوڑا اور جوت کو ایک اور کرنٹ لگ گیا۔

''واٹ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''ارے..... تو اور کیا؟ ساری معلومات کس لیے حاصل کی ہیں بھلا؟''

''اوہ مائی گڈنیس! تو یہ چکر ہے یعنی وہ واقعی اسے جانتی تھی۔'' جودت کا یقین اب اور بھی پکا ہو گیا تھا۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ جانتی تھی۔'' وکی نے جلتی پہ تیل پھینکا۔

''ہوں..... وہ اسے جانتی تھی مگر وہ مجھے نہیں جانتی۔'' جودت نے بڑے پُرسوچ سے لہجے میں کہا تھا۔

''جب تک کسی کو اپنی پہچان نہ کرواؤ کوئی ہمیں نہیں جانتا۔ اس لیے اپنی پہچان خود کروانی پڑتی ہے۔'' کامی نے بھی کے ہاتھوں مشورے سے نوازا تھا۔

''ہاں کرواؤں گا پہچان، اب اسے پہچان ہی تو کرواؤں گا، میں نے اس کے ساتھ بہت نرمی اور بہت رعایت برتنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا کچھ حاصل نہیں ہوا لیکن اب فائدہ بھی ہو گا اور حاصل بھی بہت کچھ ہو گا۔ اب اور کوئی چھوٹ نہیں رہی اس کے لیے اور اس کے بھائی کو بھی پتا چلے گا کہ اس نے غیرت اور بے غیرتی کا طعنہ کس کو دیا تھا اور گالی کس کو دی تھی؟'' جودت نے جیسے دل ہی دل میں کوئی خطرناک عزائم باندھ لیے تھے۔

''کیا ارادہ ہے پھر؟'' وکی اور کامی نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیتے ہوئے جودت سے استفسار کیا تھا۔

''تم کیا کہتے ہو؟'' جودت نے اُنہاں دونوں سے پوچھا۔

''وہی ایک دو رات کا سبق ہی کافی ہے۔'' وکی نے خباثت سے مشورہ دیا۔

''ایک دو رات کا نہیں، پورے ایک ہفتے کے لیے سبق دوں گا۔ ایک دو رات میں میرا دل ٹھنڈا ہونے والا نہیں ہے۔'' جودت دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا۔

''تو پھر اتنے دن رکھو گے کہاں؟'' کامی کو حیرت ہوئی۔

''یہیں..... اسی فلیٹ میں۔ اس سے اچھی اور بہتر جگہ تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''لیکن پروگرام کب کا ہے؟'' وکیل نے سب کچھ فائنلی پوچھ لینا چاہا تھا۔

''سب حالات دیکھ کر بتاتا ہوں کہ پروگرام کب کا رکھیں کیونکہ گھر میں آذر اور دانیال بھائی کی شادی کے ہنگامے بھی چل رہے ہیں اور میری کزن بھی ہسپتال میں ایڈمٹ ہے اس لیے احتیاطاً سوچ رہا ہوں کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔'' جودت نے وجہ بتائی تھی۔

''ارے یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تمہارے گھر میں شادی کے ہنگامے چل رہے ہیں اس طرح مصروفیت میں تمہارے گھر والوں کو تمہاری باہر کی ایکٹویٹیز کا پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔'' وکی نے اسے ایک اور مفید مشورے سے نوازا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے پھر دیکھتا ہوں کہ کب ہوتا ہے۔'' جودت ذرا جلدی میں تھا۔

''لیکن اس کے لیے سارا انتظام کون کرے گا؟'' کامی نے پھر جودت کو روکا۔

''تو تم لوگ کس مرض کی دوا ہو؟'' جودت اس کی طرف پلٹا۔

''مگر کچھ پلاننگ بھی تو ہو؟ کچھ ٹائمنگ کا تو پتا چلے؟ تم ہو کہ ادھر آئے ہو اور ادھر کوچ کے لیے تیار، کیا ایسے کام اس طرح ہوتے ہیں؟'' وکی نے جودت کو خفگی سے گھورا تھا۔

''تو کس طرح ہوتے ہیں؟ کیا دن رات سر جوڑ کر بیٹھے رہیں اور پلاننگ کرتے رہیں تو تب ہی ایسے کام ہو سکتے ہیں؟ ہاؤ ٹل طریقے سے بات کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' جودت ان پہ خفا ہو رہا تھا۔

''یار! ہم نے ایسا کب کہا ہے کہ ایسے کام نہیں ہو سکتے مگر یار سوچ بچار اور پلاننگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر ایسے معاملوں میں ایک دوسرے سے پوچھ کر ہی قدم اُٹھانا چاہیے اس طرح معاملہ بگڑتا نہیں ہے۔'' کامی نے اب ذرا تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''او کے..... آئی انڈر اسٹینڈ لیکن تم بس اتنا کرو کہ اس فلیٹ کے سب کھڑکیاں دروازے اور ان کے لاک وغیرہ اچھے سے

PAKSOCIETY.COM

کرو اور گاڑی کا انتظام بھی کر رکھو، اس کو شکار کرنے کے بس دو ہی کام ہیں ایک جب وہ اکیڈمی جاتی ہے اور دوسرا جب اکیڈمی سے واپس آ رہی ہوتی ہے اور اس کام کے لیے اور بھی جن چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی لے آؤ باقی سب کچھ فون پر بتا دوں گا۔ تم لوگ یہ پیسے رکھ لو چیزیں خریدنے میں کام آئیں گے۔" جودت نے جاتے جاتے پانچ پانچ ہزار کے چند نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھائے اور ان کو ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل آیا تھا اور پیچھے دونوں خباثت سے قہقہہ لگا کر ہنسے تھے کیونکہ ان کے تو ہر داؤ سے مزے ہی مزے تھے۔

♥

اگر تو وجہ نہ پوچھے تو اک بات کہوں
بن تیرے اب مجھ سے بھی جیا نہیں جاتا

آج ٹھیک بارہ دن بعد ڈاکٹر نے علیزے کو ڈسچارج کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا اور یہ فیصلہ سن کر دل آور بہت خوش ہوا تھا کہ چلو اب کہ علیزے اب گھر جائے گی مگر علیزے کے گھر جانے کی خوشی میں سرشار اور مسرور ہوتے دل آور شاہ کے قدم ہسپتال کے کوریڈور روم میں داخل ہوتے ہی رک گئے تھے۔

"آپ اس کی تمام چیزیں پیک کر لیں میں گاڑی نکالتا ہوں۔" آذر آسیہ آفندی سے کہتا ہوا پلٹا مگر دل آور کو دروازے کے بیچ کھڑے دیکھ کر وہ ادھر ہی کے لیے رک گیا کیونکہ وہ دل آور کے چہرے کا رنگ بھانپ گیا تھا۔

"علیزے اپنے گھر جائے گی۔" اس نے اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ان سب کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اس کے اس فیصلے پہ وہاں موجود تمام افراد نے بے اختیار چونک کر دیکھا مگر اسے جواب کسی نے بھی نہیں دیا تھا کیونکہ اس کے مقابل آذر تھا۔

"علیزے اپنے گھر ہی جا رہی ہے۔" آذر کا جواب چبھن لیے ہوئے تھا۔

"میں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں جو میرا اور علیزے کا ہے۔" دل آور نے اپنے گھر پہ زور دیا تھا۔

"مگر میں اس گھر کی بات کر رہا ہوں جو صرف علیزے کا ہے۔" آذر بھی اپنی بات پہ اڑ چکا تھا۔

"اس کا فیصلہ علیزے خود کرے گی کہ اس کا گھر کون سا ہے؟ اور اس نے کہاں جانا ہے؟" دل آور نے فیصلہ علیزے پہ چھوڑ دیا تھا اور علیزے اس کے اس سوال پہ بُری طرح سٹپٹا گئی تھی۔

"اس میں نے کہہ دیا علیزے اپنے گھر جا رہی ہے اور اس چیز کے لیے ہمیں تم سے یا علیزے سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب وہی ہوگا جو ہمارا فیصلہ ہوگا اور مجھے امید ہے کہ علیزے بھی اس سے انکار نہیں کرے گی وہ بھی ہمارے ساتھ حویلی ہی جانا پسند کرے گی کیوں علیزے! تم کیا کہتی ہو؟ کہاں جانا ہے تم نے؟ حویلی یا پیر سٹر دل آور شاہ کے گھر؟"

آذر نے انتہائی تلخ اور طنزیہ سے انداز میں کہتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھا تھا اور علیزے سب کے سامنے بے ساختہ آنکھیں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھی کیونکہ اب سب کی نظروں کا مرکز وہی تھی۔ سب اس کے جواب کے منتظر ہو گئے تھے مگر آذر کے سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا خصوصاً اس وقت۔

"علیزے! میں تم سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ سٹر صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر پھر بھی تم سے پوچھ لیا ہے تاکہ سب کے سامنے تم خود بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ حویلی یا اس کے گھر؟ ہمارے ساتھ یا اس کے ساتھ؟ اپنے ڈیڈ کے پاس یا اس سٹر کے پاس؟ بولو بتاؤ اب؟" آذر اک اک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا اور علیزے چپ چاپ سر جھکائے سب سن رہی تھی۔ اس نے جواباً ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر اس وقت اس کی چپ سے کام نہیں چل رہا تھا۔

"علیزے! فیصلہ کرو اور بات ختم کرو ہمارا ٹائم کم ہے کمرہ خالی کرنا ہے۔" آذر ذرا غصے سے بولا تھا اور مجبوراً علیزے کو سر اُٹھا کر ان سب کی طرف دیکھنا پڑا تھا۔

اس کی پہلی نظر آسیہ آفندی پر پڑی تھی ان کے چہرے پہ بھی یہی تحریر رقم تھی کہ وہ حویلی چلے اور اسے سب کے چہروں پہ یہی لکھا نظر آیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ حویلی جائے اور حویلی والوں کے چہروں کی تحریر پڑھ کر علیزے "اپنے گھر والے" کے چہرے کا لفظ اٹھانا بھول گئی وہ لفظ جو "محبت" تھا، وہ لفظ جو "مان" تھا وہ لفظ جو "محرم" تھا اس نے نہیں پڑھا اس نے نہیں دیکھا اس نے نہیں

سوچا۔ اور بس ایک نظر آخری نظر اور اجنبیت کی نظر سے سامنے کھڑے بڑے مان اور بڑی محبت سے دیکھتے اپنے "ڈیڈ ایڈ" کو دیکھا اور پھر نظر چرالی جھکالی اور شاید چھپا بھی لی تھی۔ اور اس کے اس طرح نظریں چرانے اور نظریں جھکانے پہ ہی دل آور سے قدم تھے زمین ایک بار سرکی ضرور تھی مگر پھر بھی وہ اپنے قدموں پہ جم کے اور ڈٹ کر کھڑا رہا کیونکہ اسے اب بھی امید تھی کہ وہ اس کی امید نہیں توڑے گی لیکن علیزے کے جواب پہ امید تو بھلا کیا ٹوٹتی وہ خود ٹوٹ گیا تھا۔

"میں حویلی جانا چاہتی ہوں آپ کے ساتھ اپنے پاپا کے پاس۔"

علیزے نے جو کہنا تھا کہہ دیا مگر دل آور کو یوں لگا تھا کہ علیزے نے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور اس کا دل اپنے پاؤں تلے مسل دیا ہو اور اسے بیچ چوراہے میں کھڑا کر کے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔

اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو اور وہ بالکل بے جان اور اٹھے کی مانند علیزے کو گیا تھا لیکن پھر اس نے کہا کچھ نہیں اور خاموشی سے دروازے کے سامنے سے ایک سائیڈ پہ ہٹ گیا۔

کیونکہ اب اس کا آذر کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا کوئی بحث نہیں تھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

ہاں ایک دل تھا جو یقین، امید، جبر و سے اور مان کی بلندیوں سے گر اور کرچیوں میں تقسیم ہو گیا اور دل کی اس تقسیم پہ دل دھڑکنوں کی اس تباہی پہ دل آور کا دل چاہا کہ دوزانو فرش پر گرے اور زمین میں ہی اتر جائے۔ کیونکہ اس کے پاس یہ کرنے کا بچا تھا اب تو وہ صرف دیکھ رہا تھا کسی روبوٹ کی مانند۔

علیزے کا سامان سمیٹا گیا گاڑی نکالی گئی علیزے کو تیار کروایا گیا اور پھر سب کے سہارے سے چلتی ہوئی وہ ایک سرسری سی نظر دل آور پہ ڈالتی ہوئی اس کے سامنے، اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم کی دہلیز پار کر گئی تھی اور دل آور اس دہلیز پر کھڑا کوئی پیڈ رسے مرکزی دروازے کی سمت جاتے ہجوم کو دیکھتا رہ گیا لیکن خود واپسی کے لیے قدم آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔

♥

اس کے قدم شکستہ تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں جیسے انسان کے چہرے کے تاثرات، آنکھیں اور زبان بولتی ہیں بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات اپنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم، غم زدہ ہو تو بوجھل قدم، بیمار ہو تو نڈھال قدم، تھکاوٹ میں ہو تو تھکے تھکے قدم، ناکام ہو تو مایوس قدم، بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم، جوان ہو تو مضبوط قدم، بوڑھا ہو تو کمزور قدم، پر عزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آ کر ہارا ہوا ہو تو "شکستہ قدم" اور آج وہ بھی ایک بار ہارا ہوا انسان تھا آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ڈائیٹ چکھے تھے۔ کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بوجھل اور کئی بار نڈھال ہوئے تھے اور کئی بار تھکے بھی تھے لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے کیونکہ وہ ہارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہارا ہوا ایک شکست خوردہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی سکت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اتھاہ گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی غم زدہ بوجھل ذات کا بوجھ بمشکل اٹھا کر ہسپتال کے پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا تھا اور دور تک پھیلی کشادہ اور طویل راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ مضبوط انسان وہاں وہاں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھویں کی تاریکی اسے سر تا پا اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں یوں کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں پہ ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو۔

حالانکہ اب اسے تھوڑی دیر پہلے وہ کافی حد تک مطمئن اور خوش تھا شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی ایک مدھم سی "امید" سانس لے رہی تھی اسے جانے والے پہ بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت "مان" ضرور تھا۔ لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان "اکثر" ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور امیدیں ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو وہ یقیناً کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا مگر اب..... اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا

♥

"سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟" ہسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً
ہنچ گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم از سر نو صاف کرنے کی
ضرورت تھی اور وہ جواباً کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پر رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں
دے رہے تھے وہ اپنے شکست خوردہ قدموں سے چل کر بمشکل ہسپتال سے باہر رائٹنگ تک آیا تھا۔ پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس
کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی پراڈو موجود تھی۔

اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی، شاید تنہا واپسی کے احساس نے اس کی
تنہائی، اس کی شکستگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، تھکے تھکے انداز سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت
گئی تھی جس پر سرخ خون کے دھبے اب سیاہی مائل ہونے لگے تھے اس کے ذہن میں وہ منظر، وہ لمحہ، وہ وقت آج بھی پہلے دن کی
طرح تازہ ہوا تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھا تھا آج
بھی اس کا دل کسی انہونی کے خیال سے جیسے مٹھی میں آ جاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یونہی گردن موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ
اچانک اس کے سیل فون پر ہونے والی وائبریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال
ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ لب بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیئرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہسپتال سے گھر کے گیٹ تک آ کر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا
اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

"سلام صاحب!" چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا
اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھا لے گیا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا وہ اگر کبھی
غصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی مگر جواب ضرور دیتا تھا لیکن نظر انداز نہیں کرتا
تھا۔

شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو اس کی گہری چپ سے کسی سنگین مسئلے کا احساس ہو گیا تھا جب تک چوکیدار نے گیٹ بند
کیا تب تک وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا تھا اور آگے پیچھے کچھ بھی دیکھے بنا ڈرائنگ روم کے صوفے پر آ گرا، ڈھے گیا تھا۔

"سلام صاحب جی!" اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے کشن ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اچانک اسے آتے دیکھ کر
الرٹ ہو گئی تھی مگر وہ بہت نڈھال نظر آ رہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے
مالک کی کیفیت کا فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ اس پہ چھائی مایوسی اور شکستگی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ آج حقیقتاً
دیکھنے والوں کو بھی "تنہا" لگ رہا تھا اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے ملازمہ کو بیڈ روم سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لانے کا کہا تھا
اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے تپکتے کٹاؤ دار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھا دیا تھا اور ایک گہرا کش لے
کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سو
دھوئیں کے مرغولے پھیلتے جا رہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگتا رہا اور دھواں بڑھتا
رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کر رہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلب پہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج
لمحہ بھر میں سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آنے کو بیتاب ہو گئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی
شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فریش ماحول دیکھتے ہی
دیکھتے جس زدہ ہو گیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ اپنے مالک سے بہت پیار تھے

اس کا اچھا ارادہ بھی متزلزل کر دیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی پوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں اُترا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حالِ پریشاں اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہے تھے۔ وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناکی کا یہ کھیل بھی جاری تھا۔

شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرسٹل ٹیبل پہ رکھا موبائل لگاتار ہونے والی وائبریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ "تڑپ" اور یہ کال کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر جھنک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر دوبارہ سگریٹ سلگا لیا تھا۔ آج نہ تو اس کے ذہن پہ سوار بوجھ کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی۔ ہر چیز پہ ایک جمود سا طاری تھا، سب کچھ جیسے ٹھہر سا گیا تھا، لمحات ساکت ہوئے لگ رہے تھے۔

صبح کا سورج ابھی پوری طرح سے طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ نبیل حیات کی گاڑی سیدھی اس کے گھر کے گیٹ پر آ رکی تھی اور اسے دیکھ کر گلاب خان نے فوراً گیٹ وا کر دیا تھا۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" نبیل نے گاڑی سے اُترتے ہی استفسار کیا تھا۔

"اندر ہیں مگر بہت بُرے حال میں ہیں۔" گلاب خان نبیل سے بھی زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا اور نبیل اس کی بات سن کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر اندر کی سمت بھاگا اور ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ صوفے پہ نڈھال اور بے سدھ پڑے دل آور کو دیکھ کر یکدم قدم ٹھٹک گئے تھے اور وہ بے ساختہ لپک کے اس کے قریب آیا تھا۔

"دل آورے! دل آورے! آنکھیں کھولو ادھر میری طرف دیکھو۔" نبیل نے اس کے قریب جھکتے ہوئے استفسار کیا تھا۔ اور دل آور نے اپنے درد سے پھٹتے سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"دل آور کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟ اٹھو آنکھیں کھولو۔" نبیل کا دل اسے دیکھ کر جیسے مٹھی میں آ گیا تھا کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ نبیل سے بھی برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اور دل آور نے نبیل کے بازو کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور ذرا دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

"دل آورے۔" نبیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"زندہ ہوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے تلخی سے کہہ کر وہاں سے اُٹھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ وہاں سے اُٹھ نہیں سکا تھا اور اسے یوں لڑکھڑاتے دیکھ کر نبیل نے فوراً اسے تھام کر اسے سہارا دیا تھا۔

"لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا بھابی کہاں ہیں وہ گھر کیوں نہیں آئیں؟" نبیل رات سے پریشان ہو ہو کر تھک چکا تھا۔

"وہ حویلی چلی گئی ہے۔ اپنے گھر والوں کے پاس....." دل آور نے کسی روبوٹ کی طرح جواب دیا تھا۔

"مگر کیوں..... وہ اپنے گھر کیوں نہیں آئیں؟ تمہارے ساتھ تمہارے پاس۔"

"کیونکہ اسے یہ گھر پسند نہیں ہے کیونکہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے کیونکہ وہ..... وہ..... یہاں....." دل آور کہتے کہتے بے اختیار رُک گیا تھا اور اس نے بے بسی سے لب بھینچ لیے تھے۔

"بس کرو نبیل بس کرو..... مجھ سے اور کچھ مت پوچھو میرے پاس کچھ نہیں بچا میں اب کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں اس لیے بہتر ہے کہ مجھے چپ رہنے دو پلیز مجھے چپ رہنے دو نبیل مجھے چپ رہنے دو۔" دل آور بے بسی اور شکستگی کی انتہا پہ تھا۔

"کیوں دل آورے کیوں؟ کیوں چپ رہنے دیں تمہیں؟ تم چپ کیوں رہنا چاہتے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے تم کہتے کیوں نہیں ہو کہو جو بھی دل میں ہے کہو میں سن رہا ہوں۔ تمہاری ہر بات سنوں گا اور سمجھوں گا بھی۔" نبیل نے اسے بولنے پہ اُکسایا گیا لیکن دل آور کیسے بولتا؟ کیسے کچھ کہتا؟ اس کے پاس واقعی اب خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"کیا کہوں..... کیا کہوں آخر؟ یہی نا کہ میں "ہار" چکا ہوں میں صرف علیزے کے چلے جانے سے ہی ہار چکا ہوں..... تو

ہاں میں واقعی ہار چکا ہوں..... ہار چکا ہوں میں..... اور مجھے ہرانے والی اور مجھے شکست دینے والی کوئی اور نہیں میری بیوی ہی اپنی بیوی، وہ بیوی جس کی خاطر میں نے وہ کام بھی کیے ہیں جو حقیقتاً میں مر بھی جاتا تو نہ کرتا۔'' دل آور کا کلیجہ کٹتے کٹتے رہ گیا تھا۔

''انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تم تو کہتے تھے کہ علیزے بھابی کو تم سے محبت ہے، لو میرج کی ہے تم لوگوں نے..... پھر یہ سب کیا ہے؟ کہاں ہے محبت اور کہاں ہے لو میرج۔'' نبیل دل آور کے تسلی اور دلاسوں سے تھک چکا تھا، تنگ آ گیا تھا، آج ہی رات اس نے بھی بالکل اس طرح جاگ کر گزاری تھی جیسے کہ دل آور نے جاگ کر گزاری تھی۔ وہ بھی اس کے لیے اتنا ہی پریشان تھا جتنا وہ علیزے کے لیے تڑپا تھا۔

''دل آور رے! بتاؤ نا کیا کہا تھا تم نے؟ اور کیا ہو رہا ہے آج؟''

''نبیل! میں نے جو کچھ بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا؟'' دل آور کا لہجہ پتھریلا سا ہو گیا۔

''ہم جانتے ہیں کہ تم نے جو بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا مگر ہم منتظر تھے کہ تم کبھی سچ بھی کہو گے۔'' عبداللہ کی آواز پہ نبیل اور دل آور دونوں نے ہی یکدم چونک کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا تھا جہاں عبداللہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔

''عبداللہ! تم یہاں اس وقت؟'' نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

''تم دونوں کیا سمجھتے ہو کہ تم دونوں رات بھر پریشانی اور اذیت میں تڑپ کر گزارتے ہو اور میں اپنے بیڈ روم میں سکون کی نیند سو رہا ہوں گا؟ مجھے تم دونوں کی خبر نہیں ہوتی۔ یا مجھے تم دونوں کا احساس نہیں ہوتا؟'' عبداللہ کے سوال پہ وہ دونوں ہی چپ ہو گئے تھے۔

''نہیں نبیل! میں بھی سو نہیں پاتا، میں بھی رات جاگ کر ہی گزارتا ہوں۔'' عبداللہ تھکی سے کہتا ڈرائنگ روم کے اندر آ گیا تھا دل آور کے بالکل سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

''مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ.....'' نبیل کا اشارہ علیزے کی طرف تھا۔

''مجھے بڑی حویلی سے کال آئی تھی۔'' عبداللہ نے دل آور کو نظروں میں تولتے ہوئے بتایا مگر دل آور نے کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

''کس کی؟'' سوال جواب وہ دونوں ہی کر رہے تھے دل آور صرف سن رہا تھا۔

''دانیال کی.....'' عبداللہ کا انداز بہت پُرسوچ اور عجیب سا ہو رہا تھا۔

''پر کیا کہا اس نے.....'' نبیل نے جاننا چاہا۔

''اس نے کہا ہے کہ دل آور شاہ کے سسرال والے عنقریب طلاق کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔'' عبداللہ نے نبیل کے سر پہ بم پھوڑا تھا لیکن دل آور یکدم لب بھینچ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''او کے..... دے دوں گا طلاق..... ان سے کہو مطالبہ ذرا جلدی کریں میں خود یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔'' دل آور نے بڑی مضبوط اور اٹل انداز میں کہتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور وہ دونوں گنگ رہ گئے تھے۔

♥

''یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' عبداللہ بھی ششدر سا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دل آور کا لہجہ حد سے زیادہ مضبوط ہو رہا تھا۔

''کیا تمہارے خیال میں شادی بیاہ یا نکاح وغیرہ بھی گڈے گڑیا کا کھیل ہے کہ جب چاہا نکاح کر لیا اور جب چاہا طلاق کا کہا کر لیا؟ واہ یار! عجیب منطق ہے تمہاری؟''

عبداللہ علیزے کی طلاق کا سن کر خود پہ کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔

''طلاق کا مطالبہ وہ کر رہے ہیں۔'' دل آور نے اسے یاد دلایا۔

''تو کیا نکاح کا مطالبہ بھی انہوں نے کیا تھا؟'' عبداللہ کے لہجے میں خفگی تھی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' دل آور نے پلٹ کر عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کر چکے ہو، اب اسے بھگتو..... تمہارے اس طرح ہاتھ اُٹھا دینے سے اور ملک چھوڑ کر چلے

جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔" عبداللہ الٹا دل آور پہ غصہ ہو رہا تھا اور دل آور کے چہرے پہ اک طنزیہ سی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ کر چکا ہوں میں اسے بھگت نہیں رہا؟ ہونہہ..... غلط فہمی ہے تمہاری، تمہیں کیا پتا کہ میں کیا کیا بھگت رہا ہوں اور اس بھگتنے کے چکر میں مجھ پہ کیا کیا بیت رہی ہے؟"

دل آور نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے بڑے زہر خند سے لہجے میں کہا تھا۔

"اگر ایسی بات ہے تو تم صاف بات کیوں نہیں بتاتے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ سارا چکر، یہ سارا قصہ کیا ہے آخر؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" عبداللہ نے اب کی بار ذرا نرمی سے اپنی جھنجلاہٹ ظاہر کی تھی، اور دل آور اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے چپ ہو کے رہ گیا تھا، لیکن آخر کب تک؟

فی الحال کچھ تو کہنا ہی تھا۔ تبھی وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا تھا۔

"مجھے سنبھلنے کا وقت دو..... محض چند دن کا وقت میرا وعدہ ہے تم سے..... تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

دل آور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے وعدہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اس کے وعدے پہ اعتبار کرتے ہوئے چپ ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ اس چپ کو کئی دن گزر گئے تھے، مگر پھر بھی ان دونوں نے دوبارہ اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

♥

"جوت..... جوت..... رکو..... کہاں جا رہے ہو؟ مجھے جیولر کے پاس جانا ہے۔" جوت تیار ہو کر بہت عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر گیراج کی طرف گزر رہا تھا جب ثروت بیگم نے اسے پیچھے سے پکارتے ہوئے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔

"ایم سوری..... میں اس وقت اپنی یونیورسٹی کے کسی کام سے جا رہا ہوں، مجھے اس سائیڈ پہ نہیں جانا جس سائیڈ پہ آپ جا رہی ہیں اس کے لیے پلیز آپ مبارک خان کو ساتھ لے جائیں، وہ آپ کو واپس بھی لے آئے گا۔ میں تو صرف ڈراپ ہی کر سکوں گا۔" اس نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن ثروت بیگم بھی آخر ماں تھیں، فوراً ہی اس کے گریز پہ کچھ مشکوک سی ہو گئی تھیں۔

"اب یونیورسٹی کا کام کیا ہے تمہیں..... تم تو آج کل یونیورسٹی سے فری پھر رہے ہو؟" انہوں نے جان بوجھ کر اسے گریا تھا۔

"بس ہے ایک کام، آ کر بتا دوں گا۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔" جوت ان کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا پلٹ کر جا ہو گیا تھا اور ثروت بیگم اس کے پیچھے کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"کر لیتی ہوں تمہارا بندوبست۔ بس ایک بار آذر کی شادی سے فارغ ہو جاؤں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی مبارک خان کی طرف بڑھ دیں اور وہ انہیں دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا تھا۔

♥

"ٹھہرو مریم! میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو کر نکل رہی تھی جب عدیل نے اسے روک لیا تھا۔

"آج جلدی جا رہے ہیں آپ؟" مریم صحن میں ہی رک گئی تھی۔

"ہاں..... دراصل آج مجھے جمیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جانا ہے، شوروم کے کسی کام کے سلسلے میں۔" عدیل بھی جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا اور پھر فاروق نیازی سے ملنے کے بعد باہر نکل آیا تھا۔

"او کے امی! اللہ حافظ۔ ہم ان شاء اللہ کل شام تک واپس آ جائیں گے اور اگر کام ختم نہ ہوا تو ہم لیٹ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن پلیز آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں فون کرتا رہوں گا۔" عدیل ماں سے مل کر انہیں تسلی دیتے ہوئے مریم کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اور گلی میں نکلتے ہی بائیک سٹارٹ کر لی تھی۔

"کیا آپ بائیک پہ اسلام آباد جائیں گے۔" مریم عجیب احمقانہ سا سوال کر بیٹھی تھی اور اپنے اس سوال کے بعد خود ہی پچھتائی بھی تھی کیونکہ عدیل ایک بھرپور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

اور وہ جان گئی تھی کہ یہ قہقہہ اس کی بیوقوفی پہ لگایا گیا ہے۔

"ہم نے آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے کسی ریس میں حصہ لینے کے لیے نہیں جانا کہ ہم لوگ بائیک لے کر نکل کھڑے ہوں۔" وہ اس کے احمقانہ سے سوال سے جی بھر کے لطف اندوز ہوا تھا۔

PRIME URDU NOVEL

پھر بائیک لے کر کیوں جا رہے ہیں؟" اس کے سوال میں اب بھی ناسمجھی اور بیوقوفی کی آمیزش موجود تھی۔ "اُف پاگل بائیک لے کر شوروم جا رہا ہوں، وہاں بائیک چھوڑ جاؤں گا اور وہاں سے گاڑی میں نبیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد نکل جاؤں گا سیدھا سا چکر ہے اور تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

عدیل نے بڑے دلچسپ انداز میں کہا تھا اور مریم سمجھ آ جانے پہ مسکرا اٹھی تھی۔

"نبیل صاحب کے ساتھ جا رہے ہیں تو مدیحہ صاحبہ کہاں ہیں؟ ان سے ملاقات ہوئی۔"

"ہوتی رہتی ہے۔"

"کیا نہیں ہماری بھابی کب بنائیں گے؟" مریم نے شرارت سے پوچھا۔

"جب تم لوگوں کے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔" عدیل کا جواب سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

"ابھی نہیں بھائی! ابھی تو بہت دیر ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔

"کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گا۔"

"لیکن آپ انہیں پرپوز کر دیں نا تاکہ انہیں اور ان کے گھر والوں کو پتا تو چل جائے کہ کوئی ان کو کتنا چاہتا ہے۔" مریم نے کچھ سوچتا سا مشورہ دیا تھا لیکن وہ یہ مشورہ مانگنے کو بھی تیار نہیں تھا۔

"نہیں گاہے پرپوز لیکن تب جب اس کے قابل ہو گیا جب مجھے اس کے گھر والوں سے اس کا ہاتھ مانگتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوں اپنی اوقات سے اونچی جگہ پہ ہاتھ مار رہا ہوں۔"

"لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ ایسی سوچ رکھنے والے لوگ ہوں گے؟" مریم اکیڈمی کے سامنے بائیک روکتے ہی بائیک سے

"لیکن میں تو ایسی سوچ رکھتا ہوں نا، خیر چھوڑو اس بات کو تم اندر جاؤ ان شاء اللہ کل گھر پہ ہی ملاقات ہو گی۔" عدیل نے

حافظ کہتے ہوئے بائیک کا رخ موڑ لیا تھا اور مریم اس کے سفر کی سلامتی کی دعا مانگتی ہوئی اکیڈمی کے گیٹ کے اندر داخل ہو

اور ان کو گھر سے لے کر اکیڈمی تک فالو کرنے والا جوڑت اور اس کے دونوں ساتھی دانت پیستے ہوئے رہ گئے تھے، کیونکہ ان سے موقع ضائع ہو گیا تھا اب انہیں دو بجے کا انتظار کرنا تھا۔

♥

ٹھیک سوا دو بجے وہ اکیڈمی سے باہر نکل آئی تھی۔ اور اس کی ناک میں بیٹھے شکاری فوراً ہی الرٹ ہو گئے تھے۔

"آؤ تو....." وکی نے جوڑت کو اشارہ دیا، کیونکہ مریم بس سٹاپ کی طرف جانے والے راستے پہ قدم بڑھا چکی تھی۔ اس لیے

وکی فوراً ہی گاڑی سے اتر آیا تھا اور اس نے بھی مریم کے پیچھے ہی قدم بڑھا دیئے تھے اور بالآخر اس کے بے حد قریب جا پہنچا

"ہیلو..... کہاں جا رہی ہو؟" اپنے عقب میں اور اپنے بے حد قریب ہی جوڑت آفندی کی آواز سن کر وہ چلتے چلتے کرنٹ کھا

"تم....." مریم نجانے کیوں یکدم ہی خوفزدہ ہو گئی تھی، حالانکہ وہ اتنی خوفزدہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں میں..... میں نے سوچا جہاں جا رہی ہو..... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" وہ جان بوجھ کر اسے ہراساں کرنے اور خود لطف

اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مم..... میں..... میں تو اپنے گھر جا رہی ہوں۔" مریم کی چھٹی حس اسے پہلے سے ہی خطرے کے الارم سنانا شروع ہو گئی

"اوہ یعنی میں تمہارے گھر نہیں جا سکتا..... لیکن خیر کوئی بات نہیں تم تو میرے ساتھ جا سکتی ہو نا؟" وہ خاصی لاپروائی سے کہہ

رہا تھا جبکہ مریم اس کے الفاظ پہ چونک گئی تھی۔

"میں سمجھی نہیں؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"سمجھا دوں گا، ایک بار میرے ساتھ تو چلو۔" اب جوت کا لہجہ خباثت میں بدلنے لگا تھا۔

"لک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"مطلب کہ تمہیں یاد ہوگا کہ ایک بار پہلے بھی میں تمہیں اسی طرح ایک دن گاڑی میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا لیکن تمہاری عزت، بڑی دیانت اور بڑی شرافت کے ساتھ..... مگر تمہیں وہ شرافت، وہ دیانت اور وہ عزت راس نہیں آئی تھی اور تمہیں نہیں پتا تھا کہ منصور حسین کون ہے؟"

وہ دانت پیس کر بولا تھا اور مریم اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آج نشے اور خمار کے بجائے غصے کی لالی دیکھ کر مزید خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"لیکن مجھے تو اب بھی نہیں پتا کہ منصور حسین کون ہے؟" اس نے پھر سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔

"اوہ..... تو کیا تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ عدیل عمر نیازی کون ہے؟" وہ لفظ چبا کر پوچھ رہا تھا۔

"و..... وہ تو میرے بھائی ہیں۔" مریم خود پہ کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

"ہوں تو اگر تمہیں یہ پتا ہے کہ عدیل عمر نیازی تمہارا بھائی ہے تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ منصور حسین کون ہے اور دل آور شاہ کون ہے؟" جوت کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا نہیں لگ رہا تھا اور دل آور شاہ کے نام پہ مریم کا رنگ متغیر ہو گیا تھا اور وہ اس سے نظریں چرا گئی تھی۔

"گاڑی میں بیٹھو....." وکی اور کامی دونوں گاڑی ان کے برابر لا چکے تھے اور جوت نے تیور بدلتے ہی اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نہیں..... ہرگز نہیں۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹی لیکن وہ ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر آگے بڑھا اور جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ پہ رکھ دیا تھا اور ساتھ ہی اس کی احتجاجی کارروائی سست پڑتے ہی وہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر گاڑی کے پچھلے دروازے سے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تھا اور مریم اس کے رحم و کرم پہ اس کی گود میں آ پڑی تھی، اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔

"چلو....." اس نے پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے وکی کو اشارہ کیا تھا اور اس نے گاڑی ہواؤں میں چھوڑ دی تھی اور پھر تینوں ہی قہقہے لگا کر ہنسے تھے۔

"مریم فاروق نیازی....." جوت نے خباثت سے کہتے ہوئے اس کے چہرے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا تھا اور پھر اپنی انگلیوں سے اس کے گداز رخساروں کو چھونے لگا تھا۔

"بہت ترسایا ہے تم نے..... تمہیں چھونے کے لیے بہت تڑپا ہوں۔ اور آج تم میرے ہی بازوؤں میں میرے ہی رحم و کرم پہ ہو، اب میں چاہوں تو کیا کیا نہیں کر سکتا۔"

وہ بڑی کمینگی سے کہتا اس کے کانوں کے قریب سرگوشیاں کر رہا تھا اور وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔

"آج کیا کیا کرو گے؟" وکی نے گردن موڑ کر جوت کو دیکھا۔

"نہیں..... آج نہیں..... آج کچھ نہیں کروں گا..... کیونکہ آج میری مام کو میرے گھر سے نکلنے پہ شک ہو گیا ہے اس لیے آج کی رات میں گھر جاؤں گا اور اب جو بھی کروں گا کل رات کو ہی کروں گا۔" جوت نے فوراً ہی نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تو پھر آج کی رات ہمیں دے دو۔" کامی نے آنکھ دبائی۔

"شکار میں پہلا نوالہ شیر کا ہی ہوتا ہے میرے یار! بچا کھچا کھانے کی عادت نہیں ہے۔" اس نے کافی سختی سے کہا تھا اس لیے وہ دونوں ہی چپ ہو گئے تھے اور جوت اسے سائم کے فلیٹ میں چھوڑ کر چابی اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ اسے ان کی ہوس پہ کوئی اعتبار نہیں تھا اور وہ دونوں اس کی چالاکی پہ ہاتھ ملتے رہ گئے تھے، انہیں جوت آفندی سے اس قدر بے مروتی کی امید ہرگز بھی نہیں تھی کیونکہ وہ بڑا فراخ دل آدمی تھا لیکن مریم فاروق نیازی کے معاملے میں نہیں۔

♥

وہ ابھی کورٹ سے تھکا ہارا واپس آیا ہی تھا کہ اس کے گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ بجنے لگی تھی اور اس نے سیڑھیوں پہ قدم

PRIME URDU NOVELS

کار اور وہ ٹرک کرتے ہوئے پلٹ کر فون ریسیو کر لیا تھا۔
"السلام علیکم!" اس کا لہجہ گمبھیر اور آواز بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔
"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" دوسری طرف کی آواز سن کر وہ بُری طرح چونک گیا تھا اور یکدم فون سیٹ کی سی ایل آئی کی طرف دیکھا۔ بڑی حویلی کا تھا۔
"تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟ آسیہ آفندی بات کر رہی ہوں۔" آسیہ آفندی نے اس کی خاموشی فوراً نوٹ کی تھی۔
"جی..... پہچان گیا ہوں آپ بتائیں کوئی حکم؟" اس نے بڑے تحمل اور بڑی شرافت سے استفسار کیا تھا۔
"میں نے تمہیں بڑی حویلی بلانے کے لیے فون کیا ہے؟" آسیہ آفندی بڑا ناپ تول کر بول رہی تھیں۔
"خیریت.....؟" وہ بھی صبر و برداشت کی حد کر رہا تھا۔
"ہوں..... خیریت ہی ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"
"ہونہہ..... آپ نے اپنے ہزبینڈ سے پوچھا وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں یا نہیں؟" اس کے الفاظ نوکیلے ہونے لگے تھے۔
"وہ بول نہیں سکتے۔" آسیہ آفندی بھی تحمل کے دائرے میں رہ کر بات کر رہی تھیں۔
"سن تو سکتے ہیں نا؟" وہ زہر خند ہوا۔
"سننے کے لیے ہی تو تمہیں بلا رہے ہیں۔"
"لیکن میں کچھ بھی سنانا نہیں چاہتا آپ نے جو مطالبہ وہاں کرنا ہے، وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔" دل آور نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔
"لیکن میں مطالبے سے پہلے کچھ اُلجھنیں سلجھانا چاہتی ہوں۔"
"مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ان اُلجھنوں کو سلجھاتے خود اُلجھ جائیں گی۔"
"یہ میرا مسئلہ ہے۔" وہ لاپروائی سے بولیں۔
"یہ آپ کا مسئلہ ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔
"بہرحال جو بھی ہے، میں چاہتی ہوں کہ تم آج رات کا کھانا بڑی حویلی آ کر ہی کھاؤ، ہم انتظار کریں گے۔" آسیہ آفندی نے اپنا حکم صادر کرنا چاہا تھا۔
"ایم سوری۔" اس نے انتہائی مختصر سے الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔
"کیوں..... آخر ایسی کیا بات ہے جو تمہارے قدموں کو بڑی حویلی آنے سے روک رہی ہے؟" وہ کچھ عجیب سے انداز میں بولی تھیں۔
"بھرم....." اس نے یک لفظی جواب دیا۔
"بھرم....." وہ ناسمجھی سے بولیں۔
"ہاں بھرم..... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرے آنے سے بہت سارے بھرم ٹوٹیں گے اور جہاں بھرم ٹوٹتے ہیں وہاں دل تو بے شک ٹوٹ جاتے ہیں اور کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔" وہ طنزیہ سا بولا تھا۔
"میں جانتی ہوں کہ تم وکیل ہو۔" ان کا اشارہ اس کی باتوں اور اس کی دلیلوں کی طرف تھا۔
"اور آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ میں ہار بھی چکا ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔
"تم نے اپنی ہار خود تسلیم کر لی ہے، کسی منصف نے فیصلہ نہیں سنایا ابھی تک۔" انہوں نے بھی دلیل دی تھی۔
"کیونکہ میں حقیقت پسند آدمی ہوں، وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز کو قبول کر لیتا ہوں چاہے وہ میری ہار ہی کیوں نہ ہو؟" وہ دھیمے لہجے سے بول رہا تھا۔
"پھر بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کو فیس کرنے سے گھبرا رہے ہو؟" وہ حیران ہوئیں۔
"انسان ہوں، گھبرا نہیں سکتا، کیونکہ حقیقت بہت سفاک ہوتی ہے۔" وہ تلخ ہو رہا تھا۔
"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم گھبراؤ مت اور حقیقت کو فیس کرو کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے کچھ ایسا جو تمہیں بہت

اذیت دیئے ہوئے ہے۔" آسیہ آخندی کے لہجے میں نرمی چھلکی تھی۔

"مجھے اذیت میں ہی رہنے دیں، ورنہ آپ اذیت میں آجائیں گی۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیا اگر زہرہ تمہیں اس طرح بلاتی تو تم تب بھی نہ آتے۔" یہ ان کا آخری پوائنٹ تھا جس کو انہوں نے بالآخر استعمال کر ہی لیا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" دل آور کا دل جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں جا گرا تھا۔

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل آور ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا تھا اور وہیں کھڑے کھڑے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ آخر انہوں نے کس دعوے سے یہ بات کہہ کر فون کیا ہے۔

"آخر کس دعوے سے....."

وہ سوچتا ہوا اور سلگتا ہوا سا اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا اور اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے سگریٹ بھی سلگا لیا تھا۔

نبیل ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا عدیل گاڑی میں بجتے میوزک اور نبیل سے ہلکی پھلکی گپ شپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

اس نے موبائل نکال کر دیکھا، شہریار کا نمبر تھا اور اس نے سی ڈی پلیئر کا والیوم کم کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی، کیونکہ شہریار نے بہت دنوں بعد اسے کال کی تھی۔

"ہیلو استاد..... کیسے ہو؟" شہریار کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

"ٹھیک ٹھاک..... اللہ کا بڑا احسان ہے یار۔" عدیل بھی جواباً خاصے فریش لہجے میں بولا تھا۔

"مجھے کچھ بتانا تھا اسی لیے فون کیا ہے؟" شہریار کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

"ہاں بتاؤ میں سن رہا ہوں۔" عدیل ہمہ تن گوش ہوا تھا۔

"مجھے جاب مل گئی ہے۔" اس نے فوراً خوشخبری سنائی۔

"ارے سچ....." عدیل خوشی سے چہکا تھا۔

"ہاں استاد سچ....." وہ بھی اپنی خوشی کا اظہار کافی کھل کے کر رہا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو یار! مجھے بہت خوشی ہوئی ہے تمہاری جاب کا سن کر۔" عدیل کو واقعی بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی اور اس کا انداز و اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔

"خیر مبارک استاد! میرے گھر والوں کو بھی بہت خوشی ہو رہی ہے اور اسی خوشی میں میری اماں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ یہ لیں اماں سے بات کر لیں۔"

شہریار نے باتوں باتوں میں آناً فاناً اپنا موبائل لے کر اپنی امی کو پکڑا دیا تھا اور عدیل سفر کے دوران نبیل کے ساتھ ماحول کی نزاکت کے خیال سے انکار کرتے کرتے رُک گیا تھا کیونکہ تب تک فون ان کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔

"ہیلو....." دوسری طرف سے شہریار کی امی کی آواز سنائی دی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟ بہت بہت مبارک ہو آپ کو، شہریار کی جاب کا مسئلہ حل ہو گیا۔" عدیل کو مجبوراً بڑی خوش اخلاقی اور خوش دلی سے پیش آنا پڑا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں تمہیں بھی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ نے بڑے عرصے بعد اتنی بڑی خوشی دی ہے اور اسی خوشی میں ہم لوگ چاہ رہے تھے کہ اگر ایک اور خوشی مل جاتی تو اس خوشی کا مزا دوبالا ہو جاتا۔" انہوں نے جیسے تمہیں باندھی تھی۔

"ایک اور خوشی..... میں سمجھا نہیں؟" عدیل واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"وہ دراصل بیٹا ہم لوگ تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔ ایمن بیٹی سے ملنے کے لیے۔" انہوں نے ایمن کا نام واضح کرنے ہی مناسب سمجھا تھا تاکہ عدیل بھی آسانی سے سمجھ جاتا۔

"ایمن بیٹی سے؟ آنٹی آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہا۔" عدیل اب بھی سمجھ اور ناسمجھی کے دائرے میں ہی اٹکا

تھا۔

''ارے بیٹا! میں ایمن کے رشتے کے سلسلے میں آنا چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ ایمن میرے شہریار کی دلہن بنے۔ اس لیے سوچا کہ تمہاری امی اور ابو سے بھی ملاقات ہو جائے، آخر ہم نے انہی کے در پہ تو سوالی بن کر جانا ہے۔'' انہوں نے آخر صاف لفظوں میں کہہ ہی دیا تھا اور عدیل ان کے منہ سے ایمن کے رشتے کی بات سن کر خوشی اور حیرت سے بے یقین سا ہو گیا تھا۔

''بیلا بیٹا! تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟''

''ارے نہیں نہیں آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں ہے، دراصل اپنے آفس کے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہا ہوں، راستے میں ہوں، اس لیے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ آپ ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں تو موسٹ ویلکم آپ جب چاہیں آ سکتی ہیں، باقی باتیں آپ آئیں گی تو وہ بھی ہو جائیں گی۔'' عدیل نے فوراً ہی بات سنبھالی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم اسلام آباد سے واپس آ جاؤ تو ہم آ جائیں گے، لیکن منصافی کے ساتھ آخر شہریار تمہارا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔'' دوسری اپنائیت سے بولی تھیں اور عدیل مسکرا کے رہ گیا تھا۔

''جی آنٹی! اگر اللہ تعالیٰ نے میری بہن کا نصیب شہریار کے نصیب سے جوڑا ہے تو میں اپنی بہن کو ایک خوش نصیب لڑکی کے گھر کا بھی مطمئن ہے، غیرت مند ہے، اس لیے ہمیں اور کیا چاہیے، لیکن پھر بھی آخری فیصلہ امی اور ابو کا ہی ہو گا میں ان سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گا۔'' عدیل نے انہیں بھرپور تسلی دی تھی کیونکہ وہ زیادہ نخرے دکھا کر یا موڈ بنا کر انہیں بددل نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اللہ کے سامنے کوئی ناشکری دکھانا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! ہم دوبارہ فون کر لیں گے۔ تم خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ اللہ حافظ۔'' انہوں نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل، اللہ کی اتنی کرم نوازی پہ دل ہی دل میں شکر گزار ہو رہا تھا کہ چلو شکر ہے کہ کوئی تو ابتدا ہوئی۔

''لڑکا کیسا ہے؟'' نبیل بھی اس کی ساری گفتگو سن چکا تھا اور اس نے جان بوجھ کر ہی اس کی بات میں انٹرسٹ ظاہر کیا تھا۔

''اچھا ہے..... بلکہ بہت اچھا ہے میرے ساتھ ہی ورکشاپ میں کام کرتا تھا جیسے ہی ورکشاپ بند ہوئی۔ ہم لوگ بے روزگار ہو گئے، لیکن پھر بھی ہمت کسی نے بھی نہیں ہاری اور آج اسے بھی جاب مل گئی ہے۔ اچھی جاب ہے وہ مطمئن اور خوش ہے اور اس کے گھر والے اس کی اس خوشی کے بعد اس کا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔'' عدیل بتاتے بتاتے آخر میں چپ ہو گیا تھا۔

''تمہاری سسٹر کے ساتھ؟'' نبیل جان بوجھ کر ایسے سوال پوچھ رہا تھا۔

''جی.....'' وہ آہستگی سے بولا۔

''تو پھر کیا خیال ہے تمہارا اس رشتے کے بارے میں؟'' اتفاقاً ہی یہ بات چھڑ گئی تھی تو وہ اس سے اس کے سارے خیالات جاننا چاہتا تھا۔

''میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ امی ابو بھی کوئی انکار نہیں کریں گے، کیونکہ ایسے اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ کیا ہوا جو وہ مالی لحاظ سے تھوڑا دیک ہے، لیکن باقی ہر لحاظ سے تو بہت اسٹرانگ ہے نا۔ نیت اور کردار کا کھرا ہے، بس میں اسی چیز پہ مطمئن ہوں اور مجھے پتا ہے کہ وہ میری بہن کو ہمیشہ بہت خوش رکھے گا اور اگر نہ بھی رکھ سکا تو اللہ مالک ہے، زندگی میں اپ اونز تو آتے ہی رہتے ہیں، ماں باپ کے گھر میں مشکل اٹھانا پڑے تو لڑکیاں برداشت کر لیتی ہیں، تو سسرال جا کر کوئی مشکل آ جائے تو انہیں وہ بھی برداشت کرنی چاہیے صبر اور ہمت کے ساتھ۔''

عدیل کی باتوں نے نبیل کے ذہن کی رہی سہی کشمکش بھی دور کر دی تھی اور وہ چند سیکنڈز میں ہی ریلیکس ہو گیا تھا۔

''ہوں..... اچھی سوچ ہے تمہاری، مجھے بہت خوشی ہوئی یہ سن کر، ہر ماں باپ اور بہن بھائیوں کو ایسی ہی مثبت سوچ رکھنی چاہیے۔ ان شاء اللہ، اللہ نصیب اچھے کرے گا۔'' نبیل نے اس کے خیالات اور اس کی سوچ کو سراہا تھا۔

''آمین دعا کیجیے گا۔'' عدیل آہستگی سے بولا۔

''اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' نبیل نے گردن موڑتے ہوئے اسے اک نظر دیکھا تھا۔

''کیا مطلب؟'' عدیل ٹھٹکا۔

''یہی شادی وغیرہ کے سلسلے میں..... کیا پلاننگ ہے تمہاری؟'' نبیل اپنے مطلب کی بات جاننا چاہتا تھا اور عدیل اس کے

سوال پہ چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

''بولو نا..... کچھ تو سوچ ہی رکھا ہوگا؟'' نبیل اسے بولنے پہ اُکسا رہا تھا۔

''نہیں..... ابھی کچھ بھی نہیں سوچ رکھا ابھی مجھے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا ہے اور ابھی مجھے اپنا گھر اسٹیبلش کرنا ہے اس لیے اپنے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچا اور نہ ہی کبھی کوئی پلاننگ کی ہے۔'' عدیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بارے میں بھی سوچو کیونکہ میں بھی اپنی بہن کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔''

نبیل نے اسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا دیا تھا اور عدیل نے اس کرنٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یکدم نبیل کی طرف دیکھا تھا وہ ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی کی سکرین کی طرف دیکھ رہا تھا اور بہت پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

''یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' عدیل ہکلا گیا تھا۔

''میں جو بھی کہہ رہا ہوں بہت زیادہ سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔''

''م..... مگر نبیل صاحب؟''

''میں جانتا ہوں عدیل تم عدیحہ میں انٹرسٹڈ ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے، بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہوگا کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور محبت ایک بے اختیاری جذبہ ہے یہ کہیں بھی کسی کے بھی ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں انسان کی اپنی کوئی مرضی اور کوئی کوشش شامل نہیں ہوتی، اس لیے تم دونوں کی کوئی غلطی نہیں ہے، آخر تم لوگ بھی انسان ہی ہو، لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ محبت ایک مضبوط رشتے میں بدل جائے تو زیادہ اچھا رہے گا اور ہمیں بھی کچھ سکون مل جائے گا۔''

نبیل نے بڑے ہی اچھے اور احسن طریقے سے ساری بات واضح کرتے ہوئے عدیل کو حیران پریشان چھوڑ دیا تھا، کیونکہ اسے یکے بعد دیگرے دو جھٹکے لگ چکے تھے اور ان دو جھٹکوں نے ہی اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟''

نبیل نے ذرا کی ذرا سامنے سکرین سے نظریں ہٹا کر عدیل کی سمت دیکھا تھا، عدیل نظریں جھکا گیا تھا۔

''لیکن میں فی الحال خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں سوالی بن کے آپ کے در پہ آ سکوں۔'' وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔

''تم کس قابل ہو اور کس قابل نہیں ہو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ باکردار ہو، دیانت دار ہو، محنتی ہو اور کیا چاہیے ہمیں؟ یہی ساری کوالیٹیز ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے گنوائی ہیں اور یہی ساری کوالیٹیز تم میں آل ریڈی موجود ہیں پھر تم کیوں ہمارے در پہ سوالی بن کے نہیں آ سکتے؟ جبکہ میں نے تو تمہیں سوالی بننے کی مہلت ہی نہیں دی، تمہارا ہاتھ بڑھنے سے پہلے ہی تمہارا ہاتھ تھام لیا ہے اور وہ فیصلہ بیٹھے بیٹھے کر دیا ہے جس کو سوچنے میں اور کرنے میں لوگ سالوں اور مہینوں لگا دیتے ہیں، ہم سے مشورہ کیا ہے نہ دل آور سے..... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ صرف وہی دونوں ہیں جو زیادہ اچھے ہیں اس معاملے سے..... لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن کر انہیں بھی بہت خوشی ہوگی اور کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

نبیل بہت تحمل اور اپنائیت سے بات کر رہا تھا اس لیے اب عدیل کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا آخر وہ مزید کیا کہتا؟

''تم بے شک فی الحال بارات لے کر نہ آؤ، لیکن ایک رنگ پہنا کر عدیحہ کو اپنے نام سے منسوب کر لو تو یہ بھی رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے کافی ہوگا اور دونوں فیملیز میں ایک نئے رشتے کی ڈور بھی بندھ جائے گی۔'' اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔

''تھینک یو میں امی اور ابو سے بات کروں گا، وہ باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں گے آپ کے گھر اور پھر کسی روز رسم بھی کر لیں گی۔'' عدیل نے ہامی بھر لی تھی۔

''اوکے..... تو پھر اب..... صاحب نہیں بلکہ نبیل بھائی ہونا چاہیے کیونکہ مجھے بھی تمہاری شکل میں اپنا ایک بھائی نظر آ رہا ہے، چھوٹا بھائی، جواب ہمیشہ ہر غم اور ہر خوشی میں میرے شانہ بشانہ اسی طرح قدم بڑھائے گا اور ہر طویل سفر میں میرا ساتھ دے گا۔''

نبیل نے اس کے اور اپنے درمیان کی اجنبیت اور غیریت مٹانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اور عدیل اس کی بات پہ مسکرا دیا تھا۔

''ان شاء اللہ.....'' عدیل نے بڑے صدق دل سے کہا تھا۔

''کیونکہ آخر اللہ تعالیٰ نے بیٹھے بیٹھے اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دی تھی اور اس کی زندگی کے دو مشکل ترین کاموں کو اس کے لیے آسان بنا دیا تھا اور اسے ذرا سی بھی پریشانی نہیں اُٹھانی پڑی تھی۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، تو رحیم و کریم ہے، تو جو چاہے کر سکتا ہے، بن مانگے بھی مرادیں پوری کر دیتا ہے۔"
عدیل کا رواں رواں اللہ کے حضور شکر گزار اور مشکور ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یونہی راستے سے ہی واپس لوٹ جائے اور امی ابو اور مریم کو یہ دونوں خوشخبریاں جا کر سنائے، لیکن کیا کرتا اسے سفر میں نیل کا بھی ساتھ دینا تھا اور اسے اب کسی بھی طرح اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔

♥

"امی پلیز..... چپ ہو جائیں..... اگر ابا کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہمارے لیے مزید مسئلہ کھڑا ہو جائے گا، ان کی طبیعت بگڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔"
ایمن اور ایمان دونوں ہی عابدہ خاتون کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں، کیونکہ شام حد سے زیادہ گہری ہو چکی تھی اور مریم ابھی گھر نہیں آئی تھی۔
انہوں نے ایک بار پی سی او سے اور ایک بار ساتھ والی کلثوم کے گھر سے مریم کے نمبر پہ کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نمبر بار بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی آف ہی مل رہا تھا اور ہر بار مایوس اور پریشان سی گھر واپس لوٹ آئی تھیں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ویسے شام گہری سے بھی گہری ہوتی جا رہی تھی تو ان کا دل واہموں اور خدشوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے۔ "تو کیا کروں..... چپ ہو کر بیٹھ جاؤں؟ وہ نہیں آئی تب بھی سکون سے کھانا کھا کر اپنے بستر میں جا کر سو جاؤں؟"
ایمن نے روتے روتے سسکیوں کے درمیان پوچھا تھا۔
"ہم ایسا کب کہہ رہے ہیں امی! لیکن پلیز خود کو سنبھالیں اور میرے ساتھ چلیں، ہم دوبارہ فون ٹرائی کرتے ہیں۔" ایمن نے انہیں سمجھانے کی، سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔
"اور کتنا ٹرائی کریں گے؟ چار بجے سے فون ٹرائی کرنا شروع کیا ہے، لیکن ایک بار بھی رنگ نہیں گئی، کال نہیں ملی اور نہ ہی فون بند ہوا ہے، پتا نہیں کیا ہوا ہے میری بچی کے ساتھ؟ نجانے کس حال میں ہوگی اور کہاں ہوگی ایسا کون سا حادثہ پیش آیا ہے کہ اس کی کوئی خبر ہی نہیں مل رہی؟" عابدہ خاتون بلک بلک کر رو رہی تھیں۔
"تو پھر ایسا کریں کہ بھائی کو فون کریں اور انہیں گھر بلائیں۔" ایمان نے دوسرا مشورہ دیا۔
"کیسے بلاؤں اسے؟ اتنے گھنٹے تو اس کے سفر میں ہی کٹ جائیں گے اور یہ شام آدھی رات میں ڈھل جائے گی اور اگر شام آدھی رات میں ڈھل گئی تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا، ہم لٹ جائیں گے، برباد ہو جائیں گے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا، عابدہ خاتون زار و قطار رو رہی تھیں ایمن اور ایمان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے اور اپنی ماں سے لپٹ کر وہ دونوں بھی خوب روئی تھیں۔
اور پھر بڑی ہمت اور حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے وہ دونوں ماں بیٹی عدیل کو فون کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھیں، پی سی او ان کے گھر سے خاصا دور تھا اس لیے وہ دونوں اندر سے ڈر بھی رہی تھیں، لیکن افسوس کہ قسمت نے اس دفعہ بھی ساتھ نہیں دیا تھا کیونکہ اور عدیل دونوں ہی میٹنگ میں تھے اور فون سائلنٹ پہ تھے اس لیے عدیل کو پتا ہی نہ چلا کہ ایمن اور امی اسے کال کرتی رہی تھیں۔
اور عدیل کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تو عابدہ خاتون کی کمر ہی ٹوٹ گئی تھی، وہ پاؤں گھسیٹتی ہوئی گھر آئی تھیں اور واپس آ کر پلنگ پہ گرنے کے ساتھ ہی ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اب تاریکی اور اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

♥

"آپ نے دل آور شاہ کو کال کی تھی؟ کیا کہتا ہے وہ؟"
آذر نے آفس سے واپس آتے ہی استفسار کیا تھا اور آسیہ آفندی نے سیڑھیوں پہ ٹھٹکنے والی کومل کی طرف دیکھا تھا جو اپنی شادی کے دنوں میں بھی ٹھیک طرح سے خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔
اور وجہ کیا تھی، آسیہ آفندی بھی جان گئی تھیں۔
"ہاں..... کی تھی کال، آ جائے گا کچھ دیر تک۔" انہوں نے بہت نپے تلے سے لہجے میں بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے آجائے تو بہتر ہوگا۔ آخر کچھ تو فائنل ہو، یہ معاملہ یونہی تو نہیں لٹکائے رکھنا ہم نے۔''

آذر کے لہجے میں غصہ اور خفگی تھی جس پہ آسیہ آفندی اک نظر غور کر اسے دیکھا تھا۔

''وہ اس گھر میں آپ لوگوں کی لڑائی جھگڑے کے لیے یا پھر دشمنی کے لیے نہیں آرہا ہے، میں نے اسے کھانے پہ انوائیٹ کیا ہے، جو بھی بات ہوگی، کھانا کھانے کے بعد ہوگی او ساتھ ساتھ تم سب لوگ مت بھولو کہ علیزے اب میں اس کے نکاح میں ہے، اس کا حق اور اختیار ہم سے زیادہ ہے، وہ چاہے تو اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہے، اس لیے پلیز ہم سب کو بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوگی۔'' انہوں نے آذر کے تیور دیکھ کر ہی اسے پہلے سے سمجھا دینا بہتر سمجھا تھا۔

جس پہ آذر خاموش ہو گیا تھا اور سیڑھیوں کی ریلنگ پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی کومل کو اندر ہی اندر بہت خوشی اور تسلی ہوئی تھی کہ چلو شکر ہے کہ ابھی کوئی تو امید باقی ہے نا۔

''آئی! آپ بھی یہ جانتی ہیں کہ علیزے اس کے ساتھ خوش نہیں ہے، یہ سارا کھیل زبردستی کا کھیل ہے اور اس نے یہ کھیل کیوں کھیلا ہے یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں اور اسی لیے تو اسے یہاں بلا رہے ہیں، آخر ہمیں کچھ تو پتا چلے ہم کیوں اندھیرے میں ہی رہے ہیں۔'' آذر ٹیشن میں آگیا تھا اور خاموش ہو جانے کے بعد بھی ایک بار پھر بول پڑا تھا۔

''صبر اور صرف صبر..... جہاں اتنا وقت گزر چکا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی، ورنہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔''

انہوں نے آذر کو کچھ جتایا تھا اور وہ ان کی بات پہ مزید کچھ بھی کہے بغیر ضبط کرتا اور اندر ہی اندر سلگتا ہوا سا آگے بڑھ گیا تھا اور کومل کا دل چاہا تھا کہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی کو بانہوں میں بھر کر بھینچ لے، انہوں نے بہت حقیقت پسندی سے کام لیا تھا آخر۔

♥

جو ہو فیصلہ وہ سنایئے اسے حشر پر نہ اٹھایئے
جو کریں گے آپ ستم وہاں وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی

بالآخر اس نے بڑی حویلی کے گیٹ پہ رکتے ہوئے گاڑی کے ہارن پہ ہاتھ رکھ ہی دیا تھا اور اس کی گاڑی کے ہارن پہ جہاں چوکیدار عارف نے ایک دم الرٹ ہو کر گیٹ کھولا تھا وہیں پہ حویلی کے باقی افراد بھی اپنی اپنی جگہ پہ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں الرٹ ہو گئے تھے۔

اس کی چمکتی دمکتی سرف بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی حویلی کے طویل اور انجانی کشادہ سے ڈرائیو وے پہ آئی تھی اور چوکیدار عارف ''منصور حسین'' کی پرسنالٹی اور رعب دیکھتا رہ گیا تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے اس سے ملے، لیکن پھر اس کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ وہیں کا وہیں رک گیا تھا اور دل آور شاہ گاڑی سے اتر کر اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا لیکن اس کا ایک ایک قدم اس کی ذات پہ عذاب ثابت ہو رہا تھا۔

اس کے جسم کی رگیں پھٹ رہی تھیں اور دماغ میں الگ اُبال سے اُٹھ رہے تھے۔

لیکن پھر بھی وہ قدم اُتھار ہا تھا اور محشر کے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا، کیونکہ اس وقت بڑی حویلی اس کے لیے محشر کے میدان سے کچھ کم نہیں تھی۔

اور اس نے اس سے بچنے کی کوشش بھی بہت کی تھی مگر نہیں۔ اسے اس روز حساب کا سامنا کرنے پہ مجبور کیا گیا تھا اور اسے آنا ہی پڑا تھا۔

اور جب وہ آ ہی گیا تھا تو دیکھنے والوں کو ایک دم پتھر اور سپاٹ نظر آرہا تھا۔

شاید اسی لیے آسیہ آفندی اسے کوریڈور میں داخل ہوتے دیکھ کر خود کوریڈور کے دوسرے سرے پہ ہی رُک گئی تھیں اور وہ طویل کوریڈور اپنے مضبوط قدموں سے طے کرتا ان کے قریب آ گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' ان کے سامنے رُکتے ہوئے اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو۔'' وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملاقات کی فارمیلٹی نبھا رہے تھے اور یہ بات وہ دونوں ہی جانتے تھے۔

"آپ کیسی ہیں؟ اور آپ کی صحت.....؟" اس نے بات بڑھانے کی کوشش کی تھی۔
"الحمد للہ..... ٹھیک ہوں اور صحت بھی اچھی ہے، آؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔" وہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھیں اور دل آور نے چپ چاپ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔
"بیگم صاحبہ! عائشہ بی بی نے کہا ہے کہ دل آور صاحب کو لے کر بڑے صاحب کے کمرے میں ہی آ جائیں۔" ان دونوں کے قدم رجو کی آواز پہ ہی رُک گئے تھے اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا جبکہ وہ ان کے منہ سے کچھ سننے کا منتظر کھڑا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے، تم چلو ہم آتے ہیں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رجو کو وہاں سے بھیج دیا تھا اور پھر دوبارہ اس کی طرف دیکھا تھا۔
"آؤ وہیں چلتے ہیں، وقار سے بھی ملاقات ہو جائے گی تمہاری۔" انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اسے اب وقار آفندی کے بیڈ روم کی طرف چلنے کا کہا تھا۔
اور دل آور نے پہلی بار ایک اذیت بھری سانس کھینچتے ہوئے سر خم کر دیا تھا اور ان کے ساتھ چل پڑا تھا پھر دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے وقار آفندی کے بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے اور داخل ہوتے ہی اس کے قدم جیسے اپنی جگہ جم سے گئے تھے کیونکہ سامنے ہی وقار آفندی کے سرہانے اس کی دشمن جاں اس کی اپنی زوجہ بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے بھی اندر آتے ہوئے اپنے "مجازی خدا" کو نظریں اٹھا کر سرتاپا دیکھا تھا اور نظروں کا تصادم ہوتے ہی وہ نظریں چرا گئی تھی، نہ سلام کیا تھا، نہ دعا کی تھی۔
بلکہ کچھ اس طرح سے پوز کیا تھا کہ جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ بھی جو اسے اک نظر دیکھ کر اندر سے یکدم موم کی طرح پگھلا تھا اس کے نظریں چرا لینے سے فوراً ہی کسی پتھریلے پہاڑ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جس پہ اب کچھ بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔
یہاں تک کہ علیزے کی موجودگی کا احساس بھی نہیں۔ کیونکہ وہ اس سے اور اس کی موجودگی کے احساس سے انجان ہو چکا تھا۔
"السلام علیکم!" اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے اور اونچی آواز میں سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟" عائشہ آفندی صوفے سے اُٹھ کر اس کے سامنے آ گئی تھیں اور اس کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا تھا۔
"جی ٹھیک ہوں۔" اس نے بڑے مختصر سے الفاظ میں جواب دیا تھا۔
"آؤ بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"تھینک یو۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔
"السلام علیکم۔" اچانک دانیال اور جودت بھی اندر آ گئے تھے اور دانیال نے دل آور کو دیکھ کر خود آگے بڑھ کے اس سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا تھا۔
البتہ آذر وہاں پہلے سے موجود تھا، لیکن اس نے دل آور سے ہاتھ نہیں ملایا تھا اور نہ ہی دل آور نے خود ایسی کوئی کوشش کی تھی۔
"بیٹھیے..... آپ کھڑی کیوں ہیں؟ پلیز بیٹھ جائیے۔" دل آور نے آسیہ آفندی کو وقار آفندی کے بیڈ کے قریب ہی کھڑے دیکھ کر بیٹھنے کے لیے متوجہ کیا تھا۔
"نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے، وہ بس میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تم پہلے کھانا کھا لیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم بھی تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" آسیہ آفندی بیڈ روم کے ماحول کی کشیدگی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔
"بڑی حویلی کی طرف سے دعوت کا سن کر ساری بھوک ہی اُڑ گئی تھی اس لیے فی الحال کوئی بھوک نہیں ہے۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"تو ٹھنڈا منگواؤ لیتی ہوں۔"
"تھینکس۔ میری پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔"
"تو پھر آئے کیوں ہو؟" عائشہ آفندی ناراضی سے بولیں۔
"عدالت میں پیشی کے لیے۔" وہ بھی ڈرنے اور جھکنے والا نہیں تھا۔

"اور تم جانتے ہو گے کہ فیصلہ بھی آج ہی ہو گا۔" یہ آواز آذر کی تھی اور دل آور نے آذر کی طرف دیکھا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" اس نے جان بوجھ کر سوال اُٹھایا۔

"علیزے کی طلاق کا فیصلہ....." آذر نے طلاق کے فیصلے پہ زور دیا تھا۔

"علیزے کی طلاق کا فیصلہ..... لیکن وہ کیوں؟" وہ جیسے سب کچھ ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

"کیونکہ علیزے تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔" ان دونوں کے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

"کیوں..... علیزے میرے ساتھ کیوں نہیں رہنا چاہتی؟ کیا میں بُرا ہوں اس لیے؟" وہ آذر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں شاید....." آذر نے کندھے اچکائے۔

"شاید نہیں یقیناً میں بہت بُرا ہوں، لیکن پھر بھی بدکردار نہیں ہوں اور اس چیز کو میرا خیال ہے کہ علیزے سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔" اس کی بات پہ علیزے کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا تھا۔ کیونکہ اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔

"تم کتنے بدکردار ہو، یہ بات علیزے ہی نہیں ہم سب بھی کافی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" آذر نے کمرے میں موجود تمام افراد کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں علیزے کو یہاں سے لے گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ میں بدکردار ہو گیا تھا ہونہہ..... اگر ایک لڑکی کو سب کے سامنے محض اپنے ساتھ لے جانا بدکرداری ہے تو ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دیں گے آپ لوگ؟" اس نے کہتے ہوئے آذر اور باقی سب کو بھی ایک سرسری سی نظر سے دیکھا تھا۔ لیکن آذر کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"بتاؤ آذر آفندی کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دو گے؟ بُرا یا بد سے بھی بدتر؟" اس نے آذر آفندی کو بولنے پہ اکسایا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" آذر کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن آپ لوگوں نے صرف آپ لوگوں نے مجھے یہ سب کہنے پہ مجبور کر دیا ہے، ورنہ آپ لوگوں کو کسی دوسرے کی نظروں میں گرا کر خود سرخرو ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن مجھے مجبور کیا گیا ہے کہ میں خویلی آؤں اور اپنی اس گستاخ زبان سے وہ سارے رازعیاں کر دوں جن کو میں صرف اپنے آپ کے سامنے عیاں کرتے ہوئے بھی روپڑتا ہوں۔ اور جل اُٹھتا ہوں۔"

دل آور کی شکستہ سی آواز بات کرتے کرتے انتہائی مدھم پڑ گئی تھی اور اپنے ہیڈ پہ ساکت پڑے وقار آفندی کی آنکھوں سے بے آواز بہہ نکلے تھے اور ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

"لیکن میں اور کوئی راز نہیں جاننا چاہتی۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا تھا۔ کس گناہ کی سزا دی تھی مجھے؟ کیا قصور تھا میرا؟ کیا قصور تھا آخر؟ بتاؤ مجھے۔"

دل آور کی بات سنتے سنتے علیزے پھٹ پڑی تھی اور دل آور نے اس پہ یکدم نظریں اٹھا کر اسے بہت ہی زخمی نظروں سے دیکھا تھا یوں جیسے وہ بہت اذیت میں ہو۔

"میں بتانا نہیں چاہتا علیزے اس بات کو رہنے دو۔" وہ پھر بھی گریز سے کام لے رہا تھا۔

"کیوں رہنے دے؟ اس لیے کہ تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟ تم جھوٹے ہو..... بدکردار ہو۔ بدنیت ہو۔" آذر نے بھی سارے ہی نشتر چھوڑ ڈالے تھے۔

"تمہارے دل میں کوئی بات ہے تو تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟" یہ سوال عائشہ آفندی کی طرف سے آیا تھا۔

"کیونکہ مجھے پتا ہے کہ یہاں بہت سارے رشتوں کے بھرم ٹوٹیں گے۔" اس نے پھر بھی ان سب کو باز رکھنا چاہا تھا۔

"لیکن پھر بھی ہم سب سچ سننا چاہتے ہیں۔" وانیال نے بھی مداخلت کی۔

"سچ سننے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔" دل آور انہیں بار بار روک رہا تھا۔

"اور سچ بولنے کے لیے ہمت کی اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے، جو فی الحال تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"آذر آفندی! میری ہمت اور میری جرأت کو مت آزماؤ، میں تمہاری اس پوری حویلی کا تختہ اُلٹ کے رکھ سکتا ہوں، لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ زبان سے کچھ نہ کہوں، جو خدا کی طرف سے سزا جھیل رہا ہے اسے وہی سزا جھیلنے دوں۔ اب کسی اور سزا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر میری طرف سے۔"

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم بتاؤ، تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ آخر تم نے ایسا کیا کیوں تھا؟"

آسیہ آفندی بھی کہے بغیر نہیں رہ سکی تھیں اور دل آور نے محض اک سرسری سی نظر آسیہ آفندی پر ڈالی تھی اور پھر وقار آفندی کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنے شوہر وقار آفندی سے پوچھیے کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کس لیے سزا دی تھی؟ کیا قصور تھا علیزے آفندی کا؟" اس نے وقار آفندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"وقار آفندی سے؟ مگر ان سے کیوں؟" ان سب کو تعجب ہوا تھا۔

"کیونکہ یہ گناہگار ہیں، یہ بدکردار ہیں، بدنیت ہیں، یہ جھوٹے ہیں..... یہ نفس کی پیٹ میں آنے والے زانی ہیں۔" وہ یکدم بولتے بولتے درمیان سب کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" آذر کو دھچکا سا لگا تھا۔

"ہوش..... میں ہی تو ہوش میں ہوں آذر آفندی! اس لیے تو بے سکونی کی زندگی جی رہا ہوں اور میری زندگی کو بے سکون کرنے والا شخص یہ ہے۔ وقار آفندی۔ بڑی حویلی کی سب سے بڑی اور معزز شخصیت۔ تم سب کے سرپرست۔ تم سب کے آئیڈیل اور اس ملک کے کامیاب برنس مین۔" وہ وقار آفندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور چند سیکنڈز یونہی ان کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نظروں کا زاویہ دوبارہ بدل دیا تھا اور اب اس کی نظروں کا مرکز علیزے تھی۔

"تم جاننا چاہتی ہو نا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ اور تمہیں کس گناہ کی سزا دی تھی؟ تو پھر سنو آج۔" اس نے ڈائریکٹ علیزے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"زہرہ بتول شاہ اور بابر شاہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے، بابر شاہ کی شادی ہو چکی تھی، جبکہ زہرہ بتول شاہ کالج میں پڑھ رہی تھیں اور ابھی ان کے کالج کا پہلا سمسٹر بھی نہیں ہوا تھا کہ دل آور شاہ کی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور دل آور شاہ کی ساری ذمہ داری زہرہ بتول شاہ پہ آ گئی تھی۔ وہ دل آور شاہ کے لیے ایک پھوپھی نہیں بلکہ ماں کی طرح ثابت ہوئی تھیں اور اس جہان کی بچپن کی کیئی عائشہ آفندی سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

عائشہ آفندی نے ان دنوں ان کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ساتھ ساتھ انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا بھی مشورہ دیا تھا، لیکن زہرہ بتول شاہ نے دل آور شاہ کی خاطر اپنی مزید تعلیم کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا، کیونکہ وہ اسے گھر میں ملازمہ کے حوالے کر کے خود یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی تھیں۔ اس لیے عائشہ آفندی نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور انہی دنوں ملک وجاہت علی کے گھر سے عائشہ آفندی کے لیے پرپوزل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وقار آفندی اور ملک وجاہت علی کی دوستی رشتہ داری میں بدل گئی تھی۔

دوسری طرف عائشہ آفندی، اسرار آفندی اور اظہار آفندی کو ملک وجاہت علی کی بہن آسیہ علی بہت پسند آئی تھی اور وہ اسے بہو بنانے کا خواب سجا بیٹھے تھے۔

جبکہ وقار آفندی اس رشتے سے انکاری تھے، وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ملک وجاہت علی کی بہن کی خواہش ہے تو وہ دوبارہ پھر انکار نہیں کر سکے تھے، اور شادی کے لیے ہامی بھر لی تھی، اور یوں دونوں حویلیوں میں شادیوں کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

اور اپنی دوست کی شادی میں شریک ہونے کے لیے اور ان کی ہیلپ کرنے کے لیے زہرہ بتول شاہ کو وقاص قاسم بڑی حویلی آنا پڑا تھا اور عائشہ آفندی کی ہر خوشی اور ہر کام میں شریک ہونا پڑتا تھا اور اسی شرکت نے ان کی زندگی برباد کر ڈالی۔" وہ کہتے کہتے ذرا سا رکے لیے رُکا تھا اور کمرے میں موجود تمام افراد کا دم گھٹنے لگا تھا ان کی سانسیں تک رُک گئی تھیں۔

عائشہ آفندی اور زہرہ بتول شاہ دونوں آسیہ علی کے لیے شاپنگ کرنے گئی تھیں اور واپسی پہ زہرہ بتول شاہ بھی بڑی حویلی ہی آ گئی تھیں اور بڑی حویلی کے ڈرائنگ روم میں انہوں نے اپنی شاپنگ کا سامان پھیلاتے ہوئے آسیہ علی کے مایوں کے لیے لایا ہوا دوپٹہ اپنی دوست زہرہ بتول شاہ کے سر پر ڈال دیا تھا اور وہیں پہ وقار آفندی کی نظر کسی اور نظر میں بدل گئی تھی اور اس کا احساس زہرہ بتول شاہ کو بھی ہو گیا تھا۔

وہ فوراً واپس آ گئی تھیں لیکن وقار آفندی کی نظر واپس کیسے آ سکتی تھی؟ پھر انہوں نے بار ہا زہرہ بتول شاہ کے راستے میں حائل ہونا چاہا تھا اور وہ ہر بار دامن بچا جاتی تھیں اور یونہی کتراتے کتراتے اور دامن بچاتے بچاتے شادی کے دن قریب آ گئے تھے۔ وقار آفندی اس شادی سے انکار کر دینا چاہتے تھے مگر عائشہ آفندی کا خیال آتے ہی وہ اپنی اس حرکت سے رک جاتے تھے۔ کیونکہ اب عائشہ آفندی، وقار آفندی، آسیہ علی اور ملک وجاہت علی ایک ہی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور اگر یہ ڈور ٹوٹ جاتی تو وہ چاروں ہی بکھر جاتے، جو کہ وقار آفندی کو منظور نہیں تھا، اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وقار آفندی کو یہ شادی کرنا پڑی تھی اور یوں عائشہ آفندی بیاہ کر بڑی حویلی سے ملک حویلی چلی گئی تھیں اور آسیہ آفندی ملک حویلی سے بڑی حویلی آ گئی تھیں، سب کچھ بظاہر ٹھیک چل رہا تھا لیکن وقار آفندی کا ذہن اب بھی شادی سے پہلے والی خواہش میں اٹکا ہوا تھا اور اس خواہش میں چار سال گزر گئے تھے۔

اور ان چار سالوں میں ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی، البتہ عائشہ آفندی کے ہاں دانیال کی آمد ہو چکی تھی اور وہ تین سال تین ماہ کا ہو چکا تھا۔ تب دل آور شاہ کی عمر ساڑھے چار سال ہو چکی تھی اور زہرہ بتول شاہ نے بابر شاہ سے مشورہ کر کے دل آور شاہ کو سکول میں ایڈمٹ کروا دیا تھا اور خود فارغ رہنے لگی تھیں اور اسی فراغت سے تنگ آ کر انہوں نے دوبارہ سے تعلیم کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔ جس کی خبر وقار آفندی تک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ عائشہ آفندی میکے آئی ہوئی تھیں اور کبھی کبھار زہرہ بتول شاہ بھی چکر لگا لیتی تھیں اور اسی دوران وقار آفندی نے ایک بار پھر زہرہ بتول شاہ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار زہرہ بتول شاہ نے کافی بُری طرح سے انہیں جواب دیا تھا اور کافی عزت افزائی سے کام لیا تھا جس کو وقار آفندی دبا گئے تھے اور اندر ہی اندر لاوے کی طرح اُبلتے رہے تھے۔ اور یہ لاوا اگلے چار سالوں میں اتنی بُری طرح سے پک چکا تھا کہ وہ انسانیت اور حیوانیت کا فرق بھول گئے تھے۔"

دل آور بڑے بے حس سے انداز میں سب کچھ کہتا جا رہا تھا لیکن بات جب دُکھ کی حد تک پہنچی تھی تو اس کا لہجہ مدھم میں آ گیا تھا۔ اور آسیہ آفندی بیڈ کا سہارا لیتے ہوئے بیڈ پہ ہی بیٹھ گئی تھیں۔ جبکہ علیزے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی تھی اور آذر، جودت اور دانیال وغیرہ کے چہروں پہ ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں اور کانوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"وہ دن بہت ہی بدبخت دن تھا جب دانیال اور زین کا عقیقہ رکھا گیا تھا اور اس شاندار عقیقہ کی رسم میں حویلی کے تمام افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا، لیکن صرف وقار آفندی تھے جو اس رسم میں شریک نہیں ہو سکے تھے، کیونکہ وہ سنگاپور گئے ہوئے تھے اور واپس گھر آئے تو گھر خالی پڑا ہوا تھا، اور خالی گھر میں چکراتے ہوئے انہیں کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے ڈرنک کا انتظام کر لیا، کیونکہ ان کے ذہن پہ زہرہ بتول شاہ کا خیال سوار تھا۔

اور اپنے خیال کو ایک گندہ اور غلیظ عمل بخشتے ہوئے انہوں نے ملازمہ سے بہانا کر کے فون کروایا اور زہرہ بتول شاہ کو بڑی حویلی بلا لیا، یہ کہہ کر عائشہ آئی ہوئی ہے۔ زہرہ بتول شاہ نے سوال اُٹھایا کہ عائشہ کے بیٹوں کا تو عقیقہ ہے، لیکن ملازمہ نے بہانا کر دیا کہ عائشہ آفندی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے عقیقہ چند دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔" وہ پھر رُکا تھا اور علیزے کے چہرے کو دیکھا تھا جہاں زردیاں اُتر رہی تھیں۔

"زہرہ....." عائشہ آفندی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے تھے، کیونکہ ان کے منہ سے بے ساختہ اک سسکی سی اُبھری تھی۔

"دل آور شاہ اس وقت ساڑھے آٹھ سال کا تھا جب زہرہ بتول شاہ کو عائشہ آفندی کے نام پر دھوکا دے کر حویلی بلایا گیا تھا، حالانکہ حویلی بالکل خالی پڑی تھی، لیکن اس خالی حویلی میں ایک درندہ دل آور شاہ کی پھوپھی کے لیے تاک لگائے بیٹھا تھا۔

اور دل آور شاہ کو خبر ہی نہیں ہو سکی تھی، وہ بڑی حویلی کے لان میں چکراتا رہا اور اپنی پھوپھی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور اس انتظار میں اس کی بے چینی بھی شامل تھی، وہ بار بار ملازمہ سے استفسار کرتا رہا کہ اماں کب آئے گی اور ملازمہ ہر بار اسے اپنی باتوں میں بہلا پھسلا کر کسی اور چیز کی طرف متوجہ کر دیتی تھی، لیکن آخر کار دل آور شاہ تنگ آ کر اندر آ گیا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

ہیت سیڑھیوں کے نیچے بنے تہہ خانے سے رونے کی اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دل آور شاہ دیوانہ وار بھاگا تھا۔ دل
چی میں..... میں..... دل آور شاہ اپنی ماں کی آواز سن کر میرے جسم میں کرنٹ بھر گیا تھا اور میں سیدھا تہہ خانے میں جا پہنچا تھا
دیر ہو چکی تھی۔ میری ماں سب کچھ گنوا چکی تھی۔ اس کا دامن داغ دار ہو چکا تھا اس کی حرمت لٹ چکی تھی۔ درندہ اپنی درندگی
یا تھا۔
اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کی حالت دیکھتا رہ گیا تھا جو تہہ خانے کے فرش پہ بیٹھی رو رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں۔"
کہتے کہتے اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں یوں جیسے اس کی آنکھوں سے خون چھلک رہا ہو، اور زندگی کے اس اذیت ناک
وقار آفندی نے سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور شدت دل سے اپنی موت کی دعا کی تھی، مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ نے ان
یں ہی ان کے لیے سزا بنا ڈالی تھیں۔
"میں نے ان ہاتھوں سے اپنی اماں کے بکھرے ہوئے وجود کو سنبھالا تھا اور ان سے لپٹ کر انہیں چپ کروانے کی کوشش کی
پھر بڑی مشکلوں سے انہیں اپنے ساتھ لے کر بڑی حویلی سے نکل آیا تھا لیکن بڑی حویلی سے نکلتے ہوئے میں نے دعا کی تھی
وقار آفندی کو بھی بیٹی دے اور اس کی بیٹی کا بھی وہی حشر ہو جو آج میری ماں کا ہوا ہے۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن میری
میری سمجھ اور میری سوچ بہت بڑی تھی، مگر میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اس ایک دن میں میرا پورا گھر برباد ہو کے رہ جائے
ں آور سے اب مزید بولنا مشکل ہو چکا تھا، اس کے گلے میں پھندا سا لگنے لگا تھا۔
"میں اماں کا ہاتھ پکڑے گھر میں داخل ہوا تھا اور سامنے کھڑے بابا (بابر شاہ) کو دیکھ کر میرا بھی پورا جسم کانپ گیا تھا، وہ اماں
ت کو دیکھ کر بڑی تیزی سے قریب آئے تھے اور اماں کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ پھر انہوں نے اماں کو اس قدر جھنجوڑا کہ
سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔
اور وہ ان کے قدموں میں گر کر رو پڑی تھیں ان کی کوئی بہن نہیں تھی، ماں نہیں تھی، بھائی نہیں تھی جس سے وہ اپنا دکھ کہیں۔
اور صرف ایک بھائی تھا اور اس بھائی سے وہ یہ دکھ کیسے چھپا سکتی تھیں اس لیے سب کچھ کہہ دیا تھا اور بابر شاہ جیتے جی مر گئے
انہوں نے بہن کو سنبھالا، اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا اور انہیں ان کے بیڈ روم میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں گئے، اپنا
ر نکالا اور گھر سے نکل گئے تھے لیکن گھر سے نکلنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہہ کر گئے تھے کہ اگر وہ آج کی تاریخ میں وقار آفندی کو نہ
کے تو خود کو مار ڈالیں گے۔" وہ ذرا توقف کے لیے رکا تھا۔
"اور پھر ایسا ہی ہوا تھا، وہ بڑی حویلی پہنچے تو پتا چلا کہ وقار آفندی کراچی چلے گئے ہیں اس لیے وہ ناکام اور مایوسی سے واپس
آئے تھے لیکن شدت غضب سے دماغ میں اس قدر آبال اُٹھ رہے تھے کہ ان سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا اور انہوں نے
ستے میں چلتے چلتے خود کو گولی مار دی تھی۔ اور زندگی سے رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ بابر شاہ کی میت گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر
ں اماں پاگلوں کی طرح چیخی تھیں، وہاں میرا بھی بُرا حال ہو گیا تھا، اور ہم ایک دن میں ہی سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ اور اکیلے ہو
ئے تھے۔
پھر دنیا ہمارے لیے کسی جنگل سے کم نہیں تھی، ویرانی تھی، سناٹا تھا اور درندوں کی غراہٹ تھی وہ دن کیسے گزرے یہ صرف ہم
نتے تھے۔
لوگوں نے اماں پر الزام تراشی کرنا اور بہتان لگانا شروع کر دیا تھا، اسی لیے مجبوراً انہوں نے گھر بیچ دیا اور بابا کا سارا کاروبار
کروا کے اسلام آباد چلی گئیں اور لاہور شہر سے ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ دیا تھا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی اور مضبوط کرنے کی کوشش
تی تھی۔
لیکن اس واقعے کے ٹھیک تین مہینے بعد وہ پھر سے ایک عذاب سے گزری تھیں اور جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے زہر کا پیالہ
ے ہوئے وقار آفندی کے آفس میں فون کیا تھا اور ان سے ان کا نام مانگا تھا۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اس بچے کے لیے جو ناجائز تھا،
ک تھا، حرام تھا۔"
عائشہ آفندی کی آنکھوں سے آنسو اک تواتر سے بہہ رہے تھے اور آسیہ آفندی کے جسم پہ ایک کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔
"لیکن وقار آفندی نے انتہائی سفاکی سے انکار کر دیا تھا، یہ کہہ کر اگر وہ ایسا کچھ کریں گے تو ان کی بہن عائشہ کی زندگی بھی

برباد ہو جائے گی، میں آسیہ پہ کوئی سوتن نہیں لا سکتا اور نہ ہی آسیہ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہوں، اور ویسے بھی میرا ایک اسٹیٹس ہے، میں اپنے مقام سے نیچے نہیں آنا چاہتا۔ ہمارے درمیان جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور ابارشن کروا دو، ہسپتال کا سارا خرچہ میں افورڈ کروں گا۔" دل آور ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا کیونکہ اس سے بات کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا، بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

اور ان کے اس جواب پہ اماں پہ کیا گزری یہ میں جانتا ہوں اور ٹھیک دو دن بعد ملک وجاہت علی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وقار آفندی کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو گئی، وہی زندگی جس کو وہ آباد رکھنے کا بہانا کر رہے تھے پھر عائشہ آفندی پہ کیا گزری یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے، ملک وجاہت علی کے چالیسویں کے بعد ملک شرافت علی کی بُری نظر عائشہ آفندی پہ جا پڑی تھی۔ انہوں نے بھاوج سے شادی کا شوشا بھی چھوڑا تھا مگر عائشہ آفندی نے انکار کر دیا تھا۔

اور اسی انکار سے مشتعل ہو کر انہوں نے عائشہ آفندی کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ ملک شرافت علی کی بیوی نے انہیں بچا لیا تھا اور وقار آفندی کو فون کر کے عائشہ آفندی کو بڑی حویلی لے جانے کا کہا تھا اور ساری چویشن بھی بتائی تھی تب وقار آفندی بہن کو حویلی لے آئے تھے اور حویلی آ کر ہی انوشہ پیدا ہوئی تھی، لیکن ملک شرافت علی نے ملک وجاہت علی کے بچوں کو جائیداد میں سے عاق کر دینے کا فیصلہ سنا دیا تھا جس کو وقار آفندی نے نو راتوں کو رکوا لیا تھا اور آسیہ آفندی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہیں؟ اپنے گھر والوں کے پاس یا وقار آفندی کے پاس؟

تب آسیہ آفندی نے گھر والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وقار آفندی کا ساتھ دیا تھا، اور اپنی نند اور بھاوج عائشہ کی بھی پھر وہ دلجوئی کی تھی، کیونکہ وہ بہت بڑے حادثے سے گزری تھی اور اسی دُکھ کے عالم میں انہوں نے زہرہ کو بھی پا لیا تھا مگر وقار آفندی نال گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ انہوں نے بہت ڈھونڈا مگر زہرہ بتول شاہ کا کچھ پتا نہیں چلا، شاید وہ بھائی کی دُکھ کے بعد گھر چھ کر کسی سے شادی کر کے ملک سے باہر چلی گئی ہیں اور عائشہ آفندی نے ان کے کہے پہ اعتبار کر لیا تھا، لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ زہرہ بتول شاہ پہ کیا کیا بیتی ہے۔

ان سب باتوں کی معلومات مجھے بہت سالوں بعد لاہور آنے پہ ملی تھیں اور میں نے اندر ہی اندر ملازمین سے بہت کچھ جانا تھا۔

"لیکن وہ بچہ؟" آسیہ آفندی کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"مردہ پیدا ہوا تھا۔" وہ بہت پتھریلے لہجے میں بولا تھا۔ وقار آفندی نے تو ابارشن کا کہہ دیا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی تھیں، وہ بچہ پیدا کرنا چاہتی تھیں اور اس بچے کے ذریعے وقار آفندی کا گریبان پکڑنا چاہتی تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اسی لیے وہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ اور اماں زندگی کا ایک اور بھیانک اور اذیت ناک رُخ دیکھ کر رہ گئی تھیں اور خود کو اللہ کی رضا پہ چھوڑ دیا تھا۔

پھر ان کی زندگی کا مرکز دل آور شاہ کی ذات تھی اور انہوں نے اپنا غم، اپنی خوشی، اپنے خواب، اپنی خواہش سب دل آور شاہ سے وابستہ کر لیے تھے۔ حالانکہ وہ پہلے بھی بہت پیار کرتی تھیں اور بہت توجہ دیتی تھیں مگر اب اس پیار اور توجہ میں شدت آ گئی تھی، ان کی رات اور ان کے دن کا محور ہی دل آور شاہ تھا۔

اور میں بھی سب کچھ بھول کر صرف انہی کی ذات کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے ماں بھی تھیں اور باپ بھی اور انہوں نے میرے لیے بہت زیادہ جدوجہد بھی کی تھی، پہلے ایک کالج میں لیکچرار رہیں، پھر اس کالج میں اپنا پیسہ انویسٹ کر کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا، گھر سیٹ کیا، مجھے پڑھایا لکھایا اور پھر میرے بابا کا شوق پورا کرنے کے لیے مجھے لندن بھیج دیا، وہیں پہ میری نبیل اور عبداللہ سے دوستی ہوئی اور زندگی کے پانچ سال اماں سے دور گزارنے کے بعد میں پاکستان آیا تو میرے دل میں صرف ایک ہی عزم تھا لاہور جانا اور وقار آفندی سے انتقام لینا۔

اماں کو جب میرے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی تھیں انہوں نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں قسم کھا چکا تھا کہ اگر میں بابر شاہ کا بیٹا ہوں تو ایک بار، وقار آفندی کو وہ اذیت دے کر ہی رہوں گا جس اذیت سے بابر شاہ اور زہرہ بتول شاہ گزرے تھے۔ تب انہوں نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا تھا اور یوں میں لاہور میں آیا، یہاں گھر لیا، نئے سرے سے لاہور شہر میں اپنا مقام بنایا اور وقار آفندی کو اذیت دینے کے تمام انتظامات بھی کر لیے۔

اور اس انتظام میں پہلا کام یہ کیا کہ مبارک خان کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا، مبارک خان اسلام آباد میں میٹرک تک میرا کلاس

تھا پھر اس نے سکول چھوڑ دیا اور اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے کام کرنا شروع کر دیا تھا، وہ کب اور کیسے لاہور پہنچا یہ میں نہیں
لیکن اسے وقار آفندی کے خاص ملازم کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی، وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوا تھا، مگر اس
نے میرے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن جب اسے وقار آفندی کی اصلیت کا پتا چلا تو اس نے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا۔
میرے بابا کو پیش آنے والا حادثہ اور میرا نوکری تلاش کرنے کے لیے آنا سب ایک پلان تھا۔ ایک کامیاب پلان۔ اور میں بطور
خاص بڑی حویلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
میں چاہتا تو علیزے آفندی کو کنڈیپ بھی کروا سکتا تھا، اس کے ساتھ برا بھی کر سکتا تھا۔ مگر میری ماں کا حکم تھا کہ وقار آفندی
بننا۔ وقار آفندی بنوں گا تو وہ مجھے کبھی بخشیں گی نہیں۔ ہاں البتہ وقار آفندی کو اذیت جتنی بھی دوں وہ کم ہے۔
لیکن میں کیا کرتا؟ میں جب جب علیزے آفندی کو دیکھتا تھا میرا خون کھولتا تھا، میرے اندر غضب کے ابال اٹھتے تھے مگر میں
بے بس تھا، میں پابند تھا، اس لیے صبر اور برداشت سے کام لیتا رہا اور اسی دوران مری میں علیزے کے بیڈ روم میں میں نے علیزے
کے ساتھ کچھ فوٹو گراف بنوائے تھے ان فیک میں علیزے اور وقار آفندی دونوں کو ہی بے بس کر دینا چاہتا تھا میں چاہتا تھا کہ علیزے
میرے پاس سے بھاگنے کی احتجاج کرنے کی اور میری بات سے انکاری کوشش نہ کرے، اس لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے کنٹرول کیا
جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا، علیزے کی برتھ ڈے کی نائٹ میں اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ وہ میری بیوی ہے۔ وہ حیران ہوئی
تھی، احتجاج بھی کرنا چاہا تھا اور انکار بھی۔
مگر اس کی نیند اور اس کی بیہوشی میں بنوائے گئے فوٹو گراف اسے چپ کروا دینے کے لیے کافی تھے اور میری یہ دھمکی بھی کافی
تھی کہ میں ان فوٹو گراف کے پوسٹر بھی بنوا سکتا ہوں اور پورے شہر میں چھپوا بھی سکتا ہوں اس لیے جو میں کہوں وہ کرتی جائے۔ سو ایسا
ہی ہوا تھا اور علیزے نے بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ ہی دیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ایک بیوی کی حیثیت سے میں اسے آپ سب
کے سامنے اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن وہاں جا کر میں نے اسے اپنے گھر کے بیسمنٹ میں ڈال دیا تھا۔
علیزے کے بارے میں پتا چلا تو اماں بھی اسلام آباد سے آ گئی تھیں اور وہ وقفے وقفے سے مجھے یہ تنبیہ کرتی رہی تھیں کہ کسی
بھی عزت سے کھیلنے کا کبھی سوچنا بھی مت، اگر سوچو گے تو ایک بار میرے بارے میں ضرور سوچ لینا۔ عورت قابل احترام ہستی
ہے، عورت محبت کا پیکر ہے، عورت اس دنیا کا زیور ہے، عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد کا غصہ سہنے کے
لیے نہیں بنی۔ عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی، اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آفندی کا انتقام علیزے
آفندی سے لو اور اس کی سزا اسے دو۔ وہ ایک عورت ہے اور ایک عورت کا دکھ مجھ سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جان سکتا۔"
دل آور نے آنور، جوہت اور دانیال کی طرف دیکھا تھا جو دم بخود سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہنوز دل آور شاہ کو ہی دیکھے جا
رہے تھے۔
"زہرہ بتول شاہ ظالم نہیں تھیں۔ بلکہ ایک مضبوط اعصاب کی طرف اور غیرت مند عورت تھیں۔
زندگی سے اتنے زخم اٹھانے کے باوجود بھی انہوں نے سر اٹھا کر زندگی گزاری تھی اور اپنی محرومیوں اور تکلیفوں کا بدلہ علیزے
آفندی سے ہرگز نہیں لیا تھا اور جب علیزے نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے نکاح کر لو اور مجھے اپنا نام دے دو تو خدا گواہ ہے کہ میں وقت
کی بھی بھیر اور اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی پہ دنگ رہ گیا تھا۔
علیزے نے میرے پاؤں بھی پکڑے تھے لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکا تھا البتہ روح تک کانپ ضرور گیا تھا۔ کیونکہ میں زہرہ بتول
کا بیٹا تھا اور زہرہ بتول شاہ نے مجھے ہمیشہ عورت کی عزت کرنا سکھایا تھا، احترام کرنا سکھایا تھا، کسی عورت کا سر اپنے قدموں میں
جھکنا نہیں سکھایا تھا۔
اس لیے میں نے جب یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا یہ کہتے ہوئے کہ
بیٹے تم اسے لے کر آئے ہو، تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دے دو، نکاح کر لو اس سے۔ تم مرد ہو، وہ
عورت ہے اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے، مرد سے ہی نام مانگتی ہے، جو نام نہیں دیتے وہ نامرد ہوتے
ہیں غیرت ہوتے ہیں، عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔
اور تب میں خاموش ہو گیا تھا، واپس لاہور آ گیا تھا، ان سے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا، اور وہ مطمئن ہو گئی تھیں، پھر وہ

لاہور آئیں اور یونہی ایک روز ہسپتال میں وقار آفندی سے سامنا ہوتے ہی وہ خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پائی تھیں اور ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

لیکن اس ایکسیڈنٹ کے باوجود اپنی آخری سانسوں کے دوران انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے تاکہ میں علیزے سے نکاح کرلوں اور میں نے سر جھکاتے ہوئے ان کا کہا مان لیا تھا۔

کیونکہ میں ان کا کہا کبھی ٹال ہی نہیں سکتا تھا، اور وہ علیزے آفندی سے کیا ہوا وعدہ پورا کر گئی تھیں وہ جاتے جاتے وقار آفندی کو معاف بھی کر گئی تھیں اور میرے لیے ایک "اپنے" کا انتظام بھی کر گئی تھیں۔

ایک ایسا "اپنا" جو سب سے زیادہ پرایا نکلا اور جس نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی رگوں میں واقعی وقار آفندی کا خون ہے۔"

دل آور کا یہ جملہ کوئی اور وقت ہوتا تو علیزے کے لیے قابل فخر ہوتا، لیکن اس وقت یہ جملہ اس کے لیے کسی گالی یا کسی طمانچے سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔

اس لیے علیزے نے یکدم اس طمانچے سے بلبلا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ تھا کہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے اس دیکھنے میں کیا کچھ نہیں تھا آخر؟ طنز، تمسخر، کاٹ اور تلخی۔ سب کچھ ہی تو تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا، شکایتیں تھیں اور ایک بے گانہ پن بھی تھا۔

"بتاؤ علیزے! کسی کو معاف کرنا اور اعلیٰ ظرف ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

دل آور نے ڈائریکٹ علیزے سے سوال کیا تھا مگر علیزے کے پاس الفاظ ہوتے تو وہ جواب دیتی نا "کتنا فرق ہے تم میں اور زہرہ بتول شاہ میں۔ میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر بھی تم مجھے معاف نہیں کر سکیں اور وقار آفندی نے انہیں جیتے جی مار ڈالا، پھر بھی انہوں نے اسے معاف کر دیا۔ میں نے اپنے غصے اور انتقام کے جذبات میں آ کر جو کچھ بھی کیا وہ سب بدلا تھا۔ لیکن پھر تمہاری عزت رکھ لی، اور تمہیں اپنا نام دے دیا، مقام دے دیا، اپنے دوستوں میں اور اپنے جاننے والوں میں تمہاری عزت بنائی، تمہارا احترام کیا، تمہارا بھرم رکھا، لیکن تم سے وفا نہیں ہو سکی، اور نہ ہی تم وفا کو سمجھ سکیں۔

شاید تمہیں نہیں پتا کہ عورت ہونا تو بہت آسان بات ہے، لیکن عورت ہونے کو نبھانا بہت مشکل کام ہے، عورت تو بہت حساس ہوتی ہے، لیکن تمہیں تو نہ زہرہ بتول شاہ کی کوئی بات یاد رہی اور نہ ہی دل آور شاہ کی۔" وہ تمسخر سے کہتا ہوا پھر رکا تھا۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ تو میری جان میں نے زور سچ کہا تھا، یہ تمہاری سمجھ کی بھی چیز نہیں ہے، کیونکہ تم بھی تو اس حویلی کا سچ ہو، اس لیے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، اور نہ ہی تم سے کوئی شکوہ ہے۔ تم اس حویلی میں رہنا چاہتی ہو، رہو۔ تم اپنے پاپا کے ساتھ رہنا چاہتی ہو، رہو۔ میری طرف سے آزاد ہو، میں تمہیں کل ہی طلاق بھجوا دوں گا، کیونکہ تم جانتی ہو نا کہ میں واقعی زور زبردستی کا قائل نہیں، جو ہے وہ ٹھیک ہے، جو نہیں ہے وہ بھی ٹھیک ہے، بس میری تو یہی سوچ ہے اور یہی عمل ہے، البتہ جانے سے پہلے تم سے اتنا ضرور پوچھوں گا کہ بتاؤ اس سارے فیصلے میں دل آور شاہ کہاں کہاں غلط ہے؟ اور کہاں کہاں بُرا ہے؟ اور آج اس قصے کے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر؟"

اس نے آخر میں علیزے کو اپنے سوالوں کی زد میں رکھ لیا تھا اور سوال بھی ایسے تھے جن کے جواب علیزے کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہے تھے اور وہ اپنی جگہ پہ گنگ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"بولو علیزے آج تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر۔" اس نے اپنے سوال پہ زور دیتے ہوئے علیزے کو بولنے پہ اکسایا تھا لیکن علیزے تو جیتے جی زمین میں زندہ گڑ گئی تھی، وہ بولنے کی سکت کہاں سے لاتی؟

"ہونہہ..... مجھے بھی پتا ہے اور مجھے کل بھی پتا تھا کہ حویلی والوں کے پاس کوئی انصاف نہیں ہے۔" وہ انتہائی تلخی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اور ہاں آذر آفندی! میری بدکرداری اور بدبختی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آفندی جیسا "باکردار، معزز اور عزت دار" نہیں ہوں، ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا، ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے

محبت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا، حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا، مگر مجھے وقار آفندی بننا گوارا نہیں تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ میر اللہ اور میر امیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔" دل آور نے ساری بات کہی تھی اور سب پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی، ہر چہرے پر دکھ تھا، اذیت تھی، بے یقینی تھی اور سب سے بڑی بات کہ سب کے چہروں پہ آنسو تھے۔

مگر ان کا یہ دکھ، یہ اذیت اور یہ آنسو اس کے کس کام کے تھے بھلا۔ اسے کیا فائدہ تھا آخر۔ اب سب کچھ بیکار تھا اسی لیے وہ رو رہا تھا۔

"اپنی وے! آپ لوگوں نے دعوت دی، بلایا، کنہرا سجایا، بہت اچھا لگا۔ میں تو پہلے ہی عدالتوں کا اور کٹہروں کا عادی ہوں، یہ عدالت اور سہی۔ خیر اب چلتا ہوں۔ تھینک یو۔"

اس نے الوداعی کلمات ادا کیے تھے اور علیزے نے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی دل آور اسے نہیں دیکھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ علیزے کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھیں۔ "اللہ حافظ۔" اس نے دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھولتے ہوئے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا مگر جس نظر سے اسے دیکھ کر گیا تھا۔

وہ نظر علیزے کو علیزے سے ہی بیگانہ کر گئی تھی۔ تو ڈکر لے گئی تھی اسے اور اس کے یوں سامنے سے ہٹ جانے پہ علیزے کو لگا تھا جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہو، اور ہر سو تاریکی چھا گئی ہو، جس سے گھبرا کے وہ بے ساختہ پکاری تھی۔

"ڈرائیور....." آواز اتنی مدھم تھی جیسے وہ بڑبڑائی ہو۔

"ڈرائیور....." لیکن اب کی بار اس کی آواز بہت بلند تھی اتنی کہ وہ سب بھی ہڑبڑا گئے تھے۔

"ڈرائیور! زکو میری بات سنو ڈرائیور پلیز رکو۔" علیزے اسے زور زور سے پکارتی ہوئی یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور بیڈ روم سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔

اور اس کا یہ بھاگنا کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگی تھی اور اندھا دھند بھاگی تھی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

حویلی کے کھلے گیٹ سے دل آور کی گاڑی باہر نکل رہی تھی فاصلہ بڑھ چکا تھا، گاڑی کے دروازے اور شیشے بند تھے، اس تک آواز پہنچنا مشکل تھا، مگر پھر بھی وہ پکار رہی تھی، چیخ رہی تھی اور اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

"ڈرائیور پلیز..... زکو یہاں۔ پلیز ڈرائیور مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ پلیز ڈرائیور میرا دم گھٹ جائے گا میں مر جاؤں گی۔ مجھے لے جاؤ پلیز۔"

وہ اس کی گاڑی کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر بے ساختہ تھک کے رک گئی تھی اور وہیں گھاس پہ گھٹنوں کے بل زانو بیٹھتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تھی۔ لیکن آج کوئی بھی اسے چپ کروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

کیونکہ آج سب کے دل رو رہے تھے اور سب کے ضمیر پر ایک اذیت ناک سا بوجھ آ پڑا تھا۔ آج کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا، بلکہ سب کی سماعتوں میں دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی اور سب کا ہی ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا تھا انہیں بار بار دل آور کا خیال آ رہا تھا۔

میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
اور تو سمجھا ہے کہ مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

♥

نہ چھیڑ قصہ الفت بڑی لمبی کہانی ہے
میں زمانے سے نہیں ہاری کسی کی بات مانی ہے

رات خاصی گہری ہو چکی تھی، اور وہ بہت دیر سے ٹیرس پہ کرسی ڈالے بیٹھی کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے سیاہ آسمان کے بدن پہ ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی جو آسمان پہ چاند کی غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہے تھے لیکن اس کے باوجود چاند کی کمی اپنی جگہ ہنوز تھی کیونکہ ستارے چاند کی کمی کو دور نہیں کر سکتے تھے۔ جس پہ اس کی آنکھوں میں بھی اداسی رات کی طرح گہری ہوتی جا رہی تھی لیکن کمرے میں اس کے بیڈ پہ پڑے موبائل کی رنگ نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

رات کے اس پہر فون..... یہ خیال آتے ہی وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھی تھی اور دھیمے قدم اٹھاتی اندر آ گئی تھی، کیونکہ اب اسے بھی اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی، اس نے اپنے آپ کو بہت جلدی کور کیا تھا لیکن پھر بھی ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ کچھ وقت چاہیے تھا ابھی۔

''انوشہ۔'' وہ انوشہ کا نمبر دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

''کیسی ہیں زری آپی؟'' انوشہ کی آواز بہت مست اور سنجیدہ سی لگ رہی تھی۔

''الحمدللہ! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، سب خیریت سے نا؟ اس وقت فون کیوں کیا؟'' زری اور عبداللہ کے تعلقات اپنے چچا اور کزنز سے بہت اچھے تھے۔

کیونکہ دانیال، زین اور انوشہ تینوں ہی انہیں بہت زیادہ چاہتے تھے اور ان سے ملنے کے لیے گھر بھی آئے تھے اسی لیے سب سے آپس میں کانٹیکٹ بھی بڑھ گیا تھا اور بے تکلفی بھی۔

''نیند نہیں آ رہی۔'' انوشہ نے بہانا تراشا۔

''نیند نہ آنے کی وجہ؟'' زری تھک گئی تھی، بیڈ پہ ٹک گئی۔

''دل آور شاہ۔'' انوشہ کے لہجے میں اس کے نام کے ساتھ دکھ جھلکا تھا۔

''دل آور شاہ! کیا مطلب؟'' وہ اُلجھی۔

''وہ آئے تھے یہاں۔'' انوشہ خود ہی جیسے بتانا چاہتی تھی، دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

''اوہ اچھا..... پھر؟'' زری کا تجسس مدھم پڑ گیا۔

''وہ آئے اور ہمیں ہماری ہی نظروں میں گرا کر چلے گئے اور علیزے وہ تو اب تک رو رہی ہے۔'' انوشہ رفتہ رفتہ کھل رہی تھی اور زری یونہی رفتہ رفتہ مزید اُلجھتی جا رہی تھی کیونکہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ''علیزے رو رہی ہے مگر کیوں..... کیوں رو رہی ہے وہ؟'' زری نے پھر اُلجھ کر پوچھا تھا۔

♥

''صرف علیزے ہی نہیں باقی سب بھی رو رہے ہیں۔''

انوشہ اک عجیب سے افسوس سے دوچار تھی اور زری کو مزید بے چینی اور خفگی ہونے لگی تھی۔

''پلیز انوشہ! کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ مجھے پریشانی ہونے لگی ہے سب کیوں رو رہے ہیں، آخر وہ..... بھی اس وقت؟'' زری کو سچ مچ بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی اس کا دل طرح طرح کے وہم اور وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا اور اس کی یہ پریشانی اور گھبراہٹ دیکھتے ہوئے ہی انوشہ خود بھی بے ساختہ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور پھر انہی آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ہی انوشہ نے اسے الف تا ے ساری بات بتا ڈالی تھی اور زری سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی اسے اپنے جسم پہ یوں لگا جیسے چیونٹیاں رینگنے لگی ہوں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو انوشہ! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میرا دل بند ہو جائے گا؟'' زری کی آواز کانپ رہی تھی۔

''یہ سب سچ ہے زری آپی! یہ سب سچ ہے ایک اذیت ناک سچ..... ہم مر گئے ہیں..... ہم جیتے جی مر گئے ہیں..... آج کی رات کوئی بھی سو نہیں پائے گا۔ آج کی رات سب کی تڑپتے ہوئے گزرے گی اور آج کی رات سب عذاب سے دوچار رہیں گے کیونکہ آج ہم لوگوں کا غرور، ہم لوگوں کی انا اور ہم لوگوں کا نام کیچڑ میں مل گیا ہے، ہم غلیظ ہو گئے ہیں، ہم گناہگار ہو گئے ہیں آپی۔ ہماری آنے والی سات نسلیں بھی دل آور شاہ کی گناہگار رہیں گی۔ ہم ان کے سامنے سر اُٹھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔

انہوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک ہے..... لیکن اس کے باوجود وہ اتنے مضبوط اور بلند کردار رہے کہ انہوں نے ایک بار بھی علیزے کے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کی، حالانکہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر گزرتا، مگر وہ ایسے نکلے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا انہوں نے ہماری عزت کو عزت ہی رہنے دیا۔'' انوشہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اور یونہی روتے روتے اس نے فون ہی بند کر دیا تھا۔

"دل آور شاہ! حد..... تم اتنی اذیت لیے پھرتے تھے۔ اتنی اذیت۔"

زری زیر لب کہتی ہوئی ضبط نہیں کر سکی تھی اور اس کے آنسو بے آواز چال چلتے رخساروں پہ بہہ آئے تھے اور دل آور شاہ کی [illegible] کو دکھ اس کے دل کو کاٹنے لگا تھا اور اس کا دل چاہا وہ بتول شاہ کی تباہ شدہ زندگی پہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

♥

دل آور شاہ خود تو چلا گیا تھا لیکن ان سب کے لیے ایک عذاب چھوڑ گیا تھا۔ کبھی نہ ختم ہونے والا عذاب۔ جن کو اب ان [illegible] نے ساری عمر جھیلنا تھا اور ساری عمر ایک دوسرے سے نظر چرا کے رہنا تھا۔ کیونکہ ان کے گھر سے ان کی اس عزت دار حویلی [illegible] ایک عورت بے آبرو ہو کر نکلی تھی اور اس عورت کی آبروریزی کا داغ اب اس حویلی کے ہر فرد کے ضمیر پہ آ پڑا تھا اور اس نام نہاد [illegible] کی شان و شوکت مٹی میں مل گئی تھی۔

اب اس حویلی میں سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ لیکن علیزے کو تو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا ایک رات میں ہی دم نکل جائے گا، وہ رو رو اور تڑپ تڑپ کر پاگل ہو گئی تھی اور یہی حال عائشہ آفندی کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنے بیڈروم میں بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھیں دل آور شاہ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل کو چیر رہا تھا اور وہ درد سے نڈھال ہونے لگی تھیں البتہ ایک آسیہ آفندی تھیں جو [illegible] کی تہاں پتھر کی ہو کر رہ گئی تھیں اور جن کے احساسات اور جذبات کرنا کی کی انتہا پر پہنچ کر مفلوج ہو گئے تھے۔

ان کے دل و دماغ پہ بے حسی چھا گئی تھی یوں جیسے ان کے جسم سے جان ہی نکل چکی ہو یا پھر پوری کائنات ختم ہو چکی ہو اور [illegible] ان کے لیے اس زندگی میں اور اس کائنات میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ دل آور نے سچ کہا تھا اس سکے کو [illegible] سنبھالتے وہ خود الجھ جائیں گی۔ اذیت میں آ جائیں گی اور..... اور رشتوں کے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا [illegible] وہ نہ رو سکتی تھیں اور نہ ہنس سکتی تھیں، ہاں البتہ گھٹ گھٹ کر مر ضرور سکتی تھیں۔

♥

جورت آفندی اپنے بیڈروم میں صوفے پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں ابھی بھی دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی [illegible] بار بار گونج رہی تھی۔ عورت قابل احترام ہستی ہے۔ عورت محبت کا پیکر ہے۔ عورت اس دنیا کا زیور ہے۔ عورت مرد کی ہوس پوری [illegible] کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد کا غصہ سہنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی۔

اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آفندی کا انتقام علیزے آفندی سے لو اور اس کی سزا اسے دو۔ جورت ہاتھوں کی [illegible] اور لب بھینچے دل آور شاہ کی سچی اور کھری آواز کے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ "انہوں نے زندگی میں ایک بار پیر مجھے جیران کر [illegible] یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم ہی اسے لے کر آئے ہو، تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دے کر نکاح کر لو اس [illegible] تم مرد ہو وہ عورت ہے اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے۔ مرد سے ہی نام مانگتی ہے، جو نام نہیں دیتے [illegible] مرد ہوتے ہیں، بے غیرت ہوتے ہیں، عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔"

دل آور شاہ کے یہ الفاظ اتنے کاٹ دار تھے کہ جورت یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔

"اور ہاں آذر آفندی! میری بدکرداری اور بدنیتی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں لیکن اپنے حق میں بات [illegible] کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آفندی جیسا باکردار، معزز اور عزت دار نہیں ہوں۔ ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی [illegible] بھی میں یہاں سے لے کر گیا تھا ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے اور آج یہاں [illegible] جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور [illegible] کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا، حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ مگر مجھے وقار آفندی بننا گوارا نہیں تھا [illegible] میں جانتا تھا کہ میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔"

اس کے آخری جملے نے جورت کو اور زیادہ مضطرب کر ڈالا تھا اور پھر وہ اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے بیڈروم سے باہر [illegible] گیا تھا اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا۔

اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پہ ٹیپ لگا ہوا تھا۔

وہ جب سے ہوش میں آئی تھی بے بسی سے پھڑ پھڑاتے ہوئے بار بار اپنے ہاتھ باؤں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے

ہاتھ اس کے پاؤں اور اس کا منہ اتنی سختی سے بند ھے ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ کے لیے بھی آگے یا پیچھے نہیں ہٹ سکی تھی اور اسی بے بسی کی سی حالت میں ہی اس کی پوری رات گزر گئی تھی اور اس گزرنے والی رات کا احساس اسے سامنے ہی دیوار پر لگے وال کلاک اور گلاس ونڈو سے ذرا سے سرکے ہوئے پردے سے ہوتا رہا تھا جو رات کی سیاہ تاریکی کے بعد اب ہلکی سی روشنی میں بدل رہا تھا۔

اور مریم کے آنسو بے اختیار اس کے رخساروں پہ بہہ آئے تھے کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ سیاہ رات اس کی قسمت کے دن پہ حاوی ہو گئی ہے اور پورا دن تاریک پڑ گیا ہے اب کچھ بھی ہو جائے وہ یہ سیاہی کبھی مر کے بھی نہیں مٹا سکتی اور اس سیاہی کے قہر نے اسے رلا دیا تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ یہ سیاہی عدیل کو، امی کو، ابا جی کو اور اس کی معصوم بہنوں کو نگل لے گی، پیچھے ہی مار دے گی اور وہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔

ابھی وہ اس غم کا اس دکھ کا، ماتم منا رہی تھی کہ اچانک ہی اسے دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا لاک کھلنے کے بعد چند سیکنڈز کے وقفے سے دروازہ بھی کھل گیا تھا لیکن انتہائی آہستگی کے ساتھ۔

حسب توقع جودت آفندی کی ہی صورت نظر آئی تھی جس کو دیکھتے ہی مریم کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے بلکہ ان آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی کیونکہ اسے موت کا فرشتہ اپنے قریب سے بھی قریب تر نظر آ رہا تھا اور یقین ہو چلا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی مر جائے گی۔

جبکہ دوسری طرف وہ تھا جودت آفندی خاموش، شرمندہ اور ندامت کا بوجھ کندھوں پہ اٹھائے سر جھکائے ہوئے۔

آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا اور بہت ہی بوجھل سے انداز میں آ کر بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

مریم اس کے بیڈ پہ بیٹھنے سے پھڑ پھڑائی تھی، تڑپی تھی اور اس کے اس مرغ بسمل کی سی تڑپ پہ جودت نے گردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا تھا اس کی آنسوؤں سے بھیگی متورم آنکھیں وحشتوں کے عذاب سے بھر گئی تھیں اور جودت کے دل پہ اک اور ملامت کا داغ لگا تھا اک اور طمانچہ پڑا تھا اس کے ضمیر کے منہ پر..... اور اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کے اس کے منہ پہ لگا ٹیپ کھول دیا تھا اور پھر یونہی آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی کھول دیئے تھے، جن کے کھلتے ہی مریم یکدم اٹھ بیٹھی تھی اور اپنے اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی ذرا سا توقف لیے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یکدم اک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن بھاگ نہیں سکی تھی کیونکہ جودت نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے اس کی ساری پھرتی ختم کر ڈالی تھی اور وہ ایک ہی جگہ پہ ساکت سی ہو گئی تھی کیونکہ اسے جودت کے انداز سے اور اس کے ہاتھ کی گرفت سے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔

وہ ایسا نظر نہیں آ رہا تھا، جیسا کل تھا۔

"بیٹھ جاؤ..... بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" لہجہ دوٹوک تھا، نجانے کیوں پہلی بار میں ہی اثر کر گیا تھا اور مریم چند سیکنڈ کے وقفے سے بالآخر بیٹھ ہی گئی تھی اور جودت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟" جودت کا سوال اسے مذاق لگا تھا اس نے گردن موڑ کر اسے بہت ہی عجیب سی نظروں سے دیکھا، مگر وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جس سے لگ رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا۔

"لیکن تمہاری زندگی کی ایک رات گھر سے باہر گزر چکی ہے۔" اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔

"اس ایک رات میں تمہارا بہت کچھ کھو گیا لیکن مجھے بہت کچھ حاصل ہو گیا ہے۔" جودت کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔

"مجھے عبرت حاصل ہوئی ہے۔" اس کی اگلی بات بھی عجیب تھی اور مریم اس کی عجیب سی باتوں پہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی مگر چپ چاپ۔

اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

"مجھے معاف کر دو مریم! میں نے تمہیں اور تمہاری پاکیزگی کو سب کی نظروں میں مشکوک اور بے یقین کر دیا ہے، میں نے تم سے تمہاری ذات کا غرور چھین لیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دو، میں بہت اذیت میں ہوں بہت پچھتا رہا ہوں۔" جودت کے اندر کا کرب اس کے لہجے میں اتر آیا تھا اور وہ چند قدم کھڑکی کی سمت بڑھانے کے بعد دوبارہ مریم کی سمت پلٹ آیا تھا اور بے ساختہ اس کے سامنے قالین پہ ہی دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

"لیکن تم غم نہ کرو، اپنی اس غلطی کا مداوا بھی میں ہی کروں گا، تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا، تمہارا ساتھ دوں گا، عزت دوں گا مقام دوں گا، محبت دوں گا اور وہ سب کچھ دوں گا جس کی تم خواہش کرو گی۔ بدل دوں گا اپنے آپ کو..... صرف اور صرف تمہاری خاطر..... تمہارا بن کے جیوں گا، جب تک جیوں گا۔" جودت نے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ دیئے تھے اور مریم بے ساختہ جودت کر رو پڑی تھی۔

"اب کہہ رہے ہو یہ سب..... اب کیا فائدہ ہے۔" وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پہلے نہیں کہہ سکتا تھا، پہلے مجھ پہ میرے اندر کا شیطان حاوی تھا، لیکن اب مجھ پہ میرے اندر کا انسان حاوی ہے، اب میں وہ کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جو تمہاری بہتری کے لیے ہو، کیونکہ گزشتہ ایک رات نے ہی ہمیں پوری زندگی کے لیے سبق سکھا دیا اپنی اوقات دکھا دی ہے ہمیں اور اپنے گریبان میں جھانکنے پہ مجبور کر دیا ہے۔" وہ بڑی تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"مگر اب مجھے کیا حاصل؟" وہ تڑپی تھی۔

"بتا دوں گا، تم بس ایک بار مجھے معاف کر دو۔" جودت نے التجائیہ سے لہجے میں کہا تھا اور مریم نے بڑے زخمی سے انداز میں اس کے سامنے دو زانو بیٹھے معافی کے اس طلبگار کو دیکھا تھا جس کی غلطی کو گزرے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے لیکن اس کی چوبیس گھنٹے کی زندگی پہ داغ چھوڑ گئی تھی اور مریم نے نفرت سے اس کی طرف سے رُخ موڑ لیا تھا، جبکہ جودت نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنے جوڑ دیئے تھے۔

"پلیز مریم! ایک بار، پھر ایک بار..... مجھے معاف کر کے تو دیکھو۔" وہ ابھی بھی بلکتی تھا اور وہ ایک بار پھر کچھ بھی کہنے کے بجائے اٹھ گئی تھی اور جودت نیچے قالین پہ گرا اس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال دیا تھا، جس پہ وہ روتے روتے دم بخود سی ہو گئی تھی۔

♥

عدیل ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا، اس نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بیڈ کے قریب آ کر موبائل اٹھا لیا تھا، نمبر لاہور کا تھا، رات کو بھی اس کے نمبر پہ چند مسڈ کالز تھیں لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ کس کی ہیں۔

"ہیلو.....؟"

"عدیل! کہاں ہو۔ کہاں چلے گئے ہو؟ گھر آ جاؤ میرے بچے گھر آ جاؤ۔" عابدہ خاتون اس کی آواز سنتے ہی بے اختیار شروع ہو گئی تھی اور ساتھ ہی ان کے رونے کی بھی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"امی! کیا ہوا ہے ابا ٹھیک تو ہیں نا۔" عدیل کا پہلا خیال فاروق نیازی کی طرف ہی گیا تھا۔

"وہ..... وہ ٹھیک ہیں بیٹا! لیکن مریم....." وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھیں۔

"مریم! کیا ہوا ہے مریم کو۔" عدیل کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"وہ..... وہ..... کل سے گھر نہیں آئی میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں بیٹا تم گھر آ جاؤ۔" عابدہ خاتون نے عدیل کے سر پہ پہاڑ توڑ ڈالے تھے اور موبائل فون اس کے ہاتھ میں لرز کے رہ گیا، بلکہ وہ مضبوط قد مومن کا پورا کھڑا کیا تھا اور بے اختیار کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"آپ..... یہ..... کک کیا کہہ رہی ہیں مریم کل سے گھر نہ؟" وہ جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔

"ہم برباد ہو گئے ہیں بیٹا! ہم کل سے برباد ہو گئے ہیں۔" عابدہ خاتون نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ ان دونوں نے کچھ دیر پہلے ہی اکٹھے ناشتہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ابھی وہ اسی غرض سے اسے بلانے کے لیے آیا تھا، مگر اس کے چہرے پہ آتی ہوائیاں دیکھ کر نبیل بھی متفکر ہو گیا تھا۔

"عدیل! میں تم سے مخاطب ہوں اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ کیا ہوا..... کس کا فون تھا۔" نبیل اس کے ہاتھ میں تھمے موبائل کو دیکھ چکا تھا اور اس کا کندھا ہلا کر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔

"امی کا....." عدیل کی آواز اتنی مدھم ہو چکی تھی کہ جیسے کسی گہرے پاتال میں سنائی دے رہی ہو۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" نبیل کو مزید پریشانی ہوئی تھی۔

"میری سسٹر مریم! کل آفس گئی تھی اور کل سے ابھی تک واپس نہیں آئی۔" عدیل کسی روبوٹ کی طرح بتا رہا تھا۔

"کیا....." نبیل کو یکدم اپنی بڑی بات سن کر جھٹکا سا لگا تھا۔
"ہاں..... کل میں ہی اسے ایکیڈنی ڈراپ کر کے آیا تھا۔"
"او مائی گاڈ..... یہ کیا ہو گیا؟" نبیل نے تو جیسے سر تھام لیا تھا۔
"ہمارے پاس عزت کے سوا اور کچھ نہیں تھا نبیل صاحب..... اور..... اور..... آج وہ عزت بھی۔"
"پلیز عدیل انکل مت سوچو اور جلدی اٹھو، ہمیں ابھی واپس چلنا چاہیے۔" نبیل اس کا کندھا تھپک کر بولا۔
"اب..... اب کیا ہو سکتا ہے؟"
"اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے، پہلے تمہارے گھر پہنچتے ہی ساری تفصیل معلوم کرتے ہیں، اگر حل نہ نکلا تو رپورٹ درج کروا دیں گے، باقی کا کام دل آور سنبھال لے گا۔" نبیل سارے کام کا پلان ترتیب دیتے ہوئے فلیٹ سے پلٹ گیا۔
"اور ہاں تم جلدی سے اپنا سامان پیک کر لو، میں بل کلیئر کرتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے اسے ہدایت بھی کر گیا تھا۔

♥

وہ اپنے آفس میں بیٹھا اپنے کسی کیس کی فائل میں الجھا ہوا تھا۔ جب اس کا منشی دروازے پہ دستک دے کر ذرا سا اندر کی طرف ضوردار ہوا تھا۔ "سر..... کوئی لڑکا اور لڑکی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"
"لڑکی اور لڑکی....." دل آور کو حیرت ہوئی۔
"جی ہاں..... کہتے ہیں کہ آپ کے جاننے والوں میں سے ہیں۔"
"او کے..... بھیج دو۔" اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنی فائل سمیٹنی شروع کر دی تھی۔
"السلام علیکم۔" دروازے پہ دستک کے بعد جودت کی آواز ابھری تھی اور دل آور فائل سمیٹتے سمیٹتے رک گیا تھا کیونکہ وہ جودت کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔
"کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟" اس نے اجازت طلب کی اور دل آور ٹھٹک کر متوجہ ہوا تھا۔
"ہوں..... کم ان۔" اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اجازت دی تھی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی جودت مریم کو ساتھ لیے اندر آ گیا تھا۔
"بیٹھیے....." دل آور نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔
"تھینک یو....." جودت مرے مرے سے لہجے میں کہتا کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مریم بھی بیٹھ گئی تھی۔ دل آور نے بے شک اسے صرف ایک بار ہی دیکھا تھا لیکن اس کا حافظہ کمزور نہیں تھا جبھی تو وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ عدیل عمر کی بہن ہے۔
"دل آور بھائی! وہ دراصل مجھے آپ کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔" جودت نے اب اس کے سامنے تمہید باندھنے کی کوشش کی تھی۔
"سر کہہ کر مخاطب کرو گے تو زیادہ بہتر ہو گا۔" اس نے بہت سخت لہجے میں اسے تنبیہ کی تھی۔
"لیکن میں آپ کو علیزے کے حوالے سے۔"
"علیزے کا اور میرا حوالہ آج ختم ہو جائے گا، اس لیے مناسب یہی ہے کہ کسی بھی حوالے کے بغیر بات کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اور کس ہیلپ کے لیے آئے ہو؟"
دل آور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بات ہی ختم کر دی تھی اور جودت اس کا اتنا دو ٹوک انداز دیکھ کر چپ سا ہو گیا تھا۔
"میں انتظار کر رہا ہوں تمہاری بات کا..... مجھے کچھ اور بھی کام نبٹانے ہیں۔" اس نے اسے بولنے پہ اکسایا۔
"وہ..... وہ دراصل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" جودت نے بمشکل بات کرنے کی ہمت مجتمع کی تھی۔
"یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔" دل آور استہزائیہ بولا تھا۔
"نئی بات ہے..... اور وہ یہ ہے کہ اپنی غلطی کا احساس پہلی بار ہوا ہے اور وہ بھی آپ کی وجہ سے....." جودت اب بات کہنا شروع ہو چکا تھا اور دل آور نے اس کی ساری بات پورے دھیان سے سنی تھی اور ایک گہری سانس لے کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا

"اس نکاح کے بعد تمہارے گھر والوں کا کیا ری ایکشن ہوگا۔ جانتے ہو نا؟"

"جی جانتا ہوں۔"

"پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں..... پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں دل آور شاہ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں، وقار آفندی کے نقش قدم پر نہیں۔" جودت کا لہجہ مضبوط تھا۔

"کیا اس لڑکی کے گھر والوں کو فیس کر لو گے؟" دل آور اس سے ہر طرح کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

"میں ہر چیز کو فیس کرنے کا سوچ کر ہی آپ کے پاس آیا ہوں، ورنہ آسان طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اسے چپ چاپ اس کے گھر چھوڑ کر واپس آ جاتا، لیکن نہیں۔ میں اسے دغا نہیں دے سکتا۔ ہرگز نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی غلطی کے بعد تلافی کے لیے ڈٹ جانے والے جودت کو دیکھ کر دل آور کو یقین آ گیا تھا کہ وہ اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتا ہے۔

اسی لیے اس نے اس کا کیس اوکے کر دیا تھا اور اگلے چند ہی منٹوں بعد ان کے نکاح کی رسم ادا ہو گئی تھی اور دل آور نے عدیل کو فون کر کے اپنے پاس آفس میں آنے کا کہا تھا وہ اب نبیل کے ساتھ سیدھا اس کے آفس میں آ رہا تھا اور ایسی ہی ایک کال آذر آفندی کو بھی کی تھی۔

♥

"علیزے پلیز یار ایسے کر دو یہ رونا دھونا۔ دل آور بھائی اتنے اچھے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔" کومل نے بیڈ پہ بیٹھی گھٹنوں میں منہ چھپائے، رات سے بھوکی پیاسی اور مسلسل روتی علیزے کے پاس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اس کے بالوں کو سہلا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ اچھا ہے، بہت اچھا ہے۔ حد سے زیادہ اچھا ہے، اس کی اچھائی کو مجھ سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا، مگر اب میں یہ بھی نہیں جانتی ہوں کہ اب اس کی اچھائی کی حد ختم ہو چکی ہے، اب وہ..... وہ نہیں رہا، وہ رات کو یہاں سے جاتے ہوئے کس حال میں گیا ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ میں..... صرف میں۔" علیزے روتے ہوئے اور کہتے ہوئے یکدم پھٹ پڑی تھی۔

"تو پھر..... اب کیا ہو سکتا ہے علیزے؟" یہ سارا معاملہ جان لینے کے بعد کومل کا دل بھی نرم ہو چکا تھا اس کے لیے۔

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہے، مجھے اس کے گھر میں رہنا ہے اور صرف اس کی ہو کر رہنا ہے۔" علیزے نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"لیکن علیزے!" کومل نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مجھے اس کے پاس جانے میں کوئی شرمندگی نہیں ہے، کیونکہ میں اس کی بیوی ہوں۔ مسز دل آور شاہ! میں خود اسے چھوڑ کر آئی تھی تو اب مجھے خود ہی اس کے پاس جانا بھی ہے۔" علیزے نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"کیا محبت کرتی ہو ان سے؟" یہ سوال ایک اہم سوال تھا اور علیزے کے آنسو پھر سے رواں ہو گئے تھے۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

"بولو نا علیزے! کیا محبت کرتی ہو ان سے؟" کومل نے سوال دہرایا تھا۔

"وہ..... وہ ہے ہی محبت کے قابل۔ لیکن افسوس کہ میری اب اتنی بھی اوقات نہیں ہے کہ اس سے محبت کر سکوں۔ کیونکہ وہ سچ کہتا ہے محبت بڑی حویلی والوں کے بس کی اور سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ میرے بس کی بھی نہیں ہے۔" علیزے کہتے ہوئے سسک اٹھی تھی۔

"لیکن علیزے بغیر محبت کے تو یہ فاصلے نہیں مٹ سکتے۔" کومل اسے سمجھا رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب مجھے ہر کام محبت سے ہی کرنا ہے۔ محبت سے، عقیدت سے اور عزت سے اب وہ ہے تو سب کچھ ہے۔ وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ علیزے بھی نہیں۔" علیزے نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور کومل کو اس کا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔

♥

چیلنج..... آذر نے ساری صورتحال دیکھنے اور سننے کے بعد ایک انتہائی زوردار تھپڑ جودت کے منہ پر رسید کر دیا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکا کر اس کا یہ تھپڑ سہہ گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس تھپڑ سے زیادہ کا حق دار ہے۔

"تم نے بھی وہی کیا جو آج سے کئی سال پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم نے بھی آخر یہ ثابت کر دیا کہ تمہارے اندر بھی وہی جراثیم ہیں، ذلالت والے، خباثت والے اور بے غیرتی والے۔"

آذر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جودت کو کھڑے کھڑے گولی مار دے، یا پھر اسے مار مار کر فنا کر ڈالے لیکن کیا کرتا، مجبور تھا، بے بس تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہاں دل آور شاہ بھی تھا جس کے سامنے وہ سر نہیں اٹھا سکتا تھا، وہاں عدیل عمر نیازی بھی تھا جو خود بھی سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا جس کے وہ لوگ گناہگار تھے، وہاں نبیل حیات بھی تھا، وہاں مریم بھی تھی، اور آذر اتنے لوگوں کے سامنے کیا کر سکتا تھا بھلا۔

"بھائی آپ لوگ جانتے ہیں، میں رات بھر آپ لوگوں کے ساتھ ہی گھر پہ رہا ہوں، میں نے اور کوئی بھی غلط حرکت نہیں کی۔"

"غلط حرکت جو تم کر چکے ہو، کیا وہ کم ہے؟" آذر دبے لہجے میں دانت پیس کر بولا تھا۔

"لیکن میں اپنی اس غلط حرکت کا ازالہ بھی تو کر رہا ہوں نا۔" جودت پھر بھی جھکا نہیں تھا۔

"یہ ازالہ نہیں ہے۔ ازالہ میں کروں گا۔" آذر نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا اور کہتے ہوئے عدیل کی سمت پلٹا تھا۔

"عدیل صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک عزت دار اور شریف گھرانے میں عزت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور میں اس وقت آپ کی اسی عزت کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر رہا ہوں کہ ہم یہ نکاح خاموشی کی چادر میں چھپا نہیں رکھیں گے، بلکہ سب کے سامنے آپ کی عزت کو اپنی عزت بنا کر اپنے گھر لے کر جائیں گے اور اسے بھی وہی مقام دیں گے جو ہمارے گھر میں باقی بہوؤں کا ہوگا۔ اگر اس میں ذرا سا بھی فرق آیا تو آپ میرا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن کو میں اپنی بہن سمجھ کر اپنی ذمہ داری پہ اپنے گھر لے کر جاؤں گا اور بہت دھوم دھام سے لے کر جاؤں گا، آپ بس ایک مہینے کا یا پھر چند دنوں کا وقت دے دیں، ان شاء اللہ یہ شادی اب ہماری شادیوں کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔"

آذر نے عدیل کے قریب آتے ہوئے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی طرف سے مریم کے تحفظ کا پورا پورا یقین دلایا تھا جبکہ عدیل سرخ چہرہ لیے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا، یہ آفس اگر دل آور شاہ کا نہ ہوتا تو وہ یقیناً جودت آفندی کو کب کا لہولہان کر چکا ہوتا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل آور شاہ کا لحاظ آڑے آ گیا تھا کیونکہ یہ معاملہ وہ ہینڈل کر رہا تھا۔

"عدیل!" نبیل نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور کندھے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے کسی نرم فیصلے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"دیکھیں ہم سے جو غلطی ہو چکی ہے میں اس کے لیے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہوں، ہمیں معاف کر دیں۔ آپ بھی سمجھیں کہ آپ نے اپنی سسٹر کا رشتہ طے کر دیا ہے اور چند دن بعد اس کی شادی ہے، ہم شادی کے وقت بھی آپ لوگوں پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے، آپ کو کسی بھی چیز کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" آذر نے سچ مچ عدیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

عدیل ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا جبکہ باقی کا معاملہ نبیل نے خود ہینڈل کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ جب چاہو بارات لے کر آ جانا۔ مریم اب آپ لوگوں کی ہی امانت ہے۔"

آذر کے لیے نبیل کی طرف سے اتنی تسلی ہی کافی تھی، پھر وہ مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر نکل گیا تھا اور نبیل، دل آور شاہ کے ساتھ مریم کو لیے اپنی گاڑی میں آ گیا تھا جہاں عدیل بھی موجود تھا۔

♥

"کیا بات ہے آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

جودت کے پیچھے پیچھے آذر بھی تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہوا تھا لیکن کومل، حرمت اور انوشہ وغیرہ کو پریشان دیکھ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا تھا۔

''وہ..... وہ علیزے..... صبح سے بلکہ رات سے مسلسل رو رہی ہے۔ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بھوکی ہے رات سے۔''

دل کے اشارے پہ حرمت نے ہی بات کہنا شروع کی تھی۔

''کیوں رو کیوں رہی ہے؟'' آذر نے بے ساختہ ہی پوچھ لیا تھا۔

''اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ دل آور بھائی کے پاس۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ دل آور بھائی اسے طلاق نہ دے دیں وہ رات کہہ کر گئے تھے۔'' حرمت نے جلدی جلدی وجہ بھی بتا دی تھی۔

''نہیں..... وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ بہت سمجھدار آدمی ہے۔'' آذر کو دل آور پر یقین پختہ ہو چکا تھا۔

''وہ ایسا ہی کریں گے، میں ان کی زبانی سن چکا ہوں، وہ کہہ رہے تھے کہ میرا اور علیزے کا حوالہ آج تک ہی ہے، آج یہ حوالہ ختم ہو جائے گا۔ یعنی آج وہ یہ رشتہ ختم کر دیں گے۔''

جوت بھی آگے بڑھتے بڑھتے ان کی یہ بات سن کر رُک گیا تھا اور جوت یہ بات سن کر آذر کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی ٹھٹک گئی تھیں۔

''دیکھا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بیچاری؟'' اب کی بار کومل بھی بول پڑی تھی اور اس نے علیزے کی حمایت کی تھی۔

اور آذر چند سیکنڈز وہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچنے کے بعد ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

♥

''علیزے.....''

آذر دروازے پہ دستک دے کر اندر آ گیا تھا اور علیزے اس کی آواز سننے کے باوجود بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی، گھٹنوں میں منہ چھپائے جوں کی توں بیٹھی رہی۔

''آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' آذر نے اس کے قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

علیزے کو یکدم کرنٹ چھو گیا تھا اور مارے بے یقینی کے فوراً اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

''آ..... آپ..... سچ کہہ رہے ہیں، آپ مجھے چھوڑ آئیں گے کیا؟''

''ہاں..... سچ کہہ رہا ہوں۔ تم اُٹھو میں گاڑی نکالتا ہوں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ ہمیں ایک بار پھر پچھتانا پڑ جائے۔''

آذر کل رات والی کہانی اور آج کے دن والی حقیقت سے بُری طرح بدظن اور بدگمان ہو چکا تھا اور اب تو اس بات پہ اور بھی زیادہ یقین کامل ہو چکا تھا کہ زندگی میں کہیں بھی، کسی بھی وقت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ علیزے سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور علیزے یوں بتاتی سے اٹھی تھی جیسے کسی نے اسے جنت میں داخل ہونے کی نوید سنا دی ہو۔

وہ تیزی سے اپنے آنسو پونچھتی، چپل پہن کر وہ پٹہ اوڑھ کر اس کے پیچھے ہی باہر آ گئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی ہی تھی کہ وقار آفندی کے بیڈ روم کے سامنے اس کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے تھے۔ کیونکہ آسیہ آفندی بیڈ روم سے باہر نکل رہی تھیں، اس ایک رات میں ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ جیسے وہ صدیوں کی مریض ہوں۔

''اللہ حافظ مما! میرے لیے دعا کیجیے گا۔'' علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اللہ حافظ..... جاؤ اپنے گھر میں آباد رہو، اللہ تمہیں خوشیاں نصیب کرے، لیکن اب اتنا یاد رکھنا کہ اس شخص کو زندگی میں کسی بھی موقعے پر دعا مت دینا، ورنہ کہیں کی بھی نہیں رہو گی، کیونکہ آج تو شاید وہ تمہیں قبول کر لے گا مگر بار بار ایسا نہیں کرے گا، آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔''

آسیہ آفندی نے بڑے دو ٹوک سے انداز میں اسے سمجھایا تھا اور اسے رخصت کر دیا تھا اور علیزے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی خالی ہاتھ میکے سے نکل آئی تھی اب اس کی منزل وہ تھی جہاں اس کا ''ڈرائیور'' تھا۔

♥

''وہ بہت اچھا ہے بھابی! بہت اچھا ہے۔ بہت اعلیٰ ظرف ہے بلند کردار ہے۔ اتنا کہ مجھے خود پہ فخر ہونے لگا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے، یہ..... یہ دل اس کے دم پہ دھڑکتا ہے۔ میں..... میں جی رہی ہوں تو صرف اس کی خاطر۔ صرف اس کے لیے۔ یہ

زندگی صرف اسی کی امانت ہے۔ وہ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ اس سے محبت کا احساس تو ہے نا۔"

آخر وہ بھی تو اپنے دل میں اتنے دکھ اتنی اذیتیں لیے جی رہا ہے نا۔ آخر بتول آنٹی نے بھی تو کانٹوں بھری زندگی بسر کی ہے نا۔ تو پھر میں کیوں نہیں؟ میں کیوں نہیں جی سکتی بھلا۔ میں کیوں نہیں کر سکتی ایسا۔ میں..... میں کروں گی۔ میں جیوں گی بھائی! میں جیوں گی سب کچھ اپنے دل میں دفن کر کے جیوں گی، خوشی خوشی جیوں گی، اور دل آور شاہ کی محبت میں سر اٹھا کر جیوں گی، اس طرح کہ ہر محبت کرنے والے کو مجھ پہ اور میری محبت پہ رشک آئے گا۔ کسی کی محبت میں پاگل ہو جانا، یا مر جانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ کسی کی محبت سینے سے لگا کر جی لینا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے۔ میں محبت کا ایک نیا روپ دکھاؤں گی سب کو، میں دل آور شاہ پہ قربان۔

میرا رب راضی..... میرا جگ راضی..... میں دل آور شاہ پہ قیامت تک راضی۔ جو دکھ اس نے سہے، جو قربانیاں اس نے دیں۔ اس کے آگے تو یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اب جس حال میں وہ خوش اس حال میں زری بھی خوش۔"

زری نے رو رو کر کہتے ہوئے اپنے آنسو بھی پونچھ لیے تھے اور اس کے اس فیصلے پہ نگارش کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اس نے زری کے بالوں کو سہلاتے ہوئے گلے سے لگا لیا تھا۔ لیکن جیسے ہی یہ ساری داستان عبداللہ تک پہنچی تھی وہ سن کر ششدر سا رہ گیا تھا کہ دل آور کی زندگی کا یہ کون سا باب ہے جو ان لوگوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھا؟

♥

دل آور شاہ کے گھر کے سامنے ہی گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے آذر نے علیزے کی طرف دیکھا تھا اور علیزے کا دل دھڑک اٹھا تھا اس نے بھی بے ساختہ ہی آذر کی سمت دیکھا تھا۔

"جاؤ علیزے! اپنے گھر جاؤ، دیر مت کرو۔ گھر بسنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں، لیکن گھر اُجڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگتا اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر اجڑے۔ کیونکہ دل آور شاہ جیسے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں اور جن کو ملتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان کی قدر کریں۔ اس لیے تم بھی اس کی قدر کرو، کیونکہ اب ہم سے بھی زیادہ تمہارے لیے اس کو اہم ہونا چاہیے۔ اسی کی عزت میں تمہاری عزت ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم خود بھی اس چیز کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکی ہو۔ تمہیں مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاباش..... تم جاؤ اور خوش رہو۔"

آذر نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے جانے کے لیے کہا تھا اور علیزے سر جھکا کر رو گئی تھی۔

"تھینک یو آذر بھائی! تھینک یو سو مچ۔" وہ آہستگی سے کہتی دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی تھی اور گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی بڑے خوشی بھرے انداز میں گیٹ وا کر دیا تھا۔ اور آذر گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی!" گلاب خان کے لہجے سے ہی اس کے اندر کی خوشی جھلک رہی تھی کہ وہ علیزے بی بی کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا ہے۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟" علیزے بھی بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

"الحمدللہ بی بی جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آئیں آپ اندر آئیں نا..... باہر کیوں کھڑی ہیں؟" گلاب خان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی بے پناہ خوشی اور شفقت کا اظہار کیا تھا اور علیزے آہستگی سے سر جھکا کر اندر آ گئی تھی لیکن اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس گھر میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہو۔

اور یہ تو واقعی ایک سچ تھا۔ پہلے جب وہ آئی تھی تو دل آور اسے لے کر آیا تھا اور وہ بیہوشی کے عالم میں یہاں آئی تھی، لیکن آج بھی وہ آئی تھی تو خود اپنی رضا سے آئی تھی اور پورے ہوش و حواس میں یہاں آئی تھی اس لیے دل دھڑکتا تو ایک فطری سا عمل تھا۔

"بتت..... تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" اس نے گیراج میں محض ایک گاڑی کھڑے دیکھ کر بے ساختہ استفسار کیا تھا۔

"صبح سے آفس گئے ہوئے ہیں، ابھی تک نہیں آئے۔" گلاب خان نے نفی میں سر ہلایا۔

"کب تک آئیں گے؟" اس کی بے چینی کا عالم ہی نرالا تھا۔

"بس آ جائیں گے تھوڑی دیر تک..... آپ کہتی ہیں تو میں فون کر کے بلا لیتا ہوں۔" گلاب خان نے اپنا موبائل نکالا۔

"نن..... نہیں..... رہنے دو ابھی وہ خود ہی آ جائے گا۔" علیزے نے فوراً اسے روک دیا تھا لیکن علیزے کو دیکھ کر بل ڈوگ نے دور سے ہی بھونکنا شروع کر دیا تھا کہ اسے اس کی موجودگی کا بھی پتا چل جاتا تھا۔

"ارے علیزے بی بی! یہ آپ کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔" گلاب خان اسے متوجہ کیا تھا اور علیزے ہلکے سے مسکراتی ہوئی لان کی طرف آ گئی تھی جہاں دیوار میں پیوست کھونٹے سے کسی شیر کی سی جسامت والا بل ڈوگ بندھا ہوا تھا، پہلے علیزے کو دیکھ کر بہت ڈر لگا تھا، وحشت ہوتی تھی، جھرجھری آتی تھی، لیکن آج وہ سب بھی بہت پیچھے چلا گیا تھا آج اسے دل آور شاہ سے دیکھ کر کتے سے بھی ایک اپنائیت اور انسیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ آج اس کا تن من دل آور شاہ کے نام پہ ہی مائل ہوا جا رہا تھا۔

"گلاب خان..... گلاب خان..... کس کے ساتھ باتیں کیے جا رہے ہو؟ کون آیا ہے؟" گل کوریڈور میں ہی تھی شاید اسی لیے کھلے کی آواز اور گلاب خان کی باتیں کرنے کی آواز سن کر رہ نہیں سکی تھی اور باہر نکل آئی تھی لیکن باہر لان میں بل ڈوگ کے ساتھ کھڑی علیزے کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ لپک کر علیزے کے قریب آئی تھی۔

"علیزے بی بی!" گل کا لہجہ چہک سا گیا تھا۔

"کیسی ہو گل؟" علیزے خود ہی اس کے گلے لگ گئی تھی۔

"آپ کیوں چلی گئیں علیزے بی بی! کیوں چلی گئیں؟ صاحب کو اکیلا چھوڑ دیا آپ نے، ذرا بھی خیال نہیں آیا، بڑی یاد آتی ہیں آپ۔" گل نے ایک ہی سانس میں اتنے شکوے داغ دیئے تھے اور علیزے سچ مچ شرمسار ہی ہو گئی تھی کہ گل ایک وفادار ملازمہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی دوست بھی ثابت ہوئی تھی کہ گل ایک ملازمہ ہو کر اپنے صاحب کے لیے اتنی حساس ہو رہی ہے، اور اس نے اس کی بیوی ہو کر بھی اس کا احساس نہیں کیا تھا، بے وقعت کر چلی گئی تھی اسے۔ "لیکن تمہارے صاحب کی وفا میں اتنا اثر ہے کہ وہ وفا مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔" علیزے، گل کا ہاتھ تھپک کر اندر آ گئی تھی۔

"لیکن علیزے بی بی! صاحب آپ سے صرف وفا نہیں کرتے۔ محبت بھی کرتے ہیں۔" اب کی بار گل نے بڑے کام کی بات کی تھی۔

"اچھا..... وہ کیسے؟" علیزے کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی اور گل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"وہ ایسے کہ جب آپ کو گولی لگی تھی تو صاحب جی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں، ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے جب آپ اپنے میکے چلی گئی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ صاحب جی کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے۔ کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو گل۔" علیزے بے ساختہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ٹھہر گئی اور بڑے دل سے پوچھا تھا۔

"گلاب خان کی قسم! میں جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی جی! صاحب جی کو بڑا پیار ہے آپ سے۔ جب آپ چلی گئی تھیں تو اکثر آپ کے کام کے لیے آپ کو ہی آواز دیتے تھے اور پھر چپ ہو جاتے تھے اور کئی بار تو مجھے علیزے کہہ گئے۔ بڑی شرم آئی مجھے اور بڑا ترس بھی آیا۔"

گل بھی آج بڑے دنوں بعد اس طرح کھل کے بول رہی تھی اور علیزے تو جیسے دل تھام کے رہ گئی تھی، دل آور پہ گزرنے والی کیفیات کا سن کر اس کے اپنے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"مجھے مس کرتا تھا وہ؟" علیزے دروازہ کھول کر اپنے اور دل آور کے بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔

"اس دنیا میں انہوں نے صرف آپ کو ہی تو مس کیا ہے بی بی جی! پر مجھے لگتا ہے کہ آج رات نہیں کیا۔" گل نے کہتے کہتے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ علیزے چونک کر متوجہ ہوئی اسے گل کا آخری جملہ کرنٹ کی طرح لگا تھا۔

"تت..... تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔"

"بتاؤ نا گل! تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا؟" علیزے کی بے چینی عروج پہ تھی۔

"آج میں نے کمرے کی صفائی کی تو سگریٹ کے ٹکڑے بہت کم ملے۔ ورنہ روزانہ سو سگریٹوں کا انبار لگا ہوتا تھا، جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ رات بھر جاگتے رہتے ہیں اور آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر آج....." گل کا وہی ایک جواب تھا۔ نفی والا اور علیزے اس کے مشاہدے پہ حیران رہ گئی تھی۔

"ہونہہ..... آج رات میں نے خود اسے بہت مس کیا تھا، شاید اسی لیے اس نے مجھے مس کرنا چھوڑ دیا۔" علیزے افسردگی سے کہتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''کوئی بات نہیں بی بی جی! اب آپ آ گئی ہو نا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' گل بڑے اطمینان سے کہتی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

''لیکن مجھے یہ سب کچھ ٹھیک کرنا نہیں آتا گل! اور ویسے بھی وہ مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرے گا۔'' علیزے کو اس کے کل والے تیور یاد آ رہے تھے۔

''ارے بی بی جی! آپ کو نہیں پتا۔ کوئی بھی شوہر اپنی بیوی سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتا۔ اور خاص طور پر اس وقت جب اس کی بیوی اسے منانے کے لیے خود چل کر اس کے پاس آئی ہے۔'' گل آہستگی سے مسکرائی تھی مگر علیزے ہنوز اسے ناسمجھی سے ہی دیکھ رہی تھی۔

''مگر مجھے تو منانا بھی آتا۔'' وہ جھنجلا گئی تھی۔

''اچھی طرح تیار ہونا تو آتا ہے نا۔'' گل نے اس کے حلیے کو دیکھ کر کہا۔

''تیار ہونا..... کیا مطلب؟'' وہ الجھی۔

''مطلب خود ہی سمجھ میں آ جائے گا۔ بس آپ نئے کپڑے پہن کر سر سے پاؤں تک تیار ہو جائیں۔ صاحب کی ناراضی آپ کو دیکھ کر ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ بات تو میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔'' گل کا لہجہ معنی خیز سا ہو رہا تھا اور علیزے کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

''مم..... مگر..... میں ایسا نہیں کر سکتی گل۔'' وہ سن کر ہی جھجک گئی تھی۔

''ارے یہ کیا بات ہوئی علیزے بی بی! صاحب آپ کے لیے اتنا کچھ کر لیتے ہیں اور آپ ان کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے یہ تو۔'' گل نے بابیی اور تاسف سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اس کے سر ہلانے کے ساتھ ساتھ علیزے کا دل بھی ہل گیا تھا۔

''اگر میں ایسا کر لوں تو کیا وہ مان جائے گا۔'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''ناراض رہیں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ فائدہ اسی میں ہوگا کہ مان جائیں۔'' گل آج اسے کچھ اور ہی مشورے دے رہی تھی اور علیزے دل اور کو منانے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ فوراً ہی ہر بات کے لیے مان گئی تھی اور گل اٹھ کر اس کے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

♥

دودھیا ہاتھوں پہ ریڈ کلر کی نیل پالش اس کے ننھے ہاتھوں کو اور بھی دو آتشہ بنا گئی تھی اور ابھی وہ آخری ناخن پہ نیل پالش کا آخری کوٹ لگا ہی رہی تھی کہ باہر گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن بجا تھا اور علیزے کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ نیل پالش کی شیشی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی تھی۔

''علیزے بی بی! صاحب جی آ گئے۔'' گل، علیزے کی ہدایت کے مطابق فوراً بھاگتی ہوئی آئی تھی اور علیزے یکدم ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ چلی جائیں۔ میں بھی نیچے جا رہی ہوں۔'' گل تیزی سے کہتی ہوئی شوآپ سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا رخ نیچے کچن کی طرف تھا لیکن تب تک دل اور اندر آ چکا تھا۔

''السلام علیکم صاحب!'' وہ آہستگی سے بولی۔

''وعلیکم السلام!'' اس نے لاپروائی سے جواب دے کر قدم آگے بڑھا دیئے۔

''چائے بناؤں آپ کے لیے؟'' اس نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دل اور سے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔

''نہیں..... بھوک لگ رہی ہے، کھانا لگا دو، میں چینج کر کے نیچے ہی آ رہا ہوں۔'' وہ عجلت سے کہتا ہوا اوپر اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا مگر بیڈروم میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

کمرے میں نیل پالش کی ایک مخصوص سی خوشبو اسے کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہو گئی تھی، حالانکہ اپنے کمرے میں یا اپنے گھر میں اس نے یہ خوشبو پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس سے انجان نہیں تھا، کیونکہ اپنے آس پاس اکثر خواتین کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وہ یہ خوشبو محسوس کر چکا تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ گل نے کمرے کی صفائی وغیرہ کی ہو؟'' وہ خود کو خود ہی بہلاتا سر جھٹک کر آگے بڑھ کے بریف کیس ٹیبل پر رکھ خود بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور نیچے جھک کر اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا اور بوٹوں کے تسمے کھول کے اور پاؤں بوٹوں سے آزاد ہی وہ چند سیکنڈز کے لیے بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا مگر بازو بیڈ پر پھیلائے تو وہ ایک بار پھر ٹھٹکا تھا اس کے ہاتھ سے کوئی ریشمی چیز ٹی تھی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

وہ ریشمی چیز علیزے کا دوپٹہ تھا، بلیک کلر کا انتہائی باریک شیفون کا دوپٹہ۔ جس کے چاروں اطراف ریڈ کلر کے سوتی دھاگے چھوٹے چھوٹے نفیس گچھوں کا کام ہوا تھا۔ یہ سوٹ اسی نے علیزے کو لے کر دیا تھا جب وہ اسے پہلی بار شاپنگ پہ اپنے ساتھ لے کر ی۔ لیکن علیزے نے ایک بار بھی یہ سوٹ اور یہ دوپٹہ استعمال نہیں کیا تھا، تو پھر آج یہ دوپٹہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ وہ دوپٹہ ہاتھ میں یکدم سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''گل..... گل..... کہاں ہو؟'' وہ گل کو آوازیں دیتا ہوا باہر نکل آیا۔

''جج..... جی صاحب؟'' وہ باورچی خانے سے باہر نکلی تھی۔

''کمرے میں کوئی آیا تھا کیا؟'' اور ڈریسنگ کے قریب کھڑا پیچھے کھڑی گل سے پوچھ رہا تھا۔

''جج..... جی صاحب جی ام میں گئی تھی۔ علیزے بی بی کی ساری چیزیں نکال کر سیٹ کی ہیں اور ابھی کر ہی رہی تھی کہ آپ آ گئے۔'' گل بہانہ بنا گئی تھی۔

''تو تمہیں کیا ضرورت تھی ان چیزوں کو نکال کر سیٹ کرنے کی؟ جہاں پڑی تھیں پڑی رہتیں۔ یہ چیزیں کل بھی بیکار تھیں اور ی بھی بیکار رہیں۔ چاہے یہاں رکھو۔ چاہے وہاں رکھو۔'' وہ خفگی سے کہتا ہوا وہاں سے ہٹ کے دوبارہ کمرے میں آ گیا تھا اور ہاتھ پکڑا دوپٹہ دوبارہ بیڈ پہ اچھال دیا تھا اور خود واش روم میں گھس گیا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ واش روم سے شاور لے کر تولیہ رگڑتا ہوا باہر نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا اس کے دماغ میں ایک بار پھر ید ہوئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل پہ سامنے ہی نیل پالش، پرفیوم، ہیئر برش اور ایک باڈی لوشن پڑا ہوا تھا، جن کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ انہیں ں کر کے نہیں رکھا گیا بلکہ استعمال کیا گیا ہے اور استعمال کون کر سکتا تھا بھلا؟ گل سے تو اسے ایسی امید ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسی ت کر سکتی تھی۔ تو پھر کس نے کیا تھا استعمال؟ یہ سوال اس کے ذہن میں سوال ہی رہا تھا، جواب نہیں بن سکا تھا، کیونکہ جواب بھی تو کس سے وہ کپڑے وغیرہ کھینچ کر کے نیچے آ پا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

پچھلے کافی دنوں سے اس کی رونین چلی آ رہی تھی کہ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے کے پچھلی سائیڈ والے ٹیرس پہ آ کھڑا ہوتا تھا ں سے اس کے گھر کا سوئمنگ پول ایک بہت ہی خوبصورت سا منظر پیش کرتا تھا۔ سوئمنگ پول میں پڑنے والی روشنیوں کا اثر اتنا تھا کہ ان کا عکس دل آور کے چہرے پر بھی پڑتا تھا اور پانی میں لہراتی روشنیوں کا عکس بھی لہرا رہا تھا اور اس وقت بھی ایک ایسا ہی نظر دکھائی دے رہا تھا، وہ کھانا کھا کر ٹیرس پہ نکل آیا تھا اور دونوں ہاتھ ریلنگ پہ جمائے سوئمنگ پول کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

ابھی اسے تقریباً پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ چند ملی جلی خوشبوؤں کا ایک نرم سا جھونکا اس کی سانسوں میں آ سمایا تھا اور سے نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی پشت پہ اپنی پیشانی ٹکا دی تھی۔

''آئی مس یو ڈرائیور! آئی ریئلی مس یو۔'' وہ عین اس کے عقب میں کھڑی اس کی پشت سے اپنی پیشانی ٹکائے بہت دھیمے اور ستے ہوئے لہجے میں بہت ہی معصوم سا اظہار کر رہی تھی۔ اور دل آور کو یوں لگا تھا کہ جیسے کسی نے اسے سر سے پاؤں تک پتھر کا کر ا ہو وہ چند لمحے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔

''ڈرائیور۔'' علیزے نے اپنے دونوں ہاتھ بھی اس کی پشت پر رکھ دیئے تھے لیکن اب کی بار وہ برداشت نہیں کر سکا تھا اور ام اک جھٹکے سے اس کی سمت پلٹا تھا۔

''تم..... تم یہاں؟'' وہ غصے اور بے چینی سے بولا تھا البتہ علیزے پہ نظر پڑتے ہی چونکا تھا کیونکہ وہ سر تا پا اور سے اور ہی نظر آ ی تھی۔

''ایم سوری ڈرائیور! ایم ریئلی سوری۔'' علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' وہ بہت ہی پتھریلے سے لہجے میں بولا تھا۔

''تمہارے لیے۔'' علیزے نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے اور جھجکے بغیر کہہ دیا تھا۔

''تم گئی بھی تو میرے لیے ہی تھیں نا؟'' وہ تلخی سے کہتا دوبارہ ورینگ کی سمت مڑ گیا تھا۔

''تمہارے نزدیک میرے جانے کی اہمیت ہے لیکن میرے آنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟'' اس نے جیسے شکوہ کیا تھا۔

''جب اہمیت تھی تب تم آئی نہیں اور آج جب سب کچھ ختم ہو رہا ہے تو.....'' اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

''یہ..... یہ..... کک..... کیا کہہ رہے ہو تم..... تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔'' علیزے کی زبان اور الفاظ بے ربط سے ہو گئے تھے۔

''طلاق کے پیپرز تیار ہو چکے ہیں۔ اب تمہارا اور میرا رشتہ پین سے لکھے ہوئے ایک سائن تک رہ گیا ہے اور جیسے ہی یہ سائن ہو گئے۔ ہر چیز ختم۔ ہر بات ختم۔ ہر رشتہ ختم۔ پھر تم بھی آزاد اور میں بھی۔ میں وہی ڈرائیور کاؤ ڈرائیور۔ تم وہی نیم کی نیم۔''

وہ دانت پیس کر کہتا ہوا دوبارہ پلٹا اور اس پہ اک اچٹتی سی نظر ڈال کر مضبوط قدم اٹھاتا کمرے میں آ گیا تھا۔

''میں جانتی ہوں ڈرائیور! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ مجھے تم کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا لیکن میں کیا کرتی۔ مجھے کچھ پتا بھی تو نہیں تھا۔ میں تو ہر حقیقت سے انجان تھی۔ مجھے تو صرف وہ پتا تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا اور پھر ہم دونوں کا آپس میں رویہ بھی تو ایسا ہی تھا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں تھے۔ ایسے حالات میں میرا بڑی حویلی چلے جانا کوئی بری بات نہیں تھی۔ ہاں اب اگر میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں تو بے شک ناراض ہو جانا۔ بے شک طلاق دے دینا۔ بے شک گھر سے نکال دینا لیکن اس بار..... صرف اس بار معاف کر دو۔'' علیزے نے اس کے سامنے بے اختیار اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''میرے ظرف کی حد ختم ہو چکی ہے۔ تھک چکا ہوں معاف کر کر کے۔'' وہ جھنجلا گیا تھا۔

''تمہارے ظرف کی حد ہماری سوچ سے بھی زیادہ وسیع ہے ڈرائیور۔ پلیز۔'' وہ التجا کر رہی تھی۔

''ایم سوری! میرے پاس اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ سنگدلی سے کہہ کر رخ موڑ گیا تھا۔

''پلیز ڈرائیور! مجھے وقار آفندی کی بیٹی نہیں۔ اپنی اماں کی بہو سمجھ کر معاف کر دو۔''

علیزے نے کچھ اس انداز میں اور کچھ ان الفاظ میں التجا کی تھی کہ دل آور کو کھڑے کھڑے کرنٹ چھو گیا تھا ایک تو اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی اور دوسرے اس نے اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ رکھے تھے۔ اس کا پتھر ہوا کلیجہ ایک بار پھر تڑخ گیا تھا۔ اس نے علیزے کو بڑی کاٹ دار نظروں سے دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے میں معاف کر دیتا ہوں، لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔ وہ پوری کر سکو گی تم؟''

وہ عین اس کے سامنے کھڑا اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے اب اس اسٹیج پہ پہنچ چکی تھی کہ اس نے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر اور کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر فوراً ہامی بھر لی تھی۔

♥

''ہاں کروں گی پوری، ضرور کروں گی، تم شرائط رکھو تو سہی؟'' علیزے تو جی جان سے رضامند تھی۔

''سوچ لو..... ایک بار پھر سوچ لو۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا اس کے عین سامنے آ رکا تھا۔

''پچھلے چوبیس گھنٹوں سے تمہارے سوا اور کوئی سوچ آ ہی نہیں رہی، میں اور کیا سوچوں؟''

وہ اپنے سامنے کھڑے دل آور کو اس نظر سے دیکھ رہی تھی جس سے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کھڑے کھڑے فتح کر لے گی۔ کیونکہ اس کی یہ نظر زندگی کی پہلی ایسی نظر تھی جس سے وہ کسی مرد کو دیکھ رہی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مرد اس کی اس مخمور نظر سے نہ جاتا۔ اور اس پہ اثر نہ ہوتا۔

''ساری دنیا سے ناتا توڑ لو گی میری خاطر؟ یہاں تک کہ بڑی حویلی والوں سے بھی.....'' وہ اس کے چہرے پہ نظریں جمائے

"ہاں..... توڑ لوں گی۔ سب سے توڑ لوں گی۔ تم سے ناتا جوڑنے کی خاطر میں سب سے ناتا توڑنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ مگر میری مما آپ آخری اپنے ہزبینڈ کی خاطر ملک حویلی والوں کو چھوڑ سکتی ہیں تو میں بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ میں بھی اس وقت بڑی حویلی والوں کو چھوڑ کر ہی آئی ہوں وہ بھی صرف تمہاری خاطر۔"

علیزے نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے اسے جواب دیا تھا۔ مگر اس کے اس ایک جواب سے دل آور کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا۔

"تو کیا ساری دنیا سے کٹ کے رہ لوگی؟ اتنا حوصلہ ہے تم میں؟" وہ بھی جواباً سنجیدگی سے ہی پوچھ رہا تھا۔

"مجھے اتنا حوصلہ بخشنے والے بھی تو تم ہی ہو نا؟ میں ساری دنیا سے کٹ کے رہ گئی ہوں یا نہیں یہ بات تم سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ یہاں یہ بات اور ہے کہ اب کی بار تو میں خود چاہتی ہوں کہ تم مجھے ساری دنیا سے کاٹ کر سب سے الگ ٹریٹمنٹ میں قید کر رکھو۔ تمہارے سوا کسی کا بھی آنا جانا نہ ہو۔ جہاں صرف علیزے ہو..... اور اس کا ڈرائیور ہو۔"

علیزے کے ایسے بیباک بیخبے سے جواب دل آور کے دل کو کچھ ہوا تھا اور اک منہ زور جذبات کی لہر اس کی نس نس میں دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ وہ بڑے ہی اعتماد سے اپنے اور اس کے بیچ کے فاصلے مٹا کر اک بالکل ہی نئی اور لو دیتی قربت کا حصار سا باندھتی جا رہی تھی۔

"میری بیوی بن کر رہو گی؟ یا میری اماں کی بہو؟" وہ قدم اُٹھاتا مزید اس کے قریب آ گیا تھا۔

"تمہاری اماں کی بہو بن کر رہوں گی۔" علیزے کے پاس تو ہر جواب پہلے سے تیار تھا۔

"وہ کیوں؟" اس کی نظریں دل آور کی سوالیہ نظروں سے لپٹ کر جھک گئیں۔

"کیونکہ تمہاری اماں کی بہو بننے میں بڑا فائدہ ہے۔" اس کے شفاف ہونٹوں پہ بکھرتی مدھم مسکراہٹ دل آور کی نظروں سے چھپ نہ سکی تھی۔

"کیسا فائدہ؟" وہ مزید آگے بڑھا۔

"تمہاری اماں کی بہو بنوں گی تو میرا تم پہ رعب رہے گا اور اگر تمہاری بیوی بن کے رہوں گی تو تمہارا مجھ پر رعب رہے گی اور رعب کی وجہ سے میں ہمیشہ تم سے ڈرتی ہی رہوں گی۔" وہ بڑی دور کی سوچیں سوچ رہی تھی۔

"رعب تو تم مجھ پہ ہمیشہ سے جماتی ہو ہمیشہ تم نے مجھے ڈرائیور سمجھا ہے، دل آور نہیں۔" وہ اور آگے بڑھا اور علیزے اسے اپنے قریب دیکھ کر بے ساختہ جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"تمہیں کیا پتا کہ اس ڈرائیور میں کیا چھپا ہے؟" وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"کیا چھپا ہے؟" اس کی نظریں علیزے کے چہرے پہ گہری ہو گئیں۔

"دل آور....." اس کے ہونٹ دھیمے سے کپکپائے۔

"اور دل آور میں کیا چھپا ہے؟" اس کے چھوٹے چھوٹے سوال بڑھتے جا رہے تھے۔

"علیزے کی محبت..... علیزے بھی بڑے جم کے جواب دے رہی تھی۔

"تو پھر اس محبت سے دور کیوں ہٹ رہی ہو؟ قریب آؤ نا۔" دل آور نے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"قریب ہی تو آنا چاہتی ہوں۔" علیزے کی آواز لرز گئی تھی۔

"کتنا قریب؟" دل آور کی آواز کی گمبھیرتا بھی کچھ کم نہیں تھی۔ علیزے کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں اور اس کی دھڑکنوں جیسے پورا ماحول ہی دھڑک اُٹھا تھا۔ کمرے میں فسوں خیزی بڑھنے لگی تھی۔

"اتنا قریب کہ درمیان میں کچھ نہ رہے۔" علیزے کہتی ہوئی اس کے قریب ہوئی تھی۔

"یہ قریب ہونا بھی کوئی قریب ہونا ہے؟" دل آور فی الحال اسے شرم دلا رہا تھا، کیونکہ ان دونوں کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ اب بھی حائل تھا اور وہ یہ فاصلہ بھی نہیں چاہتا تھا۔

"تو پھر کیسا قریب ہونا، قریب ہونا ہوتا ہے؟" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" دل آور فوراً ہی اپر ہینڈ سا بن گیا تھا۔ جس پہ علیزے کو اس کی اپر وائی دیکھتے ہوئے خود ہی جھجک

کا دامن چھوڑنا پڑا تھا اور وہ اپنے اور اس کے بیچ کا فاصلہ مٹاتے ہوئے بے حد آہستگی سے اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور دل آور کو یوں لگا جیسے اس کی صدیوں سے بھٹکتی اور تڑپتی روح کو قرار مل گیا ہو، جیسے ایک دم سے ہر چیز شانت ہو گئی ہو۔ جیسے اس کی ذات پہ بچھائے عذاب پل میں چھٹ گئے ہوں۔

اور اس عذاب سے نکلتے ہی اس کی روح ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ اس کا تن من سرشار سا ہو گیا تھا اور اسی سرشاری اور خماری کے ہاتھوں بہکتے ہوئے اس نے اپنے سینے سے لگی علیزے کو اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں انتہائی زور سے بھینچ لیا تھا۔ اتنے زور سے کہ علیزے کو لگا وہ اس کے سینے میں پیوست ہو جائے گی۔

"اور زور سے....." علیزے کی پسلیاں ٹوٹنے کو تھیں، مگر پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے زور سے بھینچنے کی حد کر ڈالے۔

"مر جاؤ گی۔" وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی سے بولا۔

"مر جانے دو۔" وہ اس سے بھی زیادہ سرگوشی سے بولی تھی۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے اور بھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"سوچ کر ہی تو آئی ہوں۔" علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گریبان میں چہرہ چھپا لیا تھا اور اس کے چہرے کا لمس دل آور کے سینے سے ٹکرانے لگا تھا جس سے دل آور کی رگوں میں سرپٹختا جذبات کا جنون اور بھی منہ زور ہونے لگا تھا۔

"میرے جذبات کی شدتوں کو سہہ نہیں پاؤ گی۔" اس نے علیزے کو بازوؤں کے حصار سے آزاد کرتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر عین اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

"تم اپنی شدتیں آزماؤ تو سہی۔" علیزے کا لہجہ بھی بوجھل ہو رہا تھا اور اس کے الفاظ بھی۔

"میری شدتوں سے پہلے میری شرائط تو تم نے سنی ہی نہیں۔" وہ اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے علیزے کے رخساروں کو سہلا رہی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بھی شرط سے انکار نہیں۔ چاہے تو سائن کروا لو۔"

"سائن بھی کرواؤں گا مگر آخری شرط کے بعد جو سب سے زیادہ اہم ہے۔"

"آخری شرط..... وہ کیا؟" علیزے کو حیرانی ہوئی۔

"بتا دوں؟" وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔

"ہاں....." اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو اور اتنی شدید محبت کرو کہ باقی ہر شے کو بھول جاؤ یہاں تک کہ اپنے آنے والے بچوں کو بھی۔" دل آور کی شدتیں اس کے اظہار اور اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھیں۔

"بچوں کو بھی؟ تو پھر ان سے محبت کون کرے گا؟" علیزے کو خفگی ہوئی تھی۔

"میں کس لیے ہوں آخر؟ میں کروں گا ان سے محبت۔ تم صرف مجھ سے محبت کرو گی صرف مجھ سے۔ شرط منظور ہے تو بات کرو۔" دل آور کی نظریں اس کے چہرے کے اک اک نقش کو چھو رہی تھیں اور بولے دے رہی تھیں۔

"لاؤ کاغذ قلم..... میں سائن کرتی ہوں۔" وہ یہ شرط ماننے کو بھی تیار تھی۔

"کاغذ قلم لانا ضروری تو نہیں سائن تو تم کسی بھی جگہ کسی بھی چیز پر کر سکتی ہو بلکہ یوں کہنا ٹھیک ہو گا کہ مہر بھی لگا سکتی ہو۔" دل آور کا اشارہ اس کے گلابی شفاف ہونٹوں کی طرف تھا اور علیزے اس کا اشارہ سمجھ کر بے ساختہ بدک گئی تھی۔

"لیکن ڈرائیور۔" اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا تھا۔

"اب تم محبت کی ہامی بھر چکی ہو۔" دل آور نے کہتے ہوئے اسے کچھ بھی کہنے کی مہلت نہیں دی تھی اور اس کے سارے احتجاج اور سارے الفاظ اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیے تھے اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ علیزے اس کی شرٹ اپنی مٹھیوں میں دبوچتی رہ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں سکی تھی۔

"ڈرائیور....." بڑی مشکل سے بڑی دیر بعد اس کے کھوئے ہوئے الفاظ واپس آئے تھے اور وہ بڑی کوششوں کے بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔

"جی ڈرائیور کی جان..... کہو..... میں سن رہا ہوں۔" اس نے چکراتی ہوئی علیزے کو ایک بار پھر بانہوں میں لے لیا تھا اور
کے بعد بے حد سلکی بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے انہیں سہلایا تھا۔
"میں رات بھر نہیں سوئی مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ بیڈ پہ لیٹنا چاہتی تھی۔
"میرا بھی یہی حال ہے۔" وہ گمبھیر آواز میں کہتا اس کے بالوں کو اور گردن کو نرمی سے چھو رہا تھا اور اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش
یا تھا۔
"تو پھر سونے دو نا مجھے؟" علیزے اس کی سانسوں کے لمس سے کسمسائی تھی۔
"آؤ سلاتا ہوں تمہیں۔" وہ اسے یونہی بانہوں میں لیے بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا اور بے حد نرمی اور بے حد آہستگی سے اسے بیڈ پہ لٹا
یا تھا۔
"اور تم؟" علیزے کو اب اس کا خیال آیا تھا۔
"تم بتاؤ..... میں کیا کروں؟ جاگتا رہوں یا سو جاؤں؟" وہ اس کے دائیں بائیں بیڈ پہ دونوں ہاتھ جمائے اس کے اوپر ذرا
ہوا تھا۔
"سو جاؤ۔" علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیے تھے۔
"میں پاگل نہیں ہو کہ آج کی رات بھی سو جاؤں۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا تھا۔
"کیوں..... آج کی رات کیوں نہیں سو سکتے؟" وہ ناسمجھی سے بولی۔
"کیونکہ آج کی رات، میرے پاس، میرے سامنے، میری بانہوں میں میرے جاگنے کا سامان موجود ہے۔ آج کی رات
نے سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی کنپٹی پر ریوالور رکھ کے گولی مار دوں اور مر جاؤں۔"
"پلیز..... ایسا تو مت کہو۔" علیزے نے بے ساختہ تڑپ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔
"تو پھر سلانا کیوں چاہتی ہو؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔
"میں کب سلانا چاہتی ہوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ تم خود بھی جاگو اور مجھے بھی جگاؤ۔" بے حد دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس
یکیں جھکا گئی تھیں اور دل آور بے ساختہ چلا اٹھا تھا۔
"علیزے....." وہ انتہائی زور سے اور انتہائی خطرناک تیوروں سے دھاڑا تھا اور علیزے کھلکھلاتی ہوئی چہرہ چھپا گئی تھی،
نکہ دل آور اب پوری طرح سے اس پہ حاوی ہو چکا تھا اور وہ بے تحاشہ ہنستی ہوئی اور کھلکھلاتی ہوئی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی
ی اور اس کی کھلکھلاہٹوں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔
"پلیز ڈرائیور پلیز..... بس کرو..... میں پاگل ہو جاؤں گی۔" علیزے اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے احتجاج چلائی تھی۔
نکہ دل آور نے اسے واقعی پاگل کر ڈالا تھا۔ وہ چند جسارتوں پہ ہی بوکھلا گئی تھی۔
"اوکے..... اوکے..... اب کچھ نہیں کرتا..... تم بس مجھے سلانے کی کوشش کرو اور میں تمہیں جگانے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ
ی شیزی سے کہتا اس کے چہرے کے قریب جھک آیا تھا۔ اتنا کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے میں رچنے لگی تھیں۔ جس پہ ان دونوں
ے اعصاب اک عجب سے سحر کی زد میں آ گئے تھے۔
"کیا مطلب؟" علیزے کے حواس بکھرنے لگے تھے اس کا لہجہ اور اس کی آواز دل آور کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھے اور
ے کے صبر اور ضبط کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔
"آج کی شب میری بانہوں میں رہو، سارے مطلب سمجھاؤں گا۔" وہ سرگوشی سے کہتا لیمپ کی تیز روشنی گل کر چکا تھا اور
یزے نے بڑے سکون سے اور پوری آمادگی کے ساتھ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے حوالے کر دیا
اس کی اس سپردگی پہ کب سے ٹھہری ہوئی کالی رات بھی مسکرا اٹھی تھی۔
کیونکہ ان کا یہ ملن بڑے صبر، بڑی برداشت اور بڑے ضبط کے بعد ہوا تھا۔ بڑی اذیتیں اور بڑے عذاب جھیلے تھے انہوں
نے۔ اس لیے اس وصال کی رات پہ تو اب پورا پورا حق تھا ان کا اور اس حق کو پورے استحقاق سے وصول کرنے میں وہ دونوں ہی کم
تھے۔ اس طرح کہ کائنات کا باقی ہر احساس ہی پس پشت ڈال دیا تھا سوائے ایک دوسرے کے کیونکہ اس وقت علیزے کے لیے اس

کا ڈرائیور اور ڈرائیور کے لیے اس کی علیزے ہی کل کائنات تھی۔

♥

دل کی پوچھتے ہو تو پھر سن لو
ہم نے بخشا تمہیں قیامت تک

وہ کپڑے چینج کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ حالانکہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے اسے اب بھی بڑی دقت ہوتی تھی، مگر آج اس کا موڈ فریش اور خوشگوار تھا۔ اس لیے وہ وقت کے باوجود بھی ریلنگ کا سہارا لے کر سیڑھیاں اتر آئی تھی۔ اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔

اور شبنم آلود گھاس پہ پاؤں رکھتے ہی اس کی روح سرشار ہو اٹھی تھی۔ اس کا من صبح کی ایسی تازگی پہ جھوم گیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس چلتی چند خوبیز پھولوں کو چن چن کر اپنی جھولی میں بھرنے لگی تھی اور اپنی بے دھیانی میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے کتنے ہی پھول چن ڈالے تھے۔

"زری! تم یہاں..... تم خود آئی ہو کیا؟" نگارش بھی تھوڑی دیر بعد نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر نیچے آ گئی تھی اور نیچے لان میں ٹہلتی زری کو دیکھ کر وہ سخت حیرانی اور خوشگواریت کا شکار ہوئی تھی۔

"ہاں میں....." زری مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

"لیکن تم یہاں کیسے؟" نگارش کو واقعی حیرت ہو رہی تھی، کیونکہ زری ابھی بھی چلتے ہوئے لڑکھڑا جاتی تھی۔ اس کے قدم بھی جم نہیں رہے تھے اور نہ ہی ان کی مضبوطی قائم ہو رہی تھی۔

"میں یہاں خود آئی ہوں..... بغیر کسی سہارے کے۔" زری نے خوشی خوشی بتایا تھا۔

"لیکن کیوں زری؟ تم نے ایسا رسک کیوں لیا؟ اگر تم سیڑھیوں سے گر جاتیں تو؟" نگارش کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی تھی۔

"ارے ڈونٹ وری بھابی! کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہ رسک اپنے آپ کو آزمانے کے لیے لیا ہے اپنی ہمت اور اپنا حوصلہ دیکھنے کے لیے کیا ہے یہ سب..... اگر آج میں کسی قدم پہ گر جاتی تو آپ نہیں جانتیں کہ میں زندگی بھر اٹھ نہیں سکتی تھی۔ سنبھل نہیں سکتی تھی۔ اپنے پیروں پہ چل نہیں سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا میں کہیں بھی نہیں گری اس لیے سمجھ لیں کہ سنبھل گئی ہوں اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ میرے قدم کمزور نہیں رہے۔ مضبوط ہو گئے ہیں اب میں کسی بھی سہارے کے بغیر چل سکتی ہوں۔ آئی مین چل سکتی ہوں۔ خود اکیلی۔" زری نے کچھ اس انداز اور الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ نگارش فوراً ہی چونک گئی تھی۔ "کیا بات ہے تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" نگارش پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"میں اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں کہ میں آج بہت خوش ہوں، بہت زیادہ خوش۔" زری کی خوشی ایسی تھی کہ اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

"کیوں؟ ایسا کیا ہوا ہے آج کہ تم اتنی خوش نظر آ رہی ہو؟" نگارش کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"کیونکہ علیزے، دل آور شاہ کے پاس واپس آ گئی ہے۔ اپنے گھر..... اپنے شوہر کے پاس..... اور مجھے اس کے آ جانے کی بہت خوشی ہوئی ہے۔ کیونکہ ان دونوں کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔ اور دل آور شاہ کو اس کی علیزے واپس مل گئی ہے۔ اسی لیے آج فجر کی نماز کے بعد صرف ان دونوں کے لیے ہی دعا کی ہے کہ اللہ ان کا یہ ساتھ ہمیشہ سلامت رکھے۔ میری پھولوں کی علیزے ہمیشہ سہاگن رہے، آباد رہے اور ان کی جھولی ایسے خوبصورت پھولوں سے بھر دے۔"

زری نے کہتے ہوئے اپنی جھولی میں بھرے پھولوں کو بڑی نرم نگاہوں سے دیکھا تھا اور سارے پھول نگارش کی جھولی میں ڈال دیے تھے اور خود دھیمے سے قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"بھابی! میں سوچ رہی تھی کہ ہم نبیل حیات اور دل آور شاہ کو کھانے پہ انوائیٹ کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ آنے کا موقع مل جائے گا اور عبداللہ بھائی بھی اپنے دوستوں سے مل کر خوش ہو جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" جاتے جاتے پلٹی تھی اور جواباً نگارش محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

♥

مگر مجھے تمہاری محبت بدل بھی سکتی تھی

رات بہت دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ بھی بہت دیر سے کھلی تھی اور آنکھ کھلتے ہی اس کی پہلی نظر دل آور کے سوئے ہوئے چہرے پہ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا دل بڑے زور سے اور بڑے بے ساختہ انداز میں دھڑکا تھا، کیونکہ اس کا چہرہ علیزے کے چہرے سے بے حد قریب تھا اور اسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ دیکھنے کی وجہ سے اس کے دل میں عجیب عجیب سے جذبات ابھرنے لگے تھے اور عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے تھے اور تب اسے احساس ہوا تھا کہ واقعی محبت کیا کچھ نہیں بدل سکتی؟ محبت انسان کی نفرت کو بھی محبت میں بدل سکتی ہے اور اس کا اور اک اسے کل شب دل آور شاہ کا محبت بھرا روپ دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔

"ڈرائیور....." علیزے نے اس کی پیشانی پہ بکھرے بالوں کو بے حد آہستگی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے سرگوشی نما آواز میں اسے پکارا تھا۔

"ہوں..... بولو..... کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور یونہی آنکھیں بند کیے بولا تھا اور علیزے اس کے اتنے اطمینان سے بولنے پہ رک گئی تھی۔

"تم جاگ رہے ہو؟" علیزے کا دل اور بھی بُری طرح دھڑکا تھا۔

"سوئے ایک ساتھ تھے تو جاگنا بھی تو ایک ساتھ ہی تھا نا؟" دل آور نے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے بازو کے حصار میں لے کر اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔

"ہماری زندگی کی اک نئی صبح مبارک ہو تمہیں۔" علیزے نے پلکیں جھکائے اس کے سینے پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا اور دل آور اس کی اس شرمیلی سی ادا پہ مسکرا دیا تھا۔

"اور تمہیں بھی۔" اس نے اس کی پیشانی پہ ہونٹ رکھ دیے تھے اور علیزے نے روح تک شانت ہوتے ہوتے پلکیں موند لی تھیں۔

"بڑی حویلی چلو گی؟" دل آور نے بہت سکون سے سوال کیا تھا، مگر علیزے نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"کیا..... بڑی حویلی؟" اسے شدید ترین حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"ہاں..... بڑی..... حویلی۔" مگر اس کا اطمینان ہنوز تھا۔

"مگر ڈرائیور....." اس سے بات کرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔

"دیکھو علیزے! اگر میری اماں تمہاری خاطر وقار آفندی کو معاف کرنے کا حوصلہ کر سکتی ہیں تو پھر تمہاری خاطر یہ حوصلہ میں بھی کر سکتا ہوں۔ معاف کروں گا تو پوری طرح سے کروں گا۔ کوئی کم ظرفی نہیں دکھاؤں گا۔ البتہ رات کو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا وہ بس تمہیں جان بوجھ کر ڈگمگانے کے لیے اور آزمانے کے لیے کہا تھا کہ تم میرے لیے کس حد تک جا سکتی ہو؟ یا پھر تمہارے اندر میرے لیے کتنا احساس باقی ہے؟ تم مجھ سے محبت بھی کر سکتی ہو یا صرف مجھ سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے یہاں آ گئی ہو؟ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تم ڈگمگائی نہیں اور نہ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہوئی ہے۔ بلکہ تم یہاں تک میری محبت اور میرے احساس میں آئی ہو۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کسی کی محبت دل میں ساری عمر دبائے رکھنے والے بھی اک دن برداشت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور کھل کے سامنے آ جاتے ہیں اور محبت جاگنے میں تو صرف اک لمحہ لگتا ہے اور وہ لمحہ ہی پوری زندگی پہ حاوی ہو جاتا ہے۔

اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمہیں کبھی بھی قید کر کے دنیا کاٹ کے نہیں رکھوں گا، بلکہ تم اپنی پوری آزادی سے اپنی مرضی سے اور اپنی حکمرانی سے زندگی جیو گی۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ میں تمہارا ہوں اور میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو، کیونکہ اب تم مالک ہو، میری بھی اور میری ہر چیز کی بھی۔" دل آور نے کوئی بھی لگی لپٹی کیے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا اور علیزے بے ساختہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"لیکن ڈرائیور! میں بڑی حویلی نہیں جانا چاہتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''کیوں..... کیوں نہیں جانا چاہئیں؟'' وہ بھی اس کے برابر ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''کیونکہ اس طرح جانے سے نہ تمہاری عزت، عزت رہے گی اور نہ میری۔''

''تو پھر.....'' دل آور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اگر بڑی حویلی والوں کو ہماری کوئی قدر یا ضرورت ہوئی تو انہیں ہمارے گھر خود آنا ہوگا۔ ہمیں اپنے گھر بلانا ہوگا۔ ورنہ اس طرح بن بلائے میں بھی نہیں جاؤں گی، کبھی بھی نہیں۔''

اس نے نخچی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا اور دل آور اس کا اتنا عقل مندانہ فیصلہ سن کر پہلے چند سیکنڈز کے لیے چپ ہوا تھا۔ پھر حیران ہوا تھا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ بہت سیانی ہو گئی ہو؟'' وہ اسے قریب کرتے ہوئے بولا تھا۔

''جو عورت اپنے گھر اور شوہر سے محبت کرنا جان لیتی ہے نا..... وہ سیانی ہی ہو جاتی ہے۔'' علیزے اس وقت خاصا سنجیدگی والے روپ میں نظر آ رہی تھی اور دل آور کے دل میں عجیب شرارتی سی کھد بد ہونے لگی تھی۔

''نہ کرو پیار نہ کرو..... تمہاری ایسی محبت پاش پاش باتوں سے مجھے پھر سے نشہ ہونے لگے گا اور میں بھول جاؤں گا کہ اس وقت صبح ہے یا رات؟'' وہ بے حد گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سنگی بالوں میں چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور علیزے اس کے گمبھیر لہجے اور اس کی بات کے مفہوم سے ہی چونک گئی تھی اور یکدم بدک کر بیڈ سے اُٹھ بھی گئی تھی جس پہ دل آور قہقہہ لگا کر ہنستا رہ گیا تھا اور وہ واش روم میں گھس گئی تھی، لیکن دو سیکنڈ بعد دروازہ کھول کر ذرا سا باہر جھانکتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔ مگر بڑے ہی شریر سے انداز میں۔

''سوری ڈرائیور! ایک بات تو میں نے کہی ہی نہیں۔ حالانکہ رات سے کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''کیا بات؟'' وہ بھی کمبل ہٹا کر بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''یہی کہ.....'' وہ اٹکی۔

''کیا یہی کہ؟'' وہ متجسس ہوا

''آئی..... رئیلی..... لو..... یو.....'' وہ ایک ایک لفظ بڑا ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی اور دل آور پیروں میں سلیپر پہننا بھول گیا تھا۔

''کیا..... کیا کہا؟ ایک بار پھر کہو؟'' وہ واش روم کی طرف چلتے ہوئے بولا۔

''آئی لو یو..... آئی رئیلی..... لو..... یو.....'' وہ پھر بولنے سے باز نہیں آئی تھی۔

''ذرا قریب آ کر کہو کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ دبے قدم واش روم کی طرف بڑھا تھا اور علیزے اس کے جھپٹنے کا ارادہ بھانپتے ہی یکدم کھلکھلاتے ہوئے دروازہ بند کر چکی تھی اور دل آور ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

''علیزے.....'' وہ جھنجلایا تھا۔

''جی علیزے کی جان! سن رہی ہوں۔'' علیزے نے اندر سے ہی بڑے محبت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

''باہر آؤ..... مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔'' وہ واش روم کا دروازہ بجاتے ہوئے بولا

''شاور لے لوں۔ پھر آ جاؤں گی۔'' وہ بھی وہیں سے ہی جواب دے رہی تھی۔

''بعد میں لے لینا۔ پہلے میری بات تو سن لو۔'' وہ خفگی سے کہہ رہا تھا لیکن اندر اب پانی کی آواز کے سوا خاموشی چھا گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ شاور لینا سٹارٹ کر چکی ہے، جب ہی دل آور غصے سے دروازے کو گھور تا پلٹ گیا تھا۔

''باہر آؤ..... پھر پوچھتا ہوں تمہیں۔'' اس کی مصنوعی دھمکی پہ علیزے کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

♥

جوڈت کے کارنامے کا سن کر بڑی حویلی والوں کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا اور اپنی اپنی جگہ پہ سن سے ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ آذر اپنے پورے ہوش و حواس میں ان سب سے یکسر مختلف کیفیت میں گھرا اپنے خیالات اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل سے آگاہ کر رہا تھا

اور اس کا پہلا پلان یہی تھا کہ کوئی بھی تاخیر کیے بنا آج شام پوری تیاری سے شگن لے کر مریم آفندی کے گھر جائے۔

کیونکہ اب وہ مریم فاروق نیازی نہیں، بلکہ مریم آفندی ہو چکی تھی اب اس گھر کی عزت تھی وہ۔ اس لیے وہ یہ کام جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا۔

''صرف شگن لے کر جانے سے کیا ہوگا؟'' اسرار آفندی نے بھی لب کشائی کی تھی۔

''صرف شگن لے کر جانے سے یہ ہوگا کہ شادی کی ڈیٹ فکس ہو جائے گی اور ہم اس ڈیٹ پہ بارات لے جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کو آپ سے مل کر تسلی ہو جائے گی کہ ان کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں جا رہی ہے اور اسے ہر طرح کا تحفظ ملے گا۔'' آذر اب ہر محاذ پر اکیلا ہی جنگ لڑ رہا تھا۔

''حق مہر میں دو کروڑ کا اماؤنٹ لکھوا کر بھی انہیں ابھی اور تحفظ کی ضرورت ہے کیا؟'' ثمرہ بیگم نے خفگی سے کہا تھا۔

''ہاں..... ہے ضرورت..... کیونکہ ایک شریف اور عزت دار آدمی کی عزت کے سامنے یہ دو کروڑ کچھ بھی نہیں اور ویسے بھی یہ دو کروڑ انہوں نے نہیں ہمارے اپنے صاحبزادے نے لکھوائے ہیں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو دس کروڑ لکھواتا لیکن افسوس کہ یہ نکاح میرے جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔'' آذر نے اپنی ساس کو ایک کرارا جواب دیا تھا۔ جس پہ باقی سب بھی چپ ہو گئے تھے۔

''تو شادی کی ڈیٹ کب فکس کرنی ہے؟'' اسرار آفندی بیٹے کی رائے پوچھ رہے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آذر جو بھی کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے اور اب انہیں وہی کرنا ہے جو وہ کہے گا۔

''جب ہماری شادی ہوگی۔'' وہ بیربات دوٹوک طریقے سے کر رہا تھا۔

''یعنی تینوں شادیاں ایک ہی ڈیٹ کو رکھی ہیں۔''

''نہیں..... پہلے میری اور جوت کی شادی ہوگی اور دوسرے روز دانیال کی..... کیونکہ حرمت کو رخصت کرنے کے لیے ہمارا فارغ ہونا زیادہ ضروری ہے۔'' آذر کا مشورہ اچھا تھا۔ اس لیے کوئی بھی انکار نہیں کر سکا تھا اور اس نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ مریم آفندی کے ساتھ کوئی بھی اجنبیت اور ناانصافی نہیں برتے گا۔ اس کے ساتھ بھی وہی رویہ رکھا جائے گا جو اس حویلی کی باقی بیٹیوں اور بہوؤں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اپنائیت، شفقت، محبت اور عزت والا۔

اس کے اس اعلان پہ سب نے سر تسلیم خم کر دیئے تھے۔ کیونکہ اب اس حویلی کا سارا نظام اور دارومدار اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ثروت بیگم آج شام مریم کے گھر شگن لے کر جانے کی تیاری کرنے لگی تھیں۔

♥

''کیا بات ہے عبداللہ بھائی اور نبیل بھائی سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہے تمہارا۔'' علیزے ناشتہ کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''کیوں..... تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟'' وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''کل سے ان کا کوئی ذکر..... یا ان کا کوئی فون نہیں سنا اس لیے۔'' علیزے جوس پینے لگی۔

''کیا کل سے مجھے تم سے فرصت ملی ہے جو میں ان کا ذکر کرتا۔''

دل آور اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھا اسے خاصی بے باک نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے ذومعنی انداز میں بولا تھا اور اس کی نظروں کی ایسی تپش اور لفظوں کی ایسی معنی خیزی پہ علیزے کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا تھا۔

''لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم میری ذات میں گم ہو کر اپنے بھائیوں جیسے دوستوں کو بھول جاؤ۔'' وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی تھی۔

''اُف یار..... کب بھول رہا ہوں؟ ابھی تمہاری ذات میں گم ہوئے ایک دن ہی تو گزرا ہے۔ اور تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔'' وہ خفگی سے کہتا چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں نا اگر تم ان کی ذات میں گم ہو کے مجھے بھول جاؤ گے یا مجھے کم ٹائم دو گے تو مجھے تکلیف ہوگی، دکھ ہوگا، اسی طرح اگر میری ذات میں گم ہو کر انہیں بھول جاؤ گے یا انہیں کم ٹائم دو گے تو انہیں تکلیف ہوگی، انہیں دکھ ہوگا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس چیز میں بیلنس رکھو اور تینوں دوست پہلے کی طرح رہو۔'' علیزے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور دل آور مسکراتے ہوئے سمجھ بھی گیا تھا۔

''او کے مادام..... جو آپ کا حکم۔'' اس نے سر خم کر دیا تھا۔

''مومنہ بھابی کے کیس کا کیا بنا؟'' علیزے کورٹ کے فیصلے سے انجان تھی۔
''سزا ہو گئی ہے ملک حق نواز کو۔'' وہ دوبارہ چائے پینے لگا
''اچھا..... کب؟'' وہ حیران ہوئی۔
''جب تم ہسپتال میں تھیں۔'' وہ لاپروائی سے بتا رہا تھا۔
''کیا سزا ہوئی ہے اسے؟'' وہ جاننا چاہ رہی تھی۔
''سزائے موت.....'' اس کا انداز جنوز تھا۔
''وہ کیوں..... یہ سزا تو شاید مرڈر کیس والوں کو ہوتی ہے؟'' اسے بھی تھوڑا بہت علم تھا۔
''جی..... مرڈر کیس والوں کو ہی ہوتی ہے اور ملک حق نواز کی گردن پہ چھ لوگوں کے خون کے چھینٹے تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بے گناہ اور معصوم لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کیا ہے، لیکن چھ لوگ ایسے تھے جن کے لواحقین پولیس اسٹیشن تک بھی پہنچے، مگر ملک حق نواز کے بندوں کے ہاتھوں دبوچ لیے گئے تھے اس لیے ان کی فائلز اوپن کروا کر سامنے لائی گئی اور ثبوت اور شواہد اکٹھے کیے گئے تو ملک حق نواز کے لیے عدالت کو سزائے موت کے علاوہ اور کوئی سزا نظر نہیں آئی، جبکہ ملک اسد اللہ ابھی تک اسے بچانے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے، جو کہ بہت ہی ناممکن سی بات ہے۔'' دل آور نے اسے ذرا تفصیل سے بتایا تھا۔
''ہوں..... تو پھر مومنہ بھابی تو بہت خوش ہوں گی آج کل۔''
''ہاں..... بہت خوش ہیں۔ کچھ نبیل نے ان کے ساتھ کوئی ناانصافی اور کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ بہت عزت کرتا ہے ان کی۔ اور بہت خیال بھی رکھتا ہے یہاں تک کہ فائزہ آنٹی نے پورا گھر ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔ اب سب کچھ کرنے دھرنے والی مومنہ بھابی ہی ہیں اور دوسری طرف انہیں انصاف بھی مل چکا ہے۔'' دل آور بڑے سکون سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔
''اوہ..... یہ تو بہت اچھی بات ہے..... پھر.....'' علیزے کو حقیقتاً بہت خوشی ہوئی تھی۔
''صاحب جی! وہ باہر نبیل صاحب آئے ہیں۔'' زلفی کافی مجلت میں اندر داخل ہوا تھا۔
''لیجیے جناب! آ گئے آپ کے نبیل بھائی۔'' دل آور ٹیبکن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
''بٹھاؤ اسے میں وہیں آ رہا ہوں علیزے تم چائے بناؤ اس کے لیے۔'' وہ زلفی سے کہہ کر علیزے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
''اوکے..... بنا دیتی ہوں۔ آپ جائیں۔'' وہ بڑی عزت اور بڑے احترام سے بولی تھی اور دل آور ٹھٹک کر رک گیا تھا۔
''کیا کہا..... آپ؟'' اس نے آپ پہ زور دیا۔
''کیا کروں آپ کی عزت کا سوال ہے۔ دوسروں کے سامنے اتنا احترام تو پھر کرنا ہی پڑتا ہے؟'' علیزے نے جیسے مجبوری ظاہر کی تھی۔
''اور اکیلے میں؟'' وہ اس کا اگلا جواب سننے کا منتظر تھا۔
''اکیلے میں احترام نہیں ہوتا۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں کہتی ہوئی آہستگی سے کرسی سے اٹھ کر نبیل کی دوسری سائیڈ پہ چلی گئی تھی۔
''تو پھر کیا ہوتا ہے؟'' دل آور کے قدم پوری طرح سے واپس پلٹ چکے تھے۔
''پیار ہوتا ہے محبت ہوتی ہے اور ڈرائیور اور علیزے ہوتے ہیں۔'' اس کا انداز ایسا تھا کہ دل آور کا دل مچل گیا تھا اور ابھی وہ اس کی طرف لپکنے ہی والا تھا کہ زلفی دوبارہ آ گیا تھا۔
''نبیل صاحب کے ساتھ عدیل صاحب بھی ہیں..... ان کے لیے بھی پیٹیز بنا دیجیے گا۔''
''اف زلفی.....'' دل آور اس کی مداخلت پہ دل مسوس کے رہ گیا تھا اور علیزے اپنی ہنسی دباتی ہوئی کچن میں گھس گئی تھی۔
''کیا ہوا صاحب جی؟'' وہ اب صاحب جی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
''کچھ نہیں ہوا..... آؤ میرے ساتھ۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

♥

''السلام علیکم نبیل بھائی۔'' علیزے بہت سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہیں بھابی؟" نبیل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عدیل کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔
"الحمد للہ! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں مومنہ بھابی، مدیحہ اور فائزہ آنٹی کیسی ہیں؟ آپ ان لوگوں کو بھی ساتھ ہی لے آتے؟" علیزے تو یوں بات کر رہی تھی جیسے اس کی ان سب سے صدیوں سے بے تکلفی اور گہرے مراسم چلے آ رہے تھے۔
"آپ دعوت دیں گی تو ضرور آئیں گے۔" نبیل مسکرایا۔
"لیکن میرا خیال ہے کہ اپنوں کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ خود ہی چلے آتے ہیں۔" اب تو وہ کافی سمجھ داری والی باتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔
"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے، اوکے ہم بغیر دعوت کے ہی آ جائیں گے۔
"تھینک یو..... پلیز بیٹھیے نا۔" وہ چائے کی ٹرے نبیل پہ رکھ چکی تھی۔
"تھینکس..... پلیز آپ بھی بیٹھیے۔ میں یہاں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ دونوں سے بات ہو سکے۔"
"جی..... کہیے؟" علیزے اندر سے جھجکتی ہوئی دل آور کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی تھی، کیونکہ اس سے ذرا ہٹ کے یا دوسرے صوفے پہ بیٹھتی تو یقیناً نروس ہو جاتی۔
"جوت کے نکاح کا پتا چلا آپ کو؟" نبیل نے بات شروع کی۔
"جوت کے نکاح کا؟ کیا مطلب؟ میں تو کچھ نہیں؟" اس نے ذرا الجھ کر دل آور کی سمت دیکھا۔
"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" نبیل نے بات بتانی شروع کی اور پھر اینڈ تک جا کر ہی سٹاپ لیا تھا۔ لیکن اتنے میں علیزے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی۔
"پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔ معاملہ حل ہو چکا ہے۔ بس اب یہ مسئلہ ہے کہ وہ لوگ آج شام کو شگن لے کر آنا چاہ رہے ہیں اور شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لیے عدیل پریشان ہے اور الجھا ہوا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اتنی جلدی یہ سب کرنا ٹھیک ہوگا؟ ہم لوگ تو آپ کی فیملی کو نہیں جانتے۔ لیکن آپ کی فیملی کو آپ دونوں سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا اس لیے زیادہ بہتر مشورہ آپ ہی دے سکتے ہیں۔" نبیل نے ان دونوں کے چہروں کی سمت دیکھا تھا۔
"اس میں زیادہ پریشان ہونے کی اور مشورے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ شگن لے کر آتے ہیں آپ شگن لے کر رکھ لو اور شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر دو۔ کیونکہ ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے ان دونوں کا نکاح کروا دیا تھا تو بہت سوچ سمجھ کر کروایا تھا۔ مریم تمہاری نہیں ہماری بھی بہن ہے۔ اس لیے ہم تمہیں کوئی غلط مشورہ ہرگز بھی نہیں دیں گے۔ باقی رہا شادی کے اخراجات کا مسئلہ تو سمجھو کہ وہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہم تمہیں کوئی خیرات نہیں دیں گے۔ البتہ تم ہم سے ادھار ضرور لے سکتے ہو۔ بعد میں آہستہ آہستہ رقم ادا کر دینا۔" دل آور ہمیشہ کی طرح اصل مسئلے تک جا پہنچا تھا۔
"اس طرح تو تم ایمن کی شادی بھی نبٹا سکتے ہو۔ شہریار سے کہو وہ بھی آج ہی شگن لے آئے۔" نبیل کو ایمن کا بھی خیال آیا تھا۔
"مگر....." عدیل نے کچھ کہنا چاہا۔
"اگر مگر کچھ نہیں..... آج یہ دونوں کام نبٹ جانے چاہئیں۔ شہریار کی امی کو کال کرو۔" نبیل بضد ہوا اور پھر عدیل کو مجبوراً یہ کام کرنا ہی پڑا تھا۔
"ویری گڈ..... اب یوں سمجھو کہ تم ان دونوں فرائض سے فارغ ہو گئے اور سرخرو بھی۔" نبیل نے اسے تھپکی دی تھی۔
"تھینک یو سر..... یہ سب آپ لوگوں کی ہیلپ اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی تو ہو رہا ہے..... ورنہ تو....." عدیل نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔
"ارے نہیں یار! ہوتا وہی ہے جو انسان کی قسمت میں ہوتا ہے۔ بس میرے اور تمہارے جیسے لوگوں کو اللہ وسیلہ بنا دیتا ہے۔ حالانکہ ہم کرتے کچھ بھی نہیں بس وسیلہ بنتے ہیں۔ کرتا تو اللہ کی ذات کا کام ہے۔ ہم تو اس کی رضا کے بغیر ہل بھی نہیں سکتے۔" نبیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
دل آور، نبیل اور عبداللہ بھی کسی کی ہیلپ کرتے تھے تو کچھ اس طرح کہ اگلے بندے کے ضمیر پہ کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ پڑتا اور

نہ ہی اسے شرمندگی ہوتی۔ عدیل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا ان کا۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ وہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ خود دار بھی ہے۔

''میں نے ایک فیصلہ اور کیا ہے دل آور! یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم سے مشورہ نہیں کیا۔ بس پوزیشن ایسی تھی کہ مجھے بات کرنا پڑ گئی۔ اگر بہت سوچ سمجھ کر کرتا تو تم سے پوچھے بغیر نہ کرتا۔'' نبیل نے اب دوسری بات کہنے کے لیے تمہید باندھی تھی۔

''یہی نا کہ تم مدیحہ کا رشتہ عدیل کے ساتھ طے کر چکے ہو؟'' دل آور نے اس کی بات کا پردہ خود ہی ہٹا دیا تھا اور نبیل، عدیل اور علیزے تینوں ہی بے ساختہ چونک کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' نبیل کو شدید ترین حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''تو کیا مدیحہ کے صرف ایک تم ہی بھائی ہو؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں؟ ہر بات کا تمہیں ہی پتا چل سکتا ہے، مجھے نہیں؟'' دل آور کے لہجے میں خفگی تھی۔

''نن..... نہیں..... میں ایسا کب کہہ رہا ہوں مگر یہ بات تو.....'' نبیل کی حیرت بنوز تھی۔

''تم مجھ سے کوئی بات چھپا سکتے ہو، مگر مدیحہ نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''اوہ..... تو یہ بات مدیحہ نے بتائی ہے؟'' نبیل ریلیکس ہو گیا تھا۔

''ہاں..... اور مجھے اس کا انتخاب بہت اچھا لگا ہے۔ اس کے حوالے سے اگر ہم بھی کچھ سوچتے تو ایسا ہی سوچتے۔ میری طرف سے ہاں ہے۔ اس اب شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ مت کرنا وہ میں خود کروں گا۔'' دل آور نے آخر میں نبیل کو سمجھا بھی دیا تھا۔ جس پہ وہ تینوں ہی مسکرا دیئے تھے۔

♥

آج منڈے تھا اور رات کو دل آور اسے تاکید کر کے سویا تھا کہ وہ اسے صبح ذرا جلدی جگا دے، کیونکہ اسے ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ پہنچنا تھا۔ اسی لیے علیزے اسے دو بار آواز دے کر جا چکی تھی، مگر تیسری بار اس نے کوئی اور حربہ آزمانے کی کوشش کی تھی۔

''ڈرائیور.....'' وہ آہستگی سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ہوں.....'' وہ گہری نیند سے بولا۔

''ڈرائیور میری جان! کورٹ جانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اُٹھنا نہیں ہے کیا؟'' علیزے کی ایسی جان لیوا سرگوشی پہ دل آور کی ساری نیند ہوا ہو گئی تھی۔

''علیزے.....'' وہ خاصی بوجھل آواز میں بولا۔

''ہوں.....'' جواباً وہ بڑی نرمی سے پیش آ رہی تھی۔

''میری جان! تمہیں پتا ہے نا تمہاری ایسی سرگوشیوں اور تمہاری ایسی اداؤں پہ کیا حال ہو جاتا ہے میرا؟ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ پاگل ہونے لگتا ہوں میں اور تم صبح ہی صبح میری نیت خراب کرنے کے درپے ہو رہی ہو؟'' دل آور نے جس انداز میں کہا تھا علیزے کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اس نے یکدم دل آور کے کندھے سے الگ ہونا چاہا تھا مگر تب تک وہ یکدم کروٹ بدلتے ہوئے اسے اپنے حصار میں جکڑ چکا تھا۔

''اب کہاں؟ اب ہر بار تمہاری چالاکی ہی تو کام نہیں آئے گی نا؟'' دل آور نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا۔ اور علیزے بُری طرح پھڑ پھڑائی تھی۔

''آف پلیز ڈرائیور! میں کچن کھلا چھوڑ آئی ہوں بلی سب کچھ خراب کر دے گی۔'' وہ چیخی تھی۔

''اور یہ بلی جو صبح سے شیر کو سونے نہیں دے رہی، اس کا کیا کروں میں؟'' دل آور نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی گستاخیاں کر ڈالی تھیں اور علیزے اپنا بچاؤ ہی کرتی رہ گئی تھی۔

''گل.....'' علیزے زور سے چیخی تھی اور دل آور نے یکدم اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا لیکن علیزے کی حالت دیکھ کر بے ساختہ مسکرا بھی دیا تھا۔

''آئندہ کبھی تمہیں جگانے کی کوشش نہیں کروں گی۔'' وہ غصے سے تلملائی تھی۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ اتنے اچھے اور رومینٹک طریقے سے جگانے کی کوشش کرو گی تو کس کافر کا جاگنے کو دل چاہے گا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں الارم سیٹ کر کے سو جاؤں۔'' دل آور اسے چھیڑنے والے انداز میں کہہ رہا تھا اور علیزے خفا ہو گئی تھی۔

''او کے نہیں جگاؤں گی۔ لیکن اب اگر جاگ ہی گئے ہو تو براہ مہربانی نیچے آ کر ناشتہ کر لو، مجھے مدیحہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ پہ بھی جانا ہے۔'' وہ خفگی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور دل آور ہنستا ہوا دس منٹ میں تیار ہو کر نیچے کچن میں آ گیا تھا۔

''علیزے چولہے پہ کیتلی رکھے اس کے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی، جب دل آور نے پیچھے سے آ کر بے حد نرمی سے اسے قریب کیا۔

''گڈ مارننگ میڈم!'' وہ اس کے بالوں پہ بوسہ دیتے ہوئے بولا جس پہ علیزے کو بے ساختہ ہلکی سی گدگدی سی ہوئی تھی۔ مگر اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

''خفا ہو؟'' دل آور اس کے ہاتھ کو بہت ہی نرمی سے چھو رہا تھا اور علیزے اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ کیونکہ اس کی قربت کی اور اس کے ہاتھوں کے لمس کی تپش ہی کچھ ایسی تھی کہ.....

''بولو نا..... خفا ہو مجھ سے۔'' دل آور نے اسے آہستگی سے بھینچا۔

''نہیں..... پتا نہیں کیا بات ہے..... مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی تم سے خفا نہیں ہو سکتی۔ ایسا کروں گی تو مر جاؤں گی۔'' علیزے نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بار بار خفا ہوتی رہو اور میں تمہیں ہر ہر طرح سے منانے کی کوشش کرتا رہوں۔'' وہ کہتے کہتے ایک شرارت بھی کر گیا تھا اور علیزے بے ساختہ اس کے حصار سے نکل کر اسے گھورنے لگی تھی۔

''لیکن فی الحال مجھے منانے کی کوشش کرنے سے بہتر ہے کہ تم کورٹ جانے کی کوشش کرو، کیونکہ ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔'' اس نے کلاک کی طرف اشارہ کیا تھا اور وال کلاک کی سمت دیکھ کر دل آور کا دماغ گھوم گیا تھا۔

''اوہ مائی گڈ..... جلدی ناشتہ دو۔'' وہ سر پہ ہاتھ مارتا فوراً کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور علیزے نے بڑی سعادت مندی سے ناشتہ لگا دیا تھا۔

♥

مریم اور جبوت کی شادی سے ایک دن پہلے مدیحہ اور عدیل کی منگنی ارینج کی جا رہی تھی اور مدیحہ نے اس چھوٹے سے فنکشن کی تیاری کے لیے موضعہ نگارش اور علیزے کو خاص طور پہ انوائیٹ کر رکھا تھا اور شاپنگ بھی ایک ساتھ کرنے کو کہا تھا۔ اسی لیے علیزے دل آور کے کورٹ جانے کے فوراً بعد ہی گلاب خان کے ساتھ نبیل کے گھر آ گئی تھی اور پھر نگارش کے آتے ہی وہ لوگ فائزہ بیگم کو ساتھ لیے گلاب خان کی نگرانی میں شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں اور دن بھر شاپنگ کے لیے خوار ہونے کے بعد علیزے واپس گھر آئی تو دل آور کو بے حد آف موڈ کے ساتھ روم میں بیٹھے لیپ ٹاپ پہ مینجرین الٹ پلٹ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر دور سے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

''السلام علیکم!'' ڈرتے ڈرتے سلام کیا گیا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' اس نے بغیر اس کی سمت دیکھے جواب دیا تھا۔

''تم کب آئے؟'' وہ آہستگی سے شاپنگ بیگز صوفے پہ رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔

''پانچ بجے.....'' جواب انتہائی مختصر تھا۔

''اور اب سات بج رہے ہیں دو گھنٹے ہو گئے ہیں اور تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو..... چینج بھی نہیں کیا۔'' علیزے کو اچنبھا ہوا تھا۔

''تم صبح سے بے فکر پھر رہی ہو، کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ میرے گھر آنے کا ٹائم ہو رہا ہے؟'' دل آور ایک روایتی شوہر کے سے روپ میں نظر آیا تھا۔

''خیال تو تھا لیکن وہ مدیحہ.....'' علیزے کچھ جز بز سی ہونے لگی تھی۔

"مدیحہ..... مدیحہ اہم ہے یا میں۔" وہ یکدم سیگرین ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اور علیزے دبک گئی تھی اور اس کو یوں دیکھتے دیکھ کر دل آور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا اور اس کے جاتے ہی علیزے کا دماغ کچھ فریش ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی اور اک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔ اسی لیے دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی کمرے میں آ گئی تھی۔

"ایم سوری..... تمہیں مجھ پہ بہت غصہ ہے۔ لیکن میں اس غصے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں بڑی حویلی جا رہی ہوں۔ گلاب خان سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔"

علیزے بہت نارمل طریقے سے کہتی ہوئی وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی تھی اور اس میں سے بلاوجہ ہی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔

"کیا..... کیا کہا تم نے؟ تم بڑی حویلی جا رہی ہو؟" وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا اور اس کی بات سنتے ہی تولیہ رگڑتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔

"میں نے وہی کہا ہے جو تم سن چکے ہو میں بڑی حویلی جا رہی ہوں اللہ حافظ۔" علیزے کہہ کر وارڈ روب بند کر کے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی اور دل آور کے تو جیسے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔

"علیزے۔" وہ یکدم اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے کے قریب ہی دبوچ لیا تھا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟" اس نے علیزے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"تو پھر تم غصہ کیوں کر رہے تھے؟ ناراض کیوں ہو رہے تھے؟" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ستا رہا تھا تمہیں۔" وہ خفگی سے جھنجلایا۔

"تو میں کون سا سیریس کہہ رہی ہوں؟ میں بھی تو مذاق کر رہی ہوں ستا رہی ہوں تمہیں۔" علیزے نے بڑی معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"واٹ..... ؟" وہ یکدم بپھرا اور علیزے اس کا ردعمل دیکھ کر یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور دل آور اتنے بڑے شاک کے باوجود اس کی ہنسی میں کھو گیا تھا اور یونہی ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے اور ہنسی ہنسی میں وہ دونوں ہی اک دوسرے میں گم ہو گئے تھے۔ دروازے سے پشت ٹکائے کھڑی علیزے کے دونوں ہاتھوں کا لمس دل آور کے سینے پہ محسوس ہو رہا تھا اور دل آور کے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں دروازے پہ بچھے ہوئے تھے اور مدہوشی ایسی تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو پائے تھے۔ کیونکہ اس فسوں خیز اور قیمتی لمحات میں تو ان کی سانسیں بھی ایک ہو چکی تھیں۔ وہ اس سحر سے نکلتے بھی تو کیسے؟

لیکن افسوس کہ مداخلت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی پہنچ ہی گیا تھا۔ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ مگر ان دونوں نے دروازے کے قریب کھڑے ہونے کے باوجود بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور نہ ہی جواب دیا تھا۔ اسی لیے پھر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

"علیزے بی بی! نیچے آپ سے۔ بڑی حویلی والے آئے ہیں۔" گل نے باہر سے ہی پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے پیغام پہ وہ دونوں ہی چونک کر حواسوں میں لوٹ آئے تھے۔

"بڑی حویلی والے۔" علیزے بڑبڑائی۔

"اف لو کے..... پہلے فریش ہو جاؤ، پھر نیچے جاؤ۔" دل آور اطمینان سے اس کا گال تھپتھپا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر شرٹ پہن کر بٹن بند کرنے لگا تھا۔

"اور تم.....؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

♥

اور دل آور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے کھڑے اس کے سوال پہ ٹھٹک گیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ علیزے کو اپنے دھیان اس کا دھیان نہیں رہے گا، لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ علیزے کو اب سارے دھیان ہی اس کے ہوتے تھے اسے بے دھیانی میں بھی اسی کے دھیان رہتے تھے۔

"ڈرائیور....." اس نے دل آور کو پھر سے متوجہ کیا۔

"او کے..... تم چلو..... میں بھی آتا ہوں۔" اس نے علیزے کا یہ مان بھی رکھ لیا تھا۔

"نہیں..... ہم دونوں ایک ساتھ جائیں گے۔" علیزے کا فیصلہ اٹھنے جانے کا تھا۔

''اوکے..... اوکے..... ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ تم فریش ہو کر آجاؤ، تب تک ویٹ کرتا ہوں۔'' اس نے اسے تسلی دی تھی اور علیزے اس تسلی پہ ریلیکس ہو کر واش روم میں گھس گئی۔

♥

عائشہ آفندی، دل آور اور علیزے کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

''السلام علیکم!'' دل آور نے خاصی بلند آواز میں سلام کیا تھا اور اس کے سلام پہ باقی سب بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے البتہ سب سے پہلے آگے بڑھنے والی عائشہ آفندی تھیں، جنہوں نے بے ساختہ اور والہانہ انداز میں دل آور شاہ کو گلے سے لگایا تھا۔

''وعلیکم السلام! میرے بچے..... جیتے رہو..... سدا خوش رہو..... اللہ میری عمر بھی تمہیں لگا دے تم میری زہرہ کے چاند ہو..... میری زہرہ کے جگر ہو..... اس لیے اب میری آنکھوں کا نور ہو تم..... میرے کلیجے کی ٹھنڈک ہو..... تمہارے حوصلے بہت بلند ہیں..... تمہارا ظرف بہت اعلیٰ ہے اس لیے ہم سب کو معاف کر دو..... ہم معافی کے طلب گار بن کر آئے ہیں۔'' عائشہ آفندی نے اس سے الگ ہوتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل آور ان کے اس طرح معافی مانگنے پر گھبرا گیا تھا۔ اس نے سٹپٹا کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

''پلیز آنٹی! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ میں ایسی معافی کے حق میں ہرگز بھی نہیں ہوں۔ آپ کی عزت کا آپ کا احترام سر آنکھوں پر، لیکن ایسا کچھ میں کبھی بھی نہیں چاہوں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں منع کیا تھا اور عائشہ آفندی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے وہ بے ساختہ رو پڑی تھیں جس پہ دل آور نے ان کے ہاتھ تھپک کر تسلی دیتے ہوئے انہیں دونوں کندھوں سے تھامے قریبی صوفے پہ بٹھا دیا تھا۔

اور پھر باقی سب کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کے عائشہ آفندی کی طرف سے فارغ ہونے کے منتظر تھے۔

''السلام علیکم!'' سب سے پہلے آگے بڑھنے والا آذر تھا، دل آور نے اس کے مصافحے کے لیے بڑھتے ہوئے ہاتھ اور جھکے ہوئے سر کو اک نظر دیکھا اور پھر یہاں بھی اک اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے ہاتھ ملانے کے بجائے اپنے دونوں بازو کھول دیے تھے جس پہ علیزے کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی حیران رہ گئے تھے اور آذر نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

''تھینک یو یار! تھینک یو سو مچ۔'' آور نے بڑے بے ساختہ انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا پھر باری باری دانیال، جودت، زین، احمد، حماد، عون، عدیل، کومل، فرحت، انوشہ، جویریہ، ثروت بیگم، ثمرہ بیگم، اسرار آفندی، اظہار آفندی اور سب سے آخر میں آسیہ آفندی اس سے ملی تھیں۔ جن سے مل کر دل آور کے دل کو کچھ ہوا تھا کیونکہ ان کی شخصیت ان کی ذات میں اک عجیب سی اداسی گھلی ہوئی نظر آ رہی تھی اور اس اداسی اور اس درد کو دل آور سے بہتر شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا..... آپ یہ اُلجھی ہوئی تھی نہ سلجھائیں۔'' وہ بے حد آہستگی سے بولا تھا۔

''لیکن بے خبری کی زندگی جینے سے آگہی کی اذیت اچھی ہوتی ہے، انسان بے وجہ خوش رہنے سے تو بچ جاتا ہے نا۔ خوش فہمی تو نہیں رہتی، کسی پہ مان تو نہیں رہتا۔ جو کچھ ہوتا ہے سامنے آجاتا ہے۔'' آسیہ آفندی کا مختصر سا جواب سن کر دل آور چند سیکنڈز کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

''لیکن آپ بھی اگر زہرہ بتول شاہ اور دل آور شاہ جیسا ظرف بڑا کر لیں تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔'' البتہ وہ انہیں سمجھا رہا تھا اور آسیہ آفندی محض سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔

''علیزے بیٹا! ادھر آؤ۔ ہم تم دونوں کے لیے ہی آئے ہیں۔ ادھر آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔''

اسرار آفندی نے سب سے ہٹ کے ذرا فاصلے پہ کھڑی علیزے کو اپنے قریب بلایا تھا۔ اور وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور اسرار آفندی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا ماتھا چوم کر اسے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔

اتنے میں دل آور بھی آذر اور دانیال کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ اور سب کے بیٹھنے کے بعد ہی اسرار آفندی نے اپنی بات کہنے کے لیے تمہید باندھنی شروع کی تھی۔

''دیکھو دل آور بیٹا! ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا ہم سب کو ہی بے حد دُکھ اور افسوس ہے اور اس دُکھ اور افسوس کے باوجود ہم نہ تو کوئی مداوا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی تلاش ہو سکتی ہے۔ ہم لاکھ معافیاں مانگیں تم سے مگر ہمیں پتا ہے کہ پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ انسانیت کے ناتے اور اپنے رب تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتے ہوئے، تم اپنے ظرف کو کشادہ کر کے ہمیں دل کی گہرائیوں سے معاف کرتے ہو تو یہ تمہارا ہم پہ تاحیات بہت بڑا احسان ہوگا۔ ہم وہ معافی نہیں چاہتے جس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے فاصلے پہ ہی رہیں گے بلکہ ہم وہ معافی چاہتے ہیں جس کے بعد ہمارے دلوں کی کدورتیں اور آپس کے فاصلے مٹ جائیں اور ہم ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ ایک دوسرے کی غم اور خوشی میں شریک ہو سکیں۔ ایک دوسرے کو اپنا سمجھ کر اپنا بن کر.....''

اسرار آفندی کی تمہید خاصی لمبی ہو گئی تھی کیونکہ وہ دل آور کو اپنے طور پہ سمجھانا چاہتے تھے۔

''ایسی معافی کے حق میں تو میں بھی نہیں ہوں آفندی صاحب! دوغلا پن مجھے بھی نہیں آتا، میں جب دشمن ہوتا ہوں تو دشمنی کے سوا کچھ یاد نہیں رکھتا اور جب دوست ہوتا ہوں تو دوستی کے سوا ہر چیز بھول جاتا ہوں۔ فیصلہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ وہ بتائیں۔'' اس نے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

اور اسرار آفندی نے باقی سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالی تھی اور دوبارہ سے سلسلہ کلام جوڑا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم اور علیزے آذر، جوت اور دانیال کی شادی میں شرکت کرو۔ ہم تم دونوں کو انوائیٹ کرنے کے لیے آئے ہیں۔''

انہوں نے صوفے کی سائیڈ پہ رکھا انویٹیشن کارڈ اُٹھا کر درمیانی ٹیبل پہ دل آور کے سامنے رکھ دیا تھا اور دل آور کی نظریں اس چمکتے دمکتے ریڈ اور سلور کلر کے کارڈ پہ ٹھہر گئی تھیں۔

''اگر تم یہ کارڈ قبول کرتے ہو تو ہمیں بے انتہا خوشی ہوگی۔'' اسرار آفندی نے ایک اور لقمہ دیا تھا۔

''میں علیزے کو قبول کر چکا ہوں تو سمجھیں کہ علیزے سے ریلیٹڈ ہر چیز کو قبول کر چکا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ کارڈ بھی۔'' دل آور نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے ٹیبل پر رکھا وہ کارڈ اُٹھا لیا تھا اور اس کی بات پہ وہاں موجود سب ہی افراد میں خوشی کی اک لہر سی دوڑ گئی تھی۔

اور علیزے نے بے ساختہ دل آور کی طرف دیکھا تھا اور دل آور اس کے دیکھنے سے ہی جان گیا تھا کہ وہ اندر سے کن فیلنگز کا شکار ہو رہی ہے اور کیا سوچ رہی ہے۔

وہ اس کی آنکھوں کی مشکوری جنبش سمجھ گیا تھا اور ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔

''علیزے! آپ اپنے میکے والوں کی کوئی خاطر تواضع نہیں کرو گی؟ یا پھر یونہی بیٹھی رہو گی۔''

دل آور نے ہی اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس کی بات پہ خجل ہوتی ہوئی اُٹھ کر کچن میں آ گئی تھی جہاں کل پہلے سے ہی تیاریوں میں مصروف تھی۔

♥

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے۔
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے۔

''زری! آؤ نا۔ مدیحہ تمہیں بلا رہی ہے۔''

عبداللہ نے اپنے دھیان میں گم بیٹھی زری کو متوجہ کیا تھا اور زری چونک کر رہ گئی تھی۔ اور اس کی نظر بلا ارادہ ہی سامنے کی طرف اُٹھی تھی جہاں مدیحہ اور عدیل اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے دائیں بائیں علیزے، نگارش اور مومنہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

جن کو دیکھ کر زری نے بے حد آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں بھائی! وہاں ابھی میری جگہ نہیں۔'' اس کے ہلکے سے انکار پہ عبداللہ نے فوراً گردن موڑ کر اسٹیج کی طرف دیکھا تھا جہاں ان تینوں کی بیویاں موجود تھیں اور تینوں ہی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور جہاں واقعی زری کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جس پہ واقعی عبداللہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

اور وہ بے ساختہ زری کے قریب پڑی کرسی کھینچ کر اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا تھا اور بے حد نرمی اور بے حد محبت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں شاعری بہت پسند ہے اور تمہارا ذوق اور تمہارا حافظہ بھی بہت عمدہ ہے لیکن اس کے باوجود میرے اور میرے حافظے کی سلیٹ پہ ایک شعر اُبھر رہا ہے شاید کہ یہ شعر ایک دو لفظ کے ہیر پھیر سے کچھ غلط ہو جائے، لیکن پھر بھی کوشش کروں تمہیں سنانے کی شعر کچھ یوں تھا کہ.....

اس دنیا میں کسی کو بھی مکمل جہاں نہیں ملتا
کسی کو زمین نہیں ملتی تو کسی کو آسماں نہیں ملتا

عبداللہ کے اک عجیب سے لہجے میں کہے ہوئے شعر پہ زری کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

"تو میری جان اس شعر کا مفہوم تو تم سمجھ ہی گئی ہو گی کیونکہ شاعری کی زبان تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو، لیکن پھر بھی یہ واضح کر دوں کہ جن لوگوں کو تم دیکھ رہی ہو نا اپنی اپنی جگہ پہ مکمل یہ بھی نہیں ہیں، انہیں بھی زندگی میں کسی کو زمین نہیں ملی تو کسی کو آسمان نہیں ملا۔"

علیزے بھابی نے دل آور کے ماضی سے کیا کیا اذیتیں جڑی ہیں یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی..... بے شک وہ لوگ ایک دوسرے کو معاف کر بھی دیں، لیکن وقار آفندی کے نام کا کانٹا ان کے دلوں میں ہمیشہ چبھا ہی رہے گا جس کو نہ علیزے نکال سکتی ہے، نہ دل آور اور نہ ہی ان کے گھر والے اور ایسا ہی ایک کانٹا نبیل اور مومنہ بھابی کی زندگی میں بھی پیوست ہے وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ اداس ہوتی ہے۔ لیکن جب دنیا کا سامنا کرتی ہے تو بڑے صبر، شکر اور تحمل کے ساتھ پیش آتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ اسے اس صبر و تحمل کا اجر ضرور دے گا۔ اس لیے میری جان میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تم بھی ان لوگوں کی طرح خوش رہنا سیکھو کیونکہ زندگی میں سب کچھ ہمارے لیے ہی نہیں ہوتا اس میں کچھ دوسروں کا بھی نصیب ہوتا ہے جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور ہم اپنی ہی میں کسی دوسرے کے نصیب کو اپنا حق اور اپنا نصیب سمجھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں، مگر جب ہماری یہ خوش فہمی ختم ہو جاتی ہے تو ہم اداس ہوتے ہیں۔ مایوس ہوتے ہیں اور اپنے میں حسرتیں اور رشک پیدا کر لیتے ہیں حالانکہ ایسا کرنا نہیں چاہیے کیونکہ ہر انسان کو اپنے اپنے نصیب کا ملتا ہے، دولت ہو، شہرت ہو، عزت ہو، یا پھر جیون ساتھی ہو۔

جن کو جو ملا، سمجھو اسے اللہ نے دیا، کیونکہ ہمارے نصیب لکھنے والا تو وہی ہے نا۔ ضروری نہیں ہے کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی ہو ضروری وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اللہ جن کو دولت دیتا ہے کبھی کبھی ان کی قسمت میں یہ بھی لکھ دیتا ہے کہ یہ دولت انہیں برتنا نصیب نہیں ہو گی جن کو شہرت دیتا ہے ساتھ ہی اس شہرت کا زوال بھی لکھ دیتا ہے، جن کو عزت دیتا ہے ان کی رسوائی بھی لکھتا ہے، جن کو اولاد دیتا ہے، ان کی آزمائش بھی لکھتا ہے اور جن کو جیون ساتھی اچھا ملتا ہے ان کی قسمت میں بے سکونی اور بے چینی بھی ساتھ ہی لکھی ہوتی ہے اس لیے اپنی قسمت اور اپنے نصیب پر غرور کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ اچھا بُرا وقت ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے اور ہر انسان کو جھیلنا پڑتا ہے، بس اس جھیلنے کے لیے برداشت کا مادہ ہونا لازمی ہے ورنہ سب کچھ رائیگاں چلا جاتا ہے۔

اب یہی دیکھ لو جب ہم شادی کرتے ہیں تب ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ہاں اولاد ہو گی بھی یا نہیں؟ اگر ہمیں ان چیزوں کا پہلے سے ہی پتا چل جائے تو شاید ہم یہ کام ہی نہ کریں، لیکن ہم پھر بھی یہ کام کرتے ہیں کیونکہ ہم اللہ کی رضا سے انجان ہیں اور جب سب کچھ ہونا ہی اللہ کی رضا سے ہے تو ہمیں افسردگی، مایوسی، اُداسی اور حسرت کا ماسک چہرے پہ سجانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اب یہ نگارش کو ہی دیکھ لو اس نے مجھ سے محبت کی، بے انتہا اور سچی محبت..... اس نے مجھے چاہا اور میں اسے مل بھی گیا، لیکن پھر بھی وہ محروم ہے۔ روتی ہے۔ مجھ سے چھپ چھپ کر روتی ہے۔ آخر کیوں؟ کیونکہ اسے بھی مکمل جہاں نہیں ملا۔ مجھے بھی نہیں ملا، نبیل کو بھی نہیں، مومنہ بی بی کو بھی نہیں ملا، علیزے کو بھی نہیں ملا، اور علیزے کے ڈرائیور کو بھی نہیں ملا کیونکہ یہ زندگی ہے۔"

عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھ نرمی سے تھپکے تھے اور زری کی آنکھوں سے دو اشک بہہ آئے تھے جن کو عبداللہ نے اپنی انگلیوں سے بہت نرمی سے پونچھ ڈالا تھا۔

"عشق کرنا اور نامراد رہنا، اہل عاشق اور اصل عشق کی اصل نشانی ہوتی ہے۔ تمہارے عشق پہ آزمائش اتری، مگر جم ڈگمگائی نہیں۔ مجھے خوشی ہے اس چیز کی۔ کیونکہ تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، تمہاری محبت تمہارا عشق پاک صاف تھا، اسی لیے آج میں ایک بھائی ہونے کے باوجود تم سے اتنے حساس اور گہرے موضوع پہ بھی بات کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کر رہا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری بہن کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے پانی کی طرح صاف شفاف..... ورنہ کوئی اور مسئلہ ہوتا تو شاید میں ایسی باتیں تم سے کبھی نہ کرتا، مگر نہیں..... مجھے تم پہ بھروسہ ہے اور فخر بھی ہے۔"

عبداللہ کہہ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور نبیل کی نظریں آنسو پونچھتی زری پہ ٹھہر سی گئی تھیں اور دل میں اک ایسی ہوک سی اٹھی تھی کہ سیدھی روح تک گئی تھی اور روح تڑپ اٹھی تھی مگر نہیں..... اب یہ سب فضول تھا..... اب بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا اب مومنہ کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جا سکتی تھی۔

کیونکہ اس نے جب زری کی طرف سے اپنے دل کو پھیرا تھا تو خود سے بڑے عہد کیے تھے اور اب یہ عہد ہی سب سے زیادہ اہم تھے۔ دل بے شک تڑپتا یا گھائل ہوتا رہتا۔ "زری..... آیئے نا۔ یہ مدیحہ بلا رہی ہے۔" بہت ہی خوبصورت ڈریس میں ملبوس مومنہ بی بی اسٹیج سے اتر کر زری کے قریب آ گئی تھی اور زری کو سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا جس پہ نبیل نظریں چرا کر رخ موڑ گیا تھا۔ وہ ایسا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اور زری، مومنہ بی بی کا ہاتھ تھام کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

نبیل سے اسٹیج تک کا فاصلہ مکمل چند قدموں کا تھا، لیکن زری کے لیے یہ چند قدم بھی میلوں کا سفر تھے۔ اس نے طے کیے تھے مگر بڑی مشکلوں کے ساتھ اور ابھی وہ اسٹیج پہ چڑھنے کے لیے قدم اٹھا رہی تھی کہ دوسرا ہاتھ علیزے نے آگے بڑھا دیا تھا اور زری نے چونک کر اپنے سے دو زینے اونچی کھڑی علیزے کی سمت دیکھا تھا، جس کے چہرے پہ زری کے لیے محبت ہی محبت تھی اور زری اس کے چہرے کا یہ تاثر دیکھ کر بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

جبکہ علیزے اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دو قدم نیچے آ گئی تھی۔

"میں نے ایک دفعہ ڈرائیور سے پوچھا تھا کہ زری کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا....." علیزے خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی کہ زری تڑپ کر پوچھ بیٹھی۔

"کیا جواب دیا اس نے؟" سوال بڑا بے قرار تھا۔

"محبت؟" علیزے بھی ویسا ہی بولی تھی۔ انتہائی مختصر اور یک لفظی۔

"محبت؟" زری نے زیر لب دہرایا تھا۔

"میں نے بھی جواباً یہی کہا تھا..... محبت.....؟" علیزے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اسٹیج کی سیڑھی چڑھنے میں مدد دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس سے بات بھی کر رہی تھی۔

"پھر..... پھر کچھ کہا؟" زری بمشکل سیڑھی چڑھی تھی۔

"پھر کیا..... وہ مجھے کہنے لگا۔ تم نہیں سمجھو گی۔ کیونکہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں سمجھ گئی۔" علیزے مسکرائی اور اسے دوسری سیڑھی چڑھنے میں مدد دی تھی۔

"کیا سمجھ گئیں؟" زری کے سوال بہت بے ساختہ سے تھے۔

"یہی کہ زری محبت کیوں ہے؟" علیزے کا لہجہ بدلا تھا لیکن زری محسوس نہیں کر سکی تھی۔ "علیزے....." دل آور کسی سے ملنے کے بعد اپنے دھیان میں اس کے قریب آیا تھا لیکن زری کو اس کے ساتھ دیکھ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ ہی جم گئے تھے۔

''زری کو چھوڑ کر آتی ہوں؟'' علیزے نے گردن موڑ کر اسے جواب دیا اور زری کو لے کر آگے بڑھ گئی تھی۔ جہاں بیٹھے مدیحہ عدیل اپنی ہی چھیڑ چھاڑ اور شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''مدیحہ۔'' علیزے نے اسے متوجہ کیا۔

''ارے زری.....'' مدیحہ اپنا بھاری بھرکم دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بمشکل کھڑی ہوئی تھی اور بڑے والہانہ انداز میں زندگی کے گلے

''مبارک ہو..... آخر پاکستان نے تمہیں باندھ ہی لیا۔'' زری نے کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن سے ہر چیز کا احساس جھٹکتے مدیحہ کو بڑی خوشدلی سے مبارکباد دی تھی۔

''خیر مبارک..... مجھے پاکستان نے نہیں پاکستان کی محبت نے باندھ لیا ہے، بہت اپنائیت ہے یہاں اب کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا۔'' مدیحہ، عدیل کو دیکھتے ہوئے بڑی دلچسپی سے مسکرائی تھی اور جواباً عدیل بھی مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''اور اب ہم کہیں اور جانے بھی نہیں دیں گے۔'' اس نے بڑے استحقاق سے کہا تھا جس پہ مدیحہ زری کے سامنے ذرا سا شرما گئی تھی کیونکہ وہ اسے بڑی گہری اور ذومعنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مدیحہ اس کے یوں بار بار نظر بھر کر دیکھنے پہ بلاوجہ ہی شرمائی ہوئی جا رہی تھی۔

''خیر اس بات کو فی الحال جانے دیں، یہ بتائیں آپ کیسی ہیں طبیعت بہتر ہوئی آپ کی؟'' عدیل زری کو سلام کرتا ہوا اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

''الحمدللہ..... بالکل ٹھیک ہوں..... اور اگر نہیں بھی ہوں تو ہو جاؤں گی، کیونکہ جلد یا دیر کرنا تو اللہ کی ذات نے ہے؟'' زری نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

''جی..... یہ تو بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ..... آیئے بیٹھیے۔'' اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

اور مدیحہ زری کا ہاتھ پکڑے صوفے پہ آ گئی تھی۔

''بھائی! ٹائم کافی زیادہ ہو چکا ہے۔ امی کہہ رہی ہیں کہ رسم کر دینی چاہیے۔'' ایمن بھی اسٹیج پہ آ گئی تھی۔

''عدیل! کیا خیال ہے تمہارا رسم ہو جائے۔'' نبیل نے قریب آ کر پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی؟'' عدیل بھلا کیا کہہ سکتا تھا۔

''ہمیں رنگ زری پہنائے گی۔'' مدیحہ نے یک دم ہی اعلان کیا تھا اور زری گڑبڑا گئی تھی۔

''مم..... مگر..... مدیحہ؟'' زری کو مدیحہ کے ایسے ارادے کا اندازہ بھی نہیں تھا ورنہ وہ یقیناً اسٹیج پر ہی نہ آتی۔

''زری! میں یہ بندھن تمہارے ہاتھوں سے باندھنا چاہتی ہوں، یہ میری خواہش ہے اور تمہیں میری زندگی کی پہلی خوشی اور پہلی خواہش سے انکار نہیں کرنا چاہیے ورنہ میرے لیے بدشگونی ہوگی۔'' مدیحہ نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا اور زری اس کی بات سن کر کانپ گئی تھی۔

''لیکن مدیحہ..... میں تو خود.....'' زری نے کچھ کہنا چاہا۔

''بس تم اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے میری زندگی کی ڈوری باندھ..... یہ لو۔''

اس نے عدیل کی طرف سے لائی گئی انگوٹھی مریم کے ہاتھ سے لے کر بیہ سمیت زری کے سامنے کر دی تھی اور واقعی زری سے اس موقعے پہ انکار نہیں ہو سکا تھا اور زری نے روتے ہوئے دل سے دعا مانگ کر لرزتی تکلیفوں سے انگوٹھی تھامی اور نگارش، عبداللہ، عمر، نبیل، علیزے، دل آور، جودت اور اس کی فیملی، شہریار اور اس کی فیملی، سلو اور جیدی اور محمد جہاں زیب اور فاطمہ کی موجودگی میں سب کے سامنے مدیحہ اور پھر عدیل کو انگوٹھی پہنا دی تھی۔

جس پہ جی بھر کے تالیاں بجی تھیں اور وہیل چیئر پر بیٹھے عمر فاروق نیازی بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی پہلی پہلی خوشی پر مسکرائے

''آئی لو یو بھائی! مریم، ایمن اور ایمان سے چھوٹی زونیہ اور زوبیہ نے مدیحہ کو پھول دیتے ہوئے اس کے دونوں رخسار چوم لیے تھے اور مدیحہ بے ساختہ کھلکھلا اٹھی تھی اور دونوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا اور یہ ایک دلکش سین کیمرے کی آنکھ میں

محفوظ ہو کر رہ گیا تھا بلکہ آج کے دن میں تو ایسے کئی سین تھے جو کیمرے کی آنکھ نے قید کیے تھے اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار رہنا دیا تھا۔

♥

اس سے اگلے ہی روز آذر، دانیال اور جوت کی مایوں اور مہندی کی رسم تھی۔

اور علیزے صبح ہی صبح سب لڑکیوں کے بلانے پہ بڑی حویلی چلی گئی تھی حالانکہ دل آور نے بہت شور مچایا، احتجاج کیا اور غصہ بھی دکھایا تھا، مگر وہ الٹا اسے ہری جھنڈی دکھا گئی تھی اور دل آور تلملا کے رہ گیا تھا۔

کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ علیزے پورا دن گھر پہ رہے اور رات کو ایک ساتھ شادی میں جائیں مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آئی تھی اس لیے اس کا موڈ اب آف ہی تھا۔

اور اسی آف موڈ کے ساتھ وہ شام کو بڑی حویلی پہنچا تو تقریباً سارے ہی نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ کہ وہ پہلے جیسے موڈ میں نہیں ہے۔

"کیا بات ہے علیزے! دل آور بھائی کا موڈ بہت آف لگ رہا ہے۔" علیزے اپنے بیڈ روم میں بیٹھی تیار ہو رہی تھی جب انوشہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔

"ڈرائیور آیا ہے؟ کہاں ہے وہ؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس کا موڈ آف ہے؟" علیزے کو اس کا نام سنتے ہی بے چینی سی لگ گئی تھی۔

"نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، بس مجھے تو ان کے موڈ سے یہی لگا ہے کہ ان کا موڈ آف ہے، اب کیوں آف ہے یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" انوشہ نے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"اس کے پاس کوئی ہے یا نہیں۔" علیزے کو اس کے اکیلے پن کی فکر ہوئی تھی۔

"امی اور آنی بیٹھی ہوئی ہیں اسرار انکل تو مہمانوں کو ریسیو کر رہے ہیں، اور باقی سب تو اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہیں۔" انوشہ اس کا میک اپ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"اُف..... تو تم اسے اوپر بلا لو نا اگر اتنی فکر ہو رہی ہے تو؟"

انوشہ کو بیٹھے بیٹھے ہی شرارت سوجھ گئی تھی۔

"ارے نہیں انوشہ آپی! وہ یہاں آ گیا تو میں میک اپ کیے بغیر ہی رہ جاؤں گی۔" علیزے جھنجلائی۔

"کیا مطلب؟" انوشہ جان بوجھ کر انجان بنی تھی۔

"خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی۔" علیزے سر جھٹک کر پھر سے آئینے کی طرف اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور انوشہ بڑی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

♥

"السلام علیکم دل آور بھائی!" انوشہ دوپٹہ سر پہ اوڑھے ہوئے معاملت مند بچی بنی دل آور کے سامنے آ کر جھکی اور مجبوراً دل آور کو اٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنا پڑا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" وہ بہت نارمل سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"الحمد للہ! بالکل ٹھیک ہوں..... وہ دراصل آپ کے لیے علیزے کا پیغام ہے، وہ آپ کو اپنے روم میں بلا رہی ہے۔" انوشہ نے بڑی سنجیدگی سے پیغام رساں کا روپ دھارا تھا۔

"روم....."

دل آور سب کے سامنے ایسا پیغام سن کر ٹھٹکا تھا۔

"جی..... وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ جائیے اس کی بات سن لیجیے، پھر تو اور رش بڑھ جائے گا اور فنکشن بھی شارٹ ہو جائے گا۔"

انوشہ کی سنجیدگی الجھا گئی تھی اور دل آور جز بز ہوتا آسیہ آفندی اور عائشہ آفندی وغیرہ کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"ارے کوئی بات نہیں بیٹا! جاؤ تم..... ہم بھی ذرا مہمانوں کو دیکھ لیں۔" عائشہ آفندی لاپروائی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور دل آور نے دوبارہ انوشہ کی طرف دیکھا تھا جو بمشکل اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش میں تھی۔

"جایئے نا..... دیر کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے اسے ڈرائنگ روم سے باہر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہوں..... جا رہا ہوں۔" وہ آہستگی سے کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور طویل ترین کشادہ راہداریاں طے کرتا علیزے کے روم کے سامنے آ رکا تھا اور آہستگی سے دروازے پہ دستک دی تھی۔

"یس..... کم ان....." اندر سے علیزے کی نرم سی آواز سنائی تھی۔

اور دل آور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا جبکہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی لمبی پلکوں پہ مسکارا لگاتی علیزے آئینے میں اس کا عکس ابھرتا دیکھ کر چونک گئی تھی۔

"ڈ..... ڈرائیور..... تم یہاں....."

علیزے تو بالکل یوں گھبرا گئی تھی جیسے دل آور کو پہلی بار اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر گھبرائی تھی۔

"آپ نے خود ہی تو بلایا ہے بی بی جی!" اسے بھی ڈرائیور کے کریکٹر میں جانے میں ذرا دیر نہیں لگی تھی۔

"میں نے بلایا تھا؟ مگر کب.....؟" علیزے کو اچنبھا ہوا۔

"ابھی..... چند منٹ پہلے..... میں جھوٹ نہیں بول رہا بی بی جی۔" وہ دروازے کے قریب بالکل ایسے ہی کھڑا تھا جیسے منصور حسین کے انداز میں کھڑا ہوتا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں نے تمہیں بلایا ہے؟" علیزے خفگی سے بولی۔

"آپ کی کزن انوشہ بی بی نے....." ڈرائیور کی معصومیت کی بھی انتہا ہو چکی تھی۔

"اوہ..... انوشہ؟" علیزے چپ چاپ جانے والی انوشہ کی شرارت سمجھ گئی تھی۔

"اب آپ بتایئے۔ میرے لیے کیا حکم ہے آخر؟ چلا جاؤں یا کھڑا رہوں؟"

دل آور مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا، وہ زنک اور سلور کلر کی کامدار فراک اور چوڑی دار پاجامے میں مکمل سی تیاری میں کھڑی سیدھی دل پہ لگ رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں بے ربط سی ہونے لگی تھیں۔

"ہوں..... کھڑے رہو..... جب تک میں نہ کہوں، یہاں سے ہلنے کی بھی کوشش مت کرنا۔"

علیزے دو سیکنڈ سوچنے کے بعد اسے حکم دیتی ہوئی دوبارہ سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف پلٹی تھی۔

"آنکھیں بند کر لوں یا دیکھتا رہوں؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"دیکھتے رہو۔" وہ اطمینان سے اپنے سابقہ کام میں مصروف ہو گئی۔

مگر دل آور نہ نہیں سکا تھا اور اس نے آہستہ آہستہ قدم علیزے کی طرف بڑھا دیئے تھے۔

"یہ سراسر ناانصافی ہوئی ہے بی بی جی! آپ کے حکم کی تعمیل میں کھڑا رہوں، یہ تو سیدھا سیدھا ظلم ہوا ایک ڈرائیور..... آپ کو کم از کم اپنے ڈرائیور کی حالت پہ ہی رحم آنا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ یہاں کوئی بھی کسی پہ ترس نہیں کھاتا۔ اس لیے کسی کے حکم کی تعمیل کرنے سے اور اپنی سعادتمندی ظاہر کرنے سے بہتر ہے کہ بندہ حکم عدولی سے کام لے اور بدتمیز اور بداخلاقی ظاہر کرتا ہوا سب کچھ حاصل کر لے..... ہے نا۔"

دل آور آہستہ روی سے قدم بہ قدم چلتا علیزے کے قریب پہنچ گیا تھا اور وہ اسے اپنے عقب میں دیکھ کر بے ساختہ چیخ اٹھی تھی۔ دل آور نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"اف علیزے بی بی! پاگل مت بنو۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور آپ یوں چیخیں مار رہی ہیں لوگ سمجھیں گے کہ ڈرائیور نے اپنی علیزے بی بی پر تشدد شروع کر دیا ہے۔"

دل آور نے اسے سمجھانا چاہا تھا مگر اپنے منہ پہ رکھے ہاتھ کی وجہ سے علیزے کی آنکھیں اُبلنے کو ہو گئی تھیں جس کا اندازہ دل آور کو اس کا عکس آئینے میں دیکھ کر ہوا تھا وہ دونوں آئینے کے سامنے ہی کھڑے تھے۔

"ارے کیا ہو گیا؟ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟" دل آور نے گھبرا کے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

''مم..... میری لپ اسٹک..... میرا میک اپ..... اُف..... ڈرائیور.....'' وہ اس کے ہاتھ رکھنے اور اپنا میک اپ اور لپ اسٹک وغیرہ خراب ہونے کے غم میں روہانسی سی ہو گئی تھی۔

اور سچ مچ رو دینے کو تھی اور دل آور اسے بچوں کی طرح منہ بسورتے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

لیکن علیزے بُری طرح بدک گئی تھی۔

''سوری یار! ہیوٹیشن کو بلواتا ہوں۔''

''میں ٹھیک کر لوں گی تم جاؤ یہاں سے اور نیچے جا کر میرا انتظار کرو۔'' وہ غصے سے بولی تھی۔

''تم تو ایسے حکم دے رہی ہو جیسے سچ مچ تمہارے سامنے تمہارا شوہر نہیں ڈرائیور کھڑا ہو۔'' دل آور نے اسے گھورا تھا۔

''پلیز ڈرائیور! میں لیٹ ہو جاؤں گی۔'' وہ پھر سے روہانسی ہوئی۔

''اوکے جاتا ہوں..... مگر ایک شرط پہ.....'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''شرط..... کیا.....؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''آج اپنے ہاتھوں پہ مہندی لگاؤ گی نا؟'' دل آور کو نجانے کہاں سے اس نے ہاتھوں پہ مہندی دیکھنے کا شوق آ گیا تھا کہ علیزے ڈرا دیر کے لیے ٹھہر گئی تھی۔

''کیوں؟''

''بس ایسے ہی مجھے شوق ہو رہا ہے۔'' اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ علیزے انکار نہ کر سکی۔

''ہوں..... لگاؤں گی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''اور میرے ساتھ گھر بھی چلو گی۔''

''لیکن ڈرائیور.....'' وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

''پلیز علیزے! اکیلے رہنے کی عادت بھول گیا ہوں، صبح سے تم گھر پہ نہیں ہو تو صبح سے اپنا ہی گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے، یہ چند گھنٹے میں نے کس طرح گزارے ہیں، یہ میں ہی جانتا ہوں۔'' دل آور کی بات ہی کچھ ایسی تھی کہ سیدھی علیزے کے دل پہ لگی تھی اور اس کا دل تڑپ گیا تھا۔

''اٹس اوکے ڈرائیور..... ڈونٹ وری..... میں چلوں گی گھر..... یہ فنکشن تو ختم ہو جائے۔''

وہ بھلا اس کی اُداسی یا افسردگی کب برداشت کر سکتی تھی۔ فوراً ہامی بھر لی تھی۔

''مریم کے گھر بھی جانا ہے، عدیل ہمارا انتظار کر رہا ہو گا، نبیل کی فیملی بھی یہاں سے واپسی پہ عدیل کے گھر ہی جائے گی۔'' اس نے علیزے کو آگاہ کیا۔

''ہوں..... ٹھیک ہے..... میں بھی تب تک تیار ہو جاتی ہوں۔'' وہ سر ہلاتی پھر سے مصروف ہو گئی۔ ''اور کوئی حکم'' دل آور پھر شرارت سے بولا تھا جس پر علیزے نے اسے گھورتے دیکھا وہ ہنستا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

پتھر پانی ہو جاتے ہیں
لوگ کہانی ہو جاتے ہیں
ایسا وقت بھی آ جاتا ہے
کہ دشمن جانی ہو جاتے ہیں

♥

ان سب کی شادیاں بخیر و خوبی انجام پا گئی تھیں۔

اور شادیوں کے ہنگامے سرد پڑتے ہی سب کی زندگی روٹین پہ آ گئی تھی ہر کوئی اپنی اپنی پریکٹیکل لائف میں مصروف ہو چکا تھا۔

البتہ نئی نئی شادیوں والے ہنوز نئے نئے چونچلوں میں مصروف تھے۔

''کیا خیال ہے ایک چکر مری کا ہو جائے؟'' صبح ناشتے کی ٹیبل پہ شوشا جوت نے چھوڑا تھا۔

"واؤ..... مری..... کیا خوب آئیڈیا ہے جودت بھائی۔" لڑکیوں نے بہت زیادہ خوشی سے کام لیتے ہوئے اس کے آئیڈیے کو سراہا تھا۔ جبکہ آذر اور دانیال اس کے آئیڈیے پہ ذرا بھی ایکسائیٹڈ نہیں ہوئے تھے۔ چپ چاپ خاموشی سے بیٹھے ناشتہ کرتے رہے تھے۔

"کیا بات ہے آپ لوگوں کا مری جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا۔" جودت نے ان کی خاموشی اور ان کی بے نیازی فوراً نوٹ کی تھی۔

"نہیں..... ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے تو یہ آئیڈیا سب کے لیے دیا ہے۔"

"تو تم اکیلے ہو بھلا؟ مریم ہے نا تمہارے ساتھ..... شادی تمہاری ہوئی ہے سب کو کیوں انوالو کر رہے ہو۔" آذر نے حیرت ظاہر کی۔

"تو آپ کیوں نہیں جا رہے؟" جودت کا جوش بجھ گیا تھا۔

"کیونکہ ہم سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں اس لیے۔" آذر کے جواب پہ جودت کے پہلو میں بیٹھی مریم جودت کو بیوقوف بنائے جانے پہ اپنی مسکراہٹ دبا گئی تھی کیونکہ اسے کومل اور حرمت نے شام کو ہی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ پرسوں کی فلائٹ پہ ہنی مون کے لیے سوئٹ آف کنٹری جا رہے ہیں۔ "سوئٹزرلینڈ..... مگر آپ نے پہلے تو نہیں بتایا۔" جودت ابھی تک حیرت کے دھچکے سے باہر نہیں آیا تھا۔

"ہم نے سوچا جب جائیں گے تو پتا چل جائے گا۔" آذر نے کندھے اچکائے۔

"اور دانیال بھائی؟" اس نے اب دوسرے پیل کا پوچھا حرمت الگ چہرہ جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔

"وہ لوگ جرمنی جا رہے ہیں۔ ہم نے بھی جرمنی ہی جانا تھا مگر کومل کو سوئٹزرلینڈ جانے کا شوق تھا تو میں نے سوچا ہم سوئٹزرلینڈ ہی چلے جاتے ہیں۔" آذر کی انفارمیشن کے بعد جودت کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"اور ہم؟" اس کا اشارہ اپنے اور مریم کی طرف تھا۔

"کیا مطلب؟ تم لوگ تو مری جا رہے ہو نا۔ تم نے خود ہی تو کہا ہے۔"

آذر نے حیرانی سے کہا تھا اور جودت ضبط کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"مگر میں نے تو یہ آئیڈیا آپ سب کے ساتھ مل کر جانے اور انجوائے کرنے کے لیے سوچا تھا۔ اب اگر آپ نہیں جا رہے تو میں کیسے؟" جودت بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا تھا۔

"ہوں..... تو گویا اب تم مری نہیں جا رہے؟ تمہارا ارادہ بدل گیا ہے؟" آذر چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے بولا۔

"ویسے تمہارے لیے میرا خیال ہے کہ سری لنکا یا بنگلہ دیش بیسٹ رہے گا۔ وہاں جا کر ہنی مون کے لیے۔ ہے نا گائز....." آذر نے کہتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھا تھا اور ان سب کے ساتھ ساتھ مریم کی بھی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ وہ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اپنی ہنسی نہیں روک پائی تھی۔ "آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟" جودت خفا ہوا۔

"مریم بیٹا! اس سے تو ہمیں کسی بھی قسم کی تفریح کی امید نہیں ہے۔ اس لیے اب تم ہی اسے جا کر سمجھاؤ کہ ہم اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا اس کا بھلا سوچ رہے ہیں۔"

آذر ناشتہ ختم کرنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی تقلید میں کومل بھی اٹھ گئی تھی۔ کیونکہ آذر آج شادی کے بعد پہلی بار آفس جا رہا تھا۔ اس لیے وہ اسے چھوڑنے گاڑی تک آئی تھی۔

"میری مانو تو اب آفس بھی میرے ساتھ ہی چلو۔" آذر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے مسکرایا تھا۔

"میرا بس چلے تو یہ بھی کر لوں۔" کومل کے چہرے پہ اک شرمگیں سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"فی الحال تو تم سوئٹزرلینڈ چلنے کی تیاری کرو تو بڑی بات ہے۔ باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی۔ آذر کا لہجہ اور نظریں معنی خیز سے ہو گئے تھے۔ اسی لیے کومل جھینپ کر اسے ہاتھ ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی اور آذر اس کے بیش چہرے سے لطف اندوز ہوتا گاڑی نکال لے گیا تھا۔

♥

جیسے ہی مریم اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آن وارد ہوا تھا اور مریم کو پتا تھا کہ اسے کیا بے چین لاحق ہے۔

"مریم..... بتاؤ..... آذر بھائی کیا کہہ رہے تھے۔ کیا بھلا سوچ رہے ہیں میرا۔" اسے تجسس ہو رہا تھا۔

"یہی کہ ہم لوگ مری چلے جائیں۔" وہ بھی لاپروائی سے بولی۔

"لیکن میں اب مری نہیں جاؤں گا۔ وہ اپنی بیویوں کو لے کر جرمنی اور سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں تو میں اپنی بیوی کو لے کر مری کیوں جاؤں؟ ہم بھی یورپ ہی جائیں گے۔" وہ بچوں کی طرح ضد اور مقابلے پہ اُتر آیا تھا۔

"کیا یورپ جانا ضروری ہے۔" وہ بڑے سکون اور بڑے تحمل سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ضروری ہے۔ اب ضروری ہی ہے۔ اب ہر حال میں جاؤں گا اور وہاں جاؤں گا، جہاں تمہیں پسند ہو۔" وہ تو جیسے حیران ہی گیا تھا۔

"ہاں تو ہم وہیں جا رہے ہیں نا جہاں مجھے پسند ہے۔" مریم نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب..... ہم کہاں جا رہے ہیں؟" وہ چونکا۔

"پیرس..... خوشبوؤں کے شہر۔" مریم بہت دھیما سا بولی تھی۔

"واٹ..... پیرس....." وہ حیرت سے اُچھل پڑا۔

"ہاں پیرس..... آذر بھائی نے ہماری فلائٹس پیرس کے لیے کنفرم کروائی ہیں۔ انہوں نے خود مجھ سے پوچھا تھا کہ تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو۔ تو پھر میں نے ان کے بہت اصرار کے بعد پیرس کا کہا تھا۔" مریم نے اسے اصل بات سے آگاہ کیا۔

"تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ سب کے ساتھ مل کر مجھے بیوقوف بنا رہی تھیں؟" جودت نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تھا۔

"بیوقوف نہیں بنا رہی تھی، بلکہ یہ دیکھ رہی تھی کہ آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے اور آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کیا احساسات رکھتے ہیں آپ؟" مریم کے دل سے بے رُخی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اسے جودت جیسے سر پھرے کی محبتوں اور شدتوں پہ یقین آ چکا تھا۔ اسی لیے وہ اس کی خفگیوں پہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"پھر کیا پتا چلا تمہیں؟" وہ عین اس کے سامنے آ رکا تھا۔

"یہی کہ آپ بے شک تھوڑے سے ضدی ہیں، ہٹ دھرم ہیں، سر پھرے ہیں، کم عقل ہیں، غیر ذمہ دار ہیں، لیکن پھر بھی..... پھر بھی..... میرے معاملے میں بہت سمجھدار ہیں آپ اور یہ بھی کہ محبت کرنا بھی جانتے ہیں۔" مریم اس کی شرٹ کے بٹنوں کو چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔

"سچ میں محبت کرنا جانتا ہوں۔" وہ ایک دم اس کی آخری بات پہ ایکسائیٹڈ ہوا تھا۔

"ہاں..... مگر..... وہ..... نن..... نہیں..... میرا مطلب تھا کہ....."

مریم روانی میں ہاں تو کہہ گئی تھی۔ لیکن اس کی اتنی ایکسائٹمنٹ پہ نظر پڑتے ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی تھی، کیونکہ اس کے تیور ہی کچھ ایسے تھے۔ مگر مریم کے منہ سے نکلی بات دیر ہو چکی تھی اور جودت نے اس کے بچاؤ اور فرار کے تمام ارادے اور راستے مسدود کر دیئے تھے۔

♥

وہ کب سے عدیل کے نمبر پہ کال کر رہی تھی، لیکن وہ کال ہی ریسیو نہیں کر رہا تھا اور مدیحہ کو بیٹھے بیٹھے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ گاڑی کی چابی لے کر اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔

"کہاں جا رہی مدیحہ؟" ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے مومنہ کی آواز نے ہی روکا تھا۔

"بھابی! پتا نہیں کیا مسئلہ ہے؟ میں عدیل کو کال کر رہی ہوں، وہ ریسیو نہیں کر رہا۔ ورنہ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔" مدیحہ کی پریشانی دیدنی تھی۔

"ان کی طبیعت خراب ہے۔ نبیل بتا رہے تھے کہ آج آفس بھی نہیں آئے۔" مومنہ نے اسے اک اور پریشان کن خبر سنا دی تھی۔

"اچھا..... مگر مجھے تو آنٹی اور ایمن نے بھی نہیں بتایا۔ ابھی دن میں ہی بات ہوئی ہے ان سے۔ انہوں نے شاید مریم سے

بلنے کے لیے بڑی حویلی جانا تھا۔ وہ آج شام اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ہی سون کے لیے پیرس جا رہی ہے۔" مدیحہ کی فکرمندی میں اور سے اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"تو تم خود جا کر پتا کر لو نا۔" مومنہ نے اک نیک مشورہ عنایت کیا تھا۔

"ہوں..... وہ تو میں جا ہی رہی ہوں، مگر عجیب بات یہ ہے کہ نہ اس نے خود بتایا اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔" وہ متذبذب کا شکار متفکر سے لہجے میں کہتی وہاں سے نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے مومنہ صوفے پہ کشن درست کر کے رکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

"ہیلو..... خیریت تو ہے نا؟" آفس سے واپسی پہ کپڑے وغیرہ چینج کر کے نبیل واپس ڈرائنگ روم میں آیا ہی تھا کہ مومنہ کو اکیلے مسکراتے دیکھ کر دلچسپ تعجب ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟" مومنہ اپنی مسکراہٹ دبا نہیں سکی تھی بلکہ اور گہری ہو گئی تھی۔ "یہ اکیلے اکیلے مسکرانا کوئی اچھی علامت تو نہیں ہے نا لیا۔" نبیل دلچسپی سے کہتا صوفے پہ براجمان ہو گیا تھا۔

"میں اکیلے اکیلے کب مسکرا رہی ہوں؟ میں تو آپ کے سامنے مسکرا رہی ہوں۔" مومنہ کے انداز میں بھی بیویوں والی اک خصوصی ہی ادا تھی۔ جس پہ نبیل کو بڑا ہی چھوٹا سا احساس چھو کے گزرا تھا اور دل کی دھڑکنوں نے ساز بدلے تھے۔

"سامنے مسکرا رہی ہو نا۔ مگر میں تو ابھی آیا ہوں۔" نبیل نے اپنے قریب صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"نبیل....." مومنہ اس کی بات پہ جھینپ گئی تھی۔

"اف یار! اتنا عرصہ ہو گیا ہے ہماری شادی کو..... تم ابھی تک گھبرا جاتی ہو، حالانکہ تم جانتی ہو..... اب تو ہمیں فرینڈز کی طرح بے تکلف ہو کر رہنا چاہیے۔" نبیل جواباً خفگی سے بولا تھا۔

"مم..... مگر..... نبیل....." وہ بیچاری ہکلا گئی تھی۔

"اسی لیے تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارا دوست بھی ہوں۔ اتنا نہیں گھبرایا کرو۔"

"مم..... مگر..... نبیل..... وہ..... آئی..... کیا سوچیں..... گی..... کہ ہم....." مومنہ نے اسے ٹالنا چاہا۔

"مومنہ! کیا کہا ہے میں نے..... ادھر آؤ..... میرے پاس بیٹھو۔" اب کی بار وہ ذرا جھڑک کر بولا تھا اور مومنہ مرے مرے قدم اٹھاتی اس کے برابر صوفے پہ آ بیٹھی تھی۔

"سیدھی ہو کر بیٹھو۔" اس نے حکم جاری کیا اور مومنہ آہستگی سے سیدھی ہو بیٹھی تھی اور مومنہ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق رخ اس کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"مومنہ....." اس نے تنبیہ کرنے والے لہجے میں پکارا تھا۔

"جج..... جی....." مومنہ کے حلق سے آواز نکلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

"نبیل بیٹا! اگر تم فارغ تھے تو عدیل کے گھر سے ہی ہو آتے..... اتنے دن ہو گئے کوئی خیر خبر نہیں لی ان لوگوں کی؟" فائزہ بیگم اچانک ہی اپنے دھیان میں باتیں کرتی ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں اور مومنہ ان کی آواز سنتے ہی یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اور کوئی بھی بات سنے بغیر سیدھی اپنے روم کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ یوں جیسے اسے رہائی مل گئی ہو اور نبیل سیڑھیاں پھلانگتی مومنہ کی عجلت اور سرپٹ بھاگنے کا انداز دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے نبیل؟ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں اور تم مسکرائے جا رہے ہو؟" فائزہ بیگم نے ذرا سی خفگی سے کہا۔

"نام..... ابھی سچ پوچھیں تو مجھے کوئی بھی بات سمجھ نہیں آ رہی۔ ابھی میرا دھیان آپ کی بہو کی طرف ہے۔ اسے مجھ سے کوئی کام ہے، میں ابھی آیا۔"

نبیل، فائزہ بیگم کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے بڑے لاڈ اور پیار سے کہتا خود بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور فائزہ بیگم پہلی بار اس کے موڈ کی ایسی شرارت اور شوخی پر مسکرا کے رہ گئی تھیں اور دل کی گہرائیوں سے اپنے بیٹے اور بہو کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا گی تھی۔

مدیحہ نے گھر کے دروازے پہ دستک دی ہی تھی کہ دروازہ کھلتا چلا گیا تھا اور وہ حیران پریشان سی کھلے دروازے سے اندر آ گئی تھی۔ پورا گھر خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صحن..... برآمدہ..... کمرہ..... سب خالی تھا۔

"ایمن..... ایمان..... کہاں ہو تم لوگ.....؟" وہ اونچی آواز میں پکارتی ہوئی آگے بڑھی تب ہی پورا گھر اس طرح خالی پڑا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"زونیہ..... زونیہ....." وہ باری باری سب کو آوازیں دے رہی تھی۔

مگر جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ بڑے کمرے اور چھوٹے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ البتہ فاروق نیازی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے وہ جھجکتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

"آنٹی..... انکل..... ہیلو....." اس نے پکارتے ہوئے کمرے میں جھانکا تھا۔

کمرے میں عابدہ خاتون تو نہیں تھیں۔ البتہ فاروق نیازی اپنے مخصوص چیئر پہ سو رہے تھے۔ اس لیے مدیحہ نے دوبارہ آواز دینا اور پکارنا مناسب نہ سمجھا اور کمرے کی چوکھٹ سے ہی واپس لوٹ آئی تھی۔

"جن کو پکارنا تھا۔ بس اسی کو نہیں پکارا..... باقی سب کو پکار کے دیکھ لیا۔"

وہ صحن میں آئی ہی تھی کہ اسے عدیل کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے چونک کر چھت کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سیمن سے بنے جنگلے پہ دونوں ہاتھ جمائے کھڑا اپنے صحن کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" مدیحہ اس کی بات نظر انداز کر گئی تھی۔

"سب چلے گئے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر..... مجھے کہا..... لو گھر سنبھالو اپنا۔" عدیل کی غیر سنجیدگی اس کی باتوں سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔

"مگر گئے کہاں؟ پلیز مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔" مدیحہ کو اس کے موڈ سے ہی نظر آ گیا تھا کہ وہ اسے صاف جواب نہیں دے گا، بلکہ ستائے گا۔

"جو چلے گئے ہیں ان کا مت پوچھو، جو ہیں ان کا سوچو۔" وہ ہنوز اسی موڈ میں تھا۔

"پلیز....." جھنجلا گئی۔

"تم میرے لیے آئی ہو یا ان کے لیے آئی ہو؟"

"عدیل پلیز....." وہ اس کا نام تو لے بیٹھی تھی، مگر پھر یکدم ہونٹ بھینچ لیے تھے اور اس کی یہ حرکت چھت پہ کھڑے عدیل نے بھی بآسانی نوٹ کی تھی۔

"کیا ہوا، چپ کیوں ہو گئی ہو؟" وہ دلچسپی سے بولا۔

"میں جا رہی ہوں۔" وہ جھنجلا کر واپسی کے لیے پلٹی۔

"جاؤ..... شوق سے جاؤ..... میں بھی جا رہا ہوں ڈاکٹر کے پاس۔" وہ کہہ کر جنگلے سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

اور مدیحہ کے واپس پلٹتے قدم رک گئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر جنگلے کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے سے ہٹ چکا تھا اور مجبوراً اسے سیڑھیوں کی طرف بڑھنا ہی پڑا تھا۔

وہ کشادہ چھت کے بیچوں بیچ بچھی چارپائی پہ سر جھکائے بیٹھا اپنی ناراضی کا کھلا اظہار کرتا نظر آ رہا تھا۔ مدیحہ آہستہ قدموں سے چلتی عین اس کے سامنے بچھی دوسری چارپائی پہ آ بیٹھی تھی اور سر جھکائے بیٹھے عدیل کی نظریں مدیحہ کے دودھیا پاؤں پہ ٹھہر گئی تھیں۔ بلیک سینڈلز میں مقید اس کے پاؤں ایسی چھب دکھلا رہے تھے کہ عدیل کو نظریں چرانا ہی مناسب لگا تھا۔

"کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟" مدیحہ نے طبیعت پوچھنے میں پہل کی تھی۔

"جو تمہاری طبیعت کو نہیں ہو رہا۔" عدیل نے نظریں اٹھا کر براہِ راست اس کے چہرے پہ نظریں جما دی تھیں۔

"کیا مطلب؟" وہ ناسمجھی سے بولی۔

"یہی بے چینی، بے قراری اور بے بسی۔"

"میں تمہاری طبیعت کا پوچھ رہی ہوں۔" وہ اس کی بات پر الجھی تھی۔

''میں بھی اپنی طبیعت کا ہی بتا رہا ہوں۔ ضروری نہیں کہ طبیعت صرف بخار، کھانسی، زکام سے ہی خراب ہو، طبیعت کبھی کبھی اس طرح بھی خراب ہو جاتی ہے، کیونکہ طبیعت کا سارا دارومدار دل پہ ہوتا ہے۔ انسان کا دل خوش تو سمجھو طبیعت بھی خوش۔'' عدیل نے اسے دلیل دی تھی۔

''یعنی تمہیں بخار، کھانسی، زکام کچھ بھی نہیں ہے۔'' مدیحہ نے مصنوعی خفگی سے دیکھا۔

''نہیں..... میں نے اپنی بیماری بتائی تو ہے۔''

''اوہ یعنی تم نے مومنہ بھابی کے ساتھ مل کر بیوقوف بنایا ہے؟'' وہ اب کی بار ان کا سارا پلان سمجھ گئی تھی۔

''بیوقوف نہیں بنایا۔ ایک اچھا کام کیا ہے۔'' اس کے موڈ میں ہنوز شرارت کا عنصر تھا۔ مدیحہ اپنی خفگی دبا گئی تھی۔

''لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اچھا ہونے کی بجائے کام اور بھی بگڑ جاتا ہے۔'' مدیحہ بڑی دلچسپی سے مسکرائی تھی۔

''آثار تو مجھے بھی کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔ طبیب چاہتا ہی نہیں کہ مریض اچھا ہو۔'' عدیل نے اپنی گدی کے بال کھجاتے ہوئے بڑی آہستگی سے کہا تھا۔ آخر وہ مین اس کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔

''طبیب کے ساتھ دھوکے دہی سے کام نہیں لینا چاہیے نا۔ مرض صاف صاف بتانا چاہیے۔ اس سے شفا جلدی مل جاتی ہے۔''

وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ''طبیب اپنا ہوتے ہوئے بھی پرایا ہو جائے تو پھر ایسے دھوکے دینا مجبوری بن جاتا ہے۔''

''پرایا..... مطلب؟'' اس نے نا سمجھی سے دہرا کے پوچھا۔

''مطلب کہ ایکسچینج منٹ سے پہلے لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، بے تکلف ہیں اور تو اور دو چار ملاقاتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب تو دعا سلام سے بھی گئے۔ ملنا چاہو بہانے سے بیمار ہونے کی اطلاع پہنچانی پڑتی ہے، ورنہ پہلے یہ حالات تو نہیں تھے نا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ایکسچینج منٹ ہی نہ کرواتے۔''

عدیل تو مدیحہ سے دوری کی وجہ سے جیسے بھرا بیٹھا تھا یکدم شکایتوں کا انبار ساتھ لیے پھٹ پڑا تھا اور مدیحہ اس کی صورت دیکھ کر یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''پہلے کی بات اور تھی۔ اب کی بات اور ہے۔ پہلے ہم آزاد تھے۔ اب ہم بندھ چکے ہیں۔ اب ہم میں ایک تعلق ہے، ایک رشتہ ہے۔ اب سب کا دھیان ہماری طرف ہوگا۔ اب سب ہمیں نوٹس کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم فاصلے پہ ہی رہیں۔'' اب اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مدیحہ ہی اسے سمجھاتی ہوئی نظر آتی تھی۔

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم شادی کر لیں۔'' وہ خفگی اور غصے سے تپ اٹھا تھا۔

''تم نے ہی کہا تھا کہ ایمن کی شادی کے بعد اپنے بارے میں سوچوں گا۔ تقریباً ایک یا دو سال بعد.....'' مدیحہ نے اسے اس کا بیان یاد دلایا۔

''اُف توبہ کرو..... چھ ماہ بھی گزر جائیں تو بڑی بات ہے۔ اکیلے بیٹھ کر آہیں بھرنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کسی کو سامنے بٹھا کر آہیں بھر لے۔''

''اوہ یعنی کہ تم آہیں بھرنے کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' مدیحہ نے چوائنٹ اٹھایا۔

''ظاہر ہے طبیب کو تو فی الحال یہی دھوکا دینا ہے نا۔'' وہ کہتے کہتے معنی خیزی سے مسکرایا۔

''شہریار کی فیملی تین ماہ بعد شادی کے لیے زور دے رہی ہے۔ لیکن میں نے ان سے چھ ماہ کا وقت مانگا ہے۔ چھ ماہ میں ایمن کی شادی اور آپ جناب کی رخصتی بھی ہو جائے گی۔ آخر میرے امی، ابو بھی بہو جیسی نعمت سے فیضیاب ہونا چاہتے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' مدیحہ گھبرائی تھی۔

''جو تم سن رہی ہو۔'' وہ البتہ بڑا پُرسکون تھا۔

''مم..... مگر عد..... یل.....'' وہ اس کا نام لیتے لیتے رُک گئی تھی۔ اب وہ اکثر اس کا نام لینے سے گریز کرتی تھی۔

''اب تو تم میرا نام لینے سے بھی گئیں۔ بس یہی کوفت ہوتی ہے مجھے اسی لیے تو شادی کر لینا چاہتا ہوں۔'' وہ دلچسپی سے کہتا ہوا مسکرایا تھا اور مدیحہ یکدم اس کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں چلتی ہوں۔'' جب سے اس کی ایکسچینج منٹ ہوئی تھی۔ اسے واقعی عدیل سے بہت زیادہ شرم آنے لگی تھی۔ اب وہ اس سے

بہت کم ہی ملتی تھی۔ اسی لیے تو عدیل کو آج موسمنہ کی ہیلپ لینا پڑی تھی۔

"رکو تو..... وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر آؤں گی۔" وہ جنگلے کی طرف بڑھی۔ "کب....." عدیل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"جب رخصتی کرواؤ گے۔" مدیحہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے آس پاس کی چھتوں کی طرف دیکھا۔ شام کا وقت تھا کافی سے بھی زیادہ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پہ نظر آ رہے تھے۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی کروالوں۔" وہ بہت مگلت پسند ہو رہا تھا۔

"تو کروالو۔" اس نے اب کی بار کندھے اچکائے تھے۔ اور وہ بھی کافی لاپروائی سے۔

"سچ....." عدیل کو اس کی رضامندی پہ کافی ایکسائٹمنٹ ہوئی تھی۔

"سچ....." وہ بھی جواباً شرارت سے کہتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"مدیحہ..... رکو بات سنو۔" وہ پیچھے سے پکارا تھا۔

"اب ایک بار ہی سنوں گی، جب تم دھوکے سے نہیں بلاؤ گے۔" وہ سیڑھیاں اُترتے ہوئے بولی۔

"یار! کچھ دیر تو رکو نا۔ وہ سب مریم سے ملنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔" عدیل نے دہائی دی۔

"جب وہ سب آ جائیں تو پھر آؤں گی۔ ابھی تم ان کو لینے جانے کی تیاری کرو۔" وہ سیڑھیاں اُتر کر دوبارہ صحن میں آ گئی تھی۔

"میں ان کو لینے نہیں جاؤں گا۔ جو بوت خود انہیں ڈراپ کر دے گا۔" عدیل کا منہ بن چکا تھا مگر مدیحہ نوٹس لینے والی نہیں تھی۔

"اچھی بات ہے۔ او کے اللہ حافظ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"آئی مس یو یار۔" اس نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔ مدیحہ کھنکی، پلٹی اور مسکرا اٹھی تھی۔

"آئی مس یو ٹو....." اس کے لہجے میں بھی محبت کا اک بحر پورا احساس رچا ہوا تھا۔

"کیا؟ پھر سے کہو؟" وہ جنگلے سے ہاتھ ہٹا کر سیڑھیاں اُترنے کے لیے پلٹا تھا۔ مگر تب تک مدیحہ یکدم کھلکھلاتی ہوئی دروازہ کھول کر دہلیز عبور کر گئی تھی۔

اور عدیل کے گھر کا آنگن مدیحہ کی ہنسی اور کھلکھلاہٹ سے گونج اُٹھا تھا۔ جس کو محسوس کر کے خود عدیل بھی مسکرا دیا تھا۔

♥

نہ گلہ ہے کوئی حالات سے، نہ شکایتیں کسی کی ذات سے
خود ہی سارے ورق ہو رہے ہیں جدا، میری زندگی کی کتاب سے

زری چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جب ان دونوں کی نظر بیک وقت اس کی طرف اٹھی تھی۔

"زری..... ناشتہ کرو نا پلیز! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟"

وہ تینوں صبح کے وقت ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ لیکن زری کو یونہی گم صم سا بیٹھے دیکھ کر عبداللہ سے رہا نہیں گیا

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" زری کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"کیوں..... دل کیوں نہیں چاہ رہا؟ اور یہ تم رو رہی ہو کیا؟" عبداللہ اور نگارش دونوں ہی چونک گئے تھے۔

"بھائی! پتا نہیں کیا بات ہے، میرا دل بہت ہی گھبرا رہا ہے۔ بی بی جان سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے ان کے گلے لگ کے زور، زور سے دل کھول کر روؤں۔ اتنا روؤں کہ کبھی چپ نہ ہو سکوں۔" زری کہتے ہوئے خود پہ اختیار نہ رکھ سکی اور بے تحاشہ تڑپ تڑپ کر رو پڑی تھی۔ جس پہ نگارش اور عبداللہ دونوں ہی پریشان ہو اُٹھے تھے۔

"اللہ خیر کرے زری! ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے آخر؟" نگارش نے اپنا ناشتہ چھوڑ کر فوراً زری کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"مم..... میں نے آج خواب میں بی بی جان کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور..... اور تب سے مم میرا دل بھی رو رہا ہے۔ مجھ سے آج ٹھیک سے نماز بھی نہیں پڑھی گئی۔ میرے حلق سے نوالہ بھی نہیں اُتر رہا۔ میرا دل بند ہو رہا ہے بھائی! میرا بی بی جان سے ملنے کا دل چاہ رہا ہے۔ مجھے بی بی جان کے پاس لے چلیں۔ وہ..... وہ..... میرے خواب میں آئی تھیں۔ وہ اکیلی رو رہی تھیں۔"

زری تو رو، رو کر پاگل ہو گئی تھی اور نگارش اور عبداللہ اس نئی پیچویشن پہ اندر سے حد درجہ پریشان اور وہموں اور وسوسوں کا شکار ہو کر

گئے تھے۔

"پلیز زری! سنبھالو اپنے آپ کو اللہ بہتر کرے گا۔" تم دعا کرو۔ ہم ابھی بی بی جان کو فون کرتے ہیں۔" نگارش نے اسے دلاسا دیا مگر زری کو صبر کیسے آتا بھلا؟ وہ بچی ہی تو تڑپ رہی تھی۔ اس کا دل اور اس کی رگوں میں بہتا خون اسے سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔

"صاحب جی! باہر آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔" ملازمہ بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی تھی۔

"مجھ سے..... اتنی صبح صبح....." عبداللہ کے دل میں خدشے نے سر ابھارا تھا۔

"السلام علیکم!" انسپکٹر شہباز اور ایس پی کامران مہدی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے اور ان کے پیچھے دل آور اور نبیل حیات بھی صورتیں دکھائی دی تھیں۔

"وعلیکم السلام! خیریت..... آپ سب یہاں۔" عبداللہ سے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے سب کے سب ہی بہت پریشان نظر آئے تھے۔

"ایم سوری ملک عبداللہ! ہمیں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنانی پڑ رہی ہے کہ آپ کے بڑے بھائی ملک اسد اللہ! ملک حق نواز کو جیل سے فرار کرواتے ہوئے پولیس فائرنگ سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی ڈیڈ باڈیز پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ آپ جا کر تصدیق کر سکتے ہیں۔"

ایس پی کامران مہدی نے بہت ہی تحمل سے یہ خبر سنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر پھر بھی عبداللہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ وہ کھڑے قدم سے لڑکھڑا گیا تھا۔ مگر ان دونوں نے اسے تھام لیا تھا۔ "بھائی....." عبداللہ کے ہونٹ کپکپائے تھے۔ اس نے دل آور اور نبیل کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بس یہی اللہ کو منظور تھا شاید..... صبر سے کام لیں۔" ایس پی کامران مہدی نے بھی آگے بڑھ کے عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"بی بی جان!" زری خاصی بلند آواز سے کرلائی تھی۔ اس کا خواب سچ ثابت ہوا تھا۔

"دیکھیے زرین! یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ یہ رونا دھونا سب فضول ہے۔ ہماری زندگیوں میں جو بھی ہوتا ہے۔ اللہ کی رضا سے ہی ہوتا ہے۔ پلیز سنبھالیے اپنے آپ کو..... ابھی آپ لوگوں نے یہ ڈیڈ باڈیز لے کر اپنے گھر بھی جانا ہے۔" انسپکٹر شہباز نے زری کو بہت اپنائیت سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی تھی۔ بلکہ وہ دونوں میاں، بیوی ہی ان لوگوں کی ڈھارس بندھانے میں لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ دل آور شاہ کے حوالے سے وہ نبیل حیات اور عبداللہ کی فیملی کی بھی بہت عزت و احترام کرتے تھے۔

اور اب تو وہ دونوں (انسپکٹر شہباز اور ایس پی کامران مہدی) شادی کر چکے تھے اور ان کا شمار بھی اب دل آور شاہ کے قریبی احباب میں ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ ان لوگوں کے غم میں برابر کے شریک نظر آ رہے تھے۔

"عبداللہ! چلو پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے اور....." دل آور نے اس کا بازو سہلایا۔

"نہیں..... دل آور..... نہیں..... میں، میں ایسے نہیں جا سکتا..... میں بی بی جان کے سامنے اپنے بھائی کی ڈیڈ باڈی لے کر نہیں جا سکتا۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔" عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"تم اکیلے نہیں ہو عبداللہ! ہم ہیں نا تمہارے ساتھ۔" نبیل نے اس کا کندھا تھپکا تھا اور عبداللہ ان دونوں کے کندھے سے لگ کر بے اختیار رو پڑا تھا اور اتنی شدت سے رویا تھا کہ نبیل اور دل آور کی آنکھیں بھی نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

اور پھر یونہی روتے بلکتے ہوئے وہ اسے پولیس اسٹیشن لے کر پہنچے تھے، جبکہ زری نے گھر پہ ہی رو رو کر برا حال کر رکھا تھا اتنے میں فائزہ بیگم، مومنہ بی بی، رمیحہ اور علیزے بھی وہاں پہنچ گئی تھیں انہیں دل آور کا خاص آدمی "مبارک خان" چھوڑ کر گیا تھا۔

اور جب وہ سب عبداللہ کے سامنے ڈیڈ باڈیز لے کر ان کی حویلی اور ان کے گاؤں پہنچے تھے تو ہر طرف اک کہرام سا مچ گیا تھا۔ پولیس، میڈیا اور جان پہچان کے سب لوگ ایک دم سے جیسے سمندری ریلے کی طرح امڈ کر آئے تھے اور کانوں پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

♥

زندگی ہے یا کوئی طوفان
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

آج ان کا سوئم تھا۔ بڑی حویلی سے دانیال اور عائشہ آفندی آئے تھے تو ان کی دیکھا دیکھی بڑی حویلی کے باقی سب افراد کو بھی آنا ہی پڑا تھا، لیکن جیسے ہی آسیہ آفندی آئی تھیں زری کے ضبط کا دامن پھر سے چھوٹ گیا تھا اور وہ ان کے گلے لگ کے دھاڑیں مار کے روئی تھی۔

کیونکہ آسیہ آفندی بھی اس گھر کی اکلوتی بیٹی تھیں لیکن رشتوں کی ڈوریوں میں الجھ کر اتنے سال اپنوں سے بچھڑ کر گزار دیے تھے، زندگی کا کوئی سکھ انہوں نے بھی نہیں دیکھا اور زندگی کا کوئی سکھ زری کے نصیب میں بھی نہیں تھا، وہ نصیب اور قسمتوں کے حوالے سے واقعی ایک دوسرے سے کم نہیں تھیں۔

"زری..... پلیز بس کریں۔" علیزے نے رو رو کر نڈھال ہوتی زری کو کندھے سے تھام کر تسلی دینے کی اور سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"زری! پلیز کیوں رو رہی ہیں آپ؟ کیوں..... بس کریں بہت ہو گیا اور کتنا روئیں گی آخر؟" علیزے اسے سمجھانے کے لیے اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

"کیا روؤں بھی نہ؟" زری بڑے اذیت بھرے لہجے میں بولی تھی اور علیزے کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا وہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔

پھر جتنی دیر بھی وہ لوگ وہاں رہے تھے علیزے نے دوبارہ کچھ نہیں کہا تھا، وہ شام ڈھلے تک وہاں بیٹھے تھے اور بالآخر جیل اور دل آور کو ہی وہاں سے اٹھنے کا اور واپسی کا خیال آیا تھا۔

"علیزے! گھر چلیں؟" مردان خانے سے نکل کر دل آور زنان خانے کی طرف آیا تھا اور پردے کی اوٹ سے نظر آتی علیزے کو آواز دی تھی۔

"جی..... آ رہی ہوں بس؟" علیزے اسے جواب دیتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اسے اٹھتے دیکھ کر زری بھی جیسے اپنے حواسوں میں لوٹ آئی تھی اور اس نے یکدم علیزے کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"علیزے! ایم سوری..... میرے منہ سے کوئی غلط یا سخت الفاظ نکل گئے ہوں تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تم سے ایسا بولنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو بہت عزیز ہو مجھے۔ اللہ تمہیں سدا سہاگن رکھے۔ ہمیشہ خوش رکھے، آباد رکھے۔" زری نے اسے گلے دل سے دعا دی تھی اور نادانستہ غلطی کی معافی چاہی تھی۔ جس پہ خود علیزے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

اور علیزے بے اختیار اس سے لپٹ گئی تھی پھر وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سمیٹ کر بہت زیادہ اور بے تحاشہ روئی تھیں۔

"علیزے! دیر ہو رہی ہے۔" دل آور نے پھر سے آواز دی تھی اور علیزے روتی بلکتی ہوئی زری سے الگ ہوئی تھی لیکن اس سے الگ ہوتے ہوئے بھی علیزے نے اس سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی کہ زری اپنی جگہ پہ جمی رہ گئی تھی۔ اس کے اعصاب گم سم سے ہو گئے تھے۔

"علیزے....." زری کے ہونٹ بڑی طرح کپکپائے تھے مگر علیزے نظریں پھیر کر پلٹ گئی تھی۔

"علیزے....." زری نے اسے پھر پکارنے کی اور روکنے کی کوشش کی تھی۔

مگر علیزے زنان خانے کا جالی دار پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی تھی اس نے زری کی آواز پہ کان نہیں دھرے تھے بلکہ آگے بڑھ کر دل آور کے ساتھ ہو لی تھی۔

"علیزے....." زری رو نہ سکی اور ان کے پیچھے لپکتی ہوئی نگے پیر باہر تک بھاگی آئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے اور زری وہیں حویلی کے برآمدے کے بڑے بڑے ستونوں کے پاس ہی ٹھہر گئی تھی۔ اب کی بار اسے پکارنے کی اسے ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ البتہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے دل آور اک بے ارادہ سی نظر اٹھی تھی اور ستون کے ساتھ کھڑی زری کی نظروں سے جا ٹکرائی تھی اس لمحے دل آور کو لگا حویلی کے ان بڑے بڑے ستونوں کے ساتھ زری نہیں بلکہ "عشق" کھڑا ہو سر سے پاؤں تک عشق..... ننگے سر اور ننگے پیر..... ہجر اور غم کے رنگ اوڑھتا ہوا۔

وہ عشق کی آنکھوں سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا اسی لیے نظریں چرا گیا تھا اور نظریں چرانے میں بس ایک لمحہ لگا تھا، ہمیشہ کی بس اک لمحہ.....

اور پھر یکدم سر جھٹکتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھا اور زری کے سامنے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا۔ پھر اس کے پیچھے ہی نبیل اور وغیرہ کی گاڑی رخصت ہوئی تھی اور پھر زری کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے.....

♥

سات سال بعد

تیرے عشق میں

ہائے تیرے عشق میں

راکھ سے روکھی، کوئل سے کالی

رات کٹے نہ ہجراں والی

تیرے عشق میں

ہائے تیرے عشق میں

ہر سو مکمل سا اندھیرا تھا، کیونکہ چاند کی پندرہویں رات تھی، اب چاند گھٹنے کے تراز و میں تل رہا تھا اور چاند کے ساتھ ساتھ وہ کئی دن یہ دن گھٹتی جا رہی تھی اور اسی گھٹنے کی کیفیت میں گاؤں کے کھیتوں میں دور کہیں کسی دل جلے کے دل کی جلن ان سروں میں سمیٹ فضا میں گونجتی ہولی سنائی دے رہی تھی۔

اور زری کا کسی تازہ زخم کی طرح رستا ہوا عشق پھر سے بلبلا اٹھا تھا اور وہ پھر سے درد اور اذیت سے نڈھال ہو گئی تھی۔

اور ان سات سالوں میں تو ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔ جیسے ہی عشق کے زخم پہ صبر کا کھرنڈ آنے لگتا تھا، پھر کوئی یاد چوٹ کی طرح لگتی تھی اور کھرنڈ پھر سے چھیل کر رہ جاتا تھا اور وہ پھر سے درد اور اذیت سے بلک اٹھتی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے تنہائی کے لمحات میں پھر سے نم ہونے لگتے تھے حالانکہ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا۔

دل آور شاہ اور علیزے شاہ کے دو بچے بھی ہو چکے تھے، وہ اپنی زندگی میں بہت پرسکون اور مگن تھے، ان کی زندگی ایک خوشحال زندگی کی مثال تھی اور یہی حال عبداللہ اور نبیل حیات کا بھی تھا وہ دونوں بھی صاحب اولاد ہو چکے تھے اور اللہ کی اس کرم نوازی پہ ہمیشہ شکر گزار بھی رہتے تھے۔

کیونکہ اللہ نے انہیں اپنی رحمتوں اور اپنی نعمتوں سے نوازا تھا، کسی بھی شے سے محروم نہیں رکھا تھا اس کے لیے وہ بھی انصاف ایسا ذمہ داری اور رحمدلی کا چلن چلتے تھے۔

عبداللہ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں آتے ہی دانیال اور زین کا جائیداد میں سے حصہ ان کے نام کر دیا تھا اور خود اسد اللہ کے ساتھ مل کر کاروبار بھی کرتا تھا مگر پھر بھی گاؤں کے بیوی بچوں کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھا تھا، حالانکہ وہ شہر میں نبیل اور دل آور کے ساتھ مل کر کاروبار بھی کرتا تھا مگر پھر بھی گاؤں آنا جانا اور سب کا خیال رکھنا نہیں بھولتا تھا، خصوصاً زری کا البتہ یہ الگ بات تھی کہ زری نے بھی خود کو بی بی جان، بابا جان، حویلی، گاؤں اور اسد اللہ کے بیوی بچوں میں گم کر لیا تھا، اب ان سب کے مسائل ہوتے یا زری ہوتی تھی۔

ان سات سالوں میں ایک بار بھی نہ وہ شہر گئی تھی اور نہ ہی شہر سے کوئی آیا تھا، ہاں سات سال پہلے کا اک منظر آج بھی اس کے دل و دماغ پہ تازہ تھا اور حویلی کے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا اس کا عشق بھی ہنوز تازہ تھا۔ ایسا تازہ جیسے گلاب کا پھول..... سرخ..... مہکتا ہوا..... لودیتا ہوا.....

اور ایسی ہی اک لودیتی ہوئی علیزے شاہ کی سرگوشی بھی اس کے کانوں میں تازہ تھی اور اسی تازہ سرگوشی کا زہر پل پل اس کی رگوں میں اترتا رہتا تھا۔

اور وہ پل پل مرتی رہتی تھی۔

کیونکہ علیزے کی سرگوشی ہی کچھ ایسی تھی

زری..... عشق ننگا ہوتا ہے اور محبت پردہ
محبت کو عشق پہ ڈال دو تو عشق چھپ جاتا ہے
بالکل ایسے جیسے علیزے کے وجود سے زری چھپ جاتی ہے
اس لیے تم بھی سمجھ جاؤ کہ تم عشق ہو اور میں محبت
میں ظاہر ہوں اور تم چھپ گئی ہو
میں تمہارا پردہ ہوں
کیونکہ یہ سچ ہے کہ دل آور شاہ زری سے ہی عشق کرتا ہے
بس اس نے محبت کا پردہ ڈال دیا ہے
ورنہ عشق تو اسے آج بھی ہے
ورنہ عشق تو اسے آج بھی ہے
ورنہ عشق تو اسے
یہ الفاظ اور یہ سرگوشی اس کے "دردل" پہ دستک دیتے رہتے تھے اور وہ پاگل ہوتی رہتی تھی.....!!

(تمت بالخیر)

PRIME URDU NOVELS
PRIME URDU NOVELS
نیوز کی لائبریری اینڈ فرینڈ شپ پوائنٹ
سائٹ سٹرم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
ہے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خریدوفروخت کی بھی جاتی ہے
رمضان بلڈنگ 63 صدر پاکستان چوک